علم الکتاب

جلد اول

از

خواجہ میر درد رحمہ اللہ

ترجمہ

ڈاکٹر عبد اللطیف

ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ

۲۔ کلب روڈ ○ لاہور

عِلمُ الکتاب

از

خواجہ میر درد رحمۃ اللہ

ترجمہ

ڈاکٹر عبدُاللطیف

اِدارۂ ثقافتِ اسلامیہ

۲۔ کلب روڈ ○ لاہور

سنہ اشاعت

تعداد 500

ناشر ڈاکٹر رشید احمد جالندھری
ناظم ادارہ ثقافت اسلامیہ

قیمت

مطبع نیو فائن پرنٹنگ پریس، لاہور

یہ کتاب اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد کے تعاون سے شائع کی گئی۔

فہرست مضامین

پیش لفظ

اٹھارویں صدی عیسوی میں جن شعراء نے اردو شاعری میں نام پیدا کیا' ان میں ایک نمایاں شخصیت خواجہ میر درد (۱۷۸۵-۱۷۱۹ء) کی ہے۔ درد کے والد خواجہ ناصر عندلیب ایک پیر روشن ضمیر تھے۔ درد نے انہی سے سلوک و معرفت کی تعلیم پائی تھی۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں بہ قول محمد حسین آزاد "کسی کی ہجو سے زباں آلودہ نہیں ہوئی۔" اپنے والد کے علاوہ انہوں نے اپنے عہد سے بہت کچھ سیکھا۔

میر درد نے ایک زوال پذیر معاشرے میں آنکھیں کھولیں' جہاں اجتماعی زندگی کا توازن بگڑ چکا تھا۔ زندگی کی بلند قدریں' صحت مند روایات اور خوب سے خوب تر کی تلاش میں انسانی ولولوں اور سعی و عمل کی داستاں اگلے وقتوں کی کہانیاں بن کر رہ گئی تھیں۔ مغل حکمرانوں کی نالائقیوں' پستیوں اور عیاشیوں نے نہ صرف انتشار پسند طاقتوں کو کھلے عام لوٹ مار اور دنگا فساد کرنے کی اجازت دے رکھی تھی' بلکہ بیرونی طالع آزما حکمرانوں کو بھی دہلی اور اہل دہلی کو لوٹنے اور تاراج کرنے کے لیے اکسایا تھا۔ نادر شاہ کے وحشی سپاہیوں کے ہاتھوں دہلی میں ایک لاکھ انسان قتل ہوئے تھے۔ ان تخریبی طاقتوں نے میر درد کی دیدہ بینا کے لیے زندگی کی بے ثباتی' انسانی شان و شوکت کی بے وقعتی' انسانی تمناؤں کی شکستگی کا سروسامان مہیا کر دیا تھا۔ چنانچہ خواجہ میر درد جن کا دل لذت آشنائے درد تھا' اپنے معاشرے کی زبوں حالی پر تڑپ اٹھے' اور اس کا دکھ درد ان کے شعروں میں دوڑنے پھرنے لگا۔ کہتے ہیں:

تہمت چند اپنے ذمے دھر چلے
جس لیے ہم آئے تھے سو ہم کر چلے

زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے
ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے

شمع کی مانند ہم اس بزم میں
چشم تر آئے تھے دامن تر چلے

درد کچھ معلوم ہے یہ لوگ سب
کس طرف سے آئے تھے' کدھر چلے

درد ایک خاص ڈگر پر چلنے والی بے کیف زندگی کو زندگی نہیں جانتے' فرماتے ہیں:

آ جائے ایسے جینے سے اپنا تو جی بتنگ
آخر جیے گا کب تلک' اے خضر! مر کہیں

درد ایک درویش صفت انسان تھے' لیکن اس کے ساتھ ساتھ گوشت پوست کے بھی انسان تھے۔ اس لیے لالہ و گل اور ساقی و صہبا سے چھیڑ چھاڑ کرنا ان کا حق تھا۔ فرماتے ہیں:

کبھی خوش بھی کیا ہے جی کسی رند شرابی کا
بھڑا دے منہ سے منہ ساقی! ہمارا اور گلابی کا

بے شبہ درد کو تصوف سے لگاؤ تھا' لیکن ہمیں ان کے کلام میں جذب و مستی اور کیف و نشاط کی وہ شراب نہیں ملتی جس سے اصغر گونڈوی یا عراقی کا کلام معمور ہے۔

درد نے جہاں اردو زباں میں شعر کہے' جو اپنی تاثیر' سادگی اور متانت کی وجہ سے شعرو ادب کے حلقوں میں پسند کیے گئے' وہاں انہوں نے فارسی زباں میں بھی رباعیات کہیں' جو ان کے بہ قول ان کی اپنی فکر رسا کا نتیجہ نہیں' بلکہ القائے ربانی ہیں جن میں اسرار و رموز' رباعیات کے روپ میں ان کے قلب میں جلوہ گر ہوئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے فارسی کلام کا نام الواردات رکھا' جن کی انہوں نے "علم الکتاب" کے نام سے فارسی میں شرح لکھی' اور اسے الہامی قرار دیا۔

علم الکتاب کا ماخذ دراصل نالہ عندلیب ہے' جو ان کے والد اور مرشد خواجہ ناصر عندلیب کے قلم سے ہے۔ خود خواجہ ناصر اپنے کلام کو علم لدنی کا حصہ سمجھتے ہیں اور حضرت حسنؓ کے روحانی فیض کا کرشمہ۔ اس سلسلے میں خواجہ درد نے ایک کہانی بیان کی ہے' لکھتے ہیں کہ ایک دفعہ ان کے والد (خواجہ ناصر عندلیب) ایک ہفتے تک اپنے خاص حجرے سے باہر نہ آئے اور اس عالم رنگ و بو (عالم ناسوت) سے ان کا تعلق ٹوٹا رہا۔ ایک ہفتے کے بعد حجرے کا دروازہ کھولا تو مجھے (درد) نالہ و بکا کرتے ہوئے پایا۔ فرمایا: اے محمدی! قلق و اضطراب مکن' بلکہ شادی و خوش نما کہ سبحانہ ما محمدیان را بعجب عنایت خاص نواختہ" (اے محمدی! پریشان مت ہوئیے' بلکہ خوش ہوئیے' کیوں کہ ہم محمدیوں کو اللہ پاک نے اپنی خاص نظر عنایت سے نوازا ہے)

خدا کے خاص لطف و کرم کا ذکر کرتے ہوئے خواجہ ناصر نے کہا کہ خلوت میں حضرت حسنؓ

کی مقدس روح نے نزول اجلال فرمایا' اپنے روحانی فیوض سے نوازا اور فرمایا کہ ان ---- فیوض کو بندگان خدا کے لیے عام کر دو۔ اس پر خواجہ ناصر نے حضرت حسنؓ سے اس بات کی اجازت چاہی کہ اس سلسلہ رشد و ہدایت کو سلسلہ حسنؓ کے نام سے پکارا جائے۔ "بیٹے! یہ ہمارا نہیں دوسروں کا کام ہے۔ ہم تمام لوگ بحر عینیت میں گم ہیں اور غریق سمندر' ہمارا نام' ہماری پہچان' ہماری دعوت' غرضیکہ سب کچھ حضرت محمد ﷺ ہیں۔ اس راہ کو طریقہ محمدیہؐ کہا جائے۔ ہم نے اس طریق محمدیؐ میں اپنی طرف سے کسی قسم کا کوئی اضافہ نہیں کیا۔" حضرت حسن نے جواب میں فرمایا۔ (علم الکتاب' دہلی' ۱۳۰۸ھ' ص ۸۵ (ط انصاری)

القصہ درد نے "علم الکتاب" کو علم الٰہی کا صحیفہ قرار دیا ہے' جیسا کہ ان کے والد نے اپنے کلام کو علم لدنی کا حصہ تصور کیا ہے۔ درد نے اپنے والد کو نئی "روحانی جماعت" کا امیر المحمدیین کہا ہے اور خود کو پہلا محمدی (اول المحمدیین) قرار دیا ہے۔ اپنی جماعت کی روحانی برتری کا تذکرہ کرتے ہوئے درد لکھتے ہیں کہ ان کے عہد کے علمی اور روحانی گروہ اپنی منزل سے دور ہیں۔ ان کی نظر میں فلسفی (حکماء) جو عقل کی راہ پر چلتے ہیں اور اپنی فہم و دانش کی پیروی کرتے ہیں' انبیا اور اولیاء کی باطنی واردات پر جو ہوش و حواس اور ظاہری فہم و دانش کے دائرۂ ادراک سے باہر ہیں' یقین نہیں رکھتے اور ان کے واردات کے بارے میں شک و شبہ کا شکار ہوتے ہیں۔ رہی بات صوفیہ کے اصطلاحی علم کی' جسے وہ تصوف سے تعبیر کرتے ہیں' تو اس عہد میں جاہلوں نے تصوف کے جو معنی مشہور کر رکھے ہیں' وہ مہمل اور بے معنی باتیں ہیں' جو الحاد و زندقہ کے سوا کچھ اور نہیں۔ ان بیچاروں کو جو خود کو گروہ صوفیہ میں شمار کرتے ہیں۔ معرفت و تحقیق سے کیا تعلق۔" درد نے اپنے نئے روحانی گروہ "محمدیان" کو "خالص علم حقیقی" کا وارث قرار دیتے ہوئے اپنے عہد کے مدعیان علم (فلسفی' اہل کلام' اہل تصوف) کو اصحاب غفلت اور اہل حجاب قرار دیا ہے۔ اور اپنی تحریر (علم الکتاب) کو لوح محفوظ یا ام الکتاب کا ایک عکس' قرآن و حدیث کی تفسیر و تاویل اور نالہ ء عندلیب کی تشریح و تفصیل قرار دیا ہے۔ القصہ خواجہ درد نے اپنے کلام کو جو الہامی کلام کہا ہے' وہ ہماری تاریخ کی کوئی نئی بات نہیں ہے۔ اس قسم کے دعوے متعدد علماء اور صوفیاء نے کیے ہیں۔ کچھ تعجب نہیں کہ انہوں نے اخلاص سے اپنے بارے میں ایسا ہی محسوس کیا ہو' لیکن ان کے کلام کی ناہمواری' طرز بیان کی پیچیدگی سے پتہ چلتا ہے کہ ان کا احساس صحیح نہیں تھا؟ علم الکتاب کا اسلوب بیان وقت کے عام اسلوب سے مختلف نہیں ہے' مثلاً وارد سیوئم میں لکھتے ہیں "

بیان وجود و اعیان و تحقیق مراتب وجود بشرط شئی' بشرط لا شئی و لا بشرط

شئی" (علم الکتاب ص ۱۔۸۔۱۳) یہ منطقی اسلوب بیان صوفیہ کا نہیں' بلکہ ان لوگوں کا ہے' جن کا علم ایساغوجی' تہذیب المنطق یا سلم العلوم کے سانچوں میں ڈھلا ہے۔ چنانچہ انہوں نے اپنی روحانی جماعت "المحمدیین" کے لیے وہی کچھ ثابت کیا ہے جو دوسرے اصحاب کشف و کرامت اپنی جماعت کے لیے ثابت کرتے ہیں۔ ہمیں یہ بات حسن بصری' ائمہ کرام' ابوالقاسم القشیری' ابن تیمیہ' ابن قیم' ابن خلدون یا البیرونی کے کلام میں نظر نہیں آتی' چنانچہ ہمیں جس طرح درد کے اردو کلام میں آمد کے ساتھ ساتھ آورد بھی ملتی ہے۔ اسی طرح ان کی نثر میں بھی آورد ملتی ہے۔ ظاہر ہے کہ القاء اور آورد ایک جگہ اکٹھے نہیں ہوتے۔

مقام مسرت ہے کہ ادارۂ ثقافت اسلامیہ اہل علم کے سامنے پہلی بار' درد کی علم الکتاب کا اردو ترجمہ پیش کر رہا ہے۔ یہاں اس بات کا ذکر بے جا نہ ہوگا کہ فاضل مترجم بہ وجوہ نہ تو علم الکتاب میں وارد آیات کریمہ کی تخریج اور نہ ہی ترجمہ کے ساتھ اصل فارسی اشعار کو نقل کر سکے تھے۔ ہم نے ان دونوں باتوں کو کتاب کے آخر میں درج کر کے نشرو اشاعت سے وابستہ صحت مند روایات کو بچانے کی کوشش کی ہے۔ اس سلسلے میں خاکسار ڈاکٹر محمد صدیق شبلی کا خاص طور پر ممنون ہے' جنہوں نے پورے ترجمے پر نظرثانی فرمائی اور اس کی خامیوں کو دور کر کے اسے قابل اشاعت بنانے کے لیے ادارۂ ثقافت اسلامیہ کی امداد فرمائی۔

رشید احمدؒ (جالندھری)

(شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان اور نہایت رحم کرنے والا ہے)

اے اللہ ہر قسم کی تعریف تیرے لیے ہے اور اے رب شکر بھی تیرے ہی لیے ہے۔ تو نے میرے دل میں الہام کیا اُس چیز کا جو الہام ہوئی اور سکھایا مجھ کو اپنی جناب سے جو کچھ کہ سکھایا۔ تو ہی میرا والی ہے۔ خداوندا میں حاضر ہوں۔ خداوندا میں حاضر ہوں اور اپنے معاملے کو تیرے سپرد کرتا ہوں۔ تو نے نازل کیا میرے دل پر جو کچھ کہ نازل کیا تصدیق کرتے ہوئے اس چیز کی جو میرے سامنے ہے اور ڈالا میرے دل میں جو کچھ کہ ڈالا جو تحقیق و تصدیق کرتا ہے اس کی جو مجھ پر ثابت ہو چکا ہے۔ اور درود ہو آپ پر اے اللہ کے رسول اور سلام ہو آپ پر اے آقا۔ آپ نے دیکھا جو کچھ کہ دیکھا اور آپ نے مارا جو کچھ کہ مارا (کنکریوں کی شکل میں) اور وحی کیا آپ کے رب نے جو کچھ کہ وحی کیا اور سکھایا آپ کو حضرت جبرئیل نے۔ اور آپ میرے نبی ہیں۔ آپ کے لیے نیک بختی پہ نیک بختی ہو۔ میرا اعتماد آپ پر ہے اور اس حکم پر کہ میری پیروی کرو تو اللہ تم سے محبت کرے گا۔ میں آپ کی پیروی کرتا ہوں اور اس حکم پر اعتماد ہے کہ جو کوئی اطاعت کرتا ہے رسول کی پس اُس نے اللہ کی اطاعت کی۔ میں آپ کی اطاعت کرتا ہوں۔ آپ واضح اور کھلے طور پر حق پر ہیں اور آپ تمام جہانوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجے گئے ہیں۔ آپ کی آل پر، آپ سے تعلق رکھنے والوں اور آپ کے کامل صحابہ پر سلام۔ اس حمد و درود کے بعد اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ حق ثابت کر دے اپنے کلمات سے، اور ثابت کر دے ثابت ہونے والی چیز کو اپنی آیات سے، اپنے اعلیٰ کلمات اور اپنی ارفع آیات سے ایسے انسان

پر جو عارفِ کامل ہے۔ اس ظاہر کرنے والے، جمع کرنے والے اور ہر پہلو سے جزئیات پر محیط ہو جانے والے پر حقیقت کو ثابت کر دے۔ متکلم حقیقی اللہ جل شانہٗ و عم نوالہٗ اپنی مشیت کے مطابق گفتگو کرانی چاہتا ہے اپنے بندے خواجہ میر المحمدی سے جس کا تخلص درد ہے۔ اللہ اُس کے گناہوں کو بخش دے۔ پس اُس نے اسی باطنی فہم و ادراک کی گفتگو کرائی ہے اور اُس کے حقائق کو ثابت کیا ہے۔ اے اللہ اے حاضر و ناظر ہستی، اور ہر معاملے میں میری مددگار ہستی، تو پاک ہے ہر ایسی بات چیت سے جو میں کہتا ہوں جس کے بارے میں مجھے کوئی حق نہیں جب کہ تو نے مجھے حکم دیا ہے اپنے کلام سے پس سلام کرو آپس میں ایک دوسرے کو، سلام ایک تحفہ ہے اللہ کی طرف سے مبارک اور پاکیزہ اور سکھایا ہمیں ہمارے نبی نے کہ ہم سلام بھیجیں اپنے آپ پر ہر نماز میں اللہ کے تحیات کے بعد (التحیات کے بعد) اور سلامتی کہنا نبیؐ پر۔ اُس کا اتباع کرتے ہوئے میں اپنے آپ پر سلامتی بھیجتا ہوں اور ہر اُس شخص پر جس نے خالص دینِ محمدی اختیار کیا اور جو اللہ کے پاکیزہ بندوں میں سے ہے۔ اتباع کرتے ہوئے تیرے حکم کا اور پیروی کرتے ہوئے تیرے رسول خاتم النبیین کے حکم کی اے سلامتی بھیجنے والے،[۹] اے فضل والے، اور اے بزرگی والے تیرے اس قول کی وجہ سے کہ سلامتی ہے جو قول ہے تیرے مہربان رب کا، اور سلامتی ہو مجھ پر اس دن جب میں پیدا ہوا۔ اس دن جب میں مروں گا اور اس دن جب میں زندہ اُٹھوں گا،[۱۰] اور سلامتی ہے اللہ کے ان بندوں پر جنھیں اللہ تعالیٰ نے چن لیا اور سلامتی ہے اُس پر جس نے ہدایت کی پیروی کی۔[۱۱]

تائیدِ ربّانی سے کتابِ ھٰذا کے لکھنے کا بیان:

چونکہ حق سبحانہ تعالیٰ نے محض اپنے فضل سے اس فقیرِ حقیر و بے نوا کو وہ صحیفۂ واردات عطا فرمایا۔ بے شک فضل اسی کے ہاتھ میں ہے وہ جسے چاہتا ہے عطا فرماتا ہے۔[۱۲] اس ذاتِ بے ہمتا کی وسعتوں کی انتہا نہیں۔ اور پھر احباب کو اُس صحیفۂ آسمانی کے پڑھنے اور لکھنے کی طرف مائل اور راغب فرمایا۔ ہر قسم کی نُصرت صرف اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے ہے جو کہ زبردست بھی ہے اور حکیم بھی۔ حُسنِ قبول سے کتابِ لایزال کو مقبول و محبوب بنایا[۱۳] جس طرح مریم علیہا السلام کو اُن کے رب نے بوجہِ احسن قبول فرمایا اور عمدہ طور پر ان کو نشو و نما دی[۱۴]، اسی طرح صحیفۂ آسمانی کے پڑھنے پڑھانے کا ذوق و شوق ہمارے دلوں میں پیدا کیا۔ بعض عزیزوں کا اصرار تھا کہ آپ مجالس میں ہمارے سامنے قرآنی نکات و رموز اور فوائد کے بارے میں جو کچھ اختصار سے بیان کرتے ہیں اس مجمل کو ذرا مفصل طور پر قلم بند کیجیے۔ یقیناً یہ فضل و کرم ہے

اللہ تعالیٰ کی جانب سے اور اللہ تعالیٰ کافی جاننے والا ہے۔ وہ مُصر تھے کہ جو رموز اس کلام معجز بیان میں پوشیدہ ہیں اُنھیں تفصیلاً حیطۂ تحریر میں لائیے۔ اسے حقِ تعالیٰ کا فضلِ عظیم سمجھیے کیونکہ اس میں تمام کا بھلا ہے اور یہ ہماری ملّتِ اسلامیہ کے لیے موجبِ ہدایت ہوگا اور خواص و عوام کے لیے مفید اور سُود مند۔ آپ کے ذمے صرف اس پیغامِ حق کا پہنچا دینا ہے[۸]۔ احباب کی اس درخواست پر اس بندۂ ناچیز نے اسی اللہ جل شانہٗ و عم نوالہٗ سے رجوع کیا کیونکہ وہی اپنے بندوں کی دعاؤں کو سننے والا ہے[۹]۔ نیز اس مقصد کے لیے میں نے اپنے ضمیر سے فتویٰ طلب کیا کیونکہ آنحضرت سرورِ کائنات صلعم کی حدیث ہے کہ کسی آرزو کے استحسان پہ خود اپنے دل و ضمیر سے دریافت کرو، اگرچہ تمھیں کوئی کم عقل آدمی کسی قسم کا فتویٰ بھی دے پھر بھی اپنے دل سے ضرور پوچھ لیا کرو۔ لہٰذا میں نے ضمیر کو ٹٹولا کہ اُس مبداءِ فیض کی طرف سے دل کی دُنیا پر کیا القا ہوتا ہے اور پردۂ غیب سے کیا اشارہ ملتا ہے کیونکہ اس کے القا و اشارہ سے بڑھ کر کس کا کہنا صحیح ہوگا[۱۰] اور فی الحقیقت اللہ ہی کافی کارساز ہے[۱۱]۔ چونکہ متن ہذا کی تحریر بھی اسی صحیفۂ واردات کے طریق پہ ہے جو کلامِ الٰہی ہے اور دُنیا جہان والوں کے لیے اک نصیحت ہے۔ اس فقیرِ بے نوا نے اس متن میں اپنی طرف سے کسی قسم کی ایزادی کا تکلف نہیں کیا۔ یقیناً ہم تکلف کرنے والوں میں سے نہیں ہیں[۱۲]۔ پس ایسے ارفع متن کی شرح کا اشارہ و حکم بھی اسی حاکمِ اعلیٰ کی طرف سے ہونا چاہیے کیونکہ حکم تو بس اللہ ہی کا چلتا ہے[۱۳]۔ اسی پر بھروسہ رکھتا ہوں اور اُسی پر بھروسہ کرنے والوں کو بھروسہ کرنا چاہیے۔ اسی دوران میں اس ناچیز نے اس سلسلے میں حالتِ خواب اور بیداری میں اس مجموعے کے اکثر و بیشتر مطالب کو مکتوب شکل میں دیکھا۔ اس صحیفۂ آسمانی کی آیات (دلائل سے) محکم کی گئی ہیں اور پھر اس کے ساتھ ساتھ صاف صاف بیان بھی کی گئی ہیں۔ یہ کتاب ایک حکیم باخبر کی طرف سے ہے۔ عالمِ بیداری میں بھی بہت سے مطالب و معانی غیر ارادی طور پر بلا تکلف معرضِ تحریر میں آئے اور میرا رب خوب جانتا ہے اللہ کی طرف سے کون سچا دین لے کر آیا ہے اور کون صریح گمراہی میں مبتلا ہے[۱۴]۔ میں نے اسی کو رضائے الٰہی سمجھا اور اس کی اصلاً خلاف ورزی نہ کی۔ آخر ہم سب اسی کے تابع ہی تو ہیں[۱۵]۔ جو کچھ مجھے دکھایا گیا ہے میں نے اس میں کچھ ایزادی نہ کی اور جس ترتیب سے مجھے لکھایا گیا اسی کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے بلا کم و کاست پیش کر دیا۔ جو خدا نے چاہا وہی کچھ لکھا۔ غرض جو کچھ بھی ہمیں توفیق ہوئی صرف اللہ کی مدد سے ہے[۱۶]۔ اس متن اور اس شرح کا مالکِ حقیقی وہی ہے۔ میرے حروف و الفاظ کو درمیان سے کھرچ ہی دیجیے، کیونکہ سارا اختیار تو خاص اللہ ہی کو ہے[۱۷]۔ انسانی اوصاف و اخلاق

کو مہذب بنانے والی تو فقط تادیب ربانی ہی ہے۔ میرے رب نے مجھے ادب سکھایا اور میری تادیب عمدہ اور احسن طریق سے کی یا پھر حضور پُر نور رسالت مآبؐ[۳] کی تائید جس نے عبد و معبود کے ڈانڈے ملا دیے اور فرمایا کہ جو اللہ کا ہو جائے اللہ اُسی کا ہو جاتا ہے۔ اللہ کافی گواہ ہے[۱۸]۔ میں نے ذاتِ حق کو حق ہی سے پہچانا اور ہادیٔ برحقؐ نے فرمایا ہے کہ اللہ کو اللہ ہی سے پہچانو۔ اور اگر اللہ کا فضل شاملِ حال نہ ہوتا تو یہ معرفتِ حق کیسے ہوتی۔ ذاتِ باری تعالیٰ نے میری فطرت میں جو طلبِ صادق ودیعت فرمائی تھی اسی نے مجھے منزلِ مقصود تک پہنچایا، کیونکہ جس کسی نے کسی شے کی طلب کی اور سعیٔ کامل کی وہ مطلوبہ شے کو پا لیتا ہے۔ باب مدینۃ العلم (حضرت علیؓ) نے رہنمائی فرمائی اور شہر علم میں داخل ہونے کی سعادت ملی۔ انہی کا فرمان مبارک ہے کہ جس کسی نے کوئی دروازہ کھٹکھٹایا اور اصرار کیا تو وہ داخل ہو گیا اور یمن و برکت مصطفوی نے اُسے اہل القرآن میں داخل فرما دیا۔ اہل القرآن اور اہل اللہ کی برکات اور حضور سرورِ کائناتؐ کے اتباع کی نوازشات نے اُسے نوازا۔ لہٰذا حضورِ پاکؐ کے اُمتیوں کو لازم ہے کہ وہ اپنے سادات کے کلام کو بنظرِ غائر دیکھیں، اس پر غور کریں، اور سعادت کا وہ مقام جو سالہا سال کی عبادت سے ہاتھ نہیں لگتا فی الفور حاصل کر لیں کیونکہ پل دو پل کا تفکر و تدبر اور غور و خوض سالہا سال کی عبادت سے بہتر ہے۔ سو اس تمام کا مقتضا یہ ہے کہ تم اللہ سے ڈرو اور پیغمبر پاکؐ کا کہنا مانو وہ ہم تم سے کوئی دنیاوی صلہ نہیں مانگتے۔ اُن کا صلہ تو بس رب العالمین کے ذمے ہے[۱۹]۔

احادیثِ نبوی، آیاتِ قرآنی اور خاص اسرار سے اقتباس کا بیان مع دفعِ شبہات

یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ آیاتِ قرآنی اور احادیثِ نبوی کا عبارت کی شکل میں اندراج کرنا اور اُن کے الفاظ و معانی کو دیگر حروف و مطالب سے ربط دینا یا اُن میں سے بعض کلمات کو لکھنا اور پھر اُس جزو کو کل کی علامت یا اشارت سمجھنا صنعتِ اقتباس کہلاتا ہے۔ قرآن و حدیث سے لیا ہوا کوئی شعری یا نثری اقتباس اُس کلام کی کلی ضمانت ہوتا ہے۔ محققین اور فصحا کا کہنا ہے کہ جو کوئی علم فصاحت و بلاغت سے واقف ہے وہ یہ بات خوب جانتا ہے چونکہ اُمتِ محمدیہ کے معارف و مطالب کی بنیاد خالصتہً کلام الٰہی اور احادیثِ نبوی پر ہے۔ اُن کا نورِ معرفت اُس رسول مقبولؐ اور ہادیٔ برحق کے چراغِ نبوت ہی سے

نورانیت حاصل کرتا ہے۔ اکثر و بیشتر مقامات پر اس متن کی عبارات و تشریحات اسی نوع کی ہیں جو قرآنی آیات اور احادیثِ نبوی کے مطالب سے بر محل رابطہ رکھتی ہیں اور یہ محض مجھ پر میرے رب کے فضل میں سے ہے جو کچھ کہ میں نے اقتباس کیا اُس کے کلام میں سے بغیر کسی تکلف کے اور اُس نے مجھے ہدایت کی ہے اُس راستے کی طرف اور یہ اُس کی کھلی نشانیوں میں سے اور روشن و ظاہر تائیدات میں سے ہے۔ اور بے شک اس میں عقل والوں کے لیے نشانیاں ہیں اور سلامتی ہو اُس پر جس نے ہدایت کی پیروی کی۔ کلام و اقوال سے اقتباس کی حاجت بھی کیا ہے جب کہ اُس پاک ذات نے سساداتِ محمدیہ کو تمام احوال میں اقتباس و اتباع کا شرف بخشا ہے۔ وہی پاک ذات جس کے متعلق خود خالقِ کائنات نے فرمایا کہ اگر میں تجھے پیدا نہ کرتا تو آسمانوں کو بھی پیدا نہ کرتا اور جو تمام موجودات کی ایجاد کا باعث بنی۔ علّتِ ہستی اور اُن کا وجودِ مسعود گویا ایک ہی شے کے ظاہری اور باطنی رُخ ہیں۔ اس بات کی صراحت اس لیے کی گئی ہے تاکہ کوئی جاہل اور حقیقت سے ناواقف انسان آیات و احادیث میں کسی قسم کا تصرّف نہ کرنے پائے اور ان پاک کلمات کے موضوعات کے خلاف بیان نہ کرے۔ ایسے اوہام و وساوس سے خدا کی پناہ! کیونکہ خدا نہ کرے ایسی صورت میں گویا ان آیات و احادیث کو اُن کے اصل مقام سے نچلی سطح پر لانا ہے جو سراسر کتاب و سنت کے خلاف ہوگا۔ نہ فقط یہ کہ اُمورِ حقّی میں آیات و احادیث سے چھیڑ چھاڑ یا اُن پہ گرفت بھی تحریف ہی کے زمرے میں آتی ہے بلکہ انہی جاہلوں، غافلوں اور بیگانوں کے باطل توہمات اور فاسد خیالات کے وقوع کا احتمال بھی ہوگا جو پہلے ہی جہالت میں گرفتار اور منحرف و مخالف ہیں۔ مومنوں کی تحریر و تقریر اس قسم کے شبہات و احتمالات سے مبرا ہیں تو یہ فقط تعلیم و تائیدِ ربانی کے باعث ہے، یا حضور رسالت مآب ؐ کے فیضانِ عام کا کرشمہ ہے (ان پہ لاکھوں درود و سلام) اور یقیناً ایسے لوگ جو کتابِ ربانی کے پابند ہیں اور نماز کی پابندی کرتے ہیں اور اپنی اصلاح، خدا ان کا اجر و ثواب کبھی ضائع نہیں کرے گا[2] ———— ان کے استعمال و استفادہ کے لیے بجا بجا مواقع موجود ہیں۔

خالص محمدیوں کی تحریر و تقریر ان شکوک سے بری اور ان اندیشوں سے خالی ہے، کیونکہ ان کا بیان خداوند تعالیٰ کی تعلیم و تائید اور حضرت رسالت پناہ کے فیض سے ہے اور جو کتاب کو مضبوطی سے پکڑتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں۔ بے شک ہم نیک لوگوں کا اجر ضائع نہیں کرتے۔ ان لوگوں کا آیت و حدیث استعمال کرنا بالکل بجا اور مناسب ہے۔ کیونکہ ایک ان کے رب کا اور دوسرا ان کے آقا کا کلام ہے۔ یہ

کلام بہت لطافت وضبط کا مالک اور بھیدوں کو کھولنے والا ہے اور بہت سے فوائد کا حامل ہے۔ اللہ تعالیٰ کے کلمات میں کوئی تبدیلی نہیں آتی اور یہی بڑی کامیابی ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی اے میری قوم اگر میرا مقام اور اللہ کی آیات کے ساتھ نصیحت کرنا تمھیں گراں گذرتا ہے تو میں نے اللہ پر بھروسہ کر لیا ہے۔ سو اگر تم نے روگردانی کی تو میں تم سے تو کوئی معاوضہ طلب نہیں کرتا، اس کا اجر تو مجھے میرا اللہ دے گا۔ مجھے یہی حکم دیا گیا ہے کہ میں مسلمان ہو کر رہوں اور اللہ اپنے کلمات کے ساتھ حق کو حق کر دکھائے گا خواہ یہ مجرموں کو برا ہی لگے۔ بے شک تردد میں پڑنے والے وہی ہیں جو ظاہر کو لیتے ہیں اور باطن پر حقیقی اعتقاد نہیں رکھتے۔ جب ان کے سامنے قرآنی آیات کی تلاوت کی جاتی ہیں جنھیں اللہ تعالیٰ نے کتاب میں تحریر کردہ مطالب کی حقیقت پر میرے لیے واضح دلائل اور شہادتیں بنایا ہے۔ تو ان میں تغیر ظاہر ہوتا ہے اور ان کے چہرے بھی تبدیل ہو جاتے ہیں اور قریب ہے کہ وہ تلاوت کرنے والے لوگوں سے لڑ پڑیں اور یہی وہ قدیم رسم ہے جیسا کہ خدائے عزوجل نے فرمایا "اور جب ان کو ہماری آیات پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو کفر کرنے والے لوگوں کے چہروں پر ناگواری کے آثار آنے لگتے ہیں۔ قریب ہے کہ وہ ان لوگوں پر پل پڑیں جو اُن کے سامنے ہماری آیات تلاوت کرتے ہیں۔ کہہ دیجیے پس کیا میں تمھیں اس سے بھی بُری چیز نہ بتاؤں وہ آگ ہے جس کا اللہ نے کافروں سے وعدہ کر رکھا ہے اور وہ بہت ہی بُرا ٹھکانا ہے۔

کلامِ الٰہی جو حضور سرورِ سرورِ کائنات ﷺ کے توسط سے پہنچا راقم الحروف نے اس کلام معجز بیان کی شرح کے سلسلے میں جو شریعت و طریقت پہ مشتمل، معرفت و حقیقت کا ماحصل، علم و عمل کا مجموعہ، ردّ و بدل کا دافع سراسر حق و حقیقت پر مبنی ہے۔ وہ اک کامل برہان اور ناقابلِ تردید دلیل ہے۔ تمام اسرار و رموز کا انکشاف کرنے والا تبلیغ و اظہار کا حامل ہے۔ بہمہ وجوہ جامع اور قرب و معیت کا نتیجہ ہے۔ اُس کے تمام امور (مذکورہ) میں سوچنے والوں کے (سمجھنے کے لیے) توحید پر دلائل موجود ہیں۔ ان خاصیتوں کے بیان میں جو خالصتہً امتِ

محمدیہ کے لیے مختص ہیں اور اُن کے ایمان و اخلاص کی تقویت کا باعث ہیں۔ وہ شکوک و شبہات کو دفع کرنے والی، راہِ عمل میں نفع بخش اور نجات و فلاح کا موجب ہیں۔ نیکی و برکات کا ثمرہ دینے والی، اوصاف اخلاق کو سنوارنے، ذوقِ سلیم اور احوال کو نکھارنے، اعمال و افعال کو زینت بخشنے والی اور اوراد و وظائف اور قصص و مشاغل کے بیان کرنے والی ہیں۔ بلا شبہ ان میں بڑی بڑی دلیلیں ہیں اُن لوگوں کے لیے جو ایمان رکھتے ہیں اور اس آیتِ کریمہ کے بموجب کہ رب العزت کی مدد کے بغیر کسی میں کوئی قوت اور ہمت نہیں مجھے بھی کوئی اختیار و عمل دخل نہیں۔ اس مقولے کے مطابق کہ ناموں کے فیصلے تو آسمان ہی میں ہوتے ہیں راقم الحروف نے کتاب اللہ کی نسبت سے اس مجموعے کا نام "علم الکتاب" رکھا اور اسے متنِ صحیفہ کی تمام عبارات کا حامل بنایا اور تمام مطالب اس میں شامل کیے۔ اس متن کو رباعیات کی طرح شرح و بسط کا مقید نہ بنایا۔ جو کچھ کہنا چاہا اسے دل میں بٹھایا کیونکہ یہی محلِ ورود ہے اور دل میں نقش ہو جانے والے نقوش کے لیے مانع صعود۔ کہیں تو شرح کی صورت میں ہے اور کہیں دوسرے طریق میں۔ اسی طرح اس شرح میں بھی اکثر مقامات پہ موقع محل کی مناسبت سے اسرار و رموز اور تحقیقات جو لکھتے وقت دل پہ وارد ہوئے لکھا دیے گئے اور اُس کلام کے لائق الفاظ کے مختلف اشارات کو فی الفور ثبت کرا دیا۔ ہم جو بات چیت کر رہے ہیں وہ اسی کے حوالے سے ہے اور وہی راہِ راست دکھانے والا ہے۔ اس خصوصی تعین سے میرے موہوم جسم و جان کو اپنا مظہر بنایا اور علم اعتباری کے نام سے موسوم کر کے اس جسم و جان کی طرف بھیجا اور پھر میرے پردے میں ان پہ ہدایت کا دروازہ کھولا اور بحرِ توحید میں غرق کیا اور چاہا کہ میں اپنے آپ سے باتیں کروں اور اپنے جسم و جان کو شریعت کی مضبوط رسی میں باندھ رکھوں اور پھر ان پہ اپنے ذاتی و اعتباری اسما پڑھوں اور اُنھیں حقیقت اور صحیح صورتِ حال سے آگاہ کروں۔ گویا تیری یہ خواہش تھی کہ تو اپنے اسرار کو قلم کی طرح میری زبان سے بیان کرے اور درختِ طُور کی طرح اس نمو والے جسم سے تکلّم فرمائے اور اپنی آیاتِ کبیرہ کو

اس عالمِ صغیر سے اظہار میں لائے اور اس آیت کریمہ کا پردہ اُٹھا دے جس کا مطلب ہے کہ خود تمھاری ذات میں بھی بہت سی نشانیاں ہیں کیا تم کو دکھائی نہیں دیتا[41] اور چشم بصیرت کو اس آیتِ ربانی کا سرمہ لگا دے جس کا مطلب ہے کہ اب ہم نے تجھ سے تیرا پردہ (غفلت کا) ہٹا دیا، سو آج تو تیری نگاہ بڑی تیز ہے[42] اور اس آیتِ کریمہ کی گواہی سے کہ رب العزّت کی مدد کے بغیر کسی میں کوئی قوت و ہمت نہیں، مجھے نوازا ہے اور کہ ہم تمھاری رگِ جان سے بھی زیادہ قریب ہیں[43] کی خوش خبری سے مسرور فرمائے اور مجھ سے موہومہ اور اعتباری تاریکیوں کو دور کرے اور بقا باللہ کی خلعت سے مشرف فرما کر ربانی عطا و بخشش کا وجود دے کر مجھے نچلی سطح پر لا کر من و تو کے امتیاز میں ڈال کر گرم گفتگو کرے۔ اور مصلحۃً اپنی ہی طرف کھینچے۔ چونکہ تیری رضا یہی تھی اور ارادہ بھی، میں نے اپنے آپ کو تیرے ہی عطا کردہ اسم موہوم سے یاد رکھا اور اپنے ہی جسم و جان سے گفتگو کرنے لگا۔ یہ سب کچھ میں نے بالہامِ الٰہی کیا۔ ان میں سے کوئی کام میں نے اپنی رائے سے نہیں کیا۔ اور حقیقتِ حال یہ ہے کہ آپ تو میرے دل کے اندر کی بات بھی جانتے ہیں۔ میں آپ کے علم میں جو کچھ ہے اس کو نہیں جانتا۔ لہٰذا تجھی سے دعا ہے کہ یا رب میرا حوصلہ فراخ کر دے اور میرا یہ کام آسان فرما دے اور میری زبان کی گرہ کو کھول دے"[44]

پہلا مقدمہ ان مقدمات میں سے جن کو تصنیفات میں پہلے لانا ضروری ہوتا ہے

یہ مقدمہ ابتدائی اصولات کا مرقع بھی ہے اور ساتھ ہی کتاب کا دیباچہ بھی جو اس باب کے اور مابعد مقدمات کا حامل ہے۔ یہاں سے لے کر واردات کے آغاز تک بہت سے مفید مطلب اور کارآمد مطالب پر مشتمل ہے اور عقائد کے بارے میں عنواناتات کا حامل ہے۔ ان سب کے مجموعے کو کتاب کا دیباچہ یا سببِ تالیف کہہ لیجیے۔ اس پہلے مقدمہ میں اس علم کی تعریف، غرض و غایت اور موضوع کا بیان، اس کی قدر و منزلت کا اظہار اور اپنے دیگر حریفوں پہ امتیاز کی نشاندہی ہے۔ ضمناً ان کی حقیقت کا تھوڑا بہت بیان، اس مجموعے

کی تاریخ تحریر پہ چند جملے اور نیز یہ کہ علم الکتاب کے نام میں لفظ الکتاب سے کیا مُراد ہے۔ یہ سارے کا سارا مجموعہ بہ حیثیتِ مجموعی تمام مقدمات اور اکثر جزوی نکات کا حامل ہے۔ مفصل ہوتے ہوئے مجمل بھی ہے کیونکہ خواہ مخواہ بات کو طول نہیں دیا گیا۔

موضوعِ علم کا بیان :

یاد رکھیے کہ ہر علم کا موضوع الگ ہوتا ہے۔ کسی عبارت کا موضوع اس امر سے ہے کہ اس میں عوارض (ملحقہ موضوعات) پہ گفتگو کی جائے، مثلاً علمِ نحو کا موضوع کلمہ اور کلام ہے۔ علمِ منطق کا موضوع تعارف و دلیل و ثبوت ہے۔ علمِ طبیعی کا موضوع جسم اور علمِ طب کا موضوع انسانی بدن ہے اور علیٰ ہذا القیاس۔

جان لو ہر علم کا موضوع الگ ہوتا ہے۔ موضوع سے مُراد وہ امر ہے جس کی ذات کے عوارض کے بارے میں گفتگو کی جاتی ہے۔ مثلاً علم نحو کا موضوع کلمہ و کلام ہے۔ علم منطق کا موضوع معرفت و دلیل ہے۔ علم طب کا موضوع جسم انسانی ہے، وعلیٰ ہذا القیاس۔ ہر علم کا موضوع جُدا ہے کہ اس علم کی ذات کے عوارض کے بارے میں گفتگو کی جاتی ہے۔ پس اس کتاب کا موضوع حضرتِ رب الارباب تعالیٰ شانہ و جلّ برہانہ اور اس کے عوارضِ ذاتیہ، اس کی صفات و کمالات، شیونات و اعتبارات و اضافات ہیں جن پر یہاں بحث کی گئی ہے اور جن کا یہاں ذکر کیا گیا ہے اور کوئی نا سمجھ یہ خیال نہ کرے کہ حق تعالیٰ پر لفظ موضوع کا اطلاق کیسے درست ہو سکتا ہے کہ وہ تو ہر موضوع کا وضع کرنے والا ہے اور ہر موضوع کا بنانے والا ہے، اسے موضوع تو نہیں کہا جا سکتا۔ یہ وہم تو لفظی معنوں سے پیدا ہوتا ہے اور ہمارا مقصد اصطلاحی معنی ہیں جیسا کہ بیان ہوا اور یہ بھی خیال نہ کیا جائے کہ عوارض کے لفظ سے یہ لازم آتا ہے کہ حق تعالیٰ معروض علیہ ہے اور یہ عوارض اسے لاحق ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان سب چیزوں سے بلند ہے۔ وہ جوہر ہے نہ عرض بلکہ اس کے ساتھ ذات و صفات کا امتیاز، اضافات و شیونات و کمالات بارگاہِ اقدس میں ثابت ہیں۔ اگرچہ صفات عرض ہیں جو ذات کے جوہر کے ساتھ قائم ہیں اور حق سبحانہٗ تعالیٰ جوہری اور عرضی اضافت کے اطلاق سے بالا ہے پس اس کی تنزیہہ عین تشبیہہ ہے اور اس کی تشبیہہ عین تنزیہہ ہے۔ اس کے ان سب سے مبرّا ہونے کے باوجود تمام اضافات و اعتبارات اسی سے اور اسی کے ساتھ ثابت ہیں۔ وہ صفتی و اسمی عارضی معنوں کی عدم قباحت کے باوجود سب صفات و اسماء اس میں مسلّم ہیں اور کسی حقیقت ناشناس کو یہ شک و شبہ لاحق نہ ہو کہ اس علم الکتاب میں کونسا امر ہے جس کا ذکر نہیں ہوا اور کونسی چیز ہے جو تحریر میں نہیں آئی۔ پس طرح طرح کے ان مطالب کا موضوع حق تعالیٰ کی ذات بے مثال کیسے ہو سکتی ہے، اس کے تو بہت سے موضوع ہونے چاہئیں ایک موضوع کیسے درست رہے گا۔

اس کے لیے متعدد موضوعات درکار ہیں فقط ایک موضوع پہ کس طرح اکتفا کی جا سکتی ہے کہ یہ شعبہ بھی حقیقت کا انکشاف نہ ہونے کی وجہ سے ہے اور نفس وطبعِ انسانی کی گرفتاری کا مقتضیٰ ورنہ اللہ ہی کی ملک ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے[۲۵] اور اللہ ہی کی طرف سب مقدمات رجوع کیے جائیں گے اور اسی کی طرف سب لوٹ جائیں گے[۲۶] یہ واضح اور صریح آیاتِ قرآنی ہیں اور یہ آیتِ قرآنی کہ آپ فرما دیجیے کہ بالیقیں میری نماز، اور میری ساری عبادت اور میرا جینا اور میرا مرنا یہ سب اللہ ہی کا ہے جو مالک ہے سارے جہانوں کا[۲۷] بھی خصوصاً اسی مضمون کی حامل ہے۔ لہذا انشاء اللہ تعالیٰ جو لوگ اس کتاب کو پڑھیں گے اور اس کے مطالب کو کسی حد تک سمجھیں گے وہ اس قسم کے شکوک و شبہات اور تردّدات میں مبتلا نہیں ہوں گے اور اطمینانِ قلب، یقینِ محکم اور ایمان و عرفان کامل سے شرف یاب ہو کر یہ سمجھ جائیں گے کہ واقعی اس علم الکتاب میں خصوصاً کوئی بات ایسی درج نہیں جس میں حق سے سند نہ لی گئی ہو یا اُس میں حق پہ اعتقاد کا ذکر نہ ہو اور کسی مقام پر بھی حق تعالیٰ کے توسل کے بغیر شرکتِ غیر سے اور مداخلت ماسوی اللہ سے نجات پانے کے سوا اور کچھ مقصود و منظور نہیں۔ ہر مطلب کے بیان کا مقصد حق تعالیٰ کے قرب تک پہنچانا اور راہِ حق کی حقیقت کا انکشاف کرنا ہے۔ فی الحقیقت اس علم کا موضوع فقط وہی ذاتِ بے ہمتا ہے۔ اس کے علاوہ اور کوئی شے مقصود و مطلوب نہیں۔ تشبیہہ دیے بغیر یہ بات مثال کے طور پہ کہی جا سکتی ہے کہ اگرچہ علم طب کا موضوع انسانی بدن ہے اور طب کی کتابوں میں ادویات کے مفردات و مرکبات پہ بحث بھی ہوتی ہے اور خواص و آثار اور دیگر کئی امور بھی زیرِ بحث آتے ہیں مگر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس کا موضوع انسانی بدن کیسے ہو سکتا ہے باوجود اس امر کے کہ اس میں دیگر اشیا پہ بحث و تذکرہ موجود ہے۔ ہر چند کہ ان تمام حقائق اور اشیا کے ذاتی عوارض پہ بحث پائی جاتی ہے پھر بھی موضوعیت کے لحاظ سے مذکورہ بالا واحد موضوع سے کوئی خلل نہیں پڑتا۔ اگر دوسرے بھی اپنے علوم کی موضوعیت کے ادّعا کی حقانیت ثابت کرنا چاہیں تو اسی عمومیت کی راہ سے وہ ایسا کر سکتے ہیں لیکن اس عمومیت میں ان علوم کی تخصیص کیسے ہو گی، تمام موجودات میں اس امرِ عام سے خارج کون ہے۔ اس تخصیص سے امتِ محمدیہ کا وہ خوش نصیب گروہ مختص کیا گیا جو خلوصِ قلب سے مُتصف ہوا، اور اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے اپنی رحمتِ کاملہ کے لیے مختص کر لیتا ہے۔

اغراض و فوائد کا بیان:

غرض پہلی منزل ہے علم صانع میں اس کی صنعت کے اظہار سے پہلے اور اسی وجہ سے وہ کرتا ہے جو کچھ وہ کرتا ہے اور ہر دانا کرنے والے کے لیے اس صنعت میں کوئی نہ کوئی غرض ہوتی ہے اور صنعت نکالتا ہے صانع ہستی جو کچھ کہ دل میں ہو تصویروں کی شکل میں اور اُسے نقش کرتا ہے ہیولیٰ کی شکل میں۔ یاد رہے کہ ہر علم

کی غرض بھی اُس کے موضوع کی طرح الگ الگ ہوتی ہے تاکہ وہ عبث اور بے ہودہ نہ ہو اور نہ ہی اس کا حاصل کرنا لغو ثابت ہو، مثال کے طور پر علم نحو کی غرض یہ ہے کہ لفظی غلطیوں سے تحفظ مل جائے اور علم منطق کی غرض یہ ہے کہ معنوی غلطیوں سے ذہن کا بچاؤ ہو سکے ۔ یونہی ہر علم کی غرض الگ الگ ہے ۔ کل علم میں بہ حیثیتِ مجموعی بے حد فوائد اور بے شمار اغراض ہیں ۔ اس میں تمام خزانوں کے قفلوں کی کنجیاں اور سارے اسرار و رموز کی مشکلات کا حل ہوتا ہے ، لہٰذا ایسے علم کے نتائج اور ثمرات کو حشو و زوائد سے خالی فوائد سمیت یکجا حیطۂ تحریر میں نہیں لایا جا سکتا اور اُس کی جزئیات کو ایک ہی جگہ پہ تفصیل سے بیان نہیں کیا جا سکتا ۔ ہر موضوع اور ہر مقام میں اُس کے فوائد بے انتہا ہیں اور ہر موقع اور ہر مقصد میں اس کے نتائج بے شمار اور لاتعداد ہیں ۔ صاحبِ بصیرت ناظر کو چاہیے کہ وہ خود ان کو چھانٹ کر الگ کرے ۔ ٹھاٹھیں مارتے ہوئے اس سمندر سے آبدار موتیوں کو نکالنے کی سہولت کے لیے احتیاطاً ہم نے ان تمام مطالب کی ایک مفصل فہرست حاجت مندوں کی ضرورت کے لیے کتابِ ہٰذا میں شامل کرکے اس مقدمۂ اولیٰ کے اخیر میں درج کر دی ہے ۔

کلی طور پر مختصراً عرض ہے کہ اس علم الکتاب کی غرض و غایت یہ ہے کہ اس کتاب کا قاری معرفت کے ہر مرتبہ میں مامون و مصئون رہے خواہ وہ مرتبہ ذات و صفات اور اسماء الٰہیہ کا ہو، خواہ اتحاد و امتیازِ ظاہری کا ، خواہ مراتبِ امکانی کے تحفظ کا ، خواہ دنیوی اضافتوں کی بلندی کا ، خواہ شریعت و طریقت کا مرتبہ ہو خواہ معرفت و حقیقت کا ، خواہ مزاج اور طبیعت کا مرتبہ ہو خواہ عادت و شناخت کا کیونکہ یہ سب امور اسماءِ الٰہیہ کی تجلیات کے مظاہر ہیں ۔ جب کسی کو صفات و اسمائے ذات کی صحیح معرفت اور خدائے جلّ جلالہٗ کے قرب کی نسبت نصیب ہو جائے تو پھر ایسے کامل عارف کی نظروں سے کسی چیز کا راز پوشیدہ نہیں رہتا ۔ وہ تقاضائے بشریت کے مطابق ہر شے کی حقیقت کا ادراک کرنے لگتا ہے جس نے اللہ تعالیٰ کو پہچان لیا اُس سے کوئی شے پوشیدہ نہ رہی ۔ اکثر ناواقفوں کو ان کثیر التعداد اور متضاد امور کی یکجائی اور تفصیل سے بیان کردہ جملہ مراتب ، اور حیثیّات و اعتبارات کے اختلاف اور الفاظ و اسماء کی کثرت کی وجہ سے اک امرِ واحد کی حقیقت کے ادراک میں بڑی دشواری پیش آتی ہے ۔ ان کے دلوں میں طرح طرح کے شبہات پیدا ہوتے ہیں ۔ لہٰذا ان مراتب میں سے وہ کسی مرتبے کو سمجھنے کی اہلیت نہیں رکھتے ۔ جا بجا بے جا تردّدات و شکوک بیچ میں لے آتے ہیں لہٰذا شریعت ، طریقت ، معرفت اور حقیقت کے چاروں مرتبوں میں اُنھیں مغائرت نظر آتی ہے اور وہ انھیں ایک دوسرے سے الگ سمجھتے ہیں اور ان سب میں شریعت کے مرتبے کو ادنیٰ سمجھتے ہیں ۔ ایسے توہّمات سے خدا کی پناہ ۔ جو کچھ بھی ہے شریعت ہی تو ہے ۔ ان چاروں مراتب کی حقیقت اور جوہر ایک ہی تو ہے کیونکہ شریعت حقیقت کی دوسری شکل ہے اور حقیقت شریعت کا مغز ، گویا

طریقت نام ہے شریعت سے پورا پورا انصاف کرنے کا اور معرفت نام ہے انکشافِ حقیقت کا۔ پس شریعت کو ظاہر سمجھیے اور اس کا تعلق اسلام سے ہے اور طریقت باطن ہے جس کا تعلق ایمان سے ہے۔ معرفت راز ہے اور اس کا تعلق ہر شے کی تہ اور انتہا سے ہے اور حقیقت سب رازوں کا رازِ نہاں ہے اُسے انتہا کا جوہر سمجھیے اور وہ ان سب میں رواں دواں ہے۔ یہ سب مراتب حقیقت ہی کے مختلف درجے ہیں اور اُس کے ظہور کے مختلف مظاہر۔ درجات میں فرق حیثیات کے لحاظ سے ہے نہ کہ ذات کے لحاظ سے۔ ان سب کو حقیقت سے جُدا سمجھنے کا مطلب ہے حقیقت الحقیقت تک نہ پہنچ سکنا۔

حد اور تعریف کے بیان میں وصف کے ساتھ، مرتبے اور امتیاز کی وضاحت کے لیے

ہر علم کی حقیقت اور منزلت کے سلسلے میں جو تعریفی جملے اور توصیفی کلمات اکثر مقدمات اور دیباچوں میں فرق دکھانے یا شوق دلانے اور حقیقت کو ظاہر کرنے اور کیفیت کو بیان کرنے کے لیے لکھتے ہیں اور اُس تعریف کو جو افراد کو جمع کرنے والی اور اعدا کو روکنے والی ہے ضبطِ تحریر میں لاتے ہیں یہاں بھی بقدرِ ضرورت اُس کا ذکر ہے اور دوسرے مقامات پر بھی اس کا اندراج آئے گا۔ یہ بات ذہن نشین کر لیجیے کہ یہ علم الکتاب سب علمِ الٰہی کا بیان ہے جو جملہ علوم سے اعلیٰ و ارفع ہے۔ اس کے وارد ہونے کا ڈھنگ خدائے ودُود کی طرف سے ہے کیونکہ اس قرآنی آیت کے مطابق سب بڑے علم والوں سے بڑھ کر ایک بڑے علم والا ہے[۴/۸] اور اس علم کا نام علم اللہی المحمدی رکھا گیا۔ لیکن یہ علمِ الٰہی وہ علم الٰہی نہیں جو حکما اور فلسفیوں کی اصطلاح میں استعمال ہوتا ہے۔ بلکہ یہاں توحیدِ الٰہیہ و پوشاکِ محمدیہ کو یکجا بہم کر کے ایک فرد واحد و کامل کو جامعیت کی خلعت پہنائی گئی اور کلمۂ طیبہ بنا کہ اللہ کے سوا اور کوئی معبود نہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اُس کے رسول ہیں[۵]۔ پس وہ فلسفی جو صرف اپنی عقل کے بل بوتے پر راہ پیما ہیں وہ محض اپنے فہم و ادراک کے تابع ہیں۔ انبیا و اولیا کرام کے حقّی معاملات پر جو مادی ہوش و حواس اور ظاہری عقل و فہم سے بہت بلند و بالا ہیں اور وہ محض اللہ کے برگزیدہ بندوں تک ہی محدود ہیں وہ ان پر اس طرح ایمان نہیں لاتے جس طرح کہ لانا چاہیے۔ ظن و تخمین میں پھنس کر وہ حقیقی امور کی تصدیق میں شک و شبہ اور خلجان میں مبتلا رہتے ہیں۔ یہ جماعت اور ان کا علم حدود و شرائطِ محمدیہ کے پیشِ نظر اس بیان اور تعریف سے خارج ہو جاتا ہے۔ باقی رہی حکمتِ حقہ جو حقائقِ اشیا کا علم ہے یعنی چیزوں کی حقیقتیں اُس طرح جس پر کہ وہ حقیقتاً ہیں۔ یہ علم و حکمت بشری استطاعت کے مطابق نورِ ایمان اور اتباعِ سنت سے متصل ہے۔ قرآن مجید نے بھی اسے خوابوں کی

تعبیر بتانے والا کہا ہے اور خیرِ کثیر کا موجب گردانا ہے - یہ اہلِ اسلام کے فلسفیوں کے حصے میں آیا پس یہ حکمت بذاتِ خود جملہ کمالاتِ محمدیہ میں سے ہے اور اُسی کی شاخ ہے - سب اسلامی فلسفی وحکما جامعیت کے اسی خرمن سے خوشہ چینی کرتے ہیں - لہٰذا پہلے فلاسفروں کے علم سے علم الٰہی محمدی کا طرّۂ امتیاز اُس کی جامعیت ہے جس میں سبھی کچھ شامل ہے ، کیونکہ فلسفیوں کا وہ علم الٰہی ایک ہی قسم کے مجرّدات کی قید میں مقیّد ہے اور یہ علمِ حقّانی تمام موجودات و کائنات پہ ساری و طاری ہے ، بمطابقتِ آیۂ کریمہ کہ اللہ ہر شے کو اپنے احاطۂ علمی میں لیے ہوئے ہے[1] پس رسول اللہ کے صادق عشاق کو اپنے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صدقے علمِ الٰہی سے بدرجۂ اتم نسبت ہے اور نورِ رحمانی سے ان پر ہر حقیقت روشن ہوجاتی ہے اور اُن کا سارا علم خواہ آسمانی ہو یا زمینی ، طبیعی ہو یا روحانی سراسر علمِ الٰہی ہے - اور بموجب اس فرمان کے کہ اُنھیں سکھایا اللہ تعالیٰ نے علم اپنے ہاں سے - اور یہ علم صوفیا کا وہ اصطلاحی علم بھی نہیں جسے وہ تصوف کہتے ہیں ، کیونکہ ان دنوں جاہلوں نے تصوف کو جن معانی کا لباس پہنایا ہے اور پھر اُس پہ جن مہمل لغویات کی ایزادی کی ہے وہ محض الحاد ہے ، بالکل بے بنیاد ، لغو اور پوچ باتیں ہیں - باقی رہ گیا اہلِ ایمان اور اہلِ یقین متصوفین کا گروہ ، اُن میں بھی ایک گروہ ایسا ہے جو کیف وحال کے قائل ہیں وہ کاروبار میں بھی مشغول رہتے ہیں اپنے آپ کو صوفی کہلواتے ہیں اور خود کو فرقۂ صوفیہ میں سے گنتے ہیں - ان بیچاروں کو تحقیق ومعرفت سے کیا سروکار ؟ محقق صاحبِ حال لوگوں کے سامنے وہ کس شمار قطار میں آسکیں گے - انہی میں سے محققین کی ایک دوسری قسم ہے یہ صاحبِ علم وعرفان لوگ ہیں - علمِ تصوف انہی کی تحقیقات سے عبارت ہے - فی الحقیقت یہ لوگ اہلِ تحقیق اور اہلِ تدقیق ہیں - ان کی تحقیقات فلسفیوں اور متکلمین کے مطالب سے اعلیٰ و برتر ہیں ، اُن کا کلام پُرمغز اور بامعنی ہے - ان کا طریقہ اکثر و بیشتر اشراقی حکما کی مانند ہے ، اور اُن کے اکثر امور اسی آئین پر ہیں - لیکن ان کا یہ علم بھی اضافی علم ہے کیونکہ صوفیا اپنی طرف سے اصطلاحات مقرر کر کے مطالب کو اپنے قواعد کے سانچے میں ڈھال کر نچلی سطح پر لے آتے ہیں - مصطفویوں کا علم خالصتہً حقیقی ہے - وہ مصطفوی انداز و الفاظ میں گفتگو کرتے ہیں اور مطالب کو ان کی اصلی حالت میں بیان کرتے ہیں - اگرچہ وہ اپنی کتب اور رسائل میں ہر قوم کی اصطلاحات اور حقانی امور کے اظہار و بیان کے لیے ہر ڈھنگ اور ہر قاعدے سے لکھتے ہیں لیکن اپنی تحقیقات میں اس قسم کے کلمات وہ عوام کی افہام وتفہیم کی خاطر ضرورت کے تحت لکھتے ہیں -

ان کے پیشِ نظر یہ بات بھی رہتی ہے کہ کلامِ الٰہی میں بھی روایت اور حکایت کی شکل میں ہر قسم کے لوگوں کی باتیں درج ہیں اور یہ آسمانی صحیفے بھی رسولوں اور ان کی اقوام کی اپنی مخصوص زبانوں ہی میں نازل ہوئے اور انبیا کی گفتگو اور بحث و تمحیص بھی ہر قوم کی اپنی زبان ہی میں ہے۔ اور حق بات کے اثبات یا تکذیب اور دیگر بحث مباحثے اس زمانے کی مروّجہ زبانوں میں تھے پس اللہ تعالیٰ دانا و بینا ہے اور ظاہری یا باطنی طور پر ہمارا مقصود و منظور نظر فقط رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع اور آیاتِ قرآنی اور احادیث پیغمبر کے اسرار و رموز کا انکشاف ہے۔ کلامِ ربانی جو ان ظاہر بین مجذوب بچاروں کی نظروں سے پوشیدہ ہے اور مختلف جماعتوں کی مختلف اور کثیر تعبیرات و تفسیرات کے باعث امور کی حقیقت و ماہیت بدل کر رہ گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ اس قوم کو ہدایت بخشے۔ بے شک وہ علم نہیں رکھتے اور حقیقت سے بھی غافل ہیں۔ مومنوں اور مصطفویوں کا کلام سراسر اور خالصتہً کلام اللہ کی تفسیر ہے اور حضور رسول مقبولؐ (ان پر درود و سلام) ان کے اقوال پر گواہ ہیں۔ معقول لوگ انہی شہسواروں کی رکاب کے ساتھ ساتھ دوڑتے ہیں اور اصحابِ تصوف کے کلمات بھی انہی براق سوار پیروانِ رسولؐ کے جلو میں چلتے ہیں۔ کتنا اچھا ہے وہ جس کی یہ متابعت کرتے ہیں اور کتنے بھلے ہیں یہ تابعین۔ یہ ظاہری اور باطنی تابعین محض سرورِ کائنات رسولِ مقبولؐ کے تابع اور ریزہ چین ہیں۔ وہ دوسرے کی پیروی اور کاسہ لیسی سے کوئی سروکار نہیں رکھتے۔ اگلے اور پچھلے لوگوں کی جو کوئی بات جس حد تک لفظاً اور معناً اُن کے کلام کے مطابق و موافق ہو ٹھیک ہے۔ متقدمین اور متاخرین کے بیانات ظاہراً و باطناً خواہ کتنے ہی ان کی تحقیق کے مخالف ہوں، ان کی تحقیقات ہر قسم کی تقلید سے مبرا ہیں۔ وہ محض القا و تائیدِ ربانی کے قائل ہیں۔ ان کی معلومات نہ اُن کے اپنے ظن و گمان اور مفروضوں پر مبنی ہوتی ہیں اور نہ ہی ان کے مکشوفات ان کے ذاتی موہومات پر۔ ان کی سچائی اور حقانیت میں کھوٹ اور جھوٹ کی آمیزش نہیں ہوتی۔ ان کا اتّباعِ رسولؐ ہر قسم کے کھوٹ اور نقص سے پاک ہوتا ہے۔ وہ وہی کچھ کہتے ہیں جو خدا نے فرمایا ہے، وہی کچھ دکھاتے ہیں جو رسولِ برحقؐ نے دکھایا ہے۔ یہ علمِ ربانی متکلمین کے کلام کا علم بھی نہیں جس میں بُرے اور بھلے اور صحیح و غلط کا احتمال ہو سکتا ہے کیونکہ جب وہ نئی نئی باتوں کو اپنی طرف سے گھڑ لاتے ہیں اور پھر اپنی رائے کے اعتقاد و اجتہاد کے سلسلے میں انھیں استعمال بھی کرتے ہیں تو پھر اس مقولے کے مطابق کہ اجتہاد کرنے والا خطا بھی کرتا ہے اور صحیح بات پا بھی لیتا ہے غلط یا صحیح ہونے کا جواز پیدا ہو جاتا ہے۔ چنانچہ وہ اپنے اس علم کی تعریف میں خود لکھتے ہیں کہ یہ ایک ایسا ایجنٹ ہے (گماشتہ ہے) جس سے اغیار پر دینی عقائد کے اثبات میں قدرت حاصل ہوتی ہے اور ثبوتوں کے سلسلے میں ان عقائد پر ان کے اعتراضات د

الزامات کے جواب دیے جاتے ہیں۔ وہ عقائد خواہ صحیح ہوں یا غلط۔ کیونکہ فرقۂ معتزلہ اور ان کے دیگر فرقوں کے نزدیک ایک دوسرے کو خطا وار ٹھہرانے کے باوجود خطا کار بھی علمائے متکلمین کے زمرے سے خارج نہیں ہوتا اور اس کے غلط مسائل بھی علمِ کلام سے خارج نہیں ہونے پاتے۔ پس حق بات یہ ہے کہ یہ لوگ اکثر مجہول و نامعلوم مسائل اور بیشتر نامعقول دلائل بغیر دعویٰ و اسباب کے کھڑا کر دیتے ہیں اور انھیں ان دینی و اسلامی امور کی بنا پر اثبات کا درجہ دے دیتے ہیں جو عقلاً مسلم الثبوت نہیں، حالانکہ وہ امور اپنی ذات میں اشد ضروری اور روشن و آشکارا ہیں۔ اور کسی قسم کے نقد و نظر اور دلائل کے محتاج نہیں چہ جائیکہ انھیں غیر حقی دلائل پہ مشروط کر دیا جائے اور ثبوت کے لیے انھیں ایسے امور سے پرکھا جائے جو خود ہی غیر ثابت شدہ ہوں۔ گویا یہ لوگ اپنی دینداری کے گمان میں اپنی سادہ لوحی کا مظاہرہ کرتے ہیں اور خواہ مخواہ دخل در معقولات دے کر اپنی کم عقلی ظاہر کرتے ہیں۔ خدا معاف کرے اور معاملے کو انھی کے خیال کے مطابق طے فرمائے۔ تاہم انھوں نے اغیار کے الزامات کے متعلق جتنے بھی دعوے کیے ہیں اور ان کے ثبوتوں پر جتنے اعتراضات کیے ہیں ان کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔

اسی تسلسل میں سمجھ لو کہ تصوف نام ہے چند اصطلاحات کے جاننے کا جو صرف و نحو اور اپنی کوشش سے حاصل کردہ علوم کی طرح کتابوں اور رسالوں کے پڑھنے سے آتی ہیں اور جو حکمت فلسفیوں کے نصیب میں آئی وہ اشیا کی ان چند اعتباری حدود اور اضافی قیود کا بیان ہے جو انسانی علم سے تعلّق رکھتی ہیں اور علمِ کلام چند زائد از ضرورت مسائل کا اثبات ہے کہ عقلی دلائل و براہین سے پایۂ ثبوت کو نہیں پہنچتے۔ وحدت وجود گستاخانہ تقریر اور مستانہ بیان ہے جس سے ناقص العلم اور مغلوب الحال لوگوں کو ابتدا میں واسطہ پڑتا ہے اور یہ عوام الناس کے لیے سخت نقصان کا باعث ہے اور وحدت الشہود حقیقت کا ادراک کیے بغیر شوق کی فراوانی اور جذبات کے غلبے کی حالت ہے جو اکثر سالکانِ راہ کے لیے مفید اور سود مند ہے اور سرورِ کائنات ؐ کی طرف سے لایا ہوا علمِ الٰہی عبارت ہے نورِ ایمان کی قوت اور کشف و عرفان کے شواہد سمیت براہین و دلائل کے بل بوتے پر آیاتِ قرآنی اور احادیث نبوی ؐ کے مفہوم و مدعا کو بیان کرنے سے۔ اور یہ عوام و خواص سبھی کے لیے مفید ہے۔ رسولِ پاک ؐ کے سچے پیروکار جس حکمت سے سرفراز ہوتے ہیں وہ سراسر خیرِ مطلق اور مظہرِ نورِ حکمتِ ربانی ہے اور وہی سب سے بڑا جاننے والا اور حکمت والا ہے۔ خدا کے ان ارضی خلیفوں کا کلام بھی کلامِ الٰہی اور احادیث نبوی ؐ سے ماخوذ ہوتا ہے۔ ان کے کلام کا کوئی گوشہ بھی کلام

کے پڑھنے والے سے پوشیدہ نہیں رہتا۔[۵] ان حقیقی توحید پرستوں کو جو توحید نصیب ہوتی ہے وہ وحدانیت ذاتِ حق کی آئینہ دار ہوتی ہے، وہ آدابِ شرعی سے مصدقہ اور نیک روی کا ماحصل ہوتی ہے۔ یہ اُس علم و معرفت کی انتہا ہے جو کامل عاقلوں، پاک نفوس، پختہ ایمان والے مومنوں اور باکمال عارفوں کو اللہ کے برگزیدہ و منتخب بنا کر آشکارا ہوتا ہے، اللہ جسے چاہے اپنی رحمتِ کاملہ سے مختص کر دیتا ہے۔[۹]

حکما اور متکلّمین کے دلائل کی حقیقت اور محققّوں اور عارفوں کے مسائل کی کیفیت

یہ بات سمجھ لیجیے کہ اکثر امور جنھیں متکلمینِ عالم اپنے دلائل و براہین سے ثابت کرتے ہیں۔ حکما کے دلائل کے سامنے ان کے یہ دلائل کمزور پڑ جاتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ جس امر کے لیے دلائل پیدا کرتے ہیں پہلے اپنے ذہن میں ان کی تراش خراش کرتے ہیں خواہ وہ بات معقول و مدلل ہو یا نہ ہو۔ بعد ازاں اپنے دعوے کے استقلال و قیام اور اُسے تسلیم کرانے کے لیے ہاتھ پاؤں مارتے ہیں۔ دلائل اور براہین ڈھونڈتے ہیں خواہ اس بات کے اثبات کے لیے عقلی دلائل سرے سے ہوں ہی نہ۔ وہ اپنے خیال کے مطابق عقلی دلائل ڈھونڈ نکالتے ہیں، حالانکہ فی الحقیقت وہ دلائل عقلی نہیں ہوتے اور وہ محض ان کے اپنے وہم و گمان کی پیداوار ہوتے ہیں۔ لیکن گمان ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ یہ قول بغیر دلیل کے ہے۔ لیکن ان دلائل کو چونکہ وہ اپنی عقل کے زور اور بل بوتے پر پیدا کرتے ہیں۔ لہٰذا وہ انھیں عقلی دلائل ہی شمار کرتے ہیں۔ اور اُن کے خیال میں اب ان کا مسلّم یا غیر مسلّم ہونا باقی رہ جاتا ہے۔ مثال کے طور پر جس طرح صرفی اور نحوی لوگ صرف و نحو کے سلسلے میں عربی زبان میں مستعملہ قسموں کو تسلیم کرنے کے لیے چند قواعد و ضوابط بنا لیتے ہیں، سو بعض جگہ تو وہ اتفاقاً درست ثابت ہوتے ہیں اور بعض جگہ صحیح ثابت نہیں ہوتے۔ اس عمل یعنی پہلے اپنے ذہن میں کسی امر کو تراش خراش دینے اور پھر اُس کے لیے دلائل و براہین کے تلاش کرنے کی وجہ یہ ہے کہ ان پر اس بات کا انکشاف نہیں ہوا ہوتا۔ اپنے خیال میں تو شرعی امور کے اتّباع کا قصد کر رہے ہوتے ہیں لیکن اپنی جزئی عقل، ناقص فہم، حقیقت سے عدم واقفیت اور اسرارِ شریعت سے لاعلمی کی وجہ سے اپنے وہم و گمان میں اسلامی اور ایمانی امور کو وہ منقول سے معقول کو بالکل الگ سمجھتے ہیں اور اپنے آپ کو دیندار، حقیقت شناس عالم اور شریعت کا طرفدار سمجھتے ہیں اور اپنے زعم میں دین کی خدمت کر رہے ہوتے ہیں اور اپنے علم کے زور پر اپنے عقائد کو معقول گردانتے ہیں، حالانکہ صورتِ حال اس کے بالکل برعکس ہے یعنی

کہ وہ اُمور سراسر معقول اور حق ہیں اور یہ لوگ ناحق اور بے فائدہ طور پر غیر معقول تقریریں کر کے غیر ذمہ دارانہ شکوک و شبہات اُٹھاتے ہیں۔ نہ تو ان کے پاس وہ علم و عرفان، نہ وہ عقل و ایمان ہے جو اہل اللہ اور اہلِ حقیقت عارفوں کے ہاں ہوتا ہے۔ شریعت کو عین حقیقت سمجھنے کی بدولت ان پہ تمام حقائق اور اسرار و رموز کا انکشاف ہو چکا ہوتا ہے۔ ہر امر کے راز کو کما حقہٗ پا لینے کی وجہ سے ان میں ہر طور اور ہر طریقے کے بیان کی اہلیت ہوتی ہے۔ ان کے دلوں کو سکون نصیب ہوتا ہے اور وہ دوسروں کے سامنے ہر ڈھنگ سے جواب دے سکتے ہیں اور نہ یہ لوگ عامۃ المسلمین کی ہر بات پر بغیر کسی چون و چرا کے آمنا و صدقنا کہہ دیتے ہیں لیکن چونکہ اپنے زعم میں ان کی نیت دینی خدمت کرنے کی ہوتی ہے گمان غالب ہے کہ ان پہ عذاب اور عتاب نہیں ہوگا۔ حکما کی بنیاد اس اصول پر ہے کہ جو امورِ عقلی دلائل سے ثابت ہو جائیں ان کا اثبات کرتے ہیں۔ یوں نہیں کہ پہلے ایک چیز کا قائل ہو کر بعد میں اس کے لیے دلائل ڈھونڈتے پھریں جس طرح کہ منطقی حضرات پہلے جب کسی کُل، جزو اور عموم و خصوص کے معانی کو معقول پاتے ہیں تو پھر اس کے بعد منطقی قواعد مرتب کرتے ہیں۔ اور یہ جاہل طبع عالم اکثر و بیشتر ہر حقیقت کے اظہار اور ہر امر کے بیان کو جو معقول واقع ہو سنتے ہی سوچے سمجھے بغیر کہہ دیتے ہیں کہ یہ فلسفیوں کا ڈھنگ ہے اور یہ فلسفیانہ انداز ہے، اور اُس امر کی تہ اور حقیقت کو نہیں پہنچ پاتے کہ اگر واقعاً وہ حق بات ہے تو پھر فلسفی کا کہنا کیا ہے۔ جو بات فی نفسہٖ درست ہے وہ حق ہی ہوگا اور جو غیر واقعی و نادرست ہے وہ باطل ہوگا۔ کسی کے کہنے یا نہ کہنے سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ جو فلاسفہ محض عقل کی پیروی اختیار کر لیتے ہیں اور انبیائے کرامؑ کی دعوتِ حق کو قبول نہیں کرتے اور نبوّت اور رسالت کے انکار پر لب کشائی کرتے ہیں وہ امور کی حقیقت تک پہنچنے سے محروم رہتے ہیں اور محض کفر و گمراہی کا راستہ طے کرتے رہتے ہیں، وہ اپنی عقل ہی کے پابند ہیں اور اُس مرتبے کے راستے سے جو عقل و فہم کی پہنچ سے باہر ہے اور جو صرف پیغمبروں کے اتباع اور ایمانی نور سے کُھلتا ہے دُور رہ جاتے ہیں۔ وہ یہ نہیں جانتے کہ ان کے معقول امور کے علاوہ بھی کچھ امور ہیں جنھیں انبیا اور اولیائے کرام صرف نورِ رحمانی کی بدولت دیکھ سکتے ہیں۔ لہٰذا جس طرح متکلمین اپنے اوہام میں پھنسے ہوئے ہیں اسی طرح فلسفی بھی اپنی عقل کے ہاتھوں مجبور ہیں۔ ان کی عقل کی روشنی نے اُن کی چشمِ بصیرت کے نور کو دُھندلا دیا ہے۔ ان علما کی ظاہری آنکھ کے نور نے ان کی عقل کے نور کو تیرہ و تار کر دیا ہے جبھی تو وہ صرف ان ظاہری اُمور کو دیکھتے ہیں اور ہوش و عقل سے ہرگز کام نہیں لیتے۔ چنانچہ فلاسفہ کا کام صرف عقل تک محدود رہتا ہے۔ لہٰذا

جو امور عقل کی دسترس سے باہر ہیں ان کا ادراک نہیں کر پاتے۔ ان کے دلائل و براہین خواہ کتنے ہی معقول کیوں نہ ہوں نورِ حقیقت سے بے بہرہ ہونے کی وجہ سے اُنھیں فائدہ نہیں پہنچا سکتے، اور نہ ہی اللہ تعالیٰ کے قرب کے نتائج اور ثمرات بخش سکتے ہیں۔ عقل رہنمائی ضرور کرتی ہے مگر صرف اس محبوبِ حقیقی کے دروازے تک، مگر اُس سے آگے دروازے کے اندر تک تو محض عنایت لم یزلی ہی پہنچا سکتی ہے۔ علما الفاظ کے محکم دائرے میں مقید ہیں اور فلسفی معانی کے دائرے میں، حالانکہ الفاظ و معانی دونوں اعتباری ہیں اور حقیقت کچھ اور شے ہے۔ وہ صرف کامل اولیائے کرام اور محقق عارفینِ ذات ہیں جو شہودِ حقیقت کے شرف سے شرف یاب ہوتے ہیں۔ اور انھوں نے اُن لوگوں کے اس تانے بانے کو جو اُنھوں نے مکڑی کے جالے کی طرح بُن رکھا تھا توڑ پھوڑ دیا اور کچھ شک نہیں کہ سب گھروں میں زیادہ بودا مکڑی کا گھر ہوتا ہے۔ ان بزرگ ہستیوں کا کلام عقلاً و نقلاً ہر طرح پایہ ثبوت تک پہنچتا ہے، اور ظاہراً اور باطناً بھی آیاتِ قرآنی اور احادیثِ نبوی کے مطابق ہوتا ہے۔ اور کسی بات کی دلیل دینے سے پہلے ہی وہ بات ان پہ آشکارا ہوجاتی ہے اور پھر دلیل کے بعد وہ بات اور بھی آشکارا و روشن ہوجاتی ہے۔ دلیل کے ساتھ بھی وہ مدلول منصۂ شہود پہ آتا ہے اور دلیل بازی کے دوران میں بھی وہی مدلول نظر آتا ہے۔ گویا تم نے کوئی چیز نہیں دیکھی سوائے اس کے کہ تو نے اللہ کو دیکھا پہلے بھی اور بعد میں بھی۔ وہی پہلے ہے اور وہی پیچھے، اور وہی ظاہر ہے اور وہی مخفی، اور وہ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے۔ ان بزرگوں کی حکمت بھی حکمتِ الٰہی ہے اور ان کا علم لاانتہا۔ معقول ان کے حضور میں دست بستہ اور منقول کلی طور پہ ثبوت سے پیوستہ۔ الغرض ان کی تحریر و تقریر دونوں محض رب العزت کی طرف سے القا اور حضور رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے فیضان کا نتیجہ ہوتی ہے۔

علم الکتاب کے ام الکتاب کی نسبت سے لکھے جانے کی حالت کی تاریخ پر چند جملے واردات قلبی کی شرح کے لیے، تمام جہانوں کی نصیحت کے لیے

علم الکتاب کے نام سے مراد کا بیان:

اس لفظ الکتاب میں بہت سی مرادیں اور اشارے مضمر ہیں۔ الف و لام کے اعتبار سے ذہنی و خارجی طور پہ مراد خالقِ حقیقی کی لوحِ محفوظ ہے اور حقیقتاً وہی ام الکتاب ہے۔ ہر شے کی آئینہ دار ہونے کی وجہ سے یہ سب کلام اسی کی شاخیں ہیں اور اُسی سے بہرہ مند ہیں۔ نیز اس سے مقصود کتاب اللہ اور احادیث نبوی بھی ہیں کہ یہ سب کی سب اسی کی تفسیریں اور تاویلیں ہیں۔ اسی کی تفصیل اور وضاحت ہیں نیز مراد اس سے "نالۂ عندلیب" نامی مبارک کتاب ہے اور اُس حبیب کے مقالات، کیونکہ مجھ ناچیز

کی سب تحقیقات اسی سے نکلی ہیں اور اسی کی شاخیں ہیں ، اور مجھ فقیر حقیر کی کتاب واردات کا متن بھی اسی کا مرہونِ منّت ہے۔ اس شرح میں ان علوم کے متن کی تشریح و توضیح کے سوا اور کچھ نہیں ۔ اور الف و لام کے لحاظ سے ، اور جنس و استغراق کی وجہ سے یہ کتاب اپنی انفرادیت کے باوجود تمام کتب کے خلاصے اور نچوڑ کی حامل ہے اور ان کے علمی متون کا لب لباب اور مغز ہے۔ اپنے جوہر اور مکتوبات کی بنا پر تمام کتب کی ذاتی حیثیتوں اور ان کے مندرجات کے لحاظ سے ان کے علم و نتائج کا حاصل ہے۔

کتاب ہذا کی فہرستِ مطالب
اور مختصراً جملہ مطالب کی تفصیل کا مکمل جائزہ

دیباچے کا حمدِ باری تعالیٰ اور درود وصلوٰۃِ پیغمبر سے حضور وخطاب کے انداز میں آغاز ہوتا ہے ۔ اور یوں خدائے بخشندہ و برتر کی طرف سے کتاب کی ابتدا بیان اس کتاب کی تحریر محض فضلِ ربانی اور تائید آسمانی سے ہے اظہار صنعت اقتباس کا اظہار احادیثِ نبوی ، آیاتِ قرآنی اور خصوصی اسرار ورموز سے ردِّ شبہات کے ساتھ ہوتا ہے ۔ دیوت قرآنی آیات سے دلائل دے کر بیان شدہ مطالب کی طرف دعوت بیان اس تحریر وکلام کی حقیقتِ حال اور کیفیت کا بیان اور اس کے فوائد اور منافع کا مختصر تذکرہ بیان اس مجموعہ یعنی علم الکتاب کی اسم گزاری کا بیان ، اور اس شرح اور متن کے مکمل طور پر اللہ کی طرف سے ورود اور دیگر اسرار و رموزِ توحید کا بیان اور ضمناً خدائے واحد سے مکالمہ مقدمہ مقدمہ اولیٰ میں اس علمِ جدید کے جسے ہم علمِ الٰہی محمدیؐ کہتے ہیں ، کے اغراض ومقاصد، فوائد اور حدود و تعریف وتوصیف کے موضوعات کا بیان، اس کے مرتبے اور قدر ومنزلت کا اظہار اور حکمت وتعارف وکلام پر مشتمل دیگر حریفوں پہ اس کا نولئے امتیاز اور ضمناً کسی حد تک ان کی حقیقت کا بیان ۔ نیز اس امر کا بیان کہ تصوف کیا ہے اور وہ حکمت جو نصیب فلاسفہ ہے وہ ہے کیا چیز ؟ علم کلام کی حقیقت کا انکشاف ۔ وحدت الوجود اور وحدت الشہود کی اصلیت کا ذکر نیز اس امر کی وضاحت کہ علمِ الٰہی محمدیؐ کس چیز سے عبارت ہے اور مومنانِ پاک باز کی شرافت کے کمال اور مرتبے کی بلندی کا بیان اور اُس حکمت کی وضاحت جو خیرِ مطلق کہلاتی ہے اور جو خاصانِ حق کا خاصہ ہے ۔

گفتگو کرتے ہیں اور وہ توحید و وحدانیت جو ان موحدّوں کا خاص نصیب و حصہ ہے۔ بیان متکلمین اور حکما کے دلائل اور محققوں اور عارفوں کے مسائل کا بیان۔ اس کتاب کے لکھنے کے مادہ تاریخ کے متعلق چند فقرات و جملات۔ علم الکتاب کے نام سے کیا مراد اور اشارہ ہے، فہرست، اس مجموعہ کی شروع سے لے کر آخر تک کی فہرست جو مفصل ہوتے ہوئے بھی مجمل ہے کیونکہ غیر ضروری طور پر اُسے طوالت نہیں دی گئی۔ مقدمہ اخریٰ یہاں سے لے کر واردات کے آغاز تک ہے، وہ بہت سے مطالب اور بے شمار فوائد و تحقیقات کا حامل ہے بیان کچھ خود کلامی اور اپنی ہستی کی طرف سے جسم و جان کے نام فرمان۔ بیان جسمانی اور روحانی امر، جملہ امتیازِ انسانی، اور ذاتِ حق سے حاصل کردہ نور اور اپنے وسیلے اور وساطت سے جسم و جان کی طرف سے خدائے بے نیاز کو دعوت کا بیان بیان حضورِ ذات کے قرب و نزدیکی کے مراتب اور شواہد کے ثابت کرنے کا بیان۔ مشاہدۂ حق اور قربِ باری تعالیٰ نیز چاروں دلائل یعنی نقل و عقل و ملکہ و مکاشفہ کا اظہار جو کاشفِ حقیقت ہیں۔ ذاتی معاملات، اور وارداتِ قلبی کا ذکر: ان اربعہ دلائل کی روشنی میں اپنی روئداد، اپنے اوپر ہونے والی اللہ تعالیٰ کی خاص عنایات و انعامات پہ اظہارِ تشکر بیان پرورش و تربیتِ انسانی کی صورت میں ربی مرتبے کو سرانجام دینے کا بیان۔ خلافتِ الٰہیہ کے منصب کے ظہور، تمام کمالات کا مرجع، جسم و جان کے حق میں دُنیا و آخرت کے انتظام کی عافیت و سلامتی، دینوی فلاح و بہبود اور اخروی نجات و فلاح کے سلسلہ میں مرتبۂ ربوبیت کی انتہا کا بیان۔ امرِ حق کی مخلصانہ اور بے غرضانہ ہدایت، نجات کی راہ، عبادات و اطاعات کی ترغیب جس کے بغیر خیریت و عافیت کا تصور بھی ناممکن۔ دوسرے احکام و افعالِ الٰہیہ کا انکشاف۔ اپنی ذات کے پردے کی مثال میں مرتبہ واجب الوجوب کی بے نیازی۔ اظہار نمونہ و مثال کے طور پر خدائے ذوالجلال کے قرب و ہمراہی کا اظہار، اور وحدانیت کے اسرار و رموز کا انکشاف بیان اس امرِ درپیش کے لیے اثبات کی سند لینے اور اپنے حقی معاملات کے لیے اپنے ہی نفس کو گواہ ٹھہرانے، اپنی راستی و راست روی کے ثبوت کے لیے خود پر مکمل اعتماد اور پختہ اعتقاد ہونے کا بیان۔ اس لیے کہ اہلِ حق کو بھی پہلے پہل خود اپنے راہِ حق پہ ہونے پہ اقرار اور یقینِ کامل حاصل ہوتا ہے جس سے کسی قسم کے انکار و کفران کی گنجائش نہیں رہ جاتی۔ پھر اُن کا یہ غلبۂ حق و حقانیت دوسروں کے دلوں میں سرائت کرتا ہے اور اپنا اثر دکھاتا ہے اور وہ ان کے راہِ حق پہ ہونے کا اقرار کر کے ان کے معتقد ہو جاتے ہیں۔ بیان ایمان کے مختلف مراتب کا بیان۔ ایمان کا پہلا درجہ

حق الیقین ہے جو حق تعالیٰ کو خود اپنی ذات پر ہے۔ پھر عین الیقین کا درجہ جو نبیوں کا نصیب ہوتا ہے۔
(خدا کی ان پر سلامتی ہو) ایمان کے علم الیقین کا مرتبہ اولیاء اللہ اور عارفانِ حق کو حاصل ہوتا ہے۔ ایمان سماعی
عامۃ المسلمین کا حصّہ ہے اور کفار اس سے بھی محروم ہوتے ہیں۔ بیان قرآنی آیات سے ماخوذ اللہ سبحانہ کی
حمد کا بیان۔ ب اور نقطہ و نون کے لباس میں ملبوس پوشیدہ رمز کا انکشاف، اصولِ عالیہ کے اجتماع سے
طریق محمدیہ، رسولانِ خدا کی تبلیغ و دعوتِ حق کے اظہار کے لیے بعض قرآنی آیات کے فیضان سے اس صورت
کے اسرار و رموز کا ظہور، اس فصیح و بلیغ کلام کے اعجاز کا دعویٰ، منکروں اور متردد لوگوں کی قیل و قال، شکوک و
شبہات کے مارے ہوئے لوگوں کے سوال و جواب - ان کے حال اور انجام کی خرابی، نیز اس بات کا اظہار کہ تائیدِ
ربانی اور نصرتِ رسول مقبول سے یہ خبیث الطبع، شیطان خصلت، بدسرشت منکرین جب حضور پُر نور کے
مخلص تابعین کے سامنے آتے ہیں تو لاجواب ہوکر اپنے عجز کا اعتراف کر لیتے ہیں اور اپنی پرانی ریت اور قدیم رسم
کے مطابق جب یہی بدنصیب لوگ اپنی جگہ پر واپس لوٹتے ہیں اور اپنے جیسے دوسرے شیطان سیرت احباب
سے باہم بے تکلف ملتے ہیں تو پھر اسی خباثت اور پلیدی کا اظہار کرتے ہیں، اور زمانۂ جہالت کے اُسی بازاری
قسم کے شکوک و شبہات کے قائل ہوجاتے ہیں۔ آیاتِ قرآنی کے سیاق و سباق کے شواہد کی روشنی میں ان
تمام معاملات کا بیان۔ تحدیث اپنے حق میں اللہ تعالیٰ کی نعمتوں، خاص الخاص عنایات اور خاص وقت میں
بعض الہامی کلمات کے نزول کا بیان بیان اللہ تعالیٰ کے ذاتی اور صفاتی اسماء، اسمِ اعظم اور اس مبہم اور پوشیدہ
اسم کا تمام اسمائے الٰہی میں شامل اور ساری و طاری ہونے کا بیان۔ جامع کلی و مجملی اسما اور مخصوص جزئی و مفصل
اسما کے مراتب کا فرق بیان اپنے چند ناموں کی مشابہت اور نظریے، اس امر کا بیان کہ اسمِ ذات کون سے
ہیں اور اعتباری، اضافی اور صفاتی نام کون کون سے ہیں۔ نیز عنایت شدہ ننانوے ناموں کا ذکر ربوبیت
اور الوہیت کے مشاہدے کے غلبے کے باوجود حالتِ قرب میں بندگی اور عبودیت کا دعویٰ۔ وحدت الوجود کے
ظن و تخمین کی تردید، کشفِ حقیقت کے بارے میں جو کچھ مثال کے طور پر واقع ہوا ان شکوک و شبہات کا رفع دفع
کرنا۔ بیان مقربانِ حق کی قدر و منزلت، ان کے عظیم الشان مقام، اور ان کی راہ و روش اور منشا کا بیان
اور دُنیا و آخرت میں مفید مطلب انسانی کیفیات اور معاملات کا مطالعہ کہ یہ نعمت خصوصاً انبیائے علیہ السلام
کی روحانی غذا ہے اور ان تمام کمالات کی جامعیت جو خالص مومنوں کا حصّہ اور نصیب ہے۔ بیان اس تمام
کلام کے خلاصے اور اپنے جسم و روح کو اصل حقیقت اور دیگر اسرار و رموز سے آگاہ کرنے کا بیان۔ مختلف

ادیان (مذاہب) کی حقیقت اور ہر انسان کی کیفیت۔ دین اللہ کے معانی، شریعت کی حقیقت اور تمام لوگوں کی استعداد و اہلیت کے مطابق ان کے مراتب کے مختلف درجے۔ مخلوق میں چونکہ بعض لوگ جزوی استعداد رکھتے ہیں، جیسے کہ اُمتی اور عام پیروکار جو کسی اور کو اپنے حکم کے ماتحت نہیں رکھتے۔ بعض میں مکمل استعداد ہوتی ہے جیسے کہ انبیائے کرام جو اپنی جزئیات تک میں شامل ہوتے ہیں، اپنی امتوں کو اپنے حکم کے تحت رکھتے ہیں۔ بعض انواع و اقسام کے معنی سمجھنے کی اہلیت رکھتے ہیں جیسے کہ دیندار مجتہد اصحاب اور اولیائے کرام جو خاص طریقے کے مالک ہوتے ہیں۔ بعض کلی استعداد رکھتے ہیں بلکہ وہ فی نفسہٖ افضل و اکمل ہوتے ہیں اور وہ ائمہؑ معصومین ہیں جیسے حضرت علیؓ رسول کریمؐ اور ان کی آل اولاد (ان سب پر خدا کی سلامتی ہو) تلقین قرآنی آیات سے ایمان کی تلقین یعنی کہ اس قسم کا کامل ایمان مومنوں میں ہونا چاہیے اور اُنھیں اپنے آپ کو اسوۂ حسنہ کے سانچے میں ڈھال لینا چاہیے۔ دینِ محمدیؐ کی شرعِ متین کی جامعیت اور پیغمبر اسلامؐ کا طریقہ، اُس کا دیگر شریعتوں اور طریقوں سے اعلیٰ و ارفع ہونا، اور اپنی قوم کو پختہ دلائل کے ساتھ اسوۂ محمدیؐ کے طریقے سے بشارت دینا اور عذاب سے ڈرانا دھمکانا۔ اپنے حال پر اللہ تعالیٰ ہدایت، عنایت، حمایت اور بعض الہامی کلمات کا بیان اور بعض آیاتِ شریفہ کے توسط سے اپنے درپیش معاملات کے کشف کا اظہار۔ **بیان** لوگوں کی ذاتی اہلیتوں کے اختلافات، اُن کے درجوں اور مرتبوں میں فرق کا بیان۔ نیز قرآنی آیات کو چھانٹ کر ان کی رُو سے اُنھیں مندرجہ ذیل چار حصّوں میں بانٹنا جو کامل مومنوں، ضعیف الاعتقاد اور ڈھلمل یقین والے دینداروں، بے یقین کافروں اور ڈانوں ڈول منافقوں پر مشتمل ہیں۔ **محاسبہ** تمام لوگوں کے احوال کا محاسبہ کرنا اور فرداً فرداً یہ جائزہ لینا کہ ان چہارگانہ اقسام میں سے وہ فرد کس سے تعلق رکھتا ہے اور اُس کے مناسب حال کیا ہے؟ ہر کسی کو کیا کرنا چاہیے۔ معاشرے کے ہر فرد کے لیے جو کچھ اصلاح کن اور سودمند ہے۔ **بیان** منافقوں کے حال اور مخالفوں کے انجام کا ذکر، نیز قلبی امراض کی حقیقت اور باطنی صحت و بیماری اور چند دیگر حالات و کیفیات اور حقائق و معارف کے ساتھ ساتھ ضمناً چند قرآنی رکوع کی تفسیر۔ **بیان** اصل کُل کی حقیقت، مختلف راہوں کے اختلاف کا حال، صراطِ مستقیم کی طرف ہدایت اور دینِ متین کی طرف رہنمائی کا بیان۔ **بیان** حقیقت کی کنہ و ماہیت کا بیان اور ہادیانِ برحق کا عوام و خواص یعنی عامۃ الناس کو ہدایت کا درس دینا۔ عارفوں کا مشرکوں کو ان کے شرک کے باوجود دعوتِ حق دینا اور اہلِ شرک میں سے ہر کسی کی حقیقت کا افشا جو قطعاً دعوتِ حق کو قبول نہیں کرتے۔ اور حقیقی گمراہ کرنے والے

کے گمراہ کرنے پر راستے سے بھٹک گئے ہیں۔ اُن مخلصین کا بیان جنھوں نے ہادئ برحق کی ہدایت سے راہِ راست پالیا ہے اور کلامِ الٰہی کے ذریعے ان سب کو درس تبلیغ اور بعض آیات کے پوشیدہ اسرار کے انکشاف کا بیان۔ بیان قرآنِ مجید کی ان آیاتِ محکمہ کی اقسام اور ان کی تفسیر و تاویل کا بیان جو یہ بتاتی ہیں کہ زمین و آسمان اُس حکیمِ مطلق کی نشانیوں سے اٹے پڑے ہیں اور یہ کائناتِ عالم اس بے نشان کے نشانوں سے بھری پڑی ہے۔ اور ان تمام آیاتِ شریفہ کی آفاقی، نفسی اور صامت و ناطق ہونے کے لحاظ سے تقسیم، پھر ناطقہ آیات کی مختلف اقسام کی مختلف منطقوں میں طبقہ بندی اور ان کا مختلف آوازوں، لفظوں اور کلموں میں تقسیم کرنا، اور پھر الفاظ و معانی و نقوش کی شکل میں ان کا بیان۔ بیان دل میں گزرتے والے مختلف النوع خیالات کا بیان جو کبھی خطرات و آفات، کبھی نفسانی باتوں، شکوک و شبہات، عزائم اور عطائے حکمت و الہام اور وحی سے متعلق ہوتے ہیں۔ فائدہ حقیقتِ سجدہ کا ذکر اور قربِ الٰہی کا بیان جو سجدہ کی بدولت حاصل ہوتا ہے۔ سجدۂ تلاوت کا سبب اور عبارت میں آیاتِ سجدہ کے لانے کی وجہ عقیدے کی حقیقت اعلیٰ عقیدے کی اصل اور اصلاح کن صالح عقیدے کی تعلیم اور عقائد کے متن کی تمام عبارت کی اختصار و اجمال کے ساتھ تشریح سمیت اُس کے فوائد کے بیان کے۔

واردات کا آغاز:

بیان تسمیہ یعنی بسم اللہ الرحمن الرحیم پڑھنے، حمد کرنے اور خود بسم اللہ کی تشریح کا بیان۔ بیان حرفِ با (ب) کا لفظ اسم کے ساتھ عربی طریق پہ اتصال۔ تحقیق رحمٰن و رحیم کی لغت اور اشتقاق و صیغے کے لحاظ سے تحقیق۔ ان میں سے ہر کسی کی تقدیم و تاخیر کی وجہ اور ان کا ایک دوسرے سے باہمی فرق۔ بیان آگے چل کر تسمیہ اور جو کچھ ان تینوں اسمائے الٰہی سے متعلّق ہے اس کا بیان۔ ان اسمائے الٰہی سے تعلّق خاطر پیدا کرنا اور ان کے خواص کو اپنانا، نیز اللہ کے مبارک نام کے اپنانے کا جواز۔ تعریف حمد کی تعریف، اس کی حقیقت کا بیان اور اُس کو زبانِ حال و قال اور اپنے افعال سے ادا کرنے کا بیان۔ حمد کی مختلف قسموں یعنی حمدِ قولی (زبان سے حمد بیان کرنا) حمد فعلی (اپنے فعل سے حمد کرنا) حمد حالی (اپنے حال سے سراپا حمد بن جانا) کا بیان، لفظی حمد اور لفظ حمد کی مزید تحقیق و تدقیق اور لفظی و رسمی حمد کی باہمی مناسبت جو ایک وجہ یا صورت سے عام و خاص بن جاتی ہے۔ ان تمام حمدوں کی اصل کا بیان جو ظاہری اور نمائشی حمد ہے۔ نیز ذاتی و روحانی حمد کا بیان جو حمدِ حقیقی ہے۔ بیان حمد و شکر اور مدح کے فرق کا بیان

اور حمد کی ان دونوں پہ فوقیت اس کی اولیت اور عمومیت - ان سب کی باہمی مناسبت کا ذکر۔ شکر و مدح کی تعریف اور تحقیق۔ بیان محمود و محمود علیہ سے لے کر حامد و محمود تک حمد سے متعلقات کا بیان - حمد کرنے میں جملہ اسمیہ کے بہتر ہونے اور اس کی ترکیبِ نحوی کا بیان - الف لام کے سلسلے میں تحقیق اور اُس کی تعریف کہ یہ کونسی قسم ہے - بیان اسم اللہ کے ساتھ حمد کی خصوصیت کی وجہ، اور اس کا ان ہر دو ناموں علیم و مُلہم (یعنی جاننے والا اور الہام کرنے والا) سے تعلق کا سبب - تحقیق لفظ اللہ کی تحقیق۔ اس لفظ کی اصلیت کا بیان - اُس کا وصفی اور علمی بیان - بیان نام اللہ کے تمام صفات کے جامع ہونے کا بیان جو تمام مراتب کی انتہا ہے نہ کہ اُس ذات کا علم جو ہر آمیزش سے پاک ہے - جیسا کہ بعض لوگ خیال کرتے ہیں - بیان اس اسم کا مرتبہ - اس کے سہ گانہ مراتب، (شئ کی شرط کے ساتھ، 'لا' کی شرط کے ساتھ اور بغیر کسی شرط کے) کا نئے انداز کا بیان - مرتبہ ذات کا علم جس کا نہ کوئی نام ہے نہ اثر و نشان - اس امر کا حوالہ "نالہ عندلیب" کی عمدہ تالیف میں موجود ہے - اسم اللہ کی تمام اسمائے الٰہی سے مطابقت، ان میں سے ہر ایک سے شمولیت اور اُن سے دوامی ساتھ کی دلالت کا بیان - بیان حضور پاکؐ کا محمدؐ یا احمدؐ نام رکھنے کا سبب اور ان دونوں اسمائے مبارک کی لفظی و معنوی لحاظ سے تحقیق۔ بیان علم کی اقسام کا بیان - ایک معنی دانست کے ہیں جو حاصل مصدر ہے - یہ علم ضروری و لابدی ہے اور حق تعالیٰ کی ذاتی صفت۔ اس کی دو قسمیں ہیں - پہلی قسم وجود کا ذاتِ وجود پر انکشاف ہے - اسمِ علیم اسی پر دلالت کرتا ہے - وہ پاک ذات علیم اس لیے ہے کہ وجودِ باری تعالیٰ ذاتِ وجود تک کو دیکھتا ہے - یہ علم عینِ ذات ہے - دوسری قسم ہے موجود پر وجود کا انکشاف - اس پر غالمیت کا اطلاق صادق آتا ہے - ذاتِ باری تعالیٰ عالم ہے کہ وہ دیگر معلومات کو دیکھتا ہے - یہ علم زائد بر ذات ہے یعنی اس سے الگ ہے اسے علمِ کثیر بھی کہا جا سکتا ہے - زیادتی، شدت یا مبالغہ کا اطلاق بھی اسی مرتبے میں آتا ہے جیسے علّام یعنی سب کچھ جاننے والا، اور وہ علم جسے ہم نے عینِ ذات کہا ہے - وہ ان اضافات سے بھی اعلیٰ و ارفع ہے - ایک جو دانستن کے صدری معنی میں ہے وہ دینوی علم ہے اس میں نیا پن بھی آ سکتا ہے اور یہ حاصل بھی کیا جا سکتا ہے - اس کی بھی دو قسمیں ہیں - ایک تو موجود کا موجود پر انکشاف لیکن یہ علم حقیقت کی تہ کے سمجھنے سے قاصر ہے - علمِ قلیل کی تعبیر بھی یہی ہے جو ذاتِ باری تعالیٰ تمام جانداروں کو عام تعلیم سے عطا فرماتا ہے - دوسری قسم ہے موجود پر وجود کا انکشاف جس کی تعبیر علمِ لدنی سے کی جا سکتی ہے جو اللہ تعالیٰ اپنے خاص بندوں کو اپنی طرف سے عنایت فرماتا ہے جہاں

خدا کے کامل بندوں کی تعلیمات کو تعلیم الٰہی سے نسبت دی جائے گی اُس سے مُراد یہی علم ہوگا جو حقیقت کا انکشاف کرنے والا ہوتا ہے۔ بیان علمِ انسان کی تقسیم کا بیان - اس کی دو قسمیں ہیں۔ عقلی علم جسے ہم علمِ حکمت کہتے ہیں یہ آگے الہیاتؔ ریاضیات اور طبیعیات میں تقسیم ہو جاتا ہے۔ دوسرے وہبی علم جسے علمِ لدنّی بھی کہتے ہیں، اس کو تین قسموں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ علمِ نبوت و رسالت، علمِ خلافت و امامت و کمالاتِ نبوت اور علمِ ولایت، ان سب اقسام کی تعریف اور حد بندی کی تفصیل، ان کی شاخوں کی تفصیل اور کشفِ حقیقت۔ ان میں سے آگے ہر ایک کی شاخیں ہیں۔ جیسے علمِ تصوف، علمِ ذوق و حال، علمِ دین، علمِ سلوک، علمِ شریعت اور علمِ طریقت، نیز وحدت الوجود اور وحدت الشہود، اور ملحدوں اور کافروں کا فرق اور پہچان۔ بیان الہام کی اقسام کا بیان - ایک عام الہام ہے جو مُلہم حقیقی یعنی خداوند تعالیٰ اس فرمان کے مطابق کہ کائنات کا کوئی ذرہ اُس کے حکم کے بغیر حرکت نہیں کرتا، ہر موجود کو اُس کے حال پر عطا فرماتا ہے اگر موجود صاحبِ علم نہ ہو تو پھر اس امر پر مُلہم کا نام فطری میلان ہوگا، اور اگر وہ صاحبِ علم ہو تو اس کو ارادے کا نام دیا جائے گا جس کا پہلے اُس ذاتِ جمیع صفات کی طرف سے تمام جانداروں پہ الہام ہوتا ہے اور دل میں ارادے کی لہر اُٹھتی ہے۔ پھر ہر ارادے کے فرق و شناخت سے خیر و شر اور نیکی و بدی کا الہام ہوتا ہے۔
ایک الہام خاص ہوتا ہے جو وہ پاک ذات اپنے خاص و پاک بندوں پر قربِ باری کے وقت کسی سوچ بچار اور دیگر حواس کے توسّل کے بغیر القائے رحمانی کی شکل میں نازل کرتا ہے خواہ وہ القا ان کے دلوں پہ ہو، خواہ ظاہری کانوں سے ہاتفِ غیبی کی آواز سُننے سے ہو۔ اکثر و بیشتر باطنی کان ہی اُسے سنتے ہیں اور جہاں کہیں الہام کو اولیائے کرام سے نسبت دی جاتی ہے اُس سے مراد یہی خاص الہام ہوتا ہے۔ بیان اقسامِ وحی کا بیان۔ الہام کی طرح اس کی بھی دو قسمیں ہیں۔ ایک عام وحی، جس میں کوئی تخصیص نہیں ہوتی۔ ایک خاص وحی جو صرف انبیائے کرام کے لیے مخصوص ہوتی ہے۔ اس وحی کے نزول کے طور طریقوں کی قسمیں، خاتم النبیین حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اس سلسلۂ وحی کے منقطع ہو جانے اور یوں عام معنوں میں مستعمل لفظ وحی کے عدم و جواز کا بیان۔ تحقیق صلوٰۃ وسلام اور آل و اصحاب کو درخت کی اصلی اور وصلی (پیوند شدہ) شاخوں سے تشبیہہ و مشابہت کی تحقیق۔ بیان اپنے نام کے ساتھ کلمۂ فقیر کے ضم کرنے اور لفظ میر اور خواجہ کی ترکیب سے مراد اور اشارہ کا بیان۔ مجھ بے بضاعت کا نام اس کی اپنی اصلی حالت میں میرے نانا بزرگوار سید العارفین حضرت سید محمد قادری قدس اللہ سرہٗ سے

رکھے جانے کا بیان ۔ نانا جان کے کمالات و بزرگی کا مختصر تذکرہ اُن کے بزرگوں اور اپنے آباد اجداد کے حسب نسب کا بیان ۔ حضرت شاہ نقشبند سے فرزندی کی نسبت اور پھر شجرۂ نسب کا پچیس ۲۵ واسطوں سے حضرت امام عسکری تک پہنچنے کا بیان اور دادی جان کی طرف سے حضرت سیّد عبد القادر جیلانی کی فرزندی کی نسبت اور اپنے بھائیوں کے ناموں کا ان کے مختصر حالات کے ساتھ بیان ۔ **بیان** حضور سرورِ کائنات ؐ کے طریقے سے نسبت دینے کی غرض سے لفظ محمدؐ کا ہم پیرو کارانِ آنحضرت کے ناموں کے ساتھ ضم کیے جانے کی خصوصی وجہ یہ کہ حق سبحانہ تعالیٰ نے ہمارے قبلۂ کونین (مراد والد بزرگوار) کو خدا ان پر دائمی برکات نازل کرے اور تمام جہانوں میں ان کے فیوض جاری کرے ۔ کمال عنایت سے منتخب فرماکر فنا فی الرسول کے آخری درجے کے لیے مختص فرمایا اور پھر اس مجمع کمالاتِ ذات سے ہم امتیوں کو خالصتہً مومن ہونے کا شرف عطا فرمایا ۔ **بیان** حضور سرورِ کائنات ؐ کی شمولیت کا بیان جس کا تمام اسلامی فرقوں میں التزام ہے نیز ان سب کا حال اور انجام کا تذکرہ ۔ **بیان** طریق محمدیؐ کے ظہور کے انکشاف کا ذکر اور جو لوگ اس کے طریقے پر ہیں ان پہ سلام ۔ ہمارے حضرت قبلۂ عالم کے مسلسل سات دن رات تک امام حسن علیہ السلام کی رُوح پر فتوح سے خصوصی معاملے کی ہدایت اس امام عالی مقام کا ان کے دل میں الہام ڈالنا اور اُنھیں خصوصی نسبت محمدیؐ کے طغرائے امتیاز سے مختص فرمانا اور ان کا اس غلام کو اپنے سایۂ رحمت میں لے کر سب سے پہلے بیعت کے شرف سے مختص کرنا ۔ **ضمیمہ** رسول اللہ سے اخلاص و نسبت خصوصی کی خلعت کی نعمت پہ اللہ تعالیٰ کی حمد و شکر بجالانے کا ضمیمہ ۔ اور مخلص مومنوں سے حضور پُر نور سے خصوصی لگاؤ اور قلبی خلوص کا اظہار اور اس مستحکم طریق کی طرف دعوتِ عام دینا اور اس نجات یافتہ فرقے میں داخل ہونے کا بیان ۔ **بیان** غلامانِ محمدؐ پہ محمدیؐ قباد خلعت کا تمام اطراف یعنی ذاتی ، وصفی ، حقیقی ، شرعی ، طریقتی ، عمومی ، خصوصی ، شمولی اور خلوصی لحاظ سے ہر طرح راست آتا ۔ یہ نہ تو محض عمومی اور مجازی اور نہ محاورہ و جواز کے لحاظ سے لکھا جاتا ہے ۔ اس بات کی وضاحت انسان کی انسانیت کے حقیقی و مجازی معنوں سے کی جاسکتی ہے نیز اس امر کا بیان کہ لفظ محمدیت کا دیگر تمام متفرق اسلامی فرقوں اور بدعتی اور خطا کار گروہوں پر اطلاق کا جواز عموماً مجازی طور پہ کیا جاسکتا ہے ۔ **دعوت** سعادتِ محمدیہؐ کی دولت کے حصول سے فلاح و عافیت کی طرف دعوت اور ایک حکایت کے بیان سے ادنیٰ بدعتوں کی حماقت کا پردہ فاش کرنا ۔ **حکایت** چند جاہل آدمیوں میں سے ہر کسی نے نماز کے دوران باتیں کر کے اپنی

نماز باطل کردی۔ لیکن کسی کو اپنی اس خرابیٔ حال کا قطعاً احساس نہ تھا۔ حضور پاکؐ کے مخلص پیروکاروں کی اجماع اُمّتِ مسلمہ کی خیر خواہی و دل سوزی اور اُن سے حق و انصاف کی راہ پر چلنے کا طلب گار ہونا۔ بیان امتِ محمدیہؐ کی مرادوں کی توضیح، اُمّتِ محمدیہؐ پر شرکِ خفی کے اطلاق سے مراد اصطلاحی معنوں سے خلط ملط شدہ ہے جو کہ کفرِ طریقت ہے یعنی کہ اُنھوں نے اپنے دین و ایمان میں اپنی نفسانی خواہشات کو شریک بنا رکھا ہے اور اپنی انا کو عمل دخل دے رکھا ہے۔ اس سے مُراد شرکِ جلی نہیں جو صریحاً کفرِ حقیقی ہے اور جو ذاتِ باری تعالیٰ کی وحدانیت میں دوسرے کو شریک کرتا ہے لہٰذا لفظ اہلِ شرکِ خفی اور متذکرہ بالا گم گشتگانِ راہِ طریقت سے مُراد وہ بہتر ۷۲ فرقے ہیں جن میں ملتِ اسلامیہ بٹی ہوئی ہے۔ نیز نئے نئے طریقوں کا ظہور۔ مختلف فرقوں میں تفرقہ بازی اور صحیح راستوں کو باطل قرار دینے سے منظور نہ تو خدا رسیدہ بزرگ اور نہ ہی حقانی فرقہ ہے۔ ان برگزیدہ اصحاب کو نافہم لوگ ظاہری اعتبار کی بنا پر ایک دوسرے سے الگ سمجھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ایسے اختلافات کی بدگمانیوں اور سالکانِ راہ کی جداگانہ راہوں کی کثرت سے اپنی پناہ میں رکھے۔ یہ اختلاف و کثرت ظاہری ہے حقیقی نہیں۔ سب کا منتہائے نظر ایک ہی ہے۔ یہ سب گلی کوچے اسی شاہراہِ طریقتِ محمدیہؐ سے جا ملتے ہیں اور یہ سب چھوٹے بڑے ندی نالے ٹھاٹھیں مارتے ہوئے بحرِ نبویؐ کے معاون ہیں۔ اہلِ خلوص اور خالص مومنین ان دوزخی فرقوں کی کثرت کی شامت و بدنصیبی سے محفوظ ہیں جنھیں راہِ مصطفیٰؐ پہ استقامت کی بنا پر نجات کی بشارت دی گئی ہے۔ یہ ایک الگ خصوصیت ہے جس سے اللہ تعالیٰ نے محض فدایانِ مصطفیٰؐ کو مختص فرمایا ہے اور ان کے طریق میں اسمی، رسمی، ظاہری یا معنوی یعنی کسی قسم کی غیریت اور دوئی نے راہ نہیں پائی اور ان پہ خالصتہً درِ مصطفیٰؐ کو وا کر دیا۔ بیان دینِ مصطفیٰؐ کے احیا و تجدید کے سلسلے میں عظیم الشان بزرگوں کی خدمات کا بیان اور اُن کے بلند و بالا مرتبوں اور درجوں کا فرق۔ محمدیؐ طریقے کے بزرگوں کے ظاہری و باطنی اتحاد و یگانگت کی خصوصیات کے شرف کا بیان۔ محمد مصطفیٰؐ کے پیغامِ توحید اور اُس پیام کے دوام کی سعادت کا بیان۔ تنبیہہ خبیثُ الطبع منکروں کے شکوک و شبہات اور عناد، بد اندیش مخالفوں کی بدگمانیوں اور تہمتوں کی تردید اور بد سرشت افترا پردازوں اور فطرتاً کج رو فسادانگیز اور فتنہ پرداز بدنیتوں کے خطرات کا جواب، باصفا اور مخلص مومنین کی رفتار و کردار اور عقیدے کا بیان۔ اہلِ حق کے حقوق کی ادائیگی اور ان کا سب کے متعلق نیک گمان اور حقدار بزرگوں کی تقلید مثلاً سنّتِ ابراہیمی کا اتّباع اور نقشبندی اور قادری دونوں

طریقوں سے عقیدت و ارادت سے اپنے اولیٰ تر اور برحق ہونے کا اظہار۔ امیر المسلمین، ناصر ملت والدین اور نائب رسول امین کے ظہور کا سبب اور ان کی حقی دعوت اور زمانۂ سلف کے تمام اولیائے کرام کی ولایت کی حقانیت کا اقرار۔ اسی طرح زمانۂ قدیم کے تمام انبیائے کرام کا اتباع کیے بغیر ان کی دعوت حق کا دلی اقرار اور نبی آخر الزمانؐ کے طریقۂ حق کی فرضیت کا اقرار اور دل و جان سے اُن کا اتباع اور پیروی ۔ دیگر تمام سالکانِ راہ کے یکساں کے اتباع کی لزومیت اور اس حقیقت کا کسی ڈھکی چھپی کے بغیر برملا انکشاف۔

تمثیل عامۃ المسلمین اور خواص مومنین کی تحقیق اور خالص مومنین اور مخلوط الاعتقاد مسلمین کے فرق کی مثال اور انسانیت کے کلی اور عمومی مفہوم کی مثال سے مزید وضاحت۔ اس مفہوم میں انسانیت سبھی انسانوں کو حاصل ہے۔

اور انسان کے دیگر پسندیدہ و ناپسندیدہ اوصاف و اخلاق جو حقیقت میں سبھی افراد کے شامل حال نہیں ہوتے، بعض میں پائے جاتے ہیں اور بعض میں نہیں پائے جاتے۔ اور بالخصوص حُسن انسانیت اور کمالِ آدمیت کے معانی میں انسانی خصوصیت جو کسی انسان کے ذاتی، حسبی نسبی، طور اطوار اور اوصاف و کمال کی انتہا ہے اور جملہ اوصافِ حمیدہ اور جبلّی خوبیوں کی جامع ہے اور یا پھر عامۃ المسلمین کے متعدد طریقوں پر مشتمل اسلام کے بہتر ۷۲ فرقوں کی مثال جو نو پسندگی کی خوبی کے الحاق اور فراوانیٔ علم کی وجہ اور دیگر پسندیدہ و ناپسندیدہ اوصاف کی آمیزش سے انسانیت کے مفہوم سے الگ اور ممتاز ہو گئے ہیں۔ اگرچہ بہت سی مختلف آمیزشوں کی وجہ سے جُدا تو ہو گئے مگر پھر بھی انسانیت کے احاطے سے خارج نہیں ہوئے۔ اور انسانیت پہ دلالت کرنے والی لازمی نسبت رکھتے ہیں جیسا کہ خالص محمدیت جو نجات پانے والا واحد سلسلہ ہے۔ انسانوں کے اس خصوصی گروہ نے اگرچہ اپنے خصوص اور خلوص کے مرتبے میں عمومی مرتبے سے امتیاز کا شرف حاصل کر لیا اور ذہنوں میں ممتاز نظر آتا ہے لیکن غیریت کی راہ سے وہ کوئی اور چیز نہیں بنا، نہ تو عینی مغائرت پیدا کی ہے اور نہ ہی زائد اشیا کے الحاق اور آمیزش سے نفسی مغائرت بہم پہنچائی ہے۔ بلکہ ظاہری و باطنی طور پر اسی ذاتی ڈھب پہ قائم رہا، اور اُس میں بال برابر کمی بیشی نہ ہوئی۔ اپنے حقیقی اعتدال پہ جلوہ افروز رہا اور اپنی اس خصوصی صورت میں بھی اسی مکمل ظہور کے عمومی معانی کا حامل رہا اور اپنے احسن و اکمل ذاتی تشخص کو جو قرآن مجید کی اسی آیت کریمہ (کہ آج ہم نے تمھارا دین مکمل کر دیا) کے بموجب اُسی کا خاصہ تھا ظاہر کیا۔

اور غیر مستقل فطرت کے دیگر تشخصات جو امر طبیعی کی کمی یا بیشی کے باعث اُس کے غیر طبیعی تشخصات تھے اس کی مستقل سرشت و فطرت کے امتیازی نشان بنے نہ کہ وہ اپنی ذات سے ممتاز ہوا۔ بیان اس مرتبۂ عالیہ کے حامل امیر محمدیوں کی مدح و ثنا کا بیان۔ بیان یہاں طریقۂ محمدیہ کے حقائق و معارف و خصوصیات و کلیات و جزئیات اور اس طریقے کی اصطلاحات اور منازل و مقامات سالک کی دریافت قرآن پاک کی تلاوت اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کے حوالے سے ہے۔ لیکن کلام اللہ کے اشارات اور اسرار و رموز کے سمجھانے اور رسالت مآب سرور کائنات کی احادیث کے اسرار کو جاننے کے لیے "نالۂ عندلیب" نامی عمدہ کتاب کا توسّل اور توسط ضروری ہے۔ خدا اس کتاب کے مصنّف کے لیے ہماری اور ہماری آل اولاد کی محبت، قلبی لگاؤ اور عقیدت و ارادت کا تحفظ کرے۔ نیز اس سلسلے میں ہمیں کتاب ہذا (علم الکتاب) کی تحصیل و تکمیل کا لازمی وسیلہ بنائے کیونکہ یہ انہی امور کی تفصیل و تفسیر ہے جو ہر موقع محل پہ ہمیں ہر مشکل امر کو عبور کرنے کے لیے سفینے کا کام دیتے ہیں اور دین و ایمان کو مستحکم بناتے ہیں۔ فائدہ اس امر کا بیان کہ جس طرح گناہوں کا ارتکاب کرنے والا دائرۂ اسلام سے خارج نہیں ہوتا اسی طرح حضور پاکؐ کا کوئی پیروکار راہِ مصطفیٰؐ سے کسی لغزش پہ امتیوں سے خارج نہیں ہوتا خواہ اُسے اُس خطا کا عذاب و عتاب ہو جائے اور خواہ اُسے معاف کر دیا جائے۔ عقیدے کی اصل جڑ یعنی ایمان کو مضبوط ہونا چاہیے اگرچہ اُمت محمدیہؐ میں بھی اللہ کے نزدیک وہی مکرّم ہے جو زیادہ متقی ہے لیکن عاصی اُمتی بھی طریقتِ مصطفیٰؐ سے خارج نہیں ہونے پاتے اور رحمتِ خداوندی سے مایوس نہیں ہوتے۔ اس کے برعکس دیگر کمزور ایمان والے بے یقین اور ناقص دین والے بدعقیدہ اشخاص ظاہری تقویٰ اور طہارت کے باوجود شرک خفی کے داغ سے پاک نہیں ہوتے اور خالص امتی نہیں بن سکتے۔ رہبانیت (ترکِ دُنیا) سے تو کچھ نہیں ملتا صرف ایمان درکار ہے۔ بیان اپنی تصنیفات میں اس لفظ "درد" یعنی اپنے اس تخلص کے استعمال کی وجہ اور اپنے شعر و شاعری کی وجہ حقیقت کا بیان کہ کس منوال پہ رہی۔ بیان رسالۂ واردات کے آغاز کی تقریب جس کا متن اپنے عزیز بھائی سلمہ ربہٗ کی استدعا کے مطابق ہے اور جس میں اپنے حالاتِ زندگی اور پیش آنے والے واقعات کا تذکرہ ہے۔ پھر اسے اپنے مکرم و محترم بزرگوار (اللہ تعالیٰ ان کے لطائفِ غیبی سے ہماری مدد کرے) کے حضور میں اس کا پیش کرنا اور ان کا شرفِ قبولیت بخشنا اور اسی سال سن ۱۱۷۲ھ میں ان کا اس جہانِ فانی سے کوچ کر جانا اور ان کی وفاتِ حسرت آیات پر

ہمارے ماتم اور غم و الم کا بیان۔ پھر کتاب ہذا کے محض فضل ربانی اور تائیدِ آسمانی سے پایۂ تکمیل کو پہنچنے کا بیان۔ خاتم النّبیین حضرت محمدؐ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم پہ نزولِ وحی کا خاتمہ اور بعد ازاں فقط القاءِ الہام کا رہ جانا۔ عوام اور اولیائے کرام کے کلام کا باہمی فرق۔ اور اس رسالے کا نام واردات رکھنے کی وجہ!!

تنبیہ اہلِ ظاہر اور اہلِ باطن کے کلام کے باہمی فرق سے خبردار کرنا۔ نیز تحقیق و اصل اور تقلید و نقل کا باہمی فرق یعنی اصل کسے کہتے ہیں اور نقل کا اطلاق کس پہ ہوتا ہے۔ اپنے علمی مراتب کی کیفیت و کمیت اور جزوی اور کلی استعداد (اہلیتوں) اور آخر کار اپنی مجبوری ولاچاری اور خامیوں کا اعتراف۔ تمام امور میں ما سوی اللہ سے بے نیازی اور پھر اپنے آپ اور اپنے سارے معاملات کو اُس خدائے کریم و ذوالجلال کی تائید و توفیق پہ چھوڑ دینا۔

پہلی وارداتِ قلبی:

الموسوم ابتدائی واردات اپنے متن اور شرح سمیت۔ خدا کی کُھلی کتاب کا جسے دُنیا کہتے ہیں، افتتاح اور قلم سے جسے عقل کی تعبیر کرنے والا کہا جاتا ہے اس کی ابتدا۔ اور کتاب ہدیٰ یعنی قرآن پاک کا نزول۔ سورۂ فاتحہ سے اُس کا آغاز اور اس سورۂ مبارکہ کا قرآنِ حکیم کے تمام اسرار و رموز کا مجملاً حامل ہونا، جس طرح قلم سے لکھتے وقت نقوش اُبھر آتے ہیں اور ان تمام کی استعداد لکھنے سے پہلے ہی کاتب کے علم میں تھی اور یہ علمی شکلیں کاتب کے ذہن میں پہلے سے تھیں۔ اللہ تعالیٰ کی جملہ صفات اور اسمائے حسنیٰ کے فیض اور دیگر تمام بنیادی وسیلوں اور وساطتوں کے توسط سے میرے دل پہ اللہ کی جانب سے واردات کے دروازے کا کُھلنا۔ سورۂ اقرا کی چند آیات اور پوری سورۂ فاتحہ سے نور کا استفادہ کرنا۔ بیان ہر وارد کی پیشانی پر ہوالناصر لکھنے کا بیان اور ان موارد میں بسم اللہ شریف لکھنے کے مقاصد نیز یہ بیان کہ ہر وارد ایک جداگانہ رسالے کے متن و شرح کا مجموعہ ہے۔ بجائے خود وہ حمد و صلوٰۃ کا الگ مجموعہ ہے اور نام بھی اس کا الگ ہے۔ ہر بحث میں ہر اکائی فی نفسہٖ بالکل مکمل و اکمل ہے۔ الناصر کے اسمِ مبارک کے جامع البرکات ہونے کا بیان اور اُس کا ہر جگہ پر ظہور دیگر خصوصیات سمیت۔ اس کی فتح مندی، نصرت اور معاونت کے اسرار۔ اس مقالے کے حال و تقریب کا بیان اس وارداتِ قلبی کے وقوع اور ان مطالب کے ورود و نزول کے وقت اپنی حالت و کیفیت کا بیان۔ نیز ایک سو گیارہ واردات کی اس تعداد کی وجہ اور ان کی تمام تر ترتیب و ترکیب اور باہمی تقدیم و تاخیر (یعنی آگے پیچھے ہونے) کا تذکرہ۔ بیان تقریر کے حق و راست یا اس کے باطل ہونے کے نشانات و علامات

کا بیان فائدہ بعض ظاہر و عیاں امور کے حال کا بیان، جہاں انسانی عقل و خرد اور فہم و ادراک کو عمل دخل نہیں۔ بیان اچھے اور بُرے کلام کا متکلم کے لیے نفع بخش یا نقصان دہ ہونے نیز دوسروں پہ اس کے اثر اور اُسے تسلیم کرنے والے پہ عذاب و ثواب کے عائد ہونے کا بیان۔ فائدہ جس سے ہر ایک کلام کی کیفیت کی شناخت اور مقام کے مالکوں کی حقیقت کا پتہ چل جاتا ہے۔

دوسرا وارد:

جس کا نام اللہ کی طرف سے نور ہے[۵] اپنے متن اور شرح کے ساتھ۔ اس آیت کریمہ کا بیان جس کا مطلب ہے کہ اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے[۵][۳۲] یہ اہلِ ظاہر کے اسلوب کے موافق بھی ہے اور اہلِ حقیقت کے ڈھب کے مطابق بھی۔ یہ کشّاف اور احیائے علوم کے مصنفوں کے انداز میں ہے۔ اس میں حقیقت امر کی وضاحت بھی ہے اور سطحی اور اوپرے معانی کے خلاف اک قسم کی تنبیہہ بھی ہے۔ کشف مندرجہ ذیل آیت کریمہ (جس کے معنی آگے درج ہیں) جیسے استعارات و تشبیہات کے اسرار و رموز کا انکشاف۔ اللہ تعالیٰ نور (ہدایت) دینے والا ہے آسمانوں کا اور زمین کا۔ اُس کے نور (ہدایت) کی حالت عجیبہ ایسی ہے جیسے (فرض کرو) ایک طاق ہے اور اس میں ایک چراغ ہے اور وہ چراغ ایک قندیل میں ہے اور وہ قندیل طاق میں رکھا ہے، اور وہ قندیل ایسی صاف شفاف ہے جیسے ایک چمکدار ستارہ ہو۔ اور چراغ ایک نہایت مفید درخت کے تیل سے روشن کیا جاتا ہے کہ وہ زیتون کا درخت ہے جو (کسی آڑ کے) نہ پورب رُخ ہے نہ پچھم رُخ ہے۔ اس کا تیل اس قدر صاف اور سلگنے والا ہے کہ اگر اس کو آگ نہ بھی چھوئے تاہم ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خود بخود جل اُٹھے گا۔ اور جب آگ بھی لگ گئی تب تو نُورٌ علیٰ نُور ہے۔ اور اللہ اپنے اس نور (ہدایت) تک جس کو چاہتا ہے راہ دیتا ہے اور اللہ تعالیٰ لوگوں کی ہدایت کے لیے یہ مثالیں بیان فرماتا ہے اور اللہ تعالیٰ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے[۵] تعریف نور و علم و وجود کی تعریف اور ان کے مدارج اور مراتب کا تذکرہ۔ بیان ذرّہ و آفتاب کے استعارہ سے اس نیک روی کا مکمل جائزہ۔

تیسرا وارد:

الموسوم حقیقت الحقائق مع اپنے متن اور شرح کے۔ اللہ تعالیٰ کا جملہ موجودات کو اعتباری اور اضافی حدود میں محدود کرنے اور خود تمام جہات و اطراف سے پاک و مبرّا ہونا، نیز اللہ تعالیٰ کے مرتبہ و اطلاق کی تعبیر کا عبارۃً و استعارۃً ناممکن ہونے کا بیان، نیز یہ بیان کہ اشیا کے حقائق کی پہچان ان کی

حدود و رسوم کی پہچان ہی سے ہوتی ہے، کیونکہ مرکب اشیا ان اجزا کی شناخت سے پہچانی جاتی ہیں، جن سے وہ مرکب ہوں اور سادہ اشیا اپنے مختصات کی صفات اور تعریف سے۔ وجود و افراد موجودہ کا بیان یعنی شے کی شرط کے ساتھ 'لا' کی شرط کے ساتھ اور بغیر کسی شرط کے وجود کے مختلف مرتبوں کی تحقیق کا بیان۔ حقائق موجودات کا حاصل مصدری معنوں میں تذکرے کا جو اکھاڑ پچھاڑ اور حقائق موجودہ کا اصل منشا ہے، نیز لفظ وجود کا وجود ظلی پر اطلاق، جو مصدری اور کون و فساد کے معانی میں اکھاڑ پچھاڑ کا باعث ہے۔ بیان اعتبار کی تعریف کہ وہ اصل میں ہے کیا۔ افراد موجودہ کی تعریف جسے صوفیا کی اصطلاح میں حقائق موجودات، علمی اشکال اور یکتائی کا مرتبہ بھی کہتے ہیں اور فلسفی اُسے جوہر یا حقیقت و کیفیت لکھتے ہیں۔ فائدہ جوہر کی حقیقت اور اُس کے جعلی ہونے یا جعلی نہ ہونے پر تحقیق اور نئے طریق اور عمدہ بیان سے اس میں جعلی و اصلی مرکبات کا ثابت کرنا۔ اظہار اس امر کا اظہار کہ ماہیات (جوہر و منفرد حقیقت) کا تصور جس طرح جنس اور فصل کی باہمی ترکیب سے حاصل ہوتا ہے، اسی طرح ماہیت کی تصدیق بر مجہول الکیفیت ماہیت اور موجود و معدوم ماہیت کی نسبت کے باہمی انضمام سے ظاہر ہوتی ہے۔ اور اگر یہی یقینی (فیصلہ کن) نسبت نفس ماہیت کے تصوّر کے ساتھ علمی دائرے میں جمع ہو جائے تو محکوم علیہ کو موجود ذہنی یا معدوم ذہنی سمجھا جاتا ہے۔ اور اگر ماہیت کے تصور کے ساتھ مع اپنے تشخص کے مرتبۂ معلوم پر پائی جائے تو محکوم علیہ کو موجود خارجی یا معدوم خارجی کہا جاتا ہے۔ تنبیہہ فلاسفہ، وجودی اور شہودی صوفیا اور متکلمین کے دلائل و براہین اور تحقیق و تدقیق کی روشنی میں خدا تعالیٰ کی واجب الوجود ذات کی حقیقت کا بیان نیز امرِ حق اور ہدایت کی راہ کا بیان اور حضرت مجدد الف ثانی قدس اللہ سرہ العزیز کے مکتوبات کی بعض عبارات کا نقل کرنا جو اُنھوں نے مقدمہ میں درج فرمائی ہیں اور حقیقت کا انکشاف کرتی ہیں۔ راہنمائی میانہ روی اور اعتدال کی راہ راست دکھانا جو دین محمدیؐ کی سیدھی راہ ہے جس میں نہ تو ملحدوں کی طرح چناں و چنیں کی بحث سے دوئی سے انکار اور نہ شرک کا اثبات ہے۔ مخلوق کی خالق سے مغائرت ایسی نہیں جیسے معمار اور عمارت کی ہے جو بے علم ملاؤں اور بد نصیب ظاہر بینوں کا ڈھنگ ہے۔ ان دونوں تقاریر سے اس شقِ ثالث سے انکار بھی ہے جس کا صوفیا کا ایک طبقہ ذات و غیر ذات کی نسبت سے قائل ہے یعنی اپنی ذات کی وجہ سے اور غیر ذات کی وجہ سے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر فدایانِ دینِ محمدؐ کا حاصلِ کلام نہ تو دوئی کی تردید ہے نہ اثبات اور نہ ہی اس کے بین بین کوئی بات، پھر عقل پر انحصار کرنے والی

ان تین شقوں کے علاوہ وہ چوتھی شق کونسی ہے جو ان تیز بین حضرات کا منظور و مطلوب ہے۔ محمدیؐ اصطلاحات لفظ وجود کی بجائے لفظ نور کا استعمال ہر دو معنوں میں اور تاریکی کے نہ ہونے پر، اور اس امر کی خبر کہ اس قسم کی دیگر اصطلاحات طریقۂ محمدیہؐ کی خصوصیات میں سے ہیں جنھیں حق تعالیٰ نے حضور رسول پاکؐ کے فیض کے صدقے آیاتِ قرآنی اور احادیثِ نبوی کی شہادت سے مجھ گدائے محمدؐ پہ کشف فرمایا ہے جن سے اس فقیرِ بے نوا نے ایک نئے علم کی بنیاد رکھی ہے، جو دوسروں سے بالکل الگ ہے۔ بیان ہر موجود پر وجودی فیضان کے نزول کے تسلسل و تواتر اور ممکنات کے اپنی ذات میں عدم استقلال کا بیان تنبیہہ مست و مخمور اور مغلوب الحال سالکانِ راہ کے لیے تنبیہہ جو وحدت الوجود کے قائل ہو جاتے ہیں۔

چوتھا وارد:

جس کا عنوان مطلع الفجر ہے مع اپنے متن اور شرح کے۔ اقتباس ساری سورۂ قدر سے اقتباس مع تمام اسرار و رموز و دقیق نکات کے۔ حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا خالق و مخلوق کے درمیان ایک وسیلہ ہونے، نیز سید المرسلینؐ کی ذات مبارک کا ہدایت، خدا تک رسائی، بندگانِ خدا کی سزا و جزا کی اس کارگاہ اور تخلیقِ کائنات اور انبیا و رسولوں کے بھیجے جانے کا باعث و موجب ہونے کا بیان یعنی بات تو یہ ہے کہ ذاتی طور پر کائنات کی ہر چیز کے تمام و کمال ہونے کا انحصار اسی سید المرسلینؐ اور نبی آخر الزماںؐ کے وجودِ مبارک پر ہے۔ ان کی امّت کا دیگر امتوں سے افضل و برتر ہونے اور حضور پاکؐ کے زمانے کے کافروں اور منکروں کے حالات کا بیان اور اس دور کے منکروں اور منافقوں کی حرماں نصیبی۔ بیان اگلے اور پچھلے زمانے کے صوفیا اور دینِ محمدیؐ کی خصوصی اصطلاح کے مطابق نزولِ خمسہ کے مراتب کا بیان اور ہر شے کی کلامِ ربانی اور احادیثِ نبویؐ کے الفاظ میں تفسیر و تعبیر۔

پانچواں وارد:

اپنی شرح اور متن سمیت جس کا عنوان دعوت اذان ہے۔ اذان اللہ تعالیٰ کی طرف بلانے اور کامل فلاح و بہبود تک پہنچانے کی ایک مکمل دعوت ہے۔ بیان اعتباری امتیاز کی طرف ظاہری دعوتِ عام اور معنوی اتحاد کی طرف اللہ تعالیٰ کی جانب سے ایک خاص باطنی دعوت اور عوام و خواص کے ہر فرد کا ان ہر دو دعوتوں کے قبول کرنے کا ذکر۔ خاص الخاص اصحاب کی جامعیت اور اکملیت کا بیان جنھوں نے ان ہر دو دعوتِ الٰہیہ کو قبول فرمایا اور پھر اس سنتِ الٰہیہ کے اتباع میں مخلوقِ خدا کو حق و صداقت کی خود دعوت دی۔

دین اسلام اور شرع دینِ متین اور اہلِ ظاہر و باطن کے احوال کی اصلاح اور ہدایت اور دیگر ضروری اور مروجہ مراقبوں، عبادتوں، اطاعتوں اور اوراد و وظائف کی طرف دعوت۔ آیات کی سند اور اقرار ناموں سے پیغمبروں اور رسولوں کی تبلیغ اور قرآنی آیات سے وعظ و نصیحت کا بیان بیان حضور و شہود کی نسبت کے حصول کا بیان کہ یہ سعادت کن اسباب سے حاصل ہوتی ہے۔ اور اس حضوری کی نسبت تک کیسے پہنچا جا سکتا ہے اور عوام و خواص کے حضور و شہود کی نسبتوں میں کیا فرق ہے۔ **بیان** اولیائے کرام کی ولایات کے مختلف مناصب، مراتب، مقامات اور حالات کا بیان۔ اس نیک روی کے شروع سے آخر تک تمام کمالات کا ذکر۔ اور تمام مراتب کی حد بندی کرنے اور تمام مناصب کو گھیر لینے والے خالص دین محمدی کے رتبے کی بلندی۔ نیز خالص دین محمدیؐ کو اپنانے اور حلقۂ خصوص و خصوص میں شمولیت و داخلے کا بیان جو ساری امتِ محمدیہ کی استعداد میں ہے اور عملاً اب بھی جن امتیوں نے اُسے اپنایا ہے ان کے نصیب میں لکھ دی گئی ہے۔ **تادیب** قبلۂ عالم (والد بزرگوار خدا اُنھیں اپنی غیبی امداد سے نوازے) کے ارشاد کے مطابق شاہوں اور امیروں کے آداب کا بیان جو فقط اعضائے انسانی تک محدود ہیں، اور علمائے ظاہر کے آداب جو فقط زبان تک ہیں اور درویشوں کے آداب جو ان کے قلب کی گہرائیوں تک ہوتے ہیں — "نالۂ عندلیب" نامی بلند و بالا کتاب کے حوالے سے ظاہری و باطنی آداب کی ان جزویات کی تفصیل جنھیں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور میں صحابہ کبارؓ ملحوظِ خاطر رکھتے تھے۔ اور اب بھی ہے اور کمال ادب کا مختصر اور جامع بیان **تنبیہ** فنا کے مقاماتِ ثلاثہ یعنی فنا فی الشیخ، فنا فی الرسولؐ اور فنا فی اللہ کے مقامات کے متعلق حرفِ تنبیہ۔ انہی کے مطابق بقا کے بھی درجات ہیں یعنی بقا باللہ، بقا بالرسولؐ اور بقا بالشیخ۔ ان کا اک نئے انداز اور اسلوب میں بیان۔ یہ سعادت آج تک کسی دوسرے کو نصیب نہیں ہوئی۔ نیز اس موضوعِ بحث کے اسرار و رموز اور خصوصیات کے متعلق مفصل اور مدلل بیان اور محمدیؐ طریق کے ظہور سے پہلے پچھلے وقفوں کے مرشدوں کے رتبے سے اگلے زمانے کے مریدوں کی برتری کے جواز کا بیان اور اس پختہ طریق (محمدی) کے آخری اور تمام و کمال اور مکمل ہونے کا بیان۔

چھٹا وارد:

الموسوم "اللہ کی ہدایت" اپنے متن اور شرح سمیت ہدایت کا اس کے ہر دو معنوں میں ذکر ہے اور ہدایت ثانیہ کے اسباب و علامات اور حق سے گمراہی کا ذکر۔ اور یہ بیان کہ حق تعالیٰ کی ہدایت عوام

کے حق میں نیک کام کی توفیق ہے، حقیقت کا ادراک کیے بغیر، اور خاصانِ حق میں یہی توفیق کارِ خیر ادراکِ حقیقت کے ساتھ ہے۔ اس لیے کہ انھیں خلقِ خدا کا ہادی گردانا گیا ہے۔ وُجود و موجودات کا بیان وجود دار یعنی حقائقِ موجودہ کی ماہیت و جوہر کی حقیقت جو اضافی اور اعتباری موجودات ہیں۔ علم الٰہی کے حوالے سے وجودِ حق کے ظہور کے ضمن میں امتیازی و علمی اضافات اور نسب کے اصل سبب کی چھان بین۔ خاصانِ حق کو خدا تعالیٰ کا اپنے اسرار و رموز کی طرف رہنمائی کا بیان اور اس مقام پہ اخلاق اللہ کو اپنانے والے خاصانِ حق کے سمعی، بصری، علمی، عقلی اور حسی قوا کا، یک جان و متحد ہو جانے کا بیان، جہاں یہ نائبینِ حق آلاتِ صفات سے بے نیاز ہو کر صفات کے جانچنے کے سلسلہ میں فقط اپنی ذاتی صفات و کمالات سے کام لیتے ہیں اور کلی طور پر سمیع، بصیر، علیم، عاقل اور حساس ہو جاتے ہیں۔ اس کے بعد اگر انھیں آلات کی ضرورت ہے تو صرف دوسروں کی رُشد و ہدایت کے لیے۔ اس امر کا بیان و اثبات مفصل اور مدلل طور پر کیا گیا ہے۔

ساتواں وارد:

الموسوم حکمت اللہ۔ اپنے متن اور شرح کے ساتھ۔ بیان حکمتِ عقلیہ اور حکمتِ الٰہیہ کا بیان۔ واجب الوجود کے فیض کے بغیر وجود ممکنات کے ہونے کی تردید کا بیان۔ واجب الوجود سے اکتسابِ فیض کیے بغیر کائنات اور اس میں بنی ہوئی چیزوں کے جواز کی ممانعت اور ذاتِ واجب سے استفادہ کیے بغیر ممکنہ موجودات کے امکان کی تردید کا بیان۔ بیان وجوب بالذات اور وجوب بالغیر اور امکان خاص اور امکانِ عام کی حقیقت کا بیان۔ امکانی حقائق کے حال اور ممانعت بالذات اور ممانعت بالغیر کا تذکرہ۔ بیان وجوب کی چار قسموں کا نئے اسلوب سے بیان۔ ایک بہت ہی عام وجوب جو تین مفہوم پہ مشتمل ہے اور امکانِ عام کی کھینچا تانی کا مشلہ ہے۔ دوسرا وجوب عام ہے جو تینوں موجودات (جمادات، نباتات و حیوانات) میں شامل ہے اور امکانِ خاص کے ظہور کی اصل ہے۔ تیسرا وجوبِ خاص جو فقط ذات باری تعالیٰ تک محدود ہے اُس کے تمام اسما، صفات ذاتی کمالات اور مراتب سمیت، اور چوتھا خاص الخاص وجوب جو فقط اسی ذات واجب الوجود کا حصہ ہے جس میں اسما اور صفات کی کثرت بھی نہیں۔ تعریف عرش عظیم کے ذکر اذکار کی تقریب کے ساتھ ساتھ، جسم و خط اور سطح کی تعریف ان کے جوہر و عرض سمیت، اور ان کی عمومیت خصوصیت اور دائرہ و مکان کا بیان۔

آٹھواں وارد:

جسے اللہ کی حدود کے نام سے موسوم کیا گیا ہے اپنے متن اور شرح سمیت ۔ اظہار شرعی آداب اور حدودِ الٰہیہ کی محافظت و رعایت کا اظہار ۔ بیان: حفظِ مراتب کی ضرورت کا بیان جو علم و امتیاز کا خاصہ ہیں ۔ ہر انسان کے اس جہان اور اُس جہان میں خود ہی سائل اور خود ہی مسئول ہونے کا بیان ۔ ان تمام حالات اور ان سب کیفیات کے اختتام اور اعتباری مراتب کے اثبات کا ذکر ۔

نواں وارد:

جسے قولِ حق کے نام سے موسوم کیا گیا ہے، اپنے متن اور شرح سمیت. بیان پابندی و آزادی کی حقیقت اور ان کی باہمی نسبت کا بیان ۔ مطلق اور مقید مرتبے کا اتحاد و امتیاز ، عبودیت اور بندگی کے لوازمات کے پابند ہونے کا بیان اور مقامِ الوہیت کی شان کا بیان ، کیونکہ وہ پاک ذات ہر قسم کے نسب و اعتبار سے مبرّا اور منزہ ہے ۔

دسواں وارد:

جسے ہدایت کے رستے کے نام سے موسوم کیا گیا ہے ۔ اپنے متن اور شرح سمیت ۔ بیان ایمان مجمل و مفصل اور یقینِ کامل اور اطمینانِ مکمل کا بیان ۔ رُشد و ہدایت کی دعوت اور تمام متضادۃ الحصول کمالات کی جامعیت و قبولیت کا تذکرہ ۔ بیان لڑائی جھگڑے کے طریق پر بحث مباحثے کی ممانعت کا بیان، اور ردو بدل اور دشمنی کے انداز میں نزاع کی تردید ۔ نیز حقیقت ناشناس واعظوں کے جھگڑیلو انداز کا ردّ اور ایسے جاہلوں اور غافلوں کی پندو موعظت کی صورتِ حال کا ذکر ، محقق عارفوں اور اولیا و انبیائے کرامؑ کی ہدایت کی حقیقت کا بیان اور اربابِ سلوک کے بچپن ، جوانی ، ادھیڑ عمر اور بڑھاپے کے دوران کلام کے خلل و فساد اور ردو بدل اور حقیقت کا انکشاف ۔

گیارھواں وارد:

جس کا عنوان سنت اللہ ہے ، مع اپنے متن اور شرح کے ۔ ذکر سنتِ الٰہی کے مطابق دنیا میں تغیر و تبدّل کا ذکر ۔ تمام جہان کا ذاتی حدوث کے باعث کسی قباحت کے بغیر قدیم سے حادث (نو) ہونا ۔ نیز زمانی ہمیشگی کا ثبوت اور ذاتی کہنگی کی حقیقت کا انکشاف ۔ بیان کون و فساد (یعنی بناؤ بگاڑ) کا بیان ان اصطلاحات کی تعریف کے ساتھ ، مثالوں کا لانا اور مرادوں کا واضح کرنا ۔ بے بنیاد دنیا کے فنا

کا اور زمانی موجودات کے ہر لحظہ تغیر و تبدل کا بیان ۔ اور فی الحقیقت تمام ممکنات کا خواہ وہ مادی ارضی ہوں یا غیر مادّی فلکی متغیرات میں داخل ہونا۔ ذاتی و زمانی حدوث کی موافقت اور ذاتی و زمانی فنا کا الحاق نیز حق تعالیٰ کی ذاتی بقا اور قدامت کا بیان ، اور اُس قدیم اور باقی ذات مطلق کی باقی تمام صفات کا تذکرہ ۔

بارھواں وارد:

جو قصد السبیل کے نام سے موسوم ہے، اپنے متن اور شرح سمیت خلوت و جلوت کا بیان ہے ۔ خلو یعنی قلب کا ما سوای اللہ سے خالی ہونا اور محض رُشد و ہدایت کے لیے خلق خدا کی طرف توجہ کرنا۔ نیز اس امر کا بیان کہ ان حالات سے دیگر کیا کچھ مراد ہے ، نیز ان کیفیات کی تعریف۔ اس امر کی تفصیل کہ خلوت کے سزاوار کون لوگ ہوتے ہیں ۔ اور کس وقت اور کن لوگوں کو اس بات کا حکم ملنا چاہیے۔ اور جلوت کے کون لوگ اہل ہیں۔ انھیں اس امر کی اجازت کس وقت ملنی چاہیے ۔ تعلیم آداب محبت کی تعلیم ، بابرکت مجالس میں مجلسی آئین و ضوابط کا سکھلانا، اور حقیقت شناس عارفوں کے لیے لائحہ عمل کی تلقین ۔ لطائف سبعہ کا ذکر ۔ قلبی، عددی اور زمانی وقوف اور خلوت و جلوت کا یوں باہم سمو دینا کہ انجمن میں بھی خلوت کا عالم ہو ۔ بیان مراقبے کی صورت اور حقیقت کا بیان ۔ نفی و اثبات کا ذکر ۔ کسی مردِ زندہ کی صحبت سے دیگر زندوں کے تمام اعمال و مصروفیات کا مفید ثابت ہونا اور ان پر عمل پیرا ہونے کے طریقے ۔ تعریف لغوی اور اصطلاحی لحاظ سے حق و باطل کی تعریف ۔ سچ اور جھوٹ کی تعریف و توصیف اور ان کا باہمی فرق ۔

تیرھواں وارد:

جو خلقِ جدید کے نام سے موسوم ہے، اپنے متن اور شرح سمیت ۔ ذکر فیضانِ وجودی کے ہر موجود کو متواتر فیض رسانی کا ذکر۔ تجدد امثال کا بناپن اور لباس و ستر کے استعارے اور دیگر مناسبات سے حقیقت کا انکشاف ۔ چہرے ہاتھ اور پنڈلی کی تعبیر ۔ تجدد امثال کا بیان صاحب جمال صوفیوں کے اقوال کے مطابق تجدد امثال کا بیان ، نیز دیگر سوال و جواب سمیت اس اجمال کی تفصیل تحقیق لفظ تجدد کو لفظ حدوث کے ساتھ مترادف بنانے کے سلسلہ میں نئے اسلوب اور ڈھنگ سے تحقیق ۔ حدوث کی طرح تجدد کی بھی دو قسمیں ہیں۔ ایک تجددِ حقیقی جو حدوثِ ذاتی کی طرح سب ممکنات کو نصیب ہوتا ہے اور دوسرا تجددِ اضافی جو حدوث زمانی کی طرح سفلی مادیات سے مخصوص ہوتا ہے ۔ تلقین اللہ کی طرف رجوع اور اللہ سے نسبت کے حصول کی تلقین ، تجددِ امثال کے مسئلے مسائل نہ سمجھنے کی عدم ضرورت کی تلقین اور اسی قسم کی دیگر بحث

تمحیص اور مرتبۂ کمال کا بیان - رفع اس خیال کی تردید کہ اعتبارات کی قید سے آزاد ہو کر مقیدات کبھی بھی ذاتِ مطلق سے واصل نہیں ہو سکتیں اور نہ ذاتِ حق سے حقیقی وصل پیدا کر سکتی ہیں - تحقیق اس امر کی تحقیق کہ حق سبحانہ تعالیٰ کا ہر اسم سارے اسمائے الٰہیہ کا جامع ہے - جمالی اسماء میں بھی جلالی جھلک ہے اور جلالی اسماء میں بھی جمالی جھلک ہے - کشف وجود کے لحاظ سے تجددِ امثال کی تہ کی حقیقت اور حس و نمود کے لحاظ سے اس کی مثال فیصلہ شیخ اکبر اور شیخ قیصری کے تقریری دعووں کا فیصلہ - تنبیہ ان ہر دو تقریروں کے مالکوں میں سے ہر ایک جانب کا غلبہ و رجحان اور اتحادی و امتیازی نسبت کے بارے میں تنبیہ - اور خالص دین محمدی کے اعتدال و جامعیت کا بیان (ان سب اصحاب محمدی پر درود و سلام) ذکر مبارک حضرت امیر المحمدین ناصر ملت والدین (والدِ بزرگوار) کا ذکرِ مبارک - ان کی تخمیناً تاریخ پیدائش ان کے بعض مخصوص کمالات کی شرح سمیت ، اور ان کی عمدہ تصنیف یعنی "نالۂ عندلیب" نامی کتاب کی جامعیت کی تعریف و توصیف جو تمام دینی اور دنیوی مقدمات کی جامع ہے - اس مسئلہ تجدد امثال میں سچ جھوٹ کا امتیاز کرنے کے لیے ہم اس کتاب سے اس مقام کی عبارت کو ہو بہو نقل کیے دیتے ہیں :-

چودھواں وارد :

جو خیرِ کثیر کے نام سے موسوم ہے ، اپنے متن اور شرح سمیت - بیان ہر موجود کے کثرتِ خیرات اور وجود کے خیر محض ہونے کا بیان اور مرتبۂ انسانیت کو جامعیت و بزرگی اور اللہ تعالیٰ کی عطا و بخشش کی بنا اور امانتِ الٰہیہ کا بوجھ اُٹھانے کی بنا پر انسانی درجۂ کمال و فضیلت ، اور تمام نقائصِ امکانیہ میں تمام وجودی کمالات کا عکس پذیر ہونا - اظہار نیز قرآنی آیات کے اقتباسات سے ایک صالح طبع انسان پر اللہ تعالیٰ کی برگزیدگی کے اسرار و رموز کا اظہار - بیان انسان کی جامعیت کا بیان اور حقیقتِ انسانیہ کی جملہ دنیاوی اور ربانی کمالات میں شمولیت اور مذکورہ بالا حقیقت کے عالم امر و خلق کے سارے مراتب پہ حاوی ہونے کی تفصیل اور اُسے دائرۂ موجودات کے مرکزی نقطے سے تشبیہ دیے جانے کا ذکر - مثال آفتاب کے نور کی طرح اللہ تعالیٰ کی ہدایت و فیضان کا نور خاکی انسانِ کامل کے قلب کی زمین پر چمکتا ہے جو اس کا حقیقی مرکز ہے اور وہاں سے پھوٹ کر اُس نور کی شعاعیں تمام دُنیا میں پھیل جاتی ہیں - بیان اس امر کا بیان کہ جس طرح موجودات کے سارے مراتب کمال کی انتہا و منتہی مرتبۂ انسانیت ہے اسی طرح مرتبۂ انسانیت کے جملہ کمالات کی انتہا و منتہی اُس فردِ واحد کی ذات ہے جو خاتم النبیین ہے - اعتدالِ حقیقی

اُس لاثانی ذات کے حصے میں آیا (ان پر مکمل طور پر صلوٰتیں ہوں اور ہر قسم کی سلامتیاں ہوں کامل طور پر) نیز اس امر کا اظہار کہ جو اس اعتدال کے زیادہ قریب ہے وہی زیادہ صاحبِ کمال ہے۔ اس اعتدالِ اضافی کے مراتب بے شمار ہیں۔ ان اضافی مراتب کا خاتم جو اعتدالِ حقیقی کے مالک کے قدموں سے چمٹا رہے اسی کو دینِ محمدیؐ کا خالص پیروکار کہتے ہیں (نبی پاک اور ان کی آل اولاد پہ خدا کا درود و سلام)۔ ترغیب علم وفضل اور ظاہری و باطنی کمال کے حصول کی ترغیب اور ان تمام علوم کی تفصیل جو دنیوی معیشت کی اصلاح اور آخرت کی فلاح کا موجب ہیں۔ نیز سارے متضاد کمالات کو حدِ اعتدال پہ مجمع کرنے کی ترغیب۔ تعریفیں متن میں وارد ہونے والے ان الفاظ و کلمات کی تعریف جو فرق، امتیاز، جمع، اتحاد، تطہیر، تشبیہ، خودداری بے غرضی، حمیت، انصاف، آداب اور بے تکلفی پہ مشتمل ہیں۔ **فائدہ** ہر عمل کی نیت کی حقیقت کی پہچان ہو جاتی ہے اور اس کی خیریت یا گڑبڑ کا پتہ چل جاتا ہے۔

پندرھواں وارد:

جو مفاتح الغیب کے نام سے موسوم ہے، اپنے متن اور شرح سمیت۔ **عالم مثال کا بیان** صوفیا اور حکما کے انداز میں اس عالم مثال کے لغوی اور اصطلاحی معانی کی حقیقت کا اظہار مع اس تمام بحث و تکرار کے جو ان کی ہر تعریف و تحقیق پہ وارد ہوتی ہے۔ پھر دوسروں کے اقوال اور ان کی کشفِ تحقیقات کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے مجھ فقیرِ بے نوا پر اسی عالم مثال کی مختلف کیفیتوں کے جو حقائق و دقائق منکشف کیے اور بیان فرمائے ہیں اور خاص عنایت لم یزلی سے جو اسرار و رموز کھولے ہیں ان کی مدد سے راقم نے عقلی امور کو ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ **بیان** مثل بالکسر (یعنی م کے نیچے زیر) ہو تو مطلب ہے ایک چیز کی دوسری چیز سے ظاہری اور معنوی مشابہت و یکسانیت اور اگر مثل (بالفتحین) یعنی زبر کے ساتھ ہو تو ظاہری مشابہت کے بغیر معنوی نسبت کا ہونا ہے۔ مثال ہو تو اس صورت میں اکثر ظاہری مشابہت ہوتی ہے۔ **تقسیم** عالم مثال (اس عالم اور عالم ارواح کا درمیانی عالم) کی تقسیم تین مراتب میں منقسم ہے، عالمِ مثالِ ادنیٰ، عالمِ مثالِ اوسط اور عالمِ مثالِ اعلیٰ۔ ہر ایک کی مثالوں اور اُس کی حقیقت کی تہ تک، ہر ایک کے آثار و علامات کا ذکر، اور جاہلوں کے بے جا دخل کا رد۔ **تحقیق** عالمِ مثال کے بدن و نفسِ عنصری کے متعلق تحقیق اور آخرت اور عالمِ برزخ کے معاملات کی چھان بین۔ **نکتہ** اس امر کا بیان کہ عالمِ مثال کی موجودات کو آسمانی کتنا بھی ذرا دشوار ہے اور دیگر

یہ کہ اس موضوع بحث پہ ان دیکھے اور بنا سمجھے جو کچھ بیان کیا گیا ہے، وہ سب بے جا و نامناسب ہے۔
تحقیق اس سلسلے میں تحقیق و تدقیق کہ یہ تمام مرکبۂ لطیفہ جو ناقابلِ تشخیص و تقسیم ہیں نہ پھاڑے جا سکتے ہیں
اور نہ جوڑے جا سکتے ہیں۔ ان کی تمام دنیوی قیود جو صوفیا نے اس عالم کی اشیا کے لیے بیان کی ہیں وہ سب
زائد اور خارج از بحث غیر ضروری باتیں ہیں اور خاص طور پر ثابت بھی نہیں ہو سکتیں۔ بیان اس امر کا
بیان کہ یہ سب قائل حضرات اس عالم مثال کے انھی دو مرتبوں یعنی ادنیٰ اور اوسط مرتبے سے آگاہ ہیں جسے
اُنھوں نے دو قسموں میں تقسیم کر رکھا ہے اور اسے خیالِ متّصل اور خیالِ منفصل کا نام دیا ہے۔ عالمِ مثال
کے تیسرے مرتبے سے جو مرتبۂ اعلیٰ ہے اور ہر قسم کے شک و شبہ اور وہم و گمان سے پاک ہے، وہ بالکل
بے خبر ہیں۔ نقل زمانۂ قدیم کے بعض اولیائے کرام کے متعلق حکایات، حضرت قبلۂ عالم (والد بزرگوار،
خدا ان کے لطائفِ باطنی سے ہماری مدد کرے) کے خاص معاملات کا بیان، مثلاً روحوں کو جسم دینا اور جسموں
کو روح دینا اور بعض شرائط اور پابندیوں کا کشف جو ایسے معاملات کے ظہور میں اکثر و بیشتر عمل دخل رکھتی ہیں۔

سولھواں وارد:

جو قولِ طیب کے نام سے موسوم ہے، اپنے متن اور شرح سمیت۔ بیان شاعرانہ استعارات
میں موحّدانہ گفتگو۔ یعنی توحید کا بیان جس کے متعلق محقّق اور موحّد لوگ مختلف و متعدد الفاظ کے لباس میں
استعارۃً یعنی شاعرانہ انداز میں گفتگو کرتے ہیں۔ بیان شعر و شاعری کی حقیقت کا بیان، اور یہ کہ شعر کہنا
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے شایانِ شان نہ تھا۔ باقی کسی مرتبے کے آدمی کے لیے قابلِ اعتراض نہیں اور اس
میں کسی قسم کا کوئی مضائقہ نہیں بلکہ انسانی کمالات میں یہ اک مرتبۂ کمال ہے۔ تمام بزرگوں، اماموں اور اولیائے
کرام نے شعر کہے ہیں۔ بیان اولیائے کرام کے الہامی کلمات اور ان اقوال و اشعار میں فرق جو شاعری کے
ملکہ کے غلبے میں اُنھوں نے کہے اور بعض عبارات میں ان ہر دو معانی کا یک جا جمع ہو جانا، کیونکہ بعض اشعار
بھی الہامی ہوتے ہیں اور بعض الہامات میں شاعری کی پُر لطف باتیں ہوتی ہیں جو اس فیض دائمی کے سرچشمہ
(حق تعالیٰ) کی طرف سے ہر دل پہ اُس کی استعدادِ قلبی اس کے علم و فضل کی وسعت کے مطابق بعض
مطالب کے سلسلے میں القا ہوتی ہیں۔ شعر و سخن اور علم لدنی کے فیض میں فرق۔ اوّل الذکر صرف شعرا کو حاصل
ہوتا ہے اور موخر الذکر کا فیضان اولیائے کرام کو اپنے رب سے نصیب ہوتا ہے۔ شعر کی آمد الگ چیز
ہے اور الہام کا ہونا الگ بات ہے۔ قُربِ ولایت، قربِ کمالاتِ نبوت، اور قرب محمدیؐ (جو مراتب

سے اعلیٰ وارفع ہے) کے فرق اور موخرالذکر کے افضل ترین اور جامع ترین ہونے کا بیان ۔ ایک باریک نکتہ وحدت وکثرت اور توحیدِ ذاتِ حق کے متعلق ایک دقیق نکتہ ۔

سترھواں وارد :

جس کا عنوان مغانم کثیر ہے، اپنے متن اور شرح سمیت ۔ تعریف غنیمت کی تعریف ، اس کی حقیقت کا کشف اور یہ نام رکھنے کی وجہ ! ہویت و ماہیت کا بیان اور حقیقت اور ہویت و ماہیت کی تعریفوں کے ساتھ ان کا باہمی فرق ۔ ایک دوسرے سے ان کی باہمی مناسبت ۔ ان سب مراتب کی یکسانیت و مغائرت کی تفصیل اور تمام مطالب میں جامعیت حاصل کرنے کا بیان ۔ فائدہ اس امر کا بیان کہ مذکورہ بالا اضافی نسبتیں یعنی یکسانیت و مغائرت (یگانگت و بیگانگت) ماہیت و ہویت، مطلق، مقیّد اور کلّی و جزوی نسبتیں موجوداتِ ممکنہ میں تو باہم ہو سکتی ہیں ۔ مراتبِ عالیہ اپنے اطلاق، عمومیت اور شمولیت کی وجہ سے عیناً اپنے نچلی سطح کے مراتب ہیں اور ان سب پہ حاوی ہیں ۔ مگر یہ مراتب سافلہ اپنے تقیّد ، امتیاز اور خصوص کی راہ سے عیناً اپنے مراتب عالیہ نہیں ہو سکتے ۔ پس یکسانیت اور مغائرت کا اطلاق جو ممکنات کے خواص ہیں ۔ ہم جنس کے موجود ہونے پر کیا جا سکتا ہے کہ یہ بالکل اسی طرح کی ہے یا وہ اُس سے الگ ہے ۔ اس قسم کا نسبتی اطلاق واجب اور ممکن اور عبد اور معبود میں نہیں ہو سکتا ۔ کیونکہ واجب ممکن کا ہم جنس نہیں[۵] کیونکہ نہ وہ خود جوہر ہے اور نہ ہی عرض (یعنی نہ ہی ظاہری شکل) ۔ معبود عبد کی جنس سے نہیں ۔ اُس جیسی اور کوئی شے نہیں[۳۳] وہ ایک ایسا مرتبہ ہے جو عمومی اور خصوصی اعتبارات اور اطلاق و تقید اور کل و جزو سے بالاتر ہے اور کون و مکان کے اضافات سے پرے، بہت دور ۔ ایسے مقام پر یکسانیت و مغائرت کی باتیں کرنا سراسر جہالت ہے ۔ تعلیم اللہ تعالیٰ کے قرب و نزدیکی کے بیان کے آداب سکھانا ۔ اور احاطۂ قدرت اور مخلوق سے خالق کی ماورایت اور غیریت کا بیان اور دینِ محمدیؐ کے مخلص پیروکاروں کی جامع تقریر کا بیان جو عوام اور خواص سبھی کے لیے دُنیا اور آخرت میں مفید ہے ۔ بیان تخیّل و تعقل کا بیان اور کلّی و جزوی کا ذکر ۔ کلیات ثلاثہ جو منطقی کلّی ، طبیعی کلی اور عقلی کلی پر مشتمل ہیں ۔ اُن کے حقیقی اور اضافی اجزا اور ان کی تعریفیں اور مثال دے کر حقیقت کی وضاحت کرنا ۔ فائدہ اتحادی اور امتیازی دونوں نسبتوں کے مشاہدہ و معائنہ کی نگہداشت ، اور ان دونوں تنزیہی و تشبیہی مراتب کا مطالعہ جو راہِ مستقیم ہے اور ان نسبتوں سے تعلق رکھنے والے حالات و کیفیات کی شرح ۔

اٹھارھواں وارد:

جو داعی الی اللہ کے نام سے موسوم کیا گیا ہے، اپنے متن اور شرح سمیت۔ تعریف داعی کی تعریف اور کاملوں کی اللہ تعالیٰ کی طرف دعوت دینے کی حقیقت اور ان کا اپنی تبلیغ میں داعی الی اللہ ہونے کا ذکر بیان علم و عمل سے نفس کی تکمیل کا بیان، اور ظاہری و باطنی انسانی کمالات کے تمام مراتب کا حصول، علم و معرفت کی فضیلت اور کسبی و وہبی علم میں فرق۔ بیان اس امر کا بیان کہ علم لدنی رکھنے والے اصحاب کے لیے علوم ظاہری کا اکتساب نہایت کار آمد ہوتا ہے۔ اس کی مثال ایسے ہے جیسے جنگ کے موقع پر کسی شجاع و دلیر آدمی کے ہاتھ میں خالص چمکدار فولادی تلوار ہو۔ تعریفات متن میں آنے والے الفاظ انسانی نفس مجردہ اور جوہر۔ ان کی تعریف اور ان کی پانچ حصوں میں تقسیم جو یوں ہے۔ عقل، نفس، جسم، ہیولیٰ اور صورت اور پھر ان کی مزید تقسیم بسیط روحانی اور بسیط جسمانی۔ مرکب فی العقل دون الخارج و مرکب فی الذہن خارج مادیات وغیر مادیات، اور قرب و بُعد کی تعریف اور محسوسات و معقولات کی تحقیق دس حواس جو مشتمل ہیں پانچ حواس ظاہری یعنی سننے، دیکھنے، سونگھنے، چکھنے اور چھونے کی حس پر اور پانچ باطنی حواس یعنی حسِ مشترک، قوتِ متخیلہ، قوتِ متفکرہ، قوتِ واہمہ اور قوتِ حافظہ اور اس ملکہ کی تعریف۔ فائدہ نفس کے لغوی اور اصطلاحی معنوں کا بیان۔ نفس کی قسموں اور اس کے ناموں کا ذکر جو نفسِ امارہ، نفسِ لوامہ اور نفس مطمئنہ ہیں۔ نیز انسانی نفس کے فنا ناپذیر ہونے کا اظہار، نیز یہ کہ اربابِ سلوک جو سالکانِ راہ کے فنائے نفس کی بشارت دیتے ہیں، وہ عبارت ہے اطمینان قلب کی حالت سے۔ لہٰذا دین محمدیؐ کے پیروکاروں کی اصطلاح میں فنائے نفس کی تعبیر اطمینانِ نفس سے کی جاتی ہے۔ اسی طرح فنائے قلب کی جگہ سلامتیٔ قلب، علاجِ قلب اور اسی قسم کے دیگر کلمات آیاتِ قرآنی اور احادیثِ نبویؐ سے اخذ کرکے استعمال کیے جاتے ہیں۔ اظہار انسان کے جامع و کامل ہونے کا اظہار۔ خلافتِ الٰہیہ کے اسرار و رموز اور انسان کے فضل و شرافت کا ذکر اور ضمناً قرآنی آیات کا آدم اور فرشتوں کے قصے سے اقتباس۔ تفصیل علومِ معقول و منقول کی تفصیل۔ تہذیبِ اخلاق کا حصول اور مذموم صفات کا جڑ سے اکھاڑ دینا تاکہ اس کی شاخیں جو ناشائستہ افعال اور بُرے اعمال کی شکل میں رہتی ہیں سر نہ اُٹھانے پائیں اور ظاہر و باطن کی شرع و دینِ مصطفےٰ کے مطابق کانٹ چھانٹ کرتا اور باطنی امور میں سرگرم ہو کر اس ذاتِ لاشریک کی طرف متوجہ ہو کر نورِ معرفت اور رازِ حقیقت کا پانا کہ ان علوم کا ماحصل ہے اور اپنے دل و دماغ کی تختی سے باقی تمام ظاہری دنیوی اشکال اور

دیگر حاصل کردہ علوم کے بحث مباحثے مٹا دینے چاہئیں - اس مفہوم کی مزید وضاحت طبع انسانی کی مثال ہے کہ غذا کے حل ہو جانے والی قوتوں کو تحلیل کر کے اس خوراک کے مغز اور نچوڑ کو طبع اپنے میں جذب کر لیتی ہے، اور فضلے کو اُس کی دیگر مناسبات کے ساتھ خارج کر دیتی ہے - تنبیہ اس امر کے سلسلے میں آگہی کہ تمام علوم خواہ علمِ کلام ہو خواہ علمِ حکمت یا علمِ تصوف و دیگر تمام علوم یہ سب دینِ محمدیؐ کے جامع حقائق و معارف کے خادموں اور مبادیات میں سے ہیں - اور حقائق و معارفِ دینِ محمدیؐ سب علوم کی علتِ غائی ہیں تحقیقاتِ محمدیہؐ کے مرتبے کی رفعت و بلندی اور دینِ محمدیؐ کے ہر پیروکار کے لیے اپنی استعداد اور صورتِ حال کے مطابق ان کمالات کے حصول کا بیان اور حضور نبی کریمؐ (ان پر درود و سلامؐ) کی وسیع و بے پایاں رحمت کا بیان - اللہ تعالیٰ کی عنایات بے غایات سے جوہر کا سورج کی طرح ظاہر و عیاں اور اس جامعیت کی سعادت کا معرضِ وجود میں آنا کہ جوہر و عرض کم ہی باہم یکجا ہوتے ہیں - یہ اجتماع شاید کسی خوش بخت کے نصیب میں ہو - یہ اور ایسی عنایات بے غایات اور عنایاتِ لم یزلی کا اپنے ہی حال پر بالخصوص وارد ہونے پر خداوند تعالیٰ کے شکر کا اظہار -

انیسواں وارد:

جو سراجِ منیر کے نام سے موسوم ہے مع اپنے متن اور شرح کے - بیان یہاں سراج یا چراغ سے مُراد حقیقت الوجود ہے جو روح سے منوّر ہوتی ہے - منور ہونے کی تین قسمیں ہیں - پہلے تو اپنے سے الگ کسی کی ضو سے منور ہونا، جیسے زمین سورج کی روشنی سے منور رہتی ہے - دوسرے اس ضو سے منور ہونا جو اس کی اپنی ذات کا مقتضیٰ ہے جیسے سورج خود اپنی روشنی سے - تیسرے اپنے ہی نفس سے منور ہونا کہ اُس کی روشنی ہی اُس کی عینِ ذات ہے جیسے نور بنفسہٖ - حقائقِ ممکنہ کو متکلمین کے مطابق پہلی ضو سے تشبیہ دی جا سکتی ہے اور تمثیلِ واجب کو دوسری ضو سے، اور فلسفیوں اور صوفیوں کے مطابق تیسری ضو سے - اور حقیقت یہ ہے کہ یہ سب وجود کے مراتب ہیں، اور سب اسی کی وجہ سے موجود ہیں - ذات الوجود کی حقیقت کا بیان جو بالکل حیطۂ بیان سے باہر ہے اور کوئی عبارت اس سلسلے میں مدد نہیں کرتی - جو کچھ کہا جاتا ہے وہ محض نسب و اضافات ہے، اور وہ ذات ان تمام اعتبارات سے مبرّا ہے بلکہ مبرّا ہونے کی کیفیت سے بھی مبرا ہے اور مشابہت سے معرا ہے - ہر مرتبہ اسی سے پیدا و ہویدا ہوتا ہے - اس کے ظہورات کے مراتب بے انتہا ہیں اور کلّی طور پر ان کے سہ گانہ مراتب کا بیان یہی ہے کہ شے کی شرط

کے ساتھ، لا، شرط کے ساتھ اور بغیر کسی شرط کے۔ نیز قوت و فعل کے لحاظ سے موجودات کی انتہا اور لا انتہا کا بیان۔ بیان وجود کے سہ گانہ مراتب کا دائرہ اور قوسین سلبی و ایجابی کے الفاظ سے بیان۔ پہلی کے تعین کی مثال حقیقتِ محمدیہ اپنی قابلیتِ مطلقہ کی بنا پر جو ایجاب و سلب پہ مشتمل ہے یعنی اس دائرہ میں قوسین کی تقسیم کی صلاحیت ہے اور مجموعی طور پر دائرہ کی اپنی شکل کا نقش بھی موجود ہے۔ بیان اس امر کا بیان کہ جہاں کہیں عارف لوگ مطالب کے سمجھانے کی سہولت کی غرض سے دائروں وغیرہ سے تشبیہہ دیتے ہیں وہ ان مراتب اور معانی کو اپنے ذہن میں بعینہ اسی طرح نہیں تراشتے۔

بیسواں وارد :

جو ذکر اللہ کے نام سے موسوم ہے اپنے متن اور شرح سمیت۔ بیان زبانی اور قلبی ذکر کا بیان۔ خفی و جلی ذکر کے مراتب۔ خاص ذکر الٰہی کا بیان جو اطمینانِ قلب کا باعث ہوتا ہے۔ بیان سلوک کے بعض مقدمات اور طریقت کے بعض امور کا بیان جن کی نگہداشت سالکانِ راہ کے لیے ضروری ہوتی ہے تعریف سلوک و طریقت کی تعریف۔ ہر طریقے کی نسبت کی کیفیت کا بیان اور طریقۂ محمدیہ کے اعلیٰ و ارفع اور محیط و حاوی ہونے کا بیان (اللہ تعالیٰ کی ان پر رحمتیں ہوں) اور طرفین یعنی ماضی و مستقبل کے طریقوں میں اس کے فیض کی شمولیت۔ اور آیت سجدہ سمیت دیگر قرآنی آیات سے اتمامِ حجت۔ تلقین حضرات خواجگان کے طریق پہ سلوک باطنی کا اکتساب۔ اُس کے سیکھنے کے اسباب اور اُس کے حصول کے طریقے۔ بیان نقشبندی حضرات کے مسلک کے واصل بحق ہونے کا بیان اور متن میں شامل بعض کلمات کی تعریف جو وقوفِ قلبی، ذکر قلبی اور آگہی پہ مشتمل ہیں اور آگہی کے مراتب کی عقل ہیولانی، عقل بالفعل، عقل بالملکہ اور عقل مستفاد سے تمثیل۔ فائدہ منکرین کے شکوک و شبہات کی تردید جو عارفوں کی دعوتِ حق اور رُشد و ہدایت کو نفس ہی کی طرف سے سمجھتے ہیں، اور لوگوں کی تادیب و تعلیم محض اپنی مشیخت بگھارنے کی غرض سے کرتے ہیں۔ رشد و ہدایت کی قوت کو جس کا رابطہ محض اللہ ہی سے ہوتا ہے محض اپنے نفس ہی کی طرف اخلاص و محبت کی ترغیب سمجھتے ہیں۔ بیان حقیقت کے اثبات کا واضح ثبوت قرآنی آیات کے اقتباسات اور شواہد کے دلائل سے۔

اکیسواں وارد :

جو سکینۃ القلب کے نام سے موسوم ہے اپنے متن اور شرح سمیت۔ بیان اس امر کا بیان کہ قلب

جو ہمیشہ الٹ پلٹ ہوتا رہتا ہے ۔ جب تک اللہ کی طرف سے تسکین نازل نہ ہو اسے سکون و اطمینان حاصل نہیں ہوتا ۔ اللہ تعالیٰ کامل سکون و طمانیت قلب محض اُن لوگوں کو عطا کرتا ہے جو نفسِ مطمئنہ کے مالک ہوں ۔ اور ظاہری دل کا بیان جو محض گوشت کا ایک لوتھڑا ہے اور قلبِ حقیقی جسے نفس ناطقہ بھی کہتے ہیں ۔ نیز تسکین اور اطمینان میں فرق ۔ بیان جمعیت و پراگندگی اور جو کچھ ان کے متناسب ہے ، یعنی اس امر کا بیان کہ جمعیت کس چیز سے عبارت ہے ۔ پریشانی کیا ہے اور مطالبِ سلوک میں سے ان کے متناسبات کا بیان ۔ بیان جمعیت کی قسمیں ۔ ایک ظاہری جمعیت ہے جو اربابِ سلوک کے لیے موضوعِ بحث سے خارج ہوتی ہے ۔ ایک باطنی جمعیت ہے جو نفس کے کمالات میں شمار ہوتی ہے اور دنیوی زندگی کی ایک فائدہ مند خوبی بھی ہے ، ظاہری جمعیت جس کا سارے حواس میں کافی عمل دخل ہوتا ہے اور آخرت کے لیے مفید ہے ۔ باطنی جمعیت جسے قرب و معیت سے بھی موسوم کرتے ہیں ۔ یہ باطنی جمعیت ماسوی اللہ کی الجھنوں سے نفس کو نجات دیتی ہے ، اور دُنیا و آخرت دونوں میں مفید ہے اور ایک جمعیتِ حقیقی ہے جو ان تمام مذکورہ بالا جمعیتوں کی جامع ہے ۔ یہ جمعیت تامہ دولتِ الہیہ کی مظہر اور دولتِ محمدیہ کی آئینہ دار ہے ۔ حق تعالیٰ مخلص پیروانِ محمدؐ میں سے جسے چاہتا ہے عنایت فرماتا ہے ۔ اس جمعیتِ کاملہ کے حامل اصحاب کا بیان ، نیز کہ وہ کتنے مراتب کے جامع ہوتے ہیں ۔ ان کا ظاہر و باطن کیسا ہوتا ہے ، وہ گنبدِ الہیہ کے نیچے ہوتے ہیں ، اور دوسروں کی نظروں سے چھپے ہوئے ہوتے ہیں اور اس کی حقیقت کو خدا تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے ۔ اشعار مراتب کے قیاس کرنے کا ڈھنگ ۔ ہر جمعیت کے بالمقابل پراگندگی اور پریشانی کی قسمیں جن کے بیان کی ضرورت نہیں ۔ جمعیت اور پریشانی کے ہر مرتبے میں درجات کے فرق کے لحاظ سے جزئی مراتب بے شمار ہیں فائدہ اس امر کا بیان کہ آدمی جب تک اپنے نفس اور طبیعت کے تابع اور ہوا و ہوس میں مبتلا ہو وہ ہر کسی کا محکوم اور فرمانبردار ہوتا ہے ۔ جب وہ اس جال سے رہائی پالیتا ہے تو وہ سب سے بے نیاز اور مستغنی ہو جاتا ہے ۔ پہلے تو اُسے اپنے نفس کی حاکمیت دی جاتی ہے اور اُسے صاحبِ حکم اور اولوالامری کا منصب عطا کیا جاتا ہے ۔ اس کے بعد دوسرے بھی اس کے حکم کے تابع ہو جاتے ہیں اور اُن پہ اس کی اطاعت فرض ہو جاتی ہے ۔ بیان اس امر کا بیان کہ قلب کا اللہ کے سوا دیگر خیالات سے خالی ہونے کا مطلب یہ نہیں کہ دل سے کسی وقت کوئی خیال گزرتا ہی نہیں ۔ یہ تو محال امر ہے ، بلکہ اس کے معنی ہیں کہ کوئی ایسا خیال جو آگہی کا مزاحم ہو وہ دل سے گزرتے نہیں پاتا ، اور راہ غفلت سے کوئی ایسا ارادہ نہیں

آتا جو اُسے خداوندِ تعالیٰ سے غافل کر دے۔ اور دیگر کانٹ چھانٹ اور آرائش و پیرائش کا ذکر۔

بائیسواں وارد :

جو قربت اللہ کے نام سے موسوم ہے اپنے متن اور شرح سمیت۔ بیان قرب ایک اضافی امر ہے لہٰذا ضروری ہے کہ اُسے مغائرت کا اعتبار اور دوئی کا امتیاز حاصل ہو۔ خواص کو شانِ الوہیت کے شہود کا قرب، عبودیت کے اعتبار سے شعور سمیت ہوتا ہے اور (اقربیت) میں جو قرب کے مراتب کا بعید ترین، یعنی بلند ترین مرتبہ ہے عبودیت کا شعور نہیں رہتا بلکہ صرف شہود الوہیت کا ادراک رہ جاتا ہے اور اس مرتبے میں جہاں عبارت آرائی بھی ساتھ نہیں دیتی وہاں حیثیتِ الوہیت کا لحاظ بھی نہیں رہتا۔ قربت کے ان مقامات کی تفصیل اور حالات و واقعات کا وقوع اور قرب و اقربیت کی نسبت کے ماخذ کا تذکرہ آیاتِ قرآنی کی روشنی میں۔

احاطہ وجود اور خلق کے ساتھ اقربیتِ حق کا بیان :

قرب کی امکانی اور وجوبی تقسیم۔ قرب وجوبی عبارت ہے اس قرب سے جو خالق کی طرف سے مخلوق کے ساتھ روا رکھا جاتا ہے۔ اور واجبی طور پر ذات واجب الوجوب کو ساری موجودات ممکن الوجود سے حاصل ہوتا ہے، اور قربِ امکانی عبارت ہے اُس قرب سے جو بندے کو اپنی دانست میں اپنے رب کے ساتھ حاصل ہوتا ہے، اور خاص طور پر خاص بزرگوں کو میسر ہوتا ہے۔ ممکن ہے یہ قرب بعض کو حاصل ہو اور بعض کو نہ حاصل ہو اور بعض کو بعض اوقات حاصل ہو اور بعض اوقات نہ ہو۔ بندگانِ حق کے لیے یہ قربِ امکانی دوسرے قربِ وجوبی کی نسبت زیادہ مفید، سود مند اور افضل ہے۔ کیونکہ یہ خود ان کے ذاتی کمالات کی وجہ سے ہوتا ہے اور دوسرا قربِ وجوبی اللہ کے کمالات سے ہوتا ہے جو ساری موجودات کے شاملِ حال ہوتا ہے۔ خواص کا یہ خاص قرب اس قربِ عام کی نسبت دوگنا ہوتا ہے اور درجات کے مطابق مراتب میں فرق بھی بہت ہوتا ہے۔ اپنے انتہائی درجے کو پہنچ کر یہ قرب وجوبی کی مانند ہو جاتا ہے اور کسی حال میں اس کے زوال کا اندیشہ نہیں ہوتا۔ بیان نسبتِ مریدی اور اخلاص ولایت کے ہمیشہ معرضِ خوف و خطر میں ہونے اور کمالاتِ نبوت کی نسبت برگزیدگی کے خوف و اندیشۂ عزل سے آزاد ہونے کا بیان۔ اس امر کا بیان کہ حق تعالیٰ کے غیر متغیر الحال اور بندوں کے متغیر الحال ہونے کے باوجود ان کے تغیرات کا اطلاق ادھر بھی کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ ایک طرف کا تغیر طرفین کا تغیر شمار ہوتا ہے۔

تقسیم قربِ الٰہی کی کسبی اور وہبی شاخوں میں تقسیم۔ کسبی قرب کو آگے دو شاخوں یعنی قربِ تفکری اور قربِ تذکری میں تقسیم کیا جاتا ہے، اور قربِ وہبی کا قربِ قرآنی اور قربِ فرقانی سے فرق۔ اس قرآنی قرب کو مزید قربِ قدوسی اور قربِ قدسی کی صورت پر تقسیم کیا جاتا ہے اور قربِ فرقانی کو قربِ محکم اور قربِ متشابہ میں۔ یہاں ان سب جدید اقسام کا ان کی تعریف و توصیف کے ساتھ بیان درج ہے۔ نکتہ نیز حق تعالیٰ کے مخلوق کے ساتھ علمی طور پر قریب اور وجودی طور پر قریب تر ہونے کا بیان۔

تیئسواں وارد:

جس کا نام حق الیقین ہے، اپنے متن اور شرح سمیت۔ بیان: یقین کے تین مراتب یعنی علم الیقین حق الیقین اور عین الیقین کا بیان۔ اور دُنیا میں موت کے سلسلے میں عوام و خواص کے یقین کا فرق۔ اور اس آیتِ کریمہ کے کہ سوائے اس کی ذات (چہرے) کے ہر شے ہلاک ہوجانے والی ہے۔ لفظی، حالی، نیز نحوی اور لغوی معانی جو ان الفاظ سے متعلق ہیں۔ اس حقیقت کے لحاظ سے بھی جو فقط اہلِ حال و ذوق پہ واضح ہوتی ہے۔ کلمۂ وجہ (رُخ یا چہرے کی تاویل) وجود و عدم اور ان کے سایوں کا مختصر ذکر، اور تین وجودی مرتبوں اور اُن کے مظاہر کا تذکرہ۔ فائدہ وہم کے مرتبے کا بیان۔ عارف لوگ جو دُنیا کو دُنیائے موہوم کہتے ہیں اس سے ان کی یہ مراد نہیں ہوتی کہ دُنیا کی ظاہری اشکال لوگوں کے وہم کے مطابق ہیں، بلکہ وہم، عالمِ ارواح، عالمِ مثال اور عالمِ شہادت کی طرح ایک الگ جہان ہے جو ان سب سے زیادہ وسیع اور ان سب پر محیط ہے۔ یہ سب عالم اُس کے اندر پائے جاتے ہیں۔ حق سبحانہٗ تعالیٰ نے اپنی صفتِ کاملہ سے موجودات کو یقینی بنایا ہے۔ اس کے ساتھ منکروں کے اُس خود ساختہ اور سرکش گروہ کے عقیدے کی تردید جو حقائقِ اشیا کے ثبوت کے مُنکر ہیں۔

چوبیسواں وارد:

جو عزم الامور کے اسم سے موسوم ہے، اپنے متن اور شرح سمیت۔ بیان عزم کی حقیقت اور پختہ ارادے کے آثار کے ظہور کا بیان۔ انسان کا اپنی طاقت اور عجزِ بشری کے آئینے میں اپنے مقاصد کو پاتے، مطالب کو حاصل کرتے، اپنے ارادوں کو فسخ ہوتے اور اپنے خلافِ مرضی باتوں کو ہوتے ہوئے دیکھ کر خدا کے زور و قوت اور قادرِ مطلق کی قدرتِ کاملہ کا مشاہدہ کرنا، مطالب کے حصول اور ارادوں کے فسخ ہونے والی دونوں صورتوں میں وہ ثابت قدم شخص جو اپنے اصلی عزم پر قائم رہتے

ہوئے اپنی تمام تر توجہ کا مرکز اللہ تعالیٰ کو بنا دیتا ہے وہی اولوالعزم لوگوں میں شمار ہوتا ہے۔ اس امر کا اظہار کہ عزم کسبی نہیں یہ وہبی اور فطری ہے اور اولوالعزمی ایک بہت بڑا اور گرانمایہ منصب ہے۔ نیز اولوالعزم اصحاب کی کیفیت اور ان کی خصلتوں کا بیان۔ بے نیازی اور استغنا کا بیان دنیا سے دوری اور اہلِ دُنیا سے بے نیازی کا بیان جو اہلِ فقر کا شیوہ ہے۔ اور دنیا داروں کے حال و مآل کی خرابی اور اُن ذلیل انسانوں کی تحقیر و تذلیل نیز ان بر خود غلط لوگوں کی تادیب و تہذیب کا بیان۔ بیان اس امر کا بیان کہ عزت کی بنیاد غنا و استغنا پر ہے اور بہمہ وجوہ عزت تو اُسی حقیقی غنی (خدا تعالیٰ) ہی کو ہے اور اس ضمن میں پھر اُس کے رسولؐ کو اور پھر رسول اللہ کے طفیل اور ان کے اتباع سے مومنوں کو نیز اس بات کی خبر کہ حسنِ خُلق سے عزت میں اضافہ ہوتا ہے اس کے برعکس نہیں، وہ تو غرور و تکبر ہوگا۔ درویشی طریقے کا بیان۔ فقر کی روش کی عظمت اور خواہشات سے خالی ہو کر راضی برضائے مولیٰ ہو جانے اور متضاد کمالات حاصل کر کے جامع صفات بننے کا تذکرہ۔

پچیسواں وارد:

جو قدرِ معلوم کے نام سے موسوم ہے۔ اپنے متن اور شرح سمیت۔ کشف اُس آیت کی وضاحت جس سے یہ اسم اخذ کیا گیا ہے۔ تحقیق قضا و قدر پہ تحقیق۔ اس کے لغوی اور اصطلاحی معانی، ان کا باہمی فرق اور ہر ایک کی تعریف اور اسی سلسلے میں مشیت، تقدیر، ایجاد، قوت، فعل، علت و معلول اور لازمی علت کی تعریفیں، اور یہ کہ مخلص مومن اس لفظ علت کا اطلاق حق تعالیٰ کی ذات پر نہیں کرتے۔ ان تمام مذکورہ بالا الفاظ کا حقیقی، اضافی اور مجازی لحاظ سے باہمی فرق۔ بیان کارکنانِ قضا و قدر کا بیان۔ نیز اس امر کا بیان کہ نچلی سطح کے فرشتے عالمِ خلق میں شمار ہوتے ہیں، اور مجرد و غیر مادی بلند مرتبہ فرشتے عالمِ امر میں داخل ہیں۔ فرشتوں کے حقائق اور اُن کے پروں کا انکشاف۔ اور پھر اس مخلوق کا عقول اور قوائے پہ انحصار نہ کرنا جیسے کہ بعض مسلم فلاسفروں کا خیال ہے۔ فرشتوں کے حالات اور اُن کی خدمات کے تعیّن کا اظہار اور اپنے اپنے مقررہ کاموں سے ان کے کبھی بھی فارغ نہ ہونے کا بیان۔ ان حالات کی خبر، اور ان معاملات و واقعات اور رخصت نہ ملنے کے اسرار و رموز اور ان تحقیقات کی تفصیل۔ فائدہ قضا کی فطرت سے تشبیہہ و مثال اور اس مثال سے حقیقت کا انکشاف۔ نکتہ یہ نکتہ کہ خالص ذاتِ حق میں (جیسی کہ وہ ہے) خیر کا اطلاق بھی نہیں کیا جا سکتا۔ خیر و شر دونوں اعتباری امر ہیں۔ شرّ ممکن سے نسبت

کے اعتبار سے اور غیر واجب سے نسبت کے اعتبار سے ۔ بیان اس امر کا بیان کہ وہ محض اللہ تعالیٰ ہی کی قدرت اور فعل ہے جو تمام اشیا اور افعال میں جاری و ساری ہے ۔ کائنات کی سب بنی ہوئی چیزوں میں فاعلیت کا انتساب اور علت و معلول کا اطلاق ایک دوسرے سے باہمی مناسبت و نسبت سے مجازی اور اعتباری ہے ۔ انسانی ارادے کی مثال، پھر اس (انسان) کے ہاتھ میں قلم کا حرکت میں آنا ۔ نقوش کا ظاہر ہونا اور عقلی اور نقلی طور پر فاعلیت کا واجبیت کے مرتبے کے لیے مخصوص ہونا ۔ تقسیم تقدیر کی چار قسمیں ہیں ۔ ہر قسم کا نام اور اُن کا آگے دو قسموں میں تقسیم ہونا ۔ پہلی بدیہی اسفلی (ظاہری و نچلی) جو اسبابِ ظاہر سے متعلق ہے اور عوام الناس بھی اُسے جانتے ہیں ۔ دوسری نظری اور علوی تقدیر ہے جسے طبیعتوں، ستاروں، آسمانوں اور جانداروں سے تعبیر کیا جاتا ہے ۔ اور فلاسفروں اور نجومیوں نے بشری استعداد کے مطابق اس کا کھوج لگایا ہے ۔ اُس حکیم اور قادرِ مطلق نے تقدیر کے ان مظاہر میں آثار بھی رکھے ہیں اور احکام بھی عطا کیے ہیں اور اُس نے کسی شے کو یونہی بے فائدہ پیدا نہیں کیا ۔ تقدیر کی تیسری قسم کشفی و مکتوبی ہے ۔ وہ عبارت ہے اس سے جو کچھ کہ لوحِ محفوظ میں لکھا جا چکا ہے اور فرشتوں، نبیوں اور ولیوں کو اُن کے مراتب اور حالات و واقعات کے مطابق ان سے آگاہی ہوتی رہتی ہے ۔ چوتھی قسم مخفی و مجہولی ہے کہ اشارہ ہے تقدیرِ غیبی کی طرف جس کا علم سوائے اس پاک ذات کے اور کسی کو نہیں ۔ وہ پہلی تین تقدیرات تو امکانی مرتبے میں داخل ہیں ۔ اور ان میں تغیر و تبدل، الٹ پلٹ اور محو و ثابت ہونے کا جواز ہے اور قضائے معلّق میں سے ہیں ۔ اور یہ آخری قسم مرتبۂ وجوب میں ہے اور اس میں کسی قسم کا اختلاف روا نہیں اور وہ سب تقدیرات پہ غالب ہے اور اٹل قضا کا اسی پہ اطلاق ہوتا ہے ۔

چھبیسواں وارد:

جو غیب و حضور کی خبروں کے نام سے موسوم ہے، اپنے متن اور شرح سمیت ۔ بیان غیب و حضور کے معاملے کا بیان اور قوم کے اصطلاحی معنوں کا اظہار اور وہ خبریں جو ابھی ابھی فہم میں آئی ہیں ۔ ہر واحد کی نئی تعریف ۔ ہر دو امور اعتباری و اضافی ہیں اور نسبت بہ نسبت ہر مرتبہ غیب میں بھی داخل ہے اور حضور میں بھی ۔ ہر مرتبہ میں فی نفسہٖ بھی ہر دو جانب ہیں ۔ غیبی امور ہر لحظہ عالمِ حضوری میں داخل ہوتے رہتے ہیں، اور حضور کی معلومات عالمِ غیب میں جاتی رہتی ہیں ۔ اور اللہ تعالیٰ ہی صرف

غیب وحضور کے اس عالم کو جاننے والا ہے۔ اُس پاک ذات پہ غیب کا اطلاق صرف ہمارے اعتبار سے ہے ورنہ اُس کا علم تو جہان کی تمام اشیا پہ حاوی ہے۔ اور بات کے اسی تسلسل میں احاطۂ الٰہیہ کو احاطۂ ذاتیہ سے نہیں بلکہ احاطۂ علمیہ سے تعبیر کرنا۔ اس کی تفاصیل و دلائل کا بیان۔ بیان غیب الغیب کا اطلاق صرف ذاتِ حق تعالیٰ پہ ہوتا ہے۔ جس طرح غیبِ محض صرف اسی وجودِ مطلق کا حصّہ ہے، اسی طرح حقیقی حضوری بھی فقط اسی کے نصیب میں ہے۔ دیگر مجازی موجودات کے حصّے میں آنے والے غیب وحضور اعتباری ہیں۔ نیز اس امر کا اظہار کہ غیب وحضور دونوں وجودی امر ہیں اور ایک دوسرے سے بڑھ جانے کے لیے ان کا ٹکراؤ بھی ہوتا ہے۔ ان میں سے کسی کا عدم پر اطلاق بھی جائز نہیں اور اس مطلب کے اثبات کے سلسلے میں جواب و سوال پہ اعتراض مع ایک دقیق نکتے کے۔ بیان شہادت کی اقسام کا بیان۔ وہ تین ہیں، حقیقی، علمی اور حسّی شہادت۔ غیب کی بھی تین قسمیں ہیں۔ غیبِ حقیقی، غیبِ علمی اور غیبِ حسّی۔ **فائدہ** اس امر کا بیان کہ علمِ مطلق تو فقط وہی ذاتِ حق تعالیٰ ہے۔ وہ ہر شے کے دریافت کرنے کے لیے ممکنات کو حسّ و قوت عطا فرماتا ہے۔ اُس حس اور قوت کی بنا پہ اس چیز کا ادراک کیا جا سکتا ہے اور اس معانی کی واضح مثالوں سے وضاحت۔ اس شے کی حقیقت پالینے کے بعد پالینے والے کے لیے وہ شے داخلِ شہادت ہو جاتی ہے ورنہ داخلِ غیب ہی رہتی ہے۔ اور اس مثال سے انبیاء اور اولیائے کرام کا غیبی امور سے حقیقت کے انکشاف کی خبریں دینا اور دوسروں کا ان پوشیدہ اسرار و رموز کو مادر زاد اندھوں اور پیدائشی بہروں کی طرح نہ پا سکنا جو دیکھنے اور سننے والوں کی باتوں کا یقین نہیں کرتے اور ان کو دلی تسلّی حاصل نہیں ہوتی۔ ہادیٔ حقیقی وہی ذاتِ برحق ہے اور وہی سب کا مرجع بھی ہے۔

ستائیسواں وارد:

جو استغفار کے نام سے موسوم ہے، اپنے متن اور شرح سمیت۔ بیان اس امر کا بیان کہ عبدیت کا مقام درحقیقت مقامِ خطا و عصیاں ہے، اور ربوبیت کا مرتبہ مقامِ عطا و بخشش ہے۔ نیز توبہ، ندامت اور استغفار کی کیفیت اور تمام اقوال، افعال، خیالات و خصائل کی حقیقت اور عبدیت کی اضافت سے ان پہ اک نگاہ۔ نفسِ بشری کی کسب و اکتساب سے نسبت، اور نیز ایجاد و تخلیق کی حیثیت سے کلی اور جزوی طور پہ ربوبیت سے ان کی نسبت اور خصوصی معاملات کا انکشاف اور پوشیدہ بھیدوں کا اظہار۔ غفلت و تنبیہ کا بیان اور طبعاً خواص و عوام کے

لیے ان حالات میں کمی بیشی اوسان ہر دو دائرہ میں پوشیدہ حکمت و فائدہ اور خاص و عام کا فرق ۔ **بیان** قدم اور نظر کی مثال اور عمل کے مادی کثیف جسم سے تعلق کی اور علم کے نفس ناطقہ سے تعلق کی دلیل سے عمل کے مرتبے کا علم سے افضل و برتر ہونے کا بیان ۔ حقیقت کی تہ ۔ کاملوں کی دوری، علم و معرفت میں کمی کی حیثیتوں کا اختلاف اور عبادت کا حق ادا کرنے کی نفی بموجب اس قول شریف کے کہ اے خدا ہم تجھے کما حقہٗ نہ پہچان سکے، اور نہ اس طرح تیری عبادت کر سکے جس طرح کہ عبادت کا حق تھا ۔ **بیان** اس امر کا بیان کہ شفاعت کرنے والوں کی شفاعت خدا تعالیٰ کی رضا کے مطابق ہوگی اور اُس کی رضا کے بغیر کسی کو شفاعت کی مجال نہ ہوگی ۔ پہلے تو باطناً اللہ تعالیٰ کا معاف فرمانا اور بعد ازاں ظاہراً انبیا و اولیائے کرام کے توسل سے گناہوں کی معافی اور حال دُنیا کی مثال سے اس کی وضاحت ۔

اٹھائیسواں وارد :

جو سواء السبیل کے نام سے موسوم ہے اپنے متن اور شرح سمیت ۔ **اجبار حالِ استدلال کا بیان** توحید وجودی اور توحید شہودی کا بیان کہ وجود معنی واحد ہے اور بذاتِ خود موجود ہے اور تمام مشاہدوں میں وہی مشہود ہے ۔ **اظہار** اس امر کا اظہار کہ کاملانِ حق کے نزدیک وحدت الوجود اور وحدت الشہود کا نتیجہ ایک ہی ہے، یعنی اللہ کے سوا باقی ہر مشغولیت سے دل کا پاک ہو جانا اور دل کا ہر قسم کے خیالات و تعلقات سے خالی ہو جانا اور ذاتِ حق تعالیٰ کو مکمل وسیلہ ٹھہرانا اور دنیا و ما فیہا سے مکمل طور پر کٹ جانا اور ان ہر دو معانی کے سلسلے میں جامع تقریر کا بیان ۔ **بیان** جب مسئلہ وحدت الوجود کی حقیقت اچھی طرح سمجھ میں آجائے تو پتہ چلتا ہے کہ ممکنات عین واجب تعالیٰ نہیں ہیں بلکہ سب اُسی (خدا) کی طرف سے ہیں نہ کہ سب خود (یعنی خود خدا) ہیں ۔ اس حقیقت کا بہترین بیان وحدت الشہود ہے ۔ لیکن اس طریق سے کہ حق کا دامن ہاتھ سے چھوٹنے نہ پائے اور اہلِ ظاہر کی طرح دوئی راستے کی رکاوٹ نہ بنے ۔ اور نہ ہی تعصب آنکھوں پر حجاب کی پٹی باندھ دے ۔ اس قسم کا بیان خواص و عوام میں سے بہتوں کے لیے مفید ہے اور "ہمہ اوست" والی بات عوام الناس میں سے بہتوں کے لیے نقصان دہ ۔ اس مقصد کی تفصیل اور عالی مقام اکابرین کی تربیت کا ڈھنگ ۔ **بیان** ایک توحیدِ وجودی کا علم ہے جسے صوفیا علمِ تصوف کہتے ہیں اس کے اصولوں، کلیوں، ضابطوں اور اصطلاحوں کی خبر و اطلاع کے ساتھ اس کی تعریف و توصیف، دوسرے توحیدِ وجودی کی حالت میں کیف و سرور آنے کی حالت و کیفیت اور

اس کا بیان - ایک توحیدِ شہودی کا علم ہے جسے متکلمین علمِ کلام ہی کا حصہ سمجھتے ہیں اور بزرگانِ دین اسے علمِ حقیقت سے تعبیر کرتے ہیں اور علم الکلام سے الگ سمجھتے ہیں - اس کے مقررہ قواعد و اصطلاحات - توحید شہودی کی حالت سے مشرف ہونے اور اس کیفیت کا بیان - بیان ان چاروں امور کے اہل حضرات میں سے ہر کسی کا الگ الگ بیان - ان تمام کیفیات کی جامع وضاحت - مقلدوں، عالموں اور ولیوں کے مرتبوں اور منصبوں کا فرق - بے دین ملحدوں کا بحث سے خارج ہونا - اور محقق موحدوں اور کامل ولیوں کی جامعیت اور ایسے اشخاص کا مکمل اتباع اور تمام سورۂ اخلاص سے اقتباس - تحقیق اسمائے الٰہیہ کے تمام اعتباری اور مظہری مراتب کے سلسلے میں تحقیق اور وحدت الوجودی اور ظلالی صوفیا کے طور طریقے کے علاوہ ذاتِ وحدہٗ کا ادراک و آگہی مومنوں کے طریق پر - تعلیمہ اس امر کی تنبیہ کہ بعض نافہم ناواقف لوگ اپنے گمان کے مطابق حضرت مجدد الف ثانی قدس سرہٗ کو ظلّ کا قائل سمجھتے ہیں، حالانکہ ایسا نہیں، بلکہ وہ تو اصل الاصل سے متصل ہیں - بیان اس امر کا بیان کہ اللہ تعالیٰ اپنی صفات سمیت ایک مستقل اور قائم بالذات ہستی ہے - یہ وجود ساری موجودات سے الگ ہے - اس کے وجود کی وجودیت انہی موجوداتِ ممکنہ پہ منحصر نہیں جب کہ ناقص العقل لوگ خیال کرتے ہیں اور اس وجود کو کلیتہً طبیعی سمجھتے ہیں، بلکہ موجودیت تو ذات الوجود کی صفت ہے، اور یہ نفس وجود سے قائم ہے نہ یہ کہ وجود موجودیت کے سبب سے قائم ہے جو اس کی صفت ہے - نہ تو موجوداتِ ممکنہ کے پیدا ہونے سے اس ذات الوجود میں کچھ بڑھتا ہے اور نہ ان کے نابود ہونے سے اس ذات سے کچھ گھٹتا ہے - وہ ان سب سے مبرّا ہے اور کوئی شے اس سے مبرا نہیں - تفسیر اس آیت کریمہ کی تفسیر جس کے معنی ہیں کہ آخر میں آسمان و زمین اللہ ہی کا رہ جائے گا - اور اللہ تعالیٰ تمہارے سب اعمال کی پوری خبر رکھتے ہیں - لفظ میراث کی خوبی اور سب موجودات کے لیے وجودِ ذات کے موجد اور وارث ہونے کا بیان - نکتہ برسبیل تذکرہ اس نکتے کا بیان کہ جو لوگ وجود کو کلیتہً طبیعی طور پر اپنے افراد کے اندر موجود سمجھتے ہیں، کاش وہ یوں کہتے کہ وجود مطلق موجوداتِ ثلاثہ سے تشکیل پانے والے افراد سے موجود ہے - اگر جوہر و عرض نہ ہوں جو کہ ممکنات سے ہیں تو وجود تعینِ واجبی میں موجود ہوگا کیونکہ وجوب اور وجود دونوں واجب کی عین ماہیت ہیں - فائدہ اس امر کا بیان کہ تحقیق کرنے والے عارفوں نے وجودِ حق کو ثابت کیا ہے اور اللہ کے سوا ہر وجود کی نفی کی ہے - اور یہ دہریے (نیچری) اور بے دین کم سمجھ ملحدین وجودِ خلق کو ثابت اور وجودِ حق کی نفی کرتے

ہیں نیز ان گمراہ اور گمراہ کن حضرات کے خلل و شور سے بھرے ہوئے حالات کی خبریں اور ان خبیث الطبع مفسد اصحاب کی صحبت سے اجتناب جو سالکان راہِ سلوک کے حق میں زہر قاتل ہے اور اُس مقام کا بیان جو ان شیطان سیرت انسانوں اور جنوں کے شر و فتنہ سے محفوظ ہے۔ **فائدہ** اس سلسلے کا بیان کہ محو شدہ ماہیتوں کی موجودیت کے وجود و نمود کے عکس کو شیشے میں نظر آنے والے عکس کی طرح نہیں سمجھنا چاہیے کہ یہ عکس اُس کے نقش کے معنوں میں نہیں بلکہ اُس سے الٹ کے معنوں میں ہے **تنبیہ** ان خام اور ناتمام صوفیوں کی تردید میں جو اپنے زعم میں مکمل عارف بنے بیٹھے ہیں اور اپنی اس خام خیالی میں ان بزرگوں کو جنھوں نے دوئی کے متعلق لکھا ہے اور ہمہ از دوست کے قائل ہیں، وہ اُنھیں حقیقت آشنا نہیں سمجھتے اور کہتے ہیں کہ مسئلۂ توحید بڑا مشکل مسئلہ ہے۔ ان پہ یہ اچھی طرح واضح نہیں ہوا اور خلقیت ان کی نظر میں حائل رہی (خلقیت کو عبور نہ کر سکے) اور نہ فنائے کامل حاصل کر سکے اور نہ دوئی کی قید سے نجات پا سکے۔ **بیان** اس امر کا بیان کہ اس کتاب الموسوم (علم الکتاب) میں اگرچہ جابجا توحید کا اثبات اور ماسوی اللہ کے وجود کی نفی کی گئی ہے جو کلمہ طیبہ (لا الٰہ الا اللہ) کا نچوڑ ہے۔ لیکن خدا کے فضل سے کسی مقام پر کوئی ایسی بات نہیں لکھی گئی جو شرعِ دینِ متین کے خلاف ہو اور حفظِ مراتب کو ملحوظ نہ رکھے۔ اور اعتباری غیریت کا لحاظ نہ رہے۔ ہم نے شریعت کو عینِ حقیقت کہا ہے۔ اور حفظِ مراتب کو لوازمات میں شمار کیا ہے اور حقائقِ ممکنہ اور حضرت وجود کی مغائرت کو صراحتاً بیان کیا ہے۔ دیگر عارفانِ ذات میں سے کوئی بھی یہ امتیاز حاصل نہیں کر سکا۔ شریعت و حقیقت کے امتزاج کو کسی نے اس جامعیت سے بیان نہیں کیا۔ حق بات یہ ہے کہ عبد، عبد ہی ہے اور معبود، معبود۔ خالق و مخلوق ایک نہیں ہو سکتے۔ وہ رب الارباب ہے اور ہم خاک کے پتلے مٹی کے بیے **تنبیہ** اس امر کا اظہار کہ وحدت الوجود ہے کیا؟ اور اس صورتِ حال تک پہنچنے میں کیا یہ ساری بحث و تمحیص کیا چیز ہے؟ اس کا انجام کیا ہے؟ اسی کیفیت سے کیف و حال و سرور اور اُس کی معرفت سے مشرف ہونے کے بعد کیا ہوتا ہے اور کیا کیفیت ہوتی ہے؟ اور تقلیدی طور پر بغیر کسی کیف و سرور کے وحدت الشہود ہے کیا اور اس کے مشاہدے میں کیا دکھائی دیتا ہے اور پھر اس حالت کو پا لینے کے بعد اور ہمہ وقت یا مستقل طور پر اسی کیفیت کے مدام کا بیان اور ایک قدرت اور دیگر تمام مشہودات کے مشاہدے سے شرف یاب ہونے سے کیا مطلب ہے؟ اور توحید محمدی سے ظاہراً یا تقلیداً مشرف ہونا کسے کہتے ہیں اور اُس کی کیا خوبیاں اور اچھائیاں ہیں؟ اس حقیقت کا انکشاف کہ اُس بلند مرتبے پر مشرف ہونا کتنی بڑی سعادت اور کتنی بڑی

عظمت و بزرگی ہے ۔ **بیان:** مخلص پیروانِ محمدؐ کی تمام تر تحقیقات کا حق و صداقت پر مبنی ہونے کا بیان اور ان کی تمام تر تصنیفات کے جو شروع سے لے کر آخر تک توحیدِ محمدیؐ کی راوی ہیں، مطالب کی اصل حقیقت کی تہ کا کلی طور پر مفصل اور مجمل بیان، جو سب عوام و خواص کو ایمان کی دولت سے مالامال کرتے ہیں ۔ عین ایمان و اسلام کا بیان جو حقیقت کے اسرار و رموز کو روز روشن کی طرح ظاہر کرتا ہے اور شرعی امور کو ہر کسی کے دل میں بلا کسی شک و شبہ کے ثابت و استوار کرتا ہے، اور انسانی دل و دماغ سے دنیوی اعتبارات کو محو کر دیتا ہے ۔ اور وجودِ ذاتِ حق کا کما حقہٗ اظہار کرتا ہے ۔ اللہ تعالیٰ کی عنایت اور ہادیٔ مطلق کے فضل و کرم سے کسی مقام پر کوئی ایسی بات تحریر نہیں کی گئی جس میں حق کو نظر انداز کیا گیا ہو یا حفظِ مراتب کو ملحوظ نہ رکھا گیا ہو یا مرتبۂ اتحاد کی حقیقت کے اظہار میں امتیاز روا نہ رکھا گیا ہو۔ یا بندگی (عبودیت) کے آداب میں کوئی کمی واقع ہوئی ہو، یا شانِ الوہیت کے بیان کے لکھتے وقت تقاضائے بشری کے مطابق امکانی کوشش نہ کی گئی ہو یا آیاتِ قرآنی اور احادیثِ نبویؐ نقل کرتے وقت سندات کا دامن چھوڑ دیا گیا ہو یا عقل کی، (جو دلائل و براہین کے ثابت کرنے کا وسیلہ ہے) ڈور کا سرا چھوڑ دیا گیا ہو ۔ الغرض مومنین کی سب تحقیقات مستحکم ہیں اور بالکل حق و صداقت پر مبنی ہیں ۔ حق و صداقت کی ضمانت سے اُن کا بیان کلام الٰہی پہ اور اُن کا عرفان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات پر مبنی ہے یا تقریباً آیتِ سجدہ ۔ **بیان:** جاہلوں، غافلوں اور بد اندیش خبیث روحوں، شیطانی سیرت والے شرارت پیشہ لوگوں، بے انصاف مخالفوں، اور مخالفت سے بھرے ہوئے دشمنوں کا بیان اور لفظ "او" سے مراد ذاتِ حق تعالیٰ کے متعلق نئی اور تازہ تقریر یہ نہیں کہ جو کچھ موجودات میں ہے وہی کچھ ہے ۔ (ہمہ اوست)

انتیسواں وارد:

جس کا نام وعد اللہ ہے اپنے متن اور شرح سمیت ۔ **بیان** اس امر کا بیان کہ اللہ کے وعدے کے کیا معانی ہیں؟ اور اللہ تعالیٰ نے ہر کسی کے حق میں کیا وعدہ کر رکھا ہے؟ وعدے کے ایفا ہونے تک صبر و تحمل سے کام لیا جانا اور اس وقت کا انتظار کرنا چاہیے ۔ **بیان** رویتِ حق کے وعدے اور موت کے ذوق و شوق کا بیان ۔ چونکہ حق تعالیٰ نے مومنوں سے آخرت میں اپنے دیدار کا وعدہ کر رکھا ہے، لہٰذا صادقین کو چاہیے کہ وہ ہر لحظہ موت کے لیے تیار رہیں اور خدا نے چاہا تو اس حالت والے

بندوں پر خدا اپنے فضل و کرم سے موت کی مشکل میں آسانی کرے گا، اس لیے کہ وہ تو پہلے ہی اُس کے مشتاق تھے۔ برعکس غافلوں کے جو پہلے اس دنیاوی زندگی کے لالچ میں پھنسے ہوئے ہیں۔ ان ہر دو گروہوں اور ان دونوں امور کے اسباب و وجوہ اور موت کو یاد کرنے کے طریقے کا بیان اور اس کی بُری بھلی قسموں کا مختصر اور مفصل تذکرہ اکتریں (۱۷) وارد میں درج ہے جس کا نام یادِ موت ہے۔

تیسواں وارد:

جو قولِ سدید کے نام سے موسوم ہے اپنے متن اور شرح سمیت۔ بیان اس نام کی تحقیقات کا بیان اور اس کے اسرار و رموز۔ حقیقت کی کنہ کو بیان کرنے میں انسانی عجز کا بیان کہ انسانی قوتِ ادراک اسے پانے کی صلاحیت نہیں رکھتی (جیسی کہ وہ ہے) اس سلسلے میں جو کچھ ادراک بھی پایا جاتا ہے وہ وصفی لحاظ سے پایا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں انسانی دریافت کا کمال یہی ہے کہ وہ عجزِ بشری کو پالے اور نیز اس قسم کے اور تذکرے اور ان کا دلائل سے ثابت کرنا۔

اکتیسواں وارد: جو عبرت اولی الابصار کے نام سے موسوم ہے اپنے متن اور شرح سمیت۔ مشاہدہ کیفیات کے تغیر و تبدل سے اعتبارات کے فنا ہونے کا مشاہدہ اور حالات کے گزرنے کا مطالعہ اور عبرت حاصل کرنے کا بیان جس کی تین قسمیں ہیں۔ اگر ان امور کی بنا پر ہو جن سے طبیعت متنفر ہے تو یہ عبرت ہر بیہ ہے جس کا نام حُزن و تاسف بھی ہے، اور یہ روحِ انسانی میں زبردست طریق سے اثر انداز ہوتی ہے، اور اگر یہ طبیعت کو گوارا اور نرم و ملائم امور کے فقدان کی وجہ سے ہو تو یہ عبرت سلبیہ ہے جس کا نام پچھتاوا ہے۔ اور یہ حریص روح پر بُری طرح اثر انداز ہوتی ہے اور تیسری قسم ان مذکورہ بالا نفسانی اغراض سے نہیں بلکہ یہ حقیقت کو اُس کے اصلی روپ میں دیکھنے سے ہوتی ہے اور یہ عبرت پاک نفس صاحب بصیرت اصحاب کا حصہ ہے۔ دنیا اور اہلِ دنیا کی کیفیت کا بیان۔ دُنیا سے مراد نوعیت کے لحاظ سے من حیث المجموع محض تمام کائنات ہے۔ اور اہلِ دُنیا سے مراد جزئیات کے اعتبار سے اہلِ دُنیا کے وضع و نوع سے ہے۔ اس وارد میں ان ہر دو حیثیتوں کی کیفیت کا بیان۔ مادی اقسام کے فنا و زوال کے لحاظ سے بھی ہے جو ہر دم ان کے شاملِ حال ہے اور جوہر کے قیام و بقا کے لحاظ سے بھی، جو کبھی نیست و نابود نہیں ہوتا۔ تاویل اس آیتِ کریمہ کی شرح جس کا مطلب ہے کہ جو شخص کسی شخص کو بدون کسی فساد کے جو زمین میں اُس سے پھیلا ہو قتل کر ڈالے[۳۴] تو گویا اُس نے

تمام آدمیوں کو قتل کر ڈالا اور جو شخص کسی شخص کو بچالے گویا اُس نے تمام آدمیوں کو بچالیا۔ مطالعہ اس امر کا مطالعہ کہ پوری کائنات پر اس کے قائم و دائم ہونے کے لحاظ سے نظرِ غائر نہ رکھنی چاہیے بلکہ اس کی جزئیات پر دیدۂ عبرت سے نگاہ کرنی چاہیے اور اپنے فانی ہونے اور ہر چیز کے فانی ہونے کا مشاہدہ لازمی طور پر کرنا چاہیے۔ تحقیق بلاشبہ یہ دُنیا جس میں ماضی، حال اور مستقبل کی تمام آزاد خود مختار مخلوق شامل ہے، اس ذاتِ حق کی مظہر ہے جو قدیم بھی ہے اور لازوال بھی۔ ورنہ اللہ تعالیٰ جل شانہٗ کی صفتِ خالقیت میں حدوث لازم آتا ہے۔ اور جملہ عقائد میں سے ہے کہ اس کی ذات کے ساتھ کوئی نئی چیز قائم نہیں ہوتی۔ وہ فقط ذاتِ واجب ہے جسے ذاتی قِدم (قدیم ہونا) نصیب ہے چنانچہ اس ذاتِ واجب الوجود کی ہمیشگی کی صورت میں اس کی صفات میں بھی دوام ضروری ہے اس طرح صفات ذات کے مدام پر ذاتِ واجب الوجود کے ظہورات کا دوام بھی لازمی ہے وگرنہ صفات میں تعطل ثابت ہوگا۔ اہلِ اسلام کو عالم کے قدیم کہنے میں دشواری اور خرابی قدیم فلاسفروں کے اس نظریے کی بنا پر ہے کہ یہ آسمان یہ ستارے اور دیگر اشیا جنھیں حق تعالیٰ نے صراحتاً نیا بنایا اور ان کے تغیر و تبدل کی خبر بھی دی ہے، وہ اُنھیں قدیم اور لازوال سمجھتے ہیں اور یہ نبوت کے مسلک کے خلاف ہے، ورنہ یہ مطلق عدم و نیستی اور فنائے محض کلامِ الٰہی اور احادیث سے بھی ثابت نہیں ہوتا۔ اس امر کی شہادت نہ قرآنی آیات سے ملتی ہے اور نہ ہی عرش و کرسی کا حدوثِ زمانی کسی اور جگہ سے ثابت ہوتا ہے۔ پھر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اُس کا تعلق زمان سے ہو۔ اس قسم کی اشیا کا حدوث (نیاپن) محض ذاتی ہے نہ کہ زمانی۔ اور اس قسم کی باقیات کی فنا بھی ذاتی ہے، زمانی نہیں جیسا کہ گیارھویں وارد الموسوم سنتِ الٰہی میں اس کا ذکر آچکا ہے۔ اور اسی موضوع کے سوال و جواب پر تیسویں وارد میں جو اسی سے متصل ہے بحث کی گئی ہے۔ اور اڑتالیسویں وارد الموسوم مداولۃ الایام (ایام پر غور و غوض) میں اس کی مزید توضیح و تشریح کر دی گئی ہے۔ اور زمان اور اُس کے دیگر متعلقات پر اس فقیرِ بے نوا نے مفصل تحقیق و تدقیق ترپنویں وارد میں جس کا عنوان بصائر من الرب یعنی اللہ کی عطا کردہ بصیرتیں ہیں۔ اک نئے اسلوب سے کی ہے جس کے متعلق آج تک کسی نے لب کشائی نہیں کی۔

بتیسواں وارد:

جس کا نام تعلیم الاسماء ہے اپنے متن اور شرح سمیت۔ تعریف ذاتِ حق کے اسم کی تعریف اُس کے مرتبۂ صفات سمیت۔ ذات اور اُس کی صفات کا سراپا خیر و خوبی و بھلائی ہونا۔ اسمائے ذاتِ الٰہی

اور حضرت آدم علیہ السلام کو اپنے وجود کی ضمانت سے انہی تمام اسما کی تعلیم دینے کا بیان جس سے نائب خدا (خلیفہ) مکمل اتباعِ سُنت الٰہی سے خُلقِ خداوندی کو اپنا کر مجمع کمالات اور حاملِ جامع صفات بن گیا۔ نیز حق تعالیٰ نے حضرت آدم کو تمام اشیا کی ماہیت سے عقلاً کلی طور پر اور حواساً جزوی طور پر آگاہ کیا جس سے وہ تمام مفصل اور مجمل علوم اس کی ذات میں جمع ہو گئے۔ اور یوں آدم علیہ السلام کے علم کا وحدت وکثرت کے مفصل ومجمل معانی پر حاوی ہوجانا اور جزو و کُل کے معانی کا رلز پالینا۔ تقسیم تعلیم کو چار حصّوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ تعلیم ایجادی، تعلیم الفائی مع اپنی تمام اقسام کے، تیسری تعلیم قولی اپنی تمام شاخوں سمیت اور چوتھی فعلی تعلیم اپنی تمام جزئیات کے ساتھ۔ کشف حضرت آدم کا ملائکہ پر اسماء اور اشیا کی حقیقت کا انکشاف کرنا اور ملائکہ کا اپنی کم علمی کا اعتراف کرنا۔ بیان تقابل اسما اور ظہورِ اشیا کا باہمی تقابل اور علم وخبر اور اسما میں فرق نیز ان کی اقسام کی تفصیل یعنی اس وارد میں اسمائے الٰہیہ کا باہمی تقابل ہے مثلاً کہ وہ نافع یعنی نفع رساں اور ضارّ یعنی ضرر رساں بھی ہے، زندہ کرنے والا بھی ہے اور مارنے والا بھی وغیرہ وغیرہ۔ ان اسموں کے اختلاف کا ظہور ان اشیا کے مناظر میں ہے جو ان کے مظاہر ہیں۔ دنیا کی مختلف اشیا کا وجود متقابل وحریف اسماء کے تقاضا کے سبب سے ہے۔ چنانچہ اعتبارِ اسما موجودات کی ذاتی صفات کی بنا پر ہے۔ اور صفات کا امتیاز ان کے ذاتی مراتب کی حیثیت سے جو عینِ ذات ہیں۔ تفصیل ذاتِ پاک کے مراتب، اُس کی علوِّ شان وصفات و اسماءِ ذات و اسمائے الٰہیہ کے سائے کی تفصیل جو بنیادی حقائق اور موجودات کا مرتبہ ہیں۔ بیان اس امر کا بیان کہ ہر اسم الٰہی میں تمام اسمائے الٰہیہ پر مختصراً دلالت پوشیدہ ہے۔ تمام اسمائے ذات کے مراتب کے لیے جس کے اشتراک کی ضرورت ہے وہ خود ذاتِ پاک ہی ہے اور ان مراتب کی صفات ان کا نشانِ امتیاز ہیں۔ اور اسما کا یہی مرتبہ تمام موجودات کے حقائق کی اصل الاصل ہے اور اسما کی سنّت پر اشیا کے حقائق ہم جنس اور الگ الگ ہونے سے مرکب ہیں۔ پس اسماء کا ظہور ذات اور امتیاز صفات کے اشتراک سے ہے۔ دلالت کے اعتبار سے ہر اسم ذات تمام اسمائے ذات پر مختصراً دلالت کرتا ہے اور صفت مخصوصہ پر دلالت کے اعتبار سے خصوصی حیثیت پر تفصل سے دلالت کرتا ہے۔ اسمائے حسنیٰ کی شرح اور الفاظ کی تحقیق اور ذاتِ سبحانہٗ کے ننانوے ناموں کے معانی اور اُن کے اسرار و رموز کا کما حقہٗ انکشاف پہلے عربی زبان میں اور پھر اُن کے معانی کی وضاحت اور تشریح کی غرض سے فارسی زبان میں۔ تفصیل

اسمائے ذات میں سے ہر ایک کے باہمی تعلق کی تفصیل اور اُنھیں اپنانے اور حاصل کرنے کا طریق ۔ اور حضرت قبلۂ کونین (والد بزرگوار) (اللہ تعالیٰ ان کے باطنی لطائف سے ہماری مدد کرے) کے دستور کے مطابق ہر صبح وشام ان اسمائے ذات کے ورد میں دائمی تسلسل ۔ لطیفہ حاجت مند اور حاجت روا کے درمیان احتیاج وضرورت کے معاملہ کے بیان میں ایک دلچسپ بات عالم کے قدم وحادث ہونے پر فلسفیوں اور جاہل عالموں کے ڈگر سے ہٹ کر سوال وجواب کے ساتھ ۔ تحقیق نحویوں کے مطابق اسم کی تحقیق اور منطقیوں کے مطابق اس کی تقسیم اور صُوفیا کے نزدیک اس کے اصطلاحی معانی کا بیان ۔

بیان: اس امر کا بیان کہ مخلص پیروانِ اسلام کے نزدیک خالص اسمِ ذات میں سے کوئی اسم ذات جیسی کہ وہ ہے، صفات کے معائنہ ومشاہدہ کے بغیر نہیں۔ اور نہ کوئی اسم، ذات کی توجہ ونگاہ سے خالی ہے۔ اسمِ اعظم کا ذکر اور ان کی تحقیقات کے مطابق اسمائے ذات کے مراتب کی تفصیل کہ بعض اسما فقط اسما ہیں اور بعض اپنی اسمیت میں علمی تخصیص بھی رکھتے ہیں ۔ عام اور خاص اسما میں نسبتِ مطلق ہے کیونکہ اسم کا مرتبہ ذات مع صفات مطلق کا مرتبہ ہے خواہ وہ صفتِ عام ہو جو اپنے موصوف میں کسی دوسرے کی شرکت سے مانع نہ ہو اور دوسروں میں بھی پائی جاتی ہو۔ خواہ صفتِ خاص ہو، اور مرتبہ ذات کے علم کا مرتبہ خصوصی صفت وامتیاز سمیت ہے جو کسی دوسرے کی شرکت سے مانع ہوتا ہے اور دوسروں میں نہیں پایا جاتا۔ اور اسمائے ثلاثہ کا فرق جو اللہ، رحمان اور جامع ہیں ۔ بعض اسما ذات کے لحاظ سے اپنی تمام صفات اور سارے کمالات سمیت مکمل وجامع ہیں ۔ اور بعض اسما کامل ومستقل ہیں یعنی کہ ذات اپنی مستقل صفات کے ساتھ اور بعض اسما سالبیہ ہیں یعنی ذات اپنی سلبیہ صفات سمیت ۔ بعض اسمائے حسنیٰ ہیں جو صریحاً قرآن میں پائے جاتے ہیں اور بعض اسمائے توفیقیہ ہیں یعنی کہ صاحبِ شریعت سے سننے پر موقوف ہیں یا لازمی دلائل کی بنا پر کلام اللہ سے اُن کا استخراج کیا گیا ہے ۔ اسمائے ذات میں اور بھی ان گنت اور بے شمار اسما ہیں جن کی صراحت ووضاحت کی شرعِ دینِ متین اجازت نہیں دیتی جن کی عظمت وبزرگی اور مرتبے کی بلندی سب ان حیثیتوں کی مجموعی کمی بیشی کے مطابق ہے ۔

تینتیسواں وارد:

الموسوم "سراجِ وہاج" اپنے متن اور شرح سمیت ۔ بیان سراجِ وہاج سے مراد علوم حصولی ہے۔

علم حسی کو چاند اور علم عقلی کو سورج سے تشبیہہ دینا ہے۔ نیز محسوسات کو رات اور معقولات کو دن سے تشبیہہ وتمثیل دینا ہے ۔ علم العلم کا بیان کہ علم مرکب ہے اور اس امر کا اظہار کہ علم وجود کے معانی اور حضرتِ وجود کا آئینہ دار اور جلوہ گاہ ہے۔ اور وجود کے دو مرتبوں کی طرح یعنی چھپن جلنے کا منبع اور چھپن جلنے والی چیز ہے۔ اس کی بھی دو قسمیں ہیں۔ ایک علم مفرد یعنی ذات العلم یعنی حاصل مصدری معنوں میں فقط " دانست "، اور یہ علم ذات الوجود کا مظہر ہے، اُسی کا حصّہ بلکہ عیناً وہی ہے۔ دوسرا علم مرکب ہے جو مصدری معنوں میں اس دانست کو جاننا پہچاننا ہے۔ اور یہ مرتبہ ذات سے آگے وجود ظلّی کی دید و تماشا گاہ اور ذاتِ واجب الوجود کے صفاتی مرتبے میں مستقل و دائم اور اس مقام پر وجود کی موجودگی جو اس پہ زائد امر اور اس کی پہلی صفت ہے مشاہدہ میں آتی ہے اور اس علم کی امانت حضرت انسان کو جو فطرتاً جاہل ہے حق تعالیٰ کی طرف سے ودیعت کی گئی ہے ۔ علم کی طرح جہل کی بھی دو قسمیں ہیں۔ اس کے معنی ناپیدی و نیستی کے ہیں ۔ ایک جہلِ مفرد (سادہ) یعنی محض کسی چیز کا نہ جاننا جو ذات الجہل کہلاتا ہے اور یہ محض عدم کا حصّہ یا عیناً عدم ہے ۔ دوسرا جہلِ مرکب کہ نہ جانتے ہوئے بھی یہ سمجھنا کہ جانتا ہے اور ممکنات کا وہ حصّہ جو عدم و وجود کے معانی سے مرکب ہے ۔ علم مرکب کو مرکب اس لیے کہتے ہیں کہ وہ ترکیب کے اعتبار سے مفصل و مجمل علوم کا مجموعہ ہے اور جہلِ مرکب کو مرکب اس لیے کہتے ہیں کہ ترکیب کے لحاظ سے علم وجہل سے مرکب ہے ۔ اس امر کی وضاحت کہ علم وجہل کی یہ تفصیل نفس العلم اور نفس الجہل، علم وجہل کی حقیقت و ماہیت کی وسعت و ساخت کے اعتبارات کی اصل سے متعلق ہے جو دیگر تمام اصطلاحی اور غیر اصطلاحی مراتب پر مشتمل اور حاوی ہے ۔ نیز فلسفیوں کے فلسفیانہ اور اصطلاحی معانی اور علم کے بارے میں ان کی تعریف کہ علم کس چیز سے عبارت ہے اور علمِ مرکب کیا چیز ہے ؟ جہلِ بسیط کسے کہتے ہیں اور جہلِ مرکب کیا ہے ؟

بیان سورۂ احزاب کی اس آیت کریمہ کا بیان جس میں خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہم نے یہ امانت (یعنی احکام جو بمنزلہ امانت کے ہیں) آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں کے سامنے پیش کی تھی، سو اُنھوں نے اس کی ذمہ داری سے انکار کر دیا اور اس سے ڈر گئے اور انسان نے اس کو اپنے ذمہ لے لیا اور وہ ظالم ہے، جاہل ہے۔[۲۵] حقیقت انسان کے اس ذمہ داری کو اٹھانے اور آسمانوں اور زمین کے انکار کی حقیقت۔ علم العلم کے ظہور کی حقیقت اور کامل انسانوں میں حق و صداقت کا رجحان اور علم کا غلبہ اور اپنی بساط و قوت کے مطابق ذاتِ واجب الوجود

جہلِ ذاتی سے نکل آنا جو ہر حقیقتِ ممکنہ کا حصّہ ہے۔ کیونکہ قاعدہ کلیہ کے مطابق تو ممکنات کا ذات کے لحاظ سے اس ذاتی جہل سے باہر نکلنا محال ہے۔ ان کامل انسانوں کا جہل کے شائبے تک سے مکمل طور پر خالی ہو کر محض علم ہی علم بن جانا۔ علمِ حقیقی کا خیال کہ جہل کے داغ سے بالکل پاک و مبرّا ہے، وہ تو فقط ذاتِ حق تعالیٰ کا خاصہ ہے اور علمِ کثیر جو علمِ مطلق بھی ہے وجودِ مطلق ہی کا حصّہ ہے۔ نیز یہ کہ غیر مطلق موجودات (مقیدہ) کو تو علم قلیل ہی حاصل ہے اور ناقص انسانوں میں جہل، باطل اور تردد غالب ہوتے ہیں۔ اس قدر علم ان کے حصّے میں آیا جس نے ان کے جہل کو جہلِ مرکب بنا دیا اور اس مرتبۂ انسانی کی وسعتوں سے بھی نیچے لا کر سب سے نچلے اور ذلیل ترین طبقے میں پہنچا دیا۔

چونتیسواں وارد:

جس کا نام سبل السلام کے راستے ہے، اپنے متن اور شرح سمیت۔ بیان آیاتِ قرآنی کی روشنی میں نصائح کا بیان، ان کے فوائد اور رموز۔ حسن اخلاق کی تعلیم جو دُنیا میں اصلاح کرنے اور ضرر سے بچانے والا ہے اور آخرت کے لیے مفید ہے۔ خوش و خرم، خوشی، خوش گزران، خوش اختلاطی، یاری دوستی میں صاف دلی و وفاداری اور نفاق کی خلش کے بغیر صلح و محبت کی روش، اور سارے اخلاق کی آراستگی اور نفاق کی حقیقت وصورت کا بیان۔ اور ہر قسم کے غرور و تکبر، نخوت و نفرت سے ممانعت، خود غرضی، نفس کشی کے خلاف احکام اور رضا و رغبت سے خوشی بخوشی ہر کسی سے صاف دلی سے پیش آنے اور کسی سے مخالفت اور عداوت نہ رکھنے کا بیان۔ ان تمام امور کا آیاتِ قرآنی سے اخذ اور کلام الٰہی سے استنباط کیے جانے کا بیان گویا کہ اپنی طرف سے خود کچھ نہیں لکھا فقط متعلقہ قرآنی آیات کی وضاحت کی گئی ہے اور ان کے اسرار و رموز کو بڑے لطیف پیرائے میں بیان کیا ہے۔

بیان مخالفین اور منکرین کے لیے شرعی احکام کی دعوت اور اتمام حجّت کے لیے کلام اللہ سے اخذ کر کے احوال کا مفصل طور پر انکشاف اور مدلل جواب و سوال اور قرآنی شہادت اور گواہی سے محمدی ہدایت و سچائی کی تصدیق۔ احادیثِ نبویؐ اور آیاتِ قرآنی کا ایسا ارتباط، اور یہ مخصوص طریقہ اور انوکھا ڈھب، دیگر کتابوں کی عبارات و کلمات میں کہیں نظر نہیں آیا۔ اشعار اس امر کی اطلاع کہ مخلص مومنوں کے تمام تر مطالب اور علوم کی بنیاد صرف کلام الٰہی اور احادیثِ نبویؐ پر ہے۔ وہ کسی انکشاف و القا کو جو خلافِ کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہؐ ہو قابلِ اعتبار نہیں سمجھتے اور کبھی بھی

حضور پاکؐ کی اصطلاحات و محاورات کے علاوہ کوئی لفظ زبان پر نہیں لاتے۔ ان مقربانِ رسول اللہ اور خاصانِ حق کی خوش بختی اور سعادت کا تھوڑا سا بیان۔ تنبیہہ عوام اور جاہلوں کی دشمنی وعداوت کے بارے میں تنبیہہ۔ اور خواص و عارفوں کے جہاد و مخالفت کی حقیقت۔ سانپ سے ڈسی ہوئی انگلی کو کاٹ دینے کی مثال اور آفت رسیدہ عضو کی تدبیر۔ لوگوں کا دل دُکھانے، اُنھیں تکلیف پہنچانے اور جانداروں کو ایذا دینے سے ممانعت اور موذی جانوروں کو مارنے اور حلال جانوروں کو مناسب شرعی طریقے سے ذبح کرنے کا بیان۔ بیان عندال پسندی، نیک نیتی اور مخلوقِ خدا کے ساتھ مِل جُل کر رہنے کے طریق۔ بچھڑ جانے والے مرحوم احباب اور بالخصوص شیخ معین الدینؒ کی یاد اور اُن کا ذکرِ خیر بڑے حسرت ناک انداز میں کرنے اور باقی ماندہ احباب و اصحاب کے لیے خیر و سلامتی کی دعائیں کرنے کا بیان۔

پینتیسواں وارد:

جس کا نام احسن التاویل ہے، اپنے متن اور شرح سمیت۔ بیان اس امر کا بیان کہ ہر کلام کا ایک ظاہر ہوتا ہے اور ایک باطن۔ ظاہر کی تفصیل تو الفاظ یا جسمانی شے کے متماثل ہے۔ اس کے باطن کی تشریح یوں ہے کہ کسی بھی معقول و روحانی بات کے معانی و مطالب لفظوں کی شکل میں سامنے آنے سے پیشتر لوگوں کے ذہن میں موجود ہوتے ہیں۔ پھر صرف و نحو، فصاحت و بلاغت، واقعیت سے مطابقت، سامع کی استعداد اور حق گوئی کے اعتبار سے اس ظاہر و باطن کے فرقِ مراتب کا پتہ چلتا ہے۔ اظہار اس امر کا اظہار کہ اپنے کلام کی حقیقت اور کنہ کو تو متکلم خود ہی جانتا ہے، اس میں سے جس قدر دوسروں کو آگاہ کرتا ہے وہ تفسیر شمار ہوتی ہے اور سننے والے یا دیکھنے والے ان حروف و الفاظ کو سمجھ کر اپنی اپنی سمجھ بوجھ اور فہم و ادراک کے مطابق اُن سے مطالب اخذ کر لیتے ہیں اور پھر وہ اس کی جو تعبیر کرتے ہیں اُسے تاویل کہتے ہیں۔ الٓمٓ قرآنی مقطّعات میں سے "الم" کے معانی کا بیان۔ دیگر علما کے فرمودات یا نوشتہ جات کے مطابق اور یا پھر ان رموز و نکات کا انکشاف الہامِ ربانی اور تعلیمِ آسمانی کے موافق بڑے احسن انداز میں۔ تاویلات بعض آیات بعض آیاتِ قرآنی اور حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معاملے کی تاویلیں۔ یعنی تاویل و تفسیر کی حقیقت اور ان کے باہمی فرق کا بیان۔ بعض آیاتِ قرآنی کی تاویلات اور ان کے

ظاہری الفاظ کی مناسبت اور مطابقت سے ان کے باطنی معانی کا بیان ۔ حضور سید المرسلین (ان پر خدا کی تمام رحمتیں اور مکمل سلامتیاں ہوں) کی حق تعالیٰ سے بات چیت، نیز اسی سلسلے یعنی دیدار و تجلیٔ ذات کے لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اپنے رب سے گفتگو ۔ دونوں کا فرق اور تمام و کمال ہوتے میں حضور خاتم النبیینؐ کے مرتبے کا حضرت موسیٰ کلیم اللہ کے مرتبے سے خصوصی امتیاز ۔ پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان اسرار و رموز کی جہاں تک نقاب کشائی ہوئی اُنھیں سپردِ قلم کیا ۔ بیان اس امر کا بیان کہ عوام کی رُشد و ہدایت اور فیض رسانی کے لیے مخاطب کے مرتبے اور سامع کی استعداد کے درجے تک نیچے آجانا نہایت ضروری ہے، اور اللہ کے کامل اور مرجعِ خلائق بندوں نے یہی وطیرہ اختیار فرمایا ۔ ایک درخشاں بیان اس سلسلے میں کہ نبوت کی نسبت میں مراتب و اعتبارات کا اثبات ہے ۔ نزولی مقام و حالت میں بھی ان کا رُخ خلق ہی کی طرف رہتا ہے اور ولایت کی نسبت میں امتیازات کی تردید اور اعتبارات کی نفی ہے کہ مقامِ عروج و کیفیت میں ان کا رُخ حق تعالیٰ ہی کی طرف ہوتا ہے ۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معاملے میں ان کی نسبتِ نبوت غالب اور نسبتِ ولایت مغلوب تھی ۔ اور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلّم میں یہ دونوں نسبتیں تاحدِ کمال تھیں مگر پورے اعتدال کے ساتھ ۔ فائدہ منصبِ نبوت جو اللہ ہی کے فیض و کرم سے ہے ۔ حضرات انبیا علیہم السلام میں کوئی فرق و امتیاز نہیں، لیکن انسانی شخصیتوں میں امکانی حیثیتوں کے راستے ذاتی اہلیتوں اور استعدادوں کے اختلافات کی وجہ سے ان کے رتبوں اور منصبوں میں باہمی فرق و امتیاز موجود ہے ۔ بیان خواجہ حافظ شیرازی کے شعر کی اصل مراد اور اس میں بے جا دخل اندازی کا دفعیہ ۔

چھبیسواں وارد:

الموسوم شفاء للناس اپنے متن اور شرح سمیت ۔ شفا کا ذکر اور قلبی امراض اور غافلوں کے دلوں میں وہمی مادہ کے غلبے اور عقلی صحت کے زوال کے باعث دُنیا و مافیہا سے قلبی تعلق کے امراض کے پیدا ہونے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے رسولوں کو بھیجے جانے کا بیان جو قلبی امراض کے ماہر طبیب ہیں اور اُن کا احکامِ خداوندی کے تحت ان عوام اور غافلوں کو حفظانِ صحت اور علاج معالجہ کے لیے اوامر و نواہی کی ادویات سے علاج کرتے ہیں ۔ نیک کام کرنے، اور خلافِ شرع کاموں کے نہ کرنے کی تلقین کرتے ہیں اور یوں ظاہری طبیبوں کی طرح لوگوں کی اصلاحِ حال پر مامور ہوتے ہیں ۔ یہ باطنی طبیب ہیں جو کبھی یونانی طبیبوں کی

طرح اور کبھی ہندی طبیبوں کی مانند علاج بالضد کرتے ہیں اور اپنے علاج معالجے اور اس کی اشاعت و ترویج میں اسی علاج بالضد کو ترجیح دیتے ہیں۔ اور اکثر و بیشتر اپنے مجربات کی شہادت سے کام لیتے ہیں۔ **بیان** اس امر کا بیان کہ دُنیا دار لوگوں کا اخلاق کسی سعی اور جدوجہد کے بغیر بالکل حیوانات کی طرح اپنے نفس، طبیعت کی خواہشات کے مطابق ہوتا ہے اور اہل اللہ کا اخلاق ان کی ذاتی سعی و کوشش کی بنا پر بالکل معقول و منقول کے موافق و مطابق ہوتا ہے۔ آہستہ آہستہ اس دِقّت اور مشقت کا احساس جاتا رہتا ہے، اور وہ ان کی فطرتِ ثانیہ بن جاتی ہے۔ **بیان** شریعت مصطفویؐ کے تجویز کردہ نسخے کے مطابق علاج کی درستی اور مزاج کی اصلاح کا بیان۔ کیونکہ وہ نسخہ باقی تمام اقوام و مذاہب کے تجویز کردہ نسخوں کو منسوخ کر دینے والا ہے اور محمدیؐ طریقے کے مطابق مرض کی تشخیص جو باقی تمام تشخیصوں کو ختم کر دیتی ہے اور ایمان کی راہِ راست کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔ اس کے بعد پھر اس نسخے کو تبدیل کرنا کسی کے لیے بھی جائز نہیں سوائے اولیائے کرام کے جو اس نسخے کے اجزا اور شربت کی مقدار میں معمولی ردّ و بدل کر سکتے ہیں اس لیے کہ وہ اس حکیم حاذق کے نسخہ نویس اور سعادت مند شاگرد ہیں۔ ان عالی مرتبہ حضرات کے مقبول و عزیز ہونے، اور ان عارفانِ ذات کو جو عالمانِ حق بھی ہیں بنی اسرائیل کے انبیاء سے تشبیہ دینے کی وجہ کا بیان۔ **تعلیم** جسمانی طب کے مقابلے میں روحانی طب کی تعلیم اور سادہ و پیچیدہ امراض کے علاج معالجہ کے لیے اسباب، علامات، نظریات، عملیات اور معالجات کا بیان۔ سادہ اور پیچیدہ بیماریوں کی تشخیص، نسخہ اور دوا، غذا اور پرہیز کا تجویز کرنا، نبض و قارورہ کا دیکھنا تاکہ باطنی صحت کے محافظ آسانی سے ان قلبی امراض کی تہ تک پہنچیں۔ سالکانِ راہِ مصطفیؐ ضروری طور پر ان کے اوصاف، اخلاق و عادات و حالات کی خوب چھان بین کریں۔ ان کی کیفیت کے تمام اسباب و علامات کو سمجھیں۔ صالح اور فاسد خلطوں کے فرق کو جانچیں۔ مادی اور سادہ امراض میں امتیاز کریں۔ ان کے علاج معالجے کی مناسب دواؤں سے آگاہ ہو کر اُنھیں صحیح طریق سے علاج معالجے میں کام لائیں، اور تشخیصِ مرض میں غلطی نہ کھائیں تاکہ دنیوی صحت و سلامتی کے ساتھ ساتھ اخروی فلاح و بہبود بھی نصیب ہو۔ اُنھیں فوری اور دیرپا شفا نصیب ہو اور بہمہ وجوہ خیر و عافیت حاصل کر کے وہ عاقبت میں بھی نجات پائیں۔ **بیان** اس امر کا بیان کہ جسمانی امراض کی طرح جو مرکب اور سادہ ہوتی ہیں، قلبی امراض کی بھی دو قسمیں ہیں۔ ایک جبلّی جو پیدائشی بُرے اخلاق کی وجہ سے موجود ہوتی ہے، اُس کا علاج بڑی مشکل سے ہوتا ہے۔ اس

کیفیت کی اصلاح سر توڑ جدو جہد اور کوشش سے کی جاتی ہے۔ دوسری قسم عارضی ہے جو بُری صحبت اور بُرے کاموں میں بکثرت مشغول رہنے سے پیدا ہوتی ہے۔ تھوڑی بہت تدبیر سے اس کا علاج ہو سکتا ہے۔ یہ مرض بالکل زائل بھی ہو سکتا ہے۔ **بیان** گرم اور سرد مزاج، مرطوب و خشک مزاج والوں کے بُرے اور بھلے اخلاق کے اوصاف کا الگ الگ مفصل بیان۔ ان مذکورہ بالا رکنوں، مزاجوں، خلطوں اور کیفیتوں کے تمام اخلاق و اوصاف میں باہم مناسبت، مشارکت اور خصوصیت۔ ان میں سے کسی ایک کی کمی یا بیشی کا نقصان اور ان سب کے اعتدال سے اخلاق کا معتدل ہونا اور یوں اوصافِ حمیدہ کی جامعیت پر استقامت پانا۔ **تفصیل** نفس حیوانی اور روحِ انسانی کے کاموں کی تفصیل اور ہر ایک کے الگ الگ آثار اور نشانیاں۔ **بیان** اس امر کا بیان کہ ان چار ظاہری خلطوں کی طرح چار باطنی خلطیں بھی ہیں۔ پہلی خلط علم ہے جو بمنزلہ خون کے ہے۔ دوسری غیظ و غضب جو صفرا کی مانند ہے۔ تیسری شہوت جو بلغم کی طرح ہے۔ چوتھی وہم جو بمنزلہ سودا کے ہے اور پھر انسانی بدن میں چار ظاہری خلطوں کی طرح ان چاروں باطنی خلطوں کے ضروری ہونے کا بیان۔ ہر خلط کے حدِ اعتدال سے بڑھ یا بچھڑ جانے کے نقصانات اور ہر خلط کے حدِ اعتدال تک رہنے کے فوائد و برکات **تمثیل** فرائض اور واجبات کو غذا سے تشبیہ دینے کی مثال، پھر حرامِ مطلق کو زہرِ ہلاہل سے اور مکروہات کو خواب آور ادویات اور دیگر ضرر رساں اشیا اور جو کچھ جائز ہے اُسے پھلوں، میوہ جات اور ساگ پات ترکاریوں سے تشبیہ دینا، جیسے سُنت کے مطابق نوافل اور منقول و مقبول دعاؤں کو غذائے دوائی کہنا اور دینِ محمدیؐ کے معتبر و مستند اکابرین کے دیگر اوراد و وظائف جو اُنھوں نے کنایتہً یا اہتمام و التزام کر کے قرآن و حدیث سے اخذ کیے ہیں دوائے غذائی کا نام دینا۔ اور پھر لگے پچھلے بزرگانِ دین کے افعال و اعمال کے نمونے جو اُنھوں نے سالکانِ راہِ حقیقت کے نفع کے لیے ان کے سامنے پیش کیے ہیں۔ اور وہ خلافِ شریعت بھی نہیں، وہ دوائے مطلق کی مانند ہیں جس میں غذائیت نہ ہو۔ **بیان** اس امر کا بیان کہ مریض کے مزاج کی کیفیت دریافت کرنے کے رہنما تو خود اُس کے قول و فعل ہیں۔ اس کے اقوال بمنزلہ قارورہ کے ہیں۔ اس کی باتوں کے رنگ ڈھنگ سے باطنی کیفیت معلوم ہو جاتی ہے۔ اونچے نیچے اور متوسط کلمات قارورہ کے تہ نشین، اوپر آجانے والے اور لٹکے ہوئے رسوبات کی طرح ہوتے ہیں اور افعال بمنزلہ نبض کے ہیں جس کی حرکات سے ہر شخص کی حقیقتِ حال کا پتہ چل جاتا ہے، اور وضع قطع اور گفتگو بمنزلہ قیافہ و رنگ روپ کے

ہیں ۔ **بیان** نبض و قارورہ کی اقسام کا بیان ۔ **اظہار** اس امر کا اظہار کہ باطنی طبابت اور قلبی علاج معالجے کا یہ نیا طریقہ اور ڈھنگ بھی اک خاص فن ہے جو مجھ ناچیز ہی سے مخصوص ہے جس نے اس نئے علم کی نئے سرے سے بنیاد رکھی ہے ۔ **بیان** ان کے اسباب و رعایات کے ترک کرنے کا بیان یعنی اسبابِ ظاہری کا ترک کر دینا یا مومن و متوکل انسانوں کا ان کو ملحوظِ خاطر رکھنا۔ درویشوں کو ان ہر دو شقوں میں سے کونسی شق اختیار کرنی چاہیے اور درویشانِ خدامست اور سالکانِ راہِ حق کے لیے کونسی شق مناسب اور شایانِ شان ہے اور قطعی طور پر ترک کر دینے کے لائق کیا کچھ ہے ۔ کیونکہ اس سلسلے میں عزیزوں کو اختلاف ہے ۔ بعض کا خیال ہے کہ درویش کو کلی طور پر ظاہری اسباب کو ترک کر دینا چاہیے ۔ اُنھیں ان دنیوی تعلقات سے ہرگز کوئی بگاڑ نہیں ہونا چاہیے ۔ اور بعض یوں سمجھتے ہیں کہ حکمتِ خداوندی کے مظاہر سے ہاتھ ہرگز نہیں کھینچنا چاہیے ۔ اسباب ظاہری کو بھی ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے ان کی ڈور کو ہاتھ سے نہ چھوڑنا چاہیے ۔ ان دونوں امور کی جو حقیقت مجھ پر واضح ہوئی ہے ۔ اس کی تفصیل کو بڑی شرح و وضاحت سے بیان کر دیا گیا ہے چونکہ جزئیات کو ایک ایک کر کے بیان کرنا مشکل ہے ۔ لہٰذا متن میں صرف مرض کی صورت میں اس کی دوا کو اختیار کرنے اور اس کے چھوڑ دینے پر اکتفا کی گئی ہے ۔ **بیان** ترک کی قسموں کا بیان جو چار ہیں یعنی حکمی ترک، ظاہری ترک ۔ باطنی ترک اور حقیقی ترک ۔ ان میں سے ہر ایک کی تفصیل ۔ ساتھ ہی سوال و جواب کی شکل میں بعض شکوک و شبہات کا دفعیہ ۔ ترکِ اسباب رعایت کے بالمقابل ۔ رعایت کی بھی چار قسمیں ہیں ۔ رعایت حکمی، ظاہری، باطنی اور حقیقی رعایت ۔ ان میں سے ہر ایک کی تفصیل ۔ **فائدہ** ان مبتدی تارکین کی حالت کا بیان جو غرور و نخوت میں پھنس کر طرح طرح کے توہمات میں مبتلا ہو جاتے ہیں ۔ ترک کی انتہا پر پہنچنے والوں کے نیک انجام کا بیان جو ترک کی حقیقت تک پہنچ جاتے ہیں اور فنا فی اللہ ہو کر باقی باللہ ہو جاتے ہیں ۔

نصیحت سالکانِ راہ میں سے ہر کسی کی بصیرت اور حالات کی مناسبت سے نصیحت ۔ اور ہر کسی کے مقام کے شایان، اُس کی صوابدید اور بہبود کا بیان ۔ **بیان** قرآن شریف کی اس آیت کریمہ کہ اے رب ہمارے ہم پر ایسا کوئی بار (دُنیا یا آخرت کا) نہ ڈالنا جس کی ہم کو سہار نہ ہو۔ کا عربی زبان میں بیان اور یہ زیادہ تر اسی ورق کی عبارت سے ملتا جلتا ہے جو اس بندۂ ناچیز نے خواب میں دیکھا اسے یاد رکھا، اور کسی کمی بیشی کے بغیر جوں کا توں لکھ دیا ۔ **بیان** طاقت کی حقیقت کا بیان جو

انسان میں قدرتِ خداوندی کا ظہور ہے اور بوجھ (گناہوں کے بوجھ) کے احتمال کی حالت میں ضعف و ناطاقتی کے اعتبار سے جلالی تجلیات ہیں۔ مافوق الطاقت اور اسی طرح ضعیف و ضعیف ترین کا پورا پورا لحاظ اور اُس بوجھ کو اُٹھانے کی طاقت کے نہ ہونے کا بیان۔ اور پھر اسی طریق سے جمالی تجلیات کا بیان کہ جمال کی کثرت بھی ضعیف انسان کے لیے جلال ہی ہے۔ اور دنیوی اور اخروی زندگی میں بھی ان کیفیات کے حال اور ان تجلیات کی سہار اور برداشت کا بیان۔ فائدہ اس امر کا بیان کہ جلالی تجلیات اور ظہورِ جلال کی نسبت جمالی تجلیات اور ظہورِ جمال دُنیا و آخرت دونوں میں کہیں زیادہ ہے۔
تنبیہ اس سلسلے میں تنبیہ کہ جن بندوں کو حق سبحانہ تعالیٰ بلا و مصیبت میں صابر اور راضی برضا رکھتا ہے تو پہلے تو تائیدِ ربانی اور امدادِ آسمانی سے اُنھیں ایمانی قوت اور اپنی محبت کی فروانی سے سرشار کر دیتا ہے، اور اپنے سے نسبت خصوصی ہونے کے بل بوتے پر اپنی انتہائی رحمت اور فضل و کرم سے اُنھیں جمال و جلال خداوندی کی برداشت عنایت فرماتا ہے کیونکہ تجلیاتِ ذات ان کی ذات کی قوتِ برداشت سے باہر ہوتی ہیں، اور فوق الطاقت مصائب میں خدائی مدد اور اعانت کے بغیر تو سبھی لوگ عاجز ہیں اور کوئی انسان بھی جلالِ الٰہی کے مقابلے کی تاب نہیں رکھتا۔ عوام و خواص اور خاص الخاص بندوں کے مقامات و مراتب اور درجات میں فرق جو ان کے مقام و مرتبے کی مناسبت سے الگ ہوتا ہے۔
بیان اس امر کا بیان کہ کسی تارک اسباب سے کبھی بھی کسی صورت میں مکمل طور پر مراعات اسباب ترک نہیں ہوتیں اور کبھی ان اسباب میں گرفتار سے ترک کی قطعاً کوئی صورت نہیں ہوتی۔ لہٰذا دیکھنا یہ ہے کہ اس لفظ تارکین کا اطلاق کن لوگوں پر ہوتا ہے اور اسباب میں گرفتار کا اطلاق کن لوگوں پر۔
بیان اس حدیث شریف کی وضاحت کا بیان کہ عملوں کا فیصلہ نیت پر ہے[۵]۔ اس کی حقیقت کا انکشاف اور عمل کی تعریف جو ارادۃً "حرکت یا ارادۃً" ساکن رہنے کا دوسرا نام ہے اور اس نیت کی اچھائی یا برائی کی نسبت سے وہ عمل بھی اچھا یا بُرا ہوتا ہے۔ حاشیہ آرائی نیت کی حقیقت و اصلیت کا بیان جو تمام نیتوں کا منشا و مبدا ہے۔ اور دیگر شاخوں کی کیفیات کی تفصیل جو اس کی کلیات یا جزئیات ہیں۔

سینتیسواں وارد:

جس کا نام لقاءُ اللہ ہے، اپنے متن اور شرح سمیت۔ بیان مومنوں کے لیے دیدارِ الٰہی

کی اُمید اور توقع ایک خاص ڈھب سے ممکن الحصول ہے۔ ایسا نہ ہو کہ کسی ممتنع طریق سے خواہش و درخواست کر کے مایوس ہو کر اس کی تصدیق میں خلل پیدا کریں۔ اور ناامیدی و مایوسی کے باعث اس سے محروم رہ جائیں۔ ان مشکلات اور شبہات کے دفعیہ کا بیان جو رؤیتِ حق کے اقرار کے لیے لازم ہیں۔ اور عالمِ غیب کے احکام اور اس کی لطافتوں کا اس عالم کی کثافتوں سے جُدا ہونے کا بیان۔ عالمِ خواب کی تمثیل سے حقیقت حال کا انکشاف۔ **دیدار کی حقیقت** رؤیتِ حق کی حقیقت اور اللہ جل شانہٗ کے دیدار کی ماہیت اور ذات عزوجل کی تجلی کا بیان کہ وہ ہے کیا؟ اور وہ عارفانِ حق کو اس عالمِ شہود میں کیسے میسر ہوتی ہے اور اُس عالمِ آخرت میں سارے مومنوں کو وہ دیدار کیسے نصیب ہوگا اور کس طرح وہ پاک ذات اس دُنیا والوں کی نظروں سے پوشیدہ ہے اور اُس عالمِ آخرت میں کس حیثیت سے پوشیدہ رہے گی۔ آخرت میں دیدار کے اس مسئلے کے اختلاف کا بیان جس کے اکثر و بیشتر لوگ منکر ہیں اور کچھ تھوڑے سے بہت اقراری ہیں اور جو ہر مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم (ان پر خدا کی رحمتیں اور سلامتیاں ہوں) کی حقانیت کا جامع بیان۔ **فائدہ** اس امر کا بیان کہ انکار و اقرار کرنے والے ان دونوں گروہوں کے اختلاف میں اسلامی نقطۂ نگاہ سے فرق ایسے ہی ہے جیسے متکلمین اور حکما کا وجود کے موضوع بحث پر اختلاف ہے۔ وہ بات کی حقیقت کو نہ سمجھتے ہوئے باہم بحث و مباحثہ میں لگے اور لڑائی جھگڑے میں جُٹے رہتے ہیں۔ **تحقیق** دیدارِ ذات، اُس کے دیکھے جا سکنے اور دیکھنے والے کے سلسلے میں تحقیق اور لغت و محاورہ کی رو سے انہی معنوں میں مستعمل دیگر الفاظ کا بیان، ظاہری اور باطنی آنکھوں کے دیکھنے میں فرق اور ان کے استعمال کے مواقع کا بیان۔ **تمثیل** دیکھنے اور نہ دیکھنے کے اطلاق کی صداقت کی تعبیر و تمثیل۔ نیز انسان کا مختلف حیثیات و کثیر التعداد اعتبارات کے دیکھنے یا نہ دیکھ سکنے کا بیان **خلاصہ** خلاصہ کلام یہ کہ رویت حق سے انکار ہرگز نہیں کرنا چاہیے۔ لقائے الٰہی کا اُمیدوار رہنا چاہیے، اور نہ مادی اشیا اور ممکن الوجود اجسام کے دیکھنے پر کھنے والوں کی طرح اللہ جل شانہٗ کے دیدار کا قائل ہونا چاہیے۔ **تحقیق** تجلّی کی تحقیق اور اس کی مختلف اقسام کا بیان کہ ایک وجدانی تجلی ہے اور ایک مشہودی۔ پھر ان ہر دو اقسام کی الگ الگ قسمیں یعنی وجدانی تجلّی، حالی ہوگی یا کشفی اور مشہودی تجلّی، نوری ہوگی اور یا ظاہری۔ ہر قسم کی الگ الگ تفصیل اور ان پانچ لطائف کے انوار کا بیان۔ **بیان** سالکانِ راہِ حق کی اصطلاح کردہ تجلیات کی اقسام کا بیان اور ذاتی صفاتی اور فعلی تجلّی کے سلسلے میں تحقیق و تدقیق

اور دلائل و براہین سے دیدارِ ذات کا اثبات اور منکروں کی دلیلوں کی تردید۔ اُن کے سوالات کا جواب اور اُن کی مشکلات کا حل۔

اڑتیسواں وارد:

الموسوم بہ قول لیّن۔ اپنے متن اور شرح سمیت۔ بیان اس اسم گزاری کی وجہ۔ مختصر انداز میں فنا و زوال کا بیان۔ حق جل شانہٗ کی قوتوں کے لامتناہی ہونے کا بیان۔ کثیر التعداد موجودات کے ذاتی مناصب، اضافی اعتبارات، امتیازی نسب اور علمی اضافات کی صورت میں مختلف مراتب کا ذکر۔

انتالیسواں وارد:

الموسوم بہ دارالسلام، اپنے متن اور شرح سمیت۔ بیان بعض آیات قرآنی کے معارف کا بیان، اور اہلِ عرفان کے طرز پر ان کی تاویلات اور آیت قرآنی اور حدیث نبویؐ کی رُو سے اُس کا نتیجہ اور شہرِ علم کے دروازے حضرت علیؑ کے توسل کے واجب ہونے کا بیان۔ بیان۔ اور اہلِ بیت (ان پر خدا کی رحمتیں ہوںؑ) کی محبت کا بیان اور واجب التعظیم صحابۂ کرام (ان سب کو خدا کی خوشنودی حاصل ہو) کی عزت و حرمت کا بیان اور کمال فصاحت و بلاغت اور پوری مہارت و دسترس سے ان میں سے ہر ایک کی تعریف و توصیف کسی قسم کی خود غرضی و خودی و خود بینی کے شائبہ کے بغیر۔ امرِ واقعی کا اظہار اور خدا و رسول کی عین رضا اور سچے مومنوں کے مذہب و مسلک کے مطابق ہر کسی کے مرتبہ و شان کا بیان۔ بیان اللہ تعالیٰ کی رہنمائی اور رسول مقبولؐ کی ہدایت کے مطابق خلفائے راشدین (خدا ان سب سے راضی ہو) کے مراتب و مقامات کا مفصل بیان اور معصوم و مطہر ائمہ اور اہلِ بیتِ رسولؐ (ان سب پر خدا کی رحمتیں ہوںؑ) کے فضائل اور عالی مناصب کا بیان۔ ہر حقیقت کا بلا رُو رعایت اور بغیر کسی تعصب و عداوت کے منصفانہ انکشاف۔ آیاتِ قرآنی اور احادیثِ نبوی سے اقتباس کر کے بعض خصوصیات اور عنایاتِ ربانی کے شکر کا اظہار۔ گمراہوں کی افراط و تفریط (حدِ اعتدال سے متجاوز ہونے) سے خبردار کرنا، اور راہِ راست کی طرف دعوت دینا۔ اصحاب و آلِ پیغمبر کی سعادت۔ قدردانی و حق شناسی اور آداب کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے ان کے باہمی حفظِ مراتب کا ذکر ——— اسی سلسلے میں تنبیہہ کہ بعض ضعیف الاعتقاد لوگ یہ گمان رکھتے ہیں کہ سرداری و امامت ایک وہمی و خیالی امر ہے جو یقینی طور پر ثابت نہیں ہو سکتا۔ یہ بات بالکل غلط اور

بے بنیاد ہے اور اس دیباچہ میں امر واقعی اور حق بات کا بیان، اور سادات کے سلسلے میں آداب بجالانے کے طریقے کا بیان جو مسلمانوں اور رسول اللہؐ کے امتیوں کے لیے لازم ہے، اور اس مقام و موضوع سے متعلق دیگر مناسب باتوں کا ذکر۔ ساداتِ محمدیہ کے شرف و عظمت اور اس طریقے پر چلنے والوں کی بزرگی و شرافت کا بیان۔ تحقیق امامت کا منصب جو اللہ تعالیٰ کے قرب کے مناصب میں سے ہے نبوت سے نچلی اور ولایت سے اونچی سطح پر ہے۔ اکثر لوگوں سے یہ حقیقت چھپی رہی ہے، ساداتِ بنی فاطمہ میں اس فیض کے جاری رہنے کا بیان، اپنی تمام تر خصوصیات و لوازمات کی تفصیل سمیت۔ بیان سیادت یعنی سرداری و امامت کی حقیقت کا بیان کہ اس کی اصلیت کیا ہے، اور یہ سعادت و خوش بختی کیسے نصیب ہوئی۔ ایک ظاہری سیادت ہے جو فقط حسب نسب اور فرزندیت کے اعتبار سے ہے۔ دوسری سعادت باطنی ہے جو خاص قرب کا دوسرا نام ہے جس کی تعبیر امامت سے کی جاتی ہے۔ فائدہ عظمت و کمالات سے مشرف آل و اصحاب پیغمبر علیہ السلام میں مکمل اتحاد و قلبی صفائی و یگانگت کا پایا جانا، بعض کی ہر لحاظ سے بعض پر فضیلت ثابت کرنا اور بعض کے نقص نکالنا اور کم پایہ ثابت کرنے کی کوشش کرنا سراسر جہالت و گمراہی ہے اور اپنی بدطینتی اور خباثت کا اظہار ہے۔ سچے اسلام کی طرف دعوت اور کتاب و سنّت کی روشنی میں زیادہ صائب اور صحیح راہ کی طرف رہنمائی اور قرآنی آیات سے اقتباس کر کے محمدیؐ حقانیت کا ذکر و بیان۔ تحقیق لفظ آل و اہل بیت کے سلسلے میں تحقیق اور اُن کے معنوی اور عرف عام میں مشہور معنوں کا بیان اور لفظ بیت کے اعتبار میں چند وجوہ سے فرق۔ نکتہ اس امر کی رمز کہ بیٹا کسی شخص کی ذات کا مظہر ہوتا ہے اور بیٹی اس کی صفات کی مظہر ہوتی ہے، اور یوں امام حسن و حسین رضؓ (ان پر خدا کی رحمتیں ہوں) کی افضلیت اور بزرگی کا بیان۔ تحقیق لفظ تحیۃ کی تحقیق جس کے معنی سلام کے ہیں اور تحیّات اس کی جمع ہے۔ تنبیہ اس بیان کے سلسلے میں تنبیہ کہ بعض کے نزدیک صلوٰۃ و سلام کا اطلاق صرف جنابِ رسالت مآب سے مخصوص ہے مگر اسی شمول دلی تعلق و اتباع سے حضور پاکؐ کی آل و اصحاب کے لیے بھی جائز ہے اور بعض کے نزدیک جس طرح رسولِ مقبولؐ کے لیے اس کی آزادی ہے، اسی طرح ائمہ کبار اور آل اطہار کے لیے بھی اُس کے استعمال کا اختیار و اجازت ہے اور اس سلسلے میں امتِ محمدیہ کے مخلصین کے معمول کا بیان اور اس مقصد کی مفصل تحقیق و تدقیق۔

چالیسواں وارد:

الموسوم "بشیر و نذیر" اپنے متن اور شرح سمیت ۔ دعوت بشارت دینے اور ڈرانے دھمکانے کے سلسلے میں قرآنی آیات سے اقتباس کرکے توبہ و استغفار کی دعوت اور لفظ بشارت (خوش خبری دینا) اور اِنذار (ڈرانا دھمکانا) کی تعریف مزید تحقیق کے ساتھ ۔ بیان امید اور فحش کاموں سے پرہیز کا بیان یعنی کہ اللہ کی رحمت پہ کامل اُمید رکھنی چاہیے اور حق تعالیٰ کی بخشش سے کبھی مایوس و نا امید نہیں ہونا چاہیے ۔ تاہم اللہ کے غیظ و غضب سے بھی مکمل طور پہ نڈر اور بیباک نہ ہوجانا چاہیے ۔ کم ازکم اتنا ڈر اور خوف تو ضرور ہونا چاہیے جو انسان کو خلافِ شرع کاموں سے روکے رکھے اور امرِ معروف (نیک کاموں) کی تعمیل سے مشرف بنائے اور وہ اعمال و افعال میں کھلی چھٹی نہ سمجھ لے ۔ آخر بندہ بشر ہے ۔ بشریت کے بھی تقاضے ہوتے ہیں ۔ اگر کوئی گناہ اُس سے سرزد ہو ہی جائے تو توبہ و استغفار کرنی چاہیے اور بخشش کی امید رکھنی چاہیے، کیونکہ توبہ و استغفار اور ندامت بھی تو مقررہ عبادات اور اجر و ثواب پانے والی نیکیوں میں سے ہیں جو عجز، تقصیر اور گناہ کی بدولت ہاتھ لگتی ہیں اور انسان کو خدائے بخشندہ کی تجلیات کے نزول کا مرکز بنا دیتی ہیں ۔ اس بیان سے مقصود امید کے پلڑے کو خوف کے پلڑے پر ترجیح دینا ہے، کیونکہ آس و امید ایمان کا پھل ہے ۔ جتنا ایمان مضبوط ہوگا اتنی ہی امید غالب ہوگی ۔ یاس و نومیدی تو کفر سے پھوٹتی ہے ۔ جتنی بے یقینی قوی ہوگی اتنی ہی مایوسی غالب ہوگی ۔ اور جو کیفیت بھی نفس میں راسخ ہوگی اور جس کا ملکہ پیدا ہو جائے گا تو اللہ کے اس فرمان کے مطابق کہ میں اپنے بندے کے لیے ویسا ہی ہوں جیسا کہ وہ میرے بارے میں گمان کرتا ہے[۳۵]، مرنے کے بعد وہی غالب قوت نمودار ہوگی، یعنی اگر امید قوی تر ہے تو مغفرت، رحمت اور بہشتی نعمتوں کی شکل میں نظر آئے گی اور اگر یاس و نومیدی غالب ہے تو وہ عذاب، غیظ و غضب اور سزا کی صورت میں جلوہ گر ہوگی ۔ چنانچہ دُنیا میں حق سبحانہ تعالیٰ اپنے بندوں سے ان کے وہم و گمان کے مطابق سلوک کرتا ہے اور لادینی، بے یقینی کی علامات اور اعتقاد و اعتماد کی تجلیات کو ظاہر کر دیتا ہے ۔ بیان سورۂ دہر کے رکوع کی نزدیکی آیات سے اقتباس کرکے خدائے ذوالجلال کی نعمتوں کا شکر بجالانے کا حال اور رحمتِ خداوندی کی طرف پورے خشوع و خضوع سے رجوع کرنے کا بیان ۔ کشف اور اس آیتِ کریمہ کے ان معانی کی حقیقت کہ اے پیغمبر آپ میری طرف سے فرما دیجیے کہ میں قریب ہی ہوں[۳۶] اور (باستثنا نامناسب درخواست کے) منظور کر لیتا ہوں ہر عرضی درخواست اپنے بندے کی جب وہ

میرے حضور میں درخواست دے۔ گویا حق سبحانہ تعالیٰ ابھی حقائق ممکنہ اپنے بندوں کی دعا قبول فرماتا ہے۔ اور ہر حقیقت جن معانی کا تقاضا کرتی ہے، اُسے وہی کچھ عطا فرما دیتا ہے۔ اگرچہ لوگ زبان سے ہمیشہ دُعائیں کرتے ہیں مگر ان کی قبولیت کے کوئی آثار دکھائی نہیں دیتے اور جو دُعا قبول ہو جاتی ہے وہ انہی مقبول دعاؤں کے زمرے میں آجاتی ہے۔ **بیان** اس امر کا بیان کہ مومنوں کے گناہ و خطائیں خدائے غفار کی بخشش کے مظہر ہیں اور انسان اس غفور الرحیم سے بخشش و مغفرت کے تقاضے کا حق رکھتا ہے، نیز اس سوال و جواب کے ساتھ کہ خطا کار لوگ جس طرح خدائے غفّار سے مغفرت کا تقاضا کرتے ہیں، اسی طرح اُس انتقام لینے والے حقیقی مالک کے انتقام اور سزا کے بھی مقتضی ہیں۔ جس کی شہادت آیاتِ قرآنی اور احادیثِ نبوی سے ملتی ہے۔ **بیان** اس امر کا بیان کہ حقیقت سے غافل اور سطحی علم رکھنے والے علما اللہ کے بندوں کو ضرورت سے زیادہ ہی ڈراتے دھمکاتے ہیں اور اپنے خیال میں اس خوف و وحشت کو گویا ایمان سمجھتے ہیں، حالانکہ وہ بندگانِ خدا کو بے وسیلہ بنا کر ایمان سے دُور لے جاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کو بندوں کا دشمن بتاتے ہیں۔ اولیا اللہ کو اس قسم کا کوئی خوف و خطر نہیں ہوتا۔ ان کے خوف اور اُمید دوزخ اور بہشت سے نہیں ہوتے۔ اُن کے بیم و رجا کی بات ہی الگ ہے۔ ان کا معاملہ تو محبّ اور محبوب کا سا ہوتا ہے۔ خدا کے یہ مقرب لوگ بندگانِ خدا کے لیے قرب کا وسیلہ بن جاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کو دوست اور مہربان ثابت کرتے ہیں۔ حق تعالیٰ کو توبہ قبول کرنے والا کہہ کر وہ گنہ گاروں کو مایوس نہیں کرتے۔ **بیان** اس امر کا بیان کہ گرچہ مایوس و نا امید کا ایمان مقبول نہیں ہوتا، تاہم توبہ اس حالت میں بھی ردّ و نا قبول نہیں ہوتی۔ مزہ اس میں ہے کہ گناہوں کو حتی المقدور ترک کر دیا جائے اور اللہ پاک کی طرف رجوع کیا جائے۔

اکتالیسواں وارد :

الموسوم "سلطان مبین" اپنے متن اور شرح سمیت۔ **بیان** انسان کے زور و غلبے اور اپنے نفس کی خاطر سراپا حجت و دلیل ہوتے، فصیح و نائبِ خدا ہونے کا بیان۔ **بیان** انسانی حقیقت و عرفانی کیفیت کا بیان، یعنی یہ کہ انسان کی اصل و ماہیت کیا ہے اور انسان کو عرفانی کیفیت کیسے حاصل ہوتی ہے اور پھر مکمل معرفت کس طرح نصیب ہوتی ہے۔ کمالات کے اس مظہر اور جملہ صفات کے مالک کی نیابتِ الٰہیہ کا بیان اور کائنات کی جملہ موجودات میں اس کے بلند مرتبے، عظمت و وسعت اور شرافت کا اظہار۔ فرشتوں پر بھی اس کی افضلیت و برتری کا بیان۔ **ترغیب** کسی کامل ترین مردِ حق کی صحبت

اختیار کرنے ، اولیاء اللہ کی تصنیفات اور اُن کے فرمودات سے استفادہ کرنے اور اویسیہ طریق سے ان کی ارواحِ جلیلہ سے فیض یاب ہونے کی ترغیب ۔

بیالیسواں وارد :

الموسوم احسن القول ۔ اپنے متن اور شرح سمیت ۔ کشف قول کے حُسن و خوبی کی حقیقت کا انکشاف ۔ بیان حقیقت امکانیہ اور اُس کے متعلقات کا بیان یعنی امکانی ماہیت اور اُس کے ذاتی تقاضوں کا بیان جو مذکورہ بالا حقیقت کے لوازمات اور متعلقات میں سے ہیں ۔ جو نیا پن، سنسار، فائدہ اور تغیر و تبدل ہیں ۔ اس امر کا بیان کہ اربابِ ظاہر کے نزدیک نئے پن کی دلیل ممکنات کا یہی تغیر و تبدل ہے ۔ ان کی دلیل انّی ہے اور ارباب حقیقت کی نظر میں ممکنات کا نیا پن جو لازم و ذاتی ہے، اس کے تغیر و تبدل کی علت ہے ، کیونکہ وہ عارضی ہے اور حدوث کے بعد آتا ہے ۔ ان کی دلیل لمّی ہے ۔ ان مطالب کا انکشاف اس مثال سے ہو سکتا ہے کہ طبیب کا تپ کی خلطوں کو سڑاند سے دریافت کرنا ۔ اور دوسروں کا پہلے تپ کو محسوس کر کے ان کا سراغ لگانا ۔ بیان اس امر کا بیان کہ حدوث کی علت کا امکان ممکن ہے ۔ اس لیے کہ حکما تمام ممکنات کے حدوثِ ذاتی کے قائل ہیں ، اور بعض حدوث زمانی میں ذاتی حدوث کو بھی باہم یکجا جانتے ہیں اور محتاجی کی علت امکان کو قرار دیتے ہیں ۔ اس کے برعکس متکلین حدوث کو اُس کی علت سمجھتے ہیں ۔ اس امر کے ناگوار ہونے اور فلسفیوں کی ناسمجھی اور کم عقلی کا بیان جو مفردات اور جواہر کو قدیم و لازوال سمجھتے ہیں ۔ انبیائے کرامؑ کے سچے علم کے مطابق موجود ممکنات خواہ مفرد ہوں خواہ مرکب ، جوہر ہوں یا عرض سب کے سب حادث ہیں اور ہمیشہ زوال کی زد میں رہتے ہیں ۔

تینتالیسواں وارد :

الموسوم قول بلیغ ۔ اپنے متن اور شرح سمیت ۔ بیان اس اسم گزاری کی وجہ ۔ بیان دونوں عدموں کے درمیان قول الوجود کا بیان ۔ جیسے حیض کے دو خونوں کی درمیان کی طہارت ۔ اس کلام کا ماحصل ۔ اس اعتباری وجود کے عدم اضافی اور ظاہری فنا کا بیان اور انسانی پیکر کے تغیر و تبدل کا اظہار ہے، کیونکہ ہر شخص کی شخصیت کی الگ صورت ہے نہ کہ اس کے نفسِ ناطقہ سے انکار اور اس کی فنا کا اقرار جو باطل عقیدہ ہے اور اس امر کا بیان کہ قیامتِ کبریٰ کے وقوع پذیر ہونے کے لیے مدّت کا تعین کرنا محض حماقت ہے ۔ اگرچہ اس کے برپا ہونے میں کوئی شک و شبہ نہیں اور قیامت کے متعلق قرآن و سنت کے

عین مطابق خبروں پہ یقین کرنے کا ذکر۔

چوالیسواں وارد:

الموسوم معیت اللہ اپنے متن اور شرح سمیت۔ **بیان** معیت کی اقسام کا بیان۔ ایک ظاہری معیت ہے۔ وہ یا تو باہم قریب ہونا یا قربت یا پاس ہونا ہے۔ دوسری قسم باطنی ہے، تیسری اضافی (نسبتی)، چوتھی حقیقی، پانچویں اعتباری، چھٹی علمی، ساتویں تجلی ملازمت کی، آٹھویں عارضی، نویں لازمی، دسویں عطا شدہ، گیارھویں اکتسابی (اپنی کوشش سے حاصل کردہ) اور بارھویں وصفی معیت ہے۔ **بیان** خودی و دوئی کی معیت کا بیان۔ انانیت سے مراد اپنی ذات سے آگہی اور اپنی ہستی کا شعور ہے۔ اور اثنیت سے مراد دوئی اور اجنبیت ہے۔ علم خودی کے لیے دوئی لازم ہے۔ وہ دوئی حقیقی ہو یا محض اعتباری، کیونکہ یہ علم ثانوی حیثیت رکھتا ہے۔ دوئی کثرت کا منشا و مبدا ہے اور وحدت کا تعین کنندہ۔ اس ذاتِ واحد کی پاکی اور ماورائی کا بیان جس میں کئی وجوہات کی بنا پر دوئی کی گنجائش نہیں۔

پینتالیسواں وارد:

الموسوم تاویل احادیث۔ اپنے متن اور شرح سمیت۔ **بیان** اللہ تعالیٰ کی خاص عنایات، اُس عالمِ مطلق کی تعلیم، خاص انعامات کے احسان اور اُس کی طرف سے عطا کردہ فضیلتوں کے شکرانے کا بیان اور اس درویش بے نوا کو ملکِ وجود کی بادشاہت اور حقیقی سلطنت عطا کرنے اور ہر کلام کے مطالب کے اسرار و رموز کو سمجھنے، رشد و ہدایت دینے اور اعلیٰ فہم و ادراک اور تمام حالات میں توفیق کی قوت اور مطابقت کی طاقت عطا کرنے پہ شکر کا اظہار۔ **بیان** بعض احادیث اور آیاتِ قرآنی کے اسرار و رموز کا بیان۔ اس حدیث شریف کہ مومن کا دل خدائے رحمان کی دو اُنگلیوں کے درمیان ہے جسے چاہتا ہے اس کو سیدھا کر دیتا ہے، چاہتا ہے تو موڑ دیتا ہے، اور یہ کہ آدم کو خدا نے اپنی صورت پہ پیدا کیا اور یہ آیتِ کریمہ کہ بہت سے چہرے اُس روز بارونق ہوں گے۔ اپنے رب کی طرف دیکھ رہے ہوں گے کے حسن و خوبیوں اور دیگر کلمات کی تاویلات کا مختصر بیان۔ اور سہ طرفی دلالت کی رُو سے ہر لفظ کے ان گنت اور بے شمار معنوں کی جزئیات اور کلام الٰہی اور رسالت مآبؐ کی احادیث کے معانی و مطالب کی فراوانیاں اور گہرائیاں اور صفتِ کلام کا مظہر ہونا برائے صفتِ علم جس طرح کہ وجود کے لیے صفتِ علم مظہر ہے۔ خدا و رسول کے کلام کی معجز بیانیاں اور اُمت محمدیہ کی بزرگی و شرف۔

چھیالیسواں وارد:

الموسوم قولِ ثابت بما اپنے متن اور شرح سمیت ۔ **تعریف** اس نام کی تعریف و توصیف ۔ موت اور اُس کے یقینی ہونے کا بیان اور نفس کی نفسانی خواہشات کی طرف رغبت اور نفس کے شہوانی لذّات کی طرف میلان و رجحان کی حقیقت کیونکہ انسان طبعاً نرم و نازک کاموں کی طرف مائل ہوتا ہے۔ اس امر کا بیان کہ لذّات کو ترک کرنا حصولِ سعادت اور نفسانی لذّتوں سے بالکل قطع تعلق کر لینا حصولِ نجات کا باعث ہے ۔ اس امر کا اظہار کہ موت و حیات دونوں مخلوق خداوندی اور امر وجودی ہیں ۔ قرآن مجید میں موت کے ذکر کو ذکر حیات سے مقدم سمجھنے کی وجہ اور اس عرصۂ حیات کو موت سے تعبیر کرنے والی تحریر کی خوبیاں ۔ اور حیات بعد از ممات کے کارخانے کے آغاز کا بیان ۔

سینتالیسواں وارد:

الموسوم شرابِ طہور، اپنے متن اور شرح سمیت ۔ **بیان** اس امر کا بیان کہ غلبۂ مستی اور جذبۂ الٰہیہ کی سرشار کیفیت کے باوجود شرعی آداب و مراتب کو ملحوظ خاطر رکھنا ایک اعلیٰ کیفیت اور عالی شان مقام کی نشانی ہے اور بدمست ہو کر شرعی حدود سے تجاوز کر جانا ایک ناقص کیفیت اور ادنیٰ مقام ہے اور مقلّدوں اور ملحدوں کے حال کی حقیقت ۔ **سکر صحو** مستی و ہشیاری کے حالات کا بیان ۔ ان کی تعریفات اور لوازمات سمیت ۔

اڑتالیسواں وارد:

الموسوم مداولتِ ایام، اپنے متن اور شرح سمیت ۔ (دنوں کا ہیر پھیر یا ادل بدل) **بیان** اوقات و ایام کے اعتبارات کی حقیقت جو انسانی ذہن کی معتبر قیاسی اور اعتباری موجودات ہیں ۔ لیکن وہ ذات اور کان کی طرح فرض قبیلہ سے نہیں ۔ فلکی ہیئت ۔ زمینی صورت، تقسیمات کے اعتبارات اور توسطی اور قطعی حرکات کی حیثیّات کے اختلاف اور ان تمام کیفیتوں کی بلندی کے باوجود تمام زمانوں اور وقتوں کے امتیازی نشانات اور شمسی و قمری سال مہینوں اور لیپ کے سال کا ذکر ۔ **بیان** سورج اور چاند کی گردش اور منازل کا اک انوکھے انداز میں بیان، جو ان آیات قرآنی کے الفاظ و حروف پہ مبنی ہے ۔ اور آج تک کسی کی نگاہ اُدھر نہیں اُٹھی ۔ آیات کا مطلب یُوں ہے : اور ایک نشانی آفتاب ہے کہ وہ اپنے ٹھکانے کی طرف چلتا رہتا ہے۔ یہ اندازہ باندھا ہوا ہے اُس خدا کا جو زبردست حکمت والا ہے ۔

اور چاند کے لیے منزلیں مقرر کیں۔ تحقیق زمانے کے سلسلے میں تحقیق۔ مادی جسموں کا زمانے کے تحت ہوتے اور غیر زمانی مجردات کا باہمی فرق۔ بلند و پست ہوتے کے لحاظ سے مراتب و درجات کے فرق اور اضافی اور حقیقی تجرد کا بیان۔ اس سلسلے میں شکوک و شبہات کی تردید۔ مجرد کا غیر زمانی ہونا جو ملک قدیم کا عرش عظیم ہے۔ اربعۂ عناصر کے دلائل کا ذکر۔ اجماع امت کی حقیقت کا انکشاف جس کی خلاف ورزی جائز نہیں۔ جزوی یا کلی امور کی فروعات میں جزئی اختلافات کا بیان۔ طرفین کے حقدار یا باطل کنندہ ہوتے کے سلسلے میں باہمی مخالفت کے باوجود مخالفوں کا مخالفت کے اطلاق کی نسبت باطل ہی سے دینا۔

بیان تغیر و تبدل کا بیان جو نئے پیدا ہوتے والی فانی ممکنات کی ذات کے لوازمات میں سے ہے۔ ممکنات کے سلسلے میں وجود و عدم کے معانی کو ترک کرنا حالات کے ردّ و بدل کا موجب ہے کیونکہ تغیر و تبدّل کے بغیر تو وہی ذات واجب الوجود ہے۔ مفہوم ممتنع کے نصیب میں تو صرف عدم ہی ہے۔

بیان اس سوال کا جواب کہ جب اللہ کے سوا باقی سب فانی اور حادث ہیں تو پھر ہم عرش الٰہی کو بھی احداث کرنے والا کیوں نہیں سمجھتے اور کس طریق سے متکلمین کی طرح اُس کی اور دیگر عالم باقیات کی فنا کو روا نہیں سمجھتے۔ جس طرح حادث و قدیم کی ذاتی و زمانی دو قسمیں ہیں، اسی طرح فنا و بقا کی بھی ایسی ہی دو قسمیں ہیں۔ پس ذاتی ہمیشگی و ہمیشگی اور ذاتی بقا فقط حق تعالیٰ ہی کو ہے۔ ذاتی حدوث کی طرح ذاتی فنا بھی سبھی ممکنات کا نصیب ہے اور ممکنات میں سے کوئی موجود شے اس سے کبھی خالی نہیں۔ بعض ممکنات زمانی میں ذاتی حدوث کے ساتھ زمانی حدوث بھی جمع ہے۔ انہی بعض میں ذاتی فنا کے ساتھ زمانی فنا بھی شامل ہو جاتی ہے اور ہوتی رہے گی۔ **تعلیم** پیش آنے والی ہر حالت اور رونما ہوتے والی ہر کیفیت میں اپنی بندگی کے مشاہدے اور اپنی ہی طرف رجوع کی تعلیم، کیونکہ یہ مطالعہ ہر معاملے میں بہت ہی مفید اور استقلال بخش ہے اور اسی نسبت کی قوت کے ظہور پر حیات جاوداں اور نیابت الٰہیہ کے مناصب موقوف ہیں۔

انچاسواں وارد:

الموسوم بلاغ الناس (تبلیغ عوام) اپنے متن اور شرح سمیت۔ **بیان** راہِ سلوک میں وارداتِ قلبی کے حالات کا بیان جو غفلت و آگہی، فنا و بقا، مستی و ہشیاری اور شان، شوکت و دبدبے پر مشتمل ہوتی ہیں۔ ان کے عجیب و غریب فوائد اور انوکھی رموز سمیت ان سب کی تعریف و تحقیق کا اظہار اور ضمناً ایک رباعی کے متن اور اُس کے ہر لفظ میں پوشیدہ استعارات و مقاصد کا انکشاف اور

مکمل تشریح۔ **بیان** اس امر کا بیان کہ درحقیقت یہ سب حالات و کیفیات قاعدے کُلیے کے مطابق اور عموماً سبھی پر وارد ہوتے ہیں۔ ان میں سالک و غیر سالک اور کامل و ناقص کی کوئی تخصیص نہیں۔ پھر ان کے مراتب اور اعتباری اور لازمی حیثیات کا اختلاف و تفاوت۔ **فائدہ** ان اشعار کی حقیقت کا بیان جو محترم ہستیوں نے شعر و شاعری سے مناسبت نہ ہونے کے باوجود بھی کہے ہیں۔ اور ان اشعار کی کیفیت جو حقیقت سے نابلد شاعروں نے موزوں کیے ہیں۔ ان ہر دو امور کی یکجائی محض تائید آسمانی سے ہو سکتی ہے، اور شاذ و نادر ہی دیکھنے میں آتی ہے۔ **پرہیز** حق تعالیٰ کی ہستی کی برتری ذہنی اضافت سے پاک و مبرّا ہے اور اس مرتبے کی حقیقت کے دریافت کرنے میں تائید آسمانی کے بغیر عقل انسانی بالکل عاجز ہے۔ **فائدہ** اُس حقیقت کی تہ کا انکشاف جس سے عارف و کامل و با تمکنت اصحاب دبدبہ و تغیرات سے نکل کر صاحبِ مقام اور تجربہ کار سالک بن کر رہوارِ زماں کے راکب بن گئے۔ وہ راہِ سلوک کے اناڑی مسافر اور وقت کے تابع نہ رہے۔ سلوک کی اصطلاح میں یوں کہتے ہیں کہ وہ زمان و مکان کی حدود کو پار کر گئے۔ مہر و مہ و انجم کے محاسب اور ایام کے راکب بن گئے۔ **تاویل** اس آیتِ کریمہ کی تاویل و تعریف جو یوں ہے کہ "نہ اس کو اونگھ دبا سکتی ہے نہ نیند"[۳۸] اور ان ہر دو حالتوں کے سلسلے میں تحقیق۔ **بیان** وجودِ عدم، وجودِ فنا اور وجودِ بشریت کے اصطلاحی الفاظ کے معانی اور فقہی اصطلاح زوالِ عین و اثر کے معانی کا بیان، اور یہ کہ سالکانِ راہ ان الفاظ کو کن مواقع پہ استعمال کرتے ہیں۔

بیان اس امر کا بیان کہ تمام وجودی کمالات اللہ تعالیٰ کی صفات ہیں، ساری مخلوق انہی کی آئینہ دار ہے اور دراصل یہ سب نشانیاں اور احکام و افعال و احوال اللہ ہی کی جانب سے ہیں، اور ذاتِ باری تعالیٰ سے منسوب ہیں۔ نیز عمومیت اور خصوصیت کے لحاظ سے عوام اور خواص کی حالتوں کا فرق اور نیک نہاد محقق عارفوں کے حسنِ ظن اور منفعل جاہلوں کی بدظنی کا بیان۔ مرتبۂ فنا کی نسبت مرتبۂ بقا کی برتری کا ذکر چند دیگر نصیحتوں کے ساتھ۔

پچاسواں وارد:

الموسوم بلاغِ مبین، اپنے متن اور شرح سمیت۔ **تعریف** اس اسم کی تعریف جو نظری امور کے اثبات کے لیے ظاہر و روشن امور کا بیان ہوتا ہے۔ **تحقیق** کامل اولیائے کرام کی دعوت نبیوں اور ولیوں کی تبلیغ کے سلسلے میں تحقیق۔ و نیز رسالت کے مقام اور شرعی احکام کا بیان۔۔

شرع دینِ مصطفوئیؐ کا وسطی حدود میں رہ کر کمالِ اعتدال پہ ہونا اور طریقۂ محمدیؐ (اس طریق کے سب اصحاب پہ خدا کی رحمتیں اور سلامتیاں ہوںؑ) کی طرف دعوت۔ دُنیا اور دُنیا والوں کی بے ثباتی کا بیان۔ اس دُنیا کے اعتبارات اور اہلِ دُنیا کی حسی، نقلی، کشفی اور نقلی لحاظ سے ناپائداری، نیز دُنیا اور دنیوی مال و متاع کی حقیقت کا بیان کہ وہ ہے کیا چیز؟ اور اہلِ دُنیادار اور دُنیا کے بھوکے کون لوگ ہوتے ہیں۔ سگِ دُنیا کسے کہتے ہیں، اور اس امر کا بیان کہ دُنیا کو ترک کر دینے والے محبت اور خلوص کے لائق کون لوگ ہوتے ہیں۔ بیان آیاتِ قرآنی سے اقتباس کر کے دُنیا اور دنیوی علائق کے متعلق چند نصیحتیں اور تمام حالات میں شاہ و گدا سبھی کے حال کی اصلاح کا بیان۔ عمدہ پند و نصیحت بے خبر واعظوں اور بے اثر ناصحوں کے راہ و رسم کا بیان کہ جن کے پند و موعظت کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ عارفان اور اہل اللہ جن کا ضمیر روشن اور جن کی زبان میں تاثیر ہوتی ہے اور جو کلیات سے لے کر جزئیات تک کے اسرار و رموز کا انکشاف کرتے ہیں، اُن کے وعظ و نصیحت اور ہدایت و تربیت کے انداز کا بیان۔

اکانواں وارد:

الموسوم حکمتِ کاملہ، اپنے متن اور شرح سمیت ۔ تعریف حکمت کی تعریف۔ اس میں اور حکمتِ ناقصہ میں فرق، جو انسان میں بشری قوتوں کے مطابق ہوتی ہے اور تقریباً سبھی مجازی حکما کو نصیب ہوتی ہے۔ پھر ان دونوں یعنی حکمتِ کاملہ اور حکمتِ ناقصہ کی حقیقت کا انکشاف۔ اس کے ساتھ ہی صوفیا کے حال نیز حکمتِ کاملہ کا بیان جو حکیم حقیقی اللہ جل جلالہٗ کو حاصل ہے۔ انبیا و اولیائے کرام اس حکمت کے مظاہر ہیں۔ ختم نبوت کا بیان اور اُمتِ محمدیہؐ کے کامل ترین عارفوں کا ذکر اور محمدیت کے خلوص کا ظہور۔ بیان نفس کے بدن کے ساتھ تعلق کی حکمت کا بیان اور تمام حیوانی اور ملکی مراتب میں انسان کے جامع ہونے کا ذکر۔ اُس کے افضل و اکمل مناصب کی تفصیل اور شرف و بزرگی و برتری حاصل کرنے کا بیان۔ تاویل اس آیتِ کریمہ کی تاویل جس کا مطلب ہے کہ ہم نے انسان کو بہت خوبصورت سانچے میں ڈھالا ہے (ان میں جو بوڑھا ہو جاتا ہے) ہم اس کو پستی والوں سے بھی پست کر دیتے ہیں۔ ﷺ اور صالح مومنوں کے الگ کرنے سے مراد۔

باونواں وارد :

الموسوم قولِ ثقیل (وزنی بات)، اپنے متن اور شرح سمیت - بیان قول کے وزنی ہونے کا مفصل بیان اور ساری سورہ الم نشرح کی روشنی میں اللہ تعالیٰ کے خاص القا کا انکشاف - بیان اس امر کا بیان کہ امتیاز ایک مصیبت ہے جو نفس سے کبھی زائل نہیں ہوتی - اور لفظ مصیبت کو امتیاز سے تعبیر کرنے کی وجہ - قاعدہ یہ بیان کہ ہر کلمہ یا لفظ جو عارفِ ذات کی زبان سے نکلتا ہے وہ ایک خاص حالت وکیفیت میں منہ سے نکلتا ہے اور تمام وقت ایک سی حالت نہیں رہتی، لہٰذا ہر لفظ کو اس حالت کا سراغ لگا کر جس سے کہ وہ پیدا ہوا، ان کے تمام اقوال کو دقت اُٹھا کر ایک ہی حال کے مواقق نہ سمجھنا چاہیے - ہر لفظ کو اسی مقام سے متعلق سمجھنا چاہیے جس کی کہ وہ دلالت کرتا ہے، اور اصل مطلب کی ڈور ہاتھ سے نہ چھوڑنی چاہیے، اور نہ ہی تردّد و پریشانی میں پڑنا چاہیے -

ترپنواں وارد :

الموسوم بصائر من الرّب (اللہ کی عطا کردہ بصیرتیں) اپنے متن اور شرح سمیت - تعریف لفظ بصیرت کی تعریف - انسان کا اپنے نفس پہ پختہ دلیل اور اپنی بدکاری و پرہیزگاری پہ اللہ کی طرف سے ملہم ہونا - دُنیائے فانی کے لحاظ اور زمانی نسبت کے اعتبار سے سب اچھے یا بُرے کاموں اور عملوں کے فناو ناپید ہونے اور اُن کے آثار، نتائج اور ثمرات کا دہری نسبت کے اعتبار سے باقی رہ جانے کا بیان - اللہ تعالیٰ کا جزا و سزا کے معاملات کو بہشتی نعمتوں اور عذابِ دوزخ سے نپٹانے، نیز اس کے فضل وکرم، رحمت و بخشش، عدل اور قہر و غضب کا ذکر - ممکنات کا اپنے ذاتی نقص و ندامت سے نہ نکل سکنا - لیکن انسان کا یہ عجز و قصور، انسانی فضل و کمالات میں خلل انداز نہیں ہوتا - بیان تین نسبتوں یعنی سرمدی، زمانی اور دہری و زمانی نسبتوں اور ان کے متعلقات کا بیان - ان میں سے ہر ایک کی دو قسمیں ہیں - ایک حقیقی اور دوسری اضافی - تحقیق زمانے کی حقیقت، اصلیت پہ تحقیق اور حقیقی و اضافی زمان میں فرق کا بیان اور تمام ممکنات کے لیے ذاتی اور زمانی حدوث کا ایسے انداز میں ثابت کرنا جس پہ آج تک کسی نے لب کشائی نہیں کی، اور نہ ہی کسی کتاب میں ایسی تحریر دیکھی گئی ہے، یعنی حقیقی زمانے پہ جس سے اضافی زمانے میں اکھاڑ پچھاڑ پیدا ہوتی ہے، اک بھرپور نگاہ اور جو عبارت ہے وجود کی درازیٔ مدت کی ذات الوجود کی بقائے نفسی کی حیثیت کی جانب نسبت سے اور

یہ وجوب کی اعلیٰ ترین صفات میں سے ہے۔ اسے ذاتی ہمیشگی یا نفسی پائداری کہتے ہیں اور یہ اصلی مدعا و مفہوم کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ اضافی زمانے کو الگ اور ممتاز کر کے مجدد کو بھی جسے اس کی علت قرار دیا گیا ہے ساتھ ملا کر حادث زمانی کہیں تو یہ جائز ہے اور اگر زمانے سے مراد فقط اسی اضافی زمانے کو لیتے ہوئے عرش کو قدیم زمانی سمجھیں تو یہ بھی روا ہے کہ دونوں صورتوں میں اندیشہ و خدشہ کی کوئی بات نظر نہیں آتی۔ **بیان** اضافی زمان کی جسے ازل و ابد بھی کہتے ہیں، ابتدا و انتہا کا بیان۔ زمانے کی تین قسموں میں تقسیم اور دیگر امتیازات و تقسیمات کا بیان۔ اور اس امر کا ذکر کہ بقا کی حیثیت سے زمانے کی حرکت ازل سے ابد کی طرف ہے اور گزر جانے کی حیثیت سے ابد سے ازل کی جانب ہے اور یہ سب اعتباری اور اضافی حیثیتیں ہیں، اور زمانہ فی نفسہٖ اب تک ویسے کا ویسا ہے نہ ازلی ہے نہ ابدی۔ بلکہ اس مرتبہ میں ازل و ابد ایک آن میں یکجا جمع ہیں۔ **بیان** اس امر کا مطالعہ کہ اپنی نیکیوں، اطاعتوں اور عبادتوں کو خاص واجب الوجود حق تعالیٰ سے منسوب کر کے اسی ذاتِ قدیم کے حوالے کر دینی چاہئیں تاکہ فنا انھیں چھونے نہ پائے، اور اُن سے دوامی ثمر حاصل ہو۔ اور اپنے گناہوں، خطاؤں اور لغزشوں کو اپنی فانی ذات سے محسوب کر کے بالکل بے غرضی سے کام لیتے ہوئے اپنے ذمے لے لینا چاہیے تاکہ وہ باقی نہ رہیں اور کوئی ضرر نہ پہنچا سکیں۔ ہر چند کہ حقیقت میں یہ نفع و نقصان سب خدا ہی کی طرف سے ہوتا ہے۔ **بیان** متن کے دیگر متعلقات کا بیان۔ اس کتاب کے خصوصی مطالب کی تحریر و تقریر کے اندازِ بیان کا ذکر، اور اصلیت کے لحاظ سے ان خصوصیتوں کا شروع سے آخر تک ایک مفصل جائزہ وانکشاف۔ ضرورت کے مطابق جاننے پہچاننے اور دوسروں کے لکھے ہوئے مقدمات کے انداز کا مختصر سا تذکرہ، اور اس کتاب الموسوم "علم الکتاب" کے سمجھنے کے لیے بیشتر مواد کی ضرورت، استعداد و اہلیت کے جوہر کی مناسبت اور اکثر و بیشتر علوم و کمالات میں جامع ہونے کی حاجت کا ذکر۔

چوّنواں وارد:

الموسوم زینت الکواکب، اپنے متن اور شرح سمیت۔ **بیان** آسمان کو ستاروں سے زینت دینے کی مانند اللہ تعالیٰ کا دائرہ امکان کو اعتباری نقاط سے زیب و زینت دینے کا بیان، نیز مراتب کے تحفظ اور حقوق کی ادائیگی اور باطل اعتبارات کو منحوس و نحس ستاروں سے اور حقیقی اعتبارات کو سعد اور نیک ستاروں سے تشبیہ و تمثیل دینے کا بیان، اور اس نحوست و سعادت کا اپنے ماننے والوں

پہ اثر و تاثیر۔ **بیان نجوم وکواکب** ان سیاروں اور ستاروں کے استعاروں کے مطالب کا بیان۔ یعنی حقیقت کے مطلب اور کثرت میں وحدت کے معنوں کو سیاروں اور ستاروں کے لیے متعدد الفاظ کو استعارۃً اور بے شمار کلمات کو تشبیہاً مناسب انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ حضرتِ وجود مطلق جو تمام ظاہری اور باطنی موجودات پہ محیط ہے کے ظہور مراتب کے اٹھارہ دائروں کا اُن کے ظاہری اور حقیقی عالم میں ان کے مظاہر کے عین مطابق اک نیا اور انوکھا بیان۔ **اوّل** پہلے دائرۂ وجود کا نام استوائی رحمانی ہے جو تمام مراتب سے بلند و بالا اور ارفع و اعلیٰ ہے جس کا اصلی مظہر حقیقتِ محمدیہ ہے اور اس کا ظاہری مظہر عرشِ عظیم ہے۔ **دوم** دوسرے دائرۂ وجود کا نام وجوب الوجود ہے جس کا حقیقی مظہر سب ممکنات کا وجوب بالغیر ہے اور ظاہری مظہر اس کا کُرسی ہے۔ **سوم** تیسرا امکانی دائرہ جس کا نام دائرۂ کن فیکون ہے اس کا حقیقی مظہر دُنیاوی موجودات کے حقائق ہیں اور اُس کا ظاہری مظہر گردش نہ کرنے والا آسمان۔ **چہارم** چوتھا دائرہ ملکیت وگرفت کا، جس کا خارجی مظہر فلکِ زحل ہے۔ **پنجم** پانچواں دائرہ البقا ہے یعنی باقی و قائم رہنے کا دائرہ۔ اُس کے مظاہر فلکِ مشتری کے اجسام ہیں۔ **ششم** چھٹا دائرہ تباہی و بربادی کا ہے جس کا مظہر فلکِ مریخ ہے۔ **ہفتم** ساتواں دائرہ نور و روشنی کا ہے جس کا مظہر فلکِ شمس ہے۔ **ہشتم** آٹھواں دائرہ خوشی و مسرت و شادمانی کا ہے جس کا مظہر فلکِ زہرہ ہے۔ **نہم** نواں دائرہ جزئی تقدیرات کا جس کا مظہر فلکِ عطارد ہے۔ **دہم** دسواں دائرہ حسن و جمال کا جس کا مظہر فلکِ قمر ہے۔ **یازدہم** گیارھواں دائرہ جلال ہے جس کا مظہر آتشیں کُرہ ہے۔ **دوازدہم** بارھواں دائرہ لطافت ہے جس کا مظہر ہوائی کرہ ہے۔ **سیزدہم** تیرھواں کرہ مہر و نرمی کا ہے جس کا مظہر آبی کُرہ ہے۔ **چہاردہم** چودھواں کرہ نزول کا ہے جس کا مظہر خاکی کرہ ہے۔ **پانزدہم** پندرھواں کرہ تالیف ہے جس کے مظہر جمادات ہیں۔ **شانزدہم** سولھواں کرہ جننے اور پیدا کرنے کا ہے جس کے مظہر نباتات ہیں۔ **ہفتدہم** سترھواں کرہ زندگی بخش ہے جس کے مظاہر حیوانات ہیں۔ **ہژدہم** اٹھارواں کرہ بھرپور جامعیتِ مطلقہ کا کرہ ہے جو بنیادی دائرہ ہے اور جس کا مظہر انسان ہے۔ **بیان** خدائے رحمان کا عرش پہ جلوہ افروز ہونے اور اُس کی یکسانیت و ہمواری، زمین و آسمان اور مافیہا کی تخلیق، نیز عرش سے لے کر فرش تک تمام مراتب کا بیان، اور حقیقتِ محمدیہ کی روشنی میں تمام مادّی اور غیر مادّی مخلوق کے حال کی حقیقت کا تذکرہ۔ حقیقتِ محمدیہ اور عقلِ اوّل سے لے کر دیگر عقول، نفوس، آسمانوں، اربعۂ عناصر

اور موالید ثلاثہ تک ۔ **بیان** آیتِ کریمہ ثمّ استوای الی السّمائیں حرف عطف ثم کے پیچھے لانے، حرف الی کے ساتھ استوا بطور صلہ لانے ۔ اور تمام سمتوں اور حیثیتوں پہ حق تعالیٰ کے محیط ہونے کا مفصل بیان ۔

پچپنواں وارد:

الموسوم عروۃ الوثقیٰ (مضبوط دستہ) اپنے متن اور شرح سمیت ۔ **کشف** مضبوط دستے سے مُراد کا انکشاف ۔ نیکی کے راستے کی ہدایت اور دین و دُنیا میں نجات کا بیان ۔ **تاویلات** راست روی (راہِ سلوک) کا بیان اور بعض احادیثِ نبویؐ اور آیاتِ قرآنی کی تاویلات، یعنی وہ امور جو راہِ سلوک سے متعلق ہیں اور جو سالکانِ راہ کو اپنے مسلک میں پیش آتے ہیں ۔ ان کی کلی طور پہ حقیقت کی چھان بین اور مذکورہ بالا حالات سے مناسبت رکھنے والی اور ان کی تائید کرنے والی بعض احادیثِ نبویؐ اور آیاتِ قرآنی کی تاویلات کا تذکرہ اور محمدیؐ طریقے پہ چلنے کی فوقیت جو تمام مراتب کو مکمل اور تمام کرنے والا ہے اور عروج کی سمت میں وہ ایسی عالی جنس ہے جو تمام اجناس پہ حاوی و محیط ہے اور نزول کی جانب نوعِ انسانی کی طرح تمام انواع و اقسام میں اشرف المخلوقات ہے ۔ **ہدایت** نجات حاصل کرنے کے سلسلے میں ہدایت اور درجات و مقامات کے نتیجے کی دلالت ۔ **تصفیہ** حضور و شہود کے ملکہ کی نسبت کا حصول اور حق سبحانہ تعالیٰ کی ذات سے آگہی و عرفان جو نفس کے لیے بمنزلہٗ علم حضور ہے ۔ اور وصل، قرب اور نزدیکی اس حالت سے عبارت ہیں ۔ **بیان** اپنے نفسِ امّارہ سے جہاد کرنے، اسے مارنے اور اپنی خودی، تکبر و انا کے خیالات اور اپنی نفسانی اور شہوانی خواہشات کے مٹانے کی کیفیت کا بیان اور مذکورہ بالا مطالب کے سلسلے میں درپیش آنے والی جزئیات تک کی تفصیل، انہی مطالبِ مذکورہ پہ سوالوں اور جوابوں سمیت، کیونکہ اشیا کے ذاتی تقاضے اشیا سے زائل نہیں ہوتے، پس نفس کے ہوتے ہوئے ان خواہشات سے کیسے قطع تعلق کیا جاسکتا ہے ؟ اور ہمارا اس سے اصل مقصد و مطلب کیا ہے ؟ **سوال** یہ سوال کہ اگر تائب کا درجہ صالح انسان سے افضل ہو تو پھر انبیائے کرامؑ کے حق میں کیا کہا جائے گا جو معصوم ہوتے ہیں، مع اپنے جواب کے ۔ عوام و خواص اور نیکوں کے گناہوں کا باہمی فرق کا بیان اور انبیائے کرامؑ پہ ہر بات کی حقیقت کے منکشف ہوتے، ان کی معصومیت کی حقیقت اور اولیائے کرام کے گناہوں سے مامون و مصئون رہنے اور اُن کا ہمیشہ اپنی معمولی سے معمولی تقصیر و کوتاہی پہ توبہ و استغفار کرنے کا تذکرہ ۔ **سوال و جواب** آفتاب کی روشنی میں ستاروں کے چھُپ جانے

کی مانند دنیاوی موجودات کا حضرتِ واجب الوجود کے نور کے سامنے چھپ جانے کا حال۔ وحدت الوجود اور وحدت الشہود سے قطع نظر امر حق اور توحیدِ مطلق کے اسرار کا اظہار جو مومنانِ مخلص کا مسلک ہے اور سالکانِ راہ کے مناسب حال تربیت بھی ہے۔

چھپنواں وارد:

الموسوم عاقبت الامور، اپنے متن اور شرح سمیت۔ **بیان** تمام امور میں نتائج کے انکشاف کے مقام کا بیان، اور کاموں کے انجام کو باطنی چشم کی دوربین سے دیکھنے کا تذکرہ۔ **بیان** صبر و استقامت کا بیان۔ اُس کے حاصل کرنے کا حکم، کیونکہ مصیبت و ابتلا میں صبر اور قضائے آسمانی پہ رضا کے بغیر دلی سکون حاصل نہیں ہو سکتا۔ **تحقیق** صبر و استقامت کے جوہر و اصلیت کی تحقیق کہ ان کی اصل حقیقت کیا ہے۔ یہ دونوں خدائی صفات میں سے ہیں۔ حق سبحانہ تعالیٰ جس کا ایک نام صبور بھی ہے۔ اور لفظ صبر کے اطلاق کی وجوہات و اسباب اور جہات کے ذکر کی مناسبت کی تقریب سے اللہ کے نام شکور پہ شکر کے اطلاق کا تذکرہ۔ **بیان** اس امر کا بیان کہ صبر و بے صبری کا اطلاق دو حالتوں پہ کیا جاتا ہے۔ ایک حالت کا اپنی کسی محبوب و من پسند شے کے کھو جانے پہ اور دوسری حالت کا کسی ناپسند شے کے پالینے پر۔ نیز ان کے مراتب کی کمی و بیشی کے فرق کا بیان۔ **فائدہ** یعنی صبر و استقامت اور اُن کے متعلقات کے بیان کا فائدہ۔ **بیان** مرتبۂ استقامت کی عظمت کا بیان جو تمام فضیلتوں کی سرتاج، تمام صفات کی انتہا اور سارے معاملات کا اخیر ہے۔ وہ سیر و سلوک کا نچوڑ اور تمام کمالات، کیا صبر، کیا شکر، کیا تسلیم و رضا، کیا قناعت و توکل سب کا حامل ہے۔ یہ بہت ہی عظیم شے ہے۔ اس کی دو قسمیں ہیں۔ ظاہری استقامت اور باطنی استقامت۔ ان دونوں کی تعریف اور ان کے مراتب کا فرق۔ صبر کی قسموں کا حوالہ اور اس کے مراتب کا فرق جس کا بیان اٹھاونویں (۵۸) وارد میں آئے گا جس کا عنوان صبرِ جمیل ہے۔ **تزکیہ و تصفیہ** کہ بعض اولیائے کرام کی باتوں اور حکایتوں سے پتہ چلتا ہے کہ ناپسندیدہ چیزوں پر صبر کی بجائے ناپسند اشیاء سے راضی ہو جانا چاہیے، یعنی کہ ان پر صبر کرنے کے بجائے عین رضامند ہو جانا چاہیے، بلکہ رضا سے بھی آگے بڑھ کر ان پہ شکر کرنا چاہیے اور اس مقام سے بھی آگے بڑھتے ہوئے محبوب کے مشاہدہ میں اس کا احساس تک نہ کرنا چاہیے۔ اس قسم کی باتیں مستی کے غلبے کی خبر دیتی ہیں، اور حقیقت سے ناواقفیت پہ دلالت کرتی ہیں۔ یہ حالت بھی جاودانی اور دوامی

نہیں۔ اور بالفرض اگر یہ نصیب ہو بھی جائے تو اچھی اور خوب شے نہیں ہے، بلکہ انسانی مرتبۂ کمال کا ایک نقص ہے جو سرسری نگاہ میں اعلیٰ نظر آتا ہے اور اس امر کی حقیقت کا بیان اور اس موضوع بحث پہ تحقیق و تدقیق اور اس کے مراتب کا باہمی فرق۔ عوام و خواص اور خاص الخاص بندگانِ خدا کے مقامات، کیفیات و حالات کی تفصیل اور قضا پہ راضی رہنے، ابتلا و مصیبت میں صبر اور نعمتوں پہ شکر کرنے کا بیان۔ **حاشیہ آرائی** ہر فعل کے انجام کا بیان۔ یعنی اُس فعل کے مابعد زمانے کا ذکر اور عمل کرنے والے کے نفس پر جزا و سزا کے معاملات کے وقوع کا آغاز اسی وقت سے ہے، یعنی کہ اس عمل کا وقت بیت جانے کے بعد (موت کے بعد) میدان بدل کر قیامت تک کے لیے عالمِ برزخ میں چلا جاتا ہے جو عالمِ آخرت کا ابتدائی، وسطی اور آخری وقفہ ہے، لہٰذا امور کے نتائج پر نگاہ رکھتے ہوئے سوچ سمجھ کر عمل پیرا ہونا چاہیے اور حالِ حاضر میں رنج و راحت کے فریب میں نہیں آنا چاہیے۔ **تعریف** ظاہری اور باطنی سعی کی تعریف۔ **تفسیر** اس آیت کریمہ کی تفسیر جو یوں ہے کہ "اللہ تعالیٰ کسی شخص کو مکلف نہیں بناتا مگر اُسی کا جو اُس کی طاقت اور اختیار میں ہو" اور اس امر کا بیان کہ نفس کی گنجائش و وسعت ہر شخص میں الگ الگ ہوتی ہے اور طریقت و شریعت میں اس کا اطلاق ہر کسی کی طاقت و قدرت پر ہوتا ہے۔ **حاشیہ آرائی** نفس کی وسعت و کشادگی کی تقسیم۔ اس کے دو حصے ہیں۔ ایک علمی وسعت اور ایک جسمانی وسعت، ہر قسم کی پوری تفصیل کے ساتھ اور ہر نفس کی اصلیت و اہلیت کے تقاضے کے مطابق وسعتِ نفس کی تعبیر و تفسیر۔ ہر ماہیت کی قابلیت ہی سے واجبی فیض پہنچتا ہے۔ مختلف ادوار اور زمانوں میں مختلف شریعتوں اور دینوں میں اختلاف کا سبب اور شرع دینِ مصطفیٰ کا باقی تمام شریعتوں کو منسوخ کرنے اور طریقِ محمدی (ان سب پر خدا کی رحمت اور سلامتی ہو) کے احسن اور خاتم ہونے کا بیان۔

ستانوواں وارد:

الموسوم فوزِ عظیم (بڑی کامیابی)، اپنے متن اور شرح سمیت۔ **بیان** متضاد لغوی معنوں کی مناسبت سے اس کی وجہ تسمیہ کا بیان۔ **فنا و بقا** معرفت و سلوک کے طریق سے فنا و بقا کا بیان کہ وہ ہے کیا؟ اس کی اصلیت و تہ کا اظہار کہ فنا کیسے حاصل ہوتی ہے اور بقا کس طرح میسر آتی ہے۔ معرفت و وجدان کی رو سے جو عارفانِ ذات کا اسلوب و انداز ہے سالکانِ راہ کی ان اصطلاحات کے بموجب بھی جو کامل انسانوں نے نیک انسانوں کے لیے ان کیفیات کے مواد میں اپنے الفاظ میں وضع کر رکھی

ہیں مع ان کی تشریحات اور اُن سے متعلقہ امور کی توضیحات کے ۔ اور اس بیان کے سلسلے میں مزید سوال و جواب ۔ کشف ممکنات کی حقیقت کی تہ کو عدم اور فانی یا لذات ہونے سے تعبیر کرنے کا انکشاف ۔

فتنہ و شر کے راز اور منفی معانی کے نقائص کا اُس کے آثار و تقاضوں سے ہونے کا بیان ۔ وجود ہر خیر و خوبی کا منشا و مبدا ہے ، اور عدم ہر نقص اور شر کا منبع ہے ۔ ان جیسی عبارتوں کے معانی کو سمجھنے میں بدگمانیوں اور غلطیوں کا دفعیہ ، نیز حقیقت ممکنہ کا عدم و وجود کے آثار و انوار سے متصف ہونے کا بیان اور وجود کے الٹ پھیر کی وجہ سے تمام ذاتی نقائص کے کلیتہً کمالات میں بدل جانے کا تذکرہ ۔

اٹھانواں وارد :

الموسوم فتح مبین ۔ اپنے متن اور شرح سمیت ۔ **بیان** یہ بیان کہ اس اسم سے کیا مراد ہے ۔ اس امر کا ذکر کہ حق سبحانہ تعالیٰ نے اپنے تمام اسمائے حسنیٰ کی تجلی و جلوہ گری کے اتمام کے لیے امکانی مقتضیات کے غیر حقیقی گناہوں کا انتساب انبیاءؑ و اولیائے کرام کی گرامی ذاتوں سے کیا ہے ، جو ہر قسم کے چھوٹے بڑے گناہوں سے پاک و معصوم اور مامون و محفوظ ہیں اور جنھوں نے اپنے انسانی عجز اور خطا و عصیاں کو ہمیشہ نگاہ میں رکھا اور یوں خالق و مخلوق دونوں کی نگاہ میں معزز و محترم ہو کر اس مقام پر پہنچ گئے جہاں بندوں کے پاس ہوتے ہوئے بھی انسان اللہ کے نزدیک ہوتا ہے ۔ **بیان** لوگوں کے ہجوم و اجتماع کے وقت اپنے حال کی محافظت کا بیان ، کیونکہ جب درویش کی ذات مرجع خلائق بن جائے اور اُس کی جانب قبولیت کی ہوا چلنے لگے تو اُسے چاہیے کہ اس وقت اپنے حال کی حفاظت کی پوری کوشش کرے کیونکہ ایسے اوقات و حالات میں بشری تقاضوں کے مطابق اکثر کم ظرف و ناتجربہ کار صوفیا اور ادھورے و نامکمل سالکانِ راہ بھٹک جاتے ہیں اور طرح طرح کے توہمات میں پھنس جاتے ہیں ۔ **حکایت** اس مقام کی مناسبت سے اس کلام پر وارد ہونے والے شبہات کو رفع کرنے کے لیے سوال و جواب سمیت ایک ناکارہ اور پیٹو گھوڑے کی کہانی ۔ **بیان** اس وارد کے ورود کا قصہ اور اس وقت کی ساری روئداد کی صورتِ حال کا بیان ۔ **بیان** اسی امر کا تذکرہ کہ اللہ تعالیٰ کی تدبیر و چال سے اپنے آپ کو کبھی محفوظ و مامون نہ سمجھنا چاہیے اور حقیقت بینی کے باوجود بھی حفظِ مراتب اور آداب کو ملحوظ رکھنا چاہیے ۔ **تربیت** سورۂ نصر سے اقتباس کر کے اپنے زمانے کی مشہور اور مرجع خلائق ہستیوں کی تربیت کا بیان اور حالات کی اصلاح اور خالق و مخلوق کے ساتھ راہ و رسم کی تلقین ۔ لوگوں کے رد و قبول کو اہمیت نہ دینے اور ان کے تمام کاروبار سے قطع نظر کر لینے کا بیان ۔ حق تعالیٰ کے معبودِ مطلق ہونے کا بیان ۔ عوام و خواص کی عبادت کا فرق اور سچی ،

باطل عبادت و اطاعت کا تذکرہ۔ آیت سجدہ سمیت اس آیت کریمہ کے کہ "میں نے جن اور انسان کو اسی واسطے پیدا کیا کہ وہ میری عبادت کریں" کی تفسیر اور اُس کے اسرار و رموز کا انکشاف۔ **تحقیق** محبوب کی خدمت کی مثال سے خالص عبادت کی تحقیق۔ **تفریق** عمل کی تین قسمیں ہیں۔ ایک عمل دُنیا کے لیے ایک عمل آخرت کے لیے اور ایک عمل خالصتاً اللہ کے لیے۔ **بیان** اپنے عجز و تقصیر کو سامنے رکھتے ہوئے خدائے غفور و رحیم سے دُعا و التجا کا بیان۔

اُنسٹھواں وارد:

الموسوم دین الحق، اپنے متن اور شرح سمیت۔ **بیان** دین حق کی تعریف اور حق تعالیٰ کی وحدانیت کا اظہار کہ وجود واحد میں نہ لفظی اور نہ معنوی اشتراک ہو سکتا ہے، اور ذات باری تعالیٰ کی یکتائی و یگانگت واضح و روشن ہے۔ **بیان** جامع اور مکمل کمالات کے ساتھ توحید کا جامع اور مکمل بیان، کیونکہ اعتدال کی سیدھی راہ شرک و الحاد سے محفوظ ہوتی ہے۔ **بیان حقیقت عبودیت** بندگی کی حقیقت اور پروردگاری کے غلبے کا بیان، یعنی بندگی کی حقیقت یہی ہے کہ وہ مرتبہ ربوبیت (یعنی پروردگار) کی مکمل طور پر فرمانبردار ہے اور اُس کے احکام سے روگردانی یا نافرمانی کی سکت نہیں رکھتی۔ ہر مخلوق بندوں کے پیدا کرنے والے اسی خالق کی مخلوق ہے اور مطلقاً معبود حقیقی کی عبادت میں سرگرم رہتی ہے۔ ربوبیت (پروردگاری) کا مرتبہ ہر مقام میں عبودیت (بندگی) کے مراتب پر غالب ہے اور اُس پہ حکمران ہے۔ ان حقائق کی دیگر مناسبات اور شکوک و شبہات کے دفعیہ کا مفصل بیان۔

ساٹھواں وارد:

الموسوم بیّنات (روشن دلیلیں) اپنے متن اور شرح سمیت۔ **بیان** بیّنات کی تعریف اور ظاہر حق کے باطن حق پر شاہد ہونے کا بیان۔ باری تعالیٰ کا بہ نفس نفیس اپنے نفس اور ذات حق تعالیٰ کی اپنی ذات پر خود شہادت دینے کا تذکرہ۔ اپنی اسی گواہی و شہادت کے ضمن میں وہ اپنے اسمائے حسنیٰ اور صفات ذاتی سے ہر شے پہ شاہد ہے۔ **بیان** دانشوروں اور عالموں کے دلائل و قیاسات اور عارفوں کی کرامات اور اللہ سے لے کر اللہ تک سیر و گردش یعنی تماشائے ذات اور ہمہ اوقات اسی کی رفاقت اور اسی کا ساتھ۔ اور شمس حقیقت کی روشنی میں علت و معلول کے تمام ستاروں کے گم اور ناپید ہو جاتے کا بیان اور اسی آیت کریمہ کی تفسیر جس کے معنی ہیں قسم ہے آفتاب کی اور اُس کی روشنی کی اور

چاند کی جب سورج کے غروب کے پیچھے آوے ۔ **بیان علت و معلولات** جدید باریکیوں اور نئی تحقیق کی روشنی میں علت و معلول کا اپنے فائدوں سمیت بیان اور اپنی اقسام کے لحاظ سے ہر ایک کی مفصل تعریف و توصیف ۔ **تطبیق** متکلمین اور حکما کی بعض اصطلاحات کی مطابقت کا بیان جو اکثر امور میں عدم واقفیت کی بنا پر خواہ مخواہ باہم جھگڑتے رہتے ہیں اور اپنی ناسمجھی سے مشکلات پیدا کر لیتے ہیں۔ اور اس آیت کریمہ کی حقیقت جس کا مطلب ہے کہ ہر گروہ اُس طریقے پہ نازاں ہے جو اُن کے پاس ہے اور حقیقت بین و حقیقت شناس محققین کی تیز نگاہی ۔ **بیان** علت کی قسموں کا بیان جو علتِ تامہ ، علتِ ناقصہ ، علتِ ماہیت ، وجودی ، مادی ، ظاہری ، فاعلی اور اصلی ، آخری ، شرطی اور رکاوٹوں کو دُور کرنے والی علتوں پر مشتمل ہیں۔ اور نیز ان کے متعلقات کا تذکرہ ۔ **بیان** معلول کی چار قسموں کا بیان پہلی قسم بشری و حیوانی مصنوعات ، دوسری قدرتی مصنوعات ، تیسری مفرد نفسانی مصنوعات ، اور چوتھی روحانی مصنوعات ہے ۔ اُن چھ چیزوں کا بیان جن پہ بشری مصنوعات موقوف ہیں اور جو ڈھا نچے ، مکان ، زمان ، اوزار ، آلات اور حرکات پہ مشتمل ہیں ۔ طبیعی مانع کو اوزار اور آلات کے سوا باقی چار کی ضرورت ہوتی ہے اور نفسانی صنعت گر کو فقط مادّے اور حرکات کی ضرورت ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ کو جو صانع حقیقی اور قادرِ مطلق ہے کسی چیز کی حاجت نہیں ہوتی اور اسی بے محتاجی کی وجہ سے حکما اپنی اصطلاح میں واجب تعالیٰ کو علتِ موجبہ اور علتِ موجدہ گردانتے اور اُسے علتِ تامہ سمجھتے ہیں ۔
بیان اس امر کا بیان کہ رسولِ کریمؐ کے مخلص اُمتی اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ کے سلسلے میں بڑی دُور اندیشی اور احتیاط سے کام لیتے ہیں اور اپنی طرف سے وہ اس کا کوئی نام نہیں رکھتے اور انہی اسمائے حسنیٰ کے سوا جو اُنھوں نے شارع اسلام یعنی سرورِ کائناتؐ سے سُنے ہیں اور کوئی نام اپنی زبان پہ نہیں لاتے ۔ وہ دوسروں کے تراشے ہوئے الفاظ اور پیرایوں کی مقرر کی ہوئی اصطلاحات سے کوئی سروکار نہیں رکھتے ۔
تعریف متکلمین اور حکماء کے مطابق واحدِ حقیقی کی تعریف ، اور منبع کے اصل اور اس کے معانی کے اختلافات اور مدعا کے انکشاف کا بیان ۔ **بیان** وحدت کے مختلف مرتبوں کا بیان جو بہت سے ہیں ۔ ایک مرکبات و کلیات کی وحدت ، دوسری جزئیات و مفردات کی وحدت ، تیسری اضافی و اعتباری وحدت اور آخری وحدتِ حقیقی جو فقط اللہ تعالیٰ ہی کا وجود ہے ۔ حق سبحانہٗ تعالیٰ کی وحدانیت کا بیان اور اس امر کا اظہار کہ بعض لوگ وحدت کو ہر شے میں شامل ہوتے اور عام ہونے کی وجہ سے

وجود کے برابر سمجھتے ہوئے اُسے تمام ذہنی اور خارجی موجودات سے لاحق گردانتے ہیں۔ بعض وحدت کو نفس الوجود ہی سمجھتے ہیں ۔ ان سب میں سے کوئی بھی بات کی تہ تک نہیں پہنچ سکا اور خواہ مخواہ فضول ہی ایک دوسرے سے بحث و تکرار کرتے رہتے ہیں، نیز اصل اور حق بات کا انکشاف ۔ **فائدہ** اس امر کا بیان کہ ہر چند عاقل و دانشمند اپنے علم و دانش کے بل بوتے پر ہاتھ پاؤں مارتے رہتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ کی حقیقت کو پہچاننے کی اپنی سی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن اُس وجودِ مطلق نے اپنے حریم خاص کی حقیقت کے انکشاف کی کوئی راہ کھلی نہیں رکھی ۔ ان کے علم میں اپنی لاتعداد حیثیتوں اور ان گنت اعتبارات سے فقط ایک آدھ اعتبار کو ان کے علم کی دسترس میں دے دیتا ہے ، اور یوں انتخاب و برگزیدگی کی خصوصیت کے ان پر منکشف نہ ہونے کا تذکرہ ۔ استدلالی مثال سے اس صورتِ حال کا اظہار اور انبیاؑ و اولیائے کرام اور صالح مومنوں کے مرتبے و بزرگی کا بیان ۔ **ایک دقیق نکتہ** اس سلسلے میں کہ اگر عدم و وجود کے معنی کو اچھی طرح سمجھ لیا جائے تو کوئی مشکل پیش نہیں آتی ۔ ناسمجھ لوگوں کی ساری غلط فہمیوں کی اصل جڑ یہی ہے کہ وہ اپنے وہم و گمان کے مطابق وجود کو عدم اور عدم کو وجود کے معنی دے دیتے ہیں۔ **بیان** اس امر کا بیان کہ اسلامی عارفوں اور دانشوروں پر ان لوگوں کی نئی تراشی ہوئی اصطلاحات کے سنتے ہی جاہلوں کی طرح کفر کے فتوے صادر نہیں کر دینے چاہئیں ۔ ہاں اُس قسم کی غیر شرعی اصطلاحات کو جو عوام میں شکوک و شبہات پیدا کرتی ہیں، زبان پر نہیں لانا چاہیے ۔ اور ہر امر کی حقیقت کو خوب اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے اور ناسمجھوں کی طرح تعصب سے کام نہیں لینا چاہیے ۔ **بیان** عبارات کی رنگا رنگی اور تعبیرات کی کثرت کی مثالیں، اور اُدھر جس کی تعبیریں کی جا رہی ہیں اس کا اپنی ذات میں واحد ہونے کا بیان ۔ **تلقین** صفائی قلب اور اتحاد کے رستے کی تلقین، اور ملّا کی وہ مشہور کہاوت کہ کچھ کہنے کیوں نہیں اور درویش کی یہ مثل کہ وہ کیوں اور کیسے کہے ۔ لہٰذا چون و چرا کے مارے ہوئے ان دونوں کو کسی چراگاہ میں بھیج دینا چاہیے ۔ **تعلیم** اس بات کی تعلیم کہ اکثر ناواقف حضرات حمیّت و تعصّب میں کوئی فرق نہیں کر پاتے اور غلطی سے اس مصیبت میں پھنس جاتے ہیں ۔ ہر واحد کی الگ الگ تحقیق، مختلف مراتب کا فرق اور اُن کے محمود یا مذموم اور مفید یا مضر ہونے کا بیان، اور ان ہر دو امور کے مبدا و منشا کا بیان کہ یہ ہیں کیا ؟ اور کس طرح ظہور پذیر ہوتے ہیں اور اس سلسلے میں اولیائے کرام اور عارفانِ ذات کیا کچھ فرماتے اور کرتے ہیں ۔ **سوال وجواب** اس بات پہ سوال و جواب کہ اگر علم الٰہی

کے سوا سبھی علوم داہم کی پیداوار ہیں تو پھر خواص وعوام اور صحیح وغلط اور دانش وبے دانشی کی پہچان کیسے ہوگی؟ **بیان** اُن حقائق و دقائق کا بیان جو جامع صفات عارف ذات پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوتے ہیں۔ اس مقام پر مطالب کے تقدّم و تاخّر اور لفظوں اور آوازوں سے مشروط مقدمات کی ترتیب وغیرہ سب سے پردے اور رکاوٹیں دُور ہو جاتی ہیں، بلکہ اس نزول کے سلسلے میں تو اچانک و ناگہاں کے الفاظ لکھنے کی گنجائش تک نہیں وہاں تو محض کشف وانکشاف کا کام ہے۔ **بیان** اس آیت کریمہ کی تاویل کا بیان جس کے معنی ہیں (کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عرض کی) کہ طبعی طور پر ایسے وقت میں میرا دل تنگ ہونے لگتا ہے ، اور میری زبان اچھی طرح نہیں چلتی، اس لیے ہارون کے پاس بھی وحی بھیج دیجیے۔[۱]

اکسٹھواں وارد:

الموسوم نعمت اللہ، اپنے متن اور شرح سمیت۔ **تعریف** نعمت کی تعریف کہ وہ ہے کیا چیز؟ اس کا شکر کیسے اور کس شائستگی سے ادا کرنا چاہیے اور حق تعالیٰ کے عام انعامات و احسانات اور اُس فیاضِ مطلق کی لاانتہا عنایات کا اظہار، نیز اس کی خاص عطا و بخشش کا تذکرہ کہ اس نے ہمیں آیات و احادیث کے اسرار و رموز کو کھولنے والی ایسی مقدس کتاب عطا فرمائی اور ہدایت کی راہ دکھائی اور یوں ہمیں دیگر تمام علوم سے بے نیاز و بے پروا کر دیا تاکہ ہم دین متین محمدیؐ کی تکمیل و اشاعت میں اپنی توجہ مبذول رکھیں۔

شکر و شکایت شکر و شکایت کا بیان۔ شکر گزاروں اور شکوہ شکایت کرنے والوں کے حال کا بیان، نیز یہ اطلاعات کہ شکر و شکایت کا اطلاق کس مرتبے پر ہوتا ہے اور طبعی افعال میں شمار ہونے والے کاموں میں کس درجے پر؟ اس امر کا اظہار کہ انسان کا حال کسی صورت میں بھی شکر و شکایت کے جوہر سے خالی نہیں ہوتا، لہٰذا اگر چشمِ بصیرت کو ان نعمتوں پر کھولا جائے جو شکر کی مستوجب ہیں تو عین خوش بختی و سعادت مندی، اور اگر اپنی نگاہ امتیاز ان امور پر جما دی جائے جن پہ شکایت لازمی ہے تو یہ عین سزا و عذاب کا باعث۔ **بیان** انسان کی ناشکری یا شکر گزاری کی اصل حقیقت کا بیان، یعنی ناشکری کا سبب کیا ہوتا ہے اور یہ کس راہ سے نمودار ہوتی ہے۔ حاصل ہونے والی نعمتوں پہ خوشی و مسرت کے موجب کی دو صورتیں ہیں۔ پہلی صورت قابلِ ستائش ہے جو حقیقت شناسی و عرفان و معرفت سے حاصل ہوتی ہے۔ اُسے شکر کی ادائیگی کہتے ہیں۔ دوسری صورت قابلِ مذمت ہے، وہ پست ہمتی اور حماقت کی راہ سے آتی ہے۔ وہ شکر میں شمار نہیں ہوتی، بلکہ وہ فخر و مباہات کی صورت ہے۔ جو

کم ظرف، کم حوصلہ، پست فطرت، بے ہمت جاہل اور بہ خود غلط ہونے کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔
بیان اس امر کا بیان کہ انبیائے کرام اور اولیائے دین (ان پر خدا کی سلامتی ہو) بشری تقاضوں کے سبھی حالات پیش آنے کے باوجود اللہ تعالیٰ کی دائمی نزدیکی اور دوامی قرب کی بنا پر اہل دُنیا کے غم کھانے والے اور خوشیاں منانے والے زمرے میں شمار نہیں ہوتے۔ تمام مظاہر میں تجلّیٔ ذات کے مسلسل مشاہدے کی وجہ سے ان بزرگوں پر ماسوی اللہ سے خوف و ملال اور دُنیاوی لذتوں سے فرحت و انبساط کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔ **اظہار** اس امر کا اظہار کہ شکر و شکایت نعمت و مصیبت سے مخصوص نہیں، بلکہ دل میں ایسی تمام حالتوں اور کیفیتوں کا نزول تو محض اللہ کی جانب سے ہوتا ہے اور ظاہری بکھیڑوں کے مطابق ہر واحد کے ظہور کی متعدد وجوہات ہوتی ہیں جس سے بُرے یا بھلے درجات و مراتب کا فرق ظاہر ہوتا ہے۔ ان میں سے جو قابلِ مذمّت ہیں، ان کا علاج اور چارہ اولیاء اللہ کی خصوصی توجہ کی برکت سے کیا جا سکتا ہے، نیز انسانوں کی مختلف قسموں کی خصوصیات و لوازمات کا ذکر۔ **تعلیم** رضائے مولیٰ اور صبر و شکر کا اکتساب۔ اس اکتسابی سعی سے تکلّف و تصنّع آہستہ آہستہ رفع ہو جاتے ہیں۔ **تعریف** انشراح قلب اور دل گرفتگی کی حالتوں کا بیان اور عوام و خواص کے مختلف مراتب و مقامات کا ذکر۔ **تحقیق** اس امر کی تحقیق کہ نیکو کاروں کی نیکیاں مقرّبان ذات کی لغزشوں کی سی شمار ہوتی ہیں اور مقربان حق کی خطائیں پرہیزگاروں کے لیے نیکی کا درجہ رکھتی ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ وہ کس قسم کی نیکی اور خطا ہے کہ دوسرے زمرے کے لوگوں کے حق میں اپنے عمومی معانی سے ہٹ کر شمار ہوتی ہے۔ **سوال وجواب** اسی سلسلے میں سوال و جواب کہ جب کامل انسانوں میں تغیّر احوال ماسوی اللہ باقی رہتا ہے تو پھر نرم طبع اور دبدبہ و تمکنت والے لوگوں میں کیا فرق رہے گا اور ان کے حالات و مقامات میں کیا فرق ہوگا۔ **نکتہ** قرآن مجید کی یہ آیت کریمہ کہ کوئی چیز اس کے مثل نہیں اور وہ ہر بات کا سننے والا دیکھنے والا ہے۔ دیکھیے کہ اللہ تعالیٰ نے وجود اور کمالاتِ وجود دونوں کی نفی ممکنات میں رکھ کر حقائق ممکنہ کی نیستی و فقدان کا اظہار فرمایا ہے۔

باسٹھواں وارد:

الموسوم قول الفصل (سچا اور فیصلہ کن قول) اپنے متن اور شرح سمیت۔ **تعریف** اس کی تعریف و توصیف۔ **بیان** نبوت و ولایت کا بیان اور منطقی قواعد کی رُو سے ان کی باہمی نسبت و مناسبت، یعنی نبوت کی نسبت کی کیفیت کا بیان۔ انبیا کا ہمہ وقت مخلوق رُخ رہنا اور مراتب کا ثابت کرنا

اور اُدھر اولیائے کرام کی ولایت کی نسبت کی کیفیت کہ ہمہ وقت ان کا رُخ حق تعالیٰ کی طرف ہوتا ہے ۔ وہ اعتبارات کی نفی کرتے ہیں ۔ ان دونوں امور میں سے ہر ایک کی اصلیت و علّت کا بیان اور واضح اور روشن مثالوں سے عروج و نزول کے تمام درجوں اور مرتبوں کی حقیقت کا انکشاف اور برہان لمی اور برہان انی کا بیان ۔ انبیا و اولیا کے مراتب کا باہمی فرق ، نیز اس امر کا بیان کہ چونکہ نبوت اور ولایت دونوں کلّی امور میں سے ہیں ، لہذا منطقی اصحاب نسبتی کلیات ہیں لسے چار نسبتوں سے ثابت کرتے ہیں جو یکسانیت و تفاوت ، عموم و خصوص مطلق اور عموم و خصوص من وجہ پہ مشتمل ہوتی ہیں ، لہٰذا ان میں پھر کونسی باہمی نسبت ہے اور نبوت کے معنی کی نوعی مفہوم کے لحاظ سے مثال اور ولایت کے معنی کی جنسی مفہوم کے لحاظ سے تشبیہ اور منطقی قواعد کے مطابق دیگر لطائف عالیہ کی تشبیہ اور تحقیقات ، نیز اسی کلیے سے پھوٹنے والی مناسبات کی شاخوں کا بیان ۔ **تحقیق** مرتبۂ نبوت کے سلسلے میں تحقیق جو انسانی کمالات کا آخری اور قربِ ذاتِ حق کا انتہائی مرتبہ ہے ۔ دوسرے کمالات مثلاً رسالت و عالی ہمتی اسی مرتبۂ نبوت کے تمام و کمال میں شامل ہیں اور خلافت ، امامت ، ولایت ، حکمت اور دیگر تمام کمالات کو اسی عالی شان جامع مرتبے کے گرد و پیش و نواح سمیت ۔ **بیان** ان تمام مراتب کی تعریف و توصیف اور اس کی خصوصیات و لوازمات کا مفصل بیان اور ان سب کے باہمی تعلق و لگاؤ کا ذکر ۔ **بیان** تمثیل کی حقیقت کا بیان اور ممثل اور ممثل لہٗ یعنی جسے تشبیہ دی جائے اور جس کے ساتھ تشبیہ دی جائے ان دونوں اشیاء کے مشترکہ تعلق کا بیان ۔ **اظہار** نبوت کی اقسام اور ولایت کی دیگر انواع کا بیان مع ان سوالوں اور جوابوں کے جو اس مقصد کا مقسوم ہیں ۔ **بیان** انبیائے سلف کے دین و شریعت کے منسوخ ہو جانے اور ذاتی اہلیت و سیرت میں تفاوت کے باوجود تمام انبیا میں حقیقی اتفاق و یک جہتی کا بیان ، نیز اولیائے کرام میں اختلاف کا بیان جو مختلف حقائق سے دوچار ہوتے ہیں اور تنازع کلّی کے باوجود ان کی حقانیت و حق گوئی میں کوئی خلل واقع نہیں ہوتا ۔ **تلقین** اچھے عقیدے کی راہ کی تلقین اور عمدہ انداز میں اس کی مزید تقویت ۔ **تنبیہ** اجتہادی حالت یعنی قرآن و سنّت اور اجماع پر قیاس کر کے شرعی مسائل کے استنباط کرنے اور اتحادی نسبت کے سلسلے میں تنبیہ کہ اوّل الذکر میں خطا و صواب کا احتمال رہتا ہے جو امتزاجی حیثیت رکھنے والے خالص محمدی اصحاب پر صادق آتی ہے اور مؤخر الذکر میں خالص وارثانِ محمدیہ آتے ہیں جو کسی قسم کی خطا کے شائبہ تک سے پاک و مبرا ہوتے ہیں اور اس عالی نسبت کی حقیقت کا انکشاف ۔ **بیان**

بعض کے نبوت سے ولایت کی افضلیت کے قائل ہونے کا بیان ۔ ان کے اقوال کی توجیہات و تاویلات کے اظہار کا بیان اور نبوت کے ولایت پر افضل ہونے کو ثابت کرنا کہ وہ امر حق ہے اور بشری رسولوں کے ملکی رسولوں سے افضل ہونے کے سلسلے میں تحقیق و تدقیق ۔

تریسٹھواں وارد :

الموسوم موعظت (وعظ و نصیحت) اپنے متن اور شرح سمیت ۔ **بیان** موعظت کی تعریف اور نصیحت کا بیان جو عالم کی طرف سے جاہل کو مُضر اور مفید امور کے متعلق اک قسم کی اطلاع و آگہی ہوتی ہے اور عارفوں کے وعظ و پند و نصیحت کی حقیقت کا کلی اور جزوی طریق سے انکشاف ۔ مختصر اور مفصل ہونے کی شکل میں نصیحتوں کی تقسیم اور پھر ہر قسم کے لازم اور متعدی ہونے کی بنا پر مزید بٹ جانے کا بیان ۔ **بیان** موجودات کی خودی و یکتائی کا بیان ۔ ہر صاحب علم موجود اس دعوے میں گرفتار ہے مگر باوجود اس کے کہ اعتبارات و قیود کی خرابی کو جن میں وہ خود بھی داخل ہوتا ہے ، ہمہ اوقات اچانک یا حادثاتی طور پر دریافت کر لیتا ہے مگر حقیقت کا کوئی ادراک نہیں کر پاتا ۔ ہر آدمی پہلے تو ذاتی طور پر آپ ہی اپنا معتقد اور اپنی سچائی کا اقراری ہوتا ہے اور دوسرے یہ کہ اپنے ضمن میں تقلیدی طور پر دوسرے امور کا بھی معتقد اور اقراری ہو جاتا ہے ۔ **بیان** اہلِ حق یعنی دین محمدؐ کے مخلص پیروکاروں کے سچے اعتقادات اور باطل پرستوں کے باطل توہمات کا بیان ۔ **تفریق** حق اور باطل کے دعووں کا فرق اور ہر قسم کے لوگوں کے گروہوں کی تقسیم کی تفصیل اور ان لازمی اور ملحقہ امور کے سلسلے میں تحقیق و تدقیق جو عموماً یکساں طور پر عوام و خواص میں سے ہر کسی کے حال سے لاحق ہوتے ہیں ۔ جہاں تک ان کی ذات کا تعلق ہے ، وہ نہ عیب شمار ہوتے ہیں نہ ہنر ، نہ اطاعت نہ گناہ ، نہ وہ نقائص میں آتے ہیں نہ ہی زمرۂ کمالات میں ۔ ہاں قصد و ارادے سے یا اس میں کمی بیشی اور نیتوں کے اختلاف کے مطابق انہی تمام چیزوں میں شامل ہو جاتے ہیں ۔ **حاشیہ آرائی** اس امر کا بیان کہ وحدت الوجود کے قائل اکثر اصحاب عوام کو سمجھانے اور قائل کرنے کے لیے موجودات کو قطرہ و حباب و موج سے تشبیہہ دیتے ہیں اور وجود حق تعالیٰ کو سمندر سے ، حالانکہ سمندر بھی دوسرے محدود تشخصات و مقرّرات کی طرح ایک محدود تشخص ہے ، نیز اس بات کی تعلیم کہ ایسے مطالب کی وضاحت کے لیے بہترین اور مناسب ترین عبارات وہی ہوتی ہیں جن میں کسی قسم کی دقّت و خرابی پیش نہ آئے ۔ **تعریف** خارج اور ذہن کی تعریف اور ان کی

باہمی مناسبت اور ہر واحد کے اعلیٰ و حقیقی معنوں کی تحقیق جو اس کے معانی کا منبع و مبداء ہے۔

چونسٹھواں وارد:

الموسوم کاشف الغطاء (پردوں کو کھولنے والا) اپنے متن اور شرح سمیت۔ **تعریف** کشف و پردہ کی تعریف اور عوام و خواص اور خاص الخاص بندوں کے حال کی حقیقت، اور ان میں سے ہر فرد واحد کے پردوں اور حجابات کا اُٹھا دینا۔ **بیان جبر و قدر** جبر و قدر کے مسئلہ کا بیان یعنی بندوں کا اپنے افعال میں مختار یا بے اختیار ہونے کا بیان بالکل اس روشنی میں کہ جو کچھ مجھے واضح طور پر صاف صاف نظر آیا وہی معرض تحریر میں لے آیا۔ اس سلسلے میں درپیش مشکلات کا حل، اور اس موضوع بحث کی ماہیت کی کماحقہ تحقیق کو وضاحت سے سرانجام دیا اور حق بات تو یہ ہے کہ حجابات کو اُٹھانے اور اخفاء پوشیدگی کو دور کرنے کی آخری حد تک سعیٔ جمیل کی اور پوری فصاحت و بلاغت سے واضح و آشکار انداز میں اُسے پایہ ثبات تک پہنچایا اور اسی ذیل میں دیگر اسرار و رموز کا اظہار جو سالکان راہِ حق کے فوائد پر مشتمل ہوتے ہیں۔ **بیان** فعل کی حقیقت اور ارادے کی حقیقت کا بیان، کیونکہ ارادہ ہی ساری فعلی حالتوں کا منبع و مبداء ہے اور اسی سے ساری فعلی صورتیں ابھرتی ہیں۔ اسی ارادے کی تکمیل ہی پر فعل مطلق یا عین فعلی بن جاتی ہیں۔ وہ فعل کی ساری قسموں میں شامل ہیں۔ خواہ وہ فعل نفسی ہوں یا غیر نفسی، لازمی ہوں یا اختیاری وہ عین ذات ہے، نیز فعل اپنے مصدری معنوں میں۔ اس سے نکالے جانے والا فعل ذات پر زائد کمالات مطلق ارادہ اور نکالنے کا منبع اور جس کا ارادہ کیا ہو، اور جس کے ساتھ فعلیت ہو۔ اس منشا و منبع والا فعل، ان سب کی باہمی یکسانیت، اجنبیّت، تقدم و تاخر اور قبولیت و اختیار کی حقیقت جو ہر امر کے نکالنے کا منبع بھی ہے اور اس کا عین بھی۔ ان تعریفوں اور تحقیقوں کی وضاحت و صراحت، ارادے اور افعال کی قسموں کا بیان جو ہر ذات کا تقاضا اور ان خواہشات کو ظہور میں لانے والی ہوتی ہیں، حقیقی بھی ہوتی ہیں اور اضافی بھی، اُن اضافی افعال اور ارادوں کی تفصیل جو دراصل مراد اور مفعول ہوتے ہیں جن میں کُلّی اور جزوی طور پر جاننے کا اشتراک اور بغیر جاننے کے طبعی رجحان اور طبعی فعل سے اور کسی خارجی سبب سے۔ زبردستی کیا جانے والا فعل۔ ایجاب و اختیار کی قسمیں جو حقیقی، مجازی، ذاتی اور غیر ذاتی ہوتی ہیں، اپنے متعلقات کی تحقیقات اور شبہات کے دفعیہ سمیت، اور اس امر کا بیان کہ دراصل حقیقی اختیار تو فقط اس اللہ جل جلالہٗ کو ہے

جو اپنے ان مظاہر کی کثرت میں ظہور پذیر ہے لیکن ذات الوجود کی طرح ان مظاہر کو اختیار سے نہ نوازا گیا، کیونکہ واحد مخصوص کے معنی تو فقط اُسی موجودِ حقیقی کی ذات وحدہٗ لاشریک ہے۔ باوجودیکہ اس کائنات میں مختلف انواع میں ظہور پذیر ہے، لیکن موجودات وجود نہیں ہیں۔ نیز بندوں پر جبر و اختیار کا اطلاق جمادات، نباتات اور حیوانات کی نسبت سے ہے نہ کہ واجب الوجود کے حقیقی اختیارات کی نسبت سے بلکہ ان کی اضافی اور مجازی اختیار و بے اختیاری میں تقابل ہے۔ ایک میں کامل قدرت ہے اور دوسرے میں وہ بالکل معدوم۔ **توضیح** اس مطلب کی وضاحت شطرنج کے کھیل سے کی جاسکتی ہے اور جلال و جمال ذات کی دو شاطروں سے اور مظاہر کی شطرنج کے مہروں اور امکانی مرتبے کو شطرنج کے تختے کی مثال سے واضح کیا جاسکتا ہے اور ہر حقیقت کا کماحقہٗ انکشاف شطرنج کی بازی کو سمجھنے سے ہو سکتا ہے۔ **ہوش افزا** اسرار و رموز کو سمجھنے اور ہوش بڑھانے کے سلسلے میں غفلت کو دُور کر دینے والے اُس رسالے کی طرف رجوع کریں جو حضرت قبلہ بزرگوارم کی تصنیف اور اُن کے رشحاتِ قلم ہیں۔ **بیان** اس مشہور مقولہ کہ آدمی نہ مجبورِ محض ہے اور نہ ہی کُلّی مختار، بس ان دونوں کے بین بین ہے۔ (کہ ایں فرمودۂ سلطان بدراست کہ ایمان درمیان جبر و قدر است) کے معانی کا بیان۔ قاعدہ کلیہ کے ڈھنگ پر تاکہ دوسری عبارات میں بھی کام آسکے اور ہر جگہ مفید ثابت ہو۔

پینسٹھواں وارد:

الموسوم صنع اللہ (خدا کی کاریگری) اپنے متن اور شرح سمیت۔ **بیان** اس اسم کی تعریف کا بیان ہر موجود کی حضرت وجود سے بلاواسطہ نسبت کے اظہار کے ساتھ۔ **بیان** اس امر کا بیان کہ ہر موجود وجودِ اوّل سے نکلنے والا ہے۔ چنانچہ حکما کے نزدیک صادر اوّل صرف عقلِ اول ہے اور یہ بھی کہتے ہیں کہ واحد سے سوائے واحد کے اور کچھ نہیں نکل سکتا۔ اِدھر صوفیا کے نزدیک پہلا تعین حقیقت محمدیہؐ کا ہے۔ علم فلسفہ اور تصوف کے ماہرین نے ان ہر دو معانی میں مطابقت پیدا کی ہے۔ مخلص پیروانِ رسولؐ کے پاس اس موضوع بحث پہ خاص بیان اور مخصوص تقریر ہے جو حکما اور صوفیا کی تحقیقات میں بھی شامل ہے اور سب سے ممتاز بھی ہے۔ **تفسیر** اس آیت کریمہ کی تفسیر کہ "ہم انسان کے اسی قدر قریب ہیں کہ اُس کی رگِ گردن سے بھی زیادہ"[۴۳]۔ اُس ذات سبحانہٗ تعالیٰ کا اپنے تمام اسماء و صفات و ہر لحاظ سے انسان سے قربِ حقیقی کا بیان۔ **حاشیہ آرائی** اس سلسلے کی وضاحت

کہ متکلمین کے نزدیک موجود جوہر ہیں اور وجود وہ امر جو چھینا گیا اور محققین کے نزدیک موجود وجود ہے اور جوہر چھن جانے والی چیز ۔ **سوال** اس سلسلے میں ایک سوال کہ وجود سراپا خیر ہے اور ہر خیر و کمال کا منبع و مبداء ہے اور عدم سراپا شر ہے اور ہر نقص و فتنہ و شرارت کا مبدا و منبع ۔ پھر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ عدم آثار خارجیہ کا منبع و مبدا نہ ہو ۔ اور سوال کا شافی جواب ۔ **سوال** جس طرح علم کو وجودِ ادراک کہتے ہیں اور اسی رعایت سے اُسے عدم نایافت بھی کہہ سکتے ہیں اور جہالت کو عدم وجدان کہتے ہیں تو اُسے وجودِ نایافت بھی کہا جا سکتا ہے، لہٰذا پھر اس اعتبار سے وجود کو نقص و شر کا منبع اور عدم کو خیر و کمال کا مبدا بھی کہہ سکتے ہیں ۔ ان سب کا اک شافی جواب ۔ **تحقیق** اس آیتِ کریمہ کی تفسیر جس کے معنی ہیں، "حالانکہ تم کو اور تمھاری بنائی چیزوں کو اللہ ہی نے پیدا کیا ہے"۔ اعمال کی تخلیق اور دیگر افعال کی نسبت اسی ذاتِ حقیقی سے کیونکہ فاعلِ حقیقی وہی ہے ۔

چھیاسٹھواں وارد :

الموسوم موازین القسط (عدل کے ترازو) اپنے متن اور شرح سمیت ۔ **بیان** اسی اسم کے متعلقات کا بیان ۔ **بیان** ہدایت دینے اور گمراہ کرنے نیز ہدایت و گمراہی کا بیان ۔ ہدایت کی دو قسمیں ہیں ۔ راہ کا دکھانا اور مقصود تک پہنچانا ۔ اس کے مقابلے میں گمراہی کی بھی دو ہی قسمیں ہیں ۔ ان سب میں سے ہر ایک کا باقی سب سے حقیقی و مجازی فرق ۔ پہلے تو اصل ۔ جو حق تعالیٰ سے مخصوص ہے اور اُس کی اضافی صفات میں سے ہے ۔ دوسرے اُس کا سایہ جو اُس مظاہر سے متعلق ہے ۔ ان مظاہر کے اضافی مادی انبیا و اولیائے کرام میں اُن کے مددگاروں میں فرشتے، عقول اور ارواح اور گمراہ کُن نفس امارہ و شیطان ہیں اور ان کے مددگار لالچ، آز اور ہوا و ہوس ہیں ۔ **بیان** جہاد میں جنگ و جدال اور قتل و غارت کا بیان اور سب ہدایت یافتہ اور گمراہ لوگوں کے حال کا اظہار اور متوسط الحال لوگوں کے حالات کے مطابق مناسب تدابیر ۔ **حدیث** ابلیس اور آدم علیہ السلام کے ذات باری تعالیٰ سے جواب و سوال کا بیان ۔ **بیان** ہدایت اور گمراہی کے امور کی علامات و کلیات کا بیان ۔ اور رضا اور غیر رضائے حق والی باتوں کی شناخت کے مفصل طریقے کا بیان جس سے ساری جزئیات کھُل کر خود بخود سامنے آ جاتی ہیں ۔ **بیان** اصل ایمان، خلوص قلب اور راسخ عقیدے کا معتبر ترین ہونا ۔ ان کے بغیر کوئی پند و نصیحت فائدہ مند نہیں ہوتی اور نہ ہی پیروانِ محمدؐ کے عزیزان و اقربا کی اصلاح

حال کرتی ہے۔ ان میں سے ہر ایک کی خوبی و بہتری کا بیان اس پختہ طریقے کی کتابوں کی تاثیر و برکت ۔ **بیان** عارفوں اور اولیائے کرام کی آرائش و تہذیب، اخلاق اور پیغام رسانی کا بیان جو اللہ تک پہنچنے کا وسیلہ ہیں اور وصل، شادی، عروس، مشاطہ کے الفاظ کی تعبیرات سے حقیقت کا انکشاف اور ایسی تعبیرات کے خالی از خطر و ناملائم ہونے کا بیان اور ایسے کلمات کی دیگر مناسبات اور واسطہ کی صداقت و راستی کی پہچان کی علامات اور فریب کار، مکار اور دغاباز لوگوں کے باطل، جھوٹے اور دروغ گو ہونے کی علامات اور مقصود تک پہنچنے کے سلسلے میں ظن و گمان اور غلطی میں ڈالنے والی چیزوں کے دفعیہ کا بیان ۔ **بیان** اور اس آیت کریمہ کی حسن و خوبی و باریکیوں کا اک نئے انداز سے بیان جس کے معنی ہیں کہ "آپ جس کو چاہیں ہدایت نہیں کر سکتے[۵۹] بلکہ خدا جس کو چاہے ہدایت کر دیتا ہے۔ **تصریح** ہدایت کی مطلوب تک پہنچانے والی تعریف کی مناسبت سے ہر شے کے مطلوب کی وضاحت و صراحت ۔ اور مطلوب کی قسموں کی وضاحت۔ ایک مطلوب ذاتی ہے اور وہ مطلوب یا وجوبی ہے یا امکانی ۔ دوسری قسم اضافی ہے اور وہ داخلی ہو سکتی ہے یا خارجی اور داخلی یا تمام کرنے والی ہوگی یا سیدھا کرنے والی اور خارجی یا قریب ہوگی یا بعید۔ قرب و نہایت قرب اور دوری اور نہایت دوری کے مراتب کے فرق سمیت ۔

سڑسٹھواں وارد :

الموسوم غایت التحقیق ۔ اپنے متن اور شرح سمیت ۔ **تعریف** اس اسم کی تعریف اور وجہ تسمیہ ۔ **تقابل** عدم و وجود کا توازن و تقابل کہ تمام مصنوعات کے ظہور کا منبع اور جملہ موجودات کے وجود کا مبدا ہے ۔ عدم و وجود کی یہی دو تقابلی حیثیتیں ہیں۔ ہر واحد انہی دو امور سے ہر ماہیت و حقیقت کو اُس کے تصور کے وقت صحیح معنوں میں اپنی طرف کھینچتا ہے اور اس مقولے کے صادق آنے کی اہلیت پیدا کرتا ہے کہ وہ موجود ہے یا موجود نہیں ہے اور واجب و ممکن کی حقیقت کا بیان خواہ وہ موجود ہو یا معدوم اور تمام منفی تصدیقات اس عدم مطلق کے معانی کے تحت آتی ہیں اور اعتباری عدم میں سے شمار ہوتی ہیں اور ساری لازمی تصدیقات وجود مطلق کے معنی کے تحت آتی ہیں اور اضافی وجودات کے زمرے میں سے گنی جاتی ہیں ۔ تصور کے اتحاد اور نفس الوجود اور نفس العدم کی تصدیق اور تمام اعتباری اضافتوں اور نسبتوں اور اضافی تصوروں اور تصدیقوں کا ایک سے دوسرے کی طرف منتقل ہونے کا اظہار

اور ہر امر کی حقیقت کا انکشاف ۔ عینی اور ظلّی وجود کے مراتب کی تحقیق اور اُس کے بالمقابل عدم حقیقی اور اعتباری کا فرق اور اسی سلسلے میں تقابل کی چار قسموں کا ذکر جو دگنا ہوتا یا تضاد، صاحب قدرت یا بے اختیار اور منفی و مثبت پہ مشتمل ہیں اور ہر واحد کی مثالوں اور اُن کے متعلقات کی خصوصیات اور لوازمات سمیت اس کی تعریف و توصیف، مثلاً باپ اور بیٹے کی مناسبات کا ذکر اور اپنے حسب حال بیان اور قبلہ والد بزرگوارم (ان پر خدا کی دائمی برکتیں ہوں) کی نالہ عندلیب نامی عمدہ تصنیف کے بعض مطالب کی تشریح یعنی ذات و صفات خداوندی کی تحقیق کا مطلب ۔ اور اس امر کا ثابت کرنا کہ صفت اول وجود ہے اور ذات باری تعالیٰ ہر قسم کے اطلاقات سے بے نیاز اور مبرّا ہے اور ساری موجودات اس کی صفات و اسمائے حسنیٰ کے مراتب سے فیض یاب ہوتی ہیں۔ اور کوئی مخلوق مرتبۂ خالق سے حصہ نہیں رکھتی اور موضوع بحث سے متعلق سوالات مع ان کے جوابات کے اور سب مطالب کی مفصل تشریح اور تمام مقاصد کی مکمل وضاحت ۔ ضمناً واجب میں لفظ امکان عام کے اطلاق کے متعلق توہمات و شبہات کا دفعیہ و ازالہ ۔ **توضیح** اور اس امر کی وضاحت کہ کتاب ہذا، یعنی علم الکتاب اور والد بزرگوارم کی تصنیف نالۂ عندلیب کے تمام مطالب میں باہمی موافقت اور مطابقت پائی جاتی ہے اور ان میں کسی قسم کے اختلاف کا قطعاً کوئی شائبہ تک نہیں اور جو کچھ لکھا جا چکا ہے یا لکھا جائے گا وہ میرے قبلہ والد بزرگوار کی عین مرضی کے مطابق اور ان کی خوشنودی و رضامندی کا باعث ہوگا ۔ (اللہ تعالیٰ ان کے راز کی نصرت اور نیکیوں کی برکت سے ہماری مدد کرے)

اڑسٹھواں وارد:

الموسوم مثل اعلیٰ اپنے متن اور شرح سمیت ۔ **بیان** تمثیل کے معنی کا بیان اور مثل اور جس کی مثال دی جائے اور جس سے مثال دی جائے کے سلسلے میں تحقیق اور ان کا باہمی تعلق و رابطہ اور جسم طبیعی اور تعلیم کے فرق کی طرح ان کے مراتب کا اعتباری امتیاز و فرق ۔ **کشف** ڈھانچے اور صورت کی مثال سے حقیقت کا انکشاف جیسے کہ شیخ محی الدین اکبر ابن عربی قدس سرہٗ نے ذاتِ حق کو جسم اور مخلوق کی صورت سے تشبیہہ دی ہے۔ چونکہ بات سے بات نکلتی ہے، لہٰذا اس بندۂ ناچیز نے ان کی تحریر سامنے رکھتے ہوئے اس کے برعکس لکھا ہے اور ہر دو تحریروں پر اعتراضات و سوالات و جوابات لکھے ہیں اور آنکھوں کے سامنے سے پردہ اُٹھا دیا ہے، نیز شیخ محی الدین اکبر کے مرتبے، مقام اور عظمت کا تھوڑا بہت بیان اور اس بزرگوار کے

علوم و تحقیقات کی حقیقت کی اصلیت اور ان کی ذاتِ گرامی سے مکمل حُسنِ ظن رکھتے ہوئے بھی اک بے لاگ قسم کی بے تعلقی ہوتی ہے، نیز مخلص مومنوں کے جامع پن اور خصوصیت کی عظمتوں اور آفتاب عالمتاب کے طلوع کی مانند ظہور محمدیت کی درخشندگی پر اک عمدہ بیان۔ **بیان** شعر و شاعری کی حقیقت کا بیان۔ ظاہری بندوبست اور اپنے تمام اشعار کی صورت حال اور شروع سے لے کر آخر تک در پیش آنے والے اسرار و رموز کا ذکر۔

اُنہتّرواں وارد:

الموسوم اصل الاصول اپنے متن اور شرح سمیت۔ **بیان** اصول و شاخوں کی اقسام کا بیان اور شاخوں کی جڑوں کی طرف رجوع کی قسمیں اور اُس ملاپ کی اقسام جو دیگر اشیا اور ان میں ہوتا ہے اور اُس جدائی و علیحدگی کی قسمیں جو دوسری الگ تھلگ اشیا اور ان میں ہوتی ہیں۔ اور فلسفیوں اور بعض صوفیانِ اسلام کے احوال و قاعدہ کا بیان اور اسی مقصد سے متعلق اسی قسم کے دیگر مقدمات کا تذکرہ۔ عقیدے، اقرار اور ایمان کی نسبت کی برکت اور الحاد، انکار اور باطل کی شومیٔ قسمت اور ان حالات و کیفیات کی کی کلیات اور جزئیات تک کا شروع سے لے کر آخر تک کا جائزہ۔ **تعریف** اصل کی اک نئے انداز سے مفصل تعریف اور اُسے درخت کے بیج سے تشبیہہ دینا اور نہایت واضح و آشکار طریق سے اس کی حقیقت کا کھولنا۔ نیز اُس کے مقابل میں شاخ کی تعریف اور اُسے اُسی درخت کی شاخ سے تشبیہہ دینا۔ **بیان** وصل و جدائی کا بیان۔ کیونکہ ہر اکائی کی دو قسمیں ہیں، ظاہری اور باطنی، پہلی جسم و مقدار میں پائی جاتی ہے اور دوسری علم و رنگ ڈھنگ میں۔ پھر منبع و مبدا، مجاز و حقیقت، اتحاد و امتیاز کی حیثیتوں کے اختلاف سے ہر اکائی اور اُس کے متعلقات کے مرتبوں اور درجوں کی تفصیل۔ اس کے علاوہ ذات و صفات کے لحاظ سے ان کے اور ساری موجودات کے متعلق چھان بین۔ قرب و نہایت نزدیکی اور دُوری و بہت دُوری، وصل مطلق (غیر محدود و غیر مشروط) وصل اور وصل سے آزاد، لامحدود، جدائی اور جدائی سے آزاد و خود مختار کا بیان۔ کمالات کی مختلف قسمیں جو تین طرح کی ہوتی ہیں۔ عقلی یا ذاتی سعی سے حاصل کردہ اور خدائی عطیہ، جنسی اور نوعی اتفاقات کے معانی اور شخصی اور نوعی معانی کے امتیازات، کامل انسانوں کے کمالات اور ناقص افراد کے نقائص کا فرق۔ **بیان** اصل کی سہ گانہ قسمیں جو قریب، بعید اور عالی اصل الاصول پر مشتمل ہیں۔ جنسِ قریب، جنس بعید اور جنس عالی جسے جنس الاجناس

رسب جنسوں کی سرتاج لکھتے ہیں - ان کی مثالیں اور ہر جنس کے افراد کا ذکر - نیز اس امر کا اظہار کہ اصل کا کہاں تلک اطلاق ہوسکتا ہے ، جس سے آگے اس کا استعمال نہیں کیا جا سکتا - اور قاعدۂ اصول کی بعض قسموں کی نئی اسم گزاری ، اصل جدا طراف ، ذاتی امکانی اصل ، حقیقی وجوبی اصل ، اعتباری اصل مرکب ، اضافی اصول مفرد ، حقیقی اصول مفرد - حقیقت کے مرکب و مفرد ہونے اور خود حقیقت و مجاز کی اصلیت کا بیان - **بیان** شاخوں کی سہ گانہ اقسام ، یعنی ملانے والی ، جدا کرنے والی اور نتیجہ یا ثمرہ دینے والی شاخیں ، نیز کیا شاخ اصلی جدا کرنے والی ہے یا ملانے والی - اور تین قسموں کا بیان - **رجوع فرع** شاخ کا اپنی جڑ کی طرف رجوع کرنے کی حقیقت کا انکشاف - ایک رجوع شخصی ہے خواہ وہ سنوارنے اور بنانے والا ہو ، خواہ بگاڑنے اور مٹانے والا ، دوسرے وصفی رجوع اور تیسرے نفسی رجوع ان تینوں اقسام کی ہر اکائی کی تفصیل سمیت - ہر انداز سے اللہ کی طرف رجوع کرنے کی حقیقت کا انکشاف اور انا للہِ وانا الیہِ راجعون کے بموجب انسانی عمر کے سن و سال کی مناسبات اور ہر حالت اور وقت کی مصلحت سے مطابقت کا بیان - **بیان** آسمانی بزرگ ہستیوں اور زمینی ادنیٰ ماؤں کا بیان جو دودھ پلانے والی دائیوں اور دودھ شریک حضرات کے ہیں اور مربیٔ ماؤں اور حقیقی آبا کے مرتبوں کے رموز کا انکشاف اور عیسوی نسبت اور محمدی جامعیت و افضلیت کی نسبت سے جوہر حقیقت کا بیان اور اس سلسلے میں حضرت قبلہ والد بزرگوارم کے خصوصی وفورِ محبت کا ذکر ، اپنے حالات کی خصوصیات کا باپ بیٹے کے مخصوص تعلقات و معاملات سمیت تذکرہ - خاص قرب کے معاملے اور ختم نبوت و رسالت کا بیان اور عام و خاص نبوت کے کمالات کے بلند مرتبے کا اظہار - امامت کے مرتبے کی خصوصیت اور فیض کے جاری رہنے کا بیان اور حضرت امام کا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شرع متین اور طریقت سے نسبت کا اظہار -

سترّواں وارد :

الموسوم احسن تقویم اپنے متن اور شرح سمیت - **بیان** احسن تقویم اور اسفل السافلین کے معنی اور اُس سے مراد اور سورہ والتّین کی باقی ماندہ ساری آیات کا بیان - **بیان** انسان کے اشرف المخلوقات ہونے کا تذکرہ ، نیز کمالات کے حصول سے اُس کی تکمیل کا بیان - اسی مطلب کا عمدہ عبارات ، دقیق باتوں ، مربوط انشا پردازی اور اعلیٰ تحریر کے ذریعے اظہار اور مناسب استعارات

کی مدد سے ان کے معانی کا سمجھنا اور سمجھانا ۔ **بیان** ساری مخلوقات کی تخلیق کے حال کا بیان اور ابتدا سے لے کر انتہا تک تمام پیدا کردہ موجودات کی حقیقت کا جوہر۔ اسی ضمن میں انسانی معاشرے کی حقیقت کے ظہور کا بیان جو تمام امکانی اور وجوبی مراتب پر مشتمل ہے اور جس میں اسمائے حسنیٰ وصفاتِ ذات کے جملہ مظاہر جمع ہیں جو کچھ بھی کائنات میں ہے اسی کی خاطر پیدا کیا گیا ہے۔ ہر شے اس کی خدمت پر مامور ہے اور اُس کے ماتحت اس کارخانۂ ہستی کا وہی حاکم اور مخدوم ہے ۔ یہ سب کائناتیں اس کی ذاتِ گرامی سے متعلق ہیں اور تمام مقررہ اطراف کی جانب سے وہ کون و مکان کے تمام مراتب پر حاوی ہے ۔ نیز چھ سمتوں کا ذکر اوپر اور نیچے والی سمتیں حقیقی اور باقی چار اضافی ہیں جو اضافات کے ادل بدل سے تبدیل ہو جاتی ہیں ۔ **اظہار** عرش عظیم پر اللہ تعالیٰ کا متمکن ہونا محض نورِ وجودی کے لحاظ سے جسمانی ہے اور انسانی حقیقت پر جو کہ عرش اعظم ہے وجودی اور عرفانی لحاظ سے ۔ **کشف** لفظ واقع اور نفس الامر کی حقیقت کی وضاحت اور ان کے رموز کی ماہیت کا شکوک و شبہات کے دفعیہ سمیت بیان اور خمسہ (پانچ) اور ستہ (چھ) کے تنزلات کا ذکر ۔ **تفصیل** قطب مدار اور قطب ارشاد کے مراتب کی ان کی علامات سمیت تفصیل اور مختصراً دیگر اہل خدمات کا ذکر ۔ **بیان** ان آیات قرآنی سے کیا مراد ہے جن کے معانی یہ ہیں کہ تمہارے نفع کے واسطے دن اور رات کو (اپنی قدرت کا) مسخر بنایا اور تمہارے نفع کے واسطے سورج اور چاند کو (اپنی قدرت کاملہ کا) مسخر بنایا جو ہمیشہ چلتے ہی رہتے ہیں اور تمہارے نفع کے واسطے نہروں کو (اپنی قدرت کا) مسخر بنایا اور انسان کے لیے سارے جہان کی تسخیر کا بیان ، نیز یہ کہ انسان کو نوعِ انسانی کے کامل ترین افراد کی تقلید کرنی چاہیے نہ کہ اپنے سے الگ کسی غیر کی اطاعت ۔ **بیان** انسانی کمالات اور نقائص و عیوب کا بیان ۔ اس دُنیا اور اگلی دُنیا کا تفصیلی بیان جس کا اللہ تعالیٰ کے سوا رسولؐ خدا ہی کو بہتر علم ہے اور حضور پاکؐ کے بعد اپنی اپنی استطاعت کے مطابق آپ کے نائبان کا حال جو حقیقتِ حال سے واقف ہوتے ہیں اور خدا و رسولؐ سے خصوصی تعلق کی بنا پر اطاعت کے لائق اور اُس آیت کریمہ کی تفسیر کہ اے ایمان والو تم اللہ کا کہنا مانو اور رسولؐ کا کہنا مانو اور تم میں جو لوگ اہلِ حکومت ہیں ان کا بھی۔ اور اہلِ حکومت کی اقسام کا بیان جس کی دو قسمیں ہیں ایک ظاہری اور ایک باطنی۔ ان میں سے ہر ایک کی آگے پھر کئی قسمیں ہیں ان کا ذکر ان کے ناموں سمیت بالخصوص مخلص پیروانِ محمدؐ کی عظمت کا واضح و

آشکارا بیان ان کی شہادتوں اور علامات کے ساتھ اور جزئی خصوصیتوں کی تشریح و توضیح ۔ امّت محمدیہ میں امیر المحمدیّین کے برحق و اولی وارفع ہونے کا تذکرہ اور قرآنی آیات سے اقتباسات کی روشنی میں ان کے منفرد مقام اور بلند مرتبے اور دیگر تمام حالات کا انکشاف ۔ **تعلیم** کمال انسانی کی راست روی کی تعلیم جو دُنیا اور آخرت دونوں کے لیے مفید ہے اور سبھی کو یہ راہ اختیار کرنی چاہیے ۔ اس سے حقیقت و معرفت کی راہیں کھلتی ہیں ۔ راہِ سلوک کا مکمل بیان کہ اس کے کیا معنی ہیں اور کیسے میسر آتی ہے ۔ **بیان** ارواح جمیلہ و پاکیزہ سے مدد و معاونت کا بیان اور روحانی فیض سے شرف یاب ہونے کا تذکرہ کہ یہ کس طرح نصیب ہوتا ہے ۔

الکتروال وارد:

الموسوم تذکرہ اپنے متن اور شرح سمیت ۔ **اظہار** اس لفظ کے معانی ، نیز اس سے کیا مراد ہے ۔ **اقتباس** اور تنبیہہ و ندامت سمیت قربِ قیامت کا ذکر آیاتِ قرآنی کی روشنی میں ۔ **بیان یادموت** موت و فنا کی یاد کا اور ماسوی اللہ سے خطرات کے ترک کا بیان اور یاد موت کی ہفت پہلو اقسام جو بمنزلۂ اصول کے ہیں اور جن میں دیگر جزئی اقسام بھی شامل ہیں جو اس کی کثیر التعداد شاخیں ہیں ان سب کا تذکرہ ہر اکائی کی تفصیل کے مطابق ۔ **اوّل** پہلی قسم ذاتی و حضوری یاد ہے ۔ یہ علم حضوری کسی وقت بھی نفس سے زائل نہیں ہوتا ۔ اپنی ہستی کا علم اور اپنے نفس کی یادداشت اس علم کی شاخوں میں سے ہیں جیسے ہوش اور اپنی ذات اور خودی کا ادراک و آگہی بھی کہتے ہیں ۔ یہ اکتسابی علم سے متعلق ہے ۔ اس کی آگے دو قسمیں ہیں اجمالی اور تفصیلی ۔ **دوم** دوسری قسم محبت و رغبت و میلان کی یاد ۔ اس کی بھی دو قسمیں ہیں ۔ جبلّی اور عارضی ۔ اور مراتب کے فرق کے لحاظ سے اس کی شاخوں کے مندرجہ ذیل نام ہیں ۔ عشقی یاد ، شوقی ، اشتیاقی ، ہوسی ، فرحی ، نفعی ، طمعی ، لذتی ، شہوتی ، رغبتی اور ذوقی وغیرہ وغیرہ ۔ **سوم** تیسری قسم ناپسندیدہ کراہتی و ناکارہ یاد ہے ۔ اس کی بھی کئی شاخیں ہیں ۔ مثلاً غضبی ، عداوتی ، خلافی ، طبعی ، ڈراؤنی ، نفرتی ، ضرری ، خوفی ، حزنی ، تاسفی اور غمینی ۔ **چہارم** یاد کی چوتھی قسم خیالی اور اظہاری ہے ۔ اس کی شاخیں کم ہیں ، یا ارادی ہے یا اتفاقی زبانی یا حدیثِ نفس و خیالات ہے ۔ اسے یادِ اجمالی بھی کہتے ہیں ۔ **پنجم** پانچویں قسم تصدیقی و فکری ہے یہ مفصل یاد ہوتی ہے اس کا تعلق باطنی قوا سے ہوتا ہے اور اس کی شاخوں میں ایجابی ، علمی ، عقلی ، وہمی ، خیالی ، حفظی اور ظنی

یادیں شامل ہیں۔ **ششم** چھٹی تقریبی و تحریکی یاد ہے۔ یہ حسی، لازمی، ضامنی، مطابقتی، دلالتی، اشارتی اور کنایتی شاخوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ ان جزئیات کی بھی بے شمار شاخیں ہیں۔ **ہفتم** ساتویں یاد استعدادی اور فطری ہے۔ ان دونوں کے باہمی فرق کے بیان سمیت۔ استعدادی یاد کی شاخوں میں دوامی، دائمی، اکتسابی (حاصل کردہ) وہبی (عطاشدہ) یادیں شامل ہیں۔ اور فطری یاد کی شاخوں میں حالاتی، وقتی، استیجابی، زمانی اور مکانی شاخیں شامل ہیں۔ **بیان** موت کی یاد کا مطالعہ اور اس کی مذکورہ بالا مختلف قسموں کا ملاحظہ اور ان کا باہمی فرق کہ ان میں سے کون کونسی اچھی خوب اور مفید ہیں اور ہونی چاہئیں۔ اور کون کونسی خراب، بری اور ضرر رساں ہیں جو نہ ہونی چاہئیں۔ یادداشت فنا سے کیا مقصود ہے اور یہ کیسے ہوتی ہے۔ قلبی بے خوفی و بے باکی کیا چیز ہے اور کیسے حاصل ہوتی ہے۔ **بیان** جہاد اصغر یعنی ظاہری جہاد اور جہادِ اکبر یعنی باطنی جہاد کی حقیقت و ماہیت کا بیان۔ ان دونوں امور کا آگے چل کر چھیاسیویں (۸۶) وارد میں مفصل ذکر آئے گا جس کا نام جہادِ اکبر ہے۔

بہتّرواں وارد:

الموسوم کشف الکرامت اپنے متن اور شرح سمیت۔ **بیان** مکرم بندگانِ خدا کے حق میں کراماتِ الٰہی کا بیان اور ان پر حقیقت کے انکشاف کا ذکر۔ آیاتِ قرآنی کے حوالے سے حضرت آدم علیہ السلام کا قصہ، فرشتوں کے سجدہ کرنے، ابلیس کے انکار و تکبّر اور حق سبحانہ تعالیٰ کا اپنے بندے کی عزّت افزائی و حُرمت کا ذکر اور تبلیغ و دعوتِ حق کے دیگر امور اور رشد و ہدایت کے دیگر خاص رموز نیز قرآنی آیات سے ان تمام حالات و واقعات کا تذکرہ۔ **بیان اظہار و اخفا** کشف و کرامت کے ظاہر کرنے اور چھپانے کا بیان۔ طریقت کے عین مطابق پند و نصیحت کے انداز میں یہ تعلیم کہ شیخ و مرشد کو اس قسم کے معاملات کو چھپانے اور پوشیدہ رکھنے اور اظہار و اعلان اور ایسے اوقات و حالات میں خالق اور مخلوق سے اپنا معاملہ کس طرح کا رکھنا چاہیے تاکہ مکر و فریب اور ریا و دغا سے محفوظ رہتے ہوئے اپنے آپ کو لالچ، حرص، حماقت، کم عقلی، دھوکے اور ابلہی سے ذلیل و خوار نہ ہونے دے، نیز ان سب کی حقیقت و ماہیت۔ تعریف و توصیف کی لفظی اور معنوی لحاظ سے مفصل وضاحت اور تشریح اور ہر اکائی کی مختلف قسموں کا فرق۔ **تقسیم** کشف کی چار قسموں، یعنی کشف ہستی (دنیوی) کشف الٰہی، کشف عقلی اور کشف ایمانی کا پوری تشریح و توضیح کے ساتھ بیان اور ان کے سارے متعلقات

کا بیان۔ اور ان سب قسموں کی جزئیات کے اسباب، علامات، لوازمات اور موجبات کی تفصیل اور اسی طرح کرامت کی چہارگانہ قسمیں، یعنی عام کرامت، خاص کرامت، تصرفاتی کرامت اور مافوق العادت کرامت، ہر ایک کے فرق اور شناختی امتیاز سمیت۔ انبیائے کرام کے روشن دلائل و شواہد اور معجزات کا بیان اور اولیائے کرام کی کرامات و تصرفات کا باہمی فرق اور ہر گروہ کے آثار و علامات اور تاثیرات و تصرفات کا باہمی فرق اور نبوت اور ولایت کے معاملات کے سلسلے میں حفظ مراتب کا ملحوظ خاطر رکھنا اور اجازت نہ ہونے کی وجہ سے بعض رازوں کے افشا کرنے پہ کمال عقیدت و ارادت سے مکمل خاموشی اختیار کرنا۔ **بیان** اس امر کا بیان کہ جس طرح کشف و کرامت اور تصرف کا ظہور ہر کسی انسان سے سرزد نہیں ہوتا اسی طرح ہر انسان اُنھیں سمجھ اور دیکھ بھی نہیں سکتا۔ اللہ تعالیٰ جس طرح ان کراماتی امور کا ظہور بعض خاص حضرات کے لیے مخصوص کر دیتا ہے، اسی طرح اس کے فہم و ادراک اور قبول کی قوت بھی بعض کو ہی عطا کرتا ہے۔ عام طور پر سب لوگوں کو نہ یہ نظر آتے ہیں اور نہ ہی سب لوگوں سے ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ لہٰذا قابل و مقبول حضرات کے وجود کی موافقت، کراماتی حالات و اوقات کی مطابقت کے ساتھ کرامت کرامت بن جاتی ہے اور ظاہری طور پہ نظر آ جاتی ہے و گرنہ نہیں۔ اس امر کا اظہار کہ معجزہ شرطِ نبوت ہے مگر کرامت ولایت کی شرط نہیں ہے سوائے ان اولیائے کرام کے جو کمالاتِ نبوت کے حامل ہوتے ہیں ان کے سلسلے میں ظہور کرامت شرط ہے۔ لیکن وہ کرامات اور قسم کی ہیں جن کا مرتبہ ان عام جانی پہچانی کرامات اور تصرفات سے بہت بلند و اعلیٰ و ارفع ہے نیز ان کرامات کا بیان جو ایسے کامل و اکمل انسانوں سے مختص ہوتی ہیں۔ ایسی کرامات و تصرفات کے ظہور کی کثرت اسباب و اوقات اور ان کے وقوع کی کمی کے اوقات کا بیان اور اس امر کا اظہار کہ ایسے امور کو سہل و سرسری سمجھنا چاہیے اور ان کرامات و تصرفات کو کوئی اہم اور عظیم چیز نہیں سمجھنا چاہیے۔ باوجودیکہ اولیائے کرام کی کرامات کا منکر نہیں ہونا چاہیے، لیکن ان سے چشم پوشی کرتے ہوئے خود ان کے ظہور کے درپے نہ ہو جانا چاہیے کہ یہ تو نہ اعتماد اور نہ ہی اعتقاد کے قابل ہے۔

بیان فقیری و درویشی کا بیان کہ یہ ہے کیا چیز اور کس طرح حاصل ہوتی ہے۔ علم رمل اور نجوم کے سلسلے میں تحقیق۔ علم نجوم کے احکام موافق و مخالف ہونے کی حقیقت کے سلسلے میں تحقیق و تدقیق اور رمل والوں، نیز دھوکے باز، فریبی عاملوں کی خبروں اور تعویذ گنڈے کرنے، فال نکالنے اور ٹونے

ٹوٹکے کرنے والوں اور ایسے ہی دیگر اشخاص کے احکام کے نامعقول اور غیر مقبول ہونے کا بیان، نیز اس امر کا اظہار کہ اس بیان کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ دُعا یا اسمائے حسنیٰ میں کوئی اثر نہیں ہوتا یا بزرگوں کے مقرر کردہ اوراد و وظائف اور کاملانِ حق کی زبان سے نکلے ہوئے کلمات بالکل بے اثر ہوتے ہیں یا دوسری ایسی موزوں باتیں یا پاکباز لوگوں کے پاک انفاس میں کوئی خاص اثر یا تاثیر نہیں ہوتی۔ امر مسطور کی صراحت اور ہر لکھی ہوئی چیز کی وضاحت سمیت، اور کرامات دکھانے کے سلسلے میں اکابر کی پیروی کرنے سے ممانعت اور دیگر کمالات اور فضیلتوں کے حصول کا حکم اور سب معاملات میں باقی تمام حالات کی تقلید و اتباع کا بیان۔ **تعلیم** حق سبحانہٗ تعالیٰ کے احکام کے مطابق صادقین کے بیان کے آداب کی تعلیم اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی مشہور و معروف روایت اور حکم الٰہی کے باوجود ان کے فرمائے ہوئے معاملے میں پیچھے رہ جانے کا واقعہ۔ **بیان** آزاد منشی اور بزرگی کی حقیقت کا بیان۔ آزاد منشوں اور بزرگوں کے قرب کے کمال و اکملیت کا فرق۔ اور ہر گروہ کے سچوں اور جھوٹوں کے حال کا بیان اور ہر کسی کی مفصل تعریف و توصیف اور ایک ذات کے مجمع البحرین و جامع کمالات و مظہر صفات جمیلہ ہونے کا تذکرہ۔

تہترواں وارد:

الموسوم جواب و سوال اپنے متن اور شرح سمیت۔ **تعلیم** سوال و جواب کے سلسلے میں ادب کی تعلیم اور اسی سلسلے میں دیگر متعلقہ امور کو ملحوظِ خاطر رکھنے، خاموشی کو ترجیح دینے اور اکثر اوقات جواب نہ دینے اور بسا اوقات سوال کے ممنوع ہونے اور مرشد اور سرورِ کامل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں مطالب عرض کرنے کے آداب کی تلقین اور جواب دہ امور کا اظہار۔ **بیان** سوال کی تین قسموں کا بیان۔ ایک ادنیٰ کا اعلیٰ سے سوال کرنا، دوسری قسم اعلیٰ کا ادنیٰ سے سوال کرنا اور تیسری قسم آدمی کا مساوی حیثیت والے سے سوال کرنا۔ ہر قسم کے بُرے اور بھلے انداز کی تفصیل سمیت۔ **بیان** جواب و سوال کی رسم اور ریت کو ترک کرنے، بحث و تمحیص کی مزاحمت کرنے، جاہل، خبیث النفس، بدخصلت لوگوں کے اعتراضات سے روگردانی اور چشم پوشی کرنے، جھوٹے مدعیوں کی بات کے جواب دہ نہ ہونے کے باوجود بھی ان کا منہ بند کرنے کے لیے لاجواب کر دینے کا بیان۔ **بیان** اللہ تعالیٰ کا اپنے بندوں میں سے کسی بندے کو

برگزیدہ و منتخب کرنے کا بیان ۔ اور عقیدت مند اقرار کرنے والوں اور بداندیش منکروں کو درپیش آنے والے معاملات اور اہل یقین کے سنت الٰہی کی طرف راغب و مائل ہوتے اور قرب کا بیان ۔ دائیں جانب والے اہل یقین معرفت میں ڈوبے ہوئے خداشناس انسان اور مظاہر جمالِ خداوندی ہیں اور منکرین کی مزید نفرت، حقارت اور دُور ہونے کا بیان جو بائیں جانب کے وحشی انسان اور مظاہر جلال ہیں، تمام شکوک و شبہات اور سارے خطرات کے دفعیہ، عادل گواہوں اور شہادتوں سے حق و باطل کی غلطی کے ازالے اور اسلامی خلوص کی حقانیت کا بیان، نیز عزیزان و یارانِ طریقت کے مناسب حال اور شایان شان پند و نصیحت ۔

چوہتّرواں وارد:

الموسوم حسن خُلق اپنے متن اور شرح سمیت ۔ **تعریف** خلق کی تعریف، نیز اس میں شامل اور اس کی مانع خصوصیات کا ذکر ۔ اصلی اور کسبی خلق کا باہمی فرق ۔ خوش خلقی، بد خلقی اور نفسانی ہوس کے سلسلے میں تحقیق اور خلق عظیم کے جامع پن کا تذکرہ ۔ اور اس آیت کریمہ کی پوشیدہ رمز کہ بے شک آپؐ اخلاق حسنہ کے اعلیٰ پیمانہ پر ہیں ۔ **بیان** تخلیقی خوبصورتی اور اخلاق کی خوب صورتی کا بیان ۔ جس سے مراد ظاہری صورت کا اچھا اور باطنی سیرت کا اچھا ہونا ہے ۔ **بیان** قیافہ شناسی کے قواعد و قانون کا نئے ڈھنگ سے بیان اور اُس کلیہ کے احکام جو کافی چھان بین پہ اکثر درست و صحیح ثابت ہوئے ہیں ۔ نیز یہ کہ اس علم کی جزئیات کا بیان مناسب نہیں ۔ اس پہ بھروسہ بھی نہیں کیا جا سکتا اور نہ ہی یقین کے قابل ہوتا ہے ۔

پچھتّرواں وارد:

الموسوم صبغت اللہ (رنگ الٰہی) اپنے متن اور شرح سمیت ۔ **بیان** خداوندی رنگ کی دونوں قسموں یعنی تنزیہی (پاک و مصفا) اور تشبیہی رنگوں کا بیان اور تمام رنگوں کے مطلق جامع پن کا ذکر ۔ **بیان** بیرنگی و لطافت کے باوجود انسانی طلسمات و شعبدہ بازی کا عمومی و خصوصی بیان ۔ نقشبندی طریقے کے خاص الخاص اولیائے کرام کے نسبتی رنگ اور انتہائی قرب کا بیان اور اس ہدایت یافتہ گروہ کے وصالِ حق کی راہ کا راست اور نزدیک ہونے، اور پہلے اور پچھلے خواجگان کی تعریف و توصیف (ان سب کو خدا کی خوشنودی حاصل ہو) خاص طور پہ خواجہ بہاء الحق والدین، حضرت شاہ نقشبند؛

اور ان کے خلیفوں میں سیما خواجہ احرار اور خواجہ باقی باللہ کی بزرگی و کمال کا ذکر اور جناب مرجع ہدایت حضرت مجدد الف ثانی کے کمالات کی عظمت اور ان عالی شان بزرگوں میں سے ہر ایک کی خصوصیتوں اور کیفیتوں کا تذکرہ۔ ان کے راست اور پختہ طریق کی جامعیت و اکملیت اور ان بزرگوں (ان سب پر خدا کی سلامتی ہو) کی خالص محمدیت سے عالی نسبتی اور ان گیارہ کلمات کی تشریح یادکرد (محبوب کو یاد کرنا) بازگشت (واپسی) نگہداشت (دیکھ بھال) یادداشت (یاد یا اس کا نشان) وقوف زمانی (ٹھہراؤ) وقوف عددی۔ وقوف قلبی۔ نظر برقدم۔ (نشان پا) ہوش دردم۔ سفر در وطن۔ خلوت در انجمن (انجمن میں بھی تنہائی) سب کے سب یہ کلمات حضرات خواجگان کے پاک انفاس کی یادگار ہیں۔ نیز اگلے پچھلے بزرگانِ دین کی تحریر و تقریر کے معانی کے ساتھ ساتھ ان کی تفصیل و وضاحت اور علاوہ ازیں جو کچھ اس ناچیز پہ منکشف ہوا۔

چھہتّرواں وارد:

الموسوم شکر نعمت اپنے متن اور شرح سمیت۔ **بیان** شکر کی حقیقت کی اصل کا بیان جو کمالات خداوندی میں سے ہے اور نعمتوں کی حقیقت کا تذکرہ جو وجودی کمالات میں سے ہے۔ بندوں کے شکر کی کیفیت اور انسان پہ خدائی کمالات کے ظہور اور ان اول درجے کی نعمتوں کا بیان جو منعم حقیقی (خدا تعالیٰ) نے انسان کو جبلی طور پہ ودیعت فرمائی ہیں۔ اور دیگر ذاتی حلم و بردباریاں جو دوسرے درجے کی نعمتیں ہیں اور خارجی طور پہ عنایت فرمائی ہیں۔ شکر کی سہ گانہ تقسیم یعنی قولی شکر، علمی شکر اور عملی شکر جو عوام، خواص اور خاص الخاص بندوں کے شکر ہیں۔ **بیان** عنایت کے شکر کا بیان۔ اللہ تعالیٰ کا دل اور زبان سے شکر ادا کر کے مدد طلب کرنا اور ظاہری اور باطنی طور پر اللہ تعالیٰ کی استعانت طلب کرنا۔ ابتدا سے لے کر انتہا تک یعنی آغازِ کتاب سے لے کر اس کے ختم ہونے تک کے احوال کا مختصر بیان اور تعمیل ارشاد کے طور پہ اُن ان گنت اور بے شمار نعمتوں میں سے بعض کا بیان جو مجھ بندۂ گنہ گار پہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے عنایت ہوئیں۔ نعمت کی حقیقت کا بیان۔ ان کے دنیوی اور اخروی ہونے کا باہمی فرق اور ظاہر و باطن کے لحاظ سے ہر ایک کی تقسیم۔ **کشف** اپنے سلسلے میں حاصل ہونے والی نعمتوں کے نفع و نقصان کا انکشاف اور راہِ راست پہ چلنے والے خاصان و مقبولان حق کے جملہ خرابیوں سے محفوظ رہنے کا بیان۔ **اشعار** بعض باطنی حالتوں اور قلبی واردات کی خبر

جو عرف عام کے معانی سے ہٹ کر پورے کمال اور احسن طریق سے طاری ہوئیں۔ جیسا کہ ماسوی اللہ کے خیالات سے بالکل خالی ہو جانا۔ دُنیا اور اہلِ دُنیا سے بے نیازی کا اک نئے انداز سے رونما ہونا اور فنا و بقا کا اک ایسے طور پر میسر آنا کہ آج تک کسی کو اس کی خبر تک نہیں ہوئی اور نہ کسی نے اُس کی تحقیق پر لب کشائی کی۔

سترّواں وارد:

الموسوم ارائت طریق (راستے کی رہنمائی) اپنے متن اور شرح سمیت۔ **بیان** راہِ حق کی دو قسمیں ہیں۔ ایک ابتدائی یا تخلیقی رستہ۔ موجودات کو فیض اسی راہ سے پہنچتا ہے۔ دوسرا طریق اعادتی (دہرانے کا رستہ) ہے۔ مخلوق کو رجوع کرنے کا جذبہ اسی سے لاحق ہوتا ہے۔ اور جنّ و انسان کے لیے ان میں سے ہر ایک کی مزید دو راہیں ہو کر یہ چوراہے کی شکل اختیار کر لیتا ہے، یعنی ہر ایک جمالی ہے یا جلالی اور انسانوں اور جنوّں کی ہدایت یا گمراہی کا باعث بنتا ہے۔ ہر ایک کے تقاضوں، متعلقین اور مظاہر و وسیلوں کی تفصیل کے ساتھ۔ **بیان تفرقہ** امتیاز و ہوش میں تفرقے اور چشم و گوش کی پریشانی کا بیان۔ حواس اور قوا کی کثرت اور اعضا کے متعدد افعال کی وجہ سے نفس ناطقہ کو اک قسم کی پراگندگی لاحق ہو جاتی ہے جس سے باطنی سکون اور یک سوئی سے توجہ ہٹ جاتی ہے۔ انسان پریشانی اور نفسانی خواہشات میں مبتلا ہو جاتا ہے اور اپنے ہی پھیلائے ہوئے جال میں پھنس کر ہزاروں قسم کے تردداتِ اور تفکرات میں گھر جاتا ہے۔ **بیان** قلبی خطرات اور نفسانی خواہشات کے اُبھرنے کی وجہ کی اصل حقیقت کا بیان جو عام طور پر ہر خاص و عام کے شاملِ حال ہوتی ہیں، اور ارواح میں اُن کے پیدا ہونے کی حکمت۔ اُس کا نفع نقصان اور اُس کی کمی بیشی کے اسباب اور اس کی مقدار کا بیان کہ یہ دل سے کس قدر دُور کی جا سکتی ہے اور کتنی باقی رہ جاتی ہے۔ اور قلبی بے باکی اور بے خوفی کا اطلاق کس حالت میں ہوتا ہے۔ خطرات کا علاج نہ کرنے اور نفسانی خواہشات کی راہ کو حتی الامکان بند کرنے اور اوراد و وظائف و ذکر اذکار کے طریقے کی تعلیم، باطنی خوبیوں کے حال کا اظہار۔ نکمے جاہلوں اور غافل کور باطنوں کے شکوک و شبہات کے دفعیہ سمیت۔ سالکانِ راہِ حق کے مختلف اعمال کے سلسلے میں مکمل تلقین۔ (اشعار (خبر)) مومنین کے خصوصی قرب کا بیان جو اللہ تعالیٰ کی شان رحیمی اور کریمی سے متعلق ہے اور نبوت کے کمالات اور امامت کی برکات سے مشروط ہے اور جو ایمانی نسبت اور یقینی قوت کے بغیر ہاتھ نہیں لگتا۔ کمزور ایمان والے ضعیف الاعتقاد لوگوں کے حالات اور ان کے فاسد خیالات

اور بدگمانیوں کا تذکرہ ۔ **بیان** کلام اللہ کی منسوخ کرنے والی اور منسوخ شدہ آیات کی روشنی میں نیک اور مقبول بندوں کے ابتدائی، وسطی اور آخری معقول مقولوں کی حقیقت کا بیان۔ لغو بیانی، فضول گوئی اور دیگر بدگمانیوں سے توبہ و استغفار کا بیان اور سنت رسول اللہ کے مطابق اعمال و اقوال کی توفیق کے لیے دُعا و التجا۔

اٹھتّرواں وارد:

الموسوم صبر جمیل اپنے متن اور شرح سمیت ۔ تفریق اللہ تعالیٰ سے منسوب اور بندوں سے منسوب صبر کا باہمی فرق ۔ اوّل الذکر کا حضور حق میں اطلاق کن معنوں میں ہوتا ہے اور بندگان حق کے سلسلے میں کن معنوں میں ۔ جبری صبر اور صبر جمیل کا فرق ۔ پہلا دقت اور تکلف سے حاصل کیا جاتا ہے اور وہ احسن صبر نہیں ۔ دوسرا یعنی صبر جمیل رضا و رغبت سے عبارت ہے ۔ قضائے الٰہی پہ رضا، مصائب و ابتلا میں صبر اور نعمتوں پر شکر کی تخصیص کی وجہ ۔ **بیان** صبر جمیل اور خدائے بزرگ و برتر کی رضا کا بیان ۔ صبر اور اضطرار کے سلسلے میں تحقیق ۔ ان حالات کے خدا کی طرف سے طاری ہونے اور ایسی کیفیتوں میں انسان کے لیے اختیار ہونے کا ذکر ۔ صبر کی حالتوں کے ظہور کے اسباب اور صبر کی قسمیں ۔ ایک صبر نفسی جسے صبر وسیع بھی کہا جا سکتا ہے یعنی فراغت دینے والا ۔ دوسرے قلبی صبر جسے نزولی صبر بھی کہہ سکتے ہیں ۔ ہر ایک کی شرائط، علامات و اسباب کا اظہار اور ہر ایک کی کیفیات، نتائج و ثمرات کی پہچان ۔ ان کے ظاہری اور باطنی اثرات اور ایک کی دوسرے پر فضیلت و بزرگی کا اظہار اور صبر مطلق کی افضلیت، عظمت اور جامعی کیفیت جو خاص الخاصان اور مخلص ترین مومنین کا خاصہ ہے اور مذکورہ بالا تمام مراتب کا جامع اور ان سب سے مکمل طور پر افضل و احسن ہے ۔ **بیان** بردباری کا بیان جس سے باہمی لین دین میں انسانوں کو کام لینا پڑتا ہے ۔ یہ بھی یا تو فطری ہوتی ہے اور یا پھر اکتسابی ۔ خبر ضعف و قوت کے لحاظ سے صبر کے بے شمار اور لاتعداد مرتبوں کا بیان ۔ اور انسانوں کے اضافی صبر کے ان تمام سلسلوں کا صبر خصوصی پہ جا کر ختم ہونا جو ذات حق تعالیٰ ہی کے لیے مخصوص ہے ۔ صبر و رضا کے حصول کے دستور اور مولا کریم کی عبادت کا اُس کے شایان شان طریقے سے کرنے کی تلقین ۔ **بیان** صبر کی تین قسموں کا بیان ۔ ایک طبعی صبر جو خواہ بتدریج حاصل ہو یا فوری طور پہ ۔ یہ عوام کا صبر ہے اور انسانی کمال و اصلاح میں شمار نہیں ہوتا ۔ دوارادی صبر

ہیں - ایک عقلی صبر جو خواص کا صبر ہے اور اسلامی شرط کے مطابق آخرت میں بھی مفید ہے اور اکثر و بیشتر امورِ دُنیا کا اصلاح کنندہ ہے - ایک ایمانی صبر ہے جو خاص الخاص کا حصہ ہے اور فی الحقیقت یہ انبیائے کرام کا خاصہ ہے، اور ان کے طفیل اولیاءؒ کے حصے میں آتا ہے اور پھر ان کے بعد اپنے اپنے مقدر کے مطابق صالح مومنوں اور متقی ایمان داروں کے حصے میں آتا ہے اور یہ بالکل خدا کی خوشنودی اور رضامندی کا موجب ہوتا ہے - برگزیدگی اور مقبولیت اسی سے متعلق ہے - یہ دُنیا و آخرت دونوں میں حد درجہ مفید ہے اور دونوں جہانوں میں برکتوں اور سعادتوں کا ثمر دیتا ہے -

اُناسیواں وارد :

الموسوم بجم ہدایت (ہدایت کا ستارہ) اپنے متن اور شرح سمیت - بیان اس عالم شہادت سے آفتابِ رسالت کے غروب ہونے اور کائنات کے اس خلافت و نیابت الٰہی کے کارخانے کا بعد از غروب ستاروں یعنی اہلِ ولایت و امامت (ولیوں اور اماموں) سے جاری رہنے کا بیان - اور بزرگی و عظمت کے بُرج سے چودھویں کے چاند (مخلص مومنوں) کا ظہور اور پوری سورۂ القدر اور دوسری آیات کریمہ سے نہایت لطیف پیرائے میں اقتباس - بیان ضرورت کے مطابق علم پہ اکتفا کرنے اور علم نجوم میں مبالغہ سے کام لینے سے ممانعت کا بیان - سلوک کے تمام کارآمد فوائد کے اکتساب اور شکوک سے پیدا ہونے والے تمام حشو و زوائد کے ترک کا بیان - پھر اس کی ضروری مقدار کے تعین کا ذکر کہ مومنوں کے لیے کس قدر درکار اور سزاوار ہے اور کن باتوں سے پرہیز کرنا چاہیے، اور کس طور سے اُن کا اکتساب شائستہ نہیں - اس حقیقت کا انکشاف کہ جو ستاروں پہ ایمان لے آیا وہ گمراہی میں جا پڑا - اور کہ ایمانی نسبت کی تکمیل کتاب اللہ اور سُنّت رسولؐ کو مضبوطی سے پکڑنے، ان کا اتباع کرنے، اللہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ، انبیاءؑ کے معجزات اور اولیاءؒ اللہ کی کرامات پر مکمل یقین سے ہوتی ہے - نیز اپنے قبلہ عالم والد بزرگوار کے مزارِ مبارک پہ مافوق العادت واقعات کا تھوڑا بہت ذکر اور عامۃ المسلمین کی اصلاح حال اور مصاحت اور راہ نجات کی طرف ان کی رہنمائی اور انبیاءؑ و اولیائے کرام کے حالات و معاملات کے اسرار و رموز کی اصلیت و حقیقت کا انکشاف اور مقربان حق کی دعوتِ حق اور رشد و ہدایت سے متعلقہ امور کی بھلائیوں، اور فلسفیوں اور دیگر دانشوروں کی تحقیقات کی حقیقت اور ان کی لاحاصلی اور بے نسبتی کا تذکرہ -

اسّی واں وارد :

الموسوم جذبت اللہ ، اپنے متن اور شرح سمیت ۔ **تعریف** جذبے کی تعریف اور اس کی اقسام جو مندرجہ ذیل ہیں ۔ حُبی ، عقلی ، طبعی ، جبری ، استعدادی ، عادی ، ارادی ، نفسانی ، وجدانی ، علمی ، جنونی ، خلقی ، حالی اور محمدی جذبہ ۔ ہر قسم کی حقیقت کا اظہار اس کے دیگر متعلقات سمیت ۔ ان حضرات کا ذکر جو طالبانِ حق کے جذبے میں سرشار ہیں ۔ نیز مست رہروان شریعت یا محض مست و سرشار اور محض پابند شرع ہیں اور ان میں سے ہر کسی کے مراتب ۔ **بیان** تنہائی کے فوائد اور خلوت کی فراغت کا بیان ۔ خلوت (تنہائی) کی کثرت اور مجمع کی بقدر ضرورت اجازت کا حکم اور ان دونوں امور میں راہِ راست اختیار کرنے کی تعلیم ۔ اور اس امر کا اظہار کہ طبیعت خواہ تنہائی کی طرف مائل ہو خواہ صحبت کی طرف ، ہر ایک کی تین قسمیں ہیں ۔ ایک ان میں سے محمود (قابلِ ستائش) دوسری مذموم (قابلِ مذمت اور تیسری جبری حالت ہے کہ کسی طرف بھی شمار کی جا سکتی ہے ۔ نیز خود کو درپیش صورتِ حال اور طبیعت کے ذاتی جھکاؤ کا بیان ۔

اکاسی واں وارد :

الموسوم احقاق الحق ۔ **بیان** حقیقی و واجبی حقوق ، اور دنیوی اعتباری حقوق اور خلافت الٰہیہ کے انتہائی استحقاق کا بیان ۔ اور انسانی افراد کا فرق ۔ **تعریف** حق و باطل کی تعریف ۔ حق ، صدق اور نیکی کے معانی کا باہمی فرق ۔ جب منسوب ذاتِ حق سبحانہ ہو تو پھر انتہائی استحقاق سے کیا مراد ہے اور جب نسبت بندگانِ خدا کی طرف دی جائے تو پھر استحقاق سے کیا مراد ہے ۔ بابِ تفعیل کی رُو سے لفظ تحقیق کی چھان بین اور محققین کا مرتبہ ۔ **بیان** اتباع ، خلافت ، رہبری کے رموز یا دعوتِ حق اور دیگر معاملات کی ماہیت اور اکثر شبہات کے دفعیہ کا بیان ۔ اور ان امور میں سے ہر ایک کی مفصل تعریف و توصیف ۔ ہر کسی کے اسباب و علامات و لوازمات اور متعلقات سمیت ۔ **تحقیق** خلافتِ الٰہی ، خلافت حضرت رسالت پناہی اور خلافت اولیا کے مرتبوں کے سلسلے میں تحقیق اور خلافت ، امارت اور امامت کے مراتب کا باہمی فرق و امتیاز اور انہی مراتب کو وزارت ، امارت اور شہزادگی سے تشبیہہ دینا ۔ خود کو پیش آنے والے اکثر معاملات میں خصوصی شرف و بزرگی عطا ہوتے اور اس ناچیز بندے اور احقر العباد کو حق سبحانہ تعالیٰ کی طرف سے خاص و عام عنایات کے لیے مقبول و منتخب فرمانے ،

مجمع کمالات بنانے ، اور سب خلفا حضرات کو برکات سے نوازنے اور حضور سرورِ کائنات محمد مصطفیٰؐ کے طفیل تمام انبیائے کرام کے معاملات کے نمونوں سے نوازنے اور ملکاتی حمائتوں سے تقویت بخشنے اور اسمائے حسنیٰ اور صفاتِ ذات کے ظہورات کا مظہر بناتے اور حضرت امیرالمحمدین والد بزرگوارم (خدا ان کے لطائف غیبی سے ہماری مدد فرمائے) کی خلافت کے مسند پہ بٹھانے پہ شکر کا اظہار ۔ اور آیاتِ قرآنی سے اقتباس کر کے تمام حالات و واقعات کا مفصل بیان اور قرآنی اعجاز کے صدقے فصیح ترین بیان میں دعوتِ حق اور اُسی انداز میں واضح دلائل و براہین سے اثباتِ دعویٰ ۔ **جواب** بعض نکتہ چیں حاسدوں ، کینہ توز متعصبوں اور ہنر پوش عیب بینوں اور بے ہوش کوڑھ مغزوں کے خیالات کا جواب جو محض ان لوگوں کی خواہش کے بغیر اتفاقیہ شنیدپہ کہ جن کے طریق سے نہ انکار کرتے ہیں اور نہ ہی اس انکار کا اظہار کرتے ہیں ۔ بے سُرے نغمے الاپتے ہیں اور اپنی لغویت سے اکثر امور میں کذب و افترا کی راہ اختیار کرتے ہیں اور روایت و حکایت کے وقت بے پر کی اُڑاتے ہیں ۔ **بیان** اتباع کی دو قسمیں ہیں ۔ ایک ظاہری اور ایک باطنی جو عوام اور خواص سے متعلق ہیں ۔ ہر واحد کی حقیقت کا اس کے متعلقات کی تفصیل کے ساتھ اظہار ۔ **بیان** آیاتِ قرآنی کے ناسخ و منسوخ ہونے کی وجوہات کا بیان اور بدلتے ہوئے اوقات و حالات کے پیشِ نظر احکام میں ادل بدل و اختلاف اور قرآنی آیات کی شہادت و روشنی میں بیشتر معاملات اور شکوک و شبہات کا دفعیہ ۔ اور حقیقتِ محمدیہ اور مخلص مومنوں کی صداقت کا اثبات اور متفرق قرآنی آیات اور سورۂ مرسلات کی بعض آیات سے اقتباسات کی روشنی میں اسلام و ایمان پہ اقرار اور انکار کرنے والوں کے لیے علی الترتیب خوشخبری دینے اور ڈرانے اور وعدۂ جزا و سزا اور دھمکانے کا بیان ۔ اور اس آیت کریمہ کی بار بار تکرار کی حُسن و خوبی جس کا مطلب یہ ہے کہ اس روزِ حق کے جھٹلانے والوں کو بڑی خرابی ہوگی ۔ اور صبر و تحمل ، عاجزی و انکساری اور اس طرح کے دیگر عمدہ خصائل اور پسندیدہ عادتوں کی تلقین ۔

بیاسی واں وارد :

الموسوم احسن بیان ۔ متن اور شرح سمیت ۔ **بیان** تاثیرِ کلام اور انبیا و اولیائے کرام کی معجز بیانی کا ذکر جو ان کے معجزات اور کرامات میں شمار ہوتی ہے اور جس پر شاعری اور ساحری کا اطلاق نہیں ہوسکتا ۔ مخلص مومنوں کی تحریر و تقریر کی حقانیت کے غالب آنے ، ان کی قلم کو عصائے موسوی سے تشبیہہ دینے اور عجزِ بشری کی بنا پر دوسروں کے ان کی سحر بیانی کا اعتراف کرنے کا بیان ۔ اور ان معاملات کی شہادت میں

قرآنی آیات کی سند کالانا ۔ **بیان شناخت** حقیقت سخن اور ماہیتِ کلام کی پہچان کا بیان کہ فی نفسہٖ کلام کیا چیز ہے ، اور اس کی اصل اور منبع و مبدا کیا ہے ۔ اس کی کئی قسمیں ہیں ۔ قدسی کلمات اور مکمل کلمات ربانی میں باہمی فرق کی ایسے نئے اسلوب اور نئی اصطلاحات سے تفصیل جو آج تک کسی نے نہیں کی **چھان بین** اس فن کے ماہروں کی کیفیت کی چھان بین ، اور اس کلام کے وارثوں کے حال کی کیفیت جو انبیاءؑ ، اولیاءؒ ، عارفین اور محققین ہوتے ہیں یا پھر دیگر دانشور ، عالم ، شاعر اور فصیح و بلیغ حضرات ہوتے ہیں ۔ یہاں شعر و سخن کے فن کی بات کرتے ہوئے اصطلاحی معنوں میں پیشہ ورانہ شاعری مقصود نہیں ، بلکہ عام شعر و سخن کی بات ہے جس میں سبھی دانشور شامل ہیں اور جو کلام مطلق پہ مشتمل ہے ۔ **بیان** جاندار ممکنات کے نفسی اور لفظی کلام کا بیان جو نفسی خیالات ، ذاتی باتوں ، مقولوں اور لفظوں سے عبارت ہے ۔ نیز ذات باری تعالیٰ کا نفسی اور لفظی کلام جو ارادۂ خداوندی ، مشیّت ایزدی اور آسمانی کتابوں اور صحیفوں کی آیات سے عبارت ہے ۔ ان تمام امور اور مذکورہ بالا کلام کی اُن کے متعلقات کی حاشیہ آرائی سمیت مفصل تعریف ۔ ان میں سے ہر ایک کی ساعت کا بیان کہ وہ ہے کیا چیز اور کس قسم کی ہے ، اور اس مقام پر صفت کلام اور صفت سمع کا باہمی اتحاد و امتیاز اور اس مقصد کا حادث یا قدیم ہونے ، اور حقیقت جبرئیلؑ اور حقیقت محمدیہ کا بیان اور حضرت جبرئیل علیہ السلام کو انسانی عضو زبان سے تشبیہہ دینا جو الفاظ کے معنی کو سمجھے بغیر ہر لفظ کو ادا کرنے کی اہلیت رکھتی ہے ۔ اور انبیائے کرام کو مخاطب حضرات یعنی سننے والوں سے تشبیہہ دینا جو اپنے ہر لفظ کے معانی کا ادراک بھی رکھتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی مثال ایک ایسے متکلم عالم سے دینا جو جملہ علوم اور ساری زبانوں پہ حاوی ہے ۔ حقیقت محمدیہ اور صورت محمدیہ کے مابین جبرئیل علیہ السلام کی وساطت یوں ہے کہ وہ حقیقتِ محمدیہ سے کلامِ الٰہی سنتا تھا اور صورت محمدیہ تک وہی الفاظ کلام اللہ پہنچا دیتا تھا ۔ اور عظمت الٰہیہ اور حقیقت جبرائیلیہ کے مابین حقیقت محمدیہ کی وساطت کا بیان جو مرتبۂ الوہیت سے کلام اللہ کے معانی حقیقت جبرائیلیہ پہ نازل کرتی تھی اور پھر وہی مقدس کلام ذاتِ حق سے بلاواسطہ سنتی تھی ۔ اور آیات قرآنی کے سیاق و سباق کے حوالے سے ان تمام معاملات کا ان کی نئی تاویلات کے ساتھ استنباط کرنا ۔ **بیان** انسان سے کلام کو مختص کرنے کی وجہ کا بیان اور اُس کے مراتب کی کیفیت کا اظہار کہ کمالات کا جامع مظہر کون ہے ، اور یہاں کلام سے کیا مراد ہے ۔ اور اس بیان سے وارد ہونے والے متعلقہ سوالات و جوابات سمیت ۔ **تفریق** اشارات و الفاظ و معانی کا باہمی فرق ،

اسماء کی شرط، کلام کی انواع و اقسام کی تحقیق و تعریف اور احسن طریق سے مراتب و درجات کا باہمی فرق اور ان کی تعریف و توصیف ۔

تراسی واں وارد:

الموسوم لباس تقویٰ ۔ اپنے متن اور شرح سمیت ۔ **تعریف** لباس اور تقویٰ کے معانی کا بیان اور اس سے حاصل ہونے والے فوائد اور ثمرات ۔ **بیان** تقوے کی دو قسموں یعنی سچے اور جھوٹے تقوے کا بیان ۔ ہر قسم کی تعریف و توصیف ۔ ان کے لوازمات، احکامات اور آثار و تاثیرات کا مفصل بیان اور اس تقسیم کے مطابق سچے تقوے کے ظاہر و باطن کی تعریف مع اس کے سارے متعلقات کے۔ اس امر کا بیان کہ انسان کے افعال اُس کے اقوال اور خصائل اس کا لباس ہیں جو وہ پہنتا ہے اور اُس سے اپنا ستر ڈھانپتا ہے، اور ان کے پردے کی اوٹ لیتا ہے ۔ ان کی اچھائی برائی یا نیکی بدی کا اظہار اور اس امر کا بیان کہ باطنی تقوے میں جھوٹ و کذب کا احتمال نہیں ہوتا ۔ نیز مفید مطلب نصائح کی تلقین ۔ **بیان** پوشاک و خوراک کی کیفیت اور سعی و جستجو کے ترک کرنے کا بیان ۔ پوشاک و خوراک اور روزی کے دیگر عام امور میں مخلص مومنوں کے شعار کا بیان جو تمام حالات و معاملات میں متوکل درویشوں کی وضع قطع کے شایانِ شان ہے ۔ لباس کے سلسلے میں چند خاص باتوں کو لازماً ملحوظ خاطر رکھنے اور روزی کے سلسلے میں تمام کاروبار کو پورے ہوش و حواس سے سرانجام دینے کی تلقین اور تمام کلیات و جزئیات تک کی جامع مگر مختصر تعلیم ۔

چوراسی واں وارد:

الموسوم نتائج اعمال، اپنے متن اور شرح سمیت ۔ **تعریف** نتیجے کی تعریف اور اُس کے عاجل یا آجل ہونے کے لحاظ سے باہمی تفریق، یعنی عمل کرنے والے کی حین حیات میں اسی دُنیا کے اندر فوری نتیجہ اور مستقبل یعنی اگلی دُنیا میں حاصل ہونے والا نتیجہ جو مرنے کے بعد قبر، عالم برزخ، قیامت اور دوزخ و بہشت میں وقوع پذیر ہوگا ۔ **بیان** عام فعل کے معنوں میں عمل مطلق اور مقید یعنی دقیق و محدود کے خصوصی معنوں میں عمل کا مطلب ہے نیک اور اچھے کاموں یا بد اور بُرے افعال کے باعث ثواب و عذاب کا مستوجب ہوتا ہے ۔ عمل کی دوگانہ تقسیم یعنی باطنی عمل جو دل و نفس سے متعلق ہوتا ہے اور ظاہری عمل جو جسم اور اعضا سے مربوط ہوتا ہے ۔ جیسا کہ علاج پذیر فعل اور لاعلاج فعل ۔

باطنی عمل یعنی طبعی اور ارادی فعل اور ظاہری عمل یعنی قولی و فعلی عمل کا باہمی فرق۔ ان کے آثار و احکام بیت۔ بیان نتائج اقوال و افعال کے ثمرات اور اعمال کے نتائج کا بیان۔ اس صورت حال کی حقیقت کا انکشاف اور دنیوی اور اخروی اعمال و افعال کی تفصیل اور ان کے مرتبوں، درجوں۔ فائدوں، نقصانوں اور خوبیوں، برائیوں کی تفصیل اور اطاعت و نافرمانی اور کراہت و جواز کی اصلیت و ماہیت۔ بیان نیک اعمال کی توفیق کے امتیاز کا بیان جو ابتدا میں بتدی حضرات میں پیدا ہوتی ہے اور آخیر میں انتہا کو پہنچنے والے کاملوں کے نصیب میں ہوتی ہے۔ کشف اس امر کی حقیقت کہ یہ دُنیا آخرت کی کھیتی ہے۔ جس طرح انسانی افعال و اعمال، جزا و سزا اور نیکی بدی کے درختوں کے بیج کی مانند ہیں، اسی طرح بہ حیثیت مجموعی یہ ساری دُنیا عالم عقبیٰ کی کھیتی ہے۔ وہاں کی ساری اشیا کے بیج اِدھر اسی دُنیا میں بوئے جاتے ہیں۔ دُنیا و جنت سے پہلے کی مخلوق کا بیان۔ اوّل الذکر کا مختصر قصہ جو دُنیا ہی کے لیے تیار کی گئی تھی۔ اور اس دُنیا کے بعد کے جہان مثلاً عالم برزخ، قیامت، روز حساب اور مُردوں کا اُٹھنا بہشت و دوزخ کے معاملات اور خوش بخت اور بد بخت لوگوں کے واقعات اور اہلِ اعراف کے حالات اور خیر و شر، نیکی و بدی اور نفع نقصان کے معانی کا بہشت و دوزخ کی شکل میں جلوہ گر ہونا اور تمام معانی کا صورت پذیر ہو کر آیات قرآنی اور احادیث نبوی کی شہادت سے واضح طور پہ نظر آنا۔ نیز اس امر کا بیان کہ حق سبحانہ تعالیٰ اپنی حکمت کاملہ کے تقاضوں کے مطابق تمام اعتباری، اضافی، وجودی اور عدمی معانی کو ان جہانوں میں ہر جہان کے مناسبِ حال خاص صورت میں ظہور پذیر کرتا ہے، اور پہلی صورت کو دوسری یا آخری صورت کی علت قرار دے دیتا ہے اور اُس مرتبے تک پہنچا دیتا ہے جو ممکنہ صورتوں کے اختلافات کا منتہیٰ ہے۔ اور آخری صورت کہ جس میں صورتوں کے اختلاف کا مزید امکان یا گزر نہیں ان معنوں کو ابد تک ایک ہی حال پہ قائم رکھ کر لازوال بنا دیتا ہے، اور اس مرتبے کا نام دارالقرار یا دارالآخرت ہے۔ اور ان سب مراتب کی اوّل سے لے کر آخر تک تفصیل۔ نفس امارہ کو مارنے، اس کے خلاف کام کرنے اور شہوات سے رُکنے کا بیان، اور حور و قصور اور بہشتی نعمتوں کی اصلیت و ماہیت اور عام اوسط درجے کے مومنوں، متقیوں، ابرار و صالحین کے اُن بہشتوں میں مراتب و درجات کا فرق جو اشتہا کو تیز کرنے والی اور لذیذ اشیا سے پُر ہوں گی، نیز اعلیٰ علیین اور مقربان حق کا ذکر جہاں ان نعمتوں کے باوجود اشتہا کو تیز کرنے اور نفس کی مرغوب لذیذ اشیا کی خواہشات کا کوئی گزر نہیں۔

وہاں سوائے تجلیٔ ذات کے اور کچھ نہیں نہ حور نہ قصور۔ اس حضور و شہود اور قربت ذات اور آگہی کا نتیجہ اور ثمر فقط دیدار ذات الٰہی اور رویتِ حق تعالیٰ ہے۔

پچاسی واں وارد:

الموسوم سرِّ مکنون (پوشیدہ راز) اپنے متن اور شرح سمیت ۔**بیان** سرِّ مکنون کی وجہ تسمیہ کا بیان ۔ اس باب کی شرح و متن دو رباعیوں سمیت تمام عربی زبان میں ہے۔ **بیان** اسمائے حسنیٰ اور صفاتِ الٰہیہ کے ظاہر اور ذات کے مخفی ہونے کے بیان میں یہ جو کچھ بھی ہے سب اسماء و صفاتِ ذاتِ الٰہی کے مظاہر ہیں۔ اسماء و صفات ذات کی نسبت کی وجہ سے دائمی تجلی کی حامل انواع واقسام کی یہ اشیا ہر جگہ موجود ہیں اور مخفی اور سرّ میں رہنے کے الفاظ کا ذاتِ حق پر اطلاق مناسب معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں کی عقل وفہم اور نظر و گمان سے حجاب میں ہے، وگرنہ حق سبحانہ تعالیٰ کی پاک ذات ظہور کی شدت کے کمال اور نور کی شعاعوں کی چکاچوند کے پردے میں ہے اور ظاہر و باطن سے مبرّا اور معرّا ہے اور ان دونوں کے سلسلے میں تشبیہہ و تمثیل دونوں ہی گم ہیں اور یہ سارے مرتبے عیناً وہاں ہیں بھی۔ اور اسی مطلب کے دیگر مناسبات کا عمدہ بیان۔ اور شیخ قیصری کے فرمودات کے مطابق جو ذات باری تعالیٰ کی مظہریت کے جوہری معنی اور تمام صفاتِ ذات کی مظہریت کے عرضی معانی کا قائل ہوتے ہوئے ابدیت وحق و ملکیت کو ذات باری کی صفت حقیقی سمجھ کر عین ذات کو حاکم اعلیٰ شمار کرتا ہے اور دیگر صفات کو تابع قرار دیتا ہے۔ یہ شیخ مذکور کی حقیقت کلام کی وضاحت اور صراحت سمیت! اور اس امر کا اعتراف کہ عمدہ ترین بیان وہی ہے جو میرے قبلۂ بزرگوار نے ارشاد فرمایا اور اپنی عمدہ ترین تصنیف نالۂ عندلیب میں لکھا ہے کہ کوئی چیز کبھی ذاتِ حق تعالیٰ کی مکمل طور پر مظہر ہونے کی اہلیت نہیں رکھتی۔ تمام موجودات خواہ وہ جوہر ہوں یا عرض سبھی اسمائے ذات اور اُس کی صفات کے مظاہر ہیں اور اسمائے ذات کے مقتضیات کے مرتبے کی وساطت کا بیان جو اس عالی مرتبے تک بھی محمدی خصوصی اصطلاحات میں سے ہے دوسری صفات کی طرح ابدی وحقی کا وصفی کے ہم معنی ہونے کا ذکر، اور محکومیت و حاکمیت کے ذاتی مراتب کا باہمی فرق اور قرابت سبحانہ تعالیٰ کا ان ہر دو وصفوں سے بے نیاز ہونے اور اس تمام مدعا کی حقیقت کا تفصیلی اظہار اور بعض مطالب کی ماہیت کا تمثیلی انکشاف اور ان تمام مقاصد کا دلائل وبراہین کی بنا پر ثابت کرنا۔

چھیاسی واں وارد:

الموسوم جہادِ اکبر اپنے متن اور شرح سمیت ۔ **بیان** جہاد کی دو قسموں یعنی جہاد اصغر اور جہادِ اکبر کا بیان اور ہر ایک کی مفصل تعریف و توصیف اور دلائل سے ان کے کبیر و صغیر ہونے کی حقیقت کا بیان **بیان** خدا و رسولؐ اور تم میں سے جو حاکم ہیں ان کی اطاعت کا بیان، اور ان کی استقامت، اصلیت، شرکت و شمولیت اور متابعت کے لحاظ سے فرض ہونے کے مراتب کی باہمی تفریق کا بیان ۔ **بیان** مذہبی جنگ (جہاد) اور عبادات کی ترغیب ۔ سبھی کے واسطے اللہ کی راہ میں جہاد کا تمام حالتوں یعنی ابتدائی، وسطی اور آخری حالتوں میں لازمی ہونا اور مبتدیوں اور منتہیوں کے مجاہدات کی کیفیتوں کا امتیاز اور ان کے درجوں کا باہمی فرق ۔ اور مجاہدے سے پہلے رہنمائی کے لیے فہمائش اور پھر اُس کے بعد مطلوب تک پہنچنے کے معنوں میں اور صالح اعمال اور نیک اقوال کی قدر و منزلت کا اظہار ۔ **تصویر** رشد و ہدایت کے دائرے کی تصویر اور حرف ابجد یعنی (ا۔ب۔ج۔د) پر اس کا ضبط و ترتیب ۔ انسان کے ظاہر و باطن اور ان کے باہمی طور پر رواں دواں آثار و انوار کی تاثیرات کی دوری کی نسبت ۔ مثال کے طور پر آگہی و مشاہدہ کا نتیجہ یہ ہے کہ اُس سے عمدہ اخلاق اور پسندیدہ اوصاف پیدا ہوتے ہیں اور اچھے اخلاق کا نتیجہ یہ ہے کہ اس سے نیک قول اور فعل صادر ہوتے ہیں اور ان تمام نیک عملوں اور اچھی خصلتوں کا نتیجہ یہ کہ فرشتوں سے نسبت حاصل ہوتی ہے اور فرشتوں سے مشابہت یہ کہ حُبِ الٰہی اور مشاہدہ و آگہیٔ ذات نصیب ہوتی ہے اور اس آگہی و مشاہدہ کا پھر وہی نتیجہ کہ اخلاق حمیدہ کی آخری بلندیاں حصے میں آتی ہیں ۔ اور جب تک روح و جسم کا ارتباط قائم رہتا ہے یہ چکر چلتا ہی رہتا ہے ۔ لہٰذا اعتباری لحاظ سے سالکوں کے مسلک (سلوک) کا آغاز اور انجام مختلف ہوتا ہے ۔ اور ہر مسلک کے بزرگوں نے سالک کی تربیت کے لیے اپنی اپنی سمجھ اور مصلحتِ وقت کے مطابق الگ الگ طریقے مقرر کر رکھے ہیں ۔ بعض ظاہری اعتبار کی طرف سے ابتدا کرتے ہیں ۔ تزکیۂ نفس کو مقدم سمجھتے ہوئے ریاضت و مجاہدہ کرواتے ہیں ۔ اور بعض باطنی جانب سے ابتدا کرتے ہوئے قلبی صفائی کو اہم سمجھتے ہیں ۔ لہٰذا باطنی کاموں اور ذکر اذکار میں مشغول رکھتے ہیں ۔ راہِ سلوک کے ان اطوار میں ہر فریق کے رہنماؤں اور ہر مسلک کے پیشواؤں نے نیک نیتی ہی کو ملحوظِ خاطر رکھا ۔ اور مخلص مومنوں کی بابرکت رشد و ہدایت اور باطنی تربیت کے مرتبے کا بیان جو تمام اچھائیوں اور نیکیوں کا جامع اور تمام برکتوں اور نیک نیتّوں پر مشتمل ہے ۔ وہ بن دیکھے بھالے اور بلا سوچے سمجھے مختلف اہلیت کے اشخاص کو ایک ہی لاٹھی سے ایک ہی راہ پر نہیں ہانکتے، بلکہ جس کے لیے جو طریق مناسب اور بہتر

ہے اُسے اُسی کی تلقین کرتے اور رُشد و ہدایت دے کر بڑی تیزی سے اُسے انجام کار تک پہنچانے کے لیے عمدہ وعظ و نصیحت اور اللہ کے راستے کی حکمت کی دعوت دیتے ہیں اور انہیں ہمیشہ ترقی دلاتے رہتے ہیں۔ کبھی معطل نہیں ہوتے دیتے نہ ہی رکنے دیتے ہیں۔ **بیان** اس دائرے کی تمثیل اور اس گردش دوران کی تاثیرات سے کامل اور ناقص انسانوں کے حالات اور واردات قلبی کا بیان۔ آسمان کے دائمی متحرک اور زمین کے لازمی طور پر ساکن رہنے کا تشبیہوں اور استعاروں سے اظہار اور علم ہیئت اور نجوم کی دیگر تمام اصطلاحات اور مناسب و متعلقہ تعبیرات کا ذکر۔ انسانی دل اور جسم کو اس دائرے کے قطبین سے تشبیہہ دینا کیونکہ جب تک یہ اجتماعی حالت قائم ہے یہ گھومنے والے آسمان کی طرح گردش میں ہے۔ خواہ وہ گردش رُشد و ہدایت کی طرف ہو، خواہ ضلالت و گمراہی کی طرف۔ **صورۃ** گمراہی کے دائرے کی شکل جس کی حرکت ہدایت کی مخالف سمت میں ہوتی ہے اور اُس کی قوس کے ہر حصے کی منشا اُس کے بالمقابل رکھی جاتی ہے یعنی آگہی و مشاہدے کے بجائے غفلت و بدنصیبی، اچھے اخلاق اور پسندیدہ اوصاف کے بجائے بُرے اخلاق اور اوصافِ بد۔ صالح اعمال اور اچھے اقوال کے بجائے بُرے افعال اور بُرے اقوال اور ملائکہ سے تشبیہہ اور بلند ترین مقام کی طرف چڑھاؤ (بلند پروازی) کے بجائے شیطانوں سے تشبیہہ دی جاتی ہے اور پست و ارذل ترین جگہ کی طرف گراوٹ ہوتی ہے۔

ستاسی واں وارد:

الموسوم تحذیر (ڈرانا) اپنے متن اور شرح سمیت۔ **بیان** اللہ تعالیٰ کے کمال شفقت و مہربانی سے مخلوق کو ذاتِ حق کے سلسلے میں تفکر سے ڈرانے کا بیان۔ اور مخلص مومنوں کے حال پر عین شفقت و رحمت سے کام لیتے ہوئے خلفائے الٰہی بھی ذاتِ واجب کی ماہیت پہ غور و خوض کرنے سے منع فرماتے ہیں اور ایمان بالغیب اور بلا شک و شبہ یقین کی تلقین کرتے ہیں۔ **بیان** اللہ تعالیٰ کی پاکیزگی اور انسانی فہم و ادراک کی نارسائی کا بیان۔ خدا تعالیٰ کی ذات واجب الوجود کی ماہیت انسانی فہم و ادراک سے ماورا اور ممکنات کے احاطۂ علم سے باہر ہے۔ **بیان** پاکیزگی کی دو قسموں کا بیان۔ ایک حقیقی پاکیزگی جو ہر تعلق اور لگاؤ کو بالکل سلب کر لینے والی ہے، خواہ وہ اضافت تشبیہی ہو خواہ تنزیہی اور اس مرتبے میں تنزہ اور تشبّہ عینِ ذات بھی ہے اور حقِ تعالیٰ کا ذاتی وصف بھی۔ اور باقی تمام تنزیہی مراتب کی اکھاڑ پچھاڑ کا منشا و مبدا بھی ہے۔ ایک تنزہ اضافی ہے جو فقط تشبیہی تعلقات کو سلب کرنے

والی ہے۔ اس مقید مرتبہ میں تنزہ بھی تشبّہ سے جدا ہے اور حق تعالیٰ کی ذات سے الگ۔ اسے تنزیہی مرتبہ کہا جا سکتا ہے۔ تشبّہ کی بھی دو قسمیں ہیں۔ ایک حقیقی تشبّہ جو اضافات کو تشبیہی ہوں یا تنزیہی قبول کرتا ہے۔ اس مرتبے میں مطلق تشبّہ بالکل تنزہ کا عین بھی ہے اور حق تعالیٰ کا ذاتی وصف اور اس کی شانوں کا مظہر بھی اور دیگر تمام تشبیہی مراتب کی اکھاڑ پچھاڑ کرنے والا بھی۔ ایک تشبّہ اضافی ہے جو صرف تشبیہی اضافات کو قبول کرتا ہے۔ اس مقید مرتبے میں تشبّہ تنزہ سے جدا ہے۔ ۲۔ اسی کی ایک وصفی صفت ہے اسے تشبیہی مرتبہ کہا جا سکتا ہے۔ تنزیہہ و تشبیہہ کے یہ دونوں مراتب جو ذاتِ واجب الوجود کے کمالات میں داخل ہیں۔ ممکن الوجود مخلوق اس سے بالکل محروم ہوتی ہے وہ اس درجے کو ہرگز نہیں پا سکتے اور مراتب کے لحاظ سے یہ دونوں تنزیہی اور تشبیہی مرتبے دائرۂ امکان سے برتر ہیں اور اسمائے حسنیٰ اور صفات خداوندی کے مقتضیات میں شمار ہوتے ہیں، اور تمام دنیوی مفردات و مادیات اور حاضر و غائب دُنیا کے اصول ہیں۔ اور انسان جو عالم امر اور خلق کا مجموعہ ہے اپنی استعداد کے مطابق ان دونوں مراتب سے بہرہ مند ہوتا ہے اور دو مراتب کمال کو بغیر کسی وسیلے کے حاصل نہیں کر سکتا۔ ان دونوں راستوں پر خود آگاہ سالکوں کے لیے پند و موعظت مفید ہوتی ہے۔ **بیان** اس امر کا بیان کہ عاقبت کی نجات اور دنیوی بھلائی کی فکر کرنی چاہیے اور ظاہری و باطنی طور پر شرع کے مطابق یادِ خدا میں مشغول رہنا چاہیے۔ تحقیق کی رُو سے حق سبحانہٗ تعالیٰ تک انسانی پہنچ بے جا اور یگانگت و اتحاد کا خیال محض ایک غلطی ہے۔ اُس تک رسائی، وصل اور اتحاد و حلول ترک سعادت و بدنصیبی ہے۔ وحدت و معرفت کا دعویٰ ایک باطل خیال ہے، باہمی یگانگت و بیگانگت، وصل و فصل اور ملاپ اور جدائی تو مادی اور مفرد ممکنات کا خاصہ ہیں۔ ذاتِ سبحانہٗ تعالیٰ ان سب امور سے پاک اور بلند و بالا، اور انسانی رسائی اور پہچان سے ماوراء ہے اور ان کے علم و معرفت سے دُور، اس سلسلے میں اپنے عجز و نارسائی کا اعتراف ایک حقیقت اور امر واقعی ہے اور بندگی کی حد کو ملحوظ خاطر رکھنا درجات میں ترقی کا باعث بنتا ہے۔ **کشف** راہِ راست پہ سالک کو ابتدائی اور وسطی دور میں پیش آنے والے خیالوں، وہموں اور گمانوں کی حقیقت کا انکشاف اور عجیب و غریب حالات، ذوق و شوق اور صغیر و کبیر اور اعلیٰ درجے کی ولایت اور دیگر مقامات کے عجیب قسم کے حقائق اور معارف کا تذکرہ۔ اور کمالاتِ نبوت کے معاملات کی ابتدا اور حضور سرور کائنات کی ختم نبوت کے مناصب، معاملات، پوشیدہ اسرار و رموز، سچے معاملات، خدائی تجلیات، قطعی خوشخبریوں، یقینی قربتوں، شاندار و مبین آیات، ظاہری آداب،

شرعی حقائق اور رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے علوم و معارف کا ذکر اذکار۔ بیان اس امر کا بیان کہ ممکن الوجود حادث ادنی یعنی موجودات کو واجب الوجود کے قدیم و مقدس مرتبے سے حقیقی وصل اور اصلی اتحاد کبھی بھی حاصل نہیں ہو سکا اور نہ ہو گا۔ کیا مسئلہ وحدت الشہود کی تقریر سے جو بالکل واضح و روشن ہے اور کیا وحدت الوجود کے لحاظ سے جو دلیل و برہان سے ثابت ہے۔ وحدت الوجودیوں کی تحقیقات کی ماہیت و اصلیت کا انکشاف جو فلسفیوں کی طرح اپنی باریک بینی کے گمان سے بے دینی میں جا پڑے ہیں اور شریعت کی پیروی کی باگ ڈور جیسا کہ چاہیے ان کے ہاتھ میں نہیں ہے۔ اور ان کے اکثر و بیشتر مسائل باوجودیکہ ظاہری نظر میں معقول و مدلل نظر آتے ہیں، لیکن شرعی لحاظ سے قابلِ قبول نہیں، اور اکثر و بیشتر ضرر رساں ہوتے ہیں اور اُن کا نتیجہ خراب ہوتا ہے۔ اور یہ نہ نجات کے لیے مفید ہوتے ہیں اور نہ ہی ان سے کسی قسم کی برکتیں حاصل ہوتی ہیں۔ وحدت الشہودیوں کی تعبیرات کے برعکس جو مکمل طور پر اتباعِ رسولؐ پر کمر بستہ رہتی ہیں، اور ناقص عقل کے گورکھ دھندوں سے آزاد ہوتی ہیں اور سرسری نظر میں گو انبیائے کرام کی خبروں کی طرح معقول دکھائی نہیں دیتیں اور نہ ہی عقل کے مقرر کردہ قواعد کے مطابق و موافق نظر آتی ہیں لیکن سر سے لے کر پاؤں تک ہدایت و برکت کے نور سے منور اور دنیا و آخرت میں سراسر نجات کا باعث ہوتی ہیں۔ **بیان** ان برگزیدہ بندوں کی تیز نگاہی اور حقیقت آشنا حضرات کا اس حقیقت کے سلسلے میں اپنے عجز کے اعتراف کا بیان۔

اٹھاسی واں وارد:

الموسوم خلق محمدیؐ، اپنے متن اور شرح سمیت۔ **بیان** خلق الٰہی کی عظمت اور اُس کے لاانتہا کمالات کی جامعیت کا بیان جو فقط حق تعالیٰ کی ذات سے مخصوص ہے۔ اور اُس خلقِ اعظم کی تعریف اور خلق محمدیؐ کے عظیم ہونے کا بیان جو حضور پاکؐ کی ذاتِ بے مثال سے مختص ہے۔ (ان پر درود و سلام) اس کی مثال کا دوسرے ممکنات میں تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔ نیز اس خلق محمدیؐ کی تعریف۔ اس عظیم مرتبے کے نیچے بہت سے مراتب اور مناصب اور بھی ہیں۔ اور اسی خلق محمدیؐ سے جو سرفہرست ہے ان کی نزدیکی و قرب ہی پر ان کے شرف و بزرگی کا دارومدار ہے۔ ان اعتباری مراتب کے حصول میں سب سے نزدیک ترین اتباعِ رسولؐ ہے۔ حکما اور دیگر اہلِ طریقت کے مقابلے میں سب سے اعلیٰ و بلند اخلاق خالص مومنوں کا ہے۔ وہ چونکہ خلوص اور فنا فی الرسولؐ کے درجۂ کمال میں ہوتے ہیں، للہٰذا ان میں

خلق محمدیؐ کی جھلکی پائی جاتی ہے۔ ان کی ساری صفات میں حضورؐ ہی کی صفات کا پرتو ہوتا ہے۔ اس خصوصیت کی بناپر ان کے خلق کو بھی خلق محمدیؐ کہا جاتا ہے، اور اس باب کو اس اسم سے موسوم کرنے کی وجہ یہ کہ اس میں حتی الامکان متضاد کمالات کے نہایت ہی معتدل انداز سے یکجا ہونے کا ذکر ہے۔ مثال کے طور پر فقر و غنا، انکسار و تکبر، بردباری و غیظ و غضب، لطف و ادب، عطا و بخشش اور ہاتھ کا روکنا اور ان کے علاوہ دوسرے متضاد اخلاق جو کمال تک پہنچے ہوئے ہوتے ہیں۔ کیونکہ حسنِ خلق اسی کامل و معتدل یکجائی کو کہتے ہیں نہ کہ جس طرح اکثر جاہل و احمق لوگ گمان کرتے ہیں کہ حسن خلق فقر کے اظہار، انکساری کی زیادتی، حلم و بردباری کی کثرت یا لطفِ عام اور عطائے خالص سے عبارت ہے۔ اس قسم کے اوصاف حدِ اعتدال سے متجاوز ہوتے ہیں، اس حد تک کہ فقر و بزرگی قطعاً ہوتے ہی نہیں اور غیظ و غضب و ادب وغیرہ قطعاً زائل ہوتے ہیں، اور یہ فی الحقیقت حُسن خلق نہیں ہوتا، بلکہ یہ تو بُرے اخلاق میں سے ہے۔ **بیان** فقر و بزرگی، اور خلق و صفا کی جملہ متعلقات اور سارے مناصب و مراتب اور مُرادات کا اُن کی تحقیق سمیت مفصل بیان۔ **بیان** درویشانہ وضع قطع کو ملحوظِ خاطر اور اس مردانہ لباس اور اپنے جی پر کھیل کر فنا فی اللہ ہوتے والے بے غرض لوگوں کی راہ و رسم کی حفاظت کے آداب کا بیان۔ ان خود آگاہ و خدامست صاحبِ دل لوگوں کے بے آزار اور کم ایذا ہونے اور جیتے جی مُردوں کی طرح زندگی گزارنے کا تذکرہ اور اسی ذکر کی مناسبت سے اپنے آپ اور اپنے جیسے درویش منش لوگوں کے لیے تنبیہہ۔ **حکایت** فاختہ کے ایک جوڑے کی حکایت جسے ایک شکاری نے درویشانہ لباس کا فریب دے کر شکار کر لیا۔ عارفانہ وعظ و نصیحت اور عبرت و آزمائش کا بیان اور درویشی کے تمام آداب و آئین کی تلقین۔

نواسی واں وارد:

الموسوم استخارہ، اپنے متن اور شرح سمیت۔ **تعریف** استخارے کی تعریف اور اُس کی حقیقت کا بیان۔ اکابر دین کے معمول اور سُنت رسولؐ کے مطابق استخارہ کرنے کا طریقہ، اور ہر حال اور تمام امور میں زبان یا دل سے خداوند کریم سے اپنی بھلائی طلب کرتا اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول دعاؤں کے الفاظ میں اللہ تعالیٰ سے تمام دینی و دنیاوی بھلائیوں اور ظاہری و باطنی نیکیوں کی التجا کرنا کہ اہل اللہ کا طریق استخارہ یہی ہے، نیز اس امر کا بیان جیسا کہ اکثر بدعتی لوگوں نے ایک نیا طریق شروع کر رکھا ہے، اور ہر بات میں التوا اور شرائط و قیود کے باعث اپنے آپ کو خواہ مخواہ تردّد اور تشویش میں ڈالے

رکھتے ہیں - یہ نہایت ہی نامعقول اور ناقابلِ قبول بات ہے کہ اس کا کوئی عقلی یا نقلی ثبوت موجود نہیں، اور یہ ہرگز اعتماد اور اعتقاد کے قابل نہیں اور بالکل بے بنیاد ہے - **بیان** گلہ و شکوہ کی شامت، کفرانِ نعمت کی آفت، امن کے دور اور شاہی عدل و انصاف کی برکت اور اتفاق کی شیرینی اور نفاق کی بدمزگی کا بیان، نیز شکوہ و شکایت اور گلہ گزاری کی حقیقت کا انکشاف کہ یہ ہے کیا چیز اور یہ کس چیز کا نام ہے - اظہارِ احوال کس طرح کرنا چاہیے اور کس طرح نہیں کرنا چاہیے - شکوہ و شکایت کا اطلاق کس درجے تک ہوتا ہے اور اس میں کوئی بیان کس حد تک شمار ہوتا ہے - اور اس کی کتنی مقدار قابلِ معافی ہے اور اسی طرح متن کے عنوان میں آنے والے تمام الفاظ سے مرادات کی وضاحت اور اُن کے متعلقات کی تشریح - **بیان** اکثر اہلِ دُنیا کی خرابی کا بیان جو نقصان پہ اکثر واویلا مچاتے رہتے ہیں اور ہزاروں قسم کی خواہشوں کے پابند ہوتے ہیں، نیز صبر و شکر اور رضائے حق پہ راضی اور مستقل رہنے کی راہ کی تلقین - اور بُری فالیں نکالنے سے ممانعت کا بیان کیونکہ بُری فال بُرے حال کا موجب بنتی ہے، اس لیے کہ وہ لوگوں کے اپنے ہی افعال و اقوال کی تاثیرات ہوتی ہیں اور اپنے ہی بُرے یا بھلے آثار کی عملی صورت سامنے لے آتی ہیں اور اس امر کا بیان کہ عوام کی مصیبت خواص کے شاملِ حال بھی ہو جاتی ہے، اور ہر غالب امر غلبہ کر کے سرایت کر جاتا ہے - جس طرح کلی نیکیاں جزوی برائیوں کو اعتباری نظر سے گرا دیتی ہیں، اسی طرح کلی برائیاں جزوی نیکیوں کو لغو بنا دیتی ہیں - انسانی بدن میں سب سے زیادہ معتبر عضو اور انسانی اعضا کے سردار یعنی دل کی بھلائی یا برائی کی مانند بادشاہوں کے امیروں، وزیروں اور رئیسوں کی بھلائی یا بُرائی بھی تمام ملک میں پوری طرح اثرانداز ہوتی ہے اور رعیت کو اس مقولے کے مصداق بنا دیتی ہے کہ عوام اپنے بادشاہوں کے دین پر ہوتے ہیں، اور اس امر کا بیان کہ امن و امان کے زمانے میں بادشاہ کی خوبیوں، اکابر و اراکین سلطنت کی نیکیوں کو دینی اور اسلامی احکام کے اجرا میں پورا پورا عمل دخل ہے اور یہ ظاہری تائیدات عوام و خواص کے احوال کی اصلاح کنندہ ہوتی ہیں - ثواب کی نیت سے نوکری پیشہ مخلص حضرات کے لیے بعض اسباب کے اکتساب کی اجازت کی تجویز اور اس سلسلے میں متوکل پیروانِ رسولؐ کے شایانِ شان عملی اقدام کا ارادہ اور سعادت مند اخلاص پیشہ نوجوانوں کا اسلامی طریقے اور آئین کے سیکھنے کی غرض سے دینی بھائیوں کی طرف رجوع اور ان کی عزت افزائی کرنے اور ان گوشہ نشین بزرگوں کا دُنیا اور اہلِ دُنیا سے مکمل قطع تعلق کر کے محض فی سبیل اللہ ملک اور اہلِ ملک کے لیے دُعائے خیر کرنے کا بیان - **تقسیم** ملکی تقسیم کی دو قسموں

انفسی و آفاقی کا اُس کے متعلقات سمیت ذکر اور ہر وقت پیش آنے والے حالات میں اپنی حالت کی تربیت کا اہتمام اور اس امر کا اظہار کہ اپنے دل و دماغ کو نیک کاموں میں مصروف رکھنا چاہیے اور بُرے اندیشوں اور خیالوں کی طرف دھیان نہ لگانا چاہیے، کیونکہ انسانی نفس کا دُنیاوی ڈھانچے پہ تصرف ہوتا ہے جو کئی امور میں لوگوں کی شامت اور فتنہ و فساد کا موجب بنتا ہے۔ فلکی اجرام کی تاثیرات کا ذکر، عقول عشرہ کی مناسبت سے ان کی حرکات کا ارادی ہونا اور مستقبل کے امور کا علم ہونا کیونکہ وہ ہمیشہ اس سلسلے میں سرگرم عمل اور مستقلاً دائمی گردش میں رہتے ہیں۔ افلاک کی اُس خاص قسم کی گردش کی حقیقت کا انکشاف جو قرآن حکیم کی اس آیت کریمہ کے بموجب کہ اس روز ہم آسمانوں کو اس طرح لپیٹ دیں گے جس طرح لکھے ہوئے مضمونوں کا کاغذ لپیٹ لیا جاتا ہے۔ قیامت برپا ہونے کا وقت آئے گا اور مذکورہ بالا آیت کی مانند اُس روز اللہ تبارک و تعالیٰ آسمانوں کو کاغذ کی طرح لپیٹ لے گا۔ اس پلٹے پلٹائے کے حشر و نشر کے وقت انقلاب زمانہ سے گردش فلک کو لوٹا کر جزا و سزا کے لیے ماضی کے زمانے اور گزشتہ حالات و معاملات کو سامنے لا کر پھر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ایک ہی حال پر قائم و دائم رکھے گا اور پھر ان میں کسی قسم کے تغیر و تبدل کا قطعاً کوئی امکان نہ ہوگا۔ تمام معاملات کا خاتمہ ہو جائے گا اور یہ سنورنے اور بگڑنے والی دُنیا اپنے خاتمے پہ پہنچ جائے گی۔

نوّے واں وارد:

(الموسوم انتباہ (تنبیہہ کرنا) اپنے متن اور شرح سمیت۔ **بیان** انسان کو لازمی طور پر اکثر اوقات اپنے اپنے استعدادی مراتب کے فرق کے مطابق ارواح پہ اثر انداز ہونے والے امور کی وجہ سے تنبیہہ ضروری ہوتی رہتی ہے، لیکن عام لوگ حیوانات کی طرح اس سبب کے جاتے رہنے کے بعد اُسے بُھلا دیتے ہیں اور غافل ہو جاتے ہیں۔ یہ خیالی تنبیہہ ہوتی ہے جو انسان کے حق میں معتبر نہیں۔ دنیوی مضرتوں سے حفاظت اور بچاؤ کے سوا وہ آخرت کی کسی بھلائی کی حامل نہیں ہوتی۔ اور خواص کا انتباہ دُنیا و آخرت دونوں میں مفید ہوتا ہے۔ اُس کی دو قسمیں ہیں، ایک عقلی اور دوسری ایمانی۔ ان کے باہمی فرق اور ان سے متعلّقات کی تفصیل۔ **بیان** دوستوں کی جدائی اور بچھڑ جانے والوں کے احوال سے عبرت، اور پھر اسی کو حق سبحانہٗ تعالیٰ کے حضور میں زبردست وساطت بنانے کا بیان، نیز بزرگانِ دین کے درد جدائی کو وسیلہ بنانے اور اپنے سے چھوٹوں اور یار دوستوں کی تربیت، اُن کی رشد و ہدایت اور شفقت و رحمت میں

کوئی کسر اُٹھا نہ رکھنے کا تذکرہ ۔ ان غم انگیز حالات میں افسوس و ندامت کا ذکر اور موت سے قبل اپنی اصلاح کی تدبیر اور وقت ضائع کرنے سے پرہیز اور ہر وہ کام کرنے کی تلقین جو مرنے کے بعد کام آئے ۔

اکانواں وارد

الموسوم تلقین ، اپنے متن اور شرح سمیت ۔ **بیان** حق تعالیٰ کی وحدانیت اور حضور پاک ؐ کے ختم المرسلین اور خاتم النّبیین ہونے کا بیان ، نیز حضور پاک ؐ کے فیض عام کا آپ کی پاک نسل کے وجود سے جاری رہنے کا بیان جو اُمت محمدیہ کی سرداری ، خلافت ، امامت اور پیشوائی کے لائق ہیں اور عامۃ المسلمین میں اسی دعوت و تبلیغ کے لیے نائب رسولؐ ہیں ۔ مسلمانوں کا اپنے ایمان کی ایزادی و تجدید ، یقین محکم میں ترقی مزید اطمینان قلب اور رشد و ہدایت کے لیے زمانۂ حال کے ان عالی قدر سادات محمدی کے ہاتھ پر بیعت کرنے ، انھیں وسیلہ بنانے ، باقی تمام بدعتی فرقوں سے کنی کترانے اور دینی و ایمانی احکام کی تلقین اور دیگر پند و نصائح کا تذکرہ اور قرآنی آیات کی شہادت اور اقتباسات سے اللہ تعالیٰ کے انعامات و احسانات کے شکر کا بیان ۔ حضور پاک ؐ کی جامع ، مکمل اور واثق طریقت میں داخل ہوتے وقت کی دُعا ، تبلیغ کے دیگر اسرار و رموز اور بشارت دینے اور ڈرانے دھمکانے کا اظہار اور پختہ یقین والے مومنوں اور مخالف منکروں کے انجام اور اسی سلسلے میں دیگر متعلقات کا حال اور اس کتاب اور کلام الٰہی سے ماخوذ اور مقتبس عبارات و آیات کی حقانیت وسچائی کا بیان ۔ **بیان** حق طلبی اور کار کشائی کے طریقوں اور آوارہ گردی و ہرجائیت سے ممانعت کا ذکر کیونکہ یہ دربدری محض بے فائدہ اور سراسر ذلّت و رسوائی ہے ۔ کچھ بھی ہاتھ نہیں لگتا اُلٹا نقصان ہی ہوتا ہے ۔ سالکوں کے دل میں خدا طلبی کا ذوق و شوق پیدا ہونے کی ابتدا اور طالبان حق کا ہر سواسی کی جستجو میں محو رہنے کا تذکرہ اور رسائی و وصل کے بعد آداب کی تعلیم اور راہِ نجات و مقبولیت کی تلقین اور مکمل اعتماد ، مضبوط عقیدے اور اس کی عین فرمانبرداری پر پوری توجہ دینے کا بیان ۔ **بیان** بعض بدعتیوں کے باطل عقیدے کی تردید جو روحانی فیض سے انکار کرتے ہیں اور پیری مریدی کے طریقے کو باطل قرار دیتے ہیں اور اولیائے کرام کی ولایت اور عارفوں کی ہدایت کا اقرار نہیں کرتے ، ان جاہلوں کے بے نصیب و محروم ہونے اور ان احمقوں کے دوستی کے پردے میں دشمنی کرنے کا ذکر ، اور ایسے بدعقیدہ نااہلوں اور دیگر مُنہ پھٹ ملحدوں کی صحبت سے پرہیز نیز بے حقیقت درویش صورت لوگوں کی صحبت اور جا و بے جا ارادت و عقیدت سے ممانعت کا بیان ۔

بانواں وارد:

الموسوم اصلاح القلوب۔ اپنے متن اور شرح سمیت ۔ **تعریف** اصلاح قلب کی تفصیل و تشریح کہ وہ کس چیز سے عبارت ہے۔ اور فلاح و بہبود کے لیے یہی معتبر ترین چیز ہے۔ اللہ تعالیٰ قلب کی خرابی سے بچائے کہ دُنیا و آخرت دونوں ہی میں ہلاکت کا موجب ہے۔ حیوانی نفس کی انسانی روح سے مخالفت کا بیان۔ جہادِ اصغر اور جہادِ اکبر (نفسِ امارہ کے خلاف جنگ) کا حکم۔ قرآنِ حکیم کی بعض آیات سے اقتباسات کی روشنی میں نفسانی خواہشات اور جسمانی لذات کے ترک کرنے اور صفائے قلب اور تزکیۂ نفس میں سعی و کوشش کرنے کا بیان اور حیوانی خواہشات کی تقلید میں عجلت سے بعض چیزوں کے انتخاب اور نفسانی خواہشات کی متابعت کی نسبت سے بہت سے رموز کی تعبیرات اور اطمینانِ قلب حاصل کرنے کے لیے ہوا و ہوس کی انہی خواہشات کو دبانے اور مٹانے یا پھر اس کے فنا ہونے سے مہلک فتنہ و فساد اور الحاد کے پھیلنے اور دینِ متین کے مسلک کو پوری عقیدت سے لازم جاننے اور اسی مقصد سے متعلقہ امور کی دیگر قرآنی آیات کی تفسیر و تاویل کا تفصیلی تذکرہ ۔ **بیان** جسمانی قیود کا پابند رہنے سے آفتوں اور دکھوں اور بدنی پرورش کی وجہ سے انسانی نفس میں خرابی کا بیان ۔ اس حکیم مطلق کی سنت و حکمت یونہی ہے کہ انسان جس قدر بدنی قیود اور دنیاوی ظاہری اسباب کے متعلقات میں پھنس جاتا ہے، اور جتنا محسوس مادیات، تن پروری اور ظاہری آرائش کی طرف مائل ہوتا ہے، اسی قدر اُسے باطنی پریشانی کے رنج و آفات و آلام اور ذہنی پریشانی اور تاریکیٔ قلب لاحق ہو جاتے ہیں، اور اُسی قدر نفس ناطقہ کی خرابی اور روحانی قویٰ کا ضعف نمودار ہوتا ہے، اور قلبی صفائی اور نورانیت گھٹ جاتی ہے، اور کدورت اور تاریکی بڑھ جاتی ہے ۔ لہٰذا نفس امّارہ کا مارنا، ریاضت، سخت کوشی، دُنیا کا ترک کرنا اور ماسوی اللہ سے مکمل قطع تعلق کرنا راست روی کی شرائط اور طریقِ محمدی کے لوازمات میں سے ہے۔

ترانواں وارد:

الموسوم دین کامل، اپنے متن اور شرح سمیت ۔ **اظہار** اس امر کا اظہار کہ حق سبحانہ تعالیٰ نے دین اسلام کی تکمیل طریقتِ محمدیہ کی رہنمائی اور شرع مصطفوی کی ہدایت سے فرمائی ہے اور سب امتوں سے افضل اس امت مسلمہ کے حق میں شریعت و طریقت ہی کی بدولت نعمتوں کی فراوانی کی ہے۔ مسلمانوں کی دین اسلام سے عقیدت، حق تعالیٰ کی رضاجوئی اور لقائے ربانی کا بیان۔ ان کے دلوں میں ایمان و یقین کی

طمانیت اور ان مقربوں کی برتری، قدامت اور بزرگی کا ذکر، اور اہلِ بیعت کے ان پاک نفس و پاک باز و طاہر حضرات کے سلسلے میں منسلک ہونے کا بیان۔ **بیان** خلق الٰہیہ کے پیدا کرنے، نفس ناطقہ اور تمام حواس کی ذات و صفات ربانی پر مکمل توجہ اور پھر لامتناہی کمالات کے مشاہدے کا بیان، یعنی کہ ظاہری اور باطنی طریق سے مکمل طور پر اللہ ہی کی طرف متوجہ رہنا اور ہر جگہ اسی کے نور و ظہور و تجلّی کا مشاہدہ کرنا اور تمام صفات کمالیہ سے متصف و جامع ہونا اور اپنے آپ کو آیاتِ قرآنی کی تمام بشارتوں کا مصداق بنانا۔ خالص و باکمال و مخلص مومنوں اور صادق مسلمانوں کی علامات جو صحیح اور صالح اعمال کے ساتھ ساتھ تقرب ذات اور دلِ حق آگاہ کی دولت سے مالا مال ہوتے ہیں اور اُن سے شریعت، طریقت، معرفت اور حقیقت کے جملہ اسرار و رموز ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ **بیان** طریق محمدیہ کا ابتدا سے لے کر انتہا تک اور توبہ کرنے کے پہلے قدم سے لے کر رضائے الٰہی کے آخری مقام تک تمام مقامات، حالات، کیفیات و مراتب و درجات کا قرآنی آیات کے اسناد اور قطعی اشارات و بشارات کی صراحت کے ساتھ مفصل بیان کہ آج تک اس نئے انداز میں مقاماتِ سلوک کو قرآنی آیات کے اقتباسات سے پیش نہیں کیا گیا۔ یہ بھی محمدی خصوصیتوں اور جامعیت کے اس مرتبے کے جامع کمالات ہونے کا اختصاص ہے جو مقامات و کمالات کی انتہا و بلندی ہے کامل مسلمانوں کی طرف سے مخلص مومنوں کی تربیت اور رُشد و ہدایت کے انداز کا بیان اور ضمناً دوسرے طریقوں کے حضرات کے بعض ذکر اذکار اور اوراد و وظائف کا مختصر ذکر اور اُن کا سالکان راہ سے سلوک کرنے کا بیان۔

تعلیم اپنے نفس ناطقہ کو اس پاک ذات کی طرف متوجہ رکھنے، اپنی تمام مجازی صفات کو صفات ربانی کا سایہ سمجھنے، اپنے دسوں ظاہری اور باطنی حواس کو شہود و مشاہدۂ ذات سبحانہٗ میں مصروف رکھنے اور ہر ایک حس کو الگ الگ طور پر اسی مناسب کیفیت سے معمور رکھنے اور ظاہری و باطنی طور پر اسی میں مستغرق ہونے کے خصوصی مطالعہ کی تعلیم۔ اور اس بیان کے سلسلے میں جناب ہدایت مآب، دین و ملتِ اسلامی کے مددگار، محمدیوں کے سردار یعنی والد بزرگوار (ان پر خدا کی سلامتی ہو) کے ذوق و شوق، یادِ الٰہی اور ہجر و فراق میں جلنے تڑپنے کا تذکرہ۔

چورانواں وارد:

الموسوم صراطِ سعادت (سعادت کی راہ) متن اور شرح سمیت۔ **بیان** اس امر کا بیان کہ جو کوئی اس دُنیا میں شرع نبیؐ کی سیدھی راہ پر چلتا ہے، خدا نے چاہا تو اُس دُنیا یعنی آخرت میں پل صراط سے بڑی تیزی

اور سلامتی کے ساتھ گزر جائے گا، نیز اس شریعت و طریقت محمدیہ سے اقرار اور انکار کرنے والوں کا بیان اور اس امر کا اظہار کہ بدعتیوں کے دوسرے راستوں کی طرح مسلمانوں کی یہ راہ حادث اور نئی نہیں ہے بلکہ یہ خالصتاً وہی آئین محمدیؐ ہے جس میں کسی آمیزش کا شائبہ نہیں اور یہ دینی نقدی بغیر کسی قسم کے کھوٹ کے بالکل کھری ہے۔

بیان حقیقت خوش بختی، بدبختی، کسبی و پیدائشی خلق اور خوش خلقی کی فضیلت اور بد خلقی کی رذالت کا بیان۔ اس امر کا اظہار کہ ہر شے کی سعادت عبارت ہے اس امر سے جس کے لیے وہ چیز بنائی گئی ہے اور بدبختی اس کے برعکس ہونے پر۔ اس حقیقت کا مثالوں سے واضح کرنا اور اس موضوع پر پیش آنے والی مشکلات کا حل جواب و سوال کی صورت میں اور انسانی اخلاق کی تقسیم جو دو حصوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ انسانی اخلاق کا اچھے اور بُرے اخلاق کا مجموعہ ہونے کا بیان۔ اس کی دو قسمیں ہیں ایک کسبی اخلاق جو ذاتی کوشش سے حاصل کیا جاتا ہے اور اپنے ذاتی افعال و اعمال کے ارتکاب سے نفس انسانی میں راسخ و پختہ ہو جاتا ہے۔ دوسری قسم پیدائشی خلق ہے جو کسی وجود انسان کی جبلت میں ہوتا ہے اور ذاتی کیفیتیں اور اوصاف اُس کے اعمال و افعال کے ظہور کا موجب بنتے ہیں۔ اس امر کا بیان کہ نیکیاں اور بدیاں جو بدنی اعمال و افعال کی اچھائی یا برائی کا نتیجہ ہوتی ہیں اور اکتسابی امور کا حصہ ہوتی ہیں۔ جیسے سایہ عکس اور تمثیل وغیرہ۔ لیکن اصل نیکیاں اور برائیاں جو جبلی ہوتے ہیں اور وہ باطنی اخلاق کی اچھائی یا برائی پر منحصر ہوتی ہیں۔ مثلاً شجاعت، سخاوت، بزدلی، کنجوسی اور ایسی دیگر صفات جو پیدائشی ہوتی ہیں نہ کہ کسبی۔ یہ قدرت کی طرف سے ہر شخص کے نفس میں بدن کی ساخت اور پھر جسم میں روح ڈالتے وقت پیدا کی جاتی ہیں اور نیک بختی اور بدبختی کی اصل بھی یہی صفات ہوتی ہیں۔ اصل خوش بخت بھی وہی ہے جس کے جبلی اخلاق اچھے ہوں اور حقیقی بدبخت وہی ہے جس کے جبلی اخلاق بُرے ہوں۔ ان باتوں کا آیات قرآنی اور احادیث نبوی سے ثابت کرنے اور اس حقیقت کے اثبات کے باوجود رشد و ہدایت، پند، موعظت اور وعظ و نصیحت کے فائدے کا بیان۔ شریعت میں اخلاق کے فرض، نیز اچھے کاموں کے کرنے اور بُرے کاموں سے رکنے کا بیان جسے امر معروف اور نہی منکر کہتے ہیں۔ **بیان** بُرے بھلے اوصاف کے مجموعی قواعد و کلیات کے شمار اور ان سے آگے پیدا ہونے والی جزئیات اور شاخوں کی کثرت کا ذکر اور وعظ و نصیحت کے چند کلمات اور راہ طریقت کے مفید فقرات کا بیان۔ نیز تمام کاموں کو اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم پہ موقوف رکھنے اور تکبر، غرور اور نخوت سے پرہیز کرنے اور عجز و عاجزی اور انکساری کی راہ اختیار کرنے اور ریا و مکر و فریب سے رہائی اور خلاصی پانے کا بیان۔ اور اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے حضور و شہود، آگہی و توحید پرستی اور عطا و احسان کی خلوصِ قلب سے درخواست کرنے کا تذکرہ۔

پچانوے واں وارد:

الموسوم کشف الحقیقت ۔ اپنے متن اور شرح سمیت ۔ **بیان** یہاں حقیقت سے مراد ذات حق تک رسائی ہے ۔ اس کی ماہیت کا انکشاف انسانی طاقت سے باہر ہے اور اللہ جل جلالہ کے عرفان حقیقی کے سلسلے میں انسانی عجز کا اعتراف کرنا پڑتا ہے ، اور تبعی (متابعت) کے لحاظ سے حقیقت سے مراد اُن غیبی امور کے حقائق سے ہے جن کی اللہ اور اُس کے رسولؐ نے خبر دی ہے اور جن کا انکشاف انسانی عقل و فکر کے بل بوتے پر نہیں ہو سکتا بلکہ وہ محض اسی امر پر ہے کہ اللہ جسے چاہے منتخب کرلے ۔ اور جو تمام و کمال انبیائے کرام ہی سے مخصوص ہے اور پھر انہی کے طفیل اور ضمانت سے اولیائے کرام کو نصیب ہوتی ہے اور خاص الخاص مومنان کامل کا حصہ ہے ، اور جہاں خلوص و خصوص قرب کی بنا پر ان کے مرتبوں کی بلندی ، بزرگی اور برتری میں فرق ہے ۔ **بیان** مرتبۂ ذات الٰہی کے سلسلے میں گفتگو کی لاحاصلی اور اُس تک رسائی کے خیال کے محال ہوتے ، نیز اس امر کا بیان کہ باوجودیکہ اللہ تعالیٰ نے اُنھیں وہ علم بخشا ہے پھر بھی مومنین ادب کے مارے اس مقام پر لب نہیں ہلاتے اور اپنے رسول مقبولؐ ہی کی مکمل تقلید کرتے ہوئے ایمان بالغیب کی دعوت دیتے ہیں ۔ انبیاؑ کی دعوتِ حق کے راز اور حکما کی تعلیم کی حقیقت کا تذکرہ ۔ کامل مومنین کی تحقیقات کے مرتبے کی بلندی اور اللہ کے ان برگزیدہ بندوں کا تمام مقامات ، حالات و کیفیات اور تمام قسم کے اسرار و رموز سے خوب واقف اور مطلع ہوتے کا بیان ، نیز ذات و صفاتِ خداوندی سے متعلق عقائد اور فوائد کا تذکرہ اور شرع دینِ مصطفیٰؐ کی راہِ راست کی طرف ہدایت کی تلقین ۔

چھیانوے واں وارد:

الموسوم مراۃ الجمال (آئینۂ جمال) اپنے متن اور شرح سمیت ۔ **بیان** جمال حق اور اُس ذات کے لامتناہی کمالات کے آئینوں اور حال کے مظاہر کا بیان ۔ اس جمیل مطلق کے جمال میں جلال کی شمولیت اور اُس کی وسیع رحمت کے ہر چیز پر فیض عام کا تذکرہ ۔ اپنے ذاتی حسن و جمال اور تقاضائے ذات کی بنا پر حقِ تعالیٰ کا جمال کو پسند فرمانا اور کوتاہ اندیش اور ناقص بندوں کی ارواح کے تقاضے کے مطابق جلال الٰہیہ کے انداز سے ۔ سچے محبانِ حق کی حُسن بین آنکھوں کی تیز نظری اور کامل مقربان ذات کی علمی قوت اور مشاہداتی شدت کا بیان ۔ **بیان** وجود ذات کے لیے علمی آئینے اور اُس آئینے میں اُس تمام نمود کی جلوہ گری کا بیان اور ان تمام مذکورہ بالا الفاظ سے منظور مرادات کا انکشاف ۔ وجود عینی کے لیے وجود ظلی کی اولیت

اور ان تعبیرات سے وارد ہونے والے سوال وجواب کا تذکرہ اور اُن کے دیگر متعلقات کا ذکر علم کی تعریف و توصیف میں چند جملے۔ اللہ تعالیٰ کا ایک آیت کریمہ میں علم کی رو سے اپنے احاطے کو تعبیر کرنے اور اپنے احاطۂ وجود کا ذکر نہ کرنے کی تعبیر کی وجہ اور اُس کا رازِ نہاں۔ آفاقی و انفسی (ہمہ گیر) آیات، امر الٰہی، انفس و آفاق کی رائے، حق تعالیٰ کی ہدایت و تجلّی و آیاتِ قرآنی جو امکانات کی اس دُنیا میں نازل ہوئیں۔ تمام کائنات کو ایک کھلی کتاب سے تشبیہہ دینے اور اُن میں سے باقی رہنے والی نیکیاں (باقیات صالحات) جوام الکتاب (قرآن مجید) کی آیات محکمہ سے اور دیگر مشہودات کو آیاتِ متشابہات سے اور جاہل غافلوں کے غلط سلط تاویلات کرنے اور راسخ العقیدہ عالموں اور مقرب عارفوں کا ان سب کو من جانب اللہ سمجھنے اور دوسروں کو ان کی سمجھ بوجھ کے مطابق معذور جانتے اور خیرو نیکی کی دعاؤں میں مشغول رہنے اور اپنی صفائیٔ قلب میں مصروف رہنے کا بیان، نیز اپنے فہم و ادراک کی تختی کو دنیاوی تقریروں کے نقوش سے پاک رکھنے اور فنا فی اللہ ہونے کی حالت اور اللہ کی طرف رجوع کرنے کی کیفیت کا ذکر۔

ستانوے واں وارد:

الموسوم کلمۂ عق اپنے متن اور شرح سمیت۔ **بیان** اللہ تعالیٰ کی ذاتِ پاک سے خیرو برکت کی دعا اور سبھی کے لیے حق و صداقت کی التجا اور قرآنی آیات کے الفاظ و عبارات میں خیرو نیکی کی درخواست کرنے کا بیان۔ **بیان** اس امر کا بیان کہ اعتباری آزادی دائمی گرفتاری ہے اور تشہیر کی غرض سے گوشہ نشینی اک خیالِ خام ہے۔ اس امر کا تذکرہ کہ ہر موجود صنعت خداوندی کا مظہر ہے اور ہر ذرہ لامتناہی حصّوں میں منقسم ہونے کے قابل ہے۔ اس امر کا اظہار کہ اکثر سہل انگار، کم ہمت، بے سرو پا اور اوچھے قسم کے کم عقل، آزاد منش لوگ جو ہر قسم کی پابندیوں اور قیود سے آزاد ہو کر بڑی آزادانہ، بیباکانہ اور ملحدانہ زندگی بسر کرتے ہیں اور اپنے آپ کو انتہائی خدارسیدہ، کامل و مقرب سمجھتے ہیں، وہ عجیب گمراہ اور گمراہ کن ٹولہ ہے، وہ دکھاوے کے مشائخ اور ریاکار زاہدوں سے بھی بدتر لوگ ہیں۔ ان شرپسند لوگوں کی صحبت اور مجلس سے بچنے کے لیے اُن کی شناخت اور پہچان کی غرض، ان کی علامتوں اور نشانیوں کا بیان، اور ان نا اہلوں کے باطن میں ایسی فاسد کیفیت کے ظہور کی وجوہ کا کلی ذکر، اور ان نابکار بدمعاشوں کے طور طریقوں، ان کے کاروبار اور رہنے سہنے کے ٹھکانوں اور ہم صحبتوں کی وضاحت، نیز بزرگی کے طلب گار نا اہل افراد اور شہرت کی خاطر چلّے کاٹنے والے احمقوں کا ذکر جو ہزار مکرو فریب، دھوکے اور دغابازی سے

لوگوں کے سامنے اپنی بزرگی، پاکیزگی اور کمال کو ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور اسی شہرت و ناموری کی تلاش میں ہلاک ہو جاتے ہیں، اور ان اشخاص کا تعین جن کے دلوں میں ایسے فاسد خیالات ہوتے ہیں اور ان پست فطرت کمینہ و ادنیٰ لوگوں کی دیگر علامات اور نشانیاں، نیز ان میں اور صدق و صفا والے صاحبِ دل بزرگوں اور سچے اکابر دین کی پیشوائی کا فرق اور کاملانِ حق کے گزر اوقات اور روزی کمانے کی تعلیم اور مخلص مومنوں کے لیے لائحہ عمل۔ (معمول و قاعدہ قانون)

اٹھانوے واں وارد:

الموسوم برہان الایمان۔ اپنے متن اور شرح سمیت۔ **بیان** اس امر کا بیان کہ اللہ سبحانہ تعالیٰ نے ائمہ معصومین کی عالی قدر ہستیوں اور متبرک نفوس کا ایمانی دلائل اور یقینی شہادتوں میں شمار کیا ہے اور انہی کے طفیل خالص مومنوں کو قرب و نزدیکی کی بنا پر مراتب عطا فرماتے ہیں۔ ان کی بابرکت صحبت کی بزرگی، اور ان کے منور اور نورانی چہروں کے دیکھنے کی سعادت کا ذکر اور پاک الہامی کلام اور دیگر حقائق و معارف کو حق کے ان برگزیدہ بندوں سے سننے کی برکت کا تذکرہ جنھیں اس دانائے مطلق نے اپنی طرف سے قرآنی علم کا فہم و ادراک عطا فرمایا ہے، اور اُنھیں تمام کمالاتِ محمدیہ سے متصف کیا ہے اور جن کی قدر و منزلت کو کماحقہٗ سوائے خدا اور رسولؐ کے اور کوئی نہیں سمجھ سکا۔ **بیان** بندوں کے علم کا تقاضائے بشری کے مطابق ہونے اور ان کا ایک دوسرے سے اختلاف کا بیان اور حقیقت محمدیہ (ان پر درود و سلام) کے جامع ہونے کا بیان، نیز یہ اظہار کہ اسی حقیقت محمدیہ کی شمولیت سبھی کو عذاب الٰہی سے رہائی دلا دے گی اور آخر کار تمام فرقوں کو مخلص مومن بنا دے گی۔ اس امر کا بیان کہ ہر صاحب علم کا علم اُس کی استعداد اور مرتبے کے مطابق ہوتا ہے۔ علیم مطلق تو فقط وہی ذات باری تعالیٰ ہے۔ انسان جو اپنی ذات میں سارے عالم کا مجموعہ ہے اُس کا علم دوسری موجودات کی نسبت بہت وسیع ہے، اور سوائے اللہ تعالیٰ کے علم کے اور کسی کا علم اُس سے وسیع یا فائق نہیں ہے، تاہم علم کلی انسانی کا مفہوم وہی کلی نوع انسانی سے ہے اور یہ مختلف اشخاص و افراد میں تسبیت بہ نسبت مجموعی علوم کی مناسبت سے جمع ہوتے ہیں جس کی بہت سی قسمیں ہیں اور جن سے بڑے بڑے اختلافات رونما ہوتے ہیں۔ کامل انسان تو فقط وہی فرد واحدؐ ہے جو افضل مخلوقات اور سرورِ کائنات ہے (اُن پر خدا کا درود و سلام) حضور پاکؐ کی امت میں جسے خیر الامم ہونے کا شرف حاصل ہے احیاء و تجدید دین کے لیے کاملانِ حق، نائبانِ خدا و رسول کی صورت میں ہر دور میں پیدا

ہوتے رہتے ہیں، وہی خالص نور محمدی ہمارے امیر المحمدین (یعنی والد بزرگوار مصنف) کی روشن پیشانی میں چمکا اور اُنھوں نے مومنوں پہ اس فیض کا دروازہ کھولا۔ انشاء اللہ نور محمدی کا پورا ظہور حضرت امام مہدیٔ موعود کی صورت میں جلوہ گر ہوگا۔ اس نعمت کے شکرانے اور امت محمدیہ کو دین اور شرع دین متین کی طرف دعوت دینے کا بیان اور اس آیت قرآنی سے اقتباس کی تاویل کہ "دین میں زبردستی (کافی نفسہٖ کوئی موقع) نہیں" کیونکہ ہدایت یقیناً گمراہی سے ممتاز ہوچکی ہے، اور شرع دین متین کے کامل اتباع کا حکم۔

ننانوے واں وارد:

الموسوم "نصر من اللہ" - اپنے متن اور شرح سمیت۔ **بیان** اپنے برگزیدہ بندوں میں سے ایک کے حال پہ اللہ تعالیٰ کی تائید و نصرت اور اس پہ علم و معرفت کے دروازے کھولنے، اُسے احسن تحریر و تقریر کی قوت عطا کرنے، ایمان و اسلام کی حقیقت سے مشرف فرمانے، اُسے صاحب کتاب بنانے اور کئی رئیسوں اور ذی شعوروں کو اُس کا صحابی بنانے کا بیان اور مقبولیت و خصوصیت اور قرب و نزدیکی کے معاملات کی دیگر خصوصیات کا ذکر اور سورہ النّصر اور سورۂ فلق و سورۂ الناس سے اقتباسات کی روشنی میں ان تمام مذکورہ بالا باتوں کا ذکر اور اس علم الکتاب کی سچائی اور جامعیت کا بیان اور قرآن پاک کی دیگر متفرق آیات کی شہادت سے متعلقہ امور کا انکشاف۔ **بیان فوائد** ، اچھی تصنیف کے فوائد اور دوستوں کے اتحاد اور دلجوئی و الفت کی ترغیب کا بیان۔ لکھی گئی کتابوں کی لفظی اور معنوی خوبیوں اور محاسن اور ان کی حسن و خوبی کا اظہار، نیز انبیاء و اولیائے کرام کے صاحب کتاب ہونے کی عظمت و بزرگی اور اُن کی تقریر و تحریر کے مربوط و مضبوط ہونے کا بیان کیونکہ اس خاص نعمت سے ہر ولی و نبی کو سرفراز نہیں فرمایا گیا، تالیف و تصنیف کا باہمی فرق، ان کی تعریف و توصیف اور اصل و تحقیقی کام اور نقل و تقلیدی کام کا باہمی فرق۔ نئے تحقیقات و لطیف مضامین و دقیق و سچی باتوں کی نایابی اور شاذ و نادر ہونے اور جدید و مبنی بر حقائق و معارف کی قلت و کم یابی کا بیان جو سب کی سب عقلی دلائل و براہین پہ مبنی اور سراپا آیات قرآنی اور احادیث نبوی کے درخشاں جواہرات کا تاج پہنے ہوتی ہیں اور منقول شہادتوں سے مستند بھی، جو ایمان کی تقویت، عرفان و معرفت کی تیزی، دنیوی بہبود اور اخروی فلاح اور ظاہری و باطنی برکتوں اور بھلائیوں کا ثمر لاتی ہیں۔
بیان علم کی عظمت کا بیان کہ جس سے بڑھ کر اور کوئی فضل و کمال نہیں۔ جو کچھ بھی ہے علم ہی ہے۔ اس شبہ کا دفعیہ کہ بعض مقربانِ ذات حق جن کی پیشوائی اور رہنمائی مسلمہ امر ہے لیکن وہ اتنا ظاہری علم نہ رکھتے تھے۔

ان کے سلسلے میں کیا کہا جائے گا، نیز بڑی اچھی تصنیف کے مصنف اور بڑے نیک دوستوں کے مالک اور بے تصنیف عارفوں کے مراتب کا انکشاف۔ بُری اور بے ربط تصنیف اور بے اصل کمزور تحریر و تقریر کا حال اور اوصافِ حمیدہ والے بے یار مشائخ کا مرتبہ اور شہرت کے بھوکے ریا کار زاہدوں اور خدا سے نسبت نہ رکھنے والے بُرے عالموں اور علم سے جاہل درویشوں کا درجہ۔

سوواں وارد:

الموسوم دین خالص۔ اپنے متن اور شرح سمیت۔ **دعوت** محمدیؐ خلوص، خودی وانا کی ملاوٹ سے پاک اور نفسانی شراکت سے مبرا ایمان کی طرف دعوت اور مخلص محمدیوں اور ان کے اس خالص دین کے اجر و ثواب اور ان کی اولیت کی خصوصی سعادت و عظمت کا بیان۔ **تعریف** توحید کی تعریف کہ وہ کس چیز سے عبارت ہے اور اُس کی حمایت اور اس کی مخالفت کی تفصیل۔ جاہلوں کے توہمات سے بچنے اور احمقوں کے ظن و گمان کو پہچاننے اور ان کے فاسد اور باطل عقیدوں کا مفصل انکشاف جو صاف الحاد اور واضح کفر و شرک ہے۔ خدا ایسا کبھی نہ کرے کہ توحید کے یہ معنی ہوں۔ بدنصیبی سے دورِ حاضر میں توحید کے یہی معنی رائج اور شائع ہیں، اور یہ گمراہ اور گمراہ کن لوگ اسے توحید، اتحاد، وحدت الوجود اور تصوف کا نام دیتے ہیں اور اسے عرفان و معرفت کے مراتب کو بلند کرنے والا سمجھتے ہیں۔ خدا کی پناہ۔ جو یہ بیان کرتے ہیں اللہ تعالیٰ ان باتوں سے بلند و بالا ہے۔ **تلقین** آیاتِ قرآنی کی تفسیر کے ضمن میں دین و ایمان کی تلقین۔ **بیان** وجود و ایجاد کا بیان اور توحید اور الحاد کا فرق۔ لفظ وجود سے مُراد ذاتِ حق کا وجودِ مطلق ہے جو مستقل اور قائم بالذّات ہے، اور لفظ ایجاد سے مراد اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے موجوداتِ ممکنہ کے لیے وجود ظلّی کی فیض رسانی کا تذکرہ جو واجب بالغیر ہیں اور ایجادِ حق تعالیٰ کی بنا پر موجود ہیں۔ مرتبۂ وجود کو نور اور مرتبۂ ایجاد کی اُس نور کے عکس سے مثال دی جاسکتی ہے۔ وجودیتِ ذات الوجود کا مرتبۂ کمال اور موجدیت اس کی تکمیل کا مرتبہ ہے اور اس امر کا اظہار کہ خالق خالق ہی ہے اور مخلوق مخلوق۔ توحیدی حالت اور الحادی کیفیت کے تفرقہ کا بیان جو زمانۂ حاضر پہ آن پڑا ہے۔ لوگوں میں یہی مغالطہ اور بے فائدہ الجھاؤ رونما ہو گیا ہے جس سے وہ گمراہی اختیار کر گئے ہیں۔ مقامِ توحید کی واضح تعریف و توصیف کا مفصل بیان اور ایمان دار موحدوں یعنی مخلص محمدیوں کے راہ و روش ان کی کیفیات و جملہ حالات کا مفصل انکشاف اور واضح اظہار۔ ملحدوں کے جھوٹ اور ترکِ حق اور ان بے دین گمراہوں کے

فاسد اور باطل خیالات سے متنبہ کرنے اور شریعت و طریقت و حقیقت و معرفت کی سیدھی راہ کی طرف رہنمائی کا بیان جو سلامتی کی راہ اور دُنیا و عاقبت میں نجات کا باعث ہے، نیز خدا شناسی کے معانی کے تمام مراتب کو طے کرتے پہ جو کچھ محقق ہوا اُس کا بیان کہ وہ ہے کیا چیز اور حقیقت کو نہ سمجھ سکنے والے اکثر کم عقل لوگ اُسے اپنے ظن و گمان کے مطابق کچھ اور ہی چیز سمجھتے ہیں۔

ایک سو ایک واں وارد:

الموسوم حقیقت الامر۔ اپنے متن اور شرح سمیت۔ **بیان** امور کی حقیقتوں کو ان کی اصلی حالت پہ دیکھنے کا بیان جیسی کہ وہ واقعتاً ہیں اور امکانی اور وجوبی اسرار و رموز کو انسانی طاقت کے مطابق سمجھنے اور اس انکشاف کے ہونے کا ذکر کہ کمال معرفت کے درجے پر پہنچ کر بھی اپنے عرفان و معرفت، حضور و شہود اور ذات و صفاتِ خداوندی کے سلسلے میں انسان کو اپنے عجز کا اعتراف کرنا پڑتا ہے یعنی کہ معلوم شد کہ ہیچ معلوم نہ شد، نیز تمام مراتب کے مکمل طور پہ حفظِ مراتب کا تذکرہ۔ **اظہار** امکانی حقیقت کا اظہار اور حیرت و نادانی کا اعتراف، نیز مرتبہ وجود کی یگانگت کا بیان اور حضوری و شہود کی ترغیب۔ موجود معدوم کے درمیانی واسطے کا اندازاً ذکر جس کے بعض متکلمین قائل ہیں، اور جسے وہ اپنی اصطلاح میں "حال" کہتے ہیں، لیکن جو محققوں کے نزدیک پایۂ ثبوت کو نہیں پہنچتا۔ **بیان** عمدہ انشا پردازی اور نہایت خوبصورت عبارات میں زمین و آسمان کے پیدا کرنے والے لاثانی اور بے مثال موجود حقیقی کی حمد و ثنا کا بیان اور اس امر کا اظہار کہ حقیقی وجود فقط اسی ذاتِ واحد کا ہے اور اس لفظ وجود میں لفظی یا معنوی کوئی اشتراک نہیں اور نہ ہی وجودات کی زیادہ تعداد ثابت ہوتی ہے۔ شک اور عمومیت وغیرہ اس مرتبے کے نسبی و اعتباری لگاؤ ہیں اور وہ وجودِ ظلی پہ صادق آتے ہیں۔ اس کی ذات کی طرف دیکھو تو اللہ تعالیٰ کی ذات ہر قسم کے تعلق و لگاؤ سے پاک اور مبرا ہے۔

ایک سو دوسرا وارد:

الموسوم آیت اللہ (اللہ کی نشانیاں) اپنے متن اور شرح سمیت۔ **بیان** اللہ تعالیٰ کی نشانیوں کا بیان جو تمام زمین و آسمان اور زمان و مکان میں ہر جگہ پھیلی ہوئی ہیں۔ دو کھلی اور واضح نشانیوں یعنی دن اور رات کا اظہار اور تاریک اور نورانی پردوں کا کشف۔ آفاقی و انفسی (ہمہ گیر) تجلیوں کی رہنمائی اور محجوب اصحاب کا فقط حسی صورتوں میں الجھے اور پھنسے رہنے کا ذکر۔ اس آیت کریمہ کا بیان جس کا

مطلب ہے کہ "اللہ تعالیٰ رات کے اجزا کو دن میں داخل کر دیتے ہیں"، اور (بعض فصلوں میں) دن کے اجزا کو رات میں داخل کر دیتے ہیں۔ قرآن مجید کی آیات کی تاویل اور ان کی تفسیر کے لیے مناسب الفاظ و معانی کی جستجو اور اُن امور کا بیان جو کلامِ الٰہی کے معانی کے اسرار و رموز کی اہلیت کے لیے ضروری ہیں۔

ایک سو تیسرا وارد:

الموسوم منہاج الفقر (درویشی کا راستہ) اپنے متن اور شرح سمیت۔ **بیان** درویشوں کے طور طریقوں کا بیان جن کی کئی قسمیں اور متعدد وضعیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے محبوب و متوکل درویشوں کا بہترین شیوہ یہی ہے کہ وہ فقر محمدیؐ کے وارث ہوتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کو محبوب حقیقی سمجھتے ہیں خدائے ذوالجلال سے اُس لازوال سعادت اور خوش بختی کی دُعا مانگتے ہیں جو دنیا و آخرت میں سُرخروئی کا موجب ہے اور مسکینی و دلگیری والے فقر سے پناہ مانگتے ہیں جو دونوں جہانوں میں روسیاہی کا باعث بنتا ہے۔ قرآنی آیات کے اقتباسات اور فصیح و بلیغ عبارات کے ذریعے پیغمبروں کے پیام کی تبلیغ کرنا اور راہِ نجات کی طرف بلانا۔ **بیان** درویشانہ گزر بسر اور فقر کا بیان۔ لفظ فقر کے معنوں کی لغوی، اصطلاحی، ظاہری، حقیقی، عرفی، مجازی، عمومی اور خصوصی لحاظ سے تحقیق و تدقیق۔ برکتوں والے اس مقام کے جامع و اکمل ہونے اور کمال کی آخری سرحدوں کو چھو جانے والے اس عالیشان مرتبے کی بزرگی و عظمت کا بیان، نیز اس بندۂ ناچیز کے اپنے حال پر اللہ تعالیٰ کے انعاموں اور عنائتوں کا ذکر۔ پوری سورۂ الم نشرح کے اقتباسات کی روشنی میں اللہ تعالیٰ کی ان عنایات پر اس فقیر درویش کا اُس منعمِ حقیقی کے احسانوں کا شکر ادا کرنا۔ **بیان** مقام فقر کے خواص کا بیان جو فقط حالتِ فقر ہی کے لیے مختص ہیں، اور مقامِ فقر کی ان شرائط کا بیان جن پر اس کا انحصار ہے اور جو اس سعادت کے بہم پہنچانے کی وجہ اور سبب بنتی ہیں۔ مقام فقر کے آثار کا بیان جو اس مقام و مرتبے کا نتیجہ یا پھل ہیں اور مقام فقر کے لوازمات کا تذکرہ جن کے بغیر گزارہ نہیں اور جو اس کیفیت کے لیے لازمی ہیں۔ **تقسیم** فقر کی دو قسمیں ہیں۔ ایک فقر اختیاری اور دوسرا فقر اضطراری، ہر ایک کی الگ الگ تعریف و توصیف۔ **بیان** درویشانہ گزر اوقات اور فقیرانہ ذریعۂ معاش کا بیان کہ کس طرح ہونی چاہیے اور کونسا طریقہ شائستہ ہے، اور چند امور کا کلی ذکر جن پر اس گزر بسر کی بنیاد ہے۔ اور مختصراً اعلیٰ عبارات اور عمدہ تشبیہات و استعارات سے ایک ہوش مندانہ نصیحت جس میں خیر و بھلائی ہے۔ اور فقر سے حاصل ہونے والی سعادت و عز و ناز کا اظہار اور جناب قبلہ و کعبہ والد بزرگوار کے فقر محمدی کے عز و ناز کا تذکرہ

(خدا ان پر، ان کے خاندان اور آل اولاد پر برکتیں نازل کرے) اور اس بندہ ناچیز کے نانا بزرگوار، عارفوں کے سردار، متوکلوں کے بادشاہ جناب عالی مقام میر سید محمد اور ماں اور باپ دونوں کی طرف سے اپنے جدامجد حضرت شاہ نقشبند اور جن و انس کے غوث اور مورثِ اعلیٰ سیدنا حضرت علی مرتضیٰؑ اور خدا کے اُس آخری رسول و نبیؐ کے فقر کا تذکرہ جس کی ذات بابرکات اگلوں اور پچھلوں سبھی کے لیے باعث فخر ہے اور جس کی ذات اقدس پر جاکر تمام وسیلے ختم ہوجاتے ہیں۔ اور اس امر کا اظہار کہ کوئی فضل و کمال ایسا نہیں جس پر فخر و ناز کیا جاسکے سوائے دولتِ فقر کے جس پہ بجا طور پر فخر و ناز کیا جاسکتا ہے۔ مقام فقر کے خاص قرب کا اظہار اور اُس کی اللہ تعالیٰ سے مکمل نسبت اور عالی مقام و بلند مرتبہ فقرا کے لیے ہدایت نامہ و تعلیم۔

ایک سوچوتھا وارد:

الموسوم دین قیمؔ، اپنے متن اور شرح سمیت۔ **بیان** قائم و دائم رہنے والے دین کا بیان جو عیناً طریق و سنّتِ نبوی ہے اور جسے اللہ تعالیٰ نے مخلص محمدیوں کو عطا فرمایا ہے۔ دین اور مشاہدۂ حق اور ایمان کی تقویت کے آئین کی اس طریقے سے تلقین جو اللہ اور رسولؐ کے فرمودات کے مطابق ہے۔ **بیان وحدت الوجود و شہود** وحدت الوجود اور وحدت الشہود کا بیان، اور توحید محمدی (ان پر خدا کا درود و سلام) کی طرف دعوت۔ اس امر کا اظہار کہ توحید کی اصلیت جو توحید مطلق کہلاتی ہے وہی عین ایمان ہے اور حضور پرنور رسول اللہؐ نے اُسی توحید کی طرف لوگوں کو بلایا۔ وجود و شہود کی قیود و شرائط کی جزئیات۔ یہ محض بدعتیں اور انوکھی اختراعیں ہیں۔ ان نئی نئی بحثوں کے چھڑ جانے کی وجہ اور سبب کا بیان۔ وحدت الوجود اور وحدت الشہود کے ماحصل، نتیجہ اور کیف و حال کا تذکرہ اور ان کی اختلافی مشکلات کے حل اور یگانگت و بیگانگت کی ماہیت کا بیان۔ وحدت الوجودی صوفیا اور وحدت الشہودی محققوں کے جملہ شکوک و شبہات اور اُن کا باہمی فرق۔ ان کے علوم و فنون اور اسرار و رموز کی تحقیق جسے وہ علم تصوّف یا علم حقائق کہتے ہیں۔ ان دونوں گروہوں میں سے ہر کسی کے قرب و منزلت اور نسبت کا بیان اور دونوں فریقوں کی تحقیقات کی اصلیت اور تقریروں کی حقیقت اور ساداتِ محمدیہ کی حقیقت کا انکشاف اور نیکی کے ان مجسموں کے مرتبے کی بلندی اور محمدیؐ علم الٰہی کا بیان اور حضور پاکؐ کے مکمل اتباع کا ذکر اور اس امر کا بیان کہ دینِ اسلام کے بڑے بڑے رہنما، پیشوا، صاحبِ جاہ، صاحب نگاہ اور اتحاد و امتیاز کی ہر دو حیثیتوں سے مکمل طور

پر مطلع و آشنا حضرات اور وحدت و کثرت کی ماہیت کو دیکھنے والے، یگانگت و بیگانگت کے اسرار و رموز سے آشنائی والے، پاکیزہ تشبیہات و استعارات کو جمع کرنے والے صاحبانِ جمع و فرق جنھوں نے مستی و ہشیاری، اُتار چڑھاؤ، مذہب و سلوک، فنا و بقا اور ولایت و نبوت کے قرب و نزدیکی کے تمام مدارج طے کیے ہوئے ہیں، لیکن ان بزرگ ہستیوں میں سے بعض نے حقیقت کو اپنے ہم عصروں کی استعداد کے مطابق ان کی خرابیٔ احوال کی اصلاح کی نیت سے لکھا مگر اپنی طبائع کے ذاتی رجحان اور میلان کے مطابق بیان کیا اور اسی قسم کی دیگر وجوہ در پیش ہونے کی وجہ سے کسی ایک جانب کو ترجیح دی ہے اور اسی جانب کی طرفداری اور حمایت کرتے ہوئے اسی کو ثابت کرنے کا بیڑا اٹھایا ہے جیسا کہ شیخ اکبرؒ جن پر ولایت کی ایک حالت کا غلبہ تھا لہٰذا اُنھوں نے اتحاد و یگانگت کے اسرار و رموز اور وحدت الوجود کے سلسلے میں اعتبارات و امتیازات کا دفعیہ کرتے ہوئے وحدت الوجود کے حقائق و معارف پر قلم اُٹھایا اور حضرت مجدد (خدا ان کے اسرار کو مقدس بنائے) پر چونکہ کمالاتِ نبوت کے مقام کا غلبہ تھا، اُنھوں نے دوئی و وحدت پر قلم اُٹھایا اور مسئلہ وحدت الشہود پر تحقیق فرمائی اور بڑے شد و مد سے دوئی و مغائرت کے مراتب کو ثابت کیا اور حضرت امیر المحمدین یعنی میرے والد بزرگوار جو شارع و شرع دین متین کے پیرو تھے، انھوں نے وہی معتدل قسم کی جامع دعوت دی اور عامۃ المسلمین کی رہنمائی و پیشوائی فرمائی اور پرچم اسلامی کو بلند کیا اور مجھ بندۂ ناچیز پہ خصوصی توجہ مبذول فرما کر توحید کے اسرار و رموز کھولے اور خاص عنایت فرمائی۔ اور حضور پاکؐ کی سنتِ مسنون و مقبول کے مطابق توحید ربانی کی تلقین کی اور لوگوں کو دعوتِ حق کی ہدایت و تربیت فرمائی۔ اپنے اُس ہادی کی زبان معجز بیان سے نکلنے والے تمام کلمات اور روایات کا ذکر، اور اس امر کا بیان کہ یہ توحید مطلق جو عام معنوں میں وجود کی شرط کے بغیر اور اپنی ہی قیود و شرائط پر مشتمل ہے، جب کہ توحید وجودی وجود کی شرط کے ساتھ اور توحید شہودی مرتبۂ لاشیٔ سے متعلق ہے اور وہ سیدھی اور معتدل راہ ہے جس میں کسی غلطی اور گمراہی کا شائبہ نہیں۔ لہٰذا افراد یا ان جزئیات جن کا قدرے کھُل کر ذکر آچکا ہے کی رو رعایت کے بغیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع کرتے ہوئے توحید کے اسی عام فہم معانی کی طرف بلانا چاہیے اور جہاں تک ہو سکے اپنی تحریر و تقریر میں دلائل و کشف اور منقول و معقول کو یکجا کرنا چاہیے اور علم اصول کے چاروں دلائل کی مانند کتاب و سنت کے اتباع اور خدا اور رسولؐ کی پیروی کو سب سے مقدم اور اپنا اصل مقصد و مدعا سمجھنا چاہیے اور پھر کشف و

دلیل کے ضمن میں خدمت کی نیت اور اپنی مثال کی قوت کو مزید تقویت دینے کے لیے اجماع اُمت اور قیاس کی دو دلیلوں کو بھی ہاتھ سے نہ چھوڑنا چاہیے۔ تعلیم نامتام ملاؤں، خام کار صوفیوں اور بدانجام فلاسفروں کی ڈگر سے ہٹ کر مخلص پیروان اہلِ اسلام کی تربیت اور رشد و ہدایت کے لیے لائحہ عمل جو مرشدوں اور مریدوں کے احوال و انجام کا اصلاح کنندہ اور دین و دُنیا دونوں میں مفید اور کارآمد ہے اور مختلف قسم کی اہلیتوں کے مالک سالکانِ راہ کی تربیت کی کلیات کہ سب کو ایک ہی لاٹھی سے نہ ہانکنا چاہیے بلکہ ہر کسی کی اس کے حسب استعداد ایسے طریق سے تربیت کرنی چاہیے جو اس کے لیے مناسب اور مفید ہو۔ اور عمدہ وعظ و نصیحت اور بڑی دانشمندی سے دعوتِ حق دینی چاہیے، نیز اعتدال کی وسطی راہ کو اختیار کرنے اور کلام اللہ کا مکمل سہارا لینے کا بیان اور اس امر کا اظہار کہ معرفت وہی ہے جو حقیقت کا انکشاف کرے۔ حقیقت عین شریعت ہے۔ جو کچھ بھی شرع دینِ متین کے مطابق و موافق ہے وہی حق ہے اور صحیح، اور اگر ایسا نہیں تو پھر یہ حقیقت یُوں نہیں ہے۔ حقیقت کو کل نوعِ انسانی کے مفہوم اور شریعت کو کسی ایک فرد یعنی زید یا عمر کے مفہوم سے مثال دینے کا بیان۔ اسی مثال سے تمام احوال اور حقائق کا انکشاف اور دینِ حق و باطل کی پہچان اور کفر و اسلام کا فرق نظر آجاتا ہے۔ ہر خاص و عام کو دینِ اسلام کی دعوت کے ساتھ ساتھ حقیقت کی کُنہ اور وحدت و کثرت کے دونوں مراتب کے اعتباری ہونے کا تذکرہ اور چند دیگر پند و نصائح کا مختصر ذکر اذکار۔

ایک سو پانچواں وارد:

الموسوم ضرب المثل، اپنے متن اور شرح سمیت۔ **بیان** کسی صورت حال کی وضاحت اور اپنے مطالب کو سمجھانے کے لیے ضرب المثل کے پیش کرنے کا فائدہ۔ **بیان** عقلی اور عشقی نسبت کا تفصیل سے اور اپنے مدعا کا اظہار بذریعہ تمثیل کرنے کا بیان۔ یعنی اللہ سے نسبت اور انسانی نفس ناطقہ پر وجود واجب کا ثبوت دو راہوں سے ہوتا ہے۔ ایک عقلی قوت، ذہنی دلائل کی استقامت، عقل و فہم کے زور اور فہم و فراست کے بل بوتے پر حاصل ہوتا ہے جسے حق پرستی، علم الٰہیات اور فلسفہ و حکمت کہتے ہیں جو فلسفیوں اور دیگر دانشوروں کا حصہ ہے۔ لیکن ایسی کمزور سی نسبت پہ نہ تو ایمان کو مشروط کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی ایمان کا اس پہ انحصار ہو سکتا ہے۔ اور نہ ہی اس کا ثمرہ قرب و نزدیکی اور فیض و برکت کا موجب ہو سکتا ہے۔ ہاں کسی حد تک معاش کی اس سے اصلاح ضرور ہوتی ہے اور یہ انسانی

اخلاق و اوصاف کو سنوار دیتا ہے اور بس - دوسری عشقی قوت ہے جو غلبۂ محبت سے پیدا ہوتی ہے جس کی تعبیر جذب الٰہیہ اور فیض ربانی سے بندوں کو برگزیدہ کرنے اور ان پر انوار رحمت کی بارشوں کے نزول سے کی جاسکتی ہے - یہ ایمانی سعادت اور یقین محکم سے تعلق رکھتی ہے اور درحقیقت انبیائے کرام ہی کے لیے مخصوص ہے، پھر ان کے اتباع اور انہی کے طفیل اولیائے کرام کو نصیب ہوتی ہے ، اور پھر اس کے بعد عامۃ المسلمین کو ان کے مراتب کے مطابق عطا ہوتی ہے - اور اُمت مرحومہ کے علاوہ کسی اور امت کو یہ نعمت نصیب نہیں - عشق و محبت والی یہ نسبت فنا و بقا اور قرب و نزدیکیٔ خدا و رسول ﷺ کی شکل میں ثمرہ دیتی ہے اور بے شمار فیوض و برکات ، انکشافات و الہامات اور دیگر ایسے معاملات کا موجب بنتی ہے اور یہ دین و دُنیا دونوں میں خیر و برکت اور نجات کا باعث ہوتی ہے - عقلی و عشقی نسبتوں کا مفصل بیان اسی وارد کے متن اور تشریحات میں مذکور ہے - ہر اکائی کی مثال دے کر تفصیل دی گئی ہے تاکہ عقل کے پابند دانشور اپنی انا اور خودی کے پھندے سے باہر نکل آئیں اور محض اپنی عقل و دانش ہی کو اپنا رہنما اور پیشوا نہ سمجھیں اور ہمہ تن خدا و رسوؐل کی اطاعت میں مشغول ہو جائیں اور اللہ تعالیٰ کی ذات اور اس کے مقبول بندوں سے عشق و محبت کر کے اپنے ایمان اور یقین کو محکم بنائیں اور فلسفیانہ مسلک سے نکل کر صادق مومنوں کے زمرے میں داخل ہو جائیں اور صوفیا کے مذہب سے بھی الگ ہو کر مخلص پیروانِ رسول بن جائیں اور مکمل طور پر حبیبِ خدا یعنی رسول اللہ کے عاشق بن کر ان کی درخشاں شریعت کا تتبّع کرنے لگیں اور حضور سرورِ کائنات ﷺ کی طریقت پر عمل پیرا رہیں - (ان پر خدا کی رحمتیں ہوں اور سلامتیاں) **بیان** اس امر کا بیان کہ اللہ جل جلالہٗ کو ایک صاحب شان و شوکت بادشاہ سے اور فلاسفروں اور ان کے پیروکاروں کو ایک ہوشیار دانا اور عیار آدمی سے تشبیہہ دی جاسکتی ہے جو اپنی عقل اور تدبیر و تدبر کے بل بوتے پر اپنا کام چلاتا ہے ، اور ذاتی مصلحت کی بنا پر سرکار دربار میں اثر و رسوخ پیدا کرتا یا بادشاہ سے رسم و راہ بڑھاتا ہے اور اولیائے کرام اور ان کے مقلّدین کو جنھیں ہم اولیاء اللہ کہتے ہیں ، اسی بادشاہ پر مر مٹنے والے عاشق و شیدا سے تشبیہہ دے سکتے ہیں ، جن کے سارے کاروبار کا مرکز و محور اسی بادشاہ کی والہانہ محبت ہوتی ہے - اس امر کا بیان کہ یہ انبیا کا منصب ہے کہ ان کے تمام کام کاج ، اعمال ، افعال و اقوال ، ان کے ارادے اور نیتیں حتیٰ کہ اُن سے صادر ہونے والی ہر بات اللہ ہی کی طرف سے ہوتی ہے اور اللہ ہی کے واسطے ہوتی ہے - اور اولیائے کرام کا طریقہ یہ ہے کہ ان کے بعض کام خالصتاً اللہ ہی کے واسطے

ہوتے ہیں اور بعض آخرت کے واسطے اور اُسی کی کمی بیشی اُن کے مراتب میں فرق کا باعث ہوتی ہے اور صالحین اور مومنین کا مرتبہ یہ ہے کہ ان کے بعض اعمال تو آخرت کے لیے ہوتے ہیں اور بعض دُنیا کے لیے۔ ان کے درجات و مراتب کا باہمی فرق بھی صلاح و تقویٰ اور ایمانی قوت کے ضعف اور تقویت ہی کی کمی بیشی سے ہوتا ہے، اور حق بات یہ ہے کہ محض اللہ کے لیے کام کرنے کی ان میں اہلیت ہی نہیں ہوتی۔ مجازی اور حقیقی طور پر محض اللہ کا ہو کر رہ جانے کے فرق کا بیان۔ اُدھر کافروں اور مشرکوں کا یہ درجہ ہے کہ اُن سے سرزد ہونے والا ہر فعل اور قول نفس کے لیے ہوتا ہے اور محض دُنیا کے لیے۔ خالصتاً اللہ ہی کے ہونا اور ہو رہنا تو الگ رہا اُن کا کوئی کام آخرت کے لیے بھی نہیں ہوتا اور جو نیک کام وہ کرتے بھی ہیں، ان کے کفر و شرک کی سختی و نحوست کی وجہ سے مٹ جاتے ہیں۔ چوپایوں جیسے عوام الناس کی مثال غریبوں اور رعایا سے دی جا سکتی ہے کہ اُنھیں راعی و رعایا کی ادنیٰ اسی نسبت تو ہوتی ہے، مگر اس تک رسائی کبھی نہیں ہوتی بلکہ ان میں سے بعض تو اپنی اس ادنیٰ نسبت کو سمجھنے سے بھی غافل ہوتے ہیں۔ فلاسفہ اور ان کے مقلّدوں کی مثال مکر و فن کے ماہر اور چالاک و عیّار دُنیاداروں سے بھی دی جا سکتی ہے، اور انبیائے کرام کو مخلص اور صاحبِ اقتدار وزیروں سے، اور اولیائے کرام کو خاص مصاحبوں اور محرم خواصوں سے، اور مرجع خلائق اولیا و مشائخ کو جو نبوت کے کمالات کے وارث اور امامت کی مسندگاہ کے مسند نشین ہوتے ہیں، اُنھیں وزیروں کے نائبوں سے تشبیہہ دے سکتے ہیں، اور قاضی، مفتی اور عالموں اور فقیہوں کو انہی کے دیوانی دفاتر کے اہلکار، عہدے دار اور سررشتہ دار کہا جا سکتا ہے، اور باطنی خدمات انجام دینے والے دیگر صاحب منصب لوگ ابدال، نقیب (قطب) اور غوث وغیرہ ہوتے ہیں۔ جزئی خدمات انجام دینے والے افراد باورچی، خانساماں اور گھریلو ملازم و محافظ و نگراں کی طرح ہیں، اور عوام اور عامۃ المسلمین کو نوکر چاکروں، ادنیٰ عہدے داروں، سرکاری ملازموں سے تشبیہہ دی جا سکتی ہے جو امیروں، وزیروں کے وسیلے سے تعینات ہوتے ہیں، اور جنھیں اپنے اپنے مرتبے کے مطابق سرکاری کاموں میں کچھ عمل دخل یا اس کی کچھ سوجھ بوجھ ہوتی ہے۔ کافروں اور منافقوں کی مثال ایسے ہے جیسے سرکش و باغی لوگ۔ جن کے خلاف جہاد کیا جانا چاہیے، اور ملحد اور فسادی ڈاکوؤں اور چوروں کی طرح ہیں جو تنبیہہ کے لائق ہوتے ہیں۔ **بیان** اللہ سے خیر و برکت مانگنے کی پند و نصیحت اور عشق و محبت خداوندی کے لیے دُعا کا بیان۔

ایک سو چھٹا وارد:

الموسوم انابت (ندامت) اپنے متن اور شرح سمیت۔ **بیان** اس امر کا بیان کہ ندامت اور توبہ ہدایت کا دروازہ اور سعادت و خوش بختی کی تمہید ہے۔ یہ ہدایت یافتہ بندوں کے دل میں خدا کی طرف سے نازل ہونے والی بات ہوتی ہے، اور ازلی بدنصیب اس عنایت خداوندی سے محروم ہوتے ہیں، نیز آیاتِ قرآنی کی روشنی میں نیک کاموں کی تلقین اور بُرے کاموں سے ممانعت کا بیان۔ **بیان رجوع** اللہ کی طرف رجوع اور گناہوں پہ توبہ و استغفار کرنے کا بیان۔ اللہ کی طرف رجوع کرنے کی دو قسمیں ہیں۔ ایک باطنی رجوع اور دوسرا ظاہری رجوع۔ ہر قسم کے مراتب کی تفصیل کے لحاظ سے تعریف و توصیف اور پھر اس کے سلسلے میں اہتمام و استقلال اور تسلسل و تواتر سے کام لینے کی ترغیب، نیز اوراد و وظائف کو لازمی جاننے اور کلمۂ طیبہ کے معانی کو سمجھتے ہوئے اس کے مستقل ورد کی ترغیب۔ عبادات خداوندی مثلاً نماز، قرآن حکیم کی لمبی تلاوت، کثرت سے نفل پڑھنے اور نماز کو ساری عبادتوں پر افضلیت دینے کا شوق دلانا، نیز اس امر کا بیان کہ آخر انسان بندہ بشر ہی تو ہے تو تقاضائے بشریت سے اگر کوئی جرم یا گناہ سرزد ہو جائے تو اس پر مغفرت چاہنا اور توبہ کرنی چاہیے اور خدائے غفور الرحیم کی مغفرت و بخشش سے کبھی مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ توبہ کے دروازوں کا بند ہو جانا اسی مایوسی کی حالت ہی سے عبارت ہے۔ سرے سے گناہ ہی نہ کرنا، تو فرشتوں کا کام ہے۔ یہ انسان کے خصوصی کمالات کا حصّہ نہیں۔ گناہ پر اصرار کرنا شیطان کا کام ہے۔ اور گناہ کر کے اُس پہ نادم ہونا اور توبہ کرنا آدمؑ کا کام ہے۔ توبہ کرنے والے انسان کی صالح انسان پر برتری و ترجیحی کیفیت کے ایک دقیق نکتہ کا بیان اور اس امر کا اظہار کہ اکثر مقامات پر لفظ آدم سے مراد فقط حضرت آدم علیہ السلام ہی نہیں جو باوا آدم ہیں، بلکہ اس کا اطلاق نسل انسانی پر بھی صادق آتا ہے۔

ایک سو ساتواں وارد:

الموسوم حبل اللہ (اللہ کی رسی) اپنے متن اور شرح سمیت۔ **بیان** اللہ کی رسّی کے معانی کی تفصیل اور اُسے مضبوطی سے پکڑنے اور اُسے نہ چھوڑنے کا بیان۔ **بیان** تقدیر کو سپردگی اور تدبیر کی حقیقت کا بیان۔ اس امر کا اظہار کہ تقدیرِ الٰہی کا ایک باطن ہوتا ہے جسے اللہ کا ارادہ یا مشیّتِ ایزدی لکھتے ہیں اور اُسے مرتبۂ وجوب میں داخل سمجھتے ہیں۔ ایک اُس کا ظاہر ہوتا ہے جنھیں

ظاہری اسباب کا نام دیا جاتا ہے اور اُسے مرتبۂ امکان میں موجود سمجھتے ہیں۔ ان ہر دو مرتبوں کی تعریف سمیت تدبیر کی حقیقت کا بیان کہ وہ آخر کس چیز سے عبارت ہے۔ اُس کا تقدیر کے مطابق یا موافق نہ ہونے، ہر بات میں خدا پر توکل رکھنے اور تمام کام اسی ذات باری تعالیٰ کو سونپنے کا بیان، نیز اپنے باطنی سکون سے دوسروں کے نفوس پر بھی اثر انداز ہونے اور اپنے تمام کاموں میں اللہ تعالیٰ کی قوت اور قدرت کاملہ سے رہنمائی لینے اور صبر و استقلال، بردباری، تسلیم و رضا و توکل کی سعادت حاصل کرنے کا بیان۔

ایک سو آٹھواں وارد:

الموسوم بیان واقعی، اپنے متن اور شرح سمیت۔ **بیان** واقعہ اور امر واقعی کی حقیقت کا بیان۔ واقعہ اور واقعے کی اصلیت میں باہمی نسبت۔ اور اصلی و حقیقی موجود اور اعتباری و مجازی موجود واقعی کی تعریف اور اشیا کی ان حقیقتوں کا ثبوت جن کا تعلق علم فرائض کے جاننے والے کے فرض سے ہے، اور جو صرف موہوم اور محض اعتباری نہیں ہیں اور وحدانیت کی اصل حقیقت کا بیان۔ **بیان** اعتبارات کے اختلافات اور توہمات (وہم و گمان) کا رفع کرنا جو دراصل ان کثیر التعداد اختلافات کا مبداء و منبع ہیں اور ذہنوں، فہموں اور زبانوں کی تعداد کی کثرت، اشیا کے حالات ان کی تعبیرات و تحقیقات کے اختلاف کا موجب ہے دراصل اس ساری تعداد و کثرت کا منبع مرتبۂ وحدت ہے۔ وحدت و کثرت کے مراتب کا ذکر اور اس امر کا اظہار کہ اللہ و رسولؐ کے فرمودات کو معتبر سمجھ کر ان پر مکمل یقین و عقیدہ رکھنا چاہیے، اور دُنیا بھر کے ظنی گمانوں اور اعتباری وہموں کو رفع کر کے اپنے دیکھے اور سمجھے ہوئے اور دوسروں کے کہے اور سُنے ہوئے سب کو اپنے دل و دماغ سے مٹا کر شریعتِ دینِ متین اور طریقتِ محمدی کا اتباع کرنا چاہیے، اور باقی تمام تعبیروں اور تقریروں کو بے اعتبار سمجھنا چاہیے۔

ایک سو نوواں وارد:

الموسوم رفیق طریق، اپنے متن اور شرح سمیت۔ **بیان** حق سبحانہ تعالیٰ کے قرب، ریاضت کے لزوم اور مشاہدہ ذات کے دوام و ہمیشگی کا بیان۔ کسی خالص مومن کو پوری عقیدت مندی سے وسیلہ بنا کر طریقتِ محمدی سے خصوصی نسبت حاصل کرنے کے ارادے، راہ و روش محمدی کے اپنانے اور ذکر اذکار اور اوراد و وظائف سیکھنے کے لیے اس کے ہاتھ پر بیعت کرنے کا بیان اور حقیقت محمدیہؐ اور کامل اتباع خدا و رسولؐ کے اسرار و رموز کا اظہار۔ **بیان** فانی ہستی کے فنا ہونے کا بیان اور نیکیوں کی

صحبت اختیار کرنے کی ترغیب ۔ زندگی کے ناپائدار، بے ثبات اور قلیل المدت ہونے اور اس فانی دُنیا کے موہوم و معدوم ہونے کا بیان ۔ بزرگانِ دین اور اکابر اراکین دین اسلام کی نشانیوں اور ان کی تعریف و توصیف کا بیان ۔ یہ خدا رسیدہ لوگ امتِ محمدیہ کی پیشوائی اور رہنمائی کے لائق ہوتے ہیں۔ ان خدا رسیدہ بندوں کی محبت اور صحبت کی عظمت کا ذکر، کیونکہ سینہ بسینہ فیض کے بغیر کمالاتِ نبوی کے طریق پہ حضوری، اور قرب و نزدیکیٔ حق تعالیٰ ہاتھ نہیں لگتی۔ اہلِ ولایت کے ذوق و کیف وحال کے مراتب کا باہمی فرق کیونکہ واقعاتِ کمالاتِ نبوّت سے نسبت تو اک بچگانہ کھیل ہے ۔ نبوّت کے کمالات کی نسبت کی بجائے کمالاتِ نبوت کا قرب جو اصل طریقِ نبوی کی تعبیر ہے۔ اس کی مثال مردانہ طور طریقوں سے ہے اور بڑھاپے میں باوقار بزرگ اُسے بھی پیچھے چھوڑ جاتے ہیں اور انسانی کمالات کے بلند و عالی و کامل ترین مرتبے تک جا پہنچتے ہیں۔ **بیان** بزرگوں کی ظاہری جدائی اور فراق کے افسوس و حسرت کا بیان اور اس ظاہری دوری اور فاصلے کے باوجود اُن سے باطنی اور روحانی حضوری کا بیان ۔ قبلہ بزرگوار والد محترم کے اوقات و معاملات کا کچھ ذکر اور ان کی گزر بسر اور رہنے سہنے کے ڈھنگ کا تھوڑا بہت بیان (اللہ مدد کرے ہماری اُن کے راز کے ساتھ اور پاکیزہ کرے ہمیں ان کی نیکی کی برکت سے) جو ہمارے وہم و گمان سے آگے اور ہمارے ہوش و حواس سے بڑھ کر تھا، اور ان مذکورات کا تصور جہاں اپنے بشری عجز اور اپنی کوتاہیوں کے اعتراف کے سوا اور کچھ نہ کہنے کا ہے ۔

ایک سود سواں وارد:

الموسوم ذکر حبیب ، اپنے متن اور شرح سمیت ۔ **بیان** زبانی ذکر کی قسموں کا بیان ۔ ایک قسم قولی ہے کہ ذکر بآوازِ بلند کیا جاتا ہے ۔ دوسری قسم قلبی خفی یعنی خاموشی سے چپ چاپ ذکر کیا جاتا ہے ۔ ان سات قسم کے خوبیوں بھرے مراتب ، اور عاشق کا محبوب کے ذکر اور اپنے مطلوب و مرغوب کا کثرت سے یاد کرنے کا بیان ۔ چونکہ ذکر اذکار کا منبع و مبداحبِ محبوب ہے۔ اس سے اللہ تعالیٰ کی محبت تمام نیکیوں میں سرفہرست ہے اور اللہ و رسول ﷺ کی محبت انسانی نجات کا اصل سرمایہ ہے ۔ **بیان** اسرار دوستی کے اسرار و رموز اور محبت کے فوائد کا بیان، نیز دُنیا اور علائق دنیوی سے کلی طور پہ قطع تعلق کر لینے اور اللہ تعالیٰ کے لیے ایک مضبوط و مکمل وسیلے کا ذکر۔ اور یہ بات مرشد کامل کی بیعت کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتی۔ جس طرح رسول کریم ﷺ بندوں اور خدا کے درمیان اک وسیلہ و واسطہ ہیں اور فنا فی الرسول ﷺ

ہوئے بغیر فنا فی اللہ کی منزل کو پہنچنا محال ہے۔ اسی طرح مرشد کامل، امت اور رسول اللہ صلعم کے درمیان واسطہ و وسیلہ ہے۔ لہذا فنا فی الشیخ ہوئے بغیر فنا فی الرسولؐ کے درجے تک پہنچنا محض ایک خیال اور وہم و گمان ہے، لہذا اپنے زمانے کی زندہ شخصیت کے ہاتھ پر عقیدت سے بیعت کرنا ضروری ہے، نیز پاک ارواح جلیلہ سے فیض حاصل کرنے کا انکشاف۔ حصول فیض کے بعد تفصیلاً یا حصول سے پیشتر مختصراً مرشد سے خصوصی نسبت، اور پھر کام کو کلی طور پر مرشد پہ چھوڑ دینا اور ان کی صحبت سے روحانی فیض پانا۔ حضرت اویس قرنی کے حال اور اویسیہ نسبت کا بیان۔ مقبولیت اور برگزیدگی پہ پہنچ کر فضل و کرم ربانی کے دیگر اسرار و رموز اور ذوق و شوق و محبت فراواں کی کیفیات کا بیان اور اس صورتِ حال کی تشریح و توضیح کہ اللہ تعالیٰ خود جمیل ہے اور حسن و جمال کو پسند کرتا ہے۔ اور جمال الٰہی کا بیان جو جمال حقیقی اور کمال ذات ہے۔ اس کی دو قسمیں ہیں پاک وصاف ذاتی حسن جسے عینی کمال بھی کہتے ہیں۔ دوسرا تشبیہی و وصفی جمال جسے ظلی کمال بھی کہتے ہیں اور ممکنات کے لیے ان ہر دو جمال و کمال کی فیض رسانی کی آگے چل کر پھر دو قسمیں ہیں، اک باطنی جمال اور دوسرا ظاہری جمال۔ ان ساری قسموں کی تفصیل کا ذکر و بیان۔ **بیان** باپ بیٹے کی محبت و شفقت کے خصوصی معاملات اور وہ خصوصیات جو محض اللہ تعالیٰ کی طرف سے میسر آئیں اور مثنوی کے چند اشعار کی تشریح جو اس مقدمہ کے لکھنے کے دوران غیر ارادی طور پہ موزوں ہو کر اس متن میں شامل ہو گئے، اور اپنے ضمن میں اپنے عزیز بھائی (اُس پہ خدا کی سلامتی ہو) کو قبول فرمانا اور اُس کے لیے دعائے خیر کرنا۔ اور اس تمام مقصد و مدعا کا قرآنی آیات سے اقتباس کیے جانا اور اس حقیقت کا اظہار کہ اگر توحید پہ یقین اور مشاہدہ ذات چشم بصیرت یعنی باطنی آنکھ کا نور رہے، تو سارے کام کاج اور سب معاملات حق پرستی میں داخل ہو کر عبادت ہی سمجھے جاتے ہیں، اور خودی و تکبر و غفلت چشم بصیرت کا حجاب بن کر حقیقت کے دیکھنے میں رکاوٹ پیدا کرے تو تمام نیکیاں اور عبادتیں بھی غیر مقبول اور ضائع ہو جاتی ہیں، بلکہ بے دینی میں شمار ہوتی ہیں۔

ایک سو گیارھواں وارد:

الموسوم حسنِ خاتمہ۔ اپنے متن اور شرح سمیت۔ **اظہار** اس نام کے رموز کا اظہار اور اس نام کی وجہ تسمیہ، اور اس تصنیف کے بخیر و خوبی پایۂ تکمیل تک پہنچنے اور اپنے جیسے ضعیف انسان پہ اللہ تعالیٰ کی خاص عنایات کے شکر کا بیان اور دین و شرعِ دین متین کی طرف خصوصی دعوت اور جملہ مومنوں کے حق

میں دعائے خیر خواہ وہ زندہ ہوں یا مر چکے ہوں ۔ **بیان** حضور سرورِ کائنات کے اتباع کا بیان کہ جن کی ذاتِ بابرکات موجودات کا لبِ لباب ہے (ان پر خدا کا درود و سلام ہو) اور طریقتِ محمدیہ کے امام اور ملتِ اسلامیہ کے حامی و مددگار یعنی اپنے والد بزرگوار خواجہ محمد ناصر جن کا تخلص عندلیب تھا اللہ مدد کرے ہماری ان کے راز کے ساتھ ، اور پاکیزہ کرے ہمیں ان کی نیکیوں کی برکت سے) اُن کے مبارک نام پر کلام کا خاتمہ ۔ اس امر کا بیان کہ تتبع کا وصف حقیقت ممکنہ کے لوازمات میں سے ہے اور حقیقی حاکمیت اعلیٰ ذات الوجوب ہی سے مختص ہے جس کی تعبیر خود معبود حقیقی یعنی خدا تعالیٰ ہے اور مکمل تقلید جو عام طور پر تمام موجودات ممکنہ کے شامل حال ہے وہ وجودی تقلید ہے اور اتباع جو خاص طور پر اہل ہدایت کا خاصہ ہے وہ یقینی اور بے خطا تتبع ہے ۔ اُس کا اوامر و مناہی (یعنی نیک کام کرنے کے حکم اور خلاف شرع کام کرنے سے ممانعت) کا باہمی فرق ۔ امر معروف کی اطاعت گویا فرشتوں سے نسبت ہے اور خلاف شرع یا ممنوعہ کام کرنا شیطانی نسبت ہے اور ممنوعہ کاموں کے ارتکاب کو بشریت سے نسبت ہے اور ان ہر دو امور امر معروف اور نہی منکر کا اتباع بالکل لازمی اور ضروری ہے اور وہ انسان کی ذات سے مخصوص اور متعلق ہے جس طرح وجودی تتبع ہر موجود ممکن کے لیے لازم ہے ، اسی طرح یقینی تتبع ہر داعی انسان پر فرض ہے ۔ اور جو کوئی بھی اس اتباع میں دوسروں کی نسبت کامل تر ہوگا وہ اتنا ہی اپنی ذات میں مکرم و معظم ہوگا ، اور چونکہ حقیقی حاکمیت جسے ہم معبودیت بھی کہتے ہیں فقط اسی ذات واجب تعالیٰ کے لیے ہے ۔ اس لیے اس کی عبادت میں کسی کو شریک نہیں کرنا چاہیے ۔ لیکن اضافی حاکمیت جسے ہم امامت یا پیشوائی کا نام دیتے ہیں وہ سب غیر حقیقی (مجازی) ہادیوں کا حصہ ہے ۔ ان کے تتبع کو فرمانبرداری یا پیروی کہتے ہیں ، مگر یہ اطاعت عبادت کے معنوں میں نہیں ۔ ہدایت کے ان مظہروں کی پیروی بھی عیناً اطاعت حق ہوتی ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع کامل کیے بغیر نجات کی راہ نہیں کھلتی ، اور نہ ہی دُنیا و آخرت میں سعادت نصیب ہوتی ہے ، اور جناب رسالت مآب سرورِ کائنات کے حضور تک پہنچنے کے لیے کسی ہادیٔ برحق اور مرشد کامل کا وسیلہ ہونا ضروری ہے ۔ چونکہ اسلامی فرقوں میں کوئی فرقہ بھی خالصتاً محمدی طریق سے برتر اور درست نہیں ۔ لہٰذا اس واصل بحق کر دینے والے سلسلے کے مضبوط دستے کو پختہ عقیدے کے ہاتھ سے پکڑ کر اپنی نجات کی دستاویز حاصل کر لینی چاہیے ، اور خودی و خود غرضی اور دوسری بدعتوں کی خرابیوں سے پاک ہو کر اپنے آپ کو محمدی رنگ میں رنگ لینا چاہیے ۔ **تبلیغ** آیات قرآنی

کی شہادتوں سے پیغمبرانہ تبلیغ اور کلام اللہ کے اقتباسات کی روشنی میں خوشخبری دینے اور ڈرانے دھمکانے اور فنافی الرسولؐ ہونے اور کلام الٰہی کے طفیل نوافل اور فرائض کے قرب کے حصول کی کیفیت کا بیان۔ ایمان ولیقین کی پوری قوت اور خدا اور رسولؐ کے فرمودات سے مکمل آگہی وواقفیت، اور ان پر زبردست عقیدہ اور بھروسہ رکھنے اور اپنے عرفان و معرفت پہ عجز و تقصیر کے اعتراف اور تمام معلومات اور انکشافات کو کتاب و سنّت کے مطابق پیش کرنے کا بیان، یعنی جو کچھ کتاب و سنت کے مطابق و موافق ہے وہ قابلِ قبول ہے اور جو کچھ اس کے برعکس ہو اسے رد کر دینا چاہیے۔ اور ہر وہ بات جس کے متعلق قرآن و حدیث سے کوئی واضح حکم نہیں ملتا وہاں قیاسی دلائل، مختلف قرینوں اور شہادتوں، القاء عرفان، و عقل و ذہانت کو استعمال میں لانا چاہیے اور ان امور کی جتنی بھی توفیق میسر ہو سکے اُسے غنیمت سمجھنا چاہیے اور پیغمبر پاک پر درود وسلام کے ساتھ کلام کا خاتمہ۔

دیباچۂ ثانی۔ جو متعدد تصانیف اور بصیرت افروز تحقیقات پہ مشتمل ہے

یہ میرے اپنی طرف سے اپنے ہی نام ایک بیان ہے، اور میری ہستی کا میرے جسم وجان کے نام اک فرمان کہ اے میری روح اور میرے جسم حق تعالیٰ نے تم دونوں کو لطافتوں اور کثافتوں کے ساتھ میرے لیے غیب وحضور کی اک دُنیا بنایا ہے اور ایک خاص نسبت عطا کر کے مجھ سے منسوب کر دیا ہے کہ میں تمھیں اپنی جان اور اپنا جسم کہتا ہوں، اور اس تمام خصوصی تعلّق اور لگاؤ کے باوجود تم دونوں سے بے نیاز اور بے پروا رکھتے ہوئے مجھے عالم غیب وحضور کے مرتبے کا مظہر بنا دیا۔ یہ بات تو ہر کسی کے کلام سے سمجھ میں آتی ہے کہ لفظ من کا راست اطلاق تو تن و جان کے علاوہ کسی اور شے پر ہوتا ہے۔ لہٰذا اے میری روح اور میرے جسم میں تمھاری حقیقت اور خود اپنی حقیقت تمھارے سامنے بیان کرتا ہوں کیونکہ یہ سب اعلیٰ و ارفع علم و فن تو انسان کو خود اپنے پہچاننے کا ذریعہ ہے۔ اور یہ بات ہر دانشمند اور دانا کے لیے انتہائی بُری اور ناگوار ہے کہ وہ اشیا کی حقیقتوں کو جاننے کا دعویٰ تو کرے، مگر خود اپنے نفس کی پہچان سے جاہل ہو اور اپنی ذات کی حقیقت سے ناآشنا ہو۔ اور انسان چونکہ مفرد و مادی مرکبات کا مجموعہ ہے۔ اس کی تعریف و توصیف کے لیے بھی مرکب اجزا کے بیان اور

مفرد اشیا کے وصفوں اور خوبیوں کے اظہار کے ساتھ ساتھ مجموعی ہیئت کے لوازمات کا ذکر بھی درکار ہے۔ لہٰذا انسانی حقیقت کی مکمل شناخت اسی تکون (انہی تین سروں) کی دریافت پہ منحصر ہے۔ ایک تو روح یا نفس سے الگ کر کے فقط انسانی جسم کی بات، دوسرے نفس یا روح کی بات اور جسم سے الگ کر کے فقط اسی کی ماہیت پہ بحث، اور تیسرے اس جسم و رُوح ہر دو کے مجموعے پہ بحث۔

جسمانی و روحانی امور اور اللہ تعالیٰ سے استفادہ کیے ہوئے نور کا بیان

سُن اے میری رُوح تو تمام کلیات اور جزئیات کا ادراک رکھنے والا غیر مادی، غیر محسوس اور غیر مرکب جوہر ہے۔ فلسفی و دانا تجھے نفس ناطقہ کہتے ہیں۔ نفس ایک زندہ روحانی جوہر ہے، جو طبعاً بہت فعال اور آگہی والا ہے۔ تفصیل کے ساتھ اس کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ یہ ایک سماوی، روحانی، ہلکا پھلکا، زندہ، باقی رہنے والا، غیر فاسد، بہت جاننے والا، اور چیزوں کی صورتوں کا بہت ادراک رکھنے والا ہے۔ پیروانِ محمد (ان پہ خدا کا درود و سلام ہو) اپنی اصطلاح میں تجھے امر ربیّ کہتے ہیں جیسا کہ یہ آیت کریمہ بتاتی ہے کہ " اے رسولؐ تجھ سے روح کے متعلق سوال کرتے ہیں سو کہہ دے کہ روح میرے رب کا امر ہے"[۸۹] اور اے میرے تن تو ایک جسم ہے نشوونما پانے والا، محسوس کرنے والا اور اپنے ارادے سے حرکت کرنے والا ہے، اور داناؤں نے تمھیں حیوان قرار دیتے ہوئے بدن کی یوں تعریف کی ہے کہ بدن ایک مرئی چیز ہے جو گوشت، خون، ہڈیوں، رگوں، پٹھوں، چمڑے اور ان سے مشابہت رکھنے والی چیزوں سے بنا ہوا ہے۔ یہ سارے اجسام طویل و عریض، عمیق، خاکی، مرنے والے، تاریک و بوجھل اور محسوس ہونے والے ہوتے ہیں، جو تغیر و تبدل ہونے کے بعد فاسد اور مضمحل ہو جاتے ہیں۔ اور پیروانِ محمدؐ (ان پہ خدا کا درود و سلام) اپنی اصطلاح میں تمھیں اک متناسب و متوازن شکل کہتے ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جب میں اس کو پورا کر چکوں اور اس میں اپنی جان ڈال دوں تو تم ۔ ۔ ۔ ۔ تمھارے اس سارے مجموعے کو انسان کہتے ہیں اور انسانی حقیقت اسی روح اور جسم سے مرکب ہے جو ایک دوسرے سے الگ بھی ہیں اور یک جا بھی کیونکہ 'روح' ناطق ہے اور جسم حیوان۔ نطق سے مراد بات کرنا نہیں۔ یہاں اس سے مراد ہے کلیات و جزئیات تک کا فہم و ادراک ہونے سے۔ پس انسان ایسا مجموعہ ہے جو جسمانی تن بدن اور روحانی نفس کی یک جائی ہے، جس نے انسان کا نام پایا،

اور یہ روح و جسم دو جوہر ہیں، جو اپنی صفات کے لحاظ سے علیحدہ اور ان میل ہیں، یعنی جسم کی صفات الگ ہیں۔ مثلاً کھانا پینا اور اسی طرح کی دیگر صفات اور روحانی صفات اس سے بالکل مختلف ہیں۔ مثلاً علم، فہم و ادراک اور ایسی ہی دیگر صفات۔ جو اپنی حالتوں میں ایک دوسرے سے متضاد ہیں، کیونکہ روح کے احوال تن بدن کے احوال کے بالکل برعکس ہیں جیساکہ جسم فانی ہے اور رُوح باقی، جسم مادی ہے اور روح غیر مادی، اور علیٰ ہذا القیاس، اتفاقی افعال اور فالتو (غیر ضروری) صفات میں دونوں مشترک ہیں۔ یعنی ان افعال و اوصاف میں جو روح اور جسم میں سے کسی ایک سے مخصوص نہیں، بلکہ جو ان دونوں کے اجتماعی تقاضے سے سرزد ہوں۔ روح و جسم دونوں کا ان میں اشتراک ہوتا ہے۔ اسی لیے انسان کو مجموعہ اضداد (ضدّین) کہتے ہیں۔ انسان مشاہدے میں آنے والی اور محسوس ہونے والی ملتی جلتی چیز بھی ہے۔ لطیف اور عقل والی اور پاکیزہ چیز بھی ہے۔ محسوس بھی غیر محسوس بھی۔ باطنی اور ظاہری کیفیت والی (گویا مجموعۂ اضداد) وہ اپنے تن بدن کی راہ سے طبعاً دنیاوی زندگی کا متوالا ہے اور درازیٔ عمر کا متمنی رہتا ہے جیساکہ اس آیت کریمہ سے ثابت ہے کہ آپ تو ان کو حیاتِ دنیوی کا حریص عام آدمیوں سے بھی بڑھ کر پائیں گے۔ لیکن اپنے نفس روحانی کی راہ سے وہ آخرت کے گھر کا طلب گار ہے، اور اس مقولے کے موجب کہ موت دوست کو دوست سے ملا دینے والا ایک پُل ہے، وہ عاقبت کے معاملات میں دلچسپی رکھتا ہے، اور قرآن حکیم کی یہ آیت کریمہ اسی بات کا پتہ دیتی ہے کہ "اگر تم سچے ہو تو موت کی تمنّا کر کے دکھاؤ" اور اسی طرح حضرت انسان کے اکثر امور اختلافی اور متضاد ہیں، جیسے زندگی اور موت، جوانی اور بڑھاپا، نیند اور بیداری، صحت و بیماری، رنج و خوشی، یاد اور فراموشی، علم اور جہالت، درست اور غلط، سچ اور جھوٹ، حق اور باطل، کنجوسی و سخاوت، بزدلی اور بہادری، گناہگاری و پاکیزگی، ظلم و انصاف، فقر و غنا، برائی و بھلائی، دوستی و دشمنی، خوبصورتی و بدصورتی اور اخلاق، افعال اور اقوال میں ایسی ہی دوسری مثالیں جو باہم متضاد اور مخالف ہوں۔ پس انسان گاہے جیتے جی مر بھی جاتا ہے اور گاہے اس کی خاموشی بھی گفتگو ہوتی ہے، اور وہ خاص صفات جو جسم و بدن ہی سے مخصوص ہیں ان کی تفصیل یوں ہے کہ جسم ایک طبعی جوہر ہے۔ ذائقہ، رنگ، خوشبو، وزن، سبکی (ہلکاپن) ٹھہراؤ، حرکت، نرمی، سختی، سستی و استحکام کا مالک ہے، اور چار خلطوں کے ملنے سے بنتا ہے، جو خود چار ارکان (آگ۔ مٹی۔ پانی۔ ہوا) سے پیدا ہونے والی غذا سے بنتی ہیں کہ طبائع انسانی کی چار جنسیں ہیں جو بدلتے، بگڑتے

اور تبدیل ہونے والی ہیں۔ موت کے بعد روح جب بدن کو چھوڑ دیتی ہے اور اس سے اپنا تصرف ختم کر دیتی ہے تو ان ارکان کی طرف رجوع کرتی ہے۔ لیکن نفس سے متعلقہ صفاتی تفصیلات یوں ہیں کہ نفس اک روحانی نورانی اور بالائی جوہر ہے، جو بذات خود زندہ اور اپنی قوت سے متیحر ہے۔ تہذیب و تادیب کے قابل ہے۔ انسانی جسموں میں فعال ہے اور حیوانی اور نباتی جسموں کو اس وقت معین تک مکمل کرنے والی ہے جسے ہم موت کا دن کہتے ہیں۔ اس کے بعد وہ جسم کو چھوڑ کر داغ مفارقت دے جاتی ہے اور اپنے اصل اور مبدا و منبع کی طرف رجوع کر لیتی ہے اور یا سود و بہبود اور نفع و منفعت یا گھاٹے، نقصان، ندامت اور حسرت سے دوچار ہوتی ہے۔ قیامت کے دن وہ پھر اسی قفس عنصری یعنی جسم میں مبعوث ہوگی۔ ہم مومنوں کے نزدیک جسموں کا حشر و نشر آیات قرآنی اور احادیث نبوی سے ثابت شدہ امر ہے، اگرچہ فلسفیوں کی عقل اس نکتے کو نہیں سمجھ سکی۔ اس آیت کریمہ کے مطابق وہ کہتے ہیں کہ ہڈیوں کو جب کہ وہ بوسیدہ ہو گئی ہوں کون زندہ کرے گا۔ آپؐ جواب دیجیے کہ ان کو وہ زندہ کرے گا جس نے اوّل بار ان کو پیدا کیا، اور وہ سب طرح کا پیدا کرنا جانتا ہے۔ قصہ مختصر یہ کہ حقیقتِ نفس کے متعلق دانشوروں اور عالموں کے درمیان بہت سے اختلافات ہیں، لیکن مختصراً ان تین باتوں کو ان تمام اختلافات کا جامع سمجھیے۔ بعض سمجھتے ہیں کہ روح ایک لطیف، غیر مرئی اور ناقابلِ محسوس شے ہے۔ بعض اس امر کے قائل ہیں کہ نفس اک روحانی جوہر ہے بغیر جسم کے شائستہ و موزوں مگر ناقابلِ محسوس ہے اور موت کے بعد بھی زندہ رہتی ہے۔ بعض اس وہم و گمان میں مبتلا ہیں کہ روح قائم بالذات نہیں، بلکہ یہ بدنی مادے اور جسمانی خلطوں سے پیدا ہوتی ہے اور موت کے وقت وہ بے کار ہو جاتی ہے اور اُس میں خلل آ جاتا ہے۔ وہ بذات خود قائم نہیں۔ حالانکہ یہ روح حیوانی کے بیان کی ایک قسم ہے کہ وہ اک لطیف حرارت (بھاپ) ہے جو بدن کے ترتیب دیتے وقت پیدا ہوتی ہے۔ یہ نیچریوں کا باطل عقیدہ ہے، ان سے کہا جائے گا کہ وہ جسم ہیں۔ ان عقل کے اندھوں کو جسم کے سوا اور کچھ سجھائی ہی نہیں دیتا، اور جسم سے تعلق رکھنے والی اس لمبائی، چوڑائی اور گہرائی کے سوا اور کچھ دکھائی ہی نہیں دیتا۔ سوائے رنگوں، ذائقوں، خوشبوؤں اور ان چیزوں کے جو اپنی ذات سے قائم نہ ہوں یا مختلف ضلعوں سے تشکیل پانے والی شکلوں، لکیروں اور زاویوں کے علاوہ کسی اور کو سمجھ ہی نہیں پاتے۔ اور ان کے نزدیک روحانی امور، نورانی جواہر جیسی کوئی چیز موجود نہیں۔ وہ مختلف جسموں میں جاری و ساری عقلی صورتوں اور نفسانی قوتوں کے قائل نہیں جو ان اجسام پر اثر انداز

اور متصرف ہوتی ہیں۔ معاملہ اس طرح نہیں جس طرح اُنھوں نے گمان کیا نفس کی حقیقت کے بارے میں ۔ اُنھوں نے یہ گمان کیا وہ جسم سے پیدا شدہ ہے کیونکہ وہ چیز جو پیدا ہوتی ہے کسی چیز سے وہ اُسی چیز کے جوہر میں سے ہوتی ہے۔ جسد جسم ہے، اس میں کوئی شک نہیں، لیکن نفس جسم نہیں۔ نہ وہ عرض ہے، بلکہ وہ جوہر مستقل ہے جو باقی رہنے والا ہے اور فنا کو قبول نہیں کرتا۔ چنانچہ یہ بات معقول و منقول دلائل سے ثابت ہو چکی ہے۔ فلسفیوں اور عالموں کے مابین انسان کے معنوں کی حقیقت کے بارے میں بڑی لے دے ہے۔ اسے بھی ہم ان تین مقولوں میں درج کیے دیتے ہیں۔ بعض کا خیال ہے کہ انسان بس اسی مرئی شکل کا نام ہے جو اس کی شخصیت کا خاص ثبوت ہے اور وہ مرکب ہے گوشت، پوست، خون، ہڈیوں، رگوں اور اسی قسم کی دیگر چیزوں اور بعض ایسے اعراض سے جو اس میں حلول کر گئے ہیں۔ مثلاً زندگی، اور حس و حرکت کی قدرت وغیرہ۔ بعض اس امر کے قائل ہیں کہ انسان درحقیقت وہی نفس ناطقہ ہے اور اُس کا بدن بمنزلہ لباس و پوشاک کے ہے، اور اُس غلاف کی مانند ہے جو اُس کے اُوپر چڑھایا گیا ہے اور بعض کہتے ہیں کہ انسان جسمانی بدن اور روحانی نفس کا ایک مجموعہ ہے، جیسا کہ ہم نے تم نے ابھی جان لیا ہے۔ بہر حال اے میرے جسم و جان میں نے تمھارے سامنے روح و جسم کی پوری حقیقت پیش کر دی ہے۔ اب میں اپنی حقیقت کو جو تم دونوں سے الگ ہے اور جس کا داناؤں، عالموں اور فلسفیوں نے پتہ نہیں دیا، خدائے علیم و خبیر کی مدد سے تم پر آشکارا کرتا ہوں۔ لو سُنو، کہ میں حضرت وجود ہوں جو اپنے آپ کو "میں" اور خود سے تعبیر کرتا ہوں، اور نیستی سے ہستی میں آکر تم دونوں پہ تجلّی ریز ہوا ہوں۔ تمھیں اپنے ضمن میں لے کر "ہست نما" بنا دیا۔ خودی و انانیت کی یہ نسبت جسے مجازی طور پر تم اپنے سے منسوب کرتے ہو فی الحقیقت اس کا مضاف میں ہی ہوں کیونکہ جب تک میں تم پر تجلّی ریز نہ ہوا تھا تم موجود نہیں تھے۔ تم کبھی من وما کا دعویٰ نہ کرتے تھے۔ لہٰذا تمھارے یہ تمام دعوے میری بدولت ہی پیدا ہوئے ہیں، اور میں ہی ان کا مرجع ہوں۔ اے میرے جسم و جان میں ہی تمھارا اور حق تعالیٰ کا درمیانی وسیلہ و واسطہ ہوں جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے خود فرمایا ہے کہ مجھے کسی وسیلے سے تلاش کرو۔ جتنی تمھیں مجھ تک رسائی ہے، مجھے اس سے بڑھ کر خدا تعالیٰ تک رسائی ہے۔ اور میں تم پر جتنا رحم کرتا ہوں، اللہ تعالیٰ اُس سے بڑھ کر مجھ پر رحم کرتا ہے۔ لہٰذا جہاں تک تم سے ہو سکے میرا وسیلہ پکڑنے کی کوشش کرو اور مجھے اپنی دانست کے مطابق پہچانو، کیونکہ معرفت حق تعالیٰ کے قفل کی یہی کُنجی ہے۔ کہتے ہیں کہ جس نے اپنے آپ کو پہچان لیا اُس نے اپنے رب کو پہچان لیا۔

مراتب کا اثبات، قرب و نزدیکی کی شہادتیں
اور کشف حقیقت کی چار دلیلوں کا اظہار

یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ حق سبحانہٗ تعالیٰ تمام موجودات خواہ وہ آسمانی ہوں یا زمینی، ہر موجود کے ہر وقت شامل حال اور حاضر و ناظر ہے اور ذرّے ذرّے کے کلی اور جزئی حالات سے باخبر ہے۔ اس آیت کریمہ کے بموجب کہ ”اُس کے علم سے کوئی ذرہ برابر چیز بھی غائب نہیں، نہ آسمانوں میں نہ زمین میں“[۱] اور ہر موجود کو اُس کا فیض ہر لحظہ متواتر پہنچتا ہے۔ جانداروں، روحوں، آسمانوں، ستاروں، چاروں عنصروں اور تینوں قسم کی مخلوق، یعنی جمادات، نباتات اور حیوانات میں ہر کوئی اپنی اپنی اہلیت اور قابلیت کے مطابق اس کے فیض سے استفادہ کرتا ہے، اور وہ پاک ذات ساری مخلوقات کے ظاہر اور باطن سے آگاہ ہے، اور اپنے بندوں کو طرح طرح کے معاملات در پیش لاتا ہے۔ پس حق سبحانہٗ تعالیٰ تمھیں اس طرح دیکھتا ہے، جیسے تم خود کو دیکھتے ہو۔ ”وہ تمھاری بات کو سنتا ہے جیسے کہ تم خود اپنی باتوں کو سنتے ہو“[۲]۔ وہ تمھارے خیالات اور تمھاری نیتوں سے بھی اسی طرح آگاہ ہے جیسے تم خود ان سے آگاہ ہو۔ جیسا کہ اس آیت کریمہ سے ثابت ہے کہ ”وہ تمھارے ساتھ رہتا ہے خواہ تم لوگ کہیں بھی ہو“[۳]۔ الغرض اسے اپنے بندوں سے اور بندوں کو اُس سے اک عجیب قسم کا قرب اور نسبت ہے جس کا انسان سے کما حقہٗ بیان نہیں ہو سکتا۔ سوائے اس آیت کریمہ کے بموجب کہ ”اللہ نے انسان کو پیدا کیا پھر اس کو گویائی سکھائی“[۴]۔ جتنا کہ انسان کو اُس نے مقدور بخشا فقط اتنا ہی بیان کر سکتا ہے۔ عارفوں کا کہنا ہے کہ عوام کی اکثریت سمجھے یا نہ سمجھے ہمارا کام تو پیغام کا پہنچانا ہوتا ہے۔ یہ حقیقت نفس پر منکشف ہوتی ہے اور چار چیزوں سے دل پر ثبت ہو جاتی ہے۔ یا تو منقول طریق سے، یعنی آیاتِ قرآنی اور احادیثِ نبوی پر ایمان لانے اور بزرگوں اور پیشواؤں کے اقوال پر اسی طرح یقین کرتے سے جیسے کہ صالح اور صاف و پاک عقیدے والے لوگ کرتے ہیں، یا پھر معقول طریق سے، یعنی قیاسی مسائل و موضوعات و دلائل کی بناء پر جو دانشوروں اور فلسفیوں کا حصہ ہے، یا پھر قدرتی مہارت یعنی ذکر اذکار اور اوراد و وظائف میں مسلسل مشغولیت سے اور اُس پاک ذات و بے کیف ذات کی طرف دائمی توجہ ایسے انداز میں کرتے سے جس کی کیفیت نامعلوم ہو۔ جیسی کہ سالکانِ طریقت اور اللہ کی راہ پر چلنے والوں کو نصیب ہوتی ہے، یا پھر کشف و القا کے

ذریعے ، یعنی بلا ارادہ یا بغیر مقصد کے محض اللہ تعالیٰ کی طرف سے برگزیدگی کی بنا پر حقیقت کا انکشاف ہو جانا جیسا کہ انبیاءؑ و اولیائے کرام کے ساتھ اکثر معاملات میں ہوتا رہا ہے - پس ہم پر جو کچھ بطور منقول ثابت ہوا ہے - وہ وہی کچھ ہے جو حق تعالیٰ نے قرآن حکیم میں مختلف مقامات پر فرمایا ہے - دیکھیے یہ آیات: "پس تم لوگ جس طرف کو منہ کرو اُدھر ہی اللہ تعالیٰ کا رُخ ہے"[۵۴] - یا تم جہاں کہیں بھی ہو وہ تمھارے ساتھ رہتا ہے" یا پھر یہ کہ "کوئی سرگوشی تین آدمیوں کی ایسی نہیں ہوتی جس میں چوتھا وہ (یعنی اللہ) نہ ہو اور نہ ہی پانچ کی سرگوشی ہوتی ہے جس میں چھٹا وہ نہ ہو اور نہ اس عدد سے کم ہوتی ہے اور نہ اس سے زیادہ مگر وہ ہر حالت میں ان لوگوں کے ساتھ ہوتا ہے"[۵۵] - اس قسم کی اور بھی بہت سی آیات اور احادیث ہیں جو بندوں سے حق تعالیٰ کی مستقل نزدیکی ، ہر موجود کے حال کی خبر ، اور بندوں کے اعمال کو دیکھنے ، ان کی باتوں کو سننے اور اُن کی نیتوں کو سمجھنے پر دلالت کرتی ہیں - تمام قرآنِ حکیم اور احادیث کی ساری کتابیں اسی قسم کی باتوں سے بھری پڑی ہیں ، نیز اپنے زمانے کے بزرگوں کی زبانی بھی جن کی سچائی پر ہمیں حق الیقین تک کا اعتقاد ہے اور جو یقیناً تحقیقی طور پر انتہائی دانشمند ، راست باز اور انصاف پسند تھے ، اور جنھوں نے تمام تر احوال ، اعمال ، افعال و اقوال میں حق و صداقت اور عدل و اعتدال کی راہ سے تجاوز نہ کیا ، لہٰذا ان سے کسی غلطی کے ارتکاب کا احتمال ہی نہیں - یہ ایسا ہی کچھ سُنا کہ فلاں وقت خداوند تعالیٰ نے یوں تجلی فرمائی اور فلاں معاملے میں یوں الہام کیا - فلاں عبادت میں ایسا قرب حاصل ہوا - اور فلاں بات میں بالکل خلاف معمول تائیدِ غیبی یوں ظہور پذیر ہوئی - ایسے معاملات کی بے شمار مثالیں ہیں جن کے تجربات میں ساری عمر گزر گئی اور ان کے آثار و نتائج کھلے بندوں واضح طور پر نمودار ہوئے جن میں شک و شبہ کی قطعاً گنجائش نہ رہی - جو کچھ عقل کے ذریعے پایا ہے وہ یوں ہے کہ دانشوروں اور دانشمندوں کے نزدیک یہ امر پایۂ ثبوت کو پہنچ چکا ہے کہ تمام مادی موجودات میں غیر مادی موجودات کے تصرفات اور تاثیرات جاری و ساری ہیں - چنانچہ نفوس (ارواح) اور عقول عشرہ کو متصرف اور اثر انداز سمجھتے ہیں - لہٰذا اللہ تعالیٰ جو ان کے نزدیک ان ارواحِ جلیلہ اور عقول عشرہ سے لطیف تر اور افضل و برتر ہے - اس مذکورہ بالا طریق سے وہ ہر موجود سے اس کی اپنی نسبت بھی زیادہ قریب اور نزدیک ہے - اس کا ناقابلِ بیان کیفیت والا قرب ساری مخلوق کو حاصل ہے - ان مثالوں کی بہت سی دلیلیں بھی موجود ہیں جو صحیح الدماغ دانشمندوں سے پوشیدہ نہیں - پھر ذاتی ملکہ کی بدولت جو کچھ ہماری سمجھ میں آیا وہ یوں ہے کہ مسلسل

اوراد و وظائف، اور ذکر اذکار الٰہی میں دائمی طور پر مشغول رہنے اور مراقبات کرنے سے باطن میں حضوری حق کی عالت اور رفاقتِ خداوندی کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے کہ پھر فہم و ادراک کی قوت، کو نقلی و عقلی دلائل و براہین کی طرف رجوع کیے بغیر بلا شک و شبہ ہستی حق کا ادراک اس طرح ہوتا ہے کہ نفس انسانی اس سے انکار کر ہی نہیں سکتا۔ اور پھر انسانوں، جنوں یا شیطانوں میں سے کسی کے پیدا کردہ شکوک و شبہات اور وسوسے اطمینانِ قلب میں خلل نہیں ڈال سکتے، اور میں شہادت دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا اور کوئی معبود نہیں، اور اس کے سوا کسی اور کو طاقت یا قوت نہیں۔ سبھی کے اختیارات کی باگ ڈور اُسی کے ہاتھ میں ہے۔ وہ جسے چاہتا ہے مومن بنا دیتا ہے، اور جسے چاہتا ہے کفر میں پھینک دیتا ہے، اور جسے اللہ ہدایت دے اُسے کوئی گمراہ نہیں کر سکتا، اور جسے وہ گمراہ کر دے اُسے کوئی ہدایت نہیں دے سکتا۔ البتہ کشف و کرامت سے جو کچھ میرے اپنے اوپر روشن ہوا ہے بحمد اللہ وہ نعمت ربانی ہی کے زمرے میں آتا ہے۔ بسا اوقات ایسے معاملات در پیش آتے ہیں اور ایسے ایسے انکشافات ہوتے ہیں کہ میرے جدِّ امجد حضرت خواجہ بہاؤ الدین نقشبندؒ کے فرمان کے مطابق بعض مجمل و مختصر امور بھی مفصل بن کر سامنے آ گئے اور کشف و الہام ہوا کہ ان کی آل اولاد سے اپنی موروثی نسبت ظاہر ہو گئی اور حق اپنے مرکز پہ جا پہنچا، بلکہ اصلی و حقیقی نسبت جو نسبت محمدیہ (ان پہ خدا کا درود و سلام) ہے، تمام ساداتِ بنی فاطمہ کو نصیب ہوئی اور خاندانِ نبوت کے شرف و بزرگی سے مشرف ہوئے۔ اے اللہ محمدؐ اور آل محمدؐ پہ رحمت نازل فرما جیسے کہ رحمت نازل کی تو نے ابراہیمؑ اور اُن کی آل پہ بے شک سب تعریف تیرے ہی لیے اور تو ہی عظمت والا ہے، اور اے اللہ! برکتیں نازل فرما محمدؐ اور آل محمدؐ پہ، جیسے کہ برکتیں نازل کیں تو نے ابراہیمؑ اور اُن کی آل پر۔ بے شک تو ہی ہر تعریف کے لائق ہے اور تو ہی عظمت والا ہے۔ ایک بار پھر خدا کا سو شکر کہ سبھی مقامات اور سبھی منزلیں طے ہو گئیں اور دائرے کا آخری نقطہ اس دائرے کے پہلے نقطے سے جا ملا۔ اور اُسی کے لیے سب تعریف ہے۔ اوّل میں بھی اور آخر میں بھی۔

ربوبیت اور خلافت کا انجام اور خیریت و سلامتی کا انتظام

اے اللہ تعالیٰ! تو نے مجھے دیا ہے جسمانی اور روحانی ملکہ جس قدر کہ تو نے چاہا ہے اور تو نے بنایا مجھے چھوٹا سا عالم جو جامع ہے ہر اس چیز کا جو مُلک اور ملکوت میں شامل ہے، اور تو نے مجھے سکھائی ہے

احادیثِ نبوی اور آیاتِ قرآنی کی تفسیر جسے کوئی نہیں جانتا تھا سوائے تیری ذات کے۔ تو ہی تنہا پیدا کرنے والا آسمانوں اور زمینوں کا ازل کو۔ تُو نے ابتدا کی مخلوق کی اور تُو اسے اپنی طرف لوٹائے گا۔ تو ہی میرا والی ہے دُنیا میں اور آخرت میں۔ اے میرے رب! میں تجھ سے بخشش چاہتا ہوں۔ مجھے بحیثیت مسلمان کے موت دینا اور انجام بخیر کرنا، اور مجھے صالحین سے ملا دینا جنھیں تو نے چن لیا دُنیا میں اور آخرت میں۔ تجھی پر میں نے توکّل کیا ہے اور تو ہی میرے لیے دونوں جہانوں میں کافی ہے۔ تو بہترین مولیٰ اور تو ہی بہترین کارساز ہے۔

اے میری روح اور جسم! یہ سمجھ لے کہ جس دن اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو پیدا کیا اور اپنی خلافت و نیابت کی پوشاک پہناتے ہوئے فرمایا: "تحقیق میں زمین پر اپنا نائب پیدا کرنا چاہتا ہوں! گویا اُسے اپنے تمام کمالات کا مظہر بنا دیا اور جو کچھ ساری خدائی میں ہے، اُس کا نمونہ اُس کے ظاہر و باطن میں تخلیق کر دیا۔ اسی لیے انسان کو ایک چھوٹی سی کائنات بھی کہتے ہیں۔ اور جب تمھیں میری تفویض میں دیا گیا اور تمھارے لیے مجھے اپنی ربوبیت کا مظہر بنایا، میں کبھی بھی تمھارے احوال سے غافل نہیں رہا۔ میں نے تمھیں معقول و کلّی اور نظریاتی علوم سے مستفیض کرنے کے لیے اپنے مالکِ حقیقی کی طرف سے جس کے ہاتھ میں ہر شے کی ملکیت ہے ارواحِ جلیلہ اور خاص ملائکہ کو جو غیر مادی ہیں مقرر کر رکھا ہے جو ہر لحظہ میری طرف سے تم پر القا کرتے ہیں، اور آخرت کی فلاح و بہبود سے تمھیں آگاہ کرتے ہیں اور شیطانوں سے محفوظ رکھتے ہیں۔ ہدایت کی راہ دکھلاتے اور بلندیوں کی طرف کھینچتے ہیں اور عام اور معمولی فرشتوں کو جو مادی ہیں اور میرے خدا نے اُنھیں میرا محکوم بنا دیا ہے اور وہ میری خدمت پہ مامور ہیں۔ میں نے اُنھیں تمھاری خدمت پہ مقرر کر رکھا ہے کہ وہ تمھیں محسوسات کا علم سکھائیں اور جزئیات تک سے باخبر رکھیں اور تمھاری دُنیاوی اصلاح کریں۔ تمھیں دشمنوں سے بچائیں اور وقتِ معینہ تک تمھیں موذیوں سے بچائے رکھیں اور تمھیں روزی پہنچاتے رہیں اور بدن کا نظام قائم رکھیں تم ان لاتعداد اور ان گنت نعمتوں کو شمار نہیں کر سکتے، لہٰذا میری عطا کردہ ان نعمتوں کو فراموش نہ کرو اور جہاں تک تم سے ہو سکتا ہے میرے رب کی طرف مائل ہو جاؤ، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع کامل کرو، اور مرشدِ کامل (خدا اُس کے رازوں سے ہماری مدد فرمائے) کی پیروی کرو، اور حقیقت بینی سے چشم پوشی نہ کرو، اور یہ بھی سمجھ لو کہ میں تمھیں تمھاری طاقت اور سہار سے زیادہ تکلیف نہیں دوں گا، کیونکہ تمھارے ساتھ احکام میں آسانی کرنا منظور ہے، اور تمھارے ساتھ احکام میں دشواری منظور نہیں۔ پھر بھلا مجھ سے بڑھ کر تم پہ مہربان کون ہو گا۔ چونکہ تمھاری بہتری سختیوں اور مکروہات پہ صبر و تحمل اور خواہشات

نفسانی سے بچے رہنے اور اللہ تعالیٰ کی عبادت کو رضا و رغبت سے بجا لانے میں ہے۔ میں جانتا ہوں کہ اُس دانائے مطلق نے انہی صورتوں میں تمہارا فائدہ چھپا رکھا ہے، لہٰذا اللہ ہی کے حکم سے میں تمہیں ان اُمور کی نشان دہی کرتا ہوں، ہو سکتا ہے کہ کچھ باتوں سے تمہیں کراہت آئے مگر تمہارے حق میں اچھی ہوں[۵۷]، اور بعض جو تمہیں پسند ہوں وہ تمہارے حق میں اچھی نہ ہوں، لہٰذا تم سمجھ لو کہ میرے مطلق افعال جو خیر و شر (نیکی و بدی) میں تقسیم ہیں اور محبت و نفرت کی نسبت اُن سے منسوب کی گئی ہے وہ تمہاری وجہ سے ہے، کیونکہ مجھے تو اللہ تعالیٰ نے اپنی بے سبب عنایات بے غایات سے اپنی حقانیت کا مظہر بنایا اور اپنی اُس خاص تجلی سے نوازا۔ اسی کی سنّت پر عمل پیرا ہوتے ہوئے مجھ سے بھی یہ سب افعال بالکل بے غرضانہ طور پر سرزد ہوتے ہیں، کیونکہ ظاہر اور مظہر کی حرکات بالکل ایسے ہوتی ہیں جیسے کوئی شخص اور اُس کا عکس، بلکہ یوں سمجھو کہ یہ ایک ہی حرکت ہے جو دو مرتبہ دکھائی دیتی ہے اور علما نے فعلِ حق میں غرض کو روا نہیں رکھا تاکہ کہیں واجب الوجود کی ممکن الوجود سے حاجت لازم نہ آئے، لہٰذا وہ اس ذات کو اپنے فعل و عمل میں بے غرض قرار دیتے ہیں لیکن کہتے ہیں کہ اس میں بھی کئی حکمتیں ہیں کیونکہ اس حکیم مطلق کا کوئی کام حکمت سے خالی نہیں ہوتا مگر غرض اور شے ہے اور حکمت الگ چیز ہے۔ اس کے فرق کو فقط وہی سمجھ سکتا ہے جس کی چشمِ بصیرت سے اللہ جل شانہٗ پردہ اُٹھا دے۔ جب تک ان افعال کا نفع و نقصان تمہیں پہنچتا ہے، خدا کے فضل و کرم سے میں ان نسبتوں سے بری الذمہ ہوں۔ میری عظمت کے دامن تک ثواب و عذاب کا ہاتھ نہیں پہنچتا اور نہ ہی ان محبتوں اور نفرتوں کا شکنجہ مجھے جکڑ سکتا ہے۔ پس اس مالکیت کے تقاضے کی بنا پر جو خدا نے مجھے عطا کی ہے اور ہادیٔ مطلق کی ہدایت کا جو دروازہ مجھ پہ کھلا ہے میں تمہیں وہ رستہ دکھاتا ہوں جو تمہارے لیے دُنیا و آخرت میں مفید ہے۔ ہو سکتا ہے تم اس کے مطابق عمل پیرا ہو جاؤ۔ میرا کام تو اللہ تعالیٰ کا پیغام پہنچانا اور تمہیں پند و نصیحت کرنا ہے۔[۵۸] میں اللہ کی طرف سے جو کچھ جانتا ہوں تم نہیں جانتے۔ اگرچہ دونوں جہانوں سے بے نیاز مالکِ حقیقی کا یہ نائب اسی کا مظہر ہے اور تمہاری نیکی و بدی سے مبرّا ہے لیکن چونکہ تمہارے سارے امور کا مرجع بھی میں ہوں، سو تم سے بے پروا ہونے کے باوجود اس خیر و شر کو مجھ سے منسوب کیا جاتا ہے، لہٰذا جہاں تک تم سے ہو سکے میرے کہے کے مطابق عمل کرو اور نیکی کا بیج بوؤ تاکہ وہ میری رضامندی اور تمہاری دونوں جہانوں میں فلاح و بہبود کا موجب بن سکے، اور تم پر خدا کی سلامتی ہو اور جو کارِ خیر تم کرتے رہے ہو ان کی بنا پر تم اللہ کی جنّت میں داخل ہو جاؤ۔ یہ بھی سمجھ رکھو کہ جو عمل و

فعل تم سے سرزد ہوتا ہے ہر چند کہ اُس میں میری رضا اور اشارہ بھی شامل ہوتا ہے، کیونکہ نہ تمہیں کوئی اختیار ہے اور نہ قوت مگر میرے ساتھ ۔ اگر میں تمہیں گمراہ کردوں تو ہدایت دینے والا کوئی نہیں، اور اگر ہدایت دے دوں تو تمہیں گمراہ کرنے والا کوئی نہیں، لیکن تمہاری عافیت اور بہبود کو مدّ نظر رکھتے ہوئے میری یہ مرضی ہے کہ میرے جلال و دبدبے سے میرے جمال کی پناہ میں آجاؤ، اور میری گمراہی کے بجائے میری ہدایت کے گرد گھومو ۔ اگرچہ تمہاری خطا اور سرکشی میری مشیّت و تقدیر ہے، لیکن میں اس سے راضی نہیں ہوں کیونکہ میں چاہتا ہوں کہ میں تم پہ روشن کروں جمال کو اور ہدایت کو، اور میری رحمت میرے غضب پہ سبقت لے گئی ہے ۔

اسرار و رموز اور وحدانیت کا بیان اور قرب و نزدیکی کا اظہار

یہ سمجھ لینا چاہیے کہ تمہارے لطیف و کثیف کی نسبت میرے لیے یکساں ہے، یعنی جو نسبت مجھے روح سے ہے وہی نسبت بدن سے ہے ۔ مجھے کبھی اپنے سے دُور اور الگ نہ سمجھو ۔ اس آیتِ کریمہ کے بموجب کہ میں تمہاری رگِ گردن سے بھی زیادہ قریب ہوں ۔ رگِ گردن کو چھوڑو، وہ تو ایک جگہ ہے ۔ میں تو تمہاری رگ رگ، نخ نخ اور ریشے ریشے سے واقف ہوں اور تمہارے ظاہر و باطن سے بالکل باخبر ہوں، بلکہ تمہارے موجود ہونے سے ہی میرا وجود ظاہر ہوا ۔ مجھے اپنے مخفی اسرار و رموز کی دُنیا سمجھو اور ہمیشہ اپنے تشخصات اور تصورات کے آئینے میں میری وحدانیت کا مشاہدہ کرو کہ تمہاری اس اعتباری کثرت نے میری وحدت میں کوئی خلل نہیں ڈالا ۔ میں تم سب سے ایک جیسا ہوں ۔ اگرچہ تم جسم و جان کی شکل میں دُور ہو گئے، لیکن میری وحدت میں فرق نہیں آیا ۔ اور اے ظاہر کو دیکھنے والی آنکھو! اور اے اِدھر اُدھر کی سننے والے چغل خور کانو! اگرچہ تم میرے دیکھنے اور میرے سننے کی استعداد نہیں رکھتے، پھر بھی میرے دیدار پہ جو صورت اور جہات سے مبرّا ہے اور میری گفتار کے سننے پہ جو حرف و صوت کی قید سے آزاد ہے، یقین کرو اور ایمان لاؤ ۔ اس لیے کہ تمہاری بصارت میں میری ہی وجہ سے تیزیٔ نگاہ ہے اور تمہاری سننے کی قوت بھی میرے ہی مخفی اور پوشیدہ احکام کی وجہ سے سنتی اور باخبر رہتی ہے ۔ بلکہ بصارت اور سماعت کی یہ سندیں بھی میری ہی عطا کی ہوئی ہیں ۔ تم میری مدد سے دیکھتے ہو

اور سنتے ہو۔ دیگر افعال مطلقہ کی تکمیل یا سرانجام دینا تمھارے ان مادی قوا اور بدنی قوا پہ منحصر نہیں ۔ میں جب چاہوں ایک عضو کا کام دوسرے عضو سے لے سکتا ہوں۔ کیونکہ میں سننے والا، دیکھنے والا، جاننے والا اور خبر رکھنے والا بھی ہوں۔ میں امر معروف (نیک کام) اور نہی منکر (ممنوعہ غیر شرعی کام) کی بات کانوں کی طرح تمھارے بدنی اعضا کو سناتا ہوں اور زبان کی طرح عرضداشت پیش کرنے یا سوال و جواب کی طاقت سارے بدن کو عطا کر دیتا ہوں۔ چنانچہ ہاتھ پاؤں اور جسم کا ایک ایک عضو میرے حکم کو کانوں کی وساطت کے بغیر بھی سُنتا ہے اور اُس کے مطابق عمل کرتا ہے، اور اپنی صحت مندی و بیماری اور اپنے رنج و راحت کے حالات کو زبان کے وسیلے کے بغیر میرے حضور میں بیان کرتا ہے۔ میں سبھی کی فریاد سنتا ہوں۔ سب کی دعائیں قبول کرتا ہوں اور سبھی کی حاجتوں کو پورا کرتا ہوں۔ میں اپنے تمام پوشیدہ اور کُھلے احکام اپنی اس بدنی مملکت میں نافذ کرتا ہوں۔ اور کبھی کبھی نہی کے، اور اپنے ارادے کے بموجب اپنے احکام کی ظاہری طور پر خلاف ورزی اور نافرمانی بھی کرواتا ہوں۔ اور اسے میرے غلاظت پر بنیادوں والے جسم اور اسے ہوش و حواس والی جان میں ہر جگہ اور ہر حالت میں تمھارے ساتھ ہوں۔ اس عالم شہود میں تمھاری ہستی کی شہادت دیتا ہوں اور تمھارے عالمِ مثال اور خواب و خیال سے بھی واقف ہوں ۔

عارفوں کی انا اور جاہلوں کی خُودی و تکبّر کا فرق

لفظ 'انا' یا "من" جو اس وقت میری نوک قلم یا نوک زبان پہ آرہے ہیں، اس مقام سے نکل رہے ہیں جو مقام کہ بقا باللہ کا ہے، یا باہمی وصل کے بعد فراق یا مستی کے بعد ہشیاری کا وقت ہوتا ہے اور نبوت کے کمالات کے لوازمات میں سے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت خواجہ خواجگان سرتاج سلسلۂ نقشبند (خدا ان کے رازوں کو پاکیزہ کرے) فرماتے ہیں کہ اب میرے دل کا یہ حال ہے کہ اگر میں اس کی نافرمانی کروں تو گویا میں نے خدا کی نافرمانی کی اور حضرت غوث صمدانیؒ فرماتے ہیں کہ میں نبی اکرم صلعم کے قدموں میں کمال کا چودھویں کا چاند ہوں۔ اسی مقام پہ پہنچ کر حضرت خواجہ عبید اللہ احرارؒ نے حریت و آزادی کا دعوی کیا تھا۔ غرضیکہ انبیائے کرام کی خودشناسی و انانیت کے دعوے جن کا قرآن حکیم میں جابجا ذکر ہے، نیز اولیائے کرام کے انانیت کے دعوے جو اُنھوں نے بقا باللہ کے آخری مقام سے بلند کیے ہیں اُنھیں عوام کی خودی و تکبّر کے نعروں سے کوئی نسبت نہیں کیونکہ وہ بیچارے تو اپنے وہم و گمان کے پھندے میں پھنسے ہوئے

ہیں اور اس فرق کو کوئی آدمی اس وقت تک نہیں سمجھ سکتا جب تک وہ بقا باللہ کے بلند مقام پہ فائز نہ ہو جائے۔ چنانچہ مولانا رومؒ نے اس کے معانی کی اس شعر میں کھل کر وضاحت کر دی ہے کہ فرعون کے لب پہ انا الحق کا نعرہ سراپا مکر و فریب اور جھوٹ تھا اور منصور حلاّج کے لبوں پہ یہی نعرہ انا الحق سراپا نور تھا بلکہ نُوراً علیٰ نور تھا۔

درپیش امور کے اثبات کی سند اور اپنی حقیقت پہ اعتماد

اے میرے جسم و جان، میرے اور میرے خدا کے درمیان جو معاملہ ہے اُس سے تم خوب واقف ہو۔ اور میرے ظاہری اور باطنی احوال سے مطلع ہو کر تم میرے گرویدہ ہو گئے۔ میری ابتدا یہی ہے کہ میں پہلے مسلمان و محمدی ہوں، لہٰذا تم خوب جانتے ہو کہ ان مطالب کا کشف کیسے ہوتا ہے۔ اور یہ الفاظ و کلمات کس طرح زبان پہ آتے ہیں۔ نظر نے جو کچھ دیکھا دل نے اس میں جھوٹ نہ ملایا اور "میرے اور تمھارے درمیان اللہ تعالیٰ اور وہ شخص جس کے پاس کتاب آسمانی کا علم ہے کافی گواہ ہیں"[۵] یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ جب حق سبحانہٗ تعالیٰ انبیائے کرام کو (ان پر خدا کا درود و سلام ہو) نبوت کی سعادت اور مخلوق کو دعوت حق دینے کے شرف سے مشرف فرماتا ہے یا اس قول کے بموجب کہ شیخ و مرشد کی قوم قبیلے میں وہی پوزیشن ہوتی ہے جو اک نبی کی اُمت میں جب اللہ تعالیٰ رشد و ہدایت دینے والے اولیائے کرام کو اہلِ دُنیا کی ہدایت کے لیے مقرر کرتا ہے۔ سب سے پہلے ان کی ارواح کو اپنی حقانیت کا ثبوت ملتا ہے جس سے وہ پہلے تو اپنے آپ پہ ایمان لاتے ہیں۔ اسی لیے انبیائے کرام نے فرمایا ہے کہ "ہم پہلے اپنے پہ ایمان لانے والوں میں سے ہیں"[۶]۔ اور اگر کسی شخص کے اپنے دل سے شک و شبہ دور نہ ہو تو پھر وہ دوسروں کے دلوں پہ کیسے اثر انداز ہو گا۔ دیکھیے یہ آیت کریمہ کہ اعتقاد رکھتے ہیں (رسول اکرم صلعم) اُس چیز کا جو ان کے پاس اُن کے رب کی طرف سے نازل کی گئی ہے۔ پس درجۂ حق الیقین کا ایمان پہلے تو حق تعالیٰ کو اپنی ذات پر ہے۔ اللہ نے خود گواہی دے دی ہے کہ اُس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ میں سے ایک اسم "مومن" ہے، اور عین الیقین کا ایمانی مرتبہ انبیائے کرام کا حصہ ہے، جنھوں نے حق تعالیٰ کی بڑی بڑی نشانیوں کو دیکھا ہے، اور تجلّیات ذات کا مشاہدہ کیا ہے۔ اور علم الیقین کا ایمانی مرتبہ اولیاءُ اللہ اور عارفانِ حق کا حصہ ہے۔ جو کچھ نبیوں نے دیکھا ہے انھوں نے اسے سمجھ لیا ہے اور

ان کا مرتبہ دیدار انبیا تک جا پہنچتا ہے۔ اور سُن سنا کر ایمان لانا عامۃ المسلمین کا حصّہ ہے۔ نہ انھوں نے کچھ دیکھا ہوتا ہے نہ سمجھا ہوتا ہے۔ وہ تو فقط ان باتوں کو دیکھنے اور سمجھنے والے حضرات سے سُن کر مائل بہ ایمان ہوگئے اور کافر اس نعمت سے بھی محروم ہیں۔ اس آیت کریمہ کے بموجب" بند لگا دیا ہے اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں پر اور ان کے کانوں پر اور ان کی آنکھوں پر پردہ ہے، اور ان کے لیے بڑی سزا ہے۔" پس سب تعریف اسی اللہ کے لیے ہے جس نے دور کر دیا ہمارا پردہ، اور آج ہماری نظر تیز ہے۔ سب تعریف اللہ کے واسطے ہے جس نے اپنے بندے کی مدد کی اور اب اُسے نون (ن) کے پیٹ کا نقطہ بنا دیا جیسا کہ وہ پہلے (ب) کے نیچے کا نقطہ تھا تاکہ وہ ظاہر کر دے چھپے ہوئے راز۔ تعریف اُس خدا کی جس نے کھول دیا اس پر علم کے شہر کا دروازہ اور سکھایا اپنی جناب سے علم اور اکثر لوگ نہیں جانتے۔ الف اضافت الاہیہ کا (ب) برکت محمدیہ کی اور (ن) نصرت ناصریہ کی (یاد رہے ناصرؒ نام ہے مصنف کے والد بزرگوار کا جو نامور بزرگ تھے اور بیٹے کو باپ سے بے پناہ عقیدت ہے) جب یہ چیزیں اکٹھی کر دی گئیں خاص اعتدال کے ساتھ اور ایک خاص اختصاص باہم سوار کر دیا۔ اصول عالیہ کے اجتماع سے حاصل ہوئی اس بیٹے کی شکل جس کے اندر ہے جو کچھ کہ ہے اور بیٹا باپ کا راز ہے تاکہ وہ طریق خدا کو ظاہر کر دے چاہے منکروں کو ناپسند ہی ہو اور اللہ کی ہدایت جس نے لوگوں کے سامنے واضح کر دی، بے شک اللہ کی ہدایت اصل ہدایت ہے اور غافل آدمی اس حالت کو نہیں سمجھتے اور تردّد میں پڑے ہوئے لوگوں نے جن کے دلوں میں انکار کا مرض ہے کہا کیا ہم چھوڑ دیں اپنی آرا کو ایک مجنون شاعر کے لیے حالانکہ وہ جنون زدہ نہیں ہیں۔ انھوں نے اپنی کتاب میں اپنی خواہش کے مطابق کچھ کہا بھی نہیں۔ وہ تو فقط سہارا لیتے ہیں اللہ کی کتاب سے اور استفادہ کیا گیا ہے اس کی جناب سے۔ اور یہ شاعر کا قول نہیں ہے۔ دوسرے لوگوں کے شعروں کی طرح اگر وہ یہ سمجھتے اور گمان کرتے کہ وہ ایک ایسے آدمی ہیں جنھوں نے ارادہ کیا کہ ہم پر فضیلت لے جائیں درآنحالیکہ وہ ہم جیسے بشر ہیں، نیز گمان کیا کہ نہیں پیروی کرتے اس شخص کی مگر ہم میں سے جو ذلیل وجاہل لوگ ہیں۔ یہی لوگ ہیں جنھوں نے خریدی گمراہی ہدایت کے بدلے میں۔ مگر معاملہ ایسا نہیں ہے جیسا یہ لوگ گمان کرتے ہیں کیونکہ بعض گمان گناہ ہوتے ہیں لیکن جاہل لوگوں کو اس بات کی سمجھ نہیں ہوتی۔ خبردار وہ اپنے رب سے ملاقات کے بارے میں شبہ میں پڑے ہوتے ہیں۔ بے شک یہی لوگ ہیں جنھیں اپنے رب کے دیدار سے روک دیا جائے گا۔ میرا رب خوب جانتا ہے اُس کو جو لے کے آیا ہدایت اس کے

پاس سے اور وہ نہیں ہیں مگر وہ لوگ جو جہالت کرنے والے ہیں - اگر وہ شبر میں ہیں اس چیز کے بارے میں جو نازل ہوئی ہے ہماری کتاب میں تو اس کا مقابلہ کر دیکھیں لوگوں کی تالیفات کے ساتھ اور دیکھ لیں انصاف کے ساتھ کہ آیا وہ حق بات کہہ رہے ہیں - پس وہ لے آئیں ایسی ہی کوئی وارد ہونے والی چیز جو قرآنی آیات سے مقتبس ہو، اور اللہ کی کتاب سے چمٹی ہوئی ہو، اگر وہ سچے ہیں اپنی بات میں - اگر وہ ایسا نہ کر سکیں اور یقیناً وہ نہیں پائیں گے کسی کتاب میں جو وہ پاتے ہیں اس کتاب میں ان چیزوں میں سے جن کے ساتھ میرے رب نے مجھے خاص کیا ہے - پس وہ نہیں چھپائیں گے حق کو باطل کے ساتھ اور اس حالت میں کہ وہ پڑھتے ہیں کتاب - کیا وہ عقل نہیں رکھتے - کیا وہ نہیں جانتے کہ میرا رب بڑا صاحب فضل ہے - وہ جسے چاہتا ہے اپنی رحمت کے ساتھ مختص کر دیتا ہے - اور اُسی کے ہیں بندے عزت والے - اور کون ہٹتا ہے خالص طریقۂ محمدیہ سے سوائے اُس شخص کے جس کا نفس اُسے بے وقوفی میں ڈال دے - اور ہماری دعوت نہیں ہے مگر حق کی دعوت - اے ایمان والو جواب دو اللہ کے داعی کی پکار کا اور اپنے دین کو خالص کر لو تاکہ تم اپنے ذاتی ایمان میں اضافہ کر لو، اگر تم مخلص ہو اور یہ تذکرہ نعمتِ خداوندی کے سوا اور کچھ نہیں - اس کے پیغام کو پہنچانا ہے، مگر منافق لوگ اس کا یقین نہیں رکھتے - پس پاک ہے وہ اللہ جو کافی ہے بحیثیت گواہ کے میرے اور تمہارے درمیان اور اس کے درمیان جس کے پاس کتاب کا علم ہے لیکن جو منکر ہیں وہ محروم ہیں، کیونکہ وہ قیاس کرتے ہیں اپنے نفسوں پہ اور وہ خود جھوٹے ہیں - پس پاک ہے میرے رب کا نام کہ نہیں ہے کوئی معبود سوائے اس کے اور میں اسی کی طرف لوٹنے والا ہوں، اور جان لو کہ اللہ سبحانہٗ تعالیٰ کرتا ہے جو چاہتا ہے قدرتِ کاملہ کے ساتھ اور فیصلہ دیتا ہے جو وہ چاہتا ہے حکمت شاملہ کے ساتھ - اور اس کے کیے پر سوال نہیں کیا جا سکتا، لیکن بندے جو ہیں ان سے سوال و جواب ضرور ہوتا ہے - اگر حق ان کی خواہشات کی پیروی کرتا تو زمین و آسمانوں میں فساد پڑ جاتا - اور جو کچھ بھی ان کے اندر ہے ان کی مرادوں کے تضاد اور ان کی استعدادوں کے تخالف کی وجہ سے اور اپنے مناسب حال امور کی خواہش کی وجہ سے اور مختلف امور منافرہ کی کراہت کی وجہ سے، ان کے مختلف تعینات کی وجہ سے اور جزوی تشخصات کی وجہ سے ہے - پس اللہ تعالیٰ حکمت بالغہ کے مقتضیٰ کی مناسبت سے جو چاہتا ہے کرتا ہے اور جاہل جو ہیں وہ نہیں جانتے - وہی ذات ہے جس نے پیدا کی تمام سماعت اور بصارت اور دل، اور تمہیں دی ہیں وہ نعمتیں کہ اگر تم ان کو گننا

چاہو تو گن نہ پاؤ اور تھوڑے سے لوگ ہیں جو شکر ادا کرتے ہیں۔ وہی ہے جس نے پیدا کیا تمھیں زمین میں اور اسی کی طرف تم اکٹھے کیے جاؤ گے، اور وہی ذات ہے پیدا کرنے والی اور لوٹانے والی۔ نہیں ہے کوئی معبود سوائے اس کے، اور اسی کے ہاتھ میں ہر چیز کی بادشاہی ہے۔ وہ پناہ دیتا ہے اور اس کے خلاف کہیں پناہ نہیں دی جا سکتی۔ اگر تم اس بات کو جانتے ہو۔ وہی میرا رب ہے وہی تمھارا رب ہے۔ آسمانوں اور زمین کا اور جو کچھ ان میں ہے اُن سب کا رب ہے۔ پس سب کے سب اس کے لیے فرمانبرداری کرنے والے ہیں۔ اے جنّ و انس کے گروہ نہ عبادت کرو مگر اللہ کی، اور اُس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ اور جس کسی نے اُس کے ساتھ شریک کیا وہ گمراہیوں میں بہت دُور نکل گیا۔ کیا تم اس بات کی عقل نہیں رکھتے۔ اور بناؤ اپنے نفسوں کو اللہ تعالیٰ کی رضا پر راضی، اور کہو بے شک ہم اللہ ہی کے لیے ہیں اور ہمیں اُسی کی طرف لوٹنا ہے۔ اور پیروی کرو سلامتی کے راستے کی جو طریقۂ محمدیہ ہے جس طریقے والے پر صلوٰۃ و سلام ہو اور خالص محمدی جو ہیں وہی فلاح پانے والے ہیں اور جس کسی نے اپنے دین کو اللہ کے لیے خالص کر لیا، پس وہ اللہ کے ان بندوں میں سے ہے جنھیں اللہ نے چُن لیا، اور اللہ تعالیٰ کہتا ہے بے شک ہمارا لشکر ہی غالب آنے والا ہے۔ اور شک میں پڑے ہوئے منکرین اپنے ایمان اور اعتقادات کو معلق کیے ہوئے ہیں ایسے امور کے ساتھ جو سُنے نہیں گئے اور شرطیں لگاتے ہیں ایسی جن کی کوئی اصل نہیں ہے، اپنے نفس کی خباثت کی وجہ سے اور جو کچھ وہ کرتے ہیں اللہ اُس سے غافل نہیں، جب وہ آتے ہیں امیر المحمدین کے پاس یا آتے ہیں محمدیین سے اول کے پاس۔ پس انھوں نے باتیں کیں اس طرح کی اور کہا کہ ہم ایمان نہیں لائیں گے تم پر یہاں تک کہ تم جاری کرو ہمارے لیے زمین میں سے چشمہ اور ہو تیرے لیے باغ کھجور کا اور انگور کا پس تو اُس میں چلائے بہتی ہوئی نہریں یا تو گرا دے ہمارے اوپر آسمان جیسے کہ تو سمجھتا ہے ٹکڑوں کی شکل میں جیسا کہ تیرا دعویٰ ہے یا خدا فرشتوں کو ہمارے روبرو لے آئے۔ یا ہو تیرے لیے گھر سونے کا یا تو چڑھ جائے آسمان پر۔ تیرے چڑھنے کا بھی ہم یقین نہ کریں گے، جب تک تو ہمارے اوپر تحریر نہ لائے جسے ہم پڑھیں۔ پس پاک ہے میرا رب بلندی والا جس نے مجھے کتاب دی اور اس میں ذکر کیا ہر قسم کا باب اور میں نہیں ہوں مگر ایک بشر لوگوں کی طرح، مگر میرا رب مخصوص کرتا ہے اپنی رحمت سے جسے چاہتا ہے اور وہ بڑے فضل والا ہے۔ یہ تو سب کچھ نہیں ہو گا مگر اُن کا قدیم فعل جو وہ کرتے چلے آئے ہیں رسولوں اور انبیاء سے اس سے پہلے بھی۔ بے شک اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے باخبر اور اُنھیں دیکھنے والا ہے۔ اور اُنھوں نے

نہیں روکا لوگوں کو ایمان لانے سے، جب کہ ہدایت ان کے پاس آگئی۔ مگر اس بنا پر کہ انھوں نے کہا کیا بھیج دیا اللہ نے ایک بشر کو رسول بنا کر۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے جواب میں حکم دیا۔ اے نبیؐ ان سے کہہ دو کہ اگر زمین میں فرشتے چلتے ہوتے اطمینان کے ساتھ تو میں آسمان سے ایک فرشتے کو رسول بنا کر بھیج دیتا اور یہ تو اللہ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے۔ جسے اللہ ہدایت دے وہی ہدایت پانے والا ہے اور جسے اللہ گمراہ کر دے پس اُس کے لیے کوئی نبی یا رہنمائی کرنے والا نہیں۔ اور کیسے ہدایت پاتے ہیں منکر لوگ اور وہ لوگ جو اولیا اور مرشدین پر ایمان تو رکھتے ہیں جب کہ بند کر دیا اللہ تعالیٰ نے ان پر ہدایت کا دروازہ اور مہر لگادی ان کے دلوں پر، ان کے کانوں پر اور ان کی آنکھوں پر، اور ان کے دل ہیں جن کی مدد سے وہ بات نہیں سمجھ پاتے اور ان کے کان ہیں جن سے وہ سُن نہیں پاتے اور ان کی آنکھیں ہیں جن سے وہ دیکھ نہیں پاتے اور جسے اللہ گمراہ کر دے اس کے لیے کوئی ہدایت دینے والا نہیں اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ اور جس نے غافل کر دیا اس سے جس نے بلایا اپنے رب کے کلمات کی طرف اور خود بھی غافل ہوا اور جس نے ظلم کیا اُس کے ساتھ، جس نے ذکر کیا اپنے رب کی آیات کا اور خود اس سے روگردانی کی اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر گواہ ہے۔ یہ لوگ ہیں جنھوں نے کفر کیا اپنے رب کی آیات کا اور نہ اعتبار کیا خالص محمدیوں کے کلمات پر جن کو کہ اللہ نے اپنے ہاں سے علم سکھایا اور عطا کی انھیں رحمت اپنے ہاں سے اور اُنھوں نے نہ بلایا مخلوق کو خالص محمدی طریقے کی طرف مگر اللہ اور اُس کے رسولؐ کے حکم سے، پس جو چاہتا ہے ایمان لے آئے اور جو چاہتا ہے کفر کرلے، یہ بات میں نے اپنی طرف سے نہیں کی اور میرے رب کا وعدہ حق اور سچ ہے، وہی اللہ میرا رب ہے۔ میں اپنے رب کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہراتا۔ اور میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد صلعم اس کے بندے اور رسولؐ ہیں، اور نہیں ہے کوئی نبی ان کے بعد، اور محمدی ہی ہدایت پائے ہوئے ہیں۔

اللہ کی نعمتوں کا تذکرہ

ہر قسم کی تعریف اس اللہ کے لیے ہے جس نے مجھے مومنین میں خالص محمدیت کی برکت کی وجہ سے حاکم بنایا اور اللہ اور حضور نبی کریم صلعم کے ساتھ تقرب کی نسبت کی قوت سے اور میرے دل کے اندر خاص الہام کے ساتھ حکم دیا کہ میں فیصلہ کروں لوگوں کے درمیان اللہ تعالیٰ کے احکام کی روشنی میں اور

اُنھیں بلاؤں طریقۂ محمدی کی طرف ان آیات کی مدد سے جو اللہ تعالیٰ نے نازل کی ہیں اپنی کتاب میں جو کہ کھلی کھلی گواہیاں ہیں تیری حقیقت پر۔ اور نہ پیروی کر ان لوگوں کی خواہشات کی اور سیدھا رہ جیسا تمھیں حکم دیا گیا ہے۔ اگرچہ وہ تیرے حق کے راستے سے روگردانی کریں۔ پس کہہ کہ کافی ہے میرے لیے اللہ اس کے سوا نہیں کہ اللہ یہ چاہتا ہے وہ اُنھیں سزا دے اس چیز کے ساتھ جو اس نے فاسقین کے ساتھ کر رکھی ہے کیونکہ لوگوں میں سے اکثر ضرور بالضرور فاسق ہیں۔ کیا یہ جاہلیت کا فیصلہ چاہتے ہیں۔ اس زمانے میں جب کہ اللہ فیصلہ کر رہا ہے اپنی آیات کے ساتھ جیسا وہ چاہتا ہے اپنے رسول صلعم کی رضا کے مطابق۔ خالص محمدیوں کی زبان سے، اور کون زیادہ اچھا فیصلہ کرنے والا ہے اللہ سے ایماندار لوگوں کے لیے۔ اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ آؤ اس چیز کی طرف جو نازل کی اللہ نے قرآن میں اور سنو کہ کیسے آیات سے اقتباسات لیے گئے ہیں اور میں پہنچاتا ہوں تمھیں اس کی حق پر مبنی دعوت۔ نہیں بلایا تم کو کسی نے اب تک اس پسندیدہ انداز کے ساتھ۔ پس آؤ اس کے رسولؐ کی طرف اور خالص محمدی طریقہ اختیار کرو جو کہ طریقہ حقہ ہے۔ اُنھوں نے کہا کہ کافی ہے ہمارے لیے جس پہ پایا ہم نے اپنے آبا کو دوسرے طریقوں میں سے اگرچہ ان کے آبا نہیں جانتے تھے کچھ بھی اور ہدایت یافتہ بھی نہیں تھے۔ یہ ہے وہ چیز جس کا مجھے حکم دیا ہے میرے رب نے کہ میں بیان کروں۔ اور مجھے ثالث بنایا کہ میں فیصلہ کروں اُس کے ساتھ اُن کے درمیان۔ پس میں نے فیصلہ کیا تمھارے درمیان عدل و دانائی کے ساتھ بے شک اللہ تعالیٰ عدل کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ اور دکھائیں مجھ کو میرے رب نے بڑی نشانیاں اور دیے مجھے اپنے اعلیٰ و ارفع کلمات اور مجھے عطا فرمائی یہ کتاب اور مجھے پکارا اس خطاب سے جب کہ کہا کہ اے اللہ کے نائب اور اللہ کی نشانی۔ بے شک میں گواہی دیتا ہوں تیری بندگی کی، پس میں گواہی دیتا ہوں کہ تو میرا بندہ ہے اور میرا مقبول اور میرے رسولؐ کا پیارا ہے۔ میں کہتا ہوں اے میرے رب! اب میں گواہی دیتا ہوں کہ نہیں ہے کوئی معبود سوائے تیرے اور میں گواہی دیتا ہوں کہ تو ہر چیز پر گواہ ہے۔ تو ہی میرا اللہ اور معبود ہے۔ تیرے سوا میرا کچھ مقصد نہیں۔ تیرے حبیب کا خاندان ہوں اور تیرے عندلیب کا جگر گوشہ۔ اللہ نے کہا اے بندے۔ اے عارف باللہ، بے شک میں نے بنایا تجھے ایک جامع مظہر ہر قسم کے ظہورِ حق کے لیے۔ پس جا میری نشانیوں کے ساتھ میری مخلوقات کی طرف۔ پس تیری دعوت ہوگی گروہِ الٰہی اور گروہ محمدی کی طرف سے۔ پس جس نے تیری اطاعت کی، اُس نے اطاعت کی اللہ کی اور رسولؐ کی، میں نے کہا اے میرے رب میں نے قبول کر لیے

تیرے سارے احکامات اور میں نے بلایا تیری مخلوق کو تیرے دین کی طرف اور تیرے اسلام کی طرف، پس تو اُنھیں ہدایت دے میری طرف اور میرے باپ کی طرف تاکہ میں اُنھیں ہدایت دوں تیری طرف اور تیرے رسول کی طرف اور ہدایت دیتا ہے جسے چاہتا ہے تو ۔ اللہ نے کہا اسے واردات کے ورود کی جگہ اور اسے آیات کے مصدر بے شک ہم نے بنایا تجھے لوگوں کے لیے نشانی، شاید وہ ہدایت پائیں، لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے ۔ میں نے کہا! اسے میرے رب تو جانتا ہے جو میرے دل میں ہے اور میں نہیں جانتا کہ تیرے دل میں کیا ہے ۔ اگر تو اُنھیں عذاب دے یہ تیرے بندے ہیں اور اگر تو اُنھیں بخش دے تو تو بڑی حکمت و غلبے والا ہے ۔ اس نے کہا کہ دو اگر حقیقت اس سے کچھ زائد ہوتی جو مجھ پر کشف کی گئی ہے تو ضرور اسے ظاہر کر دیتا اللہ مجھ پر، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے میرے لیے دین کو مکمل کر دیا ہے اور اپنی نعمت مجھ پر تمام کر دی ہے اور میرے لیے اسلام کو بحیثیت دین پسند کر لیا ہے ۔ اور اگر پردہ ہٹا بھی دیا جاتا تو میرے یقین میں مزید اضافہ نہ ہوتا ۔ بے شک میرا رب بہت زیادہ فضل والا ہے ۔

اللہ تعالیٰ کے ذاتی اور صفاتی اسمائے حسنیٰ کا مکمّل بیان

اس کی دو قسمیں ہیں ذاتی اور صفاتی، صفاتی کو اضافی بھی کہا جاتا ہے ۔ صفت اک اضافت ہے جسے موصوف کی ذات سے منسوب کیا جاتا ہے ۔ اسم ذات تمام صفاتی اسماء کا منبع و مبدا ہے، چنانچہ ذات ہی تمام کمالات و اوصاف کی منبع ہے ۔ اور یہ اسم ہی اسم اعظم ہے جو ضمیر کی طرح تمام اسماء میں چھپا ہوتا ہے اور اسی مخفی و مبہم نام کا سایہ ہی وہ تمام نام ہیں جو مختصراً تمام کمالات کی جامعیت پر دلالت کرتا ہے اور ابہام کی کسی حد تک تصریح کرتا ہے ۔ ان اسماء کو اسمائے کلّی یا اسمائے جامعہ کہا جا سکتا ہے ۔ اور ان اسماء کا سایہ وہ اسماء ہیں جو ایک ایک جزئی وصف پر دلالت کرتے ہیں اور مبہم معنوں کو کسی خاص وصف سے مفصّل بنا دیتے ہیں ۔ ان اسماء کو اسمائے جزئیہ اور اسمائے مفصلہ کہا جا سکتا ہے چونکہ ہر مطلب کسی مثال کے ذریعے بہتر طور پر سمجھ میں آجاتا ہے اور اعلیٰ امثال اللہ ہی کے لیے ہے ۔ میں اپنے چند ناموں کے ذکر کی مثال پیش کر کے اسمائے ذاتی و صفاتی کو سمجھانے کی کوشش کرتا ہوں کیونکہ جس نے اپنے آپ کو پہچان لیا اس نے اپنے رب کو پہچان لیا ۔ یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ میرا یہ نام جو خواجہ میر درد ہے، یہ میرا اعتباری نام ہے جو میرے لیے مقرر کیا گیا، یہ میرا ذاتی اسم نہیں کیونکہ اسم ذاتی میں قابلِ اعتبار ہونے کا یقین اور وضع کرنے والے کی وضع نہیں ہونی چاہیے، اس کا ازالہ کسی ایسی شے سے ہونا چاہیے جو خود

زائل نہ ہو۔ میں اس قسم کے وصفی اور صفاتی بہت سے نام رکھتا ہوں۔ مثلاً نورالناصر (ناصر کا نورِ چشم)، ابن الامام، نالۂ عندلیب، دردِ حبیب، درد یا اثر، سرِّ پدر، گلشنِ حقیقت، عندلیبِ طریقت، آیت اللہ (اللہ کی نشانی) عارف باللہ، خواجۂ بزرگ، منِ منی، موردِ واردات (وارد ہونے کی جگہ)، مؤید بتائید (جسے تائیدِ ربانی حاصل ہے) صاحب توحید (موحّد)، روحِ عالم، ورا الورا (پرے سے پرے)، محمدی خالص (خالص پیروکارِ حضورؐ)، اول المحمدین، دلیل الناصر (ناصر باپ کا نام ہے)، برہان الناصر (نسبت پدری سے) عین الناصر (ناصر کا نورِ چشم)، زین الناصر، جزو لاینفک (انمٹ جزو) متصل واحد۔ اسی قسم کے بہت سے دیگر لاتعداد و بے شمار نام ہیں جو گنتی میں نہیں آسکتے۔ کیونکہ قرآن مجید کی یہ آیت کریمہ کہ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو پیدا کر کے کل چیزوں کے اسما کا علم دے دیا تھا، ثابت کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنے تمام اسمائے حسنیٰ کا مظہر بنایا اور اس آئینے میں اپنے کمالات کا عکس ڈال دیا تاہم ابھی میں اپنے پروردگار کی سنت پر چلنے کے مطابق اُن میں سے ننانوے نام آپ کے سامنے بیان کرتا ہوں جو میری کامل انسانیت کی حقیقت پر دلالت کرتے ہیں اور گاہے اپنے کیف و سرور کے لمحات میں میں خود بھی ان سے ممتاز ہو جاتا ہوں۔ وہ یوں ہیں: نور، ظہور، عالم، معلوم، مجمل (مختصر)، مفصل، جامع (جمع کرنے والا) ظاہر، باطن، شاہد (مشاہدہ کرنے والا)، مشہود (جس کا مشاہدہ کیا جائے)، سامع (سننے والا)، مسموع (جو کچھ سنا جائے)، باجمال، کم جلال، مقصود، موجود، معدوم، موہوم (وہم کیا گیا)، طالب، مطلوب، محب (چاہنے والا)، محبوب (معشوق)، گویا (بولنے والا)، بینا۔ بندہ، زندہ، رشید (صاحب رشد و ہدایت)، وحید (یکتا)، مرید، حساس (بہت محسوس کرنے والا)، محسوس، عاقل، معقول، مصدر آیات (نشانیوں کا منبع)، جامع صفات (صفات کا مجموعہ)، کریم الطرفین (ماں باپ دونوں کی طرف سے کریم)، سعید الدارین (دنیا و آخرت میں سعادت مند، تائب (توبہ کرنے والا)، ذاہب (جانے والا)، پاک، بے باک، صابر، شاکر (شکر گزار)، متوکل (توکل کرنے والا)، متکفل، (کفیل۔ ضامن۔ ذمہ دار)، رحیم، مرحوم (جس پر رحمت کی گئی ہو)، مغفور (بخشا ہوا)، کریم، حکیم (دانا)، مومن، مسلم۔ عزیز دلبا (بہت پیارا)، رہنما، مستغنی (بے نیاز)، بامعنی، حق، مطلق (آزاد) مقیدّ (پابند، مشروط)، مؤید (تائید کرنے والا)، مسمی، معمی (پیچیدہ)، مقناطیس، بے تلبیس (جس میں کھوٹ نہ ہو)، مظہرِ اتم (پورا پورا مظہر)، جزو اعظم، حقیقت الحقائق (حقیقتوں کی حقیقت)، خیر خواہ

خلائق (مخلوق کا ہمدرد)، نغمہ الٰہی، سازِ آگاہی، دل عاشق، بندہ صادق، حق الیقین، بلاغ مبین (واضح کمال)، مردِ خلیق، رفیق طریق (راستے کا ساتھی۔ ہمراہی)، مستقیم المزاج (سیدھے مزاج کا)، بے احتیاج، بحر مواج (ٹھاٹھیں مارتا سمندر)، بیانِ بے زبان، زبان بے بیان، دل مہربان، جان بے جان، ولی، غنی، فقیر، امیر، ابدی (ہمیشہ یا ابد تک رہنے والا)، مہتدی (ہدایت پانے والا)، وارث، خلیفۃ اللہ (نائب حق)، مقرب، مہذب، عامل۔ (عمل کرنے والا)، شامل، فرستادہ، صاحب سجادہ، فارسی زبان میں میرا ذاتی نام یہی لفظ (من)، ہے۔ اور عربی زبان میں یہ لفظ (انا) ہے۔ اسی طرح دوسری زبانوں کے وہ لفظ جو اس کے ہم معنی ہوں۔ چونکہ تمام میں فقط ایک واحد ذات (وجود) ہی جلوہ گر ہے اس لیے اسم ذاتی میں کسی کو اختلاف نہیں۔ ہر کوئی اپنے آپ کو اسی لفظ 'من' یا "ما" سے تعبیر کرتا ہے۔ کبھی اپنی صفات و کمالات کے جامع پن پر نظر رکھتے ہوئے لفظِ 'ما' اور 'نحن' سے یاد کرتا ہے جو فارسی اور عربی میں جمع متکلم کے صیغے ہوتے ہیں اور اسی طرح دوسری زبانوں کے جمع متکلم کے صیغے۔ دوسروں کی اعتباری اجنبیّت کے ضمن میں وہ اپنی یقینی شخصیت کے پیش نظر کسی کو مخاطب کرتے وقت حاضر و غائب کی مناسبت سے ان کے لیے 'تو' اور 'او' کے ذاتی اسم استعمال کرتا ہے۔ اور ہر لفظ کے لیے چھپی ہوئی اور ظاہر یا ساتھ ملی ہوئی اور الگ الگ ضمیریں استعمال کرتا ہے۔ یہ اسمِ اعظم نظروں سے چھپا رہا اور بصارت سے حجاب میں رہا۔ تمام اسماء میں اپنے ظہور اور شمول کی کثرت کی وجہ سے جیساکہ حدیث میں اشارہ ہے اس طرف جیساکہ روایت کیا گیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک آدمی کو سُنا یہ کہتے ہوئے۔ اے اللہ میں تجھ سے سوال کرتا ہوں، کیونکہ تو اللہ ہے نہیں کوئی معبود سوائے تیرے۔ تو یکتا ہے اور بے نیاز ہے جس نے نہ کسی کو جنم دیا اور نہ وہ خود جنا گیا اور نہیں ہے کوئی ایک بھی اس کا ہمسر۔ پس آپؐ نے فرمایا کہ اُس نے بلایا اللہ کو اُس کے اسم اعظم سے جس کے ذریعے اُس سے سوال کیا جائے تو عطا کر دیتا ہے اور جب اُسے پکارا جائے اس نام سے تو اس پکار کا جواب دیتا ہے۔

غلبۂ ربوبیت کے ساتھ بندگی کا دعویٰ

حقیقت کے انکشاف کے لیے مثال کے طور پر دیے یا لکھے گئے اس بیان سے کہیں میرے خاص وجود پہ وجودِ پاک حق تعالیٰ کا گمان کر کے کہیں وحدت الوجود کے مشہور عوام مسئلہ کے قائل نہ ہو جائیں اور مجھے مسئلہ ہمہ اوست کا معتقد نہ سمجھ بیٹھیں جس طرح سے صوفیا کی کتابوں اور رسالوں میں مرقوم ہے میں تو مٹی کا

مال ہوں اور وہ رب الارباب ہے۔ میں تو ایک خاص تقید کا اسیر ہوں اور اُس کا بندہ اور اس کی مخلوق ہوں۔ یہ سمجھ لیں کہ مقام بندگی سے بڑھ کر اور کوئی قرب نہیں اور بندے کے لیے اپنے رب کے مشاہدے سے بڑھ کر اور کوئی لذت نہیں۔ سو ذاتِ الٰہیہ سے اس کے متحد ہو جانے کا خیال محض ایک خیالِ خام ہے اور اعتباری، حقیقی، وجودی اور اصلی یعنی تمام وجوہ کے لحاظ سے ذات واجب الوجود سے متحد ہو کر ایک ہو جانا اک امر محال ہے۔ اس مرتبۂ الوہیت پہ جہاں سب امتیازات ختم ہو جاتے ہیں اور اعتباری حیثیتوں میں کسی حیثیت کا فرق وہاں ہے ہی نہیں۔ وہاں پہ قرب، وصل اور نزدیکی کے لفظوں کا اطلاق بھی بے جا ہے اور اتحاد و یگانگت کی نسبت بھی غلط۔ یہ حالت تو حالتِ عدم کی مانند ہے۔ اگرچہ وہ مرتبۂ لاشئ وجودی میں شامل ہے لیکن وہ کُل اشیا کو محیط کر لینے والے احاطۂ وجود سے باہر نظر آتا ہے۔ فی الحال ذہن اس معنی کے تصور کو اعلیٰ ترین مفہوم سمجھتا ہے اور اس مطلب کے مطالعے سے پوری لذت و فراغت ہونی چاہیے۔ یہ بھی اسی علم و امتیاز کے مراتب ہی کی برکت سے ہے کہ مرتبۂ شئ وجودی میں شمار ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو اسی نور کی نورانیت سے روشن اور منور کیا ہے، اور ان پہ اپنی مختلف قسم اور رنگ برنگ کی تجلیات کا پرتو ڈالا ہے اور اُسے قرب، نزدیکی، وصل اور ملاپ کے بلند درجوں پر فائز کیا ہے اور لامحدود مقامات تک ترقی دے کر ہر لمحہ انھیں یہ دعوت دیتا ہے کہ "میرے قریب آجاؤ" اور ہر لحظہ انھیں تقرب ذات کی طرف کھینچتا ہے۔ حقیقت سے ناآشنا انسان اس مرتبۂ بندگی کی قدر و منزلت کو کیسے سمجھ سکتا ہے کہ خود سرورِ کائنات نبی اکرم صلعم اُسے مقامِ رسالت سے افضل و مقدم سمجھتے تھے۔ اقرارِ معبودیت کی طرح اقرار عبودیت (بندگی) کو بھی ایمان کا ایک رکن سمجھتے تھے۔ ذرا کلمۂ شہادت دیکھیے کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا اور کوئی معبود نہیں اور میں گواہی دیتا ہوں کہ محمدؐ اللہ کے بندے اور اُس کے رسول ہیں۔ یہاں بھی عبدیت کا بیان پہلے اور رسالت کا اظہار بعد میں آیا ہے جو عبدیت کے کمال کا آخری درجہ ہے۔ لہٰذا اس سے متعلق یہی کچھ ہے کہ اس سے بڑھ کر اور کوئی کیفیت نہیں کہ انسان ہمیشہ مقام بندگی میں رہتے ہوئے حقوق اللہ اور حقوق العباد کے ہر مرتبے کو پہچان کر اُس کا حق ادا کرتا ہے، اور باطنی طور پر اسماء و صفات سے بے نیاز ہو کر اور عربی و فارسی الفاظ کی وساطت کے بغیر ہمیشہ اللہ تعالیٰ کی ذات پاک کی طرف دھیان لگائے رکھے اور بڑی عاجزی و گڑگڑاہٹ کے ساتھ اس پاک و مقدس ذاتِ خداوندی کے ساتھ دلی کشش اور لگاؤ پیدا کرے جس سے اُسے دائمی کیف و سرور، مسرت و کشائش اور وسعتِ قلب نصیب ہوگی۔ اگرچہ

مظاہر کے ان شکستہ آئینوں میں حقیقت واحد کا مشاہدہ بھی ایک عجیب کیفیت و حالت ہے، لیکن ان اعتبارات کی توجہ اور ان امتیازات کے حضور کی شراکت کے بغیر براہ راست اُس ذاتِ بے ہمتا پہ توجہ مبذول کرنا اک بہت بڑی اور لازوال سعادت و نعمت ہے۔ اللہ تعالیٰ کو دل و جان سے زندہ، عالمِ کُل، قادرِ مطلق سب کچھ سننے، دیکھنے اور کہنے والا مان کر اُس سے یوں بات چیت کی جائے جیسے سچے دوست مخلص دوستوں کے ساتھ کرتے ہیں اور ان کے باہمی معاملات بالکل صحیح اور ٹھیک ٹھاک ہوتے ہیں۔ یہ بات انسان کے لیے دونوں جہانوں میں نفع بخش اور اُس کے ظاہر و باطن کی اصلاح کرنے والی چیز ہے۔ اِسے خصوصی ولایت کا پھل سمجھیے، بلکہ یہ شاخ نبوت کے کمالات ہی سے پھوٹتی ہے۔ انبیائے کرامؑ کے خوانِ نعمت کی یہ امتیازی نعمت ہے (ان پر خدا کا درود و سلام) پھر ان کے اتباعِ کامل سے اولیائے کرام اور کامل انسانوں کو اس نعمت سے اپنا حصہ اور نصیبہ ملتا ہے اور وہ سوال و جواب، القا و الہام و خطاب سے متمیز ہوتے ہیں اور جو کچھ چاہتے ہیں براہ راست اپنے رب سے پوچھتے ہیں، اور اُدھر سے بھی شافی جواب پاکر سکون اور اطمینان قلب حاصل کر لیتے ہیں۔ کثرت میں وحدت کا یہ مشاہدہ دوسرے عالموں، فاضلوں کو بھی علم تصوف کی کتابوں اور رسالوں کے مسلسل اور متواتر مطالعے سے میسّر ہو سکتا ہے۔ فلسفی بھی اپنی سوجھ بوجھ کے مطابق علّت و معلول کے راز کو سمجھتے ہیں اور امکانی مراتب میں ذات واجب کی فاعلیت کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ لیکن ان تمام امور اور کمالات کی جامعیت ان تمام حالات و کیفیات کا شرف اور حکمت و تصوّف اور ولایت و نبوت کے کمالات کے تمام درجوں اور مقامات کو طے کرنا خالصتاً مخلص مومنین ہی کے حصّے میں آیا ہے اور ان کے پیغمبر پاک (ان پر خدا کا درود و سلام) کے صدقے حضورؐ کا کامل اتباع کرنے والے حق پرست اس نعمت سے سرفراز ہوتے اور ہر لحظہ اپنے ظاہری اور باطنی گوشِ حق نیوش سے یہ خوشخبری سنتے ہیں کہ آج کے دن تمھارے لیے تمھارے دین کو میں نے کامل کر دیا اور میں نے تم پر اپنا انعام تمام کر دیا اور میں نے اسلام کو تمھارا دین بننے کے لیے پسند کر لیا۔ اور وہ ہر لحظہ عجیب و غریب طریقوں سے خدائے بزرگ و برتر اور رسول مقبول صلعم کے خصوصی قرب کے مرتبے سے مشرف ہوتے رہتے ہیں، اور ان کے ساتھ عمل کیا گیا جو ان کے ساتھ عمل کیا گیا۔ خلاصہ پس اے میرے جسم و جان میں چونکہ کون و مکان اور خداوندی مراتب کا مجموعہ ہوں، خدا کا بندہ ہونے کے باوجود میں نے

اپنے اندر اخلاق خداوندی کو پیدا کر رکھا ہے اور انہی انوار ذات کی ایک نورانی شعاع ہوں جو تم پر چمک رہی ہے اور مجھے تمھاری طرف بھیجا گیا ہے، تاکہ تمھیں ہدایت کی راہ دکھاؤں اور دُنیا و آخرت کے خیر و شرؔ (نیکی و بدی) سے تمھیں آگاہ کروں اور الہام کی صورت میں تمھارے رب کا پیغام تم تک پہنچاؤں کیونکہ اللہ کا فرمان ہے کہ قسم ہے انسان کی جان کی اور اس ذات کی جس نے اس کو درست بنایا پھر اس کی بدکرداری اور پرہیزگاری دونوں باتوں کا اُس کو القا کیا۔ اس آیت کریمہ کے موجب تم پر حق تعالیٰ کی حقانیت کو واضح کروں اور حضور سرور کائنات محمد الرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خاتم النّبیین ہونے کی حقیقت کو تم پر آشکارا کروں اور نیابت، امامت اور ولایت کے اسرار و رموز تمھیں بتاؤں اور طریقت محمدی کی حقانیت کا اظہار کروں (ان پر اور ان کے آل و اصحاب سب پر سلام و صلوٰۃ) اور مذکورہ بالا طریقے کے امام (خدا ان کے رازوں سے ہماری نصرت فرمائے اور ان کی نیکیوں سے ہم پر برکتیں نازل کرے) کے بتائے ہوئے طریق کی طرف دعوت دے کہ تمھیں دینِ محمدی کی طرف بلاؤں جو دینِ الٰہی ہے۔" اور اللہ ہی کے لیے ہے خالص دین"۔[۶۱]

ادیان و مذاہب کی حقیقت اور ہر انسان کی کیفیت

دین اللہ ذاتِ باری تعالیٰ کے اصلاحی معنی ہیں جو دُنیا اور اہلِ دُنیا کے قیام کا سبب اور جہان اور اہلِ جہان کی اصلاح کا موجب ہے جیسا کہ اللہ جل شانہٗ نے فرمایا ہے کہ تم یک سُو ہو کر اپنا رُخ اس دین کی طرف رکھو۔ اللہ کی دی ہوئی قابلیت کا اتباع کرو جس پر اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو پیدا کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی پیدا کی ہوئی چیز کو جس پر اس نے تمام آدمیوں کو پیدا کیا ہے بدلنا نہ چاہیے۔ پس سیدھا دین یہی ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے اور انبیائے کرام اور اولیائے اللہ سے جو اسی ہادی مطلق کے مظہر ہیں اپنے اپنے مراتب اور اپنی اپنی استعداد کے مطابق دین الٰہی کے اسرار و رموز ظاہر ہوتے ہیں اور اہلِ عالم کو مسرور کرتے ہیں۔ لہٰذا حضور پاکؐ کی برکت، جس ذات پر تمام برکتیں ختم ہو جاتی ہیں اور تمام بھلائیاں اور نیکیاں جس میں شامل ہیں وہ بابرکت ذات باقی تمام دینوں کو منسوخ کرنے والی ہے۔ اُس نے مخلوق کو باقی تمام رستوں اور راہوں سے بے نیاز کر دیا۔ چنانچہ یہ آیت کریمہ کہ یہ دین میرا راستہ ہے جو کہ مستقیم ہے۔ سو اس راہ پر چلو اور دوسری راہوں پر مت چلو کہ وہ راہیں تم کو اللہ کی راہ سے جدا کر دیں گی۔ اس کا تم کو

اللہ تعالیٰ نے تاکیدی حکم دیا ہے تاکہ تم اس راہ کے خلاف چلنے سے احتیاط رکھو۔ اگرچہ ہر کسی کی شریعت وہی ہے جس پہ وہ پیدا ہوا ہو، اور بلا ارادہ اسی شریعت پر چلتا رہتا ہے بموجب اس آیت کریمہ کے تم میں سے ہر ایک کے لیے ہم نے خاص شریعت اور خاص طریقت تجویز کی تھی۔ لیکن بعض محض جزئی استعداد رکھتے ہیں جیسا کہ عام اُمتی اور تابعین کہ جن کے حکم کے ماتحت اور کوئی نہیں ہوتا۔ وہ خود ہی اپنے آپ عمل کرتے رہتے ہیں اور بلا مقصد و ارادہ وہ اس جزو کی کلیات کے تابع ہو جاتے ہیں اور کسی اور کی کلی اطاعت نہیں کرتے، گویا وہ اس آیت کریمہ کے مصداق ہونے کے برابر ہے۔ ان کے حق میں خواہ آپ ان کو ڈرائیں یا نہ ڈرائیں وہ ایمان نہ لاویں گے۔ بعض پوری استعداد رکھتے ہیں جیسے کہ انبیا حضرات (ان پر خدا کا درود و سلام) جو اپنی جزئیات کے خود متضمن ہوتے ہیں اور ان کی اپنی اُمت ان کے حکم کے ماتحت ہوتی ہے۔ اور وہ دوسروں کو بھی اس راہ کی طرف بلاتے ہیں جس پر وہ خود چل رہے ہوتے ہیں۔ یہ سب شریعتیں، خدا ہی کی مقرر کردہ ہیں۔ دیکھیے یہ آیت کریمہ کہ جتنی اُمتیں اہل شرائع گزری ہیں، ہم نے ان میں ہر اُمت کے لیے چلنے کا اک طریقہ مقرر کیا کہ وہ اسی طریقے پر چلتے ہیں۔ بعض استعداد کی ایک خاص نوع کے مالک ہوتے ہیں، جیسے کہ مجتہد صاحبان یا اولیائے کرام جو صاحب طریقہ ہوتے ہیں یعنی نہ ان میں یہ قوت ہوتی ہے کہ کلیت کا دعویٰ کریں اور اپنے پیروکاروں کو دیگر افراد سے متمیز کر سکیں اور نہ ہی یہ برداشت کہ فقط اپنی ذات پر اکتفا کر کے بیٹھ رہیں اور دوسروں کو راہ نہ دکھائیں۔ اسی کل کے افراد کو جس کا وہ خود اک جزو ہوتے ہیں اپنے ساتھ شامل سمجھ کر اپنی قسم میں داخل کر لیتے ہیں اور انھیں دوسری قسموں سے الگ کر لیتے ہیں۔ بعض کلی استعداد رکھتے ہیں بلکہ وہ خود ہی عین کلی ہیں۔ فقط یہی ظاہری غیریت (مغائرت) رکھتے ہیں۔ جیسی کہ لفظ ناطق اور انسان میں ہے جو درحقیقت ایک ہی ہیں اور یہ لوگ آل رسول ﷺ ائمہ معصومین ہیں جنھوں نے دوسروں کی طرح اپنے طریقے کو اپنے جزوی نام کے حوالے سے ممتاز نہیں بنایا، اور اپنی خودی اور انا کے شرک سے دین محمدی میں آمیزش نہیں کی۔ خالص دین و طریقت محمدی انہی کا حصہ ہے۔ اور تمام امت محمدیہ پر ان برگزیدہ ہستیوں کا احترام ان فرمودات نبوی کے مطابق واجب و لازم کہ جس کا میں مولا علیؓ اس کا مولا اور یہ کہ امام حسنؓ اور امام حسینؓ جنت میں نوجوانوں کے سردار ہوں گے۔ ہاں ہاں خالص طریق محمدیؐ بجز سادات کے اور کس سے ظہور پذیر ہو سکتا ہے۔ اور سوائے سادات بنی فاطمہؓ کے جس کے متعلق حضور پاک ﷺ

نے خود فرمایا کہ فاطمہؓ میرا جگر گوشہ ہے۔ بھلا اسرار و رموز پہ کون لب کشائی کر سکتا ہے۔ اے اللہ مدد فرما اس کی جس نے دین محمدؐ کی مدد فرمائی اور بے شک ہمارا لشکر ہی غالب آنے والا ہے اور فتح پانے والا ہے۔

آیاتِ قرآنی سے ایمان کی تلقین

پاک ہے وہ اللہ جس نے مجھ پہ قرآن کی برکات کا فیضان کیا۔ اس کی قبولیت کی خوبصورتی کے ساتھ اور اُس کے رسولؐ کے طفیل اور یہ میرے رب کا فضل ہے اور بے شک یہ بڑا واضح فضل ہے۔ پس میں نے بلایا اپنی قوم کو طریق محمدیؐ کی طرف آیاتِ قرآنیہ کی مدد سے، تاکہ میری حجت برہان قاطع ہو اللہ کی مدد سے کہ جس کے لیے حجت بالغہ ہے۔ خاص کرتا ہے اپنی رحمت کے ساتھ جسے چاہتا ہے اپنے مومنین بندوں میں سے اور اُس نے کہا الہام شافی کے ذریعے کہ جا میری اس کتاب کے ساتھ اور لکھ اس کی آیات اپنی کتاب میں اور پیش کر اُسے لوگوں کے سامنے پھر اُن سے پیٹھ پھیر لے تجاہل عارفانہ کے طور پہ۔ پھر دیکھ کہ وہ کس چیز کے ساتھ لوٹتے ہیں۔ کیا لوٹتے ہیں انکار کی طرف یا آتے ہیں میری طرف سر تسلیم خم کر کے۔ اور ڈرا اپنے قریبی رشتہ داروں کو اللہ اور اس کے رسولؐ کے ڈرانے کے ساتھ اور جھکا لے اپنے بازو تواضع کے ساتھ اُس کے لیے جو تیری پیروی کرے مومنین میں سے۔ پس اے خالص محمدیو میرے رب نے میری مدد فرمائی ہے روح الامین کی تائید کے ساتھ تاکہ میں اللہ تعالیٰ کی مدد اور اس کے رسول اکرمؐ کی عنایت سے ڈرانے والوں اور بشارت دینے والوں میں سے ہو جاؤں فصیح عربی زبان میں اور بے شک یہ ہدایت اور رحمت ہے مومنوں کے لیے اور بے شک میں نے توکل کیا ہے۔ اپنے رب پہ اور میں نے حوالے کر دیا اپنا معاملہ اس کے، اور اللہ متوکل لوگوں سے محبت کرتا ہے اور وہ ہدایت دیتا ہے جسے چاہتا ہے اور بنا دیتا ہے اسے خالص محمدیوں سے اور گمراہ کرتا ہے جسے چاہتا ہے طریقۂ محمدیہ کے انکار کی وجہ سے اور اسے بنا دیتا ہے نافرمانوں اور مجرموں میں سے، پس دیکھ لو کہ مجرمین کا انجام کیسا تھا۔ اور اُس نے مجھے شفقت اور نرمی سے کہا۔ ان پہ غمزدہ نہ ہو اور نہ ہی تنگ دل ان باتوں سے جو حیلے ساز کرتے ہیں۔ اس کے سوا نہیں کہ انھوں نے مکر کیا ہے منافقت کے ساتھ اور اللہ نے ان سے یہ چال چلی ہے کہ وہ اُنھیں ڈھیل دیتا ہے ان کی سرکشی میں اور اللہ بہترین چال چلنے والا ہے اور تو نہیں ہے ہدایت دینے والا اندھوں کو ان کی گمراہی سے۔ تم تو صرف انہی کو سنا سکتے ہو جو ایمان رکھتے ہیں ہماری آیات پر اور سر تسلیم خم کر دیتے ہیں۔ پس وہ لوگ جو آپ کی تصدیق کرتے ہیں۔ بے شک وہ ہماری آیات پہ ایمان رکھتے ہیں اور

وہ لوگ جو آپ کو جھٹلاتے ہیں جہالت کی وجہ سے پس جان لو کہ بے شک وہ لوگ ہماری آیات پر ایمان نہیں رکھتے ۔ یہ وہ چیز ہے جس سے میری تائید کی ہے میرے رب نے اپنی آیاتِ قرآنیہ کی مدد سے اور انکار کرنے والے ایمان نہیں رکھتے، یہاں تک کہ وہ جب آجائیں گے محشر میں ۔ اور اللہ تبارک تعالیٰ نے فرمایا کیا "تم جھٹلاتے ہو میری آیات کو حالانکہ تم علم کے لحاظ سے احاطہ نہیں کر پاتے"۔ پس قول ان پر مسلط ہو گیا اس وجہ سے جو اُنھوں نے ظلم کیا اور وہ بول نہیں پاتے اور اللہ مفسدین کو خوب جانتا ہے۔ اور بشارت دو ان لوگوں کو جو اللہ کی آیات کے ساتھ ایمان لائے اور اُنھوں نے خالص محمدی راستہ اختیار کیا کہ ان لوگوں کے لیے باغات ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں ان میں وہ ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے اور اللہ احسان کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں کرتا ۔ یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہیے، جس طرح حقیقتِ محمدیہ (ان پر خدا کا درود و سلام ہو) کا تقرر و تشخص تمام تقررات اور تشخصات سے اعلیٰ و ارفع ہے ۔ اسی طرح شرعِ دینِ محمدؐ بھی تمام شریعتوں سے برتر ہے اور باقی تمام شریعتیں بھی اس میں شامل ہیں ۔ اور محمدی طریقہ سب طریقوں سے بہترین اور تمام طریقوں پر محیط اور سب فرقوں پر حاوی ہے ۔ اے سرورِ کائناتؐ کے مخلص پیروکارو تم یہ آیت کریمہ پڑھو اور کہو کہ ہم ایمان رکھتے ہیں اللہ پر اور اُس پر جو ہمارے پاس بھیجا گیا اور اُس پر جو ابراہیمؑ، اسحٰقؑ، یعقوبؑ اور اولادِ یعقوبؑ کی طرف بھیجا گیا اور اُس پر بھی جو موسیٰؑ اور عیسیٰؑ اور دوسرے نبیوںؑ کو دیا گیا ان کے پروردگار کی طرف سے اس کیفیت سے کہ ہم ان میں سے کسی ایک میں بھی تفریق نہیں کرتے ۔ اور ہم تو اللہ ہی کے مطیع ہیں۔ پس اگر دوسرے بھی اسی طرح کا ایمان لے آئیں اور اپنے اندر محمدی جامعیت کا شرف پیدا کر لیں تو وہ بھی راہِ ہدایت پا گئے۔ اور محمدیوں میں داخل ہو گئے ۔ اور اس آیت کریمہ کے مصداق کہ اگر وہ بھی اسی طریق سے ایمان لے آویں جس طریق سے تم (اہل اسلام) ایمان لائے ہو تب وہ بھی راہِ حق پہ لگ جاویں گے اور خدا نہ کرے اگر وہ اس سیدھے راہ سے بھٹک جائیں اور الٹے رستے پر ہو لیں اور اپنی ہی مخالفت میں الجھ جائیں اور اتحاد اور اتفاق کی راہ اختیار نہ کریں تو پھر ان پر یہ آیت کریمہ صادق آئے گی کہ اگر وہ روگردانی کریں تو وہ لوگ تو ہمیشہ سے برسرِ مخالفت ہیں ہی۔ مومنین کا بیان مسلّم و شافی ہے ۔ اور ان کے لیے حق تعالیٰ کی حمایت ہی کافی ہے ۔ مصداق اس آیت کریمہ کے باقی ماندہ حصے کے کہ تمھاری طرف سے عنقریب ہی نمٹ لیں گے ان سے، اور اللہ تعالیٰ سنتے ہیں اور جانتے ہیں۔ اور جامعیت کا یہ رنگ

اللہ تعالیٰ کے رنگ کی آمیزش سے ہے - اور سارے مخلص مومن اور یہ آیت کریمہ شاہد ہے کہ ہم دین کی اس حالت پر رہیں گے جس میں ہم کو اللہ تعالیٰ نے رنگ دیا ہے اور دوسرا کون ہے جس کی رنگ دینے کی حالت اللہ تعالیٰ سے خوب تر ہو، اور اس لیے ہم اس کی غلامی اختیار کیے ہوئے ہیں[۵]۔ لیکن جن لوگوں نے اپنی انا کے شرک سے طریق محمدی میں خلل ڈال دیا - ان پر یہ بات گراں گزرتی ہے۔ اس بحر بیکراں میں خود کو فنا اور گم کردینا ان کے لیے سخت دشوار ہے - لہٰذا حقیقی اعتدال رکھنے والی اس جامعیت کا حاصل کرنا ان کے لیے مشکل ہوجاتا ہے۔ جس طرح کہ اللہ تعالیٰ نے خود قرآن میں خبر دی ہے کہ "اللہ تعالیٰ نے تم لوگوں کے واسطے وہی دین مقرر کیا ہے جس کا اُس نے نوحؑ کو حکم دیا تھا اور جس کو ہم نے آپ کے پاس وحی کے ذریعے سے بھیجا ہے اور جس کا ہم نے ابراہیمؑ اور موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کو (مع ان سب کے اتباع کے) حکم دیا تھا اور ان کی امم کو یہ کہا تھا کہ اسی دین کو قائم رکھنا اور اس میں تفرقہ نہ ڈالنا"[۴۶]۔ مشرکین کو وہ بات بڑی گراں گزرتی ہے جس کی طرف آپ ان کو بلا رہے ہیں - "اللہ اپنی طرف جس کو چاہے کھینچ لیتا ہے اور جو شخص خدا کی طرف رجوع کرے اس کو اپنے تک رسائی دے دیتا ہے"[۴۷]۔ اور بشارت ہے امتِ محمدیہ کے لیے کہ اُنھوں نے حق تعالیٰ کا بیان سُنا[۵] اور مبارک قول کی طرف مائل ہو کر طریق محمدی اختیار کیا -

یہ آیت کریمہ اسی بشارت کا واضح اشارہ ہے کہ میرے ان بندوں کو خوشخبری سنا دیجیے جو اس کلام الٰہی کو کان لگا کر سنتے ہیں پھر اس کی اچھی اچھی باتوں پر چلتے ہیں - یہی ہیں جن کو اللہ نے ہدایت کی اور یہی ہیں جو اہل عقل ہیں - پس ہر قسم کی تعریف اس اللہ کے لیے ہے جس نے نازل کی اپنے رسول[۵] پر کتاب اور کھولے ہمارے اوپر اپنے فیوض کے دروازے اور بے شک ہم ہی اس کے وارث ہیں اور پڑھتے ہیں ہم اس کی آیات کو اور وہ کھول دیتا ہے ان سے ہمارے سینوں کو، اور اُس نے بنا دیا ہمیں خالص محمدی اور اُسی کے لیے دین خالص ہے اور اُس نے ہمیں فضیلت دی ہے اپنے بہت سارے مومن بندوں پر، اور میں نہیں ہوں مگر بشر، یقین رکھنے والوں کے لیے میں بشر ہی ہوں اور اس کے سوا نہیں کہ نشانیاں اللہ کے ہاں ہیں اور اس کے سوا نہیں کہ میں تو اک کھُلم کھُلا ڈرانے والا ہوں، اور کہا میری قوم میں سے شک کرنے والوں نے کہ یہ تو نہیں ہے مگر ہمارے جیسا ایک بشر - چاہتا یہ ہے کہ ہم پر فضیلت حاصل کرلے، مگر اللہ چاہتا تو وہ ضرور نازل کرتا فرشتے - ہم نے نہیں سُنا اس کے بارے میں اپنے پہلے آبا و اجداد سے اور بعض نے کہا کہ یہ نہیں ہے مگر ایک آدمی جس پر جنون طاری ہے - پس اس کے بارے میں صبر کرو۔ ٹھہرو کچھ وقت

تک اور ان میں سے بعض نے بعض کو کہا، یہ ایک ایسا آدمی ہے جو کھاتا ہے جن چیزوں میں سے تم کھاتے ہو اور پیتا ہے انہی چیزوں میں سے جو تم پیتے ہو۔ پس اگر تم نے اس کی اطاعت کی تو تم ضرور ہو جاؤ گے نقصان اُٹھانے والوں میں سے، اور جب پڑھی جاتی ہیں ان پر اللہ کی آیات، وہ پلٹ جاتے ہیں اپنی ایڑیوں کے اوپر تکبر کرتے ہوئے۔ اور میں نہیں کہتا سوائے اس بات کے جس کا مجھے حکم دیا میرے رب نے اور بے شک اس نے مجھے اپنی رحمتِ خاصہ کے ساتھ مختص کیا۔ اور وہ رحم کرنے والوں میں سے سب سے بڑا رحم کرنے والا ہے۔ اور بے شک ڈالی ہیں اللہ تعالیٰ نے میرے دل پہ آئتیں جو کھول کھول کر بیان کرنے والی ہیں۔ اس کے باوجود کہ میں حافظ قرآن نہیں ہوں اور بیان کرتا ہے مثال ان لوگوں میں سے جو تم میں سے گزر چکے ہیں اور متقین کے لیے نصیحتیں کرتا ہے۔ پس ڈرو "اللہ" سے اور اطاعت کرو اس کی۔ میں اس پر کوئی اجر طلب نہیں کرتا۔ میرا اجر نہیں ہے مگر اللہ رب العالمین پر[۱۸]۔ اور جھٹلانے والوں نے کہا کہ ہمارے لیے تو برابر ہے، چاہے تو نصیحت کرے، چاہے نصیحت کرنے والوں میں سے نہ ہو[۱۹]۔ اور اُنھوں نے کہا کہ تو نہیں ہے اولیائے مقربین میں سے اور نہیں عطا کیا تمھیں علم میں سے مگر تھوڑا۔ اور تو نہیں ہے مگر ہمارے جیسا البشر۔ بے شک ہم تو تمھیں جھوٹوں میں سے ہی شمار کرتے ہیں۔ اور اولیا کے لیے تو کرامات و تصرفات ہوتے ہیں، پس گرا دے ہمارے اوپر آسمان کے ٹکڑے اگر تو سچوں میں سے ہے۔ پس قعرِ دوزخ ہے جھٹلانے والوں کے لیے، عنقریب دیکھ لیں گے کہ مفسدین کا کیا انجام ہوتا ہے۔ کیا یہ عقل نہیں رکھتے یہ تو اللہ کی آیات ہیں جو ان پر پڑھی جاتی ہیں اور یہ نہیں ہے مگر کتابِ مُبین (باتوں کو واضح کر دینے والی کتاب) اور یہ میرے ربّ کے فضل کی وجہ سے ہے اور وہ خاص کرتا ہے اپنے فضل سے اپنے یقین رکھنے والے بندوں میں سے[۲۰]۔ اور میں نہیں ہوں مگر خالص محمدیوں میں سے پہلے جن سب کے اوپر اللہ کی برکتیں اور اُس کا سلام ہے۔ اے رب رحم فرما اور بخش دے اور تو بہترین مدد کرنے والا ہے[۲۱]۔ اور جان لو کہ لوگ سب کے سب اپنی تخلیق کی اصل میں اور جبلّت کے آغاز میں مختلف استعدادوں والے ہیں اور متفاوت درجات والے ہیں۔ پس ان میں سے پاکیزہ و طاہر لوگ ہیں اور ان میں سے خبیث اور ناقص لوگ ہیں۔ ان میں سے فرمانبردار اور ڈرنے والے ہیں اور ان میں سے سرکش اور شقی القلب ہیں۔ ان میں سے کچھ تصدیق کرنے والے اور مہذب ہیں، اور ان میں سے کچھ جھٹلانے والے اور ایذا دینے والے ہیں اور ان میں سے کچھ اقرار کرنے والے ہیں اور کچھ انکار کرنے والے ہیں۔ ان میں سے کچھ ایماندار

ہیں کچھ کافر ہیں۔ کچھ موافقت کرنے والے ہیں، کچھ منافق ہیں۔ ان میں سے بعض صالح ہیں اور بعض بدکار ہیں۔ بعض مصلح ہیں اور بعض مفسد۔ اسی طرح مختلف اقسام اور کثیر التعداد انواع ہیں۔ ان کی تعداد ان گنت اور بے شمار ہے۔ نہ ان کے افراد کی تعداد کا احاطہ کیا جاسکتا ہے، پس مختلف طریقوں والے تھے اور کثیر تعداد والے تھے۔ پس ہم بیان کرتے ہیں ان سب کو اور معین کرتے ہوئے ان میں سے بڑے بڑوں کو تفسیر کرتے ہوئے آیاتِ قرآنی کی اور بنی نوع انسان کے تمام افراد کا احاطہ کرتے ہوئے۔

استعدادات کی نسبت سے چار قسمیں

وہ لوگ جنھیں فطرت کے ساتھ مناسبت تامہ ہے، ہدایت کے مقام پر اور ظاہر اور باطن کے درمیان جمع ہونے کے مقام پر، فضیلت اور عنایت کے ساتھ ایمان رکھتے ہیں اللہ پر ظاہراً اور باطناً۔ اور روشن ہوتا ہے ان پر اس کا نام 'مومن' (اسم الٰہی)، اور انہی کے لیے ہے دین خالص اور حقیقتاً یہی لوگ مومن ہیں۔ ان کے لیے گمراہی کا کوئی رستہ نہیں، اور نہ انکار کی طرف۔ اور جسے ہدایت دے اللہ پس اُسے کوئی گمراہ کرنے والا نہیں[۵]۔ (۲) اور وہ لوگ جن کو ناقص مناسبت ہوتی ہے ایمان کے ساتھ۔ غالب آجاتا ہے ان پر کفر ظاہراً ایمان کی کمزوری کی وجہ سے۔ وہ چھپاتے ہیں اپنے ایمان کو اور اُس کے اظہار کی قدرت نہیں رکھتے اور اُنھیں اسلام کے شرف سے مشرف نہیں کیا جاتا۔ اور وہ شمار ہوتے ہیں کمزور مومنین میں لیکن ان کا کوئی اسلام نہیں ہوتا جیسے خدائے عزوجل نے فرمایا۔ ایک ایماندار آدمی آلِ فرعون میں سے چھپاتا ہے اپنا ایمان، اور ثابت ہوگیا اُس کے لیے ایمان باوجود اس کے کہ وہ مسلمین میں سے نہیں تھا[۶]۔ اور یہاں ایک نکتہ ہے کہ گویا وہ منافقین میں سے تھا فرعون کی جماعت میں جیسا کہ اسلام کے منافق کفار میں شمار کیے جاتے ہیں۔ اور نہ روکا گمان کیا جاتا اُس کا ان میں سے اسلام کے احکام نے جو اُس سے ظاہر ہوتے تھے اور نبی کریم صلعم کے حکم نے کہ اُن کے حالات کو خفیہ رکھا جائے۔ اور نہ مانع ہوا اسلام کے احکام کا جاری ہونا ان سے ظاہراً، اور حکم دیا نبی کریم نے ان کے حال چھپانے کا۔ گمان کیا اُسے مومنین میں سے اور نہ متوجہ ہوئے اس کے ظاہر کی طرف اور اُس نے چھپایا اپنا حال کفار سے اور ظاہر کردیا اپنا ایمان مسلمانوں پر۔ کیونکہ دھوکا دے دیا فرعون اور اس کی آل کو حالانکہ وہ ان میں سے نہیں تھا۔ پس کفر کے ساتھ کفر کرنا ایمان میں سے ہے۔ جس طرح کہ ایمان کرنا کفر کے ساتھ کفر میں سے ہے۔

(۳) وہ لوگ جن کو ہدایت کے ساتھ اصلاً کوئی مناسبت ہی نہیں ہوتی۔ نہ ایمان رکھتے ہیں، اور نہ مطلق ہدایت پاتے ہیں اور وہ دن رات گمراہی کی طرف جاتے ہیں اللہ کے گمراہ کرنے کی وجہ سے۔ آگاہ رہو کہ یہی لوگ کافر ہیں۔ جسے اللہ گمراہ کردے، اس کے لیے ہدایت دینے والا کوئی نہیں۔[۵] (۴) اور وہ لوگ جنھیں جہالت کے ساتھ بڑی قوی نسبت ہوتی ہے اور حقیقت کو پالینے کی بھی کسی حد تک مناسبت ہوتی ہے اور اُسے کما حقہٗ پاتے نہیں جیسے کہ مومنین پالیتے ہیں جو کہ عارف ہوتے ہیں تاکہ وہ حاصل کرسکیں اطمینان اپنے لیے اور اُسے مطلق چھوڑتے بھی نہیں ہیں جیسے کہ کافر جو بالکل جاہل ہوتے ہیں تاکہ ان کی سرکشی مکمل ہوجائے پس ہوتا ہے ان کے لیے تذبذب اور شک اور وہ ہوتے ہیں متردد اور متذبذب اس کے درمیان۔ نہ اِن سب کی طرف ہوتے ہیں اور نہ اُن سب کی طرف ہوتے ہیں۔ ان کے لیے سخت عذاب ہے ان کے ظاہر اور باطن میں اختلاف کی وجہ سے، اور وہ خبیث ترین منافق ہیں کافروں میں سے پڑھتے ہیں زبان سے پیروی کرتے ہوئے عارف لوگوں کی اور دل سے ایمان نہیں لاتے جیسے کہ اولیا ہوتے ہیں۔ پس نہیں فائدہ دیتا اُنھیں فقط زبان کا اقرار۔ اور لوگوں میں سے ایسے بھی ہوتے ہیں جو سمجھتے ہیں کہ ہم ایمان لائے اللہ پر اور آخرت کے دن پر اور وہ ایمان لانے والے نہیں ہیں۔ وہ گمان کرتے ہیں کہ وہ دھوکا دے رہے ہیں اللہ کو اور ان لوگوں کو جو ایمان لائے حالانکہ وہ دھوکا نہیں دیتے مگر اپنے آپ کو اور اس بات کا اُنھیں شعور نہیں ہے[۵] کہ ان کا دھوکا دینا اللہ کو اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ دھوکا دے رہے ہیں اپنے آپ کو، بلکہ اللہ ہی ان کو دھوکا دے رہا ہے۔ پس واقع ہوا دھوکا دینا دونوں جانب سے ایک ہی فعل۔ اُنھوں نے تو دھوکا دیا اللہ کو اپنے گمان میں حالانکہ واقعتاً اللہ نے ان کو دھوکا دیا۔ اُنھوں نے بھی مکر کیا اور اللہ نے بھی مکر کیا اور اللہ تعالیٰ ہی بہترین مکر کرنے والا ہے۔[۵] اور جان لو کہ دھوکا اور کذب اور خلوص اور صدق ایسے عوارض اور صفات میں سے ہیں جن سے انسان کا نفس متصف کیا جاتا ہے۔ پس جس نے دھوکا دیا اور جھوٹ بولا، وہی دھوکا دینے والا اور جھوٹا ہے اس کے علاوہ اور کوئی نہیں۔ جس نے خلوص اختیار کیا اور سچ بولا پس وہ صادق اور خالص ہے، لہٰذا نہیں پہنچتا ان کا ضرر اور نفع مگر اُس کے صاحب کو۔ پس اہل دھوکا اور اہل نفاق نہیں دھوکا دیتے مگر اپنے ہی نفسوں کو۔

سب لوگوں کے لیے اعمال کا محاسبہ

پس دیکھنا چاہیے دیکھنے والے کو تحقیق اور دِقت کی نگاہ سے کہ وہ ان چار مذکورہ قسموں میں سے کس قسم میں سے ہے، اور کونسی صورت ان مقسوم صورتوں میں سے اس کے احوال اور اعمال سے مطابقت رکھتی ہے۔ اگر مطابقت رکھتا ہے اُس کا ظاہر اور باطن سچے مومنین کے ساتھ اور موافقت رکھتی ہے اس کی پوشیدہ اور ظاہری کیفیت خالص محمدیوں کے ساتھ اور اس نے بیعت کر لی ہے اپنے دل کے ساتھ ان کے سرداروں سے پیروی کرتے ہوئے اللہ اور اُس کے رسولؐ کی اور اُس نے پیروی کی کلی طور پر ان کے حالات کی اللہ کی تائید اور حُسنِ قبول کے ساتھ اور پایا اُس نے اپنے آپ کو ان کے صادق اماموں اور اُن کے کلام کے قارئین میں۔ پس اُسے شکر ادا کرنا چاہیے اللہ مومن السلام کا جس نے اُسے مشرف کیا ایمان کے ساتھ اور اسلام کے ساتھ۔ اور شکر اُسے ضرور فائدہ دے گا کیونکہ جو اس کا شکر ادا کرتا ہے پس وہ اسے زیادہ کرتا ہے، اور اس کا وعدہ کتاب میں لکھا ہوا ہے اور وہ اپنے اہل و عیال میں خوش ہے اور اُسے یہ پڑھنا چاہیے۔ الٓمٓ ۔ یہ وہ کتاب ہے جس میں کوئی شبہ نہیں۔ ہدایت ہے متقین کے لیے جو ایمان رکھتے ہیں غیب پر اور قائم رکھتے ہیں نماز اور اُس میں سے خرچ کرتے ہیں جو ہم نے ان کو دیا اور وہ لوگ جو ایمان رکھتے ہیں اس پر جو نازل کیا گیا ہے اسے نبیؐ تم پر، اور نازل کیا گیا تم سے پہلے، اور آخرت پر یقین رکھتے ہیں اور یہی لوگ ہیں ہدایت پر اپنے رب کی طرف سے اور یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔ اور جان لیں وہ لوگ جو بیعت کرتے ہیں ان نائبین کی کہ اس کے سوا نہیں کہ وہ بیعت کر رہے ہیں اُن کے اُس منیب کی جس کے حق میں وہ بیعت ہیں۔ وہ لوگ جو تمھاری بیعت کرتے ہیں، اے نبیؐ وہ بے شک بیعت کرتے ہیں اللہ کی۔ اللہ کا ہاتھ اُن کے ہاتھ کے اوپر ہے۔ اور جو جس عہد کو توڑتا ہے وہ اپنے نفس ہی سے زیادتی کرتا ہے۔ اور جس نے پورا کیا اُس بات کو جس بات کا اُس نے اللہ سے عہد کیا تو اللہ اُسے عظیم اجر دے گا۔ اور وہ لوگ جو پیروی کرتے ہیں ان پیروی کرنے والوں کی تو بے شک وہ پیروی کرتے ہیں ان کے متبوع کی۔ جس کی شان میں یہ ہے، جو رسولؐ کی اطاعت کرتا ہے پس اُس نے اللہ کی اطاعت کی۔ وہ تائید ہے اللہ کے لیے ان کے اتباع سے پہلے۔ پس جو کوئی رکتا ہے اس سے تو وہ رکتا ہے اپنے ہی حق سے۔ اور جس نے اختلاف کیا اُس سے جس پر اللہ نے اُس سے عہد

لیا تھا تو اللہ اُسے بڑے دردناک عذاب کا بدلہ دے گا۔ اور اگر مطابقت رکھے اُس کا حال ان مومنین سے جو کمزور ہیں ایمان میں پوشیدہ اور چھپا کر رکھنے کی وجہ سے اور وہ قدرت نہیں رکھتا اپنے اعتقاد کے اظہار کی اپنی استعداد کی کمزوری کی وجہ سے اور وہ توفیق نہیں پاتا اپنے ارادے اور اسلام کے اعلان کی بعض عوارض اور موانع کی وجہ سے۔ ایمان کامل کے ساتھ مناسبت میں نقص کی وجہ سے تو اُسے چاہیے کہ وہ اللہ کی پناہ مانگے اور اُس سے مدد چاہے ہر وقت اور باطنی اشغال میں مشغول رہے اور یقین کو زیادہ کرے اور شک و انکار کے راستے کو بند کرے اور اقرار کے دروازے کو کھولے تاکہ اُس کے ایمان کے ساتھ ایمان کی اور زیادتی ہو اور وہ نکلے اپنی نقصان کی حالت سے شاید کہ اللہ اُسے نیک اعمال عطا فرمادے ظاہراً بھی اُس کے باطن کی برکت سے اور اُسے داخل کرے اپنی حمایت میں کیونکہ اللہ تعالیٰ نہیں دیکھتا یعنی نہیں متوجہ ہوتا صورتوں اور اعمال کی طرف، بلکہ وہ دیکھتا ہے دلوں اور نیتوں کی طرف۔ اور اگر مطابقت رکھے اُس کا حال کافرین سے جن کو ہدایت سے اصلاً کچھ بھی مناسبت نہیں ہوتی اور قرار پکڑ جاتا ہے اُس کے اندر انکار اور مخالفت تو اس کے نصیب میں تو مطلقاً کوئی ہدایت نہیں، اور شبہات اور تردداتِ اس سے زائل نہیں ہوتے اور وہ شامل ہوتا ہے اس قوم میں جن کے لیے برابر ہے کہ تو اُنھیں ڈرائے یا نہ ڈرائے وہ ایمان لانے کے نہیں۔ اللہ نے ان کے دلوں پر مہر لگا دی ہے جہالت کی وجہ سے اور کانوں پر انکار کی وجہ سے اور بصیرت پر پردہ پڑا ہے خواص کو عوام کے ساتھ امورِ معاش میں مشترک دیکھنے کی وجہ سے۔ کیونکہ وہ گمان کرتے ہیں خواص کو اسی شراکت کی وجہ سے اپنے جیسا اور کہتے ہیں یہ کہ اس رسول کو کیا ہو گیا کہ کھاتا ہے کھانا اور چلتا پھرتا ہے بازاروں میں، اور وہ یہ سمجھ ہی نہیں پاتے کہ یہ شراکت تو ظاہری صورت میں ہے ان کے فائدے کے لیے اور ان کی ہدایت کے لیے، حقیقت یہ بات نہیں ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو نہ باقی رہتا عوام اور خواص میں فرق اور اُس چیز میں جس سے ممتاز ہوتے ہیں خواص عوام سے۔ اگر ہو جاتی حاصل مناسبت فائدہ دینے والی اور فائدہ لینے والی، چاہے ظاہراً ہوتی تو بہت قوی اثر ہوتا۔ اس لیے شریک کر دیا اللہ نے اپنے خواص بندوں کو اپنے عوام کے ساتھ ان امور میں لیکن منکرین اس بات کو نہیں جانتے۔ ان کے لیے بڑا عذاب ہے جھٹلانے کی وجہ سے اللہ کے ان بندوں کو جنھیں اللہ نے چن لیا دنیا اور آخرت میں۔ پس وہ نہیں کافروں سے کلام کرتے قطعاً اور نہ ہی جواب دیتے ہیں جاہلین کو سوائے سلام کے۔ اور اُنھیں حکم دیا گیا ان کے ساتھ جنگ کرنے کا کیونکہ وہ ان سے جنگ

کرتے ہیں نہ کہ قیل وقال کا کیونکہ اس کو وہ قبول نہیں کرتے۔ (۴) اور اگر مطابقت رکھتی ہو اس کی حالت متردد منافقین سے جو زبان سے تو پڑھتے ہیں لیکن دل سے انکار کرتے ہیں تو اُسے اللہ سے بخشش مانگنا چاہیے اور کوشش کرنی چاہیے شبہات اور خیالات کو دور کرنے کی، چاہیے کہ دُور کر دے نفاق کو اپنے آپ سے اور مہذب کرے اخلاق کو۔ اگر اُسے مضبوط اعتقاد حاصل ہو گیا تو اُسے شکر کرنا چاہیے اس پر کیونکہ جُس نے توبہ کی اور اصلاح کی اور مضبوطی سے تھام لیا اللہ کو اور خالص کر لیا اپنے دین کو اللہ کے لیے پس یہی لوگ مومنین کے ساتھ ہوں گے اور عنقریب اللہ تعالیٰ مومنین کو اجر عظیم عطا کرے گا۔ اور کیا کرے گا اللہ تعالیٰ تمھیں عذاب دے کر اگر تم شکر گزار ہو اور ایمان لے آؤ اور اللہ تعالیٰ شکر کو قبول کرنے والا اور علیم ہے اور اگر ایسا نہیں تو بے شک منافقین آگ کے سب سے گہرے کھڈے میں ہوں گے (نیچے والے) اور وہ کفار میں سے سب سے زیادہ بُرے ہیں۔" [۵۷]

منافقوں کا حال اور مخالفین کا انجام

ان کے دلوں میں مرض ہے پس اللہ تعالیٰ نے ان کے مرض کو زیادہ کر دیا اور ان کے لیے عذاب عظیم ہے۔ اس وجہ سے جو وہ جھٹلاتے تھے [۵] یعنی ان کے دلوں میں غفلت و جہالت کا مرض ہے جو امراض کی جڑ ہے اور مرض لاحق نہیں ہوتا مگر تندرست کو اور ہر ایک اُن میں سے پہلے ٹھیک ٹھاک تھا کیونکہ ہر پیدا ہونے والا پیدا کیا جاتا ہے [۵] فطرت اسلام پر جو کہ سلامتی سے ماخوذ ہے۔ پس وہ ٹھیک ٹھاک تھے۔ ایمان لانے والے تھے اپنے رب پر اصلاً۔ انھوں نے جواب دیا تھا لفظ "بلیٰ" سے "الستُ بربّکم" کے جواب میں انھوں نے ہاں (مثبت) جواب دیا تھا۔ پس اس وقت واقع ہوا محجوبین کے لیے مرض جہالت کا اور ان اعتبارات سے تعلق جوڑنے کا جو کہ ہیں باطل معبود دلیلوں سے اور اپنے ارادے سے۔ جس سے اللہ نے زیادہ کر دیا ان کو مرض کے لحاظ سے جس طرح کہ اللہ زیادہ کرتا ہے مومنین کو صحت کے لحاظ سے۔ کیونکہ کھانے والی چیز میں سے جو نفع دیتی ہے ایک تندرست آدمی کو اور طاقت دیتی ہے، وہ ضرر پہنچاتی ہے مریض کو اور اُس کی قوت کو زائل کر دیتی ہے۔ پس ایک ہی چیز جو مومنوں کے لیے شفا ہے وہ کافروں کے لیے بیماری ہے، اور ان کے لیے عذاب الیم ہے اس وجہ سے جو وہ جھٹلاتے ہیں اور وہ ہے اللہ تعالیٰ کی توحید۔ اور اُس کے رسول صلعم کی حقیقت کا انکار اور نہ تصدیق

کرنا نبیؐ کے نائبوں کا جو خالص محمدیوں میں سے ہیں قیامت کے دن تک ۔ اور الم یہ ہے منافر کا پانا کیونکہ وہ منافر ہے ، اور منافر الشئ اُسے کہتے ہیں جو موافقت رکھنے والی چیز کے مقابلے میں آئے ۔ اور حیثیت کو مقید یا معین کرنے کا فائدہ بچنے کے لیے منافی چیز کو پانے سے ۔ اس کے منافات کی وجہ سے نہیں کیونکہ یہ الم (تکلیف) نہیں ہے ۔ پس تکلیف دی منافقین کو دُنیا میں ان کے دلوں کو جلا کر ان چیزوں کی وجہ سے جو اُن سے ضائع ہوگئیں حکمرانی میں سے اور اُسی حسد کی وجہ سے ان چیزوں پر جو وہ دیکھتے تھے نبی اکرم صلعم کے حکم میں ثابت ہوتے ہیں ۔ اور ان کی شان و شوکت کے چھا جانے کی وجہ سے روز بروز آج کے دن تک اور آخرت میں اللہ کی وحدانیت کے قائم ہو جانے کی وجہ سے اور اُس کے رسولؐ کی حقیقت کی وجہ سے اور محمدیین کے شرف کی وجہ سے ، ان کے حسن قول کے سبب اور اُن کے ہاں ان کی اس بات کو جھٹلانے کی تحقیق کے ساتھ کہ آخرت جو ہے وہی حساب کا دن ہے ، اور وہ دُنیا میں دین سے بھاگنے والے تھے اور جب اُن سے کہا جاتا تھا کہ زمین میں فساد پیدا نہ کرو تو وہ کہتے تھے کہ ہم تو اصلاح کرنے والے ہیں ۔ سُن رکھو اور آگاہ رہو کہ یہ لوگ ہی فساد کرنے والے ہیں ، لیکن اس کا انھیں شعور نہیں ہے ۔ اور فساد جو ہے وہ صورت کو مادے سے زائل کر دیتا ہے اس کے بعد کہ وہ حاصل ہو جائے اور فقہا کے نزدیک وہ چیز جو اصلاً مشروع نہ ہو (غیر مشروع ہو) اور امام شافعی کے نزدیک بطلان کے مترادف ہے اور تیسری قسم مبائن (مغائر) ہے صحت اور بطلان کے لیے امام ابوحنیفہ کے نزدیک (خدا ان دونوں پر رحم کرے) اور حق یہ ہے کہ اس کے اندر دونوں معنی پائے جاتے ہیں ۔ جیسے نقاہت کی حالت مرض کے اندر داخل ہوتی ہے ۔ بعض کے نزدیک اور تیسری حالت صحت اور مرض کے درمیان بعض کے نزدیک ۔ پس بہتر یہ ہے کہ کہا جائے کہ جب فساد قوی ہوتا ہے تو وہ بطلان ہے اور جب متوسط ہو تو یہ تیسری قسم ہے جو صحت اور بطلان کے درمیان ہے ۔ اور جب ضعیف ہو تو وہ صحت کے اندر داخل ہے ۔ جب منافقین سے کہا جاتا ہے کہ ان کا قول تو توحید ہے مگر حال الحاد ہے ۔ تنبیہ کرتے ہوئے اور ہدایت دیتے ہوئے کہ زمین میں فساد نہ پھیلاؤ جہالت کے فساد کے ساتھ جو کہ آج تم میں موجود ہے ۔ اور تم اصلاً اللہ تعالیٰ کی وحدت پر ایمان لانے والے تھے اور تم پیدا کیے گئے تھے فطرت اسلام پر ۔ لیکن آج وہ قبول نہیں کرتے ہدایت ان کی اس سبب سے کہ ان کی انانیت نے اُنھیں گمراہ کر دیا ہے ۔ اور وہ کہتے ہیں کہ ہم تو اصلاح کرنے والے ہیں ۔ خبردار وہی فساد پھیلانے والے ہیں ، گمراہ

کرنے والے اسم کی طرف دعوت کے ساتھ جس سے کہ گمراہ کرتا ہے جسے چاہتا ہے اس کے بندوں میں سے۔ اے اللہ میں تیری پناہ میں آتا ہوں تجھ ہی سے۔ لیکن منافقین کو شعور نہیں ہے اور نہ وہ سمجھتے ہیں اس امر کے راز کو اور مائل ہوتے ہیں نفسانی خواہشات کی طرف اور اسی میں ہلاک ہوتے ہیں۔ اور جب ان سے کہا جاتا ہے بار بار تاکید کے ساتھ اور ظاہر کرتے ہوئے رحمت کو عالمین پر کہ ایمان لے آؤ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر اور جان لو کہ وہ حاظر و ناظر ہے، اور خالی کرلو اپنے دلوں کو شہوات کے خیالات سے جس طرح کہ ایمان لے آئے لوگوں میں سے عارف لوگ خالص ایمان اللہ پر تو انھوں نے کہا کیا ہم ایمان لے آئیں جیسے کہ بے وقوف ایمان لے آئے اس چیز پر جو نظر بھی نہیں آتی اور جس کا مطلقاً ادراک بھی نہیں کیا جاسکتا۔ آگاہ رہو کہ وہی بے وقوف ہیں، کیونکہ وجود مدرک اوّل ہے اور جو موجودات ہیں اسی کی مدد سے ان کا ادراک ہوتا ہے اور عارف لوگ اس کی بداہت کے قائل ہیں جس طرح کہ نور جو ہے مبصّر اول ہے اور دوسری نظر آنے والی چیزیں اسی کے سبب سے نظر آنے والی ہیں، لیکن غافل لوگ نہیں جانتے اور منافق جب ملتے ہیں ان لوگوں سے جو ایمان لائے ہیں اور جن کو یقین ہے تو وہ ان کی پیروی کرتے ہیں ظاہراً ان کی سچائی کے غلبے کی وجہ سے اور وہ کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے اور جب وہ خلوت میں ہوتے ہیں اپنے شیاطین کے ساتھ اور حال یہ ہے کہ اُس وقت وہ تذبذب میں ہوتے ہیں توحید کے بارے میں اور حقیقت کے ادراک سے قاصر ہوتے ہیں تو کہتے ہیں بے شک ہم تمھارے ساتھ تھے، ہم تو ٹھٹھول کر رہے تھے اور وہ بات کو نہیں سمجھتے۔ اس کے سوا نہیں کہ ان کا جو ٹھٹھہ کرنا ہے وہ تو اللہ تعالیٰ کا ٹھٹھہ کرنا ہے اور اللہ اُن سے ٹھٹھہ کرتا ہے۔ (وَاللّٰهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ) کو دیکھیے یہاں 'بہم' میں بائی (ب) ظرفیہ ہے یعنی اللہ تعالیٰ اس بارے میں اُن سے ٹھٹھہ کرتا ہے جیسے کہ اللہ تعالیٰ ان کو دھوکا دیتا ہے ان کے دھوکے کے ساتھ۔ اور اللہ تعالیٰ ان کو ڈھیل دیتا ہے اور اپنی سرکشی میں وہ اندھوں کی طرح بھٹکتے چلے جاتے ہیں اور اپنے معاملے میں تذبذب اور تحیّر میں ہیں۔ یہی لوگ ہیں جنھوں نے خرید لی ہے گمراہی ہدایت کے بدلے میں۔ پس نہ فائدہ دیا ان کی تجارت نے اُنھیں اور نہ وہ ہدایت پانے والے ہیں۔ ان کی مثال اُس شخص کی سی ہے جس نے آگ جلائی۔ پس جب روشن ہوگیا سب کچھ جو اس کے گرد تھا تو اللہ نے ان کا نور بصیرت سلب کرلیا اور اُنھیں چھوڑ دیا تاریکیوں میں کہ وہ دیکھ نہیں پاتے بہرے ہیں گونگے ہیں، اندھے ہیں۔ پس وہ لوٹنے والے نہیں۔ یعنی وہ لوگ جو ایمان نہیں لائے اللہ پر

اور اُسے نہیں دیکھا اُس کی آیات باہرہ اور مظاہر ظاہرہ ہیں۔ اُنھوں نے خرید لی گمراہی جو کہ اعتبارات سے چمٹنا ہے ہدایت کے بدلے میں جو کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے وجود کو فیض پہنچتا ہے۔ پس اُنھیں فائدہ نہ دیا ان کی تجارت نے اور وہ نقصان اُٹھانے والوں میں سے ہیں، اور وہ فائدہ پانے والوں میں سے نہیں ہیں۔ پس ان کی مثال اس شخص کی طرح ہے جس نے آگ جلائی، اور آگ جلانے سے مراد نور وجود کا مظاہر امکانیہ میں ظاہر ہوتا ہے گویا کہ وہ ان مظاہر سے پہلے کثافت میں تھے جو نازل ہوتے ہیں اس کی لطافت سے۔ پس وہ آگ بن گئی۔ پس جب روشن ہو گئی وہ چیز جو اس کے ارد گرد تھی حقائق ممکنہ سے تو اُس نے دیکھا جو کچھ کہ اس کے ارد گرد تھا، اور غافلوں نے یہ گمان کیا کہ روشنی ان کے نفوس کے نور سے ہے، اور یہ کہ وہ خود مستقل طور پر موجود ہیں۔ اور بھڑک اُٹھی ان کی انانیت کی آگ پس اللہ تعالیٰ لے گیا ان کے نورِ موہوم کو موت کے ذریعے اور زائل کر دیا اُن سے ان کے علم کی روشنی کو اور چھوڑ دیا اُنھیں عدم کے ظلمات میں جو کہ اس سے پہلے ان کے نصیب کا حصّہ تھیں۔ پس اب وہ نہیں دیکھتے کچھ بھی بلکہ سلب کر لیا اللہ تعالیٰ نے تمام کمالاتِ وجودیہ کو، اور وہ بہرے گونگے اندھے ہیں۔ اور اب وہ نہیں لوٹنے کے ان کی طرف اس کے بعد غفلت کے راستے کی وجہ سے اور حاصل ہو گیا ان کے لیے (یوم دین) اور وہ ایمان رکھتے ہیں یوم دین پر اس وقت لیکن نہیں فائدہ دیتا اُنھیں آج کے دن اُن کا ایمان کیونکہ آخرت دار الجزا ہے، نہ کہ دار العمل اور دار الکسب۔ پس کہتا ہے کافر افسوس کے ساتھ اپنی حالت پر۔ اے کاش میں دُنیا میں مٹی ہوتا، مردہ ہوتا اور اپنے علم کے معاملے میں بھی اضافات سے محروم ہوتا کیونکہ طاقت و قوت نہیں تھی مگر اللہ بلند و عظیم کے پاس۔ اے ہمارے رب نہ ٹیڑھے کر ہمارے دلوں کو غفلت اور جہالت کے ساتھ، اس کے بعد کہ تو نے ہمیں ہدایت دی ایمان اور عرفان کے ساتھ اور عطا فرما ہمیں اپنی جناب سے خاص رحمت جو اصلاح کرنے والی ہو ظاہر کی بھی اور باطن کی بھی کیونکہ تو ہی عطا فرمانے والا ہے اور تیری طرف ہی لوٹنا ہے۔

اصل کل کی حقیقت، راستوں پر چلنے کی کیفیت
فضل و تائید کے ساتھ توحید کا حاصل کرنا

جان لو حقیقت خدائے واحد کی طرف نگاہ ڈالنے کی۔ جس کے لیے ہے جو کچھ آسمانوں اور

زمین میں ہے۔ حقیقتاً ہر فریق اسی کا فریق ہے، اور ہر طریقہ اسی کا طریقہ ہے، اور ہر دلیل اس کی دلیل ہے اور ہر راستہ اسی کا راستہ ہے، اور ہر متحرک چیز اللہ علیم وحکیم کی تحریک سے حرکت میں ہے۔ اور نہیں کوئی زمین پر رینگنے والا، مگر یہ کہ اللہ اُسے اُس کی پیشانی سے پکڑنے والا ہے۔ [۴۷] بے شک میرا رب صراطِ مستقیم پر ہے۔ اور زمین پر چلنے والے ہر قسم کے جانور چلتے ہیں صراطِ مستقیم پر کیونکہ رب وہی ہے جو لانے والا ہے صراطِ مستقیم پر۔ پس صراط جو ہے یہ وجود کا راستہ ہے اور واجب ممکنات کو اپنی طرف کھینچتا ہے اور وہ فطرت جس پہ مولود کو پیدا کیا گیا ہے، وہ فطرتِ اسلام ہے۔ اور یہی فطرت اس وجود کے حق میں اس کا رستہ ہے، اور ہر موجود پیدا کیا جاتا ہے فطرت اسلام پر پھر اس کے والدین اسے یہودی بنا دیتے ہیں یا نصرانی بنا دیتے ہیں یا مجوسی بنا دیتے ہیں [۵] یہ دوتوں حیثیتیں غیریت اور اثنیانیت اس موجود کے لیے والدین کی طرح ہیں۔ وہ پیدا ہوا اور ظاہر ہوا ان دونسبتوں کے ساتھ اور ظاہری دو والدین بھی داخل ہیں ان دونوں میں جو انہیں ہٹاتے ہیں تعلق اعتبارات سے پیدا ہونے والے شرک اور کفر کی طرف وحدت الٰہیہ سے جو کہ فطرتِ اسلام ہے، اور جو چلا اپنی زندگی میں توحید کے راستے پر فضل و تائید کے ساتھ اور اعتبارات سے نہ چھٹا، اور اُسے نہ ہٹا پائیں ہٹانے والی چیزیں، تاکہ یہ اُسے بڑھائیں اعتبار کے مشاہدے میں یوں اور وہ نہیں شریک ٹھہراتا اپنے رب کے ساتھ کسی کو بھی، تو وہ انشاء اللہ تعالیٰ چلے گا اس راستے پر جس کا قیامت کے دن وعدہ کیا گیا ہے۔

جیسے بادل چلتا ہے اور اچکنے والی بجلی چلتی ہے اور نہیں نقصان پہنچائے گا اُسے جہنم کا ضرر اور آگ، کیونکہ اُس کا ایمان اُس کی حرارت کو بجھا دے گا اور وہ پہنچے گا جنت کی طرف کہ نہیں نکلتا اس سے اس کے رہنے والوں نے کبھی بھی۔ اور وہ اس میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔ پس مضبوطی سے تھامے رہو اللہ کی رسّی کو۔ وجود واحد کی رسی جس نے اپنے اندر حقائق کو جمع کر رکھا ہے۔ اس میں تفرقہ نہ ڈالو [۵] اور بنایا ان حقائق کو علم میں موجود چاہے خارجی تھے یا ذہنی۔ کیونکہ خارج بھی وہ چیز ہے جو نہیں ظاہر ہوتی مگر علم کے آئینے میں۔ پس ماہیت کلی جو کہ بلا تشخص ہوتی ہے وہ ذہنی طور پر موجود ہوتی ہے اور اگر تشخص کے ساتھ ہو تو وہ موجود ہوتی ہے خارجی طور پر، اور یہ دونوں موجودات علمیہ ہیں۔ موجود ہیں جنھیں کہ اللہ قیوم نے مضبوط کیا ہے اپنی مضبوطی کے ساتھ۔ پس تم پر لازم ہے کہ تم مضبوطی سے تھام لو اس کے وجود کی رسی کو اور اس کے نور شہود میں محو ہو جاؤ۔ اور اعتبارات موہومہ کے فرقوں میں

نہ بٹ جاؤ اور ماہیات معدومہ کے امتیازات میں ٹکڑے ٹکڑے نہ ہوجاؤ۔ اور یاد کرو اللہ کی نعمتوں کو اپنے اوپر اور اس کا شکر کرو اس کی نعمت پر۔ یہ نعمت وجودیت کا غلبہ ہے۔ وہی تجھے وجود میں لایا اور اُس نے تمھیں سوار کیا۔ وجود اور عدم کے دو متضاد آثار پر اور نفس مجردہ کو جسم مادی کا قرین بنادیا اور بنایا تیرے بدن کو عناصر متخالف کے ساتھ۔ جب کہ تم تھے دشمن۔ پس تم میں اور تمھارے دلوں میں رفعت پیدا کردی تمھارے اجزا کی طبیعت میں اپنی محبت اور اپنی وحدت سے۔ پس تم ہوگئے اس کی نعمت سے بھائی بھائی باہم محبت کرتے والے، اور جمع ہونے والے اللہ سبحانہٗ کے جمع کرنے سے۔ ایک طے شدہ اجل تک جو کہ یوم فرار ہے اللہ کی طرف۔ پس بھاگو اللہ کی طرف اور مرنے سے پہلے مرجاؤ۔ نہیں ہے فرار یعنی بھاگنا مگر اسی کی طرف اور نہیں ہے قرار گاہ مگر اُسی کے ہاں۔

تمام ہادیوں کا تمام لوگوں کو عموماً اور خصوصاً ہدایت دینا اور دعوت دینا عارفین کا ہر ایک کو اہل شرک اور خلوص کی حقیقت کے جاننے کے ساتھ

جان لو کہ حقیقی ہادی کی ہدایت ظاہر ہوتی ہے اپنے مظاہر میں اور وہ بھیجے ہوئے انبیاؑ ہیں اور اولیائے کرام ہیں جن کی طرف رجوع کیا جاتا ہے۔ تم یہ چاہتے ہو کہ اللہ تم کو ہدایت پانے والا بنائے اور سب کو ہدایت دے، لیکن اللہ تعالیٰ جو جامع اور واحد ہے، کہتا ہے اس ہدایت کو ظاہر کرنے والے سے جو کہ انسان کامل اور مکمل ہیں۔ بے شک تو نہیں ہدایت دے پاتا جسے تو چاہتا ہے، بلکہ اللہ ہدایت دیتا ہے جسے وہ چاہتا ہے۔ اور اللہ فقط ہدایت نہیں چاہتا اور نہ وہ تمھارا ایک جیسا ہونا چاہتا ہے۔ اگر چاہتا اللہ تو تمھیں ایک ہی امت بنا دیتا، اور اگر چاہتا تو تم سب کو ہدایت دے دیتا۔ جو اللہ نے چاہا وہ ہوگیا اور جو وہ نہیں چاہتا نہیں ہوتا۔ پس ہدایت دینے والے نہیں ہدایت دے پاتے مگر جس کی ہدایت اللہ چاہے۔ اور اُسے اصلاً ہدایت پانے والوں میں بنا دے۔ اور یہ لوگ نہیں ہیں مگر بشیر و نذیر مومنین کے لیے اور تو ہدایت دینے والا نہیں ہے اندھوں کو ان کی گمراہی سے۔ اور نہیں سناتے تم مگر اُس کو جو ہماری آیتوں پر ایمان لے آتا ہے، اور وہ سر تسلیم خم کرنے والے ہیں۔ اُس کے ساتھ وہ بلاتے ہیں سب کے سب لوگوں کو عمومیت کے ساتھ۔ پس مجھے یہ حکم دیا گیا ہے کہ میں مسلمانوں میں سے ہوجاؤں اور میں قرآن کی تلاوت کروں۔ پس جس نے ہدایت پائی وہ ہدایت پاتا

ہے اپنے نفس کے لیے اور جو گمراہ ہوا تو کہہ دو کہ میں تو فقط ڈرانے والوں میں سے ہوں"[۷۹]۔ اے لوگو عبادت کرو اپنے رب کی جس نے تمہیں پیدا کیا اور ان لوگوں کو جو تم سے پہلے ہو گزرے ہیں۔ شاید کہ تم متقی ہو جاؤ[۸۰]۔ اللہ نے تمہیں حکم دیا کہ تم عبادت کرو اپنے رب کی، اور بلایا اس نے تمہیں تمہارے رب کی طرف اور ظاہر کی تم پر نسبت (پرورش کرنے والے) رب کی اور (پرورش کیے جانے والے) مربوب کی ابھارتے ہوئے تمہیں محبت پر اور رغبت دلاتے ہوئے عبادت پر۔ اس مناسبت کی وجہ جو رب اور مربوب اور خالق اور مخلوق میں ہوتی ہے جیساکہ اس نے بیان کی ہے اپنے اس قول میں: "وہ ذات جس نے تمہیں پیدا کیا اور ان کو جو تم سے پہلے تھے اور وہ آباو اجداد ہیں اور تمہاری محبت تمہارے اپنے نفسوں کے لیے اور آباو اجداد کے لیے طبعاً" تمہارے دل میں جاگزیں ہے۔ پس وہ تمہیں متنبہ کرتا ہے کہ وہ (اللہ) زیادہ حقدار ہے محبت کا کیونکہ وہ تمہارا خالق ہے، اور محبت کا پھل عبادت اور اطاعت ہے اور عبادت جو ہے یہ تقوے کے حصول کا سبب ہوتی ہے۔ اللہ عزّوجل نے اس اُمید سے کہا کہ شاید تم متقی ہو جاؤ۔ پس ظاہر ہوا کہ عبادت الگ چیز ہے اور تقویٰ الگ جو حاصل ہوتا ہے عبادت سے اور یہ منقطع ہو جانا باطناً غیر اللہ سے اور مکمل وسیلہ بنا لینا اُس کے حضور اس کے شہود میں اور"بے شک تم میں سے سب سے زیادہ عزت والا اللہ کے نزدیک زیادہ متقی ہے[۸۰]۔ اور تم کیسے انکار کرتے ہو اللہ کا جب کہ تم مردہ تھے۔ پس اُس نے تمہیں زندہ کیا۔ پھر وہ تمہیں مارے گا، پھر وہ تمہیں زندہ کرے گا، پھر تمہیں اُس کی طرف لوٹنا ہے"[۸۱]۔ کہتا ہے اللہ تعالیٰ اظہار کرتے ہوئے اس کے وجود کی بداہت اور اس کے ظہور کی شدت اور اس کے ایمان کی قوت کے ساتھ اپنے اوپر۔ کیونکہ مومن اللہ جل شانہ' کے ناموں میں سے ایک نام ہے اور اسی کے لیے مومن کو ایمان حقیقی اس پر اور حق الیقین بھی ہے۔ پس تم کیسے کفر کرتے ہو اللہ کا، کیونکہ یہ ممکن ہی نہیں۔ اور نہیں قدرت رکھتا تم میں سے کوئی بھی اس کے انکار کی اصلاً۔ اس کے سوا نہیں کہ تم کفر کرتے ہو اس کے ساتھ اپنے گمان کی حد تک اور اسی معاملے میں تمہارے پاس وہمی سی دلیل ہوتی ہے، جس کی واقعتاً بنیاد کوئی نہیں۔ پس اللہ نے استدلال کیا اور دلیل قائم کی محجوبین (جن کی عقل پر پردہ ہو) کے سمجھانے کے لیے، اور کہا کہ تم تھے مردہ یعنی معدوم اور تمہارا کوئی حصّہ نہیں تھا وجود میں سے اور تم معناً مردہ تھے۔ پس اس نے زندگی بخش کر تمہیں زندہ کیا اور تمہارے اندر اپنی روح پھونکی۔ پس تم ہو گئے زندہ یعنی موجود اعتباریہ۔ پھر وہ تمہیں مارے گا ظاہری موت کے ساتھ تمہارے گمان میں اور تمہارے علم میں۔ پھر تمہیں زندہ کرے گا اُس علم کے

عطیہ کے ساتھ جس کو کبھی زوال نہیں۔ پھر تم لوٹائے جاؤ گے خاص رجوع کے ساتھ۔ اور یہ ابدی بقا ہے۔
بے شک اللہ حکم دیتا ہے کہ تم دے دو امانتیں ان کے حقداروں کو، اور جب تم فیصلہ کرو لوگوں کے درمیان
تو فیصلہ کرو عدل کے ساتھ۔ بے شک کیا ہی اچھی چیز ہے جس سے اللہ تمھیں نصیحت کرتا ہے۔ بے شک
اللہ تعالیٰ سننے والا دیکھنے والا ہے[۸۴]۔ پس تم امین ہو اللہ تعالیٰ کے اور امانت کمالات وجودیہ ہیں، جو کہ صفات
میں سے صفت سمع، بصر، علم اور لذات وغیرہ ہیں۔ بلکہ تمھارا وجود بھی اس کی امانت ہے۔ پس تمھیں حکم دیا
اُس نے تمھاری قسم میں فرد کامل علیہ الصلوٰۃ والسلام پر حقیقت منکشف کر کے کہ تم امانتیں ادا کر دو، ان
کے اہلوں کو یعنی لوٹا دو اُنھیں ان کی طرف جو ان کا زیادہ حقدار ہے۔ اور لوٹتے ہیں امور سب کے سب
ایک ہی مرتبے کی طرف اور وہ وجود ہے۔ اسی لیے اللہ عزّوجل نے کہا (الی اھلہا) ضمیر واحد کے ساتھ
اور نہیں کہا (الی اھالی ھا) جمع کے ساتھ۔ اس کے سوا چارہ نہیں کہ ہو اختلاف اعتبارات میں ذہن کے
اندر۔ پس تمھارے لیے یہی طریقہ ہے کہ تم منسوب کرو اپنی سماعت کو اپنی بصیرت کو اس کی سماعت اور
اُس کی بصیرت کی طرف کہ وہی سماعت اور بصیرت والا ہے۔ اور جان لو کہ تمھارا وجود جو کہ ان کمالات کا
جامع ہے، اسی کی طرف منسوب ہے اور اسی کی طرف لوٹتا ہے۔ پس وہ یوں ظاہر کرتا ہے تمھارے
اوپر راز اس بات کا کہ مجھ ہی سے سنا جاتا ہے اور مجھ ہی سے دیکھا جاتا ہے اور ثابت کرتا ہے
تمھارے نزدیک ہر وہ چیز جو اللہ کے ہاں ہے، اور جب تم دیکھو فرق اور امتیاز کے مرتبے کو اور تم فیصلہ
کرو لوگوں کے درمیان خیر و شر کے ساتھ تو اللہ تمھیں حکم دیتا ہے کہ تم فیصلہ کرو عدل کے ساتھ یعنی منسوب کرو
شرّ کو اپنے نفسوں کی طرف جو کہ معدوم ہونے والی چیزیں ہیں اور عدم جو ہے یہ شرّ محض ہے۔ پس
شرّ عدم ہی کی طرف منسوب ہیں، اور تم منسوب کرو بھلائی کو اللہ تعالیٰ کی طرف کیونکہ وجود خالص خیر
ہے اور نیکیاں تمام کی تمام اسی کی طرف منسوب ہیں۔ جس طرح کہ اللہ تعالیٰ عزّوجل نے فرمایا کہ جو کچھ پہنچتا
ہے تمھیں اچھائی میں سے پس وہ اللہ کی طرف سے ہے اور جو چیز پہنچتی ہے تمھیں برائی میں سے وہ
تمھارے نفس کی وجہ سے ہے[۸۵]۔ یہی عدل ہے کیونکہ ظلم کے معنی ہیں کہ چیز کو بے محل رکھنا اور عدل اس
کے خلاف ہے۔ بالجملہ یہ سب ہادی اور مہدی عام طور پر سب کو بلاتے ہیں۔ اور وہ اسی طرح خبر
دیتے ہیں اور سکھاتے ہیں مومنین اور عارفین کو بالخصوص نفوس کے اطمینان کے لیے اور خلوص کی زیادتی
کے لیے۔ اور میں مومنین کو دھتکارنے والا نہیں ہوں۔ میں ان کے لیے امین ناصح ہوں[۸۶]۔ پس اے لوگو

جو ایمان لائے ہو، تمھارے ذمّے تمھارے اپنے نفس ہیں۔ تمھیں نہیں نقصان پہنچائے گا وہ شخص جو گمراہ ہو گیا جب کہ تم ہدایت پہ ہو۔ تم نے اللہ کی طرف لوٹنا ہے اور تمھیں خبر دے گا اس چیز کی جو تم کرتے رہے، یعنی حفاظت کرو اپنی جانوں کی۔ اور لازم پکڑو ان کی اصلاح اور تمھیں نقصان نہیں پہنچائے گی گمراہی جب کہ تم ہدایت پانے والے ہو۔ ہدایت دی اللہ تعالیٰ نے مومنوں کو اس آیت سے یعنی اپنے نفسوں کی طرف جانے کی۔ اور بلایا اُنھیں اُن کے نفسوں کی طرف کیونکہ جس نے اپنے نفس کو پہچان لیا، پس اس نے اپنے رب کو پہچان لیا۔ اور نفس جو ہیں وہ اللہ تعالیٰ کی معرفت کے دروازے ہیں جنھیں اس نے کھول دیا ہے مومنوں پہ جو جاننے والے ہیں اللہ کو اور اس کے سوا نہیں کہ آفاق جو ہیں اس جامع اور اجمالی حقیقت کی تفسیر ہیں اور نہیں ظاہر ہوتا آفاق میں سوائے اُس چیز کے جو نفسوں کے اندر ہوتی ہے۔ پس سیر النفس قریب ترین راستہ ہے اللہ کی طرف اور سالک پر منکشف ہوتے ہیں اس مقام پہ اللہ تعالیٰ سے قربت کے راز۔ اور وُہ زیادہ قریب ہے انسان کی شہ رگ سے بھی۔[۱۲] نہیں ضرر پہنچاتا تمھیں اے سالکین اس مقام پہ معرفت کے طالبوں کا مقام تحیّر۔ جب تم ہدایت پا جاؤ، اللہ کو پانے کے ساتھ اور تم جان لو کہ اللہ ہی تم سب کا مرجع ہے۔ اور وہ تمھیں خبر دیتا ہے اس مقام پہ اس چیز کی جو تم کرتے ہو، اور جو تم کماتے ہو۔ یعنی تجلیات فعلیہ سے تمھارے اوپر تجلی کرتا ہے اور تمھیں بتاتا ہے جو کچھ کہ تم جانتے نہیں تھے، اس سے پہلے اور ظاہر کرتا ہے تمھارے لیے حسن اعمال کا راز اور اللہ خوب جانتا ہے حقیقت حال، اور اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو اطاعت کرو اللہ کی، اور اطاعت کرو رسول کی، اور تم میں سے جو صاحبِ اختیار ہیں ان کی۔ پس اگر تم تنازعے میں پڑ جاؤ کسی معاملے میں تو لوٹاؤ اس کو اللہ اور رسول کی طرف، اگر تم ایمان رکھتے ہو اللہ پر اور یوم آخرت پر۔ اور یہ چیز بہتر ہے تاویل کے لحاظ سے۔[۱۵] (الطوع والطاعت والاطاعت) ایک ہی معنی میں ہیں، اور طاعت جو ہے، اس کے معنی متکلمین کے نزدیک معاملے کی موافقت ہے۔ اور معتزلہ کے نزدیک ارادے کی موافقت ہے اور حق یہ ہے کہ دونوں معنی درست ہیں۔ معاملے کی موافقت طاعت صوری ہے، اور ارادے موافقت طاعتِ معنوی ہے اور موجودات میں سے کوئی چیز بھی طاعتِ معنوی سے خالی نہیں ہے۔ اور جو تم چاہتے ہو نہیں ہے مگر وہی ہے جو اللہ چاہے جو کہ رب العالمین ہے۔ عدول تو کبھی کبھی واقع ہوتا ہے طاعتِ صوری میں اور یہ امر کے خلاف ہے ارادے کے نہیں۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے خبر دی ابلیس کے حال کے بارے میں کہ اُس نے اپنے رب کے حکم سے سرکشی

کی اور اسی کے اوپر اعتقاد کی بنا ہے۔ اسی لیے علما نے کہا ہے کہ کفر اور معصیت اللہ کے ارادے اور اُس کی تقدیر میں سے ہے، اور وہ اس سے راضی نہیں ہے۔ پس جب تم جان لو کہ موجودات سب کے سب اللہ جل شانہٗ کے مطیع ہیں طاعتِ معنویہ کے ساتھ، اور نہیں ہے جائز اس سے اختلاف اور نہیں پیدا کیا اُس نے جنّ و انس کو مگر اس لیے کہ اس کی عبادت کریں اور تم نہیں ہو مگر حقیقتاً اُس کے مطیع ہو۔ پس اطاعت کرو اللہ کی رضامندی کے ساتھ تمام امور میں اور بناؤ اپنے نفس کو کلی طور پر راضی برضائے الٰہی۔ اور اطاعت کرو اُس کے حکم کی بھی اور وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں جس طرح کی تم نے اطاعت اس کے ارادے کی تاکہ مطابقت ہو جائے ظاہر اور باطن میں اور اس کے سوا نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہے اور جو اطاعت کرتا ہے رسولؐ کی پس اس نے اطاعت کی اللہ کی۔ جیساکہ اس آیت کریمہ سے واضح ہے (وَمن یطع الرسول فقد اطاع اللّٰہ[۸۶]) اور اطاعت کرو اپنے میں سے با اختیار لوگوں کی یعنی وہ شخص جس کو حکم یا اختیار حاصل ہے اپنے نفس پر اور اللہ نے اُسے اختیار دیا ہے اور وہ فیصلہ کرتا ہے جس کا حکم لگایا اللہ نے اپنے رسولؐ کی زبان سے اور وہ بلاتا ہے تمھیں اللہ کی مغفرت اور اُس کی قبولیت کی طرف اور وہ قدرت رکھتا ہے نفس اور لذات کی مخالفت پر اور نہیں جاتا نفسانی خواہشات کی طرف اور وہ نہیں بات کرتا اپنی خواہش سے، مگر وہ دعوت مصطفیٰؐ ہے، اور اس کے سوا نہیں کہ یہ مرشد ہے رشد کے طالبوں کا۔ کیونکہ شیخ اپنی قوم میں اسی طرح ہوتا ہے جس طرح نبی اپنی امّت میں ہوتا ہے۔ اس کی اطاعت عین اطاعتِ اللہ اور اطاعتِ رسولؐ ہے پس اس کی اطاعت کرو تاکہ تم پر منکشف کر دیے جائیں طاعت بسیطہ (وسیع وکشادہ) کے راز جو کہ بکھرے ہوئے ہیں تمام مخلوقات پر۔ پس اگر وا شیا میں سے کسی شے کے بارے میں کش مکش میں پڑ جاؤ اعتبارات مختلفہ کے سلسلے میں کراہت اور حُبّ میں سے، تو پس اسے لوٹاؤ اللہ واحد حقیقی کی طرف کہ اُس کے حضور میں کوئی چیز زیادہ نہیں ہے۔ پس وہ اُٹھا لیتا ہے تمھاری کش مکش تمھارے دلوں سے اپنی وحدت کے نور سے، اور تمھیں مشرف کرتا ہے اطمینانِ قلب کے ساتھ، اور تمھیں ہدایت دیتا ہے توحید کے سیدھے راستے کی طرف، اور یہ بھی کرو کہ لوٹاؤ اس تنازعے کو حقیقتِ جامعہ کی طرف اور وہ حقیقتِ محمدیہ ہے اور تعین اوّل کہ اس کے صاحب پر سلام وصلوٰۃ ہو، کیونکہ تمام قسم کے تعینات نکلتے ہیں اسی حقیقت محمدیہ سے اور رسولؐ اللہ کے ہاں کوئی تنازعہ وکشمکش نہیں مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ مدد کر دیتا ہے۔

اگر تم ایمان رکھتے ہو اللہ پر اُس کی وحدانیت کے ساتھ اور رسول ﷺ پر اس کی صادریت اولی کے ساتھ اور یوم آخرت پر یوں ایمان لاتا کہ یہ وہ گھڑی ہوگی جس میں جاتا ہے اللہ کی طرف اور یہ بہت بہتر ہے اور بڑی اچھی تاویل ہے۔

آیات مطلقہ کی اقسام اور ان کی تاویل و تفسیر کا بیان

اور الفاظ و معانی اور مختلف قسم کے خیالات کا بیان

تاویل سے مُراد کلام کی ظاہر سے باطن کی طرف توجیہ اس طرح کرتے سے ہے کہ اس کا ظاہر اس کی مخالفت نہ کرے۔ کیونکہ ظاہر باطن کا عین ہوتا ہے۔ بلکہ یہ دونوں معنی کا حامل ہے۔ اور اگر یہ نہ ہو تو یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ اس کلام کی تاویل یہ ہے جیسے اللہ تعالیٰ کا قول کہ نکالتا ہے زندہ کو مردے میں سے[۸۵] اور اُس سے مُراد ہے پرندے کا نکالنا انڈے میں سے تفسیری لحاظ سے۔ اگر اس سے مراد لی جائے مومن کا نکالنا کافر میں سے، یا مومن کا نکالنا جاہل سے وغیرہ وغیرہ اور اسی قسم کی اور چیزیں تو یہ اس کی تاویل ہوگئی، اور تفسیر اصلاً انکشاف اور اظہار ہے۔ اور شرع میں آیت کے معنی ہیں اور اس کی حالت ہے اور اُس کا قصہ ہے، اور وہ سبب ہے جس میں کہ وہ نازل ہوئی ایک ایسے لفظ کے ساتھ جو رہنمائی کرتا ہے ظاہری دلالت کے ساتھ۔ اور عارف و محقق لوگ جانتے ہیں ظاہری معنی کو اور سمجھتے ہیں باطنی اسرار کو، اور بیان کرتے ہیں آیات کی تاویلات علمائے ظاہر کے برخلاف کیونکہ وہ قدرت نہیں رکھتے دقیق باتوں کے ادراک کی، اور نہیں پہنچ پاتے کلام کے لبِّ لباب کو اور وہ نہیں ہوتے زیادہ عقل و دانش والے، اور اسی لیے وہ اکتفا کرتے ہیں اس چیز پر جو انھوں نے اپنے اسلاف سے سُنی۔ چونکہ حق سبحانہٗ تعالیٰ محض اپنی خاص عنایت سے اولیا کی چشم بصیرت کو رحمانی نور سے روشن کرتا ہے اور اُنھیں پردوں کے کھولنے اور حجاب واخفا کے ہٹانے سے نوازتا ہے۔ اس لیے وہ اللہ تعالیٰ کی تمام نشانیوں کے اسرار و رموز کو سمجھتے ہیں، اور دوسروں سے بیان کرتے ہیں۔ جیسا کہ اس آیت کریمہ میں آیا ہے کہ نہیں نصیحت حاصل کرتے مگر عقل والے جو ذکر کرتے ہیں اللہ کا قیام میں، قعد سے میں اور اپنے پہلوؤں پر اور غور و فکر کرتے ہیں آسمانوں اور زمین کی تخلیق میں۔ اے ہمارے رب تو نے اس کو لایعنی پیدا نہیں کیا[۸۶] پس کائنات کی یہ ساری موجودات اسی کے دلائل ہیں اور سارے آسمان اور زمین اُس حکیم

مطلق کی نشانیوں سے بھرے پڑے ہیں جن پر آیت کریمہ شاہد ہے کہ آسمانوں اور زمین میں اہل ایمان کے استدلال کے لیے بہت سے دلائل ہیں۔ سارا جہان اس کے جلووں سے بھرا پڑا ہے، اور آسمان و زمین کی پیدائش، مکان و مکین کی آفرینش، دن رات کے یکے بعد دیگرے آنے جانے، جہازوں اور سمندروں کے چلنے، ہواؤں کے بدلنے، بارش کے برسانے، بادلوں کے فضا میں مقید و معلق رہنے، اور خشک و پژمردہ زمین کے از سرِ نو تر و تازہ ہونے، انسان و حیوان کے بنانے اور ان کے سارے کاروبار، الغرض یہ سارا جہان اس کے دلائل کی ایک کھلی کتاب ہے جس میں اسی کی تجلیاں جلوہ ریز ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ بندوں کو اُس روشن کتاب کی یہ آیات زبانی یاد ہیں کہ بلاشبہ آسمانوں اور زمین کے بنانے میں اور یکے بعد دیگرے رات اور دن کے آنے میں، اور جہازوں میں جو کہ سمندر میں چلتے ہیں آدمیوں کے نفع کی چیزیں اور اسباب لے کر، بارش کے پانی میں جس کو اللہ تعالیٰ نے آسمان سے برسایا۔ پھر اس سے زمین کو تر و تازہ کیا۔ اُس کے خشک ہوئے پیچھے اور ہر قسم کے حیوانات اس میں پھیلا دیے، اور ہواؤں کے بدلنے میں اور ابر میں جو کہ زمین و آسمان کے درمیان مقید و معلق رہتا ہے دلائل توحید کے موجود ہیں اُن لوگوں کے لیے جو عقلِ سلیم رکھتے ہیں[1] اور یہ آیت کریمہ اُسی کی نشانیوں میں سے ایک یہ ہے کہ تم کو مٹی سے پیدا کیا پھر تھوڑے ہی دنوں بعد تم آدمی بن کر پھیلے ہوئے تھے۔[2] نیز یہ بھی اسی کی آیات میں سے ہے کہ اُس نے تمھارے واسطے تمھاری جنس کی بیبیاں بنائیں تاکہ تم کو ان کے پاس آرام ملے اور تم میاں بیوی میں محبت اور ہمدردی پیدا ہوئی۔[3] اس میں ان لوگوں کے لیے نشانیاں ہیں جو غور و فکر سے کام لیتے ہیں۔[4] نیز اس کی نشانیوں میں سے آسمان اور زمین کا بنانا ہے اور تمھارے لب و لہجے اور رنگتوں کا الگ الگ ہوتا ہے۔ اس میں دانشمندوں کے لیے نشانیاں ہیں، اور اسی کی نشانیوں میں سے تمھارا سونا لیٹنا ہے رات میں اور دن میں اس کی روزی کو تمھارا تلاش کرنا ہے۔ اس میں لوگوں کے لیے نشانیاں ہیں جو سنتے ہیں۔[5] اور اسی کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ وہ تم کو بجلی دکھاتا ہے جس سے ڈر بھی ہوتا ہے اور اُمید بھی ہوتی ہے اور وہی آسمان سے پانی برساتا ہے پھر اسی زمین کو اُس کے مردہ ہو جانے کے بعد زندہ کر دیتا ہے۔ اس میں ان لوگوں کے لیے نشانیاں ہیں جو عقل رکھتے ہیں۔[5] اور اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ آسمان و زمین اُس کے حکم سے قائم ہیں پھر جب تم کو پکار کر زمین میں سے بلا دے گا تو تم یک بارگی نکل پڑو گے، اور جتنے آسمان اور زمین موجود ہیں سب اسی کے تابع ہیں اور وہی ہے جو اوّل بار پیدا کرتا ہے، پھر وہی دوبارہ پیدا کرے گا، اور یہ اُس

کے نزدیک آسان ہے، اور آسمان و زمین میں اس کی شان اعلیٰ ہے اور وہ زبردست حکمت والا ہے۔ یہ اللہ کی آیتیں ہیں جو صحیح طور پر ہم آپ کو پڑھ کر سناتے ہیں تو پھر اللہ اور اُس کی آیتوں کے بعد اور کونسی بات پر یہ لوگ ایمان لاویں گے۔ صد حیف اس شخص کے حال پر کہ نہ تو اس کی فطری استعداد میں قوتِ بصارت ودیعت کی گئی، اور نہ ہی سننے اور ماننے کے بعد اُسے تتبع کرنے سے بہرہ مند کیا گیا۔ سو وہ نہ تو اپنی آنکھوں سے دیکھ کر خدائی نشانیوں کی طرف مائل ہوتا ہے اور نہ ہی دانا و بینا لوگوں سے سُن کر ان کی پیروی کرتا ہے۔ اُس کا باتوں کو سننے والا کان بہرہ ہے۔ اس کے لیے سننا یا نہ سننا ایک برابر ہے اس آیت کریمہ کے بموجب بڑی خرابی ہوگی ہر ایسے شخص کے لیے جو جھوٹا ہو نافرمان ہو۔ جو خدا کی آیتوں کو سنتا ہے جب کہ اُس کے روبرو پڑھی جاتی ہیں اور پھر بھی وہ تکبر کرتا ہوا اپنے کفر پر اس طرح اڑا رہتا ہے جیسے اُس نے ان کی باتوں کو سُنا ہی نہ ہو۔ سو ایسے شخص کو ایک دردناک عذاب کی خبر دیجئے[91] چونکہ وہ نہ تو ایمانی چشم بینا رکھتا ہے، نہ یقین بھرا قلب سلیم، اور نہ ہی عرفان و معرفت کی صفائی، سو اس قسم کی آیات کی اُسے خبر یا اطلاع مل بھی جائے تو وہ غافل دل انسان اس کی کوئی قدر نہیں کرتا جیسا کہ اس آیتِ کریمہ میں آیا ہے کہ وہ ہماری آیتوں میں کسی آیت کی خبر پاتا ہے تو اُس کی ہنسی اُڑاتا ہے۔ ایسے لوگوں کے لیے آخرت میں ذلت کا عذاب ہے۔ یہ بھی سمجھ لیجیے کہ اس قسم کی ساری آیات کی دو قسمیں ہیں، آفاقی اور انفسی۔ جیسا کہ خود اللہ جل جلالہٗ نے کلام پاک میں فرمایا ہے کہ ہم عنقریب ان کو اپنی قدرت کی نشانیاں ان کے گرد و نواح میں بھی دکھلا دیں گے، اور خود ان کی ذات میں بھی یہاں تک کہ ان پر ظاہر ہو جائے گا کہ یہ قرآن برحق ہے۔ آفاقی اور انفسی کا اطلاق بعض نسبتوں سے ہے۔ آفاقی بعض نسبتوں کی بنا پر انفسی ہیں۔ اور اسی طرح انفسی بعض نسبتوں کے لحاظ سے آفاقی۔ یہ انفسی و آفاقی نشانیاں بھی آگے چل کر دو حصوں میں تقسیم ہو جاتی ہیں، صامتہ (خاموش) وہ کہ ان کی تسبیح و تقدیس قوت سامعہ کے زور پر نہیں سنی جا سکتی، جیسے جمادات و نباتات وغیرہ اور صامت ہونے کے اعتبار سے دیگر حیوانات و موجودات جیسا کہ اس آیت کریمہ سے واضح ہے کہ کوئی چیز ایسی نہیں جو تعریف کے ساتھ اس کی پاکی قالاً یا حالاً بیان نہ کرتی ہو۔ لیکن تم لوگ ان کی پاکی بیان کرنے کو سمجھتے نہیں۔ اور ناطقہ وہ جن کی تسبیح و تقدیس قوتِ سامعہ کے بل بوتے پر سنی جا سکتی ہے، جیسے انسان اور حیوان وغیرہ یا ایسی ندا و صدا کے لحاظ سے دیگر اشیاء۔ ان ناطقہ نشانیوں سے ندا و صدا کی صورت میں جو کچھ سُنا جا سکتا

ہے، اُسے آیاتِ منطوقات یعنی ناطق نشانیاں کہتے ہیں۔ اور اگر یہ منطوقات صرف حیوان کی زبان سے سنی جائیں یا دیگر اعضا سے کٹنے کاٹنے کے وقت توان کو اصوات (صوت کی جمع) کہتے ہیں، اور اگر یہی انسان کی زبان سے سُنی جائیں تو اُنھیں الفاظ و کلمات کہتے ہیں۔ یہاں یہ سوال نہ کرنا کہ ناطق تو فقط انسان ہے جو نفس ناطقہ رکھتا ہے، نہ کہ دیگر حیوانات بھی ناطق ہیں۔ حیوان کی آواز اور الاپ بھی منطوقات میں شامل ہے۔ گونگے پن اور بولنے میں ملکہ کے ہونے یا نہ ہونے کا فرق ہے۔ گونگاپن بول نہ سکنا ہے۔ اس چیز کے بارے میں جس کے متعلق کچھ بولنا چاہیے۔ لہذا انسان کے علاوہ کسی اور کو صامت و ناطق کیسے کہا جا سکتا ہے۔ منطوق وہی ہے جو انسانی نطق سے نکلے۔ دوسری آواز پہ منطوقات کا اطلاق کیسے کیا جا سکتا ہے۔ یہ بالکل الگ بات ہے اور اس بیان سے ہماری مُراد ایک دوسری بات ہے۔ میری مراد وہی ہے جو فلسفیوں کی اصطلاحی نطق سے ہے۔ یہ نطق کلامی ہے۔ اس کا استفادہ قرآن شریف کی اس آیتِ کریمہ سے کیا گیا ہے، کہ "گویائی دی مجھے اللہ نے، جس نے گویائی دی ہے ہر چیز کو"[۹۳] اور دوسری آیات و احادیث سے بھی ان چیزوں کا کلام کرنا (بولنا) ثابت ہے، جن پر فلاسفروں کی اصطلاح کے مطابق تکلم کا حکم صادر نہیں ہوتا، اور اصطلاح میں کوئی اختلاف نہیں۔ قصّہ کوتاہ یہ کہ یہ حروف و الفاظ جنھیں ہم کلمات کہتے ہیں جب تک دل میں ہیں اُنھیں معانی کہتے ہیں، جب وہ زبان پہ آجاتے ہیں اُنھیں الفاظ کہتے ہیں۔ جب وہ صحیفوں میں لکھے جاتے ہیں تو اُنھیں نقوش کہتے ہیں۔ اور اگر یہی کلمات بلا ارادہ و قصد یونہی دل میں آئیں ان کو خیالات و حدیثِ نفس کہتے ہیں۔ اگر اُس میں وہمی قوت بھی شامل ہو تو اُنھیں وسوسے کہتے ہیں۔ اگر وہی بامقصد طور پر کسی کام کو انجام دینے کے لیے دل میں آئیں تو اُسے ارادہ کہتے ہیں۔ اگر اُس میں غور و فکر بھی شامل ہو تو اُسے ایتائے حکمت (حکمت عطا کرنا) کہتے ہیں۔ اور اگر جلائے قلبی و القائے روحانی کے باعث کسی ولی اللہ کے دل میں آئے تو اسے الہام کہتے ہیں۔ اگر وہی بات کسی نبیؑ کے دل پہ وارد ہو تو اُسے حدیث قدسی شمار کرتے ہیں۔ اور اگر حضرت جبرئیلؑ کی وساطت سے نازل ہو تو اسے وحی اور کلام الٰہی کہتے ہیں۔ اور قرآن مجید میں چند الفاظ کے مجموعے کو جس سے پورا جملہ بن جائے آیت کہتے ہیں۔ اب ان آیاتِ قرآنی کی بھی کئی قسمیں ہیں۔ اُن میں سے بعض ایسی ہیں جن میں اصول بیان کیے جاتے ہیں۔ بلکہ ہر آیت میں چھپی ہوئی نشانیاں ہیں۔ اُنھیں نہیں دیکھتا مگر وہ جسے اس کے رب کی طرف سے بصیرت عطا کی گئی ہو[۹۵]۔ پس وہ بیان کرتا ہے لوگوں کے لیے جو وہ دیکھتا ہے۔ پس مومن کہتے ہیں ہم نے سُن لیا، ہم نے

اطاعت کی ۔ اور کافر یقین نہیں لاتے[۹۵]، اور یہ آیات ہیں اللہ کی جو ہم پڑھتے ہیں حق کے ساتھ ، اور اللہ جہانوں پر ظلم کرنا نہیں چاہتا[۹۶]" اور اس کے سوا نہیں کہ ایمان رکھتے ہیں ہماری آیات پر وہ لوگ کہ جب ان کو وہ آیات یاد دلائی جاتی ہیں تو وہ سجدے میں گر پڑتے ہیں اور اللہ کی تسبیح بیان کرتے ہیں اپنے رب کی تعریف کے ساتھ ، اور وہ اکڑتے نہیں ہیں[۹۷]"

سجدے کی حقیقت کا بیان، سجدۂ تلاوت کا سبب اور عبارات کلام اللہ میں آیات سجدہ لانے کی وجہ

عبادات میں سجدہ سرفہرست ہے۔ اور اس کی حقیقت تمام ممکنات حال میں شامل ہے۔ یہ حضور باری تعالیٰ ایسی ذاتی فقر و مسکنت، انکساری اور اپنے حقیقی عجز و ذلت کا اقرار ہے۔ جیسا کہ حق سبحانہٗ تعالیٰ نے اپنے کلام پاک میں کئی مقامات پر ساری مخلوقات کے سجدے کا ذکر فرمایا ہے۔ اس کی ظاہری صورت پورے صدق و اخلاص سے عبادت کی نیّت سے اپنی جبینِ نیاز کو زمین پر رکھ دینا ہے۔ سجدے کی یہ صورت محض حضرت انسان کے حصّے میں آئی ہے جو تمام مراتب کا جامع ہے۔ سجدے کی اس مخصوص صورت کے پیش نظر قرآنِ پاک میں بہت سے لوگوں کے شخصی امتیازات کو ناجائز و ناروا قرار دیا گیا ہے۔ اور انسانی افراد کے لیے عام سجدے کی اجازت نہیں دی گئی۔ ظاہری، باطنی اور حقیقی معنوں میں کامل سجدہ تو فقط کاملانِ حق ہی سے مخصوص ہے۔ گویا پستی کی انتہا اور معراج وصعود کے بالکل برعکس انہی کے حق میں کہا گیا ہے۔ سجدہ دائرۂ عبودیت کا مرکز ہے۔ اور اسی لیے سر سجدے کے وقت کائنات کے مرکز پر رکھا جاتا ہے اور وہ زمین ہے۔ سجدہ زمین پر اور اُس چیز پر جو اسی میں سے ہے، اور اس کی جنس کے قریب ترین ہے کرنا اولیٰ ہے۔ نبی کریم صلعم نے فرمایا کہ بنا دیا اس نے میرے لیے زمین کو مسجد، اور جب سجدہ کرتا ہے بندہ تو پاکیزہ کر دیتا ہے اس کا سجدہ کرنا اُس چیز کو جو اس کی پیشانی کے نیچے ہوتی ہے سات زمینوں تک۔ اور جب کہ زمین جو ہے اُس کے سات طبقات اور اُس کی سات اقالیم ہیں تو

شرط لگادی سجدے کی صحت اور اس کی تکمیل کی سات اعضا کو اس پر رکھنے کی ۔ اور جب آدمی سجدہ کرتا ہے تو سجدہ کرتے ہیں اس کے ساتھ سات اعضا۔ یعنی اُس کا چہرہ، دونوں ہتھیلیاں، دونوں گھٹنے اور دونوں پاؤں ۔ پس پہنچتا ہے سجدہ کرنے والے کا سر اس کے پاؤں کی قرار گاہ پر اور متحد ہوجاتا ہے اس کا سر اور اُس کے پاؤں ایک مقام پر، اور ہوجاتا ہے معنوی طور پر ایک حلقے کی مانند اور برابر ہوجاتا ہے تمام طرفوں سے اس قادرِ مطلق کے حضور میں ۔ اور یہاں سے انسان کا سر اُٹھانا سجدے کو باطل کر دیتا ہے، اور نماز کو فاسد کر دیتا ہے ۔ پس جب سجدہ کرتا ہے انسان اپنے اللہ بزرگی والے کے لیے تو اُس کے قریب ہوجاتا ہے، اور اُسے دائرہ الوہیت کے مرکز کے ساتھ خاص تقرب حاصل ہوجاتا ہے اور یہی خالص، یہی خالص معبودیت ہے جیسے کہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ سجدہ کرنے والا اللہ کے دونوں قدموں پر سجدہ کرتا ہے ۔ پس اسے چاہیے کہ سوال کرے، اور چاہیے کہ راغب ہوجائے اور سب سے زیادہ جب قریب ہوتا ہے بندہ اپنے رب کے تو وہ سجدے کی حالت ہے ۔ پس کثرت سے دُعا کرو۔ پس سجدے کی حالت میں سجدہ کرنے والے کا باطن مسجودِ مطلق اور معبودِ حقیقی کے نور سے منور ہوجاتا ہے ۔ اُس کی عبودیت کُل کے ساتھ ایسے ہوجاتی ہے جیسے چاند چودھویں رات کو چمکتا ہے حقیقتاً سورج کی تجلی سے ۔ پس وہ دیکھتا ہے اپنے رب کو جیسے کہ چاند کو دیکھا جاتا ہے چودھویں کی رات کو ۔ یعنی سجدہ کرنے والا دیکھتا ہے اپنے رب کو

کہ وہ جلوہ نما ہے اس کے اوپر سجدے کی حالت میں ۔

عبودیت معبودیت کے مقابلے میں ایسے آتی ہے جیسا کہ دیکھتا ہے چاند چودھویں رات کی حالت میں اپنے مقابل میں مکمل طور پر اپنے مربی اور اپنے روشن کرنے والے کو جو کہ سورج ہے ۔ پس جاننا چاہیے کہ جس طرح چاند کا نور حاصل ہوتا ہے سورج کی روشنی سے، اسی طرح ظاہر ہوتی ہے عبودیت اللہ تعالیٰ کی معبودیت کے ظہور کے ساتھ اور خدا کے سوا کسی کو قدرت اور طاقت نہیں ہے اور نہیں ہے توفیق مگر اسی کی مہربانی سے اور نہیں ہے کوئی معبود اُس کے سوا۔ بنائے اللہ تعالیٰ ہمیں اور تمہیں فرمانبردار سجدہ کرنے والوں میں سے اور حشر کرے ہمارا اور تمہارا خالص محمدیوں کے زمرے میں ۔ پس کثرت کرو سجدوں کی ۔ پس نہیں ہے کوئی مسلمان جو سجدہ کرتا ہے حق تعالیٰ کے لیے ایک سجدہ مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ اُس سجدے سے اس کا درجہ جنت میں بلند کر دیتا ہے، اور دُور کر دیتا ہے اس سے اس

سجدے کی وجہ سے خطا ۔ قصہ کوتاہ انسان کے ظاہر و باطن کی بھلائی متابعت اور فرمانبرداری میں ہے ۔ اور خودسری اور سرکشی شیطنت سے نکلتی ہے اور موجب بنتی ہے فساد کا ۔ کیونکہ شیطان نے انکار کیا اور وہ اکڑا ، اور وہ ہوگیا انکار کرنے والوں میں سے ۔ اس نے انکار کیا کہ وہ نہیں دے گا سجدہ کرنے والوں کا ساتھ ۔ اسی لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان آیات کی تلاوت اور سماعت کے وقت جن میں کہ خدا نے اپنی مخلوق کو اطاعت اور سجدے کا حکم دیا ہے کے متعلق فرمایا کہ ان آیات کی تلاوت کرتے یا سنتے وقت پڑھنے اور سننے والے دونوں ظاہری اور باطنی طور پر فرمانبرداروں اور اطاعت شعاروں میں داخل ہوجاتے ہیں ۔ اللہ تعالیٰ کے فرمان اور رسولؐ اللہ کے حکم کے اتباع کے شرف سے مشرف ہوجاتے ہیں ، اور وہ اس زمرے سے باہر نکل آتے ہیں جو نافرمانوں اور متکبروں کا ہے کیونکہ وہ شیطان سیرت اور انسان صورت ہیں ۔ جب پڑھا انسان نے سجدے کی آیت کو ، اور سجدہ کیا تو شیطان روتے ہوئے مُنہ موڑ جاتا ہے ، اور روتے ہوئے یہ کہتا ہے ، ہائے افسوس ابنِ آدم گرا سجدے میں ۔ اُس نے سجدہ کیا ، اس کے لیے جنت ہے ۔ اور مجھے حکم دیا گیا سجدے کا اور میں نے سرکشی کی پس میرے لیے آگ ہے ۔ "میں اللہ کی پناہ میں آتا ہوں خناس کے وسوسوں کے شر سے جو کہ وسوسے پیدا کرتا ہے انسانوں کے سینوں میں ، جنات میں سے اور انسانوں میں سے"[۹۴] لہٰذا ہم محمدی بھی اسی نیت سے اپنی تصانیف میں آیاتِ سجدہ کو ان کے مناسب موقع محل پر لاتے ہیں ، اور اپنے ساتھ دوسرے اُمتیوں کو بھی اللہ تعالیٰ کی عبادت کی طرف لے آتے ہیں تاکہ اِس "علم الکتاب" کے مطالعے کے وقت بھی دانشمند لوگ اسی کتابِ لایزال کی طرح فیضیاب ہوں اور کسی حالت میں بھی اللہ تعالیٰ کی عبادت یا اُس کے حضور میں سجدہ ریز ہونے سے روگردانی نہ کریں ۔ تاکہ امرِ حق کی طرف دعوت دینے اور رہنمائی کرنے کی بنا پر ہمیں بھی تا قیامت اُن کے ان سجدوں اور نیکیوں کا ثواب ملتا رہے ، اور پھر ہماری وساطت سے جنابِ سرورِ کائناتؐ اور حضور باری تعالیٰ میں پیش کر دیا جائے ۔ کیونکہ نیکی کی طرف رہنمائی کرنے والا نیکی کرنے والے کی مانند ہے ۔ لہٰذا ان آیاتِ قرآنی سے چھپکنے کو الفاظ و معانی کی مکمل مناسبت پالینے کے باوجود محض سجدہ کی کفایت یا سردردی کی تخفیف کے خیال سے نہیں چھوڑتے ، نہ ہی اہلِ اسلام کو ہم سجدہ ریزی کے معاملے میں اتنا کفایت شعار یا سجدے سے اتنا متنفر سمجھتے ہیں ۔ باقی رہ گئی قرأت کرتے وقت طہارت و پاکیزگی کی پابندی تو قطع نظر اس امر سے کہ کلام الٰہی سے ایسی اکثر آیات تحریر میں شامل ہیں اور دیگر عبارات

بھی جن کا ترجمہ اور تفسیر درکار ہو، کیونکہ ایسی کتابوں کے پڑھتے وقت اگر وضو نہ ہو تو تیمم لازم ہوگا۔
ہاں ناپاکیزگی کی حالت میں ایسے امور کا اقدام نہیں کرنا چاہیے۔ مخلص محمدی جو دائمی نمازی ہوتے ہیں ایسے
اوقات کا ان پر کیا اطلاق، کیونکہ وہ تو ہمیشہ طہارت ہی سے ہوتے ہیں۔ بے شک اللہ تعالیٰ توبہ کرنے
والوں اور طہارت رکھنے والوں کو پسند فرماتا ہے۔ اے اللہ تعالیٰ بنا دے مجھے توبہ کرنے والوں میں
سے اور پاکیزگی حاصل کرنے والوں میں سے، اور بنا دے مجھے اپنے صالح بندوں میں سے۔

عقائد کا بیان فوائد کی وضاحت کے ساتھ

اور عقیدہ جو ہے وہ چیز ہے جو حاصل ہوتی ہے نفس کو اور ثابت ہو جاتی ہے اس کے دل میں
پختگی کے ساتھ کسی معاملے کے حق و باطل ہونے میں اس طرح کہ کوئی تذبذب نہیں رہ جاتا۔ برابر ہے کہ
ہو کشف و مشاہدے کے ساتھ جیسے کہ انبیاء و اولیائے کرام کے ساتھ ہوتا ہے یا اشراق اور نظر کے
ساتھ جیسا کہ ہوتا ہے اشراقی اور مشائی فلسفیوں کو سننے اور ماننے والوں کے ساتھ جیسے کہ مومنین اور
مقلدین کے ساتھ ہوتا ہے۔ یا دیگر حواس سے جیسے کہ تمام انسانوں کے ساتھ ہوتا ہے مختلف امور میں
سے معتقدات کے سلسلے میں۔ یا طبعاً جیسا کہ انسان کے ساتھ ہوتا ہے گوارا اور ناگوار امور میں اپنے
آپ کے لیے یا فطرتِ اصلیہ کے ساتھ جس پر کہ ہر انسان کو پیدا کیا گیا ہے، اور یہ عقیدہ ہی اصلی عقیدہ
ہے اور ہر پیدا ہونے والا اسی فطرت پر پیدا کیا جاتا ہے، اور ہر چیز لوٹتی ہے اپنے اصل کی طرف اور
اللہ کی طرف ہی تمام کے تمام معاملات لوٹتے ہیں۔ اور اس لیے اس فطرت کو حدیث میں اسلام سے
تعبیر کیا گیا ہے (جو یوں ہے) پس نہیں ہے کوئی پیدا ہونے والا مگر یہ کہ وہ پیدا کیا گیا ہے فطرت
اسلام پر۔ ہاں البتہ جب لاحق ہو جاتے ہیں عوارض اس فطرت کو نفسانی اور شہوات حیوانی کے
پردوں وغیرہ میں سے یعنی حارج ہونے والی اور رکاوٹ ڈالنے والی باتوں میں سے جو غالب آجاتی ہیں
انسان پر، پس وہ پردہ ڈال دیتی ہیں اس پر، پس وہ اپنے رب کے مشاہدے میں حجاب میں آجاتا ہے
اور ہو جاتا ہے حیوانِ مطلق کی طرح، بلکہ اُس سے بھی زیادہ گمراہ۔ پس انسان اپنی معاش کے لیے
اور اپنی آخرت کے لیے بھی صحیح عقیدہ سیکھنے کے محتاج ہوتے ہیں۔ اور صحیح عقیدہ ہی اللہ تعالیٰ تک
پہنچانے والا ہوتا ہے۔ پس اللہ تعالیٰ نے بھیجا اپنے رسولوں کو انسانوں کی تعلیم کے لیے اور اُنہوں نے

بلایا لوگوں کو اُن کے رب کی طرف، اور یہ معاملہ آدم علیہ السلام کے زمانے سے لے کر ہمارے نبی آخرالزماں کے زمانے تک جاری رہا۔ جب کہ ختم ہوگئی نبوّت تو باقی رہ گئے نبی کریم صلعم کی اُمّت کے اولیا۔ اور وہ بنی اسرائیل کے انبیاؑ کی طرح ہیں صحیح عقیدے کی تعلیم میں جو لوگوں کی اصلاح کرنے والا ہے۔ اور جب ظاہر ہوتا ہے فساد اُمت میں بہت سارے امور کے لاحق ہونے سے بدعتی امور کی آمیزش سے اور کم عقلی سے اور جھٹلانے والے لوگوں کے خلط ملط ہو جانے کی وجہ سے، تو پھر بھیجتا ہے اللہ تعالیٰ ایک محمدی محقق کو ان کی اصلاح کے لیے۔ پس وہ بیان کرتا ہے ان لوگوں کے لیے اللہ کی ہدایت اور بے شک اللہ تعالیٰ کی ہدایت ہی ہدایت ہے۔

عقائد

چیزوں کے حقائق جو ہیں وہ ثابت ہیں، یعنی موجودات کی ماہیتیں تحقیق شدہ ہیں۔ فی نفسہٖ ان کے ثبوت تحقیق شدہ ہیں اور وہ معلّق نہیں ہیں جیسے کہ فرض کرنے والا فرض کرتا ہے، یا سمجھنے والا سمجھتا ہے جیسا کہ بعض باطل پرست لوگوں نے گمان کیا ہے جیسے کہ سوفسطائی (حقائق کے مُنکر حکما) اور مُلحد۔ ہر چیز کی حقیقت ثبوت اور تحقیق کے مقام تک ثابت ہے۔ حقیقت واجبیہ جو بلند مرتبت اور مقدس ہے اس کے ثبوت کے ضمن میں حق سبحانہ تعالیٰ کی اس بات کے ساتھ جیسے کہ وہ موجود ہے وجود کے مرتبے پر۔ اور کائنات اللہ تعالیٰ کی ایجاد کے ساتھ حق جل شانہ' وعز سلطانہ' کے وجود کے ضمن میں ہے۔ پس ماہیات مذکورہ کا انکشاف ان میں حق کے سلسلے میں بغیر اُس کے وجود اور عدم کا ملاحظہ کیے ہوئے علمی صورتیں اور اعیان ثابتہ (صورِ علمیۂ ذاتِ حق) کہلاتی ہیں۔ حکم ایجادی اور اعدامی تقدیر الٰہی کہلاتی ہے اور اس تصور کی صلاحیت ماہیات کے نفوس میں ہی ثبوت اور تحقّق کا مرتبہ ہے۔ اور ان ماہیات کا حصول ذہن میں یا خارجی کیفیت میں مرتبۂ وجود ہے اور کائنات ہے۔ ثبوت اور تحقّق مترادف ہیں اور دونوں کے معنی ایک ہی ہیں، اور وجود اور کائنات بھی یہاں ایک معنوں میں ہیں۔ اور وجود میں حاصل شدہ ماہیات کا مجموعہ عالم کہلاتا ہے۔ پس اعتقاد رکھ کہ اشیا کے حقائق اثباتِ حق کے ساتھ ثابت ہیں اور بنائے گئے ہیں، جنھیں اللہ تعالیٰ بناتا ہے اور مراد ہماری "جَعَلَ" سے ثبوت کا اثبات اور حق کو ثابت کرنا ہے یعنی ماہیات کے ساتھ ثبوت اور تحقّق کی نسبت کو منسوب کرتا ہے۔ جس طرح تحقیق کے مرتبے

یں ثبوت کا بنا تا ہے۔ کائنات کے مرتبے یں ایجاد کا بنا تا ہے۔ اور جعل ثبوتی متعلق ہے چیز کی حقیقت کے ساتھ۔ اور جعل ایجادی متعلق ہے چیز کی صورت کے ساتھ اور حقیقت موجودہ کو صورت کہتے ہیں، اور صورتِ معقولہ کو حقیقت کہتے ہیں۔ پس چیز جو ہے، یہ وہ موجود معنی ہیں جو حقیقت اور صورت کو اپنے احاطے یں لیے ہوئے ہیں اور لا شئ وہ معدوم معنی ہیں جن سے حقیقت اور صورت منفی ہیں۔ اور موجودات ممکنہ کا مجموعہ عالم کہلاتا ہے، اور عالم جو ہے یہ حادث ہے۔ حادث بالذات ہو یا حادث بالزمان ہو اور ممکنات کے حدوث (نیا ہونا) کا اعتقاد مطلق ضروری ہے ذاتی اور زمانی قید کے بغیر اور موجودات ممکنہ یں سے ہر چیز نئی پیدا شدہ ہے۔ پس وہ چیزیں جن کی خبر قرآن میں آئی ہے یا احادیث صحیحہ یں حدوثِ زمانی کے سلسلے یں آئی ہے تو ان کے بارے یں اعتقاد رکھ کہ وہ محدثات زمانی ہیں چاہے عقل سے حدوثِ زمانی ثابت نہ ہو، اور تو نہ پائے کوئی دلیل اس کے اثبات پر جیسے ساتوں آسمانوں اور زمین کا حدوثِ زمانی۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ سے زیادہ سچی بات کرنے والا کون ہے، اور اُس کا رسولِ صلعم مخبر صادق ہے۔ پس اس معاملے یں اپنی عقل کے قاصر ہونے کا اعتراف کر لے۔ ورنہ پیروی کر شیطان یا اِنس کے قدموں کی جو کہ فلسفی ہیں اور اعتقاد رکھ بغیر تحقیق کے، اور کہہ کہ اللہ اور اس کا رسولؐ اُن کے مرادی معنوں کو خوب جانتے ہیں۔ اور جہاں تک ان چیزوں کا تعلق ہے کہ جن کے حدوثِ زمانی کے بارے یں اللہ تعالیٰ کے کلام اور اُس کے رسول مقبولؐ کی احادیث یں کوئی خبر نہیں ہے اور نہ عقل ہی ان کے حدوثِ زمانی کے ہونے کے بارے یں کوئی فیصلہ دیتی ہے۔ جیسے عرش اور کرسی وغیرہ اور ان کے علاوہ اور بھی۔ پس نہیں ہے تم پر لازم کہ تو اعتقاد رکھے دوسرے احمقوں اور بے وقوفوں کی طرح جن کی عقل پر پردے پڑے ہوئے ہیں۔ سطحی علما کی پیروی کرنا ہم پر لازم نہیں ہے۔ ہمارے لیے تو اللہ کی کتاب اور اس کے رسولؐ کا کلام کافی ہے۔ ہم تو پیروی کرتے ہیں قرآن و حدیث کی، اور ہم نہیں کہتے کسی کو اللہ کے سوا اپنا کارساز، اور محمدیت کے علاوہ کسی اور راستے پر نہیں چلتے۔ ترپنویں (۵۳) باب میں جس کا نام بصائر من الرّب رکھا ہے ہم نے حدوث اور زمان کی حقیقت کو لکھ دیا ہے خالص تائید کے ساتھ اور ہم نے ثابت کر دیا ہے حدوث زمانی کو بھی تمام ممکنات کے ساتھ جدید منہج پر یوں کہ اس طرح نہیں گفتگو کی کسی نے بھی اور کوئی فرد بھی اس نہج پر سبقت نہیں لے جا سکا۔ پس اس طرف رجوع کر اور اس پر اعتقاد رکھ۔ پس جب تو جان لے کائنات کے حادث ہونے کی حقیقت کو تو سمجھ لے

کہ یہ زوال کے لیے بھی تیار ہے، اور وہ فنا کے قابل ہے - یعنی جس طرح عالم حادث ہے اسی طرح قابل فنا ہے - برابر ہے کہ یہ فنا ذاتی ہو یا زمانی ہو، اور فنائے مطلق ہمیشہ تمام موجوداتِ ممکنہ کو لاحق ہوتی ہے - جہاں تک اُن اشیا کا تعلق ہے جو زمانے کے ساتھ غیر فانی ہیں تو بے شک اُن کا فنا جو ہے اُن کے حدوث کے ساتھ فقط بالذات ہے - اور وہ چیزیں جو زمانے کے ساتھ محدثات (نئی ایجاد شدہ) ہیں اور اُن کے حدوث ذاتی کے ساتھ حدوث زمانی بھی جمع ہو گیا ہے - تو وہ فنائے زمانی کی اہل ہیں - اور جمع ہو جاتا ہے اُن کے فنائے ذاتی کے ساتھ فنائے زمانی - اور ہم نے یہ بحث تفصیل کے ساتھ اکتیسویں (۳۱) باب جس کا نام عبرۃ اولی الابصار ہے لکھی ہے - پس کلیتہً اسی طرف رجوع کرو -

اور جب تم نے جان لیا عالم کے حدوث اور اس کی فنا کی کیفیت کو تو یہ بھی جان لو کہ اللہ تعالیٰ نے اُس کو پیدا کیا اور وہی اس کا صانع ہے یعنی عالم کے لیے ایک خالق ہے، اور موجودات میں سے ہر چیز اللہ کی مخلوق ہے - وہ پاک ذات ہر چیز کی خالق ہے - اس طرح نہیں جیسے کہ گمان کرتے ہیں دہریے اور نیچری - کیونکہ وہ اقرار نہیں کرتے صانع کے وجود کا اور انکار کرتے ہیں واجب کا اور کہتے ہیں نہیں ہے کوئی عالم کے لیے بنانے والا - پس جس طرح جڑی بوٹیاں بغیر کاشت کے اُگ پڑتی ہیں بالکل اسی طرح موجودات بغیر خالق کے عالمِ وجود میں آجاتی ہیں - اور موجودات میں فاعل حقیقی نیچر ہی ہے - ہم ایسے باطل اعتقاد سے اللہ کی پناہ میں آتے ہیں - کافروں کا کوئی مولیٰ نہیں وہ بے وقوف ہیں لیکن وہ جانتے نہیں ہیں کہ اُس نے مخلوق کو پیدا کیا اور قدیم بالذات ہے، اور متقدم ہے تمام زمانی اور غیر زمانی قدما سے ذاتی تقدم کے ساتھ - وہ واجب الوجود ہے - برابر ہے کہ اسی کا وجود عین حقیقت ہو جیسے کہ حکما اور صوفیا کہتے ہیں، اور یہی حقیقت کا مقتضیٰ ہے جو اُس سے الگ ہونے کی نہیں جیسا کہ متکلمین کہتے ہیں - وہ واحد ہے وحدتِ ذاتی کے ساتھ - موجود ہے وجود حقیقی کے ساتھ - زندہ ہے ایسی زندگی کے ساتھ جس کے مقابل میں کوئی موت نہیں - اور علیم ہے اس علم کے ساتھ جو معلومات کو منقّش کرنے کا محتاج نہیں ہے - قادر ہے قدرت کے ساتھ جو وسیلوں کی محتاج نہیں ہے - وہ ارادہ کرنے والا ہے بغیر ارادے کے جو دل میں آنے والے خیالات کی طرح نہیں ہے اور کلام کرنے والا ہے ایسے کلام سے جو الفاظ و اصوات کا مقید نہیں ہے - سننے والا ہے بغیر کان کے سوراخ اور ہوا کی لہروں کے - دیکھنے والا ہے آنکھ کے توسّط اور نور کی مدد کے بغیر - اُس کی

صفات قدیم اور باقی ہیں جیسے اس کی ذات قدیم اور باقی ہے، اور کوئی نئی پیدا ہونے والی چیز اس کی ذات کے ساتھ مل نہیں سکتی۔ یعنی اُسے جدید صفت سے متصف نہیں کیا جا سکتا۔ ایسی صفت کہ جو اس کے لیے پہلے سے نہ ہو۔ اور یہ بچنا ہے اُس عقیدہ باطلہ سے جسے ابتدا کرنا کہتے ہیں، اور اہل بدعت میں سے بعض اس کے قائل ہیں۔ اللہ جسم کے ساتھ نہیں یعنی وہ اس سے پاک ہے اور مجسمیہ گروہ اللہ تعالیٰ کے مجسم ہونے کے قائل ہیں۔ اللہ اس سے بلند تر ہے، اور وہ جوہر بھی نہیں ہے۔ یعنی اس کے اوپر کوئی چیز پیش نہیں کی جا سکتی، اور نہ عرض ہے، یعنی وہ کسی چیز پر پیش نہیں کیا جاتا۔ کیونکہ جوہر اور عرض جو ہے یہ ممکن کی اقسام میں سے ہیں۔ اور جو واجب ہے وہ ممکنات کی جنس میں سے نہیں۔ نہ وہ تصویر ہے حسی جس کا تعلق تو جسم سے ہے، اور نہ وہ صورتِ عقلی ہے کیونکہ وہ تو عقل کے احاطے میں مقید ہوتی ہے اور نہ وہ مرکب ہے جیسا کہ گھر چھت اور دیواروں سے مرکب ہوتا ہے اور نہ ماہیت کے مرکب ہونے کی طرح ہے جو فصل اور جنس سے ترکیب پاتی ہے۔ نہ وہ تعداد کے ساتھ معدود ہے، اور وہ عددی واحد کی طرح نہیں ہے، اور نہ وہ محدود ہے جیسے حد جو فاصلے سے متعلق ہوتی ہے، اور نہ وصفی حد ہے۔ کیونکہ اُس کے کمالات لاانتہا ہیں، اور نہ کسی خاص جہت یا سمت کے ساتھ محدود ہے۔ بلکہ تمام کی تمام سمتیں اس کے چہرے کے نور سے منور ہیں۔ پس جس طرف بھی تم رُخ پھیرو اللہ کے چہرے کو پالو گے۔ اور نہ کسی معین جگہ میں ہے بلندی اور پستی میں سے، بلکہ وہ تو وہ ذات ہے جس کی آل آسمان میں بھی ہے اور زمین میں بھی ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ وہ مکانی نہیں اور نہ کسی زمانے میں ہے جو ازمنۂ ثلاثہ میں سے ہو۔ بلکہ ہر روز وہ اک نئی شان میں ہوتا ہے اور حاصل یہ ہے کہ وہ زمانی نہیں۔ اس کی کوئی مثال نہیں اور کوئی چیز اس سے مماثل نہیں۔ نہ اس کی کوئی شبیہ ہے، نہ کوئی چیز اس کے مشابہ ہے، نہ اس کی کوئی ضد ہے یعنی مخالف غیر جنس، اور نہ کوئی اس کا ہمسر ہے یعنی کوئی ہم جنس مخالف بھی نہیں۔ کوئی چیز اُس کے افعال میں اس کی پشت پناہی کرنے والی نہیں اور نہ اُس کے کمالات کے اظہار میں اس کی معاون ہے، اور وہ متحد نہیں ہوتا کسی دوسرے کے ساتھ جیسے کہ بعض، بعض کے ساتھ متحد ہو جاتے ہیں، اور وہ مل جُل بھی نہیں جاتا کسی چیز کے ساتھ جیسے کہ پانی اور دودھ آپس میں گھُل مل جاتے ہیں۔ اُس میں کوئی چیز حلول نہیں کرتی، جیسے کہ آواز حلول کرتی ہے ڈھانچے میں۔ کمال کی تمام صفات سے متصف ہے اور وہ کامل تمام ہے اپنے تمام کمالات میں،

اور وہ پاکیزہ ہے ہر قسم کے نقص اور زوال کے داغ دھبوں سے، اور مبرّا ہے ہر قسم کے عیوب اور نقائص سے، اور قیامت کے دن مومنوں کو نظر آنے والا ہے۔ ہم نے اس مطلب کو مفصل لکھا ہے سینتیسویں (۳۷) باب میں جس کا نام لقاء اللہ ہے۔ پس اسی کی طرف رجوع کر اور جان لے کہ اللہ تعالیٰ تمام چیزوں کا خالق ہے اور اُن کا مدبّر ہے، اور ان کی تقدیر بنانے والا ہے۔ اور ہر وہ چیز جو تھی جو ہے یا جو ہوگی وہ اس کے ارادے اور اندازے سے ہے۔ وہ تمام معلومات کا عالم ہے، اور اُس سے زمین یا آسمان میں کوئی ذرّہ بھر چیز بھی پوشیدہ نہیں، بلکہ ہر وہ چیز جو موجودات میں ہے گزری ہوئی یا آنے والی سب حاضر ہیں اس کے علم میں۔ اُس نے علمی طور پر بھی ہر چیز کو احاطے میں لیا ہوا ہے۔ درستی اور فساد میں سے کوئی چیز اس پہ واجب نہیں ہے۔ جیسے کہ اہلِ بدعت میں سے بعض لوگ کہتے ہیں کہ اصلاح یا درستی اللہ پر واجب ہے۔ اس مذکورہ اعتقاد سے اہلِ حق کی مُراد یہ ہے کہ وہ قادر ہے اور مختار ہے جو چاہتا ہے کرتا ہے اور جو چاہتا ہے حکم دیتا ہے، اور اصلاح کے واجب ہونے کی صورت میں فعل کو گھسیٹا جاتا ہے واجب ہونے کی طرف، پس اس پر غور کر لو۔ اور اس کے فعل کی کوئی غرض نہیں ہوتی اور ہم نے اشارہ کیا ہے ان مطالب کی طرف اس دوسرے مقدّمے میں تفصیل کے ساتھ اور ہم نے کھول دیا ہے اس معاملے کا راز اسے ذہنوں سے قریب کر کے اور مثالیں دے کر۔ اور نہیں ہے حکم سوائے اس کے۔ ملک بھی اللہ کا ہے، اور حکم بھی اللہ کا۔ اور حُسن وہ ہے جسے شریعت خوبصورت بتائے۔ اور قبیح وہ ہے جسے شرع قبیح بتلائے۔ اور یہ اہلِ حق کا اعتقاد ہے، یعنی خالص محمدیوں کا، اور وہی اہلِ سنّت والجماعت ہیں۔ حکما کہتے ہیں کہ حسن و قبح عقلی چیزیں ہیں۔ اور صوفیا کہتے ہیں کہ حُسن و قبح اعتباری چیزیں ہیں۔ اور فرشتے اللہ کے ہیں۔ پس فرشتوں کے وجود کا اعتقاد رکھ اور ان کی حقیقت کے ادراک کی فکر نہ کر، اور نہ کہہ جیسے کہ حکما کہتے ہیں کہ فرشتوں سے مراد شرع میں عقلیں یا نفوس یا زمانے بھر کی قوت دانشمندی ہے نہ کہ جیسے صوفیا کہتے ہیں کہ جبرئیل علیہ السلام، رسول اللہ صلعم کی قوتِ روحانی ہے یا ان کی قوتِ علم و عقل ہے کیونکہ یہ عقیدہ مؤمنین کی حالت کی اصلاح کرنے والا عقیدہ نہیں، اور نفع بخش نہیں ہے، اور تم پر نبوت کے کمالات کے فیض کو روک دیتا ہے اور بند کر دیتا ہے تیرے دل پر ملائکہ کی صورتوں اور اُن سے ملاقات کے دروازے کے کشف کو، اور ان سے بات کرنے کو، اور تجھ سے فرشتوں کی تائیدوں کو منقطع کر دیتا ہے، فرشتوں پر ایمان دین کی بنیاد ہے اس نہج پر جو کہ آیا ہے شرع میں اور اس پر بہت سارے امور کا انحصار

ہے نبوت اور ولایت کے معاملات میں، پس جان لو کہ بے شک وہ قادر ہیں مختلف شکلیں اختیار کرنے پر، اور وہ دو دو تین تین، چار چار پروں والے ہیں۔ اور اللہ اور رسول اللہ صلعم ان کی حقیقت سے آگاہ ہیں اور اُمت کے اولیا میں سے کامل ترین لوگ بھی ان کے اسرار سے واقف ہیں، اور انھوں نے انھیں دیکھا ہے اور بیداری کی حالت میں اُن سے ملے ہیں، اور ان سے باتیں کی ہیں۔ اور متعدد مرتبہ ان سے کلمات سنے ہیں، اور فرشتوں کی قسمیں ہیں۔ اُن میں سے جبرائیل علیہ السلام ہیں، اور منقطع ہو گیا جبرائیل کا نزول وحی کے نزول کے سلسلے میں خاتم النبیین علیہ الصلوٰۃ والسلام کی وفات کے بعد اور باقی ہے ان کی نسبت حقائق اور دقائق اور علوم کی تعلیم کے لیے محمدیوں کے دلوں پر اور اسے تائید جبرائیلی کہتے ہیں، اور یہ جائز ہے نبی کے علاوہ دوسروں کے لیے بھی جیسے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مومن شاعر کے حق میں کہا ہے۔ اور روح القدس جو ہے ان کی تائید کی تائید کرتے ہیں مجموعی طور پر۔ جس طرح کہ جبرائیل علیہ السلام مقرب فرشتے ہیں، اسی طرح میکائیل اور اسرافیل اور عزرائیل ہیں۔ اور اُن میں سے ہر ایک کے لیے ایک مقام معلوم اور خدمتِ معیّنہ ہے۔ علوم اور ہدایت کے معاملات کا القا جبرائیل کے ذمّے ہے۔ رزقوں کی تقسیم میکائیل کے اور صور میں پھونکنا اسرافیل کے ذمّے ہے، اور روحوں کو قبض کرنا عزرائیل کے لیے ہے۔ اور وہ نہیں سرکشی کرتے اللہ کی اس معاملے میں جس میں اُنھیں حکم دیتا ہے اور وہ کرتے ہیں وہی کچھ جس کا اُنھیں حکم دیا جاتا ہے کیونکہ ان کے اندر مختلف امور یکجا نہیں ہیں جیسے نفس اور طبیعت کہ کھینچے ایک معاملہ انھیں ایک طرف، اور دوسرا معاملہ دوسری طرف اور صادر ہو ان سے وہ کام جو مخالف ہو اس کام کا جس کا اُنھیں حکم دیا گیا ہو۔ "پس وہ تو قطعاً اللہ تعالیٰ کی نافرمانی نہیں کرتے"۔ اور جان لو کہ اللہ تعالیٰ نے جبرائیل علیہ السلام کے توسط سے اپنے انبیا کی طرف وحی کی اور اس کی نازل کی ہوئی کتابیں ہیں جو اُس نے نازل کیں اپنے رسولوں پر ان کی استعدادات اور ان کی زبانوں کی مناسبت سے۔ اُن میں سے ہے تورات جو نازل کی گئی حضرت موسیٰ علیہ السلام پر، اور زبور نازل کی حضرت داؤد علیہ السلام پر، اور انجیل نازل کی حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر، اور قرآن مجید نازل کیا ہمارے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام پر۔ اور اُس کے نام توقیفیہ ہیں یعنی اللہ تعالیٰ کے نام موقوف ہیں شارع علیہ السلام سے سننے پر۔ اور نہیں جائز کسی کے لیے کہ وہ اللہ کا نام رکھے کسی ایسے نام سے جو اپنی طرف سے ہو۔ اگرچہ پایا جائے وہ وصف اللہ سبحانہ تعالیٰ کے اندر۔ مثلاً

اللہ کو جواد کے نام سے موسوم کیا جائے گا، لیکن اس کا نام سخی نہیں رکھا جائے گا۔ اگرچہ ان دونوں کے معنی ایک ہی ہیں، اور اسی طرح قیاس کر لو دیگر اسماء پر۔ اور ہم نے لکھی ہے اس معاملے کی تفصیل تینتیسویں (۳۲) باب میں جس کا عنوان ہے تعلیم الاسماء۔ پس رجوع کرو اس کی طرف۔ اور وہی بندوں کے افعال کا خالق ہے جس طرح کہ وہ خالق ہے ان کی روحوں کا اور ان کے بدنوں کا۔ پس کفر اور معصیت اس کے ارادے سے اور اُس کی تقدیر سے ہیں، اور وہ اسے پسند نہیں کرتا، اور ہم نے اشارہ کیا ہے اس مطلب کی طرف دوسرے مقدمے میں۔ اس کا ذکر آگے قریب ہی مثال کے طور پر گزر چکا ہے۔ اور بندوں کے افعال اختیاری ہیں مجازی اعتبار سے، حقیقت کے لحاظ سے نہیں، اور اس میں تفصیل شرح و بسط کے ساتھ درج ہے چونسٹھویں (۶۴) باب میں جس کا نام کاشف الغطاء ہے۔ پس اس کی طرف رجوع کرو۔ اور بندے اپنے افعال کی طرف مجازی اختیار کے تعلق سے اجر پاتے ہیں۔ یا ان کی وجہ سے سزا دیے جاتے ہیں جنت وغیرہ کی نعمتوں میں سے اور جہنم وغیرہ کی سزاؤں میں سے۔ "اللہ جسے چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے"[۹۸] اسمائے جلالیہ کے مقتضیٰ کے تحت اور ہدایت کرتا ہے جسے چاہتا ہے اسمائے جمالیہ کے مقتضیٰ کے تحت! اور قبر کا عذاب اس کافر کے لیے ہے جو حق کی وحدانیت پر اور رسولؐ مقبول کی حقیقت پر ایمان نہ لایا اور فاسق کے لیے ہے جو مر گیا بغیر توبہ کے اور اللہ نے اُسے معاف نہ کیا، اور اہلِ اطاعت کو جنت وغیرہ کی نعمتوں سے نوازنا اس بنا پر ہے جو اللہ ہی جانتا ہے، اور جو وہ چاہتا ہے اپنے انعامات میں سے اور اپنی تجلیات میں سے۔ اور منکر نکیر کا موت کے بعد سوال کرنا برحق ہے، اور مرنے کے بعد اُٹھایا جانا بھی حق ہے اور اکٹھا کرے گا اللہ تعالیٰ لوگوں کو قیامت کے دن اُن کے عُنصریہ جسموں کے ساتھ جیسے وہ چاہتا ہے اپنی قدرتِ کاملہ کے ساتھ۔ اور میزان (ترازو) حق ہے کہ تولے جائیں گے اعمال اور اقوال سب کے سب، اور ان کا بھاری بھر کم ہونا یا اُن کا ہلکا پھلکا ہونا جان لیا جائے گا اُس دن جس میں کوئی شبہ نہیں ہے، اور کتاب (مُراد اعمالنامہ) حق ہے۔ پس جس کو دی گئی اس کی کتاب دائیں ہاتھ میں پس وہ تو مزے کی زندگی میں ہوگا، اور جس کو دی گئی اس کے بائیں ہاتھ میں وہ کہے گا۔ اے کاش نہ دیا جاتا مجھے اعمال نامہ اور میں تو نہیں جانتا تھا حساب کیا ہے۔ حساب بھی برحق ہے اور داخل کرتا ہے اللہ تعالیٰ جنت میں جسے چاہتا ہے بغیر حساب کے جس طرح وہ رزق دیتا ہے دنیا میں جسے چاہتا ہے بغیر حساب کے۔ اور پرسش بھی برحق ہے۔ اللہ سے تو نہیں سوال کیا جاتا جو وہ کرتا ہے، لیکن سب لوگوں سے پرسش

ہوگی، اور حوضِ کوثر بھی برحق ہے، اور راستہ (پل صراط) بھی برحق ہے، اور نہیں ہے کوئی شخص مگر وہاں پر اترنے والا ہے، اور ان تمام امور کے اسرار مرقوم ہیں کتاب مستطاب (عمدہ) نالۂ عندلیب میں (اللہ اُسے محفوظ رکھے) پس رجوع کرو اُس کی طرف۔ اور شفاعت بھی برحق ہے، یعنی رسولؐ کو شفاعت مومنین کی کوتاہیوں کے لیے اور اولیا اللہ کو اللہ کی اجازت سے مخلصین کے لیے۔ اور جنت بھی برحق ہے مع اپنی نعمتوں کے اہلِ جنت کے لیے جس کا اللہ تعالیٰ نے اُن سے وعدہ کر رکھا ہے، اور آگ بھی برحق ہے مع اپنی سزاؤں کے کافروں اور فاسقوں کے لیے، اور جن کو معاف نہیں کیا جائے گا، اور جنت وجہنم دونوں مخلوق ہیں اور موجود ہیں اپنے خارجی وجود کے ساتھ، اور ہمیشہ باقی رہنے والی ہیں اور فنا ہونے والی نہیں ہیں زمانے میں، اور نہ فنا ہوں گے ان دونوں میں بسنے والے ان دونوں میں داخل ہونے کے بعد۔ اور ہر وہ چیز جس کی خبر دی ہے نبی کریم صلعم نے دنیا میں احکام شرعیہ میں سے روز قیامت کی شرطوں میں سے اور آخرت کے احوال میں سے حق ہے یعنی حقیقت کے عین مطابق ہے۔ اور نبی کریم صلعم اپنی تمام خبروں میں مخبر صادق ہیں، اور ایمان دل سے تصدیق اور زبان سے اقرار کرتا ہے یعنی کلمہ شہادت کا زبان سے تلفظ کرنا اور دل سے اُس کے معانی کی تصدیق کرنا، اور یہ یعنی ایمان زیادہ اور کم نہیں ہوتا اور یہی مذہب ہمارے مجتہد امام ابوحنیفہ رح کا ہے۔ اور مجتہدین میں سے بعض کے نزدیک جیسے امام شافعی رح وغیرہ ہیں ایمان زیادہ اور کم ہوتا ہے، اور ایمان اور اسلام امام ابوحنیفہ رح کے نزدیک ایک ہی چیز ہے۔ اور جو چیز سمجھ آتی ہے اللہ تعالیٰ کے کلام کے سیاق وسباق میں اور رسول اللہ صلعم کی حدیث میں سے، وہ دلالت کرتی ہے ان دونوں کی مغائرت پر یعنی ایمان دل کے ساتھ متعلق ہے، اور وہ عقیدے کی درستی ہے۔ اور دین اور اسلام کے معاملات کی تصدیق متعلق ہے ظاہری اعضا سے، اور وہ یہ ہے کہ اوامر (نیک کام) کو اختیار کیا جائے، اور نواہی (ممنوعہ کام) سے اجتناب کیا جائے۔ اور جب اُنھوں نے ثابت کی ایمان کی تعریف تصدیق قلب کے ساتھ اور اقرار لسان کے ساتھ، اور اقرارِ لسان تو عمل ہے اعضا کے اعمال میں سے، کیونکہ زبان عضو ہے اعضا میں سے۔ تو کفایت کر دی ہمارے مجتہد نے اسی قدر اعمال میں سے نرمی کرتے ہوئے، رحم کرتے ہوئے کوتاہیاں کرنے والے مومنین پر، اور انھوں نے شمار کیا اسلام اور ایمان کو ایک ہی معاملہ۔ اللہ انھیں جزا دے ہماری طرف سے بہترین جزا، اور داخل کرے اُنھیں اللہ تعالیٰ اپنی رحمتِ خاصہ میں، جیسے اُس نے داخل کیا کوتاہیاں کرنے والے مومنین کو مسلمین کے زمرے میں، اور مومنوں میں سے کسی کو نہیں چاہیے کہ وہ کسے

انشاء اللہ تعالیٰ میں مومن ہوں۔ یہ بات خاتمہ بالایمان پر نظر کرتے ہوئے ہے نہ کہ باعتبار حال۔ اور ہر جانب کا مالک وہی ہے۔ ہر ایک کے لیے ایک رُخ ہے جس کی طرف وہ مُڑتا ہے۔ مایوسی کا ایمان مقبول نہیں یعنی اس حالت میں ایمان کچھ فائدہ نہیں دیتا۔ اور کبیرہ گناہ ایمان دار بندے کو ایمان سے خارج نہیں کرتا کیونکہ احکام میں کوتاہی ایک اور معاملہ ہے اور انکار دوسرا معاملہ ہے۔ اور کفر اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور رسول اللہ صلعم کی حقیقت کا انکار کرنا ہے نہ کہ اعمال میں کوتاہی غفلت اور سستی سے ہو۔ بدعت پرستوں کے فرقوں میں سے بعض نے یہ گمان کیا ہے کہ کبیرہ گناہ بندے کو ایمان سے نکال دیتا ہے، اور یہ عقیدہ باطل ہے اور کبیرہ گناہ کرنے والے ہمیشہ آگ میں نہیں رہیں گے، بلکہ وہ جو بغیر توبہ کے فوت ہوئے۔ اور جہنم میں ہمیشہ رہنا کافروں کے لیے مخصوص ہے۔ "بے شک اللہ تعالیٰ نہیں بخشتا اس بات کو کہ اس سے شرک کیا جائے اور اس سے کم جس کے لیے چاہتا ہے اُسے بخش دیتا ہے"[99] رسول مقبولؐ کی شفاعت سے اور اولیا کی وساطت سے یا اپنی خاص رحمت کے ساتھ بغیر کسی سبب یا حیلے کے جسے چاہتا ہے اپنے مومن بندوں میں سے! اور اللہ رحم کرنے والا ہے مومنوں پر، اور جائز ہے سزا دینا صغیرہ گناہوں پر بھی۔ اور اللہ عذاب دیتا ہے جسے چاہتا ہے چھوٹے جرموں پر اپنے جلال کے مقتضیٰ کے تحت، اور وہ اپنے بندوں پر غالب ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے بھیجا ہے رسولوں کو بشریں سے مقام جمع سے مرتبۂ فرق تک بشارت دینے والے آخرت کی بشارتوں کے ساتھ اور ڈرانے والے بنا کر عاقبت کی تکلیفوں کے ساتھ۔ اور بیان کرنے والے لوگوں کے لیے جس کے وہ محتاج ہوتے ہیں دُنیا کے اُموریں سے، اور دین کے اموریں سے۔ اور انھوں نے کھول کھول کر بیان کی معاش (دنیاوی گزران) اور معاد (آخرت) خوبصورتی سے اور کوشش کی دلوں کی اور جسموں کی اصلاح میں اور ان کی مدد کی کھُلے کھُلے معجزوں سے جن پر کوئی بشر غیبی مدد کے بغیر قادر نہیں ہو پاتا، اور روشن آیات سے مدد کی جو یقین کے لیے مفید ہیں اور منکرین کے انکار کے لیے برہان قاطع ہیں۔ اور سب سے پہلے نبی دُنیا میں ظہور کے اعتبار سے آدم علیہ السلام ہیں (درود و سلامتی ہو ہمارے نبیؐ پر اور اُن پر) اور وہ ابو البشر ہیں اور خلیفہ ہیں اللہ کے زمین پر اور ان میں سے آخری وجود کے لحاظ سے حاضر ہونے میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں (درود و سلامتی ہو ان کی آل پر اور اُن کے صحابہ پر) اور وہ خاتم النبیین اور نبیوں میں سے بہترین نبی ہیں۔ اور اولیٰ بات یہ ہے کہ انبیا کے عدد کو معین نہ کیا جائے اور اللہ بہتر جانتا ہے ان کی تعداد کو۔ اور وہ سب کے سب اللہ ہی کی طرف سے اُس کے پیغامات اور احکامات پہنچانے والے تھے۔

اور وہ سچے ہیں اپنی تمام خبروں میں اور معصوم ہیں اللہ کی عصمت کے ساتھ اور نبوت کے درجے اور رسالت کے منصب سے معزول ہونے والے نہیں۔ اور انبیا میں افضل ترین محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں عزت و منزلت اور اللہ کے ہاں قربت سے اور نبوت اور رسالت کے اتمام اور اخلاقِ جمیلہ اور اوصافِ حمیدہ کی اکملیت اور مزاج کے اعتدال اور ہمت کی بلندی اور عقل کی قوت اور علم و معرفت کی وسعت اور تمام کمالات کی جامعیت کے لحاظ سے۔ اور وہ بھیجے گئے ہیں تمام مخلوق کی طرف ہدایت اور رہنمائی کے لیے۔ اور ان کا معراج بیداری میں ہوا، ان کی شخصیت کے ساتھ آسمان تک یعنی ان کے جسم عنصری کے ساتھ، نہ کہ اُس طرح جس طرح کہ بعض عقل پر پردہ پڑے ہوئے لوگوں کا گمان ہے کہ آپؐ کا معراج روحانی اور نفسی تھا جسم کے ساتھ نہیں تھا کیونکہ یہ تو غیر معقول ہے۔ حاشا و کلّا بلکہ ان کا معراج تو فرش سے آسمان تک، اور پھر وہاں تک جہاں تک اللہ نے چاہا۔ فلکِ قمر سے اس مقام تک جسے اللہ ہی جانتا ہے جسم کے ساتھ ہی ہوا۔ پس ان کا اس طریقے کا معراج جسے عقل سمجھ نہیں پاتی، مومنین اور صادقین کے نزدیک حق ہے اور ثابت ہے، اور ان کی اُمّت بہترین اُمت ہے جیساکہ وہ خود افضلِ انبیاءؑ ہیں، اور ان کی شریعت شریعتوں میں سب سے زیادہ کامل ہے دُنیا و آخرت میں بندوں کے حال کی اصلاح کے معاملے میں۔ اور ان کا دین تمام دینوں کو منسوخ کرنے والا ہے اپنی راستی اور اپنی حقیقت میں۔ اور طریقۂ محمدی جو ہے وہ قریب ترین راستہ ہے اللہ اور رسولؐ تک پہنچنے کا۔ اور ان کے صحابہ اُمّت میں سے بہترین ہیں۔ ان کی صحبت کو پانے کی برکت سے اور ان کو دیکھنے کے شرف سے۔ اور خلفائے راشدین یقیناً اصحاب میں سے سب سے افضل ہیں جس میں کوئی شبہ نہیں۔ اور ان کی فضیلت خلافت کے استحقاق کے سلسلے میں جس ترتیب زمانی سے وہ خلیفہ ہوئے اسی طرح سے ہی ہے۔ عمر اور سبقت اور حقوق اور اجتماع اور وقتی مصلحت اور تدبیر اور اندازہ وغیرہ کے مقتضیٰ کی مناسبت سے ہے۔ ان میں سے ہر ایک کے لیے جو تھے امورِ حقہ اور لاحقہ میں سے جیسے کہ چاہا اللہ نے اور جیسے کہ رضا ہوئی اس کے رسولؐ کی نہ یہ کہ تمام امور میں ان کی باہمی فضیلت خلافت ہی کی ترتیب سے ہے۔ اور افضلیت سے مراد ثواب کی کثرت ہے، یعنی ثواب کے حصول کی کثرت میں، اُس کوشش کے بدلے میں جو اُنھوں نے کی اسلام کے اعلان میں اور دین کی اشاعت میں اور شریعت کی تقویت میں اور خلافت کے انتظام میں، اور اللہ کے کلام کو جمع کرنے میں اور شریعت کی حقیقت اور الوہیت کے اسرار کھولنے میں۔ یہ نہیں کہ اس سے مراد ہو رسولؐ اللہ سے قربت یا یہ کہ اللہ سبحانہٗ تعالیٰ سے قریب ہونا ہو۔ کیونکہ یہ ایک علیحدہ

امر ہے اور خلفاء میں سے ہر ایک کو اللہ اور اُس کے رسولؐ سے اک خاص نسبت ہے جس میں کوئی ایک دوسرے میں شریک نہیں جیساکہ پوشیدہ نہیں اُن کی احادیث کی پیروی کرنے والوں پر۔ ان میں سے ہر ایک کو بڑا عظیم مقام حاصل ہے اللہ کے ہاں اور اُس کے رسولؐ کے ہاں۔ اور ان سے محبت کرنا حقیقت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کرنا ہے اور ان سے بغض رکھنا (ہم اس سے اللہ کی پناہ مانگتے ہیں) حقیقت میں رسولؐ اللہ سے بغض رکھنا ہے اور ایمان کی سلامتی ان کی پیروی میں ہے اور اُن کے پیچھے لگنے میں ہے۔ ان میں سے ہر ایک امیر المومنین ہے، اور وہ خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے خلیفہ تھے (اللہ ان سب پر راضی ہو) اور مرتبہ خلفا کے بعد باقی عشرہ مبشرہ آتے ہیں۔ اور اُن کے بعد اہلِ بدر ہیں اور اُن کے بعد اہلِ اُحد ہیں، اور اُن کے بعد اہل بیعت الرضوان ہیں۔ اور جب تو نے صحابہؓ کے مراتب کو جان لیا تو یہ بھی جان لے کہ فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اہلِ جنت میں عورتوں میں سردار ہیں۔ اور نبی کریم صلعم کی بیٹیوں میں سب سے افضل ہیں اور حسنؓ اور حسینؓ دونوں اہل جنت کے جوانوں کے سردار ہیں۔ اور وہ دونوں رسول اللہ صلعم کے بیٹے ہیں حقیقتاً اگرچہ واسطے سے ہیں۔ رسول اللہ صلعم کے بعد خلافت تیس برس تک رہی اور یہ مرتبہ اور مقام ہے اللہ تعالیٰ کے قرب کے مقامات میں سے، جیسے ولایت اور امامت نیچے ہے نبوت اور رسالت کے اور باقی تمام مراتب سے اوپر۔ اور خُلفا میں سے پہلے صدیق اکبرؓ ہیں، اور اُن میں سے آخری حضرت علی مرتضیٰؓ ہیں اور ان پر خلافت ختم ہوگئی۔ پھر اس کے بعد یعنی خلافت کے ختم ہونے کے بعد بادشاہ ہیں اور سلطان ہیں اور امارت ہے اور سلطنت ہے، جیسے کہ تمام سلطانوں کا حال ہوتا ہے اب تک ۔ ان میں سے جو نیک بخت ہیں وہ نیک بخت ہیں، اور جو بد بخت ہیں وہ بد بخت ہیں۔ اور ہم صحابہ کے ذکر سے اب رُکتے ہیں بخیر و خوبی۔ بہر حال رسول اللہ صلعم کی صحبت کے شرف سے اور سدِ باب کے لحاظ سے آپ کے اصحاب میں سے ادب کے معاملے میں کم ترین مقام کے کیوں نہ ہوں (وہ بھی ہم سے افضل ہیں) اور مجتہد خطا بھی کرتا ہے اور درست بات بھی کہتا ہے، اور خطا اجتہاد میں جائز ہے لیکن خطائے اجتہادی مطلق ثواب سے خالی نہیں ہوتی، اس پر بھی مجتہدین کو ثواب ملتا ہے ۔ اگرچہ وہ درست اجتہاد کے ثواب کے مقابلے میں تھوڑا ہوتا ہے۔ اور ہم کسی اہلِ قبلہ کو کافر قرار نہیں دیتے۔ اگرچہ وہ اکثر معاملات میں جھٹلانے اور بدعت کا طرزِ عمل اپنائے ہوئے ہوں کیونکہ توحید کا اقرار اور رسالت کی تصدیق اور محمدی گروہ میں گھل مل جانا اور قبلے کی طرف متوجہ ہونا انھیں ایمان سے مطلقاً نہیں

نکالتا۔ پس وہ مومنین میں سے اہلِ بدعت اور جھٹلانے والے ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ لا اِلٰہَ الا اللّٰہ کہنے والوں سے رک جاؤ، انھیں کسی گناہ کی وجہ سے کافر قرار نہ دو اور جس نے اہلِ لا اِلٰہَ الا اللّٰہ کو کافر قرار دیا وہ کفر کے زیادہ قریب ہے۔ اور بشری رسول، ملائکہ کے رسولوں سے زیادہ افضل ہیں، کیونکہ انسان اشرف المخلوقات ہے اور افضل موجودات ہے اور اس نے تمام ممکنات میں سے کمالات کو جمع کیا ہے۔ پس رسالت میں بھی وہ زیادہ شرف والا ہے اور زیادہ افضل ہے ملائکہ کے رسولوں سے۔ ملائکہ کی رسالت مبادی اور مقدمات کی طرح ہیں، اور انسان کی رسالت اُس کے مطالب علّت غائیہ ہیں۔ اور بشریں سے عام جو ہیں وہ افضل ہیں عام فرشتوں سے، اور بشریں سے عوام سے مراد اولیا ہیں اور عوام ملائکہ جو ہیں وہ ہیں جو عالین اور مقربین میں سے نہیں، اور اولیا کی کرامات حق ہیں اور کبھی کبھی صادر ہوتا ہے اُن سے ایسا معاملہ جو کرامات اور تصرّفات کی جنس میں سے ہوتا ہے۔

ہاں البتہ بعض میں وہ زیادہ ہوتی ہیں، اور بعض میں تھوڑی۔ اور کرامت ولایت کی شرط نہیں ہے اور کرامات کی کثرت افضلیت کی دلیل نہیں ہے، کیونکہ یہ امر قربِ حق پہ معتبر نہیں ہے۔ اور یہ کفار سے بھی صادر ہو جاتا ہے جسے استدراج کہا جاتا ہے، اور نہیں پہنچتا ولی انبیا کے درجے کو مقام قرب اور منزل اصالت کو، اور نہیں پہنچتا کوئی بندہ کسی ایسے مقام پر جہاں امر اور نہی ساقط ہو جائیں (ہرگز نہیں، ہرگز نہیں) اور جسے یہ وہم لاحق ہو جائے وہ ملحد اور زندیق ہے، اور نصوص امر حقیقی جو ہیں ظاہر پر محمول کی جاتی ہیں۔ اس کی عبارت کے ظاہری معنوں سے جو چیز حاصل ہوتی ہے اُس سے حکم لگایا جاتا ہے۔ اس کے ظاہری معنی سے ہٹ کر اس کے ان معانی کی طرف جانا جنھیں اہلِ باطن نے پیدا کیا ہے ظاہری معانی کے انکار کے ساتھ، اور اُس کی موافقت میں اس پر عمل ترک کر دینا الحاد و زندیقیت ہے، اور اُس کے ظاہری معنی کا اقرار اور اس کے مطابق اس پر عمل، اس میں کوئی بُرائی نہیں۔ بے شک علم میں راسخ لوگوں نے تاویل کی ہے باطنی معنی کے لحاظ سے، اور عارف باللہ لوگوں نے اللہ کے کلام کے باطنی معنوں کے اسرار کو الگ الگ کیا ہے، بلکہ یہ تو اللہ کا فضل ہے۔ وہ دیتا ہے جسے چاہتا ہے جیسے کہ اکابر اور متقدمین اور متاخرین کی تصنیفات میں ہے۔ اور زندوں کا دُعا کرنا مُردوں کے لیے، اور ان کی طرف سے صدقات دینا۔ اس میں ان کے لیے فائدہ ہے اور پہنچتا ہے ثواب مُردوں کو اور عذاب میں تخفیف کر دیتا ہے اور مدد دیتا ہے درجات کی ترقی میں، اور اللہ دعاؤں کو قبول کرنے والا ہے۔ اور جواب دیتا ہے اللہ جس کو چاہتا ہے اور حاجات

کا پورا کرنے والا ہے تمام مخلوقات کی ۔ اور جائز ہے نماز پڑھنا مومنین میں سے ہر فاجر اور نیک کے پیچھے اور مسح کرنا موزوں پر حضر و سفر میں ۔ مقیم کے لیے مدت ہے رات اور پورا ایک دن یعنی کامل وقت حدث (وضو ٹوٹنے کا وقت) سے لے کر اُس وقت آخر تک (چوبیس گھنٹے) اور مسافر کے لیے پورے تین دن کی ۔ گناہ کو حلال سمجھنا چاہے چھوٹا ہو یا بڑا اور اُسے حقیقت جاننا کفر ہے ۔ کیونکہ اس کو حقیقت جاننا شریعت کو گھٹیا کرنا ہے، اور اُس کو حلال جاننا شریعت کا انکار ہے ۔ اور شریعت کا مذاق اڑانا اور اس کی اہانت کرنا کفر ہے ۔ پس بچ شریعت کے استہزا اور اُس کی اہانت سے چاہے وہ ہنسی مذاق سے یا غفلت ہی سے ہو، انکار سے نہ ہو ۔ اور کفر کے ساتھ ہزل (مسخرگی) کفر ہے ۔ یعنی کفر کے اعمال کا ارتکاب اور اُس کے اوضاع سے مشابہ ہونا مذاق کے طور پر بھی کفر ہے ۔ اور نہیں ہے مناسب مومن کے لیے کفر کے ساتھ تشابہ ۔ اور جس نے کسی قوم سے مشابہت پیدا کی پس وہ اُنہی میں سے ہے ۔ اور نشے میں مبتلا آدمی کے کفر پر فیصلہ نہیں دیا جائے گا، کیونکہ نشے میں دُھت لوگوں کے افعال اور اقوال معتبر نہیں ۔ اور کاہن کی تصدیق کرنا اس معاملے میں جس کی وہ خبر دیتا ہے غیب کے بارے میں کفر ہے، پس نہ اعتبار کر ان کی خبروں پر، اور نہ اعتماد کر ان کے اقوال پر، اگرچہ وہ اپنی خبروں میں سچے کیوں نہ ہوں ۔ اور اللہ سے مایوسی کفر ہے ۔ اللہ کی رحمت سے نہیں مایوس ہوتے مگر کافر لوگ[۱] ۔ اور امن میں رہنا اللہ کی طرف سے کفر ہے، اور نہیں امن میں رہتے اللہ کی چال سے مگر غافل لوگ ہی ۔ اور ایمان خوف اور اُمید کے درمیان ہے[۲] ڈر اُس کے غضب سے ہر زمانے میں اور اُمید رکھ اس کی رحمت کی ہر آن ۔ اور جان لے کہ اللہ تعالیٰ سخت عذاب دینے والا ہے، اور بہت بخشنے والا ہے، اور بہت رحم کرنے والا ہے[۳]

شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان اور نہایت رحم کرنے والا ہے

واردات کا آغاز

تسمیہ (بسم اللہ) اور تحمید (الحمد شریف) کی ابتدا کے سلسلے میں جو کچھ لوگوں نے لکھا ہے وہ یہ ہے ہر دو کی ابتدا کے بارے میں احادیث ہیں۔ لہذا تسمیہ میں حقیقی ابتدا ہے جسے حقیقت پر بھی تقدم ہوتا ہے، اور تحمید میں نسبتی ابتدا ہے جو تمام مطالب پہ اولیت رکھتی ہے۔ حمد بیان کرنے کے لیے بھی تسمیہ (بسم اللہ) ضروری ہے۔ کیونکہ اللہ کی حمد بیان کرنے کے لیے بھی اسی کے نام کی مدد کی ضرورت ہے۔ آپ اسے خارج از بحث سمجھیے۔ حقیقت یہ ہے کہ تسمیہ میں تحمید ہے اور تحمید (الحمد شریف) میں تسمیہ۔ اور کلامِ الٰہی کے مطابق پہلے بسم اللہ ہے اور پھر الحمد للہ۔ یعنی اسی سے ابتدا ہے اور اسی کی طرف انتہا۔ اور جو کچھ علم ازلی کے ظاہر کرنے والے، پوشیدہ اور آشکارا رازوں کے جاننے والے، وراثتِ پیغمبر اسلام کے شرف سے مشرف ہونے والے حضرت علیؓ سے بسم اللہ شریف کے معانی کی جامعیت بلکہ حرف ب اور اُس ب کے نقطے کے بارے میں روایت ہے۔ کسے یارا ہے کہ اس کی تشریح کر سکے اور کسے مجال کہ اُس کے اسرار و رموز سے پردہ اُٹھا سکے۔ یعنی حضرت علیؓ نے فرمایا کہ تمام اسرارِ الٰہی قرآنِ مجید میں ہیں اور قرآنِ مجید کے سارے رموز و اسرار سورۂ فاتحہ میں ہیں، اور سورۂ فاتحہ (الحمد شریف) کے تمام اسرار بسم اللہ میں ہیں۔ اور بسم اللہ کے تمام رموز بسم اللہ کے ابتدائی حرف ب میں ہیں اور ب کے سارے رموز اس حرف کے نقطے میں ہیں

اور میں حرف ب کا وہی نچلا نقطہ ہوں۔ اور اللہ تعالیٰ کی ہدایت وعنایت اور اس کی لامتناہی رحمتوں سے جو حقیقتیں اور باریک نکات میرے دل پر کھلتے ہیں، اور اس عالی جناب کی وساطت سے رموز واسرار اور برکات وانوار کا جو پرتو پڑتا ہے اس کی بدولت میں قرآنِ ناطق کے اجزا کا ایک جزو اور اسی حرف ب کے نیچے درج ہونے والا نقطہ ہوں جو ظاہری تقریر و تحریر کے احاطے سے باہر ہے۔ جزوی عقل اس کے فہم وادراک اور بصیرت اُس نقطے کی لامتناہی وسعتوں سے ناآشنا ہیں۔ اور اس کے لامتناہی اجزا کی انتہا سے بے خبر۔ الغرض بسم اللہ خدائی رازوں میں سے ایک راز ہے، اور اللہ تعالیٰ کے لامتناہی خزانوں میں سے اک خزانہ۔ اور وہ تریاق (اکسیر) ہے جو اللہ تعالیٰ نے دنیاوی زہروں اور مضرتوں کو رفع کرنے کے لیے مومنوں کو عطا فرمایا ہے۔

حرف ب اور لفظ اسم کا بیان

یہ سمجھ لیں کہ ب محذوف سے تعلق رکھتی ہے خواہ فعل پڑھنے یا بنانے کے سلسلے میں ہو خواہ شروع کرنے اور آغاز کرنے کے لیے ہو اور تسمیہ (بسم اللہ) میں ضمیر یں بسم اللہ کے مبتدا کا کام دیتی ہیں جیسا کہ مسافر کوچ کے وقت کہتا ہے کہ اللہ کے نام اور اُس کی برکت کے ساتھ، یعنی کوچ کرتا ہوں اللہ کے نام کے ساتھ۔ اور اسی طرح ذبح کرتے وقت ذبح کرنے والا کہتا ہے۔ پس ہر صورت میں جو کچھ بھی ہے وہ اللہ کی مدد اور اسی کے ساتھ تعلق سے ہے۔ جس پہ عمل کیا گیا، یعنی بسم اللہ کو پہلے لانا اور ضمیر یں چھپے ہوئے عمل کرنے والے کو بعد میں لانا نہایت ہی مناسب ہے جیسا کہ خود اللہ تعالیٰ کے اپنے اس قول میں ہے کہ "اُس کا چلنا اور اس کا ٹھہرنا اللہ ہی کے نام سے ہے"[۱] اور یا جیسے حدیث شریف میں ہے کہ اللہ ہی کے نام سے باہر نکلنا اور اسی کے نام سے اندر داخل ہونا جہاں عامل بعد میں آیا ہے[۲] ہم آپ کی عبادت کرتے ہیں[۳] اس آیت کریمہ میں معمول کے زیادہ اہم ہونے اور خصوصیت وابتدا پر زیادہ دلالت کرنے کی بنا پر ہے جب کہ یہاں بسم اللہ کی تشریح میں متن وسط میں آیا ہے۔ صحیفۂ واردات کا بسم اللہ سے شروع کرنے پہ خبردار کرنا منظور ہے۔ یہاں واردات کا آغاز مبتدا ہے اور بمنزلہ عامل کے۔ اس لیے اُسے پہلے لایا گیا ہے۔ چنانچہ سب سے پہلے نازل ہونے والی اس آیت کریمہ میں کہ "اپنے رب کا نام لے کر پڑھ"[۴] عامل کو مقدم کرنا۔ کیونکہ آیت شروع اسی سے ہوتی ہے، اور اُس کی قرأت کا

حکم اہم ہے۔ اور کشاف کے فاضل مصنّف کا کہنا ہے کہ ب کے دو معنی ہیں، ایک مدد اور دوسرے اللہ کے نام کے ساتھ تبرکاً لانا۔ اور یہ بھی کہا کہ دوسری وجہ نہایت عمدہ بھی ہے اور عربی زبان میں زیادہ مستعمل بھی، یعنی عربی زبان کے زیادہ قریب بھی ہے اور فصیح بھی۔ کیونکہ بائے استعانت یعنی امدادی ب کے استعمال میں خاص طور پر معانی میں زیادہ زور، ہم نشینی اور مشابہت پہ ہے، اور مقام کے مقتضیٰ کے مطابق اعلیٰ بھی ہے اور زیادہ موافق بھی، اس لیے کہ بسم اللہ کی برکت سے آغاز کرنا گویا اللہ تعالیٰ کا ادب اور اُس کی تعظیم ہے برعکس اس کے کہ اُسے ٹوٹا کر ادھر لایا جائے۔ جب اسے ہم نشینی پر محمول کیا جائے تو یہ فعل کے تمام اجزا کی مشابہت پر زیادہ دلالت کنندہ ہوگا۔ اور "اسم" اپنے مسمّیٰ کی علامت اور نشان ہوتا ہے۔ لغت میں اسم اس لفظ کو کہتے ہیں جو مسمّیٰ کے لیے رکھا گیا ہو یا اپنے ہی معنی کے لیے ہو۔ لفظی اعتبار سے لفظ اسم کسی چیز کا مضاف ہوتا ہے اور اس کی اسمیّت لفظ مضاف الیہ اور اُس کے ظاہر پہ دلالت کرتی ہے۔ اور معنوی اور مسمائی لحاظ سے مدلول اور مسمائی کی حقیقت پر اور اس پہ صادق آنے اور متحد ہونے پہ دلالت کرتی ہے۔ پس اللہ کے نام سے شروع تو تلفظ و کتابت میں یُمن برکت کے واسطے کیا جاتا ہے۔ اور حقیقت میں مراد مدلول و مسمّٰی ہی ہوتا ہے۔ لفظ اسم زائد اور متمم بھی ہوتا ہے مگر منظور وہی مضاف الیہ ہوتا ہے یُمن و برکت کے واسطے۔ خدا نے چاہا تو اسم اللہ کا بیان الحمد شریف کی تشریح کے دوران آئے گا۔

اسمائے رحمٰن و رحیم کی تحقیق اور ان کے تقدّم و تاخّر کی وجہ

یاد رہے کہ رحمان و رحیم کے معنی بخشنہار کے ہیں۔ یہ دونوں "رحمت" سے مشتق ہیں جس کے معنی ہیں بخشنا اور مہربانی کرنا۔ اور یہ دونوں صفتیں رَحِمَ (ح کی زیر کے ساتھ) مبالغے کے لیے ہیں اور متعدی کے معنوں میں ہیں۔ اس کے معنی احسان کرنا ہیں جیسے غضبان غَضَبَ سے اور علیم عَلِمَ سے۔ پس رحیم بعض کے نزدیک صیغہ مبالغہ ہے اور اس کی بنا عین کلمے میں ضم ہونے کے بغیر ہی ہے۔ اگرچہ یہ صفت مشبہ ہے اکثر کے نزدیک رحمان کی طرح۔ پس عین کلمہ کو ضم لانے کے بعد کیونکہ صفت مشبہ جائز نہیں مگر لازم ہونے کی حالت میں اور رَحِمَ (ح کی زیر کے ساتھ) متعدی ہے، لیکن یہ دونوں صیغے بالاتفاق مبالغے کا فائدہ پہنچاتے ہیں۔ یہ دونوں مبالغے کے صیغے ہیں یا نہیں یا اُن میں سے ایک مبالغے کا صیغہ ہو اور دوسرا صفت مشبہ۔ اور صفت مشبہ کا مبالغے کا فائدہ دینا دلالت کے لیے ہے اُس کے ثابت ہونے اور

استمرار کے ساتھ پائے جانے سے اور تمام علما کے نزدیک فعالاً اور فاعلاً جیسے اور صیغے اللہ کی صفات میں برابر ہیں۔ اور لغت میں رحمت کے معنی رقت قلب اور قلبی لگاؤ کے ہیں جو فضل اور احسان کے متقاضی ہوتے ہیں اور کہا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اسما جو ہیں نتائج کے اعتبار سے لیے جاتے ہیں جو کہ افعال ہیں مبادی کے علاوہ جو کہ اثرات مرتب کرتے ہیں۔ پس ان الفاظ کا اطلاق جو دلالت کرتے ہیں صفات پر اللہ تعالیٰ کا اُن سے متصف کیا جانا ممکن نہیں۔ جیسے غضب اور رحمت ملی جلی ایک دوسرے کے پیچھے آنے والی کیفیات میں سے ہیں تاثر اور انفعال کے لیے ان اثرات کی حیثیت میں جو صادر ہوتے ہیں اُن سے مقصد اور مدعا میں۔ مثلاً غضب جو ہے اس کا اثر تکلیف پہنچاتا ہے مغضوب علیہ پہ اور رحمت کا مقصد انعام اور احسان کرتا ہے۔ میں یہ کہتا ہوں کہ مخصوص کرنا بعض صفات کے ساتھ اس طرح کہ بعض دوسری صفات کو چھوڑ دیا جائے اللہ تعالیٰ کو ان صفات سے متصف کرنے کے امکان یا عدم امکان میں سے نہیں۔ کیونکہ تمام امکانی مراتب، تمام اسمائی صفاتی حیثیتوں میں ممکن نہیں کہ ان کو محمول کیا جائے اللہ تعالیٰ پر وجوب کونی، اور کون الوجوب تک، اور وجود حصولی اور حصول الوجود تک۔ اور جس طرح تو اُس کی ذات کو نہیں جانتا، اسی طرح تو اس کی صفات کو بھی نہیں سمجھتا، اور ذاتوں میں سے کوئی ذات نہیں سوائے اس کی ذات کے اور نہیں ہے کوئی معبود سوائے اللہ کے، اور صفات میں سے کوئی صفات نہیں سوائے اس کی صفات کے، اور نہیں قدرت اور طاقت مگر اللہ کو۔ اور کہتے ہیں رحمان، رحیم سے زیادہ بلیغ ہے کہ لفظ یا مدّ کی زیادتی اس کی کثرت اور شدت پر دلالت کرتی ہے جیسے فتح الباب (دروازہ کھولا) اور فتّح الابواب (شد کے ساتھ) (دروازوں کو خوب کھولا) اور صرح بمعنی ظاہر ہوا اور صرّح بمعنی خوب ظاہر ہوا۔ اور لفظ رحمان کا زیادہ بلیغ ہونا افراد رحمت کی مقدار یعنی اس مقدار کے لحاظ سے جن پہ رحمت کی گئی۔ گویا کی جانے والی رحمت یعنی ان نعمتوں کی مقدار اور تعداد پر۔ اور کہا جاتا ہے کہ اسے دُنیا کے رحمان کیونکہ یہ مومن اور کافر دونوں پر عام ہے اور رحیم الآخرت (آخرت کا رحیم) کیونکہ یہ مومنین کے لیے خاص ہے۔ اور یہ جو کہا گیا ہے کہ کبھی اس کی یہ ابلغیت (زیادہ بلیغ ہونا) رحمت، قوت اور عظمت کی کیفیت کے اعتبار سے ہے، اور اسی بنا پر کہا جاتا ہے یا رحمان الآخرت و یا رحیم الدنیا کہ اُخروی نعمتیں عظیم ہیں اور دنیوی نعمتیں حقیر۔ شاید یہ درست نہ ہو کیونکہ اس اعتبار سے اس کی عظمت، بزرگی اور رحمت کی کیفیت اور مرنے والے افراد کی شرافت، رحیم میں ہوگی۔ لہذا اضافت رحمانی

خواہ دُنیا میں ہو یا آخرت میں وہ اس کی عمومیت اور شمولیت کی وجہ سے ہے اور رحیمی اضافت ہر کسی کے لیے اس کے خصوص اور اختصاص کی بنا پر ہے۔ کہا جاتا ہے کہ وہ فیض دینے والا ہے وجود کو کمال ظاہری کو بحیثیت مجموعی جتنا کہ حکمت کا تقاضا ہے، اور آنے والے معاملات واضح طور پر جس کے متحمل ہوتے ہیں۔ اور رحیم جو ہے وہ نوع انسانی کو مخصوص معنوی کمال سے فیضیاب کرنے والا ہے مقصد کے مطابق۔ اور رحمان خاص نام ہے اللہ تعالیٰ کا، اور نہیں جائز کسی اور کو اس سے موسوم کیا جائے۔ اور یہ نام علم کی طرح ہو گیا، یوں کہ اس سے اللہ کے سوا کسی اور کو متصف نہیں کیا جا سکتا کیونکہ اس کے معنی ہیں منعم حقیقی جو کھلے بندوں رحمت کی انتہا تک پہنچنے والا ہے، اور یہ کسی اور پر صادق نہیں آتا کیونکہ اس کے لطف اور انعام سے مستفیض ہونے والی ممکنات اور موجودات سب کی سب اس کی رحمتِ مطلقہ کے مظاہر ہیں اور اس کے ظہور کے وسیلے کی مانند۔ اور رحمت اس کی باقی تمام صفات کی طرح حقیقتاً اسی کی طرف منسوب ہے کیونکہ نعمتوں والے اور جن پر نعمتیں کی جائیں اور ان تک پہنچنے کی قدرت اور وہ داعیہ جو اس کی طرف انگیخت دیتا ہے اور اُس سے فائدہ حاصل کرنے میں قدرت اور وہ قوا جن کی مدد سے فائدہ حاصل کیا جاتا ہے اس کی خلق میں سے ہے، اور اس کے وجود کے افادہ میں ہے۔ اس پر کوئی ایک بھی قادر نہیں۔ لوگوں کا لطف و کرم ان کے محض خلوص، خیال یا کمال کی بنا پر نہیں ہوتا جو کچھ بھی اس سلسلے میں ہوتا ہے وہ یا ثواب اور مدح و ثنا کی غرض سے ہوتا ہے یا اپنے ساتھ باہم شرکت والے کو اپنے جذبۂ ہمدردی کی تسکین کی خاطر نعمتوں سے بہرہ مند کیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر کوئی آدمی کسی محتاج کی حالتِ زار کو دیکھتا ہے، اس پر رقت طاری ہو جاتی ہے اور اسے انعام و اکرام عطا کرتا ہے فقط اپنے اس رنج و رقت کو دُور کرنے کے لیے یا دل سے مال کی محبت کا ازالہ کرنے یا نیک نامی حاصل کرنے کے لیے۔ اور کہا جاتا ہے کہ اس کے سوا نہیں کہ اُس نے مقدم کیا رحمان کو قیاس مقام ثنا میں اور مدح مقتضی ہے ترقی کی ادنیٰ سے اعلیٰ کی طرف دُنیا کی رحمت کے مقدم ہونے کی وجہ سے، کیونکہ رحمان نے حسب دلالت کی ان نعمتوں میں سے بڑی نعمتوں کی اور اُس کی بنیاد کی تو ذکر کیا اُس نے رحیم کا تاکہ پائے وہ چیز جو اس سے نکل گئی۔ پس وہ ہو جاتا ہے تتمّہ کی طرح اور ردیف (پیچھے آنے والی چیز) کی طرح۔ لیکن یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ تقدم کی وجہ یہ ہے کہ پہلے اللہ کا نام ہے جو اس کی ذات و صفات اور الوہیت کے پیش نظر ہے اور اُس کے بعد لفظ رحمان اپنی عمومی رحمت اور انعام کے لحاظ سے جو تمام مخلوقات

اور موجودات کے شامل حال ہے اور جسے ہم رحمتِ رحمانی کہتے ہیں۔ اس کے بعد لفظ رحیم اپنی خصوصی عنایات کے ساتھ جسے ہم رحمتِ رحیمی کہتے ہیں سے پہلے عام چیزوں کا بیان کرنا چاہیے جو اس قادرِ مطلق کی بارگاہِ اقدس میں زیادہ قریب ہیں۔ اس کے بعد خاص کا ذکر آنا چاہیے۔ لہٰذا بسم اللہ اور الحمد شریف میں جو دونوں کلامِ الٰہی ہیں، اس قادرِ مطلق کے لطفِ عمیم کا بیان پہلے کرنا نہایت مناسب و موزوں ہے اور والد بزرگوار کی نالۂ عندلیب نامی عمدہ تصنیف میں اسمِ رحیم کو رحمان پر مقدم گنا گیا ہے۔ خصوصاً اپنے اوپر اللہ کے خصوصی انعامات کی وجہ سے یعنی کہ پہلے اپنی ذات پر خصوصی نعمتوں کا ذکر کرنا چاہیے۔ اور پھر اس کے بعد اللہ تعالیٰ کی عمومی رحمت کا ذکر۔ وہاں اس عبارت کے جملے ہم قافیہ ہیں۔

بسم اللہ اور اسمائے حسنیٰ کے متعلقات کا بیان

اسمائے حسنیٰ کے ساتھ بسم اللہ کی خصوصیت اس امر پہ دلالت کرتی ہے کہ بلا شبہ معبودِ حقیقی وہی ہے۔ وہی موجود واحد ہے۔ باقی تمام مخلوق اپنے سب کاموں میں اس کی مدد کی طلب گار و مستحق ہے اور سب کچھ اسی کے قبضۂ قدرت اور تصرّف میں ہے۔ لہٰذا انسان کو پوری توجہ اور شغف سے اُسی سے لَو لگانی چاہیے اور پورے خشوع و خضوع کے ساتھ اسی کے مشاہدے و تجلیات میں مستغرق ہو جانا چاہیے اور اُس کے تمام ذاتی اور صفاتی اسمائے حسنیٰ کو وسیلہ بنا کر قلبی تعلق پیدا کرنا چاہیے، جو اصل مقصد اور ما حصل ہے۔ علمی طور پر بھی اُنھیں حاصل کرنے کی پوری کوشش کرنی چاہیے۔ اور ہمیشہ ان کے معانی کے ادراک کے لیے کوشاں رہ کر غفلت کے اُس زنگ کو کھُرچ دینا چاہیے جو توہمات کے باعث دل کے شیشے پر چڑھ جاتا ہے۔ چونکہ منعمِ حقیقی وہی ہے اور نعمتوں کے عطا کرنے میں مکمل اختیار اسی کو ہے، اُسی پر توکل کرنا چاہیے اور اپنے سارے کام اسی کے سپرد کر دینے چاہئیں کیونکہ انسانی بیم و رجا کا وہی واحد اور آخری مرکز اور سہارا ہے۔ انسان کو اپنے اندر اخلاقِ خداوندی پیدا کرنا چاہیے کیونکہ انسان تمام صفات کی جامعیت کا مظہر اور تمام تشبیہی اور تنزیہی مراتب کا مجموعہ ہے۔ بندگانِ خدا پر رحم کھانا چاہیے اور سبھی کو بڑی شفقت بھری نگاہ سے دیکھنا چاہیے۔ اور جہاں تک ہو سکے محتاجوں کی مخلصانہ اور بے غرضانہ طور پر حاجت روائی کرنی چاہیے۔ اگرچہ حقیقی رحمت تو آدمی کے بس کا روگ نہیں، بس یہی کافی ہے کہ دوسروں پہ لطف و احسان کرتے وقت کسی غرض یا عوض معاوضے کا خیال جی

میں نہ لائے اور یہ جو کہا گیا ہے کہ آدمی اسم اللہ کے علاوہ باقی اخلاق الٰہیہ سے بہرہ مند ہو سکتا ہے۔ اسم اللہ اور دیگر اسمائے حسنیٰ اسے باہمی تعلق کے لیے ہے تخلّق کے لیے نہیں۔ لہٰذا اگر صفاتِ الوہیت سے متصف نہ ہو سکنے کے لحاظ سے ہے تو پھر اللہ کے اسم سے عدم تخلق کی خصوصیت کے کیا معنی؟ چونکہ تمام صفات میں اس حیثیت سے کہ وہ اللہ کی صفات ہیں دیگر اعتبارات سے قطع نظر وہ دوسرے کے نصیب یا حصّے میں نہیں، کیونکہ "کوئی چیز اس جیسی نہیں، وہی سننے والا اور وہی سب کچھ دیکھنے والا ہے"[۴]، اور اگر یہ اسمائے حسنیٰ ذات وصفات کا مظہر نہ ہو سکنے کے اعتبار سے ہے تو پھر یہ کیسے درست ہو سکتا ہے کیونکہ اسی کے فیض عام سے سب فیضیاب ہیں، لہٰذا تعلق بھی ہے اور تخلّق بھی کہ اخلاقِ الٰہیہ کو اپنانا اور دیگر اسمائے حسنیٰ کی جامعیت کو اپنے اندر پیدا کرنا ہی گویا انسان کا اخلاقِ الٰہیہ پیدا کرنا ہے۔ ہر قسم کی تعریف، جاننے والے اور الہام کرنے والے اللہ کے لیے ہے[۵]۔

نعمت ملے یا نہ ملے اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا آدمی کے اپنے اختیار اور بس میں ہے۔ اختیار سے مراد ہے کہ انسان اپنے کام کرتے اور مقصد و ارادے کے ساتھ اچھی اچھی باتوں کے صادر کرنے میں مختار ہے اور یہ بات قابلِ ستائش ہے۔ یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ حمد وثنا صرف الحمدللہ کے الفاظ کہہ دینے کا نام نہیں بلکہ حمد ایک ایسا فعل ہے جو نعمت دہندہ کی تعظیم اور جمیل حقیقی کی ثنا خوانی اور توصیف کی خبر دیتا ہے۔ یہ فعل یا تو قلبی ہوتا ہے یعنی باوصف کمال پورا عقیدہ۔ یا پھر یہ فعل زبانی ہوتا ہے یعنی ایسی چیز کا ذکر جو اسی حمد وثنا پہ دلالت کرے یا پھر انسانی اعضا کا کوئی ایسا کام جو اسی امر ثنا خوانی کی دلالت کرے۔ گویا حمد کی زبان کی تین قسمیں ہیں، یعنی زبانِ حال، زبانِ قال اور زبانِ افعال۔ کہا جاتا ہے کہ حمد کی زبانیں تین ہیں۔ ایک زبان انسانی، دوسری زبان روحانی اور تیسری زبان ربّانی۔ جہاں تک لسانِ انسانی کا تعلق ہے یہ عوام کے لیے ہے اور اُس سے اللہ کا شکر ادا کرنا یعنی اس کی نعمتوں اور اکرام کا ذکر کرنا تصدیق قلب کے ساتھ اور ادائے شکر کے ساتھ۔ اور لسانِ روحانی خواص کے لیے ہے۔ یہ قلب کا ذکر کرنا ہے حق کی صنعتوں کی لطافتوں کا اعمال کی تربیت اور افعال کے تزکیے کے لیے۔ اور لسانِ ربانی جو ہے عارفین کے لیے ہے اور یہ خفیہ حرکت ہے حق جل جلالہٗ کے شکر کے اراد سے کے ساتھ، معارف کے لطائف اور کشفوں کی انوکھی باتوں کے ساتھ۔

حمد کی قسمیں

قولی حمد کسی چیز کے لیے زبان سے حق تعالیٰ کی ثنا کرنے کو کہتے ہیں جس پہ اس نے انبیاؑ کی زبانی خود اپنی ثنا کی ہے۔ افعال کو اللہ تعالیٰ کی رضا و خوشنودی کے مطابق بجالانے کو حمدِ فعلی کہتے ہیں اور دل و جان سے علمی اور عملی کمالات سے متصف ہونے اور اپنے اندر اخلاق خداوندی پیدا کرنے کو حمدِ حالی کہتے ہیں۔ فقط تعظیم و تکریم کی خاطر زبان سے عمدہ و خوبی بھرا بیان ادا کرنا حمد لغوی کہلاتا ہے کیونکہ اہلِ لغت کا کہنا ہے کہ لفظ 'حمد' حمدت سے مشتق ہے اور حمدت وہ آواز ہے جو آگ کی لپیٹ سے نکلتی ہے، لہذا اللہ کی نعمتوں کے انوار کے مشاہدے سے جب آدمی کے دل سے محبت کی آگ کی لپیٹ زبان تک پہنچتی ہے تو حمد و ثنا کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے اور اُسے تشبیہہ دے کر حمدت کہتے ہیں۔ لہذا اسی سے اخذ کرکے یہ کہا گیا کہ حمد سے مراد ہے تعظیم کی خاطر زبان سے اپنے محمود کی خوبیوں کی تعریف و ستائش کرنا۔ بعض یہ بھی کہتے ہیں کہ حمد حمادی سے مشتق ہے جس کا مطلب انتہا اور غایت ہے۔ پس حمد نام ہوا حق تعالیٰ کی حمد و ثنا کے ادا کرنے میں انتہائی جدوجہد اور مکمل سعی و کوشش کرنے کا۔ اور عرفی حمد وہ فعل ہے جس سے نعمت دینے والے کی تعظیم مترشح ہو۔ اس سبب سے کہ اس منعم حقیقی کا فیضان عام ہے۔ لغوی اور عرفی حمد میں عمومیت اور خصوصیت اس کے مورد یا متعلق کی وجہ سے ہے۔ ان تمام حمدوں کی اصل حمد وجودی ہے کہ یہ اعتباری وجود اور خود ساری ممکنات اسی واجب تعالیٰ کے وجود کی عین ثنا ہیں۔ جیسا کہ خود خالق نے فرمایا ہے کہ نہیں کوئی چیز مگر اس کی تعریف کے ساتھ اس کی تسبیح کرتی ہے۔ پس نہیں پیدا کی اللہ تعالیٰ نے کوئی چیز مگر اس کے اندر الہام کیا ہے اپنی الحمد کو۔ تمام حمدیں اس حمد وجودی میں داخل ہیں اور اسی کی مختلف انواع و اقسام ہیں اور حمدِ نفسی کا کرشمہ ہے، یعنی نفس الوجود کی عین وجود کے لیے ثنا۔ یہاں حمد، حامد اور محمود وہی ہے ورنہ یہ حمد موجودات سے ہو نہیں سکتی۔ جیسا کہ ان الفاظ سے ظاہر ہے کہ میں تیری ثنا کو احاطے میں نہیں لے سکتا اس طرح جیسے کہ تو نے خود اپنی ثنا کی۔ کیونکہ حمد کا احاطہ اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک کہ محمود کے ذاتی اور صفاتی کمالات کی معرفت کا احاطہ نہ ہو۔ اور یہ امر محال ہے، کیونکہ اس کی ذات وصفات کی حقیقت لامتناہی ہے، تو پھر محدود اُس لامحدود کا احاطہ کیسے کر سکتا ہے۔ اے خدا ہم تجھے کماحقہٗ نہ پہچان سکے۔

نہیں مستحق حقیقی حمد کا مگر اس کا وجود۔ پس حمد جو ہے یہ اللہ کے لیے ہے۔ اللہ کے سوا کسی کے لیے نہیں ہے۔ اور مزید یہ یعنی اللہ کی حمد اللہ کے لیے ہے کیونکہ حقیقتاً وہی اپنے آپ کی تعریف کرتا ہے کسی اور کی نہیں۔ جنیدؒ کا قول ہے کہ ہر قسم کی تعریف اللہ کے لیے ہے، اور یہ اللہ کی صفت ہے کیونکہ اس نے خود اپنی حمد بیان کی ہے تمام صفت کے ساتھ۔ اگر تعریف کرتے تمام مخلوقات سب کے سب مل کر تو نہ قادر ہو پاتے اور اس کی صفات میں سے ذرہ بھر نہ کر سکتے۔ پس نفسی و حقیقی حمد میں کوئی اور شامل نہیں اور حمد وجودی میں موجودات کے ہر موجود کا ہر ذرہ داخل ہے۔ اپنی طاقت و استطاعت کے مطابق جو اسی موجود کے فیض سے ہے۔ اور ہر وہ موجود جس نے علم جمع نہ کیا اس سے یہ حمد اس کے حال کے مطابق نہایت مختصر طریقے سے ہوگی۔ اس کی مختلف انواع و اقسام کی تفصیل سے نہیں کیونکہ عارفین حضرات کے سوا اُن کی حمد و ثنا کو اور کوئی سمجھ ہی نہیں سکتا جیسا کہ یہ آیت کریمہ کہ "تم لوگ ان کی پاکی بیان کو سمجھتے نہیں ہو" اسی حال کی خبر دیتی ہے، اور جو لوگ عارف باللہ ہیں اور علم ربانی کی تائید و توفیق اور اللہ تعالیٰ کے لا محدود فیوض کی بنا پر علم و عرفان سے بہرہ مند ہیں وہی حمد وجودی کو تفصیل سے ادا کرتے ہیں۔ اور تمام مراتب کی کماحقہ، داد دے سکتے ہیں اور ان انواع و اقسام میں سے کسی کو بھی نہیں چھوڑتے۔ ان کا رواں رواں زبان بن جاتا ہے اور ان کی خموشی بھی قولی، فعلی اور حالی حمد کا بیان ہوتا ہے کیونکہ وہ سب اسی حمدِ وجودی کی شاخیں ہیں۔ ایسے عارفانِ ذات احسن طریق سے رہنمائی و سربراہی کر سکتے ہیں، بلکہ مکمل معرفت ذات کے مالک عارفین اسی طرح حمد کرتے ہیں جیسے کہ ساری مخلوقات و موجودات کرتی ہیں کیونکہ وہ سب کی سب اُن کے آئینۂ علم پر عکس انداز ہوتی ہیں، اور وہ ان سب کو اپنے اندر دیکھ کر اپنی حمد میں شامل کر لیتے ہیں۔

الحمد اور شکر و مدح میں فرق

عزت و احترام اور مقام بندگی میں شکر کی نسبت حمد بہت بلند مرتبہ ہے کیونکہ حمد تمام کمالات اور خوبیوں کی سزاوار ہے۔ خواہ وہ فضیلتیں غیر متعدی ہوں یعنی دوسروں تک نہ پہنچیں، جیسا کہ علم و وجود اور اس کے علاوہ دوسرے مصادرِ لازم۔ خواہ وہ ایسی فضیلتیں ہوں جو متعدی ہوں یعنی جن میں دوسروں تک پہنچنے کا مفہوم شامل ہو جیسے تعلیم، ایجاد اور اسی طرح کے دیگر متعدی مصادر اور شکر مخصوص ہے صرف

ذات باری تعالیٰ سے ۔ پس حمد شکر سے زیادہ عمومیت پہ مشتمل ہے ۔ نعمت وغیرہ کی تخصیص کے بغیر، اور کہا جاتا ہے کہ حمد مطلق انعام کے ساتھ مختص ہے اور شکر تعریف ہے ان نعمتوں کے مقابلے میں جو پہنچتی ہیں شکر کرنے والے کو ۔ اور شکر کا مطلب ہے کہ والیٔ نعمت سے قولاً فعلاً، عملاً یا اعتقاداً احسانمندی کا اظہار اور اُس کی ستائش کرنا ۔ اور کہتے ہیں کہ یہ شکر کے اصطلاحی معنی ہیں، اور لغوی معنی کھولنے یا ظاہر کرنے کے ہیں اور کفر اُس کا متضاد ہے اور یہ جو کہتے ہیں کہ حمد اور شکر میں عموم و خصوص کی نسبت متعلق اور مورد کے اعتبار سے ہے ۔ یہ لغوی حمد میں ہو سکتا ہے ۔ حمد کی عمومیت اور اُس کی شکر پر فوقیت پر حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ حمد شکر کی اصل ہے ۔ پس جس نے اللہ کی حمد بیان نہیں کی، اُس نے گویا اللہ کا شکر بھی ادا نہیں کیا کہ شکر بغیر حمد کے صورت پذیر ہو ہی نہیں سکتا کیونکہ شکر حمد کے حکم کے تحت اور اُس کے جملہ اجزاو اطراف میں داخل ہے ۔ حمد کا انحصار شکر پہ نہیں ہے ۔ یہاں حمد مدح سے بہت بڑھ چڑھ کر ہے کیونکہ مدح ایک اچھی تعریف ہے مکمل اختیار ہو یا نہ ہو ۔ اور حمد صاحب علم اور ذی روح (زندہ) سے مخصوص ہے ۔ بعض نے کہا ہے کہ حمد و مدح ہم معنی ہیں، خواہ یہ ہم معنی ہونا عدم اختیار کے لحاظ سے ہو۔ حمد میں قید اختیاری ہے جیسا کہ کشاف کی اس عبارت سے ظاہر ہے ۔ خواہ اس قید کا اعتبار مدح میں بھی اسی اختیار کے ساتھ ہو ۔ ہاں حمد کتاب و سُنّت کے عین مطابق اور موافق ہوتی ہے ۔

حمد کے متعلقات اور الف ولام کا بیان

یہ سمجھ لیجیے کہ مقام حمد میں چار چیزیں ہوتی ہیں ۔ ایک محمود علیہ یعنی جس سے اس معاملہ میں حمد کی جائے، جیسے کہ انعام، دوسرے محمود بہ یعنی جس چیز کی نسبت سے اُس کی حمد کی جائے ۔ مثال کے طور پہ جیسا آپ زید کی شجاعت کی وجہ سے اس کی حمد کرتے ہیں ۔ تیسرا حامد یعنی تعریف کرنے والا ۔ چوتھا محمود جس کی تعریف کی جائے ۔ کبھی محمود علیہ اور محمود بہ (جس نسبت سے تعریف کی جائے) دونوں ایک ہی ہوتے ہیں جیسے زید کی سخاوت کی بنا پر اس کی سخاوت کی تعریف کی جائے اور کبھی اس کے برعکس ۔ یہاں محمود، محمود بہ (وہ چیز) اور محمود علیہ تینوں ایک ہی ہوتے ہیں ۔ بلکہ حمد و حامد بھی ایک جیسا کہ یہ جملہ کہ نہیں بیان کرتا اللہ کی حمد مگر اللہ ہی ۔ لہذا جملہ فعلیہ کہ احمد یا نحمد ہو وارد نہیں ہوا کیونکہ فعل کے سلب ہونے کی نسبت اس کی اپنی طرف سے ہے ۔ نہیں ہے کوئی بھی فاعل وجود کا سوائے اس کی ذات

کے ۔ اور مراد ذات الحمد بھی ہے ۔ اور حاصل مصدر بھی قطع نظر حمد کے زمانی، کونی، حصولی اور عمومی ہونے سے ۔ اپنی فعلیت میں حمد کسی معین تشخص کی طرف منسوب ہوتی ہے ۔ اور معین تشخص سے حمد مطلق علی الاطلاق ظہور میں نہیں آتی اور اس سے مقصود ہمیشگی اور دوام بھی ہے کیونکہ خداوندی کمالات کی نہ ابتدا ہے نہ انتہا اور نہ ہی اس کی حمد و ثنا کا کوئی آغاز ہے نہ انجام ۔ قدیم حمد جو ہے وہ قدیم ہی کی طرف لوٹتی ہے اور تجدد کا اس میں کوئی حصہ نہیں کیونکہ وہ ازلی ہے اور حمد ازلی کا سزاوار کوئی نہیں، مگر ازلی ہی ۔ پس الحمد میں فاعل ابتدا میں ہے اور للہ مقام خبر اور کہتے ہیں کہ اس کے اعراب کی اصل مفعولی ہے مصدریت سے جیسا کہ روایت میں آیا ہے ۔ حمد ان مصادر سے ہے جو افعال مضمرہ میں آتے ہیں ۔ اور ان کے ہمراہ استعمال نہیں کیے جاتے اور مفعولی حالت کو فاعلی حالت کی طرف پھیر دیا جاتا ہے تاکہ مذکورہ بالا مرادات اور فعل کی ضمیروں کے اندازوں پہ دلالت کرے ۔ حمد اللہ ہو یحمد اللہ یہ بہترین اور مناسب ترین ہے احمدہ' (میں تعریف کرتا ہوں) اور نحمدہ' (ہم تعریف کرتے ہیں) سے کہ وہ حق تعالیٰ کا فعل ہے اور زیادہ قوی اور زیادہ دائم اور زیادہ مکمل ہے ۔ مصدر و فعل محذوف ہیں اور الحمد للہ میں وہی فاعل مذکور ہے جو موجود ہے ۔ اور الف لام تعریف اس میں یا تو جنس کے لیے ہے، اور اس سے مطلب اس چیز کی طرف اشارہ ہے کیونکہ ہر فرد واحد یہ جانتا ہے کہ حمد کیا ہوتی ہے ۔ لہذا حمد کی تمام جنس حق تعالیٰ ہی سے مخصوص ہے، اور یا یہ الف لام تعریف استغراق کے لیے ہے یعنی درحقیقت حمد کے سب اجزا خاص اس کے لیے ہیں کیونکہ حمد خیر و بھلائی کے لیے ہے اور سب بھلائیاں، نیکیاں اور اچھائیاں اسی سے منسوب ہیں اور اسی سے پیدا ہوتی ہیں ۔ "اور نہیں ہے کوئی نعمت تمھارے پاس مگر وہ اللہ ہی کی طرف سے ہے"[۹۱] اور یہ ذہنی اور خارجی عہد کے لیے بھی ہو سکتا ہے کیونکہ موجود ذہنی ہو یا موجود خارجی، وجود کی کوئی قسم بھی اس واجب تعالیٰ کے فیضان کے بغیر وجود میں نہیں آسکتی ۔ اور اگر مضاف الیہ کے حذف کے انداز سے سے ہو یعنی حمد اللہ للہ پس الف لام اضافت کا بدل ہے ۔

الحمد کے اسم اللہ تعالیٰ کے ساتھ آنے کی تخصیص کی وجہ اور اس مقام پر اس کا علیم و مُلہم کے ساتھ تعلّق

حمد جو ہے حسین و جمیل اللہ کے لیے ہے اس کے کمالات کے جمال کے ساتھ اور متصف ہے

تمام صفات اور شانوں کے ساتھ، اور حمد کا کلمہ اس نام کے ساتھ دلالت کرتا ہے اس مرتبے پر جو تمام کمالات کو جمع کرنے والا ہے۔ پس تمام قسم کی حمد اور اُس کی اقسام وانواع اسی کے لیے ثابت ہیں اور وہی شکور اور حمید ہے اور وہی پیدا کرتا ہے وہی لوٹاتا ہے اور یہی مقام محمود ہے اور منتہا ہے اور مقصود ہے۔

اور اس جامعیت پر اللہ کی دلالت کے سبب کلام کو ایسی قوت حاصل ہوگئی کہ کہا جائے کہ تمام قسم کی حمد منحصر ہے اس کے حق میں جو جمع کرنے والا ہے تمام کمالات کو اس حیثیت سے کہ وہ اسی طرح ہے پس اس چیز کا دعویٰ اس کی دلیل اور برہان کے ساتھ ہے، اور اس کی لطافت مخفی نہیں۔ اور ہر قسم کی تعریف یہاں پر اللہ کے نام کے لیے ہے۔ خالص عمومیت کے ساتھ بغیر نعمت یا عدم نعمت کی شرط کے۔ اور اللہ کی تعریف اللہ کے لیے ہے اللہ پر ہے اور اللہ کے ساتھ ہے اور اُس کے نام علیم کے لیے ہے جو کہ صفت کے طور پر واقع ہوا ہے اور ملہم کے لیے ہے جو وارد ہوئی ہے صفت کے طور پر صفت کے بعد شُکر کے معنی کی قوت میں اور مخصوص ہے جاننے اور الہام کی تخصیص کے ساتھ۔ مشرف کیا اُس سے اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو کمال عنایت اور اکرام کے ساتھ۔

لفظ اللہ کی تحقیق اور اس کی وصفیت اور علمیّت کا بیان

لفظ اللہ کی اصل الٰہ ہے ہمزہ کی زیر اور لام کی مدّ سے، پس ہمزہ حذف کر کے الف لگایا گیا اور لام ہمزہ کے عوض میں لے آئے۔ اس لیے ندا میں یا اللہ کہا جاتا ہے منقطع کر کے اور قطع کی تخصیص فقط ندا میں ہے، کیونکہ ندا کے ساتھ معرفہ بنانا لام اور الف کے ساتھ معرفہ بنانے سے بے نیاز کر دیتا ہے پس یہ ہمزۂ اصلیہ کے قاعدے کے مطابق چل پڑتا ہے اور قطعی ہو جاتا ہے (یعنی اس کا تلفظ ضروری ہو جاتا ہے) اور منادیٰ نہ ہونے کی صورت میں جب اس سے معرفہ ہونے کی صفت زائل نہ ہو تو یہ ہمزہ وصلی (جس کا تلفظ گرا دیا جائے) ہو جاتا ہے۔ اور اللہ جو ہے یہ مخصوص ہے معبود کے لیے حق کے ساتھ۔ اگرچہ اِلٰہ جو ہے اصلاً استعمال ہوتا ہے ہر معبود پر، پھر یہ غالب آگیا معبودِ برحق پر۔ بعض یہ کہتے ہیں کہ اللہ کا لفظ جو ہے اصل میں غالب آجانے والے ناموں میں سے ہے جیسے الصاعق آدمی کا نام ہے الف لام کے ساتھ جیسے النجم ثریّا کے لیے آتا ہے۔ گویا یہ کلمہ اِلٰہ ہر معبود کے لیے تھا۔ پھر معبودِ حق کے ساتھ مخصوص ہو گیا کیونکہ وہ زیادہ حقدار ہے اُس کے والی ہونے کے حقداروں میں سے یعنی

وہ عبادت کیا جائے اور وہ ہوگیا (لام تعریف کے ساتھ) اسی کا نام ۔ کہا جاتا ہے کہ اس کا اشتقاق (اَلَہَ یَاْلَہُ) عین کلمے کی زبر کے ساتھ) اور انہی دونوں میں سے ہے۔ اِلٰہٌ وَ اُلُوہتٌ" وَ اُلُوہِیۃ بمعنی عَبَدَ (یعنی عبادت کی) جیسے عبادۃ ، عُبُودۃ ، عبودیتٌ" ۔ پس الاِہ زیر کے ساتھ فعال کے وزن پر مالُوہ ہے یعنی معبود بمعنی مفعول ہے ہے کتاب بمعنی مکتوب ہے اور امام بمعنی ماموم ۔ اور اس سے تاَلَّہَ (یعنی عبادت کی) اور استاَلہَ (یعنی مطالبہ کیا) اور کہا جاتا ہے کہ یہ اِلہَ ، اَلِہَ سے ہے (لام کی زیر کے ساتھ) جب کہ کوئی متحیر ہو جائے ، کیونکہ عقلیں اس کی معرفت سے حیران و ششدر ہو جاتی ہیں۔ یا یہ اَلِھتُ اِلیٰ فلانٍ یعنی میں نے اس کے ہاں سکون پایا کیونکہ دل جو ہیں اس کے ذکر سے اطمینان پاتے ہیں اور اس کی معرفت سے آرام پاتے ہیں یا یہ کہ اَلِہَ الفیل (بچھڑا) سے ہے جیسے کہ وہ رغبت سے مائل ہوا اپنی ماں کی طرف جب کہ بندے مائل ہوتے ہیں تضرع و انکساری کے ساتھ اللہ کی طرف مصیبتوں میں ، یا یہ وَلَہ سے ہے جب کہ عقل حیران ہو جائے اور ماری جائے اور اس کلمے کی اصل " ولاہ " سے تھی ۔ پس واؤ کو ہمزہ میں بدل دیا گیا ۔ کسرہ یعنی زیر کے ثقل کی وجہ سے پس کہا گیا ۔ اَلُہُ اَعاءٌ" کی طرح اور اس کی جمع اِلہۃُ آتی ہے اولِہَۃ نہیں اگرچہ جمع تکثیر الفاظ کو ان کے اصل کی طرف لوٹا دیتی ہے لیکن معاملہ اس سے مختلف ہے۔ ہمزہ کے اصلی ہونے کے گمان پر کیونکہ ولاہ" بالکل استعمال نہیں ہوتا ، اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس کی اصل لاہ" ہے جو کہ مصدر ہے لاَہَ یلیہُ لیھاً اور لاھاً کا ۔ جب کہ اس کے معنی ہیں پردے میں ہو جانا یا بلند ہو جانا ، کیونکہ اللہ تعالیٰ ہر طرف سے پردے میں ہے اور ہر چیز سے جو اس کے لائق نہیں بلند ہے ۔ اور کہا جاتا ہے کہ اللہ جو ہے یہ ایک ایسا نام ہے جو ابتداً نام ہے بغیر اشتقاق کے ۔ اس کی کوئی اور اصل نہیں اور یہ نام ہے خدائے حق کا ۔ اور لام تعریف جو ہے اس کی شکل کے ساتھ ہی ملا ہوا ہے ، اور یہ اصلاً وصف نہیں ہے بلکہ یہ اس کی ذات پر غالب آ گیا ، اور اُس کے خاص نام ہونے اور وصف نہ ہونے کی دلیل یہ ہے کہ اللہ کی تعریف اللہ کے ساتھ صفت لائی جاتی ہے اور یہ بطور صفت نہیں آتا ۔ یعنی لفظ اللہ موصوف بنایا جاتا ہے تمام اسمائے ربانی کا اور ان میں سے کسی نام کی صفت نہیں بنایا جاتا ۔ اس کی گواہی دیتا ہے قرآن مجید ۔ پس یہ بطور اسم ہی آیا ہے اور جو واقع ہوئی ہے بات سورۃ ابراہیم (ہمارے نبیؐ اور ان پر درود و سلام ہو) الیٰ صراط العزیز الحمید اللہ الذی یعنی اللہ کو جرّ کے ساتھ پڑھنا عطف بیان ہے ، صفت نہیں ہے ۔ اور تمام اسماء کے بارے میں کہا جاتا ہے ۔ اسم اللہ اس کے برعکس نہیں جاتا ۔

اور اس میں پھر کوئی شبہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ مخصوص ہے، کیونکہ اس کا اطلاق حقیقتاً یا مجازاً قطعاً کسی اور پر نہیں ہوتا۔ پس یہ اس کا نام بنتا ہے اور اس لیے کہ اس کے سوا چارہ نہیں کہ کوئی ایسا اسم ہو جس پر صفات کا اطلاق ہو، اور پھر نہیں مناسب اُس کے لیے اُن میں سے جو کچھ کہ اس کے لیے استعمال ہوتے ہیں سوائے اس نام کے۔ جس طرح خارج میں صفت کا قیام موصوف کے وجود کا محتاج ہوتا ہے، اسی طرح صفات کا جاری کرنا ———— اس پر الفاظ میں متقاضی ہوتا ہے ایسے اسم کے وجود کا جو اس کی ذات پر دلالت کرے چاہے وہ خاص ہو یا نہ ہو کیونکہ وجوب لفظی یہ وجود عینی کے مقام پر ہے اور یہ ظاہر ہے۔ اور اگر یہ وصف ہوتا تو یہ رحمان کی مانند ہوتا صفاتِ غالبہ میں سے۔ پس لا الٰہ الا اللہ توحید میں سے نہ ہوتا جیساکہ لا إلہ الا الرحمٰن۔ اور اجماع اس بات پہ ہے کہ پہلی صورت توحید کے معنی دیتی ہے، دوسری صورت نہیں اور شرک کی نفی نہیں کرتی، اور اس میں راز یہ ہے کہ اگر اس کا مدلول معنی ہوں ذات معینہ کے علاوہ تو وہ بھی شرک کی نفی نہ کرتے اور اگر مخصوص ہو جائے اس کے استعمال میں اللہ تعالیٰ کی بلند ذات، کسی بھی بالعکس ذات سے اگر ہو یہ جانتے بوجھتے نہیں ہوتا ہے اس کا مدلول ذات معینہ اگرچہ تو اس کا شعور رکھے کلی طور پر۔ پس اگر تو شعور رکھے جزئی طور پر کلی شعور رکھنے کے انداز میں، تو لازم نہیں آتا کہ معلوم چیز کا کلیتہً ہونا کیسا ہے اور اعتراف کیا ہے عام لوگوں نے اس کی وضع کا اور اس کے موضوع کی تخصیص کا، اور کہا جاتا ہے کہ ظاہر ہے کہ اصلاً یہ وصف ہے کیونکہ اشتقاق کے معنی ہوتے ہیں دو لفظوں میں سے ایک دوسرے سے معانی اور ترکیب میں مشارکت، اور یہی حاصل ہوتا ہے اس کے درمیان اور مذکورہ اصول کے درمیان۔ لیکن جب وہ غالب آگیا اس طرح کہ نہ استعمال کیا گیا اس کے علاوہ تو وہ ہوگیا ایک علَم کی طرح جو انہی معنوں میں رائج ہوا اس کے اوپر وصف کے طور پر رائج ہونے کے انداز میں۔ اور اُس سے متصف ہونے سے مانع ہونے کے ساتھ اور اس کا شرک کے احتمال کے راستہ پکڑنے کے معدوم ہونے سے۔

اسم اللہ کا تمام صفات کو جامع ہونے کے مرتبے کا بیان
جو کہ تمام مراتب کی انتہا ہے، نہ یہ لفظ اس کی خالص ذات کیلیے ہے جیسے بعض لوگ گمان کرتے ہیں

جان لو کہ وہ لوگ جو یہ خیال کرتے ہیں کہ اللہ صرف ذات کے لیے علَم ہے اس طرح کہ یہ تمام لوازم

اور صفات سے مجرد ہے۔ ان کا یہ گمان اللہ کے بارے میں جھوٹا ہے جاہلیت کے گمان کی طرح اور نہیں سمجھتے وہ بات جس کا وہ دعویٰ کرتے ہیں کیونکہ یہ ثابت ہوتا ہے ان کی دلیلوں ہی سے ان کے دعوے کے خلاف اور یہ کیسے ہو سکتا ہے کیونکہ یہ اسم ہے، اور اسم ذات کا مرتبہ صفت کے ساتھ ہے ۔ پس اللہ علم ہے ان جمیع صفات کے جامع مرتبے کے لیے اور یہ مرتبہ شئ کی شرط کے ساتھ ہے لوگوں کے نزدیک اور وہ یہ گمان کرتے ہیں کہ اُس کے اُوپر بھی ایک درجہ ہے مرتبہ بشرط لا و لا بشرط اور اللہ تعالیٰ کے کلام سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ مرتبہ مراتب کی انتہا تک پہنچانے والا اور ان کی حد بندی کرنے والا ہے۔ پس اللہ سے پرے کوئی انتہا نہیں، پس مرتبہ بشرط اور لا بشرط بھی دونوں داخلی ہیں اس میں کیونکہ سلب کرنا بھی موجبات میں سے ہے جیسے سلب کرنے والا قضیہ جو محمول کیا جاتا ہے وہ قضیہ موجبہ ہوتا ہے۔ اور اسی لیے ثابت کیا علما نے مثبت اور منفی صفات کو اور مرتبۂ لا بشرط جو ہے وہ اطلاق کا مرتبہ ہے اور وہ مقید ہے اطلاق تقیدّ کے ساتھ۔ پس گمان کیا گیا ایسے مرتبے پر جو کسی شے کی شرط کے ساتھ ہے اور یہی مطلوب ہے۔ اگرچہ کہا جائے کہ چیز جو ہے اس کا اطلاق ہوتا ہے ایسے معاملے پر جو وجودی ہوتی ہے۔ اور سلب کرنا یا ہونا وجودی امور میں سے نہیں ہے اگر اُسے بنایا جائے امور موجبہ میں سے اس توجیہہ کے ساتھ تو پھر شرط لاشئ کا مقام کیسے ہو سکتا ہے چیز کی شرط کے مرتبے کے عین مین ۔ پس لاشئ کی شرط کے ساتھ جو مرتبہ ہے وہ کسی چیز کی شرط کے ساتھ والے مرتبے جیسا کیونکر ہو سکتا ہے ۔ اور ہم کہتے ہیں کہ اسی انداز میں شرط لا کے ساتھ کا مرتبہ مراتب وجود میں سے نہیں ہوتا۔ اگر سلوب میں سے اس مراد کے لینے کے جواب میں کہا جائے کہ یہ شئ کذائیہ کا سلب ہے، اور اُس سے الگ ہو جانے والے مرتبے کی تجرید ہے نہ کہ مطلق شے ہے کہ یہ ہو جائے خالص لاشئ، اور یہ تجرد ہے وجود کے مراتب سے ۔ پس ہم کہتے ہیں کہ شئ کذائیہ سے الگ ہونا بھی شئ کذائیہ ہے۔ جیسے اطلاق کا تقیدّ بھی مقید کرنا ہی ہے جیسے تم جانتے ہو۔ پس ظاہر ہوا کہ یہ تینوں مرتبے جو ہیں ایک ہی درجے پہ ہیں کہ خارجی لحاظ سے اور یہ ممتاز ہیں مثبت و منفی اور اطلاقی اعتبارات سے ذہنی طور پر مختلف حیثیات کے تصور کے ساتھ جو نفس الامر میں موجود ہوتی ہیں کیونکہ یہ زیادہ عام ہیں خارج اور ذہن سے، اور ذات کا مرتبہ پرے سے پرے ہے اس کے قرب کی وجہ سے اور وہ نہیں متمیز ہوتا حیثیت اور اعتبار سے، اگر وہ ممتاز ہو جائے دوسرے مراتب کی طرح تو وہ بھی اُن جیسا ہی ہو جائے مرتبۂ اعتباریہ ۔ اس جیسی کوئی چیز نہیں ہے اگرچہ وہ دیکھنے والا اور سننے والا ہے۔

پس اس مرتبے کا کوئی نام نہیں ہے، اور جس نے اسے جان لیا تو اُس کی زبان عاجز آگئی، (جو پا گیا ہے راز وہ گُم ہے خموش ہے) یعنی اس نے جان لیا کہ وہ نہیں جانتا اور ادراک کو پانے سے عاجز آنا یہاں پا لینا ہی ہے۔ اور اس کی تہ کی معرفت محال ہے بلکہ یہ تمام معارف کی حقیقت کو پالینا ہے اور نہیں کہا جائے گا اس آدمی کو جو جانتا ہے معارف کے لوازم میں سے کچھ اس کا ایسا ہوتا کہ وہ معارف کو جان گیا ہے اور یہاں یہ بات ثابت ہوگئی کہ وہ مطلقاً کچھ بھی نہیں جانتا۔ پس مطابقت کیسے ہو سکتی ہے کیونکہ یہ اپنے ظہور کے کمال اور واضح طور پر آشکارا ہونے کے ساتھ اپنی جگہ مخفی ہے۔ پس یہ جان لے کہ بڑی دقیق چیز ہے اور اگر یہ کہا جائے کہ یہاں ' لا ' اللہ تعالیٰ کی ذات کے لیے اسم کے طور پر ثبت کیا گیا ہے اور یہ کہ یہ مطلقاً تمیز نہیں ہے اور لفظ ذات دلالت کرتی ہے اس کے مفہوم پر تو یہ بن گیا لفظ اس کا اسم کیونکہ اسم سے غرض مسمی کی معرفت ہے۔ پس ہم کہتے ہیں کہ ہم راضی ہیں اس بات پر کہ کلمہ ذات دلالت کرتا ہے اُس کے مفہوم پر، اور وہ کلی معنوں میں ہے یعنی اس کے ساتھ صفات قائم نہیں ہوتیں چاہے یہ ذات اللہ تعالیٰ کی ہو یا کسی اور کی ذات ہو۔ پس یہ نہیں ہوتا خاص نام واجب کی ذات کے لیے۔ اور نام رکھنے میں تخصیص کی شرط ہوتی ہے۔ پس ہمارا حاصل کلام یہ ہے کہ اس کے لیے کوئی مخصوص اسم اس کی حیثیت کے ساتھ نہیں ہے کیونکہ وہ مرتبہ کُنہ (تہ) کے ساتھ ممیز نہیں ہوتا جیسے کہ بات گزر چکی ہے۔ اِلّا یہ کہ ہر نام دلالت کرتا ہے اس مرتبے پر، اس مرتبے کے اپنے تمام مراتب پر حاوی ہونے کے ساتھ۔ سمجھ لیا جس نے کہ سمجھ لیا۔ پاک ہے وہ ذات جو کہ زیادہ ظاہر ہے ظہور کے نفس سے اور مستور سے زیادہ مخفی ہے۔

اور اس مقدمے کی تفصیل جو ہے لکھی ہوئی ہے عمدہ کتاب نالۂ عندلیب میں، کیونکہ یہ تصنیف نہر جاری ہے اس سمندر سے اور وہ ام الکتاب ہے بلکہ یہ اُس کی موجوں میں سے ایک موج ہے، جب کہ یہ موجزن ہوتی ہے۔ اور موج کا وجود اُس کے بحر کا وجود ہے۔ وہی اس کی ابتدا کرتا ہے، وہی اس کو لوٹاتا ہے۔ بے شک یہ شرح ہے جو اس سے پیدا ہوئی، اور بچہ اپنے باپ کا راز ہوتا ہے۔

اللہ کے نام کا تمام ناموں پر دلالت کرنے کا بیان اور ہمارے نبی اکرم صلعم کا محمد اور احمد نام رکھے جانے کا سبب

اور جان لو کہ اللہ کے نام کی دلالت تمام اسماء کے مدلولات پر مطابقت رکھنے والی دلالت ہے۔

ان میں سے ہر ایک پر اس کی دلالت تضمینیہ ہے، اور التزام کی حیثیت سے جو اُس کے ساتھ لازم آتی ہے دلالتِ التزامیہ ہے جیسے انسان دلالت کرتا ہے حیوانِ ناطق ہونے پر۔ یہ دلالتِ مطابقیہ ہے اور اس کے ایک جزو پر دلالتِ تضمینیہ ہے، اور لکھنے کے قابل ہونا دلالت التزامیہ ہے لیکن اس مثال سے یہ بات لازم نہیں آتی کہ اللہ تعالیٰ اجزا کا مرکب ہے اور وہ مجموعہ ہے، کیونکہ یہاں مثال بیان کی گئی ہے سمجھانے کے لیے اور اللہ کی مثال اعلیٰ ہے۔ کبھی مراد لی جاتی ہے اللہ کے نام رحمان سے تنہا اس کی ذات کیونکہ وہ نام اپنے اندر یہ نام لیے ہوتا ہے جیسے اللہ عزوجل نے فرمایا ہے کہ کہو ان سے کہ پکارو اللہ کو یا پکارو رحمان کو، جو بھی تم پکاروگے پس اسی کے لیے ہیں اسمائے حسنیٰ۔ پس مرتبہ جامع جو کہ مراتب کی انتہا ہے وہ ربِّ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہے جیسے کہ کہا اُس کے رب جل جلالہٗ نے کہ انتہا تیرے رب کی طرف ہے۔ یہی اللہ اُس کا رب ہے، اور وہ اس کا بندہ اور رسولؐ ہے اس لیے اس نے مکمل کی اور ختم کی رسالت اسی کے ساتھ، اور جب کہ حمد مخصوص تھی اُس کے رب کے نام کے ساتھ۔ پس اُس نے کہا کہ حمد کا جھنڈا اس دن میرے ہاتھ میں ہے۔ پس اللہ رب العالمین ہے تمام اسما کو اپنے اندر لینے کی وجہ سے اور وہ رب الارباب ہے، اور مخلوق اس کی مربوب (پروردہ) اور حقیقت محمدیہ کی پیروی کے ساتھ اس کا مشتمل ہوتا تمام موجودات کے حقائق پر اور ذاتی طور پر وہ اسی اسم کا محبوب ہے۔ پس حکم دیا اُسے اُس کے رب نے اگر تم محبت کرتے ہو اللہ سے تو پیروی کرو میری۔ اللہ تم سے محبت کرے گا۔ پس حمد کی تخصیص محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے رب کے نام کے ساتھ جو ہے اسی سے محمدؐ کو موسوم کیا گیا، اور اُس کی کائناتی اور الہیاتی مراتب پر جامعیت کے ساتھ احمدؐ سے موسوم کیا گیا کیونکہ یہ صیغہ تفضیل ہے۔ اور اس سے ان کی فضیلت ان کے رب کے مرتبے کے اوپر ثابت نہیں ہوتی کیونکہ اللہ تعالیٰ فضیلت دینے والا ہے تمام فضیلت دیے جانے والوں کو کیونکہ اس نے خود فرمایا کہ ہم نے بعض کو بعض پر فضیلت دی۔ بلکہ اس کے ایک نام کو دوسرے پر فضیلت دینا حیثیت کے اختلاف سے ہے جیسے کہ واضح ہے۔ اگرچہ بعض محققین کا مذہب یہ تھا کہ جمع محمدی زیادہ جامع ہے جمع الٰہی سے، اور جان لو کہ اسم محمدؐ تحمید سے اسم مفعول کا صیغہ ہے اور حمد سے زیادہ بلیغ ہے۔ پس اس سے مراد ابلغیت محمدیت ہے کیونکہ اُن کا رب جو ہے اس کو اپنے ضمن میں لیے ہوئے ہے، اور کہا اللہ تعالیٰ نے، بعید نہیں کہ تیرا رب تجھے مقامِ محمود پر فائز کر دے۔ اور ظاہری اعتبار سے محمودیت سے غرض ممدوحیت ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ملائکہ اور لوگوں

کے منعوت ہیں (یہ سب ان کے نعت خوان ہیں) جیساکہ اللہ عزوجل نے کہا کہ بے شک اللہ اور اُس کے فرشتے درود بھیجتے ہیں نبی پر۔ پس اے لوگو جو ایمان لائے ہو اللہ پر، درود بھیجو رسول مقبول پر۔ اور یہ حمد مجازی ہے اللہ کی حمد کی طرح حقیقی نہیں جیسے تم کہتے ہو کہ میں نے موتی کی تعریف کی اُس کے شفاف ہونے پر اور اسم احمد تفضیل کا صیغہ ہے اور اس سے مراد اس کی حامدیت ہے اللہ کے لیے اکملیت اور تمامیت کے ساتھ، کیونکہ وہ بذاتہٖ اسی نام کا مربوب (پروردہ) اور مظہر ہے۔ اور نہیں تعریف کی کسی نے اللہ کی جیسی کہ حضورؐ نے اور اس کے ساتھ اُنھوں نے کہا اس مرتبۂ واجبیہ کے عرفان کے سبب اور بشری عجز کے سبب کہ میں نہیں احاطہ کر پاتا تیری ثنا کا، جس طرح کہ تو نے خود تعریف کی ہے اپنے آپ کی۔

علم کی قسمیں

علم کے معنی دانست کے ہیں، جو دانستن کے حاصل مصدری معنوں میں ہے، یعنی کہ وجود پر اپنی ذات وجود کا انکشاف، اور اسے علمِ واجب کہتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی ذاتی صفت ہے۔ وہ علیم ہے، اس کی نظر اپنی ذات پر بھی ہے، اور دُنیا اور جہان پر اور دیگر معلومات پر بھی۔ جیساکہ نورِ خدائے عزّوجلّ نے اپنی دینوی معلومات کے سلسلے میں خود فرمایا ہے کہ "وہ غیب وحاضر سب کا علم رکھتا ہے"[۱۰۷] اور ذات کے اعتبار سے فرمایا کہ "وہ سب عالموں سے زیادہ جاننے والا ہے"[۱۰۸]۔ بعض جگہوں پر علم اشیا کے موقع پر بھی خدا نے خود کو علیم کہا ہے، عالم نہیں جیساکہ قرآن مجید میں آیا ہے کہ "تحقیق وہ تمام اشیا کے جاننے والا ہے"[۱۰۸]۔ علیم سے یہاں مراد علم اشیا کے اپنی ذات کے علم کے ساتھ ساتھ ذاتی تصوّر اور ذاتی کمالات کا تصور بھی شامل ہے جو اس کی حقیقی صفات ہیں اور لازماً ان کمالات کے مظاہر یعنی دیگر موجودات کا تصوّر بھی اس میں داخل ہے۔ لہٰذا حق تعالیٰ کے مرتبۂ علیمی میں تمام اشیا کا کلی علم شامل ہے اور اپنی ذات کا علم بھی۔ بلاتشبیہہ یہ مثال جیساکہ زید کو اپنی ذات کی ہستی کا علم ہے اور مختصراً اپنی ساری صفات اور اعضا کا علم حاصل ہے جو ان صفات کے آلات ہیں۔ (اللہ کو) تمام دنیا کے لحاظ سے تمام اشیا کا علم ہے ان کی ذاتی جزئیات سمیت اور "آسمانوں اور زمین میں ایک ذرہ برابر بھی کوئی چیز اس سے پوشیدہ نہیں ہوتی"[۱۰۹]۔ یہ علم گویا موجود پر اپنے وجود کا انکشاف ہے۔ مثلاً جس طرح زید کو علم کی بدولت اپنی تمام صفات اور اعضا کی حقیقت وپہچان کی تفصیلات کا علم ہے، اور ایک ایک چیز کے متعلق پوری معلومات

رکھتا ہے۔ دانستن کے مصدری معنوں میں علم سے مراد دینی علم ہے جو حادث بھی ہے اور قابلِ تحصیل بھی۔ یہ علم گویا ایک وجود کا دوسرے موجود پر انکشاف کا نام ہے۔ یہ علم کُنہ (تہ) کے حقیقی فہم وادراک سے قاصر ہے۔ اور حقِ سبحانہ تعالیٰ موجوداتِ عالم میں سے جسے چاہتا ہے یہ علم عطا کر دیتا ہے۔ اسے کلام اللہ میں خدا نے خود علم قلیل (تھوڑا سا علم) کہا ہے جیسا کہ اس آیتِ کریمہ سے ظاہر ہے۔ "اور تم کو بہت تھوڑا علم دیا گیا ہے۔" ایک علم لدنّی (خداداد) ہوتا ہے، اور وہ ہے موجود پر اپنے وجود کا علم اور یہ علم اللہ تعالیٰ اپنے خاص بندوں میں سے جسے چاہتا ہے عطا فرماتا ہے۔ ان کے دلوں پر حقیقت کھول دیتا ہے جیسے خود خدا نے فرمایا ہے۔ "ہم نے اپنے پاس سے ان کو ایک خاص طور کا علم سکھایا تھا۔" لہٰذا علم کی تقسیم چار قسموں پر مشتمل ہے، یعنی دو دو مرتبہ وجوب کی، اور دو دو مرتبہ امکانی کے علم کی لیکن وجوبی مرتبے میں ایک وہ علم ہے جس کا مطلب ہے موجود کو اپنے وجود کی ذات کا علم ہونا جس پر اسمِ علیم دلالت کرتا ہے یہ علم ذات واجب الوجود سے مخصوص ہے۔ دوسرا علم وہ ہے جس سے مراد وجود پر موجود کا انکشاف ہوتا ہے جس پر عالم ہونے کا اطلاق صادق آتا ہے۔ اور یہ علم ذات سے زائد علم ہے۔ اس علم کو علمِ کثیر بھی کہا جا سکتا ہے۔ اس پر شدت اور زیادتی کا اطلاق بھی کیا جا سکتا ہے، اور مبالغہ کا بھی جو کثرت پر دلالت کرتا ہے جیسے علاّم یعنی بہت جاننے والا اسی مرتبے پر صادق آتا ہے۔ اور وہ علم جو عینِ ذات ہے وہ کثرت و قلّت کی نسبت سے برتر و بالا ہے۔ کمالِ ابلاغ بھی عین وہی ہے۔ لیکن امکانی مرتبے میں علم کا وہ مرتبہ ہے جس میں موجود پر وجود انکشاف ہوتا ہے۔ یہ دنیاوی علم ہے جو سراسر حادث بھی ہے اور قابلِ تحصیل بھی۔ اور حق تعالیٰ نے تمام انسانوں کو یہ علم اپنی عمومی تعلیم سے عطا فرمایا ہے اور علم قلیل (تھوڑا سا علم) بھی اسی سے عبارت ہے جیسے کہ پہلے ذکر آچکا ہے۔ علم کا ایک مرتبہ ہے جس کے معنی ہیں موجود پر وجود کا انکشاف۔ یہ علم اللہ تعالیٰ اپنے خاص بندوں کو عنایت فرماتا ہے۔ یہی علم لدنّی ہے کیونکہ اس صورت میں اللہ تعالیٰ خود اپنے پاس سے یہ علم بندے کو سکھلاتا ہے اور موجود پر اپنے وجود کا انکشاف ہو جاتا ہے، اور انکشاف کی صورت میں پھر کسی چیز کا علم بھی پوشیدہ نہیں رہتا۔ اور کوئی چیز کسی چیز کے لیے حجاب نہیں بنتی۔ اس علم کا مالک صاحبِ نظر ہوتا ہے اور بڑا تیز بین۔ پوشیدگی اور تیرگی سب اس کے لیے بے معنی ہو جاتی ہیں۔ لہٰذا کامل انسانوں کو جہاں تعلیم الٰہی کی نسبت دی جاتی ہے اس سے مقصود یہی خاص علم ہوتا ہے جو کامل عرفان اور حقیقی معرفت کی حالت میں حاصل

ہوتا ہے۔ اس میں دنیاوی علم قلیل بھی شامل ہوتا ہے، جو کوئی اختصاص نہیں رکھتا۔ اور مخصوص علم کو کمال معلومات کے اعتبار سے علم الٰہی بھی کہا جا سکتا ہے۔ یہ بھی یاد رہے کہ علم کی مزید قسمیں ہیں۔ ایک عقلی علم ہے جسے علم حکمت کہتے ہیں، دوسرا وہبی علم ہے جسے علم لدنّی کہتے ہیں۔ علم حکمت تین علوم پہ مشتمل ہے، جو علم الٰہی، علم ریاضی اور علم طبیعی ہیں۔ اُدھر علم لدنّی کی بھی تین قسمیں ہیں۔ علم نبوت و رسالت، علم خلافت و امامت اور کمالاتِ نبوت اور علم ولایت۔ اگر ان اُمور کا علم ہو جو دین و دُنیا دونوں کی اصلاح کا موجب ہیں تو وہ تقربِ خداوندی کا باعث بنتے ہیں۔ وہ علم حضرت جبرائیل علیہ السلام کے توسّل سے نازل ہوتا ہے اور علم نبوت و رسالت کہلاتا ہے۔ یہ علم سرورِ کائنات خاتم الانبیاؐ کی ذاتِ مبارک پہ جا کر ختم ہوا، اور نزول وحی کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ اگر انہی مذکورہ امور کا علم وحی کے بغیر الہام سے، بیعت لینے کے دعوے کے ساتھ حاصل ہو پس اگر رسول اللہؐ کے زمانے کے قریب بھی ہو، یعنی تیس ۳۰ سال کے اندر کا زمانہ تو یہ علم خلافت ہے، اور تیس سال کا زمانہ گزرنے کے بعد اگر رسولؐ پاک کی فرزندیت کے دور کے دن ہیں تو وہ علم امامت ہے۔ اور اگر اس کو رسولؐ پاک کی فرزندیت سے نسبت نہیں ہے تو کمالاتِ نبوت کا علم ہے۔ اور اگر فقط قربِ الٰہی کے اسرار و رموز کا علم ہو جس میں دین و دُنیا کی اصلاح کی قید نہ ہو اور عوام و خواص کی نجات و عذاب کا حکم بھی نہ ہو، اس الہام و کشف کو علم ولایت کہتے ہیں۔ یہ علم اگر عقلی علم کی شراکت سے جمع ہوا ہو تو اُسے علم تصوّف کہتے ہیں، اور اگر ایمانی قوت سے حاصل ہوا ہو تو اُسے ذوق و حال کہتے ہیں، اگر خلافت و امامت و کمالاتِ نبوت کا وہ علم یعنی ان امور کا علم جو دُنیا و آخرت کی اصلاح و بہبود اور قربِ الٰہی کا موجب ہو اور کشف و الہام کے بغیر حاصل ہوا ہو تو اُسے علم دین اور علم سلوک کہتے ہیں اور اگر فقط دُنیا و آخرت میں اصلاحی امور سے متعلق ہے تو وہ علم شریعت ہے۔ اور اگر اس میں ان اُمور کا علم بھی شامل ہو جو باطنی ترقی، قربِ الٰہی اور اللہ سے نسبت کا باعث ہو اور حضور و آگہی کا شرف بخشے تو علمِ طریقت ہے۔ اگر وہ علم ولایت، الہام و کشف کے بغیر صوفیا کی کتابوں اور رسالوں سے تقلیداً حاصل کیا ہے پس اگر عبد و معبود کے فرق مراتب اور دوئی کو ملحوظِ خاطر رکھا گیا ہے تو وحدت الشہود ہے اور نہیں تو وحدت الوجود ہے۔ اور اگر شرعی احکام کو ترک کر کے ذوق و حال کی کیفیت کے بغیر زبانی جمع خرچ ہے تو الحاد اور زندقہ ہے۔ اسے اللہ تعالیٰ محفوظ فرما مومن مردوں اور مومنہ عورتوں کو اس مصیبت سے جو پھیلی ہوئی ہے اس زمانے میں اور تو ہی سیدھے راستے کی طرف ہدایت دینے والا ہے۔[۵]

الہام و وحی کی قسمیں

الہام کی دو قسمیں ہیں، ایک عام الہام، اور دوسرا خاص الہام۔ الہام عام تو یہ ہے چونکہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے بغیر ذرہ تک بھی حرکت نہیں کرتا تو گویا ملہم حقیقی یعنی رب العزت ہر موجود کو مسلسل و متواتر دائمی طور پر فیض پہنچاتا ہے۔ لہٰذا وہ موجود اگر صاحب علم نہیں تو کہا جاتا ہے کہ یہ بات اُسے اپنی طبعی خواہش کے مطابق الہام ہوئی، اور اگر وہ صاحبِ علم ہے تو اُس کا نام ارادہ رکھا جاتا ہے کیونکہ الہام کے لغوی معنی ہیں کسی بات کا دل میں ڈال دینا، اور اس آیت کریمہ کے بموجب کہ "تم بدون اللہ رب العالمین کے چاہے کچھ نہیں چاہ سکتے" سب کو یہ عام الہام نصیب ہے۔ یہ پہلا الہام ہے جو اس ذات پاک سے جس کی وحدت میں سب کثرتیں گم ہیں تمام جانداروں تک پہنچتا ہے، اور اُن کے دل میں ارادے کو پیدا کرتا ہے۔ یہ ارادہ مطلق ہوتا ہے خواہ کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے کے لیے ہو۔ دوسرا الہام ان مراتب کے باہمی فرق سے ہوتا ہے۔ وہ بُرے اور بھلے کی تمیز سکھاتا ہے، اور ہر کام کی اچھائی یا بُرائی بتاتا ہے جیسا کہ اس آیت کریمہ سے واضح ہے کہ (قسم ہے انسان کی) جان کی اور اُس ذات کی جس نے اُس کو درست بنایا پھر اس کی بدکرداری اور پرہیزگاری دونوں باتوں کا اُس کو القا کیا۔ یقیناً وہ مراد کو پہنچا جس نے اس جان کو پاک کر لیا، اور نامراد ہوا جس نے اس کو فجور میں دبا دیا" لیکن خاص الہام وہ ہے جو حق سبحانہ تعالیٰ اپنے خاص بندوں کے دلوں پر جب انھیں ذاتِ باری کا قرب حاصل ہوتا ہے۔ غور و فکر یا کسی دوسرے حواس کے وسیلے کے بغیر فقط تائید ربانی سے القا کرتا ہے، اور ان کی سانس کی نالی سے بغیر کسی آواز کے کلمات نکلتے ہیں۔ اور کامل ترین اولیائے کرام کی یہ دائمی حالت ہوتی ہے۔ وہ خود کبھی بھی درمیان میں نہیں ہوتے اور یوں وہ اس مرتبۂ عالیہ کے آئینہ دار بن جاتے ہیں جیسے خدا نے قرآن میں یوں بیان فرمایا ہے کہ نہ ہی آپ اپنی خواہشات نفسانی سے باتیں بناتے ہیں" ایسے لوگوں کے تمام کلمات الہامات ربانی ہوتے ہیں اور ان کا مشاہدہ اور آگہی ذات کے سوتوں سے پھوٹتے ہیں۔ یا بعض اوقات اللہ تبارک و تعالیٰ فرشتوں کی وساطت سے صدا اور آواز کی صورت میں ان تک اپنا پیغام پہنچاتا ہے، اُسے ہاتفِ غیبی کی آواز بھی کہتے ہیں۔ اسی غیبی فرشتے کی آواز کبھی ظاہری کانوں سے بھی سُنی جا سکتی ہے۔ ورنہ اکثر و بیشتر اُسے وہی باطنی کان سنتے ہیں۔ اب جب کہ الہام کی یہ عمومی و خصوصی حالتیں آپ کی سمجھ میں آگئیں تو یہ بھی سمجھ لیں کہ عارفانِ ذات اور اولیائے کرام

جہاں کہیں اپنے بیان یا سلسلے میں الہام کا ذکر کرتے ہیں تو اس سے مراد وہی الہام خاص ہوتا ہے جو انھیں قربِ الٰہی کے وقت میسر آتا ہے، وگرنہ وہ عام الہام تو ہر اعلیٰ و ادنیٰ کے شامل حال رہتا ہے۔ ان کی کوئی تخصیص نہیں ۔ یہ بھی سمجھ لیں کہ وحی کے لغوی معنی ہیں خط، اشارہ یا کوئی پیغام کسی کے دل میں ڈال دینا یا کوئی پوشیدہ بات، لہذا وحی کی بھی دو قسمیں ہیں۔ ایک عام وحی جو عام الہام کی طرح کوئی تخصیص نہیں رکھتی جیسا کہ خود اللہ تعالیٰ نے اپنے کلامِ پاک میں اس کے متعلق یوں خبر دی ہے " اور وحی کی اس نے ہر آسمان پر اس معاملے کی اور آپ کے رب نے شہد کی مکھی کے دل میں یہ بات ڈالی " ۔ ایک خاص وحی ہوتی ہے جو انبیائے کرام سے مخصوص ہے ، اور حضرت جبرائیل کے ذریعے ان پر نازل ہوتی ہے ۔ یہ خاص نبوت کا معاملہ ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ اجھیں انتخاب کر کے برگزیدہ بنا دیتا ہے انھیں حواس کی مداخلت کے بغیر اور کسی ارادہ و تکلف کے بدون بہ نزول وحی فرماتا ہے، اور ان کو غیب کی سچی باتوں کی خبر دیتا ہے ۔ اس خاص وحی کی چند صورتیں ہیں ۔ یا تو نیند کی حالت میں جب انسان حواس سے کام لینا چھوڑ دیتا ہے یا بیداری کی حالت میں ، لہذا حضرت جبرائیل علیہ السلام کا نزول یا تو رسول اللہ صلعم کے قلبِ مبارک پر ہوتا تھا ، بموجب اس فرمان کے کہ اُس نے نازل کیا ہے اسے تیرے دل پر اللہ کے اِذن سے یا سامنے آکر بات کرتے تھے خواہ اشارہ کنایہ سے یا آواز و صوت کی صورت میں یا پھر کسی شخص کو دیکھے بغیر کچھ سنتے تھے ۔ اور نہیں ہے کسی بشر کے لیے یہ بات کہ اللہ اُس سے بات کرے بالمشافہ مگر وحی کے ذریعے یا پردے کے پیچھے سے یا بھیجتا ہے رسول ۔ پس وُہ وحی کرتا ہے اُس کے حکم سے جو وہ چاہتا ہے ۔ بے شک وہ دانا و حکمت والا ہے ۔ وحی کی یہ خاص قسم یعنی حضرت جبرائیل کے نزول کی شکل میں حضور سرورِ کائنات کے ساتھ جو خاتم الانبیا تھے ختم ہوگئی ، حتیٰ کہ اب تو وحی کا عام معنوں میں اطلاق کسی شخص یا چیز پر نہیں کرنا چاہیے تاکہ کہیں اس کے خصوصی معانی کا احتمال نہ ہو اور لفظی یا معنوی طور سے قدم ادب کی راہ سے تجاوز نہ کر جائے ۔ اب تو اس کارخانۂ قدرت میں الہام و القا اور سچے خوابوں کا سلسلہ باقی رہ گیا ہے ۔ جیسا کہ حضور پاک نے فرمایا ۔ بے شک وحی اُٹھالی گئی اور باقی رہ گئے سچے خواب جو نبوت کے اجزا میں سے کچھ جزو ہیں ۔ اور خواب جو ہے یہ تصور کرتا ہے نفس کا محسوسات کے نشانات کا ان کی ذات میں اور نفس کا تخیل کرنا ہے ہونے والے امور کے بارے میں ان کے ہونے سے پہلے اپنی قوتِ فکریہ کے ساتھ نیند کی حالت میں ۔ اسمائے حسنیٰ میں سے یہ دونوں

اسم "علیم اور ملہم" ایسی تمہیدی صفت یا الفاظ ہیں جن سے اصل مقصود کا سارا پتا چل جاتا ہے۔ اور درود و سلام ہو اُس پر جسے پُر مغز باتیں دی گئیں۔ یاد رہے کہ صلوٰۃ لغت میں دعائے خیر کو کہتے ہیں۔ اگر اسے بندوں سے منسوب کیا جائے تو اس کا مطلب ہو گا طلبِ رحمت اور اگر فرشتوں سے منسوب کیا جائے تو استغفار کے معنی ہوں گے، اور اگر خدائے بزرگ و برتر سے منسوب کیا جائے تو طلب کے معنی اس سے الگ ہو جاتے ہیں۔ اس سے مراد فقط رحمت و عنایت و احسان ہوتی ہے۔ اور کہا جاتا ہے کہ صلوٰۃ کے معنی تعظیم طلب کرتا ہے نبی کریم صلّی اللہ علیہ وسلّم کے لیے دُنیا میں اور آخرت میں اور الف لام (لام تعریف) یہاں الحمد کی جنس کے لیے ہے یا استغراق کے لیے، یعنی رحمت و احسان و فیضان کی جنس کی تمام قسموں کا دارومدار اس ذات پر ہے جسے پُر مغز باتیں عطا کی گئی ہیں۔ اگر صلوٰۃ سے مراد اُن پر رحمتوں کے نزول کی دُعا ہو تو لام تعریف لام اضافت بن جاتی ہے یعنی کہ اللہ کی رحمت یا اُس صلوٰۃ کے عہد کی یاد دہانی جس کا حکم اللہ تعالیٰ نے قرآن میں یوں دیا ہے کہ اے "وہ لوگو جو ایمان لائے ہو نبی پاکؐ پر درود و سلام بھیجو" اور سلام مشتق ہے سلامت سے، اور یہ وجود کو فیض پہنچاتا ہے اور یہاں بھی جملہ فعلیہ واقع نہیں ہوا کہ میں نماز پڑھتا ہوں یا ہم نماز پڑھتے ہیں۔ مذکورہ بالا بیان اور دقیق باتیں اور درود و سلام جو پُر مغز باتوں کی مالک ہستی کے سلسلے میں آئیں۔ وہ حقیقت محمدیہ کی جامعیت کی مناسبت سے ہیں کیونکہ مذکورہ بالا حقیقت کا مالک (ان پر خدا کا درود و سلام ہوؐ) ہی وہ پاک ہستی ہے جو اسم اللہ کی جامعیت کی مظہر ہے۔ میں ادب کی بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مبارک نام قلم کی نوک پر نہیں لایا ورنہ مراد انہی کی ذات باکمالات سے ہے۔ اس ذات کا مرتبہ اس قدر بلند ہے کہ سوائے حضور کی ذات اقدس کے ذہن اور کسی طرف مائل نہیں ہوتا بلکہ ذہن میں فوراً ہی مبارک نام آتا ہے اسی لیے حمد و ثنا کے فوراً بعد پیغمبر پاکؐ ہی پہ درود و سلام بھیجتے ہیں اور یہ حدیث شریف کہ مجھے دی گئی ہیں پر مغز باتیںؐ بھی اسی امر کی صراحت کرتی ہے۔ اور درود و سلام سے بھی فقط انہی کے لیے کیونکہ وہی اس مرتبۂ جامعیت کے مکمل و کامل مظہر ہیں۔ اور پُر مغز باتوں کا عطا کرنا بھی یہی ظاہر کرتا ہے۔ اور یہ جو کہا جاتا ہے کہ رحمت و احسان و فیض کی ساری قسمیں انہی کی ذات یا صفات کے لیے مختص ہیں اس لیے کہ وہی اس کا کامل و مکمل مظہر ہیں۔ اس کی تائید کتنے ہی اقوال سے ہوتی ہے۔ پس کسی چیز کے دعوے کی مثال دلیل و گواہان صادق کے ساتھ ہوتی ہے۔ کیا ہی پُر لطف اور پُر مغز بات وہ ہے

جس کے الفاظ تھوڑے اور معانی زیادہ ہوتے ہیں، نیز پُر مغز باتوں سے مراد کلمات جامعہ کا مجموعہ ہے کیونکہ خوبی و عمدگی اور نیکی کا کوئی لفظ نہیں رہ گیا جو حق تعالیٰ نے اُن کے لیے استعمال نہ کیا ہو۔ اور اس سلسلے میں کسی طور بھی کوئی فرو گذاشت نہ ہوئی۔ اس کے بیان کا پورا پورا حق ادا کر دیا۔ لہٰذا مخلص پیروانِ محمدؐ کے لیے جنھیں یہ کلمات وراثت میں ملے ہیں اُس صاحبِ کمالات کی بزرگی و عظمت و سرداری کے طفیل ایسے کلمات کا عطا ہونا بھی روا ہے، اور اس قسم کی واردات کا القا و الہام بھی بجا ہے "(اللہ کا درود و سلام ہو اُس پر، اُس کی پاکیزہ آل پر اور اس کے ہدایت یافتہ اصحاب پر") آل رسولؐ کی طہارت و پاکیزگی کا بیان اس لیے کیا گیا کہ آیہ تطہیر اہل بیت ہی کے حق میں نازل ہوئی۔ اور یہ عالی مرتبہ ہستیاں کائنات کے اسی افضل ترین ہستی کے اجزا ہیں۔ درود ان پر اور ان کی آل پر۔ وہ مکمل طور پر پاکیزہ ہیں۔ ظاہری طور پر باطنی طور پر، پوشیدہ طور پر اور اعلانیہ طور پر۔ اور طاہر وہ ہے جسے بچالے اللہ تعالیٰ تمام مخالف باتوں سے، طاہر ظاہر وہ ہے جسے بچالے اللہ گناہوں سے، اور طاہر باطن وہ ہے جسے اللہ بچالے وسوسوں سے اور وسوسہ پیدا کرنے والی چیزوں سے، اور مخفی طاہر وہ ہے جو اللہ سے ایک پلک جھپکنے کے لیے بھی غافل نہیں ہوتا۔ اور مخفی اور اعلانیہ طاہر وہ ہے جو حق اور خلق دونوں کے حقوق کو ادا کرنے والا ہو جانبین کی رعایت کے ساتھ۔ اُنھیں رشد و ہدایت کی صفت کا موصوف اس لیے ٹھہرایا گیا ہے کہ فی الحقیقت وہی رشد و ہدایت سے متصف ہیں اور ایمان کے شرف سے مشرف اور پورے صدق اور کامل خلوص کے ساتھ شجر رسالت مآبؐ کے ساتھ پیوستہ ہیں اور اُنھوں نے اپنے آپ کو نبوت کے سدرۃ المنتہیٰ سے باندھ رکھا ہے، لہٰذا آل رسولؐ کی مثال اس درخت کی شاخوں کی سی ہے جنھوں نے اسی درخت سے پھوٹ کر نشوونما پائی۔ اور یاران رسولؐ کی مثال ان شاخوں کی سی ہے جسے اصلی درخت سے کاٹ کر کسی دوسرے درخت سے پیوند کر دیا گیا ہو۔ اس پیوستگی سے وہ اسی درخت کی دیگر شاخوں کی طرح ہو جاتے ہیں۔ اور پہنچتا ہے اس اصل کا فیض تمام شاخوں کو برابر برابر چاہے یہ شاخیں اصلیہ ہوں یا وصلیہ (پیوندی)، اور اسی وجہ سے فرمایا رسول اللہ صلعم نے کہ میری آل وہ ہے جو میرے راستے پر چلے۔ غرضیکہ ان شاخوں کے باہم وصل و پیوند اور ان معاونوں کے توسل سے یہ شاخیں خوب بار آور ہوتی ہیں۔ کتنے خوب نقوش و نشانات ہوتے ہیں اور کتنی گھنی چھاؤں ہوتی ہے۔ اور اپنے حسن و زیبائی کی بنا پر یہ زینت و آرائش کا باعث بنتی ہیں۔ اب جب کہ ان شاخوں کا اُس مقدس و طیب

درخت سے مکمل طور پر پیوند ہو چکا ہے، اور حضور سرورِ کائنات ؐ کے خصوصی قرب کے شرف سے مشرف بھی ہو چکے ہیں۔ ان میں سے کسی ایک سے پیوند گویا درحقیقت اسی شجرِ طیبہ سے پیوند ہے اور اُس سے کٹ جانا گویا اسی صاحب لولاک سے کٹ جانے کے مترادف ہے۔ ایسی فحش تقصیر سے میں خدا کی پناہ مانگتا ہوں۔ ان میں سے ہر ایک ہدایت کا ایک درخشاں ستارہ ہے اور امتِ محمدیہ کا پیشوا و رہنما۔ اسی لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میرے صحابی روشن ستاروں کی طرح ہیں جو ان کی اقتدا کرے گا، ہدایت پر رہے گا۔ آل رسولؐ کے متعلق مفصل تحقیق اور صحابہ کرامؓ کا بیان اور ان کے مراتب کا ذکر پوری توضیح و تشریح کے ساتھ ایک اگلے باب میں آئے گا جو اہل بیت کی محبت کے سلسلے میں " دارالسلام" کے نام سے لکھا گیا ہے۔ پس لوٹو اسی کی طرف اور دیکھو اس چیز کی طرف جو اُس کے اندر چھپی ہوئی ہے، اور اُس پر اعتقاد رکھو اور داخل ہو جاؤ بیت معمور میں، اور اطلاع حاصل کرو خالص محمدیوں کی تحقیقات پر، اور سوار ہو جاؤ نجات کی کشتی میں انشاء اللہ۔ اس کے بعد یہ فقیر خواجہ میر محمد جس کا تخلص درد ہے، حمد و درود کے بعد میں نے اپنے معروف نام خواجہ میر کا ذکر کیا ہے۔ اور یہ تعارف اس لیے کہ فقیر کو اسی نام سے بلایا جاتا ہے۔ اور دوسرے نام جن سے حضرت پیر و مرشد نے مجھے ممتاز فرمایا اور جن کا ذکر آخری مقدمہ میں آچکا ہے وہ نام زیادہ مشہور نہ ہونے کی وجہ سے نہیں لکھے گئے۔ لفظ فقیر کا استعمال میں نے لفظ بندہ کی جگہ استعمال نہیں کیا، بلکہ اس کے عمومی معنوں (محتاج و مسکین) میں استعمال کیا گیا ہے کہ "اللہ بے نیاز و غنی ہے باقی سب محتاج ہیں"[119] بلکہ یہ استعمال تو اپنی خاص موروثی سعادت و دولت کے اختصاص کی وجہ سے ہے جس کا اظہار اور جس پہ فخر و مباہات کرنے کا کوئی مضائقہ نہیں کیونکہ خود حضورؐ نے فرمایا کہ فقر میرے لیے باعثِ فخر ہے۔ یاد رکھنا چاہیے کہ اگرچہ ناموں میں ان کے الفاظ کا بامعنی ہونا ضروری نہیں جس مسمی کے نام پر وہ دلالت کرتے ہیں وقتی طور پر وہی اس کے معنی ہیں لیکن عارفوں اور کاملوں کی اسم گزاری کے وقت حدیث شریف کے بموجب اچھے اور بامعنی نام رکھتے ہیں اور اُس سے کوئی خاص مراد یا کوئی اشارہ ہوتا ہے۔ مہمل الفاظ کا ہرگز استعمال نہیں کرتے، بلکہ مختصر اور جامع نام ہوتے ہیں۔ اس لیے اس فقیر کا نام جو خواجہ میر ہے میری پیدائش کے وقت میری والدہ ماجدہ کے والد بزرگوار (یعنی میرے نانا سید العارفین حضرت میر سید محمد حسینی قادری بن نواب میر احمد خان شہید قدس اللہ سرہ' نے رکھا تھا۔ وہ عجیب جاہ و جلال اور فقر و غنا کے مالک تھے۔ اُنھوں نے اپنے اس بزرگی و کمال کے مرتبے سے پورا پورا انصاف کیا۔ ہمارے خاندان اور ہمارے

ددھیال و ننھیال کے بزرگوں کی بزرگی، سرداری، شرافت، بہادری، غیرت، ہمت و جرأت اور جوانمردی و مروّت اتفاق رائے سے مسلّمہ تھی اور اس کا چاردانگ عالم میں شہرہ تھا۔ الغرض میں اپنے بزرگوں کے ظاہری و باطنی اوصاف کا کہاں تک ذکر کروں، خدا کے فضل و کرم سے ان کے کمالات کی کوئی حد اور انتہا نہیں۔ کہیں بات خودستائی تک نہ جا پہنچے اور کہیں فخر کا گمان نہ گزرے، لیکن میں تو یہ اُس نعمتِ خداوندی کے شکر کے طور پر کہہ رہا ہوں۔ اللہ کا سو شکر، بحمداللہ کہ اب تک ددھیال و ننھیال کی طرف سے سب کیا مرد، کیا خواتین اور ان کے اعزا و اقربا حسبی نسبی سید تھے اور ہیں۔ یہ دو لفظ یعنی خواجہ اور میر جو دونوں ولایت کے الفاظ کے اختلاف کے مطابق سادات کے القاب ہیں، ان کے اکٹھا کرنے سے منظور یہ ہے کہ خواجہ کے معنی مالک، سردار، آقا و مولیٰ کے ہیں لہٰذا اس کا اطلاق سید السادات (ان پر خدا کی سلامتی ہو) کی نسل پر کیا گیا ہے۔ اور سادات کے بڑے بڑے بزرگ خواجہ کے لقب سے ملقب ہوئے۔ خواجہ بہاؤالدین نقشبند قدس سرہٗ صحیح النسب حسینی سید ہیں۔ اور گیارہ واسطوں کے سہارے میرے والد بزرگوار کے جد امجد ہیں اُنھیں بھی خواجہ ہی کہتے تھے۔ تیرھویں پشت میں جا کر ان کا سلسلہ امام عسکری رضؓ سے جا ملتا ہے، اور ہم سب کا شجرہ پچیس ۲۵ پشتوں تک علی الترتیب باقی گیارہ اماموں سے جا ملتا ہے لہٰذا ان کی اولاد کو اسی لحاظ سے خواجہ زادگان کہتے ہیں۔ لہٰذا میرے قبلہ و کعبہ والد بزرگوار کے نام کے ساتھ بھی خواجہ کا لفظ آیا ہے۔ اور میر بھی سادات کا لقب ہے، اسے لفظ سیّد کی جگہ استعمال کرتے ہیں اور یہ لفظ اکثر سید عبدالقادر جیلانی کی اولاد کے ناموں کے ساتھ آیا ہے؛ اور میری دادی یعنی میرے والد بزرگوار کی امی بھی خدا کے فضل سے انہی کی اولاد میں سے ہیں۔ لہٰذا ان وجوہات کی مناسبت سے میرا نام خواجہ میر رکھا گیا اور میرے بھائی کا نام خواجہ محمد میر رکھا گیا۔ خدا اُنھیں زندہ سلامت رکھے اور کہیں بھی اور کسی حال میں مجھ سے الگ نہ رکھے۔ دونوں ناموں میں امتیاز کے لیے محمد کا لفظ مبارک درمیان میں لایا گیا ہے اور اسی معنی میں اس کی تعبیر کی جاتی ہے۔ میرے ایک اور چھوٹے بھائی کا نام جو میرے اس عزیز بھائی سے چند سال بڑے تھے سید میر محمدی تھا۔ وہ پیدائش اور بچپن ہی سے عجیب کمالات اور ذاتی تقدس رکھتے تھے۔ وہ انیس سال کی عمر میں سن ۱۱۶۳ ہجری کے ماہ ربیع الاوّل کی پانچویں تاریخ کو اس عالمِ فانی سے مُنہ موڑ کر اپنے خدا کے حضور میں حاضر ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ اُنھیں غریق رحمت کرے، ان کی مغفرت فرمائے اور اُنھیں جنت الفردوس میں جگہ دے۔ اور اس فقیر زادے کا یہ نام (صاحب میر محمدی)

الملقب نورچشم ناصر (نور ناصر) اللہ اس کی حفاظت کرے، اس کو ہدایت دے اور اُسے سلامت رکھے یہ بھی اسی فقیر کے نام کا ترجمہ ہے۔ چونکہ بھائیوں کے نام کا ذکر آگیا، اپنے بڑے بھائی کی یاد بھی میرے سینے میں موجزن ہوئی۔ اُن کا اسم مبارک میر محمد محفوظ محمدی تھا۔ ان کی تاریخ پیدائش محمد محفوظ ہی کے الفاظ سے نکلتی ہے۔ وہ بڑے ظاہری و باطنی کمالات کے مالک تھے جس نے اُنھیں ایک بار بھی دیکھا دل پہ داغ مفارقت رہ گیا۔ وہ مجھ پر بڑی شفقت و مہربانی فرماتے تھے اور ہرگز وہ سلوک روا نہ رکھتے جس کا یہ نالائق سزاوار تھا بلکہ اس احقر کے حق میں بکمال شفقت فرمایا کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے تمھیں اس کم عمری (بچپن) ہی میں اپنی خصوصی نسبت سے نوازا ہے۔ میرے احوال کی طرف توجہ رکھو اور مجھے میرے ہی باطنی حالات کے متعلق مطلع کرتے رہا کرو۔ اور بڑا اصرار کر کے اس سلسلے میں مجھے والد بزرگوار سے اجازت لے دی۔ واحسرتا وادریغا مجھے بھائی کا چہرہ دیکھنے کا کتنا شوق ہے۔ وہ عین عالم شباب میں والدِ بزرگوار کی زندگی ہی میں سن ۱۱۴۵ ہجری کے ماہ رجب کی سولھویں تاریخ کو اِس عالم فانی سے اُس عالم باقی کو سدھار گئے۔ ان کے لیے سعادت ہے، بھلائی ہے اور بہترین ٹھکانہ ہے۔ اے اللہ یہ سب مذکور لوگ زندوں میں سے اور مردوں میں سے خالص محمدی ہیں اس چیز کو پانے کی وجہ سے جو تو نے ان پر انعام کی اور ان کو فضیلت دی، اور تو نے شرف دیا فضل سے اور عنایت سے۔ اے اللہ دوست بن جا اُس کا جو اُن کا دوست ہے، اور دشمن ہو جا اُن کا جو اُن سے دشمنی رکھے، اور محبت کر اُن سے جو ان سے محبت کرے، اور بغض رکھ اُن سے جو اُن سے بغض رکھے، اور نصرت فرما اُن کی جو اُن کی مدد کریں، اور رسوا کر دے ان کو جو اُن کو رسوا کریں کیونکہ وہ تیرے ولی کی اولاد ہیں اور تیرے علی کے جگر گوشے اور تیرے نبیؐ کی آل اولاد ہیں۔ اے اللہ درود اور سلام بھیج محمدؐ پر اور آل محمدؐ پر جیسا کہ تو نے درود و سلام بھیجا ابراہیمؑ پر اور آلِ ابراہیمؑ پر۔ اے اللہ برکت بھیج اوپر محمدؐ کے اور آل محمدؐ کے۔ جیسے کہ تو نے برکت نازل کی ابراہیمؑ پر اور آلِ ابراہیم پر۔ بے شک تو حمید مجید ہے۔ قصّہ کوتاہ یہ کہ اس کلمۂ محمدی کی تخصیص اور اس کا ہمارے ناموں کے ساتھ ضم ہونا اس طریقت محمدی کی مناسبت سے ہے۔ حق سبحانہٗ تعالیٰ نے ہمارے والدِ بزرگوار (ان پر خدا کی برکات کا نزول ہو اور اہلِ دُنیا کو اُن سے مستفیض فرمائے) کو کمال برگزیدگی عطا فرمائی تھی، فنافی الرسول کے بلند مقام کے لیے مختص فرمایا تھا اور پھر ان کی ذاتِ بابرکات کی وساطت سے ہمیں خالص محمدیت کے شرف سے مشرف فرمایا۔ یارب مجھے قابو میں رکھ کہ میں تیرا شکر ادا کروں تیری نعمت پر

جو کہ تو نے مجھ پر کی، اور میرے والدین پر کی، اور یہ کہ میں عمل صالح کروں جس سے تو راضی ہو جائے اور داخل کر مجھے اپنی رحمت کے ساتھ اپنے صالح بندوں میں[۴۲] اگرچہ ملی جلی محمدیت سبھی اسلامی فرقوں کو حاصل ہے، اور یہ لازوال دولت اور سعادت سبھی مومنوں کے شاملِ حال ہے، لیکن ان کا سونا خالص اور بغیر کھوٹ کے نہیں۔ انھوں نے اپنے ناموں کی انانیت اور کدورت کا تانبا بھی انہی میں ملا رکھا ہے، وگرنہ وہ خود کو خالص محمدی ہی کہلاتے اور اپنے ناموں کے ساتھ اپنے طریقوں اور روشوں کے نام نہ ملاتے۔ اور اُسی شاہراہ سے وہ الگ نہ ہوتے اور سوادِ اعظم سے کٹ جانے کو کبھی پسند نہ کرتے اور نہ ہی تہتر[۴۳] فرقوں میں بٹ کر رہ جاتے۔ اور کبھی تفرقہ کی اس آگ میں نہ جلتے لیکن خدا نے چاہا تو کچھ عرصے بعد شمولِ محمدیہ کی برکات سے پگھل کر ان کی وہ کدورت اور کھوٹ دور ہو جائیں گے اور اُنھیں خدا خالص و صاف کر کے خودی و تکبر[۴۴] کے شرک سے جو شرک خفی ہے پاک کر دے گا، اور اُن میں جتنا خالص پن تھا وہی باقی رہ جائے گا اور محمدیت کا وہ بحرِ بیکراں ان تمام ندی نالوں کو خود میں جذب کر کے (اپنے ساتھ ملا کر) سب کو خالص محمدی بنا دے گا۔ وہی ذات ہے جس نے بھیجا اپنے رسول ؐ کو ہدایت کے ساتھ اور دین حق کے ساتھ تاکہ اُسے غالب کر دے پوری جنس دین پر، چاہے مشرکوں کو یہ بات کتنی ہی ناگوار ہو۔ پاک ہے اللہ اپنی تعریف کے ساتھ کہ خالص محمدی سب کے سب دینِ حق سے جا ملے، اور اپنے نام و نشان کی قید سے آزاد ہو گئے۔ سادات کو اپنے ورثہ کی سعادت نصیب ہو گئی اور جڑ نے شاخوں کو اپنی طرف کھینچ لیا، کیونکہ ہر چیز اپنے اصل کی طرف ہی رجوع کرتی ہے۔

طریقِ محمدیؐ کے ظہور کا انکشاف
ان سب اصحاب طریقت پر خدا کا درود و سلام

اس معاملے کی حقیقت یوں ہے کہ میرے والد بزرگوار امیر محمد بن حضرت خواجہ محمد ناصر (خدا مدد کرے ہماری ان کے راز کی نصرت کے ساتھ اور پاکیزہ کرے اپنی نیکی کی برکت کے ساتھ) نے اس معاملے کے ظہور کے دنوں میں سات دن رات انسانوں کی اس فانی دُنیا کی طرف قطعاً کوئی توجہ نہ کی حتیٰ کہ کھانے پینے اور دیگر بشری تقاضوں کی طرف بھی مائل نہ ہوئے۔ وہ اکیلے اپنے اس حجرے میں بند رہے جو اسی کام کے لیے مخصوص کیا گیا تھا۔ فقط فرض جماعتوں کے اوقات میں ہم اُن کے غلام اُن کی پیشوائی میں نماز پڑھنے کے لیے

حاضر ہو جاتے تھے، اور میں کیا کہوں کہ ان ایام میں ہم بے چاروں پر کیا گزری جب حجرے کا دروازہ ہر وقت بند رہتا تھا۔ میں بچارہ اسی در پر تن تنہا پڑا رہتا اور دن رات اسی آستان مبارک پہ سر رکھ کر زار زار روتا رہتا۔ کھانے پینے اور سونے سے مجھے کوئی رغبت نہ تھی۔ ایک آدھ مرتبہ محترمہ والدہ صاحبہ (خدا ان پر رحمت کرے اور ان کی مغفرت فرمائے) مجھے تاکیداً اپنے حضور میں بلا لیتیں اور کھانے کا حکم دیتیں۔ ان کے فرمان کے بموجب میں جبراً چند لقمے کھا لیتا اور پھر فوراً ہی اس دہلیز مبارک پہ حاضر ہو جاتا۔ دیگر عزیز واقارب لگے بندھے نماز کے اوقات پہ آجاتے اور پھر اپنے گھروں کو لوٹ جاتے، مگر میں وہیں فرش محمدی (زمین) پر پڑا رہتا۔ ہرچند کہ والدہ صاحبہ کو میرا یوں زمین پر لیٹ رہنا سخت ناگوار گزرتا بلکہ اُنھیں دُکھ ہوتا اور بعض آدمیوں کو سختی سے پابند کر دیتے کہ میرے پاس حاضر رہیں لیکن میں کبھی کسی کو اپنے پاس پھٹکنے نہ دیتا تھا اور بستر یا سرہانہ و تکیہ وغیرہ جو کچھ بھی بھیجتے میں اُن میں سے کسی چیز کو استعمال میں نہ لاتا۔ پس کبھی کبھار بے اختیاری کے عالم میں اونگھ جاتا۔ بہرحال آٹھویں دن جب اللہ جل شانہٗ وعم نوالہٗ نے اپنے فضل و کرم سے اُس صاحب جمال و جلال کو ہم دُنیا کے اسیروں کی طرف واپس لوٹایا، اور ہماری جانب متوجہ کیا، جب اُنھوں نے دستِ مبارک سے حجرے کا دروازہ کھولا اور مجھے اس مذکورہ بالا حالت و طریق سے دروازے کی چوکھٹ پر پڑا پایا تو بخشش کا وہ سمندر جوش میں آیا اور قبولیت کی بادِ نسیم چلنے لگی۔ مجھے خود اپنے مبارک ہاتھوں سے اپنی بغل میں بھینچا۔ میری پیشانی پہ بوسہ دیا، اور بشارت و خوشخبری کے بہت سے کلمات جو اس وقت میری زبان سے ادا نہیں ہو رہے، میرے حق میں فرمائے۔ پس ہر قسم کی تعریف اللہ کے لیے ہے جس نے مجھے خالص محمدیوں سے پہلا بنایا، اور مجھے حکم دیا گیا کہ میں ہو جاؤں پہلا شخص جو اسلام لایا اور پہلا جس نے بیعت کی میرے باپ کے ہاتھ پہ اس طریقے پر جو بڑا قابلِ اعتماد علمی اور آخری ہے اور سب تعریف اللہ ہی کے لیے ہے۔ اُنھوں نے ارشاد فرمایا کہ اے محمدی غم نہ کھا بے چین نہ ہو بلکہ خوشیاں منا کہ حق تعالیٰ نے ہم محمدیوں کو عجیب عنایات سے نوازا ہے، اور بڑی بزرگی سے مشرف فرمایا ہے کہ حضرت امام حسن رضی اللہ تعالیٰ کی مقدس رُوح نے نزول فرمایا تھا، اور وہ یہ سارے دن وہیں ساتھ رہے، اور خاص نسبت سے میرے دل میں یہ الہامی بات ڈال دی اور فرمایا کہ یہ نسبت دیگر اُمتیوں تک پہنچا دے۔ خدا نے چاہا تو یہ نسبت جس کا اس وقت آغاز ہوا ہے مہدیؑ آخر الزماں کے ظہور کے وقت اپنے کمال کو پہنچ جائے گی۔ اس کے بعد فرمایا کہ میں نے عرض کی کہ اے امام عالی مقام کیا میں اس طریق کا نام حسنی طریق رکھ دوں کیونکہ

یہ آپ ہی نے ارشاد فرمایا ہے۔ اور مزے کی بات کہ یہ ہے بھی نیکی کا راستہ۔ امام عالی مقام نے انگشتِ حیرت مُنہ میں دباتے ہوئے فرمایا کہ بیٹا یہ ہمارا کام نہیں، یہ دوسروں کا کام ہے۔ اگر ہمارا ایسا ارادہ ہوتا تو ہم اپنے وقتوں میں دوسروں کی طرح اپنے طریق کو اپنے نام کی مناسبت سے پکارتے۔ ہم تمام فرزندانِ رسولؐ اس بحرِ حقیقت میں گم ہیں۔ اور اس سمندر میں مستغرق ہیں۔ ہمارا نام اسی نامِ محمدؐ سے ہے۔ ہمارا نشان بھی نشانِ محمدؐ ہے، ہماری محبت بھی محبتِ محمدؐ ہے اور ہماری دعوت بھی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت ہے۔ اس طریق کو طریق محمدی کہنا چاہیے (ان پر خدا کا درود و سلام) کیونکہ یہی حضور پاکؐ کا طریقہ ہے۔ ہم نے اپنی طرف سے اس پر کچھ نہیں بڑھایا۔ ہمارا مسلک بھی مسلکِ نبوی ہے، اور ہمارا طریق بھی طریق مصطفوی ہے۔ میں ختم کرتا ہوں اُسے جو واضح ہو چکا ہے۔

حاشیہ آرائی

پس ہر قسم کی تعریف اللہ کے لیے ہے، جس نے ظاہر کیے ہم پر اسرارِ محمدی حضور کے ظہور کے ساتھ اور وہ خود ظاہر کرنے والا ہے۔ اور منور کیا ہمیں اس کی تائید و نصرت کے نور کے ساتھ، اور وہی ناصر ہے۔ بے شک ہمارے لشکر ہی غالب آنے والے ہیں۔ اور اُس نے ہمیں درست کیا اپنے وجوب کی تقویم کے ساتھ، اور ہمیں مشرف کیا اپنے ہبہ کیے ہوئے کے وجود کے ساتھ، اور وہی عطا کرنے والا ہے، اور بنایا ہمیں اپنے غلبے کا مظہر عدم اور غائب پر، اور ہمیں شامل کر دیا ہے اپنے محبوب کے غلبے کے ضمن میں، اور وہی غالب ہے، اور بے شک ہمارے لشکر ہی غالب آنے والے ہیں۔ چونکہ ہمارا لشکر جو ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا لشکر ہے، اور نہیں جانتا اللہ کے لشکروں کو مگر وہی اور خالص محمدی تیرے نور سے منوّر ہیں۔ وہی ہدایت پر ہیں اپنے رب کی طرف سے اور وہی فلاح پانے والے ہیں کیونکہ ہدایت مطلوب تک رسائی ہے۔ پس پہنچا دیا اللہ نے جو مطلوب اور مقصود ہے موجودات میں سے ان پر درود و سلام اور اُس کے اندر اُنھیں فنا کر دیا، اور نہیں باقی رہا ان میں سے کوئی سوائے نام اور نشان کے، اور وہ نور محمدی میں چھپے ہوتے ہیں۔ پس کامیابی تو خلاصی پانا ہے انانیت کی قید سے۔ پس اُن کے رب نے اُنھیں خالص کر دیا اُن سے، اور یہی لوگ خالص ہیں حقیقتاً اور یہی فلاح پانے والے ہیں۔ پس بے شک وہ پہنچ گئے ہیں جنسِ عالی کے مرتبے کو جو کہ محمدیت ہے، اور احاطہ کر لیا ہے تمام اقسام

کو جو اس جنس سے نکلی ہیں، اور ممتاز ہے وہ مرتبۂ انانیت سے الگ ہونے کی وجہ سے ان چیزوں سے ہٹ کر جو اس کے علاوہ ہیں۔ یہی لوگ نجات پانے والے ہیں اور بلند مرتبہ ہیں، اور اللہ ان کے ساتھ ہے اس بلندی میں اور یہی لوگ ہدایت پائے ہوئے ہیں۔ پس خالص محمدیوں نے جو یہ اعتبار پایا ہے وہ حقیقت محمدیہ کی جامعیت کے وسیلے کے سبب سے ہے (ان سب پر اللہ کا درود و سلام) اور اسی شمولیت کی وجہ سے وہ اپنے مخالفوں سے ممتاز ہیں نہ کہ دوسروں کی طرح اپنی انانیت کی راہ سے متمیز ہوئے ہیں۔ وہ اپنے مالک کی بارگاہ میں مکمل اور پورے طور پر فنا ہو چکے ہیں۔ ان کا یہ اشتراک ہی ان کے امتیاز کا باعث ہے۔ اپنے نام و نشان سے بالکل فارغ ہو جانا چاہیے، اور دل کے آئینے سے انانیت کے شرک کا زنگ رگڑ دینا چاہیے، اور نہ ہو جاؤ مشرکوں میں سے، ان میں سے جنھوں نے اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا، اور خود گروہ در گروہ بن گئے۔ اپنے آپ کو فنا فی الرسولؐ کر لینا چاہیے اور اپنے آپ کو خالص محمدی کہلوانا چاہیے۔ یہ ہے اللہ کی ہدایت اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے۔ اگر وہ شرک کرتے تو اللہ ضرور ان کے اعمال کو ناکارہ کر دیتا۔ وہ رستہ جس پہ چل کر ہم نے ہدایت پائی ہے یہی راستہ ہے، اور وہ طریقہ بھی جس کی ہمیں قبلہ بزرگوار والد صاحب (جن کی اللہ نے روح القدس کے ساتھ مدد کی ہے) نے ہمیں دعوت دی۔ اور یہ میرا راستہ جو ہے سیدھا اور مستقیم ہے۔ پس اس کی پیروی کرو، اور نہ پیروی کرو ان راستوں کی جو تفرقے میں ڈال دیں تمھیں اس کے راستے سے[۱۸۱] اور یہی بات ہے جس کی تمھیں وصیت کرتا ہے وہ شاید کہ تم متقی ہو جاؤ۔ ہر چند کہ ملی جلی محمدیت کا اطلاق تمام اسلامی فرقوں پہ ثابت ہے، اور وہ اسی سرور کائناتؐ کی اُمّت میں داخل ہیں جس نے فرمایا تھا کہ عنقریب میری اُمّت افتراق میں پڑ جائے گا۔ لیکن خالص محمدیت اسی واحد فرقے کے نصیب میں ہے کیونکہ بدعتیوں کی کثرت اس کی وحدت میں خلل نہیں ڈال سکتی۔ اے اللہ مجھے زندہ کر محمدی بنا کر اور بنا مجھے محمدی اور میرا حشر کر نا محمدیوں کے زمرے میں۔ اگر حقیقت بین آنکھ ہو تو راہ یہی ہے تمھارے پاس تمھارے رب کی طرف سے بصیرت کی روشنیاں آگئی ہیں۔ پس جس نے بینائی سے کام لیا اپنا ہی بھلا کرے گا۔ اور جو کوئی اندھا بنے گا وہ خود نقصان اُٹھائے گا۔ اللہ تعالیٰ کی ہدایت سے محمدیت کی سچائی روشن ہے اور باقی سب تقلید ہے اور وہم و گمان۔ بے شک اللہ کی ہدایت ہی ہدایت ہے۔ اگر تم نے پیروی کی خواہشات نفسانی کی اس کے بعد کہ آگیا تمھارے پاس علم تو نہیں ہے تمھارے لیے پھر اللہ کی طرف سے ولی اور مددگار۔

خالص محمدیوں پر خالص محمدیت کا تمام جہات سے صادق آنے کا بیان اور اس کا دوسروں پہ عمومی اطلاق اور نجات کی طرف دعوت

یہ سمجھ لینا چاہیے کہ اپنے باطل وہموں اور ناقص فہموں میں خالص محمدیت کو بھی دوسرے طریقوں اور فرقوں سے الگ اور نئی پیدا شدہ چیز خیال کر کے سوادِ اعظم سے کوئی الگ تھلگ فرقہ نہ سمجھ بیٹھنا چاہیے نہ ہی محمدیت کا اُس پہ اطلاق کریں اور نہ ہی مجازاً یا اصطلاحاً اُسے اپنے دیگر ناموں کے زمرے میں رکھ کر پکاریں ۔ غلطی پہ غلطی نہ کریں ۔ ایک تو خود کو اُس حقیقتِ واحدہ سے الگ کر لیا اور تفرقوں میں پڑ گئے ، دوسرے اپنی شومیٔ قسمت سے نفس الحقیقت کو بھی نہ پہچان سکے ۔ ایک بار پھر بذاتِ خود اس امرِ واحد میں تفرقہ کا گمان کریں جو ویسا نہیں ہے ، بلکہ وہاں تو کسی دوئی یا جدائی کا احتمال یا تفرقے اور حدوث اور مجازاً یا اصطلاحاً کسی نئی اسم گزاری کا خیال اور کسی وقتی مصلحت کی بنا پر اُس کا گمان تو کیا ۔ اس مرتبے میں تو اتحاد و عینیّت کی گنجائش یا حقیقت و یگانگت کا اطلاق تک بھی ممکن نہیں کیونکہ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ فلاں شے حقیقت میں اپنا ہی عین ہے ، یا فلاں آدمی واقعتاً اپنے آپ سے یگانگت و اتحاد رکھتا ہے ۔ لیکن ان نافہموں کی کج فہمی اور ان بھینگوں کی غلط بینی کے لیے مثال کے طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ انسانیت انسان کے نصیب میں ہے اور حقیقت میں یہ اُس کی ذاتی چیز ہے ، اور اگر مجازاً یا اصطلاحاً انسانیت سے مُراد حُسن آدمیت ، کمال انسانی اور عمدہ اخلاق لی جائے تو وہ اس کا وصف بھی ہو سکتا ہے ۔ اور اس میں کوئی قباحت نہیں کہ مجازی اور اصطلاحی معنی صادق آنے کے باوجود حقیقت موجود ہے ۔ اور یہ ذاتی حقیقت بعض حیثیات اور اعتبارات کے لحاظ سے صفاتی حقیقت بن گئی ، اور اس صورت میں ہے کہ چونکہ حقیقت و مجاز کی کسی تعبیر کی گنجائش نہیں تو بھی حیثیتوں کے اعتبار کا موقع محل بھی ہو سکتا ہے ۔ اور مدت کی طوالت ، زمانے کی درازی اور تجدّد کے سبب سے دیگر افراد میں انہی معنوں میں کسی قسم کا تغیّر و تبدّل لاحق نہیں ہوتا مگر اتنا ضرور ہوتا ہے کہ بعض اوقات افراد اور بعض ارکان کی کثرت ان کی قلّت بن جائے اور یا بالفرض وہ خارجی طور پر بالکل دستیاب ہی نہ ہو ۔ یا بعض کامل ترین افراد کے شک کے لحاظ سے اول اور مقدم ہونا صادق آئے برخلاف دوسری صورتوں کے جو درحقیقت الگ چیزیں ہیں ۔ ان میں اس قسم کے امور ہرگز نہیں ۔ مگر کسی دور دراز کی وجہ یا کمزور سی مشابہت سے ایک کا دوسرے پر محض مجازاً ، اصطلاحاً یا جوازِ تسلسل کے

لحاظ سے اطلاق کریں اور وہ حقیقتاً متحد نہیں ہوتے۔ پس اسی طرح خالص محمدی خالص محمدیت کے مالک ہیں۔ حقیقت کی رُو سے بھی، اور شریعت و طریقت کی رُو سے بھی، یعنی حقیقی معانی کے لحاظ سے ذاتی طور پر بھی اور جواز و اصطلاحی وصفی معنوں کے اعتبار سے صفاتی طور پر بھی۔ بہرصورت ان کا عمومی، خصوصی، شمولی اور خالص ہونے کے لحاظ سے ان پر اطلاق بالکل صحیح ہے۔ مدتوں یا زمانوں کا گزرنا ان میں کوئی تفرقہ نہیں ڈال سکتا، اور ان کے افراد کی کثرت اور زیادتی ان کی وحدت کو متاثر نہیں کرتی، برعکس دوسرے متفرق فرقوں کے جو الگ ہو کر نئے نئے وجود میں آئے ہیں، اور ان نئی پھوٹنے والی شاخوں نے تباہی و گمراہی کا راستہ اختیار کیا۔ اس تمام جدائی و علیحدگی کے باوجود ان کے تفرقوں اور شاخوں پر نظر رکھتے ہوئے بھی اُنھیں عمومی، امتزاجی اور مجازی یا جواز کے لحاظ سے محمدیوں ہی میں شمار کیا جا سکتا ہے، اور اُنھیں اہلِ قبلہ کا نام دیا جا سکتا ہے۔ پس فی الحال حقیقت و ظہور محمدیہ کی وضاحت کے بعد ان سب کے لیے کوئی چارہ نہیں، اور نہ ہی راہِ فرار۔ اپنی تقصیر پر عذر معذرت ہی میں ان کی عافیت ہے۔ ان سب کی نجات و بہبود کے لیے مصلحت اور بہتری اسی میں ہے کہ وہ پھر اپنی اصل کی طرف مائل ہو جائیں اور اُس سے متحد و واصل ہو جائیں اور اتفاق و موافقت کی صورت تلاش کریں اور نفاق اور مخالفت کی راہ پر نہ چلیں۔ پہلے تو ظاہری طور پر اپنے اوپر خالص محمدیت کا نام درست کریں، اور باقی قیود سے بالکل نجات پا کر وہ اپنے مالک (ان پر خدا کا درود وسلام) سے پیوستہ ہو کر اسی کے بن جائیں۔ خدا نے چاہا تو اسی مبارک نام کے وسیلے اور صدقے سے وہ اسم بامسمیٰ ہو کر باطن میں بھی اسی حقیقت پہ فائز ہو سکیں گے۔ حیرت ہے ان لوگوں پر جو دین محمدی میں تفرقہ ڈالتے ہیں، اور اس مبارک نام سے نسبت کو چھوڑ کر کسی دوسرے نام و نشان کی نسبت کو جائز سمجھتے ہیں، اور پھر بھی ناز کرتے ہیں اور اُس سے بھی عجب تر یہ کہ متفرق ہونے کے باوجود ان بہتّر فرقوں میں سے ہر فرقہ خود کو اسی فرقہ واحدہ میں داخل سمجھتا ہے۔ حالانکہ ان فرقوں میں ایک نیا فرقہ ایسا بھی پیدا ہوا ہے جو اپنے آپ کو ان میں داخل نہیں سمجھتا۔ غرضیکہ ان میں سے کوئی فرقہ بھی اس دعوے میں سچا نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اگر سبھی فرقے صحیح اور سچ بات کہتے ہیں اور راہِ راست پر چلتے ہیں تو پھر ان میں تفرقہ کیسے پیدا ہوا، اور وہ بہتّر[۲] فرقے کیسے بن گئے۔ اور اگر ان میں کوئی ایک فرقہ سچا ہے، اور سچائی کے لائق تو پھر ان فرقوں میں سے وہ کونسا فرقہ ہے اور دوسروں کی تقصیر کیا ہے کہ وہ بھی ان سب کی طرح اصل سے جُدا ہو کر نئے پیدا ہوئے ہیں اور

الگ چیز بن۔ میٹھے اور پیدا بھی خالص محمدیت سے ہوئے۔ پوچھنا چاہیے کہ وہ اپنے آپ کو کیا کہلواتے ہیں اور آج تک کوئی ان کی قباحت کو نہیں جانتا۔ قوم کی اس ساری سادگی کو مدِ نظر رکھنا چاہیے، ان کے افعال و اقوال کو اچھی طرح دیکھنا بھالنا چاہیے، اور وہ خود بن کیسے جاتے ہیں اور جا کہاں رہے ہیں۔ اپنے آپ کو کہتے کیا ہیں اور پھر اپنے زعم میں خود کو سمجھتے کیا ہیں۔ ان کے حسبِ حال مجھے ایک عجیب و غریب حکایت یاد آگئی جو ان تمام صاحبوں کی عبرت اور آگہی کے لیے سپردِ قلم کی جاتی ہے:-

حکایت

جاہلوں کا ایک ٹولہ نماز پڑھنے کے لیے جماعت سے جا ملا۔ اسی اثنا میں ایک عارف بھی ادھر آنکلا، اتفاقاً اسی مکان میں داخل ہوا۔ ان نمازیوں کی صف میں سے ایک نمازی نے عارف کی طرف متوجہ ہو کر اس کا نام اور اتا پتا پوچھا۔ دوسرا جو اس کے پہلو میں نماز پڑھ رہا تھا اسے طعن و تشنیع کرنے لگا کہ تم نماز کے دوران باتیں کر رہے ہو اور نماز کے آداب کو ملحوظ نہیں رکھ رہے۔ اور اسی قسم کی بہت سی جلی کٹی باتیں اُسے سنائیں اور کہا کہ جاہل انسان تیری نماز کیسے صحیح ہو سکتی ہے۔ تیسرا آدمی جو اس کے ساتھ ہی نماز میں مشغول تھا بے اختیار ہو کر انھیں ڈانٹ ڈپٹ کرنے لگا کہ اسے کمینے آخر تجھے کیا ہوا، تو بھی اس کے ساتھ مل کر باتیں کرنے لگا اور اُس کی طرح اپنی نماز بھی باطل کر لی۔ جو اُس نے کیا وہی کچھ تو نے بھی کر دکھایا اور یہ نہ دیکھا کہ تم کس حال اور کس کے حضور میں ہو۔ چوتھے نے سخت غیظ و غضب میں آکر نماز توڑ دی اور چلانے لگا کہ جاہلو یہ کیا بحث چھیڑ رکھی ہے، اور اے غافلو یہ کیا حال ہے۔ خود میاں فضیحت اور دوسروں کو نصیحت کر رہے ہو۔ تم تینوں نہایت لغو اور جاہل انسان ہو۔ تم نے اپنی اپنی نماز توڑ ڈالی۔ اسی اثنا میں پانچواں جو ان کا امام و پیشوا تھا وہ بھی ضبط نہ کر سکا۔ کہنے لگا کہ خدا کا شکر ہے کہ میں تمھاری طرح گمراہی میں نہ گرا، اور تم جاہلوں کی طرح اپنی نماز برباد نہ کی۔ الغرض وہ عارف ایک طرف کھڑا ساری صورتِ حال دیکھ رہا تھا۔ ان کے سوال و جواب سُن رہا تھا اور بے اختیار ہنس رہا تھا۔ آخر ان کے حال پر رحم کھا کر ان سب کو جمع کیا، اور ان سب کی حقیقت سے اُن کو آگاہ کیا اور کہا کہ توبہ استغفار کرو، ہوش کے ناخن لو، اس جہالت اور حماقت سے نکلو اور پھر نئے سرے سے نماز پڑھو۔

پس اسی طرح خالص محمدیوں کا دل اس قوم کے حال اور انجام پر کڑھتا ہے، اور وہ محض خلقِ خدا کی خیرخواہی کے

لیے ان پر حقائق کا انکشاف کرتے ہیں اور سب کو صاف دل سے دعوتِ محمدیہ دیتے ہیں، اللہ تعالیٰ ہدایت ان کے نصیب کرے اور سب کو سعادت بخشے۔ سمجھ لینا چاہیے کہ ایسی بصیرت بھری خالص محمدی دعوت اور ایسے عارفوں کے پند و نصائح کو جاہلوں کے پند و موعظت یا غافلوں کے حرف و حکایت نہ سمجھنا چاہیے اور نہ ہی ان عارفانِ کامل کی ہمسری کا دعویٰ کرنا چاہیے، وہ تو خودی و تکبر کی قید سے بالکل آزاد ہو کر خالصتہً دینِ حق سے پیوستہ ہو چکے ہیں۔ عناد و مخالفت چھوڑو، ذرا انصاف کی آنکھیں کھول کر دیکھو، کیا وہ خالص دینِ محمدؐ کی دعوت دے رہے ہیں، یا کہیں دوسری نئی بدعتوں کی ترغیب دے رہے ہیں۔ ہدایت ربانی اور تبلیغ رسالت ان کے شامل حال ہے۔ اور آیات قرآنی اور احادیث نبوی ان کی باتوں کی تائید کرتی ہیں۔ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ جاہل اور بے اصول آدمیوں کا ٹولہ ان صادق اور مخلص مومنوں کی حقیقت کو بھی نہ پا سکیں اور ان کے کلام کے مفہوم کو نہ سمجھتے ہوئے حقیقت فہمی سے مُنہ موڑ لیں، کیونکہ وہ دوست اور دشمن میں تمیز ہی نہیں کر سکتے، اور مغز اور چھلکے کی پہچان تک نہیں رکھتے، وہ کچھ بھی کر گزریں کوئی مقامِ تعجب نہیں۔ اور کوئی بعید از قیاس بات نہیں کہ وہ تباہی اور گمراہی کے گڑھے میں جا گریں۔ وہ پہلے بھی حقیقتِ محمدیہ سے جُدا ہوئے ہیں اور اُس سے کچھ اخذ نہ کر سکے۔ اب بھی اگر نہ سمجھیں تو اس میں کونسی اچنبھے کی بات ہے۔ اور اگر مخلص مومن نہ بن سکیں تو تعجب کی کیا بات ہے؟

خالص محمدیوں کے مفہوم کی وضاحت
اور ان کی خصوصیات کی صراحت

ملی جلی محمدیت کے طریق والوں پر شرکِ خفی کا اطلاق اصطلاحی معنوں میں ہے جسے ہم کفرِ طریقت کہہ سکتے ہیں، یعنی کہ اُنھوں نے اپنے دین و ایمان میں اپنی نفسانیت کو شریک اور اپنی انا و خودی کو داخل کر لیا ہے۔ اور یوں ملّتِ واحدہ میں خلل و تفرقہ بازی کا ہنگامہ کھڑا کر دیا ہے۔ ہماری مراد شرکِ جلی سے نہیں، کیونکہ وہ تو صریحاً کفر ہے، اور وہ خدا کی وحدانیت میں کسی اور کو شریک بنانے سے پیدا ہوتا ہے۔ ہمارا تخاطب ان جاہلوں سے سوال و جواب کی شکل میں نہیں۔ اُن کے پاس جنگ و جدال کے سوا اور کچھ نہیں۔ اُنھیں ملی جلی محمدیت سے بھی کیا سروکار۔ ان کا تو ذکر ہی خارج از بحث ہے۔ پس لفظ شرکِ خفی یا ملی جلی محمدیت سے ہماری مراد تو ملتِ اسلامیہ کے وہ بہتر ۷۲ فرقے ہیں جو اس حدیث شریف

کے بموجب کہ عنقریب میری اُمّت افتراق میں پڑ جائے گی، خالص دینِ اسلام کی راہ سے بھٹک کر الگ ہو گئے ہیں۔ اس کے اطلاق سے ہمارا مقصد ان نئے نئے اُبھرنے والے فرقوں اور باطل فرقوں کا بزرگانِ دین کے سچے طریقوں سے الگ ہونے سے نہیں، ان برگزیدہ اصحاب کو نافہم لوگ ظاہری اعتبار کے لحاظ سے ایک دوسرے سے الگ سمجھتے ہیں، اور اکابرِ دین کے طریقوں میں حقیقی اجنبیت سمجھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان باطل طریقوں سے اپنی پناہ میں رکھے۔ اربابِ سلوک کے ان طریقوں کا اختلاف اور کثرت تو ظاہری ہے حقیقی نہیں۔ انجام سب کا ایک ہی ہے۔ یہ سب گلی کوچے اسی شاہراہ محمدی سے نکلتے ہیں اور یہ نہریں اور ندی نالے سبھی اس بحرِ بیکراں نبوت کی شاخیں اور معاون ہیں۔ خالصتہً محمدی طریق کے کلمات سے ہمارا مقصود ان اصحاب سے ہے جو اس طریقۂ واحد پہ گامزن ہیں جو اسی حدیث کے مطابق ان جہنمی فرقوں کی کثرت کی شامت سے محفوظ رہے ہیں، اور وحدت محمدیہ پہ خالصتاً چل کر نجات کی بشارت سے نوازے گئے ہیں۔ یہ ایک الگ خصوصیت ہے جو اللہ تعالیٰ نے صرف خالصتہً محمدیوں ہی کے نصیب میں کی ہے۔ اور اسمی، رسمی، ظاہری، یا باطنی الغرض کسی قسم کی غیریت اور اجنبیت کو اس میں عمل دخل نہیں، اور ان پہ خالصتہً بابِ محمدی کھول دیا۔ جتنا کچھ وہ احیائے یا تجدد دین کے سلسلہ میں کرتے ہیں وہ بھی خالصتہً دین ہی کی خدمت کے لیے ہے، لیکن غیریت کے شائبہ سے بالکل خالی بھی نہیں ہیں خواہ وہ اعتباری یا مجازی ہی کیوں نہ ہو۔ اور درحقیقت وہ خالی ہوتا بھی نہیں کیونکہ احیاء و تجدید میں کچھ نہ کچھ ردّ و بدل ضرور ہوتا ہے چونکہ محمدی طریق کے سادات ظاہری اور باطنی طور پہ محمدیت ہی سے پوری یک رنگی و یک جہتی اور فنافی الرسول کا درجہ رکھتے ہیں۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ دین کو از سر نو زندہ کر رہے ہیں۔ وہی دین محمدی جو اس سرورِ کائنات ؐ کے زمانے میں تھا وہی روشن ہے۔ اور دین محمدی زندہ و پائندہ ہے اور تا قیامت رہے گا۔ اور احیاء و تجدید کی وہ معرفت حضورؐ ہی کے خادموں سے منسوب ہے، اور خدا نے چاہا تو خادمانِ دین قیامت کے دن اس سعادت کی بنا پر مشرف و معزز ہوں گے، اور اپنی دینی خدمات کے صلے میں خدا کی عنایاتِ بے غایات اور اُس کے فضل و کرم سے بہرہ مند ہوں گے۔ ایسے عالی شان لوگ اور ایسی بابرکت ہستیاں شاذ و نادر ہی نظر آتی ہیں، اور زمانے گزر جاتے ہیں تب کہیں جا کر ایسے دیدہ ور لوگ پیدا ہوتے ہیں۔ وہ بڑے صاحبِ مرتبہ اور مقربانِ حق میں سے ہوتے ہیں۔ یہ بقائے دوام اور توحید محمدی خالصتہً اسی عالی جناب سے منسوب ہے کہ قیامت کے دن جس کا وعدہ کیا گیا ہے وہ مقامِ محمود پہ متمکن ہوں گے اور اپنے تخت و

سعادت پہ فخر کریں گے (ان پر خدا کا درود و سلام) اور فرمائیں گے کہ میرا صلہ یا اجر تو رب العالمین کے ذمے ہے۔ اپنے ہاتھ پاؤں کی مدد اور چیز ہے، اور دوسرے معاونوں اور مددگاروں کی مدد الگ چیز ہے۔ خادموں کے اعمال خدمت میں شمار ہوتے ہیں، اور اپنے افعال تو گویا بن مانگے اور بغیر احسان کے اسی شمع کا نور ہے جو خاندان سادات کی شمع ہے۔ گلشن محمدیہ میں یہ بہار اسی کے نور ظہور سے ہے بلکہ وہی ہے جو تکوین کائنات کا باعث ہے اور جملہ کائنات کا خلاصہ بھی ذات گرامی ہے (اُن پر خدا کی سلامتی و درود)۔

منکروں کے عناد و شکوک کی تردید پہ تنبیہہ اور خالص محمدیوں کے اعتقاد و سلوک کا بیان

مخلص مومنوں کے لیے اپنے دین اسلام کے بزرگوں کا اتباع ایسے ہی ہے جیساکہ مومنوں کے لیے دین ابراہیمی کا تتبّع ہے۔ وہ ان بزرگوں کی راہِ راست سے سرمُو انحراف جائز نہیں سمجھتے۔ اگر کسی کو غلط فہمی کی بنا پر ان اکابر دین کا تتبّع نہ کرنے کا وہم یا گمان گزرے، وہ اسے اپنے حق میں محض کذب وافترا سمجھتے ہیں اور اُسے ناسمجھی پہ محمول کرتے ہیں۔ اس تہمت کا ہرگز احتمال نہیں ہو سکتا۔ سوائے ان بندوں کے جو ہمارے کلام کی حقیقت کو نہ سمجھ سکے ہوں اور خباثت کی راہ پر تیزی سے چلتے ہوئے ایسے باطل توہمات میں پھنس گئے ہوں، اور محض اپنی جہالت سے انکار کی راہ اختیار کیے ہوئے ہوں۔ میں اللہ کی پناہ میں آتا ہوں ان لوگوں سے اور اس احتمال سے، اور ان لوگوں میں سے ایسا فرد بھی ہے جو اللہ کے معاملے میں جھگڑا کرتا ہے اور عقل کا یہ اندھا بحثیں کرتا ہے[۱۲۲] محمدیوں کے ساتھ بغیر حقیقت سے آگاہ ہوئے اور اُس کا ایسا دل ہے جس سے وہ کچھ سمجھ بوجھ نہیں پاتا، اور پیروی کرتا ہے شیطان سرکش کی ہر بدعتی باطل فرقوں میں سے اور جو کچھ وہ کرتا ہے اللہ اس پہ گواہ ہے۔ اور لوگوں میں سے کوئی ایسا ہے جو عبادت کرتا ہے اللہ تعالیٰ کی خالص محمدی طریقے سے انحراف کرکے۔ پس اگر وہ پالیتا ہے بھلائی دُنیا میں اس میں سے جس کی وہ خواہش کرتا ہے وہ اطمینان پا جاتا ہے اور اپنے طریقے پر قائم ہو جاتا ہے۔ اور اگر پاتا ہے کوئی آزمائش جو اس کی طبیعت کے منافی ہوتی ہے اور اس پہ شاق گزرتی ہے تو وہ مُنہ موڑ جاتا ہے اور سیدھے راستے پر نہیں چلتا، اور اللہ ہدایت دیتا ہے جسے چاہتا ہے اور کرتا ہے جو وہ چاہتا ہے۔ اور جُہلا میں سے ملحد اور علما میں سے مخالف دو ایسی قسمیں ہیں جنھوں نے جھگڑا کیا اپنے رب کے بارے میں جہالت

اور اختلاف کی وجہ سے۔ اور ناپسند کرتے ہیں محمدیوں کو اپنے دلوں میں اگر وہ قدرت نہ رکھتے ہوں کھلے بندوں مخالفت کے اظہار پر، اور ظاہری طور پر تصریح کرنے کی اللہ کی مدد اور نصرت سے۔ "بے شک اللہ تعالیٰ ہدایت دیتا ہے جسے چاہتا ہے"[۱۴۳] اور بے شک ظالم جو ہیں وہ عناد میں بہت دُور نکل گئے ہیں، اور نہیں ہے خالص محمدی مگر یہ کہ بنایا ہے اللہ تعالیٰ نے انھیں اُمّت میں سے بہترین جو نکالے گئے ہوں لوگوں کے لیے۔ ہدایت دیتے ہیں اللہ تعالیٰ کے حکم سے اور نیکی کے کام کرتے ہیں، اور وہ اپنے رب کی عبادت کرنے والے ہیں۔ یہ ذکر ہے اُس کا جو میرے ساتھ ہے، اور اُس کا جو مجھ سے پہلے گزرے اور اللہ کے لیے ہیں معزز لوگ۔ اور بے شک تمسخر اُڑایا گیا رسولوں کا پہلے بھی، اور کافران سے مذاق کیا کرتے تھے۔ میرا رب جانتا ہے ہر قول جو آسمان اور زمین میں ہے اور جانتا ہے جو کچھ وہ چھپاتے ہیں اور جو کچھ ظاہر کرتے ہیں ان کے لیے جہنم کا گڑھا ہو۔ کیوں حق کو باطل سے ملاتے ہیں اور اپنے رب کی آیات سے روگردانی کرتے ہیں۔ کیا وہ ایمان نہیں رکھتے، اور یہ ذکر مبارک ہے جس سے میرے رب نے مجھے خاص کیا ہے۔ پس وہ اس سے انکار کرتے ہیں۔ پس میں اللہ کی پناہ میں آتا ہوں منکرین کے شر سے اور حاسد کے شر سے جب کہ وہ حسد کرے۔ وہی میرا رب ہے۔ عرش کا رب ہے۔ وہ پاک ہے بلندی والا ہے اس سے جو وہ بیان کرتے ہیں[۵]۔ ہمارے پہلے بزرگ جن کی ہم پیروی کرتے ہیں خالص محمدی ہو گزرے ہیں۔ ہمارا طریقہ بھی انہی اکابر دین کا طریقہ ہے اور ہم جیسے مخلص مومنوں کے بارے میں ایسی بدظنی انہی اہل کذب و افترا کا ظن و گمان ہے۔ ہم تمام اہل حق کو خالص محمدی تصوّر کرتے ہیں۔ اور ایسے بدظن اور خلاف درزی کرنے والوں کو رذیل، کمینے اور جھوٹے کہتے ہیں جیساکہ اس آیت کریمہ میں آیا ہے کہ "مِلّتِ ابراہیمی سے تو وہ روگردانی کرے گا جو اپنی ذات ہی سے احمق ہو"[۱۴۴] اور ہم نے ابراہیم علیہ السلام کو دُنیا میں منتخب کیا اور اسی کی بدولت وہ آخرت میں صالح لوگوں میں شمار کیے جائیں گے[۵]۔ صاحبو! ہمارا بھی یہی دعویٰ ہے کہ ہمارے تمام پیر و مرشد مخلص محمدی ہیں۔ تم اپنی غلطی اور اپنے نفس کی شراکت سے ان کے طریقۂ واحدہ میں تفرقے ڈال رہے ہو۔ نئی نئی بدعتیں پیدا کرتے ہو، اور تم اہل حق کو جو باہم متحد و متفق ہیں ایک دوسرے سے جُدا اور اجنبی اور غیر سمجھتے ہو۔ چونکہ تمھارے اندر تفرقہ بازی کا یہ فاسد خلل ایک طویل مدّت کے گزرنے اور اپنی عقل کے فتور و قصور سے پیدا ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تمھارے لیے حضرت امیر المحمدیّین (اللہ نے ہماری مدد کی ہے روح القدس کے ساتھ) کو تمھاری طرف بھیجا تاکہ وہ تمھیں پھر اسی واحد طریق

محمدی کی طرف دعوت دیں اور کثرت کو وحدت میں جذب کر کے تمھیں سمجھائیں کہ ہمارے بزرگ سب کے سب خالص محمدی تھے، اور امتیازات کی یہ کثرت جو تم کہیں سے لے آئے ہو اس طریق میں بالکل نیست و نابود تھی، اور ابراہیم علیہ السلام نہ تو یہودی تھے اور نہ نصرانی تھے لیکن طریق مستقیم والے یعنی صاحبِ اسلام تھے اور مشرکین میں سے بھی نہ تھے۔ پس اللہ تعالیٰ نے ہمیں اس خالص محمدیت کے طفیل اس حقیقت کے انکشاف سے مشرف فرمایا ہے۔ اس مذکورہ بالا طریقے کی نسبت سے تم سے زیادہ قابلِ ترجیح اور بہتر ہیں۔ "بے شک ابراہیمؑ کے نزدیک لوگوں میں سے زیادہ قابلِ ترجیح وہ ہیں جنھوں نے پیروی کی اُس کی اور اس نبیؐ کی اور ان لوگوں کی جو ایمان لائے، اور اللہ مومنین کا دوست ہے"[۱۲۵]۔ اے دوستو تم جو ہمارے بزرگوں سے عقیدت رکھتے ہو اور ہمارے آباؤاجداد کے طریقے میں داخل ہو تم ان سب شبہات کا اظہار کس لیے کرتے ہو۔ ہم جو خدا کے فضل سے ان سے وراثت کی نسبت کی بنا پر اپنے بزرگوں کے طریقے کے پیرو ہیں اور امت کے سادات میں سے ہیں اس امر کا احتمال کیسے ہو سکتا ہے کہ ہم تم سے جو مرید و اُمتی ہو عقیدت و ایمان میں کم تر ہوں یا اس پاک جناب میں شرکِ خفی کا اطلاق روا رکھیں۔ اللہ تعالیٰ ایسی باتوں سے اپنی پناہ میں رکھے۔ واہ کیا قدردانی ہے مرشدوں کی، اور واہ کیا نیک گمان ہے حضرت شاہ نقشبند اور حضرت غوث الثقلین رضی اللہ کے صاحبزادوں کے حق میں جو ہمارے ماں باپ کے آباؤاجداد تھے۔ وہ اپنی اولاد کی نیت اور اپنے مریدوں کے ظن و گمان کو خوب جانتے ہیں۔ دوستو ہمارے بزرگ ہمارے لیے خدا اور رسول تک پہنچنے کا وسیلہ و واسطہ ہیں۔ ان سے ہماری عقیدت، اطاعت اور پیروی کی حقیقت یہی کچھ ہے جو بیان کر دی ہے۔ باقی رہے دوسرے طریقوں کے بزرگ، لہٰذا گو کہ ہمارے لیے ان کا اتباع ضروری نہیں، لیکن ہم تمام طریقوں کے بزرگوں کی راستی کا اقرار ضرور کرتے ہیں۔ تمام انبیا کی نبوت کے قائل ہونے کی طرح ہم تمام اولیائے کرام کی ولایت کے قائل ہونے کا اقرار بھی کرتے ہیں، اور سب کو راہِ راست اور صراطِ مستقیم پر گامزن سمجھتے ہیں۔ اگرچہ اس آیت کریمہ کے مصداق اس امر کے قائل بھی ہیں کہ رسولوں میں سے کسی میں فرق نہ رکھو[۵]، لہٰذا ہم مخلص محمدیوں کو گزشتہ زمانے کے اولیائے کرام کے سب طریقوں کی حقانیت کا اسی طرح اقرار ہے جیسے کہ انبیائے کرام کی حقانیت کا اقرار لازم ہے نہ کہ ان کا اتباع۔ باقی تمام طریقے والوں کے لیے محمدی طریق کی حقانیت کے اقرار کے ساتھ اتباع بھی ضروری ہے۔ سبحان اللہ کتنی عجیب بات ہے کہ ابھی حضور سرورِ کائناتؐ کی ہجرت کو ایک ہزار ایک سو چند سال کی قلیل مدت ہی گزری ہے کہ اہلِ اُمّت کے دلوں میں نسبت محمدیہ سے ایسی

نا آشنائی پیدا ہوگئی ہے، کہ طریق محمدی (ان پر خدا کا درود و سلام) کا نام سنتے ہی تعجب کرتے ہیں اور پوچھتے ہیں کہ یہ کونسا طریقہ ہے؟ گویا مخلص محمدیوں نے اپنے پاس سے کوئی نیا طریقہ گھڑ لیا ہے۔ صاحبو یہ وہی طریقہ ہے جو حضور سرورِ کائنات ؐ کے زمانے میں رائج تھا، اور جس پر آل رسول ؑ اور اصحابِ رسول ؑ کاربند تھے، اور تمام اولیائے کرام بھی اپنے اپنے فرق مراتب کے ساتھ اسی طریق پر تھے۔ اور رشد و ہدایت دینے والے پیر و مرشد (خدا ان سب سے راضی ہو ؓ) بھی سختی سے اسی پر قائم تھے۔ ہمارے مجتہد حضرات بھی اسی طریق پر تھے، اور ہم بھی اسی راہ پر چل رہے ہیں۔ اولیائے کرام کے یہ سب طریقے محمدی طریقے ہی ہیں اور بلا شبہ وہ سب حق پر ہیں لیکن جیسا کہ ہر طریقے میں کوئی نہ کوئی امتیازی بات لاحق ہوگئی ہے جس سے اُس نے خود کو دوسروں سے ممتاز بنا لیا ہے، اور محمدیت کے خصوصی نام کو جو سبھی میں شامل ہے لپنے گرد لپیٹ لیا ہے یوں محمدیت کی اصلیت اور خلوص نے پوری قوت پکڑ کر کامل ظہور کیا۔ وہی عمومی معانی جو اس کی ذات میں شامل تھے دیگر خصوصیات کے الحاق سے امتیاز پا گئے اور اپنے خالص پن کی بنا پر خالص محمدیت کا نام پایا۔ اور مخلص محمدیوں کو اس شرف سے مشرف فرمایا۔ ورنہ عمومیت کو نگاہ میں رکھیں تو وہی ایک محمدیت ہے جو سارے مومنوں میں جاری و ساری ہے۔ لہذا اس بات کو ہم ایک مثال کے ذریعے واضح کرتے ہیں، تاکہ ہر خاص و عام کے ذہن نشین ہو سکے۔

خالص محمدیت کی تحقیق کے سلسلے میں ایک مثال اور خالص اور ملی جلی محمدیت کا فرق

مثال کے طور پر مجموعی طور پر انسانیت کا مفہوم وہ ہے جو عموماً تمام انسانی افراد کو میسر ہے۔ اور لکھائی پڑھائی یا دیگر پسندیدہ و ناپسندیدہ اوصاف جو انسانیت سے مخصوص ہیں۔ ان کا مفہوم بھی مجموعی طور پر لیا جاتا ہے۔ مگر حقیقی معنوں میں سارے افراد اس میں شامل نہیں ہوتے۔ بعض میں وہ باتیں پائی جاتی ہیں اور بعض میں نہیں پائی جاتیں اور انسانیت ان تمام پر مشتمل اور حاوی ہے۔ انسانیت حُسن انسانیت کے معنوں میں بھی آتی ہے۔ یہ اک اصطلاح ہے۔ کہتے ہیں کہ انسان کو اپنے اندر انسانیت پیدا کرنی چاہیے اور آدمی کو آدمیت سیکھنی چاہیے۔ آدمی کے لیے آدمیت لازمی چیز ہے کیونکہ عود کی قدر و قیمت اس کی خوشبو سے ہے، وہ نہ ہو تو پھر وہ ایک عام ایندھن ہی ہے ؎ یہ بھی مجموعی معانی ہیں۔ مگر یہ بھی اسی لکھائی پڑھائی کی

طرح بالکل نسبتی امر ہے جو بعض میں پایا جاتا ہے اور بعض میں نہیں۔ لہٰذا اس خاص انسانیت کا اُس عام انسانیت سے امتیاز، اجنبیت یا آخری امر کی آمیزش سے نہیں اور یہ کوئی دوسری شے نہیں بن گئی۔ انسانیت سے لکھائی پڑھائی کا امتیاز نفس انسانیت کتابت اور علم کے وصف کے الحاق سے ہے، اور انسانیت کا شمول اس کے ان پہ محیط ہوتے کی وجہ سے ہے۔ اور انسانیت عامہ کا انسانیت خاصہ میں شامل ہونا عمومی یا خصوصی حیثیت سے ہے جو اسی ایک واحد شے کے اعتبار سے ہے۔ لہٰذا بہتر[۲۷] فرقے جو محمدیہ عامہ کے متعدد طریقوں پر ہیں وہ لکھائی پڑھائی کی طرح ہیں جو عام انسانیت کے زمرے میں آتے ہیں۔ ہر چند کہ الگ ہو کر اُنھوں نے امتیاز پیدا کر لیا ہے۔ لیکن وہ انسانیت کے دائرے سے باہر نہیں گئے اور انسانیت کے ساتھ اک لازمی دلالت کی نسبت رکھتے ہیں، اور اسی لازمی نسبت کے انکشاف کی راہ سے محمدیت سے یہ تمام فرق ہے جن کے ظہور سے پہلے ہی حضور سرورِ کائنات ﷺ نے فرمایا تھا کہ عنقریب میری اُمّت افتراق میں پڑ جائے گی۔[۵]

اور خالص محمدیت کی مثال جو نجات کا واحد طریقہ ہے اس خاص انسانیت کی مانند ہے جو عام انسانیت کے تحت واقع ہے۔ اور یہ نیچے اور اوپر کا امتیاز اسی واحد شے کی حیثیات کے اختلاف کی وجہ سے ہے نہ کہ اُس پر کوئی زائد امر۔ اگرچہ یہ خصوصی اور مخلصانہ مرتبہ انسانی ذہنوں میں عام مرتبے سے ممتاز دکھائی دیتا ہے لیکن قطعی مغائرت پیدا نہیں کر سکا، اور آخری امر سے آمیزش کی وجہ سے ذاتی اجنبیت بھی بہم نہ پہنچا سکا اور باطنی اور ظاہری طور پر وہ اپنی اسی ذاتی وحدت کے خالص پن پہ ہے، اور اپنے تمام ذاتی مرتبوں، نسبتوں، کمالات اور اعتبارات کے ختم کرنے والا، اور اپنی تمام ذاتی خوبیوں اور اچھائیوں کو جمع کرنے والا ہے جس میں بال برابر کمی بیشی کی گنجائش نہیں۔ اور اپنی اصلی معتدل صورت میں جلوہ افروز ہوا۔ اپنی اسی خاص صورت میں مکمل طور پر عمومی ظہور کیا اور اپنی شخصیت کے بہترین درجۂ کمال کو ظاہر کیا جس کی جھلک اس آیت کریمہ میں ہے کہ آج کے دن تمھارے لیے تمھارے دین کو میں نے کامل کر دیا، اور میں نے تم پر اپنا انعام تمام کر دیا اور مَیں نے اسلام کو تمھارا دین بننے کے لیے پسند کر لیا۔[۱۴۳] اور اپنی غیر مستقل سرشت کے دیگر امتیازات جو اس کی فطرت کے خلاف ہیں خواہ غیر فطری امور کی زیادتی یا ان کی کمی کی وجہ سے اس نے اس کامل شخصیت کا امتیاز پا لیا ہے۔ یہ نہیں کہ وہ ذاتی طور پر ممتاز ہو گیا ہے۔ ثابت رکھے اللہ تعالیٰ ہمیں اور تمھیں طریق محمدیہ پر اور عطا فرمائے ہمیں اور تمھیں اپنی بلند برکات، اور ان برکات کا جو صاحب ہے اس پر درود و سلام ہو۔ اے دونوں جہاں کے مالک ایسا ہی کرنا۔ خوش بخت ہے وہ پیرو محمد ﷺ جس نے خود کو محمدی چادر سے ڈھانپا اور خودی

انا کے نعرے بلند نہ کیے، لہٰذا جس نے اس مرتبے میں فنائے کامل حاصل کر لی اور خود کو مکمل طور پر اس پردے میں چھپا لیا وہی اُمّتِ محمدیہ کی سرداری کے لائق ہے۔ اللہ جسے چاہے اپنی رحمتِ کاملہ سے مختص کر دیتا ہے اور وہ بہت بڑے فضل والا ہے۔ طریقِ محمدی کی ساری حقیقتیں، سارے علم و فضل اور تمام خصوصیتیں اور دقیق نکات اور اس راہ کی تمام اصطلاحات، منازل اور مقامات کا ذکر قرآنِ مجید اور احادیث پیغمبرؐ میں موجود ہیں۔ دوسرے طریقوں کے برعکس اس طریقِ محمدی کی کلیات یا جزئیات کسی کی اپنی طرف سے نہیں۔ اس کی اصطلاحات جو ہیں وہ اصطلاحاتِ محمدی ہیں۔ اس کی منازل اور اس کے مقامات کی بشارت دینے والا خود قرآن ہے۔ اگر اس طریقِ محمدی کے اصول دریافت کرنے کا شوق اور اس فریق تک پہنچنے کی شناخت کا ذوق ہو تو قرآنِ مجید کی تلاوت اور احادیثِ نبوی کا مطالعہ ازبس ضروری ہے۔ اس کی دقیق رمزوں اور اشاروں کو سمجھنے کے لیے اور اس کے اسرار و رموز کے انکشاف کے لیے، اور چشم بصیرت کو تیز کرنے کے واسطے میرے والد بزرگوار کی نالۂ عندلیب نامی عمدہ ترین تالیف کو وسیلہ بنانا چاہیے اور بڑی محبت اور عقیدت مندی سے اس کی طرف رجوع کرنا چاہیے جو کچھ سمجھ میں آجائے وہ ٹھیک ہے۔ جہاں کہیں کوئی تردد یا شک و شبہ ہو اُسے اپنے فہم کا قصور سمجھنا چاہیے۔ ہدایت وہی ہے جو اللہ تعالیٰ دے[127]؛ اگرچہ اس کتاب کی عبارت واضح، سلیس و صاف اور بغیر کسی پیچیدگی کے ہے۔ لیکن اس کتاب کے حقائق اور باریک نکتوں کو مصنف کے فرزندوں کی وساطت کے بغیر سمجھ لینا ذرا مشکل اور دشوار ہے۔ لہٰذا ہم گنہگاروں سے بھی تھوڑی بہت محبت اور عقیدت ضروری ہے۔ جو ہم سے مُنہ موڑے گا وہ اُدھر سے اتنا ہی دُور اور محروم رہے گا۔ میری اس تصنیف یعنی علم الکتاب کا پڑھنا پڑھانا بھی لازمی ہے۔ یہ بھی اللہ سے رابطے کا توسط ہے کیونکہ یہ انہی امور کی تفسیر و تشریح و تفصیل ہے۔ تمام مستند تحقیقات کے عبور کرنے کے لیے یہ اک سفینہ ہے۔ احادیث نبوی، کتاب الٰہی اور خود اللہ تعالیٰ اس کتاب کی سچائی پر گواہ ہیں۔ ہر بات کو اس میں سے اس کے موقع محل کے مطابق چھانٹیں اور اپنے دین اور ایمان کو پختہ کریں۔

فائدہ

یہ سمجھ لینا چاہیے کہ جس طرح گناہوں کا مرتکب انسان دائرہ اسلام سے خارج نہیں ہوتا، اسی طرح خالص طریقِ محمدی کے سلسلے میں گناہوں کا مرتکب انسان خالص محمدیت کے دائرے سے خارج نہیں ہوتا

خواہ ان خطاؤں کے لیے اس پہ عتاب ہو یا اُسے معاف کر دیا جائے۔ لیکن اُمید واثق ہے ایک ہی دفعہ صدق دل سے توبہ و استغفار کرنے سے پاک ہو جائے گا۔ عقیدے کی اصل یعنی ایمان مضبوط ہونا چاہیے۔ بیشک ہم امید کرتے ہیں کہ بخش دے گا ہمارا رب ہماری خطائیں۔ بے شک ہم پہلے ہی مومن ہیں۔ نبی کریم صلعم نے فرمایا اپنے دین کو خالص کر لے تو تجھے تھوڑا عمل بھی کفایت کر جائے گا۔ اگرچہ مخلص مومنوں میں اللہ کے نزدیک مکرم و محترم وہی ہے جو زیادہ متقی ہے جیسا کہ اس آیتِ کریمہ سے واضح ہے کہ "اللہ تعالیٰ کے نزدیک وہی زیادہ مکرم ہے جو تقوے میں بڑھا ہوا ہے"[۱۲۸] لیکن گناہگار محمدی بھی طریق محمدی سے خارج نہیں ہوتے اور اس بات سے وہ اللہ کی رحمت سے مایوس نہیں ہوتے جیسا کہ اس آیتِ کریمہ میں ہے کہ اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہو۔ وہ سب کے گناہوں کو بخشنے والا ہے۔ برعکس دوسروں کے جو ظاہری پرہیزگاری اور عبادت و پاکیزگی سے شرک کے داغوں سے پاک نہیں ہوتے اور مخلص محمدی نہیں ہیں۔ ترکِ دُنیا سے تو کوئی عقدہ حل نہیں ہوتا ایمان ہونا چاہیے کیونکہ "اللہ تعالیٰ شرک کرنے والوں کو نہیں بخشے گا، اور اُن کے علاوہ جسے چاہے گا بخش دے گا۔[۱۲۹] قصہ کوتاہ یہ کہ پھر متن کی طرف رجوع کرنا چاہیے تاکہ وضاحت ہو سکے کہ اُس کے مختلف الفاظ سے کیا مراد ہے۔ میں نے اپنے رسالوں میں اپنا تخلص جو "درد" ہے اس لیے استعمال کیا ہے کہ اکثر لوگوں کے لیے شعر و شاعری کی بنا پر یہ تخلص ہی میری پہچان ہے، ورنہ وہ نہیں جانتے۔ خاص طور پر اس رسالے میں واردات، رباعیات کی مناسبت سے ہیں جن میں اکثر جگہ تخلص استعمال کیا گیا ہے، اور زیادہ تر ضرورت کے تحت۔ حالانکہ ان مطالب کے لکھنے کی ضرورت ہی کیا تھی، اللہ تعالیٰ کے فضل سے میرے اشعار رتبۂ شعری کی رعایت کے باوجود بھی محض شاعری کے پیشے یا ظاہری تخیل کی بنا پر نہیں۔ اس فقیر نے بغیر آمد کے یا ارادہ کر کے آورد کے زور پہ کبھی شعر موزوں نہیں کیا، اور کبھی بھی تکلف کر کے سوچ بچار میں ڈوب کر شعر نہیں کہا، نہ کبھی کسی کی مدح یا ہجو لکھی ہے، نہ کسی کی فرمائش اور نہ کسی کی آزمائش کے لیے کبھی شعر کہے ہیں۔ لہٰذا اس رسالے کے آغاز کی حقیقت اور اس کی ابتدا کی کیفیت یُوں ہے: کہ اکثر اوقات کیف و حال کے غلبے کے لمحات میں جو معانی بھی دل میں وارد ہوتے (وارداتِ قلبی) اور وہ مطالب جو خدائے مہربان مجھ پہ کھولتا انہی وارداتِ قلبی کے بیان کے لیے اس بے زبان و بے بضاعت فقیر سے رباعیات موزوں ہو جاتی تھیں یا دوسرے لفظوں میں مختصراً میں ان کو لکھ لیتا تھا۔ غلبۂ حال سے مراد حضوری اور شدت مشاہدہ ہے، لہٰذا ان سعید ساعتوں میں جو واردات بھی دل پہ گزرتی تھیں اُنھیں مختصراً رباعیات کی شکل میں موزوں کر لیتا تھا۔ چونکہ چار مصرعوں میں کسی مطلب کو تفصیل سے تو بیان کیا

نہیں جا سکتا، اور اجمال کے معنی یہ ہیں کہ کلام اس طرح لایا جائے کہ وہ متعدد امور کا متحمل ہو، اور تفصیل ان متحملات میں سے بعض یا کُل کی تعیین ہے۔ ہر چند باوجود اس اختصار اور موزونیت کے اعجاز اور شعری در و بست کے انداز کے جس طرح کثیر المعانی مطالب کی اشارات و کنایات سمیت متعدد امور کی تصریح و تعیین ہو سکتی ہے اس کا نثر میں تصوّر بھی نہیں کیا جا سکتا۔ ہاں اختصار کا اطلاق مسائل کی تشریح و توضیح کے لحاظ سے ہے کہ مطالب کی لمبی چوڑی تفصیلات رباعی یا اشعار میں لانا اک امر محال ہے، اور دیگر شعری اقسام و اصناف کی بجائے صرف رباعیات ہی کے موزوں ہونے کی وجہ یہ تھی کہ خصوصی طور پر انہی رباعیات کی شرح کا لکھا جانا گویا مشیت ایزدی تھی۔ لہٰذا مطالب کا اسی انداز میں لکھے جانا گویا مقدر تھا۔ لہٰذا میرے مہربان و مشفق، عالم و عارف اور عالی نسب بھائی نے جن کا نام محمد میر محمدی اور تخلص اثرؔ تھا چاہا کہ ان مسودوں کو صاف کر کے لکھا جائے، اور ان مختلف اور متفرق اشعار کو یکجا جمع کیا جائے تو یہ اس امر کا موجب بن گیا کہ وہ ان کی شرح لکھیں اور اس مختصر بیان کو مفصل بنا دیں۔ میرے محترم بھائی محمد میر محمدی سلمہ ربہٗ جو اثرؔ تخلص کرتے ہیں میرے سگے بھائی ہیں، اور حق بات تو یہ ہے کہ ہم میں ظاہری اور باطنی اتحاد بھی ہے۔ آپ نے اپنی اصل سے بڑی نسبت قائم کر رکھی ہے۔ وہ شعر کی تہ تک پہنچ جاتے ہیں۔ وہی ان مختصرات کی تفصیلات کا باعث بنے۔ ان مطالب کی توضیح و تشریح سے اُن کا منشا دوسرے احباب و اصحاب کو سمجھانا تھا۔ اگرچہ مجھ بے ہودہ اور ہیچمدان کو ایسا کوئی وہم و گمان تک نہ تھا لیکن محض ان کی رضا کی خاطر میں نے کچھ خامہ فرسائی کی اور رباعی کے محاذ میں نثر کے پیادے آگے بڑھائے۔ ہر عبارت کے اخیر میں رباعیات میں سے ایک آدھ رباعی بھی لکھ دی اور کلام میں کچھ اور محاسن کا اضافہ بھی کیا۔ بیہودگی سے میری مراد مشاہدے کے غلبے کی راہ سے امر مخصوص سے مقید نہ ہونا اور ہر تعیین سے دل برداشتہ ہونا ہے بیہودگی سے مُراد اپنی امکانی حیثیت سے بھی ہے جو عدم و وجود کی کشمکش میں ہے، اور امر واقعی کا بیان و اعتراف بھی ہے کہ میں اپنی نظر میں کسی اہلیت و قابلیت کا مالک نہیں۔ میں خود کو محض نااہل سمجھتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے اور میری تقصیرات کا گواہ بھی ہے۔ یہ تمام عنایاتِ ربانی جو مجھ فقیر پر ہیں محض میرے بزرگوار ناصر (والد) کے طفیل ہیں لہٰذا مجھ جیسے بیہودہ انسان سے ایسا عزم و ارادہ کیسے ہو سکتا تھا کہ ہمہ تن اسی سلسلے کی تصنیف پہ توجہ مبذول کرتا، لیکن اپنے برادرِ عزیز مرشد زادے کی باطنی قوت کو مدّ نظر رکھتے ہوئے انہی کی رضا کو رضائے الٰہی سمجھا اور یہ رسالہ لکھنا شروع کر دیا۔ اور بلا ارادہ اور بلا تکلف

جو کچھ اس فیاضِ مطلق کی طرف سے میرے دل پہ القا ہوا اُسے تحریر میں لاتا رہا۔ اس رسالے کا زیادہ تر حصّہ یعنی اکثر واردات قلبی امیر المحمدین قبلہ بزرگوار والد صاحب کے حضور اقدس ہی میں سن ۱۱۷۲ ہجری میں معرضِ تحریر میں لایا اور اُس ذاتِ گرامی نے اُسے بہت پسند فرمایا اور اُسے شرفِ قبولیت بخشا۔ یہ تحریر ان کی نظر میں بہت محبوب و مقبول ٹھہری اور بکمال مہربانی مجھ احقر کے حق میں جو کلمات ارشاد فرمائے، میں خود کیا کہوں جسے ایک دفعہ بھی ان کی صحبت کا شرف حاصل ہوا ہوگا اُس نے سُن ہی لیے ہوں گے۔ اس سال شعبان المعظم کی دوسری تاریخ کو بروز ہفتہ عصر اور مغرب کے درمیان اُنھوں نے رحلت فرمائی۔ ترجمہ: بزرگوں نے تو سفر کا ساز و سامان تیار کر لیا، اگر وہ بھی چاہتے ہیں تو ہم بھی ان کی رکاب میں چلنے کو تیار ہیں۔ اے درد اب تو بھی تعظیماً اُٹھ کھڑا ہو، اس لیے کہ اہلِ بزم تو اُٹھ بیٹھے۔ اب تک اگر خدا نے مجھے زندہ رکھا ہے اور اس دُنیا میں رہنے کی اجازت دی ہے شاید اللہ کو کوئی کام لینا ہو۔ وہ مختارِ کُل ہے، وگرنہ ہم تو اسی دن سے اس دُنیا سے کوچ کر چکے ہیں۔ پھر کبھی لوٹ کر ادھر نہیں آئے، فقط انھی کی خاطر اور انھی کی بجائے ادھر رُکے ہوئے ہیں۔ "ہم سب اللہ ہی کی طرف سے آئے ہیں اور ہم سب کو اسی کی طرف لوٹ جانا ہے۔"[۱۳۰] بے شک اولیا اللہ مرتے نہیں۔ آج بھی اسی طرح حاضر ہیں۔ ہماری ہستی میں انھی کے نور کی جھلکی ہے۔ ہم ہر حال میں باہم یکجا ہیں۔ بھلا ہم ان سے جدا کب ہیں۔ مجموعی طور پر مل ملا کر اس رسالے میں دیباچے سمیت ایک سو گیارہ واردات ہیں۔ ہر وارد کے دو حصّے ہیں۔ نثر ہے، اور اسی نثر کے مناسب اوّل و آخر ایک ایک رباعی ہے۔ اختیار کی باگ ڈور تو کسی کے ہاتھ میں نہیں، مختارِ حقیقی تو وہی حق تعالیٰ ہے۔ لہٰذا اس مجبور و بے اختیار نے جو واردات بھی دل پہ گزری اُسے بلا تکلف لکھ دیا اور قلم کی نوک کو وارداتِ قلبی کے تتبّع سے کبھی نہ روکا۔ جو شعر بھی موزوں کرایا وہ کہہ دیا، اور جو نثر لکھائی وہ لکھ دی، اور جو رباعی بھی مقدر میں تھی ان واردات میں شامل کر دی اور اسے اُسی ڈھب سے ترتیب دیا جیسا کہ علمِ الٰہی میں تھا۔ یہ رباعیات بھی میرے واردات ہی ہیں۔ یہ رسالہ سارے کا سارا احادیثِ نبوی اور آیاتِ قرآنی کے نور ہی سے اخذ کیا گیا ہے، اور یہ نہیں ہے میرا قول شاعرانہ حیثیت سے اور نہ میں نے یہ بات ہوائے نفسانی کے ساتھ کہی ہے۔ اگرچہ ہر بولنے والے کی اہلیت کے مطابق کلام خود خدا ہی کرتا ہے۔ لیکن اس مقام پر جہاں خودی کے پردے چاک ہو جاتے ہیں تو پھر تو نورٌ علیٰ نور ہی سمجھیے۔ ہاں عوام کا معاملہ مختلف ہے اور خواص کا الگ جس کی دلیل یہ آیت کریمہ ہے کہ اندھا اور آنکھوں والا برابر نہیں ہو سکتے۔[۵] لہٰذا جتنا فرق انبیا اور

اولیا کے کلام میں ہے۔ اتنا ہی فرق عوام اور ادنی لوگوں کے کلام میں ہے۔ جتنا فرق حدیثِ نبوی اور حدیثِ قدسی میں، اسی قدر فرق الہامی اور ولی کے غیر الہامی کلام میں ہے۔ قرآنِ حکیم کی شکل میں کلامِ الٰہی کا حضرت جبرائیل علیہ السلام کی وساطت سے نزول جو مقامِ نبوت سے ظہور میں آتا ہے وہ سلسلہ خاتم الانبیا حضرت محمدؐ مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ بابرکات پہ ختم ہوگیا اور حدیثِ قدسی کی شکل میں قلب پہ الہام و القاء ہوا۔ جو ولایت سے ظہور میں آتا ہے۔ وہ اُمتِ محمدیہ کے نصیب میں آیا۔ خدا نے اپنی خاص عنایت سے اُنھیں یہ امتیاز بخشا۔ بہرحال ہر مطلب کے سلسلے میں تحریر یا بیان کو محض القائے ربانی سمجھیے۔ اس میں میرے ارادے یا ذاتی مقصد کا کوئی عمل دخل نہیں۔ پس جہاں کہیں جو کچھ بھی حق تعالیٰ نے لکھایا میں لکھتا چلا گیا اور جس طرح تحریر کروایا اسی انداز میں تحریر کردیا جیسا کہ کہیں تو شرح و تفسیر کے انداز میں لکھا ہے اور کہیں دوسرے مطالب کو اور انداز میں لکھا ہے۔ لہٰذا اس مجموعے نے واردات کا نام پایا اور فصل یا باب کی بجائے لفظ وارد استعمال ہوا۔ بعض جگہ متن میں رباعیات کے مطلب کی شرح بیان کی گئی ہے، اور اُس کے اشارات و کنایات کی صراحت کی ہے۔ اور ہر وہ بات لکھی جو اس رباعی سے متعلق ہے۔ بعض جگہ رباعی سے متعلقہ مطالب سے آغاز کیا ہے، اور اُس کے بعد دیگر معانی لائے گئے۔ جو کچھ اُس مالک نے لکھایا وہی لفظ بلفظ لکھ دیا۔ اس تحریر کی حقیقت کو تو اللہ تعالیٰ ہی خوب جانتا ہے۔ کاتب کی تو بس کتابت پہ نظر ہوتی ہے، اور قلم اپنی تحریر سے بالکل بے خبر۔ جو خشک و دلچسپ بات نوکِ قلم پہ آئی وہ لکھتا چلا گیا اور قرآن حکیم کی اس آیت کریمہ کی آئینہ داری کرتا رہا کہ "نہ کوئی تر اور نہ خشک چیز گرتی ہے مگر یہ سب کتابِ مبین میں ہیں"[۱۴۱] چونکہ اس سلسلۂ تحریر میں تصنّع اور بناوٹ کو کوئی عمل دخل نہ تھا اللہ تعالیٰ نے مجھ پر وارداتِ قلبی کا دروازہ کھول دیا، اور رسالے کا نام واردات عطا فرمایا اور لفظ باب یا فصل وارد قرار پایا۔ اور اُسی کے پاس ہے فیصلہ کن بات۔

اہلِ ظاہر اور اہلِ باطن کے کلام کے باہمی فرق کے سلسلے میں تنبیہ

اہلِ ظاہر جو حقیقت سے بے بہرہ ہوتے ہیں اور ظاہری حواس کی امداد سے علم حاصل کرتے ہیں یعنی درس و تدریس کے ذریعے، ان کے کلام کا ڈھنگ یوں ہوتا ہے کہ ان کے بیان کا ایک ہی وطیرہ رہتا ہے۔ وہ ہر موضوع بحث پہ جس انداز سے شروع کرتے ہیں پھر اسی بحث کو طول دے کر لکھتے جاتے ہیں اور

مختلف ابواب اور چیپٹر بناتے جاتے ہیں۔ بھلا کیوں؟ اس لیے کہ ان کا کلام ان کے اپنے اختیار میں ہوتا ہے۔ وہ جس چیز کا ارادہ کرتے ہیں اسی کو بیان کرتے جاتے ہیں۔ ان کی کتابیں تالیف یعنی تدوین و ترتیب دی ہوئی ہوئی ہوتی ہیں۔ وہ طبع زاد تصنیفات نہیں ہوتیں۔ حکایت کے طور پر ہر مقام پر بزرگوں کے اقوال لاتے ہیں اور اسلاف کے کلمات نقل کرتے چلے جاتے ہیں، اور یوں دوسروں کے لکھے ہوئے مقدمات کو مرتب کر کے اُسے اپنی تصنیف کا نام دے دیتے ہیں اور کوئی نتیجہ اخذ نہیں کر پاتے۔ اُس سے آگاہ ہوتے ہوئے بھی وہ ماحصل کو سمجھ نہیں پاتے۔ اگر نادانستہ طور پر ان کی زبان سے کوئی نیک کلمہ نکل بھی جائے تو اُس کی حقیقت سے ناآشنا ہوتے ہیں۔ لہٰذا وہ قابلِ اعتبار نہیں ہوتی۔ بقول سعدی کہ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک نادان بچہ یونہی اٹکل پچو تیر عین نشانے پر دے مارتا ہے، مگر اہلِ باطن کا کلام بالکل الگ چیز ہوتی ہے۔ وہ لوگ اللہ والے ہوتے ہیں اور حقیقت سے آگاہ ہوتے ہیں۔ ان کی تمام تر تحقیقات بالکل طبع زاد تصنیفات ہوتی ہیں۔ ان کے رشحاتِ قلم تالیفات نہیں ہوتے۔ خواہ بعض مطالب اور علمی باتیں دوسروں کے کہے اور لکھے کے مطابق ہی کیوں نہ ہوں۔ اس توارد کی بنا پر اُسے تالیف نہیں سمجھنا چاہیے۔ اس لیے کہ اُنھوں نے کسی کی نقل نہیں کی بلکہ وہی بات ان پہ بھی منکشف ہوئی جو دوسروں پہ ہوئی تھی۔ وہ صاحب حال لوگ ہوتے ہیں، اور اپنے اقوال و فرمودات کے مالک۔ جیسا کہ اگر ایک مجتہد کا اجتہاد دوسرے کے اجتہاد سے مطابقت رکھتا ہو یا شرعی امور اگر دوسری شریعتوں کے مطابق ہوں تو وہ ان امور کی نقل نہیں بلکہ اُس کے اپنے اجتہاد میں بھی وہی کچھ نکلا، اور اللہ تعالیٰ نے اُسے انہی امور پہ مامور فرمایا تھا۔ لہٰذا اس قسم کی موافقت از روئے تحقیق ہو جاتی ہے۔ نقل یا تقلید نہیں ہوتی۔ مثلاً نقالی اُسے کہیں گے جو کسی دوسرے کی شکل یا صورت کی (جو اس کی اپنی شکل و صورت سے مختلف ہو) ارادۃً نقل اتارے ورنہ اگر کسی کی اپنی شکل دوسرے سے مشابہت رکھتی ہو تو اُسے نقال نہیں کہا جا سکتا۔ اگر کسی آدمی کی حرکات و سکنات بلا ارادہ کسی دوسرے آدمی کی حرکات و سکنات سے مشابہ ہوں تو یہ نہیں کہہ سکتے کہ فلاں آدمی نے فلاں آدمی کی حرکات و سکنات کی نقل کی ہے۔ لہٰذا ایسے تحقیق کرنے والے حضرات کو روح القدس کی مدد اور فیاضِ مطلق کی عنایت سے حقائق کا القا ہوتا ہے، جو ظاہری حواس کے وسیلے کے بغیر براہِ راست الہام کی صورت میں اللہ تعالیٰ سے علم حاصل کرتے ہیں۔ وہ صاحبِ کشف لوگ ہوتے ہیں۔ ان میں غیبی قوت ہوتی ہے۔ اللہ کی راہ پر چلنے والے یہ لوگ ولی اللہ اور نبوت کے کمالات سے بہرہ مند

ہوتے ہیں۔ اُن کا کلام اہلِ ظاہر کے کلام کی طرح ایک خاص ڈگر ہی پر نہیں رہتا، وہ کلمات جامع کے مالک ہوتے ہیں۔ بس وہی اک انداز یعنی القائے ربانی ان کا مختار ہے۔ اللہ تعالیٰ کی جناب سے جو کچھ ان کے قلب پر وارد ہوتا ہے وہ اسی طرح اُسے بیان کر دیتے ہیں۔ لہٰذا ان بزرگوں کے کلام کے ربطِ مضمون کو علمائے ظاہر نہیں سمجھ سکتے، نہ ہی ان کے مطالب کی تہ کو پہنچ سکتے ہیں۔ وہ اسے مجذوب کی بڑ سمجھتے ہیں۔ ان مطالب سے مطابقت پیدا کرنا سطحی علما کے لیے بہت دشوار ہے۔ بعض جو حقیقی ایمان سے محروم ہوتے ہیں وہ سرے سے انکار ہی کر دیتے ہیں، اور بعض جنھیں ان سے عقیدت ہوتی ہے اور حُسن ظن بھی، اور اُن کے دلوں پر نور ایمان کا عکس پڑتا ہے وہ بیچارے ان کے کلام میں اپنی طرف سے ہی سرد مہرانہ تکلفات ٹھونس دیتے ہیں، اور بے جا توجیہات کرتے ہیں اور اصل حقیقت یہ ہے کہ ولی کو ولی ہی پہچانتا ہے اور نبی کو نبی۔ کلام اللہ کو اللہ خود ہی بہتر جانتا ہے، "اُس کی تاویل کوئی نہیں جانتا سوائے اللہ کے"[۱۳۲]

راسخ العقیدہ علما کا یہی مقام ہے کہ اُس کلام برحق پر ایمان لائیں اور اُسے خدا کا کلام سمجھیں جیسا کہ اس آیتِ کریمہ سے واضح ہے کہ جو لوگ علم (دین) میں پختہ کار اور فہیم ہیں وہ یوں کہتے ہیں کہ ہم اس پر یقین رکھتے ہیں۔ سب ہمارے پروردگار کی طرف سے ہیں۔ چونکہ کلام الٰہی کا انداز یہی ہے کہ گفتگو ایک ہی ڈھب پہ نہیں ہوتی جو کچھ نازل ہوا سو ہوا۔ اہلِ ظاہر تو اُس کے باطنی معنوں کی تہ تک نہیں پہنچتے، اور ظاہری اعتبار ہی سے ہر آیت کا الگ الگ مفہوم لیتے ہیں۔ لہٰذا وہ اس ربط کو جیسا کہ ان میں ہونا چاہیے نہیں سمجھ پاتے۔ اللہ تعالیٰ کے بعد کلامِ الٰہی کی حقیقت سے اُس کا رسول آگاہ ہے، اور سرورِ کائنات ﷺ کے بعد ان کی آل اور ان کے صحابۂ کبار (ان سب پر خدا کی سلامتی ہو) اور یہ کلمہ کہ میں ہی قرآنِ ناطق ہوں ؑ اسی امر کی خبر دیتا ہے اور پھر ان لوگوں کے بعد خدا جسے چاہے منتخب بزرگوں کے صدقے اپنی خاص عنایت سے نوازتا ہے اور ہر کسی کی استعداد کے مطابق اُسے قرآنی اسرار و رموز سے آگاہ کرتا ہے، جس پر یہ آیت کریمہ گواہ ہے کہ یہ خاص اللہ کا فضل ہے، وہ جسے چاہے فضل سے نوازتا ہے، اور اللہ تعالیٰ بہت بڑے فضل والے ہیں۔[۱۳۳]

اس وقت انسان صدقِ دل سے اس حقیقت کا اقرار کر لیتا ہے کہ اس قسم کا کلام انسانی بس کی بات نہیں۔ واقعی یہ خدا کا کلام ہے جیسا کہ خود خدا نے قرآن میں فرمایا ہے کہ جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی ہے۔ وہ اس بات کو یقین کے ساتھ جانتے ہیں کہ یہ قرآن آپ کے رب کی طرف سے واقعیت کے ساتھ بھیجا گیا ہے۔ "سو آپ شبہ کرنے والوں میں نہ ہوں"[۱۳۴]۔ اور پھر ان پر اس آیتِ کریمہ کی حقیقت کھُل جاتی ہے کہ اگر تم لوگ کچھ

خلجان میں ہو اس کتاب کی نسبت جو ہم نے نازل فرمائی ہے اپنے بندۂ خاص پر تو اچھا پھر تم بنا لاؤ ایک محدود ٹکڑا جو اس کا ہم پلہ ہو۔ پس جو لوگ قرآنی حقیقت کے فیض سے مستفیض ہو جاتے ہیں، اور رسولِ پاکؐ کے طفیل اور ان کے اتباع کی بدولت علوم کے نور کو حقیقتِ جامعۂ محمدیہ (ان پر خدا کا درود و سلام) سے اخذ کرتے ہیں، اُن کے کلام کے لبِ لباب کو بھی ہر عقل کا اندھا نہیں سمجھ سکتا، اور نہ ہی ان کی تحریر و تقریر کی تقلید کر سکتا ہے۔ محمدؐ صلی اللہ علیہ وسلم رسولوں کے سردار ہیں، اور محمدی تمام اُمتوں کے سردار ہیں۔ اور قرآن کی یہ بشارت محمدیوں کے حق میں ہے کہ تم بہترین اُمّت ہو جو لوگوں سے نکالی گئی ہے۔

علمی مراتب کی کیفیت و مقدار اور جزئی و کلی اہلیتوں کے حال کے اختلاف کا بیان

سبحان اللہ یہ علم کا نور جو اسرار و رموز کو کھولنے والا ہے، وہی نور اہلِ ظاہر کی راہ میں دیوار کی طرح حائل ہو جاتا ہے علم حجابِ اکبر (بہت بڑی رکاوٹ یا پردہ) ہے، انہی لوگوں کے حق میں کہا گیا ہے کیونکہ اہلِ ظاہر کو جزوی علم ہوتا ہے جس سے وہ جزئی اعتبارات ہی کو دریافت کر سکتے ہیں۔ اور جب وہ ہر علم کی کتابیں اور رسالے پڑھتے ہیں ان کی معلومات بڑھتی جاتی ہیں۔ لیکن اصل علم جس کا مطلب فہم و ادراک ہے اس میں اضافہ نہیں ہوتا۔ دراصل قدرت نے ہر کسی کو وہی کچھ دیا جس کے وہ قابل تھا۔ "سُنّتِ الٰہیہ میں تبدیلی نہیں آیا کرتی"۔ علم جس کے معنی جاننے کے ہیں، اس کی مثال اُس فطری حرارت یا رطوبت کی طرح ہے جس پر انسانی زندگی کا مدار ہوتا ہے۔ انسان کو پیدائش کے وقت وہ جتنی قوی یا کمزور عطا ہوتی ہے۔ پھر اُس سے وہ بڑھتی نہیں۔ پس کوتاہ عقل علمائے ظاہر جزوی علوم کے مالک ہوتے ہیں۔ جب ان کے نفس میں اعتباری معلومات بکثرت منقش ہو جاتی ہیں تو ان کے علم کی اب ان کے ہاں سمائی نہیں ہوتی۔ وہ اپنے ذہن میں خود کو سب سے زیادہ پڑھا لکھا سمجھنے لگتے ہیں۔ کم حوصلگی کی بنا پر ان میں غرور پیدا ہو جاتا ہے۔ ان کی فطری جہالت ان کے جزوی علم کے ساتھ مل کر جہلِ مرکب بن جاتا ہے۔ دوسری طرف عارفانِ ذات جو محقق ہوتے ہیں، اور ان وسیع المشرب حضرات کے نصیب میں ذاتی استعداد کی بنا پر علم کلی ہوتا ہے ان کے لوحِ ذہن و قلب پر جزوی معلومات اور اعتباری قیود کے جتنے قطرات بھی ٹپکتے ہیں یعنی طرح طرح کی تحقیقات رونما ہوتی ہیں لیکن ان کے علم کے اتھاہ سمندر کے سامنے ان کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی، نہ ہی ان کے نزول سے اُنھیں دل تنگی ہوتی ہے۔ ان کا رتبہ بہت بلند ہوتا ہے۔ ان کے حوصلے کی نہ حد ہوتی

ہے نہ انتہا۔ جو کچھ بھی رونما ہوتا ہے اُسے بے اعتبار سمجھتے ہیں اور اُسے کوئی اہمیت نہیں دیتے۔ لیکن اس تمام وسعتِ علم و قلب کے باوجود بھی اپنی خامیوں اور کوتاہیوں کا اعتراف کرتے ہیں۔ وہ کسی شے کو خاطر میں نہیں لاتے۔ لہٰذا جو کچھ حسب حال ہوتا ہے اُسے بیان کر دیتے ہیں۔ یہ تمام خواہ بیہودہ گوئی اور تضیع اوقات ہی کیوں نہ ہو۔ لیکن عقلمند اُنھیں معذور سمجھیں گے اور دیوانے تو خیر دیوانے ہی ہیں۔ یہ بیان تسکین نفسی کے لیے ہے، اس میں کوئی تصنّع اور بناوٹ نہیں جو اہلِ ظاہر کا وطیرہ ہوتا ہے، بلکہ یہ تو مشاہدے کی خامی کے اعتبار سے ہے۔ انسانی آنکھ ہمیشہ اُس کا مشاہدہ نہیں کر سکتی، اور بندگی کے سزاوار بھی یہی ہے۔ مخلوق بچاری خالق کبریا کے بارے میں جو کچھ بھی کہے گی وہ یاوہ گوئی سے زیادہ نہ ہوگا۔ یہ بے سروپا ممکن الوجود (انسان) کہ عدم سے آیا اور عدم ہی کو لوٹ جائے گا۔ یہ فانی انسان اُس ازلی وابدی واجب الوجود کے دوام کے سامنے تو تضیع اوقات ہی ہے۔ جب ہمارے رسول پاک صلعم نے یہ فرمایا کہ اے اللہ! نہ تو ہم تمھیں کما حقہٗ سمجھ سکے، اور نہ ہی کما حقہٗ تیری عبادت کر سکے تو پھر ہم بچارے غلامانِ محمدؐ کی کیا بساط کہ اپنے علم و فضل کو تحقیقات کا درجہ دیں اور اپنے اعمال کو نیکیاں تصوّر کریں۔ میرا یہ بیان بھی معترضین اور مخالفین کی تسلّی کے لیے ہے۔ یہ احقر العباد اپنی خامیوں اور کوتاہیوں کا خود اعتراف کرتا ہے تاکہ اُنھیں اعتراضات اور طعن و تشنیع کی حاجت ہی نہ رہے۔ اس معاملے میں بھی خدا نے مجھے کسی کا محتاج نہیں بنایا۔ مجھے بُرا بھلا کہنے کے لیے میرا اپنا نفس لوّامہ ہی کافی ہے۔ وہ کون ہیں جو سامنے آئیں اور باتیں بنائیں۔ لہٰذا اگر وہ بدگو نہ ہوں تو ہم اس سلسلے میں ان کے وجود کے محتاج رہ جاتے ہیں کہ آخر کوئی تو ہو جو ہمارا بدگو اور مخالف ہو تاکہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے کامل اتباع اور تمام نسبتوں کی جامعیت ہم پر صادق آسکے۔ اور تمام اسمائے حسنیٰ کی مظہریت رونما ہو۔ خدا ایسا ہرگز نہ کرے ہمیں نہ تو عقیدت مندوں کی حاجت ہے اور نہ منکروں کی۔ ہم اپنے دوست بھی آپ ہی ہیں اور دشمن بھی آپ ہی۔ اللہ تعالیٰ نے آنکھیں دی ہیں تاکہ ہم اپنا مشاہدہ آپ کر سکیں۔ جسم دیا ہے تاکہ بینائی اس کی گواہی دے سکے۔ کان دیے ہیں تاکہ خود اپنا کلام سُن سکیں۔ زبان دی ہے تاکہ خود کلامی کر سکیں۔ عقل دی ہے تاکہ خود کو سمجھ سکیں۔ دل دیا ہے تاکہ خدا تعالیٰ کے الہامات قبول کر سکیں۔ روح دی ہے تاکہ خود سے دوستی قائم کر سکیں۔ اور نفس دیا ہے تاکہ خود سے دشمنی کر سکیں۔ اور محبت و رغبت دی ہے تاکہ سکون و آسائش مل سکے۔ وحشت دی ہے تاکہ خود سے فرار کر سکیں۔ عرفان دیا ہے تاکہ خود اپنے معتقد ہو سکیں۔ جہالت دی ہے تاکہ اپنی ذات

کے منکر ہو جائیں۔ نہ ہمارا خالق محتاج ہے اور نہ ہی ہم جو اس کی مخلوق ہیں کسی دوسرے کے محتاج ہیں۔ اللہ ہی کافی ہے۔ وہ سب سے اچھا کارساز ہے۔ وہی بہت اچھا رفیق ہے، اور وہی بہت اچھا مددگار ہے۔

بیہودہ گوئی کی مثال اس لیے دی گئی ہے کہ جس طرح ہذیانی کیفیت میں آدمی اپنے آپ اور دوسروں سے بے خبر ہوتا ہے، اور اُس حالت میں وہ بات کرتے وقت تکلف سے کام نہیں لیتا، اسی طرح ان مطالب کا ورود بھی چونکہ اللہ کی جانب سے ہوتا ہے، سو نہ تو آدمی کو اس وقت اپنی ہوش ہوتی ہے، اور نہ اس بیان میں مادی حواس کو عمل دخل ہوتا ہے۔ بلکہ ان مطالب سے مستفیض ہوتے وقت ظاہری حواس تو سلب ہو جاتے ہیں، اور اپنی ذات کی طرف توجہ بھی نہیں رہ جاتی۔ لہٰذا دانشمندوں کو اس عبارت میں کوئی نقص نظر آئے یا اس کا مطلب سمجھنے میں کوئی دقت ہو یقیناً وہ عفو و درگزر سے کام لیں گے، اور بے خودی کے عالم میں کہی ہوئی باتوں پر طعن و طنز کے لیے لب کشائی نہ کریں گے۔ البتہ یہ یقینی بات ہے کہ ذاتِ حق کے دیوانے جو ہر وقت مشاہدہ ذاتِ واحد سے عالمِ حیرت میں ہیں اور اس بیان کے محرمِ راز، ان کی صفائی قلب میں اضافہ ہوگا اور وہ اسے اپنے ذوقِ سلیم کے عین موافق پائیں گے، کیونکہ سونے کی قدر و قیمت کو سنار اور گوہر کی قدر و قیمت کو جوہری ہی جانتا ہے۔ حق سبحانہ تعالیٰ نے جسے چاہا محرمِ اسرار بنا دیا اور جسے چاہا اُس کے دل پر حجاب کا پردہ ڈال دیا۔ پھر بھلا ان کی کیا بساط، اور اُن کا غلطیاں پکڑنا کس کام کا؟ معاملہ تو خدا سے ہے اور رہنما خود رسولِ خدا ہے۔ جب کفار کا ٹولہ کلامِ الٰہی کو ایک شاعر کا کلام سمجھ بیٹھا اور کہا۔ مگر وہ شاعر کا قول نہ تھا۔ ایک گروہ نے رسول اللہ ﷺ کے فرمودات کو خواہش نفسانی سے تعبیر کیا تو قرآن نے واضح طور پر فرما دیا کہ آپ ﷺ اپنی خواہش نفسانی سے باتیں نہیں بناتے۔ جب حقیقتِ حال یہ ہے کہ ہوا و ہوس کے مارے اہلِ صفا کو بھی اپنی ہی طرح قیاس کرتے ہیں، اور ان کے افعال و اقوال کو اپنے ہی افعال و اقوال کی طرح سمجھتے ہیں۔ گویا ایک آدمی ہے جو اپنے ہی نفس پہ قیاس کرتا ہے۔ جب اُس پاک ہستی ﷺ (ان پر خدا کا درود و سلام) کو اُنھوں نے نفسانی خواہشات سے منسوب کر دیا اور نازل شدہ آیاتِ قرآنی کو شعر و شاعری سمجھا تو پھر خلقت کے ردّ و قبول کو مدِّنظر رکھنا تو سراسر وبال، اور ہر کسی کے من پسند بات کا لکھنا اک امرِ محال ہے کیونکہ ہر کسی کی استعداد مختلف ہوتی ہے۔ لہٰذا ایسی تحریر یا ایسا بیان جو ہر کسی کے ذوق کے مطابق و موافق ہو محال ہے۔ ان جزوی عقل رکھنے والوں کے دلوں پر بھی جامعیتِ محمدیہ کی رہنمائی سے فیض کا کچھ نہ کچھ پرتو پڑتا تو ہے، لیکن یہ ناسمجھ سمجھتے نہیں اور بحث و تکرار میں کھوئے رہتے ہیں۔ نہیں نجات پائی

اللہ اور اُس کے رسول ؐ دونوں نے دُنیا کی زبان درازی سے۔ پس میں کیسے نجات پا سکتا ہوں، یعنی اللہ تعالیٰ جو تمام اضافتوں اور نسبتوں سے پاک ہے، خلقت نے اُس پر بھی زبان درازی کی۔ ہر کسی نے اُسے اپنی ہی خصوصی اصطلاح کا مقصد بنا ڈالا۔ اپنے ذہن میں اپنے مخصوص تصوّر سے اُسے معین کر لیا اور پھر اسی تصوراتی امر کا کسی نے اقرار کر لیا اور کسی نے انکار کر دیا۔ اور رسول مقبول ؐ جن کی ذات جامع صفات ہے اور جن کی حقیقت تمام حقائق پہ حاوی ہے، اس لیے کہ ان کی تخلیق سب سے اوّل ہوئی جب وہ ان ناقص العقل لوگوں کا علاج نہ کر سکے اور وہ ہی سب کو مومن نہ بنا سکے، اور نہ ہی منکرین کو ان کے انکار سے روک کر توحید کا قائل کر سکے، تو پھر ہم غلامانِ محمد ؐ جو انہی کے طفیل حق بات کہہ رہے ہیں ہم ان احمقوں کی طعن و تشنیع سے کیسے بچ سکتے ہیں۔ ہم تو حضورِ پاک ؐ کے اتباع اور ان کے نقش پا پہ چل رہے ہیں ہمیں لعنت ملامت کرنے والوں کی لعن طعن کا کوئی ڈر نہیں۔ پس اطمینان و تسکین حاصل کرنے کے لیے ـــــ اللہ ہی وہ ہستی ہے جس سے مدد طلب کی جاتی ہے اور اُسی سے ہم مدد طلب کرتے ہیں۔ ہمیں یہی اطمینان قلب اور سکونِ خاطر ہی کافی ہے۔ اور اپنے ضمن میں عرض ہے کہ ہمیں تو سب بنی نوع آدم کی اصلاح و تسلّی منظور ہے اور عارفوں کی نظر میں تو سبھی لوگ آدم ؑ کے تن واحد سے پیدا شدہ ہیں۔ پس جسے خدا ہدایت دے گا وہ خالص محمدیت پائے گا۔ اور اگر اس کے خلاف چلے گا تو پھر قیامت میں جو گزرے گی وہ خود ہی دیکھ لے گا۔ جیسا کہ قرآن پاک میں آیا ہے کہ "میں تو محض احکام شرعیہ بتلا کر ثواب کی بشارت دینے والا اور عذاب سے ڈرانے والا ہوں ان لوگوں کو جو ایمان رکھتے ہیں"[۱۳] ہمیں تو اس بات میں کوئی شک و شبہ نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں پورا اطمینان قلب نصیب کیا ہے۔ جو کچھ بھی ہے یا ہوتا ہے وہ پروردگار عالم ہی کے حکم سے ہوتا ہے۔ بندہ تو حق بات کے اظہار پہ مجبور ہے۔ ہمیں خلقت کی بحث و تکرار سے کیا سروکار؟ ہمیں تو اُس کی رضا کے سوا کچھ درکار نہیں۔ پس یہ بیان اللہ کے ساتھ اور اللہ ہی کے لیے ہے اور اسی پر اعتماد اور توکّل ہے۔

ھوالنّاصر

شروع اللہ کے نام سے جو نہایت مہربان اور رحم والا ہے

ہر قسم کی تعریف اللہ فتّاح کے لیے ہے جس نے کھول دیا عارفوں کے دلوں پر عرفان کا دروازہ، اور اُنھیں سکھایا بیان اور کھول دیے واصلین کے سینے یقین کے ساتھ اور اُنھیں مشرف کیا احسان کی حالت کے ساتھ، اور درود و سلام ہو اس پر کہ جس کو اللہ نے فتح دی، فتح مبین اور راضی ہو گیا اس کے لیے اسلام بطور دین دے کر۔ اور اُن کے آل پر اور اصحاب پر سب کے سب پر درود و سلام قیامت کے دن تک۔

امّا بعد پس یہ وارد اوّل جسے فاتح الواردات کہا گیا ہے۔ کہا میرے رب نے کہ کہو کہ "ہمارا رب ہمیں جمع کریگا اور ہمارے درمیان ٹھیک ٹھیک فیصلہ کر دے گا۔ وہ ایسا زبردست حاکم ہے جو سب کچھ جانتا ہے"[۱۴۸] میں امید کرتا ہوں کہ وہ کھول دے گا میرے اور آپ کے درمیان افادے اور استفادے کا دروازہ جس طرح کہ اُس نے کھولا اپنے درمیان اور میرے درمیان فیض جاری کرنے اور فیض حاصل کرنے کا دروازہ تاکہ میں تمھیں فائدہ پہنچاؤں اُس چیز کا جو تمھیں فائدہ دے دُنیا و آخرت میں۔ اور نہیں ہے توفیق مگر اسی کے ساتھ اور وہ بہترین مددگار ہے۔[۱۴۹] اے ہمارے رب فیصلہ کر دے ہمارے درمیان اور ہماری قوم کے درمیان اور تو بہترین فیصلہ کرنے والا ہے۔ پس اے محمد یو جان لو کہ اللہ تعالیٰ نے جب کھولی اپنی مفصل کتاب جسے کہ عالم میں ابتدائی طور پر قلم کے نام سے موسوم کیا گیا۔ اور پہلی چیز جو اللہ نے پیدا کی وہ قلم ہے جیسے کہ اُس کی کتاب مُنزل کا افتتاح جو کہ قرآن ہے سورۂ فاتحہ سے ہوا۔ اور عارف لوگ قلم کی تعبیر عقل کُل سے کرتے ہیں

کیونکہ پہلی چیز جو اللہ تعالیٰ نے پیدا کی وہ عقل ہے، اور جس طرح علم کلیات سب کے سب اجمالاً عقل کا حاصل ہیں اور جزئیات مفصلہ کلیات ہی میں مندرج ہوتے ہیں۔ اسی طرح قرآن کے تمام اسرار اجمالاً سورۂ فاتحہ میں ہیں اور اُسے نہیں سمجھ پاتا مگر وہ شخص جس پر کہ پُرمغز کلمات کے اسرار منکشف ہوجاتے ہیں۔ کیا تم نہیں دیکھتے کہ ہر وہ چیز جو نکلتی ہے کاتب کے قلم سے اور فعلاً نقوش میں ظاہر ہوتی ہے، وہ قلم میں کتابت سے پہلے بالقوۃ ثابت تھی۔ اور ہر وہ چیز جو استعداد کے لحاظ سے قلم میں ثابت تھی، وہ کاتب کے علم میں قلم سے پہلے علمی صورت میں موجود تھی تقدم ذاتی کے ساتھ۔ پس جب ارادہ کرتا ہے اللہ تعالیٰ کہ وہ کھولے بندے کے دل پر واردات کا دروازہ تو متوجہ ہوتا ہے اس کی طرف اپنی ذات کے ساتھ اپنی تمام صفات اور اسمائ کے ساتھ اور دوسرے وسائط اور وسائل کے ساتھ جو پاتے کے لیے واجب ہیں اور ان میں سے ہیں عقول عشرہ میں سے بلند بنیادی چیزیں اور وہ مبدأ فیاض ڈالتا ہے اُس کے دل پر مطالب اپنے رب کے حکم سے اور اُس پر اس کا رب اپنے اسم فتّاح کے ساتھ، اور سکھاتا ہے اُسے اپنے ہاں سے علم اور بندہ اس وقت قریب ہوجاتا ہے اور پڑھتا ہے اس وقت زبانِ حال سے اپنے رب کا نام جس نے اُسے پیدا کیا، اور پیدا کیا خون کے لوتھڑے سے، اور وہی ہے بزرگی والا جس نے سکھایا قلم سے اور سکھایا انسان کو وہ کچھ جو وہ نہیں جانتا۔ پس ہر قسم کی تعریف اللہ کے لیے ہے جو تمام جہانوں کا پالنے والا ہے جس نے بنایا انسان کو بڑا جامع اور حاوی مخلوق کی ہر چیز پر جو کائناتوں میں ہے بلندیوں میں سے اور پستیوں میں سے، اور مجردات میں سے، اور مادیات میں سے۔ بہت رحمان و رحیم ہے جس نے عام کر دیا اپنے احسان کو دنیا پر اور خاص کر دیا اپنے عرفان کو عارفین کے ساتھ۔ مالک ہے روزِ جزا کا۔ نہیں ہے کوئی دین سوائے اس دین کے اور اس کے لیے دین دائم (دائمی دین) کیا یہ اللہ کے سوا کسی اور سے ڈرتے ہیں؟ اور نہیں ہے کوئی دن سوائے اس دن کے، اور ہر روز وہ اک نئی شان میں ہوتا ہے۔ اور نہیں ہے کوئی مالک سوائے اُس کے اور اُسی کے لیے ہے جو آسمانوں میں ہے، اور زمین میں ہے۔ اے اللہ ہم تیری عبادت کرتے ہیں۔ ہم عبادت نہیں کرتے اور نہ معبود ہے سوائے تیرے، اور تجھ سے مدد چاہتے ہیں اور نہ کسی اور سے مدد چاہتے ہیں، اور نہ کوئی مددگار ہے تیرے سوا۔ ہمیں سیدھا راستہ دکھا پہنچانے کے لیے مطلوب تک اور خالص محمدیت پر استقامت کے عطیے کے ساتھ۔ راستہ ان لوگوں کا جن پر تو نے انعام کیا ہم سے پہلے خاص انتخاب اور خالص برگزیدگی کے ساتھ، نہ کہ ان لوگوں کا جن پر تیرا غضب نازل ہوا کہ ان کے دلوں

پر پردہ پڑا ہوا ہو ، اور نہ گمراہوں کا جو تردد میں پڑتے ہیں تیری توحید کے بارے میں اور تیرے چناؤ کی حقیقت کے بارے میں (آمین) حضور سید المرسلین کے حق کے ساتھ اور ان کے پاکیزہ اور ہدایت یافتہ ساتھیوں کے حق کے ساتھ۔

ہر وارد کے سر پر (آغاز میں) ہوالنّاصر لکھنے سے مُراد اور ان موارد میں بسم اللہ شریف لکھنے کی نیّت کا بیان

چونکہ ہوالناصر کے الفاظ ہر باب کے مسوّدے کی ابتدا میں لکھے گئے تھے لہٰذا کتاب اور رسالے میں بھی یہی انداز اپنایا گیا تاکہ سب سے پہلے اسی نام نامی اور اسم گرامی پر نظر پڑے اور اسی کا ذکر ہو۔ چونکہ حدیث شریف کے مطابق ہر بات کا آغاز بسم اللہ شریف سے ہونا چاہیے۔ جب ہر وارد (باب) کو الگ الگ واردات کی مناسبت سے علیحدہ کیا گیا تو ہر وارد کے شروع میں بسم اللہ لکھی گئی۔ حق سبحانہ تعالیٰ نے ہمارے اس کام میں خاص عنایت فرمائی ، اور یوں معلوم ہوا کہ بسم اللہ ہر وارد کا اک جزو اور واردات ہی میں سے ہے ، اور ہر کلام کا آغاز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عین رضا کے موافق ہے لہٰذا کتابت یا نقل کرنے والے اسے معمولی یا اچنبھا سمجھ کر نہ لکھیں تو اپنے ایمان کی خامی کی بنا پر فیضِ ربانی کی راہ میں حائل ہو کر خود اپنے اوپر نقصان و زیاں کا دروازہ کھول لیں گے۔ جس طرح مکتوبات یا دیگر تحریروں کی پیشانی پر اللہ تعالیٰ کا کوئی نام یا دیگر حروف مثل ہُو و الف وغیرہ لکھ دیتے ہیں ، بالکل اسی طرح ہوالنّاصر کا کلمہ مبارک لکھا گیا ہے۔ یہ اس لیے کہ یہ ان سب سے زیادہ مناسب اور مجموعی معانی رکھتا ہے۔ لہٰذا اسے بالکل اسی زمرے میں شمار کریں اور بسم اللہ سے پہلے لانے اور اُس پہ فوقیت دینے کا گمان نہ کریں اور اسمائے حسنیٰ کے بارے میں ایسا خیال بھی نہ کریں ، کیونکہ اُن میں تقدم و تاخر کا سوال ہی نہیں اٹھتا۔ یہ پاک جملہ نہ تو داخلِ کتاب ہے اور نہ ہی آگے پیچھے سے متعلق ہے ، بلکہ یہ تو فقط اللہ تعالیٰ کی طرف صعود کرنے والا کلمہ ہے یا پھر نئی بسم اللہ کے ساتھ اک نئے باب کے شروع ہونے کی علامت اور مختلف الابواب کے باہمی فرق اور سطروں کے درمیانی فاصلے کو نمایاں کرنے کا ذریعہ۔ اس کے ساتھ ساتھ بسم اللہ سے اس اسم الٰہی کو پہلے لانے ، پہلے پڑھنے یا لکھنے میں بھی کوئی قباحت نہیں کیونکہ یہ اس امر کی دلالت کرتا ہے کہ بسم اللہ شریف اسی کی مدد و نصرت کے لیے لکھی جاتی ہے اور ہوالناصر تو ہے اُسی کے اسمائے حسنیٰ میں سے۔

چونکہ ہر وارد کے متن اور شرح کا مجموعہ اپنی ذات میں واقعاً ایک مکمل اور جامع چیز ہونے سے ایک ایک رسالے یا صحیفے کی مانند بن گئے، مجموعی طور پر ان میں سے ہر ایک کا علیحدہ خاص نام رکھ دیا گیا جس میں سب سے بالا حمد و صلوٰۃ اور اس کی وجہ بھی ساتھ درج ہے۔ اور یوں ہر ایک وارد (باب) پر بسم اللہ لکھنے کا موقع میسر آیا۔ لیکن چونکہ شرح و متن میں مکمل ربط و ہم آہنگی کی بنا پر وحدانیت کی کیفیت پیدا ہو گئی ہے اس لیے ہر وارد پہ دو ہی کلمہ ہو الناصر اور بسم اللہ ہی کافی ہیں۔ دوبارہ لکھنے کی ضرورت نہ رہی۔ بسم اللہ کی تشریح متن کے دیباچے میں آ چکی ہے۔ اب اُس کے جا بجا لکھنے کی ضرورت نہیں، اور ہو الناصر کی وجوہات بھی یہیں ایک جگہ پہ کافی ہیں بار بار جا بجا ان کا دہرانا درست نہیں۔ وہی مددگار ہے اور اُسی سے ہم مدد طلب کرتے ہیں۔[۵]
پس ھُو ضمائر میں سے ہے اور معارف کو خوب جاننے والا ہے، اور ہر مضمر کو اسمائے ذات کے ارادے سے تقویت دینے والا، اور ہر شخص اور ہر نام کا معین کرنے والا ہے۔ الناصر اللہ تعالیٰ کے ایک ہزار ایک سو اسمائے حسنیٰ میں سے ہے، اور قرآن شریف سے بڑی لازمی اور اہم دلائل سے استنباط کیا جا سکتا ہے۔ اور یہ لفظ ناصر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ننانوے ناموں میں سے بھی ہے۔ ناصر حضرت علیؓ کا نام بھی ہے اور اُن کے اسماء میں لکھا ہوا ہے اور محمدہ کی طرح ناصرہ حضرت بی بی فاطمہؓ کا نام بھی ہے، اور میرے قبلۂ کونین والد بزرگوار کا نام بھی ہے۔ لہٰذا ان نیتوں کی بنا پر ہم غلامان محمدؐ جب کبھی کچھ لکھنا چاہتے ہیں تو ہر مطلب کے آغاز میں خیر و برکت کے لیے یہ پاک نام لکھتے ہیں۔ پھر اس کے بعد مطالب کو حیطۂ تحریر میں لاتے ہیں، اور رب الارباب کے حضور میں جو حقیقی مددگار اور سب سے اچھا مددگار ہے رجوع کر کے مطالبِ حقہ کے القاء و الہام کے خواستگار ہوتے ہیں اور ان ارواح جلیلہ کو جن سے اس اسم ناصر کو پہلے منسوب کیا گیا ہے، اور جو اضافی (نسبتی) معاون ہیں وسیلہ بنا کر مدد کی درخواست کر کے صحیح و سچے معانی کے امیدوار ہوتے ہیں۔ خداوند تبارک و تعالیٰ ان اضافی مظاہر کی وساطت سے راہِ ہدایت ہم پر کھول دیتا ہے۔ ہادیٔ مطلق کی طرف سے جو انکشافات ہوتے ہیں، اور جو کچھ وہ لکھتا ہے لکھتے جاتے ہیں۔ لہٰذا حقیقی مدد و نصرت باری تعالیٰ ہی سے مخصوص ہے، اور اضافی نصرت ہدایت کے ان مظاہر حضرات سے جیسا کہ اس مقولے سے واضح ہے کہ ہدایت مطلوب تک پہنچنے کے معنوں میں مخصوص ہے اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ اور راستہ دکھانے کے معنوں میں منسوب ہے انبیا و اولیائے کرام کی ذاتوں تک۔ اگرچہ دونوں معانی حق تعالیٰ ہی سے منسوب ہیں۔ پس ہم محمدی اپنے مالک کی عنایت سے پشتینی فتح مندوں میں سے ہیں، اور ہم ناصر کے خلف الرشیدوں میں سے ہیں اور اس آیت کریمہ کے بموجب

۱۲۹

کہ ہمارا تو عام قاعدہ ہے کہ ہمارا لشکر ہی غالب رہتا ہے۔ نسبتی معاونت اور ظفر یابی کی حیثیتوں کا یہ تغیر و تبدل تو علّت و معلول، مرشد و مرید، فائدہ دینے اور فائدہ لینے والوں اور باپ، بیٹوں میں ان کے درجات کے باہمی فرق کی نسبت سے ازل سے جاری ہے اور ابد تک جاری رہے گا۔ بعض کو بعض دوسرے حضرات سے نسبت کی بنا پر فتح مند گروہ ہیں، اور اس طرح بعض کو مددگاروں کے زمرے میں شمار کیا گیا ہے۔ قصہ کوتاہ یہ کہ ہر جگہ اور ہر مقام و مرتبے پر وہی حضرت ناصر جلوہ افروز ہے، اور وہی آئینہ دار، اور وہی محوِ تماشا۔ وفورِ شوق سے میرے در و دیوار بھی آئینہ بن گئے ہیں۔ میں جدھر دیکھتا ہوں اُدھر تو ہی تو ہے۔

نہیں نہیں یہ غلط ہے۔ اس وفورِ شوق یا غلبۂ محبت سے مجھے فقط یہ کیفیت ہی حاصل نہیں ہوئی، بلکہ مجھ پر حقیقتِ اوّل کا انکشاف ہوگیا اور اُس حقیقت کے مطابق مجھے یہ کیف و سرور حاصل ہوا اور پھر معاملہ علم الیقین اور عین الیقین سے بھی آگے گزر کر حق الیقین تک جا پہنچا۔ در و دیوار کی کیا حیثیت یا بساط کہ وہ اُس کے حُسن کے آئینہ دار بن جائیں۔ یہ تو دردِ عشق ہے جو ہر جگہ اور ہر وقت (ہر زمان و مکان میں) محبوب کے حُسنِ لازوال کا آئینہ دار ہے اور اپنے عندلیب زار (مصنف کے والد بزرگوار کا تخلص) کے نالہ و زاری کو سننے والا بھی ہے۔ ("نالۂ عندلیب" کتاب کا نام) اللہ کا سو شکر آنجناب کی مدد سے وہ درد بھرا نالہ فردوش گوش بنا اور ہر لحظہ بلبل کی طرح اپنے چہچہوں، زمزموں اور نالوں سے بزمِ گلشن کو گرم رکھتا ہے، اور باغ میں سوئے ہوؤں کے کانوں میں گونجتا ہے۔ (حضرت عندلیب کے شعر کا ترجمہ) اے عندلیب تیرا درد بھرا نالہ سننے کے لائق ہے اور تیرے باغ و گلزار کی تر و تازگی دیکھنے کے لائق ہے۔ تو جزو اور کُل کو اپنی اصطلاح میں کیا کہتا ہے اور برگ و گل کو اپنی زبان میں کس نام سے پکارتا ہے۔ اے خدا تو ہی ہمارا حامی و ناصر ہے تو ہر جگہ حاضر و ناظر ہے ہمیں کسی اور سے کوئی سروکار نہیں اور دونوں جہانوں میں اے اللہ جل شانہٗ و عم نوالہٗ تیری ذاتِ بے مثال کے علاوہ ہمارا کوئی یار و غمخوار نہیں۔ تو ہمیں پوچھتا ہے کہ تمھارا کون ہے، ہم کہتے ہیں ہمارا سہارا تو ہی ہے۔ ساری دُنیا اور دُنیا والے ہمارے لیے بیگانے ہیں۔ فقط ایک ہی ہمارا دوست اور آشنا ہے۔ توبہ استغفار۔ خدا معاف کرے مغائرت ہے کہاں جو تجھ سے آشنائی کا دعویٰ کیا جائے۔ اور پھر تجھ سے جدا کب ہیں جو محبت کا دعویٰ کیا جائے۔ تو خود ہی اپنا یار اور خود ہی اپنا آئینہ دار ہے (شعرِ عندلیب کا ترجمہ) میرے سوا میرے اور تیرے درمیان اور کوئی حجاب نہیں۔ میرا حجاب تو میری آنکھوں پر پڑا ہوا پردہ ہے بلکہ ہماری آنکھوں کے پردوں میں نورِ نگاہ تمہی تو ہو۔ اور انہی پردوں کی بدولت ظاہری اعتبار سے خود کو نہاں رکھا۔ تو ہی ظاہر ہے اور تو ہی باطن ہے۔ جو کچھ تھا وہ بھی تو ہی تھا، اور جو کچھ اب ہے وہ بھی تو ہی ہے۔ اب

میری زبان پر تیرا ہی بیان ہے۔ اسی کے لیے تعریف ہے، اوّل بھی اور آخر بھی۔ اور میں سپرد کرتا ہوں اپنا معاملہ اسی کی طرف اس کا ظاہر بھی اور باطن بھی، اور تعریف کرتا ہوں اللہ کی جس نے میری مدد کی اور بنایا مجھے ناصر کے بعد وراثت میں اور خلافت میں اور وہ بہترین مدد کرنے والا ہے۔ اور بنایا مجھے منصور جس کی مدد کی جائے خالص محمدیوں میں پہلا۔ اور میں اُن میں سے پہلا ہوں اور مکمل مشابہت رکھنے والا امیر المحمدیین (باپ) سے صورتاً، معناً، ظاہراً اور باطناً اور دو میں سے دوسرا ہوں اس کے ساتھ مکمل نزول کے غار میں۔ اور عروج مکمل کے آسمان پر، اور میرے ساتھ ہے دُنیا میں اور آخرت میں اور میں اس کی عین ہوں اور میرا گوشت اس کا گوشت ہے، اور میرا خون اُس کا خون۔ میری رُوح اُس کی روح ہے اور میرا نفس اُس کا نفس ہے۔ اور میں ظاہر ہوا اس کے ظہور کے ضمن میں ایک ہی نور سے، اور جس کسی کا وہ مولیٰ ہے پس میں بھی اس کا مولیٰ ہوں اور میں نہیں ہوں مگر وہی، اور نہیں ہے شریک اس کا کوئی مگر یہی اس کی استدعا کے مطابق جب کہ کہا اُس کے رب نے اس سے الہام خاص کے ساتھ، کہ بے شک میں بنانے والا ہوں تجھے لوگوں کے لیے امام اور پیشوا اس نے کہا میری اولاد میں سے، اور پڑھ اے اللہ درود بھیج محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر اور آلِ محمدؐ پر جیساکہ تو نے درود بھیجا ابراہیمؑ اور آلِ ابراہیم پر بے شک تو حمید و مجید ہے۔ پس قبول کی اس کی دُعا اس کے رب نے اپنے رسول علیہ السلام کی دُعا کے ضمن میں۔ پس جاری کی اُس کو ہدایت کی نہر اور کھولا اس پہ علم کا دروازہ اور خاص کیا اس خالص توجہ کے ساتھ اس منجھلے بیٹے کو جس کے بارے میں اُس نے کہا کہ بہترین معاملات وسطی درجے کے ہوتے ہیں۔ "اللہ جسے چاہتا ہے اپنی رحمت سے مخصوص کرتا ہے، اور اللہ فضل عظیم والا ہے۔[۱۲۰]"

اس کلام کی رسم اور حال کے بیان کا باب

یعنی واردات قلبی کے نزول کے وقت خود میری اپنی کیفیت اور اُس وقت خاص کے مطالب کا بیان۔ اُللہ گواہ ہے اور اُسی کی شہادت کافی ہے[۱۲۱] کہ کبھی تو یہ سارا باب ایک ہی دفعہ دل پہ وارد ہو جاتا ہے گویا جیسے پہلے ہی سب کچھ یاد ہے۔ کبھی ایک ایک جملہ کر کے نازل ہوتا جیسے کوئی بھولی بسری عبارت تھوڑا تھوڑا کر کے آہستہ آہستہ یاد آتی ہے۔ کبھی راہ چلتے کہ یہ فقیر ان دنوں اِدھر اُدھر سیر کے لیے نکل جایا کرتا تھا۔ تب سیر و گردش اور آنا جانا ابھی بالکل ترک نہیں کیا تھا۔ سور رباعیات سمیت تمام عبارت سر راہے گاہے وارد ہو جاتی اور گھر آ کر میں اُسے لکھ لیتا تھا۔ کبھی واردات کے وقت بے تحاشا رونا آتا اور

کبھی حیرت کا عالم ہوتا کبھی بہت زیادہ ہنسی آتی اور کبھی خوف اور غم کا غلبہ ہو جاتا، اور کبھی امید و مسرت کی لہر دوڑ جاتی۔ غرضیکہ معاملہ میری ذات تک محدود رہتا۔ میری وہ کیفیت جس قسم کا تقاضا کرتی اسی کے مناسب حال وہ باب لکھا جاتا۔ اس وقت مجھے کسی اور کا دھیان یا کسی اور کو پڑھانے یا کسی دوسری تصنیف وغیرہ کا کوئی خیال میرے ذہن میں نہ آتا تھا۔ انجمن میں تنہائی کا عالم۔ مجلسوں اور محفلوں کی گماگمی میں بھی اک خلوت کا عجیب منظر ہوتا۔ کبھی عالم تنہائی میں یہ ماجرا رونما ہو جاتا۔ پھر جب میری توجہ اس طرف دلائی جاتی تو مجھے اپنے عزیز بھائی کی استدعا یاد آجاتی۔ میں انھیں کہتا کہ وہ لکھتے جائیں۔ آپ ہی نے ان رباعیات کی شرح لکھنے کو کہا تھا، اور یہ سب کچھ آپ ہی کی مرضی کے مطابق وارد ہوا ہے۔ وہ اُسے لکھتے جاتے۔ پھر ہم دونوں بھائی اُسے قبلہ بزرگوار والد صاحب کے گوش گزار کرتے۔ وہ سُن کر بہت متاثر ہوتے۔ اس رسالے اور میرے حق میں بہت دعائیں دیتے اور داد تحسین بھی۔ میں خود کو ان عنایات کا حقدار نہ سمجھتا تھا۔ اس احساس تشکر کی ادائیگی کے لیے مناسب الفاظ ہی نہیں ملتے۔ الغرض ان کی کمال بندہ نوازی تھی۔ کبھی رات کے وقت جب اللہ تعالیٰ واردات کا دروازہ کھول دیتا، اور اپنی خاص رحمت و عنایت سے القا و الہام سے نوازتا۔ بغیر لکھے ہوئے بھی کچھ کچھ حصص یاد رہ جاتے۔ اُسے لکھنے سے پہلے والد صاحب کی خدمت اقدس میں سناتا اور پھر دن میں اُنھیں لکھ لیتا۔ یونہی آہستہ آہستہ ایک سو گیارہ (۱۱۱) وارد لکھے گئے۔ کارکنانِ قضاو قدر نے میرے جی میں یہ بات ڈالی کہ اس رسالے کو اسی تعداد پہ ختم کر دوں۔ ایک سو دس کا عدد حضرت علیؓ کے نام کے حروف ابجد کے مساوی ہے اور ایک عدد مزید کہ اللہ واحد و تنہا ہے، اور طاق عددوں کو پسند کرتا ہے۔ لہٰذا میں نے تعمیل ارشاد کی، کیونکہ حکم بھی اللہ کا ہے اور ملک بھی اللہ کا، اور اُس کے سوا اور کوئی معبود نہیں۔ یہ بات ذہن میں رکھیں کہ ان واردات کی باہمی ترتیب ان کی تقدیم و تاخیر کے مطابق نہیں، اور نہ ہی ان کا تقدم و تاخر عبارت کی مقدار یا مطالب کی حقیقت کی بنا پر ہے۔ ہر چند کہ بعض وارد دوسروں کی نسبت زیادہ جامع اور اعلیٰ ہوں گے، اور ان میں سے بعض کا پڑھنا یا ذکر کرنا بعض کے حق میں زیادہ نفع بخش بھی ہو اور کئی ایک کی علامات و انوار دوسروں سے زیادہ پائدار اور شاندار نظر آئیں، لیکن ان اُمور کو ان کے آگے یا پیچھے ترتیب دینے میں کوئی عمل دخل نہیں۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ پہلا ہے اور وہ دوسرا یہ اعلیٰ ہے اور وہ ادنیٰ۔ لہٰذا اس مجموعہ کی ترتیب میں بھی میرا اپنا دخل نہیں ہے۔ لہٰذا ان کے تقدم و تاخر کی میرے پاس کوئی ظاہری وجہ بھی نہیں۔ مجازیا حقیقت یا معنی و صورت ہر لحاظ سے یہ علم الٰہی کے موافق ظہور

میں آیا کیونکہ وہی اس تمام کلام کا اصل اور حقیقی مالک ہے۔ ان واردات کی ہیئت انسانی تجاویز و تدابیر کے عمل دخل کے بغیر بالکل لوحِ محفوظ کے مطابق ہے۔ جو ان تمام اسرار و رموز کا اصلی ماخذ ہے اور جس کے مطابق یہ لکھے گئے ہیں۔ انہی وجوہ کی بنا پر میں نے متن اوّل، دوم اور سوم کی شکل میں تعداد کی قید نہیں رکھی، اور نہ ہی زائد از ضرورت الفاظ لکھے، لیکن جب غیر مقید اور آزاد و مطلق معانی زمان و مکان کی قید میں آکر تلفظ و کتابت کی شکل اختیار کر کے اس بارگاہِ معلیٰ سے الگ ہو کر ایک دوسرے سے ممتاز ہوئے، اور اپنی لطافت کو چھوڑ کر قرأت اور کتابت (پڑھنے اور لکھنے) کی کثافت میں پھنس گئے تو اس مجموعہ میں یقیناً اس لحاظ سے آگے پیچھے کی نوبت آئی، اور کہا جا سکتا ہے کہ فلاں وارد (باب) فلاں سے پہلے ہے یا فلاں باب فلاں سے بعد کا ہے۔ فی الحال تو اسی پہلی قسم کو درجۂ اوّل اور دوسری کو درجہ دوم لکھنا چاہیے، اور منقول کرتے وقت بھی اس حقیقت کو ملحوظِ خاطر رکھنا چاہیے، لہٰذا شرح میں گنتی کی قید رکھی گئی۔ اور ہر وارد پر اس کا نمبر لکھ دیا گیا۔ حاصلِ کلام یہ کہ متن کے مطالب کی طرف رجوع کرنا چاہیے اور اس کلام کی کیفیت و حقیقتِ حال پر سے پردہ اُٹھانا چاہیے۔

ہماری وہ خلوت جس پر انجمنوں کو بھی رشک آئے۔ ہماری زبان شمع کی مانند ہمیں سے محوِ گفتگو ہے۔ دُنیا اک آئینہ خانہ ہے۔ جدھر سے بھی اشارہ ہو ہمیں تو اپنا عکس نظر آتا ہے۔ اس رباعی میں لفظ خلوت (ما) کا مضاف ہے۔ جامع انسانی کو ایک اکائی مانا جس کا تشخص متکلم سے کیا۔ صدر انجمن سے مراد یہ چاروں کھونٹ جو طرح طرح کے حقائق سے بھرے پڑے ہیں، اور جو کچھ ساری کائنات میں ہے وہ خود حضرت انسان کے اندر بھی ہے۔ اسی لیے تو انسان کو اک عالم صغیر (اک چھوٹی سی دنیا) کہتے ہیں۔ پس انسان کی یہ مختصر سی جامع حقیقت آفاق کی ان سب مفصل کیفیات کے لیے باعث صد رشک ہے۔ دوسرے مصرع میں زبان سے مراد قوت، ادراک اور ملفس ناطقہ ہے جو ہمیشہ خود کلامی میں مصروف رہتا ہے۔ اور جہان کو شیشے کے گھر سے اس لیے تشبیہہ دی گئی ہے کہ آئینہ خانے میں بھی سوائے اپنی صورت کے اور کچھ نظر نہیں آتا اور اس جہان میں بھی انسان کی مختصر سی حقیقت کے کمالات کی تفصیل کے سوا اور کچھ نہیں جیسا کہ صراحت کی ہے اس بات کی عارف لوگوں نے۔ لہٰذا ہم جس طرف بھی اشارہ کریں گے مشارٌ الیہ بھی ہمیں ہوں گے۔ اور اشارات سے مراد انسان کی حرکات و سکنات ہیں، جو نفسانی حرکات، دلی خیالات، زبانی کلمات اور انسانی اعضا سے صادر ہونے والے افعال پر مشتمل ہیں۔ اب حرکات کی دو ہی صورتیں ہو سکتی ہیں۔ اچھی یا بُری اور پھر ان کی اچھائی یا بُرائی فاعل ہی پہ عائد ہو جاتی ہے جیسا کہ خود خدا تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ اگر

کوئی نیک کام کرتا ہے تو اپنی ذات کے لیے، اور اگر بُرا کرتا ہے تو بھی اپنی ذات کے لیے۔ یعنی جس نے نیک کام کیا اجر بھی اُسے ملا، اور جس نے بُرا کام کیا اس کا وبال بھی اسی پر پڑا۔ اسی لیے تو تمام مومنوں کے حق میں نیک گمان رکھنا چاہیے، اور کسی کو بغیر شرعی ثبوت کے رنجیدہ نہیں کرنا چاہیے۔ کسی پر حسد نہیں کرنا چاہیے۔ کسی کی چغلی کے لیے لب نہیں کھولنے چاہئیں۔ جہاں تک ہو سکے اُس کے بندوں سے احسان کرنا چاہیے۔ اُنھیں نفع پہنچانا چاہیے۔ مخلوق کی خیر خواہی کرنی چاہیے۔ اس لیے کہ یہ سب چیزیں لوٹ کر اپنی ہی طرف آتی ہیں۔ اور ہمیں ہی نفع یا نقصان پہنچاتی ہیں۔ اگر تم نے بھلا کیا تو اپنے ہی نفس سے کیا۔ اگر کوئی بیان ہے تو پھر اپنے ہی عیب ڈھونڈو کیونکہ اگر کچھ بیان ہوتا ہی نہ، تو پھر کس چیز پر نکتہ چینی و اعتراض کرتے۔ یہ تو امر محال سمجھو کہ بات یونہی کہی جائے یا لکھی جائے کہ ساری دُنیا اسے قبول کر لے۔ جب کلامِ الٰہی کے متعلق کفار نے یہاں تک کہہ دیا کہ یہ تو پچھلے لوگوں کے قصّے کہانیاں ہیں تو پھر دوسرے کلام کس شمار و قطار میں۔ لیکن جب تائیدِ ربانی حاصل ہو، اور فیاضِ مطلق آپ کے دل پر سچے مطالب کا القا کر دے تو پھر انسان ایسی باتیں کہتا ہے اور انصاف پسند دانشور اور سلیم الطبع لوگ ان کو مان لیتے ہیں۔ اگرچہ بعض ٹیڑھی سرشت کے جاہل لوگ اس کے انکار کی کوشش کرتے اور اپنی بدفطرتی کی وجہ سے واویلا مچاتے، ان مطالب کی خوبیوں کو چھپاتے اور مخالفت کا کھلے بندوں اظہار کرتے ہیں۔ لیکن اس کلام کی سچائی میں کوئی خلل نہیں آتا جیسا کہ اس آیت کریمہ میں خدا تعالیٰ نے خود فرمایا ہے کہ ان لوگوں کی باتیں آپ کے لیے آزردگی کا باعث نہ ہونا چاہیے۔ بے شک ہم سب جانتے ہیں جو کچھ کہ یہ دل میں رکھتے ہیں اور جو کچھ ظاہر کرتے ہیں۔ سو یہ ہے کسی تقریر کی سچائی کا بیان، اور اس کی تردید کی علامت یہ ہے کہ انصاف پسند دانشمند اور اعتدال پسند عارف اسے صحیح نہیں مانتے اور معقول نہیں سمجھتے لہٰذا اس قسم کا بیان پھر لغو اور بے معنی ہے۔ کوئی جاہل انسان بزعم خود اسے درست ہی کیوں نہ مانے وہ ہرگز قابلِ التفات نہیں۔ اُسے دونوں ہاتھوں سے سلام و بندگی کیجیے، اس کا کوئی جواب ہی نہ دیجیے۔ ہم جاہلوں کو نہیں چاہتے، اُن سے ہمارا کوئی واسطہ نہیں۔

فائدہ

یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ بعض کشفی امور ہوتے ہیں وہ باطنی یا روحانی قوت سے کھلتے ہیں۔

عقل و دانش کو اس میں عمل دخل نہیں ہوتا۔ اُنھیں دلیل و حجت سے دوسروں کے لیے ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن یقینی طور پر عقل بھی اس کے جھٹلانے کا حکم نہیں دیتی۔ یہ ایک الگ بات ہے جس پہ گفتگو یا بحث کی یہاں گنجائش نہیں۔ ایسے معاملے عارفان ذات ہی کو پیش آتے ہیں۔ عقیدت مندوں کو اقرار کر لینا چاہیے، دوسروں کو بھی انکار تو زیب نہیں دیتا۔ کیا تم شبہ کرتے ہو اس چیز پر جو اُس نے دیکھی۔ اگر کوئی تحریر ہو تو وہ خود پاؤں کی بیڑی ہے کیونکہ جب تک تصنیف باقی ہے تو گویا مصنف بھی زندہ اور بقید حیات ہے بلکہ مرنے کے بعد بھی وہ خلق خدا کی زبان سے نہیں بچ سکتا کیونکہ اس سے پیشتر اگلے بزرگوں نے کہا ہے کہ جس نے تصنیف کی وہ ہدف بنایا گیا۔ اور حقیقت حال یہ ہے کہ ہم بُرا یا بھلا جو کچھ بھی لکھتے ہیں یوں سمجھیے کہ وہ پھول اور کانٹے ہیں جو ہم اپنے حق میں بو رہے ہیں۔ دیکھیے یہ آیت کریمہ کہ "جو شخص دنیا میں ذرہ برابر نیکی کرے گا وہ وہاں اس کو دیکھ لے گا، اور جو شخص ذرہ برابر بدی کرے گا وہ اس کو دیکھ لے گا۔"

پھول سے مراد اچھا کلام ہے جس میں عبارت کی رنگینی بھی ہو اور معرفت کی خوشبو بھی۔ تو پھر فی نفسہٖ ایک آب و تاب والا پھول ہو گا۔ دیکھنے والوں کے لیے جنت نگاہ اور دلوں کے لیے نفع و فرحت کا باعث اور عقلمندوں کے دماغ کی تقویت کا موجب ہو گا۔ لہٰذا ایسے پھول بونے کی رسم تو جب تک باغ دُنیا قائم ہے جاری رہے گا، اور اس کا اجر باغبان ہی کی طرف لوٹ کر آتا ہے۔ اور خدا نے چاہا تو اس چمن کی بہار اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ باغ بہشت میں پھَل پھول لائے گی اور کسی اچھی تصنیف کی ترقی کی اصل کیفیت کا وہیں پتہ چلے گا کیونکہ پاک کلمات اور نیک اعمال اوپر اسی کی طرف چڑھتے ہیں۔ اور کانٹے سے مراد بُرا کلام ہے جو خود بھی لغو اور پیچیدہ ہوتا ہے، اور سخن فہم لوگوں کی دل آزاری کا باعث بنتا ہے اور اللہ کی طرف بڑھنے سے بھی رکاوٹ ڈالتا ہے۔ سادہ لوح انسانوں کے دلوں میں شکوک و شبہات کی نوک سے خلش پیدا کرتا ہے، اور گمراہی کے بیاباں میں ہر خاص و عام کی انگلیاں بھی ادھر ہی کو اُٹھتی ہیں۔ مومنوں کے دلوں میں شکوک و شبہات کا مرض پیدا کرتا ہے۔ ایسا کلام لکھنا گویا درحقیقت اپنی راہ میں آپ ہی کانٹے بونے کے مترادف ہے۔ جب تک دُنیا کا یہ ویرانہ موجود ہے اس میں کانٹے بھی اُگتے رہیں گے۔ ایسے بداقوال لوگوں کا ضرر و نقصان بیچارے نابینا لوگوں کو پہنچتا ہے۔ اس کا وبال انہی قائل افراد کی طرف لوٹ کر آتا ہے اور آخر کار دوزخ میں اس کا عذاب پوری شدت کے ساتھ ہو گا۔ لہٰذا نیکی یا بدی جو کچھ بھی ہے وہ اپنے ہی پہ عائد آتی ہے۔ اللہ گواہ ہے اگر کچھ ناجائز ہو یا کسی دوسرے کو سمجھانا منظور ہو تو خدا کو گواہ بنانا گویا

قسم کھانا ہے اپنے مطلب کی سچائی کے لیے اور سند و شہادت کے طور پر اسی کا نام لینا بھی پُر لطف ہے
اس لیے کہ شاہد بھی وہی ہے اور مشہود بھی وہی۔ لہٰذا اس معاملے میں بھی بھلا کوئی اور کیوں ملحوظ خاطر ہو گا
اور کسی دوسرے کا سمجھنا بھی کیسے منظور ہو گا۔ ہم خود راہ سے بھٹکے ہوئے ہیں ہم کسی کی کیا راہبری کریں گے۔
جب ہم خود اُس کے بحرِ شہود میں گم ہیں اور اپنی نظر میں مکمل طور پر فنا ہو چکے ہیں تو پھر ہم دوسروں کی رہنمائی کیسے
کر سکتے ہیں اور اس امر کی تہمت اپنے ذمے کیسے دھر سکتے ہیں جیسا کہ اس آیت کریمہ سے واضح ہے۔ آپؐ
جس کو چاہیں ہدایت نہیں کر سکتے بلکہ اللہ جس کو چاہے ہدایت کر دیتا ہے، اگر اس وقت رہنمائی ہے تو وہ
اللہ ہی کی طرف سے ہے، اور اگر اعتبارات کا امتیاز ہے تو بھی اسی کے علم مطلق سے ممتاز ہے۔ ہر صورت میں
ہدایت ہادیٔ حقیقی ہی فرماتا ہے اور بندوں میں سے جسے چاہے اپنی ہدایت کا مظہر بنا دیتا ہے۔ بھلا میری
کیا بساط اور میرے کلام کی کیا حیثیت؟ یہ کلمات تو اتفاقی طور پر حیطۂ تحریر میں آئے اور میری ندامت ہی کا زیادہ
باعث بنے کہ میں ہوں اک موہوم اعتبار، اور پھر لامتناہی تعینات میں کس شمار میں آ سکتا ہوں۔ لہٰذا اس واجب الوجود
کے لامحدود مراتب کے سامنے اس مقیّد و محدود موجود کی کیا ہستی؟ اور پھر مجھ سے معرضِ تحریر میں آنے والا کلام
کس شمار و قطار میں، لیکن یہ سنت الٰہی تو اسی طرح جاری و ساری ہے۔ اس آیت کریمہ کے موجب کہ اللہ تعالیٰ
نے انسان کو پیدا کیا، پھر اُسے گویائی سکھائی۔ وہ اپنے بندوں میں سے جس کسی سے چاہتا ہے اُس سے اپنے
مطالب کے اظہار کا کام لیتا ہے، ورنہ صفت کلام کا ظہور موقوف ہو جاتا ہے۔ پس اللہ تعالیٰ کی رضا پر راضی
رہنا چاہیے اور کسی ایسے انسان کی متابعت کرنی چاہیے جو حُسنِ بیان کا شرف رکھتا ہو جیسا کہ اس آیت کریمہ کا
مفہوم ہے کہ جو اس کلام الٰہی کو کان لگا کر سنتے ہیں، پھر اس کی اچھی اچھی باتوں پہ چلتے ہیں، یہی ہیں "جن کو
اللہ تعالیٰ نے ہدایت کی، اور یہی ہیں جو اہلِ عقل ہیں"۔ یہ کلمات جو واردات قلبی کی بنا پر لکھے گئے اتفاقیہ
لکھے تھے۔ یعنی چند امور کے اتفاق کی وجہ سے، یعنی روح کے جسم کے ساتھ اتفاق کی راہ سے، کیونکہ نفس ناطقہ
زبان کے بغیر تو کوئی مطالب بیان نہیں کر سکتا اور نفس ناطقہ کے تصرّف کے بغیر اکیلی زبان بھی بولنے نہیں
لگ جاتی، نیز باطنی علم کے ظاہری علم سے اتفاق کے سبب سے بھی کیونکہ نہ تو فقط ظاہری علم سے اسرار و رموز
کا ادراک ہوتا ہے اور نہ ہی اکیلے باطنی علم سے بیان کی قدرت حاصل ہوتی ہے، نیز یہ کہ عبد اور معبود
کے باہمی اتفاق کا نتیجہ بھی ہے، کہ واجب الوجود اللہ بمنزلہ کاتب کے ہے، اور اس کا بندہ جو ممکن الوجود ہے
مانند ایک قلم کے ہے۔ نہ تو اکیلے قلم سے نقش بن سکتا ہے، اور نہ ہی اکیلے کاتب سے۔ اگر نہ ہوتا وہ اگر

نہ ہوتے ہم تو نہ ہوتی وہ بات جو تھی یا ہے۔[۵] اور یہ حدیث قدسی کہ میں نے چاہا کہ میں پہچانا جاؤں۔ پس میں نے مخلوق کو پیدا کیا۔[۵] اسی امر کی خبر دیتی ہے۔ لہٰذا ان مطالب کی تحریر جو درحقیقت حضرت واجب تعالیٰ ہی کا فعل ہے، اور ممکن الوجود کے لیے جس نے اس فعل کو قبول کیا ندامت ہے۔ اگرچہ ظہور سے پہلے بھی ممکن ہے میرے باطن میں میرے ذاتی انفعال وندامت کی قوت کے تقاضے کے مطابق موجود ہو، لیکن اب جب کہ یہ باطن سے نکل کر خارج میں ظہور پذیر ہوگیا ہے تو مزید ندامت کا باعث بنا کیونکہ وہ قوت فعل کی شکل اختیار کر گئی۔ اور یہ لفظ انفعال جس کے معنی شرمندگی وندامت کے ہیں اپنے عجز کی بنا پر اک گونہ پُرلطف ہے۔ چونکہ آگ جلانے اور پانی ڈبونے پر مجبور ہے۔ آخر گویائی کا شعلہ بھڑک اُٹھا اور زبان کو خموش نہ رہنے دیا۔ کائنات کی ساری موجودات اسمائے حسنیٰ کے مظاہر ہیں۔ اور ہر موجود ایک خاص اسم الٰہی کا مظہر ہے۔ چونکہ اسمائے الٰہی میں تعطل جائز نہیں تو پھر ہر اسم کا جو بھی مظہر ہے اُس سے اُس معنی کا ظہور ہوتا ہے۔ اور انبیاء علیہم السلام اور اولیائے کرام اور عارف باللہ لوگ اسمِ ہادی کے مظاہر ہیں۔ وہ طبعاً امر حق کے ظاہر کرنے، اللہ کی طرف بلانے اور ہدایت کے امور بیان کرنے میں مشغول رہتے ہیں۔ اگرچہ وہ اس آیت کریمہ کے بموجب خوب جانتے ہیں کہ "برابر ہے ان کے حق میں خواہ آپ ان کو ڈرائیں یا نہ ڈرائیں وہ ایمان نہ لاویں گے"[۵] لیکن انھیں کسی کے اقرار یا انکار سے کوئی سروکار نہیں، اور رضائے الٰہی کے علاوہ اور کچھ درکار نہیں۔ جو اُن کا کام ہے وہ کیے چلے جاتے ہیں، اُنھیں مخلوق سے کیا غرض؟ اسی لیے تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ کہہ دو کہ "میں تم سے کوئی اجر نہیں مانگتا میرا اجر تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوگا"[۵] پس میرا معاملہ بھی کچھ اسی امر سے مناسبت رکھتا ہے۔ جو کچھ میرے مالک تعالیٰ نے لکھایا میں نے لکھ دیا۔ جس آدمی کو جس چیز کا شوق ہو وہ اس کے ہاتھوں مجبور ہے، اور ہر آدمی اپنے ہی حال میں مست۔ سو اب جو بات بھی ہے اپنی ذات ہی سے ہے، اور جو وعظ ونصیحت ہے وہ بھی اسی دل پہ نمک پاشی۔ کیونکہ اس آیت کریمہ کے بموجب کہ "تم کو ہمارا کیا ہوا ملے گا اور تم کو تمھارا کیا ہوا ملے گا"[۵] پھر جس کسی کو اپنی ذات ہی سے معاملہ درپیش ہے، اور پھر اپنی نیکی اور بدی بھی اپنے آگے آئے گی لہٰذا اپنی اصلاح ذاتی فرض ہے، اور دوسروں کی اصلاح اپنے ہی ضمن میں ثانوی فرض ہے اور اسی کی تکمیل میں انتہائی کمال ہے۔ لہٰذا حدیث شریف میں آیا ہے کہ دین ایک نصیحت ہے۔[۵] چونکہ قائم بالذات تو حق تعالیٰ ہی کی ذات ہے، اور اسی ضمن میں قیام بالغیر ممکن الوجود موجودات کے نصیب میں آیا۔ بادشاہ کے لیے عدل وانصاف اور رعیت پروری اس کا ذاتی فرض ہے۔ یہی اس کی سلطنت کی عافیت کا موجب ہے اور

ضمناً رعایا کی سلامتی کا باعث بھی ہے۔ اسی طرح مریدوں کی تربیت سے مرشدوں کو بنیادی طور پر تو اپنی ہی تربیت منظور ہوتی ہے اور پھر اس کے بعد ضمناً ان کی تربیت جس کی حیثیت ثانوی ہوتی ہے۔ لہذا جب صورتِ حال یہ ہو تو پھر ہر وعظ و نصیحت جو دوسروں کو کی جائے یا تربیت کی غرض سے جو بات بھی دوسروں کو کی جائے دراصل ہوتی وہ اپنے لیے ہی ہے، اور مقلدین کو جو تنبیہ بھی کی جاتی ہے۔ اس سے اپنے ہی زخمی دل پہ نمک پاشی کی جاتی ہے۔ حضرت بایزیدؒ نے فرمایا کہ تیس۳۰ سال سے میں اللہ تعالیٰ سے باتیں کر رہا ہوں اور لوگ سمجھتے ہیں کہ باتیں ہم سے کر رہا ہے۔ وہ اللہ والے لوگ تھے۔ سوائے اللہ کے کسی سے روئے سخن نہ رکھتے تھے۔ یہ گنہگار انسان خودی کی قید میں اسیر ہے، ہمیشہ خود کلامی ہی کرتا ہے۔ عارفوں کے سر تاج حضرت بایزیدؒ نے یہ الفاظ صفاتی تجلی کو ملحوظ خاطر رکھ کر کہے، ورنہ اُس کا مرتبہ اُس سے کہیں زیادہ بلند ہے۔ اگرچہ مشاہدہ کی اس حالت میں عارف دُنیا بھر کی صفات کی نسبتیں ذاتِ حق ہی سے منسوب کرتا ہے اور ہر طرف سے اُس کے کمالات کا مشاہدہ کرتا ہے، لیکن پھر بھی اشیا کی ذاتی حیثیت اس کی چشم حق بین سے چھپنے نہیں پاتی۔ اور یہ بینائی بھی بالکل زائل نہیں ہو جاتی۔ جیسا کہ مذکورہ بالا کلام سے اپنے وجود، وجودِ حق اور وجودِ خلق کا شعور ظاہر ہے۔ بندہ جو خود کلامی کرتا ہے وہاں ذاتی تجلّی اصطلاحی معنوں میں آتی ہے کیونکہ مشاہدے کے اس مقام پر ماسوائے اللہ باقی ہر چیز کی ذات و صفات اس کی نظر میں معدوم و فنا اور کلی طور پر زوال نگاہ، فقط وہی اک وجود جو سامنے موجود ہے باقی رہ جاتا ہے۔ یہ وہ مقام اور وقت ہے کہ وہ عارف باقی باللہ اس کی تعبیر خواہ ضمیر متکلم (میں) سے کرے یا ضمیر غائب (اس) سے کرے اُس کا مرجع وہی ایک مرتبہ وجود ہے۔ لیکن اس قسم کے مختلف اشارات کو جو دوئی کی خبر دیتے ہیں جمع کرنے کا یہ مقام نہیں پس سمجھ لے۔ ذاتی، صفاتی اور فعلی تجلّی کی حقیقت اور ان سب کی علامات و نورانیت کا مفصل تذکرہ "رؤیت و تجلی" کے باب میں آگے آئے گا جس کا عنوان لقاءُ اللہ ہے۔ وہیں اس کا مطالعہ کیجیے۔ لفظ ہمیشہ سے مراد ٹھہراؤ کے اس مقام کے مستقل قیام اور دوام سے ہے جو امکانی ماہیت اور جوہر بندگی کے مرتبے کا اک لازمی حصّہ ہے جسے اس سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ عروج و صعود کے حالات کی تبدیلیوں کا بھی وہاں گزر نہیں۔ ایسے صعودی حالات و کیفیات کے برعکس جو جدا ہونے والی (اعراض) اشیا کی مانند ہیں جو قائم بالذات نہیں۔ بعض کو دوام سے کچھ نسبت ہو یا وہ دیر سے زوال پذیر ہونے والی ہوں۔ تیس سال یا اس سے کم و بیش عرصہ لگے یا جلد زوال پذیر ہونے والی ہوں۔ وہ اعتبار کے لائق اور قیام کے قابل نہیں۔ یہاں

یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ اس بیان سے میں نے اپنے مرتبے کو حضرت بایزیدؒ کے مرتبے سے بڑھا کر پیش کرنے کا ارادہ کیا ہے۔ وہ تو عارفوں کے بادشاہ تھے۔ اللہ مجھے ایسے ارادے سے معاف فرمائے۔ اسی بدگمانی کو دور کرنے کے لیے میں نے متن میں بڑے ادب و احترام کے ساتھ لکھا، اور اوپر اس کی شرح میں بھی کہا کہ ان کا مرتبہ اس سے بھی زیادہ بلند ہے۔ لیکن یہ بات توصفاتی تجلی کی حالت میں کہی۔ درویش اگر اپنے آپ کو احقر العباد نہ سمجھے تو اُس پہ معرفت حق حرام ہے۔ چہ جائیکہ ایک ایسے بزرگ سے ہمسری یا برتری کا خیال بھی دل سے گزرے جو نقشبندی سلسلے میں ہمارے مرشدوں میں سے تھے۔ اللہ تعالیٰ اعتراض کرنے والوں کے شرّ سے محفوظ رکھے اور کلام کو دلائل و براہین سے ثابت کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

ہر کلام کی کیفیت کی شناخت

اور ہر مقام کے اہل کی حقیقت کی دریافت کا فائدہ

عارف لوگ اور اولیائے کرام جو کچھ بھی فرماتے ہیں وہ ان کے اس وقت اور اس وقت کی خاص کیفیت کے مناسب حال ہوتا ہے۔ ناسمجھ ظاہر بین لوگ جب ایک کلمہ ان کے مُنہ سے سُن لیتے ہیں یا کسی ایک خاص جگہ سے ان کی تصانیف کو پڑھ لیتے ہیں اسی کو سند قرار دیتے ہیں۔ لیکن اس شخص کی مکمل شخصیت سے بالکل آگاہ نہیں ہوتے۔ چونکہ قرآن مجید میں بعض آیات دوسروں کو منسوخ کرنے والی ہیں اور بعض منسوخ شدہ اور احادیث نبوی میں بھی الفاظ و معانی کا اختلاف موجود ہے کہ ایک وقت تو حضور سرورِ کائناتؐ نے ایک بات کا حکم دیا، اور کسی اور وقت اس سے منع فرمایا۔ اور کبھی ایک ہی بیان کی سامعین کی استعداد کے اختلاف کی وجہ سے مختلف تعبیریں کیں، لہذا اگر اولیائے کرام کے کلام میں بھی اس قسم کی چیزیں نظر آئیں، اور یہ سمجھ آئے کہ وہ ایک ہی بات کے دو مختلف معانی کے قائل ہیں تو پھر اسے وقت اور کیفیت کے اختلاف پہ محمول کرنا چاہیے، اور اسی لحاظ سے ہر کلمہ کا وہی مفہوم لیا جائے جس کی وہ دلالت کرتا ہے۔ بعض تو حالات کی ابتدا اور بعض مقامات کی انتہا سے کہے ہوئے ہوتے ہیں۔ وہ بزرگ جن کے مرتبے کی سچائی۔ کمال اور جامعیت مسلمہ ہو ایک دو کلمات کی اونچ نیچ کے فرق سے اُنھیں پست یا بلند نہیں سمجھنا چاہیے جب تک کہ مطالب میں مکمل فرق کی سمجھ نہ آجائے۔ ہو سکتا ہے ایک شخص کے علم و فضل کا پایہ نیچا ہو مگر اُس کی تحقیقات بلند تر پایہ کی ہوں۔ یہ بات اُسی کی سمجھ میں آسکتی ہے جو اتنی سمجھ

رکھتا ہو۔ لہٰذا جتنا فرق ان کے کلام کے مراتب میں ہے، اتنا ہی فرق ان کے اپنے مقام اور مرتبے میں ہے جس پہ یہ آیت کریمہ شاہد ہے کہ ہم نے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے۔ دوسروں کے کلام کی حقیقت معلوم ہو یا نہ ہو، ان کے مراتب کا فرق ظاہر ہو یا نہ ہو مگر ہمیں ہمیشہ اپنے عجز کا اعتراف کرنا چاہیے اور ہمیشہ اللہ تعالیٰ سے نسبتی قوت کی دُعا کرنی چاہیے اور بڑی مسکنت اور عاجزی سے یہ کہنا چاہیے کہ خدایا خودی کی کال کوٹھڑی کے اس قیدی کو رہا کردے اور اپنی حضوری اور مشاہدے سے مشرف فرما۔ یہ تمنا مقام بندگی اور واصل ہونے کے بعد والے فراق سے پیدا ہوتی ہے اور یہی نزولِ تام کا مرتبہ ہے۔ اس مقام پر عین امتیاز میں بھی اتحاد کی حالت ہے جیسا کہ اپنی رہائی کی دُعا میں بھی اپنی حضوری اور مشاہدے کی تمنا کی ہے اور متن میں لفظ خویش کا دو طرفہ احتمال لطف سے خالی نہیں۔ اے اللہ میں تیری پناہ میں آتا ہوں، تجھ ہی سے (رباعی کا ترجمہ) یا خدا ہر کھنڈر تیرے ہی فیض سے بھرا پڑا ہے، اور ہر غم زدہ انسان تیرے ہی لطف و کرم سے خوش و خرم ہے۔ ہر سایہ جو تیرے نور کے پرتو تلے آگیا تو اُس کی سیہ بختی نے دُنیا سے رختِ سفر باندھ لیا۔ شاعر کی اپنی توضیح کے مطابق اس رباعی میں لفظ "فیض" منسوب ہے محبوبِ حقیقی سے۔ اُسی سے تخاطب ہے۔ وہی حاضر و ناظر اور ہر جگہ جلوہ گر ہے۔ اس سے مراد فیضِ وجودی ہے اور کھنڈر سے مراد امکانی ماہیات ہیں اور معمور ہونے سے مُراد آباد اور موجود ہونا ہے۔ لطف سے مراد ہدایت عرفانی اور غم زدہ سے طالب کا دل مراد ہے۔ بخت سیاہ سے یہاں مراد ممکنات کی معدومیت ہے۔ سیہ میں ضمیر (ش) کا مرجع ہر سایہ ہے جو موجودات کی ماہیات کی تعبیر کرتا ہے، اور فارسی محاورات میں اضمار قبل الذکر کا کسی اہم یا غیر اہم جملے میں لانا بالاتفاق رائج درست ہے اور رائج ہے۔ ہر سایہ سے مراد ہر ماہیت اور سایۂ نور سے مراد وجود ظلّی ہے جو ذات واجب الوجود کا سایہ ہے۔ لہٰذا اب معنی یوں ہوئے کہ یا اللہ تیرے فیض وجودی سے امکانی ماہیات کا یہ کھنڈر آباد اور موجود ہوا اور تیری ہدایت نے معرفت و مشاہدہ کی رہنمائی سے طالب کے دل کو خوش و خرم کیا۔ جب تیرے واجب الوجود کے نور کے عکس تلے آئے تو ممکن الوجود موجودات کی معدومیت کی سیہ بختی جاتی رہی۔ "اللہ تعالیٰ ہر شے کا احاطہ کیے ہوئے ہے"[۱۲۸]

هوالناصر

شروع اللہ کے نام سے جو نہایت مہربان اور رحم والا ہے

ہر قسم کی تعریف اللہ کے لیے ہے، جس نے ایجاد کے نور سے تمام جہان کو منور کیا اور فضیلت دی بعض کو بعض پر اپنے بندوں میں سے، اور درود و سلام ہو اس پر جو اللہ کے نور میں سے نور ہے اور مخلوق اُس کے نور میں سے ہے۔ اور وہ نبی تھے اس حالت میں جب آدم مٹی اور پانی کے بین بین تھے اپنے ظہور سے پہلے۔ اور درود و سلام ہو ان کی پاکیزہ آل پر اور ان کے ہدایت یافتہ صحابہ پر۔ اما بعد یہ باب ثانی ہے جس کا نام نور من اللہ ہے۔ منور کرے ہمیں اور تمھیں اُس کے وجود کے ظہور سے۔ پس اس نورِ بسیط (وسیع) کو دکھانا عین بصیرت کے ساتھ مشاہدہ ہے، اور اس پھیلے ہوئے محیط نور کو دیکھنا عین بصارت کے ساتھ مواجہہ ہے۔ پس جدھر تم مُنہ پھیرو گے وہیں اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ پس نور جو ہے وہ مشتمل ہے اس مرتبے پر جو کہ نور کا منبع ہے، اور ہوتا ہے موجودات کی ایجاد کا سبب، اور یہ صفت کا مرتبہ ہے وجود کے لیے اس کی سات صفات کے علاوہ اور جس کی تعبیر کی گئی ہے عُلما کے نزدیک "تکوین" کے ساتھ۔ اور یہ نور جو ہے یہ ارادے کا مرجح ہے مکونات اور اس کی ایجاد کے اظہار کے لیے، کیونکہ وہ قدرت جو اس نوری درجے کی منشا و منبع ہے، وہ فقط اس کے ایجاد کی متقاضی نہیں، اس میں کرنے یا ترک کرنے کی برابری کے ساتھ۔ اور ظہور جو ہے مشتمل ہے اس مرتبے پر جو کہ امرِ منتزع ہے اور اُسے خارج کیا جاتا ہے اس کے موجودات خارجیہ کا مقام ہونے کی وجہ سے، اور یہ مرتبہ ظاہر الوجود کا ہے ماہیت کے تشخص کے ساتھ،

جمع ہونے کے اعتبار سے ان دونوں کے امتیاز کے ساتھ ۔

"اللہ نور السمٰوات والارض"[۱۵۰] کی آیت کریمہ کے وارد کا بیان

اس آیت کریمہ کا بیان اہلِ ظاہر اور اہلِ باطن ہر دو کے ڈھنگ اور ڈھب کے موافق شرح و متن میں کیا جائے گا۔ اس قرآنی آیت کریمہ کو اس لفظ کی عام شہرت کی وجہ سے صرف کریمہ بھی کہتے ہیں اور محققین کے کلام میں یہ لفظ اکثر ایسے ہی استعمال ہوا ہے۔ یہ سمجھ لیں کہ نورِ حق عبارت ہے وجودِ مطلق سے کہ تمام اشیا کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ جس طرح یہ اضافی نور مبصرات کی نمود و نمائش کا سبب ہوتا ہے اسی طرح اصل میں وہی اک حقیقی نور ہے جو اس تمام موجودات کے ظہور کا باعث ہے، اور وہی حقیقت مطلقہ ان مقیدات میں ان کے مراتب کی حیثیت و اعتبار سے ظاہر ہوئی۔ چنانچہ اس مثال سے ہماری مراد انہی اعتباری مراتب کا بیان ہے جس کے متعلق حق تعالیٰ نے اس آیت کریمہ میں فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نور ہدایت دینے والا ہے۔ آسمانوں کا اور زمین کا۔ اُس کے نورِ ہدایت کی حالتِ عجیبہ کچھ ایسی ہے جیسے (فرض کرو) ایک طاق ہے، اور اس میں ایک چراغ ہے، اور وہ چراغ ایک قندیل میں ہے، اور وہ قندیل طاق میں رکھا ہے اور وہ قندیل ایسا صاف اور شفاف ہے جیسے ایک چمکدار ستارہ ہو، اور وہ چراغ ایک نہایت مفید درخت کے تیل سے روشن کیا جاتا ہے کہ وہ زیتون کا درخت ہے جو (کسی آڑ کے) نہ پورب رُخ اور نہ پچھم رُخ ہے۔ اس کا تیل اس قدر صاف اور سلگنے والا ہے کہ اگر اس کو آگ بھی نہ چھوئے، تاہم ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خود بخود جل اُٹھے گا اور جب آگ بھی لگ گئی تب تو نورٌ علیٰ نور ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے اس نور ہدایت تک جس کو چاہتا ہے راہ دے دیتا ہے اور اللہ تعالیٰ لوگوں کی ہدایت کے لیے یہ مثالیں بیان فرماتا ہے اور اللہ تعالیٰ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے۔[۵] اس آیت کریمہ میں ان استعاروں اور مثالوں سے جو ارادہ کیا ہے، مراد وہی ہے اور اپنی مراد کو وہ خود بہتر جانتا ہے۔ لیکن بشری استطاعت کے مطابق اس عاجز کے ذہن میں جو تفسیر و تاویل آتی ہے وہ یوں ہے کہ کلمۂ نور سے مراد وجود و علم ہے اور مشکوٰۃ سے دانائیوں کے مراتب جو الگ ہونے والے غیر مادی وجود ہیں۔ مصباح سے مراد مراتب ارواح و ملائکہ جن میں قرب و نزدیکی ہے۔ اور یہی عقول و نفوس اپنی ہستیوں سے کلیات کا، اور اسباب سے جزئیات کا ادراک کرنے والی ہیں یعنی جیساکہ جزوی علم کے حصول کے لیے انسانی حواس آلات کا کام دیتے ہیں۔ اسی طرح جزوی علم کے حاصل کرنے

کے لیے نفوس، عقل و دانائی کے آلات ہیں جو انسان کو حسی آلات سے حاصل ہوتے ہیں۔ زجاج سے مراد مراتب افلاک ہے جو اجرام فلکی کے شفاف اور شیشے کے جسم کی مانند صاف ہونے کی مناسبت سے مادی موجودات ہیں، اور کوکب دری سے مراد ستاروں کے مراتب ہیں جو اللہ تعالیٰ کے نور سے منور ہیں۔ آسمان میں ستاروں کے گنجان ہونے کی وجہ سے حق تعالیٰ نے کواکب کو افلاک سے علیحدہ شمار نہیں کیا اور اسی ضمیر پہ اکتفا کی جس کا مرجع زجاج ہے اور فرمایا جیسے ایک چمکدار ستارہ ہو۔ اور شجر مبارک سے مراد فلکی اور ارضی یعنی ساری کائنات ہے کیونکہ ستاروں کا تعلق علویات سے اپنے تشخصات کے اعتبار سے ہے جو افلاک ہیں۔ اور سفلیات سے اپنی تاثیرات کے لحاظ سے جو عناصر اربعہ اور موالید ثلاثہ ہیں۔ اور شجر جسے مبارک کہا گیا ہے، اس کی صفت ظہورِ ذات کی برکتوں کی کثرت کی وجہ سے ہے جو کثیر التعداد اقسام اور مختلف انواع میں ظاہر ہے، اور اس شجر مبارک کو زیتون کے درخت سے فیض ربانی کے اس دُنیا میں جاری و ساری اور درخت زیتون کی چربی کے جاری ہونے اور اس چربی کے شعلے کو مشتعل کرنے کی مناسبت سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اس درخت کو شرقی و غربی نسبت کی نفی کر کے مجموعی اور کلی طور پہ ساری کائنات کا مطلب لیا گیا ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ بحیثیت مجموعی دُنیا نہ شرقی ہے نہ غربی بلکہ مشرق و مغرب تو دُنیا کی موجودہ سمتوں میں سے ہیں۔ اور آگ کے چھونے کی ممانعت سے مراد ذات باری تعالیٰ ہے۔ حقائق ممکنہ کی شراکت کی نفی ہے کیونکہ جس طرح ظاہر میں آگ پہ نور و روشنی کے شریک ہونے کا گمان گزرتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ وہ بذاتِ خود روشن ہے حالانکہ ایسا نہیں ہوتا بلکہ وہ تو نور سے روشن ہے اور اپنے جسم کی لطافت کی وجہ سے نورانیت کو قبول کرتی ہے۔ ورنہ نور نور ہے، اور آگ آگ۔ اسی طرح سرسری نظر میں تو یہی کچھ سمجھ میں آتا ہے اور یہی خیال ہوتا ہے کہ یہ موجودات سب وجود ہیں جیسا کہ بعض نے گمان کیا، لیکن معاملہ اس طرح نہیں ہے بلکہ وجود تو وجود ہی ہے کوئی موجود نہیں سوائے اس کے۔ بلکہ اس کے سوا نہیں کہ حقائق موجودہ جو ہیں وہ وجود کے لیے نظر آنے والے ہیں جس میں سے وہ ظاہر ہوں بلکہ یہ بھی ظاہر ہی کے لیے ہے جو اسی سے منسوب ہے نور سے نور پہ۔ "ہدایت دیتا ہے اللہ اپنے نور کے ساتھ جسے چاہتا ہے" لہذا النور ظہور کی اپنے پہ اطلاق اور دیگر موجودات کے ایجاد و اظہار کی حیثیت سے حق تعالیٰ کے وجود کا نام ہے لہذا ارض و سموات کی طرف وہ مضاف ٹھہرا، اور اکثر آیات قرآنی میں ارض و سموات کا اطلاق ساری کائنات ہی پہ ہوتا ہے، لہذا نور کی مخصوص نور سے تفسیر کرتے ہیں۔

یہی اک جانب نسبتی ہوجاتی ہے، اور اسی لیے اس کے معانی کو اہلِ ظاہر اور سطحی اصحاب سے منسوب کیا جاتا ہے جیسا کہ اس رباعی میں ہے۔ (ترجمہ) ارض و سموات میں شمس و قمر کا نور کہاں ہے، ارض و سموات کے اس نور کا خورشید تو اور ہی ہے۔ اللہ اگر ارض و سموات کا نور ہے تو پھر اس کائنات میں غیر کی تاریکی و تیرگی کا کیا سوال ہے۔ اس رباعی میں شمس و قمر سے مراد انسانی عقل و دانائی کے انوار ہیں جن کا دُنیا بھر میں تصرف اور تاثیر ہے، اور نیز یہ ظاہری سورج اور چاند جو بظاہر اس دُنیا کو روشن کرنے والے ہیں۔ نور سے مراد نور وجودی اور سما سے مراد اجرام فلکی اور ارض سے اجسامِ ارضی اور خورشید دِگر سے مُراد ذات واجب الوجود کا تعین ہے اور عرصۂ خلق سے مراد ممکن الوجود موجودات اور ظلمت سے مراد معدومیت اور غیر سے مراد عدم ہے۔ لہٰذا اب معنی یوں ہوئے کہ یہ عقول ونفوس، سورج اور چاند جو خود وجود کے محتاج ہیں وہ اجرام فلکی و ارضی کو وجود میں کیسے لاسکتے ہیں۔ یہ تو وہی ذات واجب الوجود ہے جو ان سب کو اپنی واجبیت کے گھیرے میں لے کر وجود میں لایا ہے، اور ممکن الوجود موجودات جو وجود کے لباس میں ملبوس ہیں ان کے وجود میں عدم کی معدومیت کیسے آئے جو وجود سے الگ اور غیر جنس ہے اور ضدّین کا کبھی اجتماع نہیں ہوتا۔ اگر آپ اس کلام پہ یقین رکھتے ہیں کہ اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے جیسا کہ خود خدا تعالیٰ نے فرمایا کہ اللہ نور السّموات والارض۔ اسی آیت کریمہ کی تفسیر میں صاحبِ کشاف نے "مُنوّر السموات والارض" لکھا ہے۔ اور احیائے علوم کے مصنف امام غزالی نے اسی تاویل کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ سطحی علما کے لیے خوب لکھا ہے۔ کشاف کے مصنف جار اللہ زمخشری نے جو معتزلہ جماعت سے تعلق رکھتا ہے، اس آیت کی تفسیر میں نور سے منوّر بمعنی اسم فاعل مرادلی ہے، یعنی کہ آسمانوں اور زمین کا روشن کرنے والا حق تعالیٰ ہی ہے نہ کہ شمس و قمر کی روشنی۔ اور ظاہری اعتبار سے بھی یہ معانی درست ہیں۔ کہتے ہیں کہ کشاف کا مصنف جب اپنی تصنیف کو اپنے ہمعصر محقق امام غزالی کے پاس لے گیا تو اُنھوں نے جب کتاب کھولی تو اتفاق سے یہی آیت کریمہ سامنے آئی۔ آپ نے پڑھا اور فرمایا کہ سطحی عالموں کے لیے خوب لکھا ہے، لیکن خود صاحبِ نظر اصحاب جنھیں اربابِ شعور کہا جاتا ہے کے ذوق و مذاق کے مطابق کچھ نہیں کہا۔ چونکہ اللہ تعالیٰ نے مجھ فقیر کو علم لدنّی (باطنی علم) کی بدولت اس کے معانی واضح فرمائے لہٰذا میں اس کی وضاحت کرتا ہوں۔ امام غزالی کے کہے یا لکھے سے قطع نظر جسے اُنھوں نے التوا میں ڈال کر ادھورا ہی چھوڑ دیا، اور قطع نظر اس امر کے کہ کس خاص مقام کی تخصیص ہے، اور نوشتہ جات (تحریر) کی اضافت امری سے قطع نظر محققین کے نزدیک یہ مسلمہ امر ہے کہ نور اپنی ذات میں علم اور وجود سے خود ظاہر

اور دوسروں کے ظہور کا مظہر بنتا ہے، اور یہی تعریف اُن تین مرتبوں پر صادق آتی ہے، یعنی نور وہ ہے جو بذات خود ظاہر اور روشن ہے، اور دوسرے یہ کہ اپنے اسی ظہور کے ضمن میں دوسروں کو ظاہر اور روشن کرنے والا ہے، اور تابعیت کے لحاظ سے دوسری اشیا کی نمائندگی کرنے والا ہے۔ اسی طرح علم خود دانش بھی ہے اور دیگر معلومات کے حاصل کرنے کا سبب بھی۔ اور یونہی وجود خود ہستی بھی ہے اور دیگر موجودات کو ہستی میں لانے والا بھی ہے۔ لہذا اس تعریف کے مطابق یہ تینوں نور کے مراتب و مدارج ہیں۔ اور یہ کلیہ قاعدہ ہے کہ کسی واحد کی جو تعریف بھی ہوگی وہ حقیقت کے موافق ہوگی جیساکہ زید و عمر کہ وہ وہی حیوان ناطق ہیں۔ لہذا ان تین امور کی ایک ہی تعریف کی بنا پر باہم متحد ہیں، اور یہ سب نور کے درجات ہیں۔ وجود بھی نور ہے اور علم بھی نور، اور نور بھی نور ہے۔ نور علم کا نچلا درجہ، اور علم وجود کا نچلا درجہ ہے۔ اور وجود اعلیٰ کے نور کا مرتبہ نور کے سبھی مراتب میں ہے کیونکہ علم اور نور افراد اور وجود سے ہیں، اور وجود ان سب پہ محیط ہے اور نور شہودی کی نسبت نور علم کا مرتبہ بلند تر ہے کیونکہ نور حسی مبصر ہے، اور علم حسی مبصر نہیں جیساکہ اللہ تعالیٰ نے اسی آیت مذکورہ کے آخر میں نور" علی نور فرمایا ہے، گویا اس لفظ سے نور کے انہی بلند اور پست مراتب کی صراحت و وضاحت منظور ہے۔ اگرچہ یہ سب کے سب نور الٰہی ہی کے انوار ہیں لیکن اعتبارات کے امتیاز کے لحاظ سے نور نے اپنے پہ وجود کا اضافہ کرلیا ہے جو سب سے اعلیٰ درجہ ہے؟ اور اس آیت کریمہ میں کہ اللہ جسے چاہتا ہے اپنے نور ہدایت کی طرف راہ دکھلاتا ہے[۵] یعنی وہ وجود مطلق بندوں میں سے جسے چاہے اعتبارات مقیدہ کے پھندے سے نکال لیتا ہے۔ اپنی ذات کے ظاہری اعتبار سے پہلا لازمی معنیٰ اور اوّل مرتبہ نور کا روشن ہونا ہے۔ کیونکہ نور تو ہے ہی روشنی۔ لفظ منوّر کو اگر زیر کے ساتھ پڑھا جائے تو اسم فاعل ہے روشن کرنے والا۔ اور اگر اسے زبر کے ساتھ پڑھا جائے تو اسم مفعول بمعنی روشن شدہ اور یہ تینوں اعتبارات باہم متحد اور ایک ہی ہیں، اور ایک ہی مرتبہ پہ صادق آتے ہیں۔ اور وہی اک نورانی ذات ہے جو خود ہی روشن ہے، اور خود ہی اپنے آپ کو روشن کرنے والی بھی ہے۔ اور خود ہی اپنی روشنی کی ہوئی بھی ہے۔ علم، عالم اور معلوم بھی اسی قسم سے ہے۔ اس مرتبے کی رُو سے وہ خود دانش بھی ہے، اپنے سمجھنے والا بھی، اور خود اپنا جانا پہچانا ہوا بھی ہوتا ہے جیساکہ علم العلم کی حالت میں ہوتا ہے۔ اسی طرح وجود، موجد اور موجود بھی ایک ہی ہیں کہ اپنے وجود ذاتی سے ہستی بھی ہے جو مرتبۂ لابشرط ہے، اور موجودیت اور اکھاڑ پچھاڑ کا منبع ہونے کی بنا پر اپنے آپ کو ہستی دینے والا بھی خود اور مصدری معنوں کے لحاظ سے جو کون و مکان کے مقتضی ہیں آپ ہی اپنے

کو ہستی میں لایا ہوا ہے، اور اس مقام پر کہا جاتا ہے کہ اس عالم موجودات میں ہر جگہ موجود ہے۔ یہ سمجھ لیجیے کہ پہلے معانی ان سہ گانہ مراتب کو جو عین میں ایک ہی ہیں اس کے لفظی معنوں پہ محمول کرنے سے حاصل ہوتے ہیں لہذا اس آیت کریمہ میں آنے والے لفظ "نور" کو اُسی کے ظاہر اور لفظی معانی پہ محمول کیا جائے گا۔ اور اُس سے معناً بھی وہی مراد لی جائے تو معنی یوں گے کہ اللہ تعالیٰ آسمانوں اور زمین کا نور و روشنی ہے اور ان مظاہر میں سوائے اس کے ظہور کے اور ان کی روشنی میں سوائے اُس کے نور کے اور کچھ بھی نہیں جیسا کہ خود اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے۔ اوّل بھی وہی ہے "آخر بھی وہی، ظاہر بھی وہی ہے اور باطن بھی وہی اور ہر شے کے جاننے والا ہے"[۱۵۲] اور دوسرے مرتبے میں اس کے متعدی معنوں میں یعنی اس کے دوسروں کا مظہر ہونے کی حیثیت سے کیونکہ روشن کرنا فعل متعدی ہے، اور اُسے مفعول کی ضرورت ہے۔ ان مراتب میں سے ہر ایک مصدری، فاعلی اور معنوی معنوں کے لحاظ سے ممتاز اور کریم الاصل ہے کیونکہ ہر واحد کا الگ مفہوم اور علیحدہ حلیہ ہے۔ سو علم، عالم و معلوم، وجود، موجد اور موجود، نور منوّر اور منوَر تینوں کے تینوں جدا اور الگ ہیں۔ مثلاً شمع یا شعلہ جو گھر کو روشن کرنے والا ہے خود ایک چیز ہے اور اُس شعلے کا نور ایک دوسری چیز ہے، اور گھر جو روشن کیا گیا ہے ایک علیحدہ چیز ہے۔ اور زید جو عالم ہے خود ایک چیز ہے، اور علم جو اس کی صفت ہے ایک دوسری چیز ہے اور عمر جو زید کا معلوم ہے وہ الگ چیز ہے۔ کتاب کا مصنف جو کتاب کا موجد ہے خود ایک چیز ہے، اور کتاب جو اس کی تصنیف اور وجود میں لائی ہوئی ہے الگ چیز ہے، اور اُس کتاب کا وجود اور صاحب کتاب الگ چیزیں ہیں۔ لہذا آیت معلومہ میں اگر لفظ 'نور' کی متعدی معنوں میں تفسیر کی جائے اور اُسے محمول کیا جائے وہاں پر اس کا مشتق ہونا تو کلمۂ نور سے منظور اسم فاعل ہو گا جو منوِّر ہے (زیر کے ساتھ) جیسا کہ نور السّمٰوات والارض میں ہے تو معنی یہ ہوئے کہ ذات باری تعالیٰ ہی آسمانوں اور زمین کو روشن اور ظاہر کرنے والی ہے۔ صاحب کشّاف کا بھی یہی مفہوم ہے اور حجت الاسلام امام غزالی مصنف احیائے علوم کا بھی یہی ارادہ ہے۔ چونکہ ان دونوں معانی کی پوری وضاحت کی گئی ہے، مغز اور چھلکے کا فرق معلوم بھی ہو گیا ہو گا، اور سمجھ میں بھی آ گیا۔ غالباً امام غزالی کی جو بہت بڑے دانشمندوں میں سے ہیں مراد پہلے معنوں سے تھی جو اس کے لفظی معانی پہ محمول ہے، اور صاحب کشاف نے جو سطحی علما میں سے ہیں دوسرے معنی لیے، اور مشتق معانی پہ محمول کیا، کلام کی حقیقت کو اللہ تعالیٰ ہی خوب جانتا ہے۔ ہر چند کہ امام غزالی کا ظاہری علوم میں بڑے جیّد اور ثقہ

علما میں شمار ہوتا ہے، لیکن اگر کشف و باطن کی نگاہ سے دیکھا جائے تو وہ دیگر باکمال اولیائے کرام کی طرح باطنی علم میں مقربین میں نظر نہیں آتے ۔ ولایت سے انھیں اک کمزور سی نسبت ہے ۔ اور غیب کا علم تو اللہ ہی کو ہے ۔

تنبیہہ

یہ بات ذہن نشین رہے کہ یہ دو معانی جو جار اللہ نے لکھے یا امام غزالی نے جن کا ارادہ کیا ایک اعتبار سے مغزی معانی ہیں اور ایک لحاظ سے سطحی، کیونکہ دونوں کا ظاہر و باطن عین میں ایک ہے، اور ان میں کوئی امتیاز نہیں ۔ امتیاز و اعتبار سطحی ہے کہ سطح یا چھلکا اسی ذات کی اک شاخ ہوتی ہے ۔ لہذا اس کا باطنی مرتبہ جو ظاہری مرتبے کی مانند ہے اعتبار سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا ۔ وہ بھی سطح یا چھلکے میں شامل ہے اور اُس کے بھی وہی معنی ہیں جو سطح یا چھلکے کے ہیں ۔ چونکہ ظاہری اور باطنی مراتب میں وہی حقیقتِ مطلق جلوہ گر ہے اور اُس ایک وجود کے سوا جو واجب الوجود ہے، اور کوئی موجود نہیں ۔ لہذا اسی لحاظ سے ظاہری مرتبے کا شمار بھی حقیقی مرتبے میں ہو جاتا ہے اور اسی کے معنی بھی مغز ہی کے معنی ہیں اور اگر ظاہری اور باطنی امتیاز کا باہمی مقابلہ کر کے یہ کہیں کہ ایک مغزی معانی ہیں اور دوسرے سطحی تو یہ بھی درست ہے اس استدلال کا حاصل مطلب یہ کہ اگر تم باطنی بصیرت پیدا کر سکو تو معلوم ہو گا کہ کائنات کا کوئی ذرہ بھی اس آفتاب عالمتاب کے نورِ حقیقت سے محروم نہیں یعنی کہ اُس حقیقت کا انکشاف ظاہری علم سے نہیں ہوتا ۔ پہلے صفائی قلب حاصل کی جائے اور اہل اللہ کی صحبت کے فیض سے آئینۂ دل کو صیقل کیا جائے، تو اس کے بعد جدھر دیکھو گے اس کی تجلّی کا ظہور نظر آئے گا ۔ اور اس آیت کریمہ کے مطابق "کہ تم جدھر کو رُخ کرو گے اُدھر ہی اللہ کا رُخ پاؤ گے"[۱۵۳] تم پہ مشاہدہ کا دروازہ کھُل جائے گا، اور تمھیں تمھاری ہستی سے بے خبر کر دے گا ۔ (استعارہ) ذرے میں جب آفتاب سے دُوری کا درد اور ہجر و فراق کی جلن پیدا ہوئی تو سر سے لے کر پاؤں تک بے قراری کا مجسمہ بن گیا تو وہ اپنے رب اور خالق کی تلاش میں سرگرم ہو گیا جس سے اس کی نمود اور وجود ہے اور آفتاب سے کمتر درجے کی تمام اشیا سے مُنہ موڑ لیا ۔ جب ذرّے میں اس طرح کی طلب پیدا ہوگئی تو اسے شمسی طالبوں اور سالکوں کی لڑی میں پرو کر اُسے بھی سورج ہی کی طرف جانے یا سفر کرنے والوں

کے زمرے میں شمار کرتے ہیں، اور آفتاب کے طالب اور متلاشی جانتے ہیں۔ اس مقام میں جب ایک ذرہ آفتاب کی محبت میں مبتلا ہو کر آفتاب کی طرف صعود کرے گا، اور اسی کی طرف رجوع کرے گا تو پھر انسان کا عشق جب غلبہ حاصل کرے گا اور اُس کی محبت حدِ کمال تک جا پہنچے گی تو پھر فرط محبت اور غلبۂ عشق کی وجہ سے اُسے اپنے وجود کا ظہور بلکہ تمام اشیا کا ظہور اسی آفتاب حقیقت ہی سے نظر آئے گا، اور تمام کائنات کو اسی نیرّ اعظم کا ظہور سمجھے گا، اور ہر جگہ ظہور شمسی ہی کے مشاہدے سے دوچار ہو گا تو ناچار وہ "ہمہ اوست" کا نعرہ بلند کرے گا اور سوائے جلوۂ دوست کے اور کچھ بھی نہیں دیکھے گا۔ وہ کسی ذرے کو بھی اس سے چھپا ہوا نہ پائے گا، اور دل کے کانوں سے اسی آیت کریمہ کو سُنے گا کہ اللہ کے علم سے کوئی ذرہ برابر چیز بھی غائب نہیں، نہ زمین میں اور نہ آسمان میں بلکہ سب اُس کے علم میں حاضر ہیں۔ اور اس حال میں اُسے نیرّ اعظم کے عشاق اور محبوبوں کے زمرے میں داخل کر لیا جاتا ہے، اور اُسے آفتاب کی فعلی تجلّی کا آشنا و واقف گردانتے ہیں۔ اُس پر آفاق کی سیر و گردش کا دروازہ کھول دیا جاتا ہے، اور اس مقام پر آفتاب سے محبت و دوستی کے الفاظ اس پر راست آتے ہیں۔

چونکہ اُس کی نظر کثرت سے وحدت (واحد) کی طرف مائل ہوتی ہے، یعنی وہ اپنے آپ سے متوجہ ہوتا ہے، اس لیے اس مقام پر جب وہ اپنی حقیقت کو پالیتا ہے، اور اپنے سراپا میں اسی کے نور کا ظہور دیکھتا ہے بلکہ اپنے وجود کو بھی اسی نور سے نورانی پاتا ہے، اور اپنی اصلیت کو پہچان لیتا ہے تو اسی وقت اس سے یہ نعرہ بلند ہوتا ہے کہ میں ہی شمس ہوں، اور وہ ہمہ اوست کا پرچم لہرا دیتا ہے۔ اے ذرّو اپنی خودی کو پہچانو کہ تم خود ہی عین آفتاب ہو۔ دوری اور فاصلہ یکساں ہے۔ قرب و وصل کس کا ہے، وہ تو خود ہم آپ ہی ہیں۔ ہم ہی وہ آفتاب ہیں، ہم ہی وہ عالی جناب ہیں۔ من و مائی یہ تمام کثرت جو تم دیکھتے ہو اسی ذات آفتاب ہی کے علمی امتیازات کی بنا پر ہے جو مستقل اور ثابت موجودات ہیں۔ آفتاب نے ظہور فرما کر مفصل علمی تمیز پیدا کر دی ہے۔ اس مقام پر ذرے کو اپنی حقیقت سے واصل قرار دیتے ہیں، اور اُسے روحانی سیر جانتے ہیں، اور اُسے اپنی ہی ذات میں سرگرداں کہتے ہیں، اس لیے کہ اپنے آپ سے باہر تو کوئی راہ اور گزرگاہ ہی نہیں۔ چنانچہ ایسے ذرے کے حال کی خبر دیتے ہوئے کسی نے کہا ہے کہ ذرہ خواہ بہت نیک خواہ بہت بد ہو اگر عمر بھر تگ و دو کرے تو اپنے آپ کو پالے گا۔ اس حالت میں اس تعلق کے طفیل جو ذروں اور آفتاب میں ہے۔ جس ذرے پر بھی آفتاب عالمتاب کی بے انتہا عنایت ہو جائے تو اُسے اپنی خودی کے اس مقام سے باہر نکال کر کہے گا کہ اے کوتاہ اندیش! تیری حقیقت اس مقام میں مضمر ہے جہاں تک پہنچ گیا ہے، نہ یہ کہ تو خود ہی آفتاب بن بیٹھا

بلکہ تیری اس حقیقت پر تو اُس نور وجود کا ایک پرتو (عکس) ہی پڑا ہے جو اسمائے آفتاب کا اک سایہ ہے۔ کیونکہ اس آفتاب کا ایک اسم نور ہے۔ اس پرتو ہی کو اصلی آفتاب تصور نہ کرلے، کیونکہ اس عکس کا رتبہ تو عرش آفتابی کے تحت ہے جو عبارت ہے روشنی اور آفتاب کے مقتضلے سے۔ پس جب تو اپنی حقیقت کو پاگیا اور اسے اس سائے سے منور دیکھا تو اسمائے حُسنیٰ کے اسی پرتو میں بند ہو کر رہ گیا، لیکن تو کرتے بھی کیا، کیونکہ آفتاب کی راہ میں بہت سے ذرات اسی جگہ بند ہو کر رہ گئے ہیں سوائے اس کے اللہ تعالیٰ خود کوئی دوسری صورت چاہے، چنانچہ اس گروہ کے حال کی خبر مولانا کا یہ شعر دیتا ہے۔ (ترجمہ) وہ خیالات جن میں اولیائے کرام پھنس کر رہ جاتے ہیں وہ خدائی باغ ہی کے حسینوں کا عکس ہے۔ اب آفتاب کے فضل و کرم سے خودی کے اس بھنور سے باہر آ، اور مکمل فنا حاصل کرلے۔ اپنے آپ کو اسی آفتاب کا ذرّہ بنالے اور پھر ذرّے پن کے اس جوئے سے گردن باہر مت نکال اور اُس آفتاب کو حاضر و ناظر جان کر اپنے اوپر دائمی طور پر درخشاں سمجھ، کیونکہ قرآن حکیم میں آیا ہے کہ تم کہیں بھی ہو وہ تمھارے ساتھ ہے۔ بلکہ اس کے نور حضور میں خود کو اس طرح گم کردے کہ تیرا نام و نشان تک نہ رہے جیساکہ اس شعر میں ہے۔ (ترجمہ) کمال یہی ہے کہ تو فنافی الذات ہوجائے، تیرا نام و نشان مٹ جائے۔ جا اور جاکر اُس کی ذات میں گم ہوجا۔ وصال فقط اسی کا نام ہے۔ اس قسم کی حالت کو قرب و نزدیکی، حضوری، شہودی یا وجودی وحدت اور مشاہدہ و واصل بہ آفتاب عقیقی کہتے ہیں اور اس صورت حال (معاملے) کو انفس و آفاق سے ماورائی کیفیت سمجھتے ہیں۔ ملاحظہ ہو یہ شعر (ترجمہ) بلند و پست راہوں کے عبور سے قرب حاصل نہیں ہوتا۔ اُس کا قرب تو اپنی ہستی کی قید سے چھٹکارا پانے یعنی اپنی ہستی کو مٹانے میں ہے۔ مولانا رومؒ کے ان اشعار میں مزید وضاحت دیکھیے کہ بہتر اور بھلا یہی لگتا ہے کہ اپنے محبوب کے اسرار و رموز کو رمز و کنایہ کے انداز میں دوسروں سے منسوب کرکے بیان کیا جائے۔ یا پھر یہ شعر کہ میں نہ تو ظلمت ہوں، اور نہ ظلمت پرست کہ رات اور تاریکی کی باتیں کروں۔ میں تو آفتاب (بمناسبت شمس تبریز) کا غلام ہوں، لہذا میں تو آفتاب اور نور ہی کی باتیں کرتا ہوں۔ (ترجمہ رباعی) ہستی و عدم اسی کے میخانے سے سرشار ہیں۔ امکان و وجوب اسی کے جام مے سے مست ہیں۔ تیری چشم بصیرت اگر حقیقت بین ہو تو موجودات کا ہر ذرّہ اسی کا اک روشندان ہے۔ اس رباعی میں ہستی سے مراد اعتباری وجود ہے اور عدم سے مراد اعتباری عدم کیونکہ خالص وجود اور خالص عدم پر شخصیت کے لحاظ سے کسی چیز کا اطلاق نہیں کیا جا سکتا اور خراب

ہونے سے مُراد ہے مقیدؔ یا قیود میں اسیر ہونا، اور میخانے سے مُراد حضرت وجود مطلق کا ہر شے میں شامل اور ہر چیز کا احاطہ کیے ہوئے ہونے سے، اور لفظ "او" سے مراد وجود مطلق یا ہستی مرتبہ بشرط شئ، اور عدم سے مراد مرتبہ بشرط لاشئ ہے۔ اور لفظ "او" سے مراد مرتبہ لابشرط ہے۔ امکان سے مراد حقائق ممکنہ ہیں، اور وجوب مراتب سے مراد اسمائے حسنیٰ اور صفاتِ خداوندی کا تعین ہے۔ مست ہونے سے مراد اک خاص کیف و سرور سے مسرور ہونا۔ پیمانے سے مراد واجب کا مخصوص تعین ہے چشمِ دل سے مراد عرفانی نور ہے، اور حقیقت بینی سے مراد امور کی ماہیت کو کما حقہٗ پالینے سے ہے۔ ذراتِ خلق سے مراد دنیاوی قیود و سلاسل ہیں، اور روزن (جھروکہ) سے مراد نورِ وجود کی فیض رسانی ہے۔ خانہ سے مُراد فیاضِ حقیقی کے تشخص سے ہے۔ اور اللہ ہی کے لیے ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے۔ اور تمام امور اللہ ہی کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

هوالناصر

شروع اللہ کے نام سے جو نہایت مہربان اور رحم والا ہے

تمام تعریفیں اللہ کے لیے ہیں جو حقائق والی چیزوں کا خالق ہے اور دقائق کے دانوں کو پھاڑنے والا ہے۔ اور درود وسلام ہو اسؐ پر جو تعیین اوّل کی حقیقت ہے، اور جسؐ کی شخصیت اکمل اور افضل ہے اور اُس کی کامل ترین آل پر اور فاضل ترین اصحاب پر۔ امابعد پس یہ وارد ہے تیسرا۔ یہ حقیقت الحقائق سے موسوم ہے۔ پہنچائے اللہ تعالیٰ ہمیں اور تمھیں تحقیق کی حقیقت تک اور دکھلائے ہمیں اور تمھیں اشیا کی حقیقت جیسے کہ وہ حقیقت الامر میں ہے، یعنی جیسے کہ ہوتی ہے چیز اللہ کی تحدید کے ساتھ، اپنے نفس کی حدیں اور وہی تمام اشیا کو محدود کرنے والا ہے، اور ان کا مقدر کرنے والا ہے۔ یہ "اللہ کی حدود ہیں، پس ان سے تجاوز نہ کرو، اور جو تجاوز کرتے ہیں اللہ کی حدود سے پس وہی لوگ ظالم ہیں"۔[۱۵] پس محدود کر دیا اللہ نے موجودات کو اعتبارات اور اضافات کے ساتھ، اور ہر موجود اضافی محدود ہے۔ اعتباری حد کے ساتھ تمام اطراف سے جیسا جسم منقسم ہے تین دُوریوں (لمبائی۔ چوڑائی۔ گہرائی) کے ساتھ۔ اور اُس کے لیے طبعی خیر ہے۔ نہیں ہے مگر یہ کہ اجسام میں سے نہیں ہے کوئی چیز جو اس پر حاوی ہو۔ اس کے حاوی ہو جانے والی جسم کی ظاہری سطح سے اس کے باطن کی سطح چھوتی ہے۔ اُس کا مقام ہوتا ہے آٹھ آسمانوں کی طرح ایسا کہ جس کے اوپر اور کچھ نہیں ہوتا۔ اُس کے لیے جگہ نہ ہے، مکان کوئی نہیں جیسے فلک افلاک ہے کہ جو اطراف کو محدود کرنے والا ہے۔ پس بالکل اسی طرح تمام موجودات کو نیہ ایک درجے کے بعد دوسرا درجہ،

درجات کے تفاوت کے ساتھ اضافی مخصوص مقام میں اور مکان معین اعتباری میں اور حق جو ہے وہ ہے جو مکان میں نہیں ہے، اور نہیں لاحق ہوتی اُسے حد امتیازی تفوق کی جانب سے، اور ممتاز ہوگیا ہے موجوداتِ ممکنہ میں سے نیچے کی جانب کے اعتبار سے، اور وہ مرتبۂ لاتعین ہے اور اطلاق کی جگہ پر ہے۔ بیان کے لحاظ سے اور استعارے کے لحاظ سے۔ اگرچہ وہ ذات اور حقیقت کے لحاظ سے وراء الوراء ہے، پھر وراء الوراء ہے۔ اور اللہ کے ورا کوئی منتہا نہیں ہے۔ اور بے شک تیرے رب کی طرف منتہی ہے۔ اور جان لے کہ اشیا کی حقیقتوں کی معرفت وہ اس کی حدُود اور رسوم کی معرفت ہے کیونکہ تمام اشیا دو قسموں پر منحصر ہیں مرکبات اور بسائط (مفردات) پس مرکب اشیا کی حقیقتوں کا جاننا موقوف ہے ان چیزوں کے جاننے پر جو مرکب ہیں ان میں سے۔ مثلاً جب کہا جائے کہ گوندھی ہوئی مٹی کی حقیقت کیا ہے۔ پس کہا جائے گا پانی اور مٹی ملے جلے، اور اسی طرح سکنجبین میں سرکہ اور شہد ملے ہوتے ہیں۔ اور اسی طرح پر مرکب (ترکیب شدہ) اور مولّف چیز (تالیف شدہ) پہچانی جاتی ہے۔ جہاں تک اشیائے بسیطہ کا تعلّق ہے پس جانی جاتی ہیں ان کی حقیقتیں صفات اور خوبیوں کے جاننے سے جو ان کے ساتھ مخصوص ہوتی ہیں۔ مثلاً اگر کہا جائے کہ عقل کیا ہے تو کہا جائے گا مجرد جوہر جو پالیتا ہے تمام کلیات کو جو جسم کے ساتھ متعلق ہیں، اور اسی طرح نفس ناطقہ جوہر مجرد ہے جو پالیتا ہے کلیات اور جزئیات کو، اور اُس کا تدبیر اور تصرف کا تعلّق ہوتا ہے جسم کے ساتھ اور علیٰ ہذا القیاس۔ پس چیز کی حقیقت جو ہے وہ وہ معنی ہیں کہ جن کا جاننا ممکن ہو یا جن کے بارے میں خبر دی جاسکے، اور موجود کی حقیقت وہ معاملہ ہے جسے حواس خمسہ میں کوئی حس پالے یا وہم اس کا تصور کرسکے یا دلیل اس پر رہنمائی کرسکے۔ وجود کو موسوم کیا جاتا ہے ایس (ہستی) سے، اور عدم کو لیس (نیستی) سے۔

موجودات کے وجود کے بیان کا باب

وجود جس کے معنی ہستی کے ہیں، ہویت کے لحاظ سے اس سے حاصل مصدری مراد لی جاتی ہے اُسے چھتا چھیٹی اور موجود ہونے کا منبع بھی کہتے ہیں، اور یہ مرتبہ تمام مثبت اور منفی اعتبارات و نسب سے مبرا ہے۔ اگرچہ تمام نسبتیں اس کے سوا اور کسی سے منسوب بھی نہیں کی جاسکتیں، کیونکہ اگر فقط سلبِ اعتبارات کو سامنے رکھیں تو منفی معانی کا مقیدّ ہوجاتا ہے، کیونکہ مرتبہ بشرط لاشیٔ ہے، اور اگر فقط مثبت

اضافات سے منسوب کریں تو مثبت معانی کے لیے مخصوص رہ جاتا ہے جو مرتبہ بشرط شئ ہے اور ایسا نہیں ہے بلکہ وہی ہے جو تمام تعریفوں میں شامل ہے، اور وہی ہے جو تمام صفتوں سے مبرا ہے، لہذا ان مثبت اور منفی معانی کے ایک ایک اعتبار سے تمام سے مبرّا ہے، اور مجموعی طور پر دیکھا جائے تو تمام میں شامل اور اسی مرتبے کو مرتبہ بلا شرط شئ اور مرتبہ لابشرط کہتے ہیں۔ اور اعتبار اس چیز کے بارے میں جو اس میں ملاحظہ کی جاتی ہے؛ اور اس کا وجود نہیں ہے جو خارج ہو اس چیز سے، بلکہ وہ حیثیت ہے اس کی حیثیّات میں سے جس کا اعتبار ذہن میں کیا جاتا ہے، اور اُس کی غیریت اس چیز سے مفہومیت میں ہے اور اُس کی عینیّت وجودیت میں ہے۔ پس وہ موجود جو موجودیت سے ہے وہ چیز کی ذات کے مقام پر ہے، اور موجودات سب کے سب اعتبارات اور اضافات ہیں جس میں جس کی تعبیر کی جاتی ہے اور جس میں اضافت کی جاتی ہے اور جس سے چیز کو ممیّز کیا جاتا ہے اور جس سے اخذ کیا جاتا ہے اگرچہ وہ تمام نسبتوں سے بے نیاز ہو۔ لفظ وجود کا اطلاق وجود ظلّی پر بھی کیا جاتا ہے جو مصدری معنوں میں بنتا اور حاصل ہوتا ہے۔ امرِ منتزع بھی یہی ہے کیونکہ اسی مبدا و منشا سے سب کچھ کھینچا جاتا ہے، لہذا عبارات کے ہر معانی کو اس کے مناسب مقام پر محمول کرنا چاہیے، اور بے فائدہ الجھاؤ میں نہیں پڑنا چاہیے۔ پس سمجھ لو وہ اکثر مواقع پر زائل ہو جاتا ہے۔ اور اعیان، عین کی جمع ہے جو حقیقت کے معنوں میں آیا ہے اور صوفیا اپنی اصطلاح میں اُسے حقائقِ موجودات، علمی صورتیں، اللہ تعالیٰ کی صور علمی اور مرتبۂ وحدت کہتے ہیں۔ حکما انھیں ماہیات کہتے ہیں، اور حقائق جو ہیں مخفی خزانے کی چابیاں ہیں۔ وہ خزانہ کہ جب چاہا کہ جان لیا جائے۔ پس اُس نے بنایا مخلوق کو، پس نہ ظاہر کیا ان مظاہر میں وہ جنھیں مفاتیح (چابیوں) سے تعبیر کیا گیا ہے، سوائے ایک معاملے کے جو کہ وجود خالص ہے۔ پس ان دونوں نے (یعنی صوفیا اور حکما نے) دیکھا واحد ذاتیہ کی طرف جسے تعبیر کیا گیا۔ اور کثرتِ صفاتیہ اور کثرتِ اسمائیہ پر مشتمل ہونے کے اعتبار سے اُسے خزانے سے تعبیر کیا گیا ہے۔ پس تجلیاتِ ظاہرہ، حقائق موجودہ اضافیہ میں کھلے خزانے ہیں جسے حق سبحانہٗ تعالیٰ نے کھولا اور ماہیاتِ معدومہ اعتباریہ مخفی خزانے ہیں جس کے دروازوں کو حق تعالیٰ نے بند کر رکھا ہے۔

اُس کے پاس غیب کی چابیاں ہیں، اور جن غیبوں کو سوائے اس کے کوئی نہیں جانتا۔[۱۵۵]

ماہیت کی حقیقت کے فائدے کا بیان

اور اس کے جعلی یا جعلی نہ ہونے پہ تحقیق

کسی چیز کی حقیقت اور ماہیت عبارت ہے اس امر سے کہ جو کچھ وہ ہے وجود و عدم سے قطع

نظر یہی اس کا خالص مفہوم نظر آتا ہے۔ وہ شے خواہ موجود ہو یا معدوم ایک برابر ہے کیونکہ موجودیت اور معدومیت کی حقیقت بھی دیگر تمام حقائق کی طرح ایک مفہوم سے زیادہ نہیں۔ اور ہر حال میں یعنی اپنی موجودیت یا اپنی معدومیت کے وقت کوئی ماہیت اپنے خصوصی مرتبے سے باہر نہیں نکلتی۔ یہ وجود کی ذات ہی ہے جو اپنی خصوصیت کے راستے خالص کے ان معانی کو (جن کی تعریف نامعلوم ہے) اپنے ظہور کے دوران میں ظاہر کرتا ہے۔ ان حقائق میں سے بعض کو مثبت نسبت کے تحت لا کر اپنے مرتبہ بشرط لا شیٔ کی تجلی کہا ہے اور نمائندہ بنا کر نسبتی وجود ظاہر کرتا ہے اور بعض کو منفی نسبت کے تحت لا کر اپنے مرتبہ بشرط لا شیٔ ظاہر کرتے ہوئے اسے نیستی ظاہر کرنے والا گردان کر اعتباری معدوم سمجھتا ہے۔ ان واضح علامات اور روشن تجلیات کے مشاہدے سے عارفوں کے دلوں پر وہ راز اور حقائق کھلتے ہیں جو اس آیت کریمہ کا حاصل ہیں کہ اے صاحبِ بصیرت لوگو تمہارے لیے مقامِ عبرت ہے[۱۵۶]۔ حاصل کلام یہ کہ جب یہ بات مسلّم ہے کہ کسی مفہوم کی ماہیت اس کے ذاتی اجزا سے مرکب ہے جنھیں جنس و فصل (ہم جنس اور غیر جنس) کہتے ہیں اور مفہومیت کے لحاظ سے مشترکہ اور متمیز ترکیب رکھتے ہیں اور فی نفسہٖ یہ ترکیب جعلی ہونے کا تقاضا کرتی ہے خواہ یہ تقاضا اس کی اپنی طرف سے ہو، خواہ کسی اور کی طرف سے۔ پس ماہیتوں میں ایک اپنا ذاتی جعلی پن ہوتا ہے۔ ماہیت کی اسی طرزِ ترکیب کو خالص کہنا اور فلسفیوں کی طرح اسے جعل کے بغیر بیان کرنا کچھ وحشت انگیز اور کھردرا سا بیان ہے، اور اسلامی روش سے بھی جداگانہ ہے۔ اگر اچھی طرح سمجھ لیا جائے اس میں بھی کوئی ناجائز بات نہیں۔ لیکن عوام مطلب نہ سمجھنے کی وجہ سے شکوک و شبہات میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور حقیقت کا سُراغ لگانے سے قاصر رہتے ہیں۔ اور اس سے کچھ اور ہی سمجھ لیتے ہیں جو اس کی اصل مُراد نہیں ہوتی، یعنی ماہیات کا بغیر تخلیقی عمل کے موجود ہونا ماہیت کے اصل مفہوم کی تحقیق نہ کرنے کے سبب سے ہے۔ حق بات یہ ہے کہ چونکہ فاعلیت تو اسی واجب الوجود حق تعالیٰ سے مخصوص ہے اور ممکن الوجود حقائق کے نصیب میں سوائے جمود و بے حرکتی کے اور کچھ نہیں۔ ماہیات کی تصدیق و ثبوت کو بھی خود بخود ان کے نفوس کے اندر نہیں سمجھنا چاہیے بلکہ اس کے جعلی پن کو حق سبحانہٗ تعالیٰ ہی کی طرف سے سمجھنا چاہیے اور ایسے مرکب کو علم الٰہی ہی کی ترکیب کہنا چاہیے خواہ کسی موجود ماہیت کی ترکیب منظور ہو، خواہ ماہیت کے اجزا کی ترکیب ملحوظ ہو۔ یہ تحقیق بڑی گہری جامع اور شامل ہے۔ متکلم اور حکیم کے انداز سے ماورا ہے (مراد متکلمین اور حکما) اور اُسے نہیں سمجھ پاتا سوائے اس کے جسے اللہ تعالیٰ نے قلبِ سلیم دیا ہو۔ یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ جس طرح ماہیت کا تصوّر (ہم جنس اور غیر جنس) کی ترکیب سے حاصل ہوتا

ہے، اسی طرح ماہیت کی تصدیق بھی ہر ماہیت کی نامعلوم کیفیت اور خود ماہیت کو باہم ضم کرنے سے حاصل ہوتی ہے، جس سے اس کی موجودیت یا معدومیت کا پتا چلتا ہے، اور کہا جاتا ہے کہ فلاں ماہیت موجود ہے اور فلاں معدوم۔ ماہیات سے اس یقینی نسبت کے منسوب ہونے کا سبب اور ان مناسبتوں اور نسبتوں کے باہم جمع ہونے کی وجہ تو وہی شہنشاہ حقیقی جانتا ہے جس کی شان بلند اور احسان عام ہے ہر جگہ اسی کا حکم چلتا ہے، اور سب امور اسی کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ اس امر کی اصل حقیقت جو احکام الٰہی اور شرع کے عین مطابق اور موافق ہے، ہم نے وجود و موجودات کی شرح والے باب میں لکھی ہے جس کا عنوان یہدی اللہ ہے، لہٰذا اس یقینی نسبت اور وجود ماہیت دونوں کا علم ہوجائے تو محکوم علیہ (جس کا یقین کیا جائے) کو موجود ذہنی یا معلوم ذہنی کہتے ہیں۔ اور اگر ماہیت کے تصوّر کے ساتھ اس کا تشخص بھی معلوم ہوجائے تو پھر محکوم علیہ کو موجود خارجی یا معلوم خارجی کہتے ہیں۔ اس مقام پر نسبت و مناسبت کے ان اعتبارات کے لحاظ سے وہ یقینی نسبت یا جس کو نسبت دی گئی ہے یا جس سے نسبت دی گئی ہے، سب امتیازی نسبت کے رنگ میں رنگے ہوئے ہوں گے، اور اپنے تشخصات یا ذاتوں کے لحاظ سے اس مقام پر ان تینوں کے باطن اس ایک لااعتباری حالت میں ہوں گے، اور حقیقت یہ ہے کہ فقط اللہ جلّ شانہ وعمّ نوالہٗ کی واحد ذات ایسی ہے جس کا وجود اس کی عین ماہیت ہے۔ یہ اُسی کی ہستی کا نور ظہور ہے جو نسبت و مناسبت اور مراتب میں جلوہ افروز ہے۔ پس اُس نے ظاہر کیا جو ظاہر کیا اور چھپایا جو چھپایا۔ اُس سے نہیں سوال کیا جاتا جو وہ کرتا ہے، اور لوگوں سے سوال کیے جاتے ہیں۔

حق سبحانہٗ تعالیٰ کی ذاتِ واجب کے وجود کی عینیّت کے بارے میں تنبیہ اور امرِ حق اور راہِ ہدایت کا بیان

تمام فلاسفہ اور صوفیا، وحدت الوجودی ہوں یا وحدت الشہودی، اس بات پر متفق ہیں کہ وجود بمعنی جس سے موجودیت کی شناخت ہوسکے، تو وہ پھر ذاتِ باری تعالیٰ ہے لیکن متکلمین وجود کے حقیقتِ حق تعالیٰ سے مختلف ہونے کے قائل ہیں اور ذاتِ باری تعالیٰ سے الگ ہونے کو جائز نہیں سمجھتے۔ اگر وہ اپنے کلام کے ماحصل کو سمجھیں، تو یہاں وجود کے ان مصدری معنوں سے مراد ہے جو کائنات میں ہر جگہ شامل ہے نہ کہ اس کے وہ حاصل مصدری معانی کہ وہ ہر چیز کا منبع و مبدا ہے، ورنہ وجود کا بلحاظ

ماہیت ذاتِ باری تعالیٰ سے الگ ہونا کسی طرح بھی صحیح ثابت نہیں ہوتا، کیونکہ واجب جو موجود ہے اس کی حقیقت جو وجود سے الگ چیز ہے، وجود میں موجود ہے یا وجود اس کی حقیقت سے موجود ہے، اور اگر آپ یہ کہیں کہ وجود ذاتِ واجب کی وجہ سے موجود ہے اور معانی کی یہ دونوں صورتیں غلط اور ناقابلِ قبول ہیں، کیونکہ اگر آپ یہ کہیں کہ حق تعالیٰ کی ذات وجود کی وجہ سے موجود ہے تو یہ صریحاً کفر ہوجاتا ہے، کیونکہ اس کی ذات اپنے علاوہ کسی غیر کے وسیلے کے بغیر موجود ہے، اور اگر آپ کہیں کہ وجود ذاتِ واجب کی بنا پر موجود ہے تو یہ بھی محال ہے (خلافِ امر ہے) کیونکہ اس صورت میں وجود کے مفہوم سے مراد وجود نہیں رہتا۔ پس ثابت ہوا کہ وجود ہی عینِ حقیقت ہے اور اس کے مصدری معانی کو جو کہ اس کی پہلی صفت ہے، فلاسفہ اور صوفیا بھی عین ذات نہیں کہتے، اور حق بات یہ ہے کہ ذات الوجود کی پہلی صفت موجودیت ہے، اور سب دانشوروں نے یہی نتیجہ نکالا ہے اور بلا شک و شبہ سبھی اس پر متفق ہیں۔ یہاں تعصب سے کام لینا غلطی ہے اور خواہ مخواہ تنازعہ کھڑا کرنا بے جا ہے۔ حضرت مجدد الف ثانی رح نے اسی مفہوم کو سمجھانے کے لیے اپنے مکتوبات کے دو سو چونتیسویں (۲۳۴ ویں) مکتوب میں بڑی تفصیل سے تحریر کیا ہے جو انھوں نے مخدوم زادہ شیخ محمد صادق کے نام لکھا۔ فرماتے ہیں: عزیز مکرم کو معلوم ہونا چاہیے کہ حق تعالیٰ کی حقیقت وہ وجودِ خالص ہے جس میں کوئی اور شے ضم نہیں، اور حق تعالیٰ کا وہی وجود ہر خیر و کمال کا منبع اور ہر حُسن و جمال کا مبدا ہے۔ یہ ایک حقیقی مفرد ہے اور ایسا مرکب ہے جس کی ترکیب میں باطنی یا خارجی طور پر کسی اور جزو کی سمائی کی گنجائش نہیں، اور حقیقت بھی اس صورتِ حال کے مانع ہے اور ذات حق تعالیٰ ہی پہ محمول ہے، رقابتاً نہ کہ اشتقاقاً۔ ہر چند کہ اس مقام پہ دراصل اس نسبت کی بھی گنجائش نہیں، کیونکہ تمام نسبتیں وہاں آکر ساقط ہوجاتی ہیں۔ اور وہ وجود جو عام اور مشترک ہے، اس خاص وجود تبارک و تعالیٰ کے سائے سے ہے اور یہ سایہ اللہ تبارک و تعالیٰ کی ذات پہ محمول ہے، اور اشیا پہ شک و شبہ کی راہ سے رقابتاً نہیں، بلکہ اشتقاقاً محمول ہے۔ اور اس سائے سے مراد وجود باری تعالیٰ ہے۔ نزولی مراتب میں اور اُس کے مفردات میں سے سب سے اوّل، اعلیٰ اور مقدم مفرد سایہ ہے جو ذات حق تعالیٰ پہ محمول ہے اشتقاقاً۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ کو اصلیت کے مرتبہ میں وجود کہا جا سکتا ہے نہ یہ کہ اللہ تعالیٰ موجود ہے۔ اس ظلی مرتبے میں اللہ تعالیٰ موجود صادق ہے نہ کہ وجود حق۔ پس اس تحریر سے یہ معلوم ہوا کہ وجود بھی وہی ہے اور موجود بھی وہی اور

یہ امتیاز مراتب کے اصلی اور ظلّی اعتبارات سے ہے، اور اس عبارت سے متعلق جو کچھ لکھا گیا ہے چونکہ فلسفیوں اور صوفیوں کے گروہ جو وجود کی عینیّت کے قائل ہیں اور اس فرق کی حقیقت کا سراغ نہیں لگا سکے، اور سائے کو اصل سے جدا نہ کر سکے، اس لیے انھوں نے ان کے اشتقاقی اور رقابتی دونوں کا ایک ہی مرتبہ ثابت کیا ہے۔ اور اشتقاقی لحاظ سے محمول کرنے کی تصحیح میں بڑے تکلف اور تحمل سے کام لینا پڑا جیسا کہ محقق ہو گیا اللہ تعالیٰ کے الہام سے۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ کے نزدیک فلاسفہ اور صوفیا سے مراد وہ لوگ ہیں جو ان اعتبارات و امتیازات کو رفع کرکے حفظِ مراتب کو ملحوظ نہیں رکھتے، اور بے ادبی کے الفاظ مُنہ سے نکالتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ جاہل قسم کے فلسفہ دانوں اور غافل قسم کے صوفی منش لوگوں کی اکثریت اس قسم کی ہے ورنہ حمل اشتقاق اور حمل رقابت نیز وجود کے مراتب اور حیثیات کے فرق کو نہ سمجھنے کا محقق فلسفیوں اور صوفیوں پر اس کا احتمال نہیں، کیونکہ وہ باوجود اس کے کہ وجود کو بھی امر واحد سمجھتے ہیں، پھر بھی اس کے دو معنی لیتے ہیں۔ ایک بمعنی مبداء انتزاع اور دوسرے بمعنی امر منتزع اور عینی اور ظلّی وجود کے قائل ہیں۔ چونکہ حضرت مجدد الف ثانیؒ کا پختہ ارادہ مراتب کے ثابت کرنے اور کمالاتِ نبوت کے اظہار کا تھا، اُس کے امتیاز کی خصوصیت کو خود سے منسوب کیا ہے اور اتحاد کی حقیقت بھی ان کی نظر سے پوشیدہ نہیں، جیسا کہ وہ اُسی مکتوب میں لکھتے ہیں کہ اس فقیر نے اپنی کتابوں اور رسالوں میں عینیّت وجود کی ہر جگہ نفی کی ہے اس سے وجود ظلّی مراد لینا چاہیے جو اشتقاق سے محمول کرنے کی تصحیح کرنے والا ہے، اور وجود ظلّی کی جس طرح اُنھوں نے صراحت کی ہے اس کا ذکر اوپر آچکا ہے، یعنی حضرت وجود کے ظہور کے سایہ سے واجب تعالیٰ کی عین حقیقت سے نزولی مراتب مراد لی ہے۔ پس ہر چند کہ کسی شے کا ظہور اُس سے الگ شے کے اعتبار سے ہے لیکن عینیت کے لحاظ سے وہی شے ہے۔ مثلاً نور ایک الگ امر ہے، اور اُس کا ظہور ایک الگ امر۔ لیکن ظہور بھی تو عین نور ہی ہے۔ اے دوستو! ذرا سوچو، انصاف سے کام لو۔ سمجھ لینا چاہیے کہ اپنے بزرگوں کے کلام کو جو حق اور واقعیت کے مطابق ہو، اسے اس طرح بیان کرنا بہتر ہے جس سے منکروں کے شکوک و شبہات رفع ہو جائیں اور حق بات کا بیان بھی ہو جائے، یا ایسے ڈھنگ سے بیان کرنا بہتر ہے کہ مزید شکوک و شبہات کا باعث بن جائے اور ہو بھی امر واقع کے خلاف۔ واہ سبحان اللہ! مُلّا بننا کتنا آسان، مگر انسان بننا کتنا مشکل کام ہے ؎

اعتدال کی سیدھی راہ کی طرف رہنمائی جو توحید محمدی کی سیدھی راہ ہے

یہ مطالب جو تائید و توفیق ربانی سے لکھے گئے اور جن سے حقیقت حال کھل گئی، دوئی کو اُٹھالیا گیا اس کا کوئی حاصل نہیں ہے۔ اس کو ان معنوں میں نہ لیا جائے جو ملحدوں اور مشرکوں کے بے معنی اور لایعنی کلام سے نکلتے ہیں اور وہ بلا سوچے سمجھے "ہمہ اوست" کے الفاظ زبان پر لے آتے ہیں، اور حسی مشاہدات کے اسیر ہیں، اور انھوں نے اپنی تمام تر توجہ اور رجوع اس حضرت عالم الغیب کی طرف نہیں کیا جو تمام مراتب اور اعتبارات سے ماوراء ہے اور توحید کے بہانے سے چاہتے ہیں کہ وہ اپنے لیے سہولت اور آزادی حاصل کر لیں اور وہ درخشاں شرع دین متین سے محروم اور بے بہرہ ہیں، اور کمالات نبوت کے خصوصی قرب سے محروم رہ گئے ہیں اور اپنے طبعی ذوق اور نفسانی لذتوں ہی میں مگن ہیں۔ اور اصل سے حجاب میں رہتے ہوئے سائے ہی کے پابند ہیں اور حق تعالیٰ کے مشاہدے کو فقط انھی دنیوی مظاہر سے جانتے پہچانتے ہیں اور وہ ان الہامات و عنایات سے نا آشنا ہیں جو ان حواس و قویٰ کی وساطت کے بغیر حق تعالیٰ اپنے بندوں کو عطا کرتا ہے۔ ایسا نہیں ہرگز نہیں، بلکہ ہماری مُراد مرتبۂ وجود کی یگانگت اور شرک حقیقی سے نفرت اور اُس توحید کی طرف دعوت دینا ہے جس کی حضور پیغمبر علیہ السلام نے دعوت دی ہے۔ چونکہ ظاہر بین علماً اہل حقیقت کے حکم کو سنتے ہیں، یا ان کی کتابوں کو پڑھتے ہیں، لیکن ان کے صحیح مطالب کو نہ پا کر بات کی تہ کو نہیں پہنچتے۔ اس طرح اُنھیں دوئی کا منکر سمجھتے ہیں حالانکہ یہ بزرگوار حضرات اس حقیقی دوئی کی نفی کرتے ہیں جس کی طرف کلمہ طیبہ اشارہ کرتا ہے کہ وہ واحد ہے۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہ وحدہٗ لاشریک ہے۔ اور اعتباری دوئی کو رفع کرتے ہیں، اور توحید حقیقی بیان کرتے ہیں جو ذات الوجود کی وحدانیت ہے، نہ یہ کہ موجودات کو اس کے ساتھ شریک کر کے اس کے ساتھ متحد کرتے ہیں، کیونکہ یہ معنی تو متعدد وجودوں کی صورت ہی میں لازم آتے ہیں، نہ کہ موجودات کی کثرت کے سبب سے! جان لو کہ اس بات کو کج طبع عام اور بے حقیقت درویش نہیں سمجھ سکتے اور اس کلام کے ماحصل تک نہیں پہنچ سکتے۔ نہ ہی مراتب ظاہرہ کے اثبات اور اظہار دوئی کے سلسلے میں ہماری عبارات سے مراد وہ لی جائے جو حقیقت سے محروم مُلّا لوگ لیتے ہیں اور مکمل جہالت کا ثبوت دیتے ہوئے شرک کو ثابت کرتے ہیں اور خالق اور مخلوق کی مغائرت (غیریت) کو عمارت اور معمار کی مغائرت بتاتے ہیں۔ حق سبحانہ تعالیٰ بلند ہے اُس

سے بہت زیادہ بلند ۵ــــ ان دونوں بیانات سے وہ تیسری شق بھی مراد نہ لی جائے، جو مراد کہ بعض صوفیا خالق و مخلوق میں "نہ عین ہے نہ غیر ہے" کے قائل ہو کر لیتے ہیں اور عام لوگ اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات کے بارے میں جو نسبت ثابت کرتے ہیں، وہ خالق و مخلوق کے مابین اسی نسبت کو لے آتے ہیں عین کی وجہ سے اور غیر کی وجہ سے۔ **سوال** اس بیان سے معلوم ہوا کہ خالص محمدیوں کا حاصل کلام یہ ہے کہ وہ تو دوئی کی نفی کرتے ہیں اور نہ اس کا اثبات، نہ ہی ان دونوں کے بین بین کسی امر کے قائل ہیں جیسا کہ بعض صوفیا بیان کرتے ہیں یعنی ایک اعتبار سے خلق غیر حق ہے، اور ایک لحاظ سے عین حق، تو پھر وہ چوتھی شق کون سی ہے جو ان تیز بینوں کی مراد ہے کیونکہ ان تینوں تقسیموں کا تو کچھ عقلی گھیراؤ سمجھ میں آتا ہے، لیکن چوتھی تقسیم کی گنجائش ذہن میں نہیں آتی۔ **جواب** ہم نے دُوئی کی نفی کرتے وقت یہ پابندی لگائی تھی کہ اس سے وہ مراد نہ لینی چاہیے جو ملحدوں اور مشرکوں کے بے سروپا کلام سے حاصل ہوتی ہے، یعنی جہاں کہیں ہمارے کلام سے دوئی کی نفی سمجھ میں آتی ہے، اس سے ہمارا مقصود عینیّت کے دوسرے قائلوں کی طرح ماہیتِ ممکن اور ماہیتِ واجب کا اتحاد نہیں اور عینیت کا نتیجہ عبد و معبود نہیں بلکہ ہماری مراد تو حضرت وجود کی فی ذاتہ یگانگت ہے کہ وجود کے معنی وجود واحد ہے اور اس مقام یا مرتبے پر کثرت کی تجویز عقلی یا نقلی کسی راہ سے بھی درست نہیں، جیسا کہ آیات قرآنی اور احادیث نبوی اور عقلی دلائل سے استفادہ کر کے لکھا گیا ہے۔ دُوئی کے اظہار کے بارے میں ہم نے لکھا ہے کہ اسے اُس طرز پر نہ سمجھا جائے جیسا کہ حقیقت سے بے بہرہ مُلا سمجھتے ہیں، یعنی ہمارے کلام میں جہاں کہیں بھی دُوئی کا اثبات ظاہر ہو۔ اس سے دوئی کے دوسرے قائلوں کی طرح وجود کے تعدد (متعدد وجودوں) سے نہیں، اور نہ ہی نزعتِ ۔ ود ملحوظ ہے، بلکہ ہمارا مقصود تو ماہیات کی وہ ذاتی غیریت اور اجنبیّت ہے جو مفہومات سے زائد اور کچھ نہیں اور نہ ہی وجودی مرتبے میں شرکاء کا اقرار۔ اے اللہ میں تیری پناہ میں آتا ہوں اس بات سے کہ تیری ذات میں کسی کو شریک کروں ۵۔ عین کی وجہ سے اور غیر کی وجہ سے والی اس تیسری شق کے بیان کرتے وقت ہم نے لکھا کہ اسے وہ قسم نہ سمجھ لیا جائے جس کے بعض صوفیا خلق و خالق کے مابین لاعین ولا غیر کی نسبت کے قائل ہیں کیونکہ ان صوفیا کے کلام کے طرز تحریر سے تو اسی موجودات کی موجودیت ہی محسوس ہوتی ہے اور یہی سمجھ آتی ہے کہ وجود حق بھی انہی افراد میں ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ جو کچھ مشاہدے میں آتا ہے وہی موجود ہے۔ اُسے ایک اعتبار سے حق اور ایک اعتبار سے خلق کہہ سکتے ہیں، ہم محمدیوں کا

ماحصل یہ نہیں، بلکہ باوجود اس کے کہ سوائے اس کے اور کوئی موجود ہے ہی نہیں۔ وہ ذات باری تعالیٰ ان حقائق ممکنہ سے ماوراء ہے۔ "وہ ذاتِ واحد ہے۔ اُس کا کوئی شریک نہیں، اور وہ ہر شے پر گواہ ہے ۱۰ ؎"

الغرض توحید محمدی کے اسرار و رموز کی تحقیق جس سے خالص مومنین ہی سرفراز ہوتے ہیں بہت دقیق اور کہی سنی باتوں سے بہت بلند و بالا ہے۔ اس کا انحصار انتخاب و تائید پر ہے۔ تمام شکوک و شبہات سے معرا اور ساری تقریروں اور توجیہوں سے مبرّا ہے۔ سب سے بہتر بیان فقط اسی قدر ہے جتنا کہ خدا اور رسولؐ نے فرمایا ہے اور مخلص محمدیوں کی بھی وہی دعوت ہے جو اُن کے پیغمبرؐ نے دی ہے اور وہ توحیدِ حقیقی کے انکشاف کے امیدوار رہتے ہیں، اور کسی قسم کی من گھڑت باتیں پیش نہیں کرتے۔

محمدی اصطلاحات

چونکہ خالص محمدیوں نے (ان سب پر خدا کی رحمت ہو) قرآن مجید اور احادیث نبوی میں لفظ وجود کا اطلاق ذات باری تعالیٰ پر کہیں نہیں پایا، اور یہ لفظ وجود اسمائے حسنیٰ میں سے بھی نہیں ہے لیکن ان اصطلاحات کی مکمل متابعت کرتے ہوئے ہم نے وجود کی بجائے لفظ نور کا استعمال کیا ہے اس کے دونوں معانی یعنی مصدری اور حاصل مصدری معنوں میں کیونکہ نور اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ میں سے ہے۔ قرآن شریف میں بھی یہ لفظ آیا ہے۔ نور سے مراد وجود ہے کیونکہ نور اور وجود دونوں کی تعریف ایک ہی ہے کہ وہ فی نفسہٖ ظاہر اور غیر کے لیے مظہر ہے۔ پس اگر مرتبہ بشرط شئی ملحوظ ہو تو نور مستقل کہتے ہیں۔ اور اگر مرتبہ بشرط لاشئی منظور ہو تو نور جاذب کہیں گے اور اگر اطلاقی حیثیت اور مرتبۂ لابشرط مقصود ہو تو نور الانوار کہیں گے۔ نور صفت کو بھی کہتے ہیں جیسا کہ وجود مصدری معنوں میں بھی آتا ہے اور صفات کو انوار بھی کہتے ہیں۔ ان ثابت اور جاذب صفات کے مجموعے کو انوار مطلقہ، ثابت انوار کو انوارِ ثابتہ، اور جاذب صفات کو انوارِ جاذب کہتے ہیں۔ اس قسم کی اصطلاحات طریق محمدی کی خصوصیات میں شمار کی جاتی ہیں جو اس ذات حق سبحانہ نے حضور نبی کریم صلعم کے فیض کے صدقے مجھ بندۂ ناچیز پر منکشف کی ہیں۔ جس نے ان تمام سے الگ ایک نئے علم یا درحقیقت ایک پرانے علم کی نئے سرے سے بنیاد رکھی کیونکہ فلاسفہ، صوفیا اور متکلمین میں سے ہر کسی نے انہی موجود مفردات کو سامنے رکھ کر گفتگو کی اور ان سے طاری ہونے والے حالات کو بیان کیا ہے۔

پس اس فقیر حقیر نے قرآن مجید اور احادیث پیغمبرؐ سے جو کچھ ان معانی کے واضح طور پر مطابق تھا اخذ کر کے یا جو کچھ مجھے قرائن اور التزام سے معلوم ہوا اکثر و بیشتر اصطلاحاتِ محمدیہ کو سپردِ قلم کیا ہے اور ان کے استخراج کی راہ بھی کھول دی ہے۔ صوفیوں کے لیے لازم ہے کہ وہ ان اصطلاحات کو استعمال میں لائیں اور دوسروں کی بحثوں سے کوئی سروکار نہ رکھیں، اور سب کے من گھڑت لفظوں سے بے نیاز ہو جائیں، اور پیغمبرؐ اسلام کی مکمل متابعت کی راہ اختیار کریں جسے اللہ ہدایت دے وہی ہدایت یافتہ ہے۔ اور یہ سمجھ لینا چاہیے کہ نور کے مقابل میں تاریکی ہے جیسا کہ عدم کا مقابل لفظ وجود ہے۔ لہذا عدم کو ظلمت کہتے ہیں، اور اعتباری عدمات کو ظلمات جیسا کہ قرآن پاک میں آیا ہے "کہ تمھیں ظلمت و تاریکی سے نکال کر نور کی طرف لائے"[۲۵۸]۔ یعنی حق تعالیٰ تمھیں جو ماہیات ممکنہ ہو عدم سے وجود میں لاتا ہے اور اخراج الی النور کی رمز یہ ہے۔ ان ماہیات ممکنہ کو جو درحقیقت معدومات ہیں حق تعالیٰ انھیں وجود میں نہیں لایا بلکہ انھیں وجود کی طرف کھینچا اور اپنے وجوب کے گھیرے میں لے لیا اور اُنھیں "ہست" بنا دیا۔ لفظ ظلمت و تاریکی اپنے لفظ مقابل یعنی نور کی طرح دو معنی سے محمول کیا جائے گا۔ ایک بمعنی ذات العدم جو عدم محض ہے، اور اُس کے مقابل میں وجود ہے جو اپنے موجودات کی وجہ سے ہے، اور ایک بمعنی عدم ظلی کے ہیں جو وجود ظلی کا مقابل لفظ ہے۔ پس ظلی وجود و عدم کو جب ہونے یا نہ ہونے کے لفظوں میں استعمال کرتے ہیں تو وہ اس کے مصدری معانی ہوتے ہیں، اور اس مقام پر وجود کو موجود اور عدم کو معدوم کہا جاتا ہے۔ اور پہلے مرتبے میں جو حاصل مصدری معنوں میں ہے العدم پر عدم اور الوجود پر وجود صادق آتا ہے۔ اور ماہیات و موجودات کو اصطلاحاتِ محمدیہ میں اسما کے تقاضے کہا جاتا ہے۔ اور موجودات ثابتہ کے مرتبے کو اسمائے حسنیٰ کی مقتضیات کا مرتبہ جانتے ہیں کیونکہ کائنات کی سب موجودات اسمائے الٰہی ہی کے مظہر ہیں جو اسم کے تقاضے کے بموجب معرضِ ظہور میں آئے۔ جیسا کہ قرآن پاک میں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ جب کسی کام کو کرنا چاہتا ہے، تو بس اس کام کی نسبت اتنا فرما دیتا ہے کہ ہو جا۔ پس وہ اسی طرح ہو جاتا ہے۔ ترجمہ رباعی اگر تیری سمجھ میں یہ بات آ جائے یا واضح ہو جائے کہ کون و مکان میں کس کا نور ظہور ہے، تو پھر تیرے لیے زندگی اور موت یکساں ہو جائیں۔ ان میں کوئی فرق نہ رہ جائے۔ جب تیرا مطمح نظر اللہ کا رنگ ہوگا تو پھر تمھیں پتہ لگے گا کہ کائنات میں یہ رنگا رنگی کس وجہ سے ہے۔ اس رباعی میں فہم و ادراک سے مراد ایک ایسی حقیقت کی دریافت ہے کہ

اگر اس کی کیفیت دل و دماغ پہ واضح ہو جائے تو پورا ملک حاصل ہو جائے، اور وہ سکون قلب کا باعث بن جائے گا۔ظہور سے مُراد اس قادرِ مطلق کے ظہور سے ہے، جو تمام ذہنی اور خارجی موجودات میں شامل ہے۔کونین سے مراد عالمِ غیب و شہود اور دُنیا و آخرت ہے، اور بینش جو کلمۂ ظرف ہے اس سے مراد علم و دانش کی درمیانی حالت "تو" کے لفظ سے خطابِ عام منظور ہے۔مرگ و زیست سے مراد معدومیت ہے۔ ظاہری ہونے والے حالات اور اعتباری وجود ہیں۔ نصب العین سے مراد راسخ مشاہدہ، اور صبغت اللہ سے مراد صفاتِ خداوندی کے کمالات۔معلوم کردن سے مراد معرفت کی نگاہ سے بھانپ لینا اور تلون سے مراد وجود کی کمالی کیفیات سے کیف و سرور حاصل کرنا ہے۔اب مطلب یہ ہوا کہ اگر تو اپنی صحیح دریافت یا تحقیق سے اطمینانِ قلب حاصل کر لے تو تجھے پتہ چل جائے گا کہ کائنات کی تمام ذہنی و خارجی موجودات میں کس کا ظہور ہے۔عالم حاضر ہو یا غائب، دُنیا ہو یا آخرت سبھی کچھ اسی کے نور ظہور سے ہے۔ لہذا اے مخاطب تجھ پر عدم و وجود کی طاری ہو جانے والی کیفیات یکساں ہو جائیں گی جب تجھے مشاہدے میں صفاتِ خداوندی ہی مشہود ہوگی تو ہر آن اپنی عرفان و معرفت کی نگاہ سے بھانپ لے گا کہ ان تمام کیفیات میں یہ سرور ہے کیا، اور کہاں سے آیا ہے۔ تو سمجھ جائے گا کہ اللہ تعالیٰ نے موجودات کے حقائق کے وجود کو اپنے ہی کمالات کے رنگ میں رنگ دیا ہے۔ کمالات کو رنگ سے اس لیے تعبیر کیا گیا ہے کہ رنگ قائم بالذات نہیں، وہ اپنے موضوع یعنی جوہر کی وجہ سے قائم ہے۔مثال کے طور پر کپڑا موضوع (یعنی جوہر) ہے، اور رنگ اس کی وجہ سے موجود ہے۔اسی طرح کمالی صفات وجود حق تعالیٰ سے موجود ہیں اور اسی کی بدولت اس عالمِ شہود میں جلوہ گر ہیں جیسا کہ قرآن شریف میں آیا ہے کہ "اللہ کے رنگ سے اور کونسا رنگ بہتر ہو سکتا ہے"۔ پس اللہ تعالیٰ نے حقائق ممکنہ کو اپنے ظلّی وجود کے رنگ میں رنگ دیا۔ اور انہیں ہستی بخش دی۔ اور یہ وجود حضرت واجب الوجود کی پہلی صفت ہے۔اور اللہ جل جلالہٗ کی دیگر تمام صفات و اعتبارات کی حامل ہے، کیونکہ پہلے جو کچھ حاصل مصدری مرتبے سے پیدا کیا جاتا ہے یہی مصدری معانی ہیں۔ اس کے بعد دیگر صفات اس امر کی شمولیت سے پیدا ہوتی ہیں یعنی پہلے کسی شے کو موجود ہونا ہے، اور اس کے بعد پھر اُس کے امتیازی اوصاف۔ لہذا موجودات کا یہ رنگ کمالات کے باقی رنگوں سمیت درحقیقت حضرت باری تعالیٰ کے وجود کا رنگ ہے جس نے اس ساری کائنات کی ساری موجودات کو اپنے رنگ سے رنگین کر دیا یعنی سب اسی وجود کا پرتو ہے جو اس پاک ذات

نے موجودات پر ڈالا ہے۔ اور ہر آن ہر لحظہ رنگا رنگ نئی تجلیات نمودار ہو رہی ہیں یعنی ہر دم، ہر آن طرح طرح کے انوار اور انواع و اقسام کی تجلیات کی صورت میں جلوہ ریز ہے۔ ہر آن وہ اک نئی شان میں مشغول ہے جیسا کہ قرآن شریف میں ہے کہ "وہ ہر وقت کسی نہ کسی کام میں رہتا ہے"[۱۴۸] اور اس وجودِ مطلق سے ہر لحظہ ہر گھڑی اس کا فیض سبھی موجودات تک مسلسل پہنچ رہا ہے یعنی ہر وجود پر متواتر اس فیض کی بارش ہے بلکہ کائنات کی ہر اکائی کے ساتھ متصل ہے۔ ورنہ جس گھڑی بھی وہ فیض کسی چیز تک نہ پہنچے وہ چیز اسی وقت معدوم ہو جاتی ہے، مثلاً فضا میں بجلی کی چمک۔ جب تک بجلی مسلسل اور لگاتار چمکتی ہے تو فضا روشن رہتی ہے۔ اور اگر یہ تسلسل ٹوٹ جائے تو وہ فضا تاریک! چونکہ سورج کا فیض لگاتار جاری و متصل رہتا ہے تو دن روشن اور نورانی رہتا ہے۔ جب اس کے درمیان کوئی رکاوٹ آجاتی ہے وہ روشنی مٹ جاتی ہے اور معدوم ہو جاتی ہے، اور لحظہ بہ لحظہ بدلتی رہتی ہے۔ اس فیض کے تواتر و تسلسل کے بغیر اس کی بقا نہیں۔ لہٰذا وجودِ عالم اور بقائے عالم کی بھی بالکل یہی صورتِ حال ہے۔ اُس پروردگارِ عالم کے وجودِ مطلق کا فیض جب تک موجودات کے ساتھ مسلسل و متصل ہے تو کائنات کا وجود بھی قائم و دائم ہے۔ جونہی وہ رُکا اسی لمحے وہ نیست و نابود۔ اور بعض کا جو یہ خیال ہے کہ وجودِ عالم اور وجودِ مطلق کی مثال عمارت اور معمار کی سی ہے یا برتن اور کمہار کی، جو اب اپنی ذات میں مستقل اور بنانے والے سے بے نیاز ہے اس کی کوئی اصلیت نہیں کیونکہ گھر یا عمارت یا برتن اور پیمانے کی تعمیر تو چند موجود اشیا یعنی اینٹ، پتھر، لکڑی، مٹی اور پانی وغیرہ کی باہمی ترکیب و تالیف ہے۔ اور نئی چیز پیدا کرنا یا بنانا ترکیب و تالیف نہیں ہوتا بلکہ وہ تو کسی چیز کو عدم سے وجود میں لانا ہوتا ہے یعنی کہ حضرت واجب الوجود کا فیضِ عام ممکنات کو اعتباری عدم سے باہر کھینچ کر وجودِ انسانی کی طرف لاتا ہے۔ اور یوں اس کشا کش (کھینچا تانی) سے اس کائنات میں ہمیشہ یہ رنگا رنگی اور صورتِ حال کا یہ ادل بدل ہے یعنی ان کو مختلف رنگوں اور شکلوں میں بدلتا اور مختلف حالات و کیفیات میں ڈھالتا رہتا ہے۔ وہی ذات ہے جس نے نکالا ممکنات کو عدمِ اعتباری سے وجودِ اضافی تک علمی طور پر نکالنا، اور ہر چیز کو اپنے احاطے میں لے لیا علم کے لحاظ سے[۱۴۹] اور رنگا موجود کو وجودی کمالات کے رنگوں سے ایجادی رنگ کے ساتھ، "اور اللہ کے رنگ سے بہتر رنگ کس کا ہے"[۱۵۰] یہاں اسی کی طرف اشارہ ہے۔ اس مقام پر ایک نہایت عمدہ نکتہ اور دلنشین بات ہے کہ رنگائی اور رنگریز دونوں وجود سے منسوب ہیں جب کہ کسی کپڑے کو رنگنے کے

لیے ایک رنگریز اور رنگ کے وجود کی ضرورت ہے۔ اسی طرح رنگے جانے کے لیے کسی کپڑے کے وجود کی بھی ضرورت ہے۔ اگر کپڑا ہی نہ ہو تو رنگا کس چیز کو جائے گا۔ لہذا رنگ، رنگریز اور کپڑا تینوں وجودی امور ہیں اور اضافات وحیثیات کے اختلاف کے ساتھ ان مظاہر میں ایک ہی امر واحد جلوہ گر ہے۔

یہاں موجود ہی وجود بن جاتا ہے، نہ یہ کہ کسی کو عدم سے وجود میں لایا گیا ہے۔ جس سے وجودی بوجھ کا احتمال ہو۔ اور نہیں متحمل ہوتیں بادشاہ کے عطیات کی سوائے اس کی سواریوں کے۔ بوجھ اور بوجھ اٹھانے والا دونوں ہی اس حقیقی مالک کی ملکیت ہیں کیونکہ جمود بھی ایک فعل ہے کیونکہ امکانی حقائق کا انفعال بھی ایک قسم کی فعلیت ہے۔ لہذا یہ فعل بھی وجود ہی کا مضاف ہے جو ان میں ظاہر ہے جیساکہ قرآن پاک میں ہے کہ "وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے"[۱۶۲]۔ لفظ فعال مبالغہ کے لیے ہے اور فاعلیت کی کثرت اور شدت پر دلالت کرتا ہے۔ نیز انہی معانی کی طرف اشارہ کرتا ہے یعنی انفعالی فعلیت بھی اسی جل جلالہٗ کی طرف منسوب ہے۔ اللہ تعالیٰ کے سوا اور کسی کو قوت اور طاقت نہیں ہے۔ اس کے سوا اور کوئی فاعل موجود نہیں۔ نہیں ہے کوئی معبود سوائے اللہ کے اور نہیں ہے کوئی موجود سوائے اس کے۔

تنبیہ

مست و سرشار اصحاب، اور مغلوب الحال سالکان راہ جن کی قوتِ ادراک ضعیف ہوتی ہے اور انھیں اُس علم سے مستفیض ہونے کی راہ نہیں ملتی جیسے قرآن شریف کہتا ہے کہ "اُن کو ایک فرشتہ تعلیم دیتا ہے جو بڑا طاقتور ہے"[۱۶۳]۔ پیدائشی طاقتور ہے جس سے اس بات کا انکشاف ہوتا ہے کہ وہ وحدتِ وجود کے قائل ہوکر واجب اور ممکن کو ایک ہی شے سمجھ کر عبد اور معبود میں فرق نہیں کر پاتے اور ہمہ اوست (سبھی کچھ وہی ہے) کے گستاخانہ کلمات کہنے لگتے ہیں۔ وہ اس حقیقت سے آگاہ ہی نہیں ہوتے کہ خالص و کامل وجود اسی کا ہے اور اُس کے سوا اور کوئی موجود نہیں۔ وہ واجب الوجود ہونے کی حیثیت سے ممکنات سے ماورا ہے۔ اس مقام پر کسی بیان کی گنجائش نہیں۔ دہاں عینیت کا دعویٰ بھی غیریت ہی کے دعوے کی مانند ہے جس نے اللہ کو پہچان لیا اُس کی زبان گنگ ہوگئی۔ امکانی مراتب اور ممتاز وجوبی مراتب کبھی یکساں نہیں ہو سکتے، ہر چند کہ ان میں موجود ہی امر واحد ہے۔ زید کا سر اپا بالکل زید ہی ہے، نہ یہ کہ زید کا سر اُس کا پاؤں ہے، اور اُس کا سر عیناً اُس کا پاؤں ہے۔ ادب کا دامن ہاتھ

سے نہیں چھوڑنا چاہیے اور زبان سے خلاف شرع بڑیں نہیں ہانکنی چاہئیں، اور والد بزرگوار کی بلند پایہ تصنیف "نالہ عندلیب" میں وجودی صوفیا کے کلمات پر جو اعتراض کیے گئے ہیں اُن سے مراد یہی ملحد اور بے ادب ہیں، نہ کہ محقق توحید پرست حضرات! کیونکہ توحید ہی عین ایمان ہے اور اس آیت کریمہ کہ "تم جدھر کو رخ کرو گے اسی رخ اللہ کو پاؤ گے" کے مشاہدے کے باوجود عبد کو عبد ہی سمجھنا چاہیے اور معبود کو معبود ہی۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اپنے حبیب نبی کریم صلعم کے صدقے ایمان کامل اور عرفان شامل سے مشرف فرمائے۔ چونکہ رنگائی اور رنگریزہ دونوں اسی وجود مطلق سے منسوب ہیں لہٰذا ماہیات اُس کے ظہور کے واسطے اور کمالات کی معرفت کے سبب سے زیادہ اور کچھ نہیں۔ زیادہ اس لیے نہیں کہ یہ حقائق ممکنہ محض کمالاتِ الٰہیہ کے آئینہ دار ہیں اور صرف اسمائے حسنیٰ کے انوار کے ظہور کا ایک سبب، جیسا کہ شیشہ شخص کو دیکھنے کا وسیلہ ہوتا ہے۔ آئینے سے اپنے ہی چہرے کا مشاہدہ حاصل ہوتا ہے اور آئینہ خانہ (شیشے کے گھر) میں ہر طرف اپنا ہی عکس نظر آتا ہے۔ اس حدیث قدسی میں کہ میں ایک چھپا ہوا خزانہ تھا، میں نے اپنی پہچان کرانی چاہی تو مخلوق کو پیدا کیا[۵] اسی امر کی طرف اشارہ ہے۔ اور اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ اس کا اپنی ذات پاک ہی سے معاملہ ہے۔ چنانچہ یہاں کلمہ (ان اعرف) فعل مجہول ہے، اور کسی خاص فاعل کی طرف اس کی نسبت بھی معلوم نہیں، اور معروف ضمیر متکلم ہے ایسے معنوں کی جس کا فاعل معلوم نہیں، اور قائم مقام فاعل بھی ہے۔ یہاں بھی ظاہر و بیّن طور پر یہی مقصود ہے کہ میں نے چاہا کہ خود اپنے اوپر ظاہر ہوں، اور مرتبۂ باطن سے مرتبۂ ظہور میں آؤں۔ مخلوقات کی حقیقتوں کی تعداد کی نسبت سے اللہ کی طرف راستے ہیں۔ ہر موجود اسی کی جلوہ گاہ ہے، اور ہر آنکھ میں اسی کا نور ہے۔ چونکہ وجود، عکس اور عکس کی حقیقت سبھی پردے میں ہیں جن سے وہ خود ہی استفادہ کر سکتا ہے۔ اور اس مرتبے میں بھی وہ کسی پر ظاہر نہیں، نہ اس کی شخصی صورت ہے نہ وہ دیکھا جا سکتا ہے محض قیاس آرائی ہو سکتی ہے۔ اے اللہ تو ظاہر ہے اور ظہور تیرے لیے ہے، اور معاملات تیری ہی طرف لوٹتے ہیں۔[۵] ترجمہ رباعی اگر باد نسیم تیری خوشبو سے مست و سرشار اور موسم بہار تیرے دیدار میں محو ہو کر گزرتے ہیں۔ اے اللہ تعالیٰ تو مخلوق سے کتنا نزدیک ہے کہ جو کوئی اپنی خودی کو چھوڑ دے وہ تیری طرف جا پہنچتا ہے۔[۵] یہاں اس رباعی میں باد نسیم سے مراد غیر مادی وجود اور عقلی معانی کے تعین سے ہے جو نہایت لطیف اور بے رنگ ہیں۔ مست شدہ سے مراد خاص کیفیت پیدا کرنا ہے اور "بو"

سے مراد مرتبۂ باطن وجود اور اس کی لطافت ہے، اور گزشتن سے مُراد اس قادرِ مطلق کی طرف رجوع و نسبت ہے کیونکہ کلُ امور کا مرجع وہی ہے۔ فصلِ بہار سے مراد مادی اشیا اور حسیؔ مشخصات کا تعین ہے۔ محو شدن سے مراد مصروف اور حیران وششدر ہونا ہے اور روئی سے مراد وجود کا مرتبۂ ظاہر۔ رب سے مراد خالق اور خلق سے مراد مخلوقات ہے، اور لفظ خود سے مراد اپنی موہوم انا کا وہم وگمان اور سوئے تو سے مراد حق وحقانیت کی طرف ہے۔ اس رباعی کے پہلے دو مصرعوں میں کلمۂ رابط محذوف ہے۔ یعنی دو مصرعوں میں ہونا یوں چاہیے کہ اگر باد نسیم است و اگر فصل بہار است۔ اس قسم کے حذف کی صورت متقدمین اور متاخرین اساتذہ کے شعری اور نثری کلاموں میں اکثر جگہ پہ آئی ہے اور حاصل کلام یہ کہ اگر مجردات کے تعینات اور عقلیہ معانی تیرے ہی باطنی مرتبے کی کیفیت و لطافت سے کیف وسرور ملا تو اس کا رجوع و اطلاق بھی تیرے ہی وجودِ مطلق پہ ہے، اور مادی اشیا اور حسی مشخصات کے تعینات ہیں تو وہ تیرے ہی مرتبۂ ظاہر سے حیران وششدر۔ رجوع و نسبت پھر بھی اسی وجودِ مطلق سے رہی۔ اے ہر چیز کے خالق تیری شان کتنی بلند ہے اور تو اپنی مخلوقات سے کس قدر نزدیک ہے کہ جس نے اپنی موہوم انا اور خودی کو چھوڑا تو تیری عقانیت سے منسوب ہوا۔ پس تو ہر شخص سے اس کی اپنی ذات سے بھی زیادہ قریب ہے، اور تو نے سچ فرمایا ہے کہ میں تمھاری رگِ گردن سے بھی زیادہ قریب ہوں[۵] کیونکہ ہر ممکن الوجود یا دیگر وجود کی خودی موہوم اور اُس کی ہستی معدوم ہے اور ہر موجود میں اُسی کا وجود موجود ہے۔ اے ہمارے رب تو نے یہ کائنات یونہی تو نہیں بنائی[۶]۔

هو النّاصح

شروع اللہ کے نام سے جو نہایت مہربان اور رحم والا ہے

ہر قسم کی تعریف اس اللہ کے لیے ہے کہ ہو گئے ہیں ہم اور ہو گئی ہے بادشاہی اسی کے لیے اور نہیں ہے کوئی معبود سوائے اس کے۔ اور درود و سلام ہو مطلعِ شمسِ حقیقت پر اور نبوتِ آسمانی کے افق پر اور ان کی آل پر اور اصحاب پر جو ستاروں کی طرح ہیں۔ ان میں سے تم جن کی پیروی کرو گے ہدایت پاؤ گے۔ اما بعد یہ چوتھا باب ہے جس کا نام مطلع الفجر ہے۔ نکالے ہمیں اور تمھیں اللہ غفلت اور جہالت کی رات سے شہود و معرفت کے دن کی طرف، جس طرح کہ اس نے نکالا ہمیں اور تمھیں ظلمات سے نور کی طرف بعض عدمات اعتباریہ کی تاریکیوں سے وجود اضافی کی طرف اور سکھایا ہمیں اور تمھیں لیلۃ القدر کی قدر کرنا، اور تم کیا جانو کہ وہ لیلۃ القدر کیا ہے۔ پس جان لو کہ وہ تمھاری زندگی کی طرف ہے۔ جس رات میں نازل کیے ہیں اللہ تعالیٰ نے تم پر حقائق و معارف، اور یہ تمھارے لیے بہتر ہے ایک ہزار مہینوں سے، جس میں یہ نہیں ہوتے کیونکہ نازل ہوتے ہیں فرشتے تیری حفاظت کے لیے خاص طور پر اور جبرائیل علیہ السلام نازل ہوتے ہیں تیری تعلیم کے لیے اس کی جانب سے اس رات میں اپنے رب کے حکم سے ہر معاملے میں سے یعنی دینوی اور اخروی امور میں سے۔ اور سلام بھیجتا ہے اللہ تعالیٰ تم پر اس رات میں اجل مسمیٰ تک جو کہ منقطع کر دیتا ہے سلسلۂ حیات کو۔ یہ ہے زندگی اور وہ آخری زندگی کی صبح کا دروازہ تم پر کھولتا ہے، اور یہ سلامتی ہے فجر کے طلوع ہونے تک ہے۔

آنحضرت صلعم کے خالق و مخلوق کے مابین درمیانی واسطہ ہونے کا بیان

خاتم الانبیا حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارک خالق و مخلوق کے درمیان اک واسطہ و وسیلہ ہے۔ رشد و ہدایت کے لیے بھی، اور خدا تک پہنچنے کے لیے بھی اس ذات کا وسیلہ ضروری ہے کیونکہ حضور پاکؐ کے اتباع اور ان کی نبوت پر ایمان لائے بغیر آخرت میں نجات حاصل نہیں ہو سکتی، اور نہ ہی قرب الٰہی کی راہیں کھلتی ہیں۔ حضور کی ذات سارے جہانوں کے لیے رحمت ہےؐ۔ دُنیا کا قیام اور کائنات کی تخلیق انہی کی مرہونِ منّت ہے، کیونکہ سب سے پہلے حقیقتِ محمدیہ ہی کا تعین ہوا۔ حضور نے خود فرمایا ہے کہ خدا نے سب سے پہلے جو چیز پیدا کی وہ میرا نور تھاؐ۔ اور یقین کا یہ مرتبۂ اول سبھی تعینات پر محیط ہے اور ساری مخلوقات کے ظہور کا باعث۔ خدا کا فرمان ہے کہ اے محبوب اگر تمھیں پیدا نہ کرتا تو یہ افلاک بھی پیدا نہ ہوتےؐ۔ کیونکہ حقیقت محمدیہ مختصراً اور کلیتہً تمام کمالات کی جامعیت کا ظہور ہے۔ اور یہ مرتبہ مرتبۂ اسم اللہ کا مکمل مظہر ہے کیونکہ جملہ کمالات کی جامعیت کی حیثیت تو وہی ذات احدیت ہی ہے جو لا محدود اور وحدہٗ لاشریک ہے۔ بلاشبہ سب سے پہلے تخلیق پانے اور ظہور کرنے والا نام ان تمام صفات کا جزئیات سمیت جامع ہے۔ اور اس مرتبہ جامعہ کا سزاوار اور تمام مخلوقات پر جو مانند جزئیات کے ہیں حاوی ہے۔ جس طرح اسم اللہ جو رب محمدؐ ہے اپنی واجبیت کے اوّل مرتبہ ہونے کی بنا پر سارے اسمائے حسنیٰ میں شامل ہے اسی طرح حقیقت محمدیہ جس کا رب اسم اللہ جل شانہ ہے مرتبۂ امکانی میں اوّل اور تمام اسمائیہ ظہورات میں شامل ہے جسے ہم دنیا کہتے ہیں۔ اور اس دُنیا میں کوئی بھی حضور پاکؐ کی وساطت کے بغیر عالم وجود میں نہیں آیا اور نہ ہی کوئی ان کے وسیلے کے بغیر آخرت میں نجات پائے گا! بلکہ عذاب پانے والے بھی اُنھیں کی بدولت عذاب پائیں گے جیسا کہ خود خدا تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ ہم کبھی سزا نہیں دیتے جب تک رسول نہیں بھیج لیتےؐ۔ **سوال** اگر آپ یہ پوچھیں کہ اس آیت کریمہ میں لفظ رسول اسم نکرہ ہے اس میں ہمارے رسولؐ کی تخصیص کیسے ہوئی، کیونکہ اس کا مطلب تو ہر رسول ہے؟ **جواب** میں کہتا ہوں سچ ہے۔ مومنوں کو جنت میں پہنچانا، اور کافروں کو جہنم واصل کرنا واقعی ہر رسول کا کام ہے، مگر ان دونوں فریقوں کو ثواب کے اعلیٰ ترین مدارج یا عذاب کے اسفل ترین طبقات تک پہنچانا خیر المرسلینؐ کا

(ان پر خدا کی تمام تر رحمتیں اور کامل ترین درود ہوں) کا کام ہے۔ ہمارے پیغمبر پاکؐ کے اصحاب کی جنت دوسرے انبیا کے دوستوں کی جنت سے بلند درجے کی ہوگی۔ اُسؐ کی اُمت تمام اُمتوں سے بہتر ہے۔ ابوجہل اور ابولہب، اور اُن جیسے دوسروں کا جہنم فرعون ونمرود اور ان جیسے دوسروں کے جہنم سے زیادہ نچلے طبقے کی ہوگی۔ جس طرح آنحضرت صلعم کی اُمت تمام اُمتوں سے بہتر ہے اسی طرح حضورؐ کے زمانے کے کافر اور منافق بھی سخت ترین کافر اور منافق ہیں۔ کفر اور منافقت میں عرب والے بدو شدید ترین ہیں۔ لہٰذا اسی طرح اے پیروانِ محمدؐ تم ملتِ اسلامیہ کے ان بہتر ۷۲ فرقوں میں وسطی اور معتدل فرقہ ہو۔ اور تمہارا طریقہ سب طریقوں سے اچھا ہے۔ جیساکہ اس آیت کریمہ میں واضح طور پر آیا ہے کہ ہم نے تم کو ایسی ہی ایک جماعت بنادی ہے، جو ہر پہلو سے اعتدال پر ہے اور تم (مخالف) لوگوں کے مقابلے میں گواہ ہو، اور تمہارے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم گواہ ہیں۔ حضور سرورِ کائناتؐ کے زمانے کے منکرین اور منافقین دوسرے وقتوں کے منکروں اور منافقوں سے زیادہ سخت عذاب میں مبتلا ہوں گے۔ حضور پاکؐ کے عہد بابرکت کے کافروں اور منافقوں کی روگردانی محض حضور سرورِ کائناتؐ کی مخالفت اور دشمنی کی بنا پر تھی۔ اس کی اس رحمتِ عام، مکمل ہدایت اور کلام کی سچائی کے باوجود کہ اللہ کے فضل و کرم سے بالکل عیاں ہے اگر کوئی راہِ ہدایت نہ پائے، اور صدق و اخلاص سے مُنہ موڑ لے تو صاف ظاہر ہے کہ وہ بالکل بدنصیب ہے، اور اُس نے محض اپنی دوامی بدبختی، سنگدلی اور فطری جہالت کی وجہ سے خوش بختی، ہدایت اور سلامتی کی راہ نہ پائی، اور راہ مصطفےٰؐ سے مُنہ موڑ لیا۔ ہم اللہ کی پناہ میں آتے ہیں اس سے۔ اے اللہ نہ بنا میری قوم سے کسی ایک کو بھی اُن میں سے۔ لیکن کیا کیا جاسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے رسول مقبولؐ کو جن کا اصلی منصب رشد و ہدایت ہے خود فرمایا ہے کہ آپ جس کو چاہیں ہدایت نہیں کرسکتے، بلکہ اللہ جس کو چاہے ہدایت کردیتا ہے، نیز اس آیت کریمہ میں دیکھیے کہ برابر ہے ان کے حق میں خواہ آپ ان کو ڈرائیں یا نہ ڈرائیں، وہ ایمان نہ لادیں گے۔ اور یہ سنت الٰہی ہے کہ جہاں وہ کاملانِ حق کے لیے معتقدین پیدا کرتا ہے، وہاں منکروں کو بھی وجود میں لے آتا ہے۔ جیساکہ خود اس کا فرمان ہے، اللہ جسے چاہے ہدایت دے دیتا ہے اور جسے چاہے گمراہ کردیتا ہے، اور وہ ہر شے پر قادر ہے۔ اللہ تعالیٰ دین محمدؐ کو فتح و نصرت دے اور مخالفین کو ذلت و رسوائی دے۔ حاصل کلام یہ کہ سرورِ کائناتؐ کی ذات تمام اسمائے الٰہی کی جامع صفات ہے۔

اسمائے جلالی کے مظاہر بھی آپ کی بدولت کمال کو جا پہنچیں گے، اور اسمائے جمالی کے مظاہر بھی انہی کی وساطت سے اپنے اصل سے جا ملیں گے۔ رباعی دونوں جہان میں شفاعت کے سزاوار آپ ہی ہیں۔ میں آپ کی ذات بابرکات سے امید واثق رکھتا ہوں۔ بلاشبہ دُنیا میں آفتاب حقیقت کے متعلق صبح صادق کی طرح آپ ہی مخبر صادق ہیں۔ اس رباعی میں شفاعت سے مراد پیدا ہونے کا وسیلہ اور گناہگاروں کے عفو و معافی کا سبب ہے۔ دو عالم سے مُراد عالم غیب و شہادت یعنی دُنیا و آخرت نیز انسانوں اور جنوّں سے بھی ہے۔ جناب سے مراد حقیقت محمدیہ ہے (ان پر خدا کا درود و سلام) نیز حضورؐ کی انسانی شخصیت۔ خورشید حقیقت سے مُراد وجود حق تعالیٰ اور دین و اسلام کے سچے امور۔ لہٰذا اب رباعی کے معنی یوں ہوئے کہ عالم غیب و شہادت کی ایجاد کا وسیلہ آپؐ ہی ہیں یعنی حقیقت محمدیہ ہی تعین اوّل ہے۔ باقی سب تعینات اسی سے پھوٹے اور جنوّں اور انسانوں کے گناہوں کو بخشوانے والے بھی آپ ہی ہیں۔ میں جو آپ کی اُمّت سے ہوں، اور آپ ہی کے مسلک و مشرب سے وابستہ ہوں بڑی پختہ اُمید اور یقین رکھتا ہوں کہ مجھے آپ اپنی تمام برکات سے مستفیض و شرف یاب فرمائیں گے، اور جامعیت عطا فرمائیں گے۔ اور آپ کی انسانی شخصیت سے بھی امیدوار ہوں کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ سے میرے گناہ بخشوائیں گے۔ بے شک اللہ تعالیٰ کی ہستی کے مخبر صادق آپؐ ہی ہیں۔ نیز دین و اسلام کے سچے امور سے مطلع کرنے والے بھی آپؐ ہی ہیں۔ جیسا کہ صبح صادق سورج کے وجود اور اس کے طلوع ہونے کی خبر دیتی ہے۔ اسی طرح حقیقت محمدیہ (ان پہ خدا کا درود و سلام) جو آفتابِ وجود کا ظہورِ اوّل ہے تمام موجوداتِ عالم پر چمک کر تکوین کائنات کا موجب بنی۔ اس لیے عالم صورت میں بھی آنحضرت کی ذات بابرکات سب لوگوں کے لیے ہے، اور ان کی دعوتِ حق بھی ہر خاص و عام کے لیے ہے۔ لہٰذا پختگی سے اس پر یقین رکھنا چاہیے کہ جس نے رسولؐ کی اطاعت کی اُس نے خدا کی اطاعت کی۔ جس طرح صبح سورج کے ظہور کی تمہید ہے اسی طرح حقیقت محمدیہ بھی تکوین کائنات کی تمہید ہے (ان سب پہ درود و سلام) اور متاخرین صوفیا کی اصطلاح میں اسے تنزّلِ اول اور مرتبۂ وحدت بھی کہتے ہیں، اور اسی مرتبے کو مرتبۂ احدیت (جو لامحدود ہے) اور مرتبۂ واحدیت (جو تنزلِ ثانی ہے) کا درمیانی واسطہ سمجھتے ہیں۔ اور عالم ارواح کو تیسرا تنزل، عالم مثال کو چوتھا اور عالم شہادت کو پانچواں تنزل شمار کرتے ہیں۔ اور وہ پانچ تنزلات کے قائل ہیں۔ بعض حضرت انسان کو ایک دوسری دُنیا قرار دے کر اُسے چھٹا تنزل گردانتے ہیں اور اسے برزخِ

جامع بھی کہتے ہیں اور صوفیائے متقدمین ان پانچ مراتب کو، ہاہوت، لاہوت، جبروت، ملکوت اور ناسوت کے ناموں سے تعبیر کرتے ہیں ۔

اصطلاح محمدی

پیروانِ محمدؐ (مدد فرمائے اللہ ان کے صاحب کی مدد کے ساتھ) حقیقت محمدیہ کو جو سب سے اوّل و مقدم ہے نور اوّل کہتے ہیں ۔ خود حضورؐ کا فرمودہ کہ اللہ نے سب سے پہلے جو چیز پیدا کی وہ میرا نور تھا۔ اور اس جامع مرتبہ کو اسم اللہ کا مقتضا سمجھتے ہیں جو تمام صفات کا جامع ہے ۔ اور اللہ کو پروردگارِ محمدؐ کہتے ہیں ۔ اور آنحضرتؐ کو اللہ تعالیٰ کا پرورش و تربیت یافتہ سمجھتے ہیں ۔ اور تمام کثیر حقائق کو اسی مرتبۂ جامعہ سے پھوٹنے والے کہتے ہیں، اور عالم امثال و ارواح کو عالمِ غیب اور عالم امر جانتے ہیں، اور عالم شہادت کو عالمِ خلق کہتے ہیں ۔ غرضیکہ اپنی طرف سے کوئی نئی تعبیر نہیں کرتے ، اور جو کچھ قرآن پاک اور احادیث میں آیا ہے اسی پہ اکتفا کرتے ہیں ۔ غیب و حضور کی باتیں اللہ ہی بہتر جاننے والا ہے ۔ اور وہی باخبر عالم ہے ۔ قصہ کوتاہ متن کی طرف پلٹتے ہوئے کہنا چاہیے کہ ان تمام تعینات کی صبح اور دن اسی آفتابِ نور سے پھوٹتے ہیں، اور باقی سب اعتبارات ممکنہ اُس ایک کے نورِ ظہور سے روشن و تاباں ۔ ترجمہ رباعی حُسن کا شعلہ بھڑکے تو اُسے دل کو منوّر و شاداں کرنے والا کہتے ہیں ۔ جب عشق کی آگ بھڑک اُٹھے تو اُسے سوز کہتے ہیں ۔ مخلوق اپنے خالق ہی کے ظہور سے عبارت ہے ۔ آفتاب جب نکل آئے تو اُسے دن کہتے ہیں ۔ اس رباعی میں حُسن دل فروز ، نارِ عشق ، سوز ، طلوعِ خورشید اور روز الگ الگ چیزیں ہیں جن کو دوسری عبارت نے امتیاز بخشا ، اور وہ بیان میں ممتاز ہوئے ۔ اسی طرح مخلوق بھی خالق کے ظہور فرمانے اور تجلی افروز ہونے سے عبارت ہے ۔ درحقیقت موجود فقط وہی اک ظہورِ کامل ہے ۔ وہی اوّل ہے وہی آخر ہے ، وہی ظاہر ہے اور وہی باطن ہے ۔ اور وہ ہر شے کا جاننے والا ہے ۔

هوالناصر

شروع اللہ کے نام سے جو نہایت مہربان اور رحم والا ہے

ہر قسم کی تعریف اللہ کے لیے ہے جس نے بلایا ہمیں اسلام کی طرف اور حکم دیا ہمیں نماز کا ، اور روزے کا ۔ اور درود و سلام ہو جس نے ہمیں مضبوط دین سکھایا فضل و کرم کے ساتھ : اور ہدایت دی ہمیں سیدھے راستے کی نعمتوں کے ساتھ ، اور درود و سلام ہو اُن کی بزرگی والی آل پر اور صحابہ کرام پر۔
اما بعد یہ پانچواں باب جو دعوتِ تامہ سے موسوم ہے ۔ وہ یہ ہے کہ اللہ بڑا ہے ۔ اللہ بڑا ہے ۔ اللہ بڑا ہے ۔ اللہ بڑا ہے ۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ اس کے سوا اور کوئی معبود نہیں ۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ اس کے سوا اور کوئی معبود نہیں ۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد صلعم اس کے رسول ہیں ۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد صلعم اس کے رسول ہیں ۔ آؤ طرف نماز کی ۔ آؤ طرف نماز کی ۔ آؤ طرف فلاح کی ۔ آؤ طرف فلاح کی ۔ اللہ بڑا ہے ۔ اللہ بڑا ہے ، اور اس کے سوا اور کوئی معبود نہیں ۔ اے میرے اللہ جو اس دعوت تامہ کا رب ہے اور قائم ہونے والی نماز کا رب ہے ۔ عطا کر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو وسیلہ اور فضیلت : اور دے اُسے مقام محمود جو تو نے اس سے وعدہ کر رکھا ہے بے شک تو وعدہ پورا کرنے والا ہے ۔ بلایا اللہ نے ہمیں اور تمھیں خاص طور پر قرب اور رفاقت کی بساط کی طرف ، جس طرح اس نے بلایا ہمیں اور تمھیں عام طور پر دوئی اور اجنبیت میں امتیاز کی طرف ۔ پس حق کی دعوت مخلوق کے لیے عموماً اعتباری امتیاز کی طرف دعوتِ حقہ ہوتی ہے ۔ اور اللہ تعالیٰ کی دعوت عالم کے لیے خصوصاً اتحاد معنوی کی طرف بھی

دعوتِ حقہ ہوتی ہے۔ پس اسی کے لیے ہے دعوتِ حق۔ پس دونوں دعوتیں حق کی دعوتیں ہیں سوائے اس کے کہ اللہ سبحانہ کی دعوت امتیاز کی طرف دعوتِ ظاہریہ ہے، اور اتحاد کی طرف دعوتِ باطنیہ ہے اور لوگ نہیں جانتے اپنے گمان میں مگر دعوتِ ظاہریہ کی طرف، اور خواص نہیں چلتے اپنے علم میں مگر دعوتِ باطنیہ کی طرف۔ اور خاص کامل لوگ قبول کرتے ہیں دونوں دعوتیں ظاہراً اور باطناً، علماً اور حالاً۔ اور بلاتے ہیں لوگوں کو ان کی دنیوی اور اخروی بھلائی کی طرف، اور ملاتے ہیں لوگوں کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ ان کے ظواہر اور بواطن کے ساتھ، اور یہی دعوتِ تامہ ہے۔ یہی لوگ ہیں جنھیں اللہ نے ہدایت دی ہے۔ پس ان کی ہدایت کی پیروی کرو۔ اے لوگو میں بلاتا ہوں تمھیں اللہ کی طرف جو جمع کرنے والا ہے حقیقت اور شریعت کے انداز میں۔ پس تم پر لازم ہے شرع شریف کے ساتھ چمٹے رہنا اور مکمل اہتمام کرنا حضور قلب میں اور اللہ کی طرف توجہ کرنے میں، ہر وقت اور ہر حال میں کیونکہ یہ دونوں معاملے رکن ہیں اللہ کے قرب کے لیے جس طرح ایمان کے دونوں رکن ہیں اقرار باللسان اور تصدیق بالقلب (زبانی اقرار اور دل سے تصدیق) اور جو چیز سالک کو بہت زیادہ فائدہ دیتی ہے، اخلاق میں سے وہ تحمل، توکل، رضا اور استقامت ہے۔ اور مشاغل میں لطائفِ خمسہ کا ذکر خصوصاً ذکر قلب کا دوام کیونکہ یہ اللہ سے وصال کا سبب اور اس کی طرف توجہ کا موجب ہوتا ہے۔ نبی کریم صلعم نے فرمایا۔ ذکر کرو اللہ کا کیونکہ وہ تمھارے لیے مددگار ہے اس چیز پر جو تو طلب کرتا ہے اور فرمایا نبی کریم نے ذکر کرو اللہ تعالیٰ کا ذکر خامل۔ پوچھا گیا ذکر خامل کیا ہے۔ فرمایا گیا ذکرِ خفی۔ فرمایا رسول اللہؐ نے کہ ذکر کرو اللہ کا اللہ کا ذکر، یوں کہ منافق کہیں کہ بے شک تم لوگ دکھاوا کرتے ہو۔ اور اذکار میں سے کلمۂ طیبہ کے ذکر کی کثرت زبان کے ساتھ سارے کا سارا معنی کا لحاظ رکھتے ہوئے اور نبی کریمؐ نے فرمایا، نیک بخت ہوگیا وہ شخص میری شناخت کے ساتھ قیامت کے دن جس نے اپنے دل سے خالصتاً اور مخلصاً لا الٰہ الا اللہ کہا۔ اور درود و سلام بھیجا اس کے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر اور ان کی آل پر، اور رسول اللہ نے فرمایا مجھ پر درود بھیجنے میں کثرت کرو، کیونکہ تمھارا مجھ پر درود بھیجنا تمھارے گناہوں کی بخشش کا سبب ہے۔ اور طلب کرو میرے لیے درجہ و وسیلہ کیونکہ میرا وسیلہ میرے رب کے نزدیک تمھارے لیے شفاعت ہے۔ اور (طلب کرو) اعمال میں سے فرائض واجبات اور سنت مؤکدہ کی ادائیگی کے بعد نماز تہجد اور اشراق اور چاشت اور زوال کی نماز اور اوابین اور جو شخص رضاکارانہ طور پر بھلائی کرتا ہے تو یہ اس کے لیے بہتر ہے۔ صبح اور شام کے مراقبے کا تسلسل اور مداومت اختیار کرو، اور پڑھی جانے والی چیزوں میں سے قرآن اور احادیث اور خالص محمدیوں

کی کتابوں میں سے تلاوت کرو، اور مقولوں میں خالص محمدیوں کے مقولے طلب کرو جو تم سنتے ہو یا تم دیکھتے ہو، یا تم پر معارف میں سے جو چیزیں کشف کی جاتی ہیں۔ اس کے توسط سے محمدیوں کا اتباع کرتے ہوئے اور یہی صراطِ مستقیم ہے۔ اور جان لو کہ اللہ سبحانہٗ تعالیٰ ہی آسمانوں اور زمین کا نور ہے، اور تمام عالم اسی سے منور ہے، اسے نگاہ نہیں پا سکتی۔ اس کے ظہور کی شدت کی وجہ سے، اور وہ نگاہوں کو پا لیتا ہے ہر چیز کو احاطہ کر لینے کی وجہ سے، اور ایک ذرہ برابر چیز بھی اس سے پوشیدہ نہیں امکان کی زمین میں، اور نہیں غائب ہوتی اس سے وجوب کے آسمان میں سے کوئی چیز، اور وہ لطیف وخبیر ہے۔ اور وہ لوگ جو نہیں دیکھتے اللہ کے چہرے کو جدھر بھی وہ منہ پھیرتے ہیں تو بے شک وہ غفلت اور انکار کے پردے کے اندر گھرے ہوتے ہیں کیونکہ آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں، بلکہ دل اندھے ہوتے ہیں جو سینوں میں ہوتے ہیں۔ اور اللہ سمیع وبصیر ہے، اور جسے ہدایت دیتا ہے اللہ اپنے حضور اور شہود کے ساتھ پس وہ ہدایت پانے والا ہے، اور جسے وہ گمراہ کر دیتا ہے غفلت اور جہالت سے، پس نہیں ہے اس کے لیے کوئی دوست اور نہ مددگار۔ پس اے محمدیو ذکر کرو اپنے رب کا اپنے دلوں کے اندر، قلب اور روح اور راز کے ساتھ، اور ان کے علاوہ راستے میں جو معمول کے ساتھ لطائف سبعہ ہیں دن میں سے انکساری کے ساتھ اور پوشیدہ طور پہ مکمل اہتمام کے ساتھ، یہاں تک کہ حاصل ہو جائے دوام ذکر کا ملکہ اور بغیر اونچی بات کیے جیسا کہ دوسرے طریقوں کا معمول ہے۔ اور لازم پکڑو دلوں کے مراقبے کو، صبح اور شام فجر کی نماز کے بعد طلوع شمس تک، اور مغرب کی نماز کے بعد جہاں تک کہ غائب ہو جائے شفق جیسے کہ ہمارے مشائخ کا معمول ہے۔ اور تم غافلوں میں سے نہ ہو جاؤ جو کہ انکار کرتے ہیں مراقبے کا اور توجہ کا، اور اللہ تعالیٰ جو کچھ تم کرتے ہو اس سے آگاہ ہے جیسے کہ اللہ عزوجل نے حکم فرمایا، اور مطمئن کرو اپنے دل کو ان لوگوں کی معیت میں جو پکارتے ہیں اپنے رب کو صبح اور شام اس کی رضا کے طلب گار ہو کر۔ اُن سے ہرگز نگاہ نہ پھیرو۔ کیا تم دُنیا کی زندگی کی زینت چاہتے ہو اور نہ پیروی کرو اس کی کہ جس کے دل کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کر دیا اور اُس نے پیروی کر لی ہے اپنی خواہشِ نفس کی جس کا طریق کار افراط و تفریط پہ مبنی ہے۔ اور اللہ کے لیے اسمائے حسنیٰ ہیں جن کی ہمیں خبر دی ہے شرعِ محمدی نے پس انہی ناموں سے اُسے پکارو۔ اور برابر ہے تم پکارو اللہ یا تم پکارو رحمٰن۔ جس نام سے بھی تم پکارو اسی کے لیے سب اچھے نام ہیں۔ اور وہ لوگ جو اس کے ناموں میں

راستی سے منحرف ہوتے ہیں اور اُسے موسوم کرتے ہیں وجود مطلق کے ساتھ، اور عنقائے مغرب سے اور ان جیسی اور چیزوں سے تو انھیں بدلہ دیا جائے گا اس چیز کا جو وہ کرتے تھے، اور اللہ ہر چیز پہ قادر ہے۔ اے قوم عبادت کرو اللہ کی طریقِ محمدی کے نہج پہ وہی دین خالص ہے۔ تمھارے لیے کوئی معبود اس کے سوا نہیں، وہی میرا رب اور تمھارا رب ہے۔ نہیں کوئی معبود سوائے اس کے، اور اسی کی طرف لوٹ کے جانا ہے۔ اور میں اللہ کا بندہ ہوں اور خالص محمدیوں میں سے ایک آدمی ہوں۔ اللہ برکت ڈالے ان میں۔ اور میں نہیں مالک اپنے نفس کو نفع دینے کا یا ضرر دینے کا، مگر وہی جو اللہ چاہے، اور مجھے علم غائب نہیں اور اگر میں غائب جانتا تو میں بھلائیوں میں سے کثرت حاصل کر لیتا اپنے حق میں۔ اور مجھے نہیں چھوئی کوئی بیماری امراض بدنیہ اور ان جیسی اور سے۔ میں تو فقط بشارت دینے والا، اور ڈرانے والا ہوں اللہ کی بشارت سے اور اُس کے ڈراوے سے ان لوگوں کو جو ایمان رکھتے ہیں۔ اور میں پہنچاتا ہوں تمھیں پیغامات اپنے رب کے قرآنی آیات کے ساتھ تمسک کرتے ہوئے۔ اور تمھیں نصیحت کرتا ہوں ان آیات سے، اور یہ بات اللہ پہ بڑی آسان ہے۔ اے لوگو بے شک ہم ایمان لے آئے اللہ پہ اور اُس کے رسولؐ پہ خالص ایمان اور مشرف کیا ہے ہمیں اللہ نے خالص محمدیت کے ساتھ اپنی عنایت سے، اور ہمارا رب علم کے لحاظ سے وسعت رکھنے والا ہے۔ اور ہم نے مکمل کی ہے حجت لوگوں پہ۔ بے شک ہم آئے ہیں ایک کتاب کے ساتھ جسے ہم نے اپنے علم سے کھول کر بیان کیا ہے۔ ہدایت اور رحمت ہے اس قوم کے لیے جو ایمان رکھتے ہیں اللہ پہ اور اُس کے رسولؐ پہ، اور اللہ ہدایت دیتا ہے جسے چاہتا ہے سیدھے راستے کی طرف اور اللہ پہ کچھ دشوار نہیں ہے۔ اللہ پاک ہے جو ہمارا رب ہے۔ وہی ہمارا ہادی اور وہی مددگار ہے۔

حضور و شہود کی نسبت کے حاصل کرنے کے بیان کا باب

حضور و شہود کی نسبت کے حاصل ہونے کا اظہار یعنی کن اسباب سے یہ نسبت میسر آتی ہے اور اس حالت تک کیسے پہنچا جا سکتا ہے جیسے کہ اُس کا بیان آرہا ہے۔ اگرچہ اس گروہ کے نزدیک یہ دونوں لفظ یعنی حضور اور شہود ہم معنی ہیں۔ لیکن راہِ سلوک میں جو کچھ اس فقیر حقیر کو معلوم ہوا یا قبلہ بزرگوارم والد صاحب نے جس کی بشارت دی وہ میرے ناقص ذہن میں کچھ یوں آیا ہے کہ ان دونوں

لفظوں میں نازک سا فرق ضرور ہے۔ حضور کے معنی آگہی مطلق کے ہیں جو سالک کو حاصل ہوتی ہے، اور شہود و مشاہدہ بہت بڑی نزدیکی اور قرب ہے جو مستقل اور دائمی ہوتا ہے۔ لہذا حضور عام ہے اور شہود خاص ہے۔ اور چونکہ سالک کو حضوری باطنی طور پر ہوتی ہے، اور حق سبحانہ تعالیٰ کی معرفت و آگہی دل میں ظہور کرتی ہے تو بسا اوقات وہ اللہ تعالیٰ کو اپنے ساتھ حاضر و ناظر پاتا ہے۔ اور سرور، کشادگی، مسرت، خوف و ادب کی کیفیات اوقات کے اختلاف کے مطابق حاصل ہوتی ہیں اور ان کی بدولت اس کے دل میں حضوریٔ حق ظاہر ہوتی ہے۔ اس وقت سالک کو ولایت عامہ کے دائرے میں داخل سمجھتے ہیں، جسے ولایت صغریٰ کہتے ہیں۔ یہاں اس کے دل پر افعالی تجلّی کا دروازہ کھول دیا جاتا ہے۔ اس وقت اس کے دل میں عجیب و غریب ذوق و سرور پیدا ہوتا ہے اور اس کا شمار عام اولیا میں ہونے لگتا ہے اور جب اس کے باطن میں مشاہدہ و رفاقت کی قوت راسخ ہو جاتی ہے۔ اور ایمان میں سے افضل ترین صورت یہ ہے کہ تو جانے کہ اللہ تعالیٰ تیرے ساتھ ہے[۵] جہاں کہیں بھی تو ہے جیسے محسوس چیز قوت باصرہ کی حس کے ساتھ۔ جب معاملہ یہاں تک جا پہنچتا ہے تو پھر تقویٰ کے اس بے کیف عالم میں الہامی معاملات در پیش آنے لگتے ہیں، اور ظاہری مظاہر کی وساطت کے بغیر ہی اپنے خدا سے سوال و جواب کی نوبت آجاتی ہے۔ دائمی قرب پیدا ہو جاتا ہے، اور وہ خاص ولایت کے مرتبے پر فائز ہو جاتا ہے جسے ولایت کبریٰ کہتے ہیں۔ اس کے دل پر صفاتی تجلّی کا دروازہ کھُل جاتا ہے اور وہ عنایات بے غایات اور الطافِ عمیم سے مشرف ہو جاتا ہے۔ اور خاص اولیائے کرام کے زمرے میں اس کا شمار ہونے لگتا ہے۔ جب مقربین کی طرح مشاہدۂ ذات میں کلی محویت اور استغراق نصیب ہو جاتا ہے، اور شعور خودی سے مطلقاً پاک ہو جاتا ہے اور اس کی صورتِ حال بہ تمام و کمال اس آیت کریمہ کے مصداق ہو جاتی ہے کہ وہ خدا کی ذرا نافرمانی نہیں کرتے کسی بات میں جو ان کو حکم دیا جاتا ہے۔ اور جو کچھ ان کو حکم دیا جاتا ہے اس کو فوراً بجالاتے ہیں[۵]۔ اس مقام بلوغت پر پہنچ کر وہ اس خاص ولایت کے مرتبے کو پہچاننے لگتے ہیں جسے ولایتِ علی کہتے ہیں۔ اس مقام میں اس کے دل پر ذات حق کی شانیں جلوہ ریز ہوتی ہیں اور مکمل حیرت اور فنا نصیب ہو جاتی ہے۔ وہ خاص الخاص اولیا کے زمرے میں شمار ہونے لگتا ہے۔ اور جب اس میں عروج و نزول کے مراتب کی جامعیت اور خالق و مخلوق کی طرف توجہ میں اعتدال پیدا ہو جاتا ہے، اور یہ سارے معاملات علم الیقین اور عین الیقین کے

مدارج سے گزر کر حق الیقین سے جا ملتے ہیں اور انفس و آفاق (دُنیا اور اہل دُنیا) کے تمام حجابات اور پردے سے دور ہو جاتے ہیں تو اُسے تربیت کا کام سونپ دیا جاتا ہے، اور اُس کی سب الہامی باتیں ہر قسم کی غلطی، خطا یا شک و شبہ سے مبرا ہوتی ہیں تو کمالاتِ نبوت کے شرف سے مشرف ہو جاتا ہے اور اس مقام و مرتبے میں اس پہ تجلّیٔ ذات کا ظہور ہوتا ہے جسے اصطلاح میں سلوک کہتے ہیں۔ یہاں پہنچ کر اُسے انبیائے کرام کے نائب اور اللہ تعالیٰ کا خلیفہ ہونے کی سعادت حاصل ہو جاتی ہے۔ اور اُسے انبیائے بنی اسرائیل کے زمرے میں شمار کیا جاتا ہے اور باقی تمام دیگر ضروری مقامات مثلاً کمالاتِ رسالت، اولوالعزمی، پائنداری، دوستی، خالص محبت، ملی جلی محبوبیت، خالص محبوبیت، حقیقت کعبہ، قرآنی حقیقت، حقیقتِ نماز، اور حقیقی معبودیت، جن کی طرف حضرت مجدد الف ثانیؒ نے اشارہ کیا ہے، اور مجددی رسالوں میں جن کا مفصل ذکر بھی ہے، انہی کمالات نبوت کے کلی مرتبے کے ضمن میں ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنے بزرگ بندوں میں سے جسے چاہتا ہے ان جزئی امور سے بھی نواز دیتا ہے اور کسی منصب پر نصب کر دیتا ہے یا سبھی مناصب عطا فرما دیتا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے وہ جسے چاہے اس پر فضل کرتا ہے۔ وہ بہت بڑے فضل والا ہے۔ اور ان تمام جزئی اور کلّی مراتب سے آگے مرتبۂ خالص محمدیہ ہے (ان سب پر درود و سلام) جو ان تمام مراتب کی حدبندی کرتا ہے اور سب پر محیط ہے۔ اس سے فوقیت کا گمان بھی سراسر جہالت اور گناہ ہے کہ اُس سے تجاوز منع ہے کیونکہ کمالاتِ نبوت جو اک کلی اور عالی ترین مرتبہ ہے بھی عام معنوں میں ہے۔ اور نبوتِ مطلقہ سے متعلق ہے۔ اور ہر نبی کی نبوت اس میں شامل ہے۔ لہٰذا اس کی جزوی خصوصیات مثلاً کمالاتِ رسالت و اولوالعزمی وغیرہ بھی انہی خصوصیات کی بنا پر اعلیٰ و ارفع ہے جیسے پہلے بزرگوں نے بیان فرمایا ہے۔ اور ہر ایک منصب کو ہر ایک نبی کے قدموں تلے گنا ہے لیکن منصب محمدیہ کا ایک خاص مفہوم ہے جس کا مرتبہ بڑھا کر اُسے اشرف المخلوقات کے تحت لایا گیا (ان پر درود و سلام ہو) لہٰذا وہ تمام مرتبوں کا مجموعہ اور سب سے بلند ترین ہے اور تمام مناصب سے اعلیٰ۔ جو فضل و کمال بھی فرض کیا جائے اسی کی جزئیات اور شاخوں میں سے ہوگا۔ اور اس ختمیت نبوت کے اس جامع اور عالی مرتبے کے تحت اور اس سے پست ہے۔ یہ وہ بلند ترین مرتبہ ہے جہاں جا کر تمام مرتبے ختم ہو جاتے ہیں۔ اب حق سبحانہ تعالیٰ نے جسے چاہا ان کے خانوادے سے مشرف فرما دیا، اور اللہ جسے چاہتا ہے ان کی نسل عالی سے بنا دیتا

ہے، اور جسے چاہے گا اُسے نوازتا رہے گا۔ خالص محمدیت کا یہ منصب جلیلہ انہی عالی شان حضرات کی ذات سے مخصوص ہے کیونکہ درحقیقت وہ اسی نور محمدی کی شعاعوں سے پیدا ہوئے ہیں، اور اُمّت محمدیہ میں ان کے مشن کو جاری رکھنے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ اب انشاء اللہ رسول اللہ صلعم کے صدقے اور ان برگزیدہ اصحاب کے وسیلے سے فیض محمدی قیامت تک جاری رہے گا اور اللہ کے بندے ان کی برکات سے مستفیض ہوتے رہیں گے اور طریق محمدی میں داخل ہوکر خالص مومن بنتے رہیں گے۔ اور خالص محمدیت کے مرتبے میں داخل ہونے کی صلاحیت اُمّتِ مرحومہ کے سبھی افراد میں ہے۔ اور اب بھی امتِ محمدیہ میں سے خصوصی طور پہ جسے چاہیں نوازتے ہیں، اور جن کی قسمت میں یہ امتیاز لکھا ہوتا ہے اُنھیں مل ہی جاتا ہے اور حضرت امام مہدیؑ موعود کے ظہور کے وقت یہ استعداد پورا پورا زور پکڑ جائے گی اور چاروں کھونٹ اسی نورِ واحد سے چمک اُٹھیں گے۔ اے رب ہمارے مکمل کردے ہمارے لیے ہمارے نور کو اور ہمیں بخش دے۔ بے شک تو ہر چیز پہ قادر ہے۔ لہٰذا سالکوں اور عالموں کے لیے سب سے پہلے تو کسی مرد خود آگاہ و عارفِ ذات کی طرف رجوع کرنا اشد ضروری ہے۔ ان کی حاجتوں کا قبلہ اور ان کی مرادوں کا کعبہ وہی ہے۔ ترجمہ رباعی خدا مست انسان کا دل جو ہر وقت خدا سے لَو لگائے رکھتا ہے اور ہر قسم کے چھوٹے بڑے دنیوی اور نفسانی خیالات سے خالی رہتا ہے۔ وُہ اہل تحقیق لوگوں کی حق بین نگاہوں میں بیت اللہ شریف کے ہم مرتبہ و ہم قرینہ ہوتا ہے۔ مصنف کے مطابق اس رباعی میں دل سے مراد وہی انسانی رُوح ہے جسے نفس ناطقہ کہتے ہیں، اور آگاہی سے مراد ہے ہر وقت شہود و مشاہدہ کی حالت میں رہتے ہے، خالی گشتن سے مراد دل میں کسی قسم کے دنیوی یا نفسانی خیالات کا گزر نہ ہونا ہے، اور شاہ و گدا سے مراد دُنیا کے مختلف اعتبارات سے ہے۔ دیدہ سے مُراد چشم بصیرت ہے اور اہلِ تحقیق سے مراد عارفانِ ذات ہیں۔ مصرع دگر بودن سے مراد ہے ہم قرینہ و ہم مرتبہ ہونا۔ بیت اللہ سے مُراد حقیقتِ کعبہ ہے۔ حاصل کلام یہ کہ وہ انسانی دل یا نفس ناطقہ جو دائمی شہود و مشاہدہ کی حالت سے مشرف ہے۔ وہ حدیثِ نفس سے بے خطر ہے۔ دُنیا کے مختلف قسم کے خیالات کا اُس کے دل سے گزر نہیں ہوتا۔ لہٰذا عارفوں کی نگاہ حق بین میں اس کے مرتبے کا مقابل ہے۔ خانۂ خدا اور پرستش کے لائق ہونے کے لحاظ سے حقیقت کعبہ کا ہم قرینہ و ہم مرتبہ ہے۔ دوسرے مصرع میں دل آگاہ کو بیت اللہ کی جگہ کہا۔ مصرع اور بیت کے الفاظ کی مناسبت سے یوں کہا گیا ہے، اور دوسرے

مصرع کا مطلب یہ ہے کہ وہ دل جو آگہیٔ حق کی صفت سے دوامی طور پر متصف ہے وہ دوسرا خانہ کعبہ ہے اور سالکان کی توجہ کا قبلہ، بلکہ حقیقی بیت اللہ ہے ہی یہی جیسا کہ حدیثِ قدسی اس امر کی خبر دیتی ہے کہ مجھے نہ زمین میں ڈھونڈو نہ آسمانوں میں، مجھے کسی مومن کے دل میں تلاش کرو۔ لہٰذا یہی کوشش اور اہتمام کرو کہ حقیقت دل کو جسے ادراک کرنے والی قوت سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے اللہ کے سوا کسی اور کی طرف متوجہ ہوئے بغیر ہی حاصل ہو جائے۔ اور یہ حالت دل کی اس طرح دائمی صفت بن جائے کہ اگر اسے بھلانا بھی چاہو تو نہ بھلا سکو۔ جب تم ایسے بن جاؤ گے تو تم دوسرے طالبانِ حق کی توجہ کا قبلہ بن جاؤ گے۔ زمین و آسمان میں یہ اہلیت نہیں کہ اللہ تعالیٰ براہِ راست ان پر تجلیات برسائے اور ان مادی وجودوں میں اپنے بے جان اجسام کی ضخامت کے باوجود اتنی وسعت نہیں کہ اُس کی لامتناہی تجلیات ان میں سما سکیں۔ وہ وسعت عارف ذات ہی کے دل کو نصیب ہے جو سراسر خداوندی حُسن باکمال کا آئینہ دار ہوتا ہے۔

اور اُس کی لامتناہی تجلیات کا مرکز و مظہر ہوتا ہے۔ لہٰذا اپنے تزکیۂ نفس اور صفائیٔ قلب کی پوری سعی و کوشش کرنی چاہیے تاکہ نفس ناطقہ جو حقیقت دل ہے، اور جسے قوت مدرکہ اور قوت عاقلہ بھی کہتے ہیں ماسوی اللہ کے پھندے سے آزاد ہو جائے، اور غیر کا شعور جو دنیوی اعتبارات سے عبارت ہے اللہ سے لو لگانے کی راہ میں حائل نہ ہو جائے اور معرفتِ حق کے حصول میں مانع نہ ہو۔ اور یوں تمھیں اس دُنیا سے جسے ہم نے "غیر" کے نام سے یاد کیا ہے کوئی لگاؤ اور التفات نہ رہ جائے۔ اور قرآن حکیم کی اس آیت کریمہ کہ "نگاہ نہ تو ہٹی اور نہ پڑی" کی یہی حقیقت ہے۔ اگر یہ مقام میسر آجائے، اور تکلف درمیان سے اُٹھ جائے، اور یہ شہود و مشاہدہ تیرے دل کی اس طرح دائمی صفت بن جائے جسے آنکھ میں دیکھنے اور کان میں سننے کا وصف ہے کہ اگر تم ارادۃً چاہو بھی کہ آنکھ دیکھنے اور کان سننے سے باز رہے تو تم ایسا نہیں کر سکتے، بالکل اسی طرح اگر تم چاہو بھی کہ دل کو مشاہدۂ ذاتِ حق سے باز رکھو اور اُسے غافل بناؤ تو خود میں یہ قدرت نہ پاؤ۔ جب یہ مقام نصیب ہو گیا تو تم میں وہ استعداد پیدا ہو گئی کہ لوگ اپنے دل کا رُخ تمھاری طرف کریں، اور یوں تمھارے وسیلے سے مشاہدے کی راہ دوسروں پر بھی کھل جائے گی اور تو لوگوں کی توجہ کا قبلہ و کعبہ بن جائے گا اور بنی نوع انسان کو رشد و ہدایت دینے والا بن جائے گا۔

سلوک کی اصطلاح میں قبلۂ توجہ مرشد کو کہتے ہیں یعنی جس طرح بظاہر نماز کے وقت قبلہ کی طرف منہ کرنا لازمی ہے۔ اسی طرح باطنی طور پر نماز کی حقیقت سے شرف یاب ہونے کے لیے مرشد کی

طرف دلی توجہ دینا ضروری ہے، اور کسی کامل کا وسیلہ پکڑنا فرض ہے کیونکہ مرشد کے بغیر اللہ تک رسائی محال ہے، اور یہی سنت الٰہی ہے جیسا کہ خود اللہ تعالیٰ نے قرآن میں فرمایا ہے کہ اس کی طرف وسیلہ ڈھونڈو۔ اور اس بڑی سعادت کو حاصل کرنے کے لیے ان عارفان ذات کی صحبت سے بڑھ کر اور کوئی وسیلہ نہیں جن کے دل ہر شے سے خالی ہو کر فقط اسی ذات کے شہود و مشاہدے سے پُر ہیں۔ ان بزرگواروں کے آداب صحبت کو ملحوظ خاطر رکھنے، اور اُن سے وسیلے کی نسبت پیدا کرنے میں یعنی ریاضت، عبادت، نا اہلوں سے ترکِ تعلق، گوشہ نشینی، کم خوری، کم خوابی اور کم گفتاری سے، قصہ کوتاہ یہ کہ فطری طور پہ اللہ کی طرف توجہ پیدا ہو جاتی ہے، اور سلوک کی کتابوں اور رسالوں کے مطالعے اور اس علم میں دیگر تحقیق سے اس علم سے کسی حد تک نسبت قائم ہو جاتی ہے، اور ان مطالب کے سمجھنے کی راہیں کھل جاتی ہیں لیکن اللہ تعالیٰ کے ساتھ قلبی نسبت پیدا کرنے اور معرفت و حقیقت کے انکشاف کا سب سے بڑا ذریعہ انہی لوگوں کی صحبت ہے، جو ذاتِ الٰہی کے مشاہدے سے مشرف ہو چکے ہیں۔ اپنے آئینۂ دل کو انہی صاحب جمال لوگوں کے روبرو لانا چاہیے تو پھر جو کچھ ان کے سینے میں ہے وہ خود بخود بغیر کسی محنت و مشقت کے تیرے سینے میں منقوش ہو جائے گا۔ سنت الٰہی یونہی جاری ہے کہ زندہ سے زندہ کو فیض پہنچتا ہے اور چراغ سے چراغ جلتا ہے۔ اور تو سنّت الٰہی میں کوئی تبدیلی نہ پائے گا۔ مصاحبت اختیار کرو اللہ کے ساتھ۔ پس اگر تم اللہ کے ساتھ مصاحبت اختیار نہیں کر سکتے تو ساتھی بن جاؤ اس کے جو اللہ کی مصاحبت رکھتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ تمھیں پہنچا دے اللہ عزوجل تک۔ آدابِ صحبت کو ہر وقت ملحوظ خاطر رکھنا چاہیے تاکہ فیض کی راہیں کھلی رہیں۔ بے ادب کو تو کہیں سے فیض حاصل نہیں ہوتا۔

تادیب (ادب سکھانا)

میرے قبلہ والد بزرگوار (ان پر خدا کی برکتیں نازل ہوں) فرمایا کرتے تھے کہ سرکار دربار میں بادشاہوں اور امیروں کے آداب ہاتھ پاؤں اور دیگر اعضا سے متعلق ہیں۔ گو کہ ان کے نوکر چاکر اور لگے بندھے ان کے سامنے مودبانہ طور پہ ہاتھ باندھے کھڑے رہتے ہیں۔ اور بظاہر آداب و تسلیمات بجالاتے ہیں اور سلام کرتے ہیں لیکن ان کے دلوں میں گلہ شکوہ ہوتا ہے۔ لہٰذا ان میں دلی

ادب ہرگز پیدا نہیں ہوتا۔ یونہی علمائے ظاہر کے آداب بھی زبان پر ہیں۔ وہ کبھی کوئی ایسا لفظ زبان پر نہیں لاتے جو شرع یا مذہبی عقیدے کے خلاف ہو لیکن دل میں وسوسوں کے خناس سمائے ہوئے ہیں اور اُنھیں دلی اطمینان نصیب نہیں ہوتا۔ لیکن درویشوں کے آداب کا تعلق دل سے ہوتا ہے، جس سے اُنھیں مکمل خلوص، سکون اور تاثیر حاصل ہوتی ہے۔ ان کے مخلصین کو بھی ان سے دلی عقیدت ہوتی ہے۔ چونکہ زبان اور دیگر اعضا دل کے تابع ہوتے ہیں لہٰذا ظاہری آداب سے بھی نہیں چوکتے بلکہ بڑے احسن طریق سے انجام دیتے ہیں کیونکہ جتنا انکسار دل میں ہوگا اتنا ہی دیگر اعضا میں۔ آخر بندہ بشر ہے تو اس تقاضے سے اگر بظاہر اُن سے سہواً کوئی غلطی یا لغزش ہو بھی جائے تو وہ گستاخی نہ ہوگی کیونکہ یہ کسی خباثت کی بنا پر نہ تھی۔ برعکس اہل ظاہر کے کہ وہ اگرچہ بڑی تعظیم و تکریم اور عجز و نیاز سے کام لیتے ہیں اور کوئی نازیبا بات زبان پر نہیں لاتے لیکن یہ سراسر منافقت ہوتی ہے کیونکہ اللہ تمھاری شکلوں اور تمھارے عملوں کو نہیں دیکھتا • بلکہ وہ تمھارے دلوں اور تمھاری نیتوں کو دیکھتا ہے[۵]۔ ظاہری اور باطنی آداب جو قبلۂ بزرگوارم والد صاحب کے حضور میں مومنوں کا شعار تھے اور اب بھی ہیں ان کی جزئیات تک کی تفصیل انہی کی "نالۂ عندلیب" نامی کتاب میں افسانوی صورت میں کئی مقامات پہ درج ہیں۔ قارئین اُدھر ہی رجوع فرمائیں اور ان کے مطابق اپنے اخلاق و آداب کو سنواریں۔ یہ مختصر مقالہ ان تمام تفاصیل کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا میں مختصراً جامع صورت میں یہی لکھتا ہوں کہ کمال ادب یہی ہے کہ خود کو اور اپنے ارادوں کو مرشد اور اُس کے ارادوں کے سامنے بالکل ہیچ سمجھیں، اور بالکل فنا فی المرشد ہو جانا چاہیے تاکہ یہ من و تو کا پردہ اُٹھ جائے اور فقط وہی رہ جائے۔ مرشد سے رابطہ کی نسبت جب تک عشق کی حدوں کو نہ چھو جائے یہ مقام فنافی الشیخ حاصل نہیں ہو سکتا۔

فنا کے سہ گانہ مقامات کے سلسلے میں تنبیہ، اس کے مطابق بقا کے درجات اور طریق محمدیہ (ان سب پر خدا کا سلام و درودؐ) کی خاتمیت کا بیان

سارے سلسلوں میں اصحاب سلوک کے نزدیک فنا کے تین درجے ہی مقرر ہیں: پہلا درجہ فنا فی الشیخ، دوسرا فنا فی الرسولؐ اور تیسرا فنا فی اللہ ہے۔ اور فنا کے ان تینوں درجوں کے حصول کے

بغیر سالک کے حق میں قرب الہی کو روا نہیں سمجھتے ۔ کہتے ہیں کہ جب سالک فنا فی الشیخ کے درجے سے ترقی پاتا ہے، اور مرشد کی ذیل سے نکل آتا ہے تو وہ فنا فی الرسولؐ کے مرتبے کو پہنچتا ہے ۔ جب اس مرتبے سے بھی ترقی کر جاتا ہے تو وہ مرتبۂ فنا فی اللہ پر فائز ہو جاتا ہے ۔ اور اس حالت فنا فی اللہ کو عروج کا انتہائی درجہ سمجھتے ہیں، اور اس کے بعد جب بقا باللہ کی کیفیت وارد ہوتی ہے تو اُسے نزولی معاملے کا آغاز سمجھتے ہیں کیونکہ اس حالت بقا باللہ میں عارف روبہ مخلوق ہو جاتا ہے جب کہ فنا فی اللہ کی حالت میں وہ روبحق ہوتا ہے ۔ اور مکمل و اکمل اسی سالک کو کہتے ہیں جو زیادہ تر حالت نزولی میں رہتا ہو اور فنا فی الرسول کے مقام میں آکر ثابت قدم ہو جائے ۔ اس نزولی درجے کے مالک کو اُس عروجی درجے والے سے اعلیٰ و ارفع گنتے ہیں کہ انتہا کو پہنچ کر پھر ابتدا کی طرف رجوع کیا ۔ بڑے بڑے مشائخ اور اولیائے کرام جو مرجعِ خلائق اور نائبان نبوت رہے ہیں اسی منصب کے مالک تھے ۔ خلق خدا کے رشد و ہدایت کا سلسلہ اس نزولی مقام پہ آئے بغیر صورت پذیر نہیں ہوتا، اور خالق و مخلوق سے یہ معاملہ انبیائے کرام ہی کا کام ہے اور اُنھی کا تتبع کرتے ہوئے پھر اُن اولیائے کرام کا جو مقام ارشاد پہ پہنچ چکے ہوں ۔ کہتے ہیں کہ جب سالک اس مرتبۂ عروج تک پہنچ جاتا ہے تو اُسے مرشد کے اتباع کی ضرورت نہیں رہتی ۔ وہ براہِ راست اپنے رب سے رابطہ قائم کرتا ہے ۔ اور اس مقام پر اس پہ جو انکشافات بھی ہوتے ہیں وہ یوں کرتا ہے کہ تقلید سے نکل کر تحقیق کے دائرے میں آجاتا ہے جیسا کہ ظاہری علوم میں بھی جب شاگرد اجتہاد کے مرتبے تک پہنچ جاتا ہے تو اُسے اُستاد کی متابعت ضروری نہیں رہتی ۔ اُسے خود اپنے اجتہاد سے کام لینا چاہیے ۔ یہ اُستاد سے انکاری ہونے کی صورت ہرگز نہیں، بلکہ مجتہد ہونے کا تقاضا یہی ہے ۔ اور اگر وہ یوں عمل پیرا نہ ہو تو حق اللہ تلف کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو کچھ اس پہ کشف کیا اور تحقیق سے ثابت کر دکھایا ۔ وہ گویا اس کا شکر گزار نہیں ہوتا ۔ لہٰذا صاحبینؒ نے بعض مسائل میں اپنے استاد کا اتباع نہیں کیا، اور بعض امور میں حضرت امام ابوحنیفہؒ نے بھی صاحبین سے موافقت کا رجوع کرتے ہوئے یہی فتویٰ دیا ہے ۔ لیکن کیا مجتہد، کیا محقق عرفا کوئی کبھی اتباعِ سرورِ کائنات صلعم سے باہر نہیں آئے ۔ بلکہ تمام انبیا بھی خاتم النبیینؐ ہی کی حقیقت جامعہ کے تحت ہیں (ان پہ خدا کی تمام رحمتیں اور کامل سلامتیاں ہوں) یہ حدیث پیغمبر کہ حمد کا جھنڈا اس دن میرے ہاتھ میں ہوگا اور اُس کے نیچے آدم ہوں گے، اور وہ جو ان سے کم درجے کے ہوں گے، اسی امر کی

مضمر ہے۔ اور خدائے ذوالجلال نے اپنی خاص عنایت اور قبلہ بزرگوارم والد صاحب کی پاک روح کے توسط و توسل سے فنافی الشیخ، فنافی الرسول اور فنافی اللہ کے سلسلے میں اس احقر العباد پر جو روشنی ڈالی ہے وہ یہ ہے کہ فنافی اللہ اور بقا باللہ تمام ممکنات موجودہ کو اس حکیم مطلق کے انداز سے کے مطابق خود بخود حاصل ہے کیونکہ ساری مخلوقات کا مبدا و مرجع حق تعالیٰ ہی ہے، اور کوئی موجود کسی وقت بھی اس خداوندی لین دین سے خالی نہیں لیکن دیگر مراتب کمالات انسانی کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ دو کیفیتیں بھی مخصوص انسانی مناصب میں سے منصبی حیثیت ہی رکھتی ہیں جو اللہ تعالیٰ کاملوں ہی کو عنایت فرماتا ہے۔ اور پھر انہی کے راستے ان پر مزید فضل و کرم اور عنایت کرتا ہے۔ پس ان ہر دو نسبتوں کا معاملہ اور کاروبار سلسلۂ نبوت کے ختم ہونے سے پہلے بھی بغیر انسانی وساطت اور وسیلے کے براہ راست جاری تھا یعنی ہر نبی اللہ تعالیٰ کے انتخاب ہی کی بدولت بغیر کسی اور کی وساطت کے یہ نسبت حاصل کر لیتا تھا۔ فرشتوں، قدسیوں یا دیگر ارواحِ جلیلہ اور تائید غیبی کی وساطت بشری وساطت کے قبیلے سے نہیں اور ایک نبی کا دوسرے نبی کا تتبع بھی وساطت میں داخل نہیں، اور اُس کے اصل اور براہِ راست کام میں کوئی خلل و خرابی پیدا نہیں کرتا۔ لہذا انبیائے کرام کے نصیب میں فنا و بقا کے ان تمام مراتب میں سے خاص مرتبہ فنافی اللہ اور بقا باللہ کا ہے دوسرے وسائل سے فنا و بقا حاصل کیئے بغیر کیونکہ شانِ نبوت اسی کا تقاضا کرتی ہے۔ اگرچہ بالکل کسی وسیلے کے بغیر یہ بھی نہ ہو سکے گا۔ لیکن اس کی تعبیر براہ راست ہی سے کی جا سکتی ہے۔ چونکہ ان کا معاملہ بغیر کسی وساطت کے براہِ راست حقِ تعالیٰ سے ہے جو تغیر و تبدل سے ماورا ہے۔ لہذا اُنھیں اپنے کاموں میں اللہ کی طرف سے کسی قسم کے تعطل یا تردید کا خدشہ نہیں ہوتا۔ وہ ایسی ہستیاں ہیں جو معزول ہو ہی نہیں سکتیں، اور ختمِ نبوت کے بعد جب براہِ راست تعلق کا سلسلہ منقطع ہوگیا تو فنافی اللہ اور بقا باللہ اب فنافی الرسول اور بقا بالرسول ہی کی شرط و قید تک مشروط ہوگیا۔

حضور پاک صلعم کے زمانے میں حضورؐ کے صحابہؓ کو کسی دوسرے وسیلے کی حاجت نہ تھی، مگر اسی ضمن میں حضور پاکؐ کی آل اولاد اور خاصانِ رسول کی متابعت اور محبت بھی انہی کے توسل کے زمرے میں آتی ہے اور ان کے بعد کسی خاص مرشد کا وسیلہ سب کے لیے ضروری ہے کیونکہ اُسے سرگرم عمل دیکھ کر اس کا گرویدہ ہو کر سبھی مراتب آسانی سے طے ہو جاتے ہیں، سوائے اُس کے جو طریقۂ اویسیہ اختیار کرے۔ لیکن وہ بھی دراصل کسی ظاہری وسیلے سے قطعی طور پر خالی نہیں ہوگا کیونکہ حضور پاک کے انمٹ

نقوشِ پا ہمیشہ درمیان میں ہوں گے۔ اور حق بات تو یہ ہے کہ فنا کے ان تین مراتب پہ مشرف ہوئے بغیر قربِ الٰہی حاصل نہیں ہوتا۔ اوّل جب تک مکمل طور پہ فنا فی الشیخ نہ ہو جائیں فنا فی الرسولؐ کا درجہ نہیں مل سکتا۔ جتنی کمی ادھر رہ جائے گی، اتنی ہی کمی اُدھر بھی رہ جائے گی، اور جب تک مکمل طور پر فنا فی الرسولؐ نہ ہو جائیں فنا فی اللہ کا درجہ نصیب نہیں ہوتا۔ فنا فی اللہ کے بعد بقا باللہ کا درجہ ظہور پذیر ہوتا ہے۔ اسی طرح فنا کے ان دونوں درجوں کے بعد بقا باللہ کا مرتبہ ملتا ہے۔ اور کامل ترین سالک وہی ہے جو بقا باللہ کے مقام سے بقا بالرسولؐ کی طرف نزول کرے، اور پھر اُس سے بھی بڑھ کر کامل وہ جو مقام بقا سے شیخ و مرشد کی طرف نزول کرے، اور عروج و نزول کے اس دائرے کو پورے طور پہ تمام کرے۔ اور اس مرتبے میں استقلال و دوام پیدا کرے، کیونکہ یہی سنت الٰہی ہے کہ جو نزول میں جتنا نیچا، عروج میں اتنا ہی اونچا۔ چونکہ انسان تمام موجودات کا نچوڑ اور اشرف المخلوقات ہے۔ پس عروج میں پہلی حالت فنا فی الشیخ کی ہے۔ اس کے بعد فنا فی الرسول کی اور اس کے بعد فنا فی اللہ کی۔ نزول کے زمانے میں پہلی حالت بقا باللہ کی رونما ہوتی ہے۔ اس کے بعد بقا بالرسول کا درجہ نصیب ہوتا ہے۔ آخر کار ہر وہ خوش نصیب انسان جو مکمل نزول تک پہنچے اور خوش قسمتی سے اُسے شیخ باقی بالرسولؐ بھی مل جائے تو بقا بالشیخ میسر ہو جاتی ہے۔ یہ آخری مرتبہ اللہ تعالیٰ نے محض مخلص محمدیوں ہی کے لیے رکھا ہے۔ دوسرے تمام تر کوشش و قوت کے باوجود اس سے مشرف نہ ہو سکے۔ اس آخری مرتبے کا بیان کسی نے نہیں کیا، اور نہ ہی کوئی اس کی قدر و منزلت کو جانتا ہے بلکہ بہت سے ضعیف الاعتقاد جو محبت کی نعمت سے محروم ہوتے ہیں، اسی زعم میں وہ خود کو فنا فی اللہ اور فنا فی الرسولؐ سمجھتے ہیں۔ وہاں کامل ترین محقق مرشد کی شدید محبت اور انتہائی پیر پرستی کو پہنچ کر کہتے ہیں کہ وہ ابھی فنا فی الشیخ ہی کے مرتبے میں ہیں، اور نسبتِ رابطہ کی قوت رکھتے ہیں۔ ابتدا میں یہی قسم ہوتی ہے اور مرشد سے اسی قدر رابطہ چاہیے لیکن ہم اس مرتبے کو طے کر چکے ہیں۔ اے ناحق شناس فنا فی الشیخ کا ابتدائی درجہ اور ہے، اور بقا بالشیخ کا درجہ کچھ اور ہے، وہ آخر میں جا کر حاصل ہوتا ہے تم اگر اس فرق کو دریافت ہی نہ کر سکے تو یہ اس بلند ترین مرتبے پر مشرف نہ ہو سکنے کی بنا پہ ہے۔ خواہ وہ نااہلی یا کسی ذاتی نقص کی بنا پہ ہو خواہ محض شومیٔ قسمت یا دیگر وجوہات کی بنا پہ ہو۔ آخر تم کر بھی تو کیا کہ تم معذور ہو (قابلِ معافی ہو) اس لیے کہ تمھیں مرشد سے دلی محبت ہی نہ تھی، تم تو وہ محض ملاقات

کی غرض سے کرتے تھے اور اپنے زعم میں اُسے خالص للہٰ محبت سمجھتے تھے۔ جب اپنی استعداد کے مطابق تھوڑی بہت غرض حاصل ہوگئی اُسے تم نے واصل بحق ہونے سے تعبیر کر لیا اور مرشد سے بے نیاز ہوگئے۔ اور یہ جو عارفوں نے سعادت مند مریدوں کی ترقی کا جواز پہلے بزرگوں اور اولیائے کرام کے مراتب سے روا رکھا ہے، اور تاخیر زمانی کے باعث ان کے طریقوں اور راستوں کو زیادہ صحیح اور نزدیک تر خیال کیا ہے اور ان کے مطالب و معارف (علوم و فنون) کے افکار کے اتصال کی بنا پر زیادہ مصفا پایا ہے۔ اور تحقیقات کے اختلاف کو اجتہادی اختلاف ہی سمجھا، جیساکہ اوپر ذکر آچکا ہے۔ یہ حق بات ہے اور امر واقعی، لیکن یہ معاملہ پہلے زمانے میں دوسرے سلسلوں میں جو ابتدائی تھے جائز تھا۔ اور حضور پاک ؐ کے طریق محمدیہ کے ظہور پذیر ہونے تک جائز رہا۔ اب یہ محمدی طریقہ جس کی طرف ہم نے اشارہ کیا، جو سب طریقوں سے اعلیٰ و ارفع اور سب سلسلوں کا خاتم ہے انہی معانی کا مقتضی تھا تاکہ ترقی کرتے کرتے اس آخری مرتبے پر ظاہر ہو اور پھر امتِ محمدیہ کے رشد و ہدایت کے لیے باقی بالرسول ؐ کا مرتبہ ظہور پذیر ہوا۔ جب یہ آفتاب عالمتاب ظہور پذیر ہوا تو تمام ستارے چھپ گئے اور ہر جگہ یہی فیض عام جاری و ساری ہوا، اور تمام سلسلے اور طریقے اسی کے ماتحت اور اس سے کم درجے کے ہیں بلکہ سبھی سلسلے اسی سے نکلتے ہیں۔ اس نسبت کے حامل کی وساطت تمام امت کے شاملِ حال ہے۔ جو طریق بھی ہو یا جو فریق بھی ہو، اس کے ہو بہو وہی ہونے یا جزوی طور پر مشابہت یا مکمل رفاقت اور یا ضمنی متابعت کی بنا پر وہ سب اتباعِ رسول ؐ ہی ہے۔ اور سبھی سلسلوں کے اولیا، عارف، مومن اور مسلمان حضرات اسی نسبت محمدیہ کے تحت آتے ہیں۔ خالص محمدیت سے بڑھ کر اور کونسا مرتبہ ہوگا کہ کوئی اُس سے آگے بڑھے۔ جس طرح اجرام فلکی میں عرش تمام جہتوں کی آخری حد ہے، اسی طرح محمدیت بھی تمام باطنی مراتب کی آخری حد ہے۔ اُس سے آگے کا تصور محض وہم و گمان ہے اور فہم و فراست کی گمراہی پر دلالت کرتا ہے۔ احکام ظاہر میں بھی شریعت محمدیہ کے بعد کوئی شریعت نافذ نہیں ہوگی، اور نہ ہی باطنی مقامات میں کوئی طریقہ اس طریق محمدی سے بلند تر ہوگا۔ اس کے بعد اگر کچھ ہے تو اسی نسبت کے ظہور سے شدت و قوت رہ جاتی ہے اور اُسی آفتابِ حقیقت کی ضیا و روشنی، اور خدا نے چاہا تو مہدی ؑ موعود کے زمانے میں اپنی پوری آب و تاب سے چمکے گا اور چار دانگ عالم اُمّت محمدیہ سے معمور ہو جائیں گے۔ اور اختلافات کے سارے

نقوش دُنیا کے صفحے سے مٹ جائیں گے اور خالص نور محمدیؐ ہر چھوٹے بڑے تک پہنچے گا۔ لہذا اے
طالب اس نور کے اقتباس کی طرف رُخ موڑ اور پورے یقین وایمان سے ایسے مخلص مومنوں کی صحبت
کو غنیمت جان جیساکہ حضور پاکؐ نے فرمایا ہے کہ اگر تم گزرو ریاض الجنت سے تو چر چُگ کے خوب
سیر ہوجاؤ۔ لوگوں نے پوچھا ریاض الجنہ کیا ہے۔ فرمایا ذکر کے حلقے۔ اگر شومیٔ قسمت یا دنیوی آفات
کی وجہ سے صحبت میسر نہ آئے تو مقررہ طریق کے مطابق مسلسل قلبی، نفی اور اثبات کے اوراد و وظائف
اور ذکر اذکار میں مشغول رہنا چاہیے تاکہ حقیقت انسانیت کے مخفی جذبے کا اثر ظہور میں آئے اور تجھے
بے خود و سرشار کردے اور تو اپنی اور دیگر ہستیوں سے نجات پاکر بالکل فنا ہوجائے۔ شومیٔ قسمت
سے ہماری مراد یہ ہے کہ بظاہر تو کوئی رکاوٹ نہ ہو اور مواقع بھی ہوں مگر غفلت، تساہل اور سہل
انگاری کی وجہ سے ان کی صحبت میں حاضر نہ ہو اور زمانے کی آفات یہ ہیں۔ مثلاً دور دراز کا سفر، مُسافرت
ملازمت کے بندھن، بیماری یا اسی قسم کی دیگر رکاوٹیں ان کی خدمت میں حاضر ہونے سے مانع ہوں
لہذا ایسے حالات میں بھی وقت ضائع نہ کرے۔ چاہیے کہ جہاں کہیں بھی ہو مرشد کے بتلائے ہوئے
اوراد و وظائف کو مسلسل دائمی طور پر جاری رکھے اور قلبی آگہی کی باگ ڈور کو کبھی ہاتھ سے نہ چھوڑے
تاکہ ان اذکار اور مرشد کے تصوّر کی برکت سے اس کے باطن میں اللہ کی وہ کشش ظہور پذیر ہوجائے
جو ذات باری تعالیٰ نے ہر انسان کو ودیعت کی ہے۔ اور تیرے فہم وادراک کی قوت تجھے ماسوی اللہ
اور ہر کسی سے حتیٰ کہ اپنی ذات تک سے آزاد کردے، اور تجھے دائمی حضوری نصیب ہوجائے۔

ترجمہ رباعی ہستی کے سمندر سے شور وغل اُٹھ رہا ہے۔ یہ سارا جوش وخروش کشمکش علم کی وجہ سے
ہے۔ یا اللہ مجھے مدہوش و بے خود بنا کر میری مدد فرما۔ دونوں جہانوں کا بوجھ اسی ہوش کے کندھوں پر
آپڑا ہے۔ مصنف کی اپنی تشریح کے مطابق بحرِ ہستی سے مُراد مرتبۂ وجودِ مطلق ہے۔ خروش سے
مُراد شورشِ کثرت ہے، کشمکش سے مُراد اعتباری مراد کا ظہور اور چھپنا ہے۔ یہی اس کے مدّوجزر ہیں،
جوش سے مُراد طرح طرح کی قیود کا سر اُٹھانا ہے، رب سے مراد مرتبۂ وحدت الٰہی، بے خودی سے مراد
ہے انانیت موہومہ کا رفع دفع ہونا، اور ہوش سے مراد شعور خودی ہے، اور ان اصطلاحی تشریحات
کے بعد مصنف خود رباعی کا مطلب یہ لکھتا ہے کہ وجودِ مطلق جو کثرت کی شورش میں گھر گیا ہے۔ یہ
علم کے اظہار و اخفا کی وجہ سے ہے۔ ان اعتباری مراتب کا کیا ہے؟ جو کچھ علم کی بدولت ظاہر ہوتا ہے

وہ علم میں ظاہر ہو جاتا ہے۔ اور جو کچھ مخفی رہتا ہے وہ علم سے بھی مخفی رہتا ہے۔ وگرنہ جو کچھ ہے سو ہے، اور جو نہیں ہے وہ نہیں ہے لہذا اے اللہ تعالیٰ میں تیری جناب میں اپنی اس موہوم انانیت کے امتیاز سے دہائی دیتا ہوں کیونکہ دونوں جہان کے معاملات کا بوجھ اسی خودی اور ہوش کے کندھوں پر آپڑا ہے اور آدمی اپنے ہی ارادی افعال کے زیر بار ہے۔ اپنے اعمال سے جو تم کماتے ہو تمھارے لیے ہے، اور جو ہم نے کمایا وہ ہمارے لیے ہے۔

هوالناصر

شروع اللہ کے نام سے جو نہایت مہربان اور رحم والا ہے

ہر قسم کی تعریف اللہ کے لیے ہے جس نے ہمیں ہدایت دی ہے اس کی، اور ہم ہدایت پانے والے نہیں تھے۔ اگر اللہ نے ہمیں ہدایت نہ دی ہوتی۔ بے شک آئے ہیں ہمارے پاس ہمارے رب کے رسولؐ حق کے ساتھ، اور درود و سلام ہو سید المرسلینؐ اور خاتم النبیینؐ پر اور آپ کی آل پر، تمام اصحاب پر۔ اما بعد یہ چھٹا باب ہے۔ جس کا نام ہدی اللہ (اللہ کی ہدایت) ہے۔ ہدایت دے اللہ ہمیں اور تمھیں، ایسی ہدایت جو مطلوب تک پہنچا دے۔ جیسے کہ اُس نے ہدایت دی ہمیں اور تمھیں راستے کو دیکھنے کی ہدایت۔ وہی ذات ہے جس نے ہر چیز کو اُس کی تخلیق عطا کی اور پھر ہدایت دی۔ ہر انسان بالضرور سمجھتا ہے اپنی برائی کو اور بھلائی کو طبعاً، اور فرق کرتا ہے نیکیوں اور برائیوں میں، اور ایمان رکھتا ہے اللہ پر فطری طور پر یوم الست کے مطابق۔ جب کہ ہدایت دیتا ہے اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے ہدایت ثانیہ مخصوصہ کے ساتھ۔ پس خیر کے اسباب کا رُخ اسی طرف موڑ دیتا ہے، اور اُسے توفیق دیتا ہے نیکیوں کی، اور حقیقت توحید کے اعتراف سے اُسے مشرف کرتا ہے۔ اور کھول دیتا ہے اُس پر اُس کا پردہ ہدایت کے ساتھ جو پہنچاتی ہے مطلوب تک۔ اور گمراہ کرتا ہے جسے چاہتا ہے اسبابِ شر کا رُخ ان کی طرف کر کے، اور بُرائی کی قدرت عطا کر کے اور حقیقت کے ادراک کو معدوم کر کے۔ اور اس کی سمع اور بصر پر پردہ ڈال کر، اور اس سے زیادہ

کون گمراہ ہوگا۔ جس نے پیروی کی اپنی خواہش کی بغیر ہدایت کے اللہ کی طرف سے۔ بے شک اللہ تعالیٰ ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا۔ پس اللہ تعالیٰ کی ہدایت عوام کے لیے بھلائی کے عمل کے کرنے کی توفیق ہے بغیر حقیقت کے ادراک کے برابر ہے کہ اُس چیز کا وقوع طبعاً ہو یا اتباعاً ہو یا عادتاً ہو۔ یہ کافی ہے اس کی اُخروی نجات اور دنیوی بھلائی کے لیے۔ اور خودی کے لیے حقیقت کے ادراک کے ساتھ پس وہ جانتے ہیں راز اُس چیز کا جو وہ کرتے ہیں، بلکہ جانتے ہیں راز اُس چیز کا جو اُن کے اختیار میں بھی نہیں۔ اور اللہ نے دی ہوتی ہے اُنھیں حکمت عملیہ اور حکمتِ نظریہ، اور کھول کھول کر بیان کرتے ہیں لوگوں کے لیے اشیاء کے حقائق جیسی کہ وہ ہیں اور ظاہر کرتے ہیں وجود اور موجودات کے اسرار تمام کے تمام جیسے کہ وہ ہوتے ہیں۔

وجود و موجودات کے بیان کا باب

موجودات عبارت ہیں وجود کی احاطہ کی ہوئی ماہیات اور حقائق موجودہ سے۔ لہٰذا وجود اور موجودات کے بارے میں جو بیان پہلے آچکا ہے، وہاں افراد موجودہ سے مراد صرف ماہیات کی ذاتیں ہیں۔ ان کے وجود سے متصف ہونے یا نہ ہونے کی رو رعایت کے بغیر۔ کیونکہ وجود و عدم وجود سے قطع نظر کرتے ہوئے ماہیت محض ایک امر معقول ہے۔ اور یہاں موجودات کے لفظ سے ہماری مراد ماہیات مع اپنے وجود کے ہیں، جب کہ وجود اور ماہیت کی تحقیق اسی پہلے باب میں آچکی ہے، یہاں اس کے بیان کی ضرورت نہیں۔ لیکن موجود ماہیات جو اعتباری اور اضافی موجودات ہیں کی حقیقت یہ ہے کہ ذات باری تعالیٰ میں چونکہ وجود ثابت و مستقل ہے وہ اس کی عین ماہیت ہے۔ اسی طرح موجودیت بھی اک موجود ہے اور اس کا عین تشخص (امتیاز) اور یہ چاروں اعتبار یعنی وجودیت، ماہیت موجودیت اور تشخص بلحاظ ذات و تحقیق نفس الوجود میں عین بھی ہیں اور مرتبۂ علم میں تعریف و اعتبار کے لحاظ سے ایک دوسرے سے امتیاز بھی رکھتے ہیں۔ پس موجودیت کے واجب و لازم ہونے کے اعتبار سے دیکھا جائے تو ماہیت الوجود وہی واجب الوجود ہے۔ اور اگر موجودات کے امکانی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو ممکن الوجود اور موضوعی قیام کی نظر سے ایسا موجود جو بذاتِ خود قائم نہیں اور لاموضوعی قیام کی نگاہ سے ایسا موجود جو قائم بالذات ہے۔ بے مادہ پن کے لحاظ سے مجرد موجود،

مادہ کے لحاظ سے مادی موجود، اضافی فنا کے لحاظ سے فانی موجود، اعتباری بقا کے لحاظ سے موجود باقی۔ شہودی لحاظ سے دنیوی موجود، وعدہ کیے گئے لحاظ سے اخروی موجود، ذہنی معانی کے لحاظ سے موجود ذہنی، ماہیت و شخصیت کے اجتماع کے لحاظ سے ایک خارجی موجود، تطابقت واقعہ کے لحاظ سے موجود نفس الامری، علمی امتیاز کے لحاظ سے اعتباری موجود، عقلی لحاظ سے اک موجودِ معقول، حسی لحاظ سے موجود حسی، نایافت کے لحاظ سے مجہول مخفی موجود، اور یافت کے لحاظ سے معلوم جلی، تصوراتی لحاظ سے موجود علمی، تخیلاتی لحاظ سے موجود خیالی، کمالات کے لحاظ سے موجود کامل، نقائص کے لحاظ سے موجود ناقص، مرکز کے قرب کے لحاظ سے ارضی موجود، اور محیط سے قرب کے لحاظ سے موجود سماوی، اولیت کے لحاظ سے موجود اوّل، آخریت کے لحاظ سے موجود آخر، کلیت کے لحاظ سے موجود کلّی، جزئیت کے لحاظ سے موجود جزئی، تقیدّ کے لحاظ سے موجود مقیدّ، اطلاق کے لحاظ سے موجود مطلق، کثرت کے لحاظ سے موجود کثیر، وحدت کے لحاظ سے موجود واحد۔ پاکیزگی و صفائی کے لحاظ سے ورا الورا، تشبیہی لحاظ سے ایسا ایسا یعنی ہر جیسا۔ قدامت کے لحاظ سے موجود قدیم۔ حدوث کے لحاظ سے موجود حادث، ابتدائی لحاظ سے مبتدا، اور انتہائی لحاظ سے منتہیٰ اور علیٰ ہذا القیاس۔ اپنے وجود مطلق کے ظہور کے ضمن میں مذکورہ بالا اور دیگر نسبتوں کے الحاق سے حق سبحانہ تعالیٰ نے تمام موجودات اور ساری کائنات کو پیدا کیا۔ موجود بالذات تو وہی ہے اور باقی سب اُسی سے ہیں۔ اس امر کے خصوصی سبب کی اصل حقیقت کہ فلاں نسبت کو فلاں حقیقت سے کیوں منسوب کیا گیا ہے، یا فلاں نسبت کو فلاں ماہیت سے کیوں نسبت دی گئی ہے یا فلاں چیز فلاں وقت کیوں دکھائی دیتی ہے، اور فلاں چیز فلاں وقت کیوں دکھائی نہیں دیتی۔ یہ تو صرف خدا ہی جانتا ہے کسی دوسرے کو اس کی کوئی خبر نہیں، سوائے اس کے کہ خاص عنایت اور رحمت سے اپنے خاص بندوں پہ یہ اسرار و رموز کھول دیتا ہے۔ لیکن یہ مقام تو مقام نظر ہے مقام عقل نہیں۔ یہ بات درس و تدریس اور سمجھانے بتانے سے سمجھ میں نہیں آسکتی۔ اس مقام پر تو کشف و انکشاف کی ضرورت ہے، اسی لیے تو حضورِ پاکؐ نے دُعا فرمائی کہ اے اللہ تعالیٰ مجھے اشیا کی حقیقت دکھا جیسی کہ وہ ہیں اور یہ نہیں فرمایا کہ اے اللہ مجھے ان کی حقیقت سمجھا یا ان کی خبر دے۔ حضرت ابراہیم خلیل اللہ (ہمارے نبی اور ان پہ سلام) نے بھی اسی طرح یہ کہا کہ اے رب میں یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ تو مردوں کو زندہ کیسے کرے گا۔ یہی نہیں کہا کہ سمجھنا چاہتا ہوں یا علم حاصل کرنا

چاہتا ہوں۔ لہٰذا اس مقام پر صاحبِ بصیرت لوگ ہی دیکھتے ہیں، جو کچھ کہ دیکھتے ہیں۔ اور ان پر جو انکشافات ہوتے ہیں انھیں وہی جانتے ہیں۔ جس مقام تک تعلیم و تدریس اور تفہیم کا تعلق ہے وہاں تک حکما سراغ لگاتے ہیں اور وہ اسباب، علامات، وجوہات اور معلولات بیان کرتے ہیں، لیکن رویت (دیکھنے/مشاہدہ) کے مرتبے پر صرف انبیائے کرامؑ ہی فائز ہوتے ہیں۔ اور پھر ان کے اتباع کی بدولت حق سبحانہ تعالیٰ اولیائے کرام میں سے جسے چاہتا ہے اس نعمت سے مشرف فرما دیتا ہے۔ اس مقام پر ان بزرگوں کی علمی، حسی، بصری اور سمعی قوتیں ایک ہی ہو جاتی ہیں اور ان کی شنید، دید، تصور، سمجھ سب باہم متحد ہو جاتے ہیں اور وہ کلی طور پر سمیع، بصیر، علیم، عاقل اور حساس ہو جاتے ہیں۔ اس کمال کی صفات کے لیے ایسے نائبانِ حق صفات کے آلات کے محتاج نہیں ہوتے۔ اس فقیر کا ایک شعر ہے کہ اے خدا تو نے ہمیں سراپا چشم و گوش بنا دیا ہے۔ اب مناسب و سزاوار یہی ہے کہ ہم سب (ماسوی اللہ) سے اپنی آنکھوں اور اپنے کانوں کو بند کر لیں۔ ایسے نائبانِ حق اپنے اندر مکمل اور پورے طور پر اخلاقِ خداوندی پیدا کر لیتے ہیں۔ اب اُن کی وہ شخصیت ہی ان تمام صفات کا کام کرتی ہے۔ اس کے بعد اگر انھیں آلات کی ضرورت پڑتی ہے تو وہ صرف دوسروں کے رشد و ہدایت کے لیے زبان چاہیے تاکہ اُس کے ذریعے بول کر اپنی بات دوسروں تک پہنچا سکیں۔ کان چاہئیں تاکہ وہ جان لیں کہ دوسرے ان کے کلام کو سُن رہے ہیں۔ آنکھ چاہیے تاکہ دوسروں کو دیکھیں کہ وہ بھی انھیں دیکھ رہے ہیں۔ علم چاہیے تاکہ وہ ظاہر کر سکیں کہ وہ عالم ہیں۔ عقل چاہیے تاکہ دوسرے سمجھ سکیں کہ عاقل ہیں۔ انسانی زندگی چاہیے تاکہ دوسرے سمجھ لیں کہ وہ زندہ ہیں۔ ورنہ اللہ کے برگزیدہ بندے اپنی ذات میں مجمعِ کمالات ہوتے ہیں۔ اور ان کی ذات میں آلات و صفات کے سب مراتب متحد ہوتے ہیں۔ بعض کو بعض سے امتیازی نسبت دینا ان کا کام نہیں۔ ان بزرگوں کی جانچ پڑتال سراسر معقول ہوتی ہے۔ اور ان کے علوم معقول، سالم جانچے پرکھے ہوتے ہیں۔ اپنے کانوں والی سب باتوں یا صداؤں کو وہ دیکھ سکتے ہیں۔ اور ان دیکھی چیزوں کی صدائیں سُن سکتے ہیں۔ ان کے اجمال میں تفصیل اور ان کی تفصیل میں اجمال ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میرے جدِّ بزرگوار حضرت خواجہ بہاؤالدین نقشبندؒ نے فرمایا تھا کہ سیر و سلوک کا اصل یہ ہے کہ مجمل بات مفصل ہو جاتی ہے، اور استدلالی باتوں کا کشف ہو جاتا ہے۔ یعنی اختصار اور تفصیل دونوں ایک ہی ہو جاتے ہیں۔ اس مقام پر پہنچنے کے بعد عارف کے لیے اگر صفات کی کثرت میں بھی وحدت ہے تو وہ

اس کی مختلف الحیثیات معلومات کے علم کے تعلق سے ہے نہ کہ اعتبار ذات کی بنا پر۔ مثال کے طور پر مبصرات کے علم کے تعلق کی حیثیت سے بصیر، مسموعات کے لحاظ سے سمیع، معلومات کے تعلق سے عالم، معقولات کے تعلق سے عاقل، اور محسوسات کے لحاظ سے حساس ہے۔ لیکن وہ بذاتِ خود اپنی نظر میں ہر صفت سے تمام صفات کا کام لیتا ہے۔ بخلاف ان حجاب کے ماروں کے جو ایک ایک صفت کے مقید اور پابند ہیں۔ اور ایک سے دوسری صفت کا کام نہیں لے سکتے۔ جیسا کہ قرآن پاک میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں پر بند لگا دیا ہے، اور ان کی آنکھوں پر پردہ ہے۔ وہ نہ دیکھ سکتے ہیں، نہ سُن سکتے ہیں اور نہ سمجھ سکتے ہیں، اور ان کے لیے بڑا دردناک عذاب ہے۔ اللہ نے ان کے دلوں پر مہریں لگادیں، کیونکہ ان کا علم انھیں کچھ دکھاتا ہے نہ کچھ سناتا ہے، اور ان کے کانوں پر مہریں لگادی ہیں۔ کیونکہ ان کی سماعت جو ہے کچھ سمجھ نہیں پاتی، نہ کچھ دیکھ پاتی ہے، اور ان کی آنکھوں پر پردہ ہے۔ کیونکہ ان کی بصارت نہ سنتی ہے، نہ ادراک رکھتی ہے۔ اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔[۵] اس تردد کی وجہ سے جو عقل پر مبنی امور کی رویت پر ہے۔ اور اُس تردد کی وجہ سے جو نظر آنے والے مشہودات کی معقولیت میں ہے۔ ان کا ظاہر باطن کے ساتھ متحد نہیں ہو پاتا۔ اور وہ منافق ہیں جن پر پردہ پڑا ہوا ہے، اور وہ جاہل کافر ہیں۔ جب اللہ تعالیٰ کسی کام پر سے پردہ اُٹھا دیتا ہے اور حجاب دُور کر دیتا ہے تو عارف کی عقلی اور حسی قوتیں باہم ایک ہو جاتی ہیں یعنی عقل و حس متحد ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ دیکھیے تمھاری دونوں آنکھوں کی بینائی اور دونوں کانوں کی سماعت کو خدا نے متحد کر دیا ہے کہ تم بیک وقت دونوں آنکھوں کی ایک ہی نگاہ سے ایک چیز کو دیکھ سکتے ہو۔ اور دونوں کانوں کی سماعت سے بیک وقت ایک ہی بات سنتے ہو۔ لیکن مرتبۂ توحید سے محجوب و ناآشنا لوگ اس نکتے کو سمجھیں تو کیسے؟ ایسے بھٹکے لوگ یقین ہی نہیں کرتے کہ بیک وقت ایک ہی نگاہ میں دونوں آنکھوں سے کیسے دیکھا جا سکتا ہے۔ ایک آنکھ کی بینائی الگ ہے اور دوسری کی بینائی الگ۔ لہٰذا وہ بھی یہی کہتے ہیں کہ عقلی قوت عقلی قوت ہے اور حسی قوت حسی قوت!! معقولات کو محسوس کیسے کیا جا سکتا ہے۔ اور محسوسات کو بھلا معقولات کیسے کہہ سکتے ہیں۔ اے ناواقفو جس طرح اللہ تعالیٰ نے تمھارے دماغ میں ایک ایسی قوت تخلیق کی ہے جو ساری حسوں کا ادراک رکھتی ہے اور ان سب کا مجموعہ ہے جسے تم حسِ مشترک کہتے ہو، اسی طرح عارفوں کے دلوں میں اللہ تعالیٰ نے روحانی قوت پیدا کر دی ہے جو سب امور کا انکشاف کرتی ہے۔

اور عقل و حس کی جامع ہے۔ وہی ظاہر و باطن کے رابطہ کی درمیانی کڑی ہے، اسے کشف کہتے ہیں۔ مگر جسے اللہ تعالیٰ نے قلب سلیم عطا نہ کیا ہو وہ نہیں سمجھ سکتا۔ لہٰذا عقل کے گورکھ دھندوں میں پھنسے ہوئے لوگ ان کے مشاہدات اور اسرار و رموز کے کشف پر ایمان نہیں لاتے اور قرآن پاک میں بھی ہے کہ بھلا اندھے اور بینائی رکھنے والے کیسے برابر ہو سکتے ہیں۔ قصہ کوتاہ ہم نہیں ہیں اس میں، اور اب اصل بات کی تشریح کی طرف پلٹتا اور موضوع بحث کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔ ترجمہ رباعی اسے وردؔ اگرچہ ہم مختلف قسم کے سینکڑوں رنگوں میں نمودار ہیں، لیکن دراصل ہم ایک ہی نور کے آئینہ دار ہیں۔ چونکہ ہماری نمود کا عکس اپنا نہیں کسی اور کے وجود کا عکس ہے۔ سو ہر چند کہ ہماری نمود ہے مگر یہ نہ کہو کہ ہم موجود ہیں۔
مُصنف اب خود ہی اصطلاحی تعبیرات بتاتا ہے کہ پہلے مصرع میں لفظ اگر کے معنی اگرچہ کے ہیں جو ان معنوں میں اساتذہ کے کلام میں اکثر و بیشتر مطالعہ میں آیا ہے۔ حاصل مطلب یہ کہ اگر یہ ممکنات کے حقائق علم کے آئینے میں سینکڑوں رنگوں میں نمودار ہیں، لیکن درحقیقت وہ ہے فقط ایک نوری وجود جو اتنے انواع و اقسام کے رنگوں میں نمودار ہے۔ ممکنات کے نصیب میں نمود کے سوا اور کچھ نہیں۔ وجود تو فقط ذاتِ حق کا ہے، اور رباعی کے معانی اور اس کے الفاظ سے جو کچھ مراد ہے وہ متن میں تفصیل سے درج ہے۔ جیسے ہم اب بیان کرتے ہیں۔ یکتا کے معنی ہیں وجود حق تعالیٰ سے جس میں کثرت کو دخل نہیں خواہ کتنی ہی زیادہ کیوں نہ ہو۔ ہمارے وجود کو کسی دوسرے وجود کی ضرورت ہے اور تسلسل و تواتر کی ضرورت ہے۔ جب کہ معقولات کی کتابوں میں ہے، یعنی رباعی میں جو لفظ یکتا آیا ہے اس سے مراد مرتبۂ وجود ہے بمعنی واحد اور لفظ وجود میں لفظی نہیں معنوی اشتراک ہے۔ موجودات کے وجود نہیں ہیں۔ بلکہ فقط ایک ہی وجود ہے جو ہر جگہ جلوہ گر ہے۔ وجود کے متعدد ہونے کی تردید کی اک دلیل یہ بھی ہے کہ اگر ہم ان سب وجودوں کے قائل ہو جائیں، اور اس عددی کثرت کو مان لیں تو لازمی طور پر ہمیں ہر اکائی میں کوئی ایسا امر مشترک ملے گا جس کی بدولت وجود کا اطلاق ان متعدد وجودوں پر صحیح ثابت ہوگا۔ لہٰذا وہ امر مشترک یا امر واحد ہے یا نہیں ہے۔ اگر ہم یہ کہیں کہ امر واحد ہے تو یہ مفروضے کے خلاف ہوگا، اور یہی کہنا مطلوب تھا۔ اور اگر ہم کہیں کہ امر واحد نہیں ہے، اور اس امر کا مشترک وجود دوسرا ہے گویا کہ وجود کو دوسرا وجود درکار ہے۔ ہم پھر بات کو موڑتے ہیں اسی وجود کی طرف جس کی کوئی انتہا نہیں، اور یہ تسلسل کو لازم پکڑنے والا ہے۔ پس ثابت ہو گیا کہ وجود ایک ہی معاملہ ہے اس

میں زیادتی نہیں ہوتی۔ اور دوسرے دلائل معقولات کی کتابوں میں درج ہیں جو ناظرین کی نظروں سے پوشیدہ نہ رہیں گے۔ ماہیات میں یہ اعتباری رنگارنگی ان کے اپنے مختلف النوع ہونے سے ہے۔ یعنی رباعی میں آنے والے ان الفاظ کہ بصد رنگ پیدا ایم کے معنی ہیں حقائق مختلفہ کی رنگارنگی۔ اور علمی اور امتیازی لحاظ سے وہ ایک دوسرے سے اپنی انواع واقسام کی مناسبتوں سے ممتاز ہیں۔ اور عکس ونمود مراد ہے چھین لینے سے جو ہستی اور اُس کے حاصل کرنے کے معنوں میں آیا ہے۔ یعنی عکس ونمود کے کلمات جو تیسرے مصرع میں آئے ہیں۔ یہ امر منتزع (چھین لینے کا عمل) ہے جو مصدری معنوں میں استعمال ہوا ہے، اُسے وجود ظلیّ بھی کہتے ہیں۔ حاصل مطلب یہ کہ ہمارا یہ عکس جو نمود سے زیادہ اور کچھ نہیں ہے وجود ظلیّ ہی کا اک ظہور ہے جو ہستی وحصول کے معنوں میں آیا ہے۔ صحیح معنوں میں موجودیت اُسی واجب الوجود کے حصّے میں آئی ہے، جیسا کہ رباعی میں کہا گیا ہے۔ اور لفظ وجود کسی دوسرے لفظ کا مضاف ہے اس سے مُراد اس موجود بالذات سے لینا ہے۔ دوسرے لفظوں میں وہ لفظ وجود جو کسی دوسرے لفظ کا مضاف ہے اس سے ہماری مراد مرتبۂ ذات الوجود ہے جسے حاصل مصدر، منشا، انتزاع اور ما بہ الموجودیت بھی کہتے ہیں۔ اور اس موجود کے سوا اور کوئی موجود نہیں اور وہ وجود ظلیّ انتزاعی معنوں میں ہے لہذا مختلف اور متنوع مراتب میں اس وجود واحد کے سوا اور کوئی موجود نہیں۔ کیونکہ وجود کا مطلب وجود واحد اور موجودات کی یہ کثرت جو اعتباری مظاہر کی نمود ہے اُس کی حقیقی وحدت میں خلل انداز نہیں ہوتی جس طرح کہ رومی اور حبشی صورت میں مختلف ہیں مگر حقیقت میں ایک ہیں! اسی طرح ہر موجود اپنے وجودی معانی کو ظاہر کرنے کے لیے دوسروں سے متفق ہے۔ لیکن کون وحصول کے مرتبے میں مختلف ہے۔ لہذا وحدتِ وجود کے معانی میں ہے نہ کہ مرتبۂ موجودیت میں۔ کیونکہ موجودات ایک دوسرے سے الگ اور مختلف ہیں۔ باوجود اس کے کہ ان میں وہی ایک حقیقی وحدت جلوہ گر ہے۔ یعنی یہ مختلف امتیاز اس کے علم میں ہیں۔ کیونکہ علم کا کام ہی امتیاز کرنا ہے۔ اور یہ اختلاف علمی حیثیات اور اعتبارات کے مراتب میں ہے۔ اور یہ نسبتیں وحدتِ مطلقہ کے مرتبے میں خلل نہیں ڈال سکیں۔ کیونکہ ممکنات کی ماہیات محض اور معقول ہیں۔ وجود وعدم سے قطع نظر بذاتِ خود معدوم ہیں، اور معدوم میں موجود ہونے کی اہلیت نہیں ہوتی۔ ذرا غور کیجیے۔ ترجمہ رباعی لوحِ امکان تو ہستی سے بالکل عاری تھی۔ اسی واجب الوجود نے ہر جگہ اور ہر کسی کو وجود کا فیض پہنچایا۔ اب اگر اس کی غیر متغیرہ حالت کو مدّنظر رکھیں کہ وہ اب

تک ویسے ہی ہے جیسا تھا، تو پتہ چل جائے گا کہ ممکن نے ابھی تک عدم سے قدم باہر نہیں رکھا[۵]۔ مصنف خود ہی تعبیرات بتاتا ہے کہ لوح سے مراد مرتبہ ہے اور امکان سے مراد ممکنات ہے، جیسا کہ خلق سے مراد مخلوقات ہوتی ہے، اور ہستی سے مراد مرتبۂ ذات الوجود جو موجودیت کا باعث ہے۔ فیض وجودی سے مراد وجود ظلّی کی فیض رسانی ہے اور الآن کما کان کے کلمات سے مراد حق تعالیٰ کی وحدت کی تغیر ناپذیر حالت ہے اور عدم سے مراد ممکنات کی امکانی حالت کے منفی معانی اور مفہوم عدمی ہے۔ یعنی کہ طرفین سے سلب ضرورت ۔ لہذا اب رباعی کے معانی یوں ہوئے کہ ممکنات کا مرتبہ ذات الوجود کے مرتبے سے عاری و محروم ہے، اور انھیں موجودات حاصل نہیں اور حق تعالیٰ جو واجب الوجود ہے۔ وہ اپنے وجوب کے ضمن میں ان کو وجود ظلّی کی فیض رسانی سے موجود بناتا ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ کی تغیر ناپذیر حالت واحد کو اپنی چشم بصیرت کے سامنے رکھا جائے تو یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ ممکنات نے عدم سے قدم باہر نہیں رکھا۔ اور وہ واجب بالذات نہیں بن سکے۔ وہ ہنوز اپنی عدمیت میں گم ہیں جو ان کی ذاتی چیز ہے۔ جو کچھ تمھارے پاس ہے وہ ختم ہوجانے والا ہے۔ اور جو اللہ کے پاس ہے وہ باقی رہنے والا ہے ۔

هوالناصر

شروع اللہ کے نام سے جو نہایت مہربان اور رحم والا ہے

ہر قسم کی تعریف اللہ کے لیے ہے، جس نے اپنے وجود کے نور سے موجودات کو منوّر کیا اور اپنے شہود کے ظہور سے مخلوقات کو ظاہر کیا اور وہی دانا ہے جس نے حکمت میں لپیٹ دیا۔ بہت زیادہ بھلائی کو، اور وہ علیم ہے جس نے بنایا انسان کو اس حکمت کے ساتھ بصیر۔ اور درود و سلام ہو اس نبیؐ پر جو علم کا شہر ہے اور حکمت کا گھر ہے اور خلقت کا مدار ہے۔ اور آپؐ کی آلؑ پہ اور اصحابؓ پہ جو بہت قدر و منزلت والے، درجے والے اور مرتبے والے ہیں۔ امابعد پس یہ ساتواں باب ہے جس کا نام حکمت اللہ ہے۔ عطا کرے اللہ ہمیں اور تمھیں حکمت بالغہ اور شاملہ (وسیع و عریض) زیادہ بھلائی کے لیے۔ پس جسے حکمت دی گئی اُسے خیر کثیر دی گئی۔ جس طرح کہ اس نے عطا کی ہمیں اور تمھیں طبعاً مصلحت اندیشی بدن کے لیے اور حفاظت کرنے کا جذبہ صحت کے لیے جس طرح کہ اک طبیب اعانت کرتا ہے طبیعت کی اور اُسے تقویت بہم پہنچاتا ہے دوائیوں سے، تاکہ دُور کر سکے مرض کو سہولت سے ان کی مدد سے اس طرح حکیم الٰہی مدد کرتا ہے نفس ناطقہ کی، اور اس کی مدد کرتا ہے حکمت نظریہ و عملیہ میں سے مطالب حکمت کی تعلیم کے ساتھ تاکہ حاصل ہو اس کو نیک بختی بآسانی اس کی مدد سے، اور مزید مناصب قربت الٰہیہ میں سے جن سے مشرف کرتا ہے اللہ تعالیٰ اپنے انبیاءؑ و اولیائے کرام اور حکما کو جن کے بارے میں کہا جاتا ہے دانشمند اور جنھیں ارباب المعقول کہا جاتا ہے۔ عارف لوگوں میں سے کم درجے کے لوگ

جو مقید ہوتے ہیں فقط عقل کی عقلیت کی قیدیں - اُنھیں مجازاً حکما بھی کہا جاتا ہے - جس طرح اطبّا کم درجے کے حکما میں سے ہوتے ہیں، اور وہ فقط طبیعات میں سے ایک فن کو جانتے ہیں جو طب ہے اور اُنھیں بھی مجازاً ہی حکما کہا جاتا ہے - پاک ہے وہ ذات جو دیتی ہے حکمت جسے چاہتی ہے، اور وہ علیم وحکیم ہے - پس جب کہ اس باب میں حقیقت حکمت کی اصطلاحات کی مثال ہیں تو اسے اس نام سے موسوم کیا گیا - اور جان لو کہ حکمت دو قسموں کی ہوتی ہے - ایک حکمت عقلیہ اور دوسری حکمت الٰہیہ - پس حکمت عقلیہ موجودات میں جو بڑی بڑی چیزیں ہیں ان کے احوال کا علم ہے - جیسے کہ وہ ہیں نفس امر میں طاقت بشریہ کی مقدار کے مطابق - میری مراد ہے کہ ثابت ہوتے ہیں اس سے مسائل عقلیہ دلیلوں سے - برابر ہے کہ وہ مسائل آخرت میں انسان کے لیے ضرر رساں ہوں یا نہ ہوں - اور حکیم حقیقی جل حکمۃ کی رضا کے ساتھ ہوں یا رضا کے ساتھ نہ ہوں، اور حکمت الٰہیہ جو کہ حاصل ہوتی ہے انبیا کو اور اولیائے کرام کو وہ علم ہے ان امور کا جو فائدہ دیتے ہیں انسان کو دونوں جہانوں میں، اور وہ ہوتے ہیں سبب دنیا اور آخرت کی فلاح کا، اور دُنیا میں برکات کا سبب ہوتے ہیں اور آخرت میں نجات کا - برابر ہے کہ وہ مسائل عقلیہ دلیلوں سے مدلّل بنائے گئے ہوں یا نہ بنائے گئے ہوں - اور احاطے میں لے لیتی ہے اسے انسان کی عقل پہلے پہلے - پس یہی نفع بخش مفید حکمت مراد ہے اللہ تعالیٰ کے اس کلام میں جب وہ فرماتا ہے کہ جسے حکمت دی گئی اُسے خیر کثیر دے گئی -

واجب الوجود کے فیض کے بغیر ممکنات کے وجود کے باطل ہونے کے بیان کا باب

وجود ممکنات کے واجب الوجود سے مستفیض ہونے کی تردید کرنا گویا موجودات (مخلوقات) کی ہستی کی نفی کرنا ہے، اور کائنات کی تخلیق کو واجب الوجود کی فیض رسانی کے بغیر ثابت کرتا اور ممکنات کی موجودیت کے امکان کو باطل قرار دینا ہے - کیونکہ وجود فی نفسہٖ مخصوص ذات باری تعالیٰ سے ہی ہے - کیونکہ وجود اور وجوب میں حق تبارک و تعالیٰ کی ماہیت ہیں - اور اسی کی پیروی میں اسمائے حسنیٰ اور صفات کے باہمی تضمن سے اسی کے لیے مسلّم الثبوت ہے اور حقائق ممکنہ سے لازمی طور پر لاحق - ہر وجود ممکن قائم بالغیر ہے نہ کہ قائم بالذّات - لہٰذا امکانِ خاص جو دو طرفہ سلب ضرورت ہے حقائق ممکنہ کو اپنی خصوصیت کی بنا پر کسی طرح بھی وجود میں نہیں لاتا، اور نہ ہی موجودیت کا تقاضا کرتا ہے - اور کوئی وجود ممکن ذاتی

طور پر موجود ہونے کی اہلیت نہیں رکھتا، کیونکہ جس پہ ترجیح دینی ہے اگر وہی موجود نہ ہو تو ترجیح دینے کے کیا معنی ؟ اور امکان عام جو یک طرفہ سلبِ ضرورت ہے۔ طرف وجود کی نفی کے اعتبار سے امتناعی مفہوم ہوگیا اور طرف عدم کی نفی کے لحاظ سے وجوبی معانی کا اثبات کرنا ہے اور امکان خاص کی حقیقت اپنے عام مرتبے ہی کے تحت ہے۔ حقائق ممکنہ جیسے اپنے امکان عام کے سایہ تلے اپنے وجود کے سلب طرف میں ہوتے ہوئے اس کی امتناعی دلیل کو چھپا لیتے ہیں اور مفہوم معدوم ہو جاتا ہے۔ حقائق ممکنہ کی اس معدومیت کی حالت کو امتناع بالغیر کا نام دیتے ہیں۔ اسی طرح موجودیت جس وقت اپنے امکان عام کے عکس تلے عدم کے سلب طرف کی جانب آتے ہیں، اور وجوب کا دن ان کو روشن کر دیتا ہے اور موجود دکھائی دینے لگتے ہیں اور دینوی مخلوق کی اس حالتِ موجودیت کو وجوب بالغیر کا نام دیا جاتا ہے اور حقائق ممکنہ کے یہ سارے ذرات واجب الوجود کے نور آفتاب سے چمکنے لگتے ہیں۔ گویا امکان عام اک دائرے کی مانند ہے۔ اور امتناع و وجوب اس دائرے کی قوسیں اور امکان خاص اس کا قطر جو عین درمیان میں سے گزرتا ہے۔ لیکن امتناع بالذات تو عدم ہی کے حصے میں ہے جو کبھی دریافت ہوا ہی نہیں، بالکل عنقا کی طرح جس کا مفہوم کلی ہے۔ مگر وہ اکیلا نایاب ہے۔ اور وجوب بالذات اسی ذات واجب کا حصہ ہے جو وجودِ مطلق اور حقیقی جزو بھی ہے جسے تشبیہ نہیں دے سکتے جیسے شمس کہ کلی ہے مگر فرد واحد۔ اور امتناع بالغیر اور وجوب بالغیر دونوں علی الترتیب اعتباری معدومات اور اعتباری موجودات کا حصہ ہیں۔ اور ان سب مثبت اور منفی اضافتوں کا مضاف درحقیقت ایک ہی ہے، یعنی وہی ذات الوجود جو بذات خود موجودیت کے پورے معانی کے لحاظ سے اک وجود ہے۔ اور امکان عام امتناع کے لحاظ سے اضافاتِ ثبوتیہ کے سلب کی جانب سے مرتبۂ بشرط لاشئی میں ہے اور عام وجوب کے امکان کی مانند اضافاتِ سلبیہ کے سلب کے لحاظ سے مرتبۂ بشرط شئی اور سلبیہ (منفی) اور ثبوتیہ (مثبت) مراتب پہ محیط و مشتمل ہونے کے لحاظ سے مرتبۂ لابشرط ہے۔

وجوب کی قسموں کا بیان اک نئے انداز میں

یہ سمجھ لیں کہ وجوب مطلق کی چار قسمیں ہیں۔ ایک نہایت ہی عام وجوب جو ہر جگہ موجود ہے اور تینوں مفہوموں میں شامل ہے یعنی واجب، ممکن اور ممتنع ہیں۔ کیونکہ واجب میں وہ وجود کے لازم ہونے

میں ہے جو طرف وجودی کی ضرورت سے عبارت ہے اور ممتنع میں وجوب عدم ہے۔ جس سے مراد طرف عدمی کی ضرورت ہے، اور ممکن میں طرفین کا وجوب لاضرورت جسے ہم طرفین کے سلب ضرورت کا نام دیتے ہیں۔ پس یہ وجوب اعم امکان کے نکلنے کا منشا و مبدا ہے، اور امکانِ عام اُسی سے کھینچا یا نکلا ہوا اک امر ہے۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ وجوبِ اعم امرِ منتزع اور امکانِ عام منشا! کیونکہ منشا یا انتزاع کو امرِ منتزع پہ فوقیت ضرور ہے جو دوسری حیثیت کی معقولات ہیں اور امکان پہ وجوب کی فوقیت ظاہر ہے ممکن الوجود کے واجب الوجود کی طرف محتاج ہونے کی وجہ سے۔ پس امکان خود محتاج ہے وجوب کی طرف چاہے یہ عام امکان ہو یا خاص۔ اور ممکن کے محتاج ہونے کی علّت اس کا امکان ہے، اس کا واقع ہونا نہیں ہے کیونکہ واقع ہونا علت ہے، حادث کے احتیاج کی قدیم کی طرف، اور امکان علت ممکن کے احتیاج کی واجب کی طرف۔ پس قدیم ہونا ظلّی وجود ہے اور حدوث امکان کا سایہ ہے۔ پس یہ سمجھ لے۔ ایک وجوب عام ہے جو موجودات ثلاثہ یعنی واجب، جوہر اور عرض سبھی میں شامل ہے۔ اور وہ عبارت ہے طرف وجودی کے وجوب سے خواہ وجوب بالذات ہو یا وجوب بالغیر بالکل برابر ہے۔ یہ وجوب اپنے احاطے سے ممتنع کو بالکل خارج کر دیتا ہے اور ممکن کو داخل کر لیتا ہے اور یہی امکانِ عام امکانِ خاص کے ظہور کی جڑ یا اصل ہے۔ یعنی ماہیات کو ممتنعات سے جدا کرتا ہے اور اپنے ساتھ ملا کر واجب الوجود کی طرف مائل کرتا ہے۔ امتناعی دائرے سے نکال کر امکانی دائرے کی طرف کھینچتا ہے۔ اور ایک وجوب خاص ہے جو فقط واجب تعالیٰ ہی سے متعلّق ہے۔ جو عبارت ہے وجوب بالذات سے۔ یہ وجوب خاص تمام ممکنات کو خود سے جُدا کر کے وجوب بالغیر کے مرتبے کی طرف دھکیلتا ہے جو وجوبِ عام میں شمار ہوتا ہے اور اس خاص کی طرف اس کا گزر نہیں۔ لیکن اسمائے حسنیٰ اور صفاتِ خداوندی اور اس کے کمالات و مناصب جو بے مثال اور بے اشتراک ہیں اس وجوبِ خاص میں اسی کی ذات میں داخل ہیں۔ کیونکہ ان اعتباری مراتب اور اضافی مناصب کا وجوب ذاتی ہے جو اس سے الگ نہیں، اور وہ سب اسی مرتبۂ وجوب بالذات ہی میں گنے جاتے ہیں۔ اور خاص الخاص وجوب ہے جو فقط اسی واجب الوجود جل شانہ کے نصیب میں ہے۔ اور عبارت ہے وجوب بالذات للذات سے۔ یہ وہ مرتبہ ہے جو خود ہی ذات ہے اور خود ہی وجوب۔ اس مقام پر اسماء و صفات کی اعتباری کثرت بھی ملحوظ نہیں۔ وہی واحد ذات ہے اس کا کوئی شریک نہیں، اس کے سوا اور کوئی معبود نہیں۔ اس کا ظہور عین خفا (پردہ) اور اس کا

خفا عین ظہور ہے۔ وہ کل انوار کا نور واحد ہے، اور دیگر تمام آثار میں اثر پذیر ہے۔ اس کے سوا کسی کو طاقت اور قوت نہیں، اور وہ بہت بلند اور عالی مرتبہ ہے، وہ تمام مظاہر میں تجلی ریز ہے۔ اور وہ تمام حقائق ممکنہ کو تاریکی سے نکال کر روشنی کی طرف لے جانے والا ہے۔ ترجمہ رباعی جہاں کہیں تیری جلوہ گری ہوگی تو دل پردہ دری کے درپے ہوگا۔ اس صفحۂ ہستی میں اگر تیرے وجوب کا لطف شامل نہ ہوتا تو یہ بالکل جوہری سطح کی مانند ہوتا۔ مصنّف اب خود ان اصطلاحات کی گرہیں یوں کھولتا ہے۔ ہر جا سے مراد عالمِ غیب و شہادت یا لطیف و کثیف اور مجرد مادی دنیا ہے۔ اور مخاطب اس رباعی میں محبوب حقیقی یعنی ذات باری تعالیٰ ہے۔ اور جلوہ گری سے مراد کائنات کے مظاہر کی رنگا رنگی ہے۔ دل سے مراد قوتِ عاقلہ ہے اور پردہ دری سے مراد کشف حقائق ہے۔ صفحہ سے مرتبہ اور امکان سے مراد ممکنات ہیں۔ طرف سے مراد جانب وجوب ہے۔ اور صفحہ و سطح کے الفاظ کی مناسبت سے یہ لفظِ طرف، لطف کی طرف جھکاؤ رکھتا ہے۔ سطح اس چیز کو کہتے ہیں جس کا طول و عرض ہو، مگر گہرائی نہ ہو، اور یہ جسم پر پھیلا ہو۔ سطح جوہری دانشوروں کے نزدیک باطل ہے۔ یعنی ایسی سطح جو قائم بالذات ہو۔ یہ بحث فلسفے کی کتابوں میں درج ہے۔ لہٰذا مطلب رباعی کا یوں ہوا کہ اے محبوب حقیقی اس تمام لطیف و کثیف میں جہاں کہیں تو رنگ برنگ کے ان دنیوی مظاہر میں ظہور پذیر ہوگا تو عارفوں کی قوتِ عاقلہ کشفِ حقیقی کے درپے رہے گی، اور اس حقیقت کو کھولنے کی کوشش کرے گی۔ کیونکہ ممکنات کے مرتبے میں جو طرفین کی ضرورت سے سلب شدہ ہے اگر تیرے وجوب کی جانب نہ ہو تو تُو جوہری سطح کی طرح باطل ہو جائے گا۔ لہٰذا بلا شک و شُبہ یہ سب موجودات جو قائم بالذات نہیں ہیں تیرے ہی جوہر ہستی سے قائم ہیں۔ جیسے کہ قرآن شریف میں بھی آیا ہے کہ جو کچھ آسمانوں میں ہے یا زمین میں وہ سبھی کچھ اسی سے ہے۔ جسم ذات و جوہر کا مماس ہے۔ اور سطح جوہری اور خط جوہری باطل ہیں۔ جیسا کہ اجزا میں تقسیم نہ ہونے والے جزو کے باطل کرنے کی بحث میں دلائل سمیت لکھا جا چکا ہے۔ عرضی سطح اور عرضی خط جسم سے ملے ہیں۔ پھر موضوع بحث کو لیجیے۔ جسم اک جوہر ہے جو تین دوریوں پہ پھیلا ہوتا ہے، یعنی طول عرض اور گہرائی رکھتا ہے اور حکما (فلسفیوں) کی تحقیق کے مطابق متصل واحد ہے اور جوہر ہے اور ان جوہروں سے مرکب ہے جو ڈھانچہ یا شکل رکھتے ہوں۔ نہ کہ متکلمین کے قول کے مطابق نقطوں، خطوں یا سطحوں سے مرکب ہو۔ کیونکہ جسم ان اجتماعی اعراض کا مرکب نہیں وہ ذات کا احاطہ کیے ہوئے ہے اور جگہ گھیرتا ہے۔ اس کی ذات جگہ کا تقاضا کرتی ہے۔

حیز کے معنی ہمارے نزدیک مکان یا جگہ کے ہیں۔ لیکن یہ حیز عام ہے۔ جو جگہ کے معنی میں بھی آتا ہے۔ لیکن خاص مکان ہو تو حیز کے یہ عمومی معنی اس پہ راست نہیں آتے۔ کیونکہ مکان عبارت ہے۔ جسم مادی کی سطح باطنی سے جو جسم محوی کی سطح ظاہری کی مماس ہو۔ اور حیز فقط سطح باطن ہے خواہ اس کی ظاہری سطح ہو یا نہ ہو۔ جیساکہ عرش کے لیے "حیز" ثابت ہے مگر مکان نہیں، کیونکہ جہات کی حد بندی کرتا ہے۔ اس کا فوق ثابت و معقول نہیں۔ اگرچہ گمان کی دلالت سے وہم میں آجاتا ہے۔ جہاں کہیں اس کی فوقیت کا اطلاق آیا ہو وہ اس کے مرتبے اور منصب کی فوقیت کی وجہ سے ہوگا۔ فوقیت کے بھی تقدم کی طرح مختلف مراتب ہیں۔ یا پھر مجاز و وہم کی راہ سے۔ لہذا جسم مطلق کو متحیز کہنا درست لگتا ہے جس میں سب جسمانیات شامل ہیں۔ برعکس اس کے متمکن کہنا درست نہیں کہ جس میں محدد شامل نہیں ہوتے۔ یہ فرق اصطلاحی معنوں کے لحاظ سے ہے۔ اور جوہر وہ چیز ہے جو قائم بالذات ہو جیسے کپڑا، اور عرض وہ شے جو قائم بغیر ہو جیسے رنگ۔ اور اگر ایک جوہر دوسرے جوہر میں حلول کر جائے تو پہلے کو حال اور دوسرے کو محلول کہتے ہیں۔ جیساکہ صورتِ حال ہے اور ڈھانچہ محلول۔ اور اگر عرض جوہر میں حلول کر جائے تو اس کے محل کو موضوع کہتے ہیں اور حال کو عرض۔ پس حقیقتِ امکانیہ جو طرفین سے مسلوب الضرورت ہے جب تک اُس میں وجوب کی طرف نہ ہوگی ہرگز وجود میں نہیں آسکتی۔ لہذا حکما کے نزدیک ہر ممکن واجب بالغیر ہے۔ جیساکہ قرآن مجید میں ہے کہ ہمارے رب نے یہ سب کچھ باطل (لغو) ہی تو نہیں بنایا۔[۵] درحقیقت ماہیت امکان تمام حقائق ممکنہ میں شامل ہے۔ اپنی ذات کے لحاظ سے اُسے طرفین کی ضرورت نہیں، طرفین وجود و عدم کا امکان ہے جو دونوں جانب مخالف و موافق ہے۔ اس کا ہونا یا نہ ہونا ضروری نہیں۔ لہذا اس مرتبے کو جب تک حضرت واجب الوجود اپنی حمایت کے سائے میں نہ لے اور اپنی طرف نہ کھینچے، اور اپنے ذاتی وجوب کی طرف سے اُسے وجوب بالغیر کی خلعت نہ بخشے اور اُس کی حمایت اور پشت پناہی نہ کرے حقیقت ممکنہ کبھی وجود میں نہیں آسکتی۔ اور نہ ہی موجود بن سکتی ہے۔ کیونکہ کسی پہ ترجیح بغیر ترجیح دیے جانے والی چیز کے خلاف عقل بات ہے۔ لہذا النشوروں کے نزدیک یہ ثابت ہو چکا ہے کہ ہر ممکن الوجود جو موجود ہے وہ واجب بالغیر ہے۔ کیونکہ یہ طے شدہ اصول ہے کہ جو واجب نہیں ہوتا وہ پایا بھی نہیں جاتا۔ وہ ذات واجب تعالیٰ ہے جو واجب بالذات ہے وجود حقیقی محض اور محض اسی کا ہے۔ اسی نے ہر شے کو وجود بخشا ہے۔ اور کوئی ممکن اپنی ذات میں موجود ہونے کی اہلیت نہیں رکھتا اور اُس میں وجوب ہرگز نہیں ہوتا۔ خدا تعالیٰ نے اپنے حق کو تخلیقی صفت

میں چھپا رکھا ہے، اور کسی مخلوق کو بے فائدہ اور بے کار پیدا نہیں کیا۔ ترجمہ رباعی یہ دُنیا جس کی بنیاد حکمت و دانش پر ہے اسے باطل نہ سمجھ اور کائنات میں نقوش کی کثرت کو بے ہودہ نہ سمجھ۔ وہ خالقِ حقیقی چاہتا تھا کہ اپنے جمال کا مشاہدہ کرے تو ہماری اس غیریتِ موہومہ (ہمارے وجود) نے اُس کے ہاتھ میں آئینہ تھما دیا جس میں وہ اپنے جمال کا مشاہدہ کر سکے۔* مصنف اب خود ان اصلاحات کی یوں تشریح کرتا ہے۔ کہ باطل کہتے ہیں حق کی ضد کو، اور جہان سے مراد مظہرِ حق ہے۔ پس یقیناً مظہر اپنے ظاہر کی ضد تو ہو نہیں سکتا بلکہ سراسر اسی کے ظہور کا محل ہوتا ہے۔ لہذا حکمت بنیاد جہان کی صفت ہے کیونکہ تکوین کائنات میں اُس کے حق کا اظہار ہے۔ لہذا اس کے زمانہ ہستی میں کسی نقش کو بے کار، بے فائدہ اور لغو نہیں سمجھنا چاہیے۔ یعنی اس حق تعالیٰ کے حق حقداری کا چھپانے والا نہیں سمجھنا چاہیے۔ جیسا کہ قرآن مجید میں آیا ہے۔ ہاں تو کیا تم نے یہ خیال کیا تھا کہ ہم نے تم کو یونہی مہمل اور خالی از حکمت پیدا کر دیا ہے اور یہ خیال کیا تھا کہ تم ہمارے پاس نہیں لائے جاؤ گے۔[؎] کیونکہ جب حق تعالیٰ نے چاہا کہ وہ اپنے آپ پر ظاہر ہو اور کمالات کے جمال کا کسی وجود میں مشاہدہ کرے۔ یعنی جب اس نے چاہا کہ پہچانا جاؤں تو اُس نے مخلوق کو پیدا[؎] اور ہماری یہ موہومہ اجنبیت (غیریت) اور معدوم دوئی محض آئینہ ہے کو ہستی مطلق نے اپنے آپ کو دیکھنے کے لیے بنایا، کیونکہ اپنے چہرے کو سوائے آئینہ کے نہیں دیکھا جا سکتا۔ اسی لیے فرمایا کہ تم جدھر کو بھی رُخ کرو ذاتِ حق کو اسی رُخ پاؤ گے۔[؎]

---

* رباعی:

باطل نبود جہانِ حکمت بنیاد
بیہودہ مدان کثرتِ نقش ایجاد
میخواست کہ بر خویش نظر بکشاید
غیرت ما آئینہ در دستش داد

هوالناصر

شروع اللہ تعالیٰ کے نام سے جو نہایت مہربان اور بہت رحم کرنے والا ہے

ہر قسم کی تعریف اللہ تعالیٰ کے لیے ہے جس نے کھول کر بیان کیں لوگوں کے لیے شرعی حدود اور درست کی ان کی حالت دستور و آئینِ الٰہیہ سے اور درود و سلام ہو اُس کے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر جو قربت کی سمتوں کو محدود کرنے والے ہیں، اور آپ کی آل پر اور اصحاب پر جو محافظین ہیں حقیقت کی قیود کے۔ امّا بعد یہ آٹھواں باب جو حدود اللہ سے موسوم ہے۔ مشرف کرے اللہ ہمیں اور تمھیں آداب شریعہ کی محافظت کے ساتھ جو کہ اللہ کی حدود ہیں جس طرح کہ اُس نے مقید کیا ہے۔ ہمیں اور تمھیں دوسری قیود کے ساتھ امتیازات اعتباریہ میں سے جو کہ بشریت کے لیے لازم ہیں۔ کیونکہ نہیں ممکن کہ ساقط ہو جائیں اس سے تمام کے تمام اضافات اور زائل ہو جائیں اس کے علم سے سب کے سب اعتبارات۔ پس اس کے لیے آداب شرعی کی حفاظت کے سوا چارہ نہیں جو کہ اس کی دُنیا و آخرت کا ظاہراً اور باطناً اصلاح کرنے والا ہے۔ اوامر کی ادائیگی اور نواہی (غیر شرعی کام) سے اجتناب کے ساتھ ہر وقت سوائے اس کے کہ وہ شخص جس کے دماغ میں کوئی خلل ہو اور اُس کا علم صحیح نہ ہو جیسے پاگل لوگ یا پہنچا ہو عقل کے درجے کو اور بلوغ (بالغ ہونے) کے درجے کو جیسے بچے۔ اس لیے شرع میں ایمان کی شرط عقل اور بلوغ کے ساتھ ہے۔ اور یہ اللہ کی حدیں ہیں جنھیں اللہ بیان کرتا ہے۔ ان لوگوں کے لیے جو جانتے ہیں۔

حفظِ مراتب کا بیان جو علم و امتیاز کا لازمہ ہیں

ذی ہوش اور صاحبِ امتیاز لوگوں کے لیے حفظِ مراتب کا پاس رکھنا لازمی ہے۔ کیونکہ کسی شے کا لوازمات سے خالی رہنا اک امر محال ہے، اور جس جگہ پر علم و امتیاز کا ذیشان بادشاہ نزول فرماتا ہے وہ وہاں اپنے ماتحتوں اور متعلقین سمیت آتا ہے جو اس کے امتیاز اور شہرتِ عمومی کا گروہ ہوتا ہے۔ بادشاہ کے لیے اپنے زیرِ سایہ زندگی بسر کرنے والی رعایا کی دیکھ بھال اور نگہداشت ضروری ہے۔ کیونکہ ہر راعی (حاکم) کو اس کی رعایا کے متعلق سوال کیا جائے گا[۵]۔ اس حدیث مبارک میں اس امر کی طرف اشارہ ہے چنانچہ اس دُنیا میں ہر صاحبِ علم ہر شے کی حقیقت کا خود ہی سائل ہے۔ وہ خود ہی بغیر سوچے سمجھے کبھی کبھار خیال کرتا ہے کہ فلاں چیز کیسی ہے۔ خود ہی سوال کرتا ہے اور خود ہی اس کا جواب وہ ہوتا ہے۔ پھر قدرتی طور پر کہہ اُٹھتا ہے کہ ایسی ہوگی یا اس طرح کی۔ کبھی اپنے جواب کو خود ہی رد کر دیتا ہے ۔ کبھی اُسے تسلیم کر لیتا ہے اور کبھی بعض سوالوں کا کوئی جواب دیتا ہی نہیں، اور کہہ دیتا ہے کہ بس اللہ ہی بہتر جانتا ہے، اور کبھی سرے سے کوئی سوال کرتا ہی نہیں۔ کبھی اپنے بُرے اعمال پر خود کو تنبیہہ کرتا ہے اور نادم و پشیمان ہوتا ہے، اور کبھی اپنے نیک اعمال پر خوش ہو کر خدا کا شکر ادا کرتا ہے۔ اور کبھی بڑی باریک بینی اور دِقت سے کام لیتے ہوئے اپنے اچھے اعمال کو بھی باطل اور محو خیال کرتا ہے۔ اور کبھی اپنی نالائقی سے اپنے گناہوں کو گناہ ہی شمار نہیں کرتا، اور کبھی خیر و شر (نیکی بدی) کی مطلق پرواہ نہیں کرتا، اور اللہ تعالیٰ کی رحمتِ کاملہ کے بھروسے پر شاد و شادمان ہوتا ہے۔ اور کبھی اُس کے عذاب سے ڈرتا ہے۔ اور گاہے اپنے اعمال و افعال کا خود ہی محاسبہ بھی کرتا ہے۔ اور کبھی قطعاً پرواہ نہیں کرتا۔ اس طرح اس دارِ آخرت میں اللہ تعالیٰ تمھیں خود ہی اپنا سائل بنا دے گا۔ اور خود ہی اپنا جواب دہ۔ کیونکہ اس کا بیج اس دنیا میں تیرے اندر بو دیا گیا ہے، اور یہ مصیبت یہیں سے تمھیں چمٹ گئی ہے۔ لہٰذا بعض امور میں تم خود ہی سوال کر کے خود ہی اس کا جواب دو گے۔ اور کبھی اپنے جواب کو خود ہی رد کر دو گے۔ اور کبھی اسے قبول کر لو گے، اور کبھی جواب کی بجائے چپ سادھ لو گے۔ اور بعض امور میں تم کوئی سوال نہیں کرو گے، اور بعض اعمال سے ندامت اور پشیمانی حاصل کرو گے، اور اپنے بعض کاموں سے خوش و خرم ہو گے۔ کبھی نیک کاموں پر بھی بازپرس کرو گے، اور کبھی گناہوں سے بھی درگزر کرو گے۔ کبھی حساب نہیں لو گے۔ اور کبھی اللہ کی رحمت

کے اُمیدوار بن جاؤ گے۔ کبھی اس کے عذاب سے کانپ اُٹھو گے اور کبھی ایک ایک فعل اور قول کا حساب لو گے۔ اور اس دن اللہ تعالیٰ تیرے مُنہ پر مہر لگا دے گا اور نطق دے دے گا۔ تیرے ہاتھوں کو اور تیرے پاؤں کو اُس چیز کے ساتھ جو تم کماتے ہو، اور تو خود محاسبہ کرنے والا ہو گا اپنے اعمال کا اور اپنے اقوال کا۔ کیونکہ لازم کر دیا ہو گا۔ اللہ تعالیٰ نے تیرے اعمال کو تیری گردن میں اور نکالے گا تیرے لیے تجھ ہی میں سے قیامت کے دن کتاب اور کہے گا تجھ سے پڑھ اپنی کتاب اور تو ہی کتاب اور تو ہی قاری ہے۔ اور اُس دن کافی ہو گا تُو اپنے نفس کے ساتھ ہی اپنے خلاف محاسبہ کرنے والا، تیرے علاوہ اور کوئی نہیں ہو گا۔ جیسے کہ اللہ عزوجل نے فرمایا ہے کہ ہر انسان کا شگون ہم نے اُس کے اپنے گلے میں لٹکا رکھا ہے، اور قیامت کے روز ہم ایک نوشتہ اس کے لیے لٹکائیں گے جسے وہ کھُلی کتاب کی طرح پائے گا۔ پڑھ اپنا اعمال نامہ۔ آج اپنا حساب لگانے کے لیے تو خود ہی کافی ہے۔ اور اگر عنایت خداوندی شامل حال ہوئی تو تم نجات پا جاؤ گے۔ پس یہ سمجھ لے کہ جب تو نے اس سفر زندگی کو ان خرابیوں اور برائیوں سے طے کیا تو اسی طرح قیامت کے دن جو کہ حساب کتاب کا دن ہے۔ یہ سارے حالات و واقعات تیری طرف لوٹ آئیں گے۔ اور جس چیز پہ یہاں تمھارا خاتمہ ہوا اور جس امر پہ زندگی ختم ہوئی، اس دن بھی تیرا حساب کتاب اسی کام پہ اختتام پذیر ہو گا۔ اور پھر اُس کے مطابق تم جنت یا جہنم میں جاؤ گے۔ لہذا خاتمے کا خوف تو سبھی کو دامن گیر ہے۔ اللہ تعالیٰ انجام بخیر کرے اور زندگی میں ہمیشہ اپنے ہی مشاہدے میں مستغرق رکھے تاکہ اُس کی برکت سے قیامت کے دن اس کی حمایت کے سائے تلے آفات و بلیات سے محفوظ رہ سکیں۔ اور اپنے ناخنوں سے اپنا ہی مُنہ نہ نوچیں۔ یا اللہ ہم گنہ گاروں کو رہتی زندگی تک آداب شرعی ادا کرنے اور حفظ مراتب کو ملحوظ رکھنے کی توفیق عنایت فرما، اور اپنے سامنے شرمسار نہ کرنا۔ دوستو حفظِ مرتبہ عبارت ہے اس چیز کی مناسب دیکھ بھال سے جس کی وہ اہل ہے، اور اُس مرتبے کے حق کو مع اس کے لوازمات کے کم تر نہ سمجھنے سے۔ لہذا چونکہ وحدت بھی کثرت کی طرح اعتباری مراتب میں سے ایک مرتبہ ہے تو دونوں کے حقوق کو مدّ نظر رکھنا چاہیے۔ عین کثرت میں بھی وحدت کے حسن و جمال کا مشاہدہ کرنا چاہیے، اور وحدت کے مشاہدے کے باوجود احکام کثرت کے حفظ و رعایت کو ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہیے اور ظاہری اور باطنی دونوں ہی لحاظ سے حق پرست بننا چاہیے، تاکہ دین و ایمان حقیقی نصیب ہو سکے اور علم و امتیاز سے پورا پورا انصاف کیا جا سکے۔ کیونکہ وہی اس دُنیا کی انجمن کو سجانے والے ہیں۔ اور اس وقت اس سے رہائی یا گریز محال ہے، تاکہ انسانی

خصوصیات کا کمال جن کا بوجھ اس کے ذمے سے ظہور پذیر ہو سکیں۔ ترجمہ رباعی علم نے مجھے اپنے
ظہور کی دعوت دی۔ اے اہل درد میں فریاد کرتا ہوں کہ اس علم نے مجھے محض اعتبارات سے شناسائی کروائی
جو میرے لیے باعثِ رسوائی ثابت ہوئی۔ اس علم سے پہلے نہ اپنی خبر تھی نہ غیر کی صحبت کا خیال تھا۔ یہ علم
ہی تو ہے جس نے یہ ساری انجمن آرائی کی ہے۔ حسب معمول مصنّف ان تلمیحات و کنایات کی وضاحت
یوں کرتا ہے کہ علم سے میری مراد علم مطلق کا ادراک ہے جو سبھی افراد کے شامل حال ہے۔ کیا علم خالق
کیا علم مخلوق۔ یہ علم حق سبحانہ تعالیٰ ہی سے منسوب ہے۔ اسی سے ہم نے خود کو پہچانا، اور اسی کی بدولت
حق جل شانہ کے نزدیک پہچانے گئے۔ اور جس علم سے ہمیں منسوب کیا گیا ہے وہ اسی کی معرفت کا
باعث بنا اور خود ہماری پہچان کا۔ فریاد یہاں کلمہ ہے داد چاہنے کا، اور اہلِ درد سے انصاف طلبی کا۔
یعنی میں داد چاہتا ہوں ذاتِ واحد حق تعالیٰ سے تاکہ وہ اپنی عنایت لم یزلی سے ہم مظلوموں کی داد رسی
کرے جنھوں نے خود ہی اپنے اوپر ظلم کیا ہے۔ وہی ہمیں اپنے مشاہدۂ ذات سے مشرف فرمائے کیونکہ
اس علم نے اعتبارات موہومہ سے شناسا کر کے رسوا و خوار ہی کیا، اور دُنیا میں ہمارا تعارف کرایا۔
ہم ان دونوں حیثیتوں سے مبرا ہیں۔ ہماری ذات کی تہ تک کوئی نہ پہنچ سکا اور نہ پہنچ سکے گا۔ کیونکہ
ذاتی لحاظ سے ماہیت کا ادراک اک بڑا دشوار امر ہے لہٰذا اس علم کے حصول سے پہلے نہ تو ہماری ارواح کو
اپنی خبر تھی نہ کسی دوسرے سے محبت کا ارادہ تھا، یعنی ہم میں مرتبۂ کثرت کی پہچان کی اہلیت نہ تھی۔ وہ
اک علم حضوری تھا۔ ہم نے علم حصولی میں ادراک حاصل نہ کیا تھا۔ اور یہ علم حصولی ہی ہے جس نے
اس تمام کثرت سے عین رضائے حق تعالیٰ کے مطابق یہ انجمن آرائی کی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی رضا سب سے
بہتر اور بالا۔ جب علم کے دربار سے دعوت نامہ ملے تو چاہیے کہ تو امتیاز کی ڈور ہاتھ سے نہ چھوڑے
اور آداب مراتب کا پاس و لحاظ کما حقہٗ ملحوظِ خاطر رکھے۔ بندگی اسی کا نام ہے، اور شرع دین متین کی بنیاد
بھی اسی پر ہے۔ دُنیا اک مہمان سرائے سے زیادہ کچھ بھی نہیں، جو کچھ ملے اُسے نوش جان فرما اور میزبان کی
رضا حاصل کرنے کی پوری کوشش کر۔ ہمارا سرکار ایک سخی داتا سے ہے جو کریم ہے اور صاحب لطفِ
عمیم بھی ہے۔ اس موقع کو غنیمت جان اور یونہی بے کار نہ بیٹھ۔ یعنی جب حق سبحانہ تعالیٰ کی رضا اس
کے ذاتی و صفاتی کمالات کے اظہار ہی میں ہے تو ہمارے لیے انہی اعتبارات پہ قائم رہنا نہایت مناسب
اور موزوں ہے۔ اور جب ہم حضرت علم کی طرف سے مدعو کیے گئے ہیں تو پھر ہم امتیاز کی ڈور کو ہاتھ

سے کیسے چھوڑ سکتے ہیں۔ کیونکہ مہمان کے لیے تو اپنے میزبان کی فرمانبرداری اور خوشی کو ملحوظ خاطر رکھنا ضروری ہے، کیونکہ وہ صاحبِ خانہ بھی ہے اور اس نے ہمیں بلایا بھی ہے۔ حضرت علم اس کثرت ایجاد کا مبداو منشا ہے۔ اُسے عالم اور معلوم درکار ہیں۔ لہٰذا جب مراتب کا ظہور علم میں ہے، لہٰذا اہلِ علم کے ان مراتب کا تحفظ نہایت ضروری ہے۔ جب تک بندے میں من وتو، نفع و نقصان اور مکروہ ومرغوب کی پہچان ہے، اسے شرع کا پابند ہونا چاہیے، اور خیروشر اور شرعی لحاظ سے حلال وحرام میں فرق کرنا چاہیے۔ یعنی امرِ معروف کی فرمانبرداری اور نہی منکر سے پرہیز اور بچاؤ اس کے لیے لازم ہے۔ انبیائے کرامؑ نے اسلام کی بنیاد انہی شرعی احکام پہ رکھی ہے جو ظاہری اعتبارات سے تعلق رکھتے ہیں۔ کیونکہ بندگی کا حق اسی صورت میں ادا ہو سکتا ہے۔ اور طاقت بشری کے مطابق اپنے وجود کا حق بندگی اسی طرح کیا جاسکتا ہے۔ دُنیا اک مہمان سرائے ہے۔ نیکی کی اس راہ اور رضا کا معاملہ تو خداوند کریم سے ہے جس کا فیض عام ہے۔ وقت کو غنیمت سمجھنا چاہیے، اور جہاں تک ہو سکے یونہی بے کار رہ کر وقت ضائع نہ کرنا چاہیے

ترجمہ رباعی اللہ کی طرف سے آنے والے رنج وغم کی خوب خاطر تواضع کرنی چاہیے، اور اپنے دل کو اس کے غموں سے آباد کر لینا چاہیے۔ اے اپنی ہستی سے غافل انسان یہ وقت مفت میں ہاتھ لگا ہے اسے غنیمت جان اور اگر خوشی ومسرت حاصل نہیں تو ماتم ہی کرو، کچھ تو کرو۔ اب پھر مصنف اپنے حسبِ دستور رباعی کے مختلف الفاظ کی خود عقدہ کشائی کرتا ہے۔ مہمانی سے میری مراد ہے عین رضا ورغبت سے پیشوائی کرنا ہے۔ رنج والم سے مراد خلاف طبع حالات و واقعات ہیں جن سے ہمارا نفس متنفر اور اور مخالف ہے۔ دل سے مراد نفس ناطقہ۔ آباد کردن سے مراد اللہ کی رضا اور اطمینان سے اپنے قلب کو معمور کرنا ہے۔ غم سے مراد عشق باری تعالیٰ۔ فرصت سے مراد زندگی کی یہ مختصر مدت، ہستی سے مراد یہ وجود جوان کیفیات سے کیف وسرور حاصل کرتا ہے۔ شادی سے مراد حضور وشہود کی مسرت انگیز حالت ہے، اور ماتم سے مراد گھٹن اور دل گرفتگی ہے۔ اب رباعی کا مطلب یوں ہوا۔ اپنے نفس کے ناپسند، مکروہ حالات و واقعات کو رضا ورغبت سے قبول کرنا چاہیے، اور اپنے نفس ناطقہ کے لیے اللہ تعالیٰ کے دردِ عشق سے سکون واطمینان حاصل کرنا چاہیے۔ اے عرصۂ حیات سے غافل انسان اگر تجھے حضور ومشاہدۂ ذات کی کشادگی اور سرور میسر نہیں تو غم واندوہ اور دل گرفتگی کی اس حالت کو بھی ہاتھ سے نہ جانے دے جو آخر الامر تیری مسرت اور تیرے سینے کی کشادگی کا باعث بن جائے گی کیونکہ

جتنی گھٹن شدید ہوگی، اتنی ہی زیادہ وسعت اور کشادگی رونما ہوگی۔ کیونکہ برسات کے موسم میں جتنا زیادہ حبس ہوگا۔ اس کے بعد بارش بھی اتنی زیادہ ہوگی۔ جیسا کہ قرآن پاک میں آیا ہے کہ ہر تنگی کے بعد فراخی ہے۔ اس رباعی سے یہی معنی سمجھ میں آتے ہیں کہ تمام موجودہ صورتِ احوال جو پیش آتی ہے۔ خواہ وہ مصائب و آلام و تکالیف ہوں، خواہ خوشی اور مسرّت سب غنیمت ہیں، اور مفت میں ہاتھ آئی ہیں پھر یہ بھی نہ رہیں گی۔ ہے تو سب فنا کا حال ہے۔

وقت اور صورتِ حال کے مطابق جو بھی مناسب اور شایاں ہو اسی کو بجالاؤ۔ وقت کو مفت نہ گنواؤ اور اسے ضائع نہ کرو۔ اور تم جو کچھ کرتے ہو اللہ اُس سے غافل نہیں ہے[۵]

هوالنّاصر

شروع اللہ کے نام سے جو نہایت مہربان اور بہت رحم کرنے والا ہے

ہر قسم کی تعریف اللہ کے لیے ہے جو حق بات کہتا ہے، اور وہی راستے کی طرف ہدایت دیتا ہے۔ وہی میرے لیے کافی ہے۔ وہ کیا ہی اچھا کارساز ہے اور درود و سلام ہو اس کے رسول ؐ پر جو اسی کی طرف ہدایت دینے والا رہبر ہے۔ اور اُس کی آل ؑ پہ اور اُس کے اصحاب رضؓ پر جو بڑے جلیل القدر ہیں۔ امابعد یہ نواں باب ہے جس کا نام القول الحق ہے۔ کلام کرے اللہ تعالیٰ ہم سے اور تم سے ساتھ قول حق کے کہ جس میں نہ کوئی کجی ہے اور نہ کوئی پوشیدگی۔ جیسا کہ اُس نے بتایا ہمیں اور تمھیں ٹھیک ٹھیک کلام کرنے والا بغیر کسی لکنت کے تاکہ ہم بیان کریں لوگوں کے لیے ہر چیز کے راز تمام حیثیتوں سے ذاتاً، صفتاً، اطلاقاً، تقیداً، کلیتہً، جزیتہً، اتحاداً، امتیازاً، حقیقتاً، مجازاً، وجوباً، امکاناً، عیناً، ظلاً، حقاً، بطلاناً، معاشاً، معاداً، کسباً اور وہباً تاکہ حق ان پر منکشف ہو اور وہ پہنچیں اُس چیز تک جو بنائی گئی ہے ان کے لیے، اور ساتھ کرے میری ذمہ داری سے بھی وہ معاملہ جس کے لیے میں مبعوث کیا گیا ہوں۔ پس اگر تم چاہتے ہو کہ تم مطلع ہو ان تمام مذکورہ امور سے تو دیکھو یہ کتاب ساری کی ساری اور تلاوت کرو اسے تمام کی تمام اور ہم نے نہیں زیادتی کی کتاب میں کوئی بھی چیز اور اللہ تعالیٰ حق بات کہتا ہے۔ اور وہی ہدایت دیتا ہے راستے کی طرف ؎، اور جان لو کہ تم اگر سمجھ گئے تقید اور اطلاق (قید و آزاد ہونے) کی حقیقت کو جیسی کہ وہ ہے تو تم سے پردہ ہٹ جائے گا، اور تم نہیں ہوگے پھر تردّد کرنے والوں ؎ میں مراتب میں سے کسی مرتبے

کے بارے میں۔ کیونکہ مراتب وجود یہ منحصر ہیں انہی دو مرتبوں پر۔ پس نہیں باقی رہتی پوشیدگی، اور سنو جو میں کہتا ہوں، اور اسے لے لو تاکہ تم فلاح پاؤ۔

تقیّد واطلاق (قید وآزادی) کے بیان کا باب

یعنی قید وآزادی کی حقیقت اور ان کی باہمی نسبت کا بیان۔ آزاد و مقید کے مرتبے کے اتحاد و امتیاز کو سمجھ لینا چاہیے۔ قید کی حقیقت یہ ہے کہ اس کے معنی ہی تشبیہی ہیں، یعنی دیگر مقیدات کی نسبت سے منسوب ہونا جنھیں ہم مراتب مقیدہ کہتے ہیں۔ اور اطلاق یا آزادی کی حقیقت یہ ہے کہ اُس کے معنوں میں برائیوں سے دوری اور بچاؤ مضمر ہے اور مراتب مطلقہ سے دیگر اضافتوں اور نسبتوں کے گرائے جانے کا موجب ہے۔ چونکہ تمام مراتب مقیدہ و مطلقہ میں اطلاق تقید شامل ہے، اور مرتبۂ مطلق اپنی اطلاقیت (آزادی) کی حیثیت سے تمام اضافتوں اور نسبتوں سے مبرا ہے۔ اور اطلاق معانی کی قید کی حیثیت سے تمام صفتوں سے متصف ہے۔ لہذا تمام اضافتیں اور نسبتیں اگر مرتبہ مطلق سے الگ اور پرے ہیں پھر بھی منسوب اسی سے ہیں۔ تقید عام معنوں میں مقید اور مطلق دونوں پر صادق آتا ہے۔ کیونکہ اطلاق (آزادی) بھی اک قید ہے۔ اور اطلاق اپنے خاص معنوں میں سوائے مرتبۂ مطلق کے اور کسی پر صادق نہیں آتا لہٰذا ان میں عام وخاص کی نسبت ہے، اور عین اتحاد میں مرتبۂ مقید مرتبۂ مطلق سے ممتاز ہے۔ اور ہر ایک کے علیحدہ اور الگ احکام ہیں۔ جیسا کہ قرآن شریف میں آیا ہے کہ خدا نے دو دریاؤں کو صورۃً ملایا جن میں ایک کا پانی تو شیریں و تسلی بخش ہے اور ایک کا پانی شور و تلخ ہے۔ عبارات میں جہاں کہیں لفظ مطلق التقید آیا ہے یعنی لفظ تقید لفظ مطلق کی قید بن جائے، اور اُس کا مطلب بھی قیود یا پابندیوں میں سے ایک قید یا پابندی ہو، اور جہاں کہیں تقید المطلق کا لفظ آجائے یعنی لفظ مطلق لفظ تقید کی قید بن جائے تو ان تمام اقسام کے معنی تقید ہی ہوں گے۔ ترجمہ رباعی اس دُنیا میں جہاں ہمیں محض اعتباری مرتبے کی بنا پر قیود و پابندیوں کی بلائیں عام ہیں۔ اے درد یہاں آزادی کا خیال اک وہم ہے، اک خیال ہے۔ ہم مور کی طرح قیود و پابندیوں کے اسیر ہیں۔ جس طرح کہ مور کے پروں کا ہر نقش اور رنگ آنکھوں کے لیے اک جال ہے۔ اب مصنف خود ہی ان الفاظ سے اپنی مرادات کی یوں تصریح کرتا ہے۔ لفظ اینجا سے مراد مرتبۂ اعتبارات ہے جو ہر مطلق التقید اعتبار سے لاحق ہے۔ یعنی مختلف قیود و پابندیوں میں سے کوئی نہ کوئی پابندی اور

قید ہر کسی پہ ہے اور یہ ابتلا بھی موجودات پہ طاری ہے۔ اور تقید کو بلا سے اس لیے تعبیر کیا گیا ہے کہ وہ ہمیں اس ذات سے جو اطلاق و آزادی کی اصل ہے اک نئی پہچان دے کر ہمیں اس سے جُدا کر دیتا ہے وہ تقید (قید و پابندی) خواہ واجب التعظیم و تکریم ہو۔ خواہ نفرت و حقارت کے لائق ہو، عالی ہمت لوگوں کی نگاہ میں دونوں ہی بلا و ابتلا ہیں۔ لہذا نعمت و غیر نعمت کی ان ہر دو حالتوں کو اللہ تعالیٰ نے لفظ ابتلا ہی سے بیان کیا ہے۔ چنانچہ خدا خود فرماتا ہے۔ کہ آدمی کو جب اس کا پروردگار آزماتا ہے یعنی اس کو ظاہراً انعام و اکرام دیتا ہے۔ تو وہ بطور فخر کہتا ہے کہ میرے رب نے میری قدر بڑھا دی اور جب اس کو دوسری طرح آزماتا ہے۔ یعنی اس کی روزی اس پر تنگ کر دیتا ہے تو وہ شکایتہً کہتا ہے کہ میرے رب نے میری قدر گھٹا دی۔ حالانکہ یہ اکرام نہ تو اکرام ہے، اور نہ ہی یہ اہانت ذلت ہے[۵]۔ لہذا ان امور موہومہ میں سے جو کچھ بھی رونما ہو اس پر نہ خوش ہونا چاہیے اور نہ ہی مغموم جیسا کہ خدا نے خود فرمایا ہے۔ جو چیز تم سے جاتی رہے اس پر رنج نہ کرو، اور جو چیز تم کو عطا فرمائی ہے اس پر اتراؤ نہیں[۵]۔ مشاہدۂ ذات اور حضوری، حق تعالیٰ کی اک نعمت ہے اور اس کا نہ ہونا اک شامت ہے۔ اُس ذات مطلق و مختار سے جتنی نسبت بھی پیدا ہو سکے عین سعادت ہے۔ اگرچہ وصل تام جسے ہم عینیّت کہہ سکتے ہیں وہ ممکنات کے لیے بالکل مفقود ہے۔ اپنی مثال یا اپنا عین تو فقط وہ آپ ہی ہے۔ چونکہ ہر چند مطلق عین مقید ہے، لیکن مقید عین مطلق نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ مطلق تو اپنے تمام مقیدہ افراد میں شامل ہے، لیکن مقید تمام افراد مطلق میں شامل نہیں ہو سکتا۔ **سوال** اگر تم یہ کہو کہ جس طرح مطلق کا اطلاق تمام افراد مقیدہ پر محیط ہے۔ اسی طرح تقید مطلق بھی تمام افراد مقید پہ حاوی ہے، لہذا مقید بھی عین مطلق بن گیا جس طرح کہ مطلق عین مقید ہے، **جواب** میں یہ کہتا ہوں کہ اس صورت میں منظور اطلاق تقید ہو جاتا ہے، نہ کہ اُس کا تقید۔ لہذا اطلاق ہی اطلاق کا عین ہوا نہ کہ مقید عینِ مطلق۔ اور دوسرے مصرعے میں جو لفظ آزادگی آیا ہے۔ اُس سے ہماری مراد تمام قیود و پابندیوں سے رہائی پانا، اور اطلاق المطلق حاصل کرنا ہے۔ اور اس مرتبے کا گمان بھی اک خیالِ خام ہے، کیونکہ ہم تو ایک اعتباری ہستی کے اسیر ہیں، اور بالکل مور کی طرح اپنی نسبتوں کی رنگارنگی سے گلستان اظہار کی بہار بنے بیٹھے ہیں۔ اور مور کے پَر کی طرح جو نقش و نگار بھی ہے۔ یعنی ہر نسبت اور اضافت جو ہم سے منسوب کی گئی ہے وہ آنکھ کے لیے فریب کا اک جال ہے۔ ہماری قید و اسارت، اور مور کے پَروں کے نقش و نگار کی بہار اور چشم ظاہر کی صورت بالکل واضح و عیاں ہے۔ مگر سوچیے جب

مطلق بھی اطلاقی تقید میں گرفتار ہے تو پھر دوسرے مقیدات کی کیا مجال کہ وہ آزادی کا نعرہ بلند کریں۔ جب مطلق ہی اطلاقی قید میں ہے۔ اور مطلق التقیدّ سے خالی نہیں ہے تو پھر دیگر مقیدّات مطلقہ میں یہاں دم خم کہاں کہ اطلاق کا نام لیں۔ پس کمال معرفت اسی میں ہے کہ اپنی بندگی اور عبودیت کا صدقِ دل سے اعتراف کر لیا جائے، اور یہاں تک ہو سکے بندگی کے لوازمات کو سرانجام دینے کی کوشش کی جائے۔ اور وہ عبادات کے بجالانے، نہی منکر سے بچنے اور حقوق اللہ اور حقوق العباد ادا کرنے سے عبارت ہے۔ انا الحق کا نعرہ لگانا اتنی بڑی بات نہیں جتنی لغو اور بے فائدہ ہے۔ انسان کو بندہ بننا چاہیے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا صحیح پیروکار۔ اس مقام پہ اللہ تعالیٰ ہمیشہ اپنے بندے کے ساتھ ہوتا ہے جیساکہ اُس نے خود فرمایا ہے، "تم خواہ کہیں بھی ہو میں تمھارے ساتھ ہوں"۔ بندگی کے تمام لوازمات بھی ادا ہو جاتے ہیں۔ مرتبۂ امتیاز کے ہر مرتبے کی اُس کے شایانِ شان تعبیر کی جاتی ہے، اور امرِ واقعی میں کوئی خلل پیدا نہیں ہوتا۔ اس حال میں عینیّت کا دعویٰ جوں کا توں رہتا ہے۔ اس میں کوئی آزادی نہیں ہوتی۔ بندگی کے آداب فوت ہو جاتے ہیں۔ اور ہر مرتبہ کی کماحقہٗ داد نہیں دی جا سکتی۔ اور یہ اکثر کم فہم لوگوں کی گمراہی کا موجب بن جاتا ہے۔ دراصل ذات باری تعالیٰ کا مرتبہ جو ہر قسم کی نسبتوں سے مبرا ہے، وہ عینیّت اور غیریت کی اضافتوں سے بھی بالا و برتر ہے۔ وہاں تک کسی نسبت کی رسائی ہی نہیں۔ لہٰذا یہ تقید، اطلاق، کلیت، جزویت، کثرت، وحدت، نسب و امتیاز وجود سے متعلق ہیں نہ کہ عینِ وجود سے۔ وہ تو ان سب سے وراء الورا ہے۔ اللہ کے نزدیک نہ صبح ہے نہ شام یعنی یہ ساری نسبتیں یعنی اطلاقِ تقید۔ کلیت، جزویت، کثرت وحدت اور دیگر اعتبارات ذات پر بڑھادی گئی ہیں اور علم میں اسی سے پھوٹنے والی شاخوں کی طرح ہیں۔ اور یہ سب کی سب وجود کی نسبتیں ہیں نہ کہ ذات کی۔ ذات کا مرتبہ تو ان سب سے ماوراء ہے۔ وہاں صبح و شام کا سوال و سلسلہ نہیں۔ یعنی وہ تمام نورانی اور تاریک پردوں سے باہر ہے۔ لہٰذا اس مرتبۂ عینیّت کے متعلق کیا کہا جا سکتا ہے۔ نہ تو یہ وہ عینیت ہے جو لوگوں کے ذہن میں ہے۔ اور اُس کی غیریت بھی وہ غیریت نہیں جو لوگوں کے وہم و گمان میں سما سکے۔ جب تک انسان کے دل پہ انوارِ الٰہیہ کی بارش نہ ہو کوئی انسان ان بھیدوں کو نہیں پا سکتا۔ افسوس صد افسوس کہ وجود ایسا وبال ہے اور کسی نسبت کے بغیر ہستی محال ہے۔ یہ حسرت و افسوس حقیقت سے اطلاع اور اعتباری مراتب کے شعور اور غلبۂ شوق کی وجہ سے ہے، اور عینیّت اور غیریّت کے امتیاز

کا خبر رساں ہے جو ہوشیاری و نزولی مقام کا لازمہ ہے۔ اس مقام پر عینِ وصال بھی ہجر ہے، اور انتہائی نزدیکی میں بھی دُوری ہے۔ کیونکہ اس مرتبے کے حامل صاحب نظروں کو اگرچہ ہر جگہ حضرت وجود کے علاوہ اور کچھ موجود نظر نہیں آتا، لیکن وہ اس اعتباری ہستی کو اک وبال سمجھتے ہیں۔ اور بغیر کسی نسبت کے جلوۂ وجود کو مقیدات کے آئینہ میں محال سمجھتے ہیں۔ ترجمہ رباعی جس کوچے میں تو رہتا ہے اس سے ہمارا گزر نہیں۔ تو ہر سو موجود ہے۔ مگر ادھر گیا کوئی نہیں جدھر تو ہے۔ اگرچہ ساری مخلوق تیرے ہی چہرے کی آئینہ دار ہے۔ مگر جیسا تیرا چہرہ ہے، یا جیسا تو ہے تجھے دیکھا نہیں جا سکتا۔ مصنف نے خود اس کی مزید وضاحت یوں کی ہے۔ کہ ہم تعینات کے اسیروں کا اس مرتبۂ لاتعین میں گزر کہاں۔ اگرچہ ادھر اُدھر ہر طرف اس کے ظہور کے سوا اور کچھ نہیں، لیکن اُس بے کیف کیفیت کے حصول کا یارا کسے ؟ ہر چند کہ آئینہ میں وہی جلوہ گر ہے، اور آئینے میں عکس بھی اس کی صورت کے علاوہ کسی اور کا نہیں، لیکن کسی شخص کا چہرہ بغیر کسی واسطے کے جیسا کہ وہ ہے نہیں دیکھا جا سکتا، یعنی اس وجہ سے کہ کسی غیر کے چہرے کا عکس تو اُس شخص کا چہرہ نہیں ہو سکتا۔ سو ظاہری آنکھ اُسے دریافت نہیں کر سکتی جیسا کہ قرآن شریف میں بھی آیا ہے کہ اُس کو تو کسی کی نگاہ محیط نہیں ہو سکتی، اور وہ سب نگاہوں کو محیط ہو جاتا ہے۔ اور وہی بڑا باریک بین و باخبر ہے۔

هوالناصح

شروع اللہ کے نام سے جو نہایت مہربان اور بہت رحم والا ہے

ہر قسم کی تعریف اللہ رشید کے لیے ہے۔ وہ کہ نہیں ہے کوئی ہدایت مگر اُس کے ارشاد یعنی ہدایت دینے سے، اور نہیں ہے کچھ پانا مگر اسی کی ایجاد سے (اس کے پہنچانے سے) اور درود ہو اس کے رسولؐ پر جو بھیجے گئے ہیں اس کے تمام بندوں کی طرف، اور ان کی آل پر اور ان کے اصحاب پر جو ہدایت دیتے ہیں اس کی ہدایت کے راستے کی۔ امابعد پس یہ دسواں باب ہے جس کا نام سبیل الرشاد ہے۔ ہدایت دے اللہ ہمیں اور تمھیں ایمان حقیقی کو پانے اور اُس کے عرفان کے ساتھ جیسا اُس نے نیک بخت بنایا ہمیں اور تمھیں ظاہری اسلام کے حصول کے ساتھ اور اس کے ارکان کے ساتھ۔ پس یوں میں ایمان لے آیا اللہ پر اجمالاً جیسا کہ وہ ہے اس کے اسماء اور صفات کے ساتھ اور قبول کیے میں نے اُس کے تمام احکام اور تفصیلاً بھی ایمان لایا اس پر اور اُس کے فرشتوں پر اور اس کی کتابوں پر اور اُس کے رسولوں پر اور یوم آخرت پر اور تقدیر پر اس کے خیر و شر کے ساتھ کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے اور اُٹھائے جانے پر موت کے بعد حقیقی ایمان لایا سچا، زبان کے ساتھ اور دل کے ساتھ ظاہری اور باطنی، روحانی اور جسمانی اور مخفی اور اعلانیہ طور پر۔ وہ پہنچانے والا ہے۔ اطمینان کامل کی طرف بغیر کسی شبے اور طعن و تشنیع کے۔ جس طرح کہ خبر دی اللہ تعالیٰ نے ایک سچے اور اپنے نبی کی تصدیق کرنے والے مومن کے بارے میں، اور کہا اُس نے جو ایمان لایا کہ اے قوم پیروی کرو میری میں سبیل الرشاد (ہدایت کے راستے) کی طرف تمھاری رہنمائی

کروں گا۔ پس ہدایت اور قبولیت نہیں حاصل ہوتی مگر اللہ تعالیٰ کے تمام مظاہر کو پورے طور پر مان لینے سے۔ پس جب تم قبول کر لیتے ہو ان سب کو، تو اللہ تعالیٰ قبول کر لیتا ہے اچھی طرح قبول کرتا، اور بناتا ہے تمہیں جمع کرنے والا پورے طور پر اور کامل مصلح اور اس جامعیت کی حالت میں عارف بن جاتا ہے ناصح بغیر کسی اختلاف کے اور دعویدار انصاف کے ساتھ، اور قاتل بغیر دشمنی کے، اور ہلاک کرنے والا بغیر فساد کے، اور ہنسنے والا بغیر خوشی کے، اور رونے والا بغیر غم کے۔ اور بیان کرنے والا بغیر مباحثے اور جدال کے، اور بحث و تمحیص کرنے والا ہوتا ہے بغیر جھگڑے اور فساد کے۔ اور جیسے کہ آیا ہے ہر قسم کی مخالف استعداد میں صلح پیدا کرتا ہے۔ اس طرح جس طرح صلح کرتا ہے اور جمع کرتا ہے ہر قسم کے حالاتِ متضاد میں، اور صلح بھلائی ہے۔

مباحثے اور جھگڑے سے ممانعت کا باب

مخالفت اور لڑائی جھگڑے کی شکل میں بحث مباحثہ اور دشمنی اور ردوبدل کے انداز میں تکرار اور جھگڑا نیک بندوں کا کام نہیں، اور نہ ہی ایسی قیل و قال، بحث و تکرار اور جھگڑے کی تردید اور مخالفت۔ بعض حقیقت ناآشنا واعظوں اور وہم کے مارے ناصحوں نے جو طریق یا انداز اپنایا ہے وہ بھی عارفوں کا شیوہ نہیں۔ ان دونوں معاملات کو جاہل، غافل، سطحی اور ظاہری علما کے حوالے کر دیا گیا ہے جو ہر بات میں خود غیر مطمئن ہیں اور پس و پیش میں پڑے رہتے ہیں۔ مگر شک و شبے کو دوسروں سے منسوب کر دیتے ہیں۔ محض اپنی فطری خباثت کی بنا پر خدا کے بندوں سے لڑتے ہیں۔ اور بعض اپنے جبلی شر کی وجہ سے بچارے کمزوروں سے الجھتے ہیں۔ اس پند و نصیحت، وعظ، اور ڈرانے دھمکانے یا نیک کاموں کی ترغیب دینے یا برائیوں سے روکنے سے ان کی مراد بجا ہو یا بے جا، پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ سب اپنی بزرگی، عظمت، بڑائی، پاکیزگی، برتری، فوقیت، نیکی و پرہیزگاری کا ڈھونگ رچانے اور اپنے علم و دانش، مسئلہ دانی، اپنی دھواں دھار اور ہیبت ناک چرب زبانی اور نفسانی غلبے کا ڈھنڈورا پیٹنے کے مترادف ہے۔ اور دوسرے کی تذلیل، تحقیر، چرک آلودگی، ذلت و خواری، خفت، فتنہ و فساد، دشمنی، گنہگاری، تردید، الزام تراشی، آمیزش و ملاوٹ، کم علمی و حماقت کا کیچڑ اچھالنے اور اُسے مغلوب کرنے کے لیے ہے۔ انبیا و اولیائے کرام اور عارفانِ ذات جو کافروں، منکروں

اور تعصب کے ماروں کو توحید کی دعوت اور رُشد و ہدایت دیتے اور وعظ و نصیحت کرتے ہیں اور مومنو، انصاف پسندوں اور اقرارِ ایمان کرنے والوں کو شریعت، طریقت اور حقیقت کی تعلیم دیتے ہیں وہ خود صاحبِ ایمان، محبت و معرفت ہوتے ہیں اور مکمل طور پر مطمئن ہوتے ہیں۔ اُنھیں کسی قسم کا شک و شبہ اور تردد نہیں ہوتا، اور سبھی کو اطمینان و سکون تک پہنچا دیتے ہیں۔ اور صرف اپنی ذاتی ہدایت اور نرمی سے دوسروں سے شفقت بھرا سلوک کرتے ہیں اور رحمدلی سے پیش آتے ہیں، اور اُسے ناحق شناس سرکشوں اور لوگوں میں شر پھیلانے والے مفسد پردازوں کی اصلاح و بہبود کے لیے صرف کرتے ہیں۔ ان کی یہ تمام پند و موعظت، وعظ و نصیحت، جزا و سزا کی بشارت دینا یا ڈرانا دھمکانا، سختی اور جھڑک، نیک کاموں کی رغبت دلانا، برائیوں سے منع کرنا عین موقع محل کے مناسب اور بجا ہوتا ہے اور خالصتاً اللہ ہی کے لیے ہوتا ہے۔ محض رضائے خداوندی کے لیے ہوتا ہے۔ وہ لوگ اپنے انسانی عجز و بندگی کے انکسار، اپنی خامیوں کا اعتراف اور حق بات کا اعلان اپنی نفسانی خواہشات اور ہوا و ہوس کی مداخلت کے بغیر کرتے ہیں۔ علم و معرفت کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر ہونے کے باوجود وہ اپنی ہیچ مدانی اور بے زبانی کا کھلے بندوں اعتراف کرتے ہیں، اور پھر وہ یہ سب کچھ دوسروں کی عزت افزائی، ان کی طہارت و وقار کے بڑھانے، ان کے احترام و عافیت، بخشش، اُنھیں سکھانے پڑھانے اور اُنھیں غالب و کامران و کامیاب بنانے کے لیے کرتے ہیں۔ اگر یار دوستوں اور استفادہ کرنے والوں میں سے کوئی اپنے حصول اطمینان یا از روئے عقیدت و ارادت مؤدبانہ طریق سے کچھ پوچھے یا کسی ایسے شخص کے سامنے جس پہ تیری بات کارگر اور موثر ثابت ہو تو حقیقت ہی بیان کرنی چاہیے اور ہدایت کی راہ ہی دکھانی چاہیے۔ کیونکہ دین اک نصیحت ہے[۵]۔ بصورت دیگر خاموشی اختیار کرنی چاہیے اور یونہی احمقوں کی طرح ٹرانا نہیں چاہیے۔ کیونکہ جسے تم چاہو ہدایت نہیں دے سکتے۔ البتہ اللہ جسے چاہتا ہے ہدایت بخش دیتا ہے[۶]، حاصل کلام یہ کہ اس بحث و تکرار اور قیل و قال کو چھوڑ کر موافقت کا دروازہ کھولو اور اپنے خلوص کے سورج کی حدت و گرمی سے ان کے نفاق کی برف کو جو اُن کے سینوں میں جمی ہوئی ہے پگھلا کر بہتے ہوئے پانی میں بدل کر اُنھیں خالص دینِ محمدی تک پہنچا دو۔ یہ بھی سمجھ لو کہ وہ بحث و تمحیص اور قیل و قال جو مقابلے کے طور پر ہوتی ہے۔ اس سے اکثر و بیشتر حق اور سچ بات کا بیان یا ثابت کرنا منظور نہیں ہوتا۔ دونوں طرف سے انانیت اور شیطانی شرارت کے

شعلے بھڑک اُٹھتے ہیں جو آتشیں جزو کا اثر ہوتے ہیں اور ہر کوئی اپنی اس انا کی وجہ سے یہی چاہتا ہے کہ اس کی بات مانی جائے اور اُسی کا ڈنکا بجے اور دوسروں پہ امرِ واقعی کے ثابت کرنے کے اصل مطلب کی ڈور ہاتھ سے نکلی جاتی ہے۔ اور ماضی کے محققین کی دشمنی از سرِ نو اُبھر آتی ہے۔ اور جن لوگوں کو تو دعوت دے وہ اور بھی منحرف ہوجاتے ہیں اور محبت کی جگہ بغض لے لیتا ہے، اور رشد و ہدایت کا مدعا فوت ہوجاتا ہے۔ لہذا یوں بحث و مباحثہ کرنا غافلوں کا کام ہے نہ کہ کامل عارفوں کا۔ طریقت پہ کاربند یہ بچے جب اپنے بچپنے کی حالت سے نکل کر سلوک کے وسط تک پہنچتے ہیں جو عالمِ شباب، عروج اور غلبہ، مستی کا زمانہ ہوتا ہے تو اس جوشِ جوانی کی وجہ سے ان میں گفتگو کا شوق زیادہ ہی ہوتا ہے۔ لہذا بمصداق اس مقولے کے کہ جس نے خدا کو پہچان لیا اس کی زبان دراز ہوگئی، وہ اپنی ہر وارداتِ قلبی کو کھل کر بیان کرنے لگتے ہیں۔ جب وہ ادھیڑ پن کو پہنچتے ہیں۔ یعنی جب معاملات کے نزول کا آغاز ہوجاتا ہے تو ان کی گفتگو اعتدال کے دائرے میں آجاتی ہیں، وہ خلافِ شرع باتیں کرنے سے باز آجاتے ہیں۔ اور جب بڑھاپے کو پہنچتے ہیں اور عروج و نزول کا چکر ختم ہوجاتا ہے تو چپ سادھ لیتے ہیں۔ بلا ضرورت بات نہیں کرتے بمصداق اس کے کہ ع جو پا گیا ہے راز وہ گم ہے، خموش ہے۔ ان کی زبان گنگ ہوجاتی ہے۔ ترجمہ رباعی کچھ عرصہ تو ہم شعلے کی طرح خوب بھڑکے اور بلند ہوئے، کچھ عرصہ ہم نے خوب زبان درازی کی، آخر ہم نے یہی دیکھا کہ یہ ساری سرکشی شمع کی طرح اپنے آپ کو پگھلانے ہی کے مانند تھی سراسر گھاٹے کا سودا۔ اب مصنف خود اس رباعی کی اصطلاحی گتھیوں کو سلجھاتا اور کڑیوں کو یوں جوڑتا ہے کہ سرفرازی سے ہماری مراد بے جا حرکات اور ابتدائی معاملات میں اپنی خود سری اور برتری کا منوانا ہے۔ زبان درازی سے مراد حال مست ہوکر منشر سخن کہ من عرف اللہ کل لسانہ چلانا ہے۔ سرکشی سے مُراد عروج کے زمانے کا جوش و خروش ہے اور صرف جاں گدازی کردن سے مُراد ہے خُسران و نقصان میں رہنا اور بے فائدہ کام کرنا ہے۔ اب رباعی کا مطلب یوں ہوا کہ ہر سرفرازی اور زبان درازی جو وسط سلوک میں کی گئی زمانۂ عروج میں ہر جوش و خروش جو ہم سے وقوع پذیر ہوا۔ آخر کار یہ راہِ سلوک طے کرنے کے بعد نزول تام کے وقت ہم پہ آشکار یہ ہوا جسے ہم نے دیکھا کہ وہ سب کچھ اپنی جان کا کھونا ہی تھا۔ یہ بڑی دلنشین مثال ہے۔ ظاہر ہے کہ شمع کی وہ ساری سرفرازی، زبان درازی اور وہ سرکشی محض اُس کے پگھلانے یعنی اُس کی جان کے نقصان پہ جا کر ختم ہوئی۔ اسی طرح ہماری اس تمام بسیار گوئی سے فائدہ کسی کو نہ پہنچا بلکہ

وہ بے جا حرکات اپنے ہی تضیعِ اوقات کا باعث بنیں۔ کیونکہ یہ عامی اور مبتدی کلام حقیقت کا فہم و ادراک نہیں رکھتے اور زندگی کے وسطی دور کے عارف بھی وہ شیوۂ بیان نہیں رکھتے جو کاملوں کے ذوقِ سلیم کے موافق ہو اور ناقصوں کو نفع پہنچانے کا سبب بن سکے۔ لہٰذا اس وسطی دور کی تقریروں پر توبہ استغفار کرنا ہی بہتر ہے۔ جیسا کہ آخر کار میں حضرت بایزید بسطامیؒ نے فرمایا ہے کہ لا الٰہ الا اللہ پڑھ کر میں نے زنار کو قطع کر دیا۔ دیگر تمام سلسلوں کے بزرگوں نے بھی آخر میں مستی کے اُس عالم کے کلمات سے توبہ و استغفار ہی کی ہے۔ جس کسی نے ان بزرگوں کے حالات کو دیکھا یا ان کے کلام سے استفادہ کیا ہے تو اُس سے یہ بات چھپی نہ رہی کہ ابتدائی دور کی اس بحث و تمحیص اور لاف زنی سے جو سراسر جہالت اور خطا کاری ہے۔ ظاہری اور باطنی طور پر توبہ استغفار کرنی چاہیے اور ہمیشہ اپنی اصلاح کے درپے رہنا چاہیے۔ استغفر اللہ ثم استغفر اللہ۔ اس بے فائدہ بحث اور بے کار لاف زنی اور ان زائد از ضرورت باتوں سے ہزار بار توبہ اور خاموشی اختیار کرنی چاہیے۔ دوسروں کے سامنے وہ بات کرنی چاہیے جو ان کے لیے مفید مطلب ہو۔ جیسا کہ قرآن پاک ہے کہ لوگوں سے ان کے فہم و ادراک کے مطابق بات چیت کرتا ہے۔ آدمی خواہ کسی قسم کا ہو اُسے معذور ہی سمجھنا چاہیے اور فطرتاً مجبور ہی جاننا چاہیے کیونکہ کج فہم معذور ہے اور حق گو مجبور۔ متعصب کو غیرت اچھی لگتی ہے اور متصف کو حقیقت بین آنکھ۔ پھر جس کسی سے بھی سامنا ہو وہ ان چار قسموں سے باہر نہ ہوگا۔ یا تو مدِ مقابل کج فہم ہوگا جو بات کو سمجھ نہ سکے اور تہ تک پہنچ نہ سکے اور اتنی استعداد ہی نہیں رکھتا کہ اصل مفہوم پا سکے، لہٰذا ایسا آدمی معذور ہے۔ اُس سے بحث مباحثہ یا قیل و قال اپنی عقل کا قصور ہے یا سامنے والا راست گو ہے اور امر واقعہ بیان کرتا ہے، اور تو چار و ناچار حق پوشی کرتا ہے۔ پس وہ حق بات کہنے پر مجبور ہے۔ اُس کی راست گوئی اس امر کا تقاضا کرتی ہے۔ اگر تھوڑی بہت پہچان ہو تو ایسے شخص کے سامنے جس کی تقریر معقول ہو اور مربوط بھی چپ رہنا ہی بہتر ہے، وہاں مخالفت کرنا بے جا ہے۔ یا پھر مدِ مقابل متعصب ہے۔ اُسے بات کی تحقیق سے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ اُسے سچی یا جھوٹی بات کے سمجھنے سے سروکار ہی نہیں، اُسے تو اپنے ہی مذہب و ملت کی حمایت اور جانبداری ملحوظِ خاطر ہے۔ لہٰذا ایسے شخص کے سامنے حقیقی معانی کا بیان کرنا وقت کا سراسر ضائع کرنا ہے۔ یہاں بھی خموشی ہی بہتر ہے، اور یا پھر چوتھی صورت کہ مدِ مقابل انصاف پسند آدمی ہے۔ اور اس کے پیشِ نظر حقیقت بینی

ہے ۔ لہذا ضد کرکے ایسے شخص کا مقابلہ کرنا اور اس کی انانیت کو جوش دلانا اک غلطی ہے ۔ یہاں بھی خموشی ہی مناسب اور بہتر ہے ۔ اور اگر ایسے شخص سے کچھ نرم و ملائم اور پُر خلوص گفتگو ہوسکے تو جائز ہے ۔ اگر اپنے ہی یارانِ طریقت میں سے ہو اور اس کے بموجب کہ اکثر امور میں باہمی مشورہ کرلیا کرو وہاں مشورت ضروری اور لازمی ہے ۔ حاصل کلام یہ کہ موافقت کا دروازہ کھولنا اور تنازعہ اور جھگڑے کا دروازہ بند کردینا چاہیے ۔ وہ درویش جو ہر سو حُسنِ ازل ہی کا مشاہدہ کررہا ہے وہ مخالفت کرے تو کس سے ۔ متعصب جو اپنے خیال میں اپنے دین کی غیرت و حمیت رکھتا ہے وہ بھی خوب ہے ، اور منصف جو اپنی سمجھ میں دیدۂ حق بین رکھتا ہے وہ بھی قابلِ قبول ۔ پس ایک اگر قابلِ ستائش ہے تو دوسرا لائق تحسین و آفرین ہے ۔ ہمہ از دوست ۔ سبھی کچھ اسی سے ہے اور سب کچھ ٹھیک اور درست ہے ۔ غرضیکہ تو سبھی پہ تحسین و آفریں کہہ اور ذاتِ پاک سے کو لگا ۔ حق بینی سے غافل نہ ہو ۔ غفلت کی راہ پر مت چل ۔ جب یہ حقیقت کھل جاتی ہے تو باطن سے مخالفت کا جذبہ کلّی طور پر محو ہوجاتا ہے ۔ اور مکمل اطمینان و سکونِ قلب حاصل ہوجاتا ہے ۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اور تمھیں اپنے رسولِ مقبول ؐ کے صدقے قلب و نفس کا اطمینان عطا فرمائے ۔ **ترجمہ رباعی** جب ہم ہر نیک و بد سے شاد و شادماں ہوگئے اور شمشاد کی طرح پھول اور کانٹے سے آزاد ہوگئے ۔ یعنی اس دل کو جو اس تمام تفرقے کا باعث تھا ہم نے زلفِ یار میں باندھ دیا اور خود آزاد ہوگئے ۔ مصنف خود اس رباعی کی تشریح یوں بیان کرتا ہے کہ جب ہمیں ہر نیک و بد ، دوست و دشمن سے خوشی و مسرت حاصل ہو اور ہماری عرفانی نگاہوں میں مکروہ و مرغوب یکساں ہوجائیں تو پھر یہ پھول یا کانٹے جو اس دُنیا کی مکروہات و مرغوبات پہ مشتمل ہیں سب ہیچ ہوکر رہ جاتے ہیں ۔ سروِ آزاد نے عقل و ذہن کو اپنے جال میں نہ پھنسایا ۔ شمشاد کی مثال اس لیے دی ہے کہ اُس میں نہ کانٹے ہوتے ہیں نہ پھول ۔ وہ ان پھندوں اور بندھنوں سے آزاد ہے ۔ لہذا اپنے نفس ناطقہ کو جو اس تمام امتیاز و تفرقہ کا باعث تھا ۔ ہم نے اُسے حق تعالیٰ کی محبت کا اسیر بنادیا اور اُس کے حضور و شہود کی زلفوں میں باندھ دیا اور خود ان تمام بندھنوں اور علائق سے آزاد ہوگئے اور یُوں جان چھوٹی ۔ پس اتنا کہہ دو کہ اللہ ۔ اور پھر اُنھیں اپنی دلیل بازیوں کے لیے چھوڑ دو ۔

هوالناصر

شروع اللہ کے نام سے جو نہایت مہربان اور بہت رحم والا ہے

ہر قسم کی تعریف اللہ کے لیے ہے کہ جس کی سنت جاری ہے ازل سے ابد تک، اور جس کی رحمت طاری ہے روح اور جسد تک۔ اور سلام ہو آپ کے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر جو احمدؐ سے موسوم ہے اور آپ کی آل علیہم، معصوم صحابہؓ پر جو محفوظ ہیں خطا سے۔ خطا کاری سے عمداً۔ اما بعد پس یہ گیارھواں باب ہے جس کا نام سنت اللہ ہے۔ اور تو نہیں پائے گا اس کی سنت میں تبدیلی۔ کیونکہ تبدیلی اور تغیر دُنیا میں اللہ کی سنّت میں سے ہے، اگر تبدیلی ہو تو نہیں ہو گا عالم اپنی ہیئت حاصلہ میں۔ پس عالم جو کہ سب کے سب امکانی مراتب کا مجموعہ ہے۔ وہ قدیم زمانے سے حادث ہے۔ ذاتی حدوث کے لحاظ سے اور اگر وہ تھا زمانے کے لحاظ سے حادث تو تو پاتا ہے اللہ سبحانہ کی سنت میں تبدیلی، اور تو پاتا ہے اس کی صفت میں بھی نیا پن اس کے اعتقادات کے ساتھ۔ نہیں قائم ہوتا اپنی ذات کے ساتھ حادث پس سمجھ لے اور نہیں لازم آتا اس تقدیر قدمِ زمانی سے اشیاء جزئیہ کی جو خبر آئی ہے اس کے حدوث اور فنا ہونے سے شرع میں خاصتہ، بلکہ مٹاتا ہے اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے، اور ثابت رکھتا ہے جو چاہتا ہے۔ اور اُس کے پاس ام الکتاب ہے۔ اور ہماری مُراد یہاں اس باطل قدمِ زمانی سے اس مرتبے کا قدیم ہونا ہے جس میں واقع ہوتا ہے محو ہونا اور ثابت رہنا، اور اُسے تعبیر کیا گیا ہے اللہ تعالیٰ کے کلام میں اُم الکتاب کے ساتھ۔ اور اگرچہ وہ بھی ہے اپنے امکان میں ذاتی طور پر نیا ہونا۔ پس وہ حقیقی

طور پر قدیم نہیں ہے قدیم ذاتی کے ساتھ سوائے اللہ کے، اور اللہ تھا اور نہیں ہے اُس کے ساتھ کوئی چیز اور اب بھی وہ ایسا ہی ہے جیسے وہ تھا۔

اس بے بنیاد عالم کے بناؤ بگاڑ اور فنا کا باب

دُنیا کے بگڑنے بننے یا فنا ہونے سے مراد حالات کا دم بدم تغیر و تبدل اور اس بے ثبات دنیا کا نیست و نابود ہوتا ہے۔ کیونکہ دُنیا میں ہر آن اور ہر گھڑی حالتوں کا تغیر و تبدل ہوتا رہتا ہے۔ اور عالم سے مراد زمانی (نو پیدا شدہ) موجودات ہیں۔ کیونکہ نہ زمانہ ایک حالت پر رہتا ہے۔ اور نہ ہی ان موجودات کو ایک حالت پر قرار ہے۔ بننے بگڑنے کا اطلاق اسی حیاتِ ارضی پر ہوتا ہے۔ اگرچہ از روئے حقیقت سارے امکانی مراتب انہی متغیرات میں شامل ہیں۔ کیا مادیات، کیا مجردات، کیا عالم موجودات، اور کیا عالمِ ارواح و ملائکہ۔ امکانیت خود ہی متغیر کے معنوں میں آتا ہے۔ اور موجود حادثِ زمانی ہوتا ہے، خواہ وہ زماناً ہو یا ذاتاً، عدم کو اس پر سبقت ہے کہ جو کچھ بھی ایسا ہے وہ حقیقت میں متغیر ہے، اور اُسے فنا بھی لازمی ہے اور اُس سے عدم کا لاحق ہونا بھی متحقق ہے۔ وہ شمولیت زمانی کے لحاظ سے ہو یا ذاتی لحاظ سے۔ پس جس طرح زمانی موجود حادث کی سبقت عدم ذاتی و زمانی ہر دو لحاظ سے ثابت ہے۔ اسی طرح دونوں حیثیتوں میں عدم کا لاحق ہونا بھی تحقیق شدہ ہے۔ کسی موجود حادث کی ذات کو سبقت عدم کی نسبت، ذات پر نظر سے ہے، نہ کہ زمان کے اطلاق سے۔ ہر چیز موجودات ممکنہ میں سے ہلاک ہونے والی ہے۔ زمانے کے ساتھ یا ذات کے ساتھ سوائے اللہ تعالیٰ کی ذات کے اور وہ قدیم ہے قِدم ذاتی کے ساتھ اور باقی ہے بقائے ذاتی کے ساتھ۔ اس کی اولیت سے پہلے کوئی اوّل نہیں وہی اوّل ہے اور نہیں ہے کوئی آخر اپنے آخری ہونے کے ساتھ مگر ذہی آخر ہے۔ پس پاک ہے وہ، خود نظر آنے والی چیز نہیں ہے۔ مگر چیزوں کو ظاہر کرنے والا وہی ہے وہ خود مستور نہیں ہے، لیکن وہ خود باطن ہے۔ نہیں ہے زمانے میں اور زمانہ اس کی وجہ سے زمانہ ہے اور نہیں مکان میں، اور مکان اس کی وجہ سے مکان ہے۔ اور نہیں ہے وہ جوہر مگر جوہر اس کی وجہ سے جوہر ہے، اور نہیں ہے وہ عرض مگر عرض اسی کی وجہ سے عرض ہے۔ نہیں ہے وہ جسم مگر جسم اس کی وجہ سے جسم ہے۔ نہیں ہے وہ کوئی صورت مگر ہر صورت اس کی وجہ سے صورت ہے اور نہیں

ہے وہ کسی سمت میں، مگر سمت اس کی وجہ سے سمت ہے، اور وہ اپنی ذات کے ساتھ حادث نہیں ہے۔ بلکہ ہر حادث اس کی وجہ سے حادث ہے۔ پس تحقیقی اور حقیقی لحاظ سے قائم بالذات تو فقط ذات باری تعالیٰ ہی ہے۔ اور یہ سب موجوداتِ ممکنہ، ارضی یا سماوی، کیا قدیم اور کیا حادث اس وجود مطلق کے سامنے کوئی حیثیت نہیں رکھتیں، اور اس ذات سبحانہ تعالیٰ کی ذاتی قدمت اور بقا کے سامنے یہ سب ہر لحظہ ہر آن بنتی اور مٹتی رہتی ہیں۔ ہر موجود کو ہر وقت عجیب فراموشی و غفلت لاحق ہے اور ہر مشہود پر ایک عجیب مقبولیت صادق آتی ہے لہٰذا سبھی کو مشاہدۂ ذات میں مستغرق ہو جانا چاہیے اور اپنے وجود کا مقید اور اسیر بن کر نہ رہ جانا چاہیے کہ یہ وجود تو ہمیشہ معرضِ زوال میں ہے۔ اور وہ وجود سرمدی ہمیشہ ایک ہی حالت پہ قائم و دائم۔ لہٰذا کوتاہ بین و کوتاہ اندیش عوام کو ان مشہودات متغیرہ کے احوال کو سمجھانے کی غرض سے لکھا جا رہا ہے۔ ان تغیرات کو وہ خود بھی مادی حس سے دیکھتے ہیں اور کچھ نہ کچھ سمجھتے بھی ہیں۔ اب کھول کر بیان کیا جاتا ہے تاکہ وہ اصل مقصد کو پا سکیں۔ ترجمہ

رباعی یہاں اس کائنات میں کبھی صبح اور کبھی شام یہاں تو بس بننے بگڑنے ہی کا ایک نظام اور مسلسل چکر ہے۔ شرارے کی طرح اپنی ہستی سے غافل نہ ہو جا، کیونکہ یہاں تو آنکھ جھپکنے میں کام تمام ہو جاتا ہے۔

اب مصنّف کی اپنی تصریحات دیکھیے۔ سحر جو نورانی ہوتی ہے۔ اس سے ہماری مراد وجود اعتباری ہے اور عدم جو تاریک و ظلمانی ہے اس سے مراد عدم اعتباری ہے۔ لہٰذا کون و فساد کو جو وجود و عدم کے معانی میں آیا ہے اسی عالم کے قیام سے حاصل ہونے والی کیفیت کہا گیا ہے۔ اور اس ہستی کو شرارے کی ہستی سے اس کی بے ثباتی اور کم فرصتی کی وجہ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ لہٰذا شرارے کی طرح اس اعتباری ہستی کے مشاہدے میں ہستیٔ مطلق سے غافل نہیں ہونا چاہیے، اور اُس قادرِ مطلق کے مشاہدے سے محروم نہ رہنا چاہیے۔ کیونکہ ان موہومات کا یہ کارخانۂ موجودات تو آنکھ جھپکنے، یعنی نہایت ہی قلیل مدت میں ختم اور نیست و نابود ہو جاتا ہے۔ چشم زدن کا استعمال اور اس کے ساتھ شرارے کا لانا خالی از لطف نہیں، اور دونوں کی آنی و فانی زندگی پر دلالت ہے۔ یہ معنی بالکل واضح اور روشن ہیں۔ اور عوام کے ذہن و فہم میں جلد آجانے والے ہیں۔ لیکن ذوقِ سلیم رکھنے والوں کے لیے شعر کے لحاظ سے بھی اس رباعی کے معنوں میں کوئی دشواری نہیں۔ بلکہ بالکل صاف آسان فہم اور ذہنوں میں جلد آجانے والے ہیں۔ اور حقیقی معنوں کے لحاظ سے جو صاحبانِ ذوق کے عین مناسب ہے۔ کچھ اس کا

ذکر ہولیا، اور کچھ آگے آرہا ہے۔ سمجھ لینا چاہیے کہ حکما کے نزدیک 'کون' کسی چیز کا دفعتہً پیدا ہونا ہے۔ اور فساد اس کے معدوم ہونے کو کہتے ہیں۔ اگر ہوتا ہے یہ بتدریج تو حرکت کہلاتی ہے۔ حکما کی اصطلاح ہے کہ وہ "کون" کسی چیز کے دفعتہً پیدا ہونے کو کہتے ہیں۔ جیسا کہ ہوا پانی بن جاتی ہے۔ اور پانی اولوں کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ اور فساد کسی چیز کے اچانک نابود ہونے کو کہتے ہیں۔ اسی شے کا پیدا ہونا دوسری شے کی فنا کا نام ہے۔ مثلاً ہوا کے پانی بننے کے لیے کون (بننا) آئے گا اور وہی ہوا کا بگڑنا (نابود ہونا) ہوگا۔ یہی عمل بتدریج اور آہستہ آہستہ ہو تو اُسے حرکت کہتے ہیں۔ لہذا اگر مقدار میں حرکت ہو، جیسے نشو و نما پانے والے اجسام میں قوّت نامیہ اُسے مقداری حرکت کہتے ہیں۔ اور اگر یہ حرکت چگونگی حالت (کیفیت) میں ہو جیسے رنگین چیزوں میں رنگ کا بدل جانا تو اسے کیفی حرکت کہتے ہیں۔ حاصل کلام یہ کہ یہاں شاعر کی مراد عام معنوں سے ہے۔ جو کسی چیز کے وجود و عدم سے ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے اس عالم کے انتظام کو بننے بگڑنے پہ رکھا ہے۔ اور کائنات کی مختلف صورتوں کو تغیّر و تبدل کا رنگ دیا ہے تو گویا اس رباعی میں 'کون و فساد' سے ہماری مراد وہی ہے جو عرفِ عام میں لی جاتی ہے کہ کسی شے کا ہونا یا نہ ہونا۔ اور اس کون و فساد میں حرکت اور غیر حرکت کے معانی بھی شامل ہیں۔ کون و فساد دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ یہ ایک چیز میں ایک ہی زمانے کے اندر جمع نہیں ہوسکتیں۔ کیونکہ 'کون' صورت ہیولیٰ میں صورت کا حصول ہے۔ اور فساد اس کا اس سے نکل جاتا ہے۔ اور اگر ان میں سے کوئی چیز فاسد ہو جاتی ہے تو اس کے سوا نہیں ہے کہ وہ دوسری چیز ہو، کیونکہ ہیولیٰ (جسم) جو ہے اس میں سے اگر ایک صورت نکال لی جائے تو وہ دوسری پہن لیتا ہے اور اگر وہ پہنتا ہے کوئی بزرگی والی چیز تو اُسے کون کہا جاتا ہے۔ اور اگر وہ گھٹیا چیز پہنتا ہے تو اُسے فساد کہا جاتا ہے۔ پس اس کی مثال یہ ہے کہ پانی اور مٹی نباتات بنتے ہیں۔ اور نباتات جو ہیں وہ دانے اور پھل بنتے ہیں۔ اور پھل اور دانے غذا بنتے ہیں۔ اور غذا بنتی ہے خون اور گوشت اور ہڈیاں اور اُس سے ہوتا ہے حیوان۔ اور فساد یہ ہے کہ نباتات سڑ جاتی ہیں۔ پس وہ راکھ بن جاتی ہیں اور حیوان مر جاتا ہے۔ پس وہ بھی بن جاتا ہے راکھ۔ بہر حال اللہ تعالیٰ نے اس جہان کا نظام اور اس عالم امکان کا قیام و دار و مدار انہی حالاتِ متغیرہ پہ رکھا ہے۔ اور یوں دنیوی نقوش کو اعتباری وجود اور عدم کا رنگ دیا ہے۔ کیونکہ دنیا اگر ایک حال پہ قائم رہتی تو دوسرے ممکنہ معانی وجود میں نہ آتے۔ اور

مرتبۂ واجب میں مخل ثابت ہوتا اور نہ ہی وہ اضدادی کیفیت امکان میں شامل رہتی اور وجوب میں شمار ہوتی ۔ جو کچھ اللہ تعالیٰ اپنی حکمت کاملہ و بالغہ سے عمل میں لایا ہے وہی خوب ہے ۔ پاک و بابرکت ہے وہ اللہ تعالیٰ اور سب سے اچھا تخلیق کرنے والا ہے۔ لہذا چاہیے کہ تم اپنی کوتاہ بینی سے اس مقید ہستی کے اسیر بن کر نہ رہ جاؤ۔ اور اپنے آپ کو اُس ہستی مطلق سے غافل نہ کرو ۔ کوتاہ بینی عبارت ہے محسوسات کے ادراک سے ، اور دور بینی عبارت ہے معقولات کے ادراک سے ۔ لہذا جو آدمی دونوں نگاہیں رکھتا ہے اور کلیات و جزئیات کا ادراک کر سکتا ہے تو اُسے چاہیے کہ حیوانات کی طرح صرف جزئیات کے مشاہدے میں نہ لگا رہے ، اور اپنے آپ کو کلیات کے مشاہدے سے محروم نہ رکھے ، بلکہ وہ چونکہ خلیفہ و نائب حق ہے ، اس ذات مطلق کا مظہر اور پرستار ہے اسے چاہیے کہ اپنی قوت ادراک کو ایسے مرتبے کی حضوری و مشاہدے سے مسرور رکھے جو نہ کُلی ہے اور نہ جزئی اور محض اطلاق ہی کی طرف متوجہ رہے جو مطلقیت سے بھی مبرا ہے اور اپنے دل کو مقیدات کا قیدی نہ بنائے ۔ کیونکہ ان کی ہستی کو تو اک آن و لمحہ سے زیادہ بقا نہیں اور اس ہستیٔ مطلق کو کبھی فنا نہیں ۔ جو تمھارے پاس ہے وہ ختم ہو جائے گا ، اور جو اللہ کے پاس ہے وہ باقی رہنے والا ہے۔ یعنی ان موجودات کے وجود کو تو گھڑی دو گھڑی سے زیادہ کی فرصت و بقا نہیں ۔ اور وہ وجود جو واجب تعالیٰ کا ہے اسے کبھی فنا نہیں ۔ جو تمھارے پاس ہے وہ فانی ہے ، جو کچھ اس کے پاس ہے اُسے بقائے دوام ہے ۔ مذکورہ بالا آیت کے یہی معنی ہیں ۔ ترجمہ رباعی گویا مغنّی بھی فانی ہے ، اور یہ بزم اور ساقی بھی فانی ہیں ۔ یہاں جس سے بھی تم نے ملاقات کی دریغا و واحسرتا کہ وہ فانی ہے ۔ اس کائنات کی فنا ہو جانے والی کثرت سے دل کو اُٹھا لے ۔ اللہ باقی ، اور باقی سب فانی ہیں۔ اب مصنف خود یوں اس کی تصریح کرتا ہے کہ مطرب ، بزم اور ساقی سے مراد مختلف امتیازات دنیوی ہیں جو غفلت کے مارے انسانوں کے لیے عیش و عشرت اور خوشی و مسرت کا سامان ہیں اور وجود باری تعالیٰ کے مظاہر ہونے کی نسبت سے ارباب معرفت کے لیے بھی باعث سرور ہیں ۔ پس ان میں سے تم جس کو بھی ملو گے یا جس کسی سے بھی دوچار ہو گے ، وہ فانی اور نیست و نابود ہونے والا ہی ہوگا ۔ بلکہ اس وقت بھی ہر لمحہ مٹتے جا رہے ہیں ۔ ان میں نیستی اک فطری امر ہے ۔ لفظ آہ ' کلمہ افسوس و تاسف ہے جو متنبہ کرنے کے لیے لایا گیا ہے ۔ تاکہ سننے والا خبردار اور آگاہ ہو جائے اور غفلت سے نکل

آئے۔ عبرت و آگہی حاصل کرے۔ یہ حسرت و درد سے بھرا ہوا اک ایسا لفظ ہے جو حقیقت شناس دردمندوں اور نرم دل عشاق کے سینوں سے نکلتا ہے، اور دلوں پر اثر کرتا ہے۔ لہٰذا دل کو اس فانی عالم رنگ و بو سے اُٹھا لینا چاہیے کہ فقط ذات حق ہی کو دائمی بقا ہے۔ وہی لازوال و لایزال ہے۔ اس کے علاوہ باقی سب فنا کا مال ہے۔ سوائے اس کے رُخ وجہہ کے ہر شے ہلاک ہو جائے گی۔ پس حق گو، حق بین اور حق شناس بن اور اپنے آپ کو ان پھندوں اور بندھنوں سے چھڑا لے۔ کہو اللہ اور پھر چھوڑ دو اُنھیں ؂

هوالنّاصر

شروع اللہ کے نام سے جو نہایت مہربان اور بہت رحم والا ہے

ہر قسم کی تعریف اللہ کے لیے ہے۔ نہیں ہے کوئی بھلائی کا قصد کرنے والا قصد کرتا مگر اس کی عنایت کے ساتھ، اور نہیں چلتا کوئی ہدایت کی راہ پر چلنے والا مگر اس کی ہدایت کے ساتھ۔ درود و سلام ہو اُس کے رسولؐ پر نہیں ہے نجات مگر اس کی حمایت کی خلوت میں، اور آپ کی آلؑ پہ اور اصحابؓ سابقین اور مقرّبین پہ جو قرب کی غایت اور نہایت میں ہیںؐ۔ اما بعد پس یہ بارھواں وارد ہے جس کا نام قصد السبیل ہے۔ مشرف کرے اللہ ہمیں اور تمھیں خلوت کے معاملے کے ساتھ جلوت میں، اور کثرت میں وحدت کے مشاہدے میں جو کہ اکملین کا راستہ ہے۔ اور جس طرح کہ اللہ تعالیٰ واحد ہے کہ وہ صفات اور اعتبارات کی کثرت کی اضافت کے ساتھ کثیر نہیں ہوتا، اور ہر روز اک نئی شان میں ہوتا ہےؐ۔ اور یہی حال اُس کے خلفا کا بھی ہے کہ وہ ٹکڑے ٹکڑے نہیں ہوجاتے بکھرتے ہوئے حالات کے اختلاف کی وجہ سے اور مختلف مجالس کی وجہ سے، اور اُنھیں کوئی کام کسی کام سے غافل نہیں کرسکتا اور وہ اپنے مقام پر قائم ہیں۔ اور وہ اپنی نمازوں میں مداومت کرنے والے ہیں، اور توفیق نہیں ہے مگر اللہ کے ساتھ۔ اسی پہ میں توکل کرتا ہوں اور اسی کی طرف سے ہے میانہ رویؐ

خلوت و جلوت کا باب

خلوت سے مراد ہے دل کا ماسوی اللہ کے خیالات ، اور ماسوی اللہ سے حبّ و بغض و دیگر تعلقات و بندھنوں سے خالی ہونا۔ یعنی اپنے نفس کو نفسانی باتوں سے خالی کرتا ہے ۔ جو ہر لحظہ یونہی خواہ مخواہ کائنات کی انواع و اقسام اور متفرق اشیا کی شکلوں کی طرف کھنچا آتا ہے ۔ کہا جاتا ہے کہ خلوت گفتگو کرنا ہے حق کے ساتھ کہ نہیں ہے کوئی ایک بھی ، اور نہیں ہے کوئی بادشاہ !! چنانچہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ مجھ کو خدا کے ساتھ معیت کے قرب کا ایک ایسا خاص وقت حاصل ہے جس میں کسی اور رسول یا مقرب فرشتے کی گنجائش نہیں ۔ یکساں ہے کہ صفائی قلب کی یہ کیفیت خواہ تنہائی اور گوشہ نشینی سے حاصل ہو یا مجالس و محافل میں ہاتھ لگے یا کسی نیک صحبت کی برکت کی راہ سے یا مختلف قسم کی مجالس میں اپنے حال کی مناسب نگہداشت اور دیکھ بھال کے اہتمام سے جیسے کہ بعض سالکوں کی تربیت کنج عزلت ہی میں کی جاتی ہے ۔ تنہائی کی برکت سے یقیناً جمعیت خاطر ضرور حاصل ہوتی ہے ۔ کیونکہ حواس پورے طور پر جمع ہوتے ہیں ۔ اور توجہ ایک ہی طرف مبذول ہو جاتی ہے ۔ اسی طرح بعض کی تربیت مختلف قسم کی مجالس میں بیٹھنے کے ساتھ ساتھ حضور قلب کی مناسب نگہبانی سے کی جاتی ہے ۔ اور اس قول کے بموجب کہ اشیا کی پہچان ان کی اضداد ہی سے ہوتی ہے ان کی آگہی کو قوت حاصل ہوتی ہے ۔ چونکہ اللہ تعالیٰ کا فیض ہر بندے کو ہر لحظہ پہنچتا رہتا ہے ۔ لہٰذا اس محفل کے اس وقت کے حاضرین کا سارا فیض ایک خاص انداز سے اس آگاہ شخص کی طرف رجوع کرتا ہے اور ترقی کا باعث بنتا ہے ۔ لیکن تنہائی کا حکم بالکل ابتدا و آغاز میں سنگدل ، لالچی ، جاہل ، آوارہ اور فاسق لوگوں کے لیے ہونا چاہیے ۔ اور مجلس کا حکم درمیانی سٹیج پر خلیق ، قناعت پسند ، عالم و عارف ، کم حرکت اور پارسا خصلت لوگوں کے لیے ہونا چاہیے ۔ انتہائی یا آخری سٹیج پر صحبت یا تنہائی برابر ہیں ۔ لہٰذا اگر انتہا تک پہنچنے والا آدمی مجرّد (تنہا) ہے اور تابعین و لواحقین نہیں رکھتا ، اور اسے رشد و ہدایت سے کوئی مناسبت نہیں ۔ نہ ہی دوسروں کو فیض پہنچانے کا ارادہ یا اہلیت رکھتا ہو تو اس کے لیے صحبت کی بجائے تنہائی اور گوشہ نشینی ہی بہتر ہے ۔ اور اگر عیال دار آدمی ہے اور لگے بندھے اور رشتے دار رکھتا ہے ، اُسے رُشد و ہدایت سے بھی مناسبت ہو ، اور سرداری کے بوجھ کا

متحمل بھی ہو سکتا ہو، دوسروں کو فیض رسانی کی استعداد بھی رکھتا ہو۔ علم و عرفان میں بھی ادراک ہو، اس کے لیے عزلت کی بجائے صحبت بہتر ہے۔ لوگوں سے ایسے ملاقات کرے کہ خانہ نشینی کا انداز ہاتھ سے نہ جانے پائے، اور جو کوئی آئے اُس کی صحبت میں شامل ہو جائے۔ مگر وہ ظاہراً یا باطناً کسی کی صحبت میں نہ جائے۔ مطلب یہ ہے کہ صحبت کے رنگ و کیفیت کو اپنے حسب حال رکھے اور اُس کی مجلس کی کیفیت انواع و اقسام کے مختلف الحال لوگوں کی وجہ سے متفرق نہ ہونے پائے اور کسی سے بھی کوئی فعل یا قول جو اس کی مرضی کے خلاف ہو سرزد نہ ہونے پائے، بلکہ حال اور وقت کی مناسبت سے وہ جو کچھ کہنا چاہے خود بیان کرے، دوسرے محض سنتے رہیں اور خاموش رہیں، اور اس کی اجازت کے بغیر خود بخود ہی بولنے نہ لگ جائے۔ اس اہتمام اور ان آداب کی پابندی سے درویش کے لیے لوگوں سے میل ملاقات مضر نہیں۔ بلکہ دوسروں اور خود اس کے لیے مفید ہوتی ہے۔ ورنہ بصورت دیگر وہ خود اگرچہ دوسروں کی صحبت میں نہ جائے، لیکن اگر جو کوئی آئے اپنے ہی حسب منشا حرکات کرے اور جو جی میں آئے کہتا چلا جائے تو اس صورت میں گویا وہ اس کی صحبت میں نہیں آئے۔ بلکہ یہ درویش خود ہی ان کی صحبت میں جا داخل ہوا۔ آخر اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ وہ آئے اور یہ نہیں گیا، پس درویش کو چاہیے کہ وہ خود ہی دربان بھی ہو، اور خود ہی میر مجلس بھی۔ جس طرح بادشاہوں کی مجالس چوبداروں، نقیبوں اور منتظمین کی وجہ سے مودبانہ اور شاندار قسم کی ہوتی ہے۔ اور ان کے تخت، فرش، پردوں، سائبانوں اور دیگر ایسی اشیا کی وجہ سے ان کے دیوان خانے اور محلات کمینے اور ادنیٰ دُنیا داروں اور جاہ پرست بندوں کے دلوں میں ان کی ہیبت کا نقش بٹھا کر اُنھیں اپنے مقام و مرتبے کے مطابق مودب اور چاق و چوبند رکھتی ہیں۔ بالکل اسی طرح چاہیے کہ درویش کے اقوال اور افعال، اس کی دربانی، چوبداری اور صدارت کے فرائض انجام دیں۔ اس کے اُٹھنے بیٹھنے کا انداز، اس کی بات چیت کا اسلوب خود بخود دوسروں کو مودب اور چوکنا رکھے اور تخت شاہی کی بجائے اس کے توکل کا مرتبہ اُسے دوسروں سے ممتاز اور ارفع رکھے۔ قالین یا غالیچوں کے بجائے ہر طرف حُسن خلق و انکسار کا فرش بچھا ہوا ہو۔ اور سراپردوں کے بجائے اس کی عیب پوش آنکھوں میں شرم و حیا کی جھلک ہو اور سائبان کی جگہ سر پہ کبریائی چھت ہو۔ اور اُس کی رفعت و بلندیٔ کردار کا سایہ ہر چھوٹے بڑے کے سر پہ پڑے۔ تاکہ اس بزرگانہ ٹھاٹھ کے ان سب اسباب سے ان بے چارے مغلوب النفس لوگوں کے دلوں میں خود بخود امر حق کا نقش و رعب اُبھرے

اور وہ خدارسیدہ درویشوں کی صحبت میں سلاطین اور اُمراکی مجالس سے کم ادب بجانہ لائیں، کیونکہ مجالس الٰہیہ کا یہ ادب انشاء اللہ آخرت میں اس ادب کا کفارہ ثابت ہوگا جو وہ دُنیاداری سے اہلِ دین کے لیے کرتے رہے ہیں، اور ان کے لیے ایک بڑے اجروثواب کا باعث بنے گا۔ دُنیامیں بھی ہر کوئی اُنھیں نیک سمجھے گا اور دل سے ان کی عزت کرے گا۔ سارے آداب وہ محض خدا کے لیے بغیر کسی غرض کے بجالاتے ہیں۔ اب اس کے عوض درویشوں کے سامنے بھی ادب سے سر جھکائے کھڑے ہیں اور اُن سے ایمان کی دولت حاصل کر رہے ہیں، اور ایسی موؤب صحبت درویش کی اپنی اصلاح حال کے لیے بھی مناسب ہوگی۔ فقر کے لباس کا بھرم بھی رہ جائے گا کہ یہی مردوں کا شیوہ ہے۔ اگر کوئی شر پسند، سفلہ طبع، بدوضع یا کوئی دنیوی جاہ وجلال کا متوالا اور ظاہری حشمت والا ان کی صحبت (مجلس) میں آنکلے تو درویش کو چاہیے کہ صحبت کو طول نہ دے، اس سے بات چیت کم کرے اور اُسے جلدی چلتا کرے یا خود جلدی اُٹھ جائے لیکن تندی و تیزی سے کام نہ لے۔ کیونکہ اصلاح حال منظور ہے نہ کہ بدخلقی و فتنہ انگیزی۔ اس سے یوں ملاقات کرے کہ اگر وہ پھر کبھی آئے تو سُدھر سنور کر آئے یا پھر آنے کی جرائت ہی نہ کرے۔ لیکن یہ بات یوں صورت پذیر نہ ہو جس سے بدخلقی کا پہلو نکلے یا دشمنی و عداوت کا باعث بنے۔ عاقل کے لیے اشارہ ہی کافی ہے۔ اور اگر اپنے آپ میں صحبت کے مناسب اُمور سے بعض امر اور عزلت کے مناسب امور سے بھی بعض امر رکھتا ہو تو اُن کی کمی بیشی کے بموجب خلوت وصحبت میں بھی قلت وکثرت کو اختیار کرے۔ مذکورہ بالا مقولے عارفوں اور مرشدوں کے لیے لائحہ عمل ہیں جن کی بنا پر وہ اپنی اور اپنے شاگردوں کی تربیت کر سکتے ہیں۔ ورنہ ہر سالک کو اپنے حال کی مکمل خبر کہاں ہوتی ہے۔ جس کے مطابق وہ پوری دیکھ بھال سے عمل پیرا ہو سکے اور اُسے دانشمندوں کی یاددہانی کی حاجت نہ ہو۔

جلوت سے مراد ہے خلق خدا کی اور اپنے لگے بندھوں اور عزیزوں کی یاد آوری اور ان کے حقوق کی ادائیگی کے سلسلے میں شادی بیاہ کرنے، دیگر یارانِ طریقت سے ملنے جلنے اور ہر حال میں اُن کے حال سے باخبر رہنے کی طرف توجہ کرنے سے!! خلق خدا کی طرف نزول فرمانے، ان کی رشد وہدایت کے لیے، اور ہر وقت دنیوی خیر وعافیت اور آخرت میں نجات ومغفرت کا طلب گار رہنے اور ان سب امور کو نفسانی اغراض کی شرکت کے بغیر محض فی سبیل اللہ بجالانے سے!! نیز جلوت سے مُراد لطائف خمسہ کے ذکر اذکار کو بھی ملحوظ خاطر رکھتا ہے جو قلب وروح و سِرّ، وخفی واخفی پر مشتمل ہیں۔ اور اگر لطیفۂ

نفس کو جو دماغ میں ہوتا ہے اور لطیفہ" قالب جس سے ذکر سلطان عبارت ہے کو بھی شامل کرلیا جائے تو ان کی تعداد پانچ سے سات ہو جاتی ہے، اور وقوفِ قلبی کے لحاظ سے بھی جو آگہی کی دیکھ بھال کا نام ہے اور وقوف عددی جو طاق عدد کی رعایت سے ہے۔ نفی و اثبات اور وقوف زمانی کے ذکر میں جو اللہ کے حضور میں اپنے اوقات کے محاسبے کا نام بھی ہے۔ اور اپنے اعمال و افعال کے لحاظ سے بھی محاسبہ ہی ہے۔ رزق حلال کھاتے، اور سچ بولنے کا اہتمام کرنا۔ اور کہا جاتا ہے کہ جلوت نکلنا ہے بندے کا خلوت سے خدائی تعریفوں کے ساتھ جب بندے کی آنکھ اللہ کے اعضا میں سے ہے اس کی انانیت کو مٹاتے ہوئے، اور اعضا جو ہیں وہ منسوب ہیں حق کی طرف بغیر بندے کے۔ جیسے کہ اللہ تعالیٰ کا یہ کہنا کہ تو نے نہیں مارا، جب کہ تو نے مارا، بلکہ اللہ نے مارا اور یہ کہنا کہ جو لوگ تم سے بیعت کرتے ہیں اللہ سے۔ خدا کا ہاتھ ان کے ہاتھوں پر ہے۔ اور خلوت و جلوت کا یکجا اکٹھا کر دینا عبارت ہے انجمن میں بھی خلوت کی سی حالت سے۔ اور یہ کام کاملان حق اور صاحبان ارشاد کا ہے۔ جنھیں عین بزم کثرت میں بھی تنہائی کامل حاصل ہوتی ہے۔ اور ظاہری تنہائی اور گوشہ نشینی یعنی اہل اور نا اہل سبھی لوگوں سے میل جول ترک کر دینا جو بعض ظاہری تارکین اور مجازی آزاد افراد اختیار کر لیتے ہیں۔ اور بالکل وحشی حیوانات کی طرح لوگوں سے دُور بھاگتے ہیں۔ یہ کوئی اتنا بڑا اور اہم کام نہیں۔ تھوڑی سی قناعت اور قدرے ہمت درکار ہے۔ عمدہ کام وہی ہے جو انبیائے کرامؑ اور کامل اولیاء اللہ نے اختیار کیا۔ اور وہ خلق خدا سے صحبت ہے باوجود فراغت کے بھی۔ اس کے لیے بڑے تحمل اور حوصلے اور ماسوی اللہ سے مکمل قطع تعلق کی ضرورت ہے۔ اور یہاں اللہ تعالیٰ کا واحد وسیلہ درکار ہوتا ہے۔ لہذا کامل عارفوں کو عین جمعیت اور کثرتِ عوام کی صورت میں بھی وحدت و خلوت کی سی کیفیت نصیب ہوتی ہے۔ اور سب کے ہوتے ہوئے بھی وہ ان سے بلند و بالا ہوتے ہیں، اور جانتے ہیں کہ کثرت کا یہ طومار تو محض ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر کی موجیں ہیں اور یہ سب بلبلے اور موجیں اسی بحر بیکراں میں جا کر گم ہو جاتے ہیں۔ ترجمہ رباعی جس طرح باغ میں پھول کی پتیاں بکھر جاتی ہیں۔ اسی طرح 'ما و من' کے نظم و نسق کی یہ ڈور الجھ جاتی ہے۔ بے فکری اور جمعیتِ خاطر کا عرصہ تو پلک جھپکنے کے برابر تھا۔ جس میں دوست احباب کی سینکڑوں انجمنیں درہم برہم ہو گئیں۔ حسب دستور اب مصنف خود ہی رباعی کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتا ہے۔ کہ یہاں دُنیا کی بے ثباتی اور اس بے وفا زندگی کے

قلیل المدّت ہونے کا بیان ہے۔ یعنی کہ اب بقایا زندگی ہے ہی کتنی؟ وہ محض ہماری جہالت اور حماقت تھی کہ غرور و خودی، اور ما و منی کے دعوے کے دن یعنی ایام جوانی تو کٹ گئے۔ یہ ہاتھ پاؤں اور دیگر اعضا جوان دنوں تازہ پھولوں کی شگفتہ پتیوں کی طرح تر و تازہ تھے۔ ان میں حسن و خوبی بھی تھی اور قوت بھی اب وہ مرجھا کر بکھر رہے ہیں۔ اب تو رگوں اور پٹھوں میں سُستی ہے اور وہ لٹک رہے ہیں۔ اب معلوم ہوا کہ سکونِ قلب اور بے فکری کے وہی چند ایام تھے جو پلک جھپکنے میں گزر گئے۔ جب تک ہم کچھ دل جمعی اور فراغت حاصل کر سکے۔ یار دوستوں کی سینکڑوں محفلیں برہم ہو کر نیست و نابود ہو گئیں۔ جو بات ہونے والی ہے وہ اب بالکل واضح نظر آ رہی ہے۔ اور روئے زمین اب شطرنج کی اُس بساط کی طرح دکھائی دیتا ہے جس پر کوئی مہرہ باقی نہ رہا ہو۔ جیسا کہ قرآن پاک میں آیا ہے کہ جتنے ذی روح روئے زمین پر موجود ہیں سب فنا ہو جائیں گے اور صرف آپ کے پروردگار کی ذات جو کہ عظمت والی اور احسان والی ہے باقی رہ جائے گی۔ اور ایک دوسرے معانی یوں ہیں۔ ما و من کے نظم و نسق کی ڈور سے مراد جاہلوں کی موہوم راہ و روش ہے جو انانیت کے گمان میں پھنسے ہوئے ہیں۔ اور اسی انتظام پر ان کی زندگی کی گزر بسر ہے۔ اور جب اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے حقیقت بین آنکھیں عنایت کر دیتا ہے تو عارف کا دل اس موہوم گرفتاری کے بندھن سے آزاد ہو جاتا ہے اور ظاہری صورت میں اہل دُنیا کے عمل سے یہی مشابہ ہے۔ لیکن باطن اور حقیقت میں ان سے الگ ہے۔ اس باغ دنیا میں جو یہ کثیر التعداد اعتبارات جلوہ گر ہیں پھول کی پتیوں کی طرح سب بکھر جائیں گے۔ اور ایک ہی حقیقت یعنی وحدتِ حقّہ میں جاجمع ہوں گے۔ پس جب تک ہم نے جمعیت خاطر حاصل کی اور مژگان کی طرح اعتبارات کی پلکوں کو ہم جمع کیا تو کثرت کی ہزاروں انجمنیں جو متفرق شکلوں میں نمودار تھیں ہماری چشمِ بصیرت سے اوجھل ہو گئیں۔ جیسا کہ ظاہر میں بھی پلکیں بند کرنے سے دُنیاوی مشکلیں آنکھوں سے اوجھل ہو جاتی ہیں۔ لہٰذا معلوم یہ ہوا کہ جمعیت وحدت ہی میں ہے، اور وحدت عدم کثرت ہے۔ جمعیت سے مراد ہے سکونِ قلب، اور اُسے وحدت سے اس لیے تعلّق دیا گیا ہے کہ قلبی سکون کی یہ دولت وحدتِ ذات کے مشاہدہ کے بغیر ہاتھ نہیں لگتی۔ چونکہ کثرت کے دیکھنے سے توجہ مختلف امور کی طرف پراگندہ ہو جاتی ہے جس سے دل کو پریشانی لاحق ہوتی ہے۔ سب سے اپنی آنکھیں میچ لے اور نفی و اثبات کے ذکر میں یوں کھو جا کہ تجھے انجمن میں بھی خلوت میسر آ جائے۔ اور تو شاید توحید کا

دیدار کر سکے۔ آنکھیں میچ لینے سے ہمارا مقصود کثرتِ مراقبہ اور دل کی نگہبانی سے ہے۔ کیونکہ اس عمل کے تسلسل اور تواتر سے یقیناً باطنی صفائی، سکون قلب اور بے خودی حاصل ہوتی ہے، توجہ اللہ کی طرف مبذول ہو جاتی ہے۔ اور انسان ماسوی اللہ سے بے پروا ہو جاتا ہے۔ اور مراقبے کی صورت وہی ہے جو سب کو معلوم ہے۔ آنکھیں بند کر کے سر کو جھکاؤ اور باطن کی طرف پوری توجہ دو۔ اور جن اوراد و وظائف کا حکم دیا گیا ہے۔ ان کے ذکر اذکار میں مشغول رہو۔ اور مراقبے کی حقیقت یہ ہے کہ دل کی آنکھوں کو ان مختلف النوع موجودات اور کثیر التعداد موہومات سے بلند کر لیا جائے، اور چشمِ بصیرت سے وجودِ حقیقی کا مشاہدہ کیا جائے۔ اس کے سوا اور کسی چیز کو نہ دیکھنا چاہیے۔ اور عربی یا فارسی کے الفاظ کا سہارا لیے بغیر اس پاک ذات کی طرف پوری توجہ سے مکمل رجوع کر کے حضوری کی کیفیت پیدا کی جائے اور اس کے علاوہ باقی سب نقوش کو دل کی تختی سے کھرچ ڈالے۔ پھر ظاہر آنکھیں چاہے کھلی ہوں یا بند کوئی فرق نہیں پڑتا، اور اس کیفیت کے حصول کے لیے، نفی و اثبات کے ذکر میں دوام و تسلسل بہت مفید ہے اور کلمہ طیبہ لا الٰہ الا اللہ کا ماحصل یہی ہے۔ یعنی ماسوی اللہ کی نفی اور وجود حق کا اثبات اور اس کے ظاہری معنی ہیں کہ نہیں کوئی معبود سوائے اللہ کے کوئی موجود نہیں۔ نفی و اثبات کے ذکر کا طریقہ یہاں اس لیے نہیں لکھا کہ وہ سلوک کی کتابوں میں درج ہے۔ اور ہر سلسلے والے ایک علیحدہ طریق سے کرتے ہیں۔ اور ہر ایک سے الگ الگ حالات، علامات اور کیفیات و نتائج متعلق ہیں۔ چنانچہ نقشبندی سلسلے میں اور طریقے سے کرتے ہیں۔ اور قادریہ سلسلے میں طریقہ اور ہے۔ اگرچہ حقیقت میں انجام سبھی کا ایک ہی ہے۔ مخلص پیروانِ محمدؐ کے نفی و اثبات کے ورد کا طریقہ جو سب طریقوں کا ماحصل و مجموعہ ہے اور سب سے زیادہ مفید اور نفع بخش بھی ہے۔ اسے تحریر نہیں کیا گیا اس لیے کہ کتابوں میں لکھے ہوئے اوراد و وظائف کو پڑھ کر کوئی خاطر خواہ فائدہ حاصل نہیں ہوتا، اور نہ ہی وہ کشائش اور فرحت ملتی ہے جو ایک زندہ اور تجربہ کار انسان کی رہنمائی سے مل سکتی ہے۔ اگر ایسا ہی ہو تو پھر پیرو مرشد کی کیا ضرورت، ہمیں کتابیں اور رسالے ہی کافی ہوتے۔ یہ تمام مقدمات جو ہم نے لکھے ہیں یا دیگر مطالب جو اپنے اپنے مقام پہ لکھے جائیں گے پورا فائدہ اسی کو دے سکتے ہیں جو کسی زندہ مردِ کامل کی صحبت سے فیض یاب ہو کر باطنی کیفیت پیدا کر چکا ہو۔ طب کی کتابیں کسی اچھے طبیب ہی کے لیے فائدہ مند ہوتی ہیں۔ محض کتابیں پڑھ کر کوئی طبیب نہیں بن جاتا جب تک کہ وہ

کسی مطلب میں نہ بیٹھے۔ علم اور چیز ہے اور عمل کچھ اور۔ الغرض جب تم سب سے چھٹکارا پاکر ہر این و آن سے آنکھیں بند کر لوگے اور قرب و مشاہدۂ ذات کی دولت سے مالا مال ہو کر حقیقت کے مقام تک پہنچ گئے تو پھر جلوت بھی عین خلوت ہے، اور کثرت بھی عین وحدت ہے۔ قرآن پاک میں آیا ہے کہ آپ کہہ دیجیے کہ حق آیا اور باطل گیا گزرا ہوا، اور واقعی باطل تو یونہی آتی جاتی رہتی ہے۔ جب دل پر انجمن میں بھی وحدت کا دروازہ کھل جائے اور واحدِ حقیقی کی جھلکی نظر آجائے اور حق و باطل میں خوب شناخت ہو جائے تو پھر کوئی مشاہدے میں حائل نہیں ہو سکتا اور نہ ہی کوئی چیز خلل ڈال سکتی ہے۔ کیونکہ جب حق آتا ہے تو باطل جاتا رہتا ہے۔ اور ممکن جب وجود کے پاس آگیا تو ممکن نہ رہا۔ جان لو لغت میں حق وہ ثابت چیز ہے کہ جس کا اطلاق کیا جاتا ہے۔ اقوال، عقائد، ادیان اور مذاہب پر اس اعتبار سے وہ ساری چیزیں حق پر مشتمل ہوتی ہیں۔ اور اُسی کے مقابلے میں آتا ہے باطل اور پھر جہاں تک صدق اور سچائی کا تعلق ہے تو یہ مشہور ہو گیا ہے خاص طور پر اقوال میں۔ اس کے مقابلے میں آتا ہے کذب اور کبھی ان دونوں میں فرق بھی کیا جاتا ہے۔ کیونکہ مطابقت جو ہے۔ اسی کا اعتبار ہوتا ہے حق میں واقع ہونے کی جانب سے اور صدق میں حکم کی جانب سے، اور حکم کی سچائی کے معنی ہیں اس کا مطابق ہونا واقعے سے، اور اُس کی حقیقت کے معنی واقع کا مطابق ہونا اس سے۔ ایک دفعہ جب حق کی حقانیت متحقق ہو گئی تو امر واقعی کی تصدیق ہو گئی۔

ترجمہ رُباعی اے دردؔ ہم نے دیکھ لیا کہ وجود سے معرا مخلوق کے اس ہجوم میں "ما و تو" کے جھگڑوں کے سوا کچھ بھی نہیں۔ لہٰذا مردِ حق نے کثرت کی اس مجلس سے جس کی بنیاد ہی پراگندگی اور پریشانی پر ہے اپنا دل اُٹھایا اور گوشۂ وحدت میں جا کر آسودگی پائی۔ خود مصنّف یوں صراحت کرتا ہے کہ جب یہ دیکھ اور سمجھ لیا کہ وجود سے عاری اس مخلوق میں 'ما و تو' کے جھگڑوں کے سوا کچھ بھی نہیں جو اشیاء میں باہمی اختلاف کی بنا پر ہے۔ کثرت کی اس محفل کے انتشار و پریشانی کو دیکھا کہ عارف کا دل اس سے اچاٹ اور بیزار ہو گیا۔ گوشۂ عزلت میں جا بیٹھا اور مشاہدۂ ذاتِ واحد سے آسودگی پائی۔ پہلے دو مصرعوں میں 'بود و نبود' اپنے اختلافِ معنی کے اعتبار سے آئے ہیں۔ کیونکہ پہلے مصرع میں لفظ بود بطور اسم اور معنی ہستی و وجود استعمال ہوا ہے، جو بُودن مصدر سے حاصل مصدر ہے۔ اور دوسرے مصرع میں لفظ 'نبود' بطور فعل ماضی نفی کے آیا ہے جیسا کہ اُس سے ظاہر ہے۔

هوالنّاصر

شروع اللہ کے نام سے جو نہایت مہربان اور بہت رحم والا ہے

ہر قسم کی تعریف اللہ کے لیے ہے جس نے ممکنات کے لباس کی تجدید کی، ان کے وجود کے نئے پن کے ساتھ۔ اور ان کی قیود کی تجدید کے سلسلے میں حکم کو ودیعت کیا۔ اور سلام و درود ہو اس کے رسولؐ پر جس نے پہنایا مسلمانوں کو تقوی کا لباس جو اچھا ہے، اور پہنچایا ایمان داروں کو مقامِ اقصیٰ تک اور اُنھیں ہٹادیا غیر کی جانب سے، اور ان کی پاکیزہ آلؑ اور ہدایت یافتہ اصحابؓ پر۔ اما بعد پس یہ تیرھواں باب ہے جس کا نام خلق جدید ہے۔ خلق کے معنی ہیں ایجاد۔ پس ہر وقت اللہ تعالیٰ موجودات کی تجدید کرتا رہتا ہے، اور پہنچاتا ہے فیض مخلوقات تک تواتر اور تسلسل کے ساتھ۔ اور اگر ایسے نہ ہوتا تو موجود چیز دو زمانوں میں موجود نہ ہوتی، بلکہ دو آنوں (پلوں) میں بھی نہ ہوتی اور یہ خلقِ جدید قائم رکھتی ہے اس موجودات کو اپنی حاصل شدہ صورتوں میں جب تک اللہ چاہتا ہے۔ اور نہیں ممتاز ہوتی یہ تجدید شدہ صورت ہر آن ہر چیز میں حسّی طور پر مماثل کے ساتھ۔ اور جان لیا جاتا ہے کہ ہر چیز جو ایک ہی صورت میں ہے وہ اس کا حاصل ہے۔ پس یہ تخلیق جدید عطا کرنے سے واقع ہوتی ہیں۔ نئی امثال مکونات ہیں۔ اور حق تعالیٰ نے عطا کی ہر چیز کو اُس کی خِلقت اور پھر اُسے ہدایت دی دوسری تخلیق کی طرح اسی جیسی جیسے کہ خلق اور کو اُس طرف جس طرف سے اُس نے چاہا۔ اور پہنچاتا ہے موجودات کو وجودیت کی صورتوں کی پوشاکیں لگاتار، تاکہ وہ اُس کا لباس ہو جائے، اور چھپائے وہ لباس ان کی ذاتی عدمیت

کے ستر کو، اور ہوگیا وجود پردہ پوش ممکنات کے عیوب کا اپنی پردہ پوشی کی صفت کے مقتضیٰ کے تحت۔ اور مخلوقات کی موجودات جو ہے، یہ پردہ بن گئی اس چہرے کے لیے کہ جس جانب بھی مُنہ پھیرو اسی رُخ وہ سلامتے ہوتا ہے۔ پس یہی ان سب کا لباس ہے۔ اور وہ سب اس کا لباس ہیں اور جان لو کہ اللہ تعالیٰ نے پہنایا ہے۔ تمھیں تقویٰ کا لباس۔ اور نہیں ہے مقصود لباس سے مگر اعضا کا ستر، جن کا چھپانا لازم ہے یا چھپانا زیادہ اُولیٰ ہے، ان کو ظاہر کرنے سے۔ یا تو غرض لباس سے انسان کی تزئین ہے یا اُس کے اقتدار کا اظہار ہے، کیونکہ انسان اپنے لباس کے ساتھ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اُس کے وجود کو پوشیدہ کر دیا جسے آنکھ دیکھتی ہے۔ لباس اعتبارات و اضافات کے ساتھ سارے کے سارے جسم کو اور نہ ظاہر کیا اُس سے کچھ سوائے اُس کے چہرے کی جگہ کو۔ جس کی طرف اس نے ہمیں بلایا، اور وہی الوہیت کا مقام اور وجودیت کے کمالات کا مجمع ہے۔ اور اس کے دونوں ہاتھ کھُلے ہیں۔ اور یہ دونوں قدرت ہیں اور تکوین ہیں۔ کیونکہ ہر موجود لازماً دلالت کرتا ہے اپنے بنانے والے کے وجود پر اور اپنے خالق کی قدرت پر، اور ان دو جگہوں کے علاوہ نہیں ہے جائز اعتبار کے لباس کو اُٹھانا وجودِ حق سے۔ کیونکہ یہ سُوءِ ادب اسی طرح جیسے شرمگاہ کے ستر کو کھولنا ہے۔ اور اسی پر بنا ہے آئینِ الٰہیہ اور آدابِ شرعیہ کی اور تقوے کا لباس ہی اچھا ہے۔ اور اسی لیے پنڈلی کا ننگا کرنا منسوب کیا ان کفار کی طرف جو کہ آداب سے مؤدب نہیں بنائے گئے۔ اور وہ جہنم کی آگ میں جلنے کی شدت کے ساتھ ہوں گے۔ جیسے اللہ عزّ و جلّ نے فرمایا جب کہ پنڈلی ننگی کر دی جائے گی، اور وہ بلائے جائیں گے سجدے کی طرف آور پنڈلی سے مُراد وجود کے مراتب میں سے کم ترین درجہ ہے۔ پس حرام کر دی ان پر اپنے ساتھ ملاقات۔ خبردار آگاہ رہو۔ بے شک وہ اپنے رب سے اُس دن پردے میں ہوں گے۔ اور اُس پردے نے اُنھیں محروم کر دیا۔ اور اُنھوں نے کہا کہ اُس کے دونوں ہاتھ بندے ہوئے ہیں اور وہ خود قید کر دیے گئے سب سے نچلے طبقوں اور محسوسات میں سے سب سے ذلیل ترین درجہ بندی میں۔ پس جب کہ ستر واجب تھا، اور نہیں تھا جائز کشف، تو وجود واحد کا تشخص چھپ گیا موجودات کی قید میں جدید لباس کے ساتھ جو کہ ذاتی یا زمانی حدوث ہے، اور مرتبۂ وجوبیہ میں لباس قدیم کے ساتھ جو کہ وجودِ نفسی ہے اور ذاتی قِدم ہے۔ اور دیتا ہے ممکنات کو ہر وقت خاص جدید ملبوس اس اعتبار سے۔ پس ہر موجود چیز نئے لباس میں جدید تخلیق کے ساتھ ہے۔ اور اُسے مشاہدہ کرتا ہے ہر وہ شخص جس کی نگاہ تیز ہوتی ہے

اور جو محجوب ہیں وہ یہ جدت (تجدید) نہیں دیکھ پاتے، بلکہ وہ تو نئی تخلیق کی طرف سے شک میں پڑے ہوئے ہیں:

تجدّد امثال کے بیان کا باب

جب اس ناچیز نے ایک رباعی تجدد امثال کے معانی میں کہی تو تجدد امثال کی بحث اور وہ تحریر صوفیا کے انداز میں لکھی۔ اس باب میں اہلِ تصوف ہی کے سبھی اقوال لائے گئے ہیں، اور انھی کے مذاق کے مطابق بیان کیے گئے ہیں۔ اپنی طرف سے میں نے کچھ بھی نہیں کہا۔ لیکن تشریح میں چونکہ مطالب اور اپنے مافی الضمیر کی وضاحت منظور ہے تو ہر جگہ میرے سست ذہن میں جو کچھ آیا اسے سپردِ قلم کر دیا۔ یہ سمجھ لینا چاہیے کہ مجھ ناچیز کی سمجھ میں جو کچھ آیا ہے وہ یہ ہے کہ لفظ تجدید، حدوث کا ہم معنی ہے اور محدث شے کی لگاتار امثال سے نسبت حدوث کے ثبوت کے لیے ہے۔ چنانچہ ہر لحظہ یا ہر وقت کے اس نئے پن (عدم سے وجود میں آنا) کی تجلیوں کو علیحدہ سمجھ کر اس کا نام تجدد رکھ دیا گیا۔ ہر نئی چیز کی شخصیت کو بھی اسی لحاظ سے جُدا جدا تصور کر کے معنوی اتحاد اور اعتباری لحاظ کے راستے امثال سے منسوب کیا گیا۔ کیونکہ یہ معنوی اتحاد ہی کی وجہ سے امثال کا اقراری ہوتے ہوئے اُسے مخالف قرار نہ دیا۔ اور کثرت کی بات جو لب پر آئی، تو یہ امتیازی اعتبار کی وحدت ہے۔ اور لفظ امثال چونکہ جمع ہے اس لیے جمع ہی کی بات کی گئی۔ اور امتیاز اعتباری سے قطع نظر کرتے ہوئے اسی ایک معنوی اتحاد کو جو ہر حال میں ثابت ہے۔ اور پہلا تجدد جو پہلا حدوث ہے اُسے ملحوظِ خاطر رکھا ہے تو تجدّد امثال کے قائل نہ ہونے کی پھر بھی گنجائش ہے، جیسا کہ متکلمین کا خیال ہے۔ اور اگر معنوی اتحاد کے ساتھ اعتباری امتیاز کو بھی جمع کر دیا جائے تو ہر طرف کے حدوث اور ہر وقت کے تشخص کو جدا جدا امتیاز دے دیا جائے تجدد امثال کے قائل ہونے کی پھر بھی گنجائش ہے۔ جیسا کہ صوفیا کا خیال ہے۔ غرضیکہ یہ ساری حیثیتیں اعتباری موجودات عالم کے حصوں کی راہ سے نکل کر علمی خانے میں ظہور پذیر ہوتی ہیں۔ اور امتیاز پاتی ہیں۔ اور درحقیقت جو ہے سو ہے۔ انسان بیچارہ اپنی سوجھ بوجھ میں محض مجبور ہے۔ اس سب سے جب لفظ تجدد اور حدوث کا ہم معنی ہونا ثابت ہو گیا تو معلوم ہوا کہ حدوث کی دو قسمیں ہیں۔ ایک ذاتی حدوث اور دوسرا زمانی حدوث۔ اسی طرح تجدد کی بھی دو قسمیں ہیں۔ ایک

حقیقی تجدد جو ذاتی حدوث کی طرح ممکنات کا حصہ ہے۔ اور ایک اضافی تجدد جو حدوث زمانی کی طرح ارضی مادیات سے مخصوص ہے۔ لہذا جس وقت بے بضاعت ممکن اس ذات واجب الوجود سے وجود کا استفادہ کرتا ہے۔ ہر لحظہ اور ہر آن کا حدوث و تجدد اس کے ساتھ آتا ہے، اور واجب الوجود تمام اوقات میں اس کی تجدید اور اُسے عدم سے وجود میں لانے کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ اور اُسے وجود سے مستفید کرتا ہے۔ یہ آیت کریمہ کہ ذاتِ حق ہر آن اک نئے کام میں ہے انہی معانی میں آئی ہے۔ لہذا لازم ہے کہ تم ہمیشہ فیض ربانی کے منتظر رہو۔ اور حق سبحانہ تعالیٰ کی بے مثال و لاثانی ذات سے اک دائمی کشش اور توجہ پیدا کرو۔ اور اپنے آپ کو مشاہدۂ ذات سے ہر لحظہ اور ہر آن مٹا کر حضوری کا سرور حاصل کرو۔ پھر تم مسئلہ تجدد امثال کو سمجھو یا نہ سمجھو یکساں بات ہے۔ لیکن اگر اس نسبت کے حاصل کر لینے کے بعد ایسی حقیقتوں اور دقیق باتوں سے آگاہ ہو جاؤ تو یہ ایک خاص سعادت و دولت ہے جو کاملانِ حق سے تعلق رکھتی ہے جو رشد و ہدایت دینے اور تحقیق کرنے والوں کے شایان و سزاوار ہے ورنہ کام بس اتنا ہی ہے کہ دائمی حضوری اور مشاہدہ میسر ہو جائے۔ اور نفس ناطقہ کو ماسوی اللہ کے بندھنوں اور پھندوں سے آزادی مل جائے۔ اے اللہ میرے ہر مطلب و مقصد سے تو ہی واقف ہے میں تو اپنے آنے جانے سے بالکل بے خبر ہوں، دوسرے امور کا سراغ کیسے لگا پاؤں گا۔ ترجمہ رباعی اس خانہ جہاں میں جس وقت وارد ہوتا ہوں، میں اپنی پہچان کی راہ گم کیے ہوئے آتا ہوں۔ نہ جانے مجھے کہاں پہنچنا مقصود ہے جو میں شعلے کی طرح ہمیشہ اپنے آپ سے باہر آتا رہتا ہوں۔ مصنف خود اس کی وضاحت یوں کرتا ہے، کہ میں جس لحظہ اس جہان میں آتا ہوں، اور ظہور پذیر ہوتا ہوں تو میں اپنی شناخت کا راستہ گم کیے ہوئے آتا ہوں۔ تجدد امثال کی وجہ سے میرے لحظہ بہ لحظہ نئی شکل میں آنے کا پتہ ہی نہیں چلتا اور اسی تجدد امثال کی وجہ سے ہر لحظہ یہ بدن جو اربعہ عناصر سے مرکب ہے تحلیل ہوتا رہتا ہے اور حل ہونے والے اجزا کا بدل غذاؤں سے حاصل ہوتا ہے۔ ہر چند بدنی اعضا شعلہ کی مانند نیست و نابود ہوتے رہتے ہیں۔ اسی لحظہ ان اجزا کے بدلے اک اور مشابہ شے پیدا ہو جاتی ہے لیکن ظاہری حواس سے دیکھی یا پہچانی نہیں جا سکتی، کیونکہ وہ اور شے ہوتی ہے، اور یہ کوئی ادراک اسے عقلی قوت کی بنا پر دریافت کیا جا سکتا ہے۔ اور رباعی میں اسی لیے یہ پوچھا گیا ہے کہ نہ جانے میرا مقصد کہاں پہنچنے کا ہے کہ میں ہمیشہ اپنے آپ سے باہر آتا رہتا ہوں، گویا کہ خود سے بھاگ رہا ہوں۔ بیان کا

یہ بڑا لطیف پیرایہ ہے جس کا مطلب یقینی طور پر حضورِ حق میں پہنچنے کا ارادہ ہے۔ کیونکہ جب تقید اور پابندی نہ رہ جائے گی تو پھر وہی مرتبۂ اطلاق رہ جاتا ہے۔ اس تقریر سے اس وہم میں نہ پڑ جانا کہ جب موجوداتِ مقیدہ شہودی اعتبارات کی قید سے آزاد ہو جاتی ہیں تو عالمِ شہادت کے درخت کے پھل سے لطف اندوز ہوتی ہیں، اور مرتبۂ اطلاق حقیقی سے جا ملتی ہیں، اور ذاتِ حق تعالیٰ کا وصال نصیب ہو جاتا ہے۔ اربابِ کارب جو ہے اس کے ساتھ مٹی کو کیا نسبت؟ چونکہ تقیدات کے لاانتہا مراتب ہیں۔ جیسے تشبیہی، تنزیہی، سفلی اور علوی اعتبارات، تو کیا ہوا اگر بعض موجوداتِ شکلی تشبیہہ کی قید سے خلاصی پا کر وقتی طور پر اس قفسِ عنصری سے آزاد ہو گئے۔ اور بھی کئی تنزیہی تقیدات اور روحانی تعینات در پیش ہیں اور پھر حشر کے دن اربعۂ عناصر کا یہی مرکب یعنی جسم اُٹھے گا اور بہشتی بہشت میں چلے جائیں گے اور دوزخی دوزخ میں۔ اور کبھی کسی صورت میں کوئی آدمی ذاتِ حق تعالیٰ سے واصل نہ ہو گا، اور وصال کے صاف شفاف پانی سے سیراب نہ ہو گا، اور ابدالآباد یعنی ابد تک درجات کی ترقی کا یہی بے پایاں سلسلہ انسان کے شاملِ حال رہے گا۔ اگرچہ ہر حال اور ہر مرتبہ میں قرآن مجید کی آیت کریمہ کے بموجب کہ خدا تمھارے ساتھ ہے، خدا اُس کے ساتھ رہے گا۔ لیکن وہ بلند ہمت ہر وقت اور ہر مقام پر اپنی حاصل کردہ حالت پر مطمئن نہ ہو گا۔ اس ذاتِ پاک کی طرف توجہ دے گا جو وراء الوراء ہے ع بے چارہ پیاسا تو پیاس کے مارے مر گیا لیکن سمندر جوں کا توں رہا۔ بہر حال تجدد امثال ایک ایسا مسئلہ ہے جس کے متعلق صوفیا کا کہنا ہے کہ حق تعالیٰ ہر لحظہ اک نئی شان میں جلوہ گر ہوتا ہے۔ صوفیا تجدّد امثال کے قائل ہیں۔ وہ چونکہ تمام کائنات کو اُس ذاتِ پاک کا ظہور سمجھتے ہیں۔ اسی بنا پر وہ کہتے ہیں کہ حق سبحانہ تعالیٰ ہر آن اک نئی شان میں جلوہ فرما ہوتا ہے اور یہ ہے بھی قرینِ قیاس کہ موجودات اُس کے وجود اور کمالات کے مظاہر ہیں اور وجود اس واجب الوجود ذات کی پہلی صفت ہے۔ کائنات کا تغیر و تبدل بھی بالکل واضح و عیاں ہے۔ شیخ ابو طالب مکیؒ نے قوت القلوب میں لکھا ہے۔ نہیں ظاہر ہوتا ایک صورت میں ایک آدمی کے لیے دو مرتبہ، اور نہ ہی ایک صورت میں دو کے لیے۔ قوت القلوب شیخ مکیؒ کی تالیفات میں سے ہے اور یہ مذکورہ بالا جملہ اسی کی عبارت سے لیا گیا ہے۔ اور اس کا حاصل مطلب یہ ہے کہ ایک ہی تجلّی دو بار نہیں آتی، اور نہ ہی حق تعالیٰ کسی ایک شخص پہ ایک صورت میں دو بار تجلّی ریز ہوتا ہے۔ اور نہ ہی ایک صورت میں دو شخصوں پر تجلی گراتا ہے۔ وہ ہر لحظہ اک نئی شان میں ہوتا ہے۔ اسمائے جلالیہ

ہر لحظہ موجودات میں سے کسی نہ کسی وجود کا قلع قمع کر دیتے ہیں، اور اسمائے جمالیہ اگلے ہی لمحے میں انھیں نئے وجود کے لباس میں ملبوس کر دیتے ہیں۔ شک و شبہ اور تمردد کے مارے ہوؤں کے لیے اللہ تعالیٰ خود یوں فرماتا ہے کہ ہم انھیں اک نئی تخلیق کا لبادہ اڑھا دیتے ہیں۔[۵] اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ صوفیا جلالی اسمائے ذات کو سلب کرنے والے گنتے ہیں۔ اسی لیے انھیں موجودات کے وجودوں کی نفی یا سلب کو انہی کا کام کہا ہے۔ اور جمالی اسمائے ذات کو ثابت شمار کرتے ہیں۔ اور وجود کا عطا کرنا ان کے حوالے کرتے ہیں۔ اور تجدد امثال کے اثبات کی دلیل ان کے ہاں مذکورہ بالا آیت کریمہ ہی ہے اور مجھ ناچیز کے ذہن میں یہ خیال آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ہر اسم تمام اسماء کا جامع ہے۔ اسمائے جمالی میں جلال پایا جاتا ہے۔ اور جلال کے معنی یہاں بزرگی و عظمت کے ہیں، غیظ و غضب کے نہیں۔ لہذا اللہ جل شانہ کی شانِ کبریائی ما سوی اللہ کے مٹانے کا تقاضا کرتی ہے۔ وہ اپنی مخلوق پر غیظ و غضب سے جلوہ گر نہیں ہوتا۔ اس کا اپنا فرمان ہے کہ اس کی رحمت نے سبھی کو اپنے گھیرے میں لے رکھا ہے۔[۵] اسمائے جلالی میں جمال بھی ہے، اور جمال کا مطلب یہاں قوت ظہور ہے نہ خوب صورتی و خوش خلقی جو انسانوں میں پائی جاتی ہے۔ ہر اسم جو اپنی جمالی حیثیت سے اپنے کسی مظہر کو وجود عطا کرتا ہے وہی اسم جلالی حیثیت میں اس وجود کو اکھاڑ پھینکتا ہے۔ پس ہر اسم اپنی اس موجودیت کی حالت میں اپنے اندر معدومیت کی حیثیت بھی رکھتا ہے۔ جس سے ہر معدومیت میں اسی وقت پہلی موجودیت کی بجائے دوسری موجودیت ظہور میں آجاتی ہے۔ تجدد امثال کے یہ معنی وجود کے لحاظ سے ہیں۔ ایک حسّی تجدد امثال بھی ہے۔ لہذا ایک گروہ نے اس کی مثال یوں دی ہے کہ کیا آپ چراغ کو نہیں دیکھتے کہ اس کا شعلہ ہر لحظہ ہوا میں کھو جاتا ہے، اور اک نیا شعلہ وجود میں آتا ہے۔ اور تم سمجھتے ہو کہ گویا وہی اک شعلہ اپنے حال پر قائم ہے۔ تجدد امثال کی کیفیت کو بیان کرنے کے لیے صوفیا نے اکثر و بیشتر یہی مثال دی ہے۔ اور اس سے ان کا مقصود فنائے عالم اور واجب الوجود کی ہر لحظہ تجلّی کا اظہار ہے۔ متکلمین کے گروہ سے نظام بھی اس مسئلہ میں صوفیا سے موافقت رکھتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ جسم ان اجزا سے مرکب ہے جو قائم بالغیر ہیں۔ اور ایسے اجزا میں ہر لحظہ تجدید ہوتی رہتی ہے۔ گویا نظام بھی جو متکلمین کی جماعت سے ہے صوفیا سے متفق ہے۔ اور تجدد امثال کا قائل ہے۔ برخلاف متکلمین کے دوسرے گروہ کے جو اس بات کے منکر ہیں۔ ان کے ذہن میں تجدد امثال کی صورت میں یہ مشکل

پیش آتی ہے کہ اس طرح گناہ کرتے وقت کوئی اور شخص ہے اور جزا و سزا کے وقت گویا کوئی دوسرا ہوگا۔ اور یہ سراسر ظلم ہے۔ کیونکہ قرآن مجید میں آیا ہے کہ قیامت کے دن کوئی آدمی کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اُٹھائے گا۔ اللہ تعالیٰ ظالم نہیں عادل ہے۔ حالانکہ ہم واضح طور پر دیکھتے ہیں کہ ہر شخص کے بچپن میں ایک صورت ہوتی ہے اور جوانی میں دوسری اور بڑھاپے میں اس سے بھی الگ اور مختلف۔ مگر ان سب تغیرات کے باوجود وہ شخص وہی فرد واحد ہے۔ شکل و صورت کے اس تغیر و تبدل کی کوئی اہمیت نہیں۔ لہٰذا جو گناہ کرے گا اُس کی سزا یا جزا بھی وہی بھگتے گا۔ لہٰذا نظام نے اجسام میں تجدد امثال ثابت کیا ہے نہ کہ نفوس میں، جیسا کہ اُس کی دلیل سے ظاہر ہے، اور صوفیا کے کلام کا ماحصل بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ تجدد تجلیات و کیفیات میں ہے نہ کہ ذات میں جو ان سے پیش کی گئی ہے۔ وہ اس امر کے قائل ہیں کہ دو تجلیاں ایک ہی صورت میں کسی فرد واحد میں جلوہ ریز نہیں ہوتیں۔ لہٰذا کثرت تجلیات کے باوجود بھی اس شخص کی وحدت قائم رہتی ہے۔ اُنھوں نے یہ نہیں کہا کہ کسی شخص پر تجدید تجلیات نہیں ہوتی، اور فرد واحد بھی دو مختلف تجلیوں کا متحمل نہیں ہوتا۔ اور یہ سوچنے کی بات ہے۔ نظام نے جسم کو اعراض سے مرکب اسی لیے کہا کہ متکلمین کے نزدیک جسم ڈھانچے اور شکل کا مرکب نہیں۔ وہ ان اجزا کے قائل ہیں جن کی مزید تجزّویت نہیں ہو سکتی اور جسم کو انھی اجزا کی ترکیب سمجھتے ہیں۔ اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ جسم کی یہ صورت نقطوں، لکیروں اور سطحوں کا مجموعہ ہے جو قائم بالذات نہیں ہیں تو پھر اس صورت میں فلسفیوں کو متکلمین سے جو بحث و تکرار ہے، یہاں اس کا بیان زائد از ضرورت ہوگا متکلمین کے دلائل خاصے ضعیف ہیں۔ اور ان کے حکما کے دلائل کی کل حقیقت ہم کتاب کے آغاز میں پہلے ہی درج کر چکے ہیں۔ بعضوں کا یہ خیال ہے کہ اگر مقابل کے اسمائے ذات ایک ہی لمحے میں کسی شے کا تقاضا کریں تو پھر کسی اسم کا مقتضا ظہور پذیر نہ ہو سکے گا۔ کیونکہ جب وہ ایک دوسرے سے متعارض ہوتے ہیں تو گر جاتے ہیں۔ لہٰذا نہ ان اشیا پر وجود طاری ہوگا نہ عدم۔ اس چیز کا تقاضا نہ کریں اور یہ خیال اس امر سے نکلتا ہے جس کا ہم نے صوفیا کے مذکورہ بالا مقولے میں ذکر کیا ہے۔ یعنی کہ جلالی اسمائے ذات تو موجودات کا قلع قمع کرتے ہیں، اور جمالی اسما اُنھیں وجود کے لباس میں ملبوس کرتے ہیں۔ سرسری نگاہ میں یہ اعتراض ذہن میں آتا ہے کہ اگر ایک ہی آن میں دو مقابل اسمائے ذات ایک دوسرے کے مقابلے میں آ جائیں تو کسی اسم کا تقاضا بھی پورا نہ ہوگا۔ مگر اس ثبوت کے باوجود اس کا یوں مطلب نہیں۔ اور ہر اسم کا

مقتضی ظہور پذیر ہوتا ہے۔ شیخ عبدالرزاق کاشی نے گویا اس کے دفعیہ کے لیے تجدد امثال کے بارے میں کہا ہے کہ یہ امکان ممکن کے تقاضے کی وجہ سے ہے۔ اور عدم ممکن ہر وقت اپنے دوام پہ رہتا ہے اور تجلی وجود کا یہ تقاضا ہمیشہ اسمائے ذات کے تقاضے کی بنا پر نہیں۔ شیخ مذکور نے تجدد امثال کے سبب کو امکانِ ممکن کا تقاضا قرار دیا ہے، جو عدم و وجود کی تجلّی گاہ ہے۔ اس نے اسمائے مقابل کے تقاضے کی راہ سے نہیں بتایا۔ گویا یہ انہی اغراض کی تردید کے لیے ہے کہ وہ اعتراض اسمائے مقابل کے ٹکراؤ پر یوں صادق نہیں آتا۔ لیکن اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس صورت میں بھی مقابلے کی گنجائش باقی ہے جو عدم و وجود کا تقاضا ہوگا۔ اگرچہ یہ مقابلہ اسمائے ذات کی بنا پر نہیں ہوا۔ اس تقریر پہ ایک دوسرا اعتراض بھی ہو سکتا۔ چنانچہ شیخ قیصری نے اس بات پہ اعتراض کیا ہے کہ ممکن دونوں جانب سے مغلوب الضرورت ہے۔ اگر وہ وجود کا تقاضا کرتا تو واجب ہوتا۔ اور اگر عدم کا تقاضا کرتا تو ممتنع ہوتا۔ یعنی شیخ قیصری، شیخ عبدالرزاق کی تقریر کو تسلیم نہیں کرتا۔ اس کے نزدیک امکان ممکن کا تقاضا تجدد امثال کا سبب نہیں ہو سکتا کیونکہ امکانی معانی نہ تو عدم کا تقاضا کرتے ہیں اور نہ ہی وجود کا۔ اور خود وہ یوں بیان کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اشیا کے پیدا کرنے اور مٹانے کے سلسلے میں ہر وقت نہ کہ ہر آن جلوہ ریز ہوتا ہے۔ چونکہ وقت کا چھوٹے سے چھوٹا جزو دو حصوں یعنی دو لمحوں میں تقسیم ہو سکتا ہے۔ اس ایک لمحے میں وہ بناتا اور دوسرے لمحے میں اُسے بگاڑتا ہے۔ تاکہ ایک ہی آن میں وہ دونوں تقاضے یکجا نہ ہونے چاہئیں۔ یعنی شیخ قیصری نے شیخ عبدالرزاق کی تردید کی، اور امکان ممکن کو تجدد امثال کا سبب تسلیم نہیں کیا۔ اور اسی کو اسمائے متقابل کے تقاضے کے راستے مان لیا تو مذکورہ بالا اعتراض کے دفعیہ کے لیے اسی مقابلے کا ایک ہی آن میں خود ہی قائل بھی ہوگیا کہ حق سبحانہٗ تعالیٰ اپنے اسمائے مقابل کے تقاضے کی وجہ سے ہر وقت تجلّی ریز رہتا ہے نہ کہ ہر آن۔ اور اس صورت میں آنِ واحد میں دو ضدّوں کا اجتماع بھی ضروری نہیں۔ کیونکہ زمانہ (وقت کا چھوٹے سے چھوٹا جزو دو لمحوں پہ ہی منقسم ہے۔ اور زمانہ پے در پے آنے والے لمحوں سے مرکب نہیں بلکہ وہ متصل واحد ہے۔ اور اس مفہوم کی حقیقت اس امر کی تردید پہ مبنی ہے کہ جزو کو مزید جزدں میں توڑا نہیں جا سکتا۔ کیونکہ زمانہ ایک حرکت ہے، اور حرکت فاصلے (دوری) کے مطابق ہوتی ہے اور مسافت (فاصلہ) جسم سے ملحق ہے اور جسم متصل واحد ہے، اور اُس کا چھوٹے سے چھوٹا جزو دو اجزا میں منقسم ہے۔ لہٰذا وقت کا چھوٹے سے چھوٹا جزو بھی دو لمحوں میں تقسیم ہے۔

اس بات کی مزید تفصیل معقولات کی کتابوں میں لکھی ہوئی ہے۔ ان کی طرف رجوع کیجیے گا۔ اور وہ تقریر کہ حق سبحانہ تعالیٰ اپنے اسمائے متقابلہ کے تقاضے پر ایک آن میں اشیا کو بناتا ہے، اور دوسرے لمحے میں ان کو تباہ کر دیتا ہے اس امر پر مبنی ہے کہ شیخ مذکور یعنی شیخ قیصری کے نزدیک اسمائے الٰہیہ میں تقابل ان کے دنیوی مظاہر پر ظہور سے پہلے ہے۔ کیونکہ اگر دُنیاوی مظاہر میں ظہور سے پہلے اسمائے ذات میں تقابل نہ ہوتا تو وہ اپنے مخالف معانی کا ظہور کیسے کرتے۔ چونکہ بعض اسمائے ذات بعض پر ذات و مرتبے کے لحاظ سے فوقیت رکھتے ہیں۔ اُن مراتب و حیثیات کا فرق ظاہر اور عیاں ہے تو لازمی طور پر ہر ایک کا مظہر بھی دستور و سنّت کے مطابق دوسرے مظہر کے ظہور سے مشروط ہے جب تک پہلے اسم کا مظہر جلوہ فرما نہ ہو متاخر اسم کا مظہر رونما نہیں ہوتا۔ چونکہ مختلف عدد جن میں بعض کو بعض پر فوقیت حاصل ہے ایک ہی ذات میں جمع ہیں۔ لہٰذا جب تک دونوں کے مرتبے ظہور پذیر نہ ہوں گے تیسرا مرتبہ ظاہر نہیں ہو سکتا۔ اور ضروری نہیں کہ یہ اعداد کے مراتب کو تعطل میں ڈال دے۔ لہٰذا اسی قیاس پر بعض مظاہر کا دیگر مظاہر سے ظہور کے تاخیر کے سبب والا اسماؔ کو تعطل میں ڈال دینے والا خیال بھی لازمی نہیں۔ یعنی شیخ قیصری کی یہ تقریر جو "فصوص" کی شرحوں اور شیخ محی الدین اکبر عربی کے پیروکاروں سے اس صورت میں لی ہے کہ حق تعالیٰ کے اسمائے متقابلہ کی تجلیات کو ہر آن نہیں ہر زمان کہہ کر اشیا کے بناتے اور بگاڑنے کو دو لمحوں پہ تصور کیا ہے، اور اسمائے الٰہیہ کا تقابل ان کے دُنیاوی مظاہر پہ ظہور سے پہلے ثابت کیا، اور اسمائے ذات کے تقدم اور اسمائے ذات و مرتبے کے لحاظ سے باہمی تقدم و فوقیت کو ظہور مظاہر کے تقدم و تاخر کی وجہ قرار دیا گیا ہے۔ اور اعداد اور ان کے مراتب کی مثال دے کر تعطل کے شبہ کی تردید کر دی۔ شیخ محی الدین اکبر قدس سرہٗ کی بات پر نظر ڈالیے تو یہ بالکل اس کے موافق بھی نہیں۔ کیونکہ انھوں نے بننے اور بگڑنے کے عمل کو ایک ہی آنِ واحد میں تصور کیا ہے، اور تجلّیِ ذات کو ایک وحدانی امر کہا ہے۔ اور امرِ واحد دو آنوں میں تقسیم نہیں ہو سکتا۔ اس بنا پر وہ خارجی شکلوں کے ظہور سے پہلے اسمائے ذات کے تقابل کے قائل نہیں ہیں۔ وہ یہ نظریہ رکھتے ہیں کہ اسماؔ میں تقابل اس وقت ظاہر ہوتا ہے، جب وہ خارجی صورت رکھنے والے مظاہر میں موجود ہوں۔ اور اسی واحد کے ظہور سے پہلے موجود ہوں۔ اور ایک ہی مرتبے میں جمع ہوں۔ کیونکہ ان کے نزدیک چیزوں کے نام کا تعلق عدم سے ہے۔ اور ان کے معانی کے علم اور

علمی معانی کے درمیان تقابل نہیں ہو سکتا۔ جیسا کہ گرمی، سردی، سیاہ و سفید کے اجتماع میں انسانی ذہن میں کوئی تقابل نہیں آتا۔ اور یہ سمجھ لینا چاہیے کہ چونکہ شیخ قیصری نے بنانے اور بگاڑنے کے عمل کو دو لمحوں میں بیان کیا ہے تو اغلب یہی ہے کہ اس سلسلے میں اس کے نزدیک تجلّیٔ ذات بھی امر وحدانی نہ ہو۔ اور اگر ہو تو اس اعتبار سے ہو کہ ہر آن میں ہر تجلی بذات خود اک امر واحد ہو نہ یہ کہ بنانے اور بگاڑنے والی دونوں تجلیاں امر واحد ہوں، اور ایک ہی لمحے میں واقع ہوئی ہوں۔ اسی لیے اُس نے اسمائے ذات میں تقابل کو دنیاوی مظاہر کے ظہور سے پیشتر جانا۔

شیخ اکبر اور شیخ قیصری کی تقریر پر فیصلہ

اگر بنظر غائر دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ دونوں تقریریں ہی معقول اور صحیح راہ کی طرف جاتی ہیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ زمانی و مکانی نہیں اور اُس واحد حقیقی کی تجلی بھی وحدانی امر نہیں۔ پس جو زمانی نہ ہو وہ اگر ایک ہی آن میں بنایا بگاڑ دے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ وہی ایک تجلّی دو معانی کے ظہور کا سبب بن جاتی ہے۔ جیسا کہ کون و فساد کے عمل ہیں۔ جس لمحے میں کوئی چیز بنتی ہے اسی لمحے میں دوسری چیز بگڑتی ہے۔ لہذا اس آنِ واحد میں ایجاد بھی ہوئی اور معدومیت بھی۔ اور اسماء میں تقابل بھی خارجی شکلوں میں ظہور پذیر ہونے کے بعد ہوتا ہے۔ ظہور سے قبل تقابل اور باہمی ضد نہیں۔ جیسے کہ آگ، پانی، سیاہی و سفیدی کا تصور ایک دوسرے کی نفی نہیں کرتا۔ لیکن خارجی صورت میں ان کا یکجا ہونا محال ہے۔ زید کی ایک ہی شخصیت میں رحم و غضب دونوں کے معانی جمع ہیں۔ لیکن خارجی طور پر جب رحم ظہور میں آتا ہے تو غصّہ نہیں آتا اور جس وقت غصّہ آتا ہے رحم ظہور پذیر نہیں ہوتا۔ اسی طرح اشیا عدم بھی ہیں۔ اور علمیہ معانی بھی۔ کیونکہ کسی چیز کا وجود اور شے ہے، اور اس کی ماہیت اور شے!! ماہیات تو محض امر معقولہ ہیں اور وہ مفہومات کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ لہذا جو کچھ شیخ اکبر نے بیان کیا ہے وہ واقع کے مطابق ہے، اور شیخ قیصری نے جو کہا ہے وہ بھی صحیح ہے۔ مان لیا کہ اللہ تبارک و تعالیٰ زمانی و مکانی نہیں ہے۔ وہ واحد حقیقی ہے، لیکن اس کی مختلف تجلیات جو اسمائے متقابلہ کا مقتضیٰ ہیں امر واحد کس طرح ہو سکتی ہیں۔ یہ سچ ہے کہ ہر تجلّی اپنی ذات میں امر واحد ہے لیکن متضاد تجلّیوں کا ایک ہی آن میں ظہور پذیر ہونا محال ہے۔ ایک چیز کا ایک

ہی آن میں بننا مٹ جانا درست نہیں ہے۔ بننے بگڑنے کی مثال میں یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ ایک چیز کے بننے میں دوسری کا بگاڑ ہے۔ نہ یہ کہ اس شے کا بننا یا بگڑنا اسی ایک آن میں ہے۔ اسماء میں اختلاف بھی مظاہر خارجی میں ظہور سے قبل ہے ورنہ اسماء، اسماء نہ رہیں گے کیونکہ ہر شے کی شناخت اُس کے مقابل سے ہوتی ہے۔ اور خارجی تقابل کے لیے ذہنی تقابل بھی ضروری ہے۔ کیونکہ ذہن اور خارج میں مطلق عمومیت و خصوصیت ہے تو پھر یہ کیسے ہوا کہ اسماء میں تقابل خارجی مظاہر میں ظہور کے بعد ہوا۔ اگر اصل میں تقابل نہ ہوتا تو پھر یہاں ظہور پذیر کیسے ہوتا۔ گرمی، سردی، سیاہی اور سفیدی کے معانی ذہن میں اگر مسلّم ہیں۔ لیکن وہاں بھی الگ الگ۔ جیسے کہ ایک آئینے میں پانی، آگ اور سیاہ و سفید چیزوں کا عکس اگرچہ ایک ہی چیز (آئینے) میں جلوہ گر ہے، لیکن ہیں سب جدا جدا۔ نہ پانی آگ کی جگہ آیا اور نہ آگ پانی کی جگہ، اور نہ ہی سیاہ سفید کی جگہ، اور نہ ہی سفید سیاہ کی جگہ۔ لہٰذا ذہن میں بھی ان کا اجتماع نہیں ہوا، بلکہ ان کا اختلاف قائم رہا۔ اس قسم کا اجتماع خارج میں بھی ہے۔ کیونکہ خارج میں سردی بھی موجود ہے۔ اور گرمی بھی موجود۔ اور اسی طرح سیاہی و سفیدی اور دیگر متضاد چیزیں۔ لہٰذا جس طرح یہ اجتماع تقابل کو رفع نہیں کرتا تو وہ اجتماع بھی تقابل کو رفع نہیں کرتا۔ چیزوں کے ناموں کو محض عدم کیسے کہا جا سکتا ہے۔ کیونکہ ماہیات تو امور معقولہ ہوتے ہیں، اور علمی معانی اگرچہ خارجی موجودات نہیں ہیں لیکن ذہنی موجودات میں شامل ہیں اور علم ربانی کے احاطے سے باہر نہیں ہیں۔ جو تمام حقائق کو گھیرے ہوتے ہے۔ اسی لیے شیخ محی الدین اکبرؒ نے حقائق عالم کو علمی صورتیں (صورِ علمیہ) لکھا اور اس نے اشیا کے وجود کو عدمیہ معانی کہا ہے۔ اُس سے شیخ کی مراد یہ ہے کہ موجود فقط وجود ہے اور ہر بات جو وجود کے بغیر ہے وہ عدم ہے۔ اور اسی لحاظ سے معانی علمیہ۔ کیونکہ خارجی موجودات بھی معانی عدمیہ ہیں۔ اور یہی شیخ کا مسلک ہے۔ اعیان نے وجود کی خوشبو کو نہ سونگھا۔ غرضیکہ ہر کسی کے لیے ایک رُخ ہے جس کی طرف وہ مڑتا ہے۔ **تنبیہ** یہ بات سمجھ لینی چاہیے۔ کہ اللہ تعالیٰ تمام موجودات کو خواہ ذہنی ہوں یا خارجی، اتحادی اور امتیازی نسبت سے وجود میں لایا ہے۔ کیونکہ اگر فقط اتحادی معنی ہوتے تو کوئی چیز ظہور پذیر نہ ہوتی۔ اور اگر صرف امتیازی معنی ہوتے تو حقائق ممکنہ جو وجود کے بغیر ہیں وہ وجود میں کس طرح آتے۔ جیسا کہ قرآن شریف میں ہے کہ یہ اللہ کا کام ہوگا جس نے ہر چیز کو مناسب انداز پر مضبوط بنا رکھا ہے۔ لہٰذا شیخ اکبر کی نظر میں اتحادی معنی کا مشاہدہ

غالب تھا۔ تمام نسبتیں اور اضافتیں اس کی چشمِ بصیرت سے پوشیدہ رہیں۔ اس نے تجلّیٔ ذات کو امرِ وحدانی دیکھا اور اشیا کے بننے بگڑنے (وجود و عدم) کو ایک ہی آن میں سمجھا۔ اور اسمائیں تقابل کو فقط اعتبارات خارجی کے مراتب کا ظہور ہی سمجھا اور نورِ احدیت میں مستغرق رہا۔ چونکہ شیخ قیصری کی نظر سے اعتبارات کا امتیاز دُور نہ ہو سکا۔ اور دُنیاوی نقوش جس طرح کہ چاہیے تھا اس کے دل و دماغ کی تختی سے مٹ نہ سکے تو اُس نے اسمائیں تقابل کو بھی مظاہر میں ظہور سے پیشتر دیکھا، اور اس وحدت میں بھی کثرت پائی اور تجلّیٔ ذات کو لمحوں کے اختلاف کے مطابق مشاہدہ کیا، اور یوں ایک لمحہ میں اشیا کے بننے اور دوسرے لمحے میں ان کے بگڑنے کا قائل ہوا۔ جیساکہ قرآن پاک میں آیا ہے کہ ہر گروہ اپنے اس طریقے پر نازاں ہے جو اس کے پاس ہے۔ یہ محمدیؐ جامعیت ہی ہے (ان پر خدا کا درود و سلامؐ) جس نے ہر کسی کی داد فریاد سنی۔ تمام اسرارِ ربانی کو سمجھا اور سارے مراتب کو کماحقہٗ دیکھا اور کلام کے ہر اسلوب اور انداز میں گفتگو کی اور اُنھیں وہ کلام دیا گیا جس کے الفاظ تھوڑے اور مطالب بہت زیادہ ہیںؐ۔ آپ نے سب کو حق کی راہ دکھائی، اور وہی راہ فقط وہی راہ راست ہے باقی سب وہم و گمان ہیں۔ خالصتہً طریق محمدی اختیار کیے بغیر سکون کلی اک امرِ محال ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمارے قدموں کو لڑکھڑانے سے بچائے اور طریق محمدیؐ پر ثابت قدم رکھے (ان پر درود و سلام) عارفوں کے امام، کاملوں کے سرتاج، دینِ مصطفیٰؐ کے معارف اور علمِ علیؓ مرتضیٰ کے وارث، رحمتِ خداوندی کے مظہر یعنی میرے قبلہ گاہ والاشان و بزرگوار والد صاحب (خدا اُن کا سایہ دیر تک رکھے) نے کس نئے اور پاکیزہ انداز میں تجدد امثال کے اس مسئلے کو آیاتِ قرآنی اور احادیث نبویؐ کے مطابق تحریر کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ پاک ہے۔ پاکیزگی اسی کے لیے ہے۔ میں اللہ تعالیٰ کو ہر برائی سے مبرّا قرار دیتا ہوںؐ۔ یہ کلمات یہاں تعریف و توصیف کے لیے ہیں۔ اور اس امر کی خبر و آگہی بھی دیتے ہیں کہ جس طرح حق سبحانہٗ تعالیٰ تمام تعریفات اور توصیفات سے اولیٰ ہے۔ اسی طرح نائبانِ حق کا رتبہ اور اُن کا کلام ہم عاجز انسانوں کی تعریف و توصیف سے بلند و بالا ہے۔ امام العارفین کا لقب ان کی ذات پر امامت کے انوار و برکات کے ظہور کی بنا پر ہے۔ اور زبدۃ الواصلین کا لقب اُن کی ذاتِ خداوندی سے خصوصی نسبت اور قرب کی بنا پر ہے جسے ہم اقربیت کہتے ہیں۔ اور دین محمدیؐ کا معاون اُن سے طریق محمدیؐ کے حقائق و دقائق اور اس دین متین سے تعلق اور دیگر امور کے ظاہر ہونے

کی وجہ سے کہا گیا ہے۔ چونکہ اُن کا نام ناصر ہے، لہذا اسم بامسمیٰ ہونے کی بنا پر ہم نے اُنھیں ناصر ملت والدّین کہا۔ علمِ علی مرتضیٰ کا وارث ان کے حسنی حسینی سیّد ہونے کی وجہ سے کہا ہے۔ اور وہ سادات سے ملنے والے ورثے کی بنا پر جامع کمالات ہیں اور اسی ظاہری اور باطنی وراثت کے اعتبار سے بیدار دل ہیں۔ ان کے خاص دوستوں میں سے کسی نے ان کی تاریخ پیدائش کو "وارث علم امامین وعلی" سے نکالا۔ اور یہ اشعار کہے۔ جب اس ولی اللہ کی ذات پیدا ہوئی تو اس سے امامت کے کمالات روشن ہوگئے۔ اس کی پیدائش کا سال مجھ پہ "وارث علم امامین وعلی" کے مصرع کی صورت میں القا ہوا۔ اور عالیجناب کا لفظ ان تمام کمالات کے ان کی ذات میں جمع ہونے کی بنا پر ہے۔ ان کے کمالات کا احاطہ کرنے کے لیے بڑی اہلیت اک شرط ہے۔ زبر کے ساتھ جناب کا مطلب بارگاہ ہے اور جنابِ عالی کی ترکیب کی صورت میں یہ لفظ 'عالی' صفت ہوگا جناب کی۔ اور عالی جناب کا مطلب ہے صاحبِ جنابِ عالی، یعنی درگاہِ عالی کا مالک!! اور کہا جاتا ہے کہ جناب غنا ہے اور اس سے اشارہ کیا جاتا ہے اس کی ذات کی طرف تعظیماً!! اور صاحبِ کتاب کے کلمات اس بات کی خبر دیتے ہیں کہ وہ ایک مستند کتاب کے مصنف ہیں۔ اور سنّت الٰہیہ یونہی جاری ہے کہ قدرت ہر ولی اور ہر عارف کو صاحبِ کتاب نہیں بناتی۔ اور صاحبِ کتاب اور بے کتاب اولیا میں اتنا ہی فرق ہے جتنا کہ صاحبِ کتاب اور بے کتاب انبیا میں ہے۔ لہذا خاص سلسلے کے کامل اولیا اور محقق عارفانِ ذات میں بعض صاحبِ کتاب اور بعض صاحب رسائل ہو گزرے ہیں۔ جیسے کہ صحیفوں والے انبیائے کرام کا مرتبہ صاحبِ کتاب انبیا سے کم تر ہے۔ رحمتِ الٰہی کا مظہر ہیں تے اپنی نسبت سے کہا ہے کہ وہ اپنے نالائق غلام پر کمال درجے شفقت و عنایت فرماتے تھے۔ اور بڑا رحم کھاتے تھے۔ اور میرے دین اور دُنیا بلکہ میری ہستی ہی اللہ کریم اور ان کی رحمت کا پتہ دیتی ہے، اور نیز حضور سرورِ کائناتؐ کا نائب ہونے کی حیثیت سے کہ وہ سارے انسانوں پہ کمال لطف و کرم فرماتے تھے۔ اور قبلہ گاہی کا لفظ اس مناسبت سے ہے کہ والد کو قبلہ گاہ کہتے ہیں، اور وہی جناب مجھ ناچیز کے پیر و مرشد بھی تھے۔ اور میری تمام تر توجہ کا قبلہ بھی۔ اور (مدظلہ الاقدس و دامت برکاتہٗ) دعائیہ جملہ ہے۔ اور یہ اس لیے لایا گیا کہ یہ باب ان کی حین حیات ہی میں لکھا گیا تھا۔ اور اب اولاد کے لیے دعائیہ معانی پیدا ہوگئے ہیں۔ کہ چونکہ ان کے پس ماندگان و تابعین انھی کا سایہ ہیں۔ خدا اُنھیں قائم و

دائم رکھے، کیونکہ ان کی ہستی کے قیام میں بھی انہی کے دوام کی جھلکی ہے۔ اللہ تعالیٰ ایسی برکات کو مخلص محمدیوں کے حق میں جاری رکھے۔ اور تازگی و تنقیح کے کلمات سے مراد ہے کہ متقدمین یا متاخرین میں سے کسی نے آج تک تجدد امثال کو اس انداز اور اس کی تفصیل سے نہیں لکھا جیساکہ انھوں نے لکھا ہے جو ارباب منقول و معقول دونوں کے موافق ہو۔ اس مجمل انداز میں مفصل کسی نے نہیں لکھا۔ یعنی اپنی عمدہ ترین تصنیف نالۂ عندلیب میں شاہ باکمال کے افسانے میں یار صادق کی زبانی لکھتے ہیں کہ تجدد امثال کا یہ مسئلہ عالی مقام صوفیا کی تحقیقات کی یادگار ہے۔ جسے ادھورے سالک پوری طرح سمجھ نہ سکے اور ہر جگہ اس سے انحراف کرتے رہے۔ اس لیے حق پسند علما ان کی باتوں پر شک و شبہ کا اظہار کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اگر معاملہ یوں ہے کہ کوئی چیز یا کوئی شخص دو لمحوں میں بجا و برقرار نہیں رہتا تو پھر اس دُنیا میں اور اگلی دُنیا کی سزا و جزا کا معاملہ بے جا اور غیر صحیح معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ ایک کام اور کسب کرنے والی شخصیت دوسرے ہی لمحے میں فنا ہو جاتی اور مٹ جاتی ہے۔ اور دوسری اس کی جگہ لے لیتی ہے۔ لہٰذا اس کلام میں صوفیا کی تحقیق یوں ہے کہ لفظ تجدد امثال کا اطلاق کثیف اجزا کے مرکبات اور شکلوں پر صادق آتا ہے، نہ کہ عناصر کی جڑ اور مفردات تک پہنچ کر عالم بالا اور عالمِ ارواح میں سرایت کرتا ہے۔ بلکہ وہاں تو تشکلِ اشکال (شکلوں کی تشکیل) اور تبدلِ احوال (احوال کا ادل بدل) کے الفاظ کا اطلاق صادق آتا ہے۔ اگرچہ تمام امکانی عالم کثیف ہوں یا لطیف، فلکی ہوں یا ارضی تغیر و تبدّل سے خالی نہیں ہوتے۔ لیکن عالم بقا اور عالمِ بالا میں تغیر و تبدل کم ہی ہوتا ہے اور فنا تو ہرگز نہیں ہوتی۔ وہ ذات واجب اور باقی کا مقام ہے جو ہمیشہ ایک ہی حال پر قائم و دائم ہے اس میں کبھی خلل اور زوال نہیں آتا۔ اس جناب پر محولِ احوال (احوال کو سونپنے یا سپرد کرنے والا) کے الفاظ کا اطلاق زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔ لہٰذا تجدد امثال کے لفظ کا اطلاق دریاؤں کے پانی کی روانی آگ کے شعلوں اور ناپائدار جانداروں کے انفاس پر کرنا چاہیے، اور نیز نباتات کے اُگنے اور حیوانات اور انسانوں کی پیدائش اور نسل کے بڑھنے اور چاند کے بڑھنے اور گھٹنے اور فانی اجسام کی شکلوں کی تشکیل پہ کرنا چاہیے۔ اور تبدل احوال کا اطلاق افلاک کی گردش، دن رات کے پیدا ہوتے اور ستاروں اور ان کے برجوں کی نمود پہ کرنا چاہیے۔ یہاں پہ وہ مقدس کلام ختم ہو جاتا ہے۔ اگر تفصیل کے لیے ملاحظہ کا شوق ہو تو والد بزرگوار کی نالۂ عندلیب نامی کتاب کی طرف رجوع کریں اور

علم الٰہیات کے اس سمندر کے تلاطم کا مشاہدہ کریں۔ فقط اسی ایک مسئلے پہ کیا منحصر ہے۔ وہ کونسا دینی یا دنیوی مسئلہ ہوگا جو اس جامع کتاب میں موجود نہیں۔ نالۂ عندلیب نامی یہ کتاب میرے والد بزرگوار کی تصنیفات میں سے ہے۔ چونکہ شرعی اصطلاح میں سوائے اس کتابِ مقدس کے جو حضرت جبرئیل علیہ السلام کی وساطت سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پہ نازل ہوئی کسی اور کتاب کو کتابِ منزل (نازل شدہ) نہیں کہا جا سکتا۔ اس لیے ہم نے نالۂ عندلیب کو ان کی تصنیف کہا ہے۔ ورنہ وہ ہے تو سارے کی ساری اللہ ہی کی جانب سے۔ اور سب الہامات الٰہیہ ہی ہیں۔ جو لوگ ایمان لائے ہیں، وہ کہتے ہیں ہم اس پہ ایمان لائے، کہ یہ سب ان کے رب کی طرف سے ہے۔ جو کوئی استقلال و عقیدے سے اُس کتاب کے مطالعے سے شرف یاب ہوتا ہے وہ جانتا ہے کہ یہ علم الٰہی کے سمندر کی موجیں ہیں۔ جو مصنف کے سینے میں موجزن ہیں، اور اس قسم کا کلام انسانی بس کا روگ نہیں۔ کیونکہ وہ کتاب دینی اور دنیوی تمام حقائق و دقائق کی حامل اور دنیا و آخرت کے سبھی مطالب پہ مشتمل ہے۔ غرضیکہ یہ کتاب اس آیتِ کریمہ کی آئینہ دار ہے کہ نہ کوئی تر اور نہ خشک چیز گرتی ہے۔ مگر وہ کتاب میں ہے[۵] اور کلام الٰہی کی سنّت کے مطابق اس میں بڑے عمدہ قصّے اور رنگین افسانے بھی ہیں۔ اور یہ مختصر جو ہے بچے کی طرح ہے، اس کتاب کا جس میں کوئی شبہ نہیں، اور بچہ اپنے باپ کا راز ہوتا ہے۔ یعنی جس طرح یہ بندۂ ناچیز اس کتاب کے مصنف کا ظاہری اور باطنی فرزند ہے اور فرزندیت کے ساتھ جسے ان سے پوری ارادت و عقیدت بھی ہے اسی طرح وارداتِ قلبی کا یہ رسالہ اور میری باقی تصنیفات اسی کتاب کی آل اولاد ہیں جو حقائق کے اس سر چشمے سے پھوٹی ہیں۔ اور وہ کتاب ہر قسم کے شک و شبہ سے مبرّا ہے۔ اور ہر قسم کے عیوب اور نقائص سے پاک ہے۔ اور اس کتاب کے اُس کتاب سے انتساب کیے جانے میں بھی کوئی شک و شبہ نہیں۔ اور یہ بات بالکل کسی تردد یا تذبذب کے بغیر کہی گئی ہے۔ چونکہ بیٹا باپ کا راز ہوتا ہے تو اُس عالی جناب کے جو علوم اور حقائق لوگوں کی نظروں سے پوشیدہ رہ گئے تھے، اب وہ ظہور میں آگئے اور تفصیل سے لکھے گئے۔ اور ہماری یہ دُعا ہے کہ اے اللہ عطا کر ہمیں خدمت کرنا اس کتاب کی اور اُسی کے مطابق اُس پہ عمل کرنے کی توفیق دے، اور ہمیں زندہ رکھ، اور ہمیں مار اس مصنف کی رضامندی اور مشرف کر ہمیں اس کی برکتوں سے۔ (آمین) یعنی اے اللہ ہمیں اس کتاب کی خدمت نصیب کر، یعنی اس کی ترویج و تشہیر ہمارے ہاتھوں ہی ظہور پذیر ہو۔ تاکہ ہم اس سعادت سے شرف یاب ہو سکیں، اور تیرے فضل و کرم

سے ہمیں یقین ہے کہ اس کتاب کا فیض قیامت تک جاری رہے گا، اور تو ہی اس کی حفاظت کرنے والا ہے اور ہماری وساطت بھی درمیان سے ختم نہ ہونے پائے گی اور تمام محمدیان مخلص کا ثواب ہمیں ملتا رہے گا۔ اور میرے یہ رسالے عنقا کی طرح اس نایاب کتاب کی شہرت کی پرواز میں شہپر کا کام دیں گے اور نمونہ کی اس کتاب کے انداز میں بہت سی کتابیں دُنیا میں شائع ہوں گی۔ سو اے اللہ تعالیٰ پہلے تو ہمیں اس کتاب کے مطابق عمل کی توفیق عطا فرما۔ کیونکہ ہم سابقون میں سے ہیں اور پہلے جو ہیں ان کا کیا کہنا وہی مقرب ہیں۔ ہمیں قبلہ والد صاحب کے حسب منشا زندہ رکھ اور انہی کے شوق و محبت میں مرنا نصیب فرما۔ ہمیں ان کی کتاب کی برکات سے مستفیض فرما۔ یعنی ہم پہ اپنی ذات و صفات کے اور مخلوقات کے حقائق و دقائق کا انکشاف فرما۔ کیونکہ صحیح معنوں میں بیٹا وہی ہوتا ہے جو باپ کے علم کا وارث ہو اور صحیح العقیدہ مرید وہی ہوتا ہے جو اپنے پیر و مرشد میں ہمہ تن مشغول ہو کر فنافی الشیخ ہو جائے۔ ترجمہ رباعی اے وَرد اگر تجھ میں باطنی صفائی ہے تو تو اس حُسن بے نشان کا آئینہ دار ہے۔ چونکہ تو بھی سیلاب کی طرح طبع میں روانی رکھتا ہے، مجھے یقین ہے کہ تو اپنے سمندر سے جا ملے گا۔ حسب معمول مصنف اس رباعی کی گرہوں کو یوں کھولتا ہے کہ صفائی جان سے ہماری مراد باطنی صفائی ہے اور آئینہ سے مراد مظہر ہونا ہے۔ اور حُسن بے نشان سے مُراد حق تعالیٰ کی تجلّیٔ بے کیف ہے۔ اور محیطِ خویش سے ہماری مراد مرتبۂ ذاتِ خداوندی، نیز اپنے والد بزرگوار سے بھی ہے۔ وصول سے مراد ہے قرب کی حالت اور طبع رواں کا مطلب ہے علمی اور عرفانی نسبت۔ اور اب مطلب رباعی کا یوں ہوا کہ اے درد اگر تو باطنی صفائی رکھتا ہے، اور تزکیہ و تصفیہ قلب کر لیتا ہے تو تو اس ذاتِ بے ہمتا کی تجلّی کی مظہریت کا اہل ہو جائے گا۔ لہٰذا مجھے یقین ہے کہ یہاں بھی اور اُس دار آخرت میں بھی مرتبۂ ذات اور اپنے والدِ بزرگوار کے قرب سے مشرف ہو جائے گا۔ کیونکہ واصل کرنے والی علمی اور عرفانی نسبتیں تجھ میں موجود ہیں۔ اس علمی سیلاب کا رجحان اسی بحرِ بیکراں کی طرف ہے جس سے آہستہ آہستہ جا ملے گا۔ ہر شے اپنے اصل ہی کی طرف رجوع کرتی ہے اور اللہ ہی کی طرف لوٹتی ہے۔[۵]

هوالنّاصح

شروع اللہ کے نام سے جو نہایت مہربان اور بہت رحم والا ہے

ہر قسم کی تعریف اللہ کے لیے ہے جو بلند درجوں والا ہے اور تمام کمالات کا مجموعہ ہے جس نے توفیق دی ہمیں بھلائیوں کی اور نیکیوں کی، اور سکھائے ہمیں کلمات تام، اور درود و سلام ہو اس کے رسول صلعم پر جو موجودات میں سے افضل اور مخلوقات میں سے اکمل ہیں، اور آپؐ کی آل پر اور برکات اور فیوض والے اصحاب پرؓ۔ امابعد یہ چودھواں باب ہے جس کا نام خیراً کثیر ہے۔ وجود خالص بھلائی ہے۔ پس جس میں کمالاتِ وجودیہ کا ظہور زیادہ ہو جائے وہ زیادہ بھلائی والا ہو جاتا ہے دوسری موجودات سے۔ پس جب انسان افضل موجودات میں سے سب سے زیادہ کمالات کا مجموعہ ہے تو یوں وہ ہو گیا ان میں سے اشرف ترین ذات کے لحاظ سے اور صفات کے لحاظ سے، اور انسانوں میں سب سے زیادہ عالم اور سب سے زیادہ عارف دوسرے افراد سے جو نہیں سمجھتے افضل ہے۔ اور سکھاتا ہے اللہ تعالیٰ اپنے کامل بندے کو جامع اور نافع علم، اور سکھاتا ہے اُنھیں اسماء سب کے سب، اور بناتا ہے اسے خلیفہ زمین میں اور مسجودِ ملائکہ اور قابلِ اتباع۔ اور مُسخر کرتا ہے اس کے لیے رات اور دن، اور مُسخر کرتا ہے اس کے لیے سورج اور چاند کو، اور اسے عطا کرتا ہے کمالِ انسانی۔ پس انسانیت جو حکمت الٰہیہ ہے خیر کثیر پہ مشتمل ہے اور اللہ کی امانت ہے جسے اُٹھایا تھا انسان نے، حالانکہ وہ تھا اپنے اصلی مرتبے میں جو کہ عدم ذاتی ہے، ظالم اور جاہل ہے۔ عدم کے مقابلے

میں وجود کے لیے انعکاس ہوا اس کے ظلم کے مقابلے پہ عدل اور اُس کے جہل کے مقابلے میں علم اور علیٰ
ہذا القیاس ۔ اس کے نقائص اُلٹ کے تبدیل ہو گئے کمالاتِ وجودیہ میں سب کے سب ۔ اور وہ ہو گیا
موجود عالم، عادل اور خلیفہ زمین میں ۔ پس اس نے سجدے کیے اللہ کے لیے بہت سارے شکر کے
سجدے ۔ اور وہ ہوتا ہے بعد میں آنے والوں کے لیے بشیر اور نذیر، اور اللہ رکھتا ہے اُس میں خیر کثیر ۔
پس اے انسانی طبیعت بے شک اللہ تعالیٰ نے تمھیں چن لیا خاص چناؤ کے ساتھ ایمان اور عرفان عطا
کر کے، اور تجھے تزکیے اور تصفیئے سے پاک کیا، اور تجھے منتخب کر لیا تمام زمانے کی عورتوں پر ۔ اور یہ
ہیں حیوانی طبیعتیں، نباتاتی طبیعتیں اور جماداتی طبائع اور ان جیسی اور جو کچھ کہ دُنیا میں موجود ہیں دوسرے
حقائق میں سے ۔ پس ڈالا تیری طرف اپنا وہ کلمہ جو مجرّد نفس ناطقہ ہے ۔ اور تیرا ساتھی بنا دیا اپنی طرف
سے ایک رُوح کو ۔ اور گمان کیا ان لوگوں نے جن کی عقل پہ پردہ پڑا ہوا تھا نفس انسانی کے تجرد اور
اس کی پاکیزگی سے کہ وہ نفس اللہ کا بیٹا ہے ۔ اللہ کے یہ شایانِ شان نہیں کہ وہ کسی کو بیٹا بنالے ۔
وہ پاک ہے ۔ جب وہ کسی معاملے کا فیصلہ کر لیتا ہے پس وہی کرتا ہے ۔ کہتا ہے کہ ہو جا اور وہ
ہو جاتا ہے[۵]، اور اس کے سوا نہیں کہ روح جو ہے وہ اللہ کے حکم سے ہے ۔ جو کہ اس نے
پھونکی اس اعتدال پسند طبیعت میں جو کہ انسان کا حاصل ہے ۔ پس اُس نے
اُسے اُٹھا لیا ۔ پس یہ بات اللہ کے لیے بڑی آسان ہے ۔ پس اے طبیعتِ صالحہ فرمانبرداری
اختیار کر اپنے رب کی، اور اس کو سجدہ کر اور رکوع کر رکوع کرنے والوں کے ساتھ کہ اللہ کی نافرمانی
نہیں کرتے ان معاملات میں جن کا اُس نے اُنھیں حکم دیا ہے ۔ اور وہ کرتے ہیں جن کا اُنھیں حکم دیا گیا ہے[۶]
اور حاصل کر مکمل مشابہت ملائے اعلیٰ سے اور ہو جا اطمینان بخش دل والی اور لوٹ اپنے رب کی
طرف، اس طرح کہ تو اپنے نیک انجام سے خوش ہے اور اپنے رب کے نزدیک پسندیدہ ہے اور
داخل ہو جا اللہ تعالیٰ کے بندوں میں اور داخل ہو جا اس کی جنت میں کہ جس میں وہ داخل کرتا ہے جسے
چاہتا ہے، اور وہ بڑا عظیم فضل کرنے والا ہے[۷]

انسانی جامعیت کے بیان کا باب

جامعیتِ انسان سے مُراد ہے کہ جملہ دینی اور دنیوی کمالات میں انسانی حقیقت کہاں تک

محیط اور حاوی ہے۔ عالمِ امر و خلق کے تمام مراتب میں یہ ضروری ہے کہ اس کے پچھلے کو کمالات کے حصول میں اپنے سے پہلے پر فوقیت حاصل ہو۔ اور اس کی نسبت کچھ نہ کچھ ایزادی ضرور ہو۔ مثال کے طور پہ موالیدِ ثلاثہ، یعنی جمادات، نباتات اور حیوانات میں، حیوان نباتات کی نسبت متاخر ہے۔ وہ اپنی نشوو نما کے تمام کمالات سمیت جو غذا، نمو اور پیدائش پہ مشتمل ہیں، زیادہ حساس واقع ہوا ہے اور اپنے ارادے کے مطابق اپنے اندر حرکت کی قوت رکھتا ہے۔ اور انسان جو حیوان کے بعد آیا ہے۔ نشوونمائی اور حیوانی قوتوں کے کمالات سمیت اُسے قوتِ گویائی کا امتیاز حاصل ہے۔ اور چونکہ وہ مخلوقات اور موجودات میں سے سب سے آخری مخلوق و موجود ہے۔ وہی تمام مراتبِ کمال کا خاتم بھی ٹھہرا اور انسان کے بعد کوئی موجود تخلیق میں نہیں آیا جس پہ کہ انسان سے زیادہ کمالات رکھنے کا احتمال گزرے۔ بلکہ اس بات کے ظہور کا بھی کوئی امکان نظر نہیں آتا۔ یہ تو اک امر ممتنع نظر آتا ہے۔ ورنہ اب تک اللہ تعالیٰ اسے معرضِ وجود میں لے آتا۔ سو معلوم یہ ہوا کہ جس طرح اللہ تعالیٰ کے کسی شریک کی ممانعت ہے۔ اسی طرح نائب حق کے شریک کی بھی ممانعت ہے۔ ہاں اک کامل نائب حق یا خلیفۂ ارض کو اپنے اندر اخلاق خداوندی پیدا کرنا چاہیے۔ اور صفاتِ ذات کی تمام صفتوں کی طرف کلی رجوع کرنا چاہیے۔ تاکہ خلافت کا لفظ اُس پہ صحیح طور پہ صادق آسکے۔ کائنات میں حضرت انسان اشرف المخلوقات ہے اور ساری دُنیا سے افضل، کیونکہ اُس جیسے اور کسی وجود کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ وہ اپنے خالق کا اک مکمل مظہر ہے۔ اور تمام تشبیہی اور تنزیہی صفات اور دُنیا و دین کے سارے کمالات کا جامع ہے گویا انسانی موجودات کے دائرے کا مرکز ہے، اور جس طرح عالم بالا واجب الوجود سے ممتاز ہوا، اسی طرح تحتانی دُنیا نے اس سے امتیاز پایا ہے، اور چونکہ یہ تلفظ قائم بالذات نہیں۔ حقیقت میں یہ تحتانی دُنیا بھی اسی واجب الوجود کے اعتبار سے معتبر ہوئی۔ جیسا کہ قرآن پاک میں ہے کہ وہی اوّل ہے اور وہی آخر۔ لیکن ان نقاط کی مانند خطوط کے اطراف والے عرض نے انسان کو مجازاً نقطہ قرار دیا اور اُسے مرکز اور تحتانی دُنیا کو ممتاز کرنے والا کہا۔ لہٰذا یہ مرکزی نقطہ فوقانی دائرے کے تمام اجزا سے یکساں دُوری پر ہے اور ہر جانب سے اس کے کمالات کو اخذ کرتا ہے۔ جس طرح کہ سورج کی روشنی کرۂ ارض پہ پڑتی ہے جو اضافی مرکز ہے، اور پھر یہاں سے شعاعیں پھیل کر ہوائی کرّے کو گرم کرتی ہیں۔ اسی طرح ہدایت ربانی کے آفتاب کی روشنی ربوبیت کے فلک سے کسی کامل خاکی انسان کے دل پہ پڑتی ہے جو حقیقی مرکز

ہے۔ اور پھر یہاں سے نور کی شعاعیں اُٹھ کر ساری دُنیا میں پھیل جاتی ہیں۔ اور اہلِ دُنیا کو ہدایت کی کیفیت سے سرشار کرتی ہیں۔ لیکن ان شعاعوں کو اخذ کرنے کے لیے جو شخص جتنا بھی زیادہ خلوص و عقیدت اور استقلال سے کام لے گا، یا جتنا بھی کسی عارف کامل کے دل کے قریب ہو گا اتنا ہی زیادہ اثر پذیر ہو گا، اور جو کوئی ذاتی دشمنی، مخالفت اور انکار کے باعث اس عارف کامل کی حقیقت سے دُور یا دُور تر ہو گا۔ اس پہ کوئی اثر نہیں ہو گا۔ کیونکہ زمینی شعاعیں بھی پہلے پہلے ہوائی کرّے کو گرم کرتی ہیں جو اُس کے نزدیک تر ہے اور دوسرے طبقے کو جسے ہم کرہ زمہریر (منجمد بستہ کرہ) لکھتے ہیں۔ اُسے گرم نہیں کرتیں، نہ وہ طبقہ خود بخود سورج کی روشنی سے گرم ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ روشنی فی نفسہٖ گرمی، سردی، تری اور خشکی کے اصل اجزا کی کیفیات سے مبرا ہے۔ اور اس طبقے میں یہ سردی ہوا کی رطوبت کی وجہ سے ہے۔ کیونکہ وہ بہت سا پانی پیدا ہونے کی جگہ ہے۔ اور گرم کرنے والی زمینی شعاعیں وہاں تک نہیں پہنچتیں۔ قصّہ کوتاہ یہ کہ جس طرح موجودات ممکنہ کے اندر مراتب کمال میں انسانی مرتبہ سب مرتبوں کو تمام و ختم کرنے والا ہے۔ اسی طرح انسانوں میں ایک فرد ایسا بھی ہے جس کی ذات پر انسانی کمالات کے سارے مراتب ختم ہو جاتے ہیں، اور وہ ذات نبوت کو ختم کرنے والی ہے (ان پر خدا کی تمام رحمتیں اور کامل درود ہوں) انسانیت میں حقیقی اعتدال اس بے مثال شخصیت کے حصّے میں آیا اور جو کوئی اس اعتدال کے جتنا زیادہ قریب ہے۔ اتنا ہی زیادہ وہ مکمل و اکمل ہے۔ اس انسانی اعتدال کے درجات میں فرق کے لحاظ سے کئی مرتبے ہیں۔ اور ان اضافی مراتب کو ختم کرنے والا خود اُس اعتدالِ حقیقی (ان پر خدا کا درود و سلام ہو) کے مالک کے قدوم میمنت لزوم سے چسپاں ہوتا ہے اُسے صاحبِ محمدیّت خالص کہتے ہیں، اور نبوت کے بعد محمدیّت خالصہ ہی کا منصب آتا ہے۔ حق تعالیٰ نے جسے چاہا اس کی نسل یا آل اولاد سے اُس شرف سے مشرف فرمایا، اس سے بڑھ کر کوئی مرتبہ نہیں۔ جس طرح کہ منصف کی ذہانت سے کوئی چیز مخفی نہیں ہوتی۔ ہاں ان کمالاتِ انسانی کا بیان کلی اور عمومی طور پر کیا جانا چاہیے جو خصوص کو احسن طریق سے شامل کر لے۔ ترجمہ رباعی وہ شخص جو بڑی شان رکھتا ہے۔ یعنی تمام مراتب کمال کا حامل ہے۔ وہ اپنے لیے وہ سب کچھ رکھتا ہے جو دو عالم میں ہے لیکن کونین (ہر دو عالم) کے سمندر میں وہ نایاب موتی نہیں ملتا جو اپنے اندر حقیقت انسانی رکھتا ہو۔ حسب معمول مصنف اپنے مخصوص انداز میں ان کلمات کی تعبیر یوں کرتا ہے کہ شخص سے ہماری مراد

تمام معنوں میں انسان ہے جس میں ساری نوعِ انسانی شامل ہے۔ شانِ اعظم سے ہماری مراد تمام مراتب کی جامعیت ہے۔ ہر دو عالم سے مراد مفردات اور مادیات ہیں۔ بحر کونین سے مراد سارے حقائق ممکنہ ہیں۔ گوہر نایاب وہی جامع مخصوص ہے۔ اور آدم سے مراد حقیقتِ انسانی اور کامل افراد ہیں۔ مطلب یہ ہوا کہ انسان کے کل معانی میں جو سارے مراتب کی جامع شخصیت ہو۔ ہر دو عالم میں (مفردات و مادیات) میں یہ خاصیت انسان ہی اپنے اندر رکھتا ہے کہ وہ حیوانِ ناطق بھی ہے، اور حیوان مادی بھی اور ناطق مجرد بھی، لیکن تمام حقائق ممکنہ میں اُس جامع مخصوص کا تعین جس میں حقیقتِ انسانی ہو مشکل ہی سے کیا جا سکتا ہے۔ یہ مقام محض کامل انسانوں کو حاصل ہے۔ اور قرآن شریف کی اس آیت کریمہ میں کہ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو پیدا کر کے کل چیزوں کے اسماء کا علم دے دیا۔ کلمہ آدم سے مراد حقیقت انسانی ہی ہے جو تمام افراد پہ حاوی ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ انسان کو سب علوم میں دسترس ہے۔ ورنہ فرداً فرداً دیکھا جائے تو کوئی آدمی خواہ علامۂ دہر ہی کیوں نہ ہو۔ تھوڑا بہت علم ہی رکھتا ہے، اور بہت چیزیں اس کی سمجھ سے باہر ہوتی ہیں۔ پس قرآن حکیم کی اس آیت کریمہ میں کہ ہم نے اس کے متعلق تمھیں کم علم ہی دیا ہے۔ ہر فرد کے لحاظ سے کہا گیا ہے اور اسماء کے ناموں کی تعلیم کلی طور پر انسانوں کے نصیب میں آئی اور اگر آدم سے مراد وہ کامل ترین انسان یعنی ابوالبشر (باوا آدم) ہی کو لیا جائے تو بھی جائز ہے۔ وہ اللہ کے نبی تھے (ان پر اور ہمارے نبی پر درود و سلام) اس سے مُراد دیگر کاملانِ حق سے بھی لی جا سکتی ہے جو دوسروں کی نسبت بہت زیادہ علم رکھتے ہیں۔ اور اکثریت کا حکم بھی کل کا حکم رکھتا ہے جو ایک جامع مرتبہ ہے۔ جس نے کسی کمال کو نہیں چھوڑا جسے حاصل نہ کیا ہو۔ یعنی جب حقیقتِ انسانی ہی اس جامع مرتبے کا دوسرا نام ہے۔ جو اسمائے ذات کے تمام کمالات کا مظہر ہے اور اُسی علم و عرفان کے بل بوتے پر وہ فرشتوں کا مسجود بنا اپنی عبادت یا طہارت سے نہیں۔ سو تمھارا کمال اسی میں ہے کہ جہاں تک ہو سکے کسبِ کمال سے نہ رکو۔ یہ عوام سے خطاب ہے ہر انسان کو چاہیے کہ وہ جہاں تک ہو سکے اپنی حقیقت کے کمال کو حاصل کرنے کی کوشش کرے تاکہ اس جزوی مرتبے سے اُٹھ کر حتی الوسع کلی مرتبے سے مشابہت پیدا کرے اور وہ وسعتِ علمی پیدا کرنے ہی سے ہاتھ لگ سکتی ہے۔ اور علم سے مُراد فقط ظاہری علم ہی نہیں، بلکہ اس سے مراد علمِ ظاہر اور باطن دونوں۔ اور لوگوں میں سب سے بڑا عالم وہ ہے جو لوگوں

کے علم کو اپنے علم کے ساتھ جمع کر لیتا ہے۔ اور ہر صاحب علم اور علم کا بھو کا بھی۔ پس ہر فرد کو چاہیے کہ جہاں تک ہو سکے نوع انسانی کے علوم کے اکتساب میں کوتاہی نہ کرے اور علوم کلی کو بکثرت حاصل کرے۔ اور وہ علوم جو فقط اسی دُنیا سے تعلق رکھتے ہیں اور دیگر جزوی صنعتوں کو بھی انسانی ضرورتوں اور حاجتوں کے مطابق ضرور سیکھے۔ دُنیا کے نفع بخش اور آخرت میں فائدہ مند علوم کے حصول میں پوری طرح مصروف رہنا چاہیے اور وہ علوم معقول و منقول ہیں جو حکمت، عقائد، فقہ، تصوف، اخلاق، سلوک، حدیث اور تفسیر پہ مشتمل ہیں۔ تاکہ تم اپنی ذات میں فرق و جمع، تنزیہہ و تشبیہہ، امتیاز و اتحاد، خودداری و بے غرضی، غیرت و حمیت، انصاف، ادب آداب، بے تکلفی اور دیگر متضادات کمالات کے جامع بن جاؤ۔ فرق و امتیاز سے مراد تخفیف اور حفظ مراتب ہے۔ جمع و اتحاد حالتِ فنا اور مشاہدۂ ذات ہے۔ تنزیہہ ذات کا اضافات سے معرا ہونا ہے۔ اور تشبیہہ ذات کا مع کمالات کے مشاہدہ کرنا ہے اور خودداری سے مراد اپنے مرتبے کا پاس و احساس ہے جو دیگر مراتب کی طرح بقا باللہ کا نتیجہ ہے اور بے نفسی دیگر اعتبارات کی طرح خود کو بے اعتبار سمجھنا جو فنا فی اللہ کا ماحصل ہے۔ حمیت سے مُراد غیرتِ دین ہے جو ایمانی قوت اور غلبے کی راہ سے آتی ہے۔ انصاف سے مراد حقیقت بینی کے باعث حاصل ہونے والی حق شناسی ہے اور علم و عرفان کی مقتضی ہوتی ہے۔ آداب سے مُراد حُسن اخلاق ہے جو آدمیت کے سزاوار ہے۔ بے تکلف کے معنی تصنع سے پاک صفائیٔ قلب ہے جو محبت کی اک شاخ ہے اور اسی قسم کے دیگر متضاد امور کو اعتدال کی حد تک حاصل کرنا چاہیے اور حد اعتدال سے آگے یا پیچھے تجاوز نہ کیا جائے۔ اصلاح حال کا اسی میں کمال ہے۔ اور ہر امر میں کمی یا بیشی اک وبال۔ تیرا ہر قول اور فعل وقت اور مرتبے کے مطابق و موافق ہونا چاہیے۔ کیونکہ داناؤں نے کہا ہے کہ ہر بات کے کہنے اور ہر نکتے کو بیان کرنے کا اک وقت اور اک موقع محل ہوتا ہے۔ یعنی ہر قول و فعل میں اپنے مرتبے اور پھر جس سے معاملہ کیا جائے اُس کے مرتبے کا پاس و لحاظ بھی رکھا جائے۔ وقت اور جگہ کو بھی ملحوظ خاطر رکھنا چاہیے کہ تمام شرعی احکام کا دار و مدار اسی پہ ہے۔ حاصل مطلب یہ کہ بے سوچے سمجھے اور غفلت سے کوئی حرکت نہیں کرنی چاہیے اور ہر وقت اپنی اور دوسروں کی اصلاح اور دین محمدیؐ کی خدمت گزاری مدِنظر ہونی چاہیے تو پھر اس صورت میں اس مصرع کے بمصداق سالک کو جو کچھ بھی پیش آئے گا اس میں اس کی بہتری ہی ہوگی۔ جب تیری نیت صاف

ہے اور محض رضائے الٰہی کے لیے ہے تو پھر نیکی ہی نیکی ہے۔ کیونکہ اعمال کا فیصلہ نیتوں پر ہوتا ہے
لیکن ایسا مجموعہ اضداد شخص شاذ و نادر ہی ملتا ہے۔ فقط اس وقت جب تم خالصتہً امر حق میں مصروف
ہو جاؤ اور ہوا و ہوس کے شائبے تک سے بھی پاک صاف ہو جاؤ، اور نیک نیتی سے کام کرنے
میں مشغول ہو جاؤ تو وہ سب کچھ تمھارے حق میں سراپا خیر اور نیکی ہی ہوگی۔ گو کہ کج فہموں اور طعنہ
زنی کرنے والوں کے حق میں شرؔ اور بدی ہوگی۔ نیت نیک ہونی چاہیے، کیونکہ حدیث پیغمبرؐ کے
مطابق عمل کے درست ہونے کا انحصار نیت ہی پر ہے۔ ایسا دیدہ ور انسان آئے دن پیدا نہیں
ہوتا۔ اور اگر قسمت اور نصیبے کی یاوری سے ایسے جامع اور معتدل انسان کی صحبت میسر آجائے تو
موقع کو غنیمت سمجھتے ہوئے اس کی خدمت میں ضرور ہونا چاہیے۔ کیونکہ وہ سُرخ گندھک سے
بھی زیادہ قیمتی اور نایاب ہے۔

ہر عمل کی نیت کی حقیقت کی پہچان اور بھلائی اور فساد کی دریافت کا فائدہ

اکثر ناسمجھ یہی سمجھتے ہیں کہ نیت کرنا اپنے اختیار ہی میں ہے۔ چنانچہ عالمانِ سُو (بُرے علما)
جو اکثر و بیشتر لالچی مُلّا ہوتے ہیں۔ امیروں اور دولت مندوں کو یہ فتویٰ دیتے ہیں کہ تم فلاں کام جو
کر رہے ہو تو اس میں اس نیک نیت کو منظور نظر رکھو تاکہ ثواب بھی حاصل ہو جائے۔ حالانکہ کسی
کام کی نیت کرنا یا نہ کرنا آدمی کے اپنے بس کی بات نہیں۔ اصل میں نیت یہ ہوتی ہے کہ انسان کسی
کام کے کرنے کی طرف بلا ارادہ اور بے اختیار مائل ہو جائے۔ لہٰذا اگر وہ خواہش حقیقتاً کسی نفسانی یا
شہوانی غرض سے پیدا ہو تو وہ عمل ظاہری صورت میں خواہ کتنا ہی بھلا کیوں نہ ہو سراسر شرؔ ہے اور
اسی آیت کریمہ کے زمرے میں آجاتا ہے کہ ان کے سب اعمال ضائع ہو گئے۔ اگر وہ خواہش بلا ارادہ
اللہ ہی کی طرف سے ہو، اور اس میں نیکی ہو، اور تمام نفسانی اور شہواتی داغوں سے پاک ہو تو ظاہراً
وہ فعل کتنا ہی بُرا کیوں نہ لگے، وہ فاعل کے لیے سراسر خیر ہے، اور قرآن پاک کی اس آیت کریمہ کے
زمرے میں آجاتا ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جن کی برائیوں کو خدا نیکیوں میں بدل دیتا ہے۔ یہاں کوئی کم
عقل یہ نہ سمجھ بیٹھے کہ گناہوں سے مراد یہاں گناہ کبیرہ ہیں۔ اللہ ایسی باتوں سے اپنی پناہ میں رکھے۔

کیونکہ کبیرہ گناہوں میں خیر کا کوئی احتمال نہیں۔ اسی لیے شرع نے اُنھیں قطعی طور پہ ممنوعات کہا ہے۔ بلکہ گناہ کبیرہ کی تعریف اُنھوں نے یوں بھی کی ہے کہ ان کی سزا میں شرعی حد وارد ہو جاتی ہے۔ اور ان سے بڑی سختی سے منع کیا گیا ہے۔ اور کہا جاتا ہے گناہ کبیرہ وہ ہے جو کہ خالصتہً حرام ہے جس پر نص کے ذریعے سزا مقرر کی گئی ہے جو دُنیا اور آخرت میں ہلاکت کا باعث ہے۔ گناہان کبیرہ کے تعین کرنے میں بہت اختلافات ہیں۔ ان میں بعض پہ سبھی کا متفقہ فیصلہ ہے اور بعض میں اختلاف ہے۔ لہذا سیئات سے مراد وہ خطائیں ہیں جو سہواً یا نیک نیتی ہی سے سرزد ہو جائیں جیسے کوئی اجتہادی غلطی کہ اُس میں خطا کرنے والا مجتہد بھی ثواب پا لیتا ہے۔ اور اگر روزے کی حالت میں سہواً کوئی آدمی کوئی چیز کھا جائے تو روزہ ٹوٹتا نہیں۔ اُسے اللہ کی طرف سے ضیافت خیال کیا جاتا ہے۔ اسی پر قیاس کرتے ہوئے اگر سالک سے نیک نیتی ہی سے کوئی چھوٹی موٹی خطا سرزد ہو جائے تو وہ اس کے باطن پر خلل انداز نہیں ہوتی۔ بلکہ بعض اوقات تو اُس زہد و تقویٰ کی نسبت مفید ثابت ہوتی ہے جو خودی، غرور و تکبر اور انا کی بنا پر کیا جائے۔ لہذا حضور سرورِ کائنات صلعم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ تمھاری شکلوں اور تمھارے عملوں کو نہیں دیکھتا بلکہ وہ تمھارے دلوں اور تمھاری نیّتوں کو دیکھتا ہے[۵]۔ الغرض ہر کام کی نیت دل میں خود بخود بلا ارادہ پیدا ہوتی ہے۔ اور اس سلسلے میں ہر بندے کا اپنے مولا سے معاملہ ہے۔ کسی دوسرے کو اس میں کیا عمل دخل، اور نیت میں تصنّع یا تکلّف کے کیا معنی؟ قرآن کا واضح فرمان ہے کہ تم بری ہو اُس سے جو میں کرتا ہوں، اور میں بری ہوں اس سے جو تم کرتے ہو[۵]۔ اور نیت کی اصلیت اور اس کی دیگر شاخوں اور جزوں کا مفصل بیان ترک اسباب و مراعات کے باب میں آئے گا جس کا عنوان شفا اللناس ہے۔ وہاں اُسے خوب مفصل اور مدلل انداز میں لکھا گیا ہے۔ لیکن چونکہ مذکورہ بالا متن میں متضاد کمالات کی جامعیت کا تذکرہ تھا اس کے مناسب حال ایک رباعی بھی ذہن میں آ گئی۔ ترجمہ رباعی ہمارے عجز میں بھی کبریائی سے مکمل موافقت ہے اور فقر کے لباس میں غنا بھی ہے۔ اے دردؔ ہم درویش لوگ اکسیر کی مانند اگرچہ خاک ہیں مگر کیمیا بھی ہیں[۵]۔ مصنف کی اپنی لفظی تشریحات و مرادات یوں ہیں۔ حق بات یہ ہے کہ فقر و درویشی کے شایانِ شان گزر بسر کا یہی طریقہ ہے کہ عجز و کبریائی اور فقر و غنا کو اپنی ذات میں بہم سمو لیا جائے۔ یعنی غریبوں اور صاف باطن لوگوں کے سامنے سراپا عجز و نیاز ہونا چاہیے بموجب اس آیت کریمہ کے کہ مومنوں کے

لیے اپنے پروں کو بڑی مسکنت سے پھیلاؤ[۵] اور اہل نفاق اور متموّل حضرات کے سامنے لباس فقر کو رسوا نہیں کرنا چاہیے کیونکہ متکبر کے ساتھ تکبر کرنا بھی اک صدقہ ہے۔[۵] اور حاجت مندی اور مفلسی کی حالت میں بھی استغنا اور بے نیازی ہی اختیار کرنی چاہیے، اور فقر و فاقہ کا دفیعہ یومیہ مزدوری اور دیگر اجرتوں سے نہیں کرنا چاہیے۔ اکسیر کی طرح اپنے حق میں خاک ہو جانا چاہیے یعنی کسی قسم کا مالی یا دنیاوی نفع حاصل کیے بغیر دوسروں کو فائدہ پہنچانا چاہیے۔ بھلے وہی مومن ہیں جو دوسروں کو نفع پہنچاتے ہیں۔[۵]

هوالنّاصح

شروع اللہ کے نام سے جو نہایت مہربان اور بہت رحم والا ہے

ہر قسم کی تعریف اللہ کے لیے ہے جس نے عارفین کے دلوں پر غیب کے اسرار کو کھولا اور بلاشبہ برکات کے دروازے ان پر وا کیے اور درود و سلام ہو اس کے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر جو جوانوں اور بوڑھوں کے سردار ہیں، اور آپؐ کی آل پر، اور ہر قسم کے نقص اور عیب سے پاک صحابہؓ پر۔

امابعد پس یہ پندرھواں باب ہے جس کا نام مفاتح الغیب (غیب کی چابیاں) ہے۔ اور المفاتح مفتاح کی جمع ہے۔ یہ اسمِ آلہ ہے فتح سے، اور اس کا استعمال یا تو ہوتا ہے مادیات محسوسہ میں جیسے دروازہ کھولنا، قفل کھولنا، یا ہوتا ہے امورِ مکنونہ، معقولہ اور مشہودہ میں، جیسے اللہ تعالیٰ کے اس قول میں "اے اللہ کھول دے ہمارے درمیان اور ہماری قوم کے درمیان" یعنی اٹھا دے پردہ ہمارے اور ہماری قوم کے درمیان میں سے تاکہ عیاں ہو جائے ان پر وہ چیز جو حق ہے۔ لفظ غیب کا استعمال چھپے ہوئے اور خفیہ معاملات پر ہوتا ہے۔ جیسے تیرا یہ کہنا کہ سورج غروب ہو گیا یعنی پردے میں چلا گیا۔ پس یہاں مفاتح الغیب سے مراد وہ عالم ہے جسے مناسبت ہوتی ہے دونوں مرتبوں سے شہادت اور ارواح کے اور وہ عالم مثال ہے۔ پس صورت اور شکل کی مناسبت سے اور مشابہ ہے شہادت سے، اور معنی اور لطافت کے لحاظ سے مناسبت رکھتا ہے ارواح سے، اور اس میں عجائب و غرائب ہیں جن کی گنتی اور احاطہ نہیں کیا جا سکتا۔ اور اس کے پاس مفاتح الغیب ہیں جنھیں نہیں

جانتا کوئی مگر وہی ہے[۵]

عالم مثال کے بیان کا باب

عالم مثال کے بیان سے ہمارا مقصد صوفیا اور حکما کے فرمودات کے مطابق اس دُنیا کی حقیقت کا اظہار کرنا ہے۔ اس مسئلے کے سلسلے میں ہم نے اپنی طرف سے کوئی بات نہیں لکھی، دوسروں کے اقوال ہی بیان کیے گئے ہیں۔ جیساکہ تجدد امثال کے مسئلے میں بھی ہم نے متن میں اپنی طرف سے کچھ نہیں لکھا صرف دوسروں کے مقولوں پر ہی اکتفا کی ہے۔ لیکن چونکہ مختصر سی تشریح میں بہت سے مطالب کی تفصیل درکار ہے۔ وہاں جو کچھ ہمارے ذہن میں واضح اور صاف طور پر آیا اُسے بھی کسی حد تک لکھ دیا، اور یہاں بھی۔ دوسروں نے بھی عالم مثال کے بارے میں بہت کچھ لکھا ہے۔ مجھ ناچیز اور ہیچ مدان پر حق تعالیٰ نے اس عالم مثال کی کیفیات کے جو حقائق اور دقائق کشف فرمائے یا اپنی ہدایت اور عنایت سے جن اسرار کو مجھ پر کھولا ہے۔ دوسروں کے اقوال کے دوران اُنھیں بھی بیان کر دیا۔ اور ان امور کی حقانیت کی صحیح جانچ پڑتال اور تحقیقات کے انکشاف پر توجہ مبذول کی۔ لہٰذا اسی بنا پر کہا جاتا ہے کہ یہ بات سمجھ لی جائے کہ مثال کے لغوی معنی مانند اور جسیم ہیں، اور اصطلاح میں عالم مثال عبارت ہے اس عالمِ لطیف سے جو عالم ارواح اور عالم شہادت کے درمیان اک واسطہ ہے جیسا کہ اُس کا بیان آ رہا ہے۔ اور عالم مثال کا وجود بھی عالم شہادت کی طرح تعینات میں سے ہے جس کے اثبات کے لیے کسی دلیل کی حاجت نہیں، کیونکہ ہر شخص نیند کی حالت میں خواب یا کوئی چیز دیکھتا ہے، اور جو کچھ دیکھتا ہے اس عالم سے الگ ہے۔ پس ظاہر ہے کہ اس عالم کے علاوہ بھی اس عالم سے ملتے جلتے عالم ہیں اور انسانوں کو اس عالم کا انکشاف بھی ہو جاتا ہے۔ جس طرح عوام کو نیند کی حالت میں ظاہری حواس سے چھٹکارا مل جاتا ہے اور اس عالم کا انکشاف ہوتا ہے۔ اسی طرح خواص کو بعض اوقات بیداری کی حالت میں بھی بالائی طرف مکمل توجہ کی وجہ سے اس دُنیا سے کوئی التفات نہیں رہ جاتا۔ اور ظاہری حواس سے بھی وہ چھٹکارا پا لیتے ہیں۔ اور اس دُنیا کے عجائب مشاہدے میں آجاتے ہیں۔ چنانچہ بزرگوں نے کہا ہے کہ نیند کے بغیر بھی عارف کا یہ حال ہو جاتا ہے[۵] یہ بات سمجھ لیں کہ ایک مِثل (”م“ تلے زیر اور ”ث“ ساکن ہے۔ اور اُس کا مطلب ہے ایک

چیز کی دوسری سے ظاہری و باطنی مشابہت جیسے کہ انسانی افراد کو آپس میں ہوتی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ بھی قرآن پاک میں فرماتا ہے کہ اے رسول کہہ دو کہ میں تمھاری طرح ایک بشر ہوں، اور کسی موجود کو حق تعالیٰ سے یہ مماثلت نہیں ہو سکتی، کیونکہ وہ کسی شے کی مانند نہیں ہے۔ اور ایک مثل ہے جس میں "م اور ث" دونوں پہ زبر ہے اور اس کا مطلب ہے باطنی مناسبت جس میں صوری مشابہت نہیں ہوتی۔ جیسا کہ آپ کسی بہادر اور شجاع آدمی کو شیر سے نسبت دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ زید تو شیر ہے۔ اور اس لفظ مثل کا اطلاق جناب الٰہی پہ بھی جائز ہے۔ اور اللہ ہی کے واسطے ہیں اعلیٰ نسبتیں اور مثالیں۔ اور ایک ہے لفظ مثال۔ اس میں غالب صوری مشابہت ہے جو مانند یا جسم کے معنوں میں آئے۔ اور تمثال تصویر کو کہتے ہیں۔ لہٰذا عالم مثال عبارت ہے اس عالم شہادت کے علاوہ کسی اور عالم صورت سے۔ اور اس عالم میں جس طرح ان مادی صورتوں کی مماثل صورتیں حاصل ہوتی ہیں۔ اسی طرح معانی مجردہ بھی ان ظاہری اشکال کی مناسبت سے ظاہر ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا علما نے خواب میں حق تعالیٰ کے دیدار کو بھی جائز قرار دیا ہے۔ اگر کوئی آدمی خواب میں شیر دیکھے تو اس کی تعبیر علم سے کرتے ہیں اور جو پانی دیکھے اس کی تعبیر باطنی صفائی بتاتے ہیں۔ قصہ کوتاہ یہ کہ اس عالم مثال کے تین مراتب ہیں۔ ایک مرتبۂ ادنیٰ اور وہ ہیں اشکال جو آئینے اور پانی جیسی صاف شفاف چیزوں میں نظر آتی ہیں، انھیں بصری حواس سے بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ اس مثال کے ظہور میں مشابہ کا روبرو ہونا شرط ہے۔ اور موجود اشیا کی ظاہری شکل و صورت کے بغیر مقابلہ نہیں ہو سکتا۔ عالم مثال کا دوسرا مرتبہ وسطی ہے اور وہ ایسے امور اور ایسی صورتیں ہیں جو خواب میں ہر خاص و عام کو نظر آجاتی ہیں، اور ان کے حواس اور قوت متخیلہ میں بھی آجاتی ہیں۔ اس عالم میں شکلوں کے علاوہ بھی دیکھا گیا ہے۔ مثالی اور حسی باتیں جو مشاہدہ میں نہیں آتیں اور معاملے کے چہرے سے نقاب نہیں اٹھتا خواہ جیسے دیکھا یا پایا ہو ویسے ہی نظر آئے اور سمجھ میں آئے۔ خواہ قوت متصرفہ کے باعث اس میں تغیر و تبدل ظاہر ہو۔ لیکن جنس یا قسم کے لحاظ سے وہ چیز عالم شہادت میں اس دیکھنے والے کی نظر سے نہیں گزرتی اور نہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کی کونسی حس میں آئی خواہ اس کی شکل و صورت علیحدہ قسم کی ہو۔ اس عالم میں اس کی تطابقت شرط نہیں۔ اور وہ پریشان خوابوں کی اک قسم ہے، اور ان پہ بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔ تیسرا مرتبہ اعلیٰ امثال کا ہے۔ جس میں قوت متخیلہ کی شراکت کے بغیر ہی انسانی نفس پہ شکل و صورت کا انکشاف ہوتا ہے خواہ اس عالم کی مادی صورتوں کا

انکشاف ہو، خواہ مفرد معانی کسی مناسب صورت میں ظاہر ہوں، ایک برابر ہے۔ اس عالم میں مکمل تطابق لازمی ہے۔ اس میں ماضی و حال و مستقبل کے زمانوں کی قید نہیں۔ کیونکہ نفس کو ماضی و مستقبل کے تمام امور کا علم حاصل ہے۔ جس طرح سچے خوابوں اور صحیح کشف میں صورتِ حال ہوتی ہے کہ انہی کے مطابق خارج میں آثار ظہور پذیر ہو جاتے ہیں۔ اور گزشتہ امور کا بھی جیسے وہ تھے پتہ چل جاتا ہے یا آنے والے واقعات کا اُن کے وقوع سے پہلے ہی علم ہو جاتا ہے، اگر کوئی شوخ مزاج اور ملحد وضع کا نادان شوخی و گستاخی سے یہ کہہ دے کہ خواب میں انزال کی صورت میں بھی تو اثر کا خارجی ظہور ہوتا ہے تو کیا وہ بھی سچے خوابوں میں شمار ہوگا۔ اُسے یہ جواب دینا چاہیے کہ اے کم عقل بے ادب یہ تو سارا تیرے اپنے تخیل کا معاملہ ہے کہ اُس خیالی صورت سے تیرا وحشی نفس متاثر اور اثر پذیر ہوتا ہے۔ چونکہ تیرا حیوانی نفس تیرے تمام رگ و پے میں سمایا ہوا ہے تو اسی تاثر کی لذت سے منی کے اجزا تیرے بدن سے الگ ہو کر خارج ہوتے ہیں۔ اس خواب کے اثر کا ظہور محض تیرے بدن میں ہوا۔ سچے خوابوں اور صحیح کشف کے آثار تو دُنیا بھر میں پائے جاتے ہیں۔ ترجمہ رُباعی اے کہ تو نے خواب میں سینکڑوں مناظر دیکھے۔ باغ، خیاباں، باغ کی روشیں، بہار اور طرح طرح کے پھول دیکھے۔ یہ تیرے عالمِ مثال کا کارنامہ ہے کہ یہ سب کچھ جو تیرے اندر پنہاں تھا اس کا تجھ پہ ظاہری انکشاف کر دیا[۵]۔ مصنف خود مختصر سے اشارات یوں دیتا ہے کہ خواب میں جو طرح طرح کے مناظر دیکھے جاتے ہیں۔ یعنی باغ، بہار، چمن، گلستان اور دیگر امور کا سیر تماشا جو اس خواب کی حالت میں میسر آتا ہے وہ سب کا سب اس دیکھنے والے کے عالمِ مثال کا عکس ہے جو اُس پہ ظاہر ہو گیا۔ کیونکہ ہر انسان اپنی ذات میں عالمِ ارواح، عالمِ شہادت و عالمِ مثال کا جامع ہے۔ لہذا یہ عالم درحقیقت اس کے اپنے اندر ہی پوشیدہ تھا جو اس پہ ہویدا ہو گیا، اور عالمِ مثال کا اُس پہ انکشاف ہو گیا۔ حکما اپنی اصطلاح میں عالمِ مثال کو عالمِ نفوس منطبعہ کہتے ہیں۔ اور وہ فی الحقیقت خیال عالم ہے۔ اور اشراقی (مراقبہ و مکاشفہ سے تزکیۂ نفس کرنے والا گروہ) اُسے آٹھویں ولایت اور عالمِ اشیا (یعنی عالمِ اجسام) کہتے ہیں۔ مشائی حکماجن کے مطالب کی بنیاد دلائل و براہین پہ ہے وہ منقوش عالمِ ارواح ہی کو عالمِ مثال کہتے ہیں۔ کیونکہ منقوش روح ان کے نزدیک ایک مادی قوت ہے جو اجرامِ فلک میں چھپی ہوئی ہے اور صورتوں کے عکس لینے کی جگہ ہے جیسا کہ خیال ایک قوت ہے جو انسانی دماغ میں چھپی ہوتی

ہے۔ افلاک کی جمعیت کے اعتبار سے اُنھیں منقوش ارواح کہا گیا ہے۔ اور اسے دراصل خیال عالم سمجھتے ہیں جو انسان کبیر ہے۔ مجھ ناچیز کا کہنا یہ ہے کہ عالم مثال کو افلاکی منقوش روحوں یا سماوی عالم ہی پر منحصر نہ سمجھا جائے، کیونکہ یہ عالم تمام جانداروں پر منکشف ہوتا ہے۔ اور یہ مثالی صورتیں تختی پر کسی نقش یا آئینے میں عکس کی طرح اجرام فلکی پہ منقش یا منعکس نہیں کہ اہلِ کشف کو حالتِ انکشاف میں نظر آئیں۔ بلکہ حکما منقوش ارواح کو بمنزلہ متخیلہ سمجھتے ہیں اور انسان کبیر کا خیال گردانتے ہیں۔ اور وہی صاحبِ خیال انسان اپنے خیال سے مطلع ہو جاتا ہے۔ یہ نہیں کہ کسی کی وہ خیالی تصاویر کسی دوسرے پہ ظاہر ہو جاتی ہیں، بلکہ افلاکی ارواح کی کوئی تخصیص نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ہر ذی روح میں یہ عالم ودیعت کر رکھا ہے۔ اور اُس روح پر اُسی کا اپنا عالمِ مثال منکشف ہو جاتا ہے۔ چونکہ افلاک میں ارواح ہوتی ہیں ان میں بھی عالمِ مثال ہے اور ان کے منقوش ارواح میں جلوہ گر ہیں۔ اس عالم حسّی کے علاوہ عالمِ مثال وہ ہے جو جانداروں پہ ظاہر ہو جاتا ہے، اور جس میں انسان کبیر اور عالم صغیر سبھی شامل ہیں۔ اور اشراقی حکما جن کے انکشافات کی بنیاد کشف و مراقبہ و مشاہدہ پہ ہے اور جنھیں دلیل و برہان سے کوئی تعلق نہیں ہوتا، اپنی اصطلاح میں عالم مثال کو آٹھویں ولایت اور عالم اجسام کہتے ہیں۔ یعنی جس طرح یہ ساتویں ولایت ہے، وہ آٹھویں ولایت ہے اور شبح کے معنی جسم یا کالبد کے ہیں اور اشباح اس کی جمع ہے۔ اور ملا سعد الدین تفتازانی نے اپنی تالیف شرح مقاصد میں انہی سے نقل کیا ہے کہ قدیم لوگوں نے کہا بے شک وجود میں عالم مقداری ہے عالم حسّی نہیں ہے کہ جس کے عجائب ختم ہونے کو نہیں آتے، اور نہ اُس کے مدائن (شہروں) کا احاطہ ہو سکتا ہے۔ پس اسی پہ اُنھوں نے بنا رکھی ہے جسمانی معاد کے معاملے کی۔ پس مثالی بدن وہ ہے کہ جس میں تصرف کرتا ہے نفس اپنے حکم کا، یعنی حکم بدنِ حسی اس بارے میں کہ اُسے حاصل ہوتے ہیں تمام حواس ظاہر اور باطن، پس وہ لذت لیتا ہے اور تکلیف اُٹھاتا ہے۔ ملا سعد الدین تفتازانی اپنی کتاب شرح مقاصد میں اشراقی حکما سے نقل کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ اگلے حکما نے وجود کے سلسلے میں اپنی تحقیق میں کہا ہے کہ وجود تمام عالموں پر محیط ہے۔ اس حسّی اور مادی عالم سے الگ ایک مقداری عالم ہے۔ وہ علیحدہ دُنیا ہے اور عالمِ شہادت کی مانند مقداری ہے۔ عالم ارواح کی طرح غیر مقداری نہیں۔ یعنی اس کی مثالی صورت موجود ہے، اور مراد اس عالمِ مثال سے ہے جس کے عجائبات کی کوئی انتہا نہیں۔ اور اُس کے شہر ان گنت

ہیں - کیونکہ اس حسی عالم کی تمام اشیا اس عالم میں پائی جاتی ہیں ، اور ان کے علاوہ بے حد و حساب اور بے شمار عجیب و غریب چیزیں رکھتا ہے اور ان کی باہمی ترکیب یا کسی شے کی کمی بیشی کی وجہ سے مختلف شکلوں کی کثیر تعداد پیدا کرتا ہے جن کی کوئی حد اور انتہا نہیں - اور صرفی معانی کے لحاظ سے بھی اس عالم میں ایک صورت اپنی متناسب صورت میں مل جاتی ہے جیساکہ خواب میں اگر کوئی دودھ دیکھے تو اس سے مراد علم لی جاتی ہے جو اس عالم میں اس صورت میں نمودار ہو ، اور پانی کی شکل کو صفائی باطن سے تعبیر کرتے ہیں - اور حدیث میں آیا ہے کہ جو آدمی ہر رات سورہ ملک کی تلاوت کرے تو یہ سورت قبر میں ایک اڑنے والے پرندے کی صورت میں اپنے پڑھنے والے کو اپنے پروں کی پناہ میں لے کر قبر کے عذاب سے بچائے رکھے گی - قبر موت اور قیامت کی درمیانی مدت کا نام ہے نہ کہ قبر اس جگہ کا نام ہے جہاں لحد ہو ، کیونکہ اس صورت میں تو جو لوگ مرنے کے بعد دفن نہیں ہوتے اُنھیں قبر کا عذاب و ثواب ہوگا ہی نہیں اور ایسا نہیں ہے ، بلکہ ہر مرنے والے کو قبر کے معاملات پیش آتے ہیں ، اور حکما آخرت میں ہونے والے جسمانی عذاب و ثواب کو اس مثالی بدن سے متعلق سمجھتے ہیں اور اربعہ عناصر کے اس خاکی جسد کے اُٹھنے کے مُنکر ہیں جس کی انبیاء علیہ السلام نے خبر دی ہے - اور بعض فلسفی مشرب صوفیا بھی اسی امر کے قائل ہیں اور حکما سے متفق ہیں ، اور حشر و نشر پر دلالت کرنے والی آیات قرآنی اور احادیث نبوی کی مختلف تاویلیں کرتے ہوئے اسی مثالی بدن پر لے آتے ہیں - اور سارے ظاہری اور باطنی حواس کا اثبات حکما اور ان کے مقلدین کی طرح اسی بدن مثالی ہی پہ کرتے ہیں - اُن کا کہنا ہے کہ روح اس مثالی بدن کے تصرف سے بھی عنصری بدن کی مانند غم و خوشی کی لذت کا ادراک کرتی ہے لہذا خواب میں اسی بدن مثالی کی وساطت سے لذت حاصل کرتی ہے یا رنج و الم محسوس کرتی ہے -

مثالی اور عنصری بدن اور عالم برزخ اور آخرت کے معاملات کی تحقیق

جو کچھ اللہ اور اُس کے رسول ؐ نے فرمایا ہے وہی حق بات ہے - موت کے بعد پھر اُٹھنا برحق اور قیامت کے دن اربعہ عناصر کے مرکب ان اجسام کا حشر نشر اک حقیقی امر ہے - بدن مثالی سے بھی معاملات ہوتے ہیں اور اس بدن مثالی میں بھی عنصری بدن کی طرح روح اپنا تصرف جمالیتی ہے

اور رنج وخوشی کی لذت حاصل کرتی ہے۔ لہٰذا قبر میں تو معاملہ مثالی بدن سے متعلق بتلاتے ہیں اور قبر کا عذاب وثواب بھی اسی مثالی بدن سے متعلق ہے۔ اور یہ عنصری بدن وہاں نہیں، لیکن اس بدنِ عنصری کے تمام آثار واحکام کلیتہً بدن مثالی پہ مرتب ہوتے ہیں اور کوئی فرق معلوم نہیں ہوتا جیسا کہ خواب کی حالت میں دیکھنے والے کی نظر میں وہ عالم خواب اسی عالم کی طرح ہوتا ہے اور کوئی فرق نہیں ہوتا۔ اور صرف بیدار ہونے پر اس دُنیا اور اُس دُنیا کا فرق معلوم ہوتا ہے اور قیامت کے دن جو مردوں کے اُٹھنے کا دن ہے۔ یہ عنصری بدن پھر اسی طرح اُٹھے گا۔ اور جس طرح معاملہ اس عنصری بدن سے ہے وہاں بھی اسی ڈھنگ پہ اسی عنصری بدن سے سارا معاملہ ہوگا۔ اور اللہ تعالیٰ اس بات پر پوری قدرت رکھتا ہے، جس طرح یہاں پیدا کیا ہے وہاں بھی جسموں کو دوبارہ کھڑا کردے گا۔ اس گوشت پوست کی جو یہاں ہے وہاں کوئی ضرورت نہیں کہ یہ تو اب بھی، کسی لمحے میں بھی، ایک انداز پہ نہیں رہتا۔ اور ہر آدمی کچھ عرصے بعد اپنے اندر زبردست تبدیلیاں پاتا ہے۔ لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ اب کوئی دوسرا آدمی ہے، اور وہ پہلے والا کوئی اور آدمی تھا۔ اور اگلی ملاقاتوں میں اس شخص کا امتیاز نہیں کیا جائے گا، بلکہ ہر وقت وہی آدمی، وہی روح اور وہی جسم ہے۔ اور لین دین کے جو معاملات اُسے لوگوں سے یا لوگوں کو اُس سے درپیش تھے اسی طرح برقرار ہیں۔ وہ ایک دنیا سے دوسری دُنیا میں نہیں گیا۔ نہ وہ عالم شہادت سے عالم مثال کو منتقل ہوا ہے۔ وہ جیسا تھا ویسا ہی ہے۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ لہٰذا اسی طرح قیامت میں بھی وہ اسی روح اور اسی جسم کے ساتھ ہوگا۔ اور ہر کوئی اپنے بُرے یا بھلے اعمال کی سزا یا جزا بھگتے گا۔ جنتی جنت میں چلے جائیں گے اور دوزخی داصل بجہنم ہو جائیں گے اور خدا نے چاہا تو یہ ملاقاتیں اور صحبتیں بھی یونہی میسّر آتی رہیں گی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن سب کو اکٹھا کرے گا۔ اور احادیث پیغمبرؐ میں بدنوں کے بعینہٖ اسی طرح ہونے کی کوئی قید نہیں جیسے کہ وہ اب ہیں اور چگونہ و چندگی بھی کوئی شرط نہیں بلکہ ہیئت و کیفیت کا اختلاف، حسن و خوبصورتی یا بدصورتی و بدشکلی میں ایزادی اور حسب خواہش صورتوں سے متصّف ہونا اور زبردست تبدیلیوں کی بنا پر تغیر و تبدل کا ہونا، سب بوڑھے جوانوں کا پھر سے جوان ہونا اور سبھی لوگوں کے قد و قامت کا بڑھنا ثابت ہے۔ حدیث کے پڑھنے والوں سے کچھ بھی تو مخفی نہ ہوگا اور وہ بے دین اور ضعیف الاعتقاد لوگ جو جسمانی حشر و نشر کے منکر ہیں وہ کماحقہٗ حقیقت کی تہ کو

نہیں پہنچ سکے اور اپنی کم فہمی سے اس بدن کو عنصری بدن سمجھ بیٹھے اور اس بدن کو مثالی بدن سمجھ کر اس بدن مثالی کو اس عنصری بدن سے ممتاز کر دیا۔ یہ کہاں سے پتہ چلا کہ یہی عنصری بدن ہوگا۔ ہوسکتا ہے یہ بھی مثالی بدن ہی ہو۔ اور وہ بھی مثالی بدن ہو۔ اور یہ بھی روا ہے کہ یہ بھی عنصری بدن ہو اور وہ بھی۔ اور آثار و احکام سے جو کچھ ادھر مرتب ہوتا ہے وہاں بھی مرتب ہوتا ہے۔ ہر موسم اور وقت جو اس عالم میں نظر سے گزرا ہے اور ختم ہو چکا ہے وہ عالم خواب کی طرح یاد آتا ہے اور جو کچھ خواب میں دیکھا جاتا ہے بعینہٖ اسی عالم کی طرح ہے۔ پس معلوم ہوا کہ یہ فرق اور امتیاز جو ان شکوک و شبہات کا باعث بنا ہے۔ ان لادین اور کمزور ایمان والوں کے اپنے ہی توہمات سے پیدا ہوا ہے اور حق اور حقیقی بات صرف اتنی ہے جس کی خدا اور رسولؐ نے خبر دی ہے۔ یعنی جس طرح تم اب روح و بدن رکھتے ہو اس دنیا میں بھی یہی روح و بدن ہوگا اور اسی قسم کے معاملات در پیش ہوں گے اور جزا و سزا ہوگی۔ مثالی اور غیر مثالی بدن کی یہ حجت بازی اک بے فائدہ اور زائد سی بات ہے جس کا نتیجہ اچھا نہیں۔ ارسطو اثولوجیا میں لکھتا ہے کہ اس عالم سے پرے آسمان اور زمین اور سمندر، حیوان و نباتات اور آسمانی لوگ ہیں، اور ہر وہ چیز جو اس عالم میں ہے آسمانی ہے۔ وہاں کوئی چیز زمینی نہیں ہے اور روحانی لوگ جو وہاں ہیں وہ محبت رکھتے ہیں انسانوں سے اور ایک دوسرے سے نفرت نہیں کرتے اور ان میں سے کوئی بھی اپنے ساتھی سے اختلاف نہیں رکھتا۔ ایک دوسرے کی ضد نہیں ہوتے، بلکہ ان سے راحت پاتے ہیں۔ اثولوجیا یونانی زبان میں ایک رسالے کا نام ہے جسے ارسطو نے لکھا ہے اور اب اس کی عبارات کا عربی میں بھی ترجمہ ہوا ہے۔ لیکن نام وہی رہا ہے۔ چونکہ منطق کے اس اثولوجیا نامی رسالے کا نام تو یونانی ہے اور عبارت عربی ہے۔ اس میں لکھا ہے کہ اس عالم کے علاوہ بھی آسمان، زمین، سمندر، جانور، نباتات اور انسان ہیں جو آسمانی ہیں اور مُراد اس کی عالم مثال ہے۔ وہ کہتا ہے جو اس عالم میں رہتا ہے وہ آسمانی ہے۔ یعنی منقش ارواح میں منعکس ہے۔ وہاں زمین کی کوئی چیز نہیں، کیونکہ اس کائنات کی زمین بھی آسمان ہی ہے۔ وہ یہ بھی کہتا ہے کہ جو روحانی مخلوق وہاں بستی ہے، وہ انس و محبت کے لائق ہیں۔ وہ آپس میں نفرت نہیں کرتے۔ نہ ہی اپنے ساتھیوں یا ایک دوسرے کی نفی کرتے ہیں، نہ ہی اس کے خلاف کچھ کرتے ہیں بلکہ آرام و سکون سے رہتے ہیں۔ اس کا حاصل مطلب یہ ہے کہ یہاں جس طرح اجتماع ضدین نہیں ہوسکتا وہاں ایسا نہیں ہے

بلکہ اس عالم میں ضدیت تو رفع ہونے والی ہے، اور تمام مختلف امر ایک ہی جگہ جمع ہو سکتے ہیں ۔

نکتہ

مجھ احقر العباد کی سمجھ کے مطابق عالم مثال کی موجودات کو آسمانی کہنا بھی اک نامناسب سی بات ہے۔ خواہ عالم ارواح افلاک منقوش ہی سے کیوں نہ ہو ۔ کیونکہ جس طرح اس عالم میں کوئی چیز زمینی نہیں ۔ اسی طرح آسمانی بھی نہیں ۔ وہ دُنیا اور ہے اور یہ دُنیا بالکل اور ۔ مثال کے طور پر جو کچھ شیشے یا پانی میں منعکس ہوگا اور نظر آئے گا اس کے متعلق یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ چیز آہنی ہے یا آبی، بلکہ وہ تو ایک دوسرے عالم میں پیدا ہوئی ہے اور ایک الگ چیز ہے، اور وہ آئینہ اور پانی کسی دوسرے عالم میں موجود ہیں اور مختلف چیزیں ہیں ۔ اور ظاہری طور پر یہی نظر آتا ہے کہ اس عالم کے اربعہ عناصر سے مبرا ہونے کی بنا پر صرف اظہار لطافت کے لیے اس عالم کو مجازاً آسمان کہا گیا ہے ۔ وہاں گو آسمان ہے، حالانکہ آسمانی نہیں، وہاں کی زمین بھی گو ہے مگر زمینی نہیں ۔ اور اسی طرح تمام اشیا اور آثار و احکام پہ قیاس کیا جا سکتا ہے ۔ لہذا وہاں کی نفرت و تضاد اور انس و موافقت بھی ایسے ہی ہیں کہ کبھی تو نفرت کرنے والے تضادات آپس میں موانست بڑھا کر ایسے سست و ڈھیلے پڑ جاتے ہیں، جو آپس میں ایک دوسرے کی نفی نہیں کرتے اور باہم موانست و موافقت رکھنے والے ایک دوسرے کے منافی لگتے ہیں ۔ گویا حق سبحانہ تعالیٰ نے اس عالم کو کلی وسعت عطا کر رکھی ہے ۔ اور شیخ محی الدین اکبرؒ اپنی تصنیف فتوحاتِ مکیہ کے آٹھویں باب میں کہتا ہے کہ ہر نفس میں اللہ تعالیٰ نے پیدا کیے ہیں بہت سے عالم جو تسبیح بیان کرتے ہیں اللہ کی رات اور دن، اور اُس میں سستی نہیں کرتے ۔ اور اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا اپنے تمام عالموں سے ایک عالم ہماری صورتوں میں کہ جب اُسے دیکھتا ہے ایک عارف تو مشاہدہ کر لیتا ہے اپنے نفس کو، اُس کے اندر شیخ محی الدین اکبرؒ کے کلام کا ماحصل یہ ہے کہ انسان چونکہ تینوں عالموں یعنی عالم شہادت، عالم مثال اور عالم ارواح کا جامع ہے ۔ لہذا خدا نے ہر ذی رُوح میں عالم مثال پیدا کر رکھا ہے، اور اُس عالم میں بھی دیگر کائناتوں کی طرح مخلوق پیدا کی ہے جو دن رات خدا کی تسبیح و تقدیس کرتی ہے، اور اس میں ہرگز کوئی غفلت نہیں کرتی ۔ ظاہری طور پر تسبیح کرنے سے شیخ اکبرؒ کی مراد اللہ تعالیٰ کی پاکی و پاکیزگی پر دلالت کرتا ہے اور اس عالمِ مثال کے مرتبے سے مناسبت رکھتا ہے ۔ کیونکہ وہ عالم مثال عالم شہادت کی نسبت زیادہ لطیف و

نورانی ہے، ورنہ دُنیا میں جو کچھ ہے وہ اللہ تعالیٰ کی تسبیح و تقدیس کرتا ہی ہے۔ اس سلسلے میں اُس عالم کی تخصیص کیسی ؟ اور کوئی شے ایسی نہیں جو اس کی تسبیح و تحمید و تقدیس نہ کرتی ہو۔ اور کلمۂ لا یفترون (یعنی وہ جھوٹ نہیں کہتے) سے شیخ اکبرؒ کی مراد غالباً اس عالم کا ہر وقت مسلسل قیام ہے۔ کیونکہ ان کی تسبیح ان کی یہی اس لطیف وجود کے ساتھ موجودیت ہے جو حق تعالیٰ کی پاکی و پاکیزگی پر دلالت کرتی ہے اور تسبیح و تقدیس سے سُستی یا غفلت نہ کرنے کا مطلب بھی یہی ہے کہ ہر ذی روح میں ہر لحظہ وہ عالم موجود ہے نہ یہ کہ جب کبھی کشف و انکشاف ہو صرف اسی وقت موجود ہوتا ہے۔ لہٰذا جس وقت عارف باللہ پر اُس کائنات (عالم) کا کشف ہوتا ہے تو وہ اپنی مخصوص صورت کو بھی اس عالم میں اسی طرح دیکھتا ہے جیسے کہ اس عالم میں دیکھتا ہے۔ حاصل کلام یہ کہ صوفیا کہتے ہیں کہ عالم مثال کا مرتبہ عبارت ہے ان دنیوی اشیا کے ظہور سے جو مرکب ہیں اجزائے لطیف سے جو کسی قسم کی بانٹ، تقسیم، توڑ پھوڑ اور پھر سے باہمی جوڑ قبول نہیں کرتیں۔ صوفیا کے دنیوی اشیا کے ظہور کہنے کی غرض یہ ہے کہ اس دُنیا میں جتنے بھی مفردات یا مادیات کی صورت میں جو کچھ بھی ہے ان سب کو اس عالم میں ان کے مناسبِ حال صورت ملی ہوئی ہے، نہیں تو وہ اشیا کو مادی اشیا لکھتے، اور مرکبہ کے استعمال کا مطلب یہ ہے کہ ان میں ترکیبی صورت لازماً موجود ہے خواہ وہ اجزا سے مشابہ مفرد ہی کیوں نہ ہو اور لطیف کہنے سے مطلب ہے کہ اس عالم کے جسم اربعۂ عناصر سے مرکب کثیف نہیں ہیں، اور یہ تقسیم، بانٹ، توڑ پھوڑ اور جوڑ کے الفاظ اس لیے لائے گئے ہیں کہ یہ مادی اور ارضی امور کے لوازم ہیں۔

تدقیق

صوفیا نے اس عالم کے لیے جو شرائط بیان کی ہیں ان کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ صرف یہی کہہ دینا کافی تھا کہ جس طرح یہ عالم شہادت ہے۔ اسی طرح عالم مثال اک عالم ہے اور اشیا کے ظہور کا مقام ہے۔ کیونکہ اگر اشیا کے لیے دُنیا کی قید اس لیے ہے کہ حضرت واجب الوجود کے اس عالم میں صورت پذیر ہونے کا احتمال باقی نہ رہے تو یہ بالکل بے فائدہ ہے کیونکہ ذات واجب کو کسی عالم میں بھی تنزیہی اعتبار سے یہ اضافتیں اور نسبتیں دامن گیر نہیں، اور وہ یکتا و یگانہ ہے اور تشبیہی لحاظ سے کیا عالم شہادت کیا عالمِ مثال، اور کیا عالم ارواح اس ذات واجب الوجود کے سوا کچھ موجود نہیں اور ظاہری واجب کے

علاوہ کچھ نہیں کیونکہ امکانی معانی تو محض مفہومی ہیں اور لفظ مرکب کی شرط بھی بے فائدہ ہے۔ کیونکہ اسی عالم میں تو مفردات بھی اس انفرادی صورت میں ظاہر ہیں اور مرکبات اپنی مرکب صورت میں۔ پس اگر اجزا سے مشابہت رکھنے والے مفردات پہ مطلق طور پر اجزائے ترکیبی پہ ترکیب کا اطلاق کیا جائے اور مرکبات و مفردات میں مخالف اور متشابہ اجزا کا فرق نہ دکھایا جائے تو پھر کیا اس عالم میں یا اس عالم میں بھی مرکبات میں داخل ہیں اور لفظ "لطیفہ" کی قید بھی غیر ضروری ہے۔ کیونکہ کثیف اشیا اس عالم میں بھی اسی کثیف صورت میں ظاہر ہوتی ہیں ورنہ اس عالم کی لطیف و کثیف صورتوں میں امتیاز نہ رہے گا۔ سوائے اس کے کہ یوں کہا جائے کہ وہ عالم فی نفسہ اس عالم کی نسبت لطیف ہے تو ہم کہتے ہیں کہ یہ آپ نے کہاں سے لے لیا کہ یہ عالم اپنی ذات میں کثیف ہے، بلکہ دونوں عالم لطیف ہیں۔ اور ایک کے مظاہر صورتوں کے بعد وجود کی وجہ سے لطیف تر ہیں۔ اور یہ اعتباری لطافت و کثافت اس عالم میں بھی ہے اور اُس عالم میں بھی۔ کلی طور پہ کوئی عالم بھی کثیف نہیں۔ اس عالم کی بعض محسوسات بھی بعض کی نسبت زیادہ لطیف ہیں اور اُس عالم کی بعض مشہودات بھی بعض کی نسبت زیادہ کثیف ہیں، اور یہ شرط کہ اس عالم کی صورتیں توڑ پھوڑ اور جوڑ کو قبول نہیں کرتیں۔ یہ بیان بھی دوسری شرائط کے بیان کی طرح ہے کیونکہ جو توڑ پھوڑ اور جوڑ اس عالم کے لائق ہے وہاں بھی ہے۔ پس عقل سے کام لو۔ اور یہ عالمِ مثال یا برزخ عالم ارواح اور عالم اجسام کے درمیان اک واسطہ ہے۔ اور واسطہ اس چیز کو کہتے ہیں جو دو امور کی درمیانی کڑی ہو۔ پس یہ عالم مثال عالم ارواح (جو عالم مجردات ہے) اور عالم شہادت (جو مادیات کی دُنیا ہے) کا درمیانی واسطہ ہے۔ یعنی وہ عالم جو ان دونوں عالموں کے درمیان ہے۔ کیونکہ لطیف مرکبات کی یہ دنیوی اشیا جو بانٹ، بٹائی اور تقسیم قبول نہیں کرتیں اور جنھیں عالمِ مثال سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ گو ارواح کثیف ہیں مگر اجسام کی نسبت لطیف ہیں اور یہی ان کے توسط کے معانی ہیں کہ وہ نہ مادی اشیا کی طرح جسمانی کثافت رکھتی ہیں اور نہ ہی عالم مفردات کی طرح روحانی لطافت رکھتی ہیں، اور عالم مثال کا یہ نام رکھنے کی وجہ بھی یہی ہے کہ کہ عالم ارواح اور عالم اجسام کے ہر فرد کی اُس سے ملتی جلتی (مماثلت رکھنے والی) صورت اس عالم میں ہے۔ اور اس عالم کو عالمِ مثال کا نام اس لیے دیا گیا ہے کہ اس عالم میں ارواح کی جو صورت سے معرّا ہوتی ہیں، اُنھیں بھی ان سے متناسب صورت مل جاتی ہے، اور اجسام کو بھی ان سے مماثلت رکھنے والی صورت مل جاتی ہے، سوائے ان غیر متحرک صورتوں اور آثار و احکام کے۔ علما کا ایک گروہ اُسے

عالم خیال کہتا ہے۔ کیونکہ ان کا ادراک قوتِ متخیلہ ہی کرتی ہے۔ اس مقولے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس گروہ کے نزدیک عالم مثال یہی عالم خیال ہی ہے جو قوتِ متخیلہ میں جلوہ افروز ہے۔ اگرچہ عالم خیال ہی عالمِ مثال میں داخل ہے لیکن وہ اس کے علاوہ بھی ہے جسے ہم کھُل کر تفصیل سے بیان کرتے ہیں۔ لہذا عالم مثال عالم خیال سے عام ہے جو قوتِ متخیلہ ہی سے مختص نہیں۔ اور دوسرے عارف جو محقق صوفیا بھی ہیں، وہ بھی اس کو صرف عالم خیال ہی سمجھتے ہیں۔ اس کی طویل تفصیل ہے۔ اور یہ فقط تخیّل ہی سے متعلق نہیں۔ ان کے نزدیک مثالی صورتوں کی مجموعی طور پر دو قسمیں ہیں۔ ان میں سے بعض اس قسم کی ہیں جن کے ادراک کے لیے قوتِ متخیلہ کی شرط ہے۔ اُسے خیالِ متصل کہتے ہیں۔ چنانچہ وہ صورتیں بھی جو خواب میں نظر آتی ہیں، اور ان میں بعض ایسی ہوتی ہیں جن کے ادراک میں انسانی قوتِ متخیلہ شرط نہیں، بلکہ ان کا ادراک دیکھنے کی قوت سے بھی کیا جا سکتا ہے۔ جیسے کہ وہ صورتیں جو آئینے میں صاف شفاف چیزوں میں نظر آتی ہیں، اور ان کو خیال منفصل (الگ۔ علیحدہ) کہتے ہیں۔ کیونکہ وہ انسانی قوتِ متخیلہ سے الگ بذاتِ خود بھی موجود ہیں۔ لیکن اگر خوب گہری نظر سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ ہر چند کہ اس گروہ کے جن لوگوں نے عالم مثال کو صرف عالمِ خیال سمجھا ہے اُنھوں نے بڑی تفصیل سے کام لیا ہے، اور وہ اسے محض خیال ہی نہیں سمجھتے، بصری حِسّ سے بھی اس کے ادراک کے قائل تھے۔ لیکن عالمِ مثال کے انہی دو مراتب (یعنی ادنیٰ و وسطیٰ) ہی سے مطلع ہو کر اُسے دو ہی قسموں میں منقسم جانا اور تیسرے مرتبے کا سراغ نہ پا سکے جو مرتبۂ اعلیٰ ہے، اور وہم و گمان کے شائبہ تک سے پاک ہے۔ لہذا اس کے متعلق کوئی اطلاع نہیں دی۔ اور درحقیقت اُنھوں نے دائرۂ خیال سے اپنا قدم باہر رکھا ہی نہیں۔ لہذا اس کی قسموں کا نام خیال متصل اور خیال منفصل رکھ دیا۔ حالانکہ وہ عالم مثال میں ایسے معاملات و واردات کا مشاہدہ کرتے تھے۔ جہاں خیال کا شائبہ تک بھی نہیں ہوتا جیسا کہ جسموں کی سیر و سیاحت یعنی اجسام کا بلحاظ لطافت روح کی مانند ہونا۔ چنانچہ بزرگوں سے منقول ہے کہ حضرت بایزید بسطامیؒ جس وقت سبحانی ما اعظم شانی کا دعویٰ کرتے تھے تو ان کے جسم پر تلوار کا وار ایسے ہی پڑتا جیسے پانی پر پڑتا ہے۔ اور واصلانِ حق کے سرتاج حضرت خواجہ بہاؤالدین نقشبندی قدس سرہٗ العزیز سے منقول ہے کہ وہ اپنے احباب کی نظروں سے چھپ جاتے تھے۔ جب دوست احباب چیختے چلاتے تو پھر نمودار ہو جاتے۔ یہ ناچیز فقیر بھی چودہ سال کی عمر میں اپنے والد بزرگوار

(خدا ان کے رازوں سے ہماری مدد فرمائے، اور ان کی نیکیوں کی برکت سے ہمیں پاکیزہ کرے) کی خدمت اقدس میں ایک کتاب پڑھ رہا تھا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ میرے والد بزرگوار کے اس پار جو دیوار تھی وہ ان کے جسمِ مبارک کے بیچ میں سے بھی ساری کی ساری نظر آتی تھی، اور عینک کے شیشے کی طرح والد بزرگوار کا لطیف ترین بدن اس میں حائل نہیں ہوتا تھا۔ اِدھر اُدھر کی چیزوں کے دیکھنے میں کوئی پردہ یا رکاوٹ نہ ہوتی تھی۔ میں دیر تک بار بار بڑے غور اور تعجب سے دیکھتا رہا۔ اور مجھے وہی کچھ نظر آیا۔ ارواح کے جسمانی شکل اختیار کرنے کو تجسّد ارواح کہتے ہیں۔ اور عالم مثال میں جس طرح ایک مردہ روح خواب میں دکھائی دیتی ہے اور اُس سے گفت و شنید اور ملاقات و جوابی ملاقات بھی میسر آتی ہے یا مراقبوں اور دیگر کشف و شہود کے اوقات میں قبروں پر یا قبروں کے بغیر بھی ارواح کا دیدار ہو جاتا ہے، اور ان سے سوال و جواب بھی ہو جاتے ہیں یا عالمِ ملائکہ جو فرشتوں کی دُنیا ہے۔ وہ بھی شکلوں اور صورتوں میں دیکھی جا سکتی ہے۔ یا کسی کامل کی روح زندہ حالت میں اپنے کسی مخلص پر صورت پذیر ہو کر ظاہر ہو جاتی ہے اور مدد کرتی ہے۔ اکثر و بیشتر ایسے معاملات میں خاص محبّ یا کسی امر کی شدت کی شرط ضرور ہوتی ہے۔ تب کہیں اس قسم کے حالات یا اس قبیل کے امور ظہور پذیر ہوتے ہیں ورنہ ان قیود و شرائط کے بغیر شاذ و نادر ہی نظر آتے ہیں۔ شدت سے ہماری مراد کسی حالت کا زور شور سے غلبہ ہونے کا ہے، خواہ وہ غلبہ رنج و غم کی زیادتی سے ہو یا وہ شدت خوشی و مسرّت یا رنج و راحت یا دکھ اور آفت اور خوف و وحشت کے وفور کی وجہ سے ہو یا شوق و محبت یا نورانیت و صفائی قلب یا قبول و برگزیدگی کے غلبے سے ہو یا اسی قسم کی دیگر جزئیات کی کیفیت سے ہو اور اکثر و بیشتر وہی دو ایک شخص جن کے مابین یہ معاملہ ہو وہی دیکھتے ہیں مگر بعض اوقات وہاں پر موجود تمام افراد اُسے دیکھ پاتے ہیں۔ **مثال** والدِ بزرگوار کی حینِ حیات میں ان کے مخلص عقیدت مندوں میں سے نور محمد نامی ایک شخص جنگل کی طرف گیا۔ راستے میں اُسے ڈاکوؤں نے آلیا۔ قافلے کے سبھی لوگ بڑے پریشان و مضطرب ہوئے۔ مذکورہ بالا نور محمد نے قبلہ بزرگوارم والد صاحب کی طرف رجوع کیا۔ ان کا مبارک نام زبان پر لاتے ہوئے فریاد کی کہ یا حضرت خواجہ محمد ناصر محمدی اور اے میرے پیر و مرشد میری مدد کا وقت ہے۔ میں سوائے آپ کے اور کوئی پناہ گاہ نہیں رکھتا۔ وہ یہ التجا کر ہی رہا تھا کہ ایک گھوڑ سوار محمدیؐ پرچم ہاتھ میں لیے ان ڈاکوؤں اور اہلِ قافلہ کے درمیان

آگیا۔ اور بڑے ہیبت ناک انداز میں ڈاکوؤں کو پرے ہانک دیا۔ وہ بھاگ نکلے۔ چونکہ سبھی قافلے والوں نے اس واقعے کو دیکھا تھا۔ نور محمد بڑے ذوق و شوق سے روتا ہوا اس سوار کی طرف بڑھا تاکہ قدم بوسی کرے مگر وہ سوار نظروں سے اوجھل ہوگیا۔ سارے قافلے والوں نے اس سے پوچھا کہ یہ سوار کون تھا۔ زار و قطار روتے ہوئے نور محمد نے بتایا کہ یہ میرے مرشد تھے۔ لوگوں نے کہا کہ یہ اس نواح میں کونسی آبادی میں رہتے ہیں، ہمیں بھی ان کا اتہ پتہ بتادے، تاکہ ان کی زیارت کی سعادت ہم بھی حاصل کرسکیں۔ اُس نے کہا کہ وہ دہلی میں رہتے ہیں۔ اس بات سے سبھی کو تعجب ہوا۔ وہ بڑے معتقد ہوگئے اور کہنے لگے کہ جب ہم دہلی پہنچیں گے۔ انشاء اللہ ضرور ان کی زیارت کریں گے۔ کچھ عرصے بعد جب وہ قافلہ دہلی پہنچا تو نور محمدؒ ان میں سے اکثر اصحاب کے ساتھ جو میرے بزرگوار کے دیکھنے کے سخت مشتاق تھے آپ کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہوا۔ قدم بوسی کے بعد چاہتا تھا کہ وہ گزشتہ احوال عرض کرے۔ والد بزرگوار نے اُس کی عرضداشت سے پہلے اپنی مبارک انگلی اپنے دہن مبارک پر رکھتے ہوئے فرمایا کہ چپ رہو۔ اس قسم کے معاملات ہم کئی بندگانِ خدا سے کرچکے ہیں، اور کر بھی رہے ہیں۔ لیکن ان واقعات کا ذکر کبھی اپنے ہاں روا نہیں رکھا۔ نور محمدؒ اور اُس کے دوستوں نے ہمارے اور دیگر مخلص احباب کے سامنے سارا واقعہ نقل کیا۔ نئے آنے والے معتقدین جنھوں نے اس واقعے میں والد بزرگوار کو دیکھا تھا اس حاضری کے وقت بھی ان کے جمال مبارک کو دیکھتے ہی اُنھیں پہچان گئے اور آن کے محمدی طریقے میں داخل ہوگئے۔ اس بزرگوار سے ایسی کئی کرامات دیکھنے میں آئیں۔ اگر ان کو معرضِ تحریر میں لایا جائے تو وہ ایک مستقل کتاب بن جائے گی۔ لیکن والد صاحب کی نگاہ میں کرامات کی کوئی وقعت نہ تھی۔ فرمایا کرتے تھے استقامت کرامت سے بھی بڑھ کر ہے۔ لہٰذا یہ مطلب جس کا ہم نے ذکر کیا ان کی مثالی صورت کا معاملہ تھا، ورنہ ظاہر میں وہ یہاں سے تشریف نہ لے گئے تھے۔ اور عالم مثال عالم ارواح و اجسام سے الگ ہے۔ لیکن ان دونوں عالموں میں سے اُسے ہر ایک سے نسبت و مشابہت ہے۔ لیکن اجسام سے مشابہت اُسے اس لیے ہے کہ جس طرح اجسام مقداری محسوس ہیں، اسی طرح مثالی عالم بھی مقداری محسوس ہے لیکن ارواح سے اس کی مناسبت اس وجہ سے ہے کہ جس طرح ارواح لطیف و نورانی ہیں۔ یعنی نہ تقسیم ہوسکتی ہیں۔ نہ بنائی جاسکتی ہیں۔ اسی طرح عالمِ مثال بھی لطیف ہے۔ حاصل مطلب یہ کہ چونکہ عالم مثال صورت کا مقید ہے

وہ عالم ارواح سے الگ ہوا۔ کیونکہ ارواح غیر مادی ہیں اور ان کی صورت نہیں ہوتی اور چونکہ اس عالم کی تصویریں بھی لطیف ہیں تو اس عالم اجسام سے الگ عالم سے بھی نسبت ہوگئی۔ کیونکہ اس عالم کے جسم مادی ہیں۔ اور وہ اس قسم کا مادہ نہیں، اور اُسے دونوں عالموں سے نسبت و مشابہت ہے اُسے ارواح سے نسبت لطافت کی وجہ سے ہے۔ اگرچہ وہ عالم ارواح سے ایک پایہ کم تر ہے لیکن قریب ہے اور اجسام سے اس کی مشابہت حسّ و مقدار کی بنا پر ہے۔ اگرچہ وہ عالم اجسام سے ایک مرتبہ بلند تر ہے۔ لیکن اس عالم کے نزدیک ہے۔ اور چونکہ صوفیا کے نزدیک عالم مثال کی صورت مثالی لطیفے کے اجزا سے مرکب ہے۔ وہ اُسے تقسیم، بانٹ، توڑ پھوڑ یا جوڑ کے قابل نہیں سمجھتے اور اصلیت یہ ہے کہ اس قسم کا توڑ پھوڑ، جوڑ اور بانٹ تقسیم جو ان جسموں میں ہے وہ وہاں نہیں ہے لیکن جو کچھ اس عالم کے قابل ہے وہ وہاں ہے۔ جس طرح اس عالم میں اجسام کی صورتیں ہیں اسی طرح احکام و آثار کی شکلیں بھی ہیں۔ مجھ ناچیز کا کہنا یہ ہے کہ عارفوں نے آئینے اور خواب کی مثال محض سمجھانے کے لیے دی ہوگی۔ ورنہ انبیائے کرام (ان پر خدا کی رحمتیں ہوں) کا روحوں سے معاملہ اور فرشتوں کے نازل ہوتے اور برزخ کا کاروبار جو کتاب و سنت سے معلوم ہوتا ہے، وہ اس سے بہت آگے ہے۔ اگرچہ عالم مثال میں ہے مگر دوسرے طریق سے ہے۔ ولایت کے معاملات کچھ اور ہیں اور نبوت کے اور۔ سوچنے کا مقام ہے۔ اس سب سے مُراد یہ ہے کہ صوفیا کی دی ہوئی ان مثالوں کی بنا پر عالم مثال کو صرف خواب و خیال کی قسم، یا صاف و شفاف چیزوں میں منعکس ہوجانے والی موہوم صورتوں کی کوئی جنس نہ سمجھ لینا چاہیے۔ یہ ساری مثالیں تو محض سمجھانے کے لیے تھیں تاکہ واضح طور پر معلوم ہوجائے کہ اس جہان کے علاوہ اور عالم بھی ہیں جو دیکھے جا سکتے ہیں۔ نہ کہ وہ عالم صرف انہی مثالوں ہی پہ منحصر ہے۔ بلکہ وہ عالم بھی اس عالم کی طرح موجود ہے اور جس طرح انسانی ارواح پر یہ عالم کشف ہوا، وہ عالم بھی منکشف ہوسکتا ہے۔ لہٰذا صوفیا کی یہ مثالیں ان کی بیان کردہ انہی دو قسموں پر صادق آتی ہیں جنھیں خیال متصل اور خیال منفصل کہا گیا ہے۔ اور جسے ہم نے ادنیٰ مرتبے اور اوسط مرتبے سے تعبیر کیا ہے۔ نہ یہ کہ یہی مثالیں بعینہٖ مرتبۂ اعلیٰ پر بھی جاری ہوسکتی ہیں۔ اُن کا کاروبار الگ ہے اور انہی دو قسموں میں داخل نہیں۔ جس طرح کہ انبیائے کرام کے معاملات جو ارواح سے پیش آئے یا پیش آرہے ہیں اور فرشتے جو انسانی روپ دھار کر آتے رہے۔ اور عالم برزخ کے معاملات جو مرنے سے

لے کر قیامت کے دن تک پھیلے ہوتے ہیں ۔ قرآن و حدیث کے انداز سے تو یہی پتہ چلتا ہے کہ وہ تخیلات و توہمات کی جنس سے نہیں ۔ ہر چند کہ عالم مثال میں سے ہیں، لیکن یعینہٖ محض خواب و خیال نہیں ۔ ہر امر کی حقیقت کے کما حقہٗ بیان کے لیے عبارات میں اتنی وسعت کہاں ۔ سبحان اللہ اس معاملے کی حقیقت جس طرح باطنی کشف سے معلوم ہوئی، اُس کا کما حقہٗ بیان بھی عبارات میں نہیں سماتا ۔ بہر حال اس عالم کے تمام انکشافات تو باطنی کشف ہی سے ہوتے ہیں ۔ جب تک تمھیں کوئی چیز دکھائی نہ جائے تم اس کے مفہوم سے آگاہ نہیں ہو سکتے، اور نہ ہی تمھیں یقین آئے گا ۔ سمجھ لینا اور چیز ہے اور دیکھ لینا اور چیز ۔ ترجمہ رباعی تو چاہتا ہے کہ سارے اسرارِ الٰہی کو سمجھ لے ۔ وہ چیزیں جو تیرے احاطۂ فہم سے باہر ہیں اُنھیں بھی سمجھ لے ۔ تو تو اپنی ذات کی کنہہ سے بے خبر ہے اپنی حقیقت کا پتہ نہیں ۔ لہٰذا حق تعالیٰ کے اسرار و رموز کے سمجھنے کا کیا امکان ہے؟ مصنف خود یوں تشریحی اشارات دیتا ہے کہ راز کسی ڈھکی چھپی چیز کو کہتے ہیں، اور وہ ہر شے کی ذات ہے جو شکلاً جیسی بھی ہے نظروں سے پوشیدہ ہے فقط اعتبارات کے پردے میں ظاہر ہوتی ہے ۔ لہٰذا اگر تو یہ چاہتا ہے کہ اسرار الٰہیہ کو کما حقہٗ سمجھ سکے، یعنی اشیا کی ذات و ماہیت کو دریافت کر لے تو یہ ایک امر محال ہے ۔ کیونکہ تو ایک ایسی چیز کو سمجھنا چاہتا ہے جس کا رتبہ تیری فہم سے بالا تر ہے ۔ اُسے تُو اپنے احاطۂ فہم میں کیسے لا سکتا ہے ۔ اے بے خبر تو اپنی ذات کی حقیقت سے نا آشنا ہے ۔ تو خود کو نہ پہچان سکا کہ تم کیا ہو؟ فقط انہی اضافات و اعتبارات سے کام چلا رہے ہو تو حق سبحانہ تعالیٰ کے رازوں کو کیسے سمجھ سکتے ہو ۔ اے اللہ تعالیٰ ہم تجھے نہ سمجھ سکے جیسا کہ تو ہے ۔ اور اے بے خبر خود تیرے اپنے چاہنے سے نہیں ہو سکتا جب تک کہ ادھر سے بھی فیضِ ربانی شامل حال نہ ہو ۔ اسرار الٰہیہ کا سمجھنا ممکن نہیں ۔ جس طرح آفتاب دلیلِ آفتاب ہے، اسی طرح رب کو بھی رب ہی سے پہچانا جا سکتا ہے ۔ جب تک رب کا فضل شاملِ حال نہ ہو، ہم رب کو نہیں سمجھ سکتے۔

هوالناصر

شروع اللہ کے نام سے جو نہایت مہربان اور بہت رحم والا ہے

ہر قسم کی تعریف اللہ کے لیے ہے جس نے پاکیزہ بنایا عارفین کی زبان کو ذوق کے لحاظ سے اور قول کے لحاظ سے، اور پاکیزہ کیا عاشقوں کے دل کو شوق اور کیف و حال کے لحاظ سے، اور درود و سلام اُس کے رسول صلعم پر اتمام و کمال کے ساتھ، اور آپ کی آل اور آپ کے اصحاب پر بزرگی و فضیلت کے لحاظ سے۔ اما بعد یہ سولھواں باب ہے جس کا نام قول طیب ہے۔ طیب کے معنی ہیں طاہر، پس قولِ طیب سے مراد ہے قول طاہر لفظی اور معنوی طور پر جو خطا سے داغدار ہونے سے، اور بری تقریر سے آلودہ ہونے سے مبرا ہو، اور ہوتا ہے وہ اک شافی و کافی بیان جو واقعے کے مطابق ہوتا ہے۔ دلیلوں کے ساتھ مدلل ہوتا ہے، اور آیات و احادیث کے ساتھ ملا ہوتا ہے اور فصاحت و بلاغت سے مزین ہوتا ہے، اور آراستہ ہوتا ہے لطیف باتوں اور عمدہ صنعتوں سے۔ اور کھولنے والا ہوتا ہے بلند مطالب کو، اور قابلِ ستائش اللہ کے راستے کی طرف پہنچانے والا ہوتا ہے۔ پس وہ کلام جس میں تم یہ ساری تعریفیں پاؤ اُسے پکڑ لو مضبوطی سے، اور اُس سے نصیحت لو جو کچھ اس کے اندر ہے تاکہ تم متقی بن جاؤ۔ پس وہ لوگ جو آئے ان پاکیزہ کلمات تک، اور وہ اخذ کرتے ہیں قرآن مجید سے پاکیزہ بات قبول کرنے کی ہدایت، اُنھیں خدائے ستودہ صفات کا راستہ دکھایا گیا۔

شاعرانہ استعارات میں موحدانہ گفتگو کا باب

موحدانہ گفتگو سے ہماری مراد مطالب توحید کا اس طرح بیان کرنا ہے جیسے توحید پرست اور تحقیق کرنے والے کرتے ہیں۔ نیز شاعرانہ تشبیہات و استعارات سے ان مطالب کو متعدد اور مختلف الفاظ کا جامہ پہنا کر شاعرانہ انداز میں اشارات و کنایات میں بیان کرنا ہے۔ اس قسم کے بیان میں بھی ایک خاص لطف ہوتا ہے جو شعر و سخن کے سمجھنے والوں سے پوشیدہ نہیں۔ اور انسانی روح کے لیے بہت موثر ثابت ہوتا ہے۔ خدا کی قسم شعر اک جادو ہے جائز اور حلال۔ بے شک شعر اک چلتا ہوا جادو ہے۔ لہذا شعر نہ کہنا اور عبارات میں شعری صنعتوں کو ملحوظ خاطر نہ رکھتے ہوئے بھی بلا ارادہ فصاحت و بلاغت کے تمام متعلقات ظہور پذیر ہو جائیں تو یہ بات انبیائے کرامؑ ہی سے مخصوص ہے۔ شعر و شاعری پیغمبرؐ کے شایانِ شان نہیں جیسا کہ خود اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، کہ ہم نے آپ کو شاعری کا علم نہیں دیا، اور وہ آپ کے شایانِ شان بھی نہیں۔ کیونکہ شعر نہ کہنے کے باوجود بھی کفار حضور رسول اللہ صلعم سے شاعری کی صفت منسوب کرتے تھے، اور حضور پاکؐ کو جنون زدہ شاعر کہتے تھے جیسا کہ قرآن پاک میں آیا ہے، اور کہا کرتے تھے کہ کیا ہم اپنے معبودوں کو ایک شاعر دیوانے کی وجہ سے چھوڑ دیں گے۔ اور کلام الٰہی کو جو حضرت جبرئیل علیہ السلام کی وساطت سے نازل ہوا شعر تصور کرتے تھے۔ لہذا انہی شکوک کو رفع دفع کرنے کے لیے خدا تعالیٰ نے قرآن پاک میں فرمایا کہ یہ تمہارے ساتھ رہنے والے محمد صلعم مجنون نہیں ہیں۔ اور نہ ہی یہ قرآن کسی شاعر کا قول ہے۔ لہذا اللہ تعالیٰ اگر پیغمبر علیہ السلام کو شعر کہنا سکھا دیتا اور رسول پاکؐ شعر بھی کہتے تو ان کفار کے ذہنوں پر اُن کا وہ شبہہ خوب راسخ ہو جاتا، بلکہ مومنوں کے ضعیف دلوں میں بھی تردّد پیدا ہو جاتا جیسا کہ ایک مرتبہ ایک کاتب وحی کو یہ خرابی پیش آئی۔ حضور پاکؐ کے باطن کا عکس اُس پر پڑا تو قبل اس کے کہ حضور پاک باقیماندہ آیت کو تمام کریں وہ خود ہی پکار اُٹھا۔ حضورؐ نے فرمایا یہی لکھ لو ایسے ہی ہے۔ حقیقت کو نہ سمجھنے کی بنا پر اس کے دل میں یہ گمان گزرا کہ مجھ پر بھی وحی نازل ہوئی۔ لہذا حضور پاکؐ اگر شاعری کرتے تو دعویٰ نبوت کے معاملات میں ضعف آتا اور کلمۂ ماینبغی (وہ آپ کے شایاں نہیں ہے) کی حقیقت یہی ہے اور قرآن مجید میں شعر و شاعری کی مذمت میں جو کچھ کہا گیا ہے

مثلاً شاعروں کی راہ تو بے راہ لوگ چلا کرتے ہیں۔ وہ منصبِ نبوت کے اثبات اور نبیؐ کو شاعر سے منسوب کرنے کی نفی کے لحاظ سے ہے۔ نیز یہ مذمت کفار شاعروں کی وجہ سے بھی ہے۔ کیا شرّ پسند فتنہ پردازوں کے باطل مضامین خود شعر و شاعری کی اک ہجو نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت بی بی فاطمہؓ، حضرت بی بی عائشہؓ اور امیر المومنین حضرت علی اور اکثر اماموں اور دیگر نامور بزرگوں اور اولیائے کرام نے بھی شعر کہے ہیں۔ اگر یہ بات قطعاً ممنوع ہوتی تو یہ بزرگ ہستیاں شعر کیوں کہتیں۔ خود نبی کریم صلّی اللہ علیہ وسلم مومن شاعروں سے خوش ہوتے اور اُن کی تعریف و توصیف کرتے، ان کے اشعار سنتے اور پسند فرماتے تھے۔ ایسے شاعروں کی تو روح القدس بھی مدد کرتے ہیں۔ اور حدیث شریف کے یہ الفاظ کہ روح القدس اس کی تائید کرتا ہے۔ مومن شاعروں ہی کے حق میں آئے ہیں۔ لہٰذا اولیائے کرام اور عارفانِ حق کے لیے جو نزولِ وحی کا دعوی نہیں رکھتے، شعر کہنے کے لیے کوئی مضائقہ نہیں، بلکہ کمالاتِ انسانی میں یہ ایک بڑی خوبی ہے، اور یہ لوگ اللہ تعالیٰ کے شاگرد ہوتے ہیں۔ نہیں تو ان بزرگوں کے الہامی کلمات کچھ اور قسم کے ہوتے، اور صرف شاعری کے بل بوتے پر کہے گئے اشعار و اقوال کی قسم الگ ہے اور بعض عبارات میں یہ دونوں مفہوم ہیں۔ بعض اشعار بھی الہامی ہوتے ہیں اور بعض الہامات میں شعری خوبیاں پائی جاتی ہیں۔ کیونکہ فیاضِ مطلق ہر ولی کی ذاتی استعداد اور اُس کے علم و فضل کے مطابق اُس پہ مطالب کا الہام و القا فرماتا ہے۔ جس طرح کہ (گو یہ تشبیہ نہیں) ہر رسولؑ پر اُس کی اپنی اور اُس کی اُمت کی استعداد کے مطابق وحی نازل ہوتی رہی۔ اور آسمانی صحیفے اس رسولؑ اور اُس کی قوم کی زبان میں نازل ہوئے۔ جیسا کہ قرآن مجید میں آیا ہے کہ ہم نے تمام پہلے پیغمبروں کو ان ہی کی قومی زبان میں پیغمبر بنا کر بھیجا ہے۔ تاکہ ان سے احکام الٰہیہ بیان کریں۔ مگر شعراء کی شاگردیِ حق تعالیٰ اک الگ بات ہے، اور اولیائے کرام کو حق تعالیٰ کا علم لدنی سکھانا اک علیحدہ بات ہے۔ اور شعر ایک الگ چیز ہے اور ورودِ الہام الگ۔ بلکہ قربِ ولایت کے الہامات اور قربِ نبوت کے کمالات۔ اور قربِ محمدیہؐ کے مراتب میں بڑا فرق ہے۔ قربِ ولایت کے الہامات ان زبانی کلمات کے قبیل سے ہیں جو عارف لوگ ہر شے کی زبانِ حال سے سنتے ہیں۔ اور یہ امرِ مرئی موجودات سے اخذ کیے گئے امور میں سے ہے۔ اور ظلّی مرتبے سے تعلق رکھتا ہے جو اصل کا مظہر ہے۔ نبوت کے قرب کمالات والے الہامات کا مرتبہ اس ظلّی مرتبے سے برتر ہے۔ اور یہ اس منصب کے مالک کے قلب پر براہِ راست

بغیر کسی توسط کے ظہور پذیر ہوتا ہے اور یہ الہامات اس رسولؐ کے صدقے القا ہوتے ہیں جس کے متعلق کہا گیا ہے ۔ بے شک یہ ہم نے دل پر نازل (القا) کیا اور یہ معاملہ سابقہ معاملے سے بدرجہا بلند و بالا ہے ۔ خالص قرب محمدیؐ کے الہامات مذکورہ بالا اولیاءؒ کی دید و شنید اور سمجھ سے بھی بہت بلند و بالا ہیں ۔ کیونکہ نہ کسی آنکھ نے اُسے دیکھا ، نہ کسی کان نے سُنا اور بشر کے دل پر اس کا خیال گزرا ۔ جب تک اس مرتبے تک نہ پہنچو تم نہیں سمجھ سکتے ۔ ہاں عالم اور شاعر اولیاءؒ کے الہامات غیر عالم و غیر شاعر اولیا کے الہامات سے لفظی اور معنوی لحاظ سے بہت اعلیٰ اور بہت اچھے ہوتے ہیں ۔ وہی بے کیف کلام الٰہی رنگ برنگ کے مظاہر میں رنگین ظروف کے رنگوں میں نظر آئے گا ۔ کیونکہ پانی کا رنگ اس کے برتن کا رنگ ہوتا ہے ۔ اِسے وہی سمجھ سکتا ہے جو "لم یذق لم یدد" کے معانی سمجھتا ہو ۔ (جس نے چکھا نہیں اس نے پایا نہیں) قصّہ کوتاہ یہ کہ متن میں لکھے گئے استعارات کی شرح و وضاحت کرتے ہوئے اس رباعی کے کلمات کی تشریح کرنی چاہیے ۔ ترجمہ رباعی ہر چند کہ ہمارے ہونٹوں پر ظاہری طور پر مسکراہٹ رہی ، لیکن دل اس مسکراہٹ یعنی اس ظاہری خوشی کی طرف مائل نہ ہوا ۔ زندگی جسے ہم نے ظاہری مسرت و انبساط میں گزار دیا ۔ اسے محض پھول کی سینہ چاکی کی طرح سمجھئے اس کی پتیاں منتشر ہو جاتی ہیں ایسے ہی ہماری زندگی برباد گئی ۔ اب مصنف خود ان الفاظ سے مراد لیے جانے والے معانی یوں بتلاتا ہے ۔ کہ اگرچہ رباعی کے الفاظ سے جو کچھ مُراد ہے وہ متن میں درج ہے ۔ اب اس بیان کو دہرانے کی ضرورت نہیں ، تاہم مختصر طور پر اس کا حاصل مطلب یہ ہے ۔ اگرچہ یہ جسمانی خوشی جسے خندۂ لب سے تعبیر کیا گیا ہے ۔ یعنی جو ظاہری طور پر وجود میں جلوہ گر ہے ، لیکن دل مخصوص تشخص میں گرفتاری کے سبب رہائی نہ پا کر انبساط کی طرف مائل نہ ہوا اور آزاد نہ ہو سکا ۔ پھول کی طرح اس مرتبے کے شوق میں ہم بھی سینہ چاکی کرتے رہے ۔ اور اپنے آپ کو تباہ و برباد کرتے رہے ۔ عمر حضرت وجود کی اس مسرت و انبساط پر اعتباری تعینات میں صرف ہوئی ، گویا بے فائدہ کٹی ۔ خندۂ گل اور پھول کی سینہ چاکی سے جو لطف شعر میں پیدا ہوتا ہے وہ ظاہر ہے ۔ اب رباعی کے معنی کی تفصیل آگے متن میں آتی ہے ۔ خندہ عبارت ہے حضرت وجود کی خوشی و انبساط سے جو اعتباری تعینات پر خوش ہوا ۔ لبِ وجود کا وہ ظاہری حصّہ جو اس مسرّت و انبساط کا اصل مقام ہے ۔ ہم نے لفظ خندہ کو انبساط وجودی سے اس لیے تعبیر کیا ہے کہ ہنسی میں بھی دل کو خوشی اور

طبیعت کو شگفتگی حاصل ہوتی ہے۔ وجود کی شگفتگی میں حقائق ممکنہ پر حضرت مطلق کے کمالات کی تفصیل کا ظہور ہوتا ہے۔ اور وجود کی شگفتگی دنیوی موجودات پر وجودِ ظلی کی درازی ہے۔ کلمۂ لب کو وجود کا ظاہری مرتبہ اس لیے دیا گیا کہ وہ اس مسرت و انبساط کے ظہور کا مظہر اور اصل مقام ہے۔ جسے ہم نے خندہ (مسکراہٹ) سے تعبیر کیا ہے۔ لیکن دل جو تعین خاص کا نام ہے اپنے ہی تشخص کا مقیّد ہونے کے باعث اس انبساط و مسرت کی طرف مائل نہ ہوا۔ چونکہ مقید آزاد نہیں ہو سکتا، اگرچہ وہ آزاد بالکل مقید ہے۔ یہ عبارت دوسرے مصرع کی تشریح ہے۔ جس طرح کہ پہلا جملہ پہلے مصرع کی تشریح تھا۔ اس تمام کا حاصل مطلب یہ ہے کہ عارف کا دل جو آزادی کے مفہوم کا مشتاق ہے۔ تعین خاص کا اسیر و مقیّد ہونے کے باعث اُسی انبساط و مسرت کی طرف آزادانہ بڑھ نہ سکا۔ یعنی مکمل طور پر آزاد نہ ہو سکا۔ نہ یہ کہ فقط مائل نہ ہو سکا۔ کیونکہ اس مرتبے کی طرف عارفوں کی توجہ ہمیشہ رہتی ہے، اور مقید آزاد نہیں ہو سکتا۔ اگرچہ وہ مطلق ہی مقیّد ہوتا ہے۔ جیسے کہ ہم کہتے ہیں کہ انسان مکمل طور پر زید کی طرح ہوتا ہے، پر زید مکمل طور پر انسان نہیں ہوتا۔ کیونکہ اس میں تمام افراد شامل نہیں۔ نکتہ وحدت شانِ خداوندی ہے۔ اور کثرت امکانیت سے ظہور پذیر ہوتی ہے، لہٰذا اللہ تعالیٰ کی توحید کا قائل ہونا چاہیے نہ کہ خود خدائی کا دعویٰ کر دینا چاہیے۔ پس سمجھ لے یہ اک بہت بڑا دقیق راز ہے۔ پس جو عمر ہم نے خندہ و شادمانی میں بسر کر دی وہ ہم نے اعتباری مفصلات طے کرنے کی نذر کر دی۔ کلمۂ پس جو "فا" کی جگہ ہے تفسیر ہے جو پہلے دو مصرعوں سے متعلق ہے، اور یہ جملہ چوتھے مصرع کا ماحصل ہے اور مبتدا ہے اور متن کا اگلا جملہ اس مبتدا کی خبر ہے۔ رباعی میں چوتھا مصرع مبتدا اور تیسرا مصراع خبر ہے جو مبتدا سے پہلے آئی ہے۔ اور مقصد یہ کہ جو عمر ہم نے مفصلات کے مراتب کے طے کرنے میں صرف کر دی۔ اس میں خواہ احوال کے تغیر و تبدل سے کتنی ہی مختلف کیفیات کی راہ طے کی در اصل سینہ چاکی ہی کی اک مشق تھی۔ یہ عبارت تیسرے مصرع کا ماحصل ہے اور پہلے مصرع کی خبر ہے جو متن میں بطور مبتدا آیا ہے۔ اور درحقیقت یہ ساری شگفتگی پھول کی طرح سینہ چاکی ہی کی اک مشق تھی۔ کیونکہ ہم قید و بند کی تنگ راہ گزر سے تنگ آکر آزادی کے کھلے میدان کے مشتاق اور متلاشی رہے۔ کیونکہ اس مرتبہ آزادی کی طرف رجوع کے شوق سے جب اپنے سینے سے اعتبارات کا ایک پردہ چاک کر کے اُس سے باہر نکلتے تو دوسرے تقید کے جال میں پھنس جاتے

تھے۔ کیونکہ موجودات اور اسیروں کے وجود کو اعتبارات کے پنجرے سے رہائی نہیں مل سکتی۔ اور ہم قیدوبند کی ان تنگ اور اندھی گلیوں سے تنگ آ کر آزادی کی وسعتوں کے متلاشی تھے۔ یعنی یہ وجودی حقیقت جو ہم میں جلوہ گر ہے۔ وہ ہر لحظہ ان اضافات کے جال سے رہا، اور اپنے اصل سے پیوست ہونا چاہتی تھی۔ اس لیے ہم ایک حال سے دوسرے حال، اور ایک رنگ سے دوسرے رنگ میں منتقل ہوتے رہے۔ ہر چند کہ کسی صورت اور کسی حالت میں وہ اس ذاتِ مطلق سے الگ اور علیحدہ نہیں ہو سکتی جیسا کہ اِس فرمانِ الٰہی سے بھی واضح ہے کہ تم جہاں کہیں بھی ہو میں تمھارے ساتھ ہوں؏ بلکہ ہر کام میں (ہر حال میں) وہی جلوہ گر ہے۔ لیکن ہمارے تعین کے اس تقید نے ہمیں اس سے اجنبی بنا دیا ہے گو کہ وصل کے شوق میں ہر لحظہ اضافات کے اس جامے کو پھاڑتا ہے۔ کامیابی ہو یا نہ ہو اس قیدوبند سے قدم باہر رکھنے کی کوشش ضرور کرتا ہے اور عارفوں کی فرشتوں سے مشابہت پیدا کرنے کی غرض سے یہ حرکت شوق بھی افلاک کی حرکت اور گردش کی طرح ہے۔ جو اپنی مسلسل اور دائمی جدوجہد کے باوجود بھی اپنے مرتبے سے قدم باہر نہیں رکھ سکتے۔ ترجمہ رباعی ہر چند کہ اس باغ کائنات میں ظہورات کے آب و رنگ، کمالات کے ظہور کی وجہ سے تروتازہ ہیں۔ لیکن اُس آئینۂ دل کے ہاتھوں تفرقہ کے پاٹ تلے آئے ہوئے ہیں۔ ہم کب تک اس تعین خصوص کی قیدوبند سے موافقت اور سازگاری پیدا کریں۔ کیونکہ ہم غنچے کی مانند اپنی وضعِ خاص کے ہاتھوں تنگ آگئے ہیں؏ غنچے کی ظاہری تنگی اور "تنگ آمدن" نے جو لطف پیدا کیا ہے وہ ظاہر ہے۔ یہاں یہ نہ سمجھ لینا چاہیے کہ یہ بات حالتِ رضا کے منافی ہے بلکہ اس قسم کی یہ تمنا تو صدیق ہونے کا ایک مرتبہ ہے، جو ولایت کے مرتبوں کا انتہائی مرتبہ ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے خود قرآن پاک میں کفار سے فرمایا ہے کہ اگر تم سچے ہو تو موت کی تمنا کر کے دکھاؤ؏ اور ان شاء اللہ وہ بلند ہمت لوگ جو صرف ذاتِ اقدس باری تعالیٰ کی طرف توجہ مبذول رکھتے ہیں، آخرت میں بھی اُنھیں ہوا و ہوس کے مارے ہوئے بندوں کی طرح نہ تو جنت کی مرغوب نعمتوں کی رغبت اور نہ جہنم کی مکروہ سزاؤں سے نفرت ہو گی وہ ان کے عجائب کو دنیاوی بازیگروں کا کھیل تماشہ ہی سمجھیں گے۔ جیسا کہ حضور سرورِ کائنات ﷺ نے اپنی بہشت کے متعلق یوں خبر دی ہے کہ وہاں حور و قصور نہیں، بلکہ میرا مسرور رب ہے اور اس کی خوشنودی؏ پس عارفوں کے لیے اس آیت کریمہ کے مطابق کہ جدھر کا رُخ کرو اُدھر ہی خدا کا رُخ پاؤ گے؏ یہاں بھی مشاہدۂ جمالِ ذات ہے۔ دُنیا کی ان جھوٹی باتوں پر قطعاً نظر نہیں اور وہاں بھی اسی آیتِ کریمہ کے مطابق یہ دولت نصیب ہو گی کہ بہت سے چہرے اس دن بارونق ہوں گے؏

نہ یہ کہ اس عالمِ آخرت میں نگاہ ان کھیل تماشوں پر پڑے گی جو اس دُنیا کے کھیل تماشوں کی طرح ہیں۔ لہذا اگر دل حقیقت آشنا ہے، یہ دُنیا بھی عالم آخرت ہی کی طرح ہے۔ چنانچہ حضرت مجدد الف ثانی رح نے فرمایا ہے کہ میری دنیا کو بھی خدا نے آخرت ہی بنا دیا ہے۔ اور اگر دل حقیقت سے ناآشنا ہے تو عالم آخرت بھی اس عالم دُنیا کی مانند ہوگا۔ اور وہاں بھی کھانے پینے اور پہننے اور اس قسم کی دیگر چیزوں کے سوا اور کچھ نہ ہوگا۔ بہر حال ان سب قیود سے رہائی حاصل کرنی چاہیے اور وحدتِ ذات کے حضور میں آسودہ حال رہنا چاہیے۔ اور یوں فنا فی الذات ہوجانا چاہیے کہ دنیاوی حقائق کے ان اعتبارات میں سے کوئی بھی دل کے لیے حجاب نہ بننے پائے۔ یہ سب ماسوی اللہ سے منسوب ہیں۔ کر سکو تو کام اصل میں یہی ہے، وگرنہ باقی سب ہیچ پوچ ؁

هواللّٰہ الصمد

شروع اللہ کے نام سے جو نہایت مہربان اور بہت رحم کرنے والا ہے

ہر قسم کی تعریف اللہ کے لیے ہے جس کے پاس بہت ساری غنیمتیں ہیں، اور بنایا انسان کو اپنے نفس پر بصیر، اور درود و سلام اس کے رسول صلعم پر جو خلق اور ایجاد کے سبب کی ماہیت ہے اور رشد و ہدایت کے واسطے کے نزول کا مقام ہے، اور آپ کی آل اور اصحاب پر جو محبت والے اور دوستی والے ہیں۔ اما بعد یہ سترھواں باب ہے جس کا نام مغانم کثیرہ (بہت ساری غنیمتیں) ہے۔ غنیمت وہ چیز ہے جو دوسرے سے حاصل کی جاتی ہے غلبے کے ذریعے۔ پس وجود واجب سبحانہ' نے اخذ کیے معانی ممکنہ عدم سے جو کہ اس کا غیر ہے اپنے وجوب کے غلبے کے ساتھ اور اُنھیں بنایا موجود اور ظاہر کیا کثرت کو مختلف اقسام سے اور کثیر انواع سے اور اللہ کے پاس بہت ساری غنیمتیں ہیں۔ اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ غنیمت تحائف و نوادر کو بھی کہتے ہیں۔ مجازاً جیسے ایک گرانقدر شخص کے لیے کہا جاتا ہے کہ اُس کا وجود غنیمت ہے، تحفہ ہے اور نادر ہے۔ پس اللہ کے پاس بہت ساری غنیمتیں ہیں۔ یعنی تحائف اور نوادر قسم قسم کے اور مختلف انواع کے موجودات میں سے اور اس باب کو اسی نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ انہی معنوں کی وجہ سے۔ کیونکہ اس میں نادر اور جامع کلمات ہیں جو رازوں کو عیاں کرنے والے ہیں اور تمھیں فائدہ پہنچاتے ہیں۔ اکثر مواقع پر اور نفع دیتے ہیں کثیر اور کثیر خیر۔ پس اُنھیں سمجھ لے اور اُنھیں غنیمت جان۔ وعدہ کیا ہے اللہ نے

تمھارے ساتھ بہت ساری غنیمتوں کا جنھیں تم حاصل کروگے اور جلدی کی ہے تمھارے لیے اس نفع کی اور روک دیا ہے لوگوں کے ہاتھوں کو تم سے تاکہ یہ بات ہو جائے نشانی مومنین کے لیے اور تمھیں ہدایت دیتا ہے سیدھے راستے کی، اور ایک اور غنیمتیں بھی ہیں جن پہ تم ابھی قادر نہیں ہوئے جن کو اللہ تعالیٰ نے احاطہ کیا ہوا ہے۔ اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

ماہیت اور ہویت کے بیان کا باب

ماہیت حقیقت کو کہتے ہیں۔ یعنی کسی چیز کی حقیقت جیسی کہ ہے۔ جیسے حیوانِ ناطق انسان کے لیے ضاحک اور کاتب جیسے لفظوں کے خلاف ان میں سے جو ممکن ہوتا ہے انسان کا تصوّر اُس کے بغیر۔ جیسے لفظ حیوان ناطق انسان کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ ضاحک اور کاتب کے برخلاف ان میں سے کہ ممکن ہوتا ہے تصوّر اس کے بغیر۔ اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ بے شک وہ چیز جس سے کوئی چیز ہوتی ہے، وہی ہوتی ہے حقیقت اس کی تحقیق کے اعتبار سے۔ اور اُس کے تشخص خاص کے تشخص کے اعتبار سے۔ پس ہویت عبارت ہے اس خاص تشخص سے جو ضمیر کا مرجع ہے جیسا کہ زید کے روح اور جسم کا مجموعہ ایک خاص تعین کو امتیاز دینے والا ہے، اور حقیقت عبارت ہے زید میں تحقیق شدہ انسانیت سے اور ماہیت عبارت ہے مطلق انسانیت سے جس پر تحقیق و تشخیص کی کوئی قید نہ ہو۔ یہاں ہویت اور ماہیت کے بیان سے مقصود ان دونوں کی باہمی نسبت و مناسبت کا اظہار ہے۔ لہٰذا جو مرتبہ اطلاق (آزادی یا آزاد) اپنی حیثیت کے لحاظ سے حقیقت اور ہویت کے مرتبے پر حاوی ہے اور تحقیقی حیثیت کے لحاظ سے مرتبۂ حقیقت سے متحد ہے۔ اور تشخص کے مرتبے کے لحاظ سے مرتبۂ ہویت سے متحد ہے۔ حقیقت عین ماہیت نہیں، کیونکہ اس میں تحقیق و تدقیق کی قید ہوتی ہے اور ہویت بھی عین ماہیت نہیں، کیونکہ اس میں تشخص کی قید ہوتی ہے۔ پس اگر ہویت کو ماہیت کی طرف سے دیکھا جائے تو ان کی یگانگت ثابت ہے۔ اور اگر ماہیت کو ہویت کی طرف سے دیکھا جائے تو بیگانگت کی نسبت اک تحقیق شدہ امر ہے۔ اور یگانگت و بیگانگت یہ دونوں نسبتیں اعتباری امور میں سے ہیں، اور نہ کوئی اپنا اور نہ کوئی بیگانہ والا فرمان جو طرفین کے ملاحظے کے اعتبار سے ہے وہ بھی اک اعتباری امر ہے اور چونکہ یہ ساری نسبتیں حقیقت سے منسوب ہیں سبھی

حقیقی امور سے ہیں۔ غرضیکہ اس حقیقت الامر کو اچھی طرح سمجھتے ہوئے۔ اور ہر نسبت کے اقرار کرنے والے کے اصل راز کو پالینے کے بعد اسے اپنے فہم کے لحاظ سے معذور سمجھنا چاہیے۔ اور خود اس پاک ہستی کا اتباع کرنا چاہیے جس پر قرآن مجید نازل ہوا۔ اور جہاں تک ہو سکے جامع مفہوم والے الفاظ زبان پر لانے چاہئیں۔ اور ایک ہی نسبت کی قید کا مقید نہ ہونا چاہیے، اور وجودی اور شہودی صوفیا کی طرح فقط یگانگت و بیگانگت کے ایک ہی امر کا قائل نہ ہو جانا چاہیے، اور نہ ہی بعض صوفیا کی مانند "وجہ عین سے اور وجہ غیر سے" جیسے تشبیہی بیان دینے چاہئیں۔ بلکہ ان سب ظلالی نسبتوں کو اپنے دل و دماغ سے مٹا کر اسی پاک ذات سے نسبت پیدا کرنی چاہیے جس کے کیف و سرور کی کوئی کیفیت نہیں۔ اور تحریر و تقریر دونوں سے برتر ہے، اور اشارات و اضافات و تعبیرات سے بھی مبرا ہے اور یہی وہ مطلب ہے جسے ہم نے صحبت پہ موقوف۔ اور ایک سینے سے دوسرے سینے میں منتقل ہونے سے مخصوص کر رکھا۔ یہ مقصد کتابوں اور رسالوں کے پڑھنے اور ان کے مطالب اور مسائل کو سمجھنے سے حاصل نہیں ہوتا، بلکہ یہ تو ہادیٔ برحق کی خصوصی ہدایت سے مخصوص ہے۔ کسی کے سمجھانے یا بتانے سے کچھ ہاتھ نہیں لگتا۔ گویا یہ اس امر کی خبر دیتا ہے۔ جس کی خدا تعالیٰ نے قرآن میں پیغمبر پاک کو یوں اطلاع دی کہ آپ جسے چاہیں ہدایت نہیں دے سکتے۔ لیکن اللہ تعالیٰ جسے چاہے ہدایت دے سکتا ہے۔ رسمی علوم کا فراہم کر لینا الگ بات ہے اور روحانی علم کی جوت جگانا ایک بالکل الگ بات۔ **فائدہ** یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ مذکورہ بالا نسبتوں یعنی یکسانیت و اجنبیت، کلی، جزئی، مقید اور مطلق، ہویت اور ماہیت کی یگانگت و بیگانگت کے بارے میں جو کچھ یہاں کہا یا لکھا گیا ہے موجوداتِ ممکنہ کے مراتب باہمی میں ہے۔ اور اپنی عمومیت، شمولیت اور اطلاق کے لحاظ سے عالی مراتب میں اپنے نچلے مراتب سے یکسانیت پائی جاتی ہے۔ اور وہ ان سب پہ محیط اور حاوی ہوتے ہیں۔ جیسے کہ تم نے سمجھ لیا مذکورہ بالا مثالوں سے جو مذکور ہیں ماہیت اور ہویت، مطلق اور مقید، اور کلی و جزئی ہیں۔ لیکن ادنیٰ مراتب اپنے امتیاز، تقید اور خصوص کی وجہ سے عالی مراتب کے ساتھ یگانگت پیدا نہیں کر سکے۔ مثال کے طور پر جس پر انسان کا لفظ صادق آئے گا اس پہ حیوان کا لفظ بھی صادق آئے گا۔ لیکن جن جگہوں پر حیوان کا لفظ صادق آتا ہے وہاں اپنے عمومی اور خصوصی معانی کے لحاظ سے انسان کا لفظ صادق نہیں آئے گا۔ اسی قیاس پر موجوداتِ ممکنہ کو اپنے تمام

مقیدہ، مطلقہ، کلی اور جزئی یعنی سارے مراتب میں باہمی یگانگت اور بیگانگت حاصل ہے۔ اور یگانگت و بیگانگت کی بہ نسبت ممکنات کے خواص میں سے ہے، اور صرف ہم جنس موجودات کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ فلاں بالکل یکساں ہے اور فلاں کی نسبت فلاں بالکل اجنبی ہے۔ نہ یہ کہ ان نسبتوں کا اطلاق آپ واجب و ممکن اور عبد و معبود پر کرنے لگیں۔ کیونکہ واجب تو ممکن کی جنس سے نہیں۔ اور اللہ تعالیٰ نہ تو جوہر ہے اور نہ عرض ہے۔ معبود، عبد کے زمرے سے نہیں، اُس جیسی تو کوئی شے نہیں۔ پس وہ مرتبہ جو عمومی، خصوصی، اطلاق، تقید اور کلی و جزئی اعتبارات سے برتر ہو وہ دنیوی اور امکانی اضافات سے بہت آگے ہوگا۔ اس مقام پر یگانگت و بیگانگت کے الفاظ زبان پر لانا سراسر جہالت ہے۔ اور اُس بلند مرتبے کی عظمت و بزرگی سے ناآشنا ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ کیا ہے جوڑ مٹی کا اور رب الارباب کا۔ اگر مخلوقات کا اپنے خالق سے قرب کا بیان منظور ہی ہو تو یہی کہہ دینا کافی ہے کہ وہ انسان کی رگِ گردن سے بھی زیادہ قریب ہے اور وہ ہر شے پر محیط ہے۔ نہ یہ کہ وحدت الوجودی صوفیا کی طرح انا الحق اور "ہمہ اُوست" کے گستاخانہ کلمات کہے جائیں، اور اُس سبحانہٗ تعالیٰ کو ان حادث اور فانی اشیا جیسا قرار دیا جائے۔ اللہ تعالیٰ ان سب سے بہت عظیم اور بڑا ہے۔ اور اگر خالق کی مخلوقات سے بیگانگت کا بیان مقصود ہو تو پھر یہی کہہ دینا کافی ہے کہ اللہ تعالیٰ تمام عالموں سے بے نیاز ہے۔ اور یہ کہ اللہ تعالیٰ واحد و یگانہ ہے اور نہ کوئی اس کے برابر ہے۔ نہ یہ کہ سطحی عالموں کی طرح کمہار اور گھڑے کی طرح قرار دے کر ایک دوسرے سے اجنبیت بتائی جائے کہ ایک دوسرے سے الگ الگ وجود ہیں۔ اور یوں اللہ تعالیٰ کے مقابل کو بھی اسی طرح موجود تصور کر لیا جائے۔ اس بات پر تو شرک لازم آتا ہے۔ اور جس نے کسی کو اُس کا شریک ٹھہرایا۔ اُس نے بہت بڑا جھوٹ بولا اور گناہ عظیم کیا۔ پس یہ یگانگت و بیگانگت کی نسبت تو دُنیا کی اعتباری موجودات پر ہے کہ بعض میں بالکل یگانگت ہے اور بعض میں بالکل بیگانگت و اجنبیت، اور بعض ایک حیثیت سے یکساں اور دوسری حیثیت سے اجنبی ہیں۔ جیسا کہ عقل اور جسم ایک دوسرے سے بیگانہ ہیں۔ کیونکہ ایک مادی ہے اور دوسرا غیر مادی، اور پانی اور بلبلے میں یگانگت ہے۔ کیونکہ ان میں اعتباری بیگانگت ہے۔ اور وہ بُلبلا بھی پانی ہے جو اس شکل میں نمودار ہو گیا ہے۔ اور انسانی افراد میں اس حیثیت سے کہ سب کی حقیقت ایک ہے، یگانگت پائی جاتی ہے اور مختلف

صورتیں رکھنے کے لحاظ سے بیگانگت بھی ہے، اور موجود حقیقی کی عظیم الشان ذات پر جو واجب الوجود ہے ایسی نسبتوں کا اطلاق نہیں کیا جا سکتا، اور یکسانیت و اجنبیت کی نسبت کا ہاتھ یا ایک وجہ سے یگانہ اور دوسری وجہ سے بیگانہ ہونے کی نسبت کا پنجہ اُس کی عظمت کے دامن تک نہیں پہنچ سکتا۔ اس مقام کبریائی میں ایسے توہمات تو حقیقت سے ناآشنائی کے باعث پیدا ہوتے ہیں۔ اس عالی ترین مرتبے میں یگانگت تو ذات کی اپنی ہی ذات سے ہے نہ کہ کسی اور شے سے۔ اور بارگاہ عالی میں بیگانگت وجود سے عدم کی بیگانگت ہے۔ عدم وجود سے بیگانہ ہے کہ وہ نہ ہونا ہی ہے نہ یہ کہ عدم بھی اک لحاظ سے موجود ہے، اور وجود کے معنی بھی موجود ہیں۔ لہٰذا ایک دوسرے سے بیگانہ۔ لہٰذا حقائق ممکنہ جو اضافی عدم تھے اور انھیں ذاتی طور پر وجود نصیب نہیں ہوا تھا۔ جب اللہ تعالیٰ نے اپنے وجوب میں لے کر اُنھیں وجود ظلی سے مستفیض فرمایا تو اُنھیں اعتباری موجودات بنا دیا۔ لہٰذا عدم و وجود کی اس اصلی مغائرت کی بنا پر ان میں اور موجود حقیقی یعنی خدا تعالیٰ میں حقیقی بیگانگت پیدا ہوگئی اور یہ سب موجودات حادث (نئی تخلیق) کہلائے جو قدیم سے بالکل الگ ہے جو قائم بالذات ہے۔ خالق خالق ہے اور مخلوق مخلوق ہے۔ بندہ بندہ ہے اور معبود معبود ہے۔ وہ واحد ہے، اس کا کوئی شریک نہیں۔ اعتباری اور معدومی موجودیت کے مرتبہ میں باہم اور موجودات کے مرتبے میں وجود وجودیت کے مرتبے کا نفس الوجود سے اتحاد کے پرتو کے سبب سے اور عدم کی اجنبیت اور ان ہر دو نسبتوں کی اس امکانی مرتبے میں آمیزش سے بعض بالکل، بعض کا عین اور بعض دوسرے بعض کا بالکل غیر دکھائی دیتے ہیں۔ یہ اللہ کے انداز ے ہیں۔ وہ کرتا ہے جو چاہتا ہے اور حکم صادر کرتا ہے جو وہ چاہتا ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ لہٰذا جب تم بہ تقاضائے بشری اس بیان کی طرف متوجہ ہو جاؤ تو چاہیے کہ خالص محمدیت کی برکت سے ایسی باتیں لکھو جو عوام اور خواص کے لیے دُنیا اور آخرت دونوں میں مفید ہوں۔ اور حقیقی اور اعتباری مراتب سے کسی مرتبے کا حق بھی نظر انداز نہ ہونے پائے اور نسبت و تناسب کے باریک نکات میں سے کوئی نکتہ بھی پوشیدہ نہ رہ جائے۔ اور تیرا کلام کلام الٰہی اور کلام رسول (ان پر خدا کا درود و سلام ہو) کے صدقے جزوی مطالب کا منبع و مبدا ہو اور ان تمام نامکمل تقریروں پر محیط اور حاوی ہو۔ اللہ اور اُس کے رسول کی مراد کے مطابق تیرا کلام سراپا توحید محمدی کا مظہر ہو۔ خدا نے چاہا تو اسی کے فضل و کرم اور مدد سے ان مطالب کا مفصل بیان توحید

محمدیؐ کے باب میں آئے گا جس کا عنوان دین القیمؐ ہے۔ قصہ کوتاہ یہ کہ ما نحن فیہ (وہ چیز جس میں ہم ہیں) کی طرف توجہ مبذول کرنی چاہیے، اور قلم کے گھوڑے کی باگ دوڑ ہویت و ماہیت کے ذکر کی طرف موڑنی چاہیے۔ جب یہ معلوم ہو جائے کہ ہویت سے مراد تشخص خاص ہے۔ اور ماہیت سے مُراد وہ شے جیسی کہ ہے، اور یہ امر اپنے نشان امتیاز اور نشانِ اشتراک کے معانی سے مرکب ہے جیسے نوع اور نوع کو تمیز دینے والی ذاتی خصوصیت۔ پس عمومی راہ سے ماہیت کے نشانِ اشتراک کا مادہ عین ہویت ہے اور خصوصی لحاظ سے ہویت کا نشان امتیاز اُسے ماہیت سے اجنبی بنانے والا ہے۔ پس سمجھ لے راز آزادی اور تقید کا۔ **ترجمہ رباعی** مطلق اور مقید میں اگرچہ واضح اور کھلا امتیاز ہے۔ لیکن نفی اعتبارات کے لحاظ سے ایک ہی معنی ہیں۔ مثال اس کی عمر و زید سے لو۔ ان کا تخیل جزئی ہے، اور ان کا تعقل قوتِ عاقلہ کے باعث کلی ہے۔ لیکن دونوں کے واحد معانی انسان ہیں۔ مصنف کی اپنی توضیحات کے مطابق اطلاق و تقید سے مُراد مطلق و مقید ہے اور مرتبۂ جمع سے مراد نفیٔ اعتبارات ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ مطلق اور مقیدّ کا باہمی فرق بالکل روشن اور واضح ہے۔ مثال اس کی عمر و زید سے لی۔ اُنھیں غور سے دیکھو تو سمجھ جاؤ گے کہ ان کا تخیل جو صورت کا تصور ہے۔ وہ قوتِ متخیلہ میں جزئی ہے، اور اُن کا تعقل جو ماہیت کا ادراک ہے قوتِ عاقلہ کی وجہ سے کلیّ ہے۔ اور جب نفی اعتبارات کو ملحوظ خاطر رکھو تو سمجھ جاؤ گے کہ مطلق مفہوم فقط ایک ہے، یعنی مفہوم انسانی جو ان دونوں میں جلوہ گر ہے۔ تخیلّ کا تعلق صورت سے ہے اور تعقل کا ماہیت سے۔ لہٰذا زید کی حقیقت کلی ہے جو انسانِ ناطق ہے۔ اور ہویت جو اُس کا تشخص ہے وہ جزئی حقیقی ہے۔ اور ماہیت عین ہویت ہے۔ ہر چند کہ ہویت عین ماہیت نہیں ہو سکتی۔ اسے سمجھ لو یہ دقیق بات ہے۔ یہ بیان رباعی کی وضاحت کے لیے ہے۔ سمجھ لینا چاہیے کہ تخیل اس کی قوتِ متخیلہ ہے۔ اور وہ مادی قوت ہے اور جزوی صورت کا مقام جو حیوانات کو بھی حاصل ہے۔ لیکن حیوان کلی ادراک نہیں رکھتا۔ پس ثابت ہوا کہ تخیل جزوی تشخصات کا تصور ہے۔ اور تعقل کلی ماہیات کے ملاحظہ کو کہتے ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ ماہیت اک امر کلی ہے، اور اُس کا ادراک قوت عاقلہ کے بغیر جو عبارت ہے نفس ناطقہ سے ہر گز نہیں ہو سکتا۔ اور یاد رکھو کہ کلی طور پر منطقی وہ ہے جس کے مفہوم کا تصوّر مانع شراکت نہ ہو۔ اور کلی طور پر طبیعی وہ جس پر یہ معانی صادق آئیں۔ جیسے حیوان اور انسان اور

کلی طور پر عقلی اس عارض و معروض کا مجموعہ جیسے حیوان کلی اور انسان کلی - اور جزوی کلی کے برعکس ہے۔ یعنی اس کے مفہوم کے تصوّر کی حقیقت مانع شراکت ہو - اس کی دو قسمیں ہیں - ایک حقیقی اور ایک جزوی اضافی - حقیقی وہ ہے کہ اپنے ماتحت کی نسبت سے کلی نہ ہو، اور اضافی وہ جو اپنے اوپر والے کی نسبت سے جزئی، اور اپنے ماتحت کی نسبت سے کلی ہو - جیسے کہ انسان جو حیوان کی نسبت سے اضافی ہے، اور زید و عمر کی نسبت سے کلی ہے، اور زید و عمر جزئی حقیقی ہے کہ اس کے تحت کوئی دوسرا جزو نہیں جس سے اُسے کلی نسبت ہو - پس زید جو حیوان ناطق ہے اس کی ماہیت اور اس کی ہویت میں یگانگت ہے، اور زید کا تشخّص اس کی عین ماہیت نہیں ہو سکتا جو کلی ہے۔ اس مثال سے اس حقیقت امر کو سمجھ لو کہ جس طرح انسانی معانی باوجودیکہ عین ذات ہیں، لیکن زید نے اپنے جزئی مرتبے سے قدم باہر نہیں رکھا، اور وہ کلّی نہ ہو سکا - اسی طرح باوجودیکہ حضرت موجود عین موجودات ہے لیکن موجودات نے اپنی معدومیت کے درجے سے قدم باہر نہیں نکالا، اور اُس مرتبے سے یگانگت حاصل نہ کر سکی اور نہ ہی اجنبیت کے جال سے رہائی پا سکی - پس سمجھ جا اور غفلت نہ کر، کیونکہ یہ معاملہ حقیقت اور شریعت کو جمع کرنے والا ہے، اور تجھے بہت سارا نفع دیتا ہے اور تجھے ادب سکھاتا ہے۔ بڑا اچھا ادب اور توفیق اللہ ہی سے ہے - اے عزیز ہر امر میں اتحادی اور امتیازی نسبت کو پیشِ نظر رکھو - تاکہ تم شک و شبہ کے بھنور میں نہ جا پڑو، اور جمع و تفرقے کے مرتبہ کا جامع بن سکو - اتحادی نسبت سے مراد جمع ہے، اور امتیازی نسبت سے کیفیت تفرقہ - جب ان ہر دو امور کی حقیقت کو پا لو گے، اور دونوں حقیقتوں کو مدنظر رکھو گے تو پورا اطمینان نصیب ہو جائے گا اور دل سے شک و شبہ اور پریشانی دُور ہو جائے گی - کیونکہ اس صورت میں تم ہر امر کو اس کی نسبت کے تقاضے کے لحاظ سے منسوب کرو گے - اور پھر کوئی شک و شبہ تمھاری ذہنی پریشانی کا باعث نہ بنے گا - **فائدہ** اسی لیے حضور نبی کریم صلّی اللہ علیہ وسلم نے مرتبۂ خداوندی کے تنزیہی اور تشبیہی دونوں بیان فرمائے ہیں، تاکہ جس وقت دل تنزیہی مرتبہ کی عظمت و بزرگی سے عاجز آ کر حیرت کی طرف مائل ہو، اور یاس و نومیدی کے بوجھ تلے اُس عالی مرتبے کے ادراک سے نا اُمید ہو جائے اُسے تشبیہی مرتبے کے شہود کی طرف متوجہ کر کے اُسے نوری اور صوری تجلیات کا امیدوار بنا کر اس آیت کریمہ کے مطابق کہ تم جدھر بھی رُخ کرو اُدھر ہی خدا کا رُخ ہے، آسودہ حال اور شاد کام بنایا جا سکے - اور

جس وقت دل تشبیہی جلووں میں پھنس کر اُس پاک ذات کی طرف بے کیف وسرور رجوع سے تھک کر صفات و اعتبارات کے پردوں میں چھپ جائے، اور اُکتا کر مزید ترقی میں کوتاہی کرے تو اُسے تنزیہی مرتبے کے حضور سے مشرف فرما کر اس مقدس مرتبے تک پہنچنے کے خیال سے ڈرا کر اس آیت کریمہ سے ادب سکھایا جائے کہ اللہ سے ڈرتے رہو، اور اس مرتبے تک رسائی اور حصول سے عجز کا اعتراف کرانا چاہیے اور اُسے رہتی زندگی تک سخت کڑی اور مشقت آمیز عبادات اور نفس کشی میں سرگرم رہنا چاہیے جو مزید ترقی کا موجب ہیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے خود فرمایا ہے کہ اپنے ربّ کی عبادت کرتے رہو حتیٰ کہ تمھیں موت آلے۔ اور ہر سالک جو تنزیہہ و تشبیہہ کی جامعیت کی راہ پر چلتا ہے وہ تباہی و گمراہی سے بچ جاتا ہے۔ اے اللہ ہمیں سیدھی راہ کی طرف ہدایت فرما۔ ان لوگوں کی راہ جن پر تیرا انعام ہوا نہ کہ ان لوگوں کی جن پر تیرا غضب ہوا اور نہ ان لوگوں کی راہ جو گمراہ ہوئے۔ (آمین) مغضوبین وہ لوگ ہیں جو خدائی غضب کا شکار ہوئے۔ اور اسرار و رموز الٰہیہ سے قطعاً ناواقف اور نابلد ہیں۔ چونکہ غیظ و غضب تو دشمن سے مدافعت کے لیے ہوتا ہے۔ لہٰذا حقیقت حال یہ کہ خدا نے اپنے ان دشمنوں کو اپنے سے بہت دور رکھا اور ان کی آنکھوں سے پردہ نہ اٹھایا اور ضالّین کے زمرے میں وہ لوگ آتے ہیں کہ حقیقت فہمی کے گمان میں پڑ کر اُنھوں نے ظاہری آداب و حفظ مراتب کو چھوڑ دیا اور اسی حقیقت فہمی کو حقیقت بینی سمجھ بیٹھے۔ اس حق تلفی کے باعث وہ گمراہی کے اندھے کنوئیں میں جا گرے، اور امتیازی جانب کی ڈور ہاتھ سے چھوڑ دی۔ اور جادۂ مستقیم یعنی سیدھی راہ جو اس منعم حقیقی کے انعام و اکرام سے متعلق ہے۔ وہی ظاہر و باطن اور حق کی جامع راہ ہے۔ کیونکہ جو کچھ موجود ہے اُس کے لیے اشتراکی اور امتیازی نشان لازمی ہیں۔ اور جس طرح حقیقت نوع اور نوع کی ذاتی خصوصیت سے مرکب ہے۔ اسی طرح ہر موجود دراصل انھی دو نسبتوں سے موجود ہے۔ اتحادی نسبت اس کے وجود کا باعث ہے اور امتیازی نسبت اس کے ظہور کا سبب اور یہ اُس غالب اور قابلِ حمد و ثنا کے اندازے کے مطابق ہے اور وہ جو چاہتا ہے وہی ہوتا ہے۔ جب یہ معلوم ہو گیا کہ ہر موجود کا وجود اتحادی اور امتیازی معنی کی ترکیب سے ہے۔ لہٰذا اتحادی نسبت جو اشتراکی نشان و شناخت اور یگانگت کا منبع ہے۔ بمنزلہ نوع (جنس) کے ہے اور امتیازی نسبت جو امتیازی نشان اور بیگانگت کا مبدا ہے مثل اس نوع کی ذاتی خصوصیت کے ہے اور وجود مطلق کے ساتھ اتحادی نسبت کے بغیر

کسی موجود کی ہستی کا تصور اور امکان ہی نہیں۔ کیونکہ موجودیت وجود کی شان ہے۔ اس کا غیر عدم ہے جو کسی طور بھی موجود نہیں ہو سکتا، اور امتیازی نشان کے بغیر مختلف اعتبارات کا ظہور محال ہے۔ لہذا اتحاد ہی وجود کا سبب ہے۔ اور امتیاز ان کے ظہور کا سبب، اور وہی امتیازی نسبت کے پیدا کرنے والا اور اتحادی نسبت کے دُہرانے والا ہے۔ اور ہم سب اللہ ہی طرف سے آئے ہیں اور اسی کی طرف لوٹ جائیں گے۔ ترجمہ رباعی وحدت اس کی یکتائی و وحدانیت کا نظارہ کرتی ہے اور کثرت اس کی مختلف اور متنوع تجلیات کی آئینہ دار ہے۔ اُس کے مجرد ہونے کی تنزیہہ اور مقید ہونے کی تشبیہہ یعنی کہ یہ ثبات اور یہ نفی فی الحقیقت اس کی زیبائی و رعنائی ہی کا وصف ہے۔[۵] مصنف خود یوں وضاحت کرتا ہے کہ ہم نے وحدت کو یکتائی کا نظارہ باز اس لیے کہا کہ واحد و یکتا کے ایک ہی معنی ہیں۔ شہود و حضور کی حالت میں بھی وحدت الٰہیہ چشمِ بصیرت میں وجود یکتا ہی میں دکھائی دیتی ہے اور کثرت کو نمود کا آئینہ دار اس لیے کہا کہ وہ معنیٔ یکتا ان مختلف اعتبارات کے آئینے میں انواع و اقسام کی تجلیات میں جلوہ ریز ہوتا ہے اور تنزیہہ کو تجرد اور تشبیہہ کو تقید سے اس لیے تعبیر کیا کہ تنزیہہ عبارت ہے ذات کے غیر مادی ہونے اور تمام نسبتوں اور اضافتوں سے مبرّا و معرّا ہونے سے اور تشبیہہ عبارت ہے ذات کے صفات و اعتبارات سے متصف ہونے کے لحاظ سے۔ پس یہ اثبات اور نفی جن کا تعلق مرتبہ بشرط شے اور مرتبۂ بشرط لا شی سے ہے۔ در اصل اس کی رعنائی و زیبائی کے وصف کا مرتبہ لابشرط ہے جو ان ہر دو معنوں میں شامل ہے اور رعنا نام ہے ایک دو رنگے پھول کا، اور یہاں اس کا استعمال خالی از لطف نہیں۔ کیونکہ اس کے معنی حسین و خوبصورت کے بھی ہیں۔ اُس جیسی کوئی شے نہیں۔ وہ سب کچھ سننے والا ہے اور سب کو دیکھنے والا ہے[۶]

هوالنّاصر

شروع اللہ کے نام سے جو نہایت مہربان اور بہت رحم والا ہے

ہر قسم کی تعریف اللہ کے لیے ہے جس نے بلایا ہمیں حال کی تکمیل کی طرف اجل تک اور ہدایت دی ہمیں کمال حاصل کرنے کے لیے علم اور عمل کے ساتھ۔ درود و سلام ہو اُس کے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر جو منہدم کرنے والے ہیں فساد اور خلل کی بنیاد کو، اور تمام مذہبوں اور ملّتوں کو منسوخ کرنے والے ہیں اور آپ کی آل پر اور آپ کے اصحاب پر جو راسخ ہیں علم اور عمل میں۔ اما بعد پس یہ اٹھارہواں باب ہے جس کا نام داعی الی اللہ ہے۔ داعیہ قوتِ جاذبہ ہے جسے اللہ نے بنایا ہے نفوس میں (رجحان کے اندر) جو کھینچتی ہے اس چیز کی طرف جو اس کے لیے مناسب ہے۔ مثلاً بھوک بلاتی ہے غذا کے لیے اور کھینچتی ہے کھانوں کو معدے کی طرف، اور متوجہ کرتی ہے نفس کو کھانے کے حاصل کرنے کی طرف اور اعضا کو اس کے حصول کی طرف۔ اس طرح ہر معاملے کے لیے دلوں کے اندر قوت داعیہ ہے۔ پس پاکیزہ اور کامل لوگ جو بنائے گئے خود اللہ تعالیٰ ہی کے نفس کے لیے فطرت کے اصل میں جیسا کہ اللہ عزوجل نے موسیٰ علیہ السلام کے حق میں کہا (ہمارے نبی اور موسیٰ پر سلام ہو) میں نے تجھے بنایا اپنے نفس کے لیے اور پاکیزہ لوگ بلاتے ہیں لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی طرف رات کو اور دن کو اور جنت کی طرف جو مناسب ہے ان کے لیے کیونکہ جنت جو ہے وہی ہے مناسب ان کے لیے قرارگاہ کی حیثیت سے اور ان میں اللہ کی طرف اور جنت کی طرف لے جانے والی قوت داعیہ ہوتی

ہے اور وہ قدرت والے اللہ کے پاس صدق کی نشست گاہ پر ہوں گے - پس میں نے بلایا اپنی قوم کو طبعاً بغیر تردد کے پکارتے ہوئے اللہ کی طرف اُس کے حکم سے اور میں نے ارادہ کیا کہ ان کی ذاتیں مکمل ہو جائیں علم اور اعمال سے، اور میں نے ارادہ کیا کہ حاصل ہو جائے اُنھیں نجات ہر حال میں، اور میں نے اُنھیں سکھائی اللہ کی مہربانی سے انتہائی تعلیم اور میں نے سمجھائی اللہ کی ہدایت سے تفہیم کی انتہا۔ اور میں نے تمام مومنین کے لیے معرفت اور نیک نیتی کے دروازے کھول دیے، اور میں نے شرح کی اسباب خیر اور اسباب ہدایت کی تمام محمدیوں کے لیے توکل کرتے ہوئے اللہ پر اور اس کی قبولیت کی صفت پر اور وسیلہ پکڑتے ہوئے ان کے رسولؐ کی جناب کی طرف - کافی ہے میرے لیے اللہ - کیا ہی اچھا کارساز ہے، کیا ہی اچھا مولیٰ اور کیا ہی اچھا مددگار ہے -

علم وعمل سے نفس کی تکمیل کے بیان کا باب

نفس انسانی کا کمال علم حاصل کرنے میں ہے - نیک اعمال علم کے اس آئینے کو چمکانے والے ہیں (جلا بخشنے والے ہیں) کیونکہ انسانی اعمال اور افعال جن پر انسان کو ثواب یا عذاب ہو گا اختیاری ہوتے ہیں - یعنی ان میں ارادے کو عمل دخل ہے اور ارادہ علم کی شاخ سے پھوٹتا ہے - لہٰذا جہاں تک ہو سکے پہلے تو علم و معرفت کے حصول کی کوشش کرنی چاہیے - اور پوری سعی و کوشش کے ساتھ باطن کی صفائی کرنی چاہیے - شمہ (ذرہ بھر) معرفت بہت سارے عمل سے بہتر اور اللہ کے نزدیک علم کی جستجو نماز اور روزے، اور خدا کی راہ میں جہاد سے افضل ہے - پس علم حاصل کرو کیونکہ اس کا حاصل کرنا اللہ کے لیے، نیکی ہے، اور اس کا طلب کرنا عبادت ہے - اور اُس کا ذکر کرنا تسبیح ہے - اور اُس کے لیے سعی و جستجو کرنا جہاد ہے اور اُس کا سکھانا اس کو جو نہیں جانتا صدقہ ہے - اور اس کا خرچ کرنا اس کے اہل پر قرب الٰہی کا سبب ہے - کیونکہ یہ حلال اور حرام کے راستے کی نشانیاں ہیں اور وحشت کے اندر جنوں اور انسانوں کے لیے روشنی کا مینار ہے، اور ساتھی ہے مسافرت میں اور رہبر ہے سختیوں اور مصائب میں، اور ہتھیار ہے دشمنوں کے خلاف، اجنبیوں کے نزدیک قرب کا سبب ہے اور دوستوں کے نزدیک زینت کا سبب ہے - اس کے بعد اپنی بصیرت کے حسب منشا اعمال کو سنوارنا چاہیے - اور تزکیۂ نفس کی طرف دھیان دینا چاہیے - کیونکہ اعمال کی درستی

علم کی صحت و درستی پر منحصر ہے جسے صحیح پہچان ہی نہ ہو، اُس کے اعمال کس طرح درست ہو سکتے ہیں۔ کیونکہ مشہودی معرفت کی نسبت سے ہوتی ہے۔ اور سب سے افضل عمل جو ہے وہ اللہ کا علم ہے۔ بے شک علم جو ہے اس کے ساتھ تھیں فائدہ پہنچاتا ہے تھوڑا عمل بھی اور زیادہ عمل بھی۔ اور جہالت جو ہے اس کے ساتھ نہ تھوڑا عمل تھیں فائدہ پہنچاتا ہے اور نہ زیادہ عمل۔ علم سے مراد یہاں معلومات ہیں، وگرنہ وہ علم جس کے معنی دانست (سمجھ) کے ہیں۔ وہ سیکھنے اور پڑھنے سے حاصل نہیں ہوتا۔ پیدائش کے وقت سے جس کسی کو جس قدر ادراک کی قوت دی گئی ہے وہ اس سے بڑھتی نہیں اور علم لدنّی (سینے کا علم) بھی یہی پیدائشی علم ہے۔ جس کے نتائج اوقات کے مطابق ظہور پذیر ہوتے رہتے ہیں، اور وہ حقیقی جاننے والا (اللہ تعالیٰ) اسی راہ سے امورِ حق کی ہر وقت تعلیم دیتا رہتا ہے۔ اور یہ علوم ظاہرہ جسے ہم نے معلومات سے تعبیر کیا ہے۔ اس کا حاصل کرنا علم لدنی رکھنے والوں کے لیے بھی بہت کار آمد ہوتا ہے، جیسے کہ ایک چمکدار اور اصل فولاد کی تلوار اگر کسی بہادر کے ہاتھ میں ہوگی تو لڑائی کے وقت وہ اس کا بہترین استعمال کرے گا، اور نا اہلوں کے لیے اگرچہ علم ظاہری کا حاصل کرنا یا نہ کرنا ایک برابر ہے مگر پھر بھی فائدے سے خالی نہیں۔ جیسے کہ بزدل کے ہاتھ میں تلوار اگرچہ اُس کے کسی کام نہ آئے گی لیکن پھر بھی اُس کی زیب و زینت کا باعث تو ہے۔ اگر بہادر آدمی کے پاس تلوار نہ بھی ہو، وہ اس تلوار والے بزدل پر غالب آجائے گا۔ اس کے لیے اُس کے مُکّے اور دولتیاں ہی کافی ہوں گی۔ اور اگر دو برابر کی چوٹ کے شجاع و بہادر انسانوں میں مقابلہ ہو جائے تو تلوار والا بے تلوار والے پر غالب آجائے گا۔ اور بے شمشیر شجاعت میں حریف سے آگے ہے تو وہ آخر کار صاحبِ شمشیر پر غلبہ پالے گا۔ لہٰذا حقیقت میں اصل چیز وہی شجاعت ہے۔ اور ہاتھ میں تلوار کا ہونا اسی کی اک شاخ ہے جس طرح ایک سپاہی یا مجاہد کے لیے اپنی تلوار کو چمکانا۔ اس کی دھار کا خیال رکھنا، اپنے سواری کے جانور کی تیمارداری اور مناسب دیکھ بھال کرنا ضروری ہے۔ اسی طرح ایک عارف کے لیے باطنی صفائی، نفس کی تطہیر، عبادات و اطاعات اور دیگر لوازمات میں مشغولیت از بس ضروری ہے۔ جب عالم کچھ جان لے، پس اس پر عمل نہ کرے تو وہ چراغ کی طرح ہے جو لوگوں کو تو روشنی پہنچاتا ہے اور اپنے آپ کو جلاتا ہے۔ قصہ کوتاہ یہ کہ کامل ترین عارف وہی ہوتا ہے جو صاحبِ علم و عمل ہو اور معرفت اور تقوے کو اپنی پرواز کے شہپر بنا کر وسعتِ خداوندی کی لا متناہی

فضاؤں میں ہمیشہ مائل بہ عروج ہو۔ وہ آدمی جس کے دو دن برابر ہوں وہ خسارے میں ہے۔

ترجمہ رباعی وہ لوگ جنھوں نے علوم و فنون کے حصول پہ نظر رکھی۔ انھوں نے علمی معلومات کے انبار کے انبار جمع کر لیے۔ خبردار کہ کارکنانِ قضا و قدر نے تیری قوتِ مدرکہ میں جو بیج بویا ہے، آخر کار بہار کے موسم میں وہ بیج پھل اور پھول لے آئے گا۔ اب مصنف خود اس کی توضیح و تشریح یوں کرتا ہے کہ جن لوگوں نے کمالات کے حصول پر نگاہ رکھی، اور ترقی پر ساری ہمت مبذول کی اور ہمیشہ کسب فضائل کو مدِّ نظر رکھا۔ دُنیا کے اُس کشت زار میں جو فی الحقیقت آخرت کی کھیتی ہے۔ نیک معلومات کے ڈھیر کے ڈھیر جمع کر لیے، گویا اپنا توشۂ آخرت تیار کر لیا ہے۔ کیونکہ کارکنان قضا و قدر نے انسان کی قوتِ مدرکہ میں جو بیج بویا ہے وہ رنگ لا کے رہے گا۔ بہار کے موسم میں خوب پھلے پھولے گا۔ اور ان کی نیکی و بدی کے نتائج اور پھل خوب ظاہر ہوں گے۔ انسان کا غیر مادی نفس یعنی روح بدن کے ساتھ تعلق سے پہلے ایک جوہر ہی تھا جو محسوسات اور معقولات کے ادراک سے بالکل معرا تھا۔ جب اُس نے مادے سے قرب پیدا کیا تو وہ حواس عشرہ کے آلات میں تصرف کے باعث کلی اور جزوی طور پر صاحبِ ادراک ہوگیا، اور وہ موجودہ معلوم صورتوں کا مقام بن گیا۔ اور حاصل کی ہوئی یہ استعداد میں جسم و روح کی جدائی کے بعد بھی زائل نہ ہوں گی جیسا کہ آیاتِ قرآنی اور احادیثِ نبوی سے بھی ظاہر ہے۔ اور دانشوروں کے نزدیک بھی عقلی دلائل اور براہین سے مسلّم ہیں، اور ان پہ عذاب یا ثواب کا تعلق غیر مادی نفس یا نفس ناطقہ سے ہے جسے ہم انسانی روح کہتے ہیں۔

مجرد اسے کہتے ہیں جو غیر مادی ہو، اور جوہر وہ جو قائم بالذات ہو۔ کیونکہ یہ ماہیت ہے جب تک پائے اعیان میں، وہ نہیں تھا موضوع میں اور جواہر پانچ ہیں۔ عقل، نفس، جسم۔ ہیولیٰ اور صورت۔ جہاں تک جوہر کا تعلق ہے، وہ یا تو مجرد ہوتا ہے یا غیر مجرد۔ پس پہلی چیز یا یہ کہ وہ نہیں تعلق رکھتی بدن سے تدبیر اور تصرف کا تعلق، یا تعلق رکھتی ہے پہلے عقل اور پھر نفس سے، اور دوسری اوّل کی تردید کے ساتھ ہے اور وہ یا تو ہوتی ہے غیر مجرد یا تو یہ کہ ہوتی ہے مرکب اولاً پہلے ہیں سے پہلا جسم اور دوسرا یا تو حال ہوتا ہے، یا پہلی صورت کا محل اور ثانی ہیولیٰ ہے، اور یہ حقیقت جوہر یہ کہلاتی ہے۔ اصطلاح صوفیا میں نفس رحمانی کے ساتھ۔ اور ہیولیٰ کلیہ ہے، اور وہ چیز معین ہوتی ہے اس سے۔ اور جو چیز معین ہوتی ہے اس سے وہ ہو گئی موجودات میں سے کلماتِ الٰہیہ کے ساتھ۔ اور جان

لوکہ جوہر تقسیم کیا جاتا ہے بسیط روحانی کی طرف جیسے عقل اور نفوس مجردہ، اور بسیط جسمانی کی طرف جیسے عناصر اور مرکب کی طرف عقل میں سے خارج کے بغیر جیسے ماہیات جوہریہ مرکبہ جنس میں سے اور غیر جنس میں سے، اور ان دونوں میں مرکب کی طرف جیسے موالید ثلاثہ (جمادات و نباتات وحیوانات) پس من جملہ نفس انسانی بھی غیر مادی جوہر ہے۔ اور محسوسات وہ جو حواس کے ذریعے محسوس کی جاسکیں جو مادی ہوتے ہیں، اور معقولات وہ جن کا قوتِ عاقلہ کے بغیر ادراک نہ کیا جاسکے۔ اور مادے سے قرب کا مطلب روح کا مادے میں تصرف پیدا کرنا، لہٰذا ارواح کو مقارفات بھی کہتے ہیں، اور عقول کو جو مادے میں تصرف رکھتی ہیں تصرّف مفارفات کہتے ہیں، اور آلاتِ نفس حواس عشرہ کو کہتے ہیں۔ پانچ حس ظاہری ہیں جو سننے، دیکھنے، سونگھنے، چکھنے اور چھونے کی قوتوں پر مشتمل ہیں، اور پانچ حس باطنی ہیں۔ جو حسِ مشترک، قوتِ خیال، سوچ بچار، حافظے اور واہمے کی قوتوں پر مشتمل ہیں۔ بعض نے قوتِ حافظہ کو یادداشت کی قوت سے بھی تعبیر کیا ہے اور لفظ کلی وجزئی کی تحقیق پچھلے باب کی تشریحات میں دی جاچکی ہے۔ اور محل صورِ حالیہ سے مراد ذہن پر ان معلوم صورتوں کا نقش ہوجانا ہے۔ اور یوں ساری معلومات ذہن میں منقوش ہوجاتی ہیں، اور ملکہ رُوح یا نفس کی مضبوط و استوار صفت کو کہتے ہیں اور تحقیق اس کی یوں ہے۔ انفعال میں کسی فعل کے سبب ایک ہیئت حاصل ہوجاتی ہے اور اس ہیئت کو نفسانی کیفیت کہتے ہیں اور جلدی زوال پذیر ہونے کی وجہ سے اس کا نام دائمی حالت رکھ دیا جاتا ہے اگر وہ ہیئت یا کیفیت بار بار پیدا ہو اور مضبوط و استوار بن کر دیر سے زوال پذیر ہونے والی بن جائے تو اُسے ملکہ کہتے ہیں۔ اور اس ساری عبارت کا مطلب یہ ہے کہ انسانی روح کو جسم پر تصرف سے قبل صرف علم حضوری تھا۔ اور اُسے یہ علم جو محسوسات و معقولات کے ادراک سے میسر آتا ہے اُسے حاصل نہ تھا۔ اسی کمال کے حصول کے لیے روح کو جسم کا قرب عطا کر کے یہاں لایا گیا تاکہ وہ مفصل علم حاصل کر سکے، اور حواس کی وساطت سے کلیات و جزئیات کا ادراک کرنے لگے۔ اور موجودہ معلوم صورتوں کا مقام بن جائے۔ اور جب معلومات کی یہ صورتیں روح میں پختہ طور پر جاگزیں ہوگئیں اور ہر امر کا ملکہ حاصل ہوگیا تو بدن سے جدائی کے بعد بھی جسے ہم موت کہتے ہیں یہ ملکات زائل نہیں ہوتے۔ چنانچہ نفس ناطقہ یعنی روح انسانی کی موت کے بعد بھی بقا آیاتِ قرآنی اور احادیث نبویؐ سے ظاہر ہے۔ چونکہ دین اور اسلام کی بنیاد اخروی امور پر ہے اور اپنے کمائے ہوئے یا کئے ہوئے

پر سزا و جزا بھی اس آیتِ کریمہ سے ثابت و مُسلّم کہ ہمارا کیا ہمارے لیے، اور تمھارا کیا تمھارے لیے اور دانشمندوں کے نزدیک بھی بقائے روح عقلی دلائل سے تحقیق شدہ امر ہے، اور عذاب و ثواب کا بھی اُسی سے تعلق ہے۔ یعنی وہ بھی روح کے لیے ثواب و عذاب کے قائل ہیں۔

نفس کی قسموں، اس کے ناموں اور اس کی فنا کے عدم جواز کے بیان کا فائدہ

نفس کے لغوی معنی ہیں ذات اور نفس الشئ کسی شے کی ذات کو کہتے ہیں، اور فلسفے کی اصطلاح میں یہ لفظ ارواح کے لیے مخصوص ہے خواہ وہ مادی ہوں جیسے نباتی نفس (نشو ونما پانے والے) اور حیوانی نفس خواہ وہ غیر مادی ہوں۔ جیسے ارواح سماوی اور ارواح انسانی۔ اور اخلاق کی اصطلاح میں نفس سے اکثر مراد انا کے خیال اور خودی کے تصوّر و گمان سے لی جاتی ہے، اور جو نفس درندگی اور وحشی پن کی صفات سے متصف ہو اُسے نفس امّارہ کہتے ہیں طبعاً ایسا نفس برائیوں کا حکم دیتا ہے جیسا کہ اس قول سے ظاہر ہے۔ تحقیق نفس برائیوں کی طرف لے جاتا ہے۔ جب اسی نفس کا تزکیہ ہو جاتا ہے اور وہ خلاف شرع کاموں سے نفرت کرنے لگتا ہے اور خود ہی اپنے آپ کو نصیحت اور لعن طعن کرنے لگتا ہے تو اُسے نفس لوّامہ کہتے ہیں۔ چنانچہ حق تعالیٰ نے ایسے نفس کی بزرگی کی وجہ سے یہ فرمایا ہے کہ میں قسم کھاتا ہوں نفس لوّامہ کی، اور جب وہی تزکیۂ نفس کی آخری انتہا تک پہنچ جاتا ہے اور مکمل صفائی قلب اُسے پوری طرح راضی برضائے حق کے مرتبے تک پہنچا دیتی ہے اور اس میں نیک ملکہ پیدا ہو جاتا ہے۔ اور اُس سے کوئی شرّ یا بدی پیدا ہونے کا قطعاً کوئی امکان نہیں رہ جاتا، اور اُسے ملکیت تامہ حاصل ہو جاتی ہے تو وہ اس گروہ میں داخل ہو جاتا ہے جس کے متعلق قرآن مجید کہتا ہے۔ "جو خدا کی ذرا نافرمانی نہیں کرتے کسی بات میں جو ان کو حکم دیا جاتا ہے اور جو کچھ ان کو حکم دیا جاتا ہے اس کو فوراً بجا لاتے ہیں، اور وہ نفس بالکل نیکیوں کا منبع بن جاتا ہے جیسا کہ واصلان ذات کے سرتاج حضرت بہاء الحق والدین، المعروف شاہ نقشبند رحمۃ نے فرمایا ہے کہ اب میرے پاس ایسا دل ہے کہ اگر میں اس کی نافرمانی کروں تو گویا میں نے اللہ کی نافرمانی کی۔ ایسے نفس کو نفس مطمئنہ کہتے ہیں اور اس سے متعلق قرآن پاک میں آیا ہے کہ جو اللہ کے فرمانبردار تھے ان کو ارشاد ہوگا کہ اے اطمینان والی روح تو اپنے پروردگار کے جوارِ رحمت کی طرف چل، اس طرح سے کہ تو اُس سے خوش اور وہ تجھ سے خوش۔ پس

ہے وہی نفس واحد جو مقامات اور اوصاف کے اختلاف کے تقاضے کی بنا پر مختلف ناموں میں تبدیل ہو گیا، جیسا کہ طبیبوں کی اصطلاح میں وہی مادی روح جو دل میں اک نرم و نازک بھاپ ہوتی ہے اُسے روحِ حیوانی کہا جاتا ہے، اور وہی جگر میں روح طبیعی اور دماغ میں روح نفسانی کہلاتی ہے۔ ناموں کا یہ ادل بدل ان کے مکان یا مقام اور اوصاف کے اختلاف کی بنا پر ہوا۔ مگر مسمیٰ وہی امر واحد ہے۔ اور سلوک کی اصطلاح میں اسی اطمینان کی حالت کو فنائے نفس (نفس کُشی) کہتے ہیں۔ وگرنہ وہ نفس جسے نفس ناطقہ کہتے ہیں ہرگز فنا نہیں ہوتا۔ کیونکہ یہ دانش اور علم منقول دونوں کے خلاف ہے۔ لہذا مخلص محمدیؐ اپنی اصطلاح میں فنائے نفس کے مقام کو اطمینان قلب سے منسوب کرتے ہیں۔ گو کہ دوسرے بزرگوں کی مراد بھی اس لفظ سے انہی معنوں میں ہے لیکن اس کی بہترین تعبیر وہی ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے کلامِ پاک میں کی ہے۔ اور اسی طرح فنائے قلب کے اطلاق کی بجائے جو عبارت ہے یاد داگی، دوام و قیام سے وہ اطمینانِ قلب، صلاح قلب اور قرآن و حدیث سے اخذ کیے ہوئے ایسے ہی کلمات استعمال کرتے ہیں۔ ہاں اطمینان قلب کے حصول کا سب سے بڑا سبب مرشد کی محبت، صحبت اور اس کا تصور ہے۔ اپنے آپ کو اُس کی رضا میں گم کر کے فنا فی الشیخ ہو جانا چاہیے۔ اور نفس کے پرندے کو اس کی متابعت کی چھری سے ذبح کر دینا چاہیے اور یہی بڑی قربانی ہے اور مرشد کی توجہ کے بغیر یہ فنائے نفس جو عبارت ہے اطمینان قلب سے، ہرگز حاصل نہیں ہو سکتا۔ یہ بات عبادات، اطاعات اور جد و جہد سے حاصل نہیں ہوتی، بلکہ غرور اور تکبر اور بھی بڑھ جاتے ہیں۔ حاصل کلام یہ کہ ہر آدمی کو شروع سے آخر تک جو کچھ چاہیے اور جس کا حصول انسانی حقیقت کے سزاوار ہے وہ سب کا سب اس بات میں شامل کر کے تمام افراد پہ مجموعی نظر رکھتے ہوئے کلیتہً بھی، اور ہر فرد واحد کے لحاظ اور اس کی استعداد کے مطابق جزوی طور پر بھی بیان کر دیا گیا ہے۔ پس انسانی خوش بختی اسی میں ہے کہ وہ علم حاصل کرنے میں ہر ممکن کوشش کرے۔ کیونکہ فرشتوں اور دیگر مخلوقات پر اُسے علم ہی کی بدولت فضیلت حاصل ہے۔ اور قرآنِ پاک کی اس آیت کریمہ کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو کل چیزوں کے اسماء کا علم دے دیا، کے اندر بھی علم سے مراد دنیوی اور دینی حقائق اور دقائق کی دریافت ہی ہے۔ کیونکہ اس قسم کا علم سوائے انسان کے اور کسی مخلوق کو حاصل نہیں۔ اور حضرت انسان کی اس علمی وسعت کی وجہ اس لیے ہے کہ انسان تمام ظہورات کا جامع اور جملہ اسمائے

حسنیٰ کا مظہر ہے، اور مذکورہ بالا آیت کریمہ انہی معانی پر دلالت کرتی ہے۔ اس کے برعکس دوسری مخلوقات محض بعض بعض اسمائے ذات کے مظہر ہیں، لہذا ہر انسان کی سعادت مندی اسی میں ہے کہ جہاں تک ہو سکے علم حاصل کرنے میں کوتاہی نہ کرے کہ حقیقت کا انکشاف کرنے والی قوت یہی ہے، اور انسان کو جو اشرف المخلوقات کہا جاتا ہے، فرشتوں اور دوسری مخلوقات پر فضیلت اسی وسعتِ علم کی بنا پر ہے۔ جیسا کہ قرآن میں حضرت آدمؑ علیہ السلام کے قصے میں فرشتوں کے ان کے سامنے سجدہ کرنے سے ظاہر ہے۔

انسانی جامعیت وخلافت اور فضل وشرف کے اسرار کا اظہار

اور جب کہ تیرے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں بنانے لگا ہوں زمین میں اک خلیفہ، پس یہ بیان ہے اللہ تعالیٰ کی نعمت کا جو تمام انسانوں کے لیے عام ہے۔ کیونکہ آدم علیہ السلام نبی نوع انسان میں سے اک فرد ہیں۔ پس ان کی فضیلت اور تکریم موجودات پر وہ فضیلت دینا ہے ان کی نوع کو موجودات کی اقسام پر اور خلیفہ وہ ہے جو دوسرے کے پیچھے آئے اور اس کی نیابت کرے اور ہا مبالغے کے لیے ہے۔ پس بنایا اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنا نائب زمین پر، اور جامع مظہر اپنے کمالات کا اور ظاہر کرتا ہے حق کو اس مظہر سے پہلے اور خلیفہ اس کے بعد ہے اس کے ظہور کے ضمن میں ہی۔ اور پہناتا ہے خلافت کی خلعت اُسے نور کے ساتھ مجھ ہی سے وہ سنتا ہے، اور مجھ ہی سے دیکھتا ہے اور خلفا جو ہیں وہ نہیں چاہتے کچھ بھی، مگر جو اللہ چاہتا ہے اور تمام جہانوں کا پروردگار ہے اور جب کہا انسان اکمل (ان پر خدا کا درود وسلام) کے رب نے، اور وہی رب الارباب ہے، اور مرتبہ جامع ہے تمام کمالات کا۔ کہا فرشتوں سے بے شک میں بنانے والا ہوں زمین میں ایک خلیفہ اپنی جامعیت کے ساتھ اور فرشتے تھے قدوسی خلیفے آسمان میں۔ اور تدبیر کرنے والے اس کے امر کی، پس اُنھوں نے کہا کہ تو بناتا ہے اس میں اس کو جو فساد پھیلائے گا۔ اس میں بدنی اور نفسی متقضیات کے اختلاف کی وجہ سے۔ اور بہائے گا خون شیطانی گمراہی سے، اور وہ غضب ہے اور ناری چیز کا نتیجہ ہے، اور ہم تسبیح بیان کرتے ہیں، تیری تعریف کے ساتھ پاکیزگی کے انداز میں، اور تیری تقدیس

بیان کرتے ہیں جس میں کوئی تغیر نہیں ہے تو اللہ نے کہا کہ بے شک میں جانتا ہوں وہ جو تم نہیں جانتے، کیونکہ اللہ جامع ہے اور زیادہ جانتا ہے فرشتوں سے، جمیع کمالات کو یکجا کرنے والے انسان کے حال کو۔ اور فرشتے تو فقط تسبیح بیان کرنے والے تھے اور وہ نہیں جانتے تھے تشبیہہ کے رازوں کو۔

اور سکھائے آدم کو اسما سارے کے سارے اور بنایا اُسے ان تمام کمالات کا مکمل مظہر اور مفصل بیان کی ہر چیز کی تفسیر۔ پھر اُنھیں پیش کیا اجمالاً آدم کی صحبت کی برکت کے ساتھ فرشتوں پر۔ پس کہا مجھے خبر دو ان سب ناموں کی مفصل طور پر، اگر تم سچے ہو اپنے دعوے میں۔ اُنھوں نے کہا تو پاک ہے ہمیں کوئی علم نہیں سوائے اس کے جو تو نے ہمیں سکھایا ہے اپنی تسبیح و تقدیس میں سے۔ بے شک تو وہ علیم و حکیم ہے کہ نہیں جانتا تیری حکمت کو کوئی سوائے اس کے جسے تو سکھا دے۔ اور وہ انسان کامل ہے۔ اللہ نے کہا اے آدم انھیں خبر دو ان چیزوں کے ناموں کی، کیونکہ فرشتے تیرے ہی لطائف میں سے ہیں اور جُز ہیں تیری حقیقت میں سے۔ پس کل اجزا کو اپنے اندر لیے ہوئے ہے۔ اور ظاہر ہوتے ہیں ان پر بھی وہ اسرار کہ ظاہر کرتا ہے اللہ ان پر بھی وہ راز۔ پس جب آدمؑ نے اُنھیں خبر دے دی تو اللہ نے فرمایا! کیا میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ میں جانتا ہوں آسمانوں اور زمین کے غیب کی باتیں فرشتوں اور انسانوں سے زیادہ۔ اور میں خوب جانتا ہوں وہ چیزیں جن کو تم ظاہر کرتے ہو میری تسبیح و تقدیس میں سے اور جن کو تم چھپاتے ہو آدم کی خلافت کی حقیقت میں سے، اور جان لو کہ فرشتے ہمارے اعتبار سے آسمانوں کے غیب میں داخل ہیں، اور آدم داخل ہے زمین کے غیب میں اس لحاظ سے کہ فرشتے نابلد ہیں اس کے حال سے۔ جیسے کہ اللہ عزّوجل نے فرمایا اس میں جس میں کہ کلام گزر چکا ہے۔ کہ میں خوب جانتا ہوں وہ چیز جو تم نہیں جانتے، دلالت کرتے ہوئے اللہ کے علم کے اعتبار سے کہ نہیں ہے کوئی غیب آسمان میں، اور نہ زمین میں، اور تمام مکونات حاضر ہیں اس کے علم میں، اور وہ ہر چیز پر گواہ ہے۔ علوم معقول و منقول حاصل کرنے، اخلاق کو سنوارنے اور اعمال کو شرع کے مطابق درست کرنے کے بعد بلاچون و چرا ہمہ تن ذاتِ حق تعالیٰ سے یوں لو لگانی چاہیے کہ دنیوی صورتوں کی یہ تمام کثرت دل کے آئینے سے دُور ہو جائے، اور حسنِ توحید تجلی ریز ہو جائے، اور حُسنِ الٰہی کی مستی سے بے خودی و سرشاری کا یہ عالم ہو کہ تجھے اپنے اور پرائے کی خبر نہ ہو۔ علمِ معقول عبارت ہے حکمت و منطق کے علم سے۔ یہ علم بھی اس قدر سیکھنا ضروری ہے جس سے سمجھنے اور سمجھانے کی

قوت پیدا ہو۔ اس علم کے حصول کو علوم منقول کے اکتساب پہ اس لیے مقدم رکھا گیا کہ اسی علم کے بل بوتے پر ذہن کو جلا حاصل ہوگی۔ دینِ اسلام اور دیگر حقائق و دقائق کی حقیقت کی سوجھ بوجھ حاصل ہوگی۔ لہذا اس علم کو علوم منقول کی وہ بنیادی باتیں قرار دیتے ہوئے مقدم گردانا کہ سارے علوم منقول جو تفسیر، فقہ و حدیث پہ مشتمل ہیں کا جاننا موقوف ہے۔ تاکہ آیات قرآنی اور احادیث نبوی کے معانی کا انکشاف ہو سکے۔ مومنوں کا اصل مقصد تو قرآن و حدیث ہی کے معانی کا سمجھنا ہے۔ اگر کوئی شخص علم منطق کے قواعد و مطالب و مقدمات سے واقف نہ ہوگا تو وہ آیاتِ قرآنی اور احادیثِ نبوی سے نتیجہ اخذ کرتے وقت ذہن کو کسی باطنی غلطی کے ارتکاب سے کیسے بچا سکے گا۔ اور اگر علم بیان سے کوئی شُد بُدھ نہ ہو تو کلام میں فصاحت و بلاغت سے کیسے لُطف اندوز ہو سکے گا۔ اور علم اصول میں تھوڑی بہت دسترس بھی نہ ہو تو وہ آیات کی مختلف اقسام کو کیسے سمجھ پائے گا۔ اور اگر وہ علمِ حقیقت سے بے بہرہ ہوگا تو ان کے باطنی معانی کو کیسے سمجھ سکے گا جو اُس کلام کا مغز ہوتے ہیں، اور جو فقط دانشمندوں اور دانشوروں پہ آشکارا ہوتے ہیں۔ لہذا سب سے پہلے تو بقدرِ ضرورت ان تمام علوم کا سیکھنا ضروری ہے۔ لیکن ملّاؤں کی طرح ساری عمر انہی ظاہری علوم میں صرف کر دینا محض وقت کو ضائع کرنا اور بے فائدہ ہے۔ جس کام کے لیے خدا نے تمھیں پیدا کیا ہے وہ کام اور ہے۔ ان ضروری علوم کے حاصل کرنے کے بعد اپنے اخلاق کو سنوارنے پہ توجہ دینی چاہیے، اور اُسے خوب سجانا چاہیے اور حرص، لالچ، شہوت غیظ و غضب، ہوا و ہوس، غرور، حسد، منافقت، بدخصلتی، زود خفگی اور دروغ گوئی وغیرہ جو تمام خرابیوں کا منبع ہیں، اُنھیں جڑ سے اکھاڑ پھینکنا چاہیے تاکہ ناشائستہ افعال اور ناروا اعمال جو انہی کی شاخیں ہیں سر نہ اُٹھا سکیں۔ اخلاق کے سنوارنے، خلاف شرع کاموں سے رُکنے اور امر معروف کے بجالانے کے بعد شرع دینِ متین اور طریق محمدیؐ میں شامل نفلی عبادات اور اطاعات میں مشغول ہو جانا چاہیے، اور کمالات کی جامعیت والی اس دولت کے حصول کے بعد باطنی صفائی کی طرف متوجہ ہو جانا چاہیے اور اپنی روح کو اُس تمام نسبتوں اور اضافتوں سے مبرا پاک ذات میں یوں محو کر دینا چاہیے کہ ان حاصل کردہ علوم اور دُنیا کی ان اعتباری صورتوں کے سب نقوش دل و دماغ کی تختی سے مٹ جائیں اور ان کے حصول سے روح کو جو فائدہ ہوا ہو، توجہ ذات کے سلسلے میں ترقی میں ممد ثابت ہو، اور جس طرح انسانی طبع خوراک اور اُس کے تحلیل شدہ جُز، جو کہ

کھانے کا نچوڑ ہوتا ہے اپنے اندر رکھ لیتی ہے اور فضلے کو خارج کر دیتی ہے۔ اسی طرح معرفت اور حقیقت کے نور کو جو ان علوم کا خلاصہ ہے دل و دماغ میں محفوظ رکھ لینا چاہیے، اور باقی تمام چھوٹی موٹی بحثوں اور مقدمات کو جو فضلے کی مانند ہیں اور مضر خیالات اور نفسانی باتوں میں داخل ہیں، سب سے اپنے سینے کو پاک کر لینا چاہیے۔ سو پہلے ان علوم کے حاصل کیے بغیر یہ فائدہ حاصل نہیں ہو سکتا۔ جس طرح کھائے پیئے بغیر بدن کو طاقت نہیں ملتی، اگر قبض ہو جائے اور فضلہ خارج نہ ہو تو بھی بیماری ہے، ویسے یہی کچھ ان ظاہری ملاؤں کے ساتھ ہوتا ہے۔ بخارات ان کے دماغ کو چڑھ جاتے ہیں اور ان کی سمجھ میں فتور آجاتا ہے۔ قیامت کے دن سب سے سخت عذاب ان عالموں کو ہوگا جن کا علم نافع ثابت نہ ہوا ہو۔ حاصل مطلب یہ کہ جب یہ باطنی تزکیہ اور قلبی تصفیہ نصیب ہو جائے اور اعتبارات کے سارے نقوش صفحۂ دل سے مٹ جائیں، خدا سے کامل توجہ نصیب ہو جائے تو سمجھ لو کہ تم اس قابل ہو گئے کہ تمھارے باطن میں حُسن توحید کا عکس رونما ہو جائے، اور جذب ربانی نزول فرما کر تمھیں یوں بے خود و سرمست بنا دے کہ اپنی اور پرائے کی خبر تک نہ رہے، اور یہ سب اسی کے فضل و کرم سے ہوگا۔ تنبیہہ یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ جس طرح علم منطق سارے علوم کا خادم ہے اور ہر علم میں مطالب کے نکالنے کے کام آتا ہے اور ذہن کو باطنی غلطیوں سے بچائے رکھتا ہے۔ اور فی نفسہٖ تمام مطالب کا حاصل نہیں بلکہ دستور و قانون سے زیادہ اور کچھ نہیں۔ اسی طرح سارے علوم کیا علم کلام، کیا علم حکمت، کیا علم تصوف، اور اسی طرح قیاس کرتے ہوئے دیگر علوم طریقِ محمدیؐ کے حقائق و معارف کے خادم ہیں، اور اسی کی ابتدائی باتیں ہیں جن پر علم دین موقوف ہے۔ اور یہ مطالب انہی علوم کی اصل غرض و غایت ہیں۔ جس طرح تخت شاہی کی ایجاد کی اصل غرض بادشاہ کی تخت نشینی ہے۔ حقائق محمدیہؐ کی تحقیق بڑی دقیق و دشوار ہے۔ سو جب تک پہلے ان علوم سے بہرہ حاصل نہ ہو، اور تائید آسمانی چشم بصیرت سے پردہ اُٹھا نہ دے، ان کا دریافت کرنا بڑا کٹھن کام ہے۔ اور جزوی عقل کے مالک جو اصطلاحات کے گورکھ دھندے میں پھنسے رہتے اور ذہن کے کونوں کھدروں میں چند گنے چنے الفاظ کا تانا بانا سنتے رہتے ہیں اور بات کی حقیقت پر نظر نہیں رکھتے وہ اس تک نہیں پہنچ سکتے۔ حقیقت کا انکشاف ایک الگ بات ہے۔ وہ خاص خاص اولیائے کرام کے سوا اور کسی پر نہیں ہوتا اور عقل و ہوش کے بل بوتے پر سمجھنا ایک الگ بات ہے جو حکما اور ذہین و فطین بندوں کو حاصل ہوتا ہے۔

لہذا مخلص محمدیوں کے لیے لازم ہے کہ جونہی حقیقت منکشف ہوجائے اور مقصود حاصل ہوجائے تو ان علوم کے حاصل کرنے میں کوئی کوتاہی نہ کریں، کیونکہ ان مطالب کے سمجھنے میں وہی ابتدائی بنیادیں ہیں۔ تاکہ وہ عبارات کے مطالب کے ظاہر کو بھی پوری طرح سمجھ سکیں، اور ہادی برحق جل شانہ' کے فیض کے امیدوار بھی رہیں، ہوسکتا ہے کہ اُس کی عنایت بے غایت کا نزول ہوجائے، اور ان پر بھی معاملے کی حقیقت کھُل جائے، یہ تو خوش بختی کی بات ہے۔ دیکھیے یہ سعادت کسے نصیب ہوتی ہے۔ اور جو لوگ علمی نسبت رکھتے ہیں اور ان ظاہری علوم کے حصول کے لیے وقت ان کا ساتھ نہیں دیتا۔ اُنھیں چاہیے کہ جس قدر نسبت اور عقیدہ ان کے باطن کو حاصل ہوچکا ہے اس کے تحفظ کی پوری کوشش کریں اور اس طریق کے علما سے کلی اور ضروری باتیں زبانی سنیں، اور اگر ان کے بخت میں یہ سعادت لکھی ہوئی ہے، تو ان پر بھی ان کے حوصلہ اور اہلیت کے مطابق کچھ نہ کچھ منکشف ہو ہی جائے گا اور انھیں بھی علم کی وسعت نصیب ہوجائے گی۔ اور جو لوگ صرف ظاہری علم رکھتے ہیں۔ اور ان کی نسبت بھی جہالت سے ہے اور حقیقتاً علمی نسبت سے بے بہرہ ہیں۔ اُنھیں چاہیے کہ معانی کی ظاہری عبارات اور تراکیب کی درستی کروائیں۔ جو کچھ سمجھ میں آجائے فبہا، اور جو سمجھ میں نہ آئے اُسے اپنے فہم کی کوتاہی سمجھتے ہوئے شکوک و شبہات میں نہ پڑیں؛ وہ تو شیطان کے قدموں کے نشان ہیں۔ انھیں جتنا حضور و آگہی نصیب ہوچکی ہو اسی پر اکتفا کریں اور تحقیق کے راستے پر نہ چلیں، اپنے عقیدے کو مضبوط رکھیں اور جو لوگ نہ ظاہری علوم کے حصول کی قابلیت اور نہ ہی علمی نسبت سے کسی قسم کا حصہ رکھتے ہوں اُنھیں چاہیے کہ وہ ذکر اذکار اور ان اوراد و وظائف اور اعمال پہ قناعت کریں جن کا حکم دیا گیا ہے اور یوں اپنے اخلاص و محبت کے شعلے کو ہمیشہ مشتعل رکھیں اور ہر لحظہ حُبّ خدا اور رسولؐ کی نسبت میں ترقی کرتے رہیں۔ کیونکہ خدا نے چاہا تو اس نسبت کی بدولت وہ آخرت میں کامل مومنوں کی صف میں اُٹھیں گے۔ آدمی اس کے ساتھ ہوتا ہے جس سے وہ محبت کرتا ہے۔ انس رضی اللہ تعالیٰ سے روایت ہے کہ ایک آدمی نے سوال کیا کہ یا رسول اللہؐ قیامت کب آئے گی۔ آپ نے فرمایا تیرا بُرا ہو تو نے اس کے لیے تیار کیا کیا ہے۔ اس نے کہا میں نے کچھ بھی اس کے لیے تیار نہیں کیا سوائے اس کے کہ اللہ سے محبت کرتا ہوں، اور اُس کے رسولؐ سے محبت کرتا ہوں۔ آپؐ نے فرمایا! پس تو انہی کے ساتھ ہے جن سے تو نے محبت کی ہے۔ انسؓ کہتے ہیں کہ میں نے نہیں دیکھا مسلمانوں کو کہ وہ خوش

ہوئے کسی چیز سے اسلام کے بعد جیسے کہ وہ خوش ہوئے اس سے ۔ امام بخاری اور مسلم دونوں اس پر متفق ہیں۔ سبحان اللہ وسعتِ محمدیہ (ان سب پر خدا کا درود و سلام) کے کیا کہنے کہ وہ اعلیٰ وادنیٰ میں سے کسی کو نہ چھوڑیں گے جسے وہ اپنی شفاعت کے دائرے میں نہ لیں ۔ اے خاتم الانبیا اور مومنوں کے پشتیبان دنیا و آخرت میں ہمارا وسیلہ آپؐ ہی ہیں ۔ خدا درود بھیجے آپؐ پر اور آپؐ کی پاکیزہ نسل پر۔ سبحان اللہ حقیقت محمدیہ سورج سے بھی زیادہ روشن ہے، اور ساری دُنیا اس نور سے منوّر ہے۔ دوستو موقع اور فرصت کو غنیمت جانو ، اور اُس نور محمدیؐ کو اخذ کرنے کی سعی کرو کہ فیض محمدیؐ مستقل طور پر جاری و ساری ہے ۔ اور حضور پاکؐ کی نصرت اور عنایت ہر وقت تمھارے شاملِ حال ہے اور اس کی دلیل دلیلِ قاطع ہے ، اور اُس کی دلیل کو کمال حاصل ہے۔ ایسے عارف باللہ لوگ آئے دن پیدا نہیں ہوتے جو ظاہری اور باطنی علوم کے جامع ، شکوک و شبہات کے رفع کنندہ ، حقیقت و شریعت میں شامل ، طریقت و معرفت میں کامل ۔ محبت و عقیدے سے سرشار ، رشد و ہدایت اور مشاہدۂ ذات سے لبریز ، حضوری و توکل سے مسرور ، حلم و بردباری سے معمور ، بے نیازی و استغنا کی دولت سے مشرف ، خلق و صفا کی کیفیت سے سرشار ہوتے ہوئے دُھن کے پکّے اطاعت کے لائق ، قوم کے سردار ، نماز اور روزے کے پابند ، غرور و تکبر کو منہدم کرنے والے ، ماں باپ دونوں کی طرف سے سخی و شریف ، دونوں جہانوں میں مقبول ، جانے پہچانے اور ملنے ہوئے نیکوکار ہوں جنھیں فرشتوں کی تائید بھی حاصل ہو ، اور جو اس آیت کریمہ کے معنی پر قائم و دائم ہوں کہ اللہ کے نیک بندے ملامت کرنے والوں کی لعنت ملامت اور ناپاک باتوں سے نہیں ڈرتے ، اور زبان سے قولی شکر بھی ادا کرتے ہوں ۔ ایسے لوگ محض گنتی کے چند ہوتے ہیں ۔ یہی سنت الٰہی ہے ، اور سنت خداوندی میں آپ کبھی تبدیلی نہ پائیں گے ۔ لہٰذا جب کبھی ایسی باکمال صحبت میسر آجائے تو اُسے غنیمت جانتے ہوئے ان سے اکتسابِ فیض اور اپنے عقائد کی درستی کروانی چاہیے ۔ حضوری و مشاہدہ نصیب ہو جائے تو کوشش کرنی چاہیے کہ یہ نسبت مستقل اور دائمی بن جائے ۔ تاکہ کامل اطمینان نصیب ہو جائے ۔ اور ماسوی اللہ سب خیالات دل سے نکل جائیں ۔ حبّ خدا و رسولؐ کا ظہور اور ان کے عشق کی مستی کا سرور چھا جائے اور ذات بابرکات سے یوں جذبِ کامل نصیب ہو جائے جو مجھے بے خود و سرمست بنا دے۔

ترجمہ رباعی اک عرصے تک ہم قصہ کہانی کا علم پڑھتے رہے (یعنی علوم ظاہری) ۔ ایک مدّت

تک کعبے اور بت خانے کا دروازہ کھٹکھٹاتے رہے۔ اسے ورد خدا کا احسان ہے کہ آخر ہم میخانہ حقیقی پر جا پہنچے اور جام شراب نوش جان کیا۔ اب مصنف کی اپنی وضاحت ملاحظہ ہو۔ افسانے سے ہماری مراد ظاہری علوم ہیں۔ اور کعبے سے بدنی عبادات، بت خانے سے تن پروری اور میکدے سے مراد جذبات الٰہیہ ہیں۔ اور رباعی کا مطلب یوں ہوا کہ عمر کا ایک معتدبہ حصہ ہم نے ظاہری علوم کے اکتساب میں صرف کر دیا۔ جن کی حیثیت اگلے وقتوں کے قصے کہانیوں اور افسانوں سے زیادہ نہ تھی۔ اس سلسلے میں ہم کوشش کرتے رہے اور اس راہ پہ گامزن رہے۔ کچھ عرصہ بدنی عبادات اور ریاضیات پہ صرف کر دیا جو نیکو کاروں کے کام ہیں، اور مدتوں اس کی دہلیز کے مجاور اور ملازم بنے رہے۔ اور پھر آدھی راہ چل کر ہم تن پروری میں کھو گئے جو طریقت سے ناشکری کا مقام ہے۔ مدتوں اسی کاشانے کے دروازے کھٹکھٹاتے اور یہیں کے گرد و غبار جھاڑ پونچھ کرتے رہے۔ یعنی کہ نظر آنے والے اور محسوس ہونے والے مظاہر کے پھندے میں پھنسے رہے۔ خدا کا شکر ہے کہ اُس کے فضل و کرم سے انجام کار جذبات الٰہیہ سے مستفیض ہو کر ہم ایمانِ حقیقی کی دولت سے مالا مال ہوئے اور ذات تقدس و تعالیٰ سے ناقابلِ بیان کیفیت کی نسبت پیدا کی۔ اور فنا فی اللہ ہو کر بقا باللہ کے مقام سے مشرف ہوئے اور مئے معرفت اور جام وصل نوش جان کیا۔ اور اس جذب کامل کی کیفیت سے سرشار ہو کر ظاہری اور باطنی لحاظ سے ماسوی اللہ کے پھندوں سے آزاد ہو گئے۔ اور اللہ تعالیٰ نے ہمیں رسولوں کے سردار اور امت کے سالار (ان پر خدا کا درود و سلام) کے صدقے اپنے مخلص محمدیوں میں داخل فرمالیا۔

هو النّاصر

شروع اللہ کے نام سے جو نہایت مہربان اور بہت رحم والا ہے

ہر قسم کی تعریف اس اللہ کے لیے ہے کہ نہیں ہے کوئی معبود سوائے اس کے جو رحمان و رحیم ہے، اور نہیں ہے کوئی طاقت اور نہ قوت مگر بلند اور عظمت والے اللہ کے ساتھ۔ درود و سلام ہو اس کے رسول کریمؐ پر، اور آپؐ کی آل پر اور اصحاب پر جو بڑی عزّت اور تعظیم والے ہیں۔ اما بعد پس یہ انیسواں[19] باب ہے جو سراجِ منیر کے نام سے موسوم ہے۔ سراج سے یہاں مراد حقیقت الوجود ہے جو اصطلاحاً اور استعارۃً اپنے آپ ہی روشن ہے۔ وہ اس چراغ کی طرح نہیں ہے جو منور ہوتا ہے اس نور سے جو اس کی ذات کے علاوہ ہو۔ یہ جان لو کہ روشن چیز تین قسم کی ہے۔ پہلی چیز وہ ہے جو دوسرے کی روشنی سے منور ہوتی ہے۔ جیسے روشن زمین سورج کی روشنی میں، اور دوسری وہ ہے جو روشن ہوتی ہے اُس روشنی سے جو اُس کی ذات کا مقتضیٰ ہوتی ہے، جیسے سورج روشن ہے اپنی روشنی سے، اور تیسری وہ روشن چیز ہے جو روشن ہوتی ہے اپنے نفس کے اندر ہی اس کی روشنی اس کی عین ذات ہوتی ہے۔ جیسے روشن نور اپنے نفس کے ساتھ ہی۔ پس حقائق ممکنہ روشن ہیں وجود حق کی روشنی سے جیسے زمین روشن ہے سورج کی روشنی سے، اور واجب روشن ہے وجود کی روشنی سے جو کہ اس کی ذات کا مقتضیٰ ہے۔ متکلین کے نزدیک جیسے روشن سورج ایسی روشنی کے ساتھ جو اس کی ذات کا مقتضیٰ ہے اور اُس سے الگ ہونے والا نہیں۔ حکما اور صوفیا کے نزدیک واجب روشن ہے

وجود کی روشنی سے جو کہ اس کی عین ذات ہے، جیسے روشن نور اپنے نفس کے ساتھ، اور اللہ تعالیٰ کا وجود اس کا عین نفس ہے ان کے نزدیک، اور حق یہ ہے کہ بے شک وجود کے لیے ہر مرتبہ ہے ان مذکورہ مراتب میں سے، اگر تو دیکھے موجوداتِ ممکنہ کی طرف ان کی امکانی حیثیت سے اور وجود کی طرف اس کی وجوبی حیثیت سے تو تُو پائے گا اُنھیں موجود وجود واجب کے ساتھ جیسے تو نے پایا زمین کو روشن سورج کی روشنی سے اور اگر تو دیکھے واجب کی طرف اس کے نفس کی حیثیت سے اور وجود کی طرف اس کے کون وحصول کی حیثیت سے تو تو پائے گا اسے موجود اس کے وجود کے ساتھ جو مقتضی ہے اس کی ذات کا جو اس سے الگ ہونے والا نہیں۔ اور اگر تو دیکھے واجب کی ذات کی طرف جیسی کہ وہ ہے، اور وجود کی طرف بحیثیت مبدا و انتزاع (کھینچے جانے کا مبدا و منبع) سے تو تو پاتا ہے اس سے عین وجود جو موجود ہے اپنی ذات کے ساتھ اپنی بلندی اور اپنی قدامت کے ساتھ جیسے تو پاتا ہے نور کو روشن اپنی ذات میں۔ پس میں جان گیا ہوں کہ اللہ کی طرف لوٹتے ہیں سارے کے سارے امور۔ پس میں بلاتا ہوں لوگوں کو اس کی طرف داعی بن کر اور سراج منیر بن کر اُسی کے حکم سے۔

وجود کی حقیقت اور مراتب کے بیان کا باب

یہ باب مکمل طور پر وجود کی حقیقت اور اس کے سہ گانہ مراتب (مراتب ثلاثہ) کے بیان کے متعلق ہے جو مرتبۂ بشرط شی، بشرط لاشی اور لابشرط پر مشتمل ہیں۔ کیونکہ جزوی طور پر بیان وجودی مراتب کا احاطہ نہیں کر سکتا۔ اور کوئی مرتبہ حضرت وجود کے احاطے سے باہر نہیں۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ وجود میں مراتب یعنی موجودات کو لامتناہی کیسے کہا جا سکے، کیونکہ وہ سب ایک ہی وجود کے احاطے میں ہیں اور احاطے یا گھیرے میں آجانے والی چیز لاانتہا نہیں ہوتی۔ چونکہ مرتبۂ وجود بھی لامتناہی ہے اور ایک لامتناہی کا دوسرے لامتناہی کو احاطے میں لینے کے لیے گھیرا یا انتہا لازمی نہیں بلکہ وہ وجود کی وہی لامتناہی حالت ہے۔ جس نے اپنے مظاہر کو جو عبارت ہیں موجودات سے لامتناہی بنا رکھا ہے اگر تم یہ کہو کہ حکما نے حالِ حاضر کی موجودات کو لامتناہی کہا ہے تو یہ معقول بات ہے کیونکہ حال حاضر کی قید (شرط) اور مجموعیت کے اعتبار سے ساری موجودات کو انتہا یا خاتمہ لاحق ہو جائے گا، اور متکلمین نے قدرتِ حق کو لامتناہی لکھا ہے۔ وہ قوت و طاقت کے حساب سے ہے۔ ہم کہتے ہیں

کہ آخر ہمارے کلام میں یہ حال حاضر کی شرط کہاں سے ثابت ہوتی ہے۔ اس کے ساتھ فعل و قوت تو
نسبت و اضافات سے ہے، اور اس کا تعلق بھی نسبت زمانی سے ہے۔ اور یہاں ہماری گفتگو اطلاقی
اور عمومی طور پر ذات الوجود اور حقائق موجودات کے متعلق ہے۔ لہٰذا جس طرح موجود مراتب کو زمانی اور
فعلی نسبت کے اعتبار سے انتہا کی نسبت لاحق ہوگئی ہے۔ اُسی طرح غیر زمانی اور قوت کے لحاظ سے
اس میں لامتناہی نسبت بھی شامل ہے۔ اور یہ ساری نسبتیں ہیں جو خارجی وجود نہیں رکھتیں اور موجود
فی نفسہ وجود کا جزو نہیں۔ موجودات کے یہ پیمانے جنھیں ہم ذہن و خارج زمان و غیر زمان، مکان و
لامکان، مُدعا، غیب و شہادت، حقیقت و اعتبار وغیرہ کہتے ہیں۔ دراصل وجود کے پیمانے ہی میں
رکھی ہوئی چیزیں ہیں۔ دیگر ساری موجودات کی طرح جو انہی پیمانوں میں رکھی ہوئی ہیں۔ بلکہ ظرف اور
مظروف کی یہ نسبت بھی سوائے اعتباری نسبت کے اور کچھ نہیں اور وجودیت اور موجودیت سوائے
منسوبہ نسبت کے اور کچھ نہیں۔ جس نے اللہ کو پہچان لیا، اس کی زبان گنگ ہوگئی، کیونکہ انسانی تحریر
ظاہر و مخفی کے اس مرتبے میں ساتھ دینے سے قاصر ہے اور حقیقت وجود کا انکشاف کماحقہ معرض بیان
میں نہیں آسکتا۔ اللہ سبحانہٗ کی عنایت کے ساتھ منکشف ہوگیا۔ مجھ پر وہ جو منکشف ہوگیا، تاہم جتنا
کچھ انسان کے بس میں ہے اپنی بساط کے مطابق ہر جگہ بیان کر ہی دیا گیا ہے۔ اور یہاں اس باب کے
متن میں بھی حسب ضرورت متن کی شرح کی ذیل میں لکھ دیا جائے گا۔ واہ سبحان اللہ اتنا کچھ پا لینے کے
بعد بھی کچھ نہ پایا۔ **ترجمہ رباعی** نہیں پایا جاتا کرنے والا اور کروانے والا، نہیں ثابت ہوتا نہ
فاعل اور نہ مفعول، میں نے پالیا اُس کے وجود کو کسی چیز کی شرط کے بغیر۔ یہاں نہ کوئی علّت ہے
اور نہ معلول۔ حاصل مطلب یہ کہ کام اور عمل جو اضافات اور نسبتوں ہی سے ہیں۔ وہ بھی ذات کے
کماحقہٗ مشاہدہ میں گُم اور ناپید ہوجاتے ہیں اور جب مرتبہ لابشرط کا ملاحظہ کیا جائے یعنی صرف
ذات کو اُس کی ایجابی اور سلبی نسبتوں اور اضافتوں کے بغیر دیکھا جائے تو اس مقام پر علت و معلول
کا کوئی امتیاز نہیں رہ جاتا، کیونکہ بنانے والا بھی وہی ہے۔ اور اس کام (بنانے) کا سبب یا باعث
بھی وہی ہے۔ نہ اس کی تعبیر ہوتی ہے، اور نہ وہ بیان کیا جاتا ہے مطلقاً، بلکہ نہیں کہا جاتا کہ وہاں ہے
وہ مطلق ہے اور اضافات اس سے سلب ہوچکے ہیں۔ اور نہ یہی کہا جاتا ہے کہ اضافات اس سے
سلب ہوچکی ہیں۔ اور یہی عبارت رباعی کے معانی اور ذات الوجود کے بیان کی گتھیوں کو سلجھا دینے

والی ہے۔ کیونکہ اس مرتبے میں بندش ورہائی کی کسی نسبت اور کسی حسیّ وعقلی اشارے کی ہرگز و قطعاً کوئی گنجائش نہیں، ایسے مرتبہ مطلق کہا جاسکتا ہے، جس سے تمام اضافات ونسبتیں سلب کردی گئی ہوں۔ کیونکہ اضافت کا سلب کرلینا بھی سلبیہ اضافات کا اثبات ہے اور مطلقیت کا اثبات بھی قیدو بندش کا مترادف۔ تو پھر اس مرتبے کو مطلق یا تمام نسبتوں سے مسلوب کیسے کہا جاسکتا ہے کیونکہ اطلاق اور سلب اس کے نسب میں سے ہیں اور اُس کے اعتبارات میں سے، اور دیکھتے ہوئے اس کی ذات کی طرف وہ مطلق نہیں ہے، اور نہ مقید ہے، نہ کلّی ہے، نہ جزئی ہے۔ بلکہ مطلق اس کے ساتھ مطلق ہے۔ اور مقید اس کے ساتھ مقید ہے، اور اسی طرح کلی اور جزئی ہیں، اور وہی انتزاع (کھینچے جانے) کا مبدأ ہے جس کی وجہ سے موجودیت ہے۔ اور یہ بیان ذات الوجود سے اطلاقی اور سلبی نسبتوں کے ساقط ہوجانے کی دلیل ہے۔ اور اس حدِّ کمال تک بے عیب ہونے کی دلیل بھی، کہ اُس سبحانہ تعالیٰ کی عظمت کے دامن تک نسبت وقیدو اثبات کا ہاتھ نہیں پہنچ سکتا۔ یونہی اطلاقی اور سلبی نسبتوں کی دسترس سے بھی باہر ہے۔ حق سبحانہ تعالیٰ نہ مطلق ہے نہ مقید، نہ کلّی اور نہ جزئی۔ ان مطلقہ مراتب نے بھی اسی سے اطلاق اور مقیدّات نے اسی سے تقید حاصل کیا ہے۔ امور کلیہ کو کلیت بھی اسی سے نصیب ہوئی۔ جزئی اشیا کو یہ خاصیت بھی اسی سے ملی ہے۔ اور ان تمام اضافات واعتبارات کا منبع ومبدا وہی ہے۔ موجودیت کے معانی کا اُسی سے ظہور ہے اور وہ سب سے آگے بہت آگے ہے۔ اور بے شک تیرے رب کی طرف ہی انتہا ہے۔ اور پھر جب ظاہر ہوا علم کے مراتب میں، اور ممتاز ہوگیا تو منقسم ہوگیا۔ وہ اس دائرے سے دو قوسوں میں۔ مثبت اور منفی قوسیں۔ پس منفی قوس جو ہے وہ مرتبہ بشرط لا کے ساتھ، اور مثبت قوس مرتبہ بشرط شی کے ساتھ۔ اور مطلق قابلیت وہی ہے اور وہی صلاحیت، اور یہ دونوں مرتبے لوگوں کے نزدیک تعیّن اوّل ہیں، اور اسی کا نام ہے حقیقت محمدیہ (ان پر خدا کا درود وسلام) پس جان لے اس آیت کریمہ کا راز کہ پھر وہ قریب ہوا اور اوپر معلق ہوگیا۔ پس وہ دو کمانوں کے برابر یا اس سے بھی کچھ کم فاصلہ رہ گیا اور مرتبہ لابشرط۔ اس شرط کے ساتھ جو شامل ہے ان دونوں میں وہ وجود کا خالص مرتبہ ہے۔ ثمّ (بمعنی بازـ پھر) بعد میں آنے والا یہ حرفِ اتصال ہے۔ جو تاخر پر دلالت کرتا ہے اور صرف (اذا) وقت کی خبر دیتا ہے اور حضرت وجود کے مراتب ظہور پر تقدم ذاتی کے اعتبار سے ہے نہ کہ

تقدم و تاخر زمانی کے لحاظ سے۔ یاد رہے کہ یہاں (اذا) مجرد زمان کے لیے آیا ہے۔ یعنی کہ حضرت وجود کے ظہور کے وقت، اور وہ فعل انقسم سے منسوب ہے۔ یا پھر زمانہ ماضی کے لیے ہے۔ بے شک وہ ہے اگرچہ زمانِ مستقبل کے لیے۔ غالب واکثر استعمال میں۔ وہ زمانہ مستقبل کے لیے ہے۔ اگرچہ وہ داخل ہو ماضی پر استعمال مستقبل ہی میں ہوتا ہے۔ لیکن کہیں کہیں ماضی پر بھی استعمال ہوا جیسے کہ اللہ تعالیٰ کے اس قول میں جہاں تک کہ وہ پہنچا، جب پہنچا دو بندوں (سدوں) کے درمیان! پس یہاں بھی ماضی کے لیے ہے نہ کہ مستقبل کے لیے، اور ظہور و امتیاز کے لیے ظرف، پس جب حضرت وجود نے مراتب علم میں ظہور کیا، اور امتیاز پایا تو وہ اس مرتبے سے جو بمنزلہ دائرے کے ہے، سلبی اور ایجابی نامی دو قوسوں میں بٹ گیا۔ اور لفظ دائرے سے نسبت اس مناسبت سے کی گئی ہے کہ وجود امر واحد ہے، اور گول شکل بھی امر واحد ہے۔ اور دیگر اشکال کے برعکس ایک ہی حرکت سے پیدا ہوتی ہے۔ نیز اس کے مرکز کا سارے ضلعوں سے برابر فاصلے پر ہونے کی مناسبت سے۔ یہی وجہ ہے کہ مفردات قوتِ واحدہ ہونے کی وجہ سے گول ہوتی ہیں۔ عناصر آسمان اور ستاروں کی طرح ان کی شکلیں بھی مدور (گول) ہوتی ہیں۔ حاصل کلام یہ کہ سلبی قوس مرتبہ بشرط لا شی ہے۔ اور ایجابی قوس مرتبہ بشرط شئ۔ اور صوفیا کے نزدیک ایجاب وسلب میں شامل مطلق قابلیت یعنی قوسوں میں منقسم ہوجانے کی صلاحیت اس دائرے میں تعین اوّل ہے۔ کیونکہ کسی شے کے ظہور کی صلاحیت اس شے کے ظہور سے مقدم ہے۔ لہذا تعین اوّل وہی صلاحیت ٹھہری اور یہ جامع مرتبہ یعنی اس تعین اول کا نام حقیقت محمدیہ رکھا گیا (ان پر خدا کا درود و سلام ہو) پس اس آیت کریمہ کے راز کو خوب سمجھ لے کہ پھر وہ فرشتہ آپ ﷺ کے نزدیک آیا پھر اور نزدیک آیا۔ سو دو کمانوں کے برابر فاصلہ رہ گیا بلکہ اور بھی کم۔ اور مرتبہ لابشرط شے جو مرتبہ بشرط لا، اور مرتبہ بشرط شے پر مشتمل ہے۔ اور ان تمام مراتب کا منبع و مبدا ہے۔ وہ اسی پاک ذات کا مرتبہ ہے اور مجموع کی مثال اسی طرح ہے۔ مرتبہ لابشرط کا دائرہ جو تمام مراتب کا مبدا ہے ان سب پر محیط بھی ہے۔

یہ بیان تو بات کے سمجھانے کے لیے ہے۔ ان مراتب کو بالکل دائرے اور قوسوں کی شکلوں میں نہ سمجھ لینا چاہیے، کیونکہ مثال مثل نہیں ہو سکتی۔ (مثل سب صفتوں میں مساوی مگر مثال میں بعض غیر مساوی) جیساکہ قرآن شریف میں آیا ہے کہ ہم ان قرآنی مثالوں کو لوگوں کے سمجھانے کے لیے بیان کرتے ہیں اور ان مثالوں کو بس علم والے لوگ ہی سمجھتے ہیں۔ یہ مثالیں ہیں جنھیں بیان کرتے ہیں لوگوں کے لیے اور ان کی عقل نہیں رکھتے، مگر عالم لوگ کیونکہ عالم ہی عاقل ہوتے ہیں۔ جو عقل رکھتے ہیں مثالوں میں سے ان کی حقیقت کی جو مثل ہوتی ہے عقل کے اندر اور پالیتے ہیں ان کے معانی اور غافل وجاہل وہ حیوانات کی طرح ہوتے ہیں۔ جب وہ دیکھتے ہیں ان امثال کی طرح یا سنتے ہیں اور تصور باندھتے ہیں ان کی بنی ہوئی صورتوں کے خیال میں، اور بیٹھے رہتے ہیں تردّد میں اور شبہات میں، حقیقت کا ادراک نہ پانے کی وجہ سے، اور وہ کہتے ہیں بے شک اللہ تعالیٰ ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتا کہ وہ مثال بیان کرے کوئی بھی مثلاً مچھر کی یا اس سے بھی کم چیز کی، پس وہ لوگ جو ایمان لائے وہ جانتے ہیں کہ حق ان کے رب کی طرف سے ہے۔ اور وہ لوگ جنھوں نے کفر کیا پس وہ کہتے ہیں کہ ارادہ کیا اللہ نے اس مثال سے!! گمراہ کرتا ہے اس سے اللہ تعالیٰ بہت سوں کو، اور ہدایت دیتا ہے اس سے بہت سوں کو۔ اور وہ نہیں گمراہ کرتا اس سے مگر فاسقین کو جو توڑتے ہیں عہد اللہ کا اُسے مضبوط باندھنے کے بعد۔ اور اُسے کاٹ دیتے ہیں جسے اللہ نے جوڑنے کا حکم دیا ہے اور زمین پر فساد برپا کرتے ہیں زمین میں دراصل یہی لوگ نقصان اُٹھانے والے ہیں۔ پس پاک ہے وہ ذات جس کے لیے مثل اعلیٰ ہے اس کے ساتھ کہ نہیں ہے اس جیسی کوئی بھی چیز۔ پس تم پر لازم ہے کہ تم اسے پاؤ ہر اس چیز میں جو تم پاتے ہو۔ اور اگر تم نہیں پاتے، پس جان لو کہ بے شک وہ تمھیں پالیتا ہے اور اللہ تمھارے ساتھ ہے، جہاں کہیں بھی تم ہو اور احسان کرو جس طرح کہ اللہ نے تم پر احسان کیا۔ کیا احسان کے بدلے میں احسان کے سوا کوئی اور چیز ہے، اور احسان یہ ہے کہ تو عبادت کرے اللہ کی گویا کہ

تو اسے دیکھ رہا ہے۔ اور اگر تو اُسے نہیں دیکھتا تو بے شک وہ تمھیں دیکھ رہا ہے۔ لہٰذا تم پر لازم ہے کہ تم کسی چیز کو پاؤ تو اس چیز میں اسے ڈھونڈنے کی کوشش کرو، اور اگر نہ پاسکو تو تمھارے مشاہدے کا قصور ہے۔ مگر یہ سمجھ رکھو کہ وہ تمھیں ہر جگہ اور ہر حال میں پالیتا ہے۔ جیسا کہ حق تعالیٰ نے خود فرمایا ہے کہ تم جہاں کہیں بھی ہو اللہ تمھارے ساتھ ہے۔ تم بھی احسان کرو جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے تم پر احسان کیا ہے۔ یعنی اُس نے اپنے آپ کو پوشیدہ رکھا اور تمھیں ظاہر کر دیا۔ لہٰذا تمھیں چاہیے کہ اُس کے نور وجود کی شعاعوں میں اپنے آپ کو چھپاؤ اور اُسے ظاہر کرو۔ کیونکہ غایت اطاعت کا بدلہ بجز عنایت کے اور کچھ نہیں۔ اور احسان جیسا کہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ تم حق تعالیٰ کی پرستش یوں کرو جیسے تم اسے ظاہری آنکھ سے دیکھ رہے ہو اور اگر تم نہ دیکھ سکو اور مظاہرات کے حجاب حائل ہو چکے ہوں تو یہ سمجھ لو کہ وہ تمھیں دیکھ رہا ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا قول صادق ہے کہ تم جدھر کو رُخ کرو اُدھر ہی اللہ تعالیٰ کا رُخ ہے۔ ترجمہ رباعی اے رب بے شک جب میں نے جان لیا کہ تو ہی معبود ہے، بے شک میں نے سجدہ کیا تجھے ہی یوں کہ تو ہی مسجود ہے۔ میں نے پایا تجھے تمام اعیان میں۔ اے کہ تو وہ ہے جو وجود بھی ہے اور موجود بھی۔ یعنی اے میرے رب جب کہ میں نے جان لیا، اور جب میں نے ادراک کر لیا کہ معبودیت منحصر ہے تجھ میں، اور نہیں ہے معبود سوائے تیرے۔ پس اس حقیقت کے ادراک کے بعد میں جہاں کہیں بھی ہوں سجدہ کرتے ہوئے تو پس مسجود تو ہی ہے اور کوئی نہیں۔ اور بے شک میں نے سجدہ کیا تیری مسجودیت کے مکان کو اور (اذا) میں شرط کے معنی ہیں۔ اور یہ ترتیب ہے ایک مضمون کی ایک جملے پہ دوسرے جملے کے ساتھ اور یہ اپنے اندر اس کے معنی لیے ہوئے ہے، اس میں راسخ نہیں ہے اس لیے اس کی جزا میں جملہ اسمیہ آیا ہے۔ یعنی إِنِّي سَجَدتُ (بے شک میں نے سجدہ کیا) بغیر (فا) کے جیسے اللہ تعالیٰ کا یہ قول کہ وہ لوگ جب ان پر زیادتی کی جاتی ہے تو اس کا مقابلہ کرتے ہیں۔ حاصل کلام یہ کہ جب یہ بات سمجھ میں آگئی کہ اللہ کے سوا اور کوئی معبود نہیں۔ پس ہر عبادت خواہ کوئی بھی کرے اسی کی طرف رجوع کرتی ہے۔ کیونکہ اس کے سوا اور کوئی دوسرا معبود نہیں، اور چاروں کھونٹ پہ پھیلی ہوئی یہ کائنات اس بارگاہ معلّیٰ کی جامع مسجد ہے، اور سارا روئے زمین اک سجدہ گاہ ہے۔ اور بنایا

زمین کو میرے لیے مسجد۔ پس سجدہ کرنے والا ایسا عارف اپنے معبود و مسجود کو اپنی چشم بصیرت سے دیکھتے ہوئے سجدہ کرتا ہے۔ اور جب اس حقیقت کا انکشاف ہو جاتا ہے کہ یہ موجود حقائق اسی کے وجود کی جلوہ گاہ ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ یہ وجود ہی ہے جو موجود بھی ہے۔ حق تعالیٰ کے سوا اور کوئی معبود نہیں اور الا اللہ کی حقیقت سے سوا اور کوئی مقصود نہیں اور اللہ کے سوا کوئی قائم بالذات موجود نہیں۔

هوالناصر

شروع اللہ کے نام سے جو نہایت مہربان اور بہت رحم کرنے والا ہے

ہر قسم کی تعریف اللہ کے لیے ہے جو تمام اذکار میں مذکور ہے، اور تمام افکار میں گزرنے والا ہے۔ اور درود و سلام ہو اس کے رسول محمد صلعم پر جو مقربین اور ابرار کے سردار ہیں۔ اور آپؐ کی آل پر جو واقف ہیں رازوں کے اور آپؐ کے اصحاب پر جو مہاجر اور انصار ہیں۔ امابعد یہ بیسواں[20] باب ہے جو ذکر اللہ کے نام سے موسوم ہے۔ وہ لوگ جو ایمان لائے، اور ان کے دل مطمئن ہیں اللہ کے ذکر سے آگاہ رہو کہ اللہ کے ذکر ہی سے دل مطمئن ہوتے ہیں۔ ذکر ہی امر مذکور کے نام کا تذکرہ ہے وہ اس اسم کا نام ہے جو زبان یا دل سے لیا جائے۔ بغیر مسمیٰ کی ذات کی طرف نفس کی توجہ کے۔ اور بے شک مسمیٰ کی طرف توجہ کا مجتمع کرنا یہ ذکر کے ساتھ حضور قلب ہے۔ اور اگر توجہ بغیر نفس کے تذکرے کے ہو، تو یہ فقط حضور ہے۔ اور اگر ذکر فقط زبان کے ساتھ ہے تو ذکر جہری ہے اور جہر کے لیے مرتبے ہیں دوسرے مرتبوں سے الگ، آواز کی بلندی اور پستی کے لحاظ سے۔ اگر یہ ہے فقط دل کے ساتھ تو یہ ذکر خفی ہے۔ اور خفی کے بھی مراتب ہیں اس کے راز کے اعتبار سے اور اس کے راز کے راز کے اعتبار سے، اور ذکر کی مداولت اور مواظبت (تواتر) کبھی کبھی سبب بن جاتا ہے اطمینانِ قلب کا۔ اگرچہ بحیثیت مجموعی ہو۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کسی عمل کرنے والے کا عمل تم میں سے چاہے کوئی مرد ہو یا عورت ضائع نہیں کرتا۔ تم میں سے بعض بعض میں سے ہیں، اور ذکر

کرنے والوں کے لیے یہ اک نصیحت ہے۔ جہاں تک اطمینان کی حقیقت کلی کا تعلق ہے، تو وہ اللہ کے ذکر سے حاصل ہوتی ہے، یعنی جب اللہ کا ذکر کرتا ہے اس کا بندہ۔ اللہ اپنے بندے کے انتخاب اور چناؤ کے لحاظ سے، اور حق ہوتا ہے فاعل ذکر کے لیے، اور ہوتا ہے فاعل حق ذکر کا مصدر کا منسوب کرنے کے لحاظ سے فاعل کی طرف، نہ کہ بندے کا مصدر کو منسوب کرنے کا مفعول کی طرف مقدر ہونے کی نسبت سے۔ حق فاعل ہوتا ہے ذکر کا، بندہ فاعل نہیں ہوتا۔ اور یہ ہے ذکر اللہ کا جس سے دل مطمئن ہوتے ہیں۔ اور ذکر اللہ جو ہے، یہ سب سے بڑا ہے۔

سلوک وطریق کے بیان کا باب

سلوک وطریقے کے بیان سے ہمارا مقصد سلوک کے بعض دیباچے اور طریقت کے بعض امور کا اظہار ہے۔ سالکانِ راہ کے لیے جن کو مدِّ نظر رکھنا، نہایت ضروری بلکہ لازم ہے۔ یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ سلوک (نیک روی) ان حالات وکیفیات سے عبارت ہے جو راہروانِ راہِ حق کو اس سفر کے درمیان پیش آتے ہیں، اور طریقہ عبارت ہے ان اوراد و وظائف سے جو ہر طریق کے مرشد محبوب حقیقی تک پہنچنے کے لیے اپنے مریدوں کو سکھلاتے ہیں اور ہر طریقے کی نسبت کی اپنی علیحدہ روش ہے۔ بلکہ ہر طریق میں ہر شخص کا اپنا علیحدہ رنگ ہے ع اللہ تعالیٰ کو اپنے ہر بندے کے ساتھ علیحدہ علیحدہ راز و نیاز ہے۔ اور اپنے طریق کی نسبت کا رنگ اس نسبت کے حاصل کرنے والے ہر سالک کے اپنے حسبِ حال ہوتا ہے۔ وہ خود ہی اس کی قوت یا کمزوری کا ادراک کرتا ہے۔ تمام نسبتوں کی حقیقت کو کماحقہٗ دریافت کرنے کے لیے مسلک محمدیؐ کا ایسا عارف ہونا چاہیے جسے محمدیؐ ولایت کی پوری معرفت ہو، اور جو مخلص محمدیؐ ہونے کے شرف سے مشرف ہو، اور طریق محمدیؐ کی نسبت تمام طریقوں کی نسبت پر فوقیت رکھتی ہے، بلکہ تمام طریقوں کی خاتم ہے۔ منتہی ہے جس طرح حضور پاکؐ کی نبوت، نبوت و رسالت کی خاتم ہے۔ اور سب حمد و ستائش اللہ ہی کے لیے ہے۔ جس نے اپنے مومن بندوں کو بہت سوں پر فضیلت دی۔ اس طریق کے ظہور سے ختم ہو جاتے ہیں، اور قیامت تک آنے والے طریقے بھی اسی جامع اور استوار طریق ہی کی شاخیں ہوں گے۔ سب حمد و ستائش اسی کے لیے ہے جو اوّل بھی ہے اور آخر بھی، اور اُسی کا حکم چلتا ہے

اور اسی کی طرف سب رجوع کریں گے ۔ اس نسبت کا احاطہ ازل سے لے کر ابد تک ساری نسبتوں پر پھیلا ہوا ہے ۔ اور نسبتِ کاملہ کا مالک اپنی تمام و کمال برکات کے باعث اگلوں کے لیے باعثِ فخر اور پچھلوں کے لیے اک سند ہے ۔ دونوں جہانوں کا سردار خاتم الانبیاءؐ اگرچہ سب رسولوں کے بعد آیا لیکن وہ اپنے سے پہلے آنے والوں کے لیے باعث فخر تھا ۔ جس طرح حضور محمد مصطفیٰؐ کا وجود مبارک تکوین کائنات کا باعث اور تمام عالم کے وجود کے لیے سراپا فیضان ہے ۔ جیساکہ اس فرمان سے ظاہر ہے کہ اے رسولؐ اگر تمھیں پیدا نہ کرتا تو یہ افلاک بھی پیدا نہ کرتا ۔ بالکل اسی طرح محمدیؐ طریق کا فیض طرفین پر مشتمل ہے ۔ یعنی ماضی اور مستقبل کے سب طریقے اس میں شامل ہیں خواہ اس سے مستفیض ہونے والوں کو اپنی عینِ حیات میں اس امر کی خبر ہو یا نہ ہو ۔ لیکن خدا نے چاہا تو قیامت کے دن اُنھیں اس حقیقت کا انکشاف ضرور ہو جائے گا ۔ ہمارے پاس کتاب ہے جو حق کے ساتھ بات کرتی ہے ۔ مگر جو لوگ جامعیت محمدیہ (ان پر خدا کا درود و سلام) کے قائل نہیں، اور اُس کے ساری مخلوقات پر محیط ہونے کی تصدیق نہیں کرتے اور جو مومنوں کی جماعت میں داخل نہیں، ہمارا روئے سُخن اُن سے نہیں ۔ اور اس آیت کریمہ کے حکم کے بموجب ان کا معاملہ خدا پہ چھوڑتے ہیں جیسا کہ اُس نے فرمایا کہ مجھ کو اور ان جھٹلانے والوں، ناز و نعمت میں رہنے والوں کو حالتِ موجودہ پر چھوڑ دو اور ان لوگوں کو تھوڑے دنوں اور مہلت دے دو ۔ ہمارے یہاں بیڑیاں ہیں اور دوزخ ہے اور گلے میں پھنس جانے والا کھانا ہے ۔ اور دردناک عذاب ہے ۔ افسوس صد افسوس ان کے حال پر اور حیف صد حیف اُن کے مال (انجام) پر ۔ اُنھیں کیا ہو گیا ہے کہ وہ ایمان نہیں لاتے ، اور جب ان کے سامنے قرآن پاک پڑھا جاتا ہے تو سجدہ نہیں کرتے بلکہ وہ لوگ جنھوں نے کفر کیا وہ جھٹلاتے ہیں ۔ اور اللہ خوب جانتا ہے جو کچھ وہ جمع کر رہے ہیں ۔ انھیں دردناک عذاب کی بشارت دے دیجیے سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور انھوں نے نیک عمل کیے ، ان کے لیے اجر ہے نہ ختم ہونے والا ۔ حاصل کلام یہ کہ تاکہ تجھے قرب الٰہی کی نسبت کا شرف بخشیں اور غائب ہوئے بغیر تجھے حضوری اور مشاہدے سے نوازیں اور طریقِ محمدیؐ کی برکات تجھ پہ نازل کریں اور اپنے حریم خاص میں تجھے باریابی بخشیں، حقیقت کا انکشاف کریں اور اسرار و رموز کی حقیقت دکھائیں اور تیری چشمِ بصیرت سے پردہ اُٹھا دیں اور انتخاب و برگزیدگی کے معاملات درمیان میں لائیں تو

بڑے عجز و انکسار سے اپنی کوتاہیوں کا اعتراف کر کے بڑی عاجزی اور الحاح کے ساتھ، حضور حق کی طرف رجوع کرتے ہوئے قبولیت حق کے امیدوار رہو۔ اس کے مبارک نام کو وسیلہ بناتے ہوئے اور قلبی ذکر کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے کہو کہ۔ **ترجمہ رباعی** ہر چند کہ دل حقیقت سے آگاہ نہ ہو سکا لیکن ہماری طلب و جستجو کا قدم ہنوز بر سر راہ ہے۔ یارب تو ہمیں اپنا نشان دے یا نہ دے مگر ہم ہیں اور تیرے نام (اللہ۔ اللہ) کا ورد۔ مصنف خود یوں وضاحت کرتا ہے۔ کہ اگرچہ دل جسے قوت عاقلہ کہتے ہیں حقیقت الہیہ سے آگاہ نہ ہو سکا۔ یعنی کہ کُنہِ ذات (ماہیت ذات) کو نہ پا سکا۔ کیونکہ یہ امر محال ہے جیسا کہ حضور نبی کریم صلعم نے فرمایا کہ ہم خدا کو کماحقہ' پہچان نہ سکے۔ لیکن سالک کا پائے جستجو جسے قوتِ فکریہ کہتے ہیں اپنی سرشت کے تقاضے کے بموجب ویسے ہی راہ طلب پہ چلتا جا رہا ہے۔ اے خالقِ دو جہاں تو ہمیں اپنا نشان دے یا نہ دے، یعنی اپنی ذات و صفات کے حقائق و دقائق ہم پر منکشف کرے یا نہ کرے، لیکن ہم ہیں اور یہی تیرے نام کی رٹ۔ ہم بڑے شوق و ذوق سے تیری یاد میں مشغول ہیں اور اس میں کوئی کمی نہیں کرتے۔ آخری مصرع میں اللہ اللہ یعنی اللہ جل شانہ' کے اسم مبارک کی تکرار نے جو لطف پیدا کیا ہے، جو اس کے معانی سمجھتے ہیں ان پہ واضح ہے۔ حاصل مطلب یہ کہ دل کو اتنی آگہی دینی چاہیے اور بڑے اہتمام کے ساتھ خواجگان کے مقرر کردہ انداز سے قلبی ذکر کرنا چاہیے کہ ذاتِ حق تعالیٰ کی آگہی جو حقیقتِ انسانی کا مخفی راز ہے دل میں ظہور پذیر ہو جائے۔ ان اوراد و وظائف کو اس تسلسل اور کثرت سے کرنا چاہیے جس سے خاصے فوائد مرتب ہو سکیں اور اللہ تعالیٰ کی یاد و آگہی اور حضوری و مشاہدہ کا ثمر ہاتھ لگ سے۔ حق بات تو یوں ہے کہ نقشبندی سلسلے کے حضرات کا طریق محبوب حقیقی سے واصل کرنے کا اک عجیب طریقہ ہے۔ اللہ تعالیٰ ان سب کو جزائے خیر دے۔ یاد رہے کہ وقوف قلبی عبارت ہے قلبی توجہ و حضوری اور حاصل شدہ آگہی کی نگہداشت سے، ذکر قلبی عبارت ہے ذکر خفی سے جو نقشبندی حضرات کا ابتدائی معمول اور دستور رہا ہے۔ اور آگہی سے مراد حضوری اور مشاہدہ' ذات ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انسانی حقیقت میں اُسے حاصل کرنے کی قوت ودیعت کر رکھی ہے۔ اور اس حالت کی اصل کیفیت کا ادراک ہر آدمی کو حاصل ہے۔ اور ظہور کردن سے مُراد علم کی آگہی یا آگہی پیدا کرنا ہے، اور عقل سے مراد وقتی طور پر اس کیفیت کو بہم پہنچانا ہے۔ پس اپنی مقرر کردہ تمام تر ہمت کو بروئے کار لا کر خواجگان (بزرگانِ نقشبندیہ)

کے معمول کے مطابق ہمہ تن مشغول ہو کر پشت بہ پشت، اور سینہ بسینہ اخذ کردہ ذکر اذکار و اوراد کو
عمل میں لانا چاہیے تاکہ ان کی عظیم برکات اور زبردست تاثیرات رونما ہوں، اور فائدہ مند ثابت
ہوں۔ وگرنہ اس قسم کے ورد و وظیفے جو متفقہ اور عام طور پر رائج ہیں کون نہیں جانتا، یا ایک دفعہ
سُن کر یاد نہیں رکھتا۔ لیکن کسی کام میں خودرائی اور ہٹیلا پن تو کسی کام نہیں آتا۔ بلکہ اس کے برعکس بسا
اوقات مضر اور نقصان دہ ثابت ہوتا ہے۔ لہٰذا اس نسبت کے حاصل کرنے کے لیے نیک اور نیکوکار
بندوں کی صحبت کی ترغیب دی جاتی ہے۔ جو اس دولت سے مالا مال ہوتے ہیں۔ اس عظیم دولت کے
پا لینے کے بعد اس کی دیکھ بھال میں پوری پوری کوشش کرنی چاہیے، اور حق سبحانہٗ تعالیٰ سے بڑی
عاجزی سے اس عطیہ کی طلب کرنی چاہیے، کہ یہ نسبت دائمی و دوامی بن جائے۔ اور خدائے عزّ وجل
کے حضور و مشاہدہ کا دوام اسی خدائے واحد و یکتا کے دوام کی مانند میسر آجائے۔ یعنی ذات باری تعالیٰ
کی معرفت کی عظیم دولت حاصل ہونے کے بعد اس نسبت کے تحفظ اور نگہداشت کی سعیٔ کامل کرنی
چاہیے تاکہ یہ نسبت استقلال اور دوام پیدا کرے اور اس امر کا پورا ملکہ حاصل ہو جائے اور عجز و نیاز
سے ذاتِ حق کی طرف متوجہ ہو کر اس کی عنایت خاص کا منتظر رہنا چاہیے کہ اس مقام (نسبت) سے ملنے
والے فائدے کا شعور حاصل ہو جائے اور مکمل انکشاف رونما ہو سکے۔ جو بزرگ ہستیاں حق سبحانہ تعالیٰ
کے دائمی مشاہدے و حضوری سے شرف یاب ہو چکی ہوں ان کی صحبت با برکت میں بڑے عجز و نیاز سے
حاضر ہو کر ان کی طرف ہمہ تن متوجہ ہو جانا چاہیے کہ اُمید رکھنی چاہیے کہ ان برگزیدہ حضرات کے
سر صدقے تمھاری حضوری و مشاہدے کی یہ نسبت دائمی شکل اختیار کر جائے، اور تیری اپنی ملکیت بن
جائے۔ اس نسبت کے حاصل کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ جن خوش بختوں کو دوامی مشاہدے کی یہ سعادت
حاصل ہے۔ ان کی خدمت میں بڑے خلوص و محبت اور اعتقاد سے جاؤ اور باقاعدہ حاضری دیتے
رہو۔ ان کی طرف ہمہ تن متوجہ رہو اور فیض کے امیدوار رہو۔ کیونکہ دل آگاہ دلوں پر بڑا اثر انداز ہوتا
ہے۔ (چراغ سے چراغ جلتا ہے) شاید خدا کے ان برگزیدہ بندوں کے صدقے تیری یہ نسبت بھی دوامی
ہو جائے، اور تیری اپنی ملکیت بن جائے حتیٰ کہ تو خود اس مقام کا مالک بن جائے اور اسی مرتبے پر فائز
ہو جائے جس جلیل القدر مرتبے پر بزرگ ہوتے ہیں۔ اور یہ سعادت مردانِ کامل اور مقبولانِ حق کی
متابعت، ان سے زبردست عقیدت و ارادت و محبت اور ان کے آداب خدمت بجا لائے بغیر

ہاتھ نہیں لگتی۔ **فائدہ** حقیقت ناآشنا منکروں کا گروہ عارفوں کے اس قسم کے بیان کو اپنی ذات سے اخلاص و محبت کا دعوت نامہ سمجھتا ہے۔ اور لوگوں کو آداب آموزی اپنی ہی بزرگ منشی سے منسوب کرتے ہیں۔ غفلت کے مارے یہ لوگ نہیں سمجھتے کہ عارفان ذات تو فنافی اللہ کی منزل سے گزر کر بقا باللہ تک پہنچ چکے ہوتے ہیں اور (مُوتُوا قبل اَن تمُوتُو) کے مصداق ہمیشہ اپنے آپ کو مُردوں میں شمار کرتے ہیں۔ اب مدّت حیات ہی کہاں جو ان احتمالات کی گنجائش ہو۔ یہ بیان اک امر واقعی ہے کہ زمانہ کوئی بھی ہو حال یا مستقبل آخر وہ کس صاحب کامل ذات سے مخصوص نہیں جو آیات قرآنی کی زبان سے کہتے ہیں کہ میں تم کو اپنے پروردگار کا پیغام پہنچاتا ہوں۔ اور میں تمھارا سچا خیر خواہ ہوں۔ اور نیز یہ کہ میں تم سے کوئی دنیوی صلہ نہیں مانگتا۔ میرا صلہ تو بس ربّ العالمین کے ذمّہ ہے۔ اور حق بات تو یہ ہے کہ رشد و ہدایت کا منصب ہے، اور نبوت و رسالت کے نائب ہونے کا مرتبہ ہے ۔ قرآن شریف میں آیا ہے۔ کہ آپ فرما دیجیے کہ اگر تم خدا تعالیٰ سے محبت رکھتے ہو تو تم لوگ میرا اتباع کرو، خدا تعالیٰ تم سے محبت کرنے لگے گا ۔ بندگانِ حق آگاہ کے نزدیک ایسے عارف ذات پر اس دعوے کا ہرگز احتمال نہیں کہ وہ تم سے برتری رکھتا ہے۔ اور اس تمام آگہیٔ ذات، معرفت حق اور فیض خداوندی کے بعد اس قسم کے اُمور کے حالات، یعنی غرور، تکبر، نفسانی خواہشات کی فرمانبرداری اور انا و خودی کی آمیزش ناجائز و ناروا ہے۔ اور غفلت کے مارے خبیث النفس لوگوں کی الزام تراشی کا کوئی اعتبار نہیں، اور نہ یہ ان کی راستی اور حقانیت میں خلل انداز ہو سکتی ہے۔ وہم کے ان ماروں نے تو انبیاءؑ تک کو نہیں چھوڑا کیونکہ اُنھوں نے اپنے ذہن کے مطابق اُنھیں کچھ اور ہی سمجھا۔ ایسے ہی لوگوں کے ظن و گمان کو مدّ نظر رکھتے ہوئے حق تعالیٰ نے فرمایا ہے، کہ وہ محض بے اصل خیالات پر چلتے ہیں اور بالکل قیاسی باتیں کرتے ہیں۔ بے شک تیرا رب جو ہے بہتر جانتا ہے کہ کون اُس کے راستے سے ہٹا ہوا ہے۔ اور کون سیدھے راستے پر ہے۔ پس پاک ہے وہ اللہ، کہ نہیں ہے کوئی معبود سوائے اس کے۔ اور بے شک ہم اس کی عبادت کرنے والے ہیں۔ اے قوم (لوگو) نہیں ہے کسی بشر کے لیے یہ روا، کہ دے اللہ تعالیٰ اُسے کتاب اور اختیار اور بنائے اُسے صاحب امر (اختیار) اس کے زمانے میں اور اُسے قائم مقام بنائے اپنے مرشد باپ کا۔ پھر وہ لوگوں کو کہنے لگے کہ میرے بندے بن جاؤ اللہ کو چھوڑ کر۔ یہ وہ بات ہے جس کا تم افترا کرتے ہو بلکہ وہ کہتا ہے کہ ہو جاؤ ربانی محمدؐی خالص، اور خالص کر لو اپنے دین کو اللہ کے

لیے جیسا کہ اس کتاب کی تعلیم کا تقاضا ہے جسے تم پڑھتے اور پڑھاتے ہو۔ اور تم سے ہرگز یہ نہ کہے گا کہ تم اماموں اور مرشدوں کو اپنا رب بنا لو، کیا یہ ممکن ہے کہ وہ تمھیں کفر کا حکم دے۔ اس کے بعد کہ تم مسلمان ہو گئے۔ اور وہ چیز جو تمھیں سکھاتا آداب میں سے، کہ تم نہ بلند کرو اپنی آوازوں کو اس کی آواز سے جسے بنایا اللہ نے واجب التعظیم، اور نہ بلاؤ اُسے جیسے تم آپس میں ایک دوسرے کو بلاتے ہو۔ اور اُس جیسے اور امور جو تمھاری حالت کو درست کرتے ہیں، اور تمھارے دلوں کو منوّر کرتے ہیں۔ بے شک یہی تادیبِ محمدیؐ ہے جس کے دقائق کو نہیں جانتا مگر وہی شخص جسے ادب سکھایا اللہ نے خالص محمدیوںؐ میں سے۔ اور طریقت میں یہی ہیں اللہ کی حدود، اور جس نے ان حدود سے تجاوز کیا۔ پس وہی لوگ ظالموں میں سے ہیں۔ اور جو کوئی اعتقاد نہیں رکھتا تم میں سے، مرتد ہو جاتا ہے طریق محمدیؐ سے۔ پس مختصر یہ کہ اللہ تعالیٰ ایسی قوم لے آئے گا جس سے وہ محبت کرتا ہے۔ اور وہ اس سے محبت کرتے ہوں گے۔ اور جو جہاد کرتے ہیں اللہ کے راستے میں اور نہیں ڈرتے کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے۔ اور وہ لوگ جو دوست رکھتے ہیں اللہ کو اور اُس کے رسولؐ کو، اور ان لوگوں کو جو ایمان لائے۔ بے شک اللہ کا گروہ ہی غالب آنے والا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ تائید فرماتا ہے محمدیوںؐ کی اپنی تائیدات کے ساتھ۔ اور گواہی دیتا ہے ان کی سچائی کی اپنی آیات کی شہادت کے ساتھ۔ اور بے شک ہمارا لشکر ہی کامیابی پانے والا ہے۔ حاصل کلام یہ کہ ان ہلاک کرنے والوں کے اعتراض کو نظر انداز کرتے ہوئے اُنھیں اُنہی کے حال پر چھوڑ دو۔ اور سالکوں کی تربیت کی طرف متوجہ ہو کر کوئی کوتاہی نہیں کرنی چاہیے حضوری مشاہدے کے دائمی حصول کے لیے جہاں تک اکتساب، ارادے اور سعی و کوشش کا عمل دخل ہے وہ تو اسی قدر ہے جتنا کہ ہم اوپر بیان کر آئے ہیں۔ اور سیر و سلوک میں جہاں تک بندگی کی حدود ہیں، وہ بھی اتنی ہی ہیں۔ فرمانِ الٰہیہ ہے کہ ایمان کے بارے میں انسان کو اپنی ہی کمائی ملے گی۔ اسی کے مطابق قربِ الٰہی، الہام اور حقائق و معارف میں سے جو کچھ بھی تمھیں عنایت ہو گا۔ وہ اللہ تعالیٰ ہی کا کام ہے، جس کا اُس کے فضل و کرم سے تعلق ہے۔ وہ اس کے فضل و کرم کے بغیر ہرگز نہیں ہو سکتا۔ جیسا کہ خود خدا نے فرمایا ہے کہ یہ محض اس کا فضل ہے جسے چاہے عطا فرمادے۔ سیر و سلوک اور سعی و جستجو یہیں تک ہے کہ حضوری و مشاہدے کے دوام کا مقام حاصل ہو جائے اور ارادے اور سعی کو فقط اتنا عمل دخل ہے کہ اس نسبت کا ملکہ حاصل ہو جائے۔ اس کے بعد جہاں تک قرب و

نزدیکی سے نوازیں اور اپنی خاص عنایت تجھ پہ مبذول کریں اور تجھ پہ حقائق و معارف کے کشف کی راہیں کھول دیں، اور خفی اور جلی رموز یا نشانیاں دکھائیں، اُس کا تعلق خدا کے نزدیک تمھاری مقبولیت اور برگزیدگی سے ہے۔ وہاں سعی و کوشش کا کوئی عمل دخل نہیں، بلکہ سعی و کوشش کی وہاں کوئی گنجائش ہی نہیں۔ اس کے آگے ترقی کا بالاتر مرتبہ مقصدیت اور محبوبیت کی راہ سے نکلتا ہے، اور اُس کا دارو مدار مقبولیت پہ ہے۔ ہر چند کہ سیر و سلوک کے مراتب کا طے کرنا ذاتی جد و جہد سے متعلق تھا، پھر بھی اللہ تعالیٰ کا فضل اور توفیق ربانی کی عطا اسی کی طرف سے ہے۔ لیکن وہ عنایت الٰہی انسان کی اپنی توانائی اور قوت کے آئینے میں جلوہ ریز ہوتی ہے۔ اور یہ عنایت خداوندی بغیر کسی آئینے کے جلوہ فرما ہوتی ہے۔ وہ الگ بات ہے، اور یہ بالکل الگ معاملہ ہے، اور قرآنی آیت کریمہ کے مطابق یہ بہت بڑی کامیابی ہے۔ جب تم نے ایسا مشاہدہ پیدا کر لیا اور بغیر کسی سُستی کے تمھیں اس امر کا ادراک ہوگیا کہ خدا ہمیشہ تمھارے ساتھ ہے اور ہر لحظہ تمھیں دیکھتا ہے، پس اب ہوگئی اس کی نگاہ، تمھاری بصیرت اور تم درمیان میں نہیں۔ یعنی جب اتنی قوت مشاہدہ حاصل کر لی، اور پھر اس مقام پر دائمی قرار و قیام حاصل کر لیا، اور خود فنا فی الذات ہو کر تم اس راز تک پہنچ گئے کہ وہی حاضر و ناظر ہے۔ اور یہ راز بھی تم نے اسی سے پایا تو پھر اس صورت میں تم اس حدیثِ پیغمبرؐ کے مطابق کہ تو میرے ذریعے سے سنتا اور میرے ہی ذریعے سے دیکھتا ہے تیرا گوش، گوشِ حق نیوش اور تیری چشم، چشمِ حق بین بن گئی۔ اور تو بیچ میں سے جاتا رہا۔ نہ بینائی رہی، نہ کوئی نشان۔ متن کی یہ رباعی اسی بات کی صراحت کرتی ہے۔ ترجمہ رباعی تیری چشمِ مست کی کیفیت میرے دل و دماغ پر یوں چھاگئی کہ اُس نے مجھے شراب کی کشمکش سے بے نیاز کردیا۔ میں نے اپنے دل پہ نظر ڈالی تو میں بے خود ہوگیا۔ شاید میرے اس شیشۂ دل نے تیری تجلی کا نشہ پیدا کر لیا ہے، مصنف خود اس کی وضاحت یوں کرتا ہے کہ تیری آنکھ کی مست اور ہوش ربا کیفیت سے میرے دل و دماغ پر مستی چھاگئی۔ مشاہدۂ ذات نے میرے دل میں دوام و استقلال پیدا کر لیا۔ اور میں ہر آن و ہر لحظہ تجھے حاضر و ناظر پاتا تھا۔ مستی کی اس کیفیت نے مجھے مے اعتبارات کی کشمکش سے بے نیاز کردیا ہے۔ میں فقط تیرے بے نام جذب سے مست و سرشار ہوں اور جب اپنے دل پہ نظر دوڑاتا ہوں تو بے خود ہو جاتا ہوں۔ تیرے جذب کامل کی وجہ سے مجھے اپنی ہوش نہیں رہتی لہٰذا معلوم ہوتا ہے کہ میرے آبگینۂ دل نے جو تیری شراب الست کی تجلی گاہ ہے، تیری تجلی کا نشہ پیدا کر لیا ہے۔ کیونکہ جس طرح تیری تجلیات کے مشاہدے سے فنا نمودار ہوتی ہے۔ اسی طرح اپنے اس قلبِ حق آگاہ کی طرف متوجہ ہو کر اک گونہ بے خودی حاصل ہوتی ہے، جسے اللہ تعالیٰ نے شراب طہورہ پلادی ہے۔

هوالناصر

شروع اللہ کے نام سے جو نہایت مہربان اور بڑا رحم والا ہے

ہر قسم کی تعریف اللہ کے لیے ہے، جو نازل کرنے والا ہے تسکین دلوں پر، اور درود و سلام اس کے رسول محبوب صلعم پر اور آپؐ کی آل پر، اور آپؐ کے معصوم صحابہؓ پر جو محفوظ ہیں عیوب سے اور گناہوں سے۔ اما بعد پس یہ اکیسواں باب ہے جس کا نام سکینتہ القلوب ہے۔ اور وہی ذات ہے جس نے نازل کی تسکین مومنوں کے دلوں میں۔ کیونکہ دل طبعاً ہمیشہ الٹتا پلٹتا رہتا ہے۔ پس اگر نہ نازل کرے اللہ تعالیٰ سکینت اس میں ایمان کے ساتھ اپنی قیّومیت کے ساتھ جو متغیّر نہیں ہوتی اور تبدل نہیں ہوتی، تو دل کے لیے سکون کیسے حاصل ہو سکتا ہے۔ پس اس سے یہی ظاہر ہوا کہ ظاہری دل جو کہ گوشت کا اک لوتھڑا ہے۔ اس سے الٹ پلٹ ہونے کی صفت زائل نہیں ہوتی، اور اس کا خون ایک پیٹ میں سے دوسرے پیٹ کی طرف منقلب ہوتا رہتا ہے۔ اور حرکت کرتا رہتا ہے ہر وقت۔ پس اُسے نہیں حاصل ہوتی سکینت جو کہ ماخوذ ہے سکون سے۔ پس قلب سے یہاں مراد قلب حقیقی ہے، اور وہ نفس ناطقہ ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نازل کرتا ہے سکینت مومنین عارفین کے دلوں میں، اور نہیں منقلب ہوتا یہ نفس ساکنہ مشاہدے کی حالت سے غفلت کی حالت کی طرف ہمیشہ، اور لوٹتا ہے اللہ کی طرف کامل طمانیت کے ساتھ۔ جیسے اللہ عزّوجل نے فرمایا کہ اے نفس مطمئنہ لوٹ اپنے رب کی طرف اس حالت میں کہ اللہ تجھ سے راضی اور تو راضی اپنے رب سے۔ پس سکینت عبارت ہے اطمینان کے آغاز کے

مقام سے، اور اطمینان وہ چیز ہے جو رضا کا پھل دیتی ہے، اور سکینت کے مرتبے کی انتہا ہے۔ پس یہ بات خوب سمجھ لو۔

دلجمعی و پراگندگی اور ان کے مناسبات کے بیان کا باب

دلجمعی اور پریشانی کے بیان سے ہمیں یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ دلجمعی کن چیزوں سے عبارت ہے اور پریشانی کیا چیز ہے۔ ان سے مناسبت رکھنے والے بیان کو سلوک ہی کے مطالب میں سے سمجھنا چاہیے۔ جمعیت کی چند صورتیں ہیں۔ ایک صوری جمعیت یعنی دنیاوی مال و اسباب کا جمع کرنا، اور یہ اہل دُنیا اور اہلِ ہوا و ہوس کی دلجمعی ہے، جو دراصل حقیقی پریشانی ہے۔ اور اربابِ سلوک کو اس سے کوئی سروکار نہیں۔ ایک معنوی دلجمعی جو عبارت ہے اخلاقِ حمیدہ اور اوصافِ پسندیدہ، عجیب و غریب علوم و فنون اور دیگر شائستہ ترین طور اطوار کے جمع کرنے سے، اور یہ جمعیت ذاتی کمالات میں شمار ہوتی ہے اور حُسنِ معاشرت کے لیے مفید ہے۔ ایک ظاہری جمعیت ہوتی ہے جو عبارت ہے وقت کی پابندی، نیک کاموں اور شرعی احکام کے بجالانے اور گناہوں اور خلاف شرع کاموں سے باز رہنے سے۔ اور اس دلجمعی کو حواس کے قائم رکھنے میں بڑا عمل دخل ہے۔ اور یہ آخرت کے لیے مفید ہے، اور ایک باطنی جمعیت ہے، اور یہ دل کا نفسانی خواہشات اور ماسوی اللہ اور تمام خیالات سے بے خوف و خطر ہونا ہے۔ اس میں حضوری اور مشاہدے کی لذت و سرور ہے۔ اس جمعیت کا نام قرب و نزدیکی ذات میں ہے اور نفس کے لیے ماسوی اللہ کے پھندوں سے نجات کا باعث بھی ہے، اور دُنیا و آخرت میں مفید بھی۔ ایک حقیقی جمعیت ہے جو ان تمام اقسام جمعیت کے حصول کے ساتھ ساتھ ہر معاملے میں ہر قسم کے شک و شبہ اور تردد سے پاک ہونے سے عبارت ہے اور مکمل جمعیت خاطر ذاتِ الٰہی کی منظہر اور حقیقت محمدیہ کی آئینہ دار ہے (ان پر خدا کا درود و سلام)۔ اللہ تعالیٰ نے مومنین میں سے جسے چاہا یہ دولتِ جاوید عطا فرمادی، اور دلجمعیٔ کامل کا مالک ہجر و وصال، حقیقت، شریعت، تشبیہ، تنزیہہ، مستی و ہشیاری، فنا و بقا، دُنیا و آخرت کی سوجھ بوجھ۔ کشف، دلیل، علم و عمل، فقر و استغنا، عجز، طاقت، بے غرضی، حمیت، لاتعلقی، محبت، انس و وحشت، صحبت و تنہائی انکساری مجرد ہوتے اور عیالداری سبھی کا جامع ہوتا ہے۔ اور اُس کا باطن کلیتہً نورِ حق سبحانہٗ تعالیٰ سے نوراً علیٰ

نور ہوتا ہے۔ اور اُس کا ظاہر ہجر و فراق کے آداب کی تربیت کے بعد وصال تک پہنچ جاتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ اس کے سر و پا کو خالص محمدیتؐ کی خاص خلعت پہنا کر اُسے اپنا خلیفہ اور رسول اللہؐ کا نائب بنا دیتا ہے اور اُسے اپنے اور اپنے رسولؐ کے کمالات کی چادر کی لپیٹ میں لے کر ان چمگادڑ جیسی طبیعت رکھنے والے اندھوں سے چھپا لیتا ہے، اور ان بد خود غلط اترانے والوں کے کیے کرائے کو اپنی طرف مائل کر لیتا ہے اور اولیائے کرام کو اللہ کے اس گنبد تلے کوئی غیر پہچان نہیں سکتا۔ قباب جمع ہے قبہ کی بمعنی گنبد۔ اور یہ گنبد عبارت ہے کمال الٰہی سے، اور گنبدوں سے مراد کمالاتِ الٰہیہ ہیں۔ حاصلِ کلام یہ کہ اولیائے کرام اپنے اندر اخلاق الٰہی پیدا کر لیتے ہیں۔ اور یہ ستارے اس آفتابِ حقیقی کی روشنی میں چھپ جاتے ہیں، اور یوں خدا کے یہ برگزیدہ بندے اس مرتبے پہ فائز ہو جاتے ہیں۔ جس کے متعلق خدا فرماتا ہے کہ وہ مجھی سے دیکھتے ہیں، مجھی سے سنتے اور مجھی سے کھاتے ہیں، اور کسی کو ان کی اس کیفیت کی خدا کے سوا خبر تک نہیں ہوتی۔ اور اس علیمِ حقیقی یعنی اللہ جل شانہٗ کے سوا ان کے احوال کو کوئی نہیں جانتا۔ قصہ کوتاہ یہ کہ ہمیں پھر اپنے حرفِ مطلب کی طرف پلٹنا چاہیے۔ سو جب جمعیت (دلجمعی) کے ان مراتب کو خوب پہچان لو تو اس جمعیت کے بالمقابل پریشانی و پراگندگی کے تمام مراتب کا بھی قیاس کر لو جو محتاجِ بیان نہیں۔ دلجمعی اور پریشانی کے ہر مرتبے میں درجہ بدرجہ بہت سے جزئی مراتب بھی ہیں۔ چونکہ توجہ بحق، قربِ ذات اور کامل جمعیت خاطر دُنیا کو ترک اور ماسوی اللہ سے قطع تعلق کے بغیر میسر نہیں آسکتے، اور دُنیا کو قناعت و گوشہ تنہائی اپنائے اور نفسانی خواہشات کو چھوڑے بغیر ترک نہیں کیا جاسکتا۔ لہٰذا نفسانی خواہشات اور جسمانی لذات کے تاروں کو لازماً توڑ دینا چاہیے، اور اپنی توجہ کی ڈور کو توجہ و رضائے حق سے باندھ دینا چاہیے۔ ترجمہ رباعی اگر ہمارا دل حرص و ہوا سے اپنی آستین جھاڑ لے تو کوئی تعجب کی بات نہیں کہ یہ ایک حاکم اعلیٰ کی طرح حکمرانی کرے۔ اے درد! دل کو سکون و اطمینان نصیب ہو جائے تو یوں سمجھو کہ ہزار سلطنتیں مفت میں ہاتھ لگ گئیں۔ اب مصنف کی اپنی وضاحت ملاحظہ کیجیے تو رباعی کا حاصل مطلب یوں ہے کہ اگر دل آستین کو حرص و آز سے جھاڑ دے یعنی طمع و لالچ کو بالکل خیر باد کہہ دے تو کوئی حیرت کی بات نہیں کہ وہ حکمران کی طرح حکمرانی کرے، اور سبھی اس کے محکوم ہو جائیں۔ اور بادشاہ کی مثال سے یہاں ظاہری اعتبار سے لوگوں پر اُس کے حکم کے نفوذ و رسوخ کو دکھانا مقصود ہے۔ ورنہ ان ظاہری حاکموں کو جو اپنے نفس و نفسانی خواہشات کے غلام ہیں، ان روحانی بادشاہوں سے کیا نسبت جو

شہنشاہ حقیقی کے نائب ہیں۔ پس اگر ماسوی اللہ سے قطع تعلق، سکونِ قلب اور وساطتِ ربانی نصیب ہو جائے تو ایسے مردانِ حق کو گویا ہزاروں سلطنتیں مفت میں مل گئیں۔ بلکہ وہ ان کی اپنی سلطنت کے سامنے ہیچ ہیں۔ کیونکہ یہ آب و گل کی سلطنت ہے اور وہ دُنیائے دل کی سلطنت ہے

خود اپنے دل کے اندر اک جہاں موجود پاتا ہوں اسی کی سلطنت اچھی، اسی پہ اختیار اچھا

فائدہ جب تک آدمی اپنی نفسانی خواہشات اور ہوا و ہوس کا اسیر ہوتا ہے، وہ ہر کسی کا محکوم اور فرمانبردار ہوتا ہے، اور وہ اُمرا اور بادشاہوں کے احکام کے تابع ہوتا ہے، اور بنی نوع انسان کا محتاج ہو کر رہ جاتا ہے۔ اور جب اس جال سے رہائی پالیتا ہے اور اُسے اصلی آزادی نصیب ہو جاتی ہے تو وہ سب سے بے پروا اور بے نیاز ہو جاتا ہے، تو پہلے تو وہ اپنے نفس کا حاکم بن جاتا ہے اور پھر کارکنانِ قضا و قدر اُسے اپنے ظاہر و باطن کی حکمرانی عطا فرما دیتے ہیں، اور وہ اپنے حکم کے خلاف کوئی کام نہیں کرتا۔ اس وقت وہ صاحب حکم بن جاتا ہے جس کے متعلق قرآن شریف میں اللہ تعالیٰ یوں فرماتا ہے کہ ہم نے ان کو حکمت (یعنی علم احکام) اور نبوت عطا کی۔ یہ اپنی حاکمیت اور اولوالعزمی بھی اک منصب ہے جو حق تعالیٰ ہی عنایت فرماتا ہے جس کے بعد پھر دوسرے اس کے حکم کی تعمیل کرتے ہیں اور اُس کے ماتحت اور محکوم بن جاتے ہیں۔ وہ ان پہ فرمانروائی کرتا ہے، اور وہ اسے اپنا فرمانروا تسلیم کر لیتے ہیں۔ اور دوسروں پہ اس کی اطاعت کو فرض قرار دے دیتے ہیں۔ جیساکہ قرآن شریف میں آیا ہے۔ کہ اللہ اور اُس کے رسولؐ اور تم میں سے جو صاحبِ امر ہیں ان کی اطاعت کرو۔ یہ نہ سمجھ لینا چاہیے کہ دلی اطمینان خود دل کے ماسوی اللہ سے بے باک ہونے میں ہے، اور پراگندگیٔ خاطر اُس کا بالکل برعکس اطمینانِ قلب فقط یہی ہے کہ وہ ماسوی اللہ کے تمام خیالات سے خالی ہو اور حضوریٔ حق تعالیٰ کا دوام حاصل کرے۔ اور اُس کے سوا کسی غیر کے خیالات اس کے دل کے پاس پھٹکنے بھی نہ پائیں۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ کسی وقت بھی کوئی خیال دل میں گزرنے نہ پائے، یہ تو مشکل بات ہے کیونکہ دلی ارادے کے بغیر تو کوئی کام بھی نہیں ہو سکتا، تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ کاملانِ حق اور واصلانِ ذات سے تو پھر کوئی انسانی کام سرزد ہی نہیں ہو سکتا۔ نہیں ایسا نہیں بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ دل سے کوئی ایسا خیال گزرنے نہ پائے جو آگہیٔ حق میں رکاوٹ پیدا کرے، اور کوئی ارادہ بھی غفلت کی راہ سے نہ آئے جو اُسے اپنے خالق سے غافل کر دے۔ آراستن سے مراد ایسے اسباب

آرائش و زیبائش کی فراوانی ہے، جو زیب و زینت کو بڑھا سکیں۔ جیسے عمدہ لباس اور زیور پہننا اور پیراستن زائد چیزوں کو کم کرنے کو کہتے ہیں، جیسے ناخن کٹوانا، بال ترشوانا، اور دیگر ایسی اصلاحات تاکہ اعتدال حاصل ہو اور حسن دوبالا ہو۔ پس شرعی احکام کے مطابق امر معروف (نیک کام) کی ادائیگی سے اپنے آپ کو آراستہ کرنا چاہیے اور خلاف شرع کاموں سے پرہیز کر کے خود کو پیراستہ کرنا چاہیے، اور نیک عزم اور پرہیزگاری کی راہ پر گامزن ہونا چاہیے اور اپنے آپ کو حد سے زیادہ تنگ بھی نہیں کرنا چاہیے، اور تارک الدنیا نہیں بننا چاہیے۔ کیونکہ اسلام میں ترک دُنیا کی اجازت نہیں ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ تمہیں فراخی و کشائش دینا چاہتا ہے نہ کہ تنگی و عسرت۔ پس باطنی اور ظاہری دلجمعی یہی ہے جسے ہم نے بیان کر دیا۔ نہ کہ وہ جو ہوا و ہوس کے بندوں کے ظن و گمان میں ہے کہ جمعیت اسباب جمع کرنے میں ہے اور پریشانی انہی کے نہ ہونے میں ہے۔ گویا جمعیت خاطر وہی دلجمعی ہے جس کا ذکر ہم نے کر دیا، نہ کہ وہ جو ہوا و ہوس اور حرص و لالچ کے ماروں کے ظن و گمان میں ہے۔ یعنی دنیاوی مال و متاع جمع کرنے میں کیونکہ یہ ظاہری جمعیت ہزار طرح کی پریشانی و پراگندگی کا موجب بنتی ہے۔ اور پریشانی بھی وہی باطن اور اوقات کی پریشانی ہے، نہ وہ جسے اہلِ دُنیا پریشانی گمان کرتے ہیں۔ یعنی ظاہری مال و اسباب دنیوی کا نہ ہونا۔ کیونکہ یہ صوری پریشانی اور کم مائیگی بعض اوقات پریشانی کا موجب بنتی ہے۔ غرض یہ ہے کہ یہ سوچ محض ان احمقوں کے گمان و قیاس پر مبنی ہے۔ اور اس آیت کریمہ کے بموجب یقیناً بے اصل خیالات امر حق کے اثبات میں ذرا بھی مفید نہیں ہوتے۔ اور یہ بے سر و پا خیالات امر واقعی کا ادراک نہیں کر پاتے۔ جیسا کہ ایسے لوگوں کے متعلق اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں فرمایا ہے۔ کہ اے مخاطب تو ان کو ظاہر میں متفق خیال کرتا ہے، حالانکہ ان کے قلوب غیر متفق ہیں۔ اور خود خدا نے اپنے رسول ؐ کو ایسے لوگوں کی حقیقت حال سے مطلع کیا، اور آگے چل کر ایسے لوگوں کی جن کے پاس دنیاوی مال و متاع اور جھوٹی شان و شوکت ہے۔ قلبی پریشانی اور ذہنی پراگندگی کو آشکارا کر دیا ہے اور ان کی دلجمعی کی نفی کر دی ہے۔ اسی لیے تو فرمایا کہ تم بظاہر ان کو قلبی طور پر مجموع و متفق سمجھتے ہو۔ حالانکہ ان کے دل پریشان و غیر متفق ہیں۔ یہ دنیوی مال و اسباب اُس طمانیت قلبی کے سلسلے میں کسی کام کے نہیں جو قربِ خداوندی کے حصول کے لیے ضروری ہے۔ لہٰذا حرص و آز کے مفاسد کا قلع قمع کیے بغیر اس سلطنتِ حقیقی سے جو ملک طمانیت و فراغت کی مملکت ہے شرفیاب ہونا محال ہے۔ اور باغی نفس پر جو سرکش شیطان ہے

حکم چلانا محض وہم وگمان ہے۔ اس راہ میں گام اولین تو دُنیا کو ترک کرنا اور حرص ولالچ سے پاک ہونا ہے کیونکہ حُبِّ دُنیا ہی ہر برائی کی جڑ ہے۔ اور ماسوی اللہ سے قطع تعلق اور دُنیا سے بے التفاتی کیے بغیر کامل طمانیت اور کلی سکون میسر نہیں ہو سکتا، اور نہ ہی اپنے باغی نفس امارہ پر جو باطنی شیطان و سرکش ہے غلبہ اور حکمرانی حاصل ہوتی ہے۔ وہ محض خاصانِ حق ہوتے ہیں جو اپنے نفس امارہ کے شیطان اور ابلیس کی شیطنت سے نجات پا کر ان دونوں دشمنوں کے پنجے کو لاحول ولاقوۃ الّا باللہ کے زور بازو سے توڑ مروڑ کر رکھ دیتے ہیں۔ خدا خود کہتا ہے کہ میرے جو بندے ہیں، نہیں ہے تیرے لیے ان پر کوئی دلیل۔ نفس کو شیطان استعارۃً بھی کہا گیا ہے اور گمراہی کے امور پر دلالت کرنے کی بنا پر بھی۔ اور نفس شیطان سے مراد ذاتِ شیطان ہے۔ نیز یہ تکرار لفظی حُسن عبارت کے لیے بھی کی گئی ہے۔ ان دونوں دشمنوں کا پنجہ بشری قوت و طاقت سے نہیں مروڑا جا سکتا۔ جب تک کہ قوت و طاقت کے سلسلے میں تائید ربانی ساتھ نہ ہو۔ جب ماسوی اللہ کی تمام قوتوں اور طاقتوں کی نفی کر دی جاتی ہے، تو نفس امارہ اور شیطان کی تاب و تواں کی بھی نفی ہو جاتی ہے۔ اور حق بات یہ ہے کہ لاحول ولا قوۃ الّا باللہ اور اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم پڑھنے سے نفس امارہ اور شیطان کو گمراہ کرنے کی مجال نہیں رہتی۔ شیطان تاب نہ لاتے ہوئے بھاگ کھڑا ہوتا ہے۔ اور انسان اللہ تعالیٰ کی قوت و طاقت کی پناہ میں محفوظ ہو جاتا ہے، لہٰذا جو لوگ اپنی قوت اور طاقت سے از خود خالی ہو گئے، وہ اس سلطان حقیقی جل شانہٗ کے خاص بندے ہیں ان پر شیطان قابو یا غلبہ نہیں پا سکتا۔ سبحان اللہ دُنیا کے بے ثبات ہونے کے باوجود دھوکے کی اس ٹٹی نے اک دُنیا کو ہلاکت کے بھنور اور اک جہان کو اپنی ظاہری نمود و نمائش کے تلاطم سے بحرِ غفلت میں ڈبو رکھا ہے۔ واہ سبحان اللہ، اللہ تعالیٰ کی عجیب قدرت ہے کہ ہر چند کہ متفقہ طور پر سبھی دُنیا کو فانی سمجھتے ہیں، اور سبھوں کے نزدیک اس کی بے ثباتی مسلّم ہے، لیکن اک دُنیا اس کے پھندے میں پھنسی ہوئی ہے اور اپنی ضروریاتِ زندگی کے لیے بے اختیار ہے۔ اور جن لوگوں کی قسمت میں دُنیا کے اس دامِ تزویر سے رہائی نہیں لکھی وہ بدستور اسیر روزگار، اور جنھیں حق تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے رہائی عنایت کر دی وہ رہا ہیں۔ اختیار اسی کا ہے جسے چاہے نوازے اور جسے چاہے خراب حال کرے۔ اللہ کے سوا کسی کو طاقت و قدرت نہیں، وہی اعلیٰ و غالب ہے۔ ترجمہ رباعی نفس نے ہماری عماری (ہودج) کو ہوا کے کندھوں پر باندھ رکھا ہے۔ صد حیف کہ ہمارے دل و دماغ میں ہوا و ہوس پیچ و تاب کھاتی

رہتی ہے ۔ اگرچہ ہم نے حباب کی طرح پیدا ہونے والے ہر نفسانی عقدے کو حل کر لیا تو کیا مگر مشکل کی وہ گرہ کھلی تو پتہ چلا یہ سب خالی خولی ہی تھا ۔ مصنف اس کی خودیوں وضاحت کرتا ہے کہ زندگی کی بنیاد ہوا ہی پر ہے ۔ اور یہ گنجان آباد دُنیا اک عدم آباد ہے ۔ لہذا افسوس و تاسف کا مقام ہے اگر اس دُنیا کی خواہشات ہمارے دل کو اپنے پھندے میں پھانس لیں ۔ کیونکہ نفسانی ہوا و ہوس کے تمام علاقوں کی مثال حباب کی سی ہے جو اندر سے خالی ہوتا ہے ۔ خواہشات کی ان گرہوں کو کھولتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ وہ خالی خولی تھیں ۔ سوائے توہمات کے اور کچھ پلّے نہیں پڑتا ۔ تو ہمات ہی خیالات پر چھا جاتے ہیں ۔ اور پھر پلک جھپکنے میں اڑ جاتے ہیں ۔ آگاہ رہو کہ ہر چیز اللہ کے سوائے باطل ہے ۔

هوالناصح

شروع اللہ کے نام سے جو نہایت مہربان اور بڑا رحم والا ہے

ہر قسم کی تعریف اللہ کے لیے ہے جو عظیم اور ہر چیز پر محیط اور زیادہ قریب ہے تمام چیزوں کے تمام چیزوں سے ، اور درود وسلام اُس کے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سید المقربین اور خاتم النبیین، افضل رسل پر اور آپؐ کی آل پر اور اصحاب پر جو واقف ہیں طریقوں اور راستوں سے۔ اما بعد پس یہ بائیسواں۲۲ باب ہے، جس کا نام قربت من اللہ ہے (اللہ سے قربت) قرب امر اضافی ہے۔ پس اس کے لیے اعتبار مغائرہ کے چارہ نہیں، اور دونیں سے ایک کا امتیاز ہے۔ پس حاصل ہوتا ہے مقام قرب خواص کو شان الوہیت کے شہود کے ساتھ، عبودیت کے اعتبار کے شعور کے ساتھ اور اقربیت جو کہ قربت کا سب سے بعید ترین مرتبہ ہے، نہیں ہوتا جانب عبودیت کے لحاظ سے، بلکہ ہوتا ہے الوہیت کی وحدت کے شہود کے ادراک کے ساتھ اور اس مرتبے میں جس میں نہیں مساعد ہوتی، بعید نہیں ہوتا اس میں بھی الوہیت کی حیثیت کا لحاظ اور خاص علم باقی رہتا ہے جو کہ اس کے عالم اور معلوم کا عین ہے۔ اور نہیں ہے تمیز ان حیثیات میں اس میں جیسے کہ علم حضوری کی حالت ہوتی ہے نفس کے لیے۔ پس اس مرتبے میں وہ وہ ہے، اور وہ اس کی معیت ہے، اور وہ اس کے ساتھ ہے اور مرتبۂ ثانی میں وہ الوہیت کے ساتھ ہے، اور کچھ معلوم نہیں سوائے اس کے اور مرتبۂ اولیٰ جو کہ قرب کا مقام ہے وہ تیرے ساتھ ہے اور تو اس کے ساتھ ہے، اور جب سوال کریں اللہ تعالیٰ کے بندے تجھ سے اس کے

بارے میں اپنی عبودیت کے شعور کے باوجود۔ پس کہہ بے شک وہ قریب ہے۔ اور اگر تیرا ارادہ اقربیت کے اظہار کا ہے، تو چھوڑ دے عبدیت کے تشخص کے لحاظ کو اور کہہ وہ زیادہ قریب ہے شاہ رگ سے بھی ان دو مرتبوں میں، یعنی قرب اور اقربیت میں علم زیادہ ہوتا ہے۔ اور عالم اور معلوم ممیز ہوتے ہیں۔ علمی امتیاز کے ساتھ اور علم عالم کے اور معلوم کے ساتھ اکٹھا ہوتا ہے یا فقط عالم کے ساتھ ہوتا ہے یا فقط معلوم کے ساتھ ہوتا ہے۔ جیسے علم حصولی کی حالت نفس کے لیے دیکھتے ہوئے اس کے نفس کی طرف، اور جو اس کے علاوہ ہے اکٹھے۔ یا فقط اس کے نفس کی طرف یا اس کی طرف جو نفس کے علاوہ ہے۔ فقط پس سمجھ لے، پس یہ قربتیں ہیں اللہ کے نزدیک۔

مخلوق کے ساتھ خالق کے قرب اور وجود کے احاطے کے بیان کا باب

احاطۂ وجود کے بیان سے منظور وجود کے ساری موجودات پر محیط ہونے کا بیان ہے۔

مخلوق کے ساتھ خالق کے قرب کے بیان سے اس امر کا بیان مقصود ہے کہ حق تعالیٰ ہر مخلوق سے ہر چیز اور ہر شخص کی نسبت زیادہ نزدیک ہے۔ کیونکہ کوئی شے اور کوئی شخص کسی چیز یا کسی شخص کے اتنا نزدیک نہیں جتنا کہ اللہ تعالیٰ نزدیک ہے۔ حتیٰ کہ اُس شے کی ذات سے بھی قریب تر ہے۔ لفظی طور پر قرب و نزدیکی کی اس نسبت کو قرآن پاک کی اس آیت کریمہ سے اخذ کیا گیا ہے۔ نحن اقرب الیہ من حبل الورید (کہ ہم رگِ گردن سے بھی زیادہ نزدیک ہیں) اسی طرح قرب کی نسبت کا ماخذ یہ آیتِ قرآنی ہے کہ اے رسولؐ جب میرے بندے آپؐ سے میرے متعلق دریافت کریں تو آپؐ میری طرف سے فرما دیجیے کہ میں قریب ہی ہوں۔ ان ہر دو نسبتوں کی ماہیت کا انکشاف تقرب الٰہی کے مختلف مراتب میں سے قرب و نزدیکی کے کسی مقام پر مشرف ہونے سے ہے۔ یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ قرب کی بھی دو قسمیں ہیں۔ ایک قرب وجوبی اور دوسرا قرب امکانی۔ قرب وجوبی عبارت ہے اس قرب سے جو اللہ تعالیٰ کو اپنی مخلوق سے ہے۔ اور جو واجب تعالیٰ کو عام طور پر ساری موجوداتِ ممکنہ سے ہے۔ مندرجہ بالا دو آیات قرآنی کے الفاظ کہ میں قریب ہی ہوں یا رگِ گردن سے بھی زیادہ قریب ہوں، اس عام قرب کی خبر دیتے ہیں۔ یہ قرب واجب ہے جو لازمی طور پر ہر وقت ہر کسی کے

شامل حال ہے، اور قربِ امکانی عبارت ہے۔ اُس قرب سے جو بندے کو اپنے علم کے مطابق اپنے رب سے حاصل ہوتا ہے۔ اور یہ خاص طور پر خاص خاص بندوں کو میسّر آتا ہے۔ جیسا کہ اس آیت کریمہ کے الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے کہ نماز پڑھتے رہیئے اور خدا کا قرب حاصل کرتے رہیئے۔ اسے قرب ممکن کہتے ہیں۔ اس لیے کہ ممکن ہے یہ بعض کو حاصل ہو اور بعض کو حاصل نہ ہو، اور بعض کو بعض اوقات میسّر ہو اور بعض اوقات میسّر نہ ہو۔ چونکہ یہ امکانی قربِ حقائقِ ممکنہ کے عبودیت کے مرتبہ ہی سے مخصوص ہے۔ لہٰذا یہ اللہ کے بندوں کے لیے قرب وجوبی کی نسبت زیادہ نفع بخش، سود مند اور افضل ہے۔ کیونکہ یہ قرب بندوں کے اپنے کمالات سے ہے، اور وہ دوسرا قربِ کمالاتِ خداوندی سے ہے۔ لہٰذا بندوں کو اُس قربِ وجوبی سے کیا حاصل۔ وہ قرب تو حق تعالیٰ کو ہر درخت اور ہر پتھر سے بھی ہے۔ پھر قرب امکانی میں وہ قربِ وجوبی بھی یقیناً شامل ہے۔ لہٰذا خاص بندوں کا قرب دوسروں کی نسبت دگنا ہوگا۔ یُوں کہ خدا کو ان سے قرب تو ہے ہی، اور اب اُن کا اپنا خدا سے قرب۔ لہٰذا وہ اس آیت قرآنی کے امتیاز سے ممتاز ہو جاتے ہیں کہ ان سے اللہ تعالیٰ کو محبت ہوتی ہے۔ اور ان کو اللہ تعالیٰ سے محبت ہوتی ہے، اور یوں وہ اس شرف سے مشرف ہو جاتے ہیں جو قرآن کریم کی اس آیت میں شامل ہے کہ اللہ تعالیٰ اُن سے راضی ہے، اور وہ اللہ سے راضی ہیں۔ اللہ کے بندوں کے اس قرب کے ان بندوں کے فرق درجات، ذاتی استعدادوں، مہارتوں، نیکیوں اور دانائیوں کے لحاظ سے بہت سے مراتب ہیں۔ جب یہ امکانی قرب انتہا کو پہنچ جاتا ہے۔ اور اس نسبت کا پورا ملکہ حاصل ہو جاتا ہے۔ تو یہ قرب وجودی کی مانند ہو جاتا ہے جسے زوال کا کوئی اندیشہ نہیں ہوتا، اور کبھی زائل نہیں ہوتا۔ خواب کی حالت ہو یا بیداری کی، دل گرفتگی کی یا شگفتگی کی، تنگی کی ہو یا فراخی کی۔ صحت مندی کی یا بیماری کی موت کی یا زندگی کی، معزول نہ ہونے والا اور قائم و دائم رہنے والا یہ ملکہ کمالاتِ نبوت ہی میں نصیب ہوتا ہے۔ ولایت کے قرب میں اتنی قوت نہیں ہوتی۔ کیونکہ یہ نسبت درحقیقت انبیاءؑ سے مخصوص ہے اور وہی ایسے ہوتے ہیں جو کبھی معزول نہیں ہوتے۔ بچارے اولیاء اللہ تو معزولی اور مشغولی کے خطروں سے دوچار رہتے ہیں اور ان کی نسبت کا دھاگا کچا ہوتا ہے۔ ولایت والی نسبت تو مریدی و اخلاص کی نسبت کی مانند ہے۔ مخلصین کو بڑے بڑے خطرات درپیش ہوتے ہیں۔ کمالاتِ نبوت کی نسبت مقصدیت اور برگزیدگی کی نسبت ہوتی ہے۔ اور اللہ اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے اس کے

یسے چُن لیتا ہے ۔ اس نسبت میں زوال کا کوئی احتمال نہیں ہوتا، کیونکہ اس نسبت کا منسوب انتخاب ربانی ہے، اور حق تعالیٰ تغیر و تبدل سے مبرا اور معرا ہے، لیکن اُس دوسری نسبت میں زوال کا احتمال ہے، کیونکہ اس کا منسوب اخلاص ہے ۔ اور بندہ تو تغیرات کا اک پلندہ ہے ۔ اور یہ آیت کریمہ جس کا مطلب ہے کہ ؎

خدا نے آج تک اُس قوم کی حالت نہیں بدلی نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا

مریدی کی نسبت رکھنے والوں کے لیے ہے، اور یہ انہی کا تغیر و تبدل ہے جسے حق تعالیٰ سے منسوب کر دیا جاتا ہے ۔ کیونکہ ایک طرف کے تغیر و تبدل سے دوسری طرف والوں میں تغیر و تبدل نمودار ہو جاتا ہے اگر ایک شخص کسی دوسرے شخص کے سامنے کھڑا ہو، اور پھر مُنہ پھیر کر پشت اس کی طرف کر دے ۔ لہذا جس طرح اس رُخ بدلنے والے شخص کی حالت میں تبدیلی آگئی کہ پشت کی بجائے چہرہ سامنے کر دیا اسی طرح غیر متغیر شخص کی حالت میں بھی فرق نظر آنے لگا کہ وہ پہلے تو سامنے تھا اب پیٹھ پیچھے ہو گیا ۔ اور غیر متغیر ہونے کے باوجود تغیر و تبدل کی یہ نسبت اس متغیر شخص کے تغیر و تبدل سے رونما ہوئی ۔ اور مقصدیت کی نسبت رکھنے والے ہمیشہ مرید حقیقی کی حمایت کے سایہ تلے ہوتے ہیں جیسا کہ اس آیت کریمہ سے عیاں ہے ۔ ہمارے حضور میں (یعنی خلعتِ نبوت کے عطا ہونے کے وقت) پیغمبرؑ ڈرا نہیں کرتے ۔ یاد رہے کہ حق تعالیٰ کی پاک ذات کے تقرب کی مقربان حق کے لیے دو قسمیں ہیں، ایک کسبی قرب جو نیک روی اور اپنی ذاتی جدوجہد سے حاصل کیا جاتا ہے جو عام اولیا اور ادھر سے سالکان راہ کو نصیب ہوتا ہے، اور جو ذکر اذکار اور اوراد و وظائف کے تواتر و تسلسل اور تصورات و خیالات کی درستی سے مشروط ہوتا ہے، اور اس کا تعلق انسان کی قوتِ ارادی اور قوتِ فکری سے ہے ۔ دوسرا قرب وہبی ہے جو محض اللہ تعالیٰ کے چناؤ اور انتخاب سے حاصل ہوتا ہے ۔ چنانچہ انبیائے کرامؑ اور کمالاتِ نبوت سے متصف اولیائے کرام کے حصے میں آتا ہے، اور کسب و سلوک کے امور کی شرط سے آزاد اور یہ محض عنایت ربانی اور اللہ کی دین سے مخصوص ہے ۔ پھر ان دو قسموں کی آگے بھی دو دو قسمیں ہیں، یعنی کسبی کی دو قسمیں اور وہبی کی بھی دو قسمیں ۔ یہ کسبی قرب اگر تو صرف اپنے علم و عرفان، ذہن کی تیزی اور عقل کی بدولت حاصل ہوا تو یہ قرب تفکری ہے ۔ اور یہ کثرت میں وحدت کے مشاہدے، تمام نسبتوں کے گرائے جانے، اعتبارات کی نفی کرنے، فنا فی الذات اور تمام قیود

سے لاتعلق ہونے جیسی عمدہ کیفیات اور اعلیٰ حالات کا حامل ہوتا ہے۔ اور اگر قرب محض ذکر اذکار یا اوراد و وظائف کے تسلسل صفائی باطن اور سخت جدوجہد اور کڑی عبادات کے تواتر سے تزکیۂ نفس کی بدولت حاصل ہوا ہو تو اُسے قرب تذکرہ کہتے ہیں۔ تو یہ بھی عجیب و غریب حالات و انکشافات جیسے کہ نوری وظاہری تجلیات، فعلی و صفاتی تجلیات، ماسوی اللہ سے دل کا بالکل خالی ہونا اور فقط اسی ذاتِ بے ہمتا سے لو لگائے رکھنے پر منتج ہوتا ہے اور وہبی قرب اگر صعودی حالات کے ورود کا باعث بنے اور دل پہ اس کا ورود اُدھر سے ہوا ہو اور قلبی جمعیت کی خبر دیتا ہے تو یہ قرب قرآنی ہے۔ اور اگر نزولی کیفیات پہ منتج ہے اور قلب پر حق تعالیٰ کے فرق صفات کے مرتبے سے وارد ہوا ہے اور جمع کے بعد فرق (وصل کے بعد ہجر) کے مقام کی خبر دیتا ہے تو یہ قرب فرقانی ہے اور قرب قرآنی اگر ملکوتی نفس کی وساطت سے حاصل ہو تو یہ قرب قدوسی ہے۔ اگر تصفیۂ قلب کی بدولت حاصل ہو تو یہ قرب قدسی ہے، اور قربِ فرقانی اگر مخلوق پر شہادتِ حق ہے تو قرب محکم ہے، اور اگر مخلوق کے خالق کی طرف اشارہ کرنے کی وضاحت کرے تو یہ قرب متشابہ ہے۔ بہرکیف قرب الٰہی کے معاملات کہنے سننے کی حد سے ماورا اور ناقابلِ فہم ہیں۔ اس ماوراالورا حقیقت کی دریافت کے سلسلے میں جو کچھ بھی کہا جائے وہ کم ہے۔ اور ان بزرگوں کے قرب میں کوئی شک و شبہ نہیں۔ وہ ہمیشہ اک عالم بے خودی میں ہوتے ہیں۔ جہاں اُنھیں اپنی خبر تک نہیں ہوتی۔ وہ مشاہدۂ ذات میں مستغرق ہوتے ہیں۔ ترجمہ رباعی اے درد اگر تجھے کچھ کہوں تو کیا کہوں۔ مجھے اپنی خبر نہیں تجھے کیا خبر سناؤں۔ کثرت ظہور سے وہ میرے باطن پر چھایا ہوا ہے، میں اس سے زیادہ کھُل کر تمھیں اور کیا بتاؤں!! اس رباعی میں شاعر نے اپنے آپ کو اپنے تخلص سے خطاب کیا ہے۔ اور یہ جدائی اور مغائرت اس بیان کے لیے ہے کہ اس باب میں قرب و نزدیکی کی نسبت کا ذکر ہے۔ اس مقام میں خودی کا گزر نہیں، وہ اس مرتبے سے بہت دُور اور الگ ہے۔ قصہ کوتاہ بقول شاعر رباعی کا حاصل مطلب یہ ہے کہ میں حق تعالیٰ کے قرب کے حقائق و معارف کا کیا ذکر کروں۔ کیونکہ یہ نکات نہ تحریر میں سما سکتے ہیں نہ تقریر میں۔ اگرچہ میں بشری استعداد و وسعت کے مطابق تمھیں بتانے کی کوشش کرتا ہوں، لیکن جو کچھ کہنا چاہیے وہ حیطۂ بیان میں نہیں آتا۔ کیونکہ میں وہاں ہوں جہاں سے مجھ کو بھی کچھ اپنی خبر نہیں آتی، اور خودی اور انا ایسے معاملات میں بالکل نیست و نابود ہوتی ہے۔ اور حضور رسول کریم صلعم (جنھیں کسی وقت اللہ تعالیٰ کا انتہائی قرب

حاصل ہوتا تھا) کے صدقے اس مقام میں اس وقت نہ امکانیت کو باریابی حاصل ہوتی ہے۔ نہ انانیت کا وہاں گزر ہوتا ہے۔ جیسا کہ قرآن پاک میں آیا ہے۔ بے شک انسان پر زمانے میں ایک ایسا وقت بھی آچکا ہے جس میں وہ کوئی چیز قابلِ تذکرہ نہ تھا۔ سبحان اللہ اگر تجھ پر معاملے کی حقیقت کا انکشاف کریں تو یہ راز پالے گا کہ اللہ تعالیٰ اپنے ظہور کے کمال کی راہ سے نظروں سے چھپا رہا، ایسے ہی جیسے آفتاب کی تیز شعاعوں کی شدت سے سورج کی ٹکیہ کی طرف نہیں دیکھا جا سکتا۔ اسی طرح کثرت مظاہر فطرت کے آئینوں میں جلوؤں کے اژدہام کے باعث اس ظاہر ہونے والی شے کا صحیح ادراک نہیں ہو سکتا۔ اور سوائے ان مظاہر کے اور کچھ نظر نہیں آتا۔ اور وہ کثرت ظہور سے باطن پر محیط ہو گیا، اور جو ظاہر ہے اب وہی باطن ہے۔ بقول اس آیت کریمہ کے کہ ظاہر بھی وہی ہے اور باطن بھی وہی۔ سو اس سے زیادہ واضح طور پر میں کیا بیان کروں، کیونکہ قلم ساتھ نہیں دے رہا۔ **نکتہ** یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ حق سبحانہ تعالیٰ بلحاظ علم مخلوق سے قریب ہے مگر وجودی لحاظ سے قریب تر، کیونکہ علم صفت اور وجودی امور میں ہے۔ اور صفت سے تو صرف موصوف ہی ظاہر ہوتا ہے۔ اور موجود میں سوائے وجود کے اور کچھ نہیں۔ پس اسی سے سمجھ لو۔ قرآن شریف میں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر شے پر محیط ہے۔ یعنی کہ جو کچھ بھی موجود ہے۔ اس کے وجود مقدس کے احاطے میں ہے۔ اور ہر شے اسی کے حضور کی وجہ سے حاضر ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ موجودات کی ہر اکائی کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ کیونکہ لفظ موجود وجود کا اسم مفعول ہے۔ اور جو چیز اس پر صدقہ کی اس چیز نے وجود کا روپ دھار لیا۔ اور احاطۂ وجود میں ظاہری اور باطنی طور پر موجودیت کے معانی موجود ہیں، اور وجود ذات اس پر محیط۔ جس طرح وجود کے اندر موجودیت موجود ہے، اسی طرح ظہور وجود کے اندر موجودیت کا ظہور موجود ہے۔ اور حضرت وجود کی شہادت و حضور سے جملہ مشہودات مشہود ہیں۔ اور یہی معانی اس آیت کریمہ کے کہ اللہ ہر شے سے مطلع ہے۔ لہذا وجود کو ابتدائی آشکارا چیز کہا گیا ہے جو محتاج دلیل نہیں۔ اپنے عیاں اور آشکارا ہونے کی وجہ سے پہلی دریافت کی جانے والی شے بھی وہی ہے۔ اور تمام موجودات کی نمود بھی اسی سے ہے۔ جس طرح پہلا مبصر (پہچاننے والا) نور ہے اور اشیا اس کی بدولت ظہور پذیر۔ محققین کے نزدیک وجود پہلی آشکارا شے ہے جس کی دریافت محتاج دلیل نہیں۔ کیونکہ پہلے ہر شے کی ہستی معلوم ہوتی ہے اور اس کے بعد وہ شے پہچانی جاتی ہے، اور بدیہی اسی کو کہتے ہیں جس کی دریافت میں کسی دلیل کی

ضرورت نہ ہو۔ اور نظری اُسے کہتے ہیں جو دلیل سے پہچانا جائے، اور وجود کو بدیہی کہنا بھی عبارت کی کم مائیگی کی وجہ سے ہے، بلکہ بداہت کا منبع و مبدا بھی وہی ہے، اور بداہت اس کی صفت ہے اور اپنے موصوف سے ظاہر و قائم ہے۔ پس وجود بدیہی ہے اس لیے کسی دلیل کا محتاج نہیں، اور اس کی بداہت (پیدائی) اس لحاظ سے نظری ہے کہ وہ دلیل سے بھی دریافت ہوتا ہے۔ جیساکہ نور (مبصرِ اوّل) پہلا پہچاننے والا ہے۔ پہلے تو نور خود دکھائی دیتا ہے، اور پھر اس کے بعد نور ہی کے ضمن میں ظاہر ہونے والی شے ظاہر ہوتی ہے۔ اسی طرح پہلے وجود ادراک میں آتا ہے۔ اس کے بعد اس میں موجود ماہیت دریافت ہوتی ہے۔ لہٰذا ذہن پہلے دریافت ہونے والی شے کے ادراک سے غافل رہتا ہے اور اس میں مظاہر کا پردہ حائل ہو جاتا ہے۔ ذرا اس آیت کریمہ کی روشنی میں دیکھئے کہ ہم تمھاری رگِ جان سے بھی زیادہ قریب ہیں۔ یعنی وجود ذات کے نور کی فراوانی و شدت کی وجہ سے نگاہوں کو اس کے مشاہدے کی ہمت نہیں ہوتی اور جو چیز پہلے دریافت میں آتی ہے ذہن اس کے ادراک سے غافل ہوتے ہیں اور موجودات کے سوا جو اسی کی وجہ سے ظاہر ہیں اور کچھ دیکھ نہیں پاتے۔ حالانکہ بدیہات میں سب سے پہلے وجود ہی آتا ہے بلکہ بداہت اسی وجہ سے بداہت بنی اور موجود ہوئی جیساکہ پیچھے بیان گزر چکا ہے کہ حق سبحانہ تعالیٰ بندے کے اس کی رگِ جان سے بھی زیادہ قریب ہیں۔ کیونکہ شہ رگ تو ایک جگہ پر ہے۔ اور اللہ تعالیٰ رگ رگ نخ نخ اور ریشے ریشے کو جانتا اور دیکھتا ہے۔ بلکہ اس کی حقیقت موہوم ہے۔ اور اس کی ماہیت معدوم۔ اس کی موجودیت میں بھی وجود موجود ہے اور بس۔ **ترجمہ رباعی** وہ جلوہ جو ذات واجب الوجود نے میرے شعور کے طاق پر گرایا۔ اُس نے میرے خرمن ہوش و عقل پہ طور کی بجلی گرادی۔ اس لیے کہ اس کی اقربیت کے راز کا پردہ نہ پھٹے، وہ میرے اس قدر نزدیک ہوگیا کہ اس نے مجھے خود اپنے آپ سے دُور کر دیا۔ مصنف خود یوں وضاحت کرتا ہے کہ حقائق ممکنہ پر حضرت وجود کی تجلی کا ادراک اعتباری امتیازات کے شعور سے باز رکھتا ہے اور محویت طاری ہوجاتی ہے۔ اور ہوش و علم کے خرمن پر جس میں ماہیات موہومہ جمع ہیں نور کی بجلی گرا دیتا ہے یعنی اپنی تجلّی کے ظہور سے پہلے ہی نیست و نابود کر دیتا ہے اور اس لیے کہ اس کے قرب و اقربیت کا بھید کھُل نہ جائے۔ وہ اس قدر میرے نزدیک آگیا کہ اُس نے خود مجھے ہی اپنے آپ سے دُور کر دیا اور وہ مجھ سے میری نسبت بھی زیادہ قریب ہے۔ اتنا بیان اس حقیقت کا اک ادنیٰ سا بیان ہے۔ اللہ تعالیٰ ہی کل زبانوں کو جانتا ہے۔

هو النّاصر

شروع اللہ کے نام سے جو نہایت مہربان اور بہت رحم والا ہے

ہر قسم کی تعریف اللہ سمیع و بصیر کے لیے ہے۔ نہیں کوئی معبود سوائے اس کے۔ اسی کی طرف لوٹنا ہے۔ وہ زندہ کرتا ہے، مارتا ہے، خود زندہ ہے، اُسے موت نہیں ہے۔ اس کے ہاتھ میں خیر ہے، وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ درود و سلام ہو اس کے رسول ؐ بشیر و نذیر پر اور اُس کی آل و اصحاب پر جو اہلِ تعظیم و توقیر ہیں۔ اما بعد یہ تیئسواں ۲۳ باب ہے جو حق الیقین کے نام سے موسوم ہے۔ حق کے معنی ہیں امر واقعی، اور یقین کے معنی ہیں امر واقعی کے بارے میں علم۔ پس اگر حاصل ہو جائے یقین اس امر حق کے بارے میں نظر کے ساتھ تو یہ علم الیقین ہے۔ اور اگر حاصل ہو بداہتہً (ظاہراً) یہ عین الیقین ہے اور اگر حاصل ہو جائے انصاف کے ساتھ وہ معاملہ، تو یہ حق الیقین ہے۔ اور کہا جاتا ہے حق الیقین کے معاملے کو مطابقت الیقین بالحق بھی، جیسے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام پاک میں ارادہ کیا ہے یقین سے موت!! اور فرمایا ہے کہ عبادت کرو اپنے رب کی یہاں تک کہ تمھیں موت آجائے۔ پس عوام کے لیے ہے جنھیں دُنیا کی زندگی دھوکے میں ڈال دیتی ہے موت کا جو یقین ہے وہ علم الیقین اور عین الیقین کے نہج پر ہے، اور خواص کے لیے جو مر گئے مرنے سے پہلے، اور متصف ہوئے مردے کی صفات سے ان کی زندگی کا دور وہ موت کا یقین حق الیقین کے طور پر ہے۔ اور وہ اپنی آنکھوں میں مردہ ہے۔ ہم سب اللہ کی طرف سے آئے ہیں اور بے شک ہمیں اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔

کُلّ شَیٔ ھَالِکٌ" اور اس کی وجہ کی تاویل کے بیان کا باب

کُلّ شیٔ "ھَالِکٌ (یعنی ہر شے فنا ہوجانے والی ہے) کے بیان سے ہمارا مقصد اس آیتِ کریمہ کے لفظی اور نحوی اعتبار سے معنی کا اظہار ہے، نیز حقیقی لحاظ سے بھی جو اہل حال و ذوق پہ منکشف ہوتا ہے۔ جیسے کہ آیا ہے متن میں اور اس کی شرح میں۔ یہ سمجھ لیجیے کہ ہلاک کے معنی نیست و نابود ہونے کے ہیں۔ اور یہ حقائق ممکنہ کا ذاتی فعل ہے۔ اور ممکنات میں سے ہر موجود فی ذاتہٖ ہلاک ہونے والا ہے اور حق سبحانہ تعالیٰ ہر لحظہ ان موجودات کے ذاتی تقاضوں کے مطابق انھیں ہلاک کرتا رہتا ہے جس طرح کہ ہر لحظہ اپنے وجود کے وجوب کے لحاظ سے ان کی تخلیق کرتا رہتا ہے۔ لہٰذا اشیا کی ذاتوں کے پیش نظر وہ تمام اشیا کا ہلاک کرنے والا ہے اور اپنی ذات کے لحاظ سے ان سب کا پیدا کرنے والا ہے۔ تخلیق و ہلاک کرنے کی یہ نسبت مرتبۂ بشرط الشیٔ اور بشرط لاشی کے اضافات کے ساتھ اسی باری تعالیٰ کی ذات سے منسوب ہے۔ تخلیق بمرتبۂ بشرط شی کی نسبت سے متعلق ہے، اور ہلاک کرنا بمرتبۂ لاشی اور مرتبۂ لابشرط کی نسبت سے جو ان دونوں مراتب میں شامل ہے اور دونوں میں اس کی تجلّی ہے۔ وہی پہلی بار پیدا کرتا ہے اور وہی قیامت میں بھی دوبارہ پیدا کرے گا، اور وہ ہر شے پہ محیط و حاوی ہے۔ خواہ اضافی موجودیت کی حالت ہو، خواہ اعتباری معدومیت کی۔ اور یہ اعتباری معدومیت بھی وجود کی اک قسم ہے اور مرتبۂ بشرط بشرط لاشی کا سایہ۔ جس طرح اضافی موجودیت بھی وجود کی قسم ہے اور مرتبۂ بشرط شی کا سایہ، اور ہر امکانی موجود اپنے سلبی معانی کے لحاظ سے وجود کا بشرط لاشی کے معانی میں مظہر ہے اور اثباتی اضافات کے اعتبار سے بشرط شی کے معانی میں وجود کا مظہر ہے، اور مجموعی طور پہ معنی لابشرط سے وجود کا مظہر ہے۔ اور اس جامع مرتبہ کا سایہ اور عدم حقیقی جو اس کا خالص مفہوم ہے جس کی اُس نے تصدیق کی۔ اور نہیں ہے، اور نہ پایا گیا ہے۔ جیسے کہ وجود حقیقی کہ معنی واحد ہے اور سب کا تصدیق شدہ اور ہر جگہ ہر وقت پایا جاتا ہے۔ جب تو اس حقیقت سے آگاہ ہوجائے گا اور یہ سمجھ لے گا کہ وجود میں تعدّد کا امکان نہیں۔ اس مرتبے میں وجوب وحدت ہے۔ یہ وجود جس طرح وجوب موجودیت کے لحاظ سے واجب الوجود ہے۔ اسی طرح وجوب وحدت کی بنا پر وحدہٗ لاشریک کے معانی کا آئینہ دار ہے۔ بلکہ اس مرتبے میں وجوب اور وحدت ایک ہی ہیں (ایک دوسرے کا عین ہیں) یہ وجود قائم بالذات ہے۔ نہ کہ قائم

موجود دیگر سے ۔ کیونکہ اس صورت میں ذاتِ واجبی دوسرے ممکنات کی ذاتوں کی طرح عدمی مفہوم ہوجاتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی ذات ان سب سے بہت بلند وبالا ہے۔ یہ وجود اپنی ذات میں واحد ہے۔ کسی دوسری ذات کی وحدت سے نہیں۔ یہ وحدت فقط اسی واحد مطلق کے نصیب میں ہے۔ اور اللہ تعالیٰ برتر ہے ان باتوں سے جو یہ لوگ بیان کرتے ہیں۔ لہٰذا چاہیے کہ ہمیشہ اپنے آپ کو اور دیگر موجودات کو وجود حضورِ حق میں فنا کر کے اس کے مشاہدے میں مستغرق ہوجاؤ اور اللہ جلّ شانہٗ کے وجود کے علاوہ تمھیں اور کچھ دکھائی ہی نہ دے، اور فنا فی اللہ کی منزل سے نکل کر بقا باللہ تک پہنچ جاؤ۔ اور زندگی و موت اور دیگر تمام پابندیوں اور اضافتوں سے آزاد ہوجاؤ۔ جب تک زندہ ہو شادکام رہوگے اور مروگے تو انجام بخیر ہوگا۔ اس پر یہ آیت کریمہ دلالت کرتی ہے کہ اے پروردگار ہم کو دُنیا میں بھی بہتری عنایت کیجیے اور آخرت میں بھی بہتری دیجیے اور ہم کو عذابِ دوزخ سے بچائیے۔ **ترجمہ رباعی** دردؔ جو جانِ محفل ہوا کرتا تھا، جس سے محفلوں میں رونق آجاتی تھی دوچار روز پیشتر تو اِدھر ہی تھا۔ اب اس کے مزار پہ دلِ حق آگاہ لے کر جا۔ کیونکہ وہ آج زیرِ زمین اک مشتِ غبار بن کر رہ گیا ہے۔ کبھی دلِ حق آگاہ و خدامست تھا۔ یہ رباعی گویا شاعر کا اپنا ہی مرثیہ ہے۔ وہ اپنی ہلاکت کو صاف دیکھ رہا ہے۔ اور خدا را صد شکر کہ اس وقت بھی ہردم اس پہ مستقبل کی حقیقت آشکارا ہے۔ اور اس موہوم مدت العمر (درازئ عمر) کا دروازہ بند ہے اور جیتے جی دائمی طور پر قرآن حکیم کی اس آیت کریمہ کی کیفیت طاری ہے کہ آپ کو بھی مرنا ہے اور ان کو بھی مرنا ہے۔ اور وہی فنا اور ہلاکت جو بظاہر مستقبل میں آنے والی ہے، لیکن ہر حال میں اس وقت بھی ان موہوم اعتبارات کی محافل و مجالس میں شامل ہے۔ اور یہ ناپائیدار زندگی چند دنوں میں ختم ہوجائے گی۔ اور جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ ان کے جیتے جی اس فنا کے مشاہدے سے شرفیاب کر کے فنا فی اللہ کر دیتا ہے۔ اُنھیں ایسا وجود عطا فرماتا ہے جسے بقا باللہ کا درجہ نصیب ہو۔ اور وہ مرنے کے بعد بھی اسی طرح زندہ و پائندہ رہتے ہیں۔ کیونکہ اللہ کے دوست مرتے نہیں۔ لہٰذا ایسے صاحب دل بزرگوں کے مزاروں کی زیارت بڑے احترام سے کرنی چاہیے۔ اور عبرت و آگہی اور فیض و برکت حاصل کرنی چاہیے گو کہ اب مٹی میں مل کر مٹی ہوگئے ہیں، مگر وہ جانِ پاک کے مالک ہیں اور اس وقت بھی دیکھتے ہیں اور تیری حرکات و نیّت سے آگاہ ہیں۔ وہ زندگی میں بھی فنا فی اللہ اور مر کر بھی بقا باللہ ہیں۔ وگرنہ اشیا کی ذات کو پیشِ نظر رکھیں تو کیا ارواح اور کیا اجسام، کیا پاک اور کیا مشبہ، کیا زندگی اور کیا موت،

کیا مادیات اور کیا مفردات، ذاتِ حق تعالیٰ کے سوا سب ہلاک ہوجانے والے ہیں۔ ہالک جو اسم فاعل ہے وہ مستقبل پر دلالت کرتا ہے، یعنی کہ ہر شے ہلاک ہونے والی ہے سوائے اس کی ذات کے جو باقی ہے۔ اہلِ ظاہر یہی معنی لیتے ہیں۔ وہ اس آیت کریمہ سے یہی مفہوم لیتے ہیں کہ جو کچھ پیدا یا تخلیق ہوا آخر کار فنا ہوجائے گا۔ اور اسی قسم کے معانی وہ اس آیت کریمہ (کُلُّ مَنْ علیہا فان) کے لیتے ہیں کہ اللہ کے سوا سب فنا کا مال ہے۔ ہلاک اور فنا ہونے والے کو مستقبل سے منسوب کیا جاتا ہے اور ایسا بیان قیامت کے حال کو ظاہر کرنے والا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ جس نے اشیا کو پیدا کیا ہے۔ ایک دن پھر اُنھیں نیست و نابود کردے گا۔ کیونکہ وہ پاک ذات پیدا کرنے اور مٹانے پر قادر ہے اور ان دونوں صورتوں میں اپنی اس قدرت کا مظاہرہ کرتی ہے اور اُس کے سوا اور کوئی شے نہ پائیدار ہے اور نہ باقی رہنے والی ہے۔ اور اشیا سب فنا ہوجانے والی ہیں۔ عارفوں کے نزدیک یہ بات اس وقت بھی سب اشیا کو حاصل ہے۔ کیونکہ اگر تم یہ کہو کہ زید قائم ہے، اس سے ذہن میں فوراً آنے والی بات زید کا موجودہ قیام ہے، نہ یہ کہ زید مستقبل میں قائم ہوگا۔ مطلب یہ کہ عارفانِ ذات جو باطنی معانی سے آگاہ ہیں۔ ان کے نزدیک اشیا کی یہ فنا اور ہلاکت جسے اہلِ ظاہر مستقبل سے منسوب کرتے ہیں اشیا کو حالِ حاضر میں حاصل ہے اور اس وقت وہ نورِ حقیقت میں مستغرق ہیں۔ اور اس نورِ حقیقت کے علاوہ اور کوئی چیز پیدا و ظاہر نہیں۔ اہلِ ظاہر صرف ہالک کو اسم فاعل سمجھ کر اُسے مستقبل پر دلالت سمجھتے ہیں اور آیت کے یہ معنی لیتے ہیں کہ اشیا ہلاک ہوجائیں گی۔ ان کے دعوے کی تردید میں جواب یہ ہے، لفظ ہالک کی طرح لفظ قائم بھی اسمِ فاعل ہے۔ جب ہم کہتے ہیں کہ زید قائم ہے تو یہ جملہ اسمیہ ہوا جس میں زید اسم اور قائم خبر ہے۔ اس سے فوراً ذہن میں زید کا موجودہ قیام آتا ہے۔ نہ یہ کہ وہ مستقبل میں قائم رہے گا۔ کیونکہ اسم فاعل کی حقیقت حال سے متعلق ہے، مستقبل تو مجازی معنوں میں آئے گا۔ اور ذہن میں فوراً آنے والی حقیقت ہی پہ سبھی کا اتفاق ہے۔ اہلِ سنت کے نزدیک حضور رسولِ کریمؐ، کی یہ خبر (حدیث) بھی اسی پر دلالت کرتی ہے کہ سات چیزیں ہیں جو فنا نہ ہوں گی: انسانی ارواح، عرش، کرسی، لوحِ محفوظ، قلم اور بہشت و دوزخ اور جو کچھ ان میں موجود ہے۔ کیونکہ اس کا کھانا بھی، ہمیشگی والا ہے اور سایہ بھی۔ پس لفظ ہالک کا "کُلّ شیٔ" ھالک میں مستقبل پر اطلاق راست نہیں آتا۔ لہٰذا اس وقت تمام اشیا ذاتِ مطلق کے انوارِ فیض کی شعاعوں میں بالکل مستغرق

اور ہلاک ہیں، مگر اُس کے چہرے کے سوا کچھ باقی نہیں۔ یعنی اس بیان سے معلوم ہوا کہ اشیا اپنی موجودہ حالت میں بلحاظ ذات معدوم ہیں۔ اور وجود مطلق کے فیض کے نور وجودی میں گُم ہیں اور رُخ مولیٰ کے سوا کچھ موجود نہیں۔ یہ لفظ انوار جمع ہے۔ اور یہ اعتباری مظاہر کی کثرت کی وجہ سے کثرت ہی پہ دلالت کرتا ہے جیسا کہ فقط ایک سورج کی روشنی مختلف رنگوں کے کئی شیشوں میں متعدد جگہوں پر مختلف رنگوں میں عکس انداز ہوتا ہے۔ جو سُرخ، سبز اور زرد دکھائی دیتے ہیں اور ہم کہتے ہیں کہ ہم نے ان سب رنگوں کو دیکھا، حالانکہ حقیقت میں وہ ایک ہی نور ہے جو ظاہر ہو رہا ہے۔ اسی طرح فقط وہی وجود واجب ہے جو دنیوی حقائق میں مختلف شکلوں اور رنگوں میں جلوہ گر ہے۔ اور حقیقتاً وہی موجود ہے اور بس۔ حضرت امام غزالیؒ نے مشکوٰۃ الانوار میں فرمایا ہے کہ عارفوں نے دیکھا کہ نہیں ہے وجود میں سوائے اللہ کے اور بے شک ہر چیز ہلاک ہونے والی ہے سوائے اس کے چہرے کے۔ یہ نہیں ہے کہ وہ ہلاک ہو جاتی ہے وقتوں میں سے کسی ایک وقت میں بلکہ وہ ازلاً ابداً ہلاک ہونے والی ہے۔ اور نہیں تصور کیا جا سکتا مگر اسی طرح۔ رُخ سے مراد فیض وجود ہے۔ کیونکہ فیض حاصل کرتے وقت فیض رساں کی توجہ کا فیض حاصل کرنے والے کی طرف ہونا ضروری ہے۔ جیسے کہ قرآن پاک میں ہے کہ تم جدھر کو رُخ کرو اُدھر ہی اللہ کا رُخ ہے یعنی کہ "کُلُّ شَیْءٍ ھَالِکٌ" والی آیت کریمہ میں رُخ سے مراد فیض وجود ہے جس کے معنی موجود کے ہیں۔ اور وجود موجود اسی مرتبے پر صادق آتا ہے، اور وہ وجود ظلّی کا مرتبہ ہے جو ساری موجودات پر پھیلا ہوا ہے۔ چونکہ اکتساب فیض کے وقت فیض رساں کی توجہ مستفیض کی طرف ہوتی ہے۔ اسی بنا پر اس فیض وجودی کو جو موجود ہوتا ہے رُخ سے منسوب کیا گیا۔ ہر مرتبے میں موجود وہی ہے اور آیت کریمہ کہ جدھر کا رُخ کرو ادھر ہی اللہ کا رُخ ہے بھی اسی امر کی خبر دیتی ہے۔ لہٰذا چاہیے اس کے جمال باکمال کے آئینہ دار ہوتے ہوئے بیچ میں اپنے عکس کو کبھی نہ دیکھو، فقط اسی پر توجہ مرکوز رکھو جب تک کہ تم اُس ہستیِ موہوم سے چھٹکارا نہیں پا جاتے۔ اس آیت کریمہ کے بموجب اپنے رب کی عبادت کرتے رہو حتیٰ کہ تمھیں موت آ جائے۔ مراد یہ ہے کہ جب حقیقت سمجھ میں آ جائے تو پھر ہمیشہ وحدتِ حق ہی کے مشاہدے میں مشغول رہنا چاہیے اور اپنے آپ اور باقی ہر موجود کو اس کی ذاتی وصفاتی تجلیات کے مظہر کے علاوہ اور کچھ نہ سمجھو اور حضوری و مشاہدے کی اس کیفیت کو اپنے اندر راسخ کر کے دائمی بنا لو حتیٰ کہ تمھیں اس میں ملکہ حاصل ہو جائے، اور ذات باری تعالیٰ کی طرف

رجوع میں خلل نہ آنے پائے، اور اپنے عکس جیسی کوئی چیز تمھیں درمیان میں نظر نہ آئے۔ بلکہ یہ سمجھو کہ وہی اس شخص کی صورت ہے جو عکس میں جلوہ گر ہے، اور یوں وہ اپنے ہی حُسن و جمال کا خود نظارہ کر رہا ہے۔ اور عکس سوائے مفہوم کے اور کچھ نہیں۔ اور جب ظاہری اعتبار سے لاحق ہونے والی اس ہستی موہوم کی تہمت سے نجات پا جاؤ گے یعنی مر جاؤ گے تو مشاہدہ ذات میں کی ہوئی یہ جدوجہد اور عبادات واطاعات میں اٹھائی ہوئی تکلیف جو اس وقت مشاہدے میں تمھاری معاون ہیں تم سے ساقط ہو جائیں گی اور تمھیں وہ وصل نصیب ہو جائے گا جس میں ہجر و فراق نہیں اور وہ اک یقینی امر ہے۔ اور یہ آیت کریمہ کے اپنے رب کی عبادت کرتے رہو حتیٰ کہ تمھیں موت آجائے بھی اسی امر کی خبر دیتی ہے۔ مفسّروں نے لفظ یقین سے مراد موت لی ہے۔ کیونکہ سب کو اس کے آنے پہ یقین کامل ہے۔ **ترجمہ رباعی** میں خواہ موجود تھا یا نہ تھا آخر کار میں اس دُنیا سے چلا گیا، اپنے جلوے و ظہور کے پروں کو کھولا۔ پھڑپھڑایا اور اُڑ گیا۔ اسے دردیں وہم کے آئینے میں تصویر کی طرح وہ چہرہ دکھا کر چلتا بنا جو میرا اپنا نہیں تھا مصنف خود رباعی کی مزید وضاحت یوں کرتا ہے: کہ مطلب یہ ہے کہ عوام کی سمجھ کے مطابق خواہ ہم موجود تھے یا خواص کی تحقیق کے مطابق ہماری نمود بے بود تھی۔ جو کچھ بھی تھا آخر کار ہم اس دُنیا سے رخصت ہو گئے۔ ہم نے جلوے و ظہور کے پر و بال کو کھولا، پھڑپھڑائے اور اُڑ گئے۔ ہمارا یہ ظہور یا جلوہ ہی ہمارے پر پرواز بن گئے۔ کیونکہ اگر ہم ظاہر نہ ہوتے تو پھر ہم پر پوشیدہ ہونے کا اطلاق کیسے راست آتا لہذا ہم نے عکس یا تصویر کی طرح آئینہ وہم میں اپنا چہرہ دکھایا جو فی الحقیقت ہمارا نہ تھا اور ہم چلتے بنے، کیونکہ عکس تو دیکھنے والے کے چہرے کا ہے، ورنہ عکس کا اپنا تو کوئی چہرہ نہیں ہوتا۔ اور یہ اسی شخص کا چہرہ ہے جو مرتبۂ عکس میں اپنا ظہور دکھا رہا ہے۔ **فائدہ** عارف لوگ دُنیا کو موہوم کہتے ہیں تو اس سے یہ نہ سمجھ لینا چاہیے کہ دُنیا کی یہ صورتیں محض لوگوں کے توہمات ہیں، اور وہ اپنے ہی وہم میں جس امر کو چاہتے ہیں ثابت کر دیتے ہیں اور جسے چاہتے ہیں نیست کر دیتے ہیں، یہ مراد نہیں ہے اشیا کا پیدا کرنا یا مٹا دینا تو کسی کے اختیار میں نہیں، بلکہ مقصود یہ ہے کہ وہم ایک مرتبے کا نام ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنی قدرت کاملہ سے ان موہوم اعتبارات کو اس مرتبے میں ظاہر کر دیتا ہے اور چھپا دیتا ہے۔ یعنی جس طرح ایک مرتبہ عالم ارواح کا ہے، ایک مرتبہ عالم مثال اور ایک عالم شہادت اسی طرح ایک مرتبہ مطلقہ وہم ہے کہ ان تمام عالموں پر محیط ہے اور یہ سب عالم اسی میں موجود ہیں۔

اور حق سبحانہ تعالیٰ نے اپنی صفت کاملہ سے موجودات کو اس مرتبے میں استواری (استحکام) بخشتی ہے جیساکہ اس آیت کریمہ سے پتہ چلتا ہے کہ یہ خدا کا کام ہے جس نے ہر چیز کو مناسب انداز میں مضبوط بنا رکھا ہے، نہ یہ کہ ہر شخص اپنے ہی توہم کے مطابق جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ کیونکہ یہ تو سرکشوں کے عندیہ و عنادیہ گروہ کا باطل عقیدہ ہے جو حقائق اشیا کے اثبات کے منکر ہیں۔ عندیہ وہ لوگ ہیں جو کہتے ہیں کہ اشیا کے حقائق اعتقادات کے تابع ہیں۔ یہاں تک کہ اگر ہم اعتقاد رکھیں کسی چیز کے بارے میں کہ وہ جوہر ہے۔ پس وہ جوہر ہے۔ اور اگر عرض سمجھیں تو عرض ہے، اگر قدیم سمجھیں تو قدیم ہے اور اگر حادث سمجھیں تو حادث ہے۔ عنادیہ وہ لوگ ہیں جو چیزوں کے حقائق کا انکار کرتے ہیں اور گمان کرتے ہیں کہ وہ اوہام و خیالات باطلہ ہیں جیسے پانی پر نقوش۔ پس اسے خوب سمجھ لو۔

هوالناصر

شروع اللہ کے نام سے جو نہایت مہربان اور بڑے رحم والا ہے

ہر قسم کی تعریف اللہ کے لیے ہے جو اپنی غنا کے ساتھ غنی ہے، اور کبریائی کے ساتھ متکبر ہے۔ اور استغنا کے ساتھ مستغنی ہے۔ تمام ان چیزوں سے جو اس کے سوا ہیں، اور درود و سلام ہو محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر جو سید الاصفیا اور خاتم الانبیا ہیں۔ اور آپؐ کی آلؓ پر، آپؐ کے اصحابؓ، آپ کے اولیا اور آپؐ کے احبا پر۔ پس یہ چوبیسواں ۲۴ باب ہے جس کا نام عزم الامور ہے۔ امر چیز کو کہتے ہیں اور عزم یہ قصد بالجزم ہے۔ پس یوں تعلق رکھتا ہے۔ قصد جازم ایک ایسی چیز سے جس سے ظاہر کرتا ہے اللہ تعالیٰ قوی آثار اور استقامت کے لیے عمدہ ثمرات۔ اور اکثر اوقات اللہ کی سنت یہی ہے سوائے اس کے جو وہ چاہے۔ پس اگر اپنی تائید کے ساتھ اللہ تیری مدد فرمائے اور حاصل ہو جائے وہ چیز جس کا تو قصد کرتا ہے بھلائی کے معاملات میں سے، پس اُس کا شکر ادا کر اور استقامت اختیار کر جیسا کہ تمھیں حکم دیا گیا ہے، اور دیکھ اس کی قدرت کے ظہور کو، اپنی قدرت میں، اور ہو جا فرمانبرداروں میں سے، پس اگر وہ فسخ کر دے تیرے عزم (مقصد کو پہنچنے) کو معدوم کر کے پس تو قائم رہ عزم کی اصل پر اور وہ ہے اللہ کی طرف توجہ اور تیرے رب کا عرفان، اور کہہ میں نے اپنے رب کو پہچان لیا ارادوں کے ٹوٹنے سے اور میں نے دیکھ لی اُس کی قدرت اپنی عاجزی میں ساقط ہونے کے ساتھ قدرت کی اضافت کا اپنے نفس سے، اور ہو جا ہر حال میں اسی اصلی عزم کے ساتھ ثابت اور کہہ کہ ہر قسم کی تعریف اللہ

کے لیے ہے ہر حالت میں۔ اگر تو نے استقرار پا لیا یعنی (استقامت) اس حالت میں اپنے نفس کے اندر اور اگرچہ نہ آسان ہو تیرے لیے عزم کو ظاہر کرنا تو اُٹھائے گا اللہ تعالیٰ تجھے قیامت کے دن اولوالعزم لوگوں کے زمرے میں، کیونکہ وہ نہیں دیکھتا تیری صورت اور تیرے عمل کی طرف بلکہ دیکھتا ہے تیرے دل اور تیری نیت کی طرف۔ جان لے کہ عزم کمائی سے حاصل نہیں ہوتا، جیسے کمائی کے دوسرے اوصاف ہوتے ہیں، بلکہ یہ تو امور وہبیہ میں سے ہے۔ (خداداد امور) اور پیدا کرتا ہے اللہ تعالیٰ اسے فطرتِ اولیٰ میں نفس کے اندر اور یہ مناصب میں سے بڑا عظیم منصب ہے۔ مخصوص کرتا ہے اس سے اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے انبیاء و اولیائے کرام میں سے، اور نہیں ہوتا ہر نبی یا ولی صاحب عزم، اور اہل عزم تخلیق میں علیحدہ ہوتے ہیں۔ اس مخلوق سے اور وہ بلند مرتبہ قدوسی اور متبوع (جن کی پیروی کی جاتی ہے) ہوتے ہیں اور وہ نہیں گرتے لذات کی طرف، اور نہیں متوجہ ہوتے احتیاجات (ضروریات) کی طرف اور نہیں مقید ہوتے اسباب و آلات میں اور نہیں مائل ہوتے شہوات کی طرف اور نہ بھاگتے ہیں مکروہات کی طرف اور نہ ڈرتے ہیں بلاؤں اور مصیبتوں سے اور قدم بقدم چلتے ہیں اس آیت کریمہ کے مفہوم پر کہ نہ نگاہ چندھیائی اور نہ حد سے متجاوز ہوئی، اور وہ چلتے ہیں اسی طریق پر کہ سب سے شدید مصیبت انبیاء پہ ہوتی ہے۔ بے شک یہی عزم امور میں سے ہے۔

استغنا کا باب

بے نیازی، غنا اور اہل دُنیا سے کھنچے کھنچے رہنا فقر و درویشی کے مناسب حال ہے۔ یہ باب ان اشخاص کے لیے مخصوص ہے جو درویشانہ وضع قطع رکھتے ہیں۔ اور یا دنیوی گزر بسر کا اندیشہ و ارادہ بھی، توکل ان کے دلوں میں ہوتا ہے، ورنہ اہل دُنیا یا دُنیا دار لوگوں کو اس بات کی کیا پرواہ کہ اُن کا مقصد تو محض زر اندوزی ہوتا ہے جیسے بھی ہو سکے۔ وہ رسمی علیک سلیک، آداب و تسلیمات، خوشامد، دوڑ دھوپ اور خواہ مخواہ دخل در معقولات کو مجلسی علم، مردانگی اور سلیقہ مندی سمجھ کر اس پر فخر کرتے ہیں۔ جو ان باتوں سے محروم ہو اُسے وہ بے وقعت، نالائق، نکمّا اور جاہل سمجھتے ہیں۔ اور اپنے خیال میں اس ذلت کو عزت اور اپنے گمان کے عیب کو ہنر تصور کرتے ہیں۔ اور گمان جو ہے وہ حق سے مستغنی نہیں کرتا۔ لیکن یہ دُنیا دار بھی مجبور ہیں، وہ دُنیا حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ دُنیا اک

دھوکا ہے، اور اسے دھوکے دیے بغیر حاصل نہیں کیا جا سکتا، لیکن کم از کم اتنا تو ضرور چاہیے کہ وہ انصاف کا دامن نہ چھوڑیں، اور حالات کی خرابی اور اپنی کم ہمتی کا اعتراف کریں، اور مال و اسباب نہ رکھنے والے درویشوں اور مسکینوں کو حقارت کی نگاہ سے نہ دیکھیں، اور نہ ہی ذلت سے نسبت رکھنے والے اپنے اس دنیوی مال و منال پر اترائیں۔ کیونکہ اس آیت کریمہ کے مطابق اللہ تعالیٰ شیخی خوروں سے محبت نہیں کرتا۔ اور درحقیقت اللہ اور اُس کے بندوں کے نزدیک وہی معزز و محترم ہیں جو ان دنیوی خواہشات کو ترک کرنے والے ہوں اور وہی بلند ہمت لوگ اللہ کے محبوب ہیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کے ہاں عالی ہمت لوگ ہی محبوب و مقبول ہوتے ہیں۔ دُنیا کے اس ظاہری مال و منال کا کوئی بھروسہ نہیں۔ گائے، بیلوں اور گدھوں کی کثرت آدمیت کو نہیں بڑھاتی۔ بعض اوقات تو بڑے کمینے اور ادنیٰ لوگ بھی کوّوں اور چیلوں کی طرح ہوا میں اڑتے پھرتے ہیں، اور بعض اوقات عام اور معمولی لوگ دُنیا کی رنگ برنگی نعمتیں چرتے پھرتے ہیں، اور بعض فاحشہ عورتیں مردوں کی نسبت ماہوار زیادہ کمالیتی ہیں اور بعض کافر اور فاسق و فاجر لوگ صوفیوں اور پرہیزگاروں کی نسبت زیادہ مالدار ہوتے ہیں اور بعض جاہل اور احمق اکثر عالموں اور دانشوروں کی نسبت دنیاوی جاہ و حشم زیادہ رکھتے ہیں۔ لیکن یہ باتیں قانع مزاج، شریف النفس۔ حسبی نسبی شرفا اور اللہ تعالیٰ کے کارساز ہونے پر کامل اعتقاد رکھنے والے سیر چشم، مستغنی اور متوکل عارفان ذات کے نزدیک کوئی قدر و قیمت نہیں رکھتیں۔ وہ ہر کسی سے خوش اخلاقی اور صفائی قلب سے پیش آتے ہیں۔ اور وہ ان ادنیٰ اور خسیس باتوں کی طرف دھیان نہیں دیتے، خود کبھی بد اخلاقی سے پیش نہیں آتے، لیکن اگر ان خدا رسیدہ نائبان حق کے سامنے کوئی بد سیرت اور کم حوصلہ انسان کبھی اپنے دنیوی جاہ و جلال کے غرور یا اپنے فضل و کرم کے اظہار کے لیے کوئی بے ادبانہ حرکت کرے تو پھر مجبوراً اس مقولے کے تقاضے کے طور پر کہ متکبر سے تکبر کرنا کار خیر ہے، وہ بھی ان کی اصلیت کی قلعی کھول دیتے ہیں۔ اور خدا اور رسولؐ کی نصرت و حمایت سے اُنھیں سر جھکانے پہ مجبور کر دیتے ہیں۔ لالچی بھک منگوں کی مجلسوں میں اکثر دیکھا گیا ہے کہ بظاہر یہ بے ادب دُنیا دار آپس میں اشارے کنائے سے باتیں کرتے ہیں۔ مگر درپردہ وہ اشاروں کنایوں سے فقرا پر طعنہ زنی کر رہے ہوتے ہیں، اور خود کو ان درویشوں کی نسبت افضل اور عاقل سمجھتے ہیں۔ اور وہ لالچ کے مارے نذر و نیاز کی توقع میں یا ان منافقوں کے اخلاص و اعتقاد کے

گمان میں نہ فقط ان سے درگزر کرتے ہیں، بلکہ ان کی باتوں کی تصدیق بھی کرتے ہیں، تاکہ وہ ان سے خوش اور راضی رہیں اور پھر بھی لوٹ کر آئیں۔ اور وہ بے غیرت یہ سمجھتے ہی نہیں کہ یہ فقر کے شایان شان نہیں، اور خوشامد پیشہ دُنیاداروں کی کیا مجال کہ وہ کسی درویش کے سامنے دوسرے درویش کی بُرائی کریں یا چغلی کھائیں۔ ہم مشرب و ہم مسلک ہونے کی حمیّت اس امر کو ہرگز گوارا نہیں کرتی۔ ہم نے دیکھا ہے کہ فوجی سپاہی کسی سے سپاہیوں کی برائی نہیں سنتے، اور نہ ہی اپنے سامنے کسی دوسرے سپاہی کے متعلق طعن و تشنیع سننے کے روادار ہوتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ شیر کا نقاب ہے جس میں سارے بُرے اور بھلے چھپے رہتے ہیں۔ کسی آدمی کو بُرا نہیں کہنا چاہیے۔ لہذا درویش کو چاہیے کہ ان دُنیاداروں کے خوش عقیدہ یا بد عقیدہ ہونے کی مطلق پروا نہ کرے۔ اور اُن سے یوں ملاقات کرے کہ وہ ادب کی حد سے سرِمُو تجاوز نہ کر سکیں۔ کسی ریاست کے نواب، راجہ یا بادشاہ کے دربار میں ان دنیاداروں کی گستاخانہ حرکتیں اور بے باکانہ باتیں کہاں چھپتی ہیں۔ جو یہ خود غرضی کے پتلے درویشوں کے حضور میں اُنھیں ظاہر کرتے ہیں۔ شاید اس لیے کہ درویشوں سے ان کی کوئی غرض وابستہ نہیں ہوتی۔ جس طرح ان کو درویشوں سے کوئی غرض نہیں۔ ان خدامست درویشوں اور مستغنی متوکلوں کی بھی ان سے کوئی غرض وابستہ نہیں۔ اگر معقولیت سے آنا چاہتے ہیں تو آئیں۔ خدا کے لیے درویشوں کی محافل کے آداب کو ملحوظ خاطر رکھیں ورنہ اپنے حال میں مگن رہیں۔ اور اپنے دین و ایمان کے چہرے کو اپنی ہی بے یقینی کے ناخنوں سے نہ چھیلیں۔ جس نے قناعت کی عزت پائی، اور جس نے طمع کی وہ ذلیل و خوار ہوا۔

ترجمہ رباعی ہرچند کہ زمانہ اپنا کام کیے جا رہا ہے۔ تو اپنے ہاتھ سے اپنا اعتبار نہ گنوا۔ ہم پاؤں سے لڑکھڑا کر سائے کی طرح جا گرے ہیں، لیکن ہم نے اپنا بوجھ کسی اور پر نہیں ڈالا۔ مصنف خود اس کی مزید توضیحات یوں کرتا ہے۔ کہ ہرچند گردشِ زمانہ اپنا کام کر رہی ہے یعنی تمھیں دنیوی تکلیفات اور مکروہات میں مبتلا کیے جا رہی ہے، مگر ہمیں اپنی ساکھ کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑنا چاہیے اور نہ کرنے والی چیزیں نہیں کرنی چاہئیں اور خوشامد اور لالچ اختیار نہ کرنا چاہیے۔ زمانے کی طرف سے تکالیف و مکروہات کا پہنچانا مجازی لحاظ سے ہے۔ اشعار میں ایسے اندازِ بیان میں کوئی مضائقہ نہیں ورنہ حقیقت کے لحاظ سے ہر کام کا اندازہ اور اُس کا کرنا تو قادرِ مطلق کی قدرت میں ہے۔ کیونکہ اللہ ہی نے ہمیں پیدا کیا اور جو کچھ ہم کرتے ہیں وہ جانتا ہے۔ خاکساری اور گراوٹ کی حالت میں بھی

ا

اپنا بوجھ کسی پر نہیں ڈالنا چاہیے۔ نہ کسی کا بارِ خاطر بننا چاہیے، بلکہ اس حالت میں بھی دوسروں کے آرام و آسائش کا باعث بننا چاہیے۔ ہمتِ عالی یہ برداشت نہیں کرتی کہ کسی صورت میں کسی کے آگے اپنی حاجت کا رونا روؤ۔ کیونکہ حاجت کے اظہار کا مطلب ہے سوال کرنا، اور سوال سراسر ذلت ہے۔ اور دُنیا کے لیے ذلت برداشت کرنا مومنوں پر حرام ہے۔ کیونکہ اللہ اس کے رسول اور مومنوں کے لیے تو عزت ہے۔ عالی ہمت آدمی کسی کا زیرِ بارِ احسان نہیں ہوتا۔ اور نہ ہی لالچ کی راہ پر گامزن ہوتا ہے۔ اپنی حاجتوں کا کبھی کسی سے اظہار نہیں کرنا چاہیے، اور نہ ہی لوگوں سے حاجت روائی کی توقع کرنی چاہیے۔ وہ بیچارے تو خود حاجتوں کے اسیر ہیں۔ حاجت کا اظہار خواہ حکایتہً ہی کیوں نہ ہو کیا جائے دراصل وہ حق تعالیٰ کی شکایت ہے۔ اور سوال ہی کے زمرے میں آتا ہے۔ اسے حُسنِ طلب کہتے ہیں۔ اور سوال میں ذلت اُٹھانا پڑتی ہے، اور دنیوی مطالب کے حصول میں ذلت اُٹھانا مومنوں پر حرام ہے۔ اور اسی وجہ سے شرعِ دینِ محمدؐ (ان پر خدا کا درود و سلام) میں سوال کو حرام قرار دیا گیا ہے۔ اور سوال کرنے سے منع کیا گیا ہے۔ کیونکہ محض دُنیا کی خاطر اپنے نفس کو ذلیل کرنا جائز نہیں۔ اللہ، اُس کے رسولؐ اور مومنوں کے لیے تو عزت ہے۔ چونکہ عزت کی بنیاد استغنا پر ہے۔ لہٰذا بہمہ وجوہ تمام عزت اسی حقِ تعالیٰ کے لیے ہے کہ وہ دونوں جہان سے بے نیاز ہے۔ جیسا کہ قرآن شریف میں آیا ہے کہ وہ چاہتے ہیں اپنے لیے عزت۔ پس بے شک عزت ساری کی ساری اللہ کے لیے ہے۔ پس ممکن وہ ہے جو وجود میں محتاج ہوتا ہے واجب کا۔ کیسے ہو سکتا ہے معزز، کیونکہ عزت جو ہے سب کی سب واجب کے لیے ہے۔ اور اس ضمن میں اس کے لیے جو اس کی طرف وسیلہ پکڑے اور منقطع ہو جاتا ہے اس عدمیت سے جو کہ امکانی کا توہم ہے۔ جیسے نبی علیہ السلام اور انہی کے طفیل سے اُس کے لیے جو ان کی پیروی کرتا ہے مومنین میں سے، اور وہ اُنھیں عزت دیتا ہے اپنے وجود کے ظہور سے اور اُنھیں بے نیاز کرتا ہے مخلوق سے اپنے شہود کے نور سے۔ پس وہ عزت دیتا ہے جسے چاہتا ہے اور ذلت دیتا ہے جسے چاہتا ہے، اُسی کے ہاتھ میں بھلائی ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ پس ہو جا اپنی نگاہ میں ذلیل اور فقیر اللہ کا ہمیشہ، اور بے نیاز ہو جا ہر اُس سے جو اس کے علاوہ ہے۔ کہ زیادہ کر دے گا اللہ تعالیٰ تیری عزت کو لوگوں کی نگاہ میں جیسے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اے اللہ بنا دے مجھے میری نگاہ میں چھوٹا اور لوگوں کی نگاہ میں بڑا۔ اور جان لے کہ عزت ہوتی ہے اچھے خلق سے نہ کہ

اس کے برعکس عمل سے جو کہ کبر اور غرور ہے۔ پس جو آدمی عظیم خلق پر ہوتا ہے اس کے لیے عظیم عزت ہے۔ اللہ زیادہ اچھے اخلاق والا ہے مخلوق سے نرمی کرتے ہیں، رحم کرنے میں اور صبر کرنے میں انتقام پر بندوں کے اعمالِ شنیعہ پر اور اسی کے لیے عزت عظمیٰ ہے۔ پس اللہ تعالیٰ کے اخلاق کو اپناؤ۔ اور اللہ کی غنا کے ساتھ مستغنی ہو جاؤ۔ اور درگزر کرو لوگوں سے تو ضرور ہو جائے گی عزت حاصل تمھیں۔ پس جہاں تک تجھ سے ہو سکے ضرورت کے مطابق قناعت کر اور کسی کی طرف طلب کا ہاتھ نہ بڑھا، کیونکہ درویشی کی شان تو استغنا میں ہے۔ اور فقر کی زیبائش کبریائی میں ہے۔ جیسا کہ فرمایا رسول اللہ صلعم نے کہ لوگوں میں سب سے بڑا زاہد وہ ہے جو قبر اور بوسیدگی کو نہیں بھولتا۔ اور جس نے چھوڑ دیا دُنیا کی زینت کی افضل چیزوں کو اور ترجیح دی اس چیز کو جو باقی رہنے والی ہے اس چیز پر جو فنا ہونے والی ہے۔ اور آنے والے دن کو اپنی زندگی میں شمار نہ کیا، اور شمار کیا اپنے نفس کو مردوں میں، اور فرمایا دُنیا میں زہد اختیار کر، اللہ تجھ سے محبت کرے گا، اور زہد اختیار کر اُس چیز سے جو لوگوں کے ہاتھ میں ہے تو لوگ تجھ سے محبت کریں گے، اور فرمایا بے نیازی اختیار کر لوگوں سے چاہے وہ مسواک کا عمل ہو۔ اور اگر اس سے بھی زیادہ ہمت عطا فرما دیں اور جینے مرنے سے بھی بے نیاز کر دیں۔ پھر کوئی بات بھی تیرے لیے ضروری نہیں۔ تو تو ممکن الوجود ہے۔ جب تیرے لیے عدمؔ و وجود ضروری نہیں تو دوسری اور کیا چیز ضروری ہوگی، بلکہ جیسا کہ تم عزم رکھتے ہو کہ اللہ تعالیٰ سے بھی دُنیاوی حاجتیں طلب نہ کرو اور حاجت کے پورے ہونے کا تیرے ذہن میں خیال تک نہ ہو، بلکہ تجھے سوائے اس کے اور کسی سے حاجت ہی نہ رہے۔ یعنی بنی نوع انسان سے حاجت طلبی کا کیا مقام ہے۔ جب کہ تو دُنیاوی اُمور میں خداوند کریم سے حاجت طلبی نہیں کرتا، اور نہ ہی ظاہری یا زبانی طور پر حاجت طلب کرتا ہے۔ نہ ہی باطنی یا قلبی طور پر مرادیں پوری ہونے کی دُعا کرتا ہے اور کسی حاجت یا مراد کا خیال بھی تیرے دل میں نہیں آنے پاتا۔ مانگنے یا نہ مانگنے اور ہونے یا نہ ہونے کا کیا مقام ہے۔ حقیقت میں سوائے اس معبودِ حقیقی کے تیرا مقصود اور کچھ ہونا ہی نہیں چاہیے۔ اللہ کے سوا اور کوئی موجود ہی نہیں۔ لہٰذا مشاہدۂ ذاتِ حق کے علاوہ تجھے کوئی حاجت یا مراد نہیں ہونی چاہیے۔ وہ جو سلوک کی آخری منزلوں میں ارادوں اور مرادوں کی نفی کی بشارت دیتے ہیں، یہی وہ مقام ہے اور ان مقامات کی انتہا اس کی رضا کی ابتدا ہے۔ وہی کریم ہے، اور وہی تیرے حال کو جانتا ہے۔ تمھیں جو چاہیے وہ تمھیں بن مانگے دیتا ہے۔

ضروری ہے کہ وہ عجز و انکساری کے باغ میں بڑھے اور پھلے پھولے، اور اس کی عاجزی و مسکینی روز افزوں ہو۔ اور دُعا کرے کہ خداوندا مجھے مسکین ہی زندہ رکھنا، مسکینی کی حالت ہی میں مارنا اور قیامت کے دن مجھے مسکینوں کے زمرے ہی میں اُٹھانا۔ نہ یہ کہ ہدیئے اور تحفے لے لے کر امیر بن جائے۔ اور یہ دنیوی مال و اسباب اس کے فقر کو زائل کردیں اور اس کا فقر و درویشی دولت کے بوجھ تلے دب جائے۔ جناب والد بزرگوار امیر المحمد یمین (خدا ان کے رازوں اور برکت سے ہماری مدد فرمائے) فقر و درویشی کی گزر بسر کی عظمت کے متعلق فرمایا کرتے تھے کہ اگر تمام روئے زمین کے بادشاہ اور ساتوں ولایتوں کے شہنشاہ اپنے مال و دولت سے درویش کو امیر بنانا چاہیں تو بھی ایسا نہیں کر سکتے یعنی کہ وہ جو کچھ نذر نیاز پیش کریں گے درویش اسی وقت اسے خدا کی راہ میں مناسب مقام پر صرف کر دے گا۔
یہ دنیوی مال و متاع ہے ہی کیا چیز کہ بلند ہمت درویشوں کے سامنے اس کی کوئی وقعت ہو اور انھیں امیر بنا دے۔ دنیوی متاع تو ہے ہی بڑی مختصر اور حقیر چیز۔ وہ اللہ تعالیٰ کے استغنائے حقیقی کی تجلّی ہے جس نے ان بزرگوں کے دلوں میں جلوہ گری کر کے انھیں ماسوی اللہ سے بے نیاز کر دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ وہ حقیقی استغنا عنایت کرے جو اس کے اپنے استغنائے حقیقی سے ناشی ہو۔ اللہ تعالیٰ دونوں جہانوں سے بے نیاز کر دے۔ قصّہ کوتاہ یہ کہ آخر کب تک اپنی عزت و آبرو کو ہوا و ہوس کی آگ میں جلاتے رہوگے اور اپنے آپ کو دنیاوی دھندوں کے لیے ذلیل و خوار کرتے رہوگے۔ اور یہ مسلّم بات ہے کہ لالچ ذلت کا باعث بنتا ہے، اور قناعت عزت کا سبب ہوتی ہے۔ جس نے قناعت اختیار کی عزت پائی اور جس نے طمع بڑھائی اُس نے ذلت پائی۔ خاک نشین بننا چاہیے۔ یعنی ظاہری اسباب کو ترک کر دینا چاہیے۔ اور یوں ماسوی اللہ سے بے نیاز ہو کر آبرو حاصل کرنی چاہیے۔ رباعی کے چار مصرعوں میں اربعہ عناصر یعنی (خاک و آتش و آب و باد کے چار الفاظ) کی بلا تکلف یکجائی نے جو لطف پیدا کر دیا ہے وہ ظاہر ہے۔

هوالناصر

شروع اللہ کے نام سے جو نہایت مہربان اور بہت رحم والا ہے

ہر قسم کی تعریف اللہ کے لیے ہے جو قضا و قدر کا منصف ہے اور نفع و ضرر کا موجد ہے اور درود و سلام ہو اُس کے رسول صلعم پر جو خیر البشر ہیں، اور آپ کی آل اور آپ کے اصحاب پر جو تاثیر و اثر والے ہیں۔ اما بعد یہ پچیسواں[25] باب ہے جو قدر معلوم سے موسوم ہے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ نے فرمایا نہیں ہے کوئی چیز مگر یہ کہ ہمارے پاس اُس کے خزانے ہیں۔ مگر ہم اُسے نہیں نازل کرتے مگر مقدارِ معلوم کے ساتھ۔ شے سے مراد اس چیز کی نوع ہے یا اس کی جنس ہے۔ سب کی سب اور خزانوں سے مُراد اُس کا مفرد ہونا یا اس کی اقسام ہونا ہے اجزا کے لحاظ سے اور (من) جو ہے یہ خزائن کا ظرف ہے۔ اور یہ علم الٰہی کے ہاں لفظ ہے اور تنزیل کا (من) جو ہے اُس کے معنیٰ ایجاد و اظہار کے ہیں۔ خارج میں اور قدر معلوم سے مراد کسی چیز کے تشخص کی مقدار ہے۔ صورت علیہ الیہ کے حساب سے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات کا مقتضیٰ جو ہے وہ خلق کا ایجاد ہے۔ مختصر اور کلی طور پر قضا اور اقتضا اس کی صفات کی تعبیر کرتے ہیں۔ اور اُس کے اسماء ان کے مظاہر کے اظہار کے لیے ہیں تفصیلی اور جزوی طور پر، اور موسوم کیا جاتا ہے قدر کے ساتھ جیسا کہ آگے بیان آرہا ہے۔

قضا و قدر کے بیان کا باب

یہ سمجھ لینا چاہیے کہ قضا عبارت ہے موجودات پر ازل سے ابد تک جاری و طاری ہونے والے احوال و احکام کے سلسلہ میں حکم الٰہی سے۔ اور قدر عبارت ہے انہی احکام کے اجمال کی تفصیل سے جس سے کہ وقت اور زمانہ اور دیگر مخصوص امور کے لحاظ سے تخلیق و پیدائش کی جاتی ہے۔ یہ بھی سمجھ لیجیے کہ لفظ قدر کے (د) پر زبر اور سکون ہو تو اُس کے معنی ہیں قضائے الٰہی اور جو کچھ مختلف اُمور میں اُس نے حکم کیا ہے۔ لُغت کی کتاب صراح میں لکھا ہے کہ قدر کے (د) پر سکون کے ساتھ حرکت ہو تو اس کا مطلب ہے بندے کے متعلق خدا کے حکم کا اندازہ اور یہ معنی ہوں تو پھر قضا و قدر دونوں ایک ہی ہیں اور بعض یوں فرق کرتے ہیں کہ قضا ازلی حکم ہے اور قدر اس کا اٹل وقوع۔ اور ان معنوں میں قضا کو قدر پر سبقت ہوگی، اور اُس کے برعکس بھی اطلاق ہوگا۔ قدر کے معنی ہیں ازلی تقدیر اور قضا، اُس کے متعلق حکم دینا اور وقت مقررہ پر اُس کا پیدا کرنا ہوگا۔ امام غزالی ——— نے فرمایا ہے کہ قضا و قدر کا حکم ازلی حکم ہے اور ایک ہی بات ہے۔ قضا کلّی اسباب مثلاً آسمان، ستاروں، مختلف عناصر، فرشتوں وغیرہ کی تخلیق ہے، اور قدر ان پر حوادث کی ترتیب دینا، اور ان میں باہمی تعلق ہے۔ صراح میں لکھا ہے کہ قضا کا مطلب حکم، حکم دینا، حکم چلانا، حاجات کو پورا کرنا اور آگاہ کرنا ہے۔ اور قضا کے معنی ہیں اسے بنایا اور اُس کا اندازہ کیا۔ اللہ تعالیٰ کا یہ قول ہے کہ بنایا اُنھیں سات آسمان اور اسی میں ہے قضا و قدر۔ پس جان لو کہ قضا جو ہے وہ علت کا اک تقاضا ہے معلوم کے لیے کلیتہً" اجمالاً"، معلول کے وجود سے قبل علیّت کے تقدم کے ساتھ اور قدر اقتضا ہے اُس کا معلول کے لوازم کے ساتھ، جزئیت کے ساتھ تفصیل سے اور مشیت علّیہ، متوجہ ہونا ہے معلول کے ایجاد کی طرف اور تقدیر تعین ہے ایجاد کے وقت کی، اور ایجاد معلول کا اخراج ہے قوت کے ساتھ فعل کی طرف، اور قوت جو ہے یہ پاکیزگی حاصل کرنے کی استعداد ہے باطن میں اور فعل جو ہے ظاہری طور پر قابلیت کا مظہر ہے، اور علت وہ ہے جو وجود غیر کے لیے اقتضی ہو اور معلول وہ ہے جو قبول کرتا ہے وجود اپنے غیر سے اور علل ممکنہ سب کی سب علل اضافیہ ہیں۔ اور وہ جس کی طرف منتہی ہوتا ہے علل کا سلسلہ وہ علت حقیقی ہے اور تعبیر کیا گیا ہے حکما کی اصطلاح

ہیں علتِ موجبہ سے اور وہ ان کے نزدیک ذات الواجب سے عبارت ہے اور خالص محمدیؐ جائز نہیں گردانتے ، لفظ علت کا اطلاق اللہ سبحانہ تعالیٰ پر بچتے ہوئے مشارکت جنسیہ سے علت وحدہٗ لا شریک لہٗ ہیں کہ مزید یہ کہ نہیں آیا شرع میں یہ لفظ اور اس کا بدل خالق اور باری مصوّر ہے ۔ پس ہر مرتبے میں مراتب علل اضافیہ میں سے جو کہ معلولات میں سے ہیں اصلاً تاثیر ہے قدرت واحدِ حقیقیہ اور قضائے واحدِ حقیقی اور قدرِ واحد حقیقی اور مشیت واحد حقیقت اور تقدیر واحد حقیقی اور ایجاد واحد حقیقی کی ، اور اللہ ہی کی طرف لوٹتے ہیں تمام کے تمام معاملات اور وہ چیز جو منسوب ہوتی ہے ان اعتباری انساب میں سے اُن علل اضافیہ تک مجازاً ۔ پس یہ بھی اضافی ہے ۔ جیسے کہ قضائے اضافی اور اور حیثیت اضافیہ اور تقدیر اضافی اور ایجاد اضافی اور یہ سب مجازی فاعل ہیں ۔ جن کو شرع کی زبان میں تقدیر کے فاعل سے موسوم کیا جاتا ہے ، اور یہ مادی اور غیر مادی فرشتے ہیں ۔ پس مجرد فرشتے بلند مرتبے میں داخل ہیں عالم امر میں ، اور مادی فرشتے کم درجے کے ہیں جو گمان کیے جاتے ہیں عالم خلق میں ۔ پس پاک ہے وہ ذات جس کے ہاتھ میں ہر چیز کی ملکیت ہے اور اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے ۔ اور فرشتوں کے پر ہیں باعتبار متعدد حیثیات اقتضائیہ کے دو اور تین اور چار سے زیادہ جتنے اللہ چاہے اور نہیں ہوتا فرشتے کے لیے ایک پر دو حیثیتوں کی ضرورت کی وجہ سے اس کے اندر ایک ان میں سے ایک علت اضافیہ اور دوسری معلولی حقیقت ہے جیسے کہ عقل اول میں ہے ، اور جو زیادہ ہوتا ہے ان دو حیثیتوں پر جیسے معلولیہ اضافیہ عقل ثانی میں اور محدویہ فلک اوّل میں ، اور یہ تیسرے اور چوتھے پر کی طرح ہے ۔ اور نہیں گمان کیا جاتا اس سے کہ فرشتوں کی تخلیق منحصر ہے عقول اور قوا پر جیسے کہ گمان کرتے ہیں مومن حکما بلکہ عقول اور قوا بھی اعلیٰ اور ادنیٰ فرشتوں کی جنس میں سے ہیں ۔ اور اللہ کے لیے ہیں لشکر فرشتوں کے کہ جنھیں جانتا ہے مگر اللہ ہی ، اور وہ قادر ہیں مختلف شکلیں بنانے پر اور قسم قسم کے کلمات کے تکلم پر اور ان میں سے ہر ایک کے لیے مخصوص خدمت ہے ۔ جیسے وحی کا نزول رسولوںؑ پر حضرت جبرئیلؑ کے لیے ، اور رزق کی تقسیم رزق دیے جانے والوں کے لیے حضرت میکائیلؑ کے ذمے ، اور روح کا قبض کرنا عزرائیل علیہ السلام کے ذمے ہے ، اور صور پھونکنا اسرافیلؑ کے ذمے ۔ پس علوم کی تعلیم اولیائے کرام کے لیے بھی فیض جبرائیلی سے ہے وحی کے نہج پر نہیں ، بلکہ طریق الہام و القائے نفس کے اندر ۔ اور رزق کی تقسیم سب کے لیے فیض میکائیلؑ ہے ، لیکن یہ بالمقابلہ اور دست بدست

یہ بیان ان نافہم پس و پیش کرنے والوں کی تسلیِ خاطر کے لیے ہے۔ چونکہ اللہ تعالیٰ تمام مخلوقات کے حالات کو جاننے والا ہے۔ اُس سے طلب کرنے یا حاجت روائی کی دُعا کرنے کی ضرورت نہیں۔ ہر مخلوق کو جو کچھ چاہیے وہ از خود پہنچاتا ہے، اور جب تک اُس شے کو قائم رکھتا ہے اسے پہنچاتا رہے گا۔ اور جو کچھ وہ نہیں دیتا وہ در اصل دینا چاہیے بھی نہیں۔ یہ اس کی عین عنایت و مہربانی ہے بخل یا غضب کے باعث نہیں جیسا کہ باپ بیٹے کو ازالۂ مرض کے لیے پرہیز کراتا ہے۔ اور اُس کی مرغوب و لذیذ غذائیں اُسے کھانے کو نہیں دیتا، بلکہ کڑوی کسیلی اور بدمزہ دوائیاں پینے کو دیتا ہے۔ لہذا ان زائد از ضرورت خواہشات کو دل سے یکسر نکال دینا چاہیے اور راضی برضائے حق رہنا چاہیے جیسا کہ قرآن پاک میں واضح طور پر کہا گیا ہے کہ ہو سکتا ہے جس چیز سے تمھیں گھن آتی ہو وہ تمھارے لیے اچھی ہو۔ اور جو چیز تمھیں اچھی لگے وہ تمھارے لیے بُری ہو۔ اللہ جو کچھ جانتا ہے وہ تم نہیں جانتے۔ اے ابنِ آدم تیرے پاس وہ چیز ہے جو تیرے لیے کافی ہو جائے۔ اور تو طلب کرتا وہ چیز جو تجھے بغاوت میں ڈال دے۔ اللہ کو اپنا سچا دوست ماننا چاہیے، اور ستر ماؤں سے بھی زیادہ مہرمادری کا حامل سمجھنا چاہیے۔ اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ وہ ہمارا حقیقی خیر خواہ و دوست ہے۔ اے ایمان والو یقین رکھو اللہ تمھارا دوست ہے۔ لہذا اس کی دوستی اور کارسازی پر اعتماد کرتے ہوئے پورے اطمینانِ قلب کے ساتھ دُنیاوی اسباب سے قطعِ تعلق کر لینا چاہیے، اور توکل کے مسند پر بڑے سکون و اطمینان سے بیٹھ رہنا چاہیے۔ جیسا کہ خدا خود فرماتا ہے کہ جو شخص اللہ پر توکل کرے گا تو اللہ تعالیٰ اُس کی اصلاح مہمات کے لیے کافی ہے، اور اللہ توکل کرتے والوں کو پسند فرماتا ہے۔ اگرچہ میرا مُنہ یہ بات کہنے کے قابل نہیں، یہ مت دیکھو کہ متکلم کون ہے، یہ دیکھو کہ وہ کہتا کیا ہے۔ یعنی میرا یہ دہانِ بشریت اس بیان کے قابل نہیں۔ میں سراسر عاجز ہوں۔ اور یہ باتیں میں محض فضلِ خداوندی سے لب پر لایا ہوں۔ اور مجھے خدا نے اس حالت پر محض اپنے فضل و کرم ہی سے قائم رکھا ہے اور مجھے اس کے فضل و کرم سے پوری اُمید ہے کہ وہ خاتم الانبیاؐ کے صدقے مجھے یوں ہی قائم و برقرار رکھے گا۔ اور میرا انجام بھی بخیر ہوگا۔ جیسا کہ قرآن پاک میں آیا ہے کہ اسی نے سب کو پیدا کیا ہے۔ وہی مجھ کو میری مصلحتوں کی طرف رہنمائی کرتا ہے، وہی مجھ کو کھلاتا، پلاتا ہے۔ اور جب میں بیمار ہو جاتا ہوں تو وہی مجھ کو شفا دیتا ہے۔ اور وہی مجھ کو وقت پر موت دے گا، اور پھر قیامت کے روز مجھے زندہ

کرے گا۔ اور اُس سے مجھ کو یہ اُمید ہے کہ وہ میری غلط کاری کو قیامت کے روز معاف کر دے گا۔ لہذا اے کتاب کے دیکھنے والے تو صرف ظاہر ہی کو دیکھتا ہے۔ اور مصنف ہی کو کلام کرنے والا سمجھتا ہے اور اس معاملے میں پوری طرح آگاہ نہیں۔ یہ مت دیکھ کہ بظاہر یہ کلمات کس کی زبان سے نکل رہے ہیں۔ یہ دیکھ کہ مجازی طور پر کہنے والا کون ہے۔ اور اس امر کو ملحوظ رکھ کہ اس سے کن اسرار و فوائد کا حصول ہوتا ہے۔ اور وہ بات ہے کیا تاکہ تمھیں بھی فائدہ پہنچے اور کہیں انکار کے پردے ہی میں محجوب ہو کر نہ رہ جاؤ۔ میں صالحین سے محبت کرتا ہوں۔ اور میں ان میں نہیں ہوں۔ شائد کہ اللہ تعالیٰ مجھے صلاح (نیکوکاری) سے نوازے۔ مصنف اس شعر کی خود یوں وضاحت کرتا ہے کہ صالح افراد فی الحقیقت مقربانِ ذات ہوتے ہیں۔ جو قرب و نزدیکی کے باعث آخری مرتبے پر فائز ہوتے ہیں۔ اور خودی و انا کی خرابیوں سے بالکل مامون و مصؤن ہوتے ہیں۔ لہذا شاعر کہتا ہے کہ میں خود کو اس درجے پر پہنچا ہوا نہیں پاتا، لیکن حق سبحانہ تعالیٰ کے لطف و کرم سے پوری اُمید ہے کہ وہ اپنے ان برگزیدہ بندوں کی محبت اور متابعت کی بنا پر مجھ گناہگار کو بھی حقیقی بھلائی نصیب کر دے گا۔ اور مجھے بھی قرب و نزدیکی کی زبردست نسبت عطا فرما دے گا اور فنا فی اللہ کی منزل سے آگے بقا باللہ تک لے جائے گا۔ اور ان بزرگوں سے نسبت کے شرف سے مجھے بھی کمالات کئے درجوں سے نوازے گا۔ اللہ تعالیٰ ہی ہمیں اور تمھیں روزی دیتا ہے۔ اور توکل و استقامت کی حقیقت سے آگاہ کرتا ہے۔ یعنی اے طالبانِ حق جنھوں نے اس راہ حق میں قدم رکھا ہے خدا توکل و استقامت کی حقیقت عطا کرے۔ یعنی ظاہری اور باطنی طور پر توکل کی روزی عطا فرمائے اور اس پر تمھیں استقامت بخشے اور اپنے خاص احسان سے تمھارے قدموں کو لڑکھڑانے سے بچائے۔ ترجمہ رباعی دولت مندوں کے ساتھ تندخوئی برت اور مفلسی و غریبی کے باغ میں نشوونما پا۔ تم کب تک ہوا و ہوس سے اپنی عزت کو نذرِ آتش کرتے رہو گے۔ خاک نشینی اختیار کر کے آبرو حاصل کرو۔ اب آگے مصنف خود ہی اس کی مزید تشریح یوں کرتا ہے کہ حق بات یہ ہے کہ درویش کو گزر بسر یوں کرنی چاہیے کہ وہ متمول لوگوں سے تندخوئی سے پیش آئے۔ اُس کا مطلب یہ نہیں کہ بُرے اخلاق یا بدمزاجی سے پیش آئے۔ کیونکہ یہ بات تو حُسنِ اخلاق سے بہت دُور ہے۔ بلکہ مراد یہ ہے کہ فانی جاہ و جلال رکھنے والے متمول لوگوں سے عاجزی و انکساری سے ملاقات نہیں کرنی چاہیے۔ اور یوں فقر کے لبادے کو دنیوی مال و اسباب کے سامنے ذلیل و خوار نہ کرنا چاہیے۔ بلکہ درویش کے لیے

طریقے پر نہیں بلکہ اسباب رزق کی توجیہہ کے ضمن میں ہے اور قبض الارواح توسط عزرائیلی سے ہے لیکن مقاربت اور مواجہت کے انداز میں نہیں، بلکہ شدت امراض اور موت کے اسباب کی جمع کی شکل میں۔ اور صور کا پھونکنا ہے متنفس میں ہر وقت توسط اسرافیلؑ سے، لیکن قیامتِ کبریٰ کے انداز میں نہیں بلکہ امثال کی تجدید کے ضمن میں اور اُن میں سے کوئی بھی معطل نہیں ہے اپنی خدمت سے کسی بھی زمانے میں، بلکہ وہ مامور ہیں ہر وقت کسی کام پر، اور کرتے ہیں وہ چیز جن کا اُنھیں حکم دیا جاتا ہے۔ پس تعریف ہر قسم کی اللہ کے لیے ہے جس پر میں ایمان لایا اور اُس کے فرشتوں پر اور اُس کی کتابوں پر اور اُس کے رسولوں پر مکمل ایمان۔ اور اگر پردہ ہٹا بھی دیا جائے تو میں یقین کے معاملے میں زیادہ نہیں ہو پاؤں گا۔

اور اگر میں چاہوں تو میں خبر دوں ملائیکہ کے احوال کی جزئیتہً، کلیتہً، صورۃً اور حقیقتاً سب کی سب اور میں نے مشاہدہ کیا عالم ملکوت میں ان کی صورتوں کا، اور میں نے پا لیے حقائق، مگر مجھے حکم نہیں ان مطالب کی تصریح کا اور ان مکشوفات کے اظہار کا مفصلاً۔ اور ملک اللہ کا ہے اور نہیں ہے کوئی بھی حاکم سوائے اللہ کے اور ہم نہیں عبادت کرتے کسی کی سوائے اس کے۔ **فائدہ** قضا کو مزاج سمجھیے کہ انسانی بدن کا حاکم اور تدبیر کنندہ ہے اور وہ اپنے بدن کو اس ریاست میں اصلاح، خیر و عافیت، صحیح نظام کار اور آراستگی کے سوا اور کچھ نہیں چاہتا، ہر چند کہ صحت کا دارومدار اسی مزاج پر ہے، مگر مرض بھی اسی سے پیدا ہوتا ہے کیونکہ اگر مزاج نہ ہو تو مرض بھی پیدا نہ ہو۔ لیکن فطری طور پر مزاج اور اُس کے تحفظ کا متقاضی ہوتا ہے اور گندے مندے مواد کی خلل اندازی سے مرض کا موجب بنتا ہے۔ اسی طرح قضا جو واجب الوجوب کا حکم ہوتا ہے موجودات کی بھلائی اور خیر خیریت کے سوا اور کچھ نہیں چاہتی اور ہر آن وجود کو فیض پہنچاتی ہے جیسا کہ قرآن پاک میں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ فساد و خرابی کو پسند نہیں فرماتا اور اپنے بندوں پر بڑا مشفق و مہربان ہے لیکن عدم کا فاسد مادہ جو امکانی حقیقت میں درج ہوتا ہے بڑے مرض کا تقاضا کرتا ہے اور واجب الوجود اپنی اس شفقت کی راہ سے جو ہر وقت تمام ممکنات کے شامل حال رہتی ہے ان ممکن معانی کو موجود کرتی ہے اور امکانی حالت کو وجود میں لے آتی ہے۔ اور خیر و شر کا اندازہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتا ہے، اور وہ کسی پر ظلم نہیں کرتا، بلکہ وہ خود ہی اپنے نفسوں پر ظلم کرتے ہیں۔ پس جو کچھ بھی ہے خیر ہی خیر ہے، اور اضافی اور نسبی شر کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ **نکتہ** اس پاک وجود کے مرتبے میں جیسے کہ وہ ہے خیر کا اطلاق بھی نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ خیر بھی شر کی طرح اعتباری ہے۔ لیکن شر نسبت

کے اعتبار سے ممکن ہے اور غیر نسبت کے اعتبار سے واجب۔ قرآنِ حکیم میں ارشاد ہے کہ اسے انسان تجھ کو جو خوشحالی پیش آتی ہے وہ محض اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہے۔ اور جو کوئی بدحالی پیش آئے تو وہ تیرے ہی سبب سے ہے۔ جامعیتِ مطلقہ سے نسبت کے اعتبار سے۔ کہہ دو کہ سب کچھ اللہ ہی کی طرف سے ہے۔ ہر قضا و قدر کا حکم اللہ تعالیٰ ہی نے دیا ہے۔ جس کے سبب سے ہر شے وجود میں آئی ہے۔ جیسا کہ خود خدائے بزرگ و برتر نے فرمایا کہ جب وہ کسی کام کو کرنا چاہتا ہے تو صرف یہ کہہ دیتا ہے کہ ہو جا اور وہ ہو جاتا ہے۔ خدا کی قسم نفع و ضرر کی ہستی بھی اسی سے ہے۔ اس سے مُراد وہ تمام متضاد امور ہیں۔ فقط نفع و ضرر ہی نہیں دُنیا بھر میں اختلافی امور اسی کے اسمائے حسنیٰ کے مظاہر ہیں۔ اور ان میں متقابل اسماء کا ظہور ہے۔ پس جو کچھ بھی ہے اُسی سے ہے، اور اللہ تعالیٰ کے سوا اور کسی کو قوت اور قدرت حاصل نہیں ہے۔ کیونکہ اگر اس موثرِ حقیقی کی تاثیر شامل نہ ہو تو کوئی چیز کسی پر اثر انداز نہ ہو۔ لہٰذا عقول، نفوس، افلاک، ستاروں، طبیعتوں، دواؤں، عملوں اور قولوں میں یہ سب تاثیرات اسی ذاتِ خداوندی کی تاثیرات ہیں۔ پس نفع یا نقصان پہنچانے والا اللہ کے سوا اور کوئی نہیں۔ جان لو کہ اشیائے مقدرہ فتح کے ساتھ ساری کی ساری مقدر ہیں۔ کسرہ کے ساتھ ان چیزوں کے لیے جو ان کے بعد ہیں اور افعال بھی دوسرے افعال کے لیے کسی بھی فاعل سے ہوں۔ کیونکہ ان کا فاعل نفس امر میں وہ اللہ ہے حقیقتاً اگرچہ ہو اس کا اسناد باعتبار مجازاً ان فاعلین کی طرف مفعول میں واقعتاً۔ یہ بھی جان لیں کہ اندازہ کی ہوئی چیزیں سب کی سب اپنے بعد میں آنے والی چیزوں کا اندازہ کرنے والی ہیں۔ اور ان میں علت و معلول کا تقدم و تاخر ہے۔ اور افعال بھی دوسرے افعال کے لیے خواہ وہ کسی فاعل کے ہوں۔ کیونکہ تحقیقاً ثابت ہے کہ ان افعال کا فاعلِ حقیقی صحیح اندازہ کرنے والا حق تعالیٰ ہی ہے۔ اگرچہ ان افعال کو مجازی طور پر دیگر فاعلوں سے نسبت دی جاتی ہے جو حقیقتاً خود مفعول اور مخلوق ہیں۔ حاصل مطلب یہ کہ اگر دُنیا کی مجموعی حالت اور ساری زمینی اور فلکی مخلوقات کو چشم بصیرت سے دیکھا جائے تو پتہ چلے گا کہ یہ ساری موجودات تقدیرِ الٰہی کے مظاہر ہیں۔ اور فقط اسی کی قدرتِ کاملہ اور اسی فاعلِ حقیقی کا فعل ہے جو تمام اشیا میں جاری و ساری ہے۔ چونکہ اشیا اور افعال کا باہمی تقدم اور تاخر ثابت شدہ ہے۔ لہٰذا پہلے آنے والی چیزیں اپنے سے بعد میں آنے والی موجودات کے لیے تقدیرِ الٰہی کی مظاہر ہیں اور ان کا اندازہ مقرر کرنے والی۔ اور اسی قیاس پر پہلے افعال پچھلے افعال کے تقدیر کنندہ (اندازہ کرنے والے) ہیں۔ مثال کے طور پر

انسان کا ارادہ ہاتھ کی حرکت کا باعث بنتا ہے۔ اور ہاتھ کی حرکت قلم کی جنبش کا باعث بنتی ہے اور قلم کی جنبش نقوش کے ظہور کا باعث بنتی ہے اور دراصل ان تمام حرکات کی نسبت کاتب ہی کی ذات کی طرف جاتی ہے، اور کہتے ہیں کہ یہ چیز فلاں کاتب نے لکھی ہے، اور یوں لکھی ہے اور ہاتھ کی قوت بھی اسی کی قوت ہے۔ قلم کی قدرت بھی اسی کی ہے۔ کیونکہ قلم اور ہاتھ بذاتہ حرکت کی قابلیت نہیں رکھتے۔ ان کو حرکت دینے والی کاتب ہی کی شخصیت ہے۔ اگرچہ مجازی طور پر ان حرکات کو ان سے بھی نسبت دے دی جاتی ہے۔ اور کہا جا سکتا ہے کہ فلاں حرف کے لکھنے میں قلم یوں گھومتی ہے اور انگلیاں یوں حرکت کرتی ہیں، لیکن فی الحقیقت یہ ساری حرکات کاتب ہی کی ہوتی ہیں۔ پس اسی پہ قیاس کر لو جس کا ہم نے ذکر کیا ہے۔ اشیا کے حال اور افعال میں سے۔ پس ہاتھ اور قلم دو مثالیں ہیں مقدم و موخر اشیا کے لیے، اور ان کی حرکات مثالیں ہیں افعال صادرہ کے لیے اشیا میں سے، اور نفس کاتب۔ یہ مثالوں میں اعلیٰ مثال ہے، جو کہ مثال ہے ذاتِ واجب کے لیے، اور اللہ کے لیے مثل اعلیٰ جیسا کہ نقل میں ثابت ہے اور نہیں ہے طاقت اور قوت مگر اللہ کے پاس اور عقل کے ساتھ، اور نہیں ہے فاعل کوئی بھی وجود میں مگر وہی کیونکہ فاعلیت مخصوص ہے مرتبہ واجبیہ کے ساتھ، اور انفعال مختص ہے مرتبۂ امکانیہ کے ساتھ۔ جیسا کہ رسول اللہ صلعم سے یہ منقول بات ثابت شدہ ہے، کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو قوت اور طاقت حاصل نہیں۔ اور عقل یعنی کہ عقلی دلائل کے ساتھ بھی دانشوروں کا یہ فیصلہ ہے، کہ وجود میں سوائے اُسی وجود کے اور کوئی فاعل نہیں۔ کیونکہ فاعلیت مرتبۂ وجوب سے مخصوص ہے، اور وجود ہی وجوبِ عین ہے۔ اور انفعال جو فعل کا قبول کرنا ہے وہ امکانی مرتبے کی خصوصیت ہے۔ اور اس کے علاوہ فعل کا قبول کرنا بھی چونکہ فعل ہے، لہٰذا اسی وجود سے منسوب ہے جو کہ ممکنات میں جلوہ گر ہے نہ کہ ماہیاتِ ممکنہ میں۔ حاصل مقصد یہ کہ علوم منقول اور معقول کی رو سے اسی حق سبحانہ تعالیٰ سے منسوب ہے۔ ہر امر کے اندازے کی نسبت اسی کی طرف ہے۔ اور ہر صورت میں ہر امر کا تقدیر کنندہ وہی ہے۔ اور تدبیریں بھی انہی اندازوں میں داخل ہیں جیسا کہ فرمایا گیا ہے کہ "اللہ نے تمھیں پیدا کیا، اور جو کچھ تم کرتے ہو وہ جانتا ہے۔ جیسا کہ حق سبحانہ تعالیٰ نے بعض امور کے لیے اپنی تقدیرات کا مظہر فرشتوں کو بنایا ہے اسی لیے فرشتوں کو کارکنانِ قضا و قدر کہتے ہیں۔ ایک فرشتے کو رزق رسانی کا کام سونپ دیا، ایک کو روحیں قبض کرنے کا کام سپرد کیا، اور علیٰ ہذا القیاس دیگر مقدرہ امور فرشتوں کو سونپ دیے۔ اسی طرح

اس نے اپنی تقدیر کے کام ہر موجود کے حوالے کر دیے ہیں۔ لہٰذا احکام و آثار اشیا ہی سے ظاہر ہوتے ہیں اور اشیا کے خواص حق ہیں۔ آدمیوں کو بھی کام سونپے گئے ہیں۔ ان کے اعمال و اقوال کے نتیجے بھی مسلّم ہیں۔ یہ سب اللہ تعالیٰ کی تقدیرات (اندازے) ہیں، جیسے کہ تفصیل آرہی ہے۔ پس اشیا اور افعال ایک حیثیت سے مقدورات ہیں، اور ایک حیثیت سے تقدیرات ہیں۔ اور یہ سب کے سب شمار کیے جاتے ہیں تقدیریں۔ کیا تم دیکھتے نہیں کہ شخص واحد بیٹا ہوتا ہے اپنے والد کا اور باپ ہوتا ہے اپنے بیٹے کا۔ مختلف ہو جاتے ہیں احکام اعتبارات کے اختلاف کے ساتھ۔ پس تمام اشیا اور افعال کی ایک حیثیت سے تقدیر یا اندازہ مقرر کر دیا گیا ہے۔ اور ایک حیثیت سے وہ خود تقدیر یا اندازہ مقرر کرنے والے ہیں۔ کیونکہ تمام موجودات کو آپس میں علّت و معلول کی نسبت ہے۔ لہٰذا تقدیر کنندگان کی علّتیں ان کے اپنے ہی معلول ہیں، اور جن کی تقدیر مقرر کر دی گئی ہے۔ ان کے معلولات ان ہی کی اپنی علّتیں ہیں، اور وہ تمام اشیا اور افعال قدر ہی کے کھاتے میں کیے جاتے ہیں۔ کیونکہ یہ سب قدرت اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے دی گئی ہے اور اُسی جل شانہٗ کے اندازے ہیں۔ مثال اس کی یہ کہ کیا تمھیں دکھائی نہیں دیتا کہ ایک آدمی اپنے باپ کا بیٹا ہے، اور وہی شخص اپنے بیٹے کا باپ بھی ہے۔ احکام اپنے مختلف اعتبارات کے لحاظ سے مختلف ہوئے۔ پس واحد اوّل کا فعل جو کہ صادرِ اوّل ہے، اُسے قضا کہا جاتا ہے۔ کیونکہ حکم اجمالی ہے جو مشتمل ہے تمام تفاصیل مقدرہ پر۔ اور دوسرے کثیر افعال موسوم کیے گئے ہیں قدر سے کیونکہ وہ تفصیلی معاملہ ہے جو مختص ہے معین مخصوصات کے ساتھ۔ لہٰذا وہ فعل پہلا واحد ہے کہ وہ پہلے نکلنے والا ہے اور اسی بزرگ و برتر واحدِ حقیقی سے ظہور میں آیا ہے۔ کیونکہ دانشوروں کا اس امر پہ اقرار ہے کہ وہ واحد سے صادر نہیں ہوتا، مگر اس کا نام قضا رکھ دیا جاتا ہے۔ کیونکہ قضا ایک مجمل یا مختصر سا حکم ہے جو تقدیر کی جملہ تفصیلات پر مشتمل ہے۔ اور وہ دیگر افعال جو متعدد و کثیر ہیں ان کا نام قدر رکھ دیا گیا ہے کیونکہ قدر معلوماتِ معینہ کی خصوصیات کا تفصیلی حکم ہے۔ ہم اس کی وضاحت ایک مثال سے کرتے ہیں۔ مثلاً ایک بادشاہ حکم دیتا ہے کہ ملازموں کو تنخواہ دے دی جائے۔ لہٰذا یہ مختصر سا حکم قضا کی مانند ہے۔ اور ان کے مراتب اور مناصب کے لحاظ سے اُس کی تقسیم کہ زید کو اس قدر دے دو، اور عمر کو اتنی تنخواہ دے دو۔ یہ تفصیلی کام قدر کی مانند ہے۔ لہٰذا قضا جسے ہم نے مختصر حکم کہا اس میں قدر بھی شامل ہے جس کی امور کی تفصیلات ہوتی ہیں۔ سو قضا مثل مصدر کے ہے، اور قدر اس مصدر کے

مشتقات کی طرح۔ یعنی کہ قضا کے ان مجملات میں قدر کے سب مفصلات شامل ہیں۔ یہ لیجیے یہ اس کی دوسری مثال ہے۔ یعنی قضا مصدر کی طرح ہے۔ اور قدر کی مثال ان صیغوں کی طرح ہے جو اُس مصدر سے مشتق ہوتے ہیں۔ اور قدر میں جو کچھ تفصیل کے ساتھ ہے وہ قضا میں اختصار کے ساتھ ہے۔

اور قدر کی چار حقائق یعنی بدیہی، نظری، کشفی اور مخفی رو سے یہی چار قسمیں ہیں۔ یعنی قدرِ بدیہی، قدرِ نظری، ایک قدر کشفی اور ایک قدر مخفی۔ مطلب یہ کہ فلکی اور ارضی اشیا و افعال چونکہ تقدیرات الٰہی ہی سے نکلنے والے ہیں۔ وہ سابقہ بیان کے مطابق قدر ہی کے مراتب میں داخل ہیں۔ ان کو مجموعی طور پر چار قسموں میں تقسیم کر دیا گیا۔ اور ہر ایک کا الگ الگ نام رکھ دیا گیا۔ ہر ایک کی حقیقت کی وضاحت اور صراحت کے لیے ہر قسم کے دو دو نام رکھ دیے گئے۔ ان کے مرتبوں کی مزید توضیح و تصریح یوں ہے۔ پس قدر بدیہی جسے سفلی کہا جاتا ہے، اُسے بھی سُنتِ عوام سے موسوم کیا گیا ہے ظاہری اسباب کی وجہ سے۔ پس جسے بدیہی قدر کہا جاتا ہے اسی کا نام ارضی (سفلی) قدر بھی ہے۔ عوام کی زبان میں اس قدر کا نام ظاہری اسباب ہیں۔ اور یہ ظاہری اسباب بھی جملہ تقدیرات میں سے ہیں اور ان کا نتیجہ بھی اکثر ظہور پذیر ہوتا ہے۔ بعض نادان اسباب کی بھی قدر ہی طرح رو رعایت کرتے ہیں۔ لیکن یہ تو سفلی اندازہ ہے۔ اور ہرگز قابلِ اعتماد نہیں۔ کیونکہ مذکورہ بالا قضائیں اس کی تردید بھی کرتی ہیں۔ اور کبھی بعض کام ان اسباب کے خلاف بھی ظہور پذیر ہوتے ہیں جن کا یہ ظاہری اسباب تقاضا نہ کرتے ہوں۔ اور حق سبحانہ تعالیٰ نے آگاہ فرما دیا ہے تمام عوام کو اُن سے۔ اطلاع باب افعال سے ہے اور اس کے معنی ہیں اپنے آپ کی جانکاری (آگہی) ہونا۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے تمام عوام کو ان ظاہری اسباب سے آگہی دی ہے جو بدیہی یا سفلی قدریں ہیں اور ان اسباب کے آثار ہر کسی کو اچانک نظر آتے ہیں، اور ان کے نتائج بھی نظر آجاتے ہیں۔ اور وہ نظر جسے علوی کہا جاتا ہے وہ بھی اسی لیے موسوم کی گئی ہے کہ اس میں تاثیرات ہیں طبائع، نجوم، افلاک و نفوس اور عقول کی تاثیرات سے۔ جسے نظری قدر کہا جاتا ہے۔ اسے فلکی قدر کا نام بھی دے دیا جاتا ہے۔ فلسفیوں کی اصطلاح میں طبائع ستاروں، آسمانوں، ارواح اور عقول کی تاثیرات میں سے ہر ایک تقدیر الٰہی کا مظہر ہے، اور اُس حق تعالیٰ کی قدرت سے صاحب تاثیر ہیں۔ اور اربعہ عناصر سے منسوب طبائع سفلیات سے ہیں۔ اسی وجہ سے علویات میں شمار کرتے ہیں کہ چیزوں سے ان کی دریافت کا مرتبہ جو عوام کی فہم میں آتا ہے بہت بلند و بالا

ہے۔ اطبا اس سے آگاہ ہیں۔ اور ان تمام مذکورہ بالا تاثیرات میں اختلاف کا احتمال بھی ہے۔ ہر چند کہ ان کا قدر ہی میں شمار ہوتا ہے اور وہ تقدیر نظری ہے، مگر بدیہی قدر کی طرح مذکورہ بالا قدر کے تقاضے کے طور پر نظری قدر میں بھی اختلاف کا جواز ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ جب چاہے ان کو موثر بنا دیتا ہے، اور جب نہ چاہے تو تاثیر نہیں دیتا۔ کیونکہ سورج، چاند اور ستارے سبھی اس کے حکم کے تابع ہیں۔ فلاسفہ اور نجومیوں کے علم نے بعض گمراہی کی باتیں بھی سکھائی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس نظری قدر جو طبائع اور ستاروں وغیرہ کی تاثیرات سے موسوم ہے۔ اس کے متعلق حکما اور نجومیوں کو جو علم دیا گیا ہے وہ اسی سے سیکھا ہوا ہے اور عوام اس سے آگاہ نہیں، حکما کا نام ہم نے اس لیے پہلے بیان کیا کہ علم حکمت و فلسفہ عام ہے اور اس میں طب اور نجوم کے علوم بھی شامل ہیں۔ لہٰذا حکما مذکورہ بالا تاثیرات سے مکمل طور پر آگاہ ہیں۔ اور چونکہ طبیب کو بھی عرف عام میں حکیم ہی کہتے ہیں۔ لہٰذا اطبا بھی انہی میں شمار ہوئے، انھیں طبائع کی تاثیرات معلوم ہوتی ہیں۔ اور علاج معالجے میں موسم اور آب و ہوا کو ملحوظ خاطر رکھتے ہیں۔ نجومیوں کو واضح طور پر حکما کے بعد اس لیے بیان کیا گیا کہ ہر چند علم طب کی طرح علم نجوم بھی علم حکمت ہی کی اک شاخ ہے لیکن سورج گرہن اور چاند گرہن اور دیگر امور کے وقت ستاروں کی سعادت اور نحوست کے لحاظ سے احکام و اخبار کے نکالنے کی وجہ سے نجومیوں کے گروہ نے حکما کے فرقے سے الگ شہرت پائی۔ نجومی کو کوئی فلسفی نہیں کہتا۔ ہاں نجومیوں کو ستاروں اور افلاک کی حرکات کا علم ہوتا ہے۔ وہ ان کے آثار کو دریافت کر لیتے ہیں۔ لیکن وہ ان کی تاثیرات کے اختلافات کو جائز نہیں سمجھتے۔ یہ حقیقتِ امر سے ناواقفیت کی بنا پر ہے۔ اور یہ بالکل کفر و گمراہی ہے جس طرح کہ ان کو بالکل بے تاثیر سمجھنا اور ستاروں اور افلاک کی گردش کو فضول، لغو اور بیہودہ سمجھنا نادانی اور جہالت کی وجہ سے ہے۔ حق بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرتِ کاملہ سے ان میں بھی اثرات رکھے ہوئے ہیں۔ جیسا کہ قرآن پاک میں آیا ہے کہ حق تعالیٰ نے یہ سب کچھ یونہی بے فائدہ تو نہیں بنایا۔ اور اللہ تعالیٰ اس امر پر بھی قدرت رکھتا ہے کہ بعض اوقات احکام ان کی تاثیرات کے مطابق ظہور پذیر نہ ہوں۔ **فائدہ** حاصل مطلب یہ ہے کہ عرفانی (معرفت) نقطۂ نگاہ سے ہر شے کو اُس بزرگ و برتر حکیم حقیقی کی حکمت کا مظہر سمجھنا چاہیے اور ہر چیز میں اسی کی قدرت اور حکمت کو دیکھنا چاہیے۔ کیونکہ حکیم کا کوئی فعل حکمت سے خالی نہیں ہوتا۔ جب اس قسم کا مشاہدہ حاصل ہو جائے تاثیرات کی نسبت اشیا کی ذاتوں سے جاتی رہے اور اشیا

کو ذاتی طور پر (اپنی ذات میں) موثر نہ سمجھا جائے، اور اس حدیث مبارک کہ جو ستاروں کے علم پر ایمان لایا اُس نے کفر کیا کا بھی یہی مطلب ہے۔ نہ یہ کہ حق تعالیٰ نے ستاروں کو بے تاثیر یا یونہی بیہودہ ہی پیدا کیا ہے۔ اور کشفی جسے کہا جاتا ہے مکتوبی وہ بھی موسوم کیا گیا ہے اس سے جو کہ لکھا ہوا ہے لوحِ محفوظ میں۔ یہ جو قدر کشفی کے متعلق کہا گیا ہے۔ اس کا نام مکتوبی بھی ہے جو شرع کے مطابق اس چیز کو کہتے ہیں جو لوح محفوظ میں لکھی ہوئی ہے۔ اور اس تقدیر (اندازے) میں اختلاف کا جواز ہے۔ کیونکہ قرآن پاک میں آیا ہے کہ خدا تعالیٰ جس حکم کو چاہیں موقوف کر دیتا ہے اور جس حکم کو چاہے قائم رکھتا ہے۔ اور اصل کتاب اُسی کے پاس ہے۔ اور اُس سے اُس نے باخبر کیا ہے فرشتوں کو انبیا کو، اور اولیائے کرام کو (ان سب پر خدا کا درود و سلام ہو) یعنی کہ اللہ تعالیٰ نے کشفِ حقیقت کی راہ سے فرشتوں، نبیوں[۴] اور ولیوں کو مطلع کیا ہے۔ اور جب کبھی حق سبحانہ تعالیٰ کا ارادہ ہو وہ لوح محفوظ میں لکھی ہوئی بعض باتیں ان پر کشف فرما دیتا ہے۔ لیکن حکما اور نجومیوں کو ان باتوں کا علم نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ نے لوح و قلم کے جو اسرار کشف فرمائے ان کے مطالب کی وضاحت کی اجازت نہیں۔ خدا نے چاہا تو جس کسی کے نصیب میں ہوگا اسی بیج سے وہ پودا پھوٹ کر پروان چڑھے گا، اور خود بخود تائیدِ غیبی سے منکشف ہو جائے گا۔ اور مخفی جو ہے وہ ہے جسے مجہول کہا جاتا ہے اسے بھی اس غیب سے موسوم کیا گیا ہے جسے نہیں جانتا کوئی سوائے اس کے۔ اور اس انداز سے میں اختلاف کی کوئی گنجائش نہیں، اور وہ اپنے سے نچلی سطح والی تمام تقدیرات پر غالب ہے وہ بھی امر الٰہی ہی میں سے ہیں۔ کیونکہ اللہ تمام امور پر غالب ہے۔ وہ تقدیریں مرتبۂ امکان میں داخل ہیں۔ اور یہ مستقل تقدیر مرتبۂ وجوب میں داخل ہے جیسا کہ فرشتوں نے حق تعالیٰ سے اعتراف کیا تھا کہ اے خدا تیری ہی ذات پاک ہے، ہمیں تو کچھ علم نہیں سوائے اس کے جو تو نے ہمیں سکھایا ہے۔ تو ہی عالمِ حقیقی اور حکیمِ مطلق ہے۔ یعنی تو پاک ہے اعتبارات کی تمام آلائشوں سے۔ اور ہمیں تو صرف اتنا ہی علم ہے جو تو نے ہمیں سکھایا ہے۔ اور قدر کو مجازاً قضا سے بھی موسوم کیا جاتا ہے، اور اس کا اطلاق تین قسموں پر ہوتا ہے، پہلا اطلاق قضائے معلّق پر جس میں تبدل اور تخلف کا جواز ہے اور چوتھی قسم کا اطلاق قضائے مبرم پر۔ اس میں تخلف اور تبدیلی نہ ہونے کی وجہ سے۔ کیونکہ وہ مختص ہے اللہ سبحانہ کے علم کے ساتھ، اور منسوب ہے اسی کی طرف، اور نہیں ہے خلاف اللہ کے علم میں۔ اللہ بلند ہے۔ اس بات سے بہت زیادہ بلند ہے۔ اور کبھی مجازاً قدر کو بھی قضا کا نام

دے دیا جاتا ہے۔ یعنی ان اندازوں کو بھی کبھی قضا سے تعبیر کر دیا جاتا ہے، اور اس کا پہلی تین قسموں یعنی قدر بدیہی، کشفی اور نظری پر اطلاق کر دیا جاتا ہے۔ ان تین اقسام میں اختلاف اور تغیر و تبدل کے جائز ہونے سے قضائے معلق کا اطلاق چوتھی قسم یعنی قدر مخفی پر، اور اس چوتھی قسم میں اختلاف و تغیر و تبدل نہ ہونے سے اس کا اطلاق قضائے مبرم (اٹل قضا) پر اس لیے کہ وہ چوتھی قسم یعنی قدر مخفی صرف حق تعالیٰ ہی کے علم سے مخصوص ہے۔ اور حق سبحانہٗ تعالیٰ کے علم میں اختلاف جائز نہیں۔ وہ پاک ذات اس اختلافی نسبت سے بزرگ و برتر ہے۔ **ترجمہ رباعی** میں پاکیزہ کی تعریف کرتا ہوں جو اِلٰہ سے موسوم ہے لوگوں میں۔ میں نے اُسے پایا ہے مخلوق میں۔ اگرچہ وہ ان کے سوا ہے۔ حقائق ممکنہ اس کے جمال کا آئینہ ہیں اور کائنات میں میں نے نہیں دیکھا سوائے اس کے اور میں نے نہیں دیکھی کوئی چیز مگر اُس میں اللہ ہی دیکھا۔ مصنف کی اپنی توضیح کے مطابق کلمہ حمدا حذف شدہ فعل کا مفعول مطلق ہے جس کا حذف سماع میں واجب ہے۔ یعنی احمد حمداً۔ پس معانی یہ ہوئے کہ میں حمد و ثنا کرتا ہوں اور حمد و ثنا کرتا ہوں اور حمد و ثنا کے سزاوار ہے وہ پاک ذات اور اِلٰہ سے موسوم ہے۔ میں نے اُسے مخلوق ہی میں پایا کیونکہ ساری کائنات اس کے کمالات کا مظہر ہے۔ اگرچہ وہ اس کائنات کے سوا ہے۔ اور حقائق ممکنہ سے الگ۔ تمام موجودات اسی کے حُسن و جمال کی آئینہ دار ہے۔ پس میں نے مرتبہ و وجود میں اس کے سوا کسی اور کو نہ دیکھا، یعنی کہ موجودات میں سوائے اس کے وجود کے اور کچھ نہیں۔ تمام اشیا یا موجودات میں سوائے وجود واجب کے اور کچھ دکھائی نہیں دیتا۔

هوالناصر

شروع اللہ کے نام سے جو نہایت مہربان اور بہت رحم کرنے والا ہے

ہر قسم کی تعریف اللہ کے لیے ہے جو غیب اور حاضر کا عالم ہے، اور وہی حکیم و خبیر ہے۔ وہ جانتا ہے آسمانوں اور زمینوں کے غیب کو۔ اور ہر چیز میں بصیرت رکھتا ہے، اور درود و سلام ہو بشیر و نذیر محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر اور ان کی آل پر اور صحابہ پر جو پاکیزہ ہیں ہر قسم کے نقص اور عیب سے اور غیب پر ایمان لانے والوں پر اور جو یقین رکھنے والے ہیں بغیر شک و شبہ کے۔ پس یہ چھبیسواں[۲۶] باب ہے جس کا نام انباء الغیب (غیب کی خبریں) ہے۔ یعنی غیب اور شہادت کی خبروں سے موسوم ہے۔ انباء کے معنی اخبار ہیں اور غیب وہ ہے جو نہ جانا جائے۔ اور شہادت وہ ہے جس کا مشاہدہ کیا جائے پس غیب باطن ہے شہادت کا اس کے چھپنے کی وجہ سے آنکھوں سے۔ اور شہادت ظاہر ہے غیب کی بلحاظ اپنے کشف کے آنکھوں پر، اور ان رازوں میں سے جو میں تمھیں دیتا ہوں اللہ کی تعلیم میں سے جو کہ غیب و حاضر ہے۔ غیب کی خبریں ہیں تیری نگاہ کے لحاظ سے اور شہادت کی خبریں ہیں میری نسبت سے اور اللہ ہر چیز پر گواہ ہے۔

غیب و حاضر کے معاملات کا بیان

اصطلاح میں عالمِ غیر محسوس کو غیب کہتے ہیں جیسے کہ عالم ملائکہ اور عالم ارواح، اور عالم

شہادت عبارت ہے عالمِ محسوس سے یعنی کہ عالمِ اجسام اور مجھ کم فہم کی سمجھ میں جو کچھ آتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ غیب عبارت ہے عالمِ نامعلوم سے خواہ وہ غیر مادی ہو خواہ مادی۔ فلکی ہو یا ارضی، ایک برابر ہے۔ محسوس ہونا یا محسوس نہ ہونا لازمی نہیں۔ اسی لیے حق تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ بے شک وہ زمین اور آسمانوں کی پوشیدہ باتوں کو جانتا ہے۔ سو معلوم ہوا کہ غیب آسمانوں میں بھی ہے اور زمین پہ بھی۔ عالم شہادت عبارت ہے عالم معلوم سے۔ یہ ایک ہی بات ہے کہ وہ محسوس ہو یا معقول، حاضر ہو یا غائب۔ پس غیب وحضور اعتباری اور اضافی امر ہیں۔ اور ہر مرتبہ غیب میں بھی داخل ہے اور شہادت میں بھی۔ کیونکہ بعض کے سلسلے میں وہی مرتبہ غیب میں شمار ہوتا ہے، اور بعض کے لیے شہادت میں۔ اور ہر مرتبے کی ذاتی پوشیدگیوں اور اُس کی کنہہ وماہیت والا پہلو بھی اس مرتبے کے عالم غیب ہی میں شامل ہے اور اُس کی کیفیات کی شناخت اور ظہور کا پہلو عالمِ شہادت میں۔ چونکہ حق تعالیٰ کا علم ہر طرف سے تمام اشیا کو احاطہ کیے ہوئے ہے۔ سو غیب کا اطلاق ہمیں پہ ہوتا ہے۔ ورنہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک تو جو کچھ تھا، ہے یا ہوگا سب حاضر ہے اور اُسے ہر چیز کی ہر طرح سے خبر ہے۔ وہ زمین اور آسمان کی پوشیدہ باتوں کو دیکھتا ہے اور سنتا بھی ہے۔ مجردات اور مادیات سبھی اس کے لیے حاضر ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ ہر چیز کی پوری خبر رکھتے ہیں۔ یاد رہے کہ غیب وحاضر کے مرتبے کا تعلق علم سے ہے۔ یعنی جو کچھ کہ معلوم نہ ہو وہ غیب ہے اور جو معلوم ہوگیا وہ حاضر ہے۔ اور حضرتِ وجود سے غیبی امور ہر لحظہ علمی مظاہر میں ظہور پذیر ہو کر عالمِ شہادت میں داخل ہوتے رہتے ہیں، اور اسی طرح ہر وقت معلومات حاضر انھی علمی مظاہر یعنی تعینات میں چھپ کر قدم عالم غیب میں رکھ دیتے ہیں۔ اور اللہ غائب اور حاضر سب کچھ جاننے والا ہے۔ اور وہ علمِ الٰہی کے احاطہ سے کبھی بھی باہر نہیں جانے پاتے۔ کیونکہ اللہ تمام اشیا کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ چونکہ تمام مراتب کو متمیز کرنے والا علم ہی ہے۔ سو احاطے کو امتیاز بھی علم ہی سے ہے۔ کیونکہ ہر چیز علمی امتیاز ہی سے شے قرار پائی اور اس کی حد وانتہا علمی احاطے ہی حاصل ہوئی اور متناہی اور لامتناہی امور کی انتہا اور لاانتہا علمی فرق ہی سے ظاہر ہوئی۔ پس معلوم ہوا کہ موجوداتِ الٰہیہ کا احاطہ جو کہ معلوماتِ الٰہیہ ہیں احاطۂ علمیہ ہے۔ اسی نے احاطہ کیا ہے تمام چیزوں کا علمی طور پہ نہ کہ وہ احاطۂ ذاتیہ ہے۔ کیونکہ ذات کے ملاحظہ میں موجودات کا اثر باقی نہیں رہتا اور ختم ہو جاتے ہیں اس کے نور کے اندر سب کے سب، اور یہاں نہیں ممتاز ہو پاتا محاط اور محیط اور احاطہ۔ ہر چیز ہلاک ہوتے

والی ہے سوائے اس کے چہرے (ذات) کے۔ پس کیسے اعتبار کیا جا سکتا ہے احاطے کا احاطۂ ذاتیہ کی حیثیت سے۔ بلند ہے وہ ذات، تمام قسم کی نسبتوں اور اضافتوں سے، تمام اعتبارات کے ثبوت کے ساتھ ان کے اندر۔ پس اولیٰ یہ ہے کہ منسوب کیے جائیں اور اضافت دی جائے احاطے کی نسبت کو، اُس کے علم کی طرف، وہ جس نے احاطہ کر لیا ہے ہر چیز کو۔ ذاتی احاطے کی یہ نفی اور علمی احاطے کا اثبات اس زمرے سے نہیں جس کے متکلین اپنی کم فہمی کی وجہ سے قائل ہیں۔ کیونکہ ان کی تحریروں سے اور ذاتوں کی طرح ذاتِ حق بھی کسی معین مکان یا مخصوص مرتبے پر منحصر ہے۔ اس پاک ذات کا علم سب اشیا پہ محیط ہے جیسا کہ زید ایک جگہ پہ بیٹھا ہوا ہے لیکن اس کے علم نے گھر کی ساری اشیا کا احاطہ کر رکھا ہے اور وہ سب کو جانتا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ بھی سب پر محیط ہے لیکن اس بیان سے ہمارا مقصد یہ ہے کہ اگرچہ ہر مرتبے میں ذاتِ باری تعالیٰ ہی موجود ہے۔ لیکن پہلی بات تو یہ ہے کہ احاطہ کرنے کی نسبت کو علمی مرتبے سے منسوب کرنا چاہیے۔ جیسا کہ مذکورہ بالا آیت سے ظاہر ہے۔ پس تمام نسبتوں کا مرجع ہونے کے باوجود بھی اس کی ذات کو تمام نسبتوں سے مبرا سمجھنا چاہیے۔ کیونکہ یہ معانی تنزیہہ و تشبیہہ دونوں کے جامع، اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کے شایانِ شان اور اہلِ اسلام کے عقائد کے مطابق ہیں۔ اور صوفیا کی طرح ذاتی احاطے کے بیان سے تو فوری طور پہ یہی بات ذہن میں آتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کا وجود مطلق بھی دیگر تمام موجودات کے وجود کی طرح اپنی جزئیات پہ محیط ہے۔ لیکن وہ جو بیان کرتے ہیں اللہ تعالیٰ اُس سے بہت بلند و برتر ہے۔ احاطہ کرنے کے اس قسم کے بیان سے درحقیقت اس ذات کے محیط ہونے سے انکار کرنے کے مترادف ہے۔ پس حق وہ ہے جو علم الٰہی محمدیؐ میں ہے جو کہ بیان کرتا ہے لوگوں کے لیے اور بے شک اللہ کی ہدایت ہی ہدایت ہے۔ حاصل کلام یہ کہ اللہ تعالیٰ چونکہ تمام غیبوں کا جاننے والا ہے۔ اس پہ ہر چیز کا انکشاف ہے۔ اور کسی وقت بھی کوئی شے اس کے علم سے غائب نہیں ہوتی اور نہ ہی اس کے علم کے احاطے سے باہر جاتی ہے۔ پس مذکورہ بالا سارے غیب اضافی ہیں۔ ان میں سے جس غیب کو بھی جس کسی پہ ظاہر کیا گیا وہ اس کے لیے حاضر کے زمرے میں شامل ہو گیا۔ اور غیب الغیب عبارت ہے اس مرتبے سے جس کی دریافت سے عقل انسانی عاجز ہے، اور کما حقہٗ جس کا ادراک ہرگز نہ ہو سکے۔ اور نہ ہی وہ علم کے احاطے میں سما سکے اور اس کی کما حقہٗ پہچان محال ہو جیسے کہ اُس واجب تعالیٰ کی ذات ہے، اور یہی غیب حقیقی ہے۔ اور یہ بشارت کہ جو لوگ غیب پر ایمان لائے اسی مرتبے کے

صوفیوں کے حق میں ہے۔ **سوال** اگر یہ کہا جائے کہ ہر چند کہ ذات پاک کی کما حقہٗ معرفت یا شناخت محال ہے، لیکن پھر بھی کامل انسانوں پر بشری طاقت کے مطابق منکشف بھی ہو جاتی ہے، اور دریافت کرنے کے سلسلے میں اپنے عجز کا اعتراف ہی اُس مرتبے کی دریافت ہے۔ یعنی کہ ذات باری تعالیٰ کے ادراک سے عجز کا اعتراف ہی اس کا ادراک ہے۔ لہٰذا بہتر یہی ہے کہ ماہیات معدومہ کو غیب الغیب ہی کہا جائے جو کسی طرح بھی وجود میں نہیں آتیں اور نہ پائی جاتی ہیں، اور دریافت نہ ہونے کی اہلیت کا نہ ہونا ہی عدم ہے تو پھر گویا عدم ہی غیب الغیب ہوا۔ **جواب** ہم یہ کہتے ہیں مرتبۂ غیب، مرتبۂ شہادت کا بالمقابل ہے، اور دونوں وجودی امر ہیں، اور ان میں باہمی تقابل ہے۔ ان دونوں میں سے کسی ایک کا سمجھنا دوسرے کے قیاس پر ہے کیونکہ حاضر کی سمجھ غیب کو سمجھے بغیر نہیں آ سکتی۔ اسی طرح غیب کی سمجھ حاضر کے سمجھے بغیر حاصل نہیں ہو سکتی۔ لیکن عدمات کو غیب کہنا کس طرح صحیح ہو سکتا ہے۔ کیونکہ گفتگو موجودات کی ہو رہی ہے نہ کہ معدومات کی۔ عدم جو نیستی ہی کا دوسرا نام ہے اس پر غائب ہونے کا اطلاق وہم کی دلالت پر ہے۔ اور یہ کم فہمی اور غلطی سے ناشی ہوتا ہے عدم نہ تو غائب میں شمار ہوتا ہے اور نہ ہی حاضر میں۔ پس ثابت ہوا کہ غیب الغیب ذات دلجب الوجود ہی کا مرتبہ ہے جو دائم و قائم ہے اور انسانی فہم و ادراک سے مبرا۔ **نکتہ** یہ سمجھ لینا چاہیے کہ چونکہ غیب ہونا صرف وجود ہی کا حصّہ ہے لہٰذا حقیقی حاضریت (شہادت) بھی اسی مرتبے کو حاصل ہے۔ ہر جگہ فقط اسی کا جلوہ ہے۔ اسی لیے قرآن پاک میں آیا ہے کہ تم جدھر کا رُخ کرو اُدھر ہی اللہ کا رُخ ہے اور غیب و حضور اعتباری تھے جو دوسری موجودات کو اللہ جل شانہٗ کے ضمن میں میسر تھے۔

شہادت کی قسمیں شہادت کی تین قسمیں ہیں، پہلی حقیقی شہادت، اور وہ یوں ہے کہ کسی طرح سے بھی چھپ نہ سکے۔ اور اس کے جلووٗں کے ازدحام سے اس مشہود کا ادراک نہ ہو سکے۔ اس مرتبے میں شاہد بھی ہے اور مشہود بھی وہی۔ اللہ ہی حاضر ہے اس کے سوا کوئی وجود نہیں۔ وہی اوّل ہے وہی آخر، وہی ظاہر ہے اور وہی باطن۔ اور وہ ہر شے کو جانتا ہے۔ دوسری قسم علمی شہادت ہے جس کا انسانی فعل سے دیگر معقولات اور دیگر امور کلیہ کی طرح ادراک کیا جا سکتا ہے۔ تیسری قسم حسی شہادت ہے جس کا ادراک نظر آنے والی، سنائی دینے والی اور محسوس ہونے والی اشیا کی طرح مادی حواس سے کیا جا سکتا ہے۔ **غیب کی قسمیں** غیب کی بھی تین قسمیں ہیں۔ ایک غیب حقیقی جس کے ادراک سے انسانی

صوفیوں کے حق میں ہے۔ **سوال** اگر یہ کہا جائے کہ ہر چند کہ ذات پاک کی کماحقہٗ معرفت یا شناخت محال ہے، لیکن پھر بھی کامل انسانوں پر بشری طاقت کے مطابق منکشف بھی ہو جاتی ہے، اور دریافت کرنے کے سلسلے میں اپنے عجز کا اعتراف ہی اُس مرتبے کی دریافت ہے۔ یعنی کہ ذات باری تعالیٰ کے ادراک سے عجز کا اعتراف ہی اس کا ادراک ہے۔ لہٰذا بہتر یہی ہے کہ ماہیات معدومہ کو غیب الغیب ہی کہا جائے جو کسی طرح بھی وجود میں نہیں آتیں اور نہ پائی جاتی ہیں، اور دریافت نہ ہونے کی اہلیت کا نہ ہونا ہی عدم ہے تو پھر گویا عدم ہی غیب الغیب ہوا۔ **جواب** ہم یہ کہتے ہیں مرتبۂ غیب، مرتبۂ شہادت کا بالمقابل ہے، اور دونوں وجودی امر ہیں، اور ان میں باہمی تقابل ہے۔ ان دونوں میں سے کسی ایک کا سمجھنا دوسرے کے قیاس پر ہے کیونکہ حاضر کی سمجھ غیب کو سمجھے بغیر نہیں آسکتی۔ اسی طرح غیب کی سمجھ حاضر کے سمجھے بغیر حاصل نہیں ہو سکتی۔ لیکن عدمات کو غیب کہنا کس طرح صحیح ہو سکتا ہے۔ کیونکہ گفتگو موجودات کی ہو رہی ہے نہ کہ معدومات کی۔ عدم جو نیستی ہی کا دوسرا نام ہے اس پر غائب ہونے کا اطلاق وہم کی دلالت پر ہے۔ اور یہ کم فہمی اور غلطی سے ناشی ہوتا ہے عدم نہ تو غائب میں شمار ہوتا ہے اور نہ ہی حاضر میں۔ پس ثابت ہوا کہ غیب الغیب ذات واجب الوجود ہی کا مرتبہ ہے جو دائم و قائم ہے اور انسانی فہم و ادراک سے مبرا۔ **نکتہ** یہ سمجھ لینا چاہیے کہ چونکہ غیب ہونا صرف وجود ہی کا حصّہ ہے لہٰذا حقیقی حاضریت (شہادت) بھی اسی مرتبے کو حاصل ہے۔ ہر جگہ فقط اسی کا جلوہ ہے۔ اسی لیے قرآن پاک میں آیا ہے کہ تم جدھر کا رُخ کرو اُدھر ہی اللہ کا رُخ ہے اور غیب و حضور اعتباری تھے جو دوسری موجودات کو اللہ جل شانہٗ کے ضمن میں میسر تھے۔

شہادت کی قسمیں شہادت کی تین قسمیں ہیں، پہلی حقیقی شہادت، اور وہ یوں ہے کہ کسی طرح سے بھی چھپ نہ سکے۔ اور اس کے جلوؤں کے ازدحام سے اس مشہود کا ادراک نہ ہو سکے۔ اس مرتبے میں شاہد بھی ہے اور مشہود بھی وہی۔ اللہ ہی حاضر ہے اس کے سوا کوئی وجود نہیں۔ وہی اول ہے وہی آخر، وہی ظاہر ہے اور وہی باطن۔ اور وہ ہر شے کو جانتا ہے۔ دوسری قسم علمی شہادت ہے جس کا انسانی فعل سے دیگر معقولات اور دیگر امور کلیہ کی طرح ادراک کیا جا سکتا ہے۔ تیسری قسم حسی شہادت ہے جس کا ادراک نظر آنے والی، سنائی دینے والی اور محسوس ہونے والی اشیا کی طرح مادی حواس سے کیا جا سکتا ہے۔ **غیب کی قسمیں** غیب کی بھی تین قسمیں ہیں۔ ایک غیب حقیقی جس کے ادراک سے انسانی

فہم قاصر ہے۔ جیساکہ اوپر ذکر آچکا ہے۔ دوسرا علمی غیب ہے جو معلوم ہونے کی حیثیت رکھتا ہے مگر حال حاضر میں معلوم نہیں، تیسری قسم حسی غیب ہے جو حس میں نہیں آتی۔ یہ حال حاضر میں محسوس نہیں کی جا رہی۔ **فائدہ** وجود کے ظہور کے کئی مرتبے ہیں جن کا احاطہ علم میں آنا ناممکن ہے۔ وہ صرف ذاتِ خداوندی ہی ہے جس کا علم جملہ موجودات پر محیط ہے، اور وہی ہر شے کے دریافت کرنے کی حس عطا فرماتا ہے جس کی قوت سے اس شے کا ادراک کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً رنگوں کو قوتِ باصرہ سے دیکھا جا سکتا ہے۔ اور آوازوں کو قوتِ سامعہ سے سُنا جا سکتا ہے، اور خوشبوؤں کو قوتِ شامہ سے سونگھا جا سکتا ہے، اور سخت اور نرم یا گرم و سرد چیزوں کے فرق کو چھونے کی قوت سے معلوم کیا جا سکتا ہے۔ اور عقلی امور کو عقل کی قوت سے سمجھا جا سکتا ہے، اور اسی پر قیاس کرتے ہوئے تمام مادی یا غیر مادی موجودات کو اس موجود کی حس و قوت کے بل بوتے پر دریافت کیا جا سکتا ہے۔ لہٰذا ہر شے کے ادراک کے لیے حق تعالیٰ نے جس کسی کو اس کے دریافت کی قوت عطا فرمائی وہ شے اس کے لیے شہادت میں داخل ہوگئی اور جسے اس ادراک کی قوت نہ دی وہ اس کے لیے غیب میں داخل ہوگئی۔ لہٰذا انبیائے کرام ؑ نے غیبی امور کے متعلق جو خبریں دی ہیں یا اولیائے کرام دیتے ہیں وہ بالکل سچ اور امر واقعی ہیں۔ کیا ہوا اگر تم اس کو نہیں پا سکتے تمہیں خدا نے وہ قوت ہی نہیں بخشی جس سے تو اس کا ادراک کر سکے۔ دراصل وہ حقیقت ہے جس طرح کہ خدا کے کامل بندوں نے خبر دی ہے۔ چنانچہ اگر ایک پیدائشی اندھا یہ کہے کہ میں سُرخ اور زرد رنگوں کو نہیں دیکھ سکتا، اگر وہ موجود ہوتے تو مجھے بھی معلوم ہو جاتے۔ مگر رنگوں کے موجود ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ بینائی والے لوگ دیکھتے ہیں، لیکن یہ اندھا کہ اپنی فطری جہالت سے اپنی دریافت پہ اعتماد رکھتا ہے، دوسروں کی بات کا یقین نہیں کرتا، یا پھر ایک بہرہ جو سننے سے محروم ہے یہ کہے کہ آوازیں موجود نہیں ہیں۔ میں بھی تو آنکھ، ہوش، ہاتھ پاؤں اور دیگر اعضا رکھتا ہوں۔ اگر آوازیں بھی دوسری چیزوں کی جگہ موجود ہوتیں تو میں بھی سنتا یا اپنے ہاتھ پاؤں سے ان کی بلندی و پستی کے فرق کو معلوم کر لیتا، کیونکہ دوسری چیزوں مثلاً سیڑھی۔ کوٹھے اور دروازے کی پستی و بلندی کو میں دریافت کر لیتا ہوں۔ لہٰذا آواز چونکہ میری دریافت میں نہیں آرہی، سو معلوم ہوا کہ وہ موجود ہی نہیں ہے۔ حالانکہ فی الحقیقت آوازیں موجود ہیں۔ اونچے یا دھیمے ہونے پر مراتب بھی۔ مگر اُسے تو خدا نے وہ حس عطا ہی نہیں کی جس سے وہ دریافت کر سکے۔ سننے والے سنتے ہیں، اور ان کے مراتب کی اُونچ نیچ کو سمجھتے ہیں۔ پس معلوم ہوا کہ جس کسی کو جو کچھ

دکھایا سو دکھایا، اور جس کسی سے جو کچھ پوشیدہ رکھا وہ چھپائے رکھا، اور اللہ تعالیٰ کو پورا علم اور مکمل خبر ہے۔ جب تک ہدایت ربانی کسی پہ دریافت کا دروازہ نہ کھولے، اور اُسے اشیا کی شناخت کی قوت نہ بخشے کوئی آدمی بھی فیاض مطلق کے فیض کے بغیر محسوسات یا معقولات کو نہ تو محسوس کر سکتا ہے، اور نہ سمجھ سکتا ہے، اور سمجھے بھی کیسے جب اللہ تعالیٰ نے وہ راہ ہی مسدود کر رکھی ہے جیسا کہ قرآن شریف میں آیا ہے کہ اے رسولؐ ان میں بعض ایسے بھی ہیں جو ظاہر میں آپ کی طرف کان لگا کر بیٹھتے ہیں۔ کیا آپ بہروں کو سنا کر ان سے ماننے کا انتظار کرتے ہیں۔ گو ان کو سمجھ بھی نہ ہو۔ اور اسی طرح ان میں بعض ایسے ہیں کہ ظاہراً تو آپ کو مع معجزات و کمالات کے دیکھ رہے ہیں، تو پھر کیا آپ اندھوں کو راستہ دکھانا چاہتے ہیں۔ گو ان کو بصیرت بھی نہ ہو۔ غرضیکہ خدا نے جسے نگاہ دے دی سو دے دی، اور جو راہ کھول دی سو کھول دی۔ خدا نے جس کسی کو جو کچھ دکھایا ہے وہ چاہتا ہے کہ سبھی کو دکھلائے، اور جو راہیں اس پہ کھولی ہیں وہ دوسروں پہ بھی کھولے۔ لیکن کرے تو کیا دیکھنے کے لیے چشم بینا چاہیے، اور سننے کے لیے گوش حق نیوش۔ لہٰذا کاملانِ حق طریق ہدایت کے لیے مجبور اور ناقص لوگ اپنی گمراہی کے ہاتھوں معذور اور واجب الوجود کی نظر سے امکانی نقص اور کمال ہر دو ہیچ ہیں۔ بیچارے ممکن الوجود کو بہر صورت، ہر لحظ ہر موڑ پہ اپنی فنا کی کوشش کرنی چاہیے، اور خود کو واجب الوجود کے دامن میں چھپانا چاہیے، تاکہ دل ہر وقت عالم غیب کی طرف مائل رہے اور عیب و ہنر سے نجات پالے۔ **رباعی** ہم خواہ مست شباب ہوں پھر بھی زندگی کی شیبی منازل کے خراب حال ہیں۔ خواہ ہنر نمائی میں محو ہوں، یعنی وجود کی نمائش ہیں تو وہ بھی عیب ہی کی اک قسم ہے۔ اُس علام الغیب کے علاوہ عیبوں کو ڈھانپنے والا اور کوئی نہیں۔ ہم اسی پردہ پوش (غیب الغیب) کے چہرے کے مشتاق ہیں۔ مصنف خود تلمیحات و کنایات کی یوں گرہ کشائی کرتا ہے۔ کہ حاصل کلام یہ کہ شباب جو عالم شہادت کے ظہور کی شدت کا زمانہ ہوتا ہے دراصل شیب یعنی ادھیڑ عمری کا مقدمہ ہے۔ جہاں عالم نیست کی طرف رجوع ہوتا ہے اور رجوع مادی قوت کی کمزوری و ضعف کا زمانہ ہوتا ہے، اور ہنر یعنی آلات حسّی کا وجود حس سے محسوسات کا ادراک کیا جاتا ہے عیب ہی کی ایک قسم ہے جو اس کثرت موہومہ کی طرف کھینچتا ہے، اور دنیوی پستیوں سے تعلق پیدا کرتا ہے۔ مقصد یہ کہ انسانی کمالات بھی نقائص ہی ہیں تو اندازہ لگائیے کہ نقائص کا کیا حشر ہوگا۔ پس عیبوں کی پردہ پوشی پردۂ غیب ہی کرتا ہے، اور ان غیبی عیبوں کو دفع کرنے والی فنا، شہادت

یعنی حضوری کی مشتاق ہے جو اس کی جلوہ گاہ ہے جیسے قرآن مجید یوں کہتا ہے کہ اللہ ہر شے سے باخبر ہے اور حضوری غیب کی متلاشی ہے کہ وہی اس کی پناہ گاہ اور جائے قرار ہے۔ اور قرآن پاک کے فرمودہ کے مطابق ہر شے لوٹ کر اللہ ہی کی طرف جائے گی۔ حضرت وجود جو اپنے ظہور کا مشتاق ہے ہر لحظہ امکانی مظاہر میں جلوہ افروز ہے اور عالم شہادت میں مشہود۔ اور دنیوی لباس میں ملبوس یہ ساری مشہودات ہر لحظہ اس قید سے رہائی چاہتی ہیں، اور عالم غیب کی طرف رجحان رکھتی ہیں اور سب کو اسی کی طرف لوٹنا ہے۔ رباعی اگرچہ ہم نے اس عالم شہادت میں ہزاروں جلوے پیدا کیے، لیکن آخر کار ہر جلوے کو پردۂ غیب میں چھپا دیا۔ وہ چیز جسے تم نے اپنے حواس سے سینکڑوں بار مشاہدہ کیا۔ آخر وہ بھی آتش زدہ کاغذ کی طرح غیب ہی میں جا چھپی۔ اب مصنف کی اپنی تشریح ملاحظہ کیجیے۔ کہ اگرچہ ہم نے عالم شہادت میں مشہودات کے ہزاروں جلوے دکھائے، لیکن آخر کار ہر ظہور کو پردۂ غیب میں چھپا لیا۔ جو کچھ یہاں اپنے متعدد حواس کی بنا پر ہم نے سینکڑوں مرتبہ دیکھا وہ بھی آتش زدہ کاغذ کی طرح ہمارے شہود سے ہمارے ہی غیب میں جا چھپا۔ آتش زدہ کاغذ کے شراروں یا کثرت چشم اور جلوؤں کا ازدحام اور پھر ان کا شراروں کی طرح چھپ جانا بالکل واضح اور عیاں ہے۔ اے ہمارے رب ہمیں تیری طرف ہی لوٹ کر جانا ہے اور تو ہی سب کچھ سننے والا اور سب کچھ دیکھنے والا ہے۔

هوالناصر

شروع اللہ کے نام سے جو نہایت مہربان اور بہت رحم والا ہے

ہر قسم کی تعریف اللہ ہی کے لیے ہے جو گناہوں کو بخشنے والا ہے، توبہ قبول کرنے والا ہے۔ ارحم الراحمین ہے۔ درود و سلام ہو اُس کے رسول محمد صلی اللہ وعلیہ وسلم پر جو گناہگاروں کی شفاعت کرنے والے ہیں، اور رحمت ہیں تمام جہانوں کے لیے اور آپؐ کی آل پر اور آپؐ کے تمام اصحاب پر۔ اما بعد پس یہ ستائیسواں باب ہے جو کہ موسوم ہے استغفار کے ساتھ۔ جو کوئی بُرا کام کرتا ہے یا ظُلم کرتا ہے اپنے نفس پر پھر بخشش مانگ لیتا ہے اللہ سے، پائے گا اللہ کو بخشش کرنے والا، رحم کرنے والا۔ پس میں بخشش مانگتا ہوں اللہ سے ان تمام گناہوں کے بارے میں جو میں نے کیے قولاً اور فعلاً اور خیالاً اور سنتے ہوئے اور دیکھتے ہوئے۔ اور نہیں کوئی قوت اور طاقت سوائے اللہ کے جو طاقت والا اور بلندی والا ہے۔ میں نے اُس سے بخشش مانگی ہے اپنی تمام حرکات سے اس علم کے ہوتے ہوئے کہ نہیں ہے کوئی طاقت اور نہ قوت مگر اسی کے ساتھ، اور وہ بلند مرتبہ اور غالب ہے اپنے معاملے میں اور عظیم اور محیط ہے ہر چیز پر۔ پس معلوم ہوا کہ عبدیت کا مقام انحطاط اور عصیاں کا مرتبہ ہے جس طرح کہ رب ہونے کا مرتبہ ربّیت عطا و غفران کا ہے۔ پس ہر چیز جو منسوب کی جاتی ہے عبدیت کی طرف اور مضاف کی جاتی ہے بندے کے نفس کی طرف اقوال، افعال، دلوں میں گزرنے والے خیالات اور اوصاف، وہ سب باطل ہے اور برائی ہے اور قابل ہے استغفار کے اور ندامت کے۔ پس بخشش مانگو

اُس سے اور توبہ کرو اُس کے حضور، بے شک وہ رب قریب اور جواب دینے والا ہے ۔ اور ان مذکورہ بالا امور میں سے ہر ایک جس کی اضافت ہو ربیت کی طرف ، اور ان کی نسبت رب کی ذات کی طرف ہو ایجاد و تخلیق کے حوالے کے ساتھ وہ چیز حق اور نیکی ہے اور تعریف کیے جانے کے قابل ہے اور کہو کہ اللہ ہی کی تعریف ہے ہر حالت میں ۔ اے ہمارے رب نہیں پیدا کیا تو نے یہ سب یونہی باطل ، اور جب دیکھا جائے کسی چیز کی طرف اس کی اضافت رب کی طرف ہونے کے لحاظ سے جیسا کہ تم دیکھتے ہو اعتباری نیکیاں اور احکام شرعیہ ، پس جو پہنچے تم کو نیکی میں سے پس وہ اللہ کی طرف سے ہے اور نہیں ہے توفیق مگر اسی کے ساتھ ، اور جب تو دیکھے بعض کی طرف اس کی اضافت کے اعتبار سے بندے کی طرف جیسا تو دیکھتا ہے اضافی برائیوں اور شرعی ممنوعات کی طرف ، تو پس جو پہنچتی ہے تجھے برائی وہ تمھارے نفس میں سے ہے ، اور تو ظلم کرنے والا ہے اپنے نفس پر ۔ اور جب تو نے دیکھا اعتباری نیکیوں اور اضافی برائیوں میں سے سب کی طرف اس حیثیت سے کہ ان کی اضافت ہو عبدیت کی طرف تو توجہ کر ان سب سے اور کہہ اے اللہ میں نے کی برائی ، اگرچہ میں نے اچھائی کی ہے ، اور میں نے ظلم کیا اپنے نفس پر اگرچہ میں نے عدل کیا ہے ۔ پس بخش دے مجھے ، پس بخش دے مجھے ، پس بخش دے مجھے ۔ پس نہیں بخشتا گناہ کوئی بھی سوائے تیرے ، اور جب تو نے دیکھا ان سب اُمور کو ان کی حیثیت سے کہ ان کی اضافت ہو ربیّت کی طرف ، پس کہہ کہ یہ سب کچھ اللہ کی طرف سے ہے ۔ اور میں سپرد کرتا ہوں سب امور اللہ کو ۔ بے شک میری نماز ، میری قربانی ، میری زندگی اور موت اللہ کے لیے ہے جو تمام جہانوں کا پالنے والا ہے ، اور اُسی کی طرف سارے کے سارے امور لوٹتے ہیں ۔ انتہائی طور پر جو کچھ اس باب میں ہے کہ میں نادم نہ ہوتا ، اور میں نے توبہ کی ہر عمل سے جو میں نے کیا دیکھتے ہوئے اپنی امکانیت کی طرف چاہے وہ کام ٹھیک تھا یا غلط تھا ۔ پس بخش دیا مجھے میرے رب نے اور مجھے چھپا لیا اپنے وجوب کی چادر میں ، اور میں نے دیکھی اس کی چادر اور سنی اس کی بخشش ، اور میں نے کہا ہم نے سُنا اور ہم نے اطاعت کی ہے ۔ اے ہمارے رب تیری بخشش چاہیے ، اور تیری طرف ہی لوٹنا ہے ۔ اے قوم بخشش طلب کرو اپنے رب سے ۔ پھر توجہ کرو اس کی طرف اور بخشش چاہو اپنے رب سے ، پھر توبہ کرو اس کی طرف ۔ بے شک میرا رب رحیم اور محبت کرنے والا ہے ۔

غفلت اور ہشیاری کا باب

غفلت و ہشیاری دونوں انسانی تقاضے ہیں اور طبعاً کم و بیش ہر آدمی کو یہ حالتیں پیش آتی ہیں۔ یعنی عوام میں غفلت زیادہ ہوتی ہے اور ہشیاری کم۔ اور خواص میں ہشیاری زیادہ ہوتی ہے اور غفلت کم۔ اس میں بھی اس حکیم مطلق نے حکمتیں پوشیدہ رکھ چھوڑی ہیں۔ کیونکہ اگر تنبیہہ اور ہشیاری نہ ہوتے تو ہدایت کی راہیں کون دکھاتا، اور اگر غفلت کا دروازہ نہ کھلتا تو کوئی انسان بھی اپنے وجود کے بوجھ سے سستا نہ سکتا، اور اگر انسان بالکل ہی غافل ہو جائے تو حیوانات مطلق کے زمرے میں شامل ہو جائے، اور اگر وہ سراپا ہشیار و خبردار ہی رہتا تو وہ فرشتوں کے گروہ میں جا ملتا، اور ترقی کی راہیں مسدود ہو جاتیں اور وہ مقامِ معلوم سے آگے نہ بڑھ سکتا جیسا کہ فرشتوں کا یہ مقولہ کہ نہیں ہے ہم میں سے کوئی بھی مگر اُس کے لیے ایک معلوم مقام ہے۔ پس انسانی حقیقت غفلت و ہشیاری کا خود ہی تقاضا کرتی ہے۔ کیونکہ آگہی حق جل شانہ، کی بارگاہ تک رسائی کا وسیلہ ہے۔ اور غفلت کے باعث وہ وجود کے اُس بوجھ سے تھوڑی دیر کے لیے سستا لیتا ہے۔ یہ حدیثِ پیغمبرؐ کہ یا حمیرا مجھ سے باتیں کرو (کلام کرو) اسی امر کی خبر دیتی ہے۔ اور پھر اس غفلت سے نادم اور پشیمان ہو کر انسان ترقی کے لیے پَر پُرزے نکالتا ہے اور اس مقام سے آگے نکل جاتا ہے۔ اور یونہی وہ ابدالآباد تک بے انتہا منزلیں طے کرتا رہے گا۔ کیونکہ نہ تو اس ذات پاک کی کوئی انتہا ہے، اور نہ ہی اس نائب حق کی۔ یہ سمجھ لینا چاہیے کہ خواص کی غفلت کا رتبہ عوام کی آگہی و ہشیاری سے بلند و برتر ہے۔ عوام کی نسبت وہ دائمی آگاہ ہوتے ہیں، اور یہ بزرگوار کبھی غافل نہیں ہوتے۔ اگر بتقاضائے بشری کسی وقت ان پہ غفلت طاری ہو بھی جائے وہ ان کی آگہی کی قوت کی مناسبت سے ہوگی، اور وہ بھی ان کی آگہی ہی میں شمار ہوتی ہے کہ وہ احوال کی مزید ترقی کے لیے ہوتی ہے۔ جیسا کہ اوپر بتایا جا چکا ہے۔ خواص کسی لحظہ بھی مشاہدہ حق سے غافل یا لاپرواہ نہیں ہوتے۔ اللہ تعالیٰ ایسے خیالات سے اپنی پناہ میں رکھے۔ ان پہ غفلت یا ہشیاری کا اطلاق ان کی حالت کی قوت یا ضعف کی نسبت سے ہوتا ہے، اور یہ اختلاف مزید ترقی کا باعث بنتا ہے اور کاملان ذات پر بھی یہ واردات آتی ہے۔ چنانچہ حضور پاک سرورِ کائناتؐ نے فرمایا کہ دل کی آنکھوں سے دیکھو، باوجود اس کے کہ حضورؐ پاک نے یہ بھی فرمایا تھا کہ میری آنکھیں سوتی ہیں مگر میرا دل نہیں سوتا۔ بہر حال خود اپنے

غفلت زدہ احوال کو مدنظر رکھتے ہوئے اپنے ہی آپ سے کہتا ہوں کہ دل کی آنکھیں کھلتی ہیں تو شاہد مقصود نظر آتا ہے۔ ترجمہ رباعی عرصۂ زندگی میں تونے کبھی شب بیداری سے کام نہ لیا، اور موت نزدیک آن پہنچی۔ سحر کی مانند اب رات کے آخری لمحے ہیں۔ اسے درد تیرا دل غفلت کا ماندہ ہے اور موت بہت ہی نزدیک ہے۔ جس طرح پھول جب مسکرا کر کھلتا ہے تو اس کی مسکراہٹ کے ساتھ اس کی افسردگی بھی قریب ہی ہوتی ہے۔ اب مصنف کی اپنی تشریح ملاحظہ کیجیے۔ شب سے مُراد عرصۂ زندگانی ہے۔ کیونکہ یہ حیوانی حیات انسانی روح کا لباس ہے جس نے اس روح کو چھپا رکھا ہے اور اُس سے تعلق پیدا کر رکھا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے بھی قرآن مجید میں رات کو لباس ہی سے منسوب فرمایا ہے۔ دیکھیے یہ آیت کریمہ کہ ہم ہی نے رات کو پردہ کی چیز بنایا۔ شب زندہ داری سے مراد قیام لیل یعنی رات کو بیدار رہنا ہے اور یہاں مُراد آگاہ و ہشیار رہنے سے ہے۔ اور نفس شماری سے مُراد حالتِ نزع کی بے ہوشی ہے اور دل کو پھول اور غنچے سے تشبیہہ اس کی شگفتہ دلی اور دل گرفتگی کی حالت سے دی گئی ہے اور اپنا تخلص استعمال کر کے تخاطب خصوصاً خود ہی سے کرنے کا مطلب ہے کہ شاعر خود اپنے آپ ہی سے گفتگو کر رہا ہے۔ اگرچہ یہ حالت سبھی آدمیوں پر طاری و ساری ہوتے ہیں۔ پھول کا مسکرانا اس کا کھلنا ہے، اور یہاں مراد ہے غفلت کی حالت میں خوشی منانا۔ اور پھول کے مرجانے سے مُراد اُس نباتاتی روح کا ساقط ہونا ہے، اور یہاں مراد موت ہے۔ مصیبت در مصیبت یہ کہ اس ساری ہشیاری و آگہی کے باوجود بھی تم غافل ہو اور کرنے کے کام ہم کبھی کرتے نہیں۔ افسوس تو اس بات کا ہے کہ اس ساری سوجھ بوجھ کے باوجود جو کچھ کرنا چاہیے وہ کوئی آدمی کرتا نہیں۔ چونکہ علم کا مرتبہ عمل سے نیچے ہے جس طرح کہ قدم نظر کے بعد اُٹھتا ہے، وہ نظر کے برابر ہرگز نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح عمل بھی علم جیسا نہیں ہو سکتا، اور علم سے نچلے درجے پر رہ جاتا ہے۔ کیونکہ عمل کا تعلق جسم سے ہے اور جسم مادی ہے۔ اور علم کا تعلق رُوح سے ہے اور روح غیر مادی ہے۔ لہٰذا جس طرح ارضی مادیات فلکی مجردات کی برابری نہیں کر سکتیں، وہ چیز جس کا تعلق مادیات سے ہے کسی ایسی چیز کی برابری نہیں کر سکتی جس کا تعلق مجردات سے ہو۔ لہٰذا کاملانِ حق جو حقیقت سے آگاہ ہوتے ہیں بے شمار عبادات و ریاضیات کے باوجود بھی اپنی خامیوں کا اعتراف کرتے ہیں۔ اور ہمیشہ اعتراف عجز ان محققین کے نصیب میں ہوتا ہے۔ جیسا کہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ اے اللہ ہم تیری کماحقہٗ عبادت نہ کر سکے۔ اور یہ جو حضور

پاک ؑ نے فرمایا ہے کہ اے اللہ ہم تجھے کماحقہٗ پہچان نہ سکے۔ یہاں بھی مُراد علم ہی کی کمی سے ہے۔ ذات پاک کا کماحقہٗ ادراک و معرفت کا تعلق ماہیت سے ہے نہ کہ چہرے (رُخ) سے، اور وہ محال ہے۔ حقِ عبادت ادا نہ کر سکنے سے مراد حقیقتِ علم سے عمل کی کمی و کوتاہی ہے۔ کیونکہ عبادت کی صحیح ادائیگی کا حق یہی ہے کہ عمل بھی علم کے برابر ہو، اور اس کا بھی امکان نہیں۔ لہٰذا امکانی حقیقت مرتبۂ وجوب کے سامنے ہمیشہ نادم ہے اور یہ ندامت ذاتی ہے۔ اے خدا اگر تو تے معاملات کو عدل سے نپٹایا تو پھر ہماری کوئی پناہ گاہ نہیں، اور اگر اپنے فضل و کرم سے کام لے تو تیرے عفو سے بڑھ کر کوئی معذرت خواہی نہیں۔ جیسا کہ قرآنِ حکیم میں آیا ہے کہ ایسا کون شخص ہے جو اس کے پاس کسی کی سفارش کر سکے بغیر اس کی اجازت کے۔ پس ممکنات میں بذات خود نہ تو مرتبۂ وجودیت کی صلاحیت ہے اور نہ ہی معدومیت کی اہلیت۔ اور اگر اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے کام لیا، یعنی ممکنات کو اپنے وجوب کے سایہ تلے لے کر موجود بنا دیا تو اُس کے عفو و بخشش کے سوا جو اس ذات واجب الوجوب کا حصہ ہے، ان حقائق ممکنہ کو بخشنے والا کون ہے، اور نہ ہی اُنھیں عدم کے ان اندھیروں سے نکالنے والا ہے۔ کون ہے جو اس کی اجازت کے بغیر اس کے پاس کسی کی شفاعت کر سکے۔ اور شفاعت کی اجازت دینا بھی اُس بخشنہار کی بخشش ہی کا تقاضا ہے اور انبیاءؑ و اولیائے کرام میں یہی تقاضائے ذات ظہور پذیر ہوتا ہے جو خدائے غفار کی بخشش کے مظاہر ہیں۔ (ان سب پر خدا کا درود و سلام) اور وہ اس خدائے جل شانہٗ کے حکم کے بموجب خدا سے ہم گناہگاروں کی مغفرت طلب کریں گے جیسا کہ قرآن مجید میں واضح طور پر آیا ہے کہ اللہ کی رحمت سے نااُمید نہیں ہونا چاہیے۔ بے شک اللہ تعالیٰ سب گناہوں کو معاف کرنے والا ہے۔ حاصل مطلب یہ کہ انبیاءؑ و اولیائے کرام کی مجرموں اور گناہگاروں کے لیے شفاعت بھی حق تعالیٰ کی مرضی ہی سے ہوگی۔ جیسا کہ قرآن پاک میں آیا ہے کہ وہ اس سے آگے بڑھ کر بات نہیں کر سکتے اور وہ اسی کے حکم کے موافق عمل کرتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کے اگلے پچھلے احوال کو جانتا ہے اور بجز اس کے جس کے لیے (شفاعت کرنے کی) خدا تعالیٰ کی مرضی ہو اور کسی کی سفارش نہیں کرتے پہلے اللہ تعالیٰ باطنی طور پر معاف کر دیتا ہے۔ پھر اس کے بعد کسی کو شفاعت کرنے کی جرأت یا مجال ہوتی ہے۔ اور یوں ظاہری طور پر وہ کسی گناہگار کے گناہوں کی معافی کا وسیلہ بن جاتی ہے۔ ورنہ اس کی رضا اور حکم کے بغیر یہ یارا کسے کہ وہ اس بارگاہ کبریائی میں دم بھی مار سکے اور کسی کی شفاعت کرے۔

قرآن شریف کی یہ آیت کریمہ بھی اسی امر کی مخبر ہے کہ اس کے سامنے کوئی سفارش کرنے والا سفارش نہیں کر سکتا بدون اس کی اجازت کے۔ ایسا اللہ تمھارا رب حقیقی ہے سو تم اس کی عبادت کرو، جیسا کہ دنیا میں بھی امرا یا سلاطین کو اگر کسی پر غیظ و غضب آجائے تو اُن کی اس حالت غیظ و غضب میں کسی کو ان سے سفارش کرنے کی ہمت نہیں پڑتی۔ جب غصہ ٹھنڈا پڑجاتا ہے اور شاہی مصاحب سمجھ جاتے ہیں کہ اب عفو و معذرت کی مرضی ہے تو وہ شاہی ندیموں کو اشارے کنائے سے سمجھاتے ہیں کہ اب خطاؤں کی معافی کا وسیلہ بنو اور اُنھیں معافی لے دو۔ تو اس وقت وہ شاہی مصاحب اور ندیم اس کی بخشش کے لیے سفارش کرتے ہیں اور ان کی خاطر انھیں معافی مل جاتی ہے۔ اگر باطنی طور پر وہی رحمتِ خداوندی شفیع بنتی ہے، جیسا کہ اس آیتِ کریمہ سے بالکل واضح ہے۔ کہ اے پیغمبرؐ کہہ دیجیے کہ سفارش تو تمام تر خدا ہی کے اختیار میں ہے۔ تمام آسمانوں اور زمین کی سلطنت اسی کی ہے۔ پھر تم اسی کی طرف لوٹ کر جاؤ گے۔ اور ان لوگوں کے لیے جو کافر ہیں اور جنھیں معاف کرنے کی مرضی نہیں ہوتی تو ان کے حق میں خدا تعالیٰ نے اپنے رسولِ مقبولؐ سے فرمایا کہ آپ خواہ ان منافقین کے لیے استغفار کریں یا استغفار نہ کریں، اگر آپ ان کے لیے ستر بار بھی استغفار کریں گے، تب بھی اللہ تعالیٰ ان کی بخشش نہیں کرے گا۔ یہ اسی وجہ سے ہے کہ اُنھوں نے اللہ اور اُس کے رسولؐ کے ساتھ کفر کیا، اور اللہ تعالیٰ ایسے سرکش لوگوں کی ہدایت نہیں کیا کرتا۔ اور جن لوگوں کے لیے اس کی رحمت جوش زن ہوتی ہے۔ ان کے لیے خداوند تعالیٰ نے یوں فرمایا ہے کہ اے رسولؐ ہم ایسا نہ کریں گے کہ ان میں آپؐ کے ہوتے ہوئے ان کو ایسا عذاب دیں اور نیز اللہ تعالیٰ آپؐ کی موجودگی میں ان کو عذاب نہیں دے گا۔ مراد اس سے یہ ہے کہ جس کسی کے دل میں محبوب خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت ہوگی خدا اُسے عذاب نہیں دے گا۔ اور جو کوئی بھی اس کے حضور میں اپنے گناہوں کا اقرار اور اپنے لیے استغفار کرے گا تو باری تعالیٰ خود ایمان کی بدولت دوزخ کی آگ سے نجات دے گا۔ خدا کا شکر ہے کہ ہم محمدیوں کا معاملہ ربِ رحیم سے ہے اور کام رسولِ کریمؐ سے۔ ہر چند کہ ہم گنہگار ہیں لیکن ہم خدا اور رسولؐ رکھتے ہیں۔ اپنے آپ کو خام کار اور گنہگار سمجھتے ہیں، توبہ استغفار کرتے ہیں کہ ہم سراپا ندامت و پشیمانی ہیں تو سب سے بڑھ کر کریم ہے۔ تو جانتا ہے کہ ہم نے ظلم کیا اپنی جانوں پر، اور اگر تو نے ہم کو نہ بخشا اور ہم پر رحم نہ فرمایا تو یقیناً ہم زیاں کاروں میں سے ہو جائیں گے۔ اے خدا ہم خام کاروں کے پلے ندامت و پشیمانی کے سوا اور کچھ نہیں پڑتا۔ تو کریم ہے

توکرم کے سوا تیرے اور کچھ شایان نہیں۔ اے اللہ ہم نے اپنی جانوں پر ظلم کیا۔ اگر تو نے ہمیں نہ بخشا اور ہم پر رحم نہ کیا تو یقیناً ہم ہو جائیں گے زیاں کاروں میں سے۔ پس حاصل کر لیے آدم ع نے اپنے رب سے چند الفاظ، تو اللہ تعالیٰ نے رحمت کے ساتھ توجہ فرمائی ان پر، یعنی توبہ قبول کر لی۔ یقیناً وہی توبہ قبول کرنے والے اور رحم فرمانے والے ہیں۔ **ترجمہ رباعی** اے درد اگر تم اپنے جرم کا اعتراف کر لوگے تو یقیناً اپنے دل کو صاف کر لوگے۔ اے اللہ تو کریم ہے اور میں تیرا گنہگار ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ آخر الامر تو مجھے معاف فرما دے گا۔ اپنے جرم اور گناہ کا اعتراف کرنا گویا اپنے قصور کا اقرار کر لینا ہوتا ہے، اور اپنی تقصیر کا معترف ہونا ہے اور پشیمانی و ندامت کے بھی یہی معانی ہیں۔ اور قبول و معذرت کا منبع بھی یہی اور مغفرت و بخشش کا وسیلہ بھی یہی ہے۔ ندامت توبہ ہے، اور گناہ سے توبہ کرنے والا ایسا ہے جیسے کہ اُس نے گناہ کیا ہی نہیں۔ پس اپنے جرم و عصیاں کا اعتراف آدم کا کام ہے اور صفائی قلب کا باعث ہے۔ اور تکبّر اور انکار شیطان کا کام ہے، اور عذاب کا باعث اور عین گناہ ہے۔ یارب ہم جیسے بنی آدم تجھ ایسے کریم پالنہار کے گنہگار ہیں۔ آخر ہم تیرے اسی لطفِ عمیم کی حمایت کے سائے میں ہیں۔ خاص طور پر ہم محمدیؐ تو شانِ رحیمی سے اُمید رکھتے ہیں اور دوسروں سے زیادہ توقع رکھتے ہیں۔ اور ہم لائیں گے محمد صلی اللہ علیہ وسلم تیرے حبیب کو سفارشی بنا کر۔ اور ہم نہیں مایوس تیری رحمت سے۔ بے شک تو بخشنے والا ہے گناہ سب کے سب۔

ھوالناصر

شروع اللہ کے نام سے جو نہایت مہربان اور بہت رحم والا ہے

ہر قسم کی تعریف اللہ کے لیے ہے جو ایک ہے اور موجود ہے اپنے وجود کے ساتھ ، اور شاہد و مشہود ہے اپنے شہود کے ساتھ ، اور درود و سلام ہو محمد صلی اللہ وعلیہ وسلم پر ، جو تعریف کرنے والے ہیں اپنے محمود کی ، اور سجدہ کرنے والے ہیں اپنے مسجود کو ، اور آپؐ کی آل اور آپؐ کے اصحاب پر جو عبادت کرنے والے ہیں آپؐ کے معبود کی ۔ اما بعد پس یہ اٹھائیسواں باب ہے ۔ جس کا نام سواء السبیل ہے (سیدھا راستہ ۔ شاہراہ) ۔ قریب ہے کہ میرا رب ہدایت دے سیدھے راستے کی ، جیسے اس نے درست بنایا میرے بدن کو عنصری اجزا کی ترکیب کے ساتھ ۔ اور کیفیات مزاجیہ کے ساتھ ایسا درست بنانا جو معتدل اور صالح ہے زندگی کو قبول کرنے کے لیے ، اور پھونکا اس میں اپنی روح میں سے پھونکنا جو ایجادی تھا ، اور لطیف بخار کو ایجاد کیا ، جو قابل تھا روحانی تعلق کے جو میرے اختیار و حکم سے تصرف کرنے والا بدن ہے ۔ اور تدبیر کرنے والا ہے اس کی ، اور یہ نفس مجردہ ہے ۔ اور اس کی مدد فرمائی روح القدس کے ساتھ ۔ پس ہدایت دی میرے رب نے مجھے اپنی معرفت دکھانے سے اور حقیقت تک پہنچانے سے ۔ درست راستہ جس میں کوئی کجی نہیں ہے اتحاد کی جانب رجحان میں سے یا امتیاز اور یا تشبیہہ اور تنزیہہ یا نشے اور غفلت کے غلبے سے یا جمع سے یا تفریق سے اور دکھائی مجھے میرے رب نے تحقیق کی حقیقت اور توفیق اللہ ہی کے ساتھ ہے ۔

وجودی اور شہودی توحید کا باب

وجود ایک واحد حقیقت ہے جو قائم بالذات ہے۔ یہ نہیں کہ ممکن الوجود اور واجب الوجود ایک ہیں، اور عبد اور معبود میں کوئی فرق نہیں، اور حق تعالیٰ کلی مفہوم کی طرح فطری طور پر تمام افراد میں خود ہی موجود ہے۔ کیونکہ یہ معنی عقل کے خلاف ہیں، اور یہ ملحدوں اور مشرکوں کا عقیدہ ہے، اور محققین کے کلام کی حقیقت کو نہ سمجھ سکنے کی وجہ سے وہ رذیل لوگ اس مصیبت میں پھنسے ہیں اور بات کی تہ کو نہیں پہنچ سکے۔ نیز یہ باب وحدت الشہود کے بیان کے بارے میں بھی ہے۔ کیونکہ تمام موجودات میں سوائے ایک وجود کے اور کچھ موجود نہیں۔ اور حقائق ممکنہ سوائے مفہومات کے اور کچھ نہیں۔ کاملانِ حق کے نزدیک وحدتِ وجود اور شہود کا خلاصہ ایک ہی ہے۔ نیز اس امر کا اظہار کہ یہ کلام ان دونوں کے مفہوم کا جامع ہے، اور اس امر کا اظہار بھی کہ اگر مسئلہ وحدت الوجود کو خوب اچھی طرح سے سمجھ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ممکنات عین واجب تعالیٰ نہیں ہیں۔ بلکہ اسی سے ہیں، نہ یہ کہ خود وہی ہیں۔ حقیقت کا بہترین بیان وحدت الشہود میں ہے۔ لیکن اس طرح کہ صداقت کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹے، اور اہلِ ظاہر کی طرح دوئی راستے کا رکاوٹی پتھر نہ بنے، اور نہ ہی تعصب کی پٹی چشمِ بصیرت کا حجاب بننے پائے۔ کیونکہ اس قسم کا بیان خواص و عوام میں سے بہت سوں کے لیے مفید اور دوسری طرف ہمہ اوست والی بات عوام الناس کی اکثریت کے لیے ضرر رساں ہے۔ کیونکہ عوام الناس طبعاً محسوسات میں گرفتار ہوتے ہیں، اور اپنی حیوانی قوت کے سامنے مجبور اور بے بس ہوتے ہیں۔ اور اخلاق کا بناؤ سنگار جو انسانیت کا تقاضا ہے اسے حد کمال تک نہیں کر پاتے، اور نہ ہی عبادت کے عادی ہوتے ہیں جو آدمیت کا خاصہ ہے۔ اور نہ ہی خدا اور رسولؐ پر ان کا پختہ یقین ہوتا ہے جو راستی و سچائی کی اصل ہے۔ اور نہ ہی احکامِ الٰہیہ کے بوجھ کو جو بندگی کے کندھوں پر اس کے شایانِ شان ہے رضا کارانہ انداز میں اُٹھاتے ہیں اور حُبِّ رسولؐ کی مضبوط رسی کو جس کا تعلق ایمان سے ہے پوری مضبوطی سے نہیں پکڑ پاتے۔ نہ ہی باطنی صفائی کی، نہ ہی نفسانی خواہشات اور ہوا و ہوس سے قطع تعلق کیا، اور نہ ہی اپنے آئینۂ قلب کو صیقل کیا، کہ وہ حضور و شہودِ حق کا آئینہ دار بن سکے۔ وہ کھیل کود کے عادی ہوتے ہیں اور بچپن ہی سے حسّی لذتوں کے خوگر و دلدادہ، شروع ہی سے کھانے پینے اور پہننے پہ مائل رہے۔

حکمرانی کے وہم و گمان میں پھنسے ہوئے یہ لوگ اپنی انا کی کال کوٹھڑی میں اسیر ہیں۔ جب توحید خداوندی کی کچھ باتیں سننے سے اعتباری امتیازات کا پردہ ان کی چشمِ بصیرت سے کسی حد تک اُٹھتا ہے اور اختیار کی باگ ڈور ان کے علم کے ہاتھ سے چھوٹ جاتی ہے، اور وہ اس جامِ توحید سے تھوڑی سی شراب چکھتے ہیں تو اُن کا توسنِ نفس سرکش ہو کر اپنی چھپی ہوئی برائیوں کو آشکار کر دیتا ہے۔ اور ان کی فطرت کا سُوَر گستاخ باتوں کے گندمند کے چرنے میں مشغول ہو جاتا ہے۔ اور ان کی وہ خصلتیں جو ان کے باطن میں پوشیدہ تھیں اور اُنھوں نے اپنی امتیازی قوت سے اُنھیں گھاس پھوس سے ڈھانپ رکھا تھا، شرابِ توحید نے ان امتیازات کو رفع دفع کیا تو وہ ڈھکی چھپی برائیاں ظاہر ہو گئیں۔ اور یہ مسلمہ امر ہے کہ شراب ایسے بدوں کے لیے ایسی ہی بدمستی لاتی ہے۔ لہٰذا شرع محمدیؐ میں ظاہری نشہ بھی حرام ہے اور طریقتِ محمدیہؐ میں اس باطنی شراب کی بھی ممانعت ہے۔ کیونکہ اکثریت آدمیوں کی اسی قماش کی ہوتی ہے اور اکثریت کل کا حکم و درجہ رکھتی ہے۔ ہمارے اس بیان سے یہ خیال نہ کر لینا کہ اچھے اوصاف اور عالی ظرف والوں کے لیے نشہ و مستی جائز ہے۔ خدا ہمارے گناہوں کو معاف فرمائے۔ نشہ تو سبھی کے لیے حرام ہے۔ یہ بات تو ہم نے محض مثال کے طور پر کہہ دی۔ حاصل کلام یہ کہ عوام کی اسی بداخلاقی کی وجہ سے پچھلے بزرگ تزکیۂ نفس کو تصفیۂ قلب پر مقدم گردانتے تھے۔ اور شروع شروع میں سالک کو ظاہری اطاعات و عبادات کا عادی بناتے اور ان کے اخلاق کو سدھارتے اور صحیح عقائد سکھاتے تھے۔ اس کے بعد باطن کی طرف توجہ دیتے تھے اور توحید کا علم سکھاتے، اور ایسی الہامی حالت پہ لے آتے جہاں نیکوں سے سوائے نیکی کے اور کچھ سرزد ہی نہ ہو۔ لیکن نقشبندی سلسلے کے بزرگوں نے جب شاگردوں اور مریدوں کی کم ہمتی کو محسوس کیا تو آغاز تصفیۂ قلب سے کیا۔ ضمناً وہ تزکیۂ نفس کو بھی ملحوظِ خاطر رکھتے تھے تاکہ وہ مبتدی مریدان ابتدائی مراحل ہی میں ان کی کیفیتوں سے آشنا ہو سکے اور مقربان ذات سے اپنا حصہ لینے میں محروم نہ رہ جائے۔ آہستہ آہستہ تزکیۂ نفس اور تصفیۂ قلب دونوں کمال کی حد تک پہنچ جائیں گے اور گوہر مقصود حاصل ہو جائے گا۔ ابتدا میں انتہا کے یہی معانی ہیں۔ لیکن ان بزرگوں نے علم توحید کی تعلیم کو موقوف کر کے توحید کے عمل کے سرایت کرنے کا انداز اپنایا اور سالک کے دل کو اپنی ذاتی توجہ سے ماسوی اللہ کے پھندوں سے چھڑا کر حضوری و مشاہدے کے رنگ میں رنگ دیتے ہیں۔ اور شرعی احکام کو اپنے اوپر لازم قرار دینے کی تلقین کرتے ہیں اور اہل سنت

والجماعت کے عقیدے کی سچائی کو راسخ کرتے ہیں اور اگر توحید کا بیان درمیان میں آجائے تو "ہمہ از وست" کے مطالب بیان کرتے ہیں اور سالکوں کو "ہمہ اوست" کے کلمات زبان پر لانے سے منع کرتے ہیں تاکہ ان کا بیان عوام و خواص کے لیے سراسر فائدہ مند ہو۔ اور کسی قسم کے نقصان کا احتمال نہ رہ جائے۔

وحدتِ وجود کے بیان سے اکثر لوگ بے راہ ہو جاتے ہیں۔ سوائے ان خاص الخاص بندوں کے جو اعتدال کی سیدھی راہ پر ثابت قدم ہوتے ہیں۔ وہ تمام امور کے اسرار و رموز کو جانتے پہچانتے اور وحدانیت کی راہ پر چلتے رہتے ہیں۔ اور کسی وقت بھی حفظِ مراتب کا دامن چھوڑے بغیر وحدتِ حق کے مشاہدے سے غافل نہیں ہوتے۔ سمجھ لیجیے کہ ایک علم توحید وجودی کا ہے۔ وہ ہے چند مقدمات کا سمجھنا۔ وحدتِ مرتبۂ وجود انہی مقدمات کی ترتیب کا نتیجہ ہے۔ صوفیا اسے علم تصوف کہتے ہیں اور اس کو سمجھانے کے لیے وہ چند مثالیں پیش کرتے ہیں۔ جیسے پانی۔ موج اور بلبلہ اور ایسی ہی دیگر مثالیں بیان کرتے ہیں۔ اس مقصد کی بنیاد انھوں نے چند اصطلاحات پر رکھی ہے جو عبارت ہیں وحدت، وحدانیت ارواح اور مثال اور شہادت سے۔ اور اپنے مطلب ہی کے لیے چند الفاظ کی اصطلاحات تراش رکھی ہیں۔ جیسے کہ لاتعین، تعینِ اول، حقیقت محمدیہ، اعیانِ ثابتہ، علمی صورتیں، فیض اقدس، فیض مقدس، قرب نوافل، قرب فرائض، اعتبار الاعتبار، اطلاق، تقید، جمع و فرق اور تنزلات وغیرہ وغیرہ۔ تنزلات خمسہ کو وہ حضرات الخمس بھی کہتے ہیں۔ ایک علم توحید شہودی کا ہے۔ وہ بھی چند مقدمات ہی سمجھنا ہے۔ جن کی ترتیب کا نتیجہ ہے۔ ذات حق تعالیٰ کی وحدانیت اور ذاتِ واجب سے وجود کے الگ ہونے کا عدم جواز اور تمام موجودات کا اسی وجود کے نور سے ظاہر ہونا جو ذاتِ واجب تعالیٰ کا تقاضا ہے۔ متکلمین اس کلام کو علم کلام میں داخل سمجھتے ہیں۔ اور بزرگ اُسے علم حقیقت سے تعبیر کرتے ہیں اور علم کلام سے علیحدہ شمار کرتے ہیں، اور اس کے ذہن نشین کرانے کے لیے وہ چند مثالیں پیش کرتے ہیں۔ جیسے عکس آئینہ اور شخص کا قد، اور اسی طرح کی دیگر مثالیں۔ اُنھوں نے بھی اس کی بنیاد چند اصطلاحات پر مقرر کر رکھی ہے جو عبارت ہیں مرتبۂ ذات، شیونات ذاتیہ، صفات، اسمائے حسنیٰ، ظلال اسما، لامکان، عالمِ امر، اور علم خلق سے۔ نیز اپنے مطلب کی مزید وضاحت کے لیے چند اصطلاحی لفظ بھی تراش رکھے ہیں۔ مثلاً اصل، ظل، اصل الاصل، دائرہ، قوس، مرکز، عکوس اسما، اعتباری علامات، اور حقائق ممکنات وغیرہ۔ اسی قسم کی اور بھی کئی اصطلاحات ہیں۔ ایک حالتِ توحید وجودی کی کیفیت

سے سرشار ہونے کی ہے، وہ ہے اپنی باطنی بصیرت سے تمام موجودات مقیدہ میں وجود مطلق کا پورے ذوق و شوق سے دائمی مشاہدہ، اور اسی مستی و سرشاری سے ہمیشہ مسرور رہنا۔ اور ایک ہے توحید شہودی کی حالت سے شرفیاب ہونا، اور وہ ہے ذات واحد حق تعالیٰ کا دنیاوی اعتبارات کو ملحوظ نہ رکھتے ہوئے مستقل اور دوامی حضور و مشاہدہ اور باطن کا دائمی طور پر اللہ ہی کے جذب و کشش اور ناقابل بیان کیفیت سے لطف اندوز و مسرور رہنا۔ ان دونوں توحیدوں کا حاصل مطلب ایک ہی ہے، یعنی کہ دل کی ماسوی اللہ کے پھندوں سے رہائی۔ اور اُسے ماسوی اللہ کے خیالات و تعلقات سے بالکل خالی کر لینا ہے۔ یعنی ذات باری تعالیٰ سے مکمل واسطہ اور دُنیا و مافیہا سے بالکل قطع تعلق کہ ایک الگ مخلوق ہے۔ لہذا جو کوئی ان دونوں توحیدوں کے ماحصل تک جا پہنچا یعنی ان مذکورہ بالا کیفیتوں سے مشرف ہو گیا تو اس کے لیے ایک ہی بات ہے۔ وہ خواہ ان دونوں کا علم سیکھے یا نہ سیکھے ان کی اصطلاحات کو جانے یا نہ جانے، وہ اولیا کے زمرے میں داخل ہو گیا۔ گرچہ محققین کی صف میں نہیں آئے گا۔ اور جس کسی نے ان دونوں توحیدوں کا علم سیکھ لیا۔ یعنی ان کی اصطلاحات کو سیکھ لیا اور سمجھ لیا لیکن اس کیفیت کو نہ پا سکا اور اپنے باطن کو ماسوی اللہ کے پھندوں سے آزاد نہ کرا سکا اور حضور و شہود کی دولت سے مالا مال نہ ہو سکا، وہ اس کے عالموں اور مقلدوں میں تو داخل ہو گیا لیکن اولیاء کے زمرے میں نہ آ سکا۔ اللہ امان دے اگر وہ گروہ شریعت کی راہ سے ہٹ جائے اور واہی تباہی بکنے لگے جیسا کہ آج کل ہو رہا ہے۔ وہ مقلد بھی نہیں، وہ ملحد ہے۔ اس نے علم کے مطالب کو بھی نہیں سمجھا۔ نہ ہی ان کے مطالب تک جا سکا۔ اور اپنی غلط فہمی سے ہلاکت کے گڑھے میں جا گرا۔ اور جس کسی نے ان دونوں توحیدوں کا علم بھی سیکھ لیا۔ اور دوسرے بلند مقام پر بھی فائز ہو گیا ہو۔ اور اس کا باطن قرب حق کی بنا پر نورٌ علیٰ نور، اور ظاہر بھی شرعی آداب سے آراستہ ہو وہ ایک محقق عارف ہے اور ولیٔ کامل۔ لہذا ظاہری اور باطنی طور پر ایسے عالی مرتبہ بزرگوں کی پیروی کا قصد کر، اور کلامِ الٰہی کی ہدایت کے دامن کو تھام لے۔ کہو ظاہر اور باطن کی زبان سے کہ وہ اللہ ایک ہے وحدتِ ذاتیہ کے ساتھ جو اس کی عین ذات ہے۔ اور وہ جامع اور شامل ہے (حاوی) اللہ بے نیاز ہے تمام صفات کا مرجع ہونے کی صفت کے لحاظ سے اس کے اندر ذاتی بے نیازی کے تصور کے ساتھ۔ پس وہ ذات جس نے نہ جنم دیا ہے کسی بیٹے کو یعنی وہ زیادہ نہیں ہوتا اعتباری کثرت کے ظہور سے۔ اور نہ وہ جنا گیا ہے کسی واحد سے۔

یعنی وہ نہیں قائم ہوتا اپنے علاوہ کسی دوسرے کے ساتھ جیسے اعراض اور امور منتزعہ جنھیں نکالا جاتا ہے ایک معاملے میں سے اور ان کے لیے نہیں وجود ہوتا خارج میں مگر ذہن کے اندر سے اور نہیں ہے اس کا کوئی موجودات کونیہ میں سے، ہمسر اور شریک وجود کے اندر فقط ایک واحد ہے۔ ترجمہ رباعی علم و فکر اگرچہ اعتبارات ہی کے آگے پیچھے گھومتا رہتا ہے۔ لیکن وہ عدمی حقیقت سے کسی وقت بھی باہر نہیں آیا تا۔ کوئی آدمی بھی اس ہستی واحد کا شریک نہیں ہو سکتا۔ اور نہ ہی وہ ہستی مطلق کسی اور کی شریک ہوسکتی ہے۔ مصنف خود رباعی کی تلمیحاتی کڑیوں کو یوں کھولتا ہے۔ کہ اندیشہ عبارت ہے علم سے۔ اور پیش و پس گشتن سے مراد ہے اعتبارات ہی سے تعلق رکھنا اور تیسرے مصرع میں در خویش گردیدن سے مراد اپنی عدمی حقیقت سے باہر نہ آسکنا ہے۔ لہذا ہستی واحد کہ وجود مطلق ہے۔ وہ کسی امکانی حقیقت سے متحد نہیں ہو سکتی، کیونکہ وہ عدم ہے۔ ورنہ معدوم حقیقت بھی موجود ہو جائے گی یعنی وجود مطلق ایک ہی ہے۔ اور کوئی امکانی حقیقت اس کی شریک نہیں ہو سکتی۔ موجودات، وجودات نہیں ہیں۔ بلکہ فقط وہی ایک حقیقت ہے جو ان متعدد اور کثیر مظاہر میں ظہور پذیر ہے۔ اور یہ مفہومی ماہیات اعتباری عدم ہیں اور اُس وجود سے الگ اور اپنے عدم کے دائرے سے قدم باہر نہیں رکھ سکتے۔ اور نہ ہی حضرت واجب الوجود کے ساتھ موجودیت پا سکتے ہیں، اور ظہور مراتب کے یہ آئینے محض اعتباری وجود ہیں جنھیں اسمائے حسنیٰ کہتے ہیں۔ اور ذاتِ مطلق کا مرتبہ ظاہر و باطن سے بلند و بالا ہے اور کسی نسبت کا ہاتھ اس کی عظمت کے دامن تک نہیں پہنچ سکتا۔ اگرچہ ان کثیر التعداد آئینوں میں سوائے جمالِ وحدت کے اور کچھ ظہور پذیر نہیں، لیکن آئینہ، شخص اور عکس سب الگ الگ ہیں۔ اس مقام پہ یک رنگی و مغائرت باہم اکٹھے اور ہجر و وصال بھی جڑواں بچے ہیں۔ پس سمجھ لو کہ ایک معاملہ ایسا بھی ہے جو صوفیا، وجودیہ اور ظلالیہ طریقے سے وراء ہے (دُور ہے) یعنی الگ ہے۔ ہر چند کہ یہاں بھی سوائے اسی وجود مطلق کے کسی اور کو وجود نہیں کہا گیا، اور آئینے والے عکس اور شخص کی مثال بھی دی گئی ہے۔ لیکن وجودی گروہ اور ظلی طائفے کا مطلب اور ہے۔ اور طریقت محمدیہ پہ چلنے والے اصحاب کی مراد کچھ اور ہے اور وہ جو کچھ ہے خدا کے فضل و کرم ہی سے ہے۔ تنبیہہ بعض حقیقت ناآشنا لوگ حضرت مجدد الف ثانی رح (خدا ان کے رازوں کو پاکیزہ فرمائے) کے کلام کے اسرار و رموز کماحقہ، نہ سمجھ سکے، اور ان کے اصل مطلب کی تہ تک نہ پہنچ سکے اور بزعم خود انھیں قائلِ ظل سمجھ

بیٹھے، حالانکہ ان کی اس تحقیق کا تعلق اس دور سے ہے جب وہ سلوک کی وسطی منزلوں میں تھے۔ اور اس ظلیّ مسلک کی انہی سے کیا تخصیص ہے۔ کیونکہ یہ معانی تو بعض متقدمین کے اقوال سے بھی ظاہر ہوتے ہیں اور اسلاف کے قارئین و ناظرین سے یہ بات مخفی نہیں۔ جیسا کہ مولانا رومؒ نے فرمایا ہے کہ اگر تو یہ سمجھ جائے کہ تو کس کا سایہ ہے تو خواہ مردہ ہے یا زندہ اپنے آپ کو فارغ سمجھ۔ بات صرف اتنی ہی ہے کہ اُنھوں نے دوسروں کی اس مختصر سی بات کو اپنے ابتدائی دور کے مکتوبات میں ذرا شرح و تفصیل کے ساتھ لکھ دیا، لیکن انجام کار اس مرتبے سے ترقی کر کے اصل مرتبے تک جا پہنچے، اور ایک مکتوب مبارک میں یہ شعر لکھتے وقت اس امر سے بالکل انکار کر دیا ؎ خالق مخلوق کو اپنا چہرہ کیسے دکھا سکتا ہے۔ الغرض ان کی تحقیقات کے اسرار و رموز اور طریقہ احمد سرہندیؒ کو سادات محمدیہ ہی خوب سمجھتے ہیں۔ اور اب ان مطالب کے وسیلے کے بغیر ان مطالب کا سمجھنا بھی دشوار ہے۔ اپنے ہی وہم و گمان کے تانے بانے میں بندھے ہوئے لوگ جنھوں نے بزعم خود اس مرتبے کے اصطلاحی سلوک کو طے کر لیا ہے۔ وہ یقین کریں یا نہ کریں، اُنھیں اس آیتِ کریمہ سے متنبہ کرتے ہیں کہ اُنھیں بہت جلد قبر میں جاتے ہی معلوم ہو جائے گا۔ دوبارہ متنبہ کیا جاتا ہے کہ ہرگز تمھاری یہ حالت ٹھیک نہیں۔ قیامت بھی نزدیک ہی ہے۔ خدا نے چاہا تو اس روز اصل حقیقت معلوم ہو جائے گی۔ اور اس آیتِ کریمہ کے بموجب قیامت کے دن اللہ تعالیٰ ان تمام اختلافات کا فیصلہ کر دے گا جو تم باہم رکھتے ہو۔ حاصل مطلب یہ کہ اگر تم توحید کی حقیقت کو اچھی طرح ذہن نشین کر لو اور وجود کے راز کو کماحقہٗ سمجھ لو، تو تم پہ یہ بات کھل جائے گی کہ موجود بالذات فقط حق تعالیٰ ہی ہے۔ اور تمام موجودات سے مستقلاً خارج اور الگ۔ نہ یہ کہ ان میں وجود کلی کی طرح موجود، اللہ تعالیٰ ان سب باتوں سے بہت بلند و بالا ہے۔ اگرچہ موجودات اس سے خارج نہیں ہیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ ہر شے پر محیط ہے۔ پس اگر تم توحید کی حقیقت پر کماحقہٗ غور کرو اور وجود کے راز کو خوب اچھی طرح سمجھ لو تو معلوم ہو جائے گا کہ موجود فقط اسی کا وجود ہے۔ اور اسی حاصل مصدری معانی سے مصدری معانی کی شاخ پھوٹتی ہے۔ اور وجود مطلق مستقلاً قائم اور موجود بالذات کی ہے نہ کہ موجوداتِ موہومہ کے ضمن میں۔ موجودات سے خارج ہونے کے لفظ کا مطلب یہ ہے کہ اُس وجودِ مطلق کی موجودیت فقط انہی موجوداتِ ممکنہ ہی میں نہیں جیسا کہ کم فہم دانشوروں کا گمان ہے کہ وہ حضرت واجب الوجود کو کلی طبیعی کہتے ہیں۔ اور موحّد محققین کے اصل مطلب کو نہ سمجھتے ہوئے

الحاد کے بھنور میں جا پھنستے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان سے اور ان کے خیالات سے بچائے۔ کیونکہ یہ تو بالکل انکارِ حق ہے اور صاف کفر ہے۔ بے شک کافروں کا کوئی ساتھی نہیں۔ حق بات یہ ہے کہ موجودیت تو ذاتِ واجب کی صفت ہے اور وہ قائم بالذات ہے، نہ یہ کہ موجودیت کے سبب سے اس کا وجود قائم ہے۔ وہ تو اس کی صفت ہے۔ پس اللہ تعالیٰ اپنی تمام صفات کے ساتھ جو اس کے کمالات ہیں قائم بالذات ہے۔ ان موجوداتِ ممکنہ کے پیدا ہونے سے اس ذات الوجود میں نہ کوئی بیشی ہوتی ہے اور نہ ان کے نہ ہونے سے اس میں کوئی کمی آتی ہے۔ اللہ تھا اور اس کے ساتھ کوئی اور چیز نہیں تھی۔ وہ جیسا تھا ویسا ہی ہے۔ وہ سب سے میرا ہے مگر اس سے کوئی چیز باہر نہیں۔ ہر موجود اسی کے احاطۂ وجود میں ہے، اور قرآنی آیات کے مطابق وہ ہر شے پر محیط ہے۔ اللہ کے لیے ہے میراث آسمانوں کی اور زمین کی۔ کیونکہ وجود وارث ہے تمام موجودات کا، کیونکہ وہ موجد ہے چیزوں کا۔

وہی اول ہے، وہی آخر ہے، وہی ظاہر ہے اور وہی باطن ہے۔ پس اپنی اولیت کی حیثیت سے وہ موجد ہے اور اپنی آخریت کی حیثیت سے وہ وارث ہے۔ ظاہری اعتبار سے وہ مالک المُلک ہے، اور باطنی اعتبار سے لطیف و خبیر ہے۔ اور جان لو اللہ تمھیں نیک بخت کرے کہ بے شک وارث میراث کی وراثت پاتا ہے شخص کی موت کے بعد۔ پس اسی طرح آسمانوں اور زمین کا وجود ان کی فنا کے بعد منسوب ہوتا ہے اس کی طرف جب کہ وہ ہوتا ہے موجود اپنے اعتبارات کے لحاظ سے۔ پس لوٹتا ہے ہبہ (عطا) کیا ہوا وجود جو کہ تھا مستعار اپنے صاحب کی طرف، اور ہوتا ہے یہ حال موجودات کے لیے ہر وقت، کیونکہ وہ موجودات جو ہیں باقی رہتی ہیں اور فنا ہوتی ہیں ہر زمانے میں اکٹھی۔ وہ لیتی ہیں اپنا وجود موجد سے، اور لوٹائی جاتی ہیں وارث کی طرف اور وہی اُنھیں پیدا کرتا ہے یا لوٹاتا ہے۔ اور وہ ہر چیز پر گواہ ہے۔ اور یہ بیان باطل کر دیتا ہے اس شخص کے کلام کو جس نے کہا کہ وہ کلی طبیعی کی طرح ہے۔ اللہ تعالیٰ بلند ہے اس سے بہت زیادہ بلند کیونکہ کلی طبیعی نہیں باقی رہتا افراد کے فنا کے بعد اور یہاں معاملہ اس طرح نہیں ہے۔ کیونکہ وہ تو ہر چیز سے پہلے بھی معبود ہے اور ہر چیز کے بعد بھی معبود ہے۔ **نکتہ** جو لوگ وجود کو کلی طبیعی سمجھ کر افراد میں موجود خیال کرتے ہیں۔ کاش وہ اپنا مطلب یوں بیان کرتے کہ وجود مطلق افراد میں خود موجود ہے چونکہ وجودی افراد تین قسم کی موجودات پر مشتمل ہیں۔ یعنی واجب، جوہر اور عرض۔ انھی میں وجود بھی

موجود ہے۔ اور اگر جوہر اور عرض جو ممکنات میں سے ہیں، نہ ہوں تو وجود واجبی تعین میں موجود ہوگا۔ کیونکہ وجوب اور وجود واجب کی ماہیت ہیں۔ اس صورت میں وجود حق تعالیٰ کی نفی کا خیال اور اس موجودات کے اندر اس کی موجودیت نظر نہیں آتی۔ اور حق تعالیٰ کا وجود انہی ممکنہ موجودات پہ موقوف متصور نہیں ہوتا۔ اسلاف نے جو یہ کلمات کہے ہیں کہ وہ خالص معقول ہے جنس عالی کی طرح اس کے غالباً یہی معنی ہیں اور اُنھوں نے ایسا اس لیے لکھا کہ قلم یا قوّتِ بیان نے ساتھ نہیں دیا۔ مومنوں کے بارے میں اچھا گمان کرو۔

فائدہ محقق عارفوں نے وجودِ حق کا اثبات اور ما سوی اللہ کے وجود کی نفی کی ہے اور یہ کم فہم بے دین لوگ جو وجود حق کو کلی طبیعی وجود سمجھتے ہیں۔ وہ گویا وجود خلق کا اثبات اور وجودِ حق کی نفی کرتے ہیں اور درپردہ وہ خود انکار کا اقرار کر رہے ہیں۔ اور اپنے آپ کو موحدوں میں شمار کرتے ہیں۔ اور ان لغویات اور ترہات کو معارف و تحقیق کا نام دیتے ہیں۔ اور اپنی اسی وہمی حجت بازی کو عقلی دلیل تصوّر کرتے ہیں اور احمقوں کو فریب دینے والے چند الفاظ و کلمات سیکھ کر بیچارے عام مسلمانوں کو کفر و گمراہی کے گڑھے میں دھکیل رہے ہیں، اور امورِ حقّہ کی حیثیت رکھنے والے شرعی فرائض کو ان کی نظر میں اک عام اور معمولی بات ظاہر کرتے ہیں۔ اور اُنھیں ظاہری ایمان و اسلام سے بھی محروم کر کے بالکل کافر بنا دیتے ہیں۔ وہ شرعی احکامات اور ممنوعات کو محض روزی کے انتظام کا ایک طریقہ سمجھتے ہیں اور اُنھیں صرف عوام کی تربیت ہی تک محدود سمجھتے ہیں اور اپنے آپ کو کامل انسان اور محقق سمجھ کر ان شرعی امور سے مبرا اور بے نیاز شمار کرتے ہیں۔ ہم اللہ کی پناہ میں آتے ہیں اس معصیت سے۔ وہ بڑے بُرے مکان والے ہیں اور بھٹکے ہوئے ہیں سیدھے راستے سے۔ اور نہ پیروی کرو اس قوم کی خواہشات کی جو گمراہ ہوئے پہلے، اور گمراہ کیا اُنھوں نے بہت سوں کو اور بھٹک گئے سیدھے راستے سے۔ ایسے لوگوں سے ہرگز ہرگز صحبت نہیں رکھنی چاہیے۔ بلکہ ان سے دُور بھاگنا چاہیے۔ اور ان کی تمام خرق عادت باتوں کو کفر ہی کے درجے سمجھنا چاہیے۔ ان کی باتوں کو دل میں جگہ نہ دینی چاہیے، اور جس وقت خدا تعالیٰ اپنے رسول مقبولؐ کے صدقے تجھ پر توحید کی حقیقت کا عکس ڈالے اور اطمینان کامل نصیب کر دے اور ما سوی اللہ کے وجود کو تیری چشمِ بصیرت سے دُور کر دے اور تجھے عبادات و اطاعات کی توفیق عطا کر دے اور طریقِ محمدیؐ پر استقامت بخش دے اور بلند مقام پر فائز فرما دے۔ اور کائنات کی اس رنگا رنگی سے پیدا ہونے والے تغیر و تبدل تم پہ

اثر انداز نہ ہوں، اور حضوری و مشاہدہ محسوس ہونے کے بجائے دکھائی دینے لگے اور تجھے حق الیقین کا عالی شان مرتبہ حاصل ہو جائے تو پھر اس کے بعد تم جس کے ساتھ چاہو اُٹھو بیٹھو، کیونکہ اس مرتبے کے مالک کو پھر کسی نا اہل کی صحبت سے کسی نقصان کا اندیشہ نہیں ہوتا۔ بلکہ اس مقام پر دوسروں کی صحبت میں نہ جانا یا گوشۂ تنہائی میں جا بیٹھنا بھی خدا کی اس عطا کردہ نعمت کی ناشکری ہے۔ اور جس شرف سے تمھیں مشرف فرمایا گیا ہے۔ اُس کی حق تلفی ہے۔ کیونکہ اگر ان کے مقدر میں ہوگا تو وہ تمھاری صحبت میں ہدایت پا جائیں گے، اور گمراہی سے سیدھی راہ پر آجائیں گے اور اپنی ان لغو اور فضول باتوں سے توبہ کرلیں گے۔ اگر ذہنِ رسا رکھتے ہوں تو پھر بعد از خرابیٔ بسیار اس امر کی حقیقت کو بھانپ لیں گے کہ یہ بات حق ہے کہ بندہ ہوتا بڑا دشوار ہے، اور حق بننے کی سعی محض بے فائدہ اور بے کار بات۔ اور وہ اس کا بندہ اور اُس کے رسول ﷺ ہونے کے بلند مرتبے کو تھوڑا بہت سمجھ کر نماز و درود و سلام کے بھی قائل ہو جائیں گے، اور پھر کبھی سرورِ کائنات ﷺ کے اتباع سے روگردانی نہیں کریں گے۔ دے اللہ تعالیٰ ہمیں اور تمھیں مصطفوئی (تبعیت) پیروی اور ثابت رکھے ہمیں اور تمھیں طریقہ محمدیہ پر۔ اور اس طریق والے پر درود و سلام۔ قصّہ کوتاہ یہ کہ وجود کے راز کو اچھی طرح سمجھنے کا نتیجہ اور توحید کی حقیقت تک پہنچنے کا ثمرہ بھی یہی ہے کہ تمھیں یقین ہو جائے کہ بلا شرکتِ غیرے مستقلاً قائم بالذات صرف حق تعالیٰ ہی ہے اور بس۔ اور کوئی شے اور کوئی شخص اس کے ساتھ شریک نہیں۔ کیونکہ وجود جیسا کہ ہے اپنے حاصل مصدری معنوں میں حقائق ممکنہ سے بالکل الگ ہے۔ ابتدا میں حاصل مصدری شرط اس لیے عاید کی گئی ہے کہ لفظ وجود سے مراد یہاں بلا ملاحظۂ اعتبارات ذات الوجود کے بشرط شی اور لبشرط لاشی کے معنی ہیں۔ نہ یہ کہ علت کی یہ شرط (قید) حقائق ممکنہ سے وجود کی غیریت ہے۔ اور مصدری معانی میں آنے والا وجود ظلّی حقائق ممکنہ کے یکساں ہے، اور حاصل مصدری معانی میں الگ۔ کیونکہ وجود کے ان دونوں مراتب میں وجود وہی ایک ہے اور یہ امتیاز وجود کے اعتباری معانی میں ہے۔ ہاں وجود ماہیات سے ضرور الگ ہے جو اپنی ذات میں معدوم ہیں۔ وجود اور شے ہے اور ماہیت ایک الگ شے۔ جس کے امتیاز کا ادراک فوراً ذہن میں آجاتا ہے۔ لہذا ماہیات جو معدوم ہیں وجود کے ظاہر ہیں۔ عدم و وجود کے تقابل سے عکس پذیر ہوتے ہیں۔ اور وجود کے سوا اور کچھ موجود نہیں۔ کیونکہ معدوم موجود نہیں ہو سکتا اس لیے کہ متضاد اشیا کا باہم جمع ہونا ممکن نہیں۔ ماہیات کو جو ہم نے عدمات کہا ہے۔ ان کی ذاتی معدومیت

ی وجہ سے ہے۔ اور وجود کے ظاہر میں یہ معدومات عدم کے وجود سے تقابل کی وجہ سے عکس پذیر ہونے کی بنا پر دکھائی دیتے ہیں۔ مگر حقیقت میں موجود نہیں ہوتے۔ سوائے وجود کے کہ عدم نہیں ہوسکتا اور معدوم کبھی موجود نہیں ہوتا، کیونکہ متضاد اشیا کا اجتماع محال ہے۔ فائدہ ماہیاتِ معدومہ کے وجود ونمود کی موجودیت میں عکس پذیر ہونے کو آئینے میں منعکس ہونے کی طرح نہ سمجھنا چاہیے۔ کیونکہ یہ عکس منقوش ہونے کے معنی میں نہیں، بلکہ یہ اُس کے اُلٹ معنوں میں ہے۔ یعنی جب وجود وعدم میں حقیقی مقابلہ ثابت شدہ ہے۔ لہذا وہ مفہومات جو عدم ہیں معدوم ہیں۔ اختلافات کی وجہ سے وجود میں موجود نظر آتے ہیں اور اصل میں عدم کے سوا اور کچھ معدوم نہیں اور وجود کے سوا اور کچھ موجود نہیں۔ اسی سے اخذ کرکے سمجھ لیجیے۔ ماہیات کا اپنے مرکز سے ہٹ جانا اور موجودات کا ایک دوسرے سے امتیاز ان کی غیریت کے منعکس ہونے سے ہے۔ بے شک یہ دقیق بات ہے اسے سمجھ لے۔ یہ بیان حقیقت کے انکشاف کے لیے بھی ہے۔ اور مقدر کے سوال کی تردید کے لیے بھی کہ اگر واقعی موجود وجود ہے اور ممکنات اپنی ذات میں معدوم ہیں تو پھر موجودات کی ایک دوسرے سے شناخت یا اجنبیت کس راہ سے ہے تو جواب میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ بھی اسی اختلاف اور انعکاس کی وجہ سے ہے۔ کہ چونکہ عدم میں بھی اجنبیت کے معانی ان معدوم ماہیات کی طرح ہیں اور مرتبۂ وجود میں اس کے برعکس یہ اجنبیت پائی جاتی ہے۔ لہذا اس دقیق اور نازک بات کا سمجھنا ہر کسی کے بس کا روگ نہیں، اور نہ ہی ہر کند نظر کی نگاہ وہاں تک پہنچ سکتی ہے اور وہ ان دونوں کے اتحاد وامتیاز کو نہیں دیکھ سکتا۔ لہذا توحید ربانی کا بہترین بیان ہمہ ازوست ہے، نہ کہ ہمہ اوست۔ یعنی جب اس ساری تحریر سے ثابت ہوگیا کہ وہی وجود مطلق موجود ہے اور حقائق ممکنہ اپنی ذات میں معدوم ہیں، اور ان کی نمود اسی وجود مطلق سے ہے لہذا توحید کا مناسب ترین اور بہترین بیان ہمہ ازوست ہے، نہ کہ ہمہ اوست۔ کیونکہ ہمہ عبارت ہے ماہیاتِ معدومہ سے تو پھر وہ عدمی معانی وجودی معنی کیسے بن سکیں۔ چنانچہ شیخ محی الدین اکبر نے بھی لکھا ہے کہ اعیان (بڑے بڑے لوگوں) نے وجود کی خوشبو کو نہیں سونگھا۔ لہذا جو کچھ بھی کائنات میں ہے اسی سے ہے نہ کہ سب کچھ وہی ہے۔ یہاں وہ ہو وہاں سب کی سمائی کہاں؟ تنبیہہ اکثر ادھورے صوفیا جو اپنے گمان میں باکمال عارف بنے بیٹھے ہیں۔ جب ان بزرگوں کی تصنیفات پڑھتے ہیں جو دُوئی اور ہمہ ازوست کے قائل ہیں تو اپنے خیال میں انھیں حقیقت سے آشنا نہیں سمجھتے بلکہ کہتے ہیں کہ توحید کا

مسئلہ بڑا دقیق ہے، ان پہ اچھی طرح واضح نہیں ہو سکا۔ اور مخلوق ان کی نظر سے دُور نہ ہو سکی۔ اور وہ فنائے کامل حاصل نہ کر سکے، اور نہ ہی دوئی کی قید سے رہائی پا سکے۔ اسے یکسانیت کے وہم کے اسیر و تم خود مرتبۂ اطلاق کی حقیقت کو کماحقہٗ نہ پا سکے، اور نہ ہی بحر بیکراں خداوندی کی موجوں کو دیکھ سکے۔ یکسانیت اور اجنبیت دونوں اعتباری ہیں۔ اور دونوں میں ایک ہی حقیقت جلوہ گر ہے۔ وہ بزرگ تو ہمہ اوست کے مرتبے کو طے کر کے ہمہ از وست سمجھنے لگے اور اس کلام کو اُنھوں نے توحید کے معانی کا بہترین بیان سمجھا جو خواص و عوام سب کے لیے فائدہ مند ہے۔ ان بزرگوں کی تربیت تو یونانی علاج کی طرح ہے جن کی دواؤں سے مریض کو نقصان نہیں ہوتا۔ اس دوسرے فرقے کے برعکس کہ ان کی تعلیم ہندی ویدوں کی طرح ہے کہ یا تو فوری صحت اور یا موت۔ بلکہ اکثر اوقات موت ہی واقع ہوتی ہے۔ شفا کا احتمال کم ہی ہوتا ہے۔ لہٰذا سب سے زیادہ سود مند طریقہ یہی حفظِ مراتب کا سلیقہ ہے۔ اور توحید کا بلیغ ترین بیان ہمہ از وست ہے۔ کہ وہ سب کچھ اللہ کی جانب سے ہے۔ بے شک بہترین کلام اور بلیغ ترین نظام اللہ علیم و علاّم کا کلام ہے۔ یعنی بیانوں میں سے سب سے اچھا اور فصیح ترین بیان حق تعالیٰ ہی کا ہے۔ اور جب خود حق تعالیٰ نے قرآن مجید میں سب کچھ اللہ کی طرف سے کہا ہے۔ سب کچھ اللہ نہیں کہا۔ تو پھر اس سنتِ الٰہیہ کے مطابق توحید کے معنی ہمہ از وست ہی کے معنوں میں لینے چاہئیں نہ کہ ہمہ اوست کے۔ اور اس کتاب میں اگرچہ ہر جگہ توحید کا اثبات کیا گیا ہے۔ اور ماسوی اللہ کے وجود کی نفی کی گئی ہے۔ اور کلمہ طیبہ کا ماحصل بھی یہی ہے کہ اللہ کے سوا اور کوئی معبود نہیں۔ لیکن خدا کے فضل سے کہیں بھی ایسا بیان نہیں آیا جس سے شرع دینِ متین کے خلاف، حفظِ مراتب کی تردید کا پہلو نکلے یا اعتباری اجنبیت کو ملحوظ نہ رکھا گیا ہو۔ بلکہ شریعت ہی کو عین حقیقت کہا ہے۔ اور حفظ مراتب کو لوازمات میں شمار کیا ہے۔ اور حقائق ممکنہ کی وجود ذات باری تعالیٰ سے اجنبیت کو صراحت و وضاحت سے بیان کیا ہے۔ اور عارفوں میں سے کوئی بھی اس امتیاز سے متمیز نہ ہو سکا اور شریعت و حقیقت پر ایسا جامع بیان کوئی نہیں لکھ سکا۔ عبد عبد ہے اور معبود معبود ہے۔ ہم تو خاک کے پتلے ہیں، اور وہ بادشاہوں کا پروردگار۔ تنبیہہ وحدت الوجود کے متعلق محض دوسروں کی تقلید کر کے لکھنا یا اس حال تک پہنچے بغیر کچھ کہنا جیسا کہ گمراہ لوگوں کا طریقہ اور مُنہ پھٹ ملعونوں کا وطیرہ ہے سخت بے ادبی، شرک، سرکشی اور شیطانی بہکاوا ہے کہ ممکنات کو وجود سمجھنا، خود کو پا لینا

اور پھر بھی ہمہ اوست کہنا اک بے بنیاد سی بات ہے اور وحدت کی شکل میں کفر والحاد ہے ۔ اس کیفیت سے کیف حاصل کرتے اور معرفتِ حق سے مشرف ہونے کے بعد مستی اک معذوری اور مغلوب الحال ہونا اک مجبوری ہے، جو اللہ کے نزدیک قابلِ معافی ہے۔ صاحبِ ذوق اصحاب کے نزدیک محض دوسروں کی تقلید کرتے ہوئے زبان سے وحدت الشہود کا بیان اور وہ بھی مشاہدے کی کیفیت کے بغیر محض ناقدردانی، بدنصیبی، شرک خفی اور گمراہی ہے۔ یعنی کہ موجودات کو موجود بالذات سمجھنا اور ان میں طاقت اور فاعلی قوت دیکھنا اور ساتھ ہی ہمہ ازوست کے الفاظ زبان پر لانا، یہ تو محض خود فریبی، کھلی غلطی، بدفطرتی اور ہوس ہے۔ اس حالت کو حاصل کرنا اور پھر تمام وقت اسی پہ قائم رہنا اور تمام موجودات میں ایک قوت کے مشاہدے کے مقام پر مشرف رہنا تو فعلی و صفاتی تجلی کا ایک مرتبہ ہے۔ جو سلوک کے دوران سالک کو پیش آتا ہے۔ اور اس حقیقت کے انکشاف سے پہلے ہی ظاہری یا تقلیدی طور پر توحید محمدیؐ سے شرفیاب ہونا اور اُس منزل تک پہنچ جانا ظاہری ایمان و اسلام ہے۔ کیونکہ ذاتِ واجب کی وحدت اسی طرح ہے جیسی کہ ہونی چاہیے۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا اور کوئی معبود نہیں، وہ واحد یکتا ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں۔ ادب آداب اور حفظِ مراتب میں بھی کوئی خلل نہیں آتا۔ اور ہر چند کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس کے بندے اور رسول ہیں کے اندر جو رموز اور گہرے مطالب ہیں وہ عام مسلمانوں پر منکشف نہیں ہوتے۔ لیکن یہ یقین اور ایمان اُن کے ظاہر و باطن میں کسی قسم کی خرابی پیدا نہیں کرتے۔ بلکہ ان کی استعداد اور ظرف کے مطابق نفع پہنچا کر ان پر نجات کی راہیں کھول دیتے ہیں اور ان کے قول و فعل، طور اطوار اور وضع قطع کی اصلاح کرتے ہیں۔ اس حقیقت کے انکشاف اور اس بلند مرتبے پر مشرف ہونے کے بعد فنائی الذات، حقیقی ایمان، صحیح اسلام، حقیقت و شریعت کا مرتبہ، طریقت و معرفت کا ماحصل اور سیر و سلوک کا انتہائی مقام آتا ہے۔ سالکین کے لیے وہ اک شاہراہ ہے جس میں کسی قسم کے نقصان کا احتمال نہیں۔ ثابت رکھے اللہ ہمیں اور تمہیں اسی توحید پر۔ خدا کے فضل سے مخلص مومنوں کی ساری تصانیف میں شروع سے آخر تک توحید محمدیؐ کا بیان ہے جو ہر خاص و عام کو ایمان بخشتا ہے اور عین ایمان و اسلام ہے جو حقیقت کے رموز کو روزِ روشن کی طرح عیاں کر دیتا ہے۔ اور ہر کسی کے دل میں شرعی امور کو بغیر کسی شک و شبہ کے مستحکم کر دیتا ہے اور دنیوی اعتبارات کی نمود و نمائش کو ان کے دل و دماغ کی تختی سے سرے سے مٹا ہی دیتا ہے۔ اور وجود باری تعالیٰ

کا ویسا ہی اظہار کرتا ہے جیسا کہ وہ ہے، اور اللہ تعالیٰ کی مہربانی سے کسی قسم کی کوئی ایسی بات معرضِ تحریر میں نہیں آئی۔ جس سے ظاہر ہو کہ کسی مرتبے کی حق تلفی ہوئی ہے، یا مرتبۂ اتحاد کی ماہیت کا اظہار نہیں کیا گیا۔ یا کسی امتیازی حیثیت کو بیان نہیں کیا گیا۔ یا آدابِ بندگی میں کوتاہی ہوئی ہو یا بشری استعداد کے مطابق شانِ خداوندی کو شایانِ شان طریقے سے بیان نہیں کیا گیا۔ یا روایات و منقولات سے آیاتِ قرآنی اور احادیث نبویؐ کی سندات کا دامن ہاتھ سے چھوٹ گیا ہو۔ یا دلائل و براہین کے اثبات میں کوئی نامعقولیت ہوئی ہو۔ غرض یہ کہ مومنوں کی تمام تر تحقیقات بالکل درست اور حق گوئی کی بنیاد پر مضبوط ہیں۔ کیونکہ ان کا بیان کلامِ ربانی اور ان کی پہچان تعلیمِ نبویؐ پر مبنی ہے۔ اور خدا تعالیٰ نے اپنے کلام کے حق میں ہمارے آقائے دو جہاں سے یوں فرمایا ہے کہ ہم نے اس قرآن کو راستی کے ساتھ نازل کیا۔ اور ہم نے آپؐ کو صرف بشارت دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے۔ اور قرآن میں ہم نے جابجا فصل رکھا تاکہ آپ اس کو لوگوں کے سامنے ٹھہر ٹھہر کر پڑھیں، اور ہم نے اس کو اتارنے میں بھی تدریجاً اتارا۔ کہہ دیجیے کہ تم اس قرآن پر خواہ ایمان لاؤ خواہ ایمان نہ لاؤ۔ جن لوگوں کو قرآن سے پہلے (دین کا) علم دیا گیا تھا۔ یہ قرآن جب ان کے سامنے پڑھا جاتا ہے تو ٹھوڑیوں کے بل سجدے میں گر پڑتے ہیں۔ اور کہتے ہیں۔ ہمارا رب (وعدہ خلافی سے) پاک ہے۔ بے شک ہمارے رب کا وعدہ ضرور پورا ہی ہوتا ہے اور ٹھوڑیوں کے بل گرتے ہیں روتے ہوئے۔ اور یہ قرآن ان کا خشوع بڑھا دیتا ہے۔ لہذا کوئی جاہل محض جہالت کی وجہ سے چشم پوشی کرے اور اپنی گمراہی سے غافل ہوتے ہوئے تعظیم و تکریم اور فرمانبرداری کی طرف مائل نہ ہو۔ اور کوئی خبیث انسان کسی جگہ سے فقط ایک دو جملے دیکھے اور اس مقام کی ساری عبارت کو تحقیقی نگاہ سے نہ پڑھے۔ یا کوئی شیطان سیرت مخالفت کی خاطر سرکشی اور تکبر سے کام لے یا کوئی دشمن جان بوجھ کر محض نکتہ چینی اور اعتراض کی نیت سے دو چار الفاظ یاد کر لے اور ساری عبارت نہ پڑھے اور حق کو چھپانے کی کوشش کرے، تو اس کی مثال ایسے ہی ہے کہ کسی نے قرآنِ مجید سے ایک آیت کے یہ چند کلمات یاد کر لیے کہ مت جاؤ نماز کے نزدیک اور کہے کہ خدا نے خود فرمایا ہے کہ تم نماز کے قریب مت جاؤ، اور باقی ماندہ آیت کو نہ پڑھے جس کا مطلب ہے کہ جب تم نشے کی حالت میں ہو۔ وہ ان لوگوں کے زمرے سے باہر نہیں نکل سکتا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس قسم کے بے انصاف مخالفین رسول مقبولؐ سے ہم مخلص محمدیوں کو آگاہ اور خبردار کیا ہے کہ

پھر اگر یہ روگردانی کریں تو آپ کہہ دیجیے کہ میرا کیا نقصان ہے کہ میرے لیے تو اللہ تعالیٰ (حافظ و ناصر) کافی ہے۔ اس کے سوا کوئی معبود ہونے کے لائق نہیں۔ میں نے اسی پر بھروسہ کر لیا اور وہ بڑے بھاری عرش کا مالک ہے۔ اور اس آیت کریمہ کے مطابق خدا تعالیٰ نے ان کا دل ہی ایمان سے پھیر دیا ہے، اس وجہ سے کہ وہ محض بے سمجھ لوگ ہیں کہ اپنے نفع سے بھاگتے ہیں۔ وہ (خدا) وہی ہے نہ یہ کہ سارے وہی ہیں۔ کیونکہ ہمہ (تمام) تو عبارت ہے ممکنات کی ماہیات سے جو اپنی ذات کے لحاظ سے معدوم ہیں اور اُس (وہ) کا اشارہ ذات الوجود کے مرتبے کی طرف ہے۔ پس وجود وجود ہے نہ کہ ساری موجودات کے وجود ہیں جیساکہ جاہلوں کا خیال ہے۔ درحقیقت اس بات کا اقرار کرنا ہی کفر ہے۔ اور اس آیت کریمہ کے بموجب جس نے خدا کے ساتھ کسی کو شریک کیا تو وہ بہت گہری گمراہیوں میں بھٹک گیا۔ سیدھی راہ یہی ہے کہ تفریق و جمع کا جامع ہونا چاہیے۔ اور امتیاز و اتحاد کے دونوں معانی کے مشاہدے سے، غافل نہ ہونا چاہیے۔ اور میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا اور کوئی معبود ہونے کے لائق نہیں اور میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اُس کے بندے اور رسول ہیں۔ یہ وہ چیز ہے جو مجھ پر ظاہر ہوئی ہے قدیم اللہ کے فیض سے اور اُسے نہیں سمجھ پاتا سوائے اس کے جسے اللہ نے دیا ہو قلبِ سلیم۔ اسی کی نجات ہوگی جو اللہ کے پاس کفر و شرک سے پاک دل لے کر آئے گا۔ یعنی وحدت الوجود اور وحدت الشہود کی جامع تحقیق یہی ہے جسے حق سبحانہ تعالیٰ نے محمدیتؐ کی برکت اور جامعیتِ محمدیتؐ کے طفیل مجھ ناچیز پر منکشف فرمایا ہے اور ہدایت دی ہوتی ہے جو ہادی برحق کی طرف سے آئے۔ اور دقیق اور گہرے مطالب کو کفر و شرک سے پاک دل والوں اور اعتدال پسندوں کے سوا اور کوئی سمجھ ہی نہیں سکتا۔ ترجمہ رباعی اے درد اگر تو اس ذاتِ قدیم کے رازوں کا محرم ہوتا تو ان امتیازی اور حادث اور فانی اضافات پہ خوشی اور غم کی تہمت سے کاہے کو متہم ہوتا۔ اے ناچیز تجھے ایسے خیالات سے کیا سروکار۔ کیونکہ جہاں وجود کا مرتبہ ہے۔ تیری وہاں عدم کی حیثیت ہے۔ اب مصنف کی اپنی تشریح ملاحظہ ہو۔ محرم راز ہونے سے ہماری مراد حضرت وجود واجب کے مرتبے کا حقیقی عارف ہوتا ہے۔ کیونکہ ذاتی قدامت تو اسی کے نصیب میں ہے۔ شادی و غم سے مراد ہے یہ اعتباری اور حادث اضافات اور نسبتیں جو فانی ہیں اور جنھیں بقا نہیں۔ کیونکہ وہ عوارض موہومہ ہیں۔ چرا سے ہماری مراد عدم ضرورت اور بے وجہ ہونے کے اظہار سے ہے۔ عبث سے مراد لغو و بے ہودہ ہوتا ہے۔ متہم

ہونے سے ہمارا مطلب ہے کسی غیر واقعی امر کی تہمت میں پھنس جانا جس کی کوئی اصلیت ہی نہ ہو۔ اور رباعی کا حاصل مطلب یہ کہ اگر تو وجود ہستی کے مرتبے کی حقیقت کا عرفان رکھتا ہے تو پھر اعتباری، حادث اور فانی اضافتوں اور نسبتوں سے جو عوارض موہومہ ہیں تو کیوں خواہ مخواہ اور ناحق متہم ہو رہا ہے اور اس تہمت میں پھنس رہا ہے۔ تیری ممکنہ حقیقت کی تو کوئی حیثیت نہیں۔ تو محض ناچیز ہے۔ تجھے ان خیالات اور اس سوچ بچار سے کیا سروکار۔ ان اضافتوں اور نسبتوں کو اپنی معدوم حقیقت ممکنہ سے منسوب نہ کر کیونکہ وہ مرتبہ جہاں وجود ذات ہے وہاں تو فی الحقیقت معدوم ہے۔ اور اُس وجود کے سوا اور کوئی موجود نہیں، اور موجود سوائے اللہ کی ذات کے اور کوئی نہیں۔

هوالنّاصر

شروع اللہ کے نام سے جو نہایت مہربان اور بہت رحم والا ہے

ہر قسم کی تعریف اللہ کے لیے ہے جو کبھی اپنے وعدے کے خلاف نہیں کرتا۔ سلام و درود ہو اس کے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر کہ جس کے بعد کوئی نبی نہیں، اور آپؐ کی آل پر جو واصلانِ حق ہیں، اور آپؐ کے صحابہ پر جو کاملانِ ذات ہیں۔ اما بعد یہ انتیسواں باب ہے جس کا نام وعداللہ ہے اللہ تعالیٰ کا قول ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سچا وعدہ کیا اور وہ غالب اور حکمت والا ہے۔ پس ہر وہ چیز جس کے لیے تو مستعد ہو استعداد کے لحاظ سے اور قابلیت کے لحاظ سے۔ وہ اللہ کا وعدہ ہے تیرے حق میں۔ پس جب تک یہ معاملہ ہوتا ہے قوت کے ساتھ وہ داخل ہوتا ہے وعدے میں۔ اور جس وقت وہ ہوتا ہے بالفعل تو وہ ایفائے عہد میں گمان کیا جاتا ہے۔ پس صبر کر، بے شک اللہ کا وعدہ حق ہے۔ اور ہرگز ہلکا نہ پائیں تم کو وہ لوگ جو یقین نہیں لاتے۔ اے ایمان والو، میرے رب کا وعدہ سچا ہے۔ بے شک اس کا وعدہ پورا ہو کر رہنے والا ہے۔ اور اسی کی طرف تم سب کو لوٹنا ہے۔ اللہ کا وعدہ سچا ہے۔ بے شک وہی مخلوق کو پیدا کرنے والا ہے۔ پھر وہی اُسے لوٹاتا ہے۔ تاکہ جزا دے ان لوگوں کو جو ایمان لائے۔ اور اُنھوں نے نیک کام کیے عدل کے ساتھ، اور وہ لوگ جنھوں نے کفر کیا ان کے لیے شراب ہے گرم اور عذاب ہے دردناک اس وجہ سے جو وہ کفر کیا کرتے تھے۔

وعدۂ دیدارِ ذات اور اشتیاقِ موت کے بیان کا باب

چونکہ حق سبحانہٗ تعالیٰ نے مومنوں سے قیامت میں دیدار کا وعدہ کر رکھا ہے۔ لہٰذا سچے مومنوں کو چاہیے کہ وہ ہر لحظہ موت کے لیے تیار رہیں۔ اور انشاء اللہ ربِ رحیم سے پوری اُمید ہے کہ ایسے صاحبِ حال لوگوں سے موت کی دشواری بھی آسان ہوجائے گی۔ کیونکہ وہ اس کے خود مشتاق تھے، اور دل و جان سے چاہتے تھے کہ اس عالمِ ناسوت کی قیود سے رہائی پاجائیں۔ برعکس غافل انسانوں کے جو دنیاوی زندگی کے حریص ہیں، جیساکہ قرآنِ پاک نے صریحاً کہا ہے کہ آپ تو ان کو حیاتِ دنیویہ کا حریص عام آدمیوں سے بھی بڑھ کر پائیں گے۔ سبب اس کا یہ ہے کہ یہ غافل لوگ صرف حسّی لذتوں ہی سے واقف ہیں، اور وہی دُنیا میں حاصل کرتے ہیں، اور آخرت پر کماحقہٗ ایمان نہیں رکھتے۔ وہ روحانی لذات اور آثارِ خیر سے ناآشنا ہیں۔ اور سوائے اس دُنیا کی کشش والے افعال کے اور کچھ نہیں کرتے۔ اور عالمِ آخرت کی طرف متوجہ کرنے والے افعال سے باز رہتے ہیں۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے قرآن میں فرمایا ہے کہ وہ موت کی کبھی تمنا نہ کریں گے۔ بوجہ (خوفِ سزا) ان اعمال (کفریہ) کے جو اپنے ہاتھوں سے سمیٹتے ہیں۔ سچ ہے امیروں کے لیے موت حسرت اور مسکینوں کے لیے عین راحت ہوتی ہے۔ جہاں تک ہوسکے ہمیں ضروری و لازم چیزوں ہی کی فکر کرنی چاہیے۔ اور موت کو بھلانا نہیں چاہیے۔ لذتوں کو ختم کرنے والی موت اور ملک الموت دونوں کا کثرت سے ذکر کرنا چاہیے اور کمال جوانمردی اور حقیقت بینی سے کام لیتے ہوئے دُنیاو مافیہا سے لاتعلق رہتے ہوئے موت کا مشتاق ہونا چاہیے۔ اور بڑے ذوق و شوق اور خوشی و مسرّت سے موت کا منتظر رہنا چاہیے کہ وہ لقائے الٰہی (دیدارِ الٰہی) کا دیباچہ اور وسیلہ ہے۔ موت چونکہ لقائے الٰہی کی طرف لے جانے والی ہے۔ اس لیے وہ مومن کے لیے اک تحفہ ہوتی ہے۔ یوں نہ ہو کہ دنیاوی مکروہات اور سختیوں سے تنگ اور ناراحت ہوکر بے صبری سے زندگی سے نالاں ہوکر ناجوانمردی، کم ظرفی اور غیر مستقل مزاجی سے کام لیتے ہوئے غم و اندوہ کے عالم میں عورتوں کی طرح موت کی تمنا کی جائے کہ یہ بھی دُنیاوی لالچ کی طرح فانی امور میں گرفتاری ہی ہے۔ اور یہ دونوں صورتیں قابلِ مذمت اور بُری ہیں، اور یہی وجہ ہے، یہ جو آیاتِ قرآنی اور احادیثِ نبویؐ میں آیا ہے کہ تمہیں دنیوی زندگی دھوکے میں نہ ڈالے۔ اور کیا وہ چاہتے ہیں دُنیا کی زندگی کہ موت کی تمنا نہ کرو۔ کیونکہ مطلع (قیامت کے دن

کھڑے ہونا یا موت کے بعد آخرت کا معاملہ) کا خوف بڑا شدید ہے۔ اور نہ تمنا کرے تم میں سے کوئی بھی موت کی کسی ضرر کی وجہ سے جو اُسے پہنچا ہو۔ اگر ایسا کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ ہو تو اُسے کہنا چاہیے، اے اللہ مجھے زندہ رکھ جب تک کہ زندگی میرے لیے بھلائی ہے، اور مجھے وفات دے جب کہ وفات میرے لیے اچھی ہو۔ اور نہ تمنا کرے تم میں سے کوئی بھی موت کی۔ اگر وہ نیک عمل کرنے والا ہوگا تو ممکن ہے وہ زیادہ ہو جائے بھلائی میں۔ اور اگر وہ بُرے کام کرنے والا ہے، ممکن ہے وہ اللہ کی رضامندی طلب کرے، اور تم میں سے کوئی بھی موت کی تمنا نہ کرے اور نہ دُعا کرے اس کے لیے، اس سے پیشتر کہ وہ اُس کے پاس آجائے۔ کیونکہ اگر وہ فوت ہو گیا تو اُس کی اُمید منقطع ہو جائے گی۔ کسی مومن کی عمر زیادہ نہیں ہوتی مگر یہ کہ بھلائی کے ساتھ۔ لہٰذا موت کے شوق، ذکر یا یاد کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اپنی موت یا فنا جو طبعاً انسان کو ناگوار گزرتی ہے۔ اور بڑی مشکل اور کٹھن نظر آتی ہے۔ اس سے اس قدر رغبت اور موافقت پیدا ہو جاتی ہے کہ زندگی و موت یکساں نظر آنے لگتے ہیں۔ بلکہ ہر دم غالب آنے والی موت کا پلڑا، زندگی کے پلڑے سے جھکا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ اور یوں زندگی موت کی صفت سے متصف ہو جاتی ہے۔ اس کے آنے سے پہلے ہی آدمی اس کے لیے تیار ہوتا ہے۔ اور مرنے سے پہلے ہی مر جاتا ہے۔ تیار ہو جاؤ موت کے لیے موت کے نزول سے پہلے اور مر جاؤ مرنے سے پہلے۔ دو چیزیں ایسی ہیں جن سے ابنِ آدم کو کراہت ہے۔ وہ موت سے کراہت کرتا ہے، اور موت اس کے لیے بہتر ہے آزمائش سے۔ اور وہ قلتِ مال سے کراہت کرتا ہے، اور قلتِ مال حساب میں کمی کا سبب ہے۔ اور اس غیر فطری پلڑے کے جھکاؤ اور اضطراب کو ملحوظ خاطر رکھے بغیر اس فطری جانب والا اعتدال اور مساوات میسر نہیں آتے۔ پس جب تک اس موت و حیات سے نجات حاصل نہ ہو۔ اور جب تک ایسے حالات اور اس سے دیگر متعلقات رونما نہ ہوں بڑی مسرت اور اشتیاق سے اس کا فوری استقبال کرنا چاہیے اور موت و فنا کے مبارک قدموں کا منتظر رہنا چاہیے۔ کیونکہ یہ اس عالم کی آخری مراد اور بنی نوع انسان کے سلوک کی آخری منزل ہے۔ اس حق کا خود مشتاق ہونا چاہیے اور حق کو اپنا مشتاق بنانا چاہیے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو اللہ سے ملاقات کی چاہت رکھتا ہے خدا بھی اس کی ملاقات کا خواہاں ہوتا ہے۔ اور جو اللہ سے ملاقات سے کراہت کرتا ہے۔ خدا بھی اس کی ملاقات سے نفرت کرتا ہے۔ پس کہا حضرت عائشہؓ یا آپؐ کی ازواج میں سے کسی نے بے شک

ہم تو موت سے کراہت محسوس کرتے ہیں ۔ آپؐ نے فرمایا ، یہ بات یوں نہیں ہے ۔ لیکن مومن جب اس پر موت حاضر ہو جاتی ہے تو اُسے بشارت دی جاتی ہے ۔ اللہ کی خوشنودی کی اور اُس کی عزت کی ، پس نہیں ہوتی اس کے نزدیک کوئی چیز اس سے زیادہ پیاری اس سے جو اس کے آگے آ رہی ہے ۔ پس وہ پسند کرتا ہے اللہ سے ملاقات کو اور اللہ پسند کرتا ہے اُس سے ملاقات کو ۔ اور بے شک کافر جب اس پر موت حاضر ہوتی ہے تو اسے بشارت دی جاتی ہے اللہ کے عذاب کی ، اور اس کی سزا کی ۔ پس اس کے لیے اس سے زیادہ مکروہ کوئی چیز نہیں ہوتی جو اس کے سامنے آ رہی ہے ۔ پس وہ ناپسند کرتا ہے اللہ سے ملاقات ، اور اللہ ناپسند کرتا ہے اس سے ملاقات کو ۔ دیدارِ خداوندی کے طالب کتنے خوش بخت ہوتے ہیں اور محبوبِ حقیقی کے متلاشی لوگوں کا انجام بخیر ہوتا ہے ۔ **ترجمہ رباعی** محبوب کا جلوہ آخر نظر آ ہی جائے گا ۔ آخر کار تمام اسرار و رموز ظاہر ہو ہی جائیں گے ۔ ہم حقائقِ ممکنہ اُس کا آئینہ ہیں جس میں وہ خود پرست محبوب اپنا دیدار کرتا ہے ۔ آخر کار وہ ہم سب سے (عوام سے) بھی دوچار ہو ہی جائے گا ۔ مصنف خود رباعی کی توضیح میں یوں رقم طراز ہے کہ " آن جلوہ " سے ہماری مراد تجلّیٔ حق تعالیٰ سے ہے ۔ وہ تجلی خواہ نوری ہو یا صوری ۔ دیدہ سے ہماری مُراد چشمِ بصارت اور بصیرت دونوں ہیں ۔ یعنی کہ حق تعالیٰ ہم سب پہ ظاہری اور باطنی طور پر آشکارا ہو ہی جائے گا ، اور کسی کو اُس کی ذات جلّ شانہٗ کے انکار کی مجال نہ رہ جائے گی ۔ قیامت کے دن کو خود اللہ تعالیٰ نے روزِ جزا کہا ہے ۔ اُس روز اُس کے تمام پوشیدہ اور چھپے ہوئے اسرار و رموز ظاہر و آشکارا ہو جائیں گے ۔ ہم حقائقِ ممکنہ مثلِ آئینے کے ہیں ۔ اور اُس کے کمالات کے مظاہر ہیں ۔ اور لقائے الٰہی کی تجلّی گاہ ہیں ہم خود ہر قسم کی شکل و صورت سے معرا ہیں ، لیکن اس کے دیدار کے مشتاق ہیں ۔ اور خود پرست محبوب یعنی محبوبِ حقیقی جو خود ذاتِ باری تعالیٰ ہے ہمیشہ اپنے اسمائے حسنیٰ کے ظہورات کے اظہار کی طرف متوجہ رہتا ہے ۔ جس طرح اب خواص پہ اپنا انکشاف کرتا ہے ۔ اور ان کی چشمِ بصیرت کو ان نورانی تجلیات سے منور کرتا ہے ۔ بالضرورت آخرت میں عوام پر بھی ان کی استعداد کے مطابق آشکارا ہو جائے گا ، اور انھیں بھی اپنے رب تک رسائی ہو جائے گی ۔ اگرچہ اب بھی ہر طرح اسی کے اسمائے حسنیٰ کی تجلی ہے ۔ لیکن آخرت میں جب انسانی نفس دُنیاوی آلائشوں سے پاک ہو گا اور بصیرت اپنی پوری قوت حاصل کر لے گی ۔ اور انسانی غفلت کا پردہ بالکل اُتر جائے گا ، اور اپنی نمائش

کرنے والے اس محبوب کا حسن پوری آب و تاب کے ساتھ سامنے آئے گا۔ جیساکہ خود خدا نے قرآن میں فرمایاہے کہ رب نے تجھ پر سے تیرا پردہ (غفلت کا) ہٹادیا۔ سو آج تو تیری نگاہ بڑی تیز ہے ۔ ہر موجود کی ہستی اس کی ہستی پر دلالت کرتی ہے ۔ یعنی اگر تھوڑی سی قوت ادراک بھی ہو تو معلوم ہوجائے گا کہ دنیا کی یہ سب مصنوعات اپنے صانع کے وجود پر دلالت کرتی ہیں ۔ اور اُس کے اثبات کی بیّن دلیل ہیں ۔ کیونکہ کوئی مصنوع چیز بغیر صانع کے وجود میں نہیں آسکتی ۔ اور اس موجودات کا خود بخود پیدا ہوجانا ۔ جیساکہ دہریوں کے ٹولے کا گمان ہے سراسر غلط ہے ۔ اور اُس کی بنیاد ہی باطل پر ہے ۔ ہر موجود خدا کی ہستی کی اک دلیل ہے ۔ اور یہ آیت کریمہ کہ تم جدھر کو رُخ کرو اُدھر ہی خدا کا رُخ ہے اُس کی خود پرستی کی آئینہ دار ہے ۔ یعنی ہم جدھر کا رُخ کریں اُدھر اُسی کا رُخ ہے ۔ اور جو ہماری طرف رُخ کرے گا وہ بھی اسی کا رُخ ہوگا ۔ تو اس صورت میں وہی ہے جو خود اپنے روبرو ہے ۔ اور اس کی نگاہ اپنی ہی طرف ہے ۔ جیساکہ آئینہ دیکھنے والا شخص دیکھنے والا بھی آپ ہی ہے ۔ اور جسے دیکھ رہاہے وہ بھی خود آپ ہی ہے ۔ یہ آئینے اور شخص کی مثال محض سمجھانے کے لیے دی ہے ۔ وگرنہ خالق اور مخلوق کے درمیان یہ مشاہدے کی بات تو کما حقہ' بیان میں آ اور سما ہی نہیں سکتی ۔ جب تک اُسے چکھو نہیں اس کی شیرینی کو نہیں سمجھ سکتے ۔ اگرچہ آج بھی اس کی شوخی ساز کے ہر تار سے نکلنے والے نغمے کی طرح ہے، لیکن اس کی معشوقیت نے وعدۂ دیدار کو فردائے قیامت پہ ٹال رکھا ہے ۔ جس کی قرآن میں یوں یقین دہانی ہے ۔ پس جو کوئی اُمید کرتا ہے اللہ سے ملاقات کی، تو بے شک اللہ کا مقرر کیا ہوا وقت آنے ہی والا ہے ۔ اگرچہ اس کے جمال جہاں افروز کی شوخی و بے حجابی اس مصرع کے مطابق وہ پری رو حسین چھپنے کی تاب ہی نہیں لا سکتا اب بھی ہر طرح ظاہر ہے اور تعینات کے ہر تار سے اسی لاتعین کے نغمات پھوٹ رہے ہیں ۔ لیکن وہ ایسا معشوق ہے کہ اپنے وصل کے پیاسوں کو ہمیشہ اپنا طلبگار رکھتا ہے ۔ اور اس کے لامتناہی مراتب کے تقاضوں کے مطابق عشاق ذات جس مرتبے پر بھی پہنچیں وہ سیر نہیں ہوتے ۔ لہٰذا اس وعدۂ دیدار کو کل پہ ڈال دیا ۔ کیونکہ خدا نے چاہا تو آخرت میں وہاں وہ مزید لطافت اور قوت سے مومنوں پر آشکارا ہوگا ۔ اور مذکورہ بالا آیت کریمہ میں بھی یہی نوید جانفزا تھی ۔ اُس جہانِ آخرت میں عارفانِ ذات ابدالآباد تک ترقی کے منازل طے کرتے اور تجلیات ذات سے شرف یاب ہوتے رہیں گے اور اسی پر اکتفا نہ کریں گے ۔ اللہ اللہ لوگ زندہ رہنا چاہتے ہیں اور ہم (عارفانِ حق) موت

کے متمنی ہیں ۔ اور اس آیت کریمہ کے مطابق کہ اگر تم سچے ہو تو اپنے وعدے کی تصدیق کے لیے موت کی تمنا کر کے دکھلا دو ۔ تو جب صورتِ حال یہ ہے کہ تجلیات خداوندی مکمل طور پر آخرت ہی پر موقوف ہیں ۔ اس کے عاشقان صادق ہر لحظہ موت کے مشتاق ہیں ۔ اور ہر گھڑی مرنے کی تمنّا کرتے ہیں ۔ اس جہان کی تمام کیفیات کو تو ہم نے دیکھ ہی لیا اور چونکہ ہمارا عنایاتِ الٰہیہ سے سرشار ترم و نازک مزاج اور ہماری عالی ہمتی اس دنیاوی چون وچند کے گورکھ دھندوں میں نہ پھنسی ۔ بلکہ عالمِ بالا کا اشتیاق اور اُس محبوب بلند و بالا سے بغلگیر ہونے کا شوق اور بھی بڑھ گیا ہے ۔ مگر ہر کام تو اپنے مقررہ وقت پر ہی ہوگا ۔ ترجمہ رباعی سوائے دردِ دُنیا میں چار و ناچار جینا ہی پڑے گا ۔ زندگی جتنی بھی دراز ہوگی گراں گزرے گی ۔ مگر اپنی مراد کے مطابق اگر موت میسر نہیں تو پھر کچھ عرصہ دوسروں کی مُراد کے مُطابق جینے کی تمنا کرو ۔ موت کی اس تمنّا کو ایسی آرزو نہ سمجھا جائے جیسے کہ غافل لوگ دُنیاوی سختیوں اور مکروہات سے تنگ آ کر موت کی آرزو کرتے ہیں ۔ یہ تمنّا تو اشتیاق و شوق ملاقات کے لیے ہے ۔ اور موت دوست کو دوست سے ملا دینے والے پُل کا کام دیتی ہے ۔ اور قرآن شریف میں بھی اس امر کی تمنّا کا ذکر آیا ہے جہاں اسے راستی سے مشروط کیا گیا ہے کہ یہ تمنّا عاشقانِ صادق ہی کر سکتے ہیں ۔ لہٰذا رباعی کا مطلب یوں ہُوا کہ اجل کے آنے تک شاد باید زیستن ناشاد باید زیستن ، تب تک اِدھر ہی رہنا پڑے گا ہر چند کہ اُس پاک مرتبے کے وفورِ شوق کی وجہ سے اس مادی دُنیا کے بندھن روح انسانی پر گراں گزرتے ہیں ۔ کیونکہ اپنی استعداد کے مطابق یہاں تو خدا کے فضل سے ہم نے اپنا مقدر حاصل کر ہی لیا ۔ اب یہاں مزید پڑے رہنا بے کار ہے ۔ اور گو کہ مزید آراستگی کے مانع ہے ، لیکن اگر خدا کی رضا یہی ہے کہ ہمیں کچھ عرصہ دوسرے عزیزوں کی خاطر مزید زندہ رکھے اور ان کے کاموں کی تکمیل کے لیے چندے اور اس دُنیا میں قیام کریں تو ہم راضی برضا ہیں ۔

هوالنّاصح

شروع اللہ کے نام سے جو نہایت مہربان اور بہت رحم والا ہے

ہر قسم کی تعریف اللہ کے لیے ہے، یہ کہ رہنمائی کی ہے عارفوں نے اس کی ذات کی معرفت کو جاننے سے عاجز ہونے کی طرف اور تمام بیان کرنے والوں نے اس کی صفات کی کُنہ کے ادراک سے عاجزی ظاہر کی ہے اور درود و سلام ہو اس کے رسول محمدؐ صلعم پر جو اس کی مخلوقات میں بہترین ہیں اور آپؐ کی آل پر اور آپؐ کے اصحاب پر جو کہ متصف ہیں اس کے کمالات سے۔ اما بعد یہ تیسواں[30] باب ہے جو قول سدید (درست قول) کے نام سے موسوم ہے۔ قول وہ مرکب لفظ ہے جو زبان سے ادا کیے گئے قضیہ ملفوظہ میں، یا وہ سمجھ میں آنے والا عقلی مرکب ہے قضیہ معقولہ میں۔ پس جب ہوتا ہے قول مرکب اپنے نفس میں برابر ہے کہ وہ ملفوظاً ہو یا معقولاً۔ تو وہ مناسب نہیں ہوتا تفصیلی ماہیت کے بیان میں اور ذاتِ مجردہ کے لیے اور خالص حقیقت کے لیے اس حیثیت سے کہ وہ وہ ہے اسی لیے عبارات مددگار نہیں ہوتیں اس کے بیان میں۔ پس قول نہیں ہوتا مگر یہ معاملے کی تفصیل معلوم ہوتی ہے۔ اور علم جو ہے نہیں پا سکتا ذات کو بغیر اضافت کے اور وہ اس سے متعلق ہوتا ہے کسی ایک اعتبار سے یا زیادہ اعتبارات سے۔ اس حالت میں معلوم چیز اپنے نفس میں ذات و اعتبار کے لحاظ سے مرکب ہوتی ہے، اور قول جو اس کی تفصیل ہے وہ بھی البتہ مرکب ہوتا ہے۔ پس قول سدید مرتبۂ ذات میں اعتراف ہے ادراک کے عاجز ہونے کا ان لوگوں کے لیے جو چاہتے ہیں اُس کا بیان۔ پس

اُنھیں اعتراف کر لینا چاہیے ادراک کی عاجزی کا اور اُنھیں کہنا چاہیے سیدھا سیدھا قول۔

کُنہہ (تہ) کے ادراک کے عجز کا بیان

انسانی قوت ادراک میں اتنی اہلیت اور قابلیت نہیں کہ وہ اشیا کی ذات یا کُنہہ کو کما حقہ، دریافت کر سکے۔ اس سلسلے میں دریافت یا سراغ لگانے کا کمال اسی میں ہے کہ اپنے عجز و شکست کا اعتراف کرے۔ اور جو کچھ دریافت کر پائے وہ بھی اس کے اوصاف سے ہے۔ کیونکہ اس شے کے اوصاف میں بھی اس ذات کے ظہور کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوتا۔ انسانی علم و دانش اسی قدر دریافت پہ مطمئن ہو جاتے ہیں۔ وہ اپنی ذات سے بھی کما حقہ، آگہی نہیں رکھتا۔ اضافی عقل و دانش کا منتہی یہی اعتراف نادانی ہے۔ اور اگر علم ذات کو دریافت کر لے تو پھر گویا ذات احاطۂ علم میں آگئی اور علم جو اس کی صفت ہے وہ اسی پہ محیط ہوگیا، اور یہ امر ناقابلِ تصوّر ہے۔ اور بعض عزیزانِ گرامی اس موضوع بحث پہ اپنی حد سے بڑھ کر اور ادب کی حدود کو پھلانگ کر یہ کہتے ہیں کہ حقِ تعالیٰ کے علم اور اُس کی ذات میں بھی یہی شبہ ہے کہ اگر اُسے دریافت کر لیا جائے تو ذات پر علم کے محیط ہونے کی قباحت لازم آتی ہے وگرنہ پھر اس کے حضور میں اپنی جہالت ثابت ہوتی ہے۔ یہ بیان ان عزیزوں کے توہمات ہی کا نتیجہ ہے اور حقیقت سے ان کی ناآشنائی کی بنا پر ہے کہ وہ اس کی ذات اور صفات کو اپنی ذات و صفات کی طرح سمجھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان سے بہت بلند و بالا ہے۔ وہ عظیم ہے، وہ بہت بڑا ہے، اللہ جل شانہ' کی ذات و صفات میں ایسی غیریت (اجنبیت) نہیں کہ ایک کو احاطہ کرنے والی اور دوسری کو گھیرنے میں آنے والی کہا جائے۔ اور ان پر موہوم امتیازات کا اطلاق کیا جائے، اور نہ ہی ان میں ایسی یک رنگی ہے جیسی کہ اُن کے ذہنوں میں ہے۔ اور صفات کی نفی پر جا ختم ہوتی ہے۔ غور کیجیے کہ اس سلسلۂ دریافت میں اپنے عجز کا اعتراف کر لینا بھلا ہے۔ یا حق تعالیٰ کے سلسلے میں شبہات کا بڑھانا بھلا۔ جب ہمیں اشیا ہی کی ماہیت کا پتہ نہیں چلتا تو حق تعالیٰ کی ذات و صفات کی کنہہ بھلا کیسے سمجھ میں آئے گی۔ **ترجمہ رباعی** اگرچہ واجب الوجود نے سینکڑوں جلوؤں میں اپنی نمائش کی ہے۔ لیکن جب آنکھ اُٹھا کر دیکھا تو سوائے حیرت کے اور کچھ نہ ملا۔ اور جو کچھ انکشاف ہوا اس کے متعلق پتہ نہ چلا کہ کس نے یہ انکشاف کیا، کس پہ کیا، اور کیا

انکشاف کیا۔ مصنف نے رباعی کی خود وضاحت یوں کی ہے۔ اگرچہ ہر مرتبے میں اس حضرت وجود کے ظہور کے سوا اور کچھ نہیں، اور موجودات کے سارے مراتب میں، گوناگوں تجلیات اسی کے نورِ بسیط کا جلوہ کارفرما ہے۔ لیکن علم و دانش کی آنکھ کھولی تو حیرت کے سوا اور کچھ ہاتھ نہ آیا۔ سوچ بچار سے بھی حیرت اور بڑھی اور یہ سمجھ آئی کہ کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ ع معلوم شد کہ ہیچ معلوم نشد۔ اس حقیقت وحدت کے انکشاف میں کشف، کاشف اور مکشوف کے سارے مراتب ہماری نظر سے اوجھل ہوگئے اور اُس ذات لاتعین کے آفتاب عالمگیر کی روشنی میں تعینات کے سارے ستارے چھپ گئے میرے رب زیادہ کر مجھے حیرانگی کے لحاظ سے اپنے بارے میں۔ جس طرح ظاہری آنکھ کو حسی مبصرات کے دیکھنے سے روک لیتا ہے، اور حیرت کی ماری آنکھ کچھ دیکھ نہیں پاتی۔ اسی طرح مشاہدے کے عالم میں وہ حالت چشم بصیرت کو علمی اعتبارات کے دیکھنے سے محروم کردیتی ہے۔ چونکہ مشہود و مشاہدہ بھی اعتبارات ہی میں سے ہیں تو اُس بات کا امتیاز بھی باقی نہیں رہ جاتا، اور فنائے کامل حاصل ہوجاتی ہے جو سعادتمندیوں کی معراج ہے۔ اس سے یہ نہ سمجھ لینا چاہیے کہ مشاہدے کے امتیاز کا یہ فقدان غافل لوگوں کے شہود سے غفلت کی مانند ہے بلکہ اس مقام پر تو عارف ذات کو بقا باللہ کے شرف سے مشرف کیا جاتا ہے اور عین مشاہدے میں حیرت عطا کی جاتی ہے۔ بقول مولانا روم رح یہ وہ مقام حیرت نہیں کہ حیران ہونے والے کی اس کی طرف پشت ہو۔ بلکہ یہاں تو حیران ہونے والا اُس کے روبرو ہے۔ پس یہاں مزید حیرت کی طلب کا مطلب اس ذاتِ لاتعین سے مزید نسبت کی قوت کی طلب ہے اور اس حدیث شریف کے مطابق کہ اے اللہ میری حیرت اور حیرانی کو اور بڑھا۔ ہجر کے ماروں کی حیرانی اور شے ہے اور عین وصال والوں کی حیرانی کچھ اور شے ہے۔ جب تک اس مقام پر پہنچو نہ تم اسے نہیں سمجھ سکتے۔ ہر چند کہ علم کا آئینہ جو حضرت وجود کی شاہراہ ہے۔ اس نے مختلف النوع متفرقات کے ذریعے چہرے سے پردہ اُٹھا رکھا ہے، اور اعتباری اشارات کی انگلیوں سے مرتبۂ ذات کی طرف اشارہ کر رکھا ہے جو مرجع موجودات ہے۔ لیکن کسی چیز کی ماہیت جیسی کہ وہ ہے کسی کی سمجھ میں نہ آئی۔ اور قوت ادراک کو گریبان عجز کی طرف سر جھکائے بغیر نہ بن پڑی۔ یعنی ہر چند کہ علم کا آئینہ جو ہستی کے ظہور کا مقام اور اُس کے مراتب کا انکشاف کرنے والا ہے۔ اس مرتبے کی کثیر التعداد انواع واقسام سے اُسے ظاہر کر رہا ہے اور حقیقت کے چہرے سے حجاب اُٹھائے ہوئے ہے۔ اور ان اعتباری اشارات سے ادھر ہی کو

اشارہ کر رہا ہے جو ذات کہ سب کی مشاراً الیہ ہے، لیکن کسی چیز کی ماہیت کا کماحقہٗ پتہ نہ چل سکا۔
اور انسانی عقل و ادراک کو عجز و نیاز کے گریبان میں جھانکنے کے سوا اور کچھ نہ ملا تو پھر اس ذات
واجب الوجود کی کنہہ جو تمام مراتب سے اعلیٰ و ارفع ہے کے ادراک کا کیا امکان؟ ہم نے نہیں پہچانا تجھے
تیری پہچان کے حق کے ساتھ۔ سبحان اللہ وہ مرتبۂ ذات کہ جس کا کسی طرح ادراک کیا ہی نہیں جا سکتا۔ وہ
حاضر و روبرو بھی ہے اور تمام نسبتوں سے منسوب ہونے والی ذات بھی اس کے سوا اور کوئی نہیں، جیسے
کہ نفی اضافات کا مقام بھی اسی کی ذات ہے۔ لہذا حضور پاک صلعم نے اس حدیث شریف میں واضح
طور پر معرفتِ حق سے عجز کا اعتراف فرمالیا۔ کہ اے خدا ہم تیری پہچان کا حق پوری طرح ادا نہ کر سکے۔
یعنی باوجود اس کے کہ انسانی عقل و دانش اس کے ادراک سے قاصر ہے لیکن جو تخاطب بھی ہے! تجھی
سے ہے۔ اور تو ہی حاضر و ناظر بھی ہے اور اُس سے اگر قطعی اور نایافت منظور ہوتی تو حضور پاکؐ یوں
فرماتے کہ ہم اسے نہیں پہچان سکے کماحقہٗ۔ پس شہود و دریافت کے کمال کے باوجود حق معرفت کی دریافت
کا عجز ہے، نہ کہ دعویٰ معرفت کے عجز کا۔ کیونکہ حق معرفت تو ذات کی تہ کا ادراک ہے اور وہ امر محال۔
پس اپنی دریافت کے عجز کا اعتراف بھی کمال ہے۔ حاصل مطلب یہ کہ مراتب کی ان تمام تفصیلات
کے انکشاف کے باوجود انجام کار حیرت ہی حیرت ہے۔ اور معرفت کا ماحصل بندگی کا اعتراف عجز، کیونکہ
یافت تو مرتبۂ صفات سے متعلق ہے۔ مگر معلومات کی انتہا سے لاعلمی اور اشیا کی ذات کا ادراک تو
حق تعالیٰ ہی سے مخصوص ہے کہ یہ سب اسی کی ہستی کا شعور دلاتے ہیں۔ خدا نے اُنھیں قرآن شریف میں
ملکوت الاشیا (یعنی اشیا کی سلطنت) سے تعبیر کیا ہے۔ جیسے کہ اس آیتِ کریمہ میں ہے کہ پاک
ہے وہ ذات جس کے ہاتھ میں ہر چیز کا پورا اختیار ہے اور تم سب کو اسی کے پاس لوٹ کر جانا ہے۔
پس بندوں کو اشیا کی ذات کی کنہہ (تہ) کی دریافت میسر نہیں ہوتی۔ پھر اس ذات کا علم کیسے حاصل ہو۔
جس نے ان تمام چیزوں کو وجود بخشا ہے۔ اور سب اسی کے احاطۂ وجود میں موجود ہیں۔ لہذا ابوالحسن اشعری
کے نزدیک تمام ماہیات کا وضعی لحاظ سے تو ادراک ہو سکتا ہے، کنہہ کے لحاظ سے نہیں۔ ان کی کنہہ کا
علم فقط اللہ جل شانہٗ کو ہے اور بس۔ ابوالحسن اشعری متکلمین میں سے ہے اور اُس کے نزدیک ہر
ہر حقیقت کی دریافت اس کے وصف سے ہو سکتی ہے۔ وجہ وصف ہی کو کہتے ہیں کنہہ کو نہیں۔ کُنہہ
سے مراد ذات ہے اور اس کا علم سوائے خدا کے کسی کو نہیں، کیونکہ اس کا علم اس کی عین ذات ہے۔

پس ذات کا علم اور ذات علم اسی کو حاصل ہیں ۔ اس کا علم عین اس کی ذات ہے ۔ اور انسان جس کا علم اک لاحقہ ہے وہ علم کی حقیقت کو کیونکر پا سکتا ہے ۔ یہ انسان بے چارہ جسے قرآن نے ظالم و جاہل (بے علم) کہا ہے ، کہاں تک اپنی جہالت کے گڑھے سے باہر نکلے ۔ اور اتنا علم حاصل کرے ۔ اس کی تو سرشت اور خمیر ہی نادانی اور بے علمی سے ہے ۔ کیا اُس کے حق میں قرآن میں ظلوماً جہولا نہیں کہا گیا ، پھر یہ اپنی اس فطری بے علمی سے کہاں تک باہر آئے اور علم حاصل کرے ۔ امکانی حقائق تو بذاتہٖ علامات ہیں ، اور عدم سراسر نامعلوم ۔ **ترجمہ رباعی** ہم خواہ کتنے ہی عارف کیوں نہ ہوں فطری طور پر بے علم و نادان ہیں ۔ خواہ کتنے ہی لمبے چوڑے علوم کیوں نہ پڑھ جائیں ہنوز طفلِ مکتب ہی ہیں ۔ ہم سے آگے دوسری بات نہ پوچھے گا ۔ ہم سب کچھ جانتے ہیں ، ہمیں پتہ ہے یعنی اپنے مبلغِ علم کا !! مصنف کی اپنی مزید توضیح یوں ہے کہ آدمی خواہ کتنا ہی صاحبِ عرفان کیوں نہ ہو نادان و بے علم ہوتا ہے ۔ اور اُس کی یہی نادانی عدم و وجود کے اختلاف کے سبب سے علم کی آئینہ داری کر کے اس کے ظہور کا باعث بنی ، اور اسے اس کلّی و جزئی علم والی امانت کے بوجھ کا حامل بنا دیا ۔ انسان میں بچوں کی سی فطری لاعلمی و نادانی ہوتی ہے ۔ وہ خواہ کتنا کچھ ہی کیوں نہ پڑھ جائے اور کتنے مروجہ علوم و فنون سیکھ کر کتنی ہی زیادہ معلومات اور فصاحت و بلاغت فراہم کیوں نہ کر لے تب بھی اگلی بات یعنی اشیا کی ذات کے اعتباری اوصاف کے سوا اُسے کچھ نہ پوچھنا چاہیے کیونکہ عارف کو اپنے مبلغ علم کا پتا ہوتا ہے ، اور حقیقتِ حال کو اللہ ہی بہتر جانتا ہے ۔

هوالنّاصر

شروع اللہ کے نام سے جو نہایت مہربان اور بہت رحم والا ہے

ہر قسم کی تعریف اللہ کے لیے ہے جس نے ہمیں دکھایا، جو کچھ کہ دکھایا اور ہمارے لیے واضح کیا، جو کچھ کہ واضح کیا، اور درود و سلام ہو اُس کے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر جو ہمارے سیّد اور آقا ہیں اور آپؐ کی آل اور اصحاب پر جو اللہ کے فضل اور اس کی رضامندی کے آرزومند ہیں۔ امابعد یہ اکتیسواں[۳۱] باب ہے جس کا نام عبرت اولی الابصار (آنکھوں والوں کے لیے عبرت) ہے۔ پس عبرت حاصل کرو اے آنکھوں والو، کیونکہ تم مشاہدہ کرتے ہو اپنی فنا اور بنی نوع انسان فنا کا حالات کے تغیر اور کیفیات کے تبدل سے، بچپنے، جوانی، بڑھاپے، موت اور حیات وغیرہ میں سے احوال متغیرہ جنھیں اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا تاکہ تمھیں آزمائے کہ تم میں سے کون اچھا عمل کرنے والا ہے۔ پس عبرت یا تو حاصل ہوتی ہے ناپسندیدہ امور کے وجود سے جیسے شدائد عقوبات، اور یا نہ میسر ہونے سے طبیعت سے مناسبت رکھنے والے امور نعمتیں اور دوسری مشتہیات (بھوک) پہلی عبرت جو ہے وہ ہے عبرت ہربیہ جسے تلھفیہ سے موسوم کیا گیا ہے۔ اور یہ زیادہ تاثیر والی ہوتی ہے۔ ایک بزدل کے دل میں، اور دوسری عبرت میلیہ (میلان والی) جو تاسیفیہ کے نام سے موسوم ہے۔ یہ زیادہ قوی ہوتی ہے تاثیر کے لحاظ سے ایک لالچی کے دل میں، اور اُس کے لیے جو بلند نفس والا ہوتا ہے اور بزدل نہیں ہوتا اور وہ شخص جو صاحب نفس عالیہ ہوتا ہے، اور بزدل اور لالچی نہیں ہوتا، حاصل ہوتی ہے اُسے

عبرت حقیقت کے دیکھنے سے۔ اس حالت میں جس میں وہ ہوتی ہے۔ نہ کہ ان اعراض نفسیۂ مذکورہ سے، بلکہ اس کی عبرت خالصتہً اللہ کے لیے ہوتی ہے۔ اُس کے نفس کے تقدس اور اس کی ذات کے تقیدات اور اعتبارات کی برائیوں سے منزہ ہونے کے ساتھ، اور طبیعت کے لحاظ سے وہ اولی الابصار کے زمرے سے ہوتی ہے۔ اور وہ لوگ جنھوں نے نہیں دیکھی ہوتی کوئی چیز، مگر یہ کہ دیکھی ہوتی ہے اللہ نے اور اُس کے پہلے اُس کے ساتھ اور اُس کے اندر اور اُس کے بعد اور کھول دیا اللہ نے ہم سے ہمارا پردہ اور بنادی ہے ہماری نگاہ آج کے دن بہت تیز۔

عالم اور اہلِ عالم کی کیفیت کے بیان کا باب

کیفیت مشتمل ہے معقولاتِ عشر پر، یعنی ان دس باتوں پر جو ممکن میں پائی جاتی ہیں۔ لہذا عالم کی کیفیت کا بیان عالم کی عرضیت کا بیان ہے نہ کہ جوہریت کا۔ کیونکہ دُنیا میں فنا و زوال انہی عرضی اعتبارات سے لاحق ہے۔ کیونکہ ان اعراض کے وجود کی ہر لحظہ تجدید ہوتی رہتی ہے۔ اسی لیے عارفوں نے اس عالم کو اعراض کا مجموعہ کہا ہے، وگرنہ جوہریت جو تعینات کی تمام صورتوں میں موجود اور اور دُنیا کے قیام کا سبب ہے کبھی نیست و نابود نہیں ہوتی۔ اور نہ ہی فنا کا اُدھر سے گزر تک ہوتا ہے اور وہ ذات واجب الوجود ساری موجودات میں جلوہ گر ہے۔ اور وجود پر عدم کا اثر انداز ہونا محال ہے کیونکہ دو متضاد چیزیں یکجا نہیں ہو سکتیں۔ مثلاً لکڑی کو جلائیں تو وہ کوئلوں کی شکل اختیار کر لیتی ہے مگر لکڑی کی شکل فنا ہو جاتی ہے، اور کوئلہ جل کر راکھ ہو جائے تو اس کی نوعی صورت پر فنا طاری ہو جاتی ہے اور اصل جسمیت اس کی اپنی ذات میں باقی رہتی ہے۔ اس تحریر سے ہماری مراد عالم کی کہنگی یا ہمیشگی سے نہیں بلکہ فنائے عالم کے حاصل سے ہے جو نوعی صورت کے بمنزلہ ہے یا مرتبۂ وجود کی بقا سے ہے جو ان مظاہر میں ظاہر ہے اور بمنزلہ جسمیت کے ہے، اور اس بیان سے ہمارا یہ مقصود بھی نہیں کہ حق جل شانہٗ کا وجود فقط انہی ممکنہ موجودات کے افراد کے طبیعی وجود کی طرح ہے۔ نہیں اللہ تعالیٰ ایسی چیزوں سے بہت بلند و بالا ہے۔ ذات الوجود یعنی حق تعالیٰ کا وجود تو واجب الوجود ہے، اور وہ موجود یا قائم بالذات ہے اور حقائق ممکنہ بالکل الگ اور معدومی حیثیت رکھتے ہیں۔ بلکہ یہاں ہمارا مقصد تو صرف حضرت وجود کی بقا کا دکھانا ہے جو مظاہر کے مختلف آئینوں میں ہر وقت اور ہر حال میں ظہور پذیر ہے۔ اور

ان اعتباری مراتب کے فنا و زوال کی مثال کو اس آیت کریمہ میں دیکھیے کہ جو کچھ تمھارے پاس ہے وہ ختم ہو جائے گا ، اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ دائم رہے گا ۔ لہٰذا عالم اور اہل عالم معرض زوال و ہلاکت میں ہیں ، اور باقی رہنے والی ذات فقط خداوند تعالیٰ کی ہے ۔ یاد رہے کہ عالم سے مراد کائنات کی مجموعی و نوعی حیثیت سے ہے ، اور اہلِ عالم سے مراد جزئی اعتبار سے افراد کی اس نوعی حیثیت سے ہے ۔ لہٰذا اس باب میں انہی دو حیثیتوں کی کیفیت کا بیان ہے ۔ اگرچہ اہلِ عالم (عالمیان) کے لفظ میں تمام امکانی موجودات شامل ہیں ۔ اور اصل کے لحاظ سے دُنیا و مافیہا کی معقولات ، لیکن زیادہ تر اس کا استعمال ذی روحوں پر ہوتا ہے ۔ سو یہاں بھی اس لفظ عالیان سے ہمارا مطلب انسانی افراد ہیں ۔ کیونکہ بات بنی نوع انسان کی ہو رہی ہے ۔ بلکہ ہمارا تخاطب ان میں سے بھی کامل اور صاحب شرف انسانوں سے ہے ۔

ترجمہ رباعی اے درد اگر تمھیں اس بزم دُنیا کی اصل خبر ہوتی تو تُو اِدھر اُدھر کاہے کو جھانکتا پھرتا ۔ یہاں تو شمع کی طرح اپنے آپ کو دیکھ ۔ اس کی طرح اگرچہ تو بھی اپنی جگہ پر قائم ہے مگر جس طرح وہ پگھلتی جا رہی ہے تو بھی رو بہ زوال ہے ۔ مصنف خود رباعی کی تلمیحاتی کڑیاں یوں کھولتا ہے ، کہ چونکہ بات جملہ افراد کائنات کی ہو رہی ہے ۔ لہٰذا حرف ندا کا منادیٰ خود کو بنایا ۔ اور گو بظاہر اپنا تخلص استعمال کیا مگر حقیقت میں مراد حقیقت انسانیہ سے ہے جو تمام بنی نوع انسان پر مشتمل ہے ۔ اور انسان ایک دوسرے سے بمنزلہ نفس واحدہ کے ہیں ، کیونکہ ان سب کی حقیقت ایک ہی ہے ۔ اسی لیے تو اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں فرمایا ہے کہ جو شخص بلا معاوضہ دوسرے شخص کے یا بدون کسی فساد کے قتل کر ڈالے تو گویا اس نے تمام آدمیوں کو قتل کر ڈالا ۔ اور وہ شخص جو کسی شخص کو بچالے تو گویا اس نے تمام آدمیوں کو بچا لیا ۔ دراصل قتل کا مطلب یہاں امانت نفس کو غفلت میں یا پس پشت ڈال دینا ہے ۔ اور احیاء یا بچانے سے مطلب یہاں نفس کو آگاہ کرنا اور کار ہائے خیر میں مشغول رکھنا ہے ۔ لہٰذا جس نے غفلت برتی اور بے کار رہا تو گویا اس نے سبھی لوگوں کو غفلت اور کوتاہی میں ڈال دیا ۔ اُسے سب غافل اور بے کار ہی نظر آئیں گے ، کیونکہ آدمی اپنے نفس پر قیاس کرتا ہے ۔ اور جس نے اپنے آپ کو تنبیہہ کی اور آگاہ بنایا اور ہمیشہ رہنے والے کار ہائے خیر میں خود کو مشغول رکھا ، گویا اُس نے سب کو آگاہ اور صالح بنا دیا ۔ اُسے سبھی لوگ آگاہ اور صالح ہی نظر آئیں گے ۔ جیسا کہ اس آیت کریمہ میں ہے کہ کوئی چیز ایسی نہیں جو تعریف کے ساتھ اس کی پاکی قالاً یا حالاً بیان نہ کرتی ہو ۔ قصہ کوتاہ

یہ کہ اس لفظ سے ہماری مراد عالم امکان کی یہ بزم اور سارا جہان ہے ۔ اور باخبر بودن سے مراد ہے
عرفان و معرفت حاصل کرنا ۔ اور بیہودہ دیکھنے سے ہمارا مطلب خود کو غفلت میں ڈال دینا ہے ۔
ہر طرف سے مراد چاروں کھونٹ اور کثیر التعداد امکانی جوانب سے ہے ۔ بر خموش چشم کشودن سے مراد
روحانی سیر کرنے اور اپنے احوال سے متوجہ ہونے سے ہے ۔ اور شمع کی ایستادگی سے مُراد بقائے موہوم
جو اس وقت تو سب میں دیکھی جا رہی ہے ۔ گذشتن سے ہماری مراد وہ فنا و زوال ہے جو ہر لحظہ ان فانی
موجودات کو لاحق ہے ۔ اور حاصل مطلب یہ ہوا ۔ اگر تو نے عالم امکان کی کیفیت سے آگاہی اور معرفت
حاصل کر لی ہے تو پھر اِدھر اُدھر غفلت سے کاہے کو دیکھتا ہے ۔ اور آفاق کی اس کثرت کی تشویش سے
کیوں پریشان حال ہو رہے ہو ۔ شمع کی طرح خود کو دیکھ اور اپنے باطن کی سیر کر تو پتہ چلے کہ گو بظاہر تو قائم
ہے ، یعنی یہ بقائے موہوم تجھے حاصل ہے ، لیکن ہر آن اور ہر لحظہ تو مائل بہ فنا و زوال ہے ۔ اور اسی
عالمِ فنا سے اس عالمِ بقا کی طرف بڑھ رہا ہے ۔ شمع کی اس مثال میں کئی محاسن ہیں ۔ جیسے اس کا ہر طرف
دیکھنا خود بہ آنکھ کھولنا ، بظاہر اس کی ایستادگی اور قیام اور پھر ہر لحظہ اس کا پگھلنا اور گھٹتے جانا سب
کچھ ظاہر اور پُر لطف ہے ۔ اسی کو ہم دوسری مثال سے بھی دکھا سکتے ہیں کہ اگرچہ باغِ عالم کی بہار جیسی تھی
ویسی ہی ہے ۔ لیکن تیری ترو تازگی کا موسم ہمیشہ مائل بہ خزاں ہے ۔ اس باغِ عالم کی بہار یعنی نوع عالم
کا ظہور جیسے تھا ویسا ہی ہے اور رہے گا ، لیکن اس باغ کے پھولوں کی تازگی کا موسم (مراد افراد نوعِ
دُنیا) ہمیشہ مائل بہ خزاں ہے ۔ اور ہر موجود کو فنا و زوال لاحق ہے ۔ **تحقیق** یہ سمجھ لینا چاہیے کہ بنی نوع
عالم یعنی یہ مخلوق جو ماضی ، حال اور مستقبل کی مخلوقات پر مشتمل ہے ، اس خالق قدیم کی مظہر ہے جس کی
سلطنت (بادشاہت) قدیم بھی ہے اور لازوال بھی ۔ ورنہ ذات جل جلالہٗ میں خالقیت کی صفت کے
حادث ہونے کا لزوم آئے گا ۔ اس سلسلے میں سعدیؔ نے خوب کہا ہے کہ کبریائی ، عظمت اور بڑائی کا سزاوار
وہی شہنشاہ حقیقی ہے کہ جس کی بادشاہت قدیم بھی ہے اور لازوال بھی ۔ اور ہمارے جملہ عقاید میں یہ
عقیدہ بھی ہے کہ کوئی حادث چیز قائم بالذات نہیں ہوتی ۔ یعنی کہ تیری صفت خدا تعالیٰ میں نہیں ہو سکتی ،
صفات بھی قدیم ہیں ۔ لہٰذا جس طرح اس کی ذات کا قدیم ہونا واجب ہے ۔ اس کی صفات کا قدیم ہونا بھی
لازمی ہوگا ، اور اس طرح صفات کی قدامت میں صفات کے ظہورات کی قدامت بھی ضروری ہے ورنہ
تعطّل لازم ہو جائے گا اور اہلِ اسلام کو عالم کے قدیم کہنے میں اس طریق سے قباحت ہے جس طرح کہ

فلسفی قدیم کہتے ہیں۔ اور ان آسمانوں، ستاروں اور دیگر ایسی اشیا کو جنھیں حق تعالیٰ نے صراحتاً حادث کہا ہے، اور ان کے احوال کے تغیر و تبدل کی خبر بھی دی ہے۔ وہ اسے لازوال گنتے ہیں۔ مگر یہ مسلک نبوت کے مسلک کے خلاف ہے، وگرنہ قطعی فنا اور کلی طور پر نیست و نابود ہونا تو قرآن مجید اور احادیث نبوی سے بھی ثابت نہیں ہوتا۔ جیساکہ خود خدا تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین کے متعلق یوں فرمایا ہے کہ اس (اللہ) کی وہ شان ہے کہ ساری زمین اس کی مٹھی میں ہوگی قیامت کے دن، اور تمام آسمان لپٹے ہوں گے اس کے داہنے ہاتھ میں۔ پہاڑوں کے سلسلے میں خدا کا فرمان ہے کہ پہاڑ دھنکی ہوئی رنگین روئی کی طرح ہو جائیں گے۔ (متفرق ہو کر اڑتے پھریں گے) اور زمین کے بارے میں خدا نے یہ فرمایا، کہ جس دن دوسری زمین بدل دی جائے گی اس زمین کے علاوہ، اور آسمان بھی اور سب کے سب زیر دست اللہ کے روبرو پیش ہوں گے۔ اور سورج کے متعلق فرمانِ خداوندی ہے، کہ سورج بے نور ہو جائے گا۔ اور ستاروں کے حق میں فرمایا کہ ستارے ٹوٹ پھوٹ کر گر پڑیں گے اور علیٰ ہذا القیاس۔ دیگر خبریں بھی دُنیا کے احوال کے تغیرؔ و تبدل کے بارے میں ہیں نہ کہ ان کی مکمل نیستی اور فنا کی۔ اور ہمارے عقائد میں یہ بھی شامل ہے کہ بہشت و دوزخ وہاں موجود ہوں گے۔ باقی ہیں انھیں فنا نہیں۔ نہ ہی ان کے مکینوں کو فنا ہے۔ اور احادیثِ نبویؐ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس فانی مخلوقات کی تخلیق سے پہلے دیگر موجودات بھی تھیں۔ جیساکہ اس آیت کریمہ میں ہے کہ اس وقت اس کا عرش پانی پر تھا۔ اور اس آیت کے معانی سے کہ اللہ تھا اور باقی کوئی قابل ذکر شے نہ تھی، یہ مراد نہیں کہ کوئی چیز تھی ہی نہیں اور صرف حق تعالیٰ تھا تن تنہا، اور اپنی صفات کے ظہور سے بھی بے کار اور معطّل، اور ابھی کچھ مدّت سے وحدت سے کثرت بنی اور وہ کاروبار میں مشغول ہو گیا اور مصروفِ کار ہے۔ اور پھر بھی کسی زمانے میں ویسا ہی ہو جائے گا۔ یوں نہیں بلکہ اس کے معنی یوں ہیں کہ کوئی شے ہستیٔ حق تعالیٰ کی شریک نہ تھی، نہ ہے، اور نہ ہوگی۔ اور یہ لفظ "کان" اس آیت کریمہ والے معنوں میں مستعمل ہے کہ اللہ تعالیٰ دیکھنے والا اور سننے والا ہے۔ یعنی کہ دوامی حالت پر دلالت کرتا ہے۔ لہٰذا سبھی صوفیا نے یہ تشریح کی ہے کہ وہ جیسا تھا ویسا ہے۔ اور حدیث شریف میں جو الفاظ اس سلسلے میں آئے ہیں وہ اشیا کی ذاتی قدرت کی نفی اور ان کے ذاتی حدوث کا اثبات کرتے ہیں اور عرش و کرسی کے لیے کسی جگہ سے حدوث زمانی ثابت نہیں ہوتا۔ اور ہو بھی کیسے سکتا ہے کہ زمانے کا تعلق اسی سے ہے۔ ایسی اشیا کا حدوث ہونا ذاتی لحاظ سے ہے، نہ کہ زمانی لحاظ سے، اور حادث

چیز وہ ہے جس پہ عدم سبقت لے جائے، اور اُسے حدوثِ زمانی کہتے ہیں اور کبھی اسے حدوث بالحاجتہ الغیر سے تعبیر کیا جاتا ہے، یعنی کہ (ایسا حدوث جو دوسرے کا محتاج ہوتا ہے) اور اسے حدوث ذاتی کہا جاتا ہے۔ اور تمام اشیا کا کلّی طور پہ حدوث زمانی آیاتِ قرآنی اور احادیث میں نہیں آیا۔ حدیث میں ہے کہ کچھ لوگ یمن سے آنحضرت صلعم کی خدمتِ اقدس میں آئے اور کہنے لگے کہ ہم اس لیے آئے ہیں کہ دین کا علم حاصل کریں۔ نیز آپؐ سے یہ پوچھنے آئے ہیں کہ اس سلسلۂ کائنات سے پہلے کیا تھا؟ حضور سرورِ کائناتؐ نے فرمایا کہ اللہ تھا، اس سے پہلے کوئی شے نہ تھی۔ اور اللہ کا عرش پانی پر تھا، پھر اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین کو بنایا۔ بہر حال جب تم نے خود اس مسلسل آنے جانے کو دیکھ لیا اور ہر لحظہ اپنی فنا و زوال کو بھی سمجھ لیا، تمھیں ساری خدائی کے ہونے نہ ہونے سے کیا سروکار، اور ہر مقید موجود کی پیدائش اُس قادرِ مطلق کے سامنے کس شمار میں۔ اپنی فکر کرو۔ اِدھر اُدھر مت دیکھو۔ اور اپنی فکر کرنے سے مُراد ہے کہ اپنی فنا اور نیستی کا سوچو اور حضرت وجود سے نسبت اور توسل پیدا کرو۔ پس اپنی جُزئی حیثیت پر نگاہ رکھنی چاہیے، اور ہر لحظہ اپنی فنا کا مشاہدہ کرنا چاہیے۔ اور دل کو کبھی مشاہدۂ ذات سے غافل نہ کرنا چاہیے۔ اور این و آں، یعنی حادث و قدیم اور فنا و بقا کے اعتباری گورکھ دھندوں میں پھنس کر نہ رہ جانا چاہیے۔ ہوا و ہوس کا سمندر موجزن ہے، اور زندگی کا پیمانہ لبریز۔ یہ ہوا و ہوس تو جب تک زندگی ہے اپنے ساتھ رہیں گے۔ اور اچانک موت آدھمکے گی۔ اس جسمانی موت کے آنے سے پہلے باطنی فنا کی کوشش کر، اور نفسانی خواہشات و لذات سے ہاتھ کھینچ لے۔ قبل اس کے کہ تو اس دُنیا سے اُٹھ جائے لالہ کی طرح اپنی بہار کا داغ بن کر رہ اور اس چمن کے کانٹوں سے اپنے دل کو مت خراش۔ یعنی اپنے امکانی داغ کے ہاتھ سے اپنی بہار میں جو عارضی اور قائم بالغیر ہے سراپا داغ بن کر رہ۔ ہمیشہ اپنی ذاتی کوتاہیوں پر نگاہ رکھو۔ جو کبھی تمھارا ساتھ نہیں چھوڑتیں۔ ہر چند کہ ممکن بھی واجب ہی کے نور کا مظہر اور خدا کا امانت دار ہے، لیکن پھر بھی امکانیت کی تاریکی اور سیاہی سے داغدار ہے، اور حبشی کا کالاپن کیسے دُور ہو سکتا ہے، وہ تو اس کا قدرتی رنگ ہے۔ لہٰذا اپنے نشو و نما کے شباب میں عشق، محبت الٰہیہ کا چرکہ پیدا کر، اور دُنیا کی ان طرح طرح کی رنگینیوں سے قطع تعلق کر لے۔ اور اپنے دل کے چہرے کو جو سدا بہار پھول اور حسنِ یار کا آئینہ ہے، ہوا و ہوس کے مقید معانی کے خس و خاشاک سے لہولہان نہ کر اور بہار و خزاں کی اعتباری شگفتگی اور افسردگی سے

فارغ دل رہ۔ باغ تو ویسے ہی لدا پھندا اور آباد ہے۔ لیکن موسم گل نہایت ہی مختصر اور بے بنیاد ہے۔ اگرچہ باغ کبھی بہار کے بغیر نہیں ہوتا لیکن گل و لالہ کی زندگی کا اعتبار نہیں، آفاق کی اسی کثرت میں نہ کھو جا۔ سرو و سمن کو چھوڑ کر روحانی سیر کے لیے آ۔ مقصود تو یہ ہے کہ اس مجموعۂ کائنات کو قیامِ عالم کے لحاظ سے مت دیکھ، اس سے تو اسی کی بقا اور قیام کا منظر آنکھوں میں بچا رہے گا۔ اور یوں دل کو ان فانی اشیا کی الفت کا اسیر بنا دے گا۔ اور پھر مرنے اور اس دُنیا سے کوچ کا تصور گراں گزرے گا۔ بلکہ جزئیات کی طرف دیکھ اور اپنی اور دوسری ہر چیز کی فنا کا مشاہدہ کرو، تاکہ دل اس دُنیا کے دلفریب عجائب و غرائب پر فریفتہ نہ ہونے پائے، اور مرنے سے پہلے ہی ان سب سے قطع تعلق ہو جائے تاکہ مرنے کے بعد نفس کی توجہ اِدھر ہونے ہی نہ پائے۔ کیونکہ اس آیت کریمہ میں کہ وہ سر جھکائے ہوں گے میں انہی لوگوں کی طرف اشارہ ہے جو پسِ مرگ بھی مادی دُنیا ہی کی طرف متوجہ ہوں گے۔ سو مرنے سے پہلے ہی اپنی ہستی کو مٹا دے۔ گزرنے والے ہر لحظہ میں باغِ عالم اپنے باغبان کی حمد و ثنا کر رہا ہے۔ اور اس کی قرآن پاک بھی یوں تصدیق فرماتا ہے کہ کوئی چیز ایسی نہیں جو تعریف کے ساتھ اس کی پاکی (حالاً یا قالاً) بیان نہ کرتی ہو۔ لیکن تم لوگ ان کی پاکی بیان کرنے کو سمجھتے نہیں۔ جب کوئی چیز خود کاشتہ نہیں، اور نہ ہی کوئی شے بذاتِ خود وجود رکھتی ہے۔ وجود میں آنے والی ہر حقیقت اسی صانع حقیقی کی مدح و ثنا پہ زبان کھولتی ہے۔
ترجمہ رباعی کونسی ایسی حقیقت ممکنہ ہے جسے وہ وجُود میں نہ لایا ہو۔ اور کونسا ایسا گوہر مفہوم و معانی ہے جسے اس کی قدرتِ ایجاد نے نہ پرو دیا ہو۔ یہ دُنیا تو اک عجیب پُرانی سرائے ہے۔ آخر وہ کونسا پھول ہے جو اس باغِ عالم میں کِھلا نہیں۔ مصنف کی اپنی تشریح کے مطابق کوئی حقیقتِ ممکنہ ایسی نہیں جسے حضرت واجب الوجود وجوب میں نہ لایا ہو۔ اور کوئی مفہوم ایسا نہیں جسے خالق کی قدرتِ ایجاد وجود میں نہ لائی ہو۔ یہ باغ عالم جو عالمِ امکان کے مجموعے سے عبارت ہے۔ عجیب پُرانی سرائے ہے اور کہنگی سے مراد نسبت زمانی ہے جو مشتمل ہے ماضی، حال اور مستقبل پہ۔ لہذا کونسا ایسا پھول ہوگا جو اس باغِ دُنیا میں نہ کِھلا اور یہاں ظہور پذیر نہ ہوا۔ موجودات کی قسمتیں لکھنے والا قلم خشک ہو چکا ہے۔

هوالناصر

شروع اللہ کے نام سے جو نہایت مہربان اور بڑا رحم والا ہے

ہر قسم کی تعریف اللہ کے لیے ہے۔ نہیں ہے کوئی معبود سوائے اس کے۔ اسمائے حسنیٰ اسی کے ہیں جن کی نہ تعداد گنی جا سکتی ہے، نہ ان کا احاطہ کیا جا سکتا ہے۔ تسبیح بیان کر رہی ہے اس کے لیے ہر وہ چیز جو آسمانوں اور زمین میں ہے۔ اور جو پاتال کے نیچے ہے۔ اور درود و سلام ہو اس کے رسول محمد صلعم پر اللہ تعالیٰ کے کل اسمائ کے عدد کے برابر اور نیز آپؐ کی آل پر اور اصحاب پر جو بزرگی والے اور بلندی والے ہیں۔ اما بعد پس یہ بتیسواں[۳۲] باب ہے جو تعلیم الاسمائ سے موسوم ہے۔ اسم ذات کا مرتبہ ہے صفت کے ساتھ جیسے علیم اور حکیم، یعنی ذات ہے جس کے لیے ہے علم اور حکمت جب کہ ثابت ہو جائے کشف، برہان نقل اور ایمان سے۔ بے شک وجود اپنے نفس میں خالص خیر ہے۔ پس ثابت ہوا کہ اس کی صفات جو کہ کمالات وجودیہ ہیں، وہ بھی خالص بھلائیاں ہیں، اور اس کے نام جو کہ متصف کرتا ہے اس کے نفس کو کمالات کے ساتھ وہ بھی حسنات ہیں۔ اور اسی کے ہیں اسمائے حسنیٰ۔ پس سکھلائے اللہ تعالیٰ نے آدمؑ کو وہ اسمائ بشمول اس کے وجود میں اور اس کی تخلیق میں، اس کی صورت کے اندر ہی۔ پس متصف کیا اللہ نے آدمؑ کو اپنی صفات کے ساتھ، اور اسے تخلیق کیا اپنے اخلاق کے ساتھ ظلّیہ تبیعہ کے ساتھ، اور وہ ہو گیا زندہ جاننے والا مرید (ارادہ کرنے والا) قادر، سمیع، بصیر، متکلّم، اظہار کرنے والا، جمع کرنے والا اس کے تمام اسمائ کو۔ پس سکھلائے اللہ تعالیٰ نے

اسمائے مطلقاً" اپنے اسمائے حسنیٰ میں سے اور اشیا کے ناموں میں سے سب کے سب کلیتہ" عقل کے ساتھ اور جزیتہ" حواس کے ساتھ۔ پس ہو گیا آدم جامع علم اجمالی کا اور تفصیلی کا۔ اور احاطہ کر لیا اس کے علم نے حق کی تعلیم کے ساتھ ان جملہ معانی میں سے تمام کا جو تفصیل کے لیے موزوں نہیں ہوتے۔ جیسے وحدت اور کلیّت کے معانی۔ کیونکہ وحدت۔ نہ تو اس کی تفصیل کی جا سکتی ہے، اور نہ وہ زیادہ ہوتی ہے، نہ وہ پھیلتی ہے اور ہوتی ہے اپنے حال میں ہی ہمیشہ اور کلیّت میں بھی اسی طرح۔ اور معانیٔ مفصّلہ میں سے جو اجمال کے لیے موزوں نہیں ہوتے، جیسے کثرت اور جزئیت کے معنی۔ یہ محمول نہیں کیے جا سکتے اور وہ وحدت کا مفہوم نہیں دیتے اور وہ ہمیشہ اپنی حالت ہی میں رہتے ہیں۔ کیونکہ کثرت جو ہے۔ یہ نہ محمول کی جا سکتی ہے، اور نہ اسے وحدت سمجھا جا سکتا ہے۔ اور یہ ہوتی ہے اپنے ہی حال میں ہمیشہ اور جزئیت بھی اسی طرح دلالت کرنے والی ہوتی ہے۔ وحدت، وحدت نہیں ہوتی، اور نہ کثرت، کثرت ہوتی ہے۔ اور نہ کلیّت، کلیّت ہوتی ہے، اور نہ جزئیت، جُزئیت ہوتی ہے اس کے ساتھ کہ بے شک نہیں فضیلت دی جاتی کثرت کو مگر وحدت کے ساتھ، اور نہیں تفصیل بیان کی جاتی جزئیت کی مگر کلیت کے ساتھ۔ پس وحدت کو فضیلت دی جاتی ہے کثرت سے، اور وحدت منفصل نہیں ہوتی کثرت کے ساتھ۔ اور کلیت بھی منشا ہے جزئیات کی تفصیل کا۔ اور جزئیات سے وہ مفصل نہیں ہوتا۔ اور کثرات کی وحدت اور وحدت کی کثرت، اور جزئیات کی کلیّت اور کلیات کی جزئیت معتبر نہیں ہیں۔ اس مقام پر کیونکہ ہم بحث کر رہے ہیں اس موقع پہ وحدت کے نفس پہ، اور کثرت کے نفس پر اور کلیّت کے نفس پہ اور جزئیت کے نفس پہ۔ پس جب پیدا کیا اللہ تعالیٰ نے آدمؑ کو اور بنایا اُسے صورت کے لحاظ سے جزئی اور حقیقت کے لحاظ سے کلّی، اور سکھلائے اُسے اسمائے کلّیہ اور جزئیہ میں سے سب کے سب۔ تعلیم چار شکلوں میں ہوتی ہے۔ تعلیم ایجادی، اور یہ ہوتی ہے فطرت کی ابتدا سے۔ ہر ذی علم کے اندر اس کی استعداد کی نسبت سے، اور اُس کی قابلیت کی نسبت سے تعلیم ایجادی کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف قوت علم کی تخلیق کے ساتھ۔ اور تعلیم القائیٔ جو حاصل ہوتی ہے عطیے کے ذریعے یا تو رُوح الامین کے واسطے سے، جیسے وحی کا نزول انبیائے کرامؑ پر یا شخصی رُوح کے واسطے سے، جیسے الہام کا القا اولیائے کرامؒ کے لیے، یا عقل کے واسطے سے، جیسے مطالب کا سمجھنا حکما کے لیے یا حواس کے ذریعے سے، جیسے معلومات آگاہی عوام کے لیے یا طبعی میلان کے واسطے سے، جیسے

متنبہ ہو جانا حیوانات کا اپنی طبیعت سے مناسب اور اپنی طبیعت سے منافی چیزوں سے ۔ اور تعلیم بالقول جو کوشش سے حاصل کی جاتی ہے، جیسے اساتذہ کا تعلیم دینا اپنے تلامذہ کو اور آبا کا ادب آداب سکھانا اپنے بچوں کو، اور مرشدوں کا رہنمائی کرنا اپنے مریدوں کی، یا تو یہ مرشد رہنمائی کرتے ہیں، کبھی فقط باطن کے ذریعے نفس پر نفس کی تاثیر کے ساتھ، اور قلب کی قلب کی طرف توجہ کے ساتھ اور کبھی جمع کرتے ہیں ظاہر کو باطن کے ساتھ اور عملی تعلیم ۔ اور یہ حاصل ہوتی ہے استعمال اور دیکھنے سے ۔ جیسے اہلِ صنائع کا تعلیم دینا ان کی صنعت کے طلب کرنے والوں کو ۔ اور یہ مذکورہ بالا تعلیمات جو ہیں، یہ اللہ ہی کی تعلیم ہے ۔ اس نے سکھایا انسان کو سب کچھ، اور خبر دی آدمؑ نے فرشتوں کو ان اسما کی، اور وہ ہوا مصداق ان اسما کے ظہور کا ۔ کیونکہ فرشتوں نے نہیں پایا آفاق میں آدمؑ سے پہلے کوئی ایسا شخص جو جمع کرنے والا ہو ان ظہورات کو ۔ پس جب آدمؑ نے انھیں خبر دی اور دیکھیں فرشتوں نے وہ چیزیں جس پر صادق آ گئے امکان میں وہ کمالات، اور وہ خلیفہ ہے اللہ احسان کرنے والے کا ۔ تو کہا اللہ تبارک و تعالیٰ نے ۔ کیا میں نے نہیں کہا تھا تم سے کہ میں جانتا ہوں آسمانوں اور زمین کے غیب کو ۔ پس اعتراف کیا فرشتوں نے اپنے علم کے کوتاہ ہونے کا اور کہا تو پاک ہے ۔ ہمیں کچھ علم نہیں سوائے اس کے جو کچھ تو نے ہمیں سکھایا ۔ بے شک تو علیم و خبیر ہے ۔ پس ہر قسم کی تعلیم اللہ کے لیے ہے جس نے پیدا کیا انسان کو، اور بات کرنا سکھایا ۔ پس وہ بیان کرتا ہے لوگوں کے لیے ذات اور صفات اور اسما کے حقائق بہترین کلام کے ساتھ، اور فرق کرتا ہے اسما اور اعلام کی قسموں میں اللہ علیم و علام کی تعلیم کے ساتھ اور اس کے رسولؐ کے فیض سے ۔ پس بے شک میں تمھیں سکھاتا ہوں اپنے رب کی تعلیم کے ساتھ جو چیزیں تم نہیں جانتے تھے ۔ اور بیان کرتا ہوں تمھارے لیے اللہ تعالیٰ کے اسما کے اسرار تاکہ تم فلاح پاؤ ۔

اسما کے تقابل اور اشیا کے ظہور اور اعلام اور اسما کے فرق کا باب

اسمائے حسنیٰ کے تقابل اور اشیا کے ظہور سے ہمارا مقصود اسمائے الٰہیہ کے باہم متقابل ہونے کا بیان ہے، جیسا کہ نفع پہنچانے، نقصان دینے والا، عزت دینے والا، ذلت دینے

والا ہے۔ اور علیٰ ہذالقیاس۔ دوسرے متضاد اسمائے حسنیٰ اور انہی ناموں کے اختلافات کے ظہور کی اشیا آئینہ دار ہیں جو ان کی مظاہر ہیں۔ دُنیا کی مختلف چیزوں کا وجود اسمائے متقابلہ کے تقاضے کے سبب سے ہے۔ جیسے کہ اسماء کا اعتبار چیزوں کی ذات کی صفات کے باعث ہے اور صفات کا امتیاز چیزوں کی ذاتی حالتوں کی حیثیت سے ہے جو عینِ ذات ہے۔ پس مرتبۂ ذات پاک نے چیزوں کی حالتوں کے مرتبے میں جلوہ فرمائی کی، اور حالتوں کا مرتبہ صفات کے مرتبے میں تجلی ریز ہوا اور مرتبۂ صفات نے مرتبۂ اسماء میں اپنی تفصیل پائی، اور مرتبۂ اسماء نے ظلال اسماء کے مرتبے میں تجلی کی جو حقائق ممکنہ ہیں۔ اور اس مرتبۂ ظلال اسماء نے دنیوی موجودات کو منور کر دیا۔ اور حق سبحانہٗ تعالیٰ نے اس آیتِ کریمہ کے بموجب کہ وہ ہر لحظہ اک نئے کام میں ہے اپنے اسمائے حسنیٰ کی وساطت سے اپنے وجود کے نور کو اشیا پر ڈالا۔ ان اسما کی تفصیل، ان کے باہمی فرق کا بیان اسی باب میں مناسب موقع محل پر آئے گا۔ ہاں اللہ تعالیٰ کے ننانوے اسمائے حسنیٰ اور ان کی حیثیت جیسی کہ ہے درج ذیل ہے۔

اسمائے حسنیٰ کی تشریح

جان لو کہ ہر اسم میں پوشیدہ دلالت ہے اسماء پر اجمالی طور پر، کیونکہ اسم کے مرتبے سے مراد ذات ہے صفت کے ساتھ، اور ذات شامل ہے تمام اسماء کے ساتھ اور صفات کے ساتھ۔ پس ہر اسم کی ذات پر دلالت کے اعتبار سے ہر اسم رہبری کرنے والا ہے تمام اسماء کی طرف، اور اسماء میں سے ہر اسم کا ایک صفت مخصوصہ پر دلالت کرنے کے اعتبار سے ہر اسم دلالت ہے ایک خاص حیثیت پر تفصیل کے ساتھ۔ پس ذات وہ مرتبہ ہے جس میں اشتراک ہے اسمائے الٰہیہ میں اور اعتبارات صفات جو ہے، یہ مرتبہ ہے جس سے کہ امتیاز حاصل ہے اللہ تعالیٰ کے اسماء کو۔ پس ظاہر ہوا اسماء کا مرتبہ ذات کے اشتراک سے اور صفات کے امتیاز سے اور یہ مرتبہ موجودات کے حقائق میں سب کی اصل الاصل ہے، اور بنائی گئی ہیں حقائق اشیا مرکب جنس کے ساتھ اور مفصل ہیں اسماء کی صفت کے ساتھ۔ کیونکہ اشیا اسماء کی مظاہر ہیں اور اللہ ہی کے ہیں اسمائے حسنیٰ: **ھو اللہ** وہ اللہ ہے کہ جس کا وجود عین حقیقت ہے۔ نہیں ہے کوئی معبود سوائے اس کے، اس کے وجود کا اس کے ساتھ مختص ہونے کی وجہ سے۔ **الرحمٰن** رحمتِ عامہ کے ساتھ جو وسیع ہے ہر چیز پر۔

الرّحیم رحمتِ خاصہ کے ساتھ جس کے ساتھ وہ جسے چاہتا ہے خاص کر دیتا ہے۔ **الملک** تصرفِ حقیقی کے ساتھ موجودات پر ملکیت کے معاملے میں، اور نہیں کوئی طاقت اور نہ قوت مگر اس کے ساتھ۔ وہی سلطان ہے اور اس کے لیے غلبہ ہے۔ اور وہ حاکمِ مطلق ہے النفس و آفاق پر غالب ہے اپنی ذات و صفات میں۔ بے نیاز ہے اپنی تمام مصنوعات اور مخلوقات سے، اور ہر چیز اس کی محتاج ہے۔ اور اس کی فیض یافتہ ہے، اس کی مملوک ہے، اس کی مطیع ہے، اور کلمہ ملک زیادہ بلیغ ہے مالک سے۔ پس ہر ملک مالک ہے، اور اس کے برعکس صورتِ حال نہیں کلی طور پر۔ **القدوس** ذاتی پاکیزگی کے ساتھ اور تقدس نفس کے ساتھ ہر نسب اور اضافات سے۔ **السلام** اضافت وجودیت تمام ممکنات پر سلامتی کے ساتھ ان پر سلام بھیجتا ہے تمام آفات سے۔ پس سلام جو ہے سلامت سے ہے، اور یہ سالم کے معنوں میں بھی ہے۔ یعنی اس کی ذات سالم ہے۔ اس کی صفات کامل ہیں۔ اور اس کے افعال صحیح ہیں۔ القدوس والسّلام کے فرق میں کہا جاتا ہے کہ القدوس دلالت کرتا ہے پاکیزہ ہونا نفس سے بتقاضائے ذات، اور السلام جو ہے وہ پاکیزہ ہونا ہے لاحق ہو جانے والے نقائص سے آفات میں سے۔ اور کہا جاتا ہے قدوس جو ہے ازل میں ہے اور سلام لایزال میں۔ **المومن** حقیقی ایمان کے ساتھ اپنے نفس پر اپنے نفس کے ساتھ۔ گواہی دی ہے اللہ تعالیٰ نے کہ نہیں کوئی معبود سوائے اس کے، اور شہادت کے ساتھ ہمارے اوپر اپنی ذات کی شہادت کے ضمن میں، اور وہ ہر چیز پر گواہ ہے، اور تصدیق کے ساتھ اپنے انبیاؑ و اولیا کی تصدیق کے ساتھ بالتخصیص اور وہ **مومن** ہے امن و امان کے عطا کرنے کے ساتھ، اور خیر و فیضان کے اسباب کے عطیے کے ساتھ، اور نجات دینے والا ہے آفات سے اور پہنچانے والا ہے نجات کی طرف، اور **مہیمن** ہے گواہی کے ساتھ، اور نگرانی کی شدت کے ساتھ اور حفاظت کی زیادتی کے ساتھ، اور دنیا میں امن اور عافیت کے ساتھ پیدا کرنے اور آخرت میں مغفرت اور نجات کے ساتھ۔ **العزیز** الوہیت کی عزت اور ربوبیت کے غلبے کے ساتھ۔ **الجبار** موہومہ فخر اور غرور کو توڑنے اور اس کو ہلاک کرنے کے ساتھ، اور ٹوٹی ہوئی چیزوں کو باندھنے اور الگ چیزوں کو جوڑنے اور حالات کو درست کرنے اور افعال کے تعین کے ساتھ۔ الجبار فتح کے ساتھ اور تشدید کے ساتھ بلند درخت کو کہتے ہیں کہ جن تک ہاتھ نہیں پہنچ پاتا، جیسے کہا جاتا ہے نخلة جبّارة یعنی عظیم کھجور کا درخت اور ناقة الجبّارة میمنة " بڑی اعلیٰ اور بہت بلند اونٹنی کو کہتے ہیں۔ الجبار کے معنی

کسی کام پر قائم ہونا تحکم اور جبر کے ساتھ۔ اور جبر کی طرف نسبت کے معنی سے جو کہ قدر کے خلاف ہے۔ پس وہ اختیار وجوبی اور اختیار حقیقی کے ساتھ بھلائی کرنے والا ہے۔ اور منسوب کیا جاتا ہے جبر مجبوریوں کی طرف حقیقتاً، اگرچہ وہ ظاہری طور پر مختار ہوں۔ **المتکبّر** اپنی ذاتی کبریائی کے ساتھ اور اپنے نفسی غلبے کے ساتھ، اور ہر کبیر سے اپنی بڑائی کے ساتھ۔ **الخالق** ماہیات کے اندازے اور ان کی ذاتوں کی تعین کے ساتھ موجودات سے پہلے اور عدم سے حقائق کا اخراج وجود کی طرف جب کہ مخلوقات کی تخلیق ہوئی۔ **الباری** دُنیا کی ایجاد اور امکانی زمین کے ایجاد کے ساتھ وہ باری ہے۔ **المصوّر** اور مصوّر ہے موجودات کو رنگنے کے ساتھ وجود کے رنگ میں لوحِ علم کے اندر اور موجودات کی صورت بنانے میں اور مخصوص ہیئت عطا کرنے میں تمام مشخص چیزوں کو۔ **الغفار** غفار ہے قولی اور فعلی مضافات کی اضافت کے ساتھ حقیقتاً اسی کی طرف نسبت دینے کے معاملے میں۔ پس اللہ کی طرف تمام معاملات لوٹتے ہیں۔ پس غفار مبالغہ ہے مغفرت اور غفران سے، اور زیادہ بلیغ ہے غافر، غفور سے اور غفر جو ستر کے معنی میں ہے وہ بھی معنی بنتے ہیں۔ پس وہ گناہوں اور عیبوں پر پردہ ڈالنے والا ہے ستار کے معنوں میں۔ **القہار** پس قہار مبالغہ ہے اور زیادہ بلیغ ہے قاہر سے۔ **الوہاب** ممکنات میں سے غیر کو وجوب کا عطیہ دینا۔ وہب اور ہبہ اور موہبہ کے معنی میں عطا یا عطیہ، اور ہبہ حقیقۃ جو ہے یہ عطیہ ہے بلاغرض اور بلاعوض کے، اور عطیہ دینے والا کسی عوض اور غرض کے لیے واہب نہیں ہوتا بلکہ وہ تو بیچنے والا ہوتا ہے۔ اور وہاب مبالغہ ہے یعنی بہت زیادہ ہبہ دینے والا، اور ہمیشہ عطیہ دینے والا، اور یہ سخی کے معنوں میں بھی ہے۔ **الرزّاق** رزاق ہے ان چیزوں سے جن سے غذا پہنچتی ہے، اور نمو حاصل ہوتی ہے اجسام کو، اور وہ چیز جس سے زندگی ہوتی ہے حیوانات کے لیے، اور جس سے نیک بختی حاصل ہوتی ہے نفوسِ انسانیہ کو۔ **الفتاح** مشکلات کے حل میں اور نفوس کاملہ پر واردات کے القا سے اور فتاح مبالغہ ہے فتح سے، اور وہ حکم اور مدد کے معنوں میں بھی ہے۔ **العلیم** اور علیم ہے معلومات کو منکشف کرنے میں اپنے نفس پر، اور یہ علیم مبالغہ ہے عالم کا۔ **القابض** القابض جو ہے قبض کے حالات وارد کرنے میں بندوں پر۔ مقیدات کا بنانا مقبوضہ تقدیرات کی تنگی کے اندر یا قابض ہے روح کے قبض کرنے کے ساتھ نفوس سے، حالاتِ قبض کو وارد کرنے سے بندوں پر۔ **الباسط** موجودات پر وجود

کے بسط و انبساط کے ساتھ۔ اور وسعت عطا کرنا نفوس کو، اور شرح صدور اور رزق کا پھیلانا بندوں کے لیے۔ **الخافض** ممکنات کو پست کرنا امکانیت کے حضیض میں اور لوٹانا انسان کو مکان اور رتبے کے لحاظ سے اسفل السافلین تک۔ **الرافع** رافع ہے بلند مرتبوں کی بلندی کے ساتھ مجازی میں سے، حقیقی میں سے، مکانی میں سے اور امکانی میں سے، اور انسان کا بلند کرنا قرب الٰہی کی بلندی پر اور علم توحید کی بلندی پر۔ **المعز** مرسلین اور مومنین کے اعزاز کے ساتھ دُنیا و آخرت میں عزتِ نفسی اور قوت علمی اور عملی بھلائیوں کے ساتھ معزز کرنے کے ساتھ معز ہے۔ **المذل** کفار اور جُہّال کو ذاتی ذلت کی تذلیل اور علمی نسبت کے ضعف اور عملی برائیوں کی کثرت کے ساتھ ذلیل کرنے سے مذّل ہے۔ **السمیع** مسموعات کے علم کے اعتبار کے ساتھ اور معقولات کی اطلاع کے ساتھ، مکمل انکشاف کے ساتھ بغیر وسائل کی ضرورت کے۔ پس وہ سمیع ہے صفت سماعت کے ساتھ نہ کہ فقط علیم کے معنی کے ساتھ۔ **البصیر** بصیر ہے دیکھے جانے والی چیزوں کے ادراک کے لحاظ سے اور مشہودات کے علم کے ساتھ واضح طور پر انکشاف جلی کی معیت میں اسباب کا محتاج نہ ہوتے ہوئے وہ بصیر ہے صفت بصارت کے ساتھ فقط ادراک کے ساتھ نہیں۔ **الحکم** اور حکم ہے دو جھگڑنے والوں کے نقطۂ نظر سے، اور واقع کے مطابق حق دلاتے ہیں، اور واقع سے مخالف کے جھٹلاتے کے ساتھ اور حکم کے معنی فیصلے کے ہیں، اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ قضاو قدر بھی حکم کی شاخیں ہیں۔ پس اللہ تعالیٰ کی تدبیر اور اس کی قضا اسباب کی شکل کے اصل کے اعتبار سے حکم ہے اور وہ امر (حکم) سے عبارت ہے اور آنکھ جھپکنے کی طرح ہے۔ اسباب کی تخلیق کلیتہً اس کی قضا ہے، اور مسبّبات کی ترتیب اسباب پر لحظہ بہ لحظہ جزئیتہً۔ یہ قدر ہے۔ **العدل** اعتدال کی تخلیق کے ساتھ مزاجوں میں تعدیل و تسویت کے ساتھ، اور عدالت کا بیان احکام شرعیہ کے ساتھ دُنیا میں اور جزا کا معاملہ نیکیوں اور بدیوں کے ساتھ آخرت میں، اور عدل ضد ہے ظلم کی اور یہاں پر واقع ہوا ہے عادل کے معنوں میں مبالغے کے طور پر۔ **اللطیف** اپنی لطافت کی پاکیزگی اور نرمی و نرم خوئی کے ساتھ، اور اُس کے الطاف میں نرمی کی شمولیت کے ساتھ اور دُنیا میں نظر نہ آنے کے اعتبار کے ساتھ۔ **الخبیر** اور خبیر ہے بلحاظ اپنی اطلاع کے غیب و شہادت اور قیامت اور دُنیا و آخرت کی تمام خبروں کی اطلاع کے ساتھ۔ اور خبیر اور علیم میں فرق یہ ہے کہ خبیر مخصوص ہے اخبار کے ساتھ، یعنی اخبار کے عالم

کے ساتھ۔ اور کہا جاتا ہے کہ علیم کے معنوں میں ہے سوائے اس کے کہ اگر علم کو منسوب کر دیا جائے باطنی اخفا (پوشیدگی) کی طرف، اسے خبرۃ کہتے ہیں، اور ایسے شخص کو خبیر کہا جاتا ہے۔ اور خبیر معنی مخبر (خبر دینے والا) کے بھی ہوتا ہے۔ اور ان معنوں میں یہ لوٹتا ہے صفت کلام کی طرف اور خبرہ اور اختیار امتحان کے لیے بھی استعمال ہوتے ہیں۔ **الحلیم** حلیم ہے اس اعتبار سے کہ تغیر نہیں ہوتا اس کے نفس میں غضب سے، اور مستی سے، اور سزا میں نرمی سے، اور انتقام میں تیزی و عجلت کے معدوم ہونے سے۔ **العظیم** عظیم ہے ذاتی عظمت کے اعتبار سے، اور الوہیت کے مرتبے کے عظیم ہونے کے ساتھ، اور کبھی کبھی عظمت کا کلمہ اجسام و محسوسات پر بھی بولا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ یہ بڑا جسم ہے (ھٰذا جسمٌ عظیم) اور یہ اس سے زیادہ بڑا ہے جب کہ وہ بڑا ہوتا ہے اور پھیلا ہوتا ہے مساحت میں طول اور عرض اور گہرائی کے حوالے سے۔ اور یہ عظمت صوری ہے۔ جیسے اللہ عزوجل نے فرمایا کہ وہ عرش عظیم کا رب ہے۔ اور کبھی کبھی اس کا اطلاق ہوتا ہے مجردات اور معقولات پر مراتب معقولہ کے لحاظ سے، جیسے کہا جاتا ہے کہ یہ عظیم مرتبہ ہے اور یہ عظیم منزل ہے۔ یہ معنوی عظمت ہے، اور نفس عظمت جو کہ منشاء و مبدا ہے ان عظمتوں کا وہ مطلق اور حقیقی عظمت ہے، جو کہ مخصوص ہے مطلق اور حقیقی عظیم کے ساتھ جس کی عظمت جلیل ہے۔ **الغفور** گناہگاروں کی مغفرت کے اعتبار سے مومنین میں سے، غفار کے معنی میں۔ اور یہ دونوں کلمے مبالغے کے لیے ہیں۔ پس غفار بخشے جانے والوں کی کثرت کے اعتبار سے اور مغفرت کی تعداد کی اکثریت کے اعتبار سے اور غفور عطا کے مکمل ہونے کے اعتبار سے اور بخشش کی کاملیت کے اعتبار سے، اور مغفرت کے بعید ترین (بلند ترین) مراتب کے لحاظ سے، اور کہا جاتا ہے کہ جب کہ غفر کے معنی ستر اور کتمان کے ہیں، تو غافر ہے وہ جو چھپانے والا ہے گناہوں کو حشر کے دن اور غفار وہ ہے جو چھپائے گا اور مٹا دے گا گناہوں کو فرشتوں کی نگاہوں سے اور ان کے ضمیروں سے بھی، اور غفور وہ ہے جو بھلا دیتا ہے برائیوں کو اور لے جاتا ہے ان برائیوں کو گناہ کرنے والوں کے نفوس سے، اور ان کے دلوں سے بھی، یہاں تک کہ کوئی ندامت اور انفعال ان کے دلوں میں نہیں ہوتا۔ **الشکور** اپنے جمالیاتی اسمائے کے اعتبار سے جو کہ اپنے مقتضی کے اعتبار سے موجودات کو رنگ دیتا ہے وجود کے رنگ سے، اور مخلوقات کی تکمیل ہے عطا اور سخاوت سے اور اس کے

کمالات کا اظہار اس کی ذات کا شکر ہے اور بلحاظ بیان کرنے اس کی نعمتوں کے اس کے کلام میں اور عطا کرتا شکر کی توفیق کو بندوں کو، اور دینا ہے بہت بڑا ثواب بہت تھوڑے عمل پر اور مشکلوں میں شکر گزار لوگوں کے شکر کے بدلے کے اعتبار سے پہلے معنوں میں سے نکلا ہے اسی میں داخل ہے۔

العلیّ مرتبے کی بلندی اور مرتبے کے ارتفاع کے ساتھ اور علو کے معنی غلبے کے بھی ہوتے ہیں۔

الکبیر موجودات زمانی اور غیر زمانی پر اس کی سبقت کے اعتبار سے اور کبیر اکبر ہے ہر کبیر سے اور تمام ازلی وابدی کبیر جو ہیں اس کے کبر کے پہلو میں طفل مکتب اور بچے کی مانند ہیں، اور وہ تمام عظیم اور عظمت و کبریائی والوں میں سے سب سے بڑا ہے یعنی کامل الذات ہے جامع صفات ہے۔ **الحفیظ** حفیظ ہے موجودات کی حفاظت کے ساتھ آفات اور مصیبتوں سے وجود اور عزت کی حفاظت کے ساتھ۔ تاکہ باقی رہے عالم کا قیام اور عظیم نظام۔ **المقیت** قوتوں کی تخلیق کے لحاظ سے اور انھیں پہنچانے کے لحاظ سے بدنوں تک، اور اقانت کے معنی کھانا کھلانا ہے۔ اور مقیت کے معنی حافظ، قادر، شاہد اور حاضر بھی ہیں، اور اللہ ہر چیز پر مقیت ہے۔ **الحسیب** نفس کی کفایت کے اعتبار سے، اور ذاتی کفایت کے اعتبار سے ہر معاملے میں ہر چیز کے لیے، جیسے کہ کہا جاتا ہے کہ چیز میرے لیے کافی ہوگئی۔ (احسبی الشئی الی کفائی) میرے لیے اللہ کافی ہے، اور کوئی کفایت کرنے والا نہیں ہے اس کے سوا۔ اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ حسیب کے معنی محاسب کے ہیں۔ جیسے جلیس اور ندیم کے معنی مجالس اور منادم کے ہیں۔ اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ حسیب کے معنی شریف بھی ہیں، اور یہ معنی حسب سے ہیں، جس کے معنی فضائل ہیں اور مناقب کا احاطہ کرنا ہے۔ **الجلیل** ذاتی جلالت اور عظمت نفسیہ کے ساتھ، اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ کبیر راجع ہے کمال ذاتی کی طرف اور جلیل راجع ہے کمال صفائی کی طرف، اور عظیم ان دونوں کے مجموعے کی طرف راجع ہے اور لوگوں کی اصطلاح میں کہا جاتا ہے کہ جلال صفات قاہریہ کے آثار کے ظہور کے لیے آتا ہے اور جمال صفات لطیفہ کے آثار کے ظہور کے لیے ہے، اور جمیل بھی اللہ تعالیٰ کے اسماء میں سے ہے۔ اور جمال اصلاً موضوع ہے ظاہری صورت کا جس کا نگاہ سے ادراک ہوسکتا ہے۔ اور خوبصورت چیزوں کا جو مناسب و موافق ہیں آنکھوں کے لیے۔ پھر یہ لفظ منتقل ہوگیا باطنی صورتوں کی طرف جن کا ادراک بصیرت سے ہوتا۔ جیسے کہا جاتا ہے خلق جمیل اور خوش آیند کشائش (لیسرۃ جمیل)۔ **الکریم** اور کریم ہے

کرم وجوبی اور عزتِ نفس کے ساتھ، اور کہا جاتا ہے کہ کریم وہ ہے کہ جیسے وعدہ کرتا ہے اسے پورا کرتا ہے، اور جب قادر ہوتا ہے تو معاف کر دیتا ہے، اور جب اس سے سوال کیا جاتا ہے تو عطا کرتا ہے۔ جب عیوب کو دیکھتا ہے تو پردہ پوشی کرتا ہے۔ اور جب گناہوں کو دیکھتا ہے تو بخش دیتا ہے اور کریم احسان کرنے والوں کے معنی میں بھی ہے۔ جیسے جلیل مُجل کے معنوں میں (روشن کرنے والا) اور یہ آیا ہے سخی کے معنوں میں بھی۔ **الرقیب** موجودات کی وجودیت کی نگرانی کے ساتھ، اور معلومات کی علمی طور پر رقابت کے لحاظ سے، اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ رقیب کے معنی ہیں حفیظ کے۔ حفاظت کرنے والا۔ وہ اشیا کا مراقب ہے، اور ان کے دیکھنے والا ہے۔ اس سے نہیں پوشیدہ ایک ذرے کے برابر چیز بھی نہ زمین میں، نہ آسمان میں۔ اور رقابت جو ہے یہ راجع ہے علم اور حفاظت کی طرف۔ **المجیب** یعنی سوالات کے جواب دینے کے اعتبار سے اور دعا کے قبول کے اعتبار سے، اور وہ پکارنے والے کی پکار کا جواب دیتا ہے، اور سائل کے سوال کا جب بھی اس نے اس سے سوال کیا زبانِ حال یا زبانِ قال سے۔ **الواسع** غیر متناہی وسعت کے ساتھ۔ السّعت وجود کا پھیلنا ہے۔ پس علم میں اس کی وسعت اس کے علم کے احاطے کے اعتبار سے ہے۔ تمام قسم کی معلومات پر اور احسان کے اعتبار سے موجودات پر نعمتوں کی وسعت کے لحاظ سے اور علیٰ ہٰذا القیاس تمام صفات میں۔ **الحکیم** موجودات کی ایجاد کے لحاظ سے اس طرح جو ان کو مناسب اور جو ان کو لازم ہے، اور اپنے علم کے حاوی ہونے کے لحاظ سے تمام ماہیات پر اس پر جو وہ ہیں، اور حکمت علم محکم کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے، اور علم اور عمل کے امکانات کے متحقق ہونے پر۔ **الودود** وجود اور موجودات کی محبت کے اعتبار سے کیونکہ وجود موجودات سے ربط و ضبط رکھتا ہے، جو کہ اس کے مظاہر ہیں اور موجودات تعلق خاطر رکھتی ہیں وجود سے جو اُن کا موجد ہے۔ وہ ان سے محبت کرتا ہے اور وہ اس سے محبت کرتے ہیں۔ اشارہ ہے اسی طرف۔ **المجید** نفسی بزرگی اور ذاتی شرف، افعال کی سلامتی، فضائل کی بزرگی اور عطا و بخشش کی کثرت کے لحاظ سے۔ **الباعث** انبیاؑ اور اولیا کی بعثت کے اعتبار سے اور مرسلینؑ اور عارفین کو دُنیا میں بھیجنے کے اعتبار سے، اور آخرت میں مردوں کو دوبارہ زندہ کرنے اور جسموں کو دوبارہ اکٹھے کرنے کے اعتبار سے، اور برانگیختہ کرنا نفوس کو اور ارادوں کو ابھارنا اور علت پیدا کرنا، سبب بنانے موجودات

کے ظہور کے ساتھ عدم سے اور غافلوں کو بیدار کرنے کے لحاظ سے غفلت کی نیند سے ۔ **الشہید** شہود کے اعتبار سے جو کہ حضور کا مترادف ہے ، اور اللہ حاظر و ناظر ہے ہر حال میں ، اور اُس شہادت کے اعتبار سے جس کی اس نے گواہی دی ہے اپنے نفس پر ، جیسے کہ اُس نے کہا کہ اللہ نے گواہی دی کہ نہیں ہے کوئی معبود اس کے سوا ، اور اس شہادت کے اعتبار سے جو اُس نے دی تمام موجودات پر جیسے کہ اُس نے کہا کہ اللہ ہر شے پر گواہ ہے ۔ **الحق** بلحاظ اُس کے ثبوت اور موجودیت کے اور اس کے مقابل باطل ہے جو غیر ثابت اور غیر موجود کے معنوں میں ہے ۔ پس حق وجودِ حقیقی ہے بلکہ وجود ہے اس چیز کے معنوں میں کہ جس سے موجودیت ہے اور باطل معدوم ہے ، اور ہر چیز جو اللہ تعالیٰ نے پیدا کی ہے وہ باطل نہیں ہے یعنی موجودات ممکنہ حق ہیں ۔ حق بالغیر ہیں اللہ تعالیٰ کی حقیقت کے تقمن کے سلسلے میں ۔ اور وہ اپنے نفوس میں باطل ہیں جب تک ہر ممکن چیز واجب بالغیر ہے ، اور ممکن ہے اپنے نفس کے ساتھ ۔ **الوکیل** اپنے اختیار اور اصلاح کے اعتبار سے تمام امور میں نظام عالم میں سے ۔ اور اس کے پاس تمام کی وکالت ہے اور وہ وکیل مطلق ہے ۔ **القوی** مظاہر میں ظہور کی قوت کے لحاظ سے قوی ہے ۔ **المتین** اپنی ذات میں استقلال کے اعتبار سے اللہ تعالیٰ موجود مستقل ہے اپنی ذات کے ساتھ ۔ **الولی** اپنی محبت اور نصرت کے لحاظ سے مومنین کے لیے ، اور والی ہونے کے لحاظ سے متوکل لوگوں کے اُمور کا ، اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ولی قریب کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے ۔ **الحمید** پسندیدہ معاملات کی تعریف کرنے کے اعتبار سے ، اور اس کی محمودیت جو ہے تمام حامدین کے لیے ہے ، اور وہ حامد اور محمود ہے ۔ **المحصی** المحصی ہے تمام موجودات کے احاطہ کر لینے کے لحاظ سے ۔ پس موجودات جو کہ بالفعل موجود ہیں ، وہ فعلاً قید کے احاطے میں ہیں ۔ اور ہر وہ چیز جس کا احاطہ کیا جائے وہ متناہی ہے ۔ پس احاطہ کر لیا اللہ تعالیٰ نے ان کی انتہائی حدود کو پالینے کے ساتھ ، اور موجوداتِ ماضی اور موجوداتِ مستقبل بھی محدود ہیں ازل اور ابد کی حدیں ، اور ان دونوں قیدوں کے اندر ان کی انتہائیں ہیں ۔ جیسے کہ اللہ تعالیٰ نے کہا اور ہر شے کو ہم نے احاطہ کر لیا ہے گنتی کے ساتھ ۔ اس کے ساتھ اگر تو تصور کرے اسے غیر متناہی تو پس اللہ تعالیٰ کا علم بھی غیر متناہی ہوا ، اور غیر متناہی کا احاطہ متناہی سے نہیں ہو سکتا ۔ پس اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کا احاطہ کر لیا ہے ، اور وہ محصی یعنی احاطہ کرنے والا ہے ۔ محصی کی تفسیر عالم سے بھی کی گئی ہے اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ جب علم کو منسوب کیا جاتا ہے معلومات کی طرف عدد کی حیثیت سے اور

احاطے کے اعتبار سے تو اُسے احصا کہا جاتا ہے۔ **المبدا** ممکنات کے واقع ہونے کے لحاظ سے چاہے وہ ذات کے ساتھ واقع ہونے والے ہوں، یا زمانے کے ساتھ اور بلحاظ تمام امور کے انوکھے پن کے اشیا میں سے اور افعال میں سے۔ **المعید** اور لوٹانا مرکبات لاغر کو بسیط ارکان کی طرف، یا بوسیدہ مرکبات کو ارکان بسیطہ کی طرف۔ اور لوٹانا شاخوں کو اصول کی طرف مطلق اور نفوس کا لوٹانا اجسام کی طرف موت کے بعد اور جسمی عناصر کو قیامت کے دن اکٹھا کرنا اور معدوم کر دینے کے بعد دوبارہ ایجاد کرنا۔ **المحی** بلحاظ ایجاد زندگی دونوں جہانوں میں، اور بلحاظ ذکر و فکر سے دلوں کو زندہ کرنے کے، اور بلحاظ حیوانات اور انسانوں میں سے ذی حیات کو زندہ کرنا عناصر اربعہ کی ترکیب کے ساتھ۔ اور ہلکی سی بھاپ کی پیدائش کے ساتھ، اور نفس ناطقہ کا ملانا مادے کے ساتھ یا مجرد نفس کے ساتھ، جیسے کہ عالی مرتبہ فرشتے یا عناصر ثلاثہ کی ترکیب کے ساتھ بغیر ارضی عنصر کی شراکت کے جیسے جنّ یا ملانا دو عنصروں کا ہوا اور آگ میں سے، جیسے شیاطین یا ملانا دو عنصروں کا پانی اور ہوا میں سے جیسے ملائکہ سافلہ (کم درجے کے۔ ادنیٰ) کہ ابلیس جنّ کا معلّم تھا۔ **الممیت** موت کی تخلیق کے اعتبار سے اس عالم میں، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اُس نے پیدا کی موت اور زندگی اور صاحبانِ نفوس کو مارنے کے اعتبار سے اجل مسمیٰ کے موقع پر جس کا اُس نے وعدہ کیا ہے اور قلوب کو غفلت اور جہالت سے مار دینے کے اعتبار سے۔ **الحیّ** کمالات کے حصول کے اعتبار سے جو لازم ہیں زندگی کے لیے علم اور ارادے، اور قدرت اور سماعت اور بصارت، اور کلام میں سے اور ذاتی زندگی کے اعتبار سے جو کہ باعث اور سبب ہے ان کمالات کے ظہور کے مظاہر ہیں۔ **القیوم** قائم رہنا اپنے نفس کے ساتھ اپنے تنفس کی مدد سے، اور وہ اپنی ذات کے قیام کے ساتھ قائم ہے، اور وہ اپنے نفس کے دائم ہونے کے ساتھ دائم ہے، اور جواہر کا اپنی ذاتوں کے ساتھ قائم ہونے کے اعتبار، اور اعراض کا ان کے موضوعات کے اعتبار سے، اور حدود شرعیہ کی اقامت اور عام رسومات کے ثبات کے اعتبار سے۔ کہا جاتا ہے کہ قیوم قیّم کا مبالغہ ہے جو کہ معاملات کی اصلاح کرنے والے اور اس کا تدبر کرنے والے کے معنی میں آیا ہے۔ **الواجد** یا تو وجود کے اعتبار سے موجودیت کے معنوں میں ہے، یا جس کی وجہ سے موجودیت واقع ہوئی ہے اس کے معنوں میں آیا ہے۔ اور یا اس کا پالینا ہے احاطہ کرتے ہوئے موجودات میں سے ہر چیز کو وہ ہر چیز کے لیے محیط ہے، اور یا اس کے پالینے کے اعتبار سے تمام مطلوبات کو کمالاتِ نفسیہ میں سے اور اُس کے لیے کوئی حالتِ منتظرہ نہیں۔

الماجد یہ وصفی بزرگی کے لحاظ سے ہے، جیسے کہ مجید مجد نفسی کے اعتبار سے ہے۔ اسی کے لیے مجد ذاتی اور وصفی۔ وہ مجید ہے ذاتی حیثیت میں، اور ماجد ہے صفاتی طور پر۔ **الواحد** صفت وحدیت کے اعتبار سے جس سے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات وحدت کی فضیلت سے مخصوص ہوئی ہے۔ اور یہ وحدیت امر منتزع ہے جو نکالا جاتا ہے احدیت کے مرتبے سے، جو کہ منبع ہے اس حیثیت کے نکالنے کا۔ **الاحد** حقیقت کی حد ہے جو کہ وحدتِ ذاتی ہے۔ اور جسے احدیت سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اور واحد کے معنی وہ چیز جس کے اجزا نہ ہو سکتے ہوں۔ یعنی اس کا کوئی جُز نہیں ہے، اور احد بمعنی عدیم المثنیٰ یعنی اس کی نظیر کوئی نہیں۔ **الصمد** اللہ تعالیٰ کے نفس کا تمام چیزوں کا مرجع ہونے کے اعتبار سے اور موجودات میں سے ہر چیز اُسی کی طرف لوٹنے والی ہے۔ **القادر** اس کی قدرت کے لحاظ سے تمام ممکنات کو ایجاد کرنے میں اور اسماء اور صفات کے ظہور کے اظہار کے لیے، اور بلحاظ اس کی قدرت کے ان چیزوں پر جن پر کوئی قادر نہیں ہے مجازی قادروں میں سے، جیسے کہ اللہ عزوجل نے فرمایا۔ پس مالک ہے اللہ جو بہترین خالق ہے۔ **المقتدر** بلحاظ مبالغے کے قدرت میں اور ہمیشہ کمالات کے حصول میں قادر ہونے کے اعتبار سے اور یہ اسم مشتمل ہے لازم اور متعدی دونوں معنوں پر، یعنی ان معنوں پر کہ اُس کو قدرت ہے اپنے کمالات کے اظہار کی جو کہ زاید صفات ہیں اس کی ذات پر، اور اس معنی میں کہ اُسے قدرت ہے ان کمالات کے مظاہر کے ایجاد کی جو کہ موجوداتِ ممکنہ ہیں۔ **المقدم** اسباب ایجاد کے اعتبار سے معلومات سے پہلے اور تمام مقدمات کی، اور مبادی کی تقدیم ان پر جو اُن کے بعد ہیں مقاصد اور مطالب میں سے حکمتِ کاملہ کے مقتضا کے ساتھ اور نفس ازلیہ کے اندازے کے اعتبار سے ہر قسم کے ازل سے۔ **المؤخر** موخر تخلیق معلومات کے لحاظ سے اسباب کے بعد۔ اور تمام عواقب اور انجاموں کی تاخیر کے لحاظ سے اس نسبت کے ساتھ کہ جو اس سے پہلے گزری ہیں افعال اور اشیا میں سے۔ اپنی تمام چیزوں پر حاوی قدرت کے مقتضا سے تعین اور تمام ابد جو ہیں ان کے نفسِ ابدیت کے تعین کے لحاظ سے۔ **الاوّل** وجودات پر اس کے وجود کے تقدم کے اعتبار سے اور تمام اوائل اضافیہ کے ساتھ۔ پس وہ قدیم ترین ازلی اوّل ہے بغیر کسی ابتدا کے، بلکہ ہدائت شروع ہوئی اس کی اولیت سے۔ وہی اس کا مبدا و منشا ہے۔ **الآخر** بلحاظ مخلوقات کے بعد بقا کے تاخر کے اور تمام اواخر اعتباری کے لحاظ سے، پس وہ آخر ابدی اور سب سے زیادہ دائم ہے بلا انتہا بلکہ نہایت منتہی ہوتی ہے اس کی آخریت کے تحت۔ وہی اس کا منتہی اور مرجع ہے۔

جس طرح کہ عرش جہات کو محدود کرنے والا ہے اجسام میں، اور جہات سب کے سب تحت ہیں اور محدود ہیں اس کے ساتھ اسی طرح تمام ہدایت کے مراتب اور ابتدائیت اور انتہائیت محسوس ہونے والے اعتبار کی جہات سے، اور منقولہ اور مفروضہ اور موہومہ اور معروفہ اور مجہولہ اور ماضیہ اور آنے والی محدود ہیں اللہ تعالیٰ کی اولیت اور آخریت کی حدود میں، اور اس کے احاطے کے اندر لے لی گئی ہیں۔ اور وہ ہر چیز کا احاطہ کرنے والا ہے۔ **الظاہر** وجود کے ظاہر ہونے کے اعتبار سے، اور ظہور کی شدت کے اعتبار سے اور مصنوعات کی دلالت کے اعتبار سے اپنے صانع پر، اور محتاج ہونے کے اعتبار سے ممکن کا واجب کی طرف اور ان کے علاوہ دیگر چیزوں کے اعتبار سے، ان اعتبارات میں سے جو دلالت کرتی ہیں اس پر۔ اور یہ کہ اس کی کھلی نشانیاں ہیں جو کہ پھیلی ہوئی ہیں آفاق میں، اور تمھارے نفوس کے اندر بھی۔ کیا تم دیکھتے نہیں ہو۔ **الباطن** بلحاظ پردے میں ہونے اس کے نفس کے کنہ کا آنکھوں سے حسّی طور پر اور افکار سے ادراکی طور پر۔ پس پاک ہے جو چھپا ہوا ہے اپنے ظہور کی شدت اور جلال کے ستر میں اور اپنے جمال و کمال کے حجاب اندر محجوب ہے۔ **الوالی** باعتبار امور کے والی ہونے اور اس کا تصرف ہونے جمہور پر، اور وہ والیوں کا والی ہے۔ اور سلطنتوں کا مالک ہے، اور ولایت زیر کے ساتھ اس کے معنی ہیں تولیت، نصرت، سلطنت اور تدبیر اور زبر کے ساتھ تصرف اور قدرت کام پر۔ **المتعالی** اپنی قدرت و منزلت کی بلندی کے لحاظ سے تمام بلندوں کے مقابلے میں، کیونکہ اللہ تعالیٰ بلند ہے ذات کے ساتھ، بلندی کے ساتھ نہیں، ذات کے ساتھ بلند ہے۔ بلکہ بلندی بلند ہے اس کی وجہ سے اور ہر بلند، بلند ہوتا ہے علو کے ساتھ۔ **البرّ** اپنے بندوں پر احسان کے اعتبار سے نعمتیں دینے کے ساتھ دُنیا میں، اور انعامات عطا کرنے کے ساتھ آخرت میں، اور مغفرت اور درگزر کرنے کے ساتھ مومنین سے، اور احسان کرنے سے کونین میں تمام موجودات کو وجود سے مشرف کرنے کے احسان کے ساتھ، اور ظاہر کرنے کے ساتھ پرہیزگاری، تقویٰ اور نیکی بندوں پر۔ **التوّاب** توفیق عطا کرنے کے ساتھ توجہ اور اپنی طرف رجوع کی بندوں کو، اور توبہ کے معنی میں لوٹنا اور رجوع کرنا، جب کہ منسوب ہو بندے کی طرف، اور اس کے معنی ہیں رحمت اور توفیق جب یہ مضاف ہو حق سبحانہٗ تعالیٰ کی طرف۔ پس توّاب مبالغہ ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی توبہ یقیناً قبول کر لیتا ہے۔ اور وہ بڑا توبہ قبول کرنے والا، رحم کرنے والا ہے **المنتقم** باعتبار بیان کرنے کے حدود شرعیہ مجرمین سے دُنیا میں انتقام

لینے کے ساتھ قصاص سے اور دیت (خون بہا) اور ان جیسی اور چیزوں سے ۔ اور باعتبار انتقام لینے کے کفر اور معاصی کا عذاب سے آخرت میں ۔ **العفو** بلحاظ برائیوں کو مٹا دینا بندوں سے توبہ کی توفیق کے ساتھ یا بغیر توبہ کے، اور وہ درگزر کرتا ہے لوگوں سے رسولؐ اور مرشدین اور نیک آبا وغیرہ اور ان کے علاوہ دوسرے اسباب شفاعت میں سے اعمال واقوال میں سے ۔ جیسے کہ قرآن میں فرمایا بے شک نیکیاں برائیوں کو لے جاتی ہیں، یا اپنی رحمت سے بغیر کسی سبب کے جس کے لیے وہ چاہے ۔ اور عفو کے معنی ہیں قریب غفور کے معنوں کے، لیکن یہ اس سے زیادہ بلیغ ہے ۔ کیونکہ غفران چھپانا اور پوشیدہ کرنا ہے ۔ اور عفو محو اور معدوم کرنا ہے ۔ **الرؤف** اپنی نرم خوئی کی شدت کے اعتبار سے اور اپنی رحمت کے اعتبار سے لوگوں پر، اور کہا جاتا ہے رأفت احسان کے معنی ہیں، اور اس کا مبدا محسن کی شفقت ہے بغیر کسی سبب کے، اور رحمت احسان ہے کہ جس کا مبدا حاجت ہے اس کی جس نے اس پر احسان کیا ۔ **مالک الملک** اپنے حکم کے نافذ ہونے اور معاملے کے پہنچنے کے اعتبار سے اس کی سلطنت میں ایجاد و معدوم اور بقاو فنا کے لحاظ سے، اور ہر قسم کا جلال و کمال ثابت ہے اس کے لیے، اور ہر بزرگی اور مکرمت صادر ہوتی ہے اسی سے ۔ **المقسط** بلحاظ اپنے عدل وانصاف کے ہر معاملے میں اور بندوں کے اعمال کی جزا دینے کے لحاظ سے دُنیا میں تحسین کے ساتھ، اور ملامت کے ساتھ اور سرور و ندامت دینے کے ساتھ، اور جزا اور تعزیر اور توقیر اور تحقیر اور عزت و ذلت اور نفع وضرر اور خیر وشر شریعت کے حکم کے مطابق اور نعمتوں سے نوازنا یا عذاب دینا آخرت میں اپنے وعدے اور وعید کے مطابق ۔ **الجامع** بلحاظ تمام کمال صفات کے اپنے نفس میں ذاتی معاملات میں چاہے وہ مثبت ہوں یا منفی ۔ اور بلحاظ تمام مجموعوں کو جمع کرنے کے، جیسے موجودات کا جمع کرنا کسی بھی عالم میں، عالم شہادت اور عالم ارواح اور عالم مثال میں سے ۔ جمع کرنے کے لحاظ سے مرکبات کے اجزا کو باوجود اس کے کہ ان کے مزاج مختلف ہیں، اور جمع کرنا اجزائے بسائط کا مشابہت کے ساتھ اور جمع کرنا اخلاق و اوصاف کا بہت زیادہ انسانِ واحد میں، اور جمع کرنا آثار و متعدد خواص کا ایک شخص میں یا ایک چیز میں، اور جمع کرنا اہلِ قبور کا بعثت کے ساتھ اس دن جس میں کوئی شبہ نہیں ۔
الغنی اپنے بے نیاز ہونے کے اعتبار سے ہر چیز سے اپنی صفات اور کمالات کی تکمیل واہتمام میں اور وہ موجود ہے کسی غیر سے وجود اخذ کیے بغیر، اور زندہ ہے بغیر مزاج کے، اور علم ہے بغیر کسبِ علم

کے اور سمیع ہے بغیر ہوا کے توسط کے اور بصیر ہے بغیر نور کی وساطت کے، اور قادر ہے بغیر آلات و اسباب کے، اور ارادہ کرنے والا ہے بغیر اس بات کے کہ اس کے دل میں کوئی خیال یا وسوسہ گزرے اور متکلم ہے بغیر لہجے اور آواز کے، اور کام کرنے والا ہے بغیر علت اور مادے کے۔ علیٰ ہذا القیاس۔ غنی ہے ہر اُس چیز سے جو اس کے سوا ہے تمام معاملات میں، اور تمام چیزیں موجودات میں سے اس کی محتاج ہیں۔ **المغنی** بلحاظ ڈالنے کے غنائے نفسی کو کامل اور قانع لوگوں کے نفوس میں اور عطا کرنے کے لحاظ سے عارضی تمنا امرا اور سلاطین کو اور بلحاظ عطا کرنے کے وجود اور کمالاتِ موجودات کو اپنے وجوب کے ضمن میں اور ہر ممکن واجب بالغیر ہو گئی ہے، اور فی الحقیقت اللہ غنی اور بے نیاز ہے اور تمام فقرا اور مغنی بمعنی معطی یعنی دینے والے کے بھی ہیں۔ اور اسی لیے کسی روایت میں لفظ معطی بھی آیا ہے اس کی جگہ۔ **المانع** بلحاظ روکنے کے عدم کو حضور اور واجبیت کی طرف، اور اُس کا روکنا وجود کو ممتنعات کی طرف، اور باعتبار اس کا روکنا حقیقت کے انکشاف کو محجوبین کے دلوں پر اور باعتبار نعمتوں کے روکنے کے کافروں پر، اور باعتبار اس کے روکنے کے احوالِ دُنیا کو فقرا پر اور باعتبار اس کا روکنا ممنوعات شر عیہ سے، اور باعتبار اس کا روکنا صحت کا مریضوں سے، اور زندگی کو مُردوں پر اور ہدایت کو روکنا گمراہوں سے اور اطمینان قلب کو روکنا لاچار لوگوں پر، اور باعتبار اس کا روکنا اشیائے متضادہ کو ایک جگہ پر جمع ہونے سے ایک وقت میں اور ایک حیثیت میں اور باعتبار اس کا روکنا تمام امورِ ممنوعہ کا مطلقاً، چاہے وہ اچھے ہوں یا بُرے جیسے ہدایت کا روکنا گمراہوں پر، اور ضلالت کو روکنا ہدایت یافتہ لوگوں پر اور جسے اللہ ہدایت دیتا ہے اس کو کوئی گمراہ کرنے والا نہیں، اور جسے وہ گمراہ کر دے اُسے کوئی ہدایت دینے والا نہیں۔ وہ تمام معاملات میں مانع ہے۔ اور نہیں ہے کوئی عطا کرنے والا اس چیز کو جسے وہ روک دے۔ **الضار** ضرر پہنچانے کے اعتبار سے مخلوقات کو دُکھ اور غم اور مرض اور تکلیف اور موت اور مال کا ضائع ہونا اور مطلوب کا کھو جانا۔ مصیبتوں اور آفتوں وغیرہ کے نزول کے اعتبار سے، اور تکلیف دینے والی اشیا کی ایجاد کے اعتبار سے کھانے والی اور مشروبات میں سے، جیسے زہر وغیرہ اور منحوس چیزوں میں سے، جیسے بعض ستارے وغیرہ۔ اور داخلی طور پر ضرر پہنچانے والی چیزوں میں سے، جیسے فاسد مواد اور ردی اخلاط میں سے، اور خارجی ضرر رساں اشیا میں سے، جیسے اسلحہ، موذی حیوانات اور ان جیسی دیگر اشیا۔ اور ذلیل صفات کی تخلیق کے اعتبار سے جو ضرر پہنچاتی ہیں نفوس

کو ۔ اور کمینے اخلاق، جو انسان کے لیے مہلک ہیں ۔ جیسے کفر، فسق، نفاق اور بغض اور ان جیسے اور کفار کو جہنم داخل کرنے کے لحاظ سے ۔ مومنین میں سے سرکشوں اور فاسقوں کو عذاب دینے کے اعتبار سے **النّافع** ہر اس چیز کے اعتبار سے جو الضارّ کے معنی کے مقابل میں آتی ہے ۔ **النّور** اپنے نفس ہی سے اپنے نفس کے لیے نورانیت کے اعتبار سے اور تمام منور چیزوں کو منور کرنے کے لحاظ سے نور ہے ۔ **الہادی** معاش اور معاد کی صلاح کی ہدایت کے اعتبار سے، اور حقائق کو دکھانے کے اعتبار سے جس شکل میں وہ ہیں اپنے بندوں کو وحی اور تعلیم جبرئیلؑ کے ساتھ، جیسے انبیائے علیہ السلام کے ساتھ سلسلہ رہا ۔ اور عقل و حکمت کے ساتھ، جیسے عقلاء اور حکماء کے لیے سلسلہ رہا جنھیں مشرف کیا اللہ نے ایمان اور حس اور حواس سے، اور اسی طرح عوام کے لیے ۔ اللہ ان سب کو بخشے ۔ **البدیع** اس لحاظ سے کہ وہ عدیم المثال ہے، اور اس لحاظ سے کہ وہ مخلوقات کو پیدا کرنے والا ہے ۔ جیسے اللہ سبحانہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ وہ آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے، اور بدیع آیا دونوں معنوں میں ۔ **الباقی** اس کی بقا کے دوام کے اعتبار سے، اس کے بعد جب کہ عالمین میں سے ہر چیز فنا ہو جائے گی، اور ہر چیز ہلاک ہونے والی ہے سوائے اس کی ذات کے ۔ **الوارث** وراثتِ حقیقی کے اعتبار سے جو پوشیدہ ہے نظروں سے ورثے میں سے ہر چیز جس کے لوگ وارث ہوئے، اس کی حقی وراثت اللہ کی ہے اور اس کی وہ کُھلی کُھلی وراثت جو ذہنوں میں آتی ہے عالم کی فنا کے بعد، اور اس کی طرف لوٹنے کے بعد جو وراثت کا تصوّر ذہن میں آتا ہے اس لحاظ سے ۔ **الرشید** بندوں میں سے ہدایت کے خواہش مند لوگوں کی رہنمائی کے اعتبار سے، اور اُس کے تمام افعال کے ہدایت پر مبنی ہونے کے اعتبار سے اور اُس کے تمام طریقوں کی ہدایت کے اعتبار سے، اور تمام احکام کی درستی کے اعتبار سے اور تمام معاملے کو راست روی کے اعتبار سے ۔ **الصبور** مجرموں سے انتقام لینے میں صبر کے اعتبار سے اور صبر کرنے کے اعتبار سے ہر اس چیز پر جس کا اُس نے فیصلہ کر رکھا ہے حکمتِ بالغہ کے تقاضے کے تحت جیسے علتوں کے بعد معلولات کی ایجاد اور دُنیا کو فنا کرنے کے بعد قیامت کو ظاہر کرنا اور علیٰ ہذا القیاس ہر اس چیز میں جو اس نے پیدا کی ہے زمانیات میں سے ۔

اسمائے الٰہی سے تعلق پیدا کرنے اور اخلاق خداوندی کو اپنانے کی تفصیل کا بیان

سمجھ لینا چاہیے کہ کمال اسی میں ہے کہ جہاں تک ہو سکے اخلاق خداوندی کو اپنایا جائے اور حق تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ سے قلبی تعلق پیدا کیا جائے۔ نیابتِ الٰہی اسی سے عبارت ہے۔ اسی لیے اخلاق خداوندی کو اپنانے کا حکم صادر ہوا۔ پچھلے باب میں اسمائے حسنیٰ کا بیان آچکا ہے۔ چونکہ اسمائے الٰہی ان گنت اور بے شمار ہیں، اور اسی بنا پر اس کے کمالات کی بھی انتہا نہیں۔ ایک حدیث شریف کے مطابق خدا تعالیٰ کے ننانوے نام جو لامتناہی اسمائے ذات کا سرچشمہ ہیں، اور سارے اسمائے الٰہیہ کا کلی ماخذ۔ دوسرے جزئی ناموں کا بھی یہاں اندراج ہوا، اور وقت نے ساتھ دیا، اور مہلت ملی تو ان کے اسرار و رموز کی تشریح بھی مناسب اختصار کے ساتھ صاحب بصیرت اصحاب کے لیے لکھ دی جائے گی، تاکہ مومنین ان اسمائے حسنیٰ کو زبانی یاد کر کے صبح و شام ان کا ورد کریں اور اپنی استعداد کے مطابق ان کے اسرار و رموز کو سمجھ کر ان اسمائے حسنیٰ سے قلبی تعلق پیدا کریں اور ان کو وسیلہ بنائیں، جہاں تک ہو سکے انہی اسماء کے اخلاق کو اپنانے کی کوشش کریں اور قربِ الٰہی کی نسبت پائیں اور ایمان کامل سے مالا مال ہوں۔ میرے قبلہ گاہی والد بزرگوار (خدا ان کے رازوں کی نصرت اور ان کی نیکیوں کی برکت و تقدس سے ہماری مدد فرمائے) اسی مذکورہ بالا ترتیب کے مطابق ہر صبح و شام ان ننانوے ناموں کا ورد کرتے تھے، اور فرمایا کرتے تھے کہ جو کوئی بھی ان اسمائے کے ورد وظیفہ میں تسلسل و تواتر پیدا کرے گا، اور اپنی حاجت طلب کرتے وقت جس اسم کو مناسب حال سمجھے اسے بار بار دہرائے اور اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کر کے اپنی مشکل کا حل طلب کرے۔ پوری اُمید ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مدد و معاونت آن پہنچے گی، اور اس کی حاجت پوری ہو جائے گی۔ لہٰذا اس قلبی تعلق اور اخلاق کو اپنانے کا بیان یکجا باہم کیا جا رہا ہے، اور اس تعلق اور تخلق کی مناسبت و ترتیب سے اسما کو تحریر میں لایا جا رہا ہے۔ اسی عالم و ہادیٔ برحق کی مدد سے، اسی کی طرف رجوع اور اسی پہ اعتماد کامل رکھو۔ لہٰذا یاد رکھو کہ لفظ ھُو اشارہ ہے اسی ذات مجرد اور اس کی ہویت کی طرف، اور اکثر کے نزدیک اللہ اُس ذات واجب الوجوب کا اسم خاص ہے۔ لیکن مخلص مومنوں کے نزدیک یہ تمام صفات اور جملہ کمالات کے مجموعی مرتبے کا اسم خاص ہے، نہ کہ ذاتِ پاک کے علم کا جیسی کہ وہ ہے۔ وہ ذات تو

اسم و رسم سب سے مبرا ہے۔ اگرچہ تمام نسبتیں اسی بلند و عالی مرتبے سے منسوب ہیں۔ اس امر کا مفصل بیان خطبے کی شرح میں درج ہے اور اسمائے حسنیٰ سے تعلق عبارت ہے حق تعالیٰ کے اُن اسماء کے معانی کی روشنی میں پختہ یقین پیدا کرنے اور پھر انہی ناموں کی بدولت ذات حق کی طرف رجوع کر کے اسے اپنا وسیلہ بنانے اور یوں دوامی مشاہدہ و حضوری کی سعادت پانے سے۔ اور اپنے دل میں اس مرجع اور مسمیٰ کی توجہ راسخ کرنے سے، اور تخلق عبارت ہے بشری طاقت اور ذاتی استعداد کے مطابق ان اوصاف پر دلالت کرنے والے اسما سے خود متصف ہونے سے۔ پس اس امر پر اعتقاد رکھنا چاہیے کہ لائق عبادت وہی حق تعالیٰ ہے۔ تمام صفاتِ خداوندی کا جامع بھی وہی ہے، اور اسی کے وجودِ حقیقی کو انفرادیت حاصل ہے۔ ہر موجود نے اپنے وجود کا اسی سے استفادہ کیا ہے وگرنہ فی ذاتہٖ وہ معدوم ہے۔ اس کا وجود اس وجہ سے ہے کہ اسے اللہ تعالیٰ سے نسبت ہے اور اُدھر ہی کو اُس کا رُخ ہے، اور سوائے رُخِ الٰہی کے ہر چیز فنا ہو جانے والی ہے، اور فی الحقیقت اس کے سوا کوئی موجود اور کوئی قائم بالذات نہیں۔ عالمانِ دین کے نزدیک اسم اللہ سے تعلق تو ہو سکتا ہے پر اس اسم سے تخلق کو وہ جائز نہیں سمجھتے۔ لیکن مخلص محمدیوں کے نزدیک اس اسمِ مبارک سے تعلق اور تخلق دونوں میسّر ہو سکتے ہیں۔ کیونکہ تعلق عبارت ہے اس مرتبۂ جامعہ پر پختہ عقیدے سے جس میں اسم اللہ ہی پر دلالت کی گئی ہے۔ اور تخلق عبارت ہے ان تمام ممکن الحصول اوصاف سے مجموعی طور پر متصف ہونے سے۔ اسم اللہ سے تخلق یہی انسانی جامعیت کی حیثیت ہے۔ اور نیابتِ الٰہی اور رحمتِ خداوندی کو دُنیا کے ہر موجود کے حال میں بلا شرط شامل سمجھنا چاہیے۔ اور جہاں تک ہو سکے ان صفتوں سے متصف ہونے کا عزم رکھنا چاہیے اور حتی المقدور اللہ کے بندوں سے بھلائی کرنی چاہیے۔ رحمت کے معنی ہی حاجت مندوں سے بھلائی کرنا ہے۔ سب سے بھلا آدمی وہ جس سے لوگوں کو نفع پہنچے، اور رحمتِ الٰہی کو آخرت میں خصوصاً مومنوں کی بخشش اور جنت کی نعمتوں سے نوازنے پہ محمول کرنا چاہیے، اور ان اوصاف سے متصف ہونے کے ارادے میں طریقِ محمدیؐ کی تبلیغ و فیض رسانی اور آخرت میں مومنوں کی بھلائیوں کو پیشِ نظر رکھنا چاہیے، اور ان کے حق میں ان کے انجام بخیر اور اخروی نجات کی دُعاؤں میں مصروف رہنا چاہیے، اور قربِ الٰہیہ کی نسبت، نیک کاموں کی تعلیم، اوراد و وظائف کے ذکر اذکار اور علومِ دین و عبادات میں مشغولیت سے

اپنے ظاہر و باطن کا تصفیہ اور تزکیہ کرنا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ کو کون و مکان کا بادشاہ اور دونوں جہانوں کا حاکم سمجھنا چاہیے، کیونکہ حقیقی بادشاہت اسی کی ہے، اور دونوں عالم اسی کے احاطۂ قدرت میں ہیں۔ ان اوصاف سے متصف ہونے کا قصد اپنے اندرونی تابعین یعنی حواس اور اعضا کی حکومت اور دینوی تابعین یعنی آل اولاد، یار دوستوں اور دیگر ماتحتوں پر حکمرانی کے ذریعے کرنا چاہیے، اور اخلاق کو سدھارنے اور خاندانی اصلاح پہ توجہ دینی چاہیے، اور اپنے وجود کی مملکت کی شہری سیاست میں مصروف ہو جانا چاہیے، کہ تیرا یہی قفس عنصری تیرے لیے ہفت اقلیم ہے۔ اور دُنیا میں بھی جہاں تک تیرا نام و نشان پہنچے گا تیری اسی ولایت میں شامل اور تیری سلطنت میں شمار ہے۔ بلکہ تو چونکہ زمین پر خلیفۂ حق ہے، تو اللہ کے فضل و کرم سے اور نیابتِ رسولِ مقبولؐ کی برکت سے چار دانگ عالم تیری خلافت تلے ہیں۔ حق سبحانہ تعالیٰ کو کمی کے داغ، ذاتی امکان اور حادث ہونے کے لوازم سے بالکل پاک اور منزہ سمجھنا چاہیے۔ اور اُسے ہر اس وصف سے جسے انسانی حس محسوس کر سکے یا انسانی خیال اُسے پا سکے یا انسانی وہم وہاں تک پہنچ سکے یا انسانی عقل و فہم اس کا احاطہ کر سکے۔ پاک سمجھنا چاہیے۔ وہ ان سب سے بہت آگے بہت دُور ہے۔ ان صفات سے متصف ہونے کا ارادہ ہو تو اپنے ظاہر و باطن کو ظاہری نجاستوں اور باطنی خباثتوں، خلافِ شرع کاموں کے میل کچیل اور علائق دُنیا کے داغ دھبوں سے پاک رکھو۔ ہمیشہ طہارت سے رہو۔ باوضو رہو۔ اور ظاہری باطنی طور پہ پاک صاف رہو۔ اور حق تعالیٰ کو ذاتی عیوب، وصفی نقائص اور فعلی شرّوں (بدیوں) سے بے عیب اور بے داغ سمجھنا چاہیے۔ اور راسخ عقیدہ رکھنا چاہیے کہ اس کی ذات بے عیب ہے۔ اس کی صفات میں کوئی نقص نہیں۔ اس کے افعال میں کوئی شر نہیں، اور اپنی ذات وصفات اور افعال میں مجموعی طور پہ محمود، کامل اور سراپا خیر ہے۔ اور انھی صفات سے متصف ہونے کا ارادہ یوں کرنا چاہیے کہ اپنی ذات کو غفلت کے عیب سے بچائے رکھو، اللہ کی طرف دائمی توجہ رکھو اور اپنی صفات کو مزید آراستہ کرو۔ قابلِ ستائش اوصاف حاصل کیے جائیں اور اپنے افعال کو اچھا بنایا جائے، اور نیک کام کیے جائیں۔ خدا کی ذات اور اُس کی وحدانیت پہ غیر مشروط ایمان لاتے ہوئے اُسے دُنیا میں امان کے اسباب پیدا کرنے اور آخرت میں نجات دہندہ کی بنا پر مخلوق کا امان دہندہ سمجھنا چاہیے۔ اس صفت سے متصف ہونے کا ارادہ خلقِ خدا کو اپنے شر سے محفوظ رکھنے اور حتی الوسع ان کے دل سے خوف و ہلاکت کو دفع کرنے اور بندگانِ خدا

کے لیے ان کی رشد و ہدایت کے ذریعے عذابِ الٰہی سے رہائی اور امن کا موجب ہونے سے کرنا چاہیے۔ حق تعالیٰ کو مختلف النوع مخلوق کا نگہبان سمجھنا چاہیے اور محافظِ کل۔ اس سے شرم و حیا کرنی چاہیے اور ظاہری اور باطنی شرعی ممنوعات سے پرہیز کرنا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ کی اس صفت کو اپنانے کا ارادہ خود اپنے حال کی تمام احوال میں نفسانی خواہشوں، قلبی وسوسوں، ماسوی اللہ کے مخصوں، معاشی بیقراریوں اور تضیعِ اوقات کی نگہبانی سے کرنا چاہیے اور مستقل طور پر دائماً ذکر و فکر، غور و خوض اور حضوری و مشاہدہ میں مشغول رہنا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ کو اس کی ذاتی ارجمندی سے عزیز سمجھے اور بندوں کو عزت دینے والا بھی اُسی کو جانے۔ اسی سے عزت طلب کرے نہ کہ دُنیاوی مال و اسباب سے یا ہم جنسوں سے۔ جیساکہ قرآن پاک میں آیا ہے۔ کیا یہ ان لوگوں کے پاس معزز رہنا چاہتے ہیں۔ سو اعزاز تو سارا خدا تعالیٰ کے قبضے میں ہے۔ اس صفت سے متصف ہونے کا ارادہ حق سبحانہ کی عزت کے ضمن اور دامن تلے خود عزتِ نفس حاصل کر کے کرے۔ یعنی اپنے نفس اور نفسانی و جسمانی خواہشات دینوی امور، اور رذیل خصلتوں پر اللہ تعالیٰ کی عزت یعنی اس کے غلبے اور دبدبے کا نقش پیدا کرے۔ اور اسی کی پاک ذات کو تباہ حالوں کی اصلاح کنندہ اور شکستہ دلوں کی شکست و ریخت کا درست کنندہ اور حقیقی غالب اور بلند و اعلیٰ و ارفع سمجھنا چاہیے۔ اس صفت سے متصف ہونے کا ارادہ ہو تو بڑے خشوع و خضوع و عجز و انکساری اور شکستہ دلی سے اللہ کی طرف توجہ اور رجوع کرے۔ اپنے نقائص کو دُور کرے۔ اپنی انا و تکبر کو توڑے، اور پھر تصفیۂ قلب و تزکیۂ نفس سے اس توڑ پھوڑ کو درست کرے۔ اللہ تعالیٰ کو اصل بزرگی و عظمت کا مالک سمجھ کر اُس کی کبریائی کے مشاہدے میں مستغرق ہو کر عجز و نیاز و انکساری کا طریقہ اپنائے اور کبھی تکبر، غرور و نخوت اور سرکشی نہ کرے۔ اور ہمیشہ درویشوں اور مسکینوں میں اُٹھے بیٹھے۔ اور اس صفت کو اپنانے کا ارادہ یوں کرے کہ ذاتِ حق تعالیٰ کے مشاہدے سے عظمت حاصل کرے۔ اور متکبر سرکشوں، امیروں اور بادشاہوں میں سے کسی کو خاطر میں نہ لائے۔ ذاتِ حق کی کبریائی کے مشاہدے کا ثمرہ بھی اسی عظمت میں ملتا ہے نہ کہ غرور و نخوت سے۔ تمام موجودات عالم اور مخلوقات دُنیا کو پیدا کرنے، وجود میں لانے اور صورت بخشنے والا اسی کی ذات کو سمجھے اور یہ تین اسمائے حسنیٰ خالق، باری اور مصوّر انہی معانی میں ہیں، اور ان میں نہایت ہی دقیق اور نازک سا فرق ہے، جیساکہ ان کے امتیازات کی تشریح کے سلسلے میں اوپر بیان آچکا ہے۔ ان صفات سے

متصف ہونے کا ارادہ مجازی راہ سے حاصل ہوتا ہے، اور وہ یہ ہے کہ ایسی مفید مطلب اختراعات کرے، نئی نئی چیزیں اور خاص وضعیں بنائے اور ایسے کارہائے خیر کرے جو کثیر المنفعت ہوں۔ صورت، شکلوں کو زینت بخش ہوں، جیسا حضرت قبلہ گاہی نے نو ایجاد چیزیں مثلاً پل سفری، تنبو، سائبان، گل تکیے، حمام اور دیگر ہوش افزا کھیلیں (کھیل کود کے سامان) مفید اور کار آمد چیزیں، اور ضروریاتِ زندگی کی جزئی اور کلی اشیا بنوائیں اور مخلص مومنوں کے لیے ایک خاص وضع کی ٹوپی، تلوار کا تسمہ، حمائل شریف اور محمدی نشان (پرچم) کو ساتھ رکھنے کی تاکید کی ہے، جو مومنوں کے لیے نصرت خداوندی اور فتح مندی کی علامت ہے۔ کہ یہ بہت کار آمد بھی ہیں اور شان و شوکت اور زینت میں بھی اضافہ کرتی ہیں۔ لیکن ان اسمائے حسنیٰ کو اپنے اخلاق کا حصہ بنانے کی قوت ہر کسی عارف کو، ہر وقت ہی عطا نہیں ہوتی۔ مدتیں گزر جاتی ہیں۔ گردشِ دوران کے ہزار در ہزار چکروں کے بعد کہیں جا کر کوئی ایسی ہستی پیدا ہوتی ہے جو ان اخلاقِ خداوندی کا مظہر ہو۔ سو کیسی بڑی شان ہے اللہ کی جو تمام صناعوں سے بڑھ کر ہے۔ سو اس صفت سے متصف ہونے کی ہر شخص کو بے فائدہ کوشش نہیں کرنی چاہیے اور خواہ مخواہ تقلیدی طور پر بے فائدہ چیزوں کی ایجاد و اختراع کا تکلف نہیں کرنا چاہیے۔ کیونکہ وہ سب کچھ تو فضولیات ہی میں شامل ہوگا۔ ان کے لیے یہی باعثِ سعادت ہے، کہ وہ بزرگوں کی ایجادات کی ترویج قائم رکھیں اور ان چیزوں کو صفحۂ ہستی سے مٹنے نہ دیں، تاکہ لوگوں کو اس سے ظاہری و باطنی فائدہ حاصل ہو، اور انھیں دونوں جہانوں کی فلاح و بہبود نصیب ہو۔ کیونکہ نیکی کی طرف رہبری کرنے والا نیکی کرنے والے کی مانند ہوتا ہے اور حق سبحانہ تعالیٰ کو گناہوں کا بخشنہار اور عیبوں اور گناہوں کا پردہ پوش سمجھنا چاہیے، اور اُس کی بخشش کا اُمیدوار رہنا چاہیے، اور صفت سے متصف ہونے کا ارادہ لوگوں کی عیب پوشی اور تقصیروں کی معافی سے کرنا چاہیے، بلکہ خود اپنی اور باقی سب کی ہستیوں کو مشاہدہ ذات سے ڈھانپ لینا چاہیے، اور ذاتِ حق کے مشاہدے میں محو و مستغرق ہو جانا چاہیے اور اللہ تعالیٰ کو ہر موجود پر غالب اور ہر امر پر قاہر اور تمام مجازی غالبوں اور ظاہری قاہروں سے بڑھ کر غالب اور قاہر سمجھنا چاہیے، اور خوفِ الٰہی سے لرزتے، کانپتے اور ڈرتے ہوئے اس کی رحمت کا ملتجی رہنا چاہیے۔ اب اس صفت سے متصف ہونے کا ارادہ مندرجہ ذیل چیزوں پر غلبہ پانے سے کرے، مثلاً نفس امارہ، شیطان، دنیوی حرص اور ہوا و ہوس پر غلبہ اور دین کے دشمنوں سے

اپنی ہمت وطاقت کے مطابق ٹکر لے کر اُمرا ، بادشاہوں اور دنیاوی شان وشوکت والوں سے کبھی مغلوب نہ ہو۔ بلکہ غلبۂ حق کے ضمن میں ان پر غالب آنے کی کوشش کرے اور علمائے ظاہر بھی اپنے علمی غلبے کی بنا پر بجز عنایت الٰہی اور حمایتِ رسالت پناہی کے، غیظ و غضب خداوندی کے ان مظاہر پہ غالب نہیں آسکتے، بلکہ وہ ان کی اطاعت کی طرف مائل ہوتے ہیں۔ اگرچہ بعض علوم میں وہ ان بزرگوں سے زیادہ معلومات ہی کیوں نہ رکھتے ہوں۔ علم کی افزونی اور شے ہے، اور معلومات کی زیادتی اور چیز ہے۔ اس کا تعلق الفاظ سے ہے، اور اُس کا معانی سے ہے، لہذا اس کا خاصہ ذکاوصفا سے ہے۔ اور یہ کُندذہنی و نادانی سے بھی جمع کی جاسکتی ہیں۔ اور عزم بالجزم کر لینا چاہیے کہ دُنیاوی امور میں سے کوئی امر مثلاً راحت و رنج، امیری وغریبی، من پسند و مکروہ، غم اور خوشی اور ایسی ہی دیگر کیفیات و احساسات تیرے نفس پہ غالب نہ آنے پائیں، اور تجھے حدِ اعتدال سے متجاوز نہ کر دیں۔ ہاں بشری تقاضوں کے مطابق ان آثار کے معتدل انداز میں مرتب ہونے سے مضائقہ بھی نہیں۔ بمصداق اس آیت کریمہ کے کہ اللہ تعالیٰ کسی شخص کو مکلف نہیں بناتا مگر اُس کا جو اس کی طاقت اور اختیار میں ہو۔ حق سبحانہٗ تعالیٰ کو ظاہری، باطنی، دینی و دنیوی بخششوں، بخشائش و عطیات کا بخشندہ یوں سمجھے کہ جو کچھ بھی ہے اسی کی دین ہے، اور جو کچھ درکار ہو اُسی سے مانگے۔ بلکہ مانگے تو یہی کہ تیرے دل میں اُس کی طلب، قرب، نزدیکی اور رحمت کے سوا اور کسی چیز کی طلب ہی نہ رہے۔ اس صفت سے آراستہ ہونے کا ارادہ سخاوت، خیرات، اور محض اللہ کی خاطر اپنی جان مال اور آبرو کی بازی لگا کر کرے، جس میں کسی نفسانی خواہش کا دخل نہ ہو، اور پھر اس سلسلے میں حتی الوسع دریغ نہیں کرنا چاہیے۔ اور علم و معرفت، حضوری و مشاہدہ، حب الٰہی، اعتقاد و پرہیز گاری و اخلاقِ حسنہ اور ادب کے سلسلے میں تجھ سے جو کچھ بھی سرانجام پائے اس کا فائدہ خدا کے بندوں، اور راہِ ہدایت کے طالبوں کو پہنچنا چاہیے۔ تمام روزی خوار مخلوق کا روزی رساں اسی کو سمجھنا چاہیے۔ کیونکہ بدنوں اور روحوں کو جسمانی اور روحانی غذا وہی مہیّا کرتا ہے، اور وہی سب کی روزی کا ضامن ہے۔ اس کی رزّاقیت (روزی رسانی) پر مکمل اطمینان، راسخ عقیدہ اور پورا ایمان ہونا چاہیے۔ اس صفت سے متصف ہونے کے لیے لوگوں کو نان و نفقہ دے اور فیض پہنچائے، اپنی بساط بھر فیض رسانی سے دریغ نہ کرے۔ اللہ ہی کو تمام مخلوقات کا کارکشا اور کارساز سمجھے اور ہر ظاہری اور باطنی اُمید کی کشائش

اسی سے سمجھے، اور اس صفت کو جہاں تک ہو سکے لوگوں کی کار کشائی کر کے حاصل کرے، اور خدا کے بندوں پر علم و معرفت، رشد و ہدایت، انعام و اکرام، قربانی و ایثار، اور دیگر کارہائے خیر کے دروازے کھول دے، اور ان کے لیے فیض ربانی کا کھلا ہوا دروازہ بن جائے۔ اور حق تعالیٰ کو سب اشیا میں سب سے بڑا دانا و عالم سمجھے، اور اُس کے علم کو تمام اُمور کی جزئیات و کلیات پر محیط سمجھے اور پھر حقیقت کو ملحوظ رکھتے ہوئے اسی کے مناسب عمل پیرا ہو۔ اور اسی پاک کیفیت کو خوب سمجھ کر اپنے ظاہر و باطن کو بُرے کاموں اور فاسد خیالوں سے پاک رکھے۔ اپنے علم کو علم الٰہی میں گم کر کے ہمیشہ مشاہدۂ ذات میں محو و مستغرق رہنا چاہیے۔ اس صفت سے متصف ہونے کا ارادہ انسانی طاقت کے مطابق علم و معرفت حاصل کرنے سے کرے، اور اللہ تعالیٰ ہی کو اُس کے اسمائے جلالیہ کے تقاضے کے مطابق عمزدوں کے دماغوں، کم نگاہوں کے دلوں اور دل گرفتہ لوگوں کے سینوں کو تنگی دینے والا روحوں کو قبض کرنے والا، اور رزق و روزی کو تنگ کرنے والا سمجھنا چاہیے۔ اور ایسے ہر امر، جس کا تعلق دل گرفتگی تنگی اور انقباض سے ہو۔ اسی کے اسم "القابض" کا اثر سمجھتے ہوئے اس دل گرفتگی و تنگی و انقباض پر صبر کرنا چاہیے، اور اس صفت سے متصف ہونے کے لیے شکوہ و شکایت سے اپنی زبان بندی اور لذّات شہوانی و نفسانی پہ اپنے نفس کا قافیہ تنگ کر کے اور دل و ناخوشگواری سے کرے، اور ان امور کا حصول بھی اسی کے بابرکت نام سے کرے۔ اللہ تعالیٰ اپنے اسمائے جمالی کے تقاضے کے طور پر شاد و شادکام حضرات کے دماغوں، سیر چشم حضرات کے دلوں اور انشراحی حالت والے سینوں کو فراخی اور کشائش بخشنے والا ہے اسی کو (باطنوں) پوشیدگیوں اور روزیوں کو فراخی دینے والا سمجھنا چاہیے اور یوں جو بات بھی کشادگی، فراخی اور کشائش سے متعلق ہو۔ اسے حق تعالیٰ کے اسم باسط کا اثر سمجھتے ہوئے اپنی کشائش رزق، فراخی طبع اور خوش حالی کا شکر ادا کرنا چاہیے۔ اس صفت سے آراستہ ہونے کا ارادہ اپنی کشادہ پیشانی، خندہ جبینی اور کلمات شکر کی ادائیگی سے کرنا چاہیے۔ اور شرعی حکم کے مطابق اپنے نفس کو بھی اطاعت کی اجازت دے کر حتی المقدور خدا کے بندوں کی فراخ روزی کا باعث بننا چاہیے، اور اللہ تعالیٰ ہی کو کافروں اور رسولِ خدا کے دشمنوں کے مراتب کو گرانے اور نیچے لانے والا، اور بعض چیزوں کو بعض کی نسبت پست تر اور ادنیٰ بنانے والا سمجھنا چاہیے اور ہمیشہ عذاب کے نچلے طبقات سے خائف رہنا چاہیے، اور خدا کی پناہ طلب کرنی چاہیے۔ اس صفت کو

یوں اپنایا جا سکتا ہے کہ دُنیا اور اُس کے رنج و راحت کو نظر انداز کر دے ، اور اہلِ دُنیا کے اس اعتباری جاہ و حشمت کو اپنی نگاہِ معرفت میں بالکل حقیر و ناچیز سمجھے ۔ اور مالی امارات کو قلبی استغنا سے بہت گھٹیا سمجھے ، اور اسی ذات سبحانہ تعالیٰ کو مومنوں کے اور رسولؐ خدا کے دوستوں کے درجات کو بڑھانے ، بلند کرنے اور بعض چیزوں کو بعض دوسری چیزوں پر بلندی اور برتری دینے والا جانے ۔ اور اُس کے فضل و کرم سے ہمیشہ عالی مرتبوں پر فائز ہونے کا اُمیدوار رہے ۔ بلند نظر بننا چاہیے ۔ اس صفت سے متصف ہونے کا ارادہ خود اپنی ہمت کو بلند کر کے ، حقیقی مراتب عالیہ کو باطل کے ادنیٰ امراتب پر برتری دے کر اور اہل حق کو اہلِ باطل پر ترجیح و فوقیت دے کر کرنا چاہیے ۔ اور خدا تعالیٰ ہی کو مومنوں کو دُنیا و آخرت میں ایمان ، علم و معرفت ، حق و صداقت ، محبت ، اطاعت ، ہدایت ، نعمت دینے والا سمجھنا چاہیے ۔ اور نجات میں درجات کی بلندی کے سلسلے میں خود اپنے لوگوں کے نزدیک معزز و آبرومند بنانے والا گردانا چاہیے ۔ عزت اسی سے مانگنی چاہیے ۔ اس صفت سے متصف ہونے کا ارادہ مومنوں ، عالموں ، عارفوں ، صادقوں ، محبّوں ، عابدوں اور ہدایت یافتہ لوگوں کی عزت و احترام کرنے سے کرنا چاہیے ۔

یہی سمجھے کہ اللہ تعالیٰ ہی کافروں کو دونوں جہانوں میں اُن کے کفر ، جہل ، تکبر ، جھوٹ ، دشمنی ، گناہوں ، گمراہی ، بغض و کینہ اور ادنیٰ امرتبے سے ذلیل و خوار کرنے والا ہے ۔ اور ایسے رذیل امور سے خدا کی پناہ ڈھونڈنی چاہیے اس صفت سے آراستہ ہونے کے ارادے کی تکمیل اپنے منکر نفس امارہ ، اپنی جاہل طبیعت اور اپنے غرور و تکبّر کی تذلیل کر کے کرنی چاہیے ۔ کافروں ، جھوٹوں اور دین محمدیؐ سے موافقت رکھنے والوں کے دشمنوں کو مصلحتاً بھی کھلے بندوں رسوا کرنا چاہیے ، تاکہ اہل ہدایت اور گم کردہ راہوں میں امتیاز ہو سکے ۔ لیکن صرف اتنا ہی جتنا کہ بندگانِ خدا کے لیے نفع مند ہو ، نہ کہ اتنا زیادہ جو نقصان دہ بن جائے ۔ یعنی ہر مومن وقت کے تقاضے کے مطابق مدّمقابل کے مناسب حال اور مجلس کی نوعیت کے سزاوار ذلت ہی تھوپے اور اپنے غیظ و غضب اور حمیت کے مُنہ زور گھوڑے کو یونہی سرپٹ نہ دوڑائے ۔ اور اپنے اس للّٰہی عمل کو نفسانیت کے ساتھ خلط ملط نہ کر دے ۔ (اسے اچھی طرح سمجھ لو) اللہ تعالیٰ ہی کو تمام قابلِ سماعت چیزوں یعنی آوازوں ، لفظوں اور اقوال و کلمات نیز تمام مقاصد یعنی مرادوں ، نیتوں ، خیالوں اور ظاہری باطنی گمانوں اور قیاسوں کا سننے اور جاننے والا ماننا چاہیے ، اور ہمیشہ اپنی زبان کو ناشائستہ الفاظ اور دل کی بُری آرزوؤں ، نامعقول ارادوں ، بُری نیتوں اور وہمی گمانوں سے روکے رکھنا چاہیے ۔

اس صفت سے متصف ہونے کا ارادہ ہو تو تمام سُنی گُنی باتوں کے پردے اور جملہ آوازوں اور مقولوں کی اوٹ سے کلام الٰہی ہی سُن کر اپنے نفس کو تنبیہ اور آگاہ و خبردار کرنے سے کرے۔ جس کسی سے کوئی بات بھی سُنے وہ اگر اچھی ہو، اور ہدایت پر دلالت کرتی ہو تو اس سے استفادہ کرنا چاہیے، اور اس آیت کریمہ کے مطابق عمل پیرا ہو کہ جو اس کلام الٰہی کو کان لگا کر سنتے ہیں، پھر اسی کی اچھی اچھی باتوں پر چلتے ہیں۔ غفلت سے سننا نہ سننے کے برابر ہے جیسا کہ خود خداوند تعالیٰ غافلوں کی حالت کے متعلق فرماتا ہے کہ کیا ان (منکروں) کے کان ایسے ہو جاویں جن سے سننے لگیں۔ دکھائی دینے والی چیزوں مثلاً رنگوں، جسموں، کاموں، عملوں، ڈھانچوں اور شکلوں، غرضیکہ ہر اُس چیز کو جس کا تعلق دیکھنے یا دکھائی دینے سے ہو۔ حق تعالیٰ کو ان سب کا دیکھنے والا سمجھے۔ لیکن اس حقیقت کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے ہمیشہ باحیاء باادب رہے، کیونکہ حیا ہی سے ایمان ہے، کے یہی معنی ہیں۔ نیک کاموں اور عملوں میں مشغول رہنا چاہیے، اور بری حرکات سے بچنا چاہیے۔ اس صفت کو اپنانے کا ارادہ ہو تو نظر آنے والے مظاہر قدرت میں اسی کی گوناگوں تجلّیوں کو دیکھے، اور یہ سمجھ کر دیکھے کہ ہر چیز کے آگے بھی وہی ہے، پیچھے بھی وہی، ہر چیز کے ساتھ بھی وہی ہے، اور ہر چیز کے اندر بھی وہی جلوہ فرما ہے۔ یعنی کہ تو کسی شے کو نہ دیکھے جب تک تو یہ نہ سمجھ لے کہ اُس کے آگے، پیچھے، ساتھ اور اُس کے اندر وہی ہے۔ ان مظاہر میں سے جن کا رُخ ہدایت کی جانب ہو ان کی طرف بڑھیے اور جن کا رُخ گمراہی کی جانب ہو ان سے مُنہ پھیر لیں، اور خدا سے پناہ مانگیں۔ اور یوں صاحب بصیرت لوگوں کے زمرے میں شامل ہو جانا چاہیے۔ اشیا کو یونہی جہالت سے دیکھنا، نہ دیکھنے کے برابر ہے۔ کیونکہ ایسے عقل کے اندھوں کے متعلق خدا خود قرآن پاک میں فرماتا ہے کہ جن کی آنکھیں ایسی ہیں جن سے وہ دیکھتے نہیں۔ اللہ تعالیٰ کو تمام دینی اور دنیوی احکام میں بے بند و بار حاکم سمجھنا چاہیے، اور تمام موجودات میں اسی کے حکم کو نافذ سمجھنا چاہیے۔ اور ساری مخلوقات کو اسی کا محکوم جاننا چاہیے، جیسا کہ قرآن نے فرمایا ہے کہ سبھی اسی کے مطیع و فرمانبردار ہیں۔ اور شرع مصطفویؐ اور طریق محمدیؐ ہی کی راہ پہ چلنا چاہیے کہ یہ شرع متین اپنے سے پہلی شرعوں کو منسوخ کرنے والی اور ساری شریعتوں کو ختم کرنے والی ہے۔ یہ پختہ طریقہ، سب طریقوں سے اچھا ہے، اور یہ راہ ساری راہوں سے راست تر ہے۔ اس صفت سے متصف ہونے کا ارادہ ہو تو اپنے نفس، اپنی طبع، اپنی آل اولاد اور تابع اشیا جیسے اپنے جسمانی اعضا اور اجزا وغیرہ پہ صحیح

حکومت اور درست فرمانروائی کرے۔ سب حاکموں کا حاکم اعلیٰ اللہ ہی ہے۔ اسی کی پاک ذات کو حقیقی عادل اور منصف سمجھنا چاہیے۔ وہ عینِ عدل ہے، اور ظلم وستم سے بالکل پاک ہے، کیونکہ ظلم عبارت ہے کسی دوسرے کے ملک پر قبضہ کرنے سے، مگر اللہ کے سوا کوئی اور مالک نہیں۔ ملک بھی اُسی کا ہے اور حکم بھی اسی کا۔ نیز ظلم عبارت ہے کسی شے کے بے محل وضع ہونے پر اور حق تعالیٰ نے ہر ماہیت کو وہی کچھ عطا کیا جس کی وہ مقتضی تھی۔ اور جس کی اس میں استعداد تھی۔ کسی شے کو بے محل وضع پر نہیں بنایا ۔۔ اور نہ ہی بے جا بنایا۔ جیسا کہ ان آیاتِ کریمہ میں آیا ہے کہ یہ بات ثابت ہی ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں، نیز اللہ تعالیٰ نے ان پر ظلم نہیں کیا، لیکن وہ خود ہی اپنے آپ کو ضرر پہنچا رہے ہیں، اور اللہ تعالیٰ کے سب کام سیدھے اور معتدل ہیں۔ اُس نے وہی کچھ کیا جو کیا جانا چاہیے تھا۔ اس کے کسی کام پہ اعتراض نہیں کرنا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ کی کاریگری کے اس کارخانے میں شکوک وشبہات اور ترددات کی الجھنیں (گرہیں) انسانی ذہنوں پر ان کی اپنی ہی نادانی اور جہالت سے پڑ جاتی ہیں، اور پھر مزید الجھتی جاتی ہیں۔ اُس کے تمام کام، اغراض اور سوال وغیرہ سے مبرا ہیں جیسا کہ قرآن میں آیا ہے کہ اللہ سے سوال نہیں کیا جاتا جو کام وہ کرتا ہے، اور لوگوں سے سوال کیے جائیں گے۔ اس کے سبھی کام اچھے اور خوب ہیں۔ تمھیں چاہیے کہ اپنی ایمانی قوت سے اپنے دل ودماغ کی تختیوں سے شکوک وشبہات کے یہ داغ دھو ڈالو اور بشری طاقت کے مطابق نور معرفت سے حقیقتِ الٰہیہ کا ادراک کرو۔ اُسے تمام مجازی عادلوں سے زیادہ بڑا عادل سمجھو اور اپنے آپ کو لغویت کے بیابان میں خواہ مخواہ ہلاک نہ کرو۔ اس صفت سے متصف ہونے کا ارادہ تمام امور میں عدل وانصاف برتنے سے کرنا چاہیے، کسی پر ظلم روا نہیں رکھنا چاہیے، نہ کسی کی حق تلفی کرنی چاہیے۔ نماز ورکوع وسجود کو اطمینان سے ٹھیک ٹھاک ادا کرنا چاہیے۔ جہاں تک ہوسکے خدا، رسول ؐ، والدین، مرشد اور تمام بندگانِ الٰہی کے حقوق کو ان کے مرتبوں کے مطابق اور درجوں کے فرق کی مناسبت سے ادا کرنا چاہیے کسی شے کی وضع بے محل نہیں ہونی چاہیے، نہ ہی ظلم کرنا چاہیے۔ یعنی بزرگوں کی پیروی کرنی اور چھوٹوں کو ادب سکھانا چاہیے۔ جو بات سمجھنے کے قابل ہو اُسے سمجھنا چاہیے، اور جو کام کرنے کے لائق ہو اسے کرنا چاہیے۔ اور جو بات تیرے فہم وادراک سے بالاتر ہو، اس پر صرف خدا اور رسول ؐ اور مرشد کے فرمودات کی روشنی میں یقین کرو۔ اور اس سلسلے میں اپنے ناقص فہم سے تردد میں نہ پڑنا چاہیے،

اور نہ ہی اپنے اوپر ظلم کرنا چاہیے۔ جو عمل شرعِ دینِ متین اور طریق محمدیؐ میں منع ہو اُس سے بچنا چاہیے خواہ تمھاری سمجھ کے مطابق اس میں کوئی قباحت نہ ہو اور طبیعت بھی اس کے ارتکاب پہ مائل ہو۔ اگر اتفاقاً کبھی بمقتضائے بشریت کوئی چھوٹا یا بڑا گناہ سرزد ہوجائے تو خود کو تنبیہ کے ساتھ توبہ بھی کرنی چاہیے، اور خود کو قصوروار سمجھنا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ کی عدالت سے ڈرنا چاہیے، اور اس کے فضل وکرم کا اُمیدوار رہنا چاہیے۔ اے اللہ ہم گناہگار محمدیؐ تیرے انصاف کی تاب نہیں لاسکتے۔ اسی لیے ہم تیرے فضل کے دامن کو تھامتے ہیں۔ اور گناہگاروں کی شفاعت کرنے والے (ان پر خدا کا درود وسلام) کی شفاعت کی چادر میں خود کو ڈھانپتے ہیں۔ میرے جدِّ بزرگوار حضرت خواجہ بہاؤالدین نقشبند رحمہ نے کیا سچ فرمایا تھا کہ ہم تو اللہ کے فضل والے بندے ہیں۔ ہمیں فضل کے دروازے ہی سے اندر لایا گیا ہے۔ جیساکہ اس آیت قرآنی سے ثابت ہے کہ تمام تعریفیں اللہ ہی کے لیے ہیں۔ جس نے ہم کو بہت سے ایمان والے بندوں پر فضیلت دی۔ حق سبحانہٗ تعالیٰ کو اپنے بندوں سے نرمی اور ملائمت کے ساتھ سلوک کرنے والا سمجھنا چاہیے۔ بندے پر خدا کا لطف عبارت ہے اطاعت اور نیک عمل کرنے کی توفیق عطا کرنے نیز گناہوں اور بُرے کاموں سے روکنے سے۔ لطفِ خداوندی کی تفسیر، مصلحتوں کی باریکیوں کے علم، انوار کی پوشیدگیوں، اور نرم وملائم انداز میں صلح جوئی تک پہنچانے سے بھی کی ہے، اور حقیقت یہ ہے کہ الطاف الٰہی بے انتہا ہیں جن کی جزئیات کو گنا نہیں جاسکتا۔ اور وہ عام طور پر ہر موجود کے شامل حال ہیں۔ کائنات کا کوئی ذرّہ بھی لطف خداوندی سے خالی نہیں، لیکن کلّی طور پر اس کی نو قسمیں ہیں۔ جن کے اپنے ذیل میں ان گنت جزئیات آتی ہیں۔ پہلی قسم تخلیقی یا پیدا کرنے کی ہے، اور یہ ہے کہ تمام موجودات کو اُسی نے وجود عطا کرکے لطف فرمایا۔ یہ وہ لطفِ عام ہے جس پہ کوئی قید نہیں ہر موجود میں شامل ہے۔ دوسری قسم ہے لطف روحانی یعنی غیر مادی اشیا پہ اپنا پرتو ڈالا، جیساکہ عقول وارواح اور فرشتے۔ تیسری قسم صوری لطف جو مادی اشیا، خوبصورت صورتوں، موزوں شکلوں، نرم و نازک جسموں، صاف شفاف جرموں، خوش نما رنگوں اور متناسب آوازوں کے حصے میں آیا۔ چوتھا ظاہری لطف جو صحت وسلامتی اور امن وعافیت سے عبارت ہے۔ ہرچندکہ یہ لطف بھی عام ہی ہے۔ لیکن کبھی کبھار خصوصیت بھی اختیار کرلیتا ہے۔ یوں کہ بعض پہ بعض اوقات ہوتا ہے، اور بعض اوقات نہیں ہوتا۔ اور کبھی کسی

ایک ہی شخص میں کسی ایک عضو میں ہوتا ہے، اور دوسرے عضو میں نہیں ہوتا۔ پانچواں باطنی لطف ہے جو نبیوںؑ، ولیوں، خوش خلق، پاک طینت، صابر، آزاد منش، خوش خصال اور نیک سیرت لوگوں کو حاصل ہوتا ہے۔ چھٹا علمی لطف ہے جو سب سے پہلے تو انبیاؑ و اولیائے کرام کو میسر آتا ہے اور ان کے بعد دانشمندوں، عقلمندوں، عالموں، باخبر سالکوں اور صاحب معرفت مجاہدوں کو اپنی اپنی استعداد کے مطابق حاصل ہوتا ہے۔ ساتواں عملی لطف ہے۔ یہ بھی پہلے انبیاؑ و اولیائے کرام کے حصّے میں آتا ہے، اور ان کے بعد صالح، عبادت گزار، صاحب شعور، دُنیادار، دانا اور عاقل بندوں کو بھی حاصل ہوتا ہے۔ آٹھویں قسم دنیاوی لطف ہے جو بادشاہوں، امیروں، حاکموں، فاسقوں اور غافلوں کو حاصل ہوتا ہے۔ نواں اخروی لطف ہے جو اللہ کے مقربین کو یہاں بھی حاصل ہے اور آخرت میں بدرجۂ کمال حاصل ہوگا، اور نجات پانے والوں کو یہ فقط آخرت ہی میں معلوم ہوگا۔ اس صفت سے متصف ہونے کا ارادہ ہو تو بندگانِ خدا پر لطف کرے۔ عبادات کی ادائیگی اور ہر حال میں اور ہر چیز پر لطفِ حق کا دائمی مشاہدہ کرے، اور یوں سراپا الطافِ خداوندی سے لبریز ہونا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ کو ماضی، حال و مستقبل کی تمام خبروں سے آگاہ و مطلع سمجھنا چاہیے۔ اس صفت کو اپنانے کا ارادہ خود خبر و آگہی اور دائمی حضوری و مشاہدے سے کرنا چاہیے، اور حق سبحانہ تعالیٰ کو حلیم اور اعتباری تغیر و تبدّل سے ناقابلِ تغیر سمجھنا چاہیے، اور خود ہمیشہ حلم خداوندی کی تجلّی کا اُمیدوار رہنا چاہیے۔ اس صفت سے آراستگی کا ارادہ ہو تو پھر حلم، بردباری، وقار، تمکنت، عفو و درگزر اور اسی قسم کی دیگر صفات کو اپنے اندر پیدا کرنے کی کوشش کرو۔ اور اس سلسلے میں ایسا ملکہ حاصل کرو کہ تمھارے نفس کو کبھی غضب و شہوت کی کیفیات متغیر نہ کرنے پائیں اور نہ ہی تمھیں حدِّ اعتدال سے متجاوز ہونے دیں، اور تم سے کبھی ناکردنی امور ظہور ہی میں نہ آئیں۔ اس پاک ذات کو حقیقی عظمت اور شان و شوکت والا سمجھنا چاہیے۔ عظمت الٰہی کے مشاہدے کے سلسلے میں ہمیشہ اپنے آپ کو حقیر سمجھنا چاہیے۔ بلکہ بالکل ناچیز سمجھتے ہوئے فنا فی اللہ ہو جانا چاہیے۔ اس صفت سے متصف ہونے کا ارادہ ہو تو ہمت بلند رکھے۔ ہر وہ ملکہ حاصل کرے جس سے اللہ کے نزدیک اس کی وقعت بڑھے۔ چنانچہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ وہ عمل کرنے والا عالم جو بہت سے لوگوں کو پڑھاتا ہے عالم ملکوت میں اُسے عظیم انسان کے نام سے پکارا جائے گا۔ انسانوں میں کاملانِ حق کا عظیم مرتبہ تو انبیائے کرام کو حاصل ہے۔

(ان پر خدا کا درود و سلام) اور ان سب میں عظیم ترین ہمارے پیغمبر علیہ السلام ہیں۔ اور عالم اجسام میں عرش عظیم اور اس عالم میں انسانی روح ہیں۔ اللہ تعالیٰ کو گناہوں اور گنہگاروں کو بخشنے والا سمجھنا چاہیے اور اُس کی بخشش کا امیدوار رہنا چاہیے۔ اس صفت سے متصف ہونے کے ارادے کی تکمیل خود اپنے غلاموں اور ماتحتوں کو معاف اور اپنے ساتھ لین دین کرنے والوں کی خطاؤں کو بھلا کر کرنی چاہیے۔ بندگانِ خدا سے کینہ اور دشمنی نہ رکھنی چاہیے، سوائے اس بغض کے جیساکہ دینِ متین مصطفیٰؐ اور طریقِ مستقیم محمدیؐ کے معاندوں سے دشمنی، کیونکہ اس قسم کا بغض دین کی حمیت کے زمرے میں آتا ہے اور یہ ایمانی قوت، راسخ عقیدے اور خدا اور رسولؐ اور مرشد کی محبت کے قوی جذبے کا نتیجہ ہوتا ہے۔ محبت بھی ہو تو اللہ کے لیے اور بغض بھی ہو تو اللہ ہی کے لیے۔ ذاتی خباثت زیب نہیں دیتی۔ نہ یہ کہ اپنے طریق کی حمیت سے بھی باز رہے۔ خدا تعالیٰ کو شکر کی جزا دینے والا سمجھنا چاہیے پھر اپنی حکمتِ کاملہ کے مقتضی کے مطابق مخلوقات کو ایسے احسن طریق سے تخلیق کرنے پر کہ جس سے بہتر طریق تصوّر میں بھی نہیں آسکتا۔ اسے اپنی ذات کا سپاس گزار جاننا چاہیے۔ اور اپنے منتخب (مثلاً نبیؑ، ولی، عالم، صالح اور مومن) بندوں کا مداح اور ثناخواں بھی سمجھنا چاہیے۔ اس صفت سے متصف ہونے کے ارادے کی تکمیل، اپنی زبان پر شکر کے کلمات جاری کرکے اور ہر حال میں حالتِ شکر کو قائم رکھ کر اور اللہ کی بنائی ہوئی چیزوں کو عبرت و آگہی کی نگاہ سے دیکھ کر اور دائمی مسرت اور روحانی سرور حاصل کرکے کرے۔ ہر وقت خدا کی رضا پہ راضی اور شکرگزار رہنا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ کو سب سے بلند تر سمجھے، اور سب عالی رتبے والوں سے اعلیٰ و ارفع مرتبے کا حامل سمجھے۔ اور پھر اُسی اعلیٰ مرتبے کو ہمیشہ مدِنظر رکھے، اور ہمیشہ اسم اللہ کا ذکر کرے یہاں تک کہ قلب جاری ہوجائے جیساکہ خود خدائے عزّوجل نے فرمایا ہے کہ اے رسولؐ آپؐ اور آپ کے ساتھ جو مومن ہیں اپنے پروردگار عالیشان کے نام کی تسبیح کیجیے۔ اس صفت سے آراستہ ہونے کا ارادہ ہو تو باطنی ترقیات میں عالی ہمتی حاصل کرے، اور ماسوی اللہ اور حبِ دُنیا سے قطع تعلق کرکے روحانی بلندی پیدا کرے۔ حق سبحانہٗ تعالیٰ کو عظیم اور حقیقی عظمت کا مالک سمجھے، اور ذاتِ حق کی عظمت کے سامنے خود کو چھوٹی بڑی موجودات میں بھی حقیر اور کم تر سمجھے۔ اہلِ دُنیا کے ٹھاٹھ باٹھ کو خاطر میں نہ لائے، اور آدم علیہ السلام سے لے کر قیامت کے دن تک کی مدّت کو آنکھ جھپکنے کی مدّت

سمجھے، اور قیامت کے دن کے متعلق یہ آیتِ کریمہ کہ ہم اُسے قریب دیکھ رہے ہیں۔ انہی معنوں میں آئی ہے، نہ یہ کہ وقت کم ہونے کی بنا پر حشر کا دن قریب آن پہنچا ہے۔ جیسا کہ اکثر کم فہم جاہل بیچارے چوپایوں جیسے عوام کے ہجوم کے سامنے قیامت کے آنے کی مدت کو سالوں میں بیان کرتے ہیں۔ نہیں ایسا ہرگز نہیں۔ قیامت کتنی مدت بعد آئے گی، یہ تو فقط اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے اگرچہ قیامت کا آنا یقینی اور برحق ہے، لیکن کتنے عرصے بعد آئے گی۔ اس کے سالوں کا شمار تو لاکھوں کروڑوں میں نہیں سما سکتا بلکہ انسانی حساب دانوں کے حساب و شمار سے باہر ہے۔ اس کو وہی شمار کر سکتا ہے جسے قرآن پاک میں بہت جلد حساب لینے والا کہا گیا ہے، اور دوسرا کوئی اس کے شمار کی طاقت نہیں رکھتا۔ لیکن تیری قیامت تو تیری موت ہی ہے۔ اور مرنے کے بعد یہ ساری طویل مدت تو آنکھ جھپکنے میں ختم ہو جائے گی، اور قبروں والے شور مچادیں گے کہ ہمیں ہماری قبروں میں سے کس نے اُٹھایا۔ اُنھیں طوالتِ مدّت کا پتہ ہی نہ ہوگا۔ جیسے کہ سونے والے کو رات کی درازی کا پتہ ہی نہیں چلتا، اور جاگنے والے کو چار پہر گزارنے دوبھر ہو جاتے ہیں۔ کیا تم دیکھتے نہیں کہ آخر روزِ ازل کو بھی تو اس سے کم عرصہ نہیں گزرا۔ کیونکہ آفرینش کے ابتدائی زمانے کی مدت بھی تو ہمارے حساب و شمار سے باہر ہے۔ اگرچہ یہ مدت حادث ہے۔ لیکن ایسی حادث بھی نہیں کہ اس کی طوالت تمھارے حساب و شمار میں آسکے۔ یہ سارا عرصہ بعد آخر کٹ ہی گیا، اور یکایک تو وجود میں آیا، اور تیرے ظہور کی نوبت اس زمانے میں آئی۔ تجھے اس ساری مدت کی طوالت کی کچھ خبر نہیں، اور اس کا گزرنا تو اب تجھ پہ ہرگز گراں نہیں گزرتا۔ اور تو نے اس بنا پر کوئی رنج و زحمت نہیں اُٹھائی، اور بعض احمق لوگ جو کہتے ہیں کہ آدم علیہ السلام کو آئے سات ہزار سال گزرے ہیں وہ شعور سے قطعاً بہرہ مند نہیں۔ دوسری اقوام کی تاریخی کتب میں لکھا ہے کہ کسی ایک واقعے یا فلاں واقعے کو ہزاروں سال گزر گئے ہیں۔ اور انسان سے تعلق رکھنے والی ان سب گوناگوں صنعتوں کو پیدا ہوئے بس سات ہزار سال ہی گزرے۔ یہ تو محال امور میں سے ہے۔ ایک ایک صنعت کو سیکھنے کے لیے سالہا سال چاہئیں، چہ جائیکہ اس مدت میں ان کی اختراع و ایجاد بھی شامل ہو۔ حدیث شریف میں بھی یونہی آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آدمؑ کو لاکھوں سال پہلے پیدا کیا، اور حضرت علیؓ سے ایک روایت مشہور ہے کہ کسی نے ان سے پوچھا کہ آدم علیہ السلام سے پہلے کیا تھا۔

آپ نے فرمایا آدم - پھر پوچھا اس سے پہلے کیا تھا - فرمایا آدم - اس نے پھر پوچھا تو بھی وہی جواب دیتے ہوئے فرمایا کہ تم اگر ستر سال تک مجھ سے یہ پوچھتے رہو تو بھی مجھ سے یہی جواب سنو گے - لہٰذا آیات قرآنی یا احادیث نبوی سے کہیں آدم علیہ السلام کی پیدائش کی مدت معلوم نہیں ہوتی، سوائے اس کے کہ سب سے اوّل اللہ کے نبی بابائے آدم (ان پہ اور ہمارے نبی پر درود و سلام ہو) بن ماں باپ کے پیدا ہوئے پھر سب بنی نوع انسان ان کی نسل میں. یہ سچ ہے کہ اللہ کا برگزیدہ بندہ حضرت آدمؑ نوع انسانی کا پہلا فرد ہے - لیکن ان کی پیدائش کی مدّت کوئی انسان نہیں جانتا، یہ صرف ان کا خالق ہی جانتا ہے کہ وہ کس وقت پیدا کیے گئے، یا پھر فرشتے جو اُن کی تخلیق سے پہلے پیدا ہو چکے تھے - اور وہی سب کچھ جاننے والا اور حکمت والا ہے - اس صفت سے متصف ہونے کا ارادہ ہو تو اس کی تکمیل بزرگوں کی سی وضع قطع اور بڑوں کے طور اطوار اپنا کر اور ذاتی عظمت سے شرفیاب ہو کر کرنی چاہیے، اور اپنے آپ کو دوسروں کی نظر میں حقیر و ذلیل نہ کرنا چاہیے - دیکھئے یہ دعائے پیغمبرؑ کہ اے اللہ مجھے بنا دے میری نگاہ میں چھوٹا اور لوگوں کی نگاہ میں بڑا - حق تعالیٰ کو ہر شے کا نگہبان سمجھ کر اُس کے تحفظ پر اعتقاد رکھنا چاہیے - اور ماسوی اللہ کا خوف اور ڈر دل سے نکال پھینکنا چاہیے - حفاظت کے خواہ کتنے ہی ظاہری اسباب مہیّا کیوں نہ ہوں اُنھیں بھی اسی حافظ حقیقی ہی کی طرف سے سمجھنا چاہیے - اور اس صفت سے متصف ہونے کا ارادہ ہو تو ظاہراً شرعی آداب کی نگہبانی اور باطناً حق تعالیٰ کی حضوری و مشاہدے کی نگہبانی اور اپنے اندر اپنی ہمت اور وسعت کے مطابق موجودات کے تمام مراتب کی درجہ وار جمع بندی سے کرے - اللہ تعالیٰ تمام بدنی قوتوں کا خالق ہے - بدنوں میں قوت رسان بھی اُسے ہی سمجھنا چاہیے اور روحانی قوتوں کا خالق بھی اور ارواح کا قوت رسان بھی اسی کو سمجھنا چاہیے - یہ دونوں قوتیں اسی سے طلب کرنی چاہئیں، اور ظاہری طور پہ بھی اس کے حسین مظاہر کو ملحوظ خاطر رکھنا چاہیے، یعنی وہی پیشہ یا ہنر اختیار کرے جس کی شرعاً اجازت ہو، پھر اکتساب بھی شرعی شرائط کو ملحوظ رکھ کر کرے - توکّل کا پیشہ بھی اک ہنر ہی ہے - جیسا کہ فرمایا آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلم نے کہ سارے نبیوں نے کوئی نہ کوئی پیشہ اختیار کیا، لیکن ان کا پیشہ درویشی و جہاد پر مشتمل تھا - یہ پیشہ بہت مشکل اور کٹھن ہے - اللہ تعالیٰ کی مدد و معاونت کے بغیر اس پیشے کے آداب و شراط کو بجا لانا ناممکن نہیں، اور انسانی قوت اس کی متحمل نہیں ہو سکتی - جن کی گزر بسر توکّل پہ ہو وہ لوگ محبوبِ خدا ہوتے ہیں - خود قرآن

میں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ متوکل لوگوں کو محبوب رکھتا ہے۔ روحانی غذا پہنچانے والے مظاہر استادان و مرشدانِ کامل ہوتے ہیں۔ اس حقیقی روزی رساں سے روحانی غذا کی جستجو انہی کے دروازوں سے کرنی چاہیے اس صفت کو اپنانے کے لیے اپنی بساط کے مطابق مسکینوں اور محتاجوں کو غذا مہیا کرنی چاہیے۔ نیز اپنی استعداد کے مطابق روحانی غذا کے طالبوں کو بھی روحانی غذا پہنچانی چاہیے، اور سارے کاموں کے لیے اللہ ہی کو تمام و کافی سمجھنا چاہیے اور اللہ کے سوا کسی کی مدد و معاونت کو خاطر تلے نہ لاؤ۔ ظاہر میں تجھے یہ مدد و اعانت خواہ عمر، بکر یا زید سے پہنچے اُسے بھی اللہ ہی کی جانب سے سمجھنا چاہیے، اور خدا کا شکر بجالانا چاہیے اور ان ظاہری مظاہر کا شکریہ بھی خوش خلقی اور احسان مندی سے بڑے اچھے الفاظ میں ادا کرنا چاہیے، اور اس کے بدلے میں حتی الوسع دینی اور دُنیاوی اُمور میں اُن سے نیکی اور ان کے حق میں دعائے خیر کرے۔ کیونکہ جو بندوں کا شکریہ ادا نہیں کرسکتا وہ اللہ کا شکر گزار کیسے ہو سکے گا، اور خود ہر وقت صرف اسی پر توکل کرنا چاہیے، جیسا کہ قرآن پاک میں آیا ہے کہ جس نے اللہ پر توکل کیا تو اللہ اس کے لیے کافی ہے۔ وہی کافی ہے۔ اس کے سوا اور کوئی کفایت کرنے والا نہیں۔ اس صفت سے متصف ہونے کے لیے خالص محمدیوںؐ کی ہر کام میں مدد امداد کرنی چاہیے، اور خود اپنے نفس پہ کفایت کرتے ہوئے ان پر اپنی خدمت گزاری اور مدد امداد کا بوجھ کم ڈالنا چاہیے۔ مقدور بھر اپنے کام آپ ہی کرنے چاہئیں اور دوسروں کے کام آنا چاہیے سوائے ادنیٰ اور رذیل کاموں اور ناشائستہ خدمات کے جو تمہاری وضعداری اور مرتبے کے شایان نہ ہوں۔ دیکھیے یہ آیت کریمہ کہ اللہ تعالیٰ کسی شخص کو مکلف نہیں بناتا مگر اُس کا جو اس کی طاقت اور اختیار میں ہو۔ حق سبحانہٗ تعالیٰ کو حقیقی عظمت اور جلالت کا مالک سمجھنا چاہیے، اور ہمیشہ اپنی چشمِ بصیرت سے جلالِ الٰہی کے مشاہدے میں پورے انہماک، اضمحلال اور محویت سے اپنے آپ کو فنافی اللہ کر دینا چاہیے، اور اللہ تعالیٰ کے نور بزرگی کے سامنے باقی تمام ماسوی اللہ کو ناچیز سمجھنا چاہیے۔ اس صفت کے حصول کے لیے اپنے اندر بزرگانہ اخلاق و اوصاف اور بزرگانہ وضع کے شایانِ شان اقوال و افعال پیدا کرنے چاہئیں اور اپنے سے چھوٹوں اور ماتحتوں کے ساتھ وقار اور تمکنت اور رعب داب سے گفتگو کرنی چاہیے لیکن تندی و تیزی اور سختی سے نہیں بلکہ بڑی شفقت، مہربانی اور عنایت کی شکل میں بھی۔ حفظِ مراتب کے آداب کو ملحوظِ خاطر رکھنا چاہیے اور اپنے آپ کو ان کی نظروں میں بے وقار اور بے وزن نہیں بنانا

چاہیے، کیونکہ یہ بات دونوں کے لیے دینی اور دنیاوی امور میں مفید ہے۔ یہ بات چھوٹوں کے حالات کی اصلاح کنندہ بھی ہے، اور بڑوں کے شایان شان بھی۔ حق تعالیٰ کو حقیقی سخی اور صاحب جود و سخا سمجھنا چاہیے اور ہمیشہ اس کی نوازشات کا امیدوار رہنا چاہیے، اور اس کی طرف دوامی کشش، انتظار اور رجوع حاصل کرنا چاہیے۔ اس صفت سے آراستہ ہونے کے لیے مخلوق خدا کے ساتھ معاملات کے دوران اپنے اندر کریمانہ اوصاف پیدا کرنے چاہئیں۔ اور انسانی طاقت کے مطابق خود بھی کریم اور سخی ہونا چاہیے، اور یہاں تک ہو سکے وعدہ وفا کرنے اور دوسرے کریمانہ اوصاف بجالانے کے لیے پورا اہتمام کرنا چاہیے جیسا کہ مشہور ہے کہ کریم جو ہے وہ وعدہ وفا کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کو تمام اشیا کا نگہبان، محافظ اور ناظر سمجھنا چاہیے، اور نگہبانی حق کو ہمیشہ اپنی چشم بصیرت کا نصب العین بنانا چاہیے۔ اس صفت سے متصف ہونے کے ارادے کی تکمیل اپنے حال اور دل کی نگہبانی کر کے کرنی چاہیے۔ اور ہمیشہ نگہبان حقیقت ہونا چاہیے، یعنی اپنی توجہ اللہ ہی کی طرف مرکوز رکھنی چاہیے۔ اور اپنے دل کو باطل خیالوں اور وسوسوں سے باز رکھنا چاہیے۔ اپنے باطن کو بُری کیفیات اور ظاہر کو بُرے اعمال سے پاک رکھتے ہوئے خود ہی اپنا نگہبان بن جانا چاہیے۔ ہر صبح و شام مراقبہ کر کے ظاہر و باطن کا مجموعی جائزہ لے تاکہ دوسروں کو بھی فائدہ پہنچے اور یوں یہ فیض عام بن جائے، اور بزرگوں کے دستور کے مطابق توجہ اور مراقبے کا سلسلہ بھی جاری رہے، اور درحقیقت مراقبے کا یہ ڈھب اور اسی توجہ کے وقت سالک کو اپنے روبرو بٹھا لینا ہمارے مرشدوں کا اختیار کیا ہوا ہے۔ اور نقشبندی اور مجددی سلسلوں میں جاری کیا گیا ہے۔ جو لوگ ایسی مقدس محفلوں میں پہنچے اور اس طریقے میں داخل ہوئے انھوں نے اس کی عجیب و غریب اور زبردست تاثیرات اور فوری نتیجے دیکھے ہیں۔ ناواقف بیچارے تو معذور ہیں۔ وہ ان بزرگوں کے اکثر و بیشتر معاملات پر تعجب کرتے ہیں اور شکوک و شبہات میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ انھیں بھی یہ راہ دکھائے اور بزرگوں کے انکار سے روکے۔ دگرنہ بزرگوں کے ہر سلسلے میں ایسے بہت سے طریقے ہیں جس سے دوسرے سلسلے والوں کو آگاہی نہیں ہوتی، اور وہ ان پر شک و شبہ کرتے ہیں۔ یہاں ان کی تفصیلات کا لکھنا مناسب نہیں، کیونکہ ہمارا مقصد دوسروں کے طریقوں پر اعتراض کرنا نہیں، بلکہ اس حقیقت کا اظہار تو ان کے باطل شکوک و شبہات کو رفع کرنے کے لیے کیا گیا ہے۔ ورنہ نہ تو کوئی دشمنوں کی زبان سے بچ سکتا

ہے، اور نہ کوئی معترضین کے ہاتھوں سے رہائی پا سکتا ہے، اور حق تعالیٰ ہی کو ہر سوال کا جواب دینے اور ہر دُعا کو قبول کرنے والا سمجھنا چاہیے۔ جو کوئی بھی اسے پکارتا ہے اور اُس سے سوال کرتا ہے۔ خواہ اپنی استعداد کی زبان سے، خواہ ماہیت کے تقاضے سے وہی اسے شرفِ قبولیت بخشتا ہے یہ ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ ہر ممکنہ حقیقت اس واجب الوجود سے اپنی استعداد کے مطابق طلب کرتی ہے، اور جو کچھ ذاتی تقاضے کے مطابق اس سے مانگتی ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کی دُعا کو قبول کر کے اس کی مطلوبہ شے فراہم کر دیتا ہے۔ سوال خواہ زبانِ حال سے کیا جائے یا زبانِ قال سے، ان کے قبول ہونے کا اعتبار نہیں۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے یہ دعائیں بھی قبول ہو جاتی ہیں، اور بعض مُرادیں جو زبان سے بول کر مانگی جائیں، اور بعض جو حالاً بیان کی جائیں وہ بھی پوری ہو جاتی ہیں۔ اور کبھی یوں ہوتا ہے کہ زبانِ قال یا زبانِ حال سے چاہے ہزار بار کیوں نہ مانگا جائے۔ ان کی مقبولیت کا کوئی نشان ظہور پذیر نہیں ہوتا۔ چنانچہ اکثر جاہل طبع فضول طلبوں کو یہی معاملہ در پیش ہوتا ہے۔ اور یہ امر اللہ تعالیٰ کی صفت ایجاب و قبول میں تردد کا باعث نہیں بنتا، کیونکہ یہ جاہل طبع فضول طلب اپنی استعداد اور اپنی حقیقت سے اتنا زیادہ طلب کرتے ہیں جو ممنوعات میں داخل ہے۔ اور اگر واجب الوجود ان امور کو بھی وجود میں لے آئے تو گویا اس نے وہ کچھ کیا جو نہیں کرنا چاہیے تھا۔ اور یہ بات اسراف میں داخل ہوگی نہ کہ جود و سخا میں۔ جود و سخا اک ہنر ہے لیکن اسراف اک عیب ہے۔ اور حق تعالیٰ سراپا مجموعہ ہے صفاتِ کمال کا اور ناقص صفات سے مبرّا ہے۔ حالاً یا قالاً مانگی جانے والی ہر دُعا جو استعداد اور ماہیت کے تقاضوں کے مطابق ہو اُسے اللہ تعالیٰ یقیناً قبول فرما لیتا ہے۔ اور بندوں کے کہے بموجب ظاہر میں بھی اسے ظہور میں لے آتا ہے، اور اُن کے مناسب حال عطا فرما دیتا ہے۔ لیکن چونکہ ہر شخص کو اپنی استعداد اور ماہیت کی مطابقت کا علم نہیں ہوتا اور وہ اپنی زبان حال کو اپنی حقیقت کے اقتضا کے مطابق نہیں کھول سکتا اُسے چاہیے کہ اٹکل ہی سے پتھر پھینکنے کی طرح ہر وقت خدا سے وہ شے طلب کرتا رہے جو اس کا فضول من چاہتا ہے، اور اُمید کی ڈور ٹوٹنے نہ دے۔ جو دُعا قبول ہو جائے اُسے مقبول دُعاؤں میں شمار کر لے، اور جو ظہور پذیر نہ ہو سکے اُسے اُن دعاؤں کے زمرے میں شامل کر لے جو خلاف رضائے الٰہی ہوں، اور یوں راضی برضائے مولیٰ کریم ہو جائے، اور قبولیت حق کے بارے میں اپنے دل کے اندر شکوک و شبہات نہ لائے۔

اپنی کوتاہی کا اعتراف کرے۔ ادب کی حد سے تجاوز نہ کرے۔ اگر اس حقیقت کو پاکر اپنی فضول طلب کو ترک کردے اور خود کچھ نہ مانگے، اور اس کے انداز سے اور تقدیر کے حوالے کرکے زبان کو سوال کرنے سے روک لے۔ اور معاملہ چونکہ ذات حق سے ہے، اور تمام اعمال کا فیصلہ نیتوں ہی پر ہوتا ہے۔ اس صفت سے متصف ہونے کے ارادے کی تکمیل یوں کرے کہ دین و دُنیا کے معاملے میں اللہ کے بندے جو اُس سے مانگتے ہیں اُن کی طلب و استدعا کو پورا کرے، اور جہاں تک ہو سکے اس سلسلے میں کوتاہی نہ کرے۔ اور ہر بے کس کے حالِ زار کو شفقت بھری نگاہ سے دیکھے اور ہر ملتجی کی التجا کو کان لگا کر سُنے تاکہ ان نعمتوں کا شکر ادا ہو سکے جو حق تعالیٰ نے اُسے عطا کی ہیں، اور ساتھ ہی بشری طاقت کے مطابق اُس حقیقی مجیب الدعوات کی صفت کو بھی اپنایا جا سکے۔ جیسا کہ قرآن مجید میں آیا ہے۔ اور آپ (اس کے شکرانے میں) یتیم پر سختی نہ کیجیے اور سائل کو مت جھڑکیے (یہ تو شکر فعلی ہے) اور اپنے رب کے انعامات کا تذکرہ کرتے رہا کیجیے (یہ شکر قولی ہے) اور ان سوالوں سے جو تمھارے مقدور سے باہر ہوں اور ان مطلوبات میں سے جن کی تمھیں قدرت نہ ہو، اُنھیں منع شدہ امور کی قسم میں شامل کرکے نہ سُنی گئی دعاؤں کے زمرے میں رکھ لو جو رضائے حق کے مطابق نہ تھیں۔ اور اپنے آپ کو ان کے سرانجام نہ پانے پر خواہ مخواہ پریشاں حال اور پراگندہ خاطر نہ کرنا چاہیے اور جو چیز فوری طور پر ادا ہو سکتی ہو اسے واجبات میں شمار کرکے فوراً عمل پیرا ہو جانا چاہیے اور جس کے پورا کرنے کی قوت کا احتمال اپنے اندر پاؤ اُسے ممکنات کی قسم میں شمار کرکے اُس کا وعدہ کرکے اگلے کو وقت مقررہ کا امیدوار بنا دو۔ اور خود سراپا تجلیات ذات کا آئینہ دار بن کر فنا فی اللہ کی منزل سے بقا باللہ کی طرف بڑھ جاؤ۔ کیونکہ جو اللہ کا ہو جائے اللہ اس کا ہو جاتا ہے، اور اللہ تعالیٰ کو حقیقی وسعتوں کا مالک اور تمام اضافی وسعتوں کو فراخ کرنے والا سمجھنا چاہیے۔ خواہ وہ وسعتیں باطنی ہوں یا ظاہری، علمی ہوں یا جسمی، نفسی ہوں یا وصفی، اُس کی یا وسعت ذات کو تمام ذاتوں پر، اُس کے وسیع علم کو تمام معلومات پر، اُس کی وسیع رحمت کو تمام اشیا پر اور اُس کی فراوانیٔ نعمت کو تمام نعمتوں پر محیط سمجھنا چاہیے۔ کیونکہ اللہ جل شانہٗ وعم نوالہٗ تمام حقیقی صفات کا واسعِ مطلق ہے۔ اس صفت سے متصف ہونے کے ارادے کی تکمیل علم و عرفان کی وسعت، فراخ حوصلگی اور طور طریقوں میں وسعت پیدا کرکے کرنی چاہیے۔ ہمیشہ خندہ جبین رہے، اور دُنیا کی مکروہات اور اہل دنیا سے

کبھی نہ اُکتائیے ۔ دل ہمیشہ کھُلا رکھنا چاہیے ۔ حکمتِ کاملہ کا مالک اسی حق تعالیٰ کو سمجھنا چاہیے ۔ یعنی اس کے علم کو کامل اور اس کے عمل کو بہترین سمجھنا چاہیے ، کیونکہ دانا اسی کو کہتے ہیں جو اشیا کی حقیقت کا کماحقہٗ عالم ہو اور صنعتوں کو خوب جانتا ہو ، اور صنعت کو مزید استوار اور مضبوط کرے ۔

اور یہ خدا کا کام ہے جس نے ہر چیز کو (مناسب انداز پر) مضبوط بنا رکھا ہے ۔ یہ یقینی بات ہے کہ اللہ تعالیٰ کو تمھارے سب افعال کی پوری خبر ہے ۔ لہٰذا حکمتِ خداوندی پر اعتماد کرتے ہوئے موجودات میں جو کچھ بھی دکھائی دے ، اور جیسے معاملات بھی رونما ہوں ، ان سب کو بجا اور برمحل سمجھے اور جاہلوں کی طرح یونہی فضول اور بے فائدہ مشاہدہ نہ کرے ۔ جیساکہ قرآن شریف میں آیا ہے ، کہ کیا تم نے یہ خیال کیا تھا کہ ہم نے تم کو یونہی مہمل (خالی از حکمت) پیدا کر دیا ہے (اور یہ خیال کیا تھا) کہ تم ہمارے پاس نہیں لائے جاؤ گے ۔ حقِ تعالیٰ نے جو کچھ پیدا کیا ہے سب برحق ہے نہ کہ باطل ۔ اور اسی کی حکمت بالغہ ہر شے میں شامل ہے ۔ کیونکہ دانا کا کوئی کام بھی حکمت سے خالی نہیں ہوتا ۔ اس صفت سے متصف ہونے کے ارادے کی تکمیل طاقت بشری کے بموجب ہر امر کا صحیح علم اور اُس حقیقت واقعی کی دریافت اور بھلے اور بُرے اعمال و افعال کو بجالانے سے کرے ، یعنی کہ تیری قوت ادراک خطا کی دریافت سے مبرا و منزہ ہو ۔ اور تیرا کوئی قول و فعل بے فائدہ اور حکمت سے خالی نہ ہو ۔ اور بموجب فرمان خداوندی سچ تو یہ ہے کہ جس کو دین کا فہم مل جائے اس کو بڑی خیر کی چیز مل گئی حق تعالیٰ کو اپنا دوست سمجھنا چاہیے ۔ خدا تعالیٰ تجھ سے جو معاملہ بھی کرے اُسے اُس کی دوستی ہی پر محمول کرنا چاہیے ۔ اگرچہ بظاہر تمھیں اس سے اختلاف اور نفرت ہی کیوں نہ ہو ۔ یعنی اگر تمھیں بلاؤں ، دکھوں اور بیماریوں اور دیگر مکروہات میں مبتلا کر دے ، اور فقر و مسکنت ، مفلسی اور تنگدستی اور تنگ روزی سے دوچار کر دے تو بھی ان تمام معاملات کو اس کی دوستی ہی سے منسوب کرو جس سے اُسے تمھاری تربیت منظور تھی ۔ نہ یہ کہ اُس کی دُشمنی اور غیظ و غضب پہ محمول کرو ۔ حق سبحانہٗ تعالیٰ درست ہے اور مومنوں سے اس کا ہر معاملہ دوستی ہی کا آئینہ دار ہوتا ہے ۔ مثال کے طور پر کوئی باپ یا اُستاد اپنے کسی بیٹے یا شاگرد کو غصّے میں آ کر مارتا ہے تو محض اس کی تربیت اور اصلاح کے لیے ہوتا ہے وہ بھی دوستی اور محبت ہی ہے جو غصّے کی صورت میں نمودار ہوئی ۔ اور معالج جو مریض کو کڑوی کسیلی دوائیاں کھلاتا ہے اور مرغن اور لذیذ غذاؤں سے منع کرتا ہے تو وہ محض مریض

کی خیر خواہی کے لیے کرتا ہے، نہ کہ کسی دشمنی کی وجہ سے۔ اس مطالعے کے نتائج نہایت ہی مفید ہوتے ہیں۔ یہ مقام رضا اور سکون قلب کے حصول کا موجب بنتا ہے۔ خدا نہ کرے کہ مومن کو اپنے فقر و فاقہ اور بیماری و دکھ تکلیف پر خدا تعالیٰ کی دشمنی کا گمان گزرے۔ اور صحت و دولت کو اس کا فضل سمجھے بلکہ مومن تو باری تعالیٰ کے ہر سلوک کو اس کی دوستی اور مہربانی ہی سمجھتا ہے خواہ وہ اسے امیر کر دے یا غریب۔ خواہ تندرست رکھے یا بیمار، خواہ سکھ میں رکھے یا دکھ میں۔ وہ بڑا مہربان و مشفق دوست ہے۔ اس صفت سے متصف ہونے کے ارادے کی تکمیل یاران طریقت اور خالص محمدیوں سے دوستی اور محبت بڑھا کر اور بندگان خدا کی خیر خواہی سے کرے۔ باہمی محبت کے دروازے کھول دینے چاہئیں اور ایک دوسرے کی دوستی کا دم بھرنا اور نفاق کو دور کرنا چاہیے۔ ذات باری تعالیٰ کو سراپا عظمت و بزرگی کا مالک سمجھنا چاہیے۔ اس صفت کو اپنانا ہو تو خود میں بزرگوں کے سے اعمال و اقوال پیدا کرے اور بزرگوں کی سنت کی متابعت کرے۔ انسانوں کو نکوکاری پر ابھارنے، مردوں کو قبروں سے اٹھانے، سوئے ہوؤں کو خواب سے جگانے اور نباتات کو زمین سے اگانے والا بلکہ ہر موجود کو وجود میں لانے والا اللہ تعالیٰ ہی کو سمجھے۔ اور انبیاء و اولیائے کرام کی نبوت و ولایت پر ماموریت اور موت کے بعد جی اٹھنے پر ایمان رکھنے اور ہر شے کے وجود کو خواہ وہ جوہر ہو یا عرض اسی کی بدولت سمجھے۔ اس صفت کو اپنانے کے ارادے کی تکمیل خود اپنی ہمت کو اطاعات و عبادات الٰہیہ اور حب رسولؐ کے جذبات کو ابھار اور دیگر ایسی باتوں کو دل میں اتار کر کرے۔ اللہ تعالیٰ کو ہر زمان و مکان میں حاضر و ناظر جانے اور اسے اپنی حقانیت اور ثبوت بلکہ ساری موجودات اور حق و باطل کے سچے یا جھوٹے ہونے کے سلسلے میں ان موجودات کے اعمال و اقوال کا گواہی دینے والا سمجھے، اور اس امر کے فہم کو اپنے دل و دماغ میں یوں راسخ کر لے کہ حضوری و مشاہدۂ ذات کو فراموش کرنے کی کبھی نوبت ہی نہ آئے اور کسی اور کو دیکھے بغیر، ہمیشہ حضوری و مشاہدۂ حق میں محو و مستغرق رہے۔ سوائے اس کے کسی اور کو شاہد و مشہود نہ سمجھے۔ اس صفت سے متصف ہونے کے ارادے کی تکمیل اسی نسبت مشاہدے کی نگہبانی سے کرو، اور ظاہری طور پر بھی حقّی امور پر شہادت دینی چاہیے۔ اور کلمۂ شہادت کا اکثر ذکر و ورد کرنا چاہیے۔ خود خدا نے تاکید کی ہے کہ شہادت کا اخفا مت کرو، اور جو شخص اس کا اخفا کرے گا اس کا قلب گنہگار ہوگا۔ حق تعالیٰ کو قائم بالذات اور موجود سمجھنا چاہیے۔ کیونکہ

موجود مطلق اور قائم بالذات فقط وہی ہے ۔ اور حق کی طرح بیان کیے جانے والا باطل نہ ثابت ہے نہ قائم ۔ وہ نیست و نابود ، ناچیز اور معدوم ہے ۔ لہٰذا امکانی حقائق والی یہ ساری موجودات فی نفسہٖ نیست و ناچیز و معدوم ہے ۔ اپنی ذات میں نہ اُن کا کوئی وجود ہے ، اور نہ ثبوت ۔ بس ایک مطلق حق ہے جیسے ذات واجب الوجود اور ایک مطلق باطل ہے جیسے کہ ممتنع (منع کیا گیا یا روکا گیا) اور ایک ایسا جو ایک لحاظ سے حق اور ایک لحاظ سے باطل ہے جیسے ممکن الوجود ۔ چنانچہ حجت الاسلام حضرت امام غزالیؒ نے فرمایا کہ عبد (بندہ) اگرچہ حق ہے مگر بذاتہٖ حق نہیں بلکہ وہ اللہ تعالیٰ کی ذات کی بدولت حق ہے ، ورنہ بندہ بذاتِ خود باطل ہے ۔ پس جس نے انا الحق کہا انتہائی غلطی کی ۔ لیکن مجھ فقیر کا کہنا یہ ہے کہ انا الحق کہنے والے کی مراد کلمہ " انا " کے امکانی معانی تھے ۔ اور اُس نے اُسے حق کہا تو حجت الاسلام کی تحریر کے بموجب اس نے غلطی کی اور بڑی فاش غلطی کی ، اور اگر اس کلمہ ' انا ' سے اس کی مراد وجودی معنی تھے ، اور اُس نے اُسے حق کہا تو کہنے میں کوئی مضائقہ نہیں ۔ بلکہ اس نے حقیقت بیانی سے کام لیا ۔ لیکن پھر بھی ہم مخلص محمدیوںؐ کے نزدیک ایسا بیان سہل انگاری ، مغلوب الحالی ، غلبۂ مستی اور بے ادبی کے پہلو سے خالی نہیں ۔ کیونکہ صحیح بیان وہی ہوتا ہے جس سے عوام اور خواص سبھی فائدہ اُٹھائیں اور اُس سے کسی شک و شبہ میں نہ اُلجھ جائیں ۔ حق وہ ہے جو محقق ہو جائے حقِ متین کے الہام سے اور اُس کے رسولؐ کی تحقیق سے جو مبین پر ہے ۔ اس صفت سے متصف ہونے کے ارادے کی تکمیل صحیح و سچے عقائد حاصل کرکے اور خلفائے راشدین ، ائمہ معصومین ، اور عالم و فاضل مجتہدین اور اولیائے کرام اور عارفان ذات جیسے سچے پیروکاروں کی پیروی کرکے کرے ۔ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی شرع متین اور حضور پاکؐ (ان پر خدا کا درود و سلام) کے حقی طریقے پر قائم و ثابت قدم رہنا چاہیے ۔ اور معبود حقیقی یعنی حق تعالیٰ کی عبادت میں مشغول رہنا چاہیے اور ہمیشہ حضوری و مشاہدۂ ذات میں مستغرق رہنا چاہیے اور ہر مرتبے کا حق اپنی استعداد اور وسعت کے مطابق ادا کرنا چاہیے ۔ الغرض ظاہری اور باطنی طور پر سراسر حق ہی کا مظہر بن جائے ۔ حق و راستی ہی بہم پہنچائے اور حق کا ساتھ دے ۔ مشاہدۂ حق کرے ۔ حق کہے اور حق سنے ، اور جہاں تک ہو سکے اس کا مصداق بن جائے کہ جس نے مجھے دیکھا اُس نے حق کو دیکھا ۔ اور اگر ان تمام حقوق کی ادائیگی کے باوجود بدمذاقی تیرے گھاٹ سے کڑواہٹ

اور بدمزگی محسوس کرے تو یہ اس قول کے بموجب ہوگا کہ سچ کڑوا ہوتا ہے ۔ اور یہ تیری سچائی کی تائید مزید ہوگی ۔ حق اور حق ہی ہے جو میں سمجھتا ہوں ، اور خداوند تعالیٰ کو حقانیت کا وکیل سمجھنا چاہیے ۔ کیونکہ اختیارات کی باگ ڈور اسی کے ہاتھ میں ہے ، اور سب اسی کے قبضۂ قدرت میں ہے ۔ اور ساری موجودات کے تمام کاموں کا انجام اسی کے طاقتور ہاتھوں میں ہے ۔ پس خود کو اور اپنے سارے کاموں کو خداتعالیٰ کے سپرد کر کے تدبیر کے تردد اور نان ونفقہ کے تفکر سے آسودہ ہو کر راضی برضائے حق ہو جانا چاہیے اور اُس کی کارسازی پہ مکمل یقین رکھتے ہوئے طمانیت قلب حاصل کرنی چاہیے ۔ بموجب ان آیاتِ کریمہ کے کہ میں اپنا معاملہ اللہ کے سپرد کرتا ہوں ۔ خداتعالیٰ سب بندوں کا نگران ہے اور یہ کہ اللہ ہی کافی ہے ۔ وہی بہت اچھا رفیق ہے ، اور بہت اچھا کارساز ہے ۔ اور بشری تقاضے کے مطابق ظاہری اسباب یا تدبیر کو ملحوظ خاطر رکھنا توکّل کے منافی نہیں ۔ کیونکہ حق سبحانہٗ تعالیٰ نے دیگر مظاہر قدرت اور کارکنان قضاوقدر کو تیرے کاموں کے سرانجام دینے میں مجازی عمل دخل دے رکھا ہے ۔ اسی طرح تیرے عقل وحواس کو بھی انہی اجزا کا اک جزو بناتے ہوئے کاموں میں عمل دخل کا مجاز بنا کر اپنی کارسازی کا مظہر بنا رکھا ہے ۔ اور تدبیر کا تھوڑا بہت دخل تو کسی نے بھی نہیں چھوڑا یعنی درویش اگرچہ رزق کے حصول کے لیے کوئی سعی نہیں فرماتے اور اس کے حصول کے ظاہری اسباب کو بھی ترک کر دیتے ہیں ، مگر جب وہی رزق میسر آجاتا ہے تو کھانا پکاتے ہیں ، کپڑے سیتے ہیں اور علیٰ ہذا القیاس گزر بسر اور رہنے سہنے کے سب امور عقل وہوش کے موافق رکھتے ہیں ۔ مجنونانہ حرکتیں نہیں کرتے ، اور لباس کو سر پہ اور پگڑی کو گلے میں نہیں باندھتے ۔ لقمے کو کان میں نہیں ڈالتے ۔ نہ پانی کو آنکھ میں ٹپکاتے ہیں ۔ پس تھوڑی بہت تدبیر بھی تقدیر ہی کے جملہ شعبوں اور انسانی کمالات میں سے ہے ۔ ترک اسباب کا دعویٰ جاہل اور احمق لوگ کرتے ہیں ، اور خود کو کلی طور پہ تارک سمجھتے ہیں ۔ یہ امر خلاف واقع ہے ۔ ایسا نہ کبھی ہوا ہے ۔ اور نہ ہو سکتا ہے ۔ متوکل یا تارک الدنیا اسی کو کہتے ہیں جس کے دل میں غافلوں کی طرح روزی کا فکر و اندیشہ نہ ہو ۔ نہ ہی وہ اس کے باطنی سکون کو پراگندہ کر سکے ، اور اسبابِ ظاہری کے اسیروں کی طرح نوکری ، یومیہ اجرت یا کسی دوسری ملکیت سے روزی کا طلبگار نہ ہو ۔ نہ یہ کہ وہ مخبوط الحواس درویش بن بیٹھے اور بے شعور ہو جائے ۔ قناعت ، قلبی سکون اور طمع سے پاک ہونا الگ چیز ہے ۔ اور حماقت ، جہالت اور نکماپن ایک الگ

چیز ہے۔ سکون قلب اور سلامتی تو شائستہ چیزیں ہیں، مگر دیوانہ پن اور جہالت بالکل ناشائستہ۔ لیکن قباحت یہ ہے کہ عارفوں کے حقیقت کا انکشاف کرنے والے بیان کا اکثر حریص اور احمق اصل مفہوم تو سمجھتے نہیں اور اپنے دل میں پہلے سے موجود خواہش یعنی اسباب ظاہری کا سہارا لینے کی اُسے سند سمجھ لیتے ہیں کہ بزرگوں نے اسباب ظاہری کی مراعات کو روا رکھا ہے تاکہ کہیں انہیں مکمل طور پر ترک اسباب کا حکم نہ دے دیا جائے، اور یوں وہ اتنا بھی نہیں کرتے کہ حدِ اعتدال ہی کی طرف آجائیں۔ حالانکہ جس طرح کہ محققین کی ان ظاہری اسباب کو ملحوظ رکھنے کے بیان سے مراد ان ظاہری اسباب میں پھنس جانا اور جدوجہد میں مقید ہو کر رہ جانا نہیں۔ اسی طرح عارفوں کی ترک اسباب سے مراد بھی پاگلوں، دیوانوں، بے غیرتوں اور سست الوجودوں کی طرح ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھ رہنا اور دوسروں پر بوجھ بن جانا نہیں۔ کبھی کسی پر بوجھ نہیں بننا چاہیے، اور نہ ہی معاشی تدبرو تفکر میں آزردہ خاطر ہونا چاہیے، اور نہ ہی دُنیا داروں کی طرح سعی وجستجو کے میدان میں کود پڑنا چاہیے۔ جو کچھ ملے اسے نہایت مہذب انداز میں خرچ کرنا چاہیے، اور شائستگی سے لینا چاہیے اور اس روزی کے سلسلے میں بے کھٹکے رہنا چاہیے۔ اور ان امور کو کارسازِ حقیقی کو سونپ دینا چاہیے۔ اس سے بڑھ کر کوئی وکیل یا کفیل نہیں۔ اس صفت سے متصف ہونے کے ارادے کی تکمیل اپنی وسعت اور طاقت کے مطابق اپنے لواحقین اور ماتحت ملازمین کی حاجت روائی سے کرے۔ جہاں تک ہو سکے دوسروں کا بوجھ خود اُٹھائے مگر یوں کہ اپنی جمعیت خاطر میں خلل نہ آنے پائے اور اسے اپنی بساط سے باہر نہ لے جائے۔ یعنی اپنی وضعداری کو قائم رکھتے ہوئے اگر ہو سکے تو پہلے اہل اللہ میں تقسیم کرے۔ اس کے بعد اپنی ذات پر خرچ کرے۔ اور پھر ہر کسی کو اس کے حسبِ حال حصہ دے۔ اور اللہ تعالیٰ کو توانا اور کامل توانائی کا مالک ومصدر، بندوں کو توانا کرنے والا، اور مخلوق کو توانائی بخشنے والا سمجھے۔ ظاہری اور باطنی توانائی اُسی سے مانگے، اور ہر مجازی توانا اور قوی کو اس کی حقیقی قوت کے سامنے عاجز اور ضعیف دیکھے، کیونکہ وہ آنِ واحد میں کسی قوی کو ضعیف اور کمزور کو توانا بنا سکتا ہے۔ اللہ کے سوا کسی کو طاقت اور قوت نہیں، وہی اعلیٰ وعظیم ہے۔ اس صفت سے متصف ہونے کے ارادے کی تکمیل درکار ہو تو اپنی ایمانی قوت، نسبت الٰہیہ کی قوت، مرشد سے رابطے کی قوت، نیک اعمال سے عقل وروح کی قوت، مراقبات، ذکر اذکار، اوراد و وظائف، باطنی محویت

سے قلبی تقویت اور یاران طریقت سے ایک دوسرے کے بازوئے قوت بننے، عرفانی قوت بہم پہنچانے اور علم و فضل سے قوتِ تقریر بڑھانے سے حاصل کرنی چاہیے، اور اللہ کے فضل سے ظاہری اور باطنی قوت حاصل کرنی چاہیے، اور اللہ جلّ شانہ' کی حقیقی قوت کا مظہر اور نائب بننا چاہیے، اور اللہ تعالیٰ کو کامل متانت اور استواری کا مالک اور مجازی محکمی رکھنے والوں کی استواری و متانت کا خالق سمجھنا چاہیے اور اس سے مستقل اور دائمی رجوع پیدا کرکے ایک باوقار مقام اور محکم مرتبے کی طلب کرنی چاہیے۔ اس صفت کو اپنانے کے لیے اپنے عقیدوں میں مضبوطی، شریعت پر استقامت، مزاج میں پختگی، نسبتِ الٰہیہ میں شدت اور تسلیم و رضا، صبر و قناعت اور توکل سے اپنی گزر بسر میں استحکام پیدا کرنا چاہیے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ کو تمام امور میں اپنا دوست، مددگار اور نگہبان سمجھنا چاہیے۔ کیونکہ لفظ ولی (بمعنی دوست، سرپرست) کا ان تمام معنوں میں اطلاق کیا جا سکتا ہے۔ اور جب بندے کو اللہ تعالیٰ کے اسم مبارک کا پورا توسط اور راسخ عقیدہ حاصل ہو جائے، اور اُس کی محبت اور اس کے ذکر سے دل کو اطمینان ملے تو اُس پر ولایت کا دروازہ کھول دیتے ہیں اور اُسے اولیاء اللہ کے زمرے میں داخل کر دیتے ہیں۔ اسی نسبت الٰہیہ کے قوی یا ضعیف ہونے کی بناء پر اولیاء اللہ کے مراتب میں بے شمار فرق ہوتا ہے۔ اسی صفت سے متصف ہونے کے ارادے کی تکمیل کے لیے اپنے اندر حُبّ اللہ اور حُبّ رسولؐ پیدا کرے۔ مرشد سے رابطہ کی قوت اور مومنوں اور اسلامی بھائیوں سے للّٰہی اخلاص سے کرے۔ محبت ربانی کو اپنی نفسانی محبت پر غالب رکھے۔ اور اس فرمانِ الٰہی کو یاد رکھے کہ وہ لوگ جو ایمان لائے وہ اللہ سے محبت کرنے کے اعتبار سے زیادہ شدید ہوتے ہیں۔

ولایت کی انواع و اقسام کے فائدوں کا بیان

یہ سمجھ لینا چاہیے کہ ہر چند کہ ولایت کی کئی نوعیں اور قسمیں ہیں۔ اور اولیائے کرام کے فرق اور ان کے افراد کی تعداد ان گنت ہے۔ لیکن ولایت مطلقہ (خود مختار) جو تمام ولایات پر محیط اور ان میں شامل ہے۔ اور کوئی ولی اللہ اس کے دائرے سے باہر نہیں۔ اس کی تین قسمیں ہیں۔ ایک ولایت خود مختار جو ہر موجود کے شامل حال ہے۔ خالق خود بھی ساری مخلوقات کا دوست اور ولی (سرپرست) ہے۔ اُسے ہر کوئی اپنا خالق جانتا ہے، اور ذاتی طور پر اسی سے سروکار رکھتا ہے۔ اور اس ولایت

کے فیض کی وساطت کے بغیر نہ کوئی چیز عالم وجود میں آتی ہے اور نہ قائم رہ سکتی ہے۔ لیکن اللہ کی جانب سے اس نسبت کی فیض رسانی صرف اشیا کی تخلیق اور ان کے قیام کے متعلق ہوتی ہے۔ اس فیض کا سب سے زبردست اور عظیم مظہر قلب ہے جس پہ دُنیا کا دار و مدار ہوتا ہے کہ پہلے تو وہ خود فیض کے اس حقیقی منبع و مبداسے مختصراً (مجمل طور پر) فیض حاصل کرتا ہے۔ اور اس کے بعد اس کی وساطت سے وہ فیض سارے عالم میں پھیل جاتا ہے۔ جزوی خدمات کے دوسرے اہل ابدال و اوتاد ہوتے ہیں۔ جو اس مرتبۂ تمام و کمال کے تابع ہوتے ہیں۔ دوسری قسم ولایت مشروطہ ہے۔ جسے ایمان کی شرط مشروط بناتی ہے۔ یہ مومنوں کے حصّے میں آتی ہے۔ جیساکہ خود خدا تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ بے شک اللہ تعالیٰ ایمان لانے والوں کا دوست ہے۔ سو اللہ تعالیٰ ہر مومن کا دوست ہے۔ ہر بندۂ مومن کو اُس تک رسائی ہے۔ اور اس فیض کی وساطت کے بغیر ہدایت کی راہیں نہیں کھُلتیں اور کوئی آدمی ہدایت نہیں پا سکتا۔ یہ نسبت دینوی معاش کی اصلاح کے لیے بھی فیض رساں ہے۔ اور اخروی فلاح و بہبود کے لیے بھی۔ اس فیض کا زبردست اور عظیم مظہر قلب ہدایت ہوتا ہے جو پہلے خود اُس حقیقی ہادیٔ مطلق سے فیض اخذ کرتا ہے۔ اس کے بعد اس کے باطن کی وساطت سے ہدایت کا یہ نور دُنیا بھر میں پھیل جاتا ہے۔ باطنی کمالات کے باقی سب ماہر مثلاً عارفان و سالکانِ راہِ حق، رہرواں راہِ ہدایت اس مرشد وقت کے تابع ہوتے ہیں۔ ایک ولایت مخصوصہ ہوتی ہے جو اللہ تعالیٰ کے خصوصی قرب سے مخصوص ہوتی ہے اور خاص مومنین کے حصّے میں آتی ہے۔ اور اس نسبت کے فیض کے بغیر کسی دل پہ اللہ تعالیٰ کے قرب، نزدیکی اور الہام کی راہیں نہیں کھُلتیں۔ اس فیض کا سب سے بڑا اور عظیم مظہر محمدیؐ مشرب کا عارف ہوتا ہے۔ یہ فیض پہلے تو اس فیاض مطلق اللہ جل شانہٗ کی جناب سے ایسے عارف کے دل پر نازل ہوتا ہے۔ اس کے بعد اس کی وساطت سے قطب ارشاد اور قطب مدار تک اُن کے مناسب اور دیگر اہلِ مراتب تک، ان کے مراتب کے درجات کے فرق کے لحاظ سے پہنچتا ہے۔ ایسے محمدیؐ مشرب عارفوں کے باطنوں سے بلند تر صاحب مرتبۂ خالص کا باطن ہوتا ہے۔ وہ گویا اس فیض کا سرچشمہ ہے جو بغیر کسی واسطے کے سر جوہر مصطفیٰؐ اور حق تعالیٰ کے مقدس مرتبۂ جامعیت سے اکتساب فیض کرتا ہے اور باقی سب اہلِ عالم کو مسلسل پہنچاتا رہتا ہے۔ محمدیؐ مشرب کے سبھی عارف اور ولایت محمدیؐ رکھنے والے اولیائے کرام اسی خالص محمدیّت کے مالک ہی کے تیار کردہ اور اس کے معاون ہوتے ہیں،

اور رہیں گے، اور انشاءاللہ قیامت میں خدا ان سب کو پرچم محمدیؐ تلے اُٹھائے گا۔ اور حمد کا جھنڈا اس دن ہمارے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ میں ہوگا۔ اور اُس کے نیچے ہوں گے آدمؑ اور وہ جو ان سے کم درجے والے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کو ہر تعریف و ستائش کا سزاوار اور تمام خوبیوں کا مستحق سمجھنا چاہیے۔ دل اور زبان، جسم اور جان سے قالاً اور حالاً اس کی حمد وثنا کرنی چاہیے۔ یعنی زبان پر ہمیشہ اسی کی تحمید و تقدیس اور اُسی کی عظمت وکبریائی کے الفاظ جاری رہنے چاہئیں۔ بندگانِ خدا کے سامنے بھی ہمیشہ کمالات ربانی بیان کرتے رہنا چاہیے۔ اور ذکرِ الٰہی اور یادِ خدا سے اطمینانِ قلب حاصل کرنا چاہیے اور رُوح کو حضوری و مشاہدہ ذات سے مانوس و مسرور رکھنا چاہیے اور اپنے نفس کو راضی برضائے حق بنا کر راضی بقضائے الٰہی بنانا چاہیے۔ اور ظاہری اور باطنی طور پر اسی حمید حقیقی کی حمد کرتے رہنا چاہیے۔ اس صفت کو اپنانے کے لیے اپنے اندر بشری استعداد کے مطابق اوصافِ حمیدہ اور اخلاق پسندیدہ پیدا کرنے چاہئیں اور حق سبحانہٗ تعالیٰ کو کائنات کی تمام اشیا اور مخلوقات کے تمام افعال، اقوال اور حرکات و سکنات کے گننے اور شمار کرنے والا سمجھنا چاہیے۔ بعض نے لفظِ "محصی" (گننے والا) کی تفسیر، عالم (جاننے والا) سے کی ہے۔ یعنی اُن کا کہنا ہے کہ علم کو چونکہ عددی حیثیت سے معلومات سے نسبت دیتے ہیں۔ لہٰذا عدد اور معدود پھر اس کے محیط ہونے کو احصا (شمار کرنا) کہتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کے علم میں ہر معلوم کی حد اس کی تعداد اس کی مقدار کا انکشاف ہے۔ اسی شمار کنندہ کے تعلق ہی سے حق تعالیٰ کو کلیات اور جزئیات کا جاننے والا سمجھتے ہوئے اس کے حساب کتاب اور گنتی و شمار سے غافل نہیں ہونا چاہیے۔ اور روزِ حساب یعنی قیامت کے دن سے ڈرنا چاہیے۔ اس صفت کو اپنانے کا ارادہ ہو تو پہلے تو خود اپنا محاسب بن کر اور اپنے افعال و اقوال کا محاسبہ کرکے کرے، اور حیوانوں کی طرح غفلت سے بے فائدہ زندگی نہیں گزارنی چاہیے، اور نہ ہی اندھا دھند کھانا پینا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ کو ہر ابتدا کا آغاز کنندہ سمجھنا چاہیے۔ آفریدگان کے سلسلے میں اسی کو نو آفریدگار سمجھنا چاہیے۔ بعض ممکنات کی کمتگی کو ثابت کرنے کے اندازے کے لیے حکما کے نزدیک بھی ہر ممکن بذاتہٖ احداث کرنے والا ہے اور ہمیشگی اور تقدم ذاتی وہ حقِ تعالیٰ ہی کے لیے ثابت کرتے ہیں اور مبدیت (مبدا ہونے کے لیے) اسکے لیے یہ ذاتی تقدم ہی کافی ہے۔ کیونکہ ادوار (زمانوں) میں بعض کو بعض پر تقدم زمانی تو ہوتا ہی ہے۔ اگر ہم غیر زمانی کو بھی زمانے کے لحاظ سے متقدم فرض کرلیں تو اس صورت میں وہ بھی

زمانی ہو جائے گا۔ ہر چند کہ غیر زمانیات کا وجود جو اپنی ذات یا اپنی علت کی بنا پر متقدم ہیں۔ ان کا یہ تقدم ان کی علل کی بنا پر ہے۔ لیکن پھر ان کی زمانیات کی نسبت کی بنا پر ان کا تقدم زمانی ذہن میں گھومنے لگتا ہے، بلکہ ان کی نسبت اور بھی پہلے زمانے سے لگتی ہے۔ اس لیے نہیں کہ زمانے کے لحاظ سے خود متقدم ہیں جیسا کہ تم زمانیات کو تصور کرتے ہو۔ پس اللہ تعالیٰ ہی ہر شے خواہ وہ زمانی ہو یا غیر زمانی کا منبع و مبدا ہے۔ پس پھر ابتدا کے آغاز کا پیدا کرنے والا بھی وہی ہے۔ اس صفت سے متصف ہونے کے ارادے کا آغاز ہر کام کو پوری مہارت اور جانکاری سے کرنا چاہیے۔ اور ہر بات اور کام سے پوری طرح آگاہ ہونا چاہیے، تاکہ تمھارے فعل کا منبع و مبدا آگہی سحق ہی ہو۔ اور تیرا ہر کام خالصتہً اللہ ہی کے ہو۔ اور یونہی ہر کام کی ابتدا میں اللہ کا ذکر کرنے سے پروردگار کا نام لینے کی عادت پڑ جاتی ہے، اس لیے ہر کام کے شروع کرنے میں بسم اللہ شریف پڑھنے کی شرط یا پابندی کی احادیث نبویؐ میں ہر جگہ روایت ملتی ہے اور حق سبحانہٗ تعالیٰ ہی کو اضافی علامات سے اعتباری پیدائش کی طرف لوٹا دینے والا سمجھنا چاہیے۔ کیونکہ ہر موجود حق تعالیٰ ہی کی ایجاد سے وجود میں آتا ہے۔ اور ہر معدوم اسی کے مارنے سے عدم میں چلا جاتا ہے۔ یہاں مارنے یا پیدا کرنے کے ساتھ نسبت و اعتبار کی شرط اس لیے بیان کی گئی ہے کہ اس اضافت و اعتبار کو ملحوظ رکھے بغیر معدوم کبھی موجود اور موجود کبھی معدوم نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا یہ ممکن الوجود موجودات جو فی نفسہٖ معدوم ہیں۔ اور وہ واجب الوجود کے تضمن سے موجودات بنتے ہیں۔ جب وہ مرتبہ بشرط شئ وجودی کی آمیزش سے ثبوتی اضافتوں کا مضاف بن جاتے ہیں تو انھیں موجودات کہا جاتا ہے۔ ممکنات سے ثبوتی نسبت کے اسناد کو ایجاد کہتے ہیں۔ اور جب وہ بشرط شئ وجودی کے مرتبے میں امکاناتِ سلبیہ کے مضاف بنتے ہیں انھیں معدومات کہا جاتا ہے۔ ممکنات سے سلبیہ نسبت کی اسناد کو اعدام کہتے ہیں۔ لہٰذا یہ عقیدہ رکھنا چاہیے کہ جس طرح حق تعالیٰ نے تمھیں اس دُنیا میں پیدا کیا ہے۔ اُس جہان میں بھی دوبارہ حشر کے دن تمھاری پیدائش کو دہرا دے گا۔ اور موت کے بعد اٹھنا برحق ہے۔ اور وہی پیدا کرتا اور وہی لوٹاتا ہے۔ اس صفت کو اپنانے کے ارادے کی تکمیل اسمائے حسنیٰ کے ذکر اذکار اور اس کی بار بار تکرار، ہر لحہ دل اور زبان سے یادِ خدا، اور اُس کی طرف لوٹ جانے کے وقت یعنی موت کو یاد رکھنے سے کرے۔ یا پھر نیکیوں میں جو باتیں رہ گئی ہوں۔ مثلاً نماز روزے وغیرہ کی قضا کی ادائیگی، ہر لحظہ خدا کی طرف لوٹ جانے اور اس آیتِ کریمہ کو یاد رکھنے سے کرے کہ آخر کار سبھی کو اسی کی طرف

لوٹ جاتا ہے، اور اللہ تعالیٰ کو جسم میں حیاتِ انسانی، نفس ناطقہ میں حیاتِ روحی، عارفوں کے دلوں میں حیاتِ عرفانی، اولیا میں حیاتِ حضوری و شہود، عالموں میں حیاتِ علمی، اور مومنوں میں حیات ایمانی اور علاوہ ازیں بھی زندہ کرنے والے تمام متعلقات کے پیدا کرنے والا سمجھے۔ اور ہر ذی روح کو ظاہری اور باطنی احیا بخشنے والا سمجھنا چاہیے۔ اس صفت سے متصف ہونے اور اس کی تکمیل حتی الوسع ایمانی قوت سے بندوں کے قلوب کی احیا، علم سکھانے، کشف معرفت اور حضوری و شہود کے الہام والقا کی نسبت سے کرنی چاہیے۔ اور خود بھی ہمیشہ اپنی باطنی زندگی کو زندہ رکھنے کے لیے کوشاں رہنا چاہیے تاکہ غفلت کا کوئی لمحہ یا کوئی لحظہ جو درحقیقت دل کی موت ہوتا ہے اسے مار نہ دے، اور ماسوی اللہ کے پھندوں میں نہ پھنسا دے۔ دُنیا بھر کے تمام جانداروں کو مارنے والا بھی اسی کو سمجھنا چاہیے اور کفار کے دلوں کو کفر، جاہلوں کے دلوں کو جہالت، غافلوں کے دلوں کو غفلت اور احمقوں کے دلوں کو حماقت سے مارنے والا بھی اسی کو سمجھنا چاہیے۔ الغرض وہی زندہ کرنے والا ہے، اور وہی مارنے والا ہے۔ اس صفت کو اپنانے کے لیے نفسانی ہوا و ہوس اور خواہشات کو مارے۔ حق تعالیٰ کو زندہ و قائم بالذات سمجھے کیونکہ اس کی حیات عین ذات ہے۔ دوسرے زندوں کی طرح نہیں جو نفس و روح کی بدولت زندہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ پر لفظ حیات کے اطلاق کا حاصل یہ ہے کہ تمام کمالی صفات مثلاً علم، ارادہ، سماعت، بصارت، گویائی اور قدرت یعنی سبھی متعلقات حیات اس کے لیے تحقیق شدہ ہیں لہذا ان سب کی اصل جو حیات ہے اس کے لیے ثابت ہے۔ لیکن جس طرح اس کی دیگر صفات اسباب و آلات کی محتاج نہیں۔ اسی طرح یہ صفت بھی اسباب و آلات کی حاجت مند نہیں۔ جیسا کہ اس آیت کریمہ میں ہے کہ اُس جیسی کوئی شے نہیں، اور وہ سننے والا اور دیکھنے والا ہے۔ اس صفت کو اپنانے کا ارادہ ہو تو اپنے دل کو حق تعالیٰ کی حضوری و شہود سے زندہ رکھے اور ہمیشہ اس کی یاد سے اپنے آپ کو زندہ رکھے۔ اللہ تعالیٰ کو قائم بالذات سمجھنے کے ساتھ ساتھ تمام موجودات کو قائم کرنے والا بھی جانے، کیونکہ ہر شے اسی کے قیام سے قائم ہے۔ سبھی کا قیام اسی کی قیومیت سے ہے۔

اس صفت سے متصف ہونے کے ارادے کی تکمیل حدود اللہ یعنی حدود شرعی پر قائم ہو کر کرے۔ اپنے آپ کو شرع مصطفویؐ اور دین محمدیؐ پر قائم کرے۔ اور باطنی طور پر خدا کی مدد اور اُس کے حُسن قبولیت سے بقا باللہ کے بلند مقام پر فائز ہو۔ ہر مطلوب اور ہر شے کو پا لینے والا اسی کو سمجھے۔

کیونکہ اس کا وجود ہر موجود کو پالیتا ہے۔ اُس نے سبھی کو پایا ہوا ہے، لیکن اُسے کما حقہ' کوئی نہیں پا سکا، اور نہ ہی اُسے کما حقہ' سمجھ سکا۔ اس صفت کو اپنانے کے ارادے کی تکمیل ذات باری کے لازمی کمالات کے مشاہدے اور رضائے الٰہی کے حصول سے کرنی چاہیے جو تمام مقاصد میں سر فہرست ہے۔ اللہ تعالیٰ کو اُس کی رضا میں ڈھونڈو اور اُس کے سوا کسی کو نہ دیکھو۔ اسی ذات پاک کو بزرگ اور بزرگی کا حقیقی مالک سمجھنا چاہیے۔ ماجد (صاحب شرف) مجید (گرامی) کے معنوں میں آیا ہے۔ جیسے عالم، علیم کے معنوں میں آتا ہے۔ لیکن مجید مبالغہ و تاکید کے صیغے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی تمام صفات کامل و بالغ ہیں۔ ہاں کبھی لفظوں میں اس کی خبر دی جاتی ہے، اور کبھی لفظ کے اصل معنی ہی کے اثبات پہ اکتفا کر لی جاتی ہے جو بذاتِ خود کامل ہے۔ الفاظ کی دلالت کی ضرورت نہیں۔ عادت بنانے (سیکھنے) کا بیان اسمِ مجید میں آچکا ہے۔ حق تعالیٰ کو واحد اور یکتا سمجھنا چاہیے۔ احدیت اور وحدت یکتا و یگانہ کے معانی میں آتے ہیں۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ اپنی ذات کے لحاظ سے واحد اور صفات کے لحاظ سے یگانہ ہے۔ اعداد کے مبدا یعنی عددی واحد کی طرح نہیں۔ اس اسم میں اسی وحدت کے مشاہدے کا تعلق ہے۔ اس صفت سے متصف ہونے کا ارادہ ہو تو خود اللہ کے سوا باقی سب سے منقطع ہو کر منفرد اور متوحد بن جائے اور دُنیا کو ترک کر دے۔ فقط ایک ہی کو دیکھے اور ایک ہی کو سُنے۔ حق تعالیٰ کو ذاتی وحدانیت کا مالک سمجھ کر باقی تمام اضافی ذاتوں کو اسی وحدت کے شہود میں فنا کر دے۔ یاد رکھیں کہ ابو ہریرہؓ کی روایت، جامع ترمذی، دعواتِ بیہقی اور شرح السنہ میں اسم احد نہیں آیا۔ لیکن جامع الاصول میں واحد اور الاحد دونوں آئے ہیں، اور ان دونوں میں فرق یوں قرار دیتے ہیں کہ وہ احد تو ذات کے اعتبار سے ہے، اور واحد صفات کے اعتبار سے، بعض نے اس کے برعکس کہا ہے۔ اور ان دونوں اسموں کا تعلق یا تخلق (عادت کا سیکھنا) یکساں ہے مگر ان دونوں کے معانی میں امتیاز وہی ذات و صفات کے لحاظ سے ہے۔ کائنات کی تمام موجودات کا حاجت روا سمجھنا چاہیے۔ کیا وجود، اور کیا کمالاتِ وجود کے لحاظ سے، سبھی اس کے محتاج ہیں۔ اُسے سب نقص اور آفتوں سے پاک اور سب سے بے نیاز سمجھنا چاہیے۔ اس صفت کے حصول کا ارادہ ہو تو طالبانِ خدا کے رجوع اور مخلوق خدا کی رشد و ہدایت سے کرے، نیز دُنیاوی امور میں خود لوگوں کا حاجت روا بن کر کرے۔ اور خود سب سے بے نیاز ہو جائے۔ کسی پہ اپنی حاجت کا اظہار نہ کرے۔ اس ذات پاک کو حقیقی طاقت و توانائی کا سرچشمہ

سمجھے کہ جو کچھ ہے اُسے خدا نے اپنی قدرتِ کاملہ سے پیدا کیا ہے۔ اور تمام مجازی صاحبانِ قدرت کو ظاہراً اور صورتاً طاقت اسی نے عطا کی ہے، اور اپنی حقیقی قوت کا مظہر بنایا ہے۔ اور یوں اپنی ہی قدرت کا اظہار کیا ہے۔ اس صفت کی خصوصیات کا ارادہ ہو تو امر بالمعروف کی ادائیگی اور خلافِ شرع کاموں سے پرہیز کرے، نیز شر اور برائیوں سے باز رہنے کی قدرت پیدا کر کے حاصل کرے۔ تمام امور میں حق تعالیٰ ہی کو مقتدرِ اعلیٰ سمجھنا چاہیے۔ ساری موجودات میں بھی اسی کے اقتدار کا مشاہدہ کرنا چاہیے۔ اس صفت کو اپنے اندر پیدا کرنا ہو تو ذاتی قدرت حاصل کرنی چاہیے۔ اور ایسی باطنی قوت حاصل کرو کہ جب تم اپنے طالبوں کی طرف اپنی توجہ مرکوز کرو تو تمھاری توجہ سے ان کی باطنی غفلت اور پریشانی دُور ہو جائے۔ اور تمھارے باطنی فیض کی وساطت سے وہ اللہ تعالیٰ کی حضوری و شہود میں آسائش پائیں، اور خدا اور رسولؐ پر ایمان میں مزید تقویت پائیں اور گمراہی سے ہٹ کر سیدھی راہ پہ آ کر شرعِ مصطفویؐ اور دینِ محمدیؐ کا تتبع کرنے لگیں۔ اللہ تعالیٰ کو ہر پہلے امر کا پیش کرنے والا اور دُنیا و دین کے پیشواؤں کو پیشوا بنانے والا سمجھنا چاہیے۔ کیونکہ حق تعالیٰ سب سے پہلے، بلکہ پہلے سے بھی پہلے ہے۔ سبھی کی پیشوائی اسی کی پیشی کے ضمن میں ترقی کرتی ہے، اور اسی کی حمایت سے آگے بڑھتی ہے۔ اس صفت کو اپنانے کے لیے خود حضورِ حق میں پیش ہو کر اس کا قرب و نزدیکی ڈھونڈے، اور دوسروں کو بھی اپنی صحبت کی برکت سے ان کی استعداد کے مطابق پیشوا بنانا چاہیے حق تعالیٰ ہی کو ہر پچھلے کام کو پیچھے ڈالنے والا جانے۔ تمام ظاہری اور باطنی پیروکاروں کو پیچھے رہ جانے والا اُس نے بنایا۔ کیونکہ سب چیزوں کے بعد وہی باقی رہ جائے گا۔ اور پیچھے رہ جانے والوں کو یہ پس ماندگی اسی کی بدولت ہے۔ اس صفت کو اپنانا ہو تو لقا باللہ کی کیفیت اور رسول اللہؐ کی پیروی کر کے اپنائے یا پھر ایسی تحریر چھوڑ جائے جو اس کے بعد کام آسکے۔ اللہ تعالیٰ کو ہر اوّل اور ازل سے بھی اوّل سمجھنا چاہیے۔ کیونکہ اس کے وجود کی ابتدا اور اُس کی ہستی کا آغاز نہیں، نہ ہی ذہنی، نہ خارجی، اور نہ عقلی اور فرضی طور پہ۔ ہر اوّل کا مبدا وہی ہے۔ اس صفت کو اپنانے کے لیے ہر جگہ حق تعالیٰ کی اولیت کا مشاہدہ کرے۔ یعنی کہ تم جس موجود یا مشہود پر نظر ڈالو تو پہلے اسی کا نورِ وجود تمھارے فہم میں آئے بموجب اس آیت کریمہ کے کہ میں نے نہیں دیکھی کوئی چیز مگر یہ کہ دیکھا اللہ کو اس سے پہلے بھی! اور خود کو بھی انہی معنوں میں پہلے مومنوں اور مقربوں یعنی (سابقون الاولون) میں سمجھے اور اللہ تعالیٰ

کو تمام اواخر کا آخر جانے، کیونکہ اس کی بقا کی انتہا نہیں اور اس کے مدام کو اختتام نہیں، نہ ہی حقیقی، نہ ہی مجازی، نہ ہی اضافی، اور نہ ہی اعتباری طور سے، اور اخیر کا رجوع بھی اسی کی طرف ہے۔ اس صفت کا حصول چاہے تو ہر مرتبے میں اسی کی آخرت کا مشاہدہ کر کے حاصل کرے۔ یعنی تم جس چیز پہ نگاہ ڈالو ان سب کے آخر میں اسی وجود حق کو مدنظر رکھو۔ اور یہ کیفیت پیدا کرو کہ میں نے نہیں دیکھی کوئی چیز، مگر یہ کہ دیکھا اللہ کو اس کے بعد بھی۔ اور یوں اپنے آپ کو پچھلوں کا سب سے پچھلا اور مخلصوں کا ختم کرنے والا سمجھو۔ حق تعالیٰ کو اس کی روشن نشانیوں اور شافی دلیلوں سے ہر جگہ ظاہر، عیاں، پیدا اور ہویدا سمجھنا چاہیے۔ کیونکہ اس کی کامل نشانیاں چار دانگ عالم اور ارواح میں روشن ہیں۔ اور اسی کی ظہورات شاملہ ہر موجود پر سایہ فگن ہیں۔ اس صفت کو اپنانے کا ارادہ ہو تو ہر جگہ اسی کی ظاہریت کا مشاہدہ کرے۔ یعنی جس کسی مظہر پر نگاہ ڈالو تو اُسی کے ظہور کو ظاہر دیکھو۔ اور ہر شے سے اس کے قرب کا ادراک کرو۔ اور یہ نسبت پیدا کرو کہ نہیں دیکھی میں نے کوئی چیز، مگر یہ کہ دیکھا خدا کو اس کے ساتھ۔ اور خود کو اس فہم و ادراک سے شرفیاب کرو۔ حق سبحانہٗ تعالیٰ کو اس کی ذات کی ماہیت پاکیزگی، عظمت اور جلال کے اعتبار سے نہاں، پنہاں، پوشیدہ اور پردہ نشین سمجھنا چاہیے۔ کیونکہ تمام عقلیں اور روحیں حقیقت کی تہ کو سمجھنے سے قاصر ہیں۔ سوائے اس کے وصفوں کے آج تک کوئی اُسے پا نہیں سکا۔ اس صفت سے آراستہ ہونے کے لیے ہر مقام پر حق تعالیٰ کی پوشیدگی کا مشاہدہ کرے، یعنی ہر پوشیدہ مقام میں اسی کا وجود مطلق نظر آئے۔ یعنی یہ کیفیت پیدا کرے کہ نہیں دیکھی میں نے کوئی چیز مگر یہ کہ دیکھا خدا کو اُس کے اندر۔ فانوسوں کے پردوں میں تجلّی کی اسی شمع کا مشاہدہ کرے۔ اور خود کو مشاہدہ ذات میں محو کر کے اپنی نظروں سے چھپ جائے اور باطن کو غیر کے شعور سے بالکل صاف کر دینا چاہیے۔ حق تعالیٰ ہی کو مخلوقات کے سارے امور کا نگہبان اور موجودات کے ازدحام کا مالک سمجھنا چاہیے۔ کیونکہ جو کچھ ہے اسی کی مدد اور رفاقت سے ہے۔ اسی کے قبضۂ قدرت اور اسی کے تسلط میں ہے۔ اس صفت سے متصف ہونا چاہے تو بشری طاقت کے مطابق خلق خدا کے امور کی نگہبانی اور ظاہری و باطنی کاموں میں ان کی کمک اور ان کے نفوس پہ قبضہ اور اپنے نفس کا حاکم بن جائے۔ جسم کی اس ولایت کا والی بن جانا چاہیے۔ خدا تعالیٰ کو سب سے اعلیٰ و ارفع سمجھے جو کچھ بھی ہے اس کی ذاتی بلندی سے بہت کم درجہ ہے۔ اور وہ تمام مراتب

سے برتر ہے۔ اس صفت سے متصف ہونے کا ارادہ ہو تو علم و فضل، پرہیزگاری اور قرب الٰہیہ میں ذاتی بلندی حاصل کرو۔ اور اللہ تعالیٰ کو بندوں سے نیکی کرنے والا اور ان کے حال اور انجام کو نیک کر دینے والا سمجھنا چاہیے۔ دونوں جہانوں کی بھلائی اسی کے بھلا کرنے سے ہے۔ پس طاقت بشری کے مطابق، تم سے حتی المقدور جتنا بھی ہو سکے اس کی ان عنایات کا شکر بجالاؤ جو اس نے تمہارے حال پہ فرمائی ہیں۔ اس صفت کو اپنانے کے لیے تمام امور میں دوسروں سے بھلائی کرے۔ جہاں تک ہو سکے دوسروں سے بھلائی کرو۔ اور اپنے تمام امور کو اپنی ذات تک محدود ہوں یا دوسروں تک اثر انداز ہونے والے ہوں کو ٹھیک بنانا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ کو توبہ کی توفیق دینے والا اور اسی کو توبہ قبول کرنے والا سمجھنا چاہیے۔ کیونکہ توبہ کے اسباب بھی وہی مہیا کرتا ہے۔ دل میں توبہ کرنے کا ارادہ بھی وہی پیدا کرتا ہے۔ گناہوں سے متنفر بھی وہی اور باز بھی وہی رکھتا ہے۔ اس صفت کو اپنانا ہو تو خود گناہوں سے باز رہ کر دوسروں کو توبہ کی ترغیب دے کر دوسروں کی توبہ اور ان کی خطاؤں پر ان کی معذرت قبول کر کے اپنائے۔ اور لوگوں کو اپنی صحبت کی برکت سے گناہوں سے توبہ دلوائے اور محمدی طریق میں داخل کرے۔ کیونکہ گناہوں سے تائب ہو جانے والا اس جیسا ہے جس کا کوئی گناہ نہ ہو۔ اور اللہ تعالیٰ بہت توبہ قبول کرنے والا اور بہت رحم کرنے والا ہے۔ اللہ تعالیٰ کو خطاؤں اور جرموں پر انتقام لینے اور سزا دینے والا سمجھنا چاہیے۔ اس کی سزا سے ڈرتے، کانپتے رہنا چاہیے۔ سزا و جزا کے دن سے بھی خائف رہنا چاہیے۔ اس صفت سے متصف ہونے کا ارادہ ہو تو عبادات میں کوتاہی اور گناہوں کے ارتکاب پر اپنے ہی نفس سے انتقام لے کر اس کی تکمیل کرے اور یوں دُنیا میں اپنے لیے آپ ہی منتقم بن جائے تاکہ آخرت میں تو اللہ تعالیٰ کے انتقام سے بچ جائے اور معاف کر دیا جائے۔ اللہ تعالیٰ کو بندوں کے گناہوں کو محو کر دیتے اور گناہوں سے درگزر کرنے والا سمجھنا چاہیے اور ہر وقت اس کی بخشش کا امیدوار رہتے ہوئے خود کو اس کے دامنِ عفو میں چھپا لینا چاہیے۔ اس صفت کو اپنانے کا آغاز اپنے بال بچوں، یار دوستوں، لگے بندھوں، نوکر نوکرانیوں اور دوسرے ماتحتوں کو معاف کر کے کرے۔ اللہ تعالیٰ کے عفو کو ہر لحظہ پیشِ نظر رکھے کہ تیرے کتنے گناہ دیکھ کر بھی وہ آخر کار رسول کریم صلعم کے صدقے تمہیں معاف کر دے گا۔ ملاحظہ ہو یہ آیت کریمہ کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے ناامید نہ ہو۔ بے شک وہ تمام گناہوں کو بخش دینے والا ہے۔ اللہ تعالیٰ

کو بڑا رحیم اور بڑی رحمت کرنے والا سمجھنا چاہیے، کیونکہ اس کی مہر مطلقہ تمام بندوں کے شامل حال ہے۔ اور اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر بڑا ہی مہربان ہے۔ پس اپنے حال پر اُس کے دائمی احسانات کو دیکھتے ہوئے اس کی حمد و ثنا اور شکر میں محو رہنا چاہیے۔ دوسرے بندوں کے حال پر خود رحم فرما کر اس صفت خداوندی کو اپنائے اور ہر کسی سے شفقت و مہربانی سے پیش آئے، اور خدا کی شفقت و مہربانی کا مظہر بن جائے۔ اس پاک ذات کو ساری مخلوقات کا مالک اور قابض سمجھنا چاہیے۔ کیونکہ اس کی بادشاہت میں عدم و وجود، زندگی و موت اور موجودات سے متعلق دیگر احکام کے لحاظ سے اسی کا حکم جاری ہے۔ ہر عظمت اور ہر کمال اسی کے لیے مسلّم ہے اور ہر بزرگی اور عظمت اسی سے صادر ہوتی ہے۔ اس صفت کو پیدا کرنے کا ارادہ ہو تو جلال و جمال کی جامع صفت اور اپنے وجود کی سلطنت میں اپنا قبضہ جما کر، ماتحتوں پر حکم نافذ اور اپنے نفس پر غالب آ کر اس کی تکمیل کرے۔ اللہ تعالیٰ کو منصف و عادل سمجھنا چاہیے کہ اس نے جو کچھ کیا ہے اور کر رہا ہے، سراسر عدل و انصاف ہے۔ اُس نے وہی کچھ کیا جو کیا جانا چاہیے تھا۔ بلکہ بسا اوقات تو اس نے اپنے بندوں کے حال پر اپنے رحم و کرم ہی کی تجلّی گرائی۔ جیسا کہ اس آیت کریمہ میں ہے کہ یہ امر ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں۔ اس صفت کو اپنانا ہو تو اپنے نفس کو عدل و انصاف کا عادی بنائے۔ جہاں تک ہو سکے اپنی دانست کے مطابق اپنے سے لین دین رکھنے والوں کی کبھی حق تلفی نہ کرے۔ جو کچھ جمع ہو چکا ہے یا حاصل مجموعہ کو اکٹھا اور جمع کرنے والا اسی کو سمجھے۔ اس کی جمع آوری لاانتہا ہے جو شمار اور گنتی میں نہیں آ سکتی اور اُس کی جامعیت مطلقہ کا تفصیل سے سراغ تک نہیں لگایا جا سکتا، سوائے اس کے کہ تمام مخلوقات اور موجودات کے حاصل جمع کا اک مختصر سا تصور کیا جا سکتا ہے۔ اور مجمل طور پر اس کے اسمائے حسنیٰ اور صفات ذات پر ایمان لایا جا سکتا ہے۔ اس کی ذاتی وسعت نے اس کی مطلق جامعیت کو چھو لیا ہے۔ یہ قول، کہ میں نہیں احاطہ کر سکتا تیری ثنا کا جیسے کہ تو خود ثنا کرتا ہے اپنے آپ کی، بھی انہی معانی کی خبر دیتا ہے۔ اس صفت سے متصف ہونا ہو تو اوصاف کمال کے سلسلے میں تمام امور میں جامعیت پیدا کرے۔ کیونکہ انسان اللہ تعالیٰ کے اسم "الجامع" کا مظہر ہے۔ اور ہر آدمی کمالات میں جتنا دوسروں سے زیادہ جامع ہوگا، اتنا ہی زیادہ افضل ہوگا۔ تمام تعریفیں اللہ ہی کے لیے سزاوار ہیں جس نے اپنے بہت سے ایمان والے بندوں پر فضیلت دی۔ اللہ تعالیٰ کو

تمام دُنیا اور اہلِ دُنیا سے بالکل بے نیاز سمجھنا چاہیے، کیونکہ ذاتی جزا اور غنا اور حقیقی بے نیازی موجودات میں اور کسی کو حاصل نہیں۔ اس صفت سے متصف ہونے کا ارادہ ہو تو اپنے نفس میں استغنا اور بے نیازی پیدا کرکے ماسوی اللہ سے بالکل بے نیاز ہو جائے اور اپنی جبین نیاز کو فقط اسی بے نیاز کے آستاں پر رگڑے اور اپنی بے نیازی اور استغنا کے ضمن میں اللہ تعالیٰ کو مخلوق کے مستغنی اور بے نیاز کرنے والا جانے۔ وہ اولیاؒ میں سے جس کسی کو چاہتا ہے استغنا کے اس عظیم منصب سے مشرف فرماتا ہے۔ اور اپنے سے ماسوا سبھی سے اسے بے نیاز کر دیتا ہے۔ اس صفت کو اپنانے کا ارادہ ہو تو طالبوں اور سالکوں کے دلوں میں استغنا کی نسبت ڈال کر، اور ان کے باطنوں کو حضور و شہود کی بدولت مستغنی بنا دے۔ مریدوں میں سے ہر کسی کو اس کی استعداد کے مطابق غنا و استغنا کا حصہ پہنچائے۔ کیا دُنیا اور کیا آخرت ہر جگہ اللہ تعالیٰ ہی کو ہر امر سے منع کرنے والا، یا اُسے پورا نہ کرنے والا سمجھے۔ جس کسی کو جو کچھ نہیں ملا اور نہ ملے گا، وہ اسی کی روک رکاوٹ کی وجہ سے نہیں ملا۔ اور نہ ہی ملے گا۔ بلکہ نہیں ہے کوئی روکنے والا اس کو جسے وہ دیتا ہے۔ اور نہیں دینے والا کوئی اس چیز کا جسے وہ روک لیتا ہے۔ اس صفت کو اپنانے کا ارادہ ہو تو اپنے نفس اور طبیعت کو شرعی ممنوعات کی اجازت نہ دے کر اور اپنے دیگر ماتحتوں کو ناپسندیدہ ممنوعات سے منع کرکے اسع کی تکمیل کرے۔ تمام ضرر رساں چیزوں کو پیدا کرنے والا اسی حق تعالیٰ کو سمجھے اور اپنی ذات کو جو نقصان، تکلیف، درد یا رنج پہنچے اسے خدا تعالیٰ ہی کی طرف سے سمجھ کر صبر کرے۔ کیونکہ جب تک اللہ نہ چاہے کوئی آدمی کسی دوسرے آدمی کو، اور کوئی شے کسی دوسری شے کو ضرر نہیں پہنچا سکتی۔ اس صفت سے متصف ہونے کا ارادہ ہو تو اپنے ظاہر اور باطن کے لیے مضر امور کو ضرر پہنچاؤ۔ یعنی جو امور ضرر رساں ہوں اُنھیں ضرر پہنچاؤ۔ دوسرے لفظوں میں اپنے نفس کو مارنا چاہیے۔ طبیعی خواہشات کو دبا کر، اور ہوا و ہوس کو کچل کر خود کو رنج و مشقت میں ڈال لو۔ سبھی منفعتوں کا خالق اسی ذات باری تعالیٰ کو سمجھتے ہوئے ہر نفع و فائدہ اور دوا و شفا کو اسی کی طرف منسوب کرکے اس کا شکر ادا کرو۔ کیونکہ جب تک خدا نہ چاہے کوئی شخص کسی دوسرے شخص کو اور کوئی شے کسی دوسری شے کو نفع نہیں پہنچا سکتی۔ اس صفت کو اپنانے کی خواہش ہو تو لوگوں کو نفع پہنچاؤ اور روحانی اور عقلی اور دُنیا و آخرت میں اپنے ظاہر و باطن کی نافع قوتوں کو تقویت دو۔ ہاں اپنے نفس کی رعایت کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے اس پر انتہائی تنگی اور سختی نہ کرنی چاہیے۔ اور یہ فرمان کہ تیرے نفس

کا بھی تجھ پر حق ہے۔ اسی امر کی خبر دیتا ہے۔ کیونکہ یہ بات بھی فساد کا موجب بن جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کو اپنی ذات میں روشن وعیاں، اور اپنے ظہور کے ضمن میں تمام موجودات و مخلوقات کو روشن اور پیدا کرنے والا سمجھنا چاہیے۔ کیونکہ مشہودات اور معقولات میں جو کچھ بھی مشہود و معقول ہے۔ اس کے نور کی نورانیت سے روشن و ہویدا ہے۔ پس اس صفت سے متصف ہونا چاہو تو اپنے اندر باطنی نور، حضور و شہود کا نور، علم و معرفت کا نور اور صلاح و تقویٰ کا نور پیدا کرو۔ حق تعالیٰ کو ہر رہرو کو راہ دکھانے اور منزل مقصود پر پہنچانے والا سمجھنا چاہیے۔ اسی کی رہنمائی طلب کرنی چاہیے، اور اُس کی ہدایت کے مظاہر سے پیوست رہنا چاہیے۔ اس صفت کو اپنانا ہو تو سالکان و رہروان راہِ حق کی رہنمائی اور رشد و ہدایت سے کرو۔ اپنی ہمت کے مطابق لوگوں کو ہدایت دو۔ اللہ تعالیٰ کو بے نظیر، بے مثال اور بے نمونہ اور بے مادہ بنانے والا، اور نئی اور حادث ممکنات کو وجود میں لانے والا سمجھنا چاہیے۔ جیسا کہ خدا نے خود فرمایا ہے کہ حق تعالیٰ موجد ہے آسمانوں اور زمین کا۔ اور مصنوعات اور نادرات کے مشاہدے سے اُس صانعِ مطلق اور موجدِ حقیقی کا سراغ لگانا چاہیے۔ اس صفت کی خواہش کی تکمیل انسانی طاقت کے مطابق مجازی و اعتباری اور مفید مطلب ایجادات و مصنوعات سے ہوتی ہے۔ مگر موجدِ حقیقی فقط وہی ہے۔ اسی کو دائم الوجود اور قائم البقا سمجھ کر اور اپنی خودی و انا کو چھوڑ کر فنا فی اللہ ہو جانا چاہیے اور پھر مشاہدۂ حق کی لقا سے باقی باللہ کے درجے کو پہنچ کر دائمی طور پر ان نیک کاموں میں مشغول ہو جانا چاہیے جنھیں باقیات الصالحات یعنی پسِ مرگ زندہ رہنے والے آثار خیر کہتے ہیں۔ کیونکہ اس صفت کو اپنانے اور اس سے تعلق پیدا کرنے کا یہی طریق ہے۔ اس ذات سبحانہٗ کو وارث حقیقی سمجھنا چاہیے۔ یعنی کہ تمام موجودات کے فنا ہونے کے بعد بھی باقی رہنے والا۔ کیونکہ فنا کے بعد تمام املاک کا رجوع اسی کی طرف ہوگا۔ جیسا کہ اس آیت کریمہ سے ظاہر ہے کہ تمام کے تمام امور اسی کی طرف رجوع کریں گے، اور یہ تو اس کے ظاہری معنی ہیں۔ ورنہ اب تو فقط وہی مالک حقیقی ہے اور ان غیر حقیقی مالکوں کو یہ عارضی قبضہ بھی از روئے حقیقت نہیں بلکہ اس کی حقیقی مالکیت کے ضمن میں اعتباری طور پر حاصل ہے۔ اور اس مشروط قبضے میں بھی اسی کی مطلق مالکیت کی جھلک ہے۔ اس صفت کو اپنانے کا ارادہ ہو تو اس کے انبیائے کرامؑ کی وراثت کو اپنا کر خلیفۂ حق بن جائے۔ علما، انبیاؑ کے وارث ہیں، اور اللہ تعالیٰ نے انسان کو زمین پر اپنا خلیفہ بنایا، پس تو ہو جا سچا وارث

اور لائق نائب تاکہ اللہ تیرے ساتھ وہ معاملہ کرے جو اس نے معاملہ کیا اپنے برگزیدہ بندوں کے ساتھ۔ اللہ تعالیٰ کو ہر حیثیت کے لحاظ سے درست تدبیر سمجھنا چاہیے۔ کیونکہ اس کے تمام اقوال ہدایت کے اسلوب پر اور تمام افعال راستی، درستی اور مضبوطی کی راہ پر ہیں۔ رشد و ہدایت کی التجا ہمیشہ اسی سے کرنی چاہیے، اور پورے خشوع و خضوع کے ساتھ اس کے فیض کا منتظر رہنا چاہیے۔ اس صفت سے متصف ہونے کا ارادہ ہو تو اپنے نفس کی رشد و ہدایت اور اپنے اقوال و افعال کی اصلاح کرو۔ دوسرے مریدوں کا مرشد بن جانا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ کو صابر حقیقی سمجھنا چاہیے یعنی گناہگاروں کی پکڑ دھکڑ میں صبر سے کام لیتے ہوئے اُنھیں سزائیں دینے میں عجلت نہ کی۔ لہٰذا اس کی بارگاہ سے ہمیشہ صبر کا سوال کرنا چاہیے۔ اور خود کو پیش آنے والی ناپسندیدہ باتوں اور دشواریوں پہ صبر کرنا چاہیے۔ اس صفت کو اپنانے کا ارادہ ہو تو مجرموں سے انتقام لینے میں صبر کرو۔ شاید وہ اپنی ان غلط کاریوں سے باز آجائیں اور توبہ کرلیں۔ عجلت نہیں کرنی چاہیے کہ یہی سنتِ الٰہی ہے اور وہی پاک ذات صبور اور شکور ہے۔ قصہ کوتاہ یہ کہ جب تم اسمائے حسنیٰ کے مراتب کی تفصیل کو اچھی طرح سمجھ لو۔ اور اس کائنات کو بالکل اسی کے اسمائے حسنیٰ کا مظہر سمجھنے لگو تو پھر تمھیں چاہیے کہ ان اسماء اور ان کے مظاہر کی اس کثرت میں مسمیٰ کی وحدت ذات ہی کا مشاہدہ کرو اور کثرت سے وحدت کی طرف پلٹ جاؤ اور وجہ اللہ کے مشاہدے میں مستغرق ہو جاؤ، اور اعتباری صورتوں کے امتیاز کی تشویش میں مبتلا نہ ہو جاؤ۔ رباعی

تمیز کہ غیر نقش تشویش نہ بست
ہر لحظہ بہ نیرنگیٔ رنگی پیوست
گفتم وحدت چاں بکثرت گنجد
دل آمد و پیش رویم آئینہ شکست

ترجمہ رباعی: اس اعتباری مراتب کے امتیاز نے تشویش و پراگندگی کے علاوہ اور کوئی نقش نہ دیکھا لہٰذا وہ ہر لحظہ نتِ نئی نیرنگیوں کی رنگا رنگی اور کثرت میں کھویا رہا۔ میں نے کہا کہ اس کثرت میں وحدت کیسے سما سکتی ہے۔ دل نے آگے بڑھ کر میرے سامنے آئینے کو توڑ کر چکنا چور کر دیا۔ اب مصنف کی اپنی توضیح ملاحظہ کیجیے۔ وہ لکھتا ہے کہ پہلے مصرع میں تمیز کا لفظ تفصیل کے وزن پر

جس سے مراد موہوم و اعتباری مراتب کے امتیاز سے ہے جس کا یقینی لازمہ تشویش و پراگندگی ہے، جو ہر لحظہ عجائبات عالم کی رنگا رنگی میں کھویا رہتا ہے۔ اور مختلف اعتبارات اور رنگوں میں محو رہتا ہے۔ اور یوں وحدتِ ذات کے مشاہدے سے محروم رہتا ہے۔ کثرت کے ان متعدد مراتب میں وحدت کے دیدار پر تعجب کرتا ہے۔ لہٰذا عارف کا دل جو مادیت سے پاک ہوتا ہے۔ اپنی صفائی و پاکیزگی کی بنا پر ذاتِ خداوندی کے مرتبۂ وحدت کا آئینہ دار بنا۔ وہ ماسوی اللہ کے تمام اعتبارات سے کٹ کر فقط وحدتِ ذات سے جا ملا۔ گویا وہ ایک ایسا آئینہ ہے جو ٹوٹ چکا ہے جس نے کثرت کے متعدد مراتب میں فقط وحدت ہی کو ظاہر و آشکارا کیا ہے۔ یعنی جس طرح آئینے میں کثیر التعداد ریزے فقط ایک ہی شکل میں منعکس ہوتے ہیں۔ اسی طرح اعتباری موجودات کے مراتب میں حضرت واجب الوجود کی وحدتِ حقیقی کا حسن جلوہ افروز ہے۔ ہر چند کہ کسی چیز کو وجہ اللہ کے مقابل یا برابر نہیں ٹھہرایا جا سکتا، لیکن پھر بھی کائنات کا ہر فرد اُس کے اسماء اور صفات کا مظہر ہے۔ یعنی اگرچہ اللہ تعالیٰ کو ممکنات سے شخص اور آئینے کا سا تقابل نہیں کہ وہ عکس کی مانند اس میں جلوہ گر ہو۔ لیکن اس کی پرورش اس کی "پرورش یافتہ مخلوق" کو ہر لحظہ اپنی حمایت کے سایہ میں موجود رکھتی ہے اور آفتابِ حقیقی ہر لحظہ ان ذرّوں کو اپنے ظہور کے ضمن میں نمود و نمائش بخشتا ہے۔ اور ظل اللہ سے مراد موجودات میں وجودِ ذات کی یہی شمولیت ہے۔ اور اس آیت کریمہ کے بموجب کہ اسے مخاطب کیا تو نے اپنے پروردگار کی قدرت پر نظر نہیں کی کہ اُس نے سایہ کو کیونکر دُور تک پھیلایا ہے۔ متقابل اسماء مرتبۂ ظہور کا امتیاز پا کر اشیا کے پردے میں ممتاز ہوئے، اور اشیا اپنی اضداد سے ظاہر ہوتی ہیں۔ یہاں ضمیر کا مرجع اسماء ہیں، یعنی اشیا اسماء کے تقابل و تضاد سے ظاہر ہوتی ہیں جو اُن کے مظاہر ہیں۔ یعنی کہ اسمائے متقابل نے مرتبۂ علم میں امتیاز پایا اور حقائق اشیا میں جو ان کے مظاہر ہیں ایک دوسرے سے ممتاز ہوئے۔ اگرچہ یہ اعتباری و علمی مجمل امتیاز ذاتی شانوں اور حالتوں میں بھی ثابت ہے۔ کیونکہ اس کا علم عین اس کی ذات ہے، لیکن مظاہر کے مراتب میں ظاہری امتیاز پیدا ہو گیا۔ کیونکہ وہ اس مجمل کا مفصل ہیں، اور علمی اشکال انہی سے عبارت ہیں۔ اور ان مختلف اشیا کا وجود اسما کے کمالات کے ظہور کا باعث بنا، اور اسماء کا امتیاز اشیا کے وجود کا موجب بنا۔ لہٰذا اشیا جو اللہ جل شانہٗ کے اسمائے متقابل کے مظاہر ہیں۔ اسما کے اسی باہمی تقابل و تضاد کی

وجہ سے ممتاز ہوئیں اور اسما ہی اشیا کے موجود ہونے کی علت ہیں اور اشیا اسما کے ظہور کی۔ اسمأ کے ظہور کا لازم ہونا اشیا کے ساتھ ہے۔ جیسے کہ صورت اور ہیولی کا لازم ہونا، پس نہیں ہے دوری۔ یعنی اشیا کے ساتھ ظہور اسما کا ہمیشہ رہنا ایک حیثیت کی راہ سے نہیں، بلکہ مختلف اعتبارات کے لحاظ سے ہے جو ظہور و وجود کے اعتبارات ہیں۔ جس طرح کہ صورت ڈھانچے کے وجود کی علت ہے۔ اور ڈھانچہ صورت کے ظہور کی علت ہے۔ اور اسی صورت میں کہ حیثیتوں میں اختلاف ہے دوری لازم نہیں۔ کیونکہ دوری اس وقت ثابت ہوتی ہے جب طرفین میں ایک حیثیت سے محتاجی ہو۔ اور مخلوق کا خالق سے محتاج ہونا محتاج بیان نہیں۔ اور یہ بالکل عیاں ہے کہ خالقیت کے معانی کے ظہور کے لیے مخلوق کا ہونا کتنا ضروری ہے۔ وہ خالقِ حقیقی خود کہتا ہے کہ مجھے پہچانے جانے کی تمنا تھی سو میں نے خلقت کو پیدا کیا۔

حاجت مند اور حاجت روا کے درمیان
معاملۂ احتیاج کے بیان میں ایک عمدہ بات

سمجھ لو کہ احتیاج دونوں طرف ہی سے ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر جس طرح رعیت بادشاہ کی محتاج ہے، اسی طرح بادشاہ بھی رعیت کا محتاج ہے۔ طرفین میں جو ادنیٰ ہو اسے حاجت مند کہتے ہیں، اور جو اعلیٰ ہو اُسے حاجت روا کہتے ہیں۔ حاجت مند اور حاجت روا دونوں محتاج ہوتے ہیں ایک دوسرے کے۔ حیثیت کے لحاظ سے غنی کی ذات سے حاجت کو سلب کر لینے کا نام غنا ہے۔ جیسا کہ قرآن میں ہے کہ وہ یہ نہیں کہتا کہ تمھارا رب غنی ہے۔ کیونکہ پرورش کنندہ کا مرتبہ پرورش پانے والوں کو چاہتا ہے، اور پرورش پانے والے اس کے محتاج ہیں۔ ربوبیت کے مرتبے میں لفظ احتیاج لانے میں بھی بے ادبی کا پہلو نکلتا ہے۔ ان معنوں کو حُبّ سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ رب اور مربوب کی اس نسبت کو خود حق سبحانہ تعالیٰ نے لفظ حُبّ سے تعبیر کیا ہے۔ دیکھیے یہ آیت کریمہ کہ اللہ تعالیٰ ان سے محبت کرتا ہے، اور وہ اس سے محبت کرتے ہیں۔ لہٰذا غنا فقط اسی اللہ جل جلالہٗ کی ذات واجب سے مخصوص ہے۔ سب ممکنات اس کے محتاج ہیں۔ اسما اور صفات واجب الوجود کا مرتبہ سب کا حاجت روا ہے۔ اور یہ اس کی ذات کی طرف دیکھتے ہوئے

ہے کہ نہیں ہے وہ محتاج اور نہ محتاج الیہ ہے۔ پس یہ بات خوب سمجھ لو۔ پس اسماء وصفات کی تفصیل کے مراتب میں ظہور کے لیے مظاہر کا ہونا لازمی ہے جو اس کی تمام حالتوں (شانوں) کی نورافگنی اور عکس ریزی کا محل ہوتے ہیں۔ کیونکہ مخلوق اپنے خالق ہی سے موجود اور قائم ہے اور معبود کے لیے بھی عبد کا ہونا لازمی وضروری ہے۔

سوال اگر تم یہ کہو کہ تمھاری اس تقریر سے دوری کی لزومیت رفع ہوگئی، لیکن ایک اور شبہ باقی ہے۔ اشیا کے ساتھ ظہور اسماء کی (ملازمت) یعنی ہمیشگی سے یوں لگتا ہے کہ ظہور اسماء کے لیے اشیاء کا وجود لازم ہے، اور وجود اشیا کے لیے ظہور اسماء لازم ہیں۔ اور نہ تو ظہور اسماء سے وجود اشیا کبھی جدا ہو سکتا ہے، اور نہ ظہور اسما کے بغیر اشیا کا وجود صورت پذیر ہو سکتا ہے۔ جس طرح کہ نہ تو صورت کو ڈھانچے سے الگ کیا جا سکتا ہے، اور نہ ہی ڈھانچہ صورت کے بغیر ہوتا ہے۔ پس اسمائے الہیہ چونکہ قدیم ہیں، اور اسمائے الہیہ میں تعطل روا نہیں تو پھر ضروری ہے کہ اشیا بھی قدیم ہوں جیسا کہ فلاسفروں کا عقیدہ ہے کہ وہ عالم کو قدیم سمجھتے ہیں۔ اور یہ بات شرع شریف کے خلاف ہے۔ کیونکہ آسمانوں اور زمین اور جو کچھ ان میں ہے اُن کا حادث اور فانی ہونا آیات قرآنی اور احادیث نبوی سے ثابت ہے۔ **جواب** لفظ اشیاء سے مُراد مطلق اشیا ہیں جو ماضی وحال ومستقبل یعنی ازل سے لے کر ابد تک کی تمام موجودات پہ مشتمل ہیں، نہ کہ موجودہ مخصوص اشیا جس سے کہ آسمانوں اور زمین کے قدیم ہونے کا شبہ لازم قرار پائے۔ یقیناً یہ سب فنا کا مال ہے۔ اور ان کا فانی ہونا قرآن وحدیث سے ثابت ہے۔ اور یہ سب جن کا نو ایجاد ہونا آیات قرآنی اور احادیث نبویؐ سے ظاہر ہے یقیناً حادث ہیں۔ محدثوں کے نزدیک ان کے قدیم ہونے کا کوئی احتمال نہیں۔ ہاں مخلوقاتِ مطلق کی ایک قسم قدیم ہے۔ کیونکہ خالق کا تصور کبھی بھی بغیر مخلوق کے ممکن نہیں۔ اگر زمانے کے لحاظ سے یہ مخلوقات حادث ہیں یا فانی تو کیا ہوا، ان سے پہلے بھی تو مخلوقات تھیں۔ ان کے بعد بھی ہوں گی، اور ممکنات کا یہ حدوث تو زمانۂ قدیم سے جاری ہے اور ہمیشہ جاری رہے گا۔ لہٰذا شیخ محی الدین اکبر ابن عربیؒ کے نزدیک بھی عالم کی ایک قسم قدیم ہے۔ اور قرآن وحدیث میں بھی اشیا کے کسی وقت موجود نہ ہونے کا بیان کہیں نہیں آیا۔ حضور سرور کائناتؐ نے فرمایا؛ اور ان آسمانوں اور زمین سے پہلے اللہ کا عرش پانی پہ تھا۔ اور حدیث میں بھی آیا ہے کہ کسی شخص نے آنحضرت رسولِ کریمؐ سے پوچھا کہ جب یہ مخلوقات نہ تھی تو اللہ تعالیٰ کہاں تھا۔ فرمایا بادل کے اوپر جس کے نہ اوپر ہوا تھی اور نہ نیچے۔ اور دُنیا کے فنا ہونے کے بعد قیامت کا برپا ہونا، مردوں کا اٹھنا، بہشت و دوزخ،

پل صراط ، میزان ، عدل ، کوثر اور ایسی دیگر چیزوں کا ہونا خدا و رسولؐ کے فرمودات سے ثابت ہے ، اور یہ سب ہمارے دینی عقائد میں سے ہیں۔ سو یقیناً مخلوقات کی ایک نوعِ قدیم ہے۔ اور دُنیا حادث اور فانی ہے۔ اور یہ بعض علما جو قیامت کے دن کل موجودات کے آناً فاناً فنا ہو جانے کا بیان کرتے ہیں وہ اس بات کو نہیں سمجھتے کہ اس کے لیے بھی قیامت کے اس روز اور اُس گھڑی کا وجود لازمی ہے۔ چونکہ قیامت کا دن بھی ایک دن ہی ہوگا لہذا وہ بھی زمان ہی کے زمرے میں آئے گا ، اور زمانے کا تعلق حرکت سے ہے اور حرکت کا فاصلے سے ، اور فاصلے کا جسم سے۔ پس یہ بات سمجھ لو کہ اسما کا تقابل اسمائے سے ہے نہ کہ اشیا کا تقابل اسمائے سے۔ پس " اُس " کے مقابل بھی " وہ خود " ہی ہے۔ باطن مغز ہے اور ظاہر پوست۔ یعنی اسمائے الٰہیہ کا تقابل اپنے آپ سے ہے۔ ایک اسم ذات ، دوسری اسم ذات کے اس طرح بالمقابل ہے جس طرح اسم ظاہر اسم باطن کے مقابل ہوتا ہے نہ یہ کہ دنیوی موجودات کا اسمائے الٰہیہ سے مقابلہ ہے۔ اور یہ چونکہ اسمائے الٰہیہ کے مجازی آئینے ہیں۔ سو اس کا مقابلہ اُسی سے ہے۔ باطن کا مرتبہ مغز کی طرح ہے جو چھپا ہوا ہے۔ اور ظاہر کا مرتبہ چھلکے یا پوست کی طرح جو ظاہر اور عیاں ہے۔ بلکہ فقط وہی ایک مرتبہ اطلاق ہے جو ان کثیر التعداد مشروط مراتب میں مختلف شکلوں میں جلوہ گر ہے۔ یہ سمجھ لیجیے کہ نحویوں کے نزدیک " اسم " اُسے کہتے ہیں جو مستقل معنی رکھتا ہو ، بغیر کسی ضمیمے اور شرکت کے اور ازمنۂ ثلاثہ (ماضی و حال و مستقبل) سے اس کا ربط و شرکت نہ ہو۔ یعنی اسم وہ کلمہ ہے جو بذاتِ خود اک مستقل معنی رکھتا ہے ، اور اسے اپنے ان معانی کی دلالت کے لیے کسی دوسرے کلمہ سے مربوط ہونے کی حاجت نہیں۔ مقترن نہ ہونے سے ہماری مُراد یہ ہے کہ وضعِ اوّل کے مطابق اس کی کسی سے شراکت یا رفاقت نہ ہو۔ لہذا افعال کے نام بھی اسما ہی میں داخل ہیں۔ اور گزرے ہوئے زمانے کے افعال اسما میں داخل نہیں ہیں۔ چونکہ نحویوں کے اسلوب پر اسم کی تعریف متن میں بھی دی جا چکی ہے۔ براہِ راست ہمارا وہ مقصد یا منظور نہیں ، لہذا یہاں شرح میں بھی اس تعریف سے متعلق تحقیقات کی تفصیل جو نحویوں کے علم سے مخصوص ہے ، بیان نہیں کی گئی۔ اور یہ دو قسموں میں تقسیم کیے جاتے ہیں۔ ایک ہے اسمِ عین جو ایسی معین چیز پر دلالت کرتا ہے جو اپنی ذات کے ساتھ قائم ہوتی ہے ، جیسے زید اور عمر۔ اور اس میں دوسری قسم اسم معنیٰ جو اپنی ذات کے ساتھ قائم نہیں ہوتی ، چاہے اس کے معنی وجودی ہوں جیسے علم ، چاہے عدمی ہوں جیسے جہل۔ اربابِ معقول کے نزدیک اسم کی دو

قسمیں ہیں۔ منطقیوں نے لکھا ہے کہ اگر اسم کے معنی واحد کے ہیں۔ پس وہ اسمِ ذات واحد ہے اور کسی واحد کی شخصیت سے مخصوص ہے، جیسے زید اور عمر، اس اسم کا نام اسمِ علم ہے یا پھر اِسم معنیٰ ہے جو کسی واحد شخصیت سے مخصوص نہیں ہوتا۔ اُس کے معنی وصفی و جنسی ہوتے ہیں جو کسی چیز کے ساتھ لاحق ہوتے ہیں، اور وہ تعین کے اعتبار بغیر عوض کے طور پر خارجی فرد کا موضوع ہوتے ہیں۔ جیسے کاپی اور مرد، اس کے معنی خواہ وجودی ہوں جیسے علم خواہ عدمی ہوں جیسے جہالت اگر وہ ہموار (یکساں) ہو تو اپنے خارجی یا ذہنی افراد سے متوافق ہوگا جیسے انسان اور شمس (سورج) اگر بعض افراد میں بعض کی نسبت اس کا حصول مقدم اور اولیٰ ہو تو وہ مشکوک، جیسے اپنے مصدری معنوں میں وجود۔ واجب اور ممکن کی کئی نسبتیں ہیں۔ اگر ان معانی کی وضع کے لیے تمام یکساں ہوں تو وہ مشترک ہیں جیسے عین، اور اگر یکسانیت نہ ہو، بلکہ ایک معنی میں موضوع ہو، پھر دوسرے معنی کی طرف منقول ہو جائے۔ پس اس صورت میں اگر پہلا موضوع متروک اور عرف عام کا نقل کنندہ ہو تو اسے منقول عرفی کہتے ہیں، اگر وہ شرع کا ناقل ہو تو اُسے منقول شرعی کہتے ہیں، جیسے نماز، اگر عرفِ خاص کا نقل کنندہ ہو تو وہ منقول اصطلاحی کہلاتا ہے۔ اور اگر اس موضوع پر دلالت کرنے والا پہلا لفظ متروک نہ ہو تو وہ پہلی نسبت سے حقیقی ہے اور منقول الیہ کی حیثیت سے مجازی ہے۔ جیسے شیر کی نسبت پھاڑنے والے درندے اور مرد شجاع سے، صوفیا کی اصطلاح میں اس کا مرتبہ ذاتِ حق کے مرتبے سے مع اس کی صفات کے ہے۔ جب یہ معلوم ہوگیا کہ مرتبۂ اسم، مرتبۂ ذات مع مرتبۂ صفات ہے جس طرح کہ علیم اور سمیع، یعنی وہ ذات جو علم رکھتی ہے، اور وہ ذات جو سُن سکتی ہے۔ اور اسی طرح دیگر اسماء کے متعلق بھی قیاس کرلو، پس ذات باری تعالیٰ کا کوئی اسم (نام) جیسا کہ وہ ہے ملاحظۂ صفات کے بغیر نہیں، جیسا کہ خالص محمدیوں کا عقیدہ ہے۔ سوائے اس کے کہ اسمائے حسنیٰ میں بڑا اسم وہ ہے جس میں ذات کو مع تمام صفات کے ملحوظ رکھا گیا ہے۔ جیسے "اللہ" یا صفات کو ملحوظ رکھے بغیر، کہ یہ بھی بے عیب ہونے کی اک صفت ہے، جیسا کہ "ہُو" لہٰذا احادیث میں اس سب سے بڑے اسمِ ذات کو اسمِ اعظم سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اور اسمِ ذات کا اطلاق نہیں ہوا۔ اور کوئی اسم مبارک ذات کے بغیر محض صفات کے لحاظ سے نہیں، کیونکہ ذاتِ حق کا مکمل نام (اسم) صفات سمیت ہے۔ حتیٰ کہ اگر کسی اسم سے منظور صفت ہو تو وہاں بھی ذات الصفت کو

ملحوظ رکھا جائے گا۔ اور محمدیوں کے نزدیک اسمائے مراتب کی تفصیل ہے، جیسے کہ آگے آ رہی ہے۔ پس وہ اسماء کہ جن کا اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور پہ تجویز کرنا درست نہ ہو، اور جو فقط حق جل جلالہ کے لیے مخصوص ہیں۔ جیسے اللہ اور رحمٰن، وہ اسمِ علم ہیں، اور وہ نام جن کا دوسروں پر بھی اطلاق ہو سکتا ہو، جیسے مومن اور مصوّر۔ وہ اسماء ہیں مگر اسمائے علم نہیں۔ پس اسم کا مرتبہ گویا مرتبۂ ذات مع صفات کے ہے۔ خواہ وہ صفت عام ہو خواہ صفت خاص۔ اور علم مرتبۂ ذات تشخص ذات اور صفت سمیت ہے، اور شخص واحد سے مخصوص ہے۔ اور علمی معنی کے برعکس اُس کے اسمی معانی میں علمی معانی بھی شامل ہیں۔ چاہے بلاؤ اللہ کو چاہے پکارو اسے رحمان، جو بھی نام تم پکارتے ہو اسی کے ہیں سب اسمائے حسنیٰ۔ بعض اسماء فقط اسم ہیں۔ اور بعض اپنی اسمیت میں علمیت (یعنی اسم علم ہونے کی) کی تخصیص بھی رکھتے ہیں۔ پس مرتبہ اسم مرتبۂ ذات بمع صفات کے ہے۔ خواہ صفت خاص ہو، خواہ صفت عام جو اپنے موصوف میں غیر کی شرکت کی مانع نہ ہو۔ اور وہ صفت دوسروں میں بھی پائی جاتی ہو جیسا کہ مصوّر اور حکیم جو اسمائے الٰہیہ ہیں۔ اور پھر جس کسی میں یہ تصویر کشی اور حکمت کی صفت پائی جاتی ہو اُسے بھی مصوّر اور حکیم کہا جاتا ہے۔ علم مرتبۂ ذات کا مرتبہ ذات کے تشخص اور خاص صفت سمیت ہے۔ وہ صفت جو اپنے موصوف میں غیر کی شراکت کی مانع ہو۔ اور دوسروں میں نہ پائی جاتی ہو۔ اور فقط ایک ہی ذات سے مخصوص ہو جیسے اللہ اور رحمٰن کہ سوائے حق تعالیٰ کے یہ الوہیت اور رحمتِ عام کسی اور میں نہیں پائی جاتی۔ جہاں کہیں مجازی طور پہ ظہور رحمت اور الوہیت کا نمونہ پایا بھی جائے اسے اللہ اور رحمٰن نہیں کہہ سکتے۔ اور ان باطل الاہوں کہ جن کی نفی ضروری ہے۔ اگرچہ بظاہر انھیں اِلٰہ کہا گیا ہے، لیکن اللہ کسی نے نہیں کہا۔ اسمائے علم میں مطلق عمومیت و خصوصیت ہے۔ تمام اسمائے علم اسماء میں داخل ہیں، مگر تمام اسماء اسمائے علم نہیں۔ یاد رکھیے کہ اللہ اور رحمٰن وہ اسمِ مرتبہ ہیں جو تمام صفات اور تمام کمالات کے جامع ہیں۔ اور یہ دونوں اسم اسی ایک مرتبۂ جامع پہ دلالت کرتے ہیں۔ جیسا کہ خود خدا تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ خواہ اللہ کہہ کے پکارو، خواہ رحمٰن کہہ کر سب نیک اور مبارک نام اسی کے لیے ہیں۔ لیکن اتنا فرق ضرور ہے کہ اسم اللہ میں تنزیہی طرف غالب ہے۔ اور اسم رحمٰن کا تشبیہی طرف جھکاؤ ہے۔ مرتبے کی اسی جامعیت کو ہم اسم جامع کہتے ہیں۔ اس میں تنزیہہ و تشبیہہ یکساں ہیں۔ کوئی جانب دوسری پہ غالب نہیں۔ لیکن چونکہ شرافت (بزرگی) میں تخصیص و علمیت نہیں، اس کا رتبہ ان دونوں اسموں سے پایاں تمہ

(بلند تر) اور مضبوط و مستحکم ہے - ان مراتب کو اسمائے جامعہ کا مرتبہ کہتے ہیں۔ بعض اسمائے ثابت ہیں جیسا کہ مذکورہ بالا اسماء علیم و سمیع اور ایسے ہی دیگر اسماء یعنی جن سے مراد ذات اپنی ثابت شدہ صفات سمیت ہے - بعض اسمائے سالبہ ہیں، جیسے کہ اس جیسی اور کوئی شے نہیں، جو ایک ہزار ایک ناموں میں آیا ہے - یعنی ذات مع صفاتِ سلبیہ - بعض اسمائے حسنیٰ ہیں۔ یعنی وہ نام جو واضح طور پر قرآن شریف میں آئے ہیں - اور وہ ہی ننانوے نام ہیں - بعض اسمائے توقیفیہ ہیں۔ یعنی جو سماع پر موقوف ہیں، اور کتاب اللہ ہی سے ان کا استخراج کیا گیا ہے - اگرچہ وہ صریحاً قرآن شریف میں نہیں آئے لیکن لزومیت کے دلائل سے آیات قرآنی ہی سے نکالے گئے ہیں۔ جیسے کہ ان کو رات میں داخل کر دینے والا جو ایک ہزار ایک ناموں میں داخل ہے - اس قسم کے دوسرے اسماء جو احادیث میں آئے ہیں - یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ بعض اسما میں مذکورہ حیثیتیں بہت سی جمع ہیں، اور بعض میں کم، یعنی بعض اسمائے توقیفیہ بھی ہیں - اور اسمائے حسنیٰ میں شامل نہیں ہیں، جامعیت اور علمیت نہیں رکھتے صرف سلبیت یا ثبوتیت رکھتے ہیں، اور علیٰ ہٰذا القیاس اسی طرح دوسری قسمیں۔ پس بزرگی و عظمت کی حیثیتیں ان حیثیتوں سے کہیں زیادہ ہیں - بعض اسماء ان گنت ہیں جن کی تصریح کی شرع شریف نے اجازت نہیں دی - حدیث شریف میں صرف یہی اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے بے شمار اور لا تعداد نام ہیں - لامتناہی انتہا کا مقید کیسے ہو سکتا ہے - یہ اک امر محال ہے - رباعی

ہر چند کہ اسفلیم لیک اعلائیم
سنگیم ولی کعبۂ ہر بینائیم
جز نام دگر زمانیاید طلبید
مانند نگین جلوہ گہ اسمائیم

ترجمہ رباعی : ہر چند کہ ہم ادنیٰ و پست ہیں، لیکن پھر بھی اعلیٰ و اولیٰ ہیں - اگر ہم پتھر ہیں، لیکن چشم بینا کے لیے کعبہ کی حیثیت رکھتے ہیں - اس ہستیٔ موہوم کے علاوہ ہم سے کسی اور نام کی طلب نہ کرنی چاہیے - یہ ہستی موہوم اس نگینے کی مانند ہے جو اسمائے حسنیٰ یعنی موجود حقیقی کی جلوہ گاہ ہے - مصنف کی اپنی تشریح کے مطابق اشارات و کنایات کی وضاحت یوں ہے - کہ سبحان اللہ انسان جو اللہ تعالیٰ کے اسم جامع کا مظہر ہے - اور اپنے اندر تمام اسمائے الٰہیہ کے ظہور کی جامعیت رکھتا ہے

اس آیت کریمہ میں کہ اللہ تعالیٰ نے آدم کو تمام اسما سکھا دیے اسی طرف اشارہ ہے ۔ گرچہ بظاہر سب سے نیچے، لیکن بباطن سب سے بلند اور تمام کائنات سے اعلیٰ و ارفع ہے ۔ گرچہ بظاہر کعبہ کی طرح آب و گل اور سنگ و خشت سے مرکب ہے ۔ لیکن حقیقت میں قدسیوں کا مسجود یعنی مسجود ملائک ہے ۔ یہ انسانی صورت جلوۂ رحمانی کی آئینہ دار ہے، کہ قرآنِ پاک میں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آدم کو اپنی صورت پہ پیدا کیا ۔ یہ برائے نام ہستی فقط ہستیٔ موہوم ہے ۔ مگر وہ موجود حقیقی کی جلوہ گاہ بھی ہے ۔ دیکھئے یہ آیت کریمہ کہ بڑی شان والا ہے وہ اللہ جس نے انسان کو پیدا کیا، اُسے گویائی سکھائی اور اس کو اپنی صورت پہ بنایا، اور وہ تمام صنّاعوں سے بڑھ کر ہے ۔

هوالناصح

شروع اللہ کے نام سے جو نہایت مہربان اور بہت رحم والا ہے

ہر قسم کی تعریف اللہ تعالیٰ کے لیے ہے، جس نے بنایا علم و عرفان کو نور اور چراغ، اور بنایا ہمارے اسلام اور ایمان کو شریعت اور طریقت اور درود و سلام ہو اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر جس نے نکالا مخلوق کو تاریکیوں سے نور کی طرف، اور خوب نکالا، اور آپ کی آل رض پر اور آپ کے اصحاب رض پر جنھوں نے داخل کیا لوگوں کو اس کے دین میں جوق در جوق۔ اما بعد پس یہ تینتیسواں ۳۳ باب ہے جس کا نام سراج الوہاج ہے۔ (سراج الوہاج سے یہاں مراد علم حصولی ہے) جو حاصل ہوا ہے انسان کو اور منکشف کیا گیا ہے اس پر علم کے نور سے اس چیز کو جو امکان میں ہے جس طرح کہ بنایا اللہ تعالیٰ نے سورج اور چاند کو آفاق میں بھڑکنے والا (بہت زیادہ روشن) اسی طرح بنایا علم اور احساس کو نفوس کے اندر سراج وہاج۔ پس علم حسی کی مثال چاند کی ہے اور علم عقلی کی مثال سورج کی ہے اور محسوسات کا مقام رات کے عرصے کی طرح ہے، جیسے بنایا اللہ نے لباس۔ اور پردے میں، ہو جاتے ہیں نفوس محسوسات کے تعلق کے ساتھ حق کے شہود سے، اور معقولات کا مرتبہ جو ہے وہ عرصۂ نہار (دن) کی طرح ہے، جیسے بنایا اللہ نے معاش اور منکشف کرتا ہے نفوس پر معقولات کے ادراک سے معاش اور معاد کی صلاح و فلاح، عاقل اور عارف لوگ دُنیا میں اور آخرت میں اچھا معاش بناتے ہیں۔ اے ہمارے رب ہمیں عطا کر دُنیا میں بھی نیکی اور اچھائی، اور آخرت میں بھی اچھائی

اور بھلائی۔ اور ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچا۔

علم العلم کے بیان کا باب جسے علمِ مرکب کہتے ہیں

علم وجود باری تعالیٰ کا آئینہ دار اور اس کی جلوہ گاہ ہے۔ وجود ذات اسی آئینہ میں جلوہ فرما ہو کر اپنا ظہور کرتا ہے۔ جس طرح وجود کے دو مرتبے ہیں۔ ایک کھینچنے کا منشا اور دوسرے کھینچ کر نکالے جانے والی چیز۔ اُسی طرح علم کے بھی دو مرتبے ہیں۔ ایک علمِ بسیط جو فقط دانست یعنی جاننا ہے۔ یا حاصل مصدری معنوں میں ذات العلم، اور یہ علم ذات الوجود کا مظہر ہے جو کھینچے جانے کا منشا ہے، بلکہ عیناً وہی ہے۔ اللہ کو اللہ کے سوا نہیں پہچان سکتے۔ دوسرا علم مرکب ہے جو اس دانست کو بھی جانتا ہے یعنی مصدری معنوں میں۔ یہ علمِ وجود ظلی کا مظہر ہے۔ وہ ذات الوجود کے زائد معنی ہیں، اور اس کی پہلی صفت ہے۔ اس مقام پر حضرت وجود کا موجود ہونا نظر آتا ہے۔ جہل جو علم کی ضد ہے، اس کی بھی دو قسمیں ہیں۔ ایک جہل بسیط یعنی کہ نہ جاننا۔ دوسری قسم جہلِ مرکب ہے۔ جہاں نہ جاننے پر جاننے کا رنگ چڑھا ہوا ہوتا ہے۔ یعنی نہ جانتے ہوئے بھی یہ سمجھنا کہ وہ جانتا ہے۔ علم کو علم مرکب، علم تفصیل اور علم اجمالی کی ترکیب کی بنا پر کہتے ہیں۔ اور جہل کو جہل مرکب علم کی جہل کے ساتھ ترکیب کی بنا پر کہتے ہیں۔ اور اس بیان کا تعلق نفس العلم اور نفس الجہل سے ہے، اور اس کا انحصار اعتبارات کی رُو سے علم و جہل کی آمیزش سے ہے۔ جو علم و جہل کے دیگر تمام اصطلاحی اور غیر اصطلاحی مراتب میں شامل ہے۔ جو علم حق و باطل کو بالکل نہ جاننے اور نہ جانتے ہوئے، جاننے کی غلط فہمی پہ مشتمل ہو، اور اصطلاحی معنی کے لحاظ سے جس پہ حکمانے لب کُشائی کی ہے۔ علم عبارت ہے واقع کے مطابق عقل میں کسی چیز کے تصوّر کے کے حصول سے، یا کسی چیز کے نفس کی تصدیق سے جیسی وہ فی نفسہٖ ہے۔ یعنی حق کے مطابق صحیح دانست اور علمِ مرکب عبارت ہے اپنے اس علم کی سچائی کو پختگی کے ساتھ جاننے سے کہ اس نے نفس کو معلوم شے کی نسبت دو علم جمع ہونے سے ترکیب پائی۔ اور جہلِ بسیط یہ ہے کہ نفس کسی خلاف واقع بات کا تصوّر یا اس کی تصدیق کرے، لیکن اس پہ پختگی سے قائم نہ ہو، یعنی ثبوت کے بغیر غیر واقعی علم، اور غلطی کے لحاظ سے یہ علم بھی جہل ہی میں داخل ہے۔ کیونکہ اُس نے اس کی حقیقت کو نہیں سمجھا۔ اور جہل مرکب یہ ہے کہ نفس کو کسی ایسے امر پہ اعتقاد ہو جو خلاف حق بھی ہو اور خلاف واقع بھی، اور وہ

اس پہ پختگی سے ڈٹا رہے۔ اسے جہل مرکب اس لیے کہتے ہیں کہ علم تو وہ ہے کہ کسی چیز کی صورت جیسی کہ وہ ہے اسے حاصل ہو جائے یا یہ کہ نفس کسی ویسی چیز کی تصدیق کرے جیسے کہ وہ واقعتاً ہے۔ پس جب بھی نفس کسی خلاف واقع چیز کی تصدیق یا تصوّر کرے گا، اور یہ سمجھ لے کہ یہ تصدیق یا تصور واقع کے مطابق ہے، تو نفس کو ایک امر میں دو جہل لاحق ہو گئے۔ یہ سمجھ لینا چاہیے کہ جس طرح علم معنیٰ وجودی ہے، اسی طرح جہل معنیٰ عدمی ہے۔ پس علم بسیط ہی عین العلم ہے اور اجمال و تفصیل کے اطلاق سے مبرّا ہے اور وہ فقط ذات الوجود یا اس کے عین کے نصیب میں ہے۔ اور جہل بسیط جو ذات الجہل ہے وہ عدم محض اور اُس کے عین کے نصیب میں ہے۔ اور جہل مرکب ان ممکنات کے حصّے میں ہے جو عدمی اور وجودی معانی سے مرکب ہیں۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے انسان کے حق میں فرمایا کہ بے شک انسان ظالم اور جاہل ہے۔ اور علم مرکب جو علم ذات کی تفصیل ہے، واجب تعالیٰ کے مرتبۂ صفات میں ثابت ہے۔ اور اس علم کی امانت کو خدا نے اپنی رحمت خاصہ سے اسی جاہل کو سونپا جسے حضرت انسان کہتے ہیں، جیسا کہ قرآن کی اس آیت کریمہ میں آیا ہے۔ کہ ہم نے یہ امانت (احکام جو بمنزلہ امانت کے ہیں) آسمانوں زمینوں اور پہاڑوں کے سامنے پیش کی تھی۔ سو اُنھوں نے اس کی ذمہ داری سے انکار کر دیا۔ اور اس سے ڈر گئے، اور انسان نے اس کو اپنے ذمے لے لیا۔ وہ ظالم ہے اور جاہل ہے، لہٰذا زمین و آسمان کے اس بار امانت کو اُٹھانے سے ڈرنے اور انکار کرنے کے یہی معنی ہیں کہ ان میں کلی اور جزوی علم کی استعداد نہ تھی۔ پس کامل انسانوں میں علم کی یہ جانب غالب ہوتی ہے۔ ان میں علم العلم کا ظہور ہوتا ہے اور ان کا حق و وجود کی طرف زیادہ جھکاؤ ہوتا ہے۔ واجب الوجود سے اپنی نسبت کی تقویت کی بدولت وہ اپنے اس ذاتی جہل سے باہر نکل آتے ہیں جو ممکنات کا نصیب ہے۔ اور اس کی یہ سبب اور واجب رحمت میں شامل ہو جاتے ہیں۔ لیکن ممکنات کا اپنی ذات کے لحاظ سے مرتبۂ جہل سے کلّی طور پر نکل آنا اک امر محال ہے، اور جہل کے شائبہ تک سے خالی ہو جانا اور علم محض بن جانا محض اک وہم و خیال ہے۔ وہ علم حقیقی جو جہل کے داغ تک سے پاک ہو وہ تو فقط اسی ذات حق سے مخصوص ہے جیسا کہ اس آیت کریمہ میں آیا ہے کہ تم کو بہت تھوڑا علم دیا گیا ہے۔ کیونکہ علم کثیر جو علم مطلق ہے۔ وہ تو فقط اسی وجودِ مطلق کا حصّہ ہے۔ اور عقیدہ موجودات میں تو فقط علم قلیل ہے۔ اور ناقص انسانوں میں جہل، یا طل اور امکانی جانب غالب ہوتی ہے۔ ان میں فقط اتنا علم ہی

ہوتا ہے جو اُن کے جہل کو مرکب بناکر اس مرتبۂ بسیط سے بھی نیچے لے آتا ہے، اور اسفل طبقوں میں پہنچادیتا ہے۔ یہ اسفل ترین اور ناقص ترین طبقہ حقیقی زوال اور حق تعالیٰ سے دوری کا مقام ہے۔ اسے عروج و برتری سمجھنا اور اپنی بے ہوشی و جہالت کو ہشیاری اور خبرداری شمار کرنا اُنھیں غفلت سے مزید غافل کردیتا ہے، اور ان کے علم و آگہی کو جہل مرکب میں ڈال دیتا ہے۔ کامل ترین لوگوں کا معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ جیساکہ اس رباعی اور اس کی شرح میں آرہا ہے۔ رباعی

باعث شدہ بر عروجِ ما پستیٔ ما
ہشیاریٔ ما فزودہ از مستیٔ ما
آگاہ ز آگاہیٔ خود ساختہ است
عارض شدہ غفلتے کہ بر ہستیٔ ما

ترجمہ رباعی: ہماری پستی ہی ہمارے عروج کا باعث بن گئی۔ ہماری مستی نے ہماری ہشیاری کو اور بڑھایا۔ وہ غفلت جو ہماری ہستی سے لاحق ہوگئی ہے، اس نے ہمیں ہماری آگہی سے آگاہ کردیا ہے۔ مصنف کی اپنی تشریحات یوں ہیں، کہ عروج عبارت ہے کمال حقیقی پہ ترقی پانے سے جو واصل بحق ہونے کا ذریعہ ہے، اور پستی سے مراد ہے عالمِ شہادت میں گرنے اور نفس کے بدن سے تعلق پانے سے۔ ہشیاری سے مراد حکمت و معرفت ہے، اور مستی سے مراد حق پرستی اور مرتبۂ الوہیت سے نسبت کی قوت ہے جو حقیقت کے انکشاف کی وجہ سے ہے۔ آگاہی سے مراد اس علم سے آگہی ہے جو واصل بحق کردے، اور غفلت کے لاحق ہونے سے مُراد مقیدات کے تشخص کے امتیاز کا پیدا ہوتا ہے جو حضرت اطلاق کی جمعیت سے جہالت کی بنا پر پھوٹتا ہے۔ حاصل مطلب یہ کہ عروج یعنی کمالِ حقیقی کے مرتبے پہ ترقی جو حق سبحانہٗ تعالیٰ سے واصل ہونے کا مقام ہے۔ اس عالمِ شہادت میں گرنے اور نفس کا بدن سے تعلق پانے کی بنا پر میسّر ہوا۔ ہماری ہشیاری سے مراد حکمت و معرفت ہے یعنی حقائق اشیا کا علم جیسی کہ وہ ہیں، اور حق پرستی سے مُراد مرتبۂ الوہیت سے نسبت کی قوت ہے جس نے حقیقت کے انکشاف کی علّت کو بڑھایا، لہذا آگاہی سے آگہی جو حضور و مشاہدۂ حق کا حصول ہے۔ اور اس غفلت کے لاحق ہونے کی راہ سے پیدا ہوا جو مقیدات کے تشخص کا امتیاز ہے۔ اور حضرت اطلاق کی جمعیت سے جہل سے پیدا ہوتا ہے۔ کیونکہ علم حضور کے لیے مغائرت

(غیر جنسیت) لازم ہے، اور علم غفلت کے عین مغائرت ہے۔ اور اسی علم سے یہ جو مَن و تُو کی کثرت پیدا ہوئی ہے، گویا وہ غفلت ہے جو نفس انسان سے لاحق ہوئی۔ اور اُسے اپنے اصل مرتبہ سے الگ کیا۔ لیکن پھر یہی جدائی وصل کا موجب بھی ہے۔ اور علم کا علم جو ہے، جاہل طبع لوگوں کو پہنچنے والا ہے: جیسا کہ پہلے ذکر آچکا ہے۔ اور یہ رباعی کی شرح انہی معنوں میں متن میں بھی درج ہے کہ آگاہی عبارت ہے علم سے اور علم حضرت وجود کے مرتبۂ نازلہ سے۔ لہذا آگاہی سے آگہی جو علمِ مرکب ہے۔ تیسرا مرتبہ بن گئی۔ علم یہاں عالمیت اور معلومیت کی حیثیت رکھتا ہے اور کثرت میں بدل جاتا ہے۔ پس کثرت کی طرف توجہ ہی ذات واحد سے غفلت ہے، لیکن یہی غفلت جو اعتبارات کا امتیاز ہے مرتبۂ آگہی کا باعث بن گئی۔ کیونکہ وحدت بھی اعتبار ہے۔ پس یہ بات اچھی طرح سمجھ لو۔ اس عبارت کا ماحصل بھی رباعی کے مطلب کی وضاحت سے ملتا ہے۔ اس کا حاصل کلام بھی ہم نے مذکورہ بالا رباعی کی شرح میں لکھ دیا ہے۔ اب دوبارہ اس کے دہرانے کی ضرورت نہیں۔ رباعی

امروز کہ وا کرد ز رُخ یار نقاب
در پردۂ بے پردگی آمد بحجاب
از ہجر و وصال او چہ گویم کہ مرا
دریا در مشت و مشت خالی چو حباب

ترجمہ رباعی: آج جب محبوب نے اپنے رُخ سے نقاب اُٹھایا تو وہ بے پردگی کے پردے میں محجوب ہو گیا۔ میں اُس کے ہجر و وصال کا کیا کہوں، کیونکہ دریا میری مٹھی میں ہے، اور میری مٹھی بلبلے کی طرح خالی ہے۔ اب مصنف کی اپنی وضاحتوں کو دیکھیے۔ کلمۂ (امروز) یعنی آج سے مُراد دنیوی موجودات کی موجودیت کا زمانہ ہے جو آفتابِ وجود کے طلوع ہونے کی جگہیں ہیں۔ آج سے مُراد وجود کا مرتبۂ ظاہر۔ یار سے مرادِ موجودِ حقیقی یعنی حضرت وجود مطلق۔ نقاب اُلٹنے سے مُراد ان مظاہر میں وجود کے ظہور سے ہے۔ پردہ سے مراد مخفی ہونا اور چھپنا ہے، اور بے پردگی سے مراد ظہور ہے، اور حجاب سے یہاں مُراد اپنی اس صورت میں جیسی کہ وہ ہے ادراک میں نہ آنا۔ ہجر سے مُراد جدائی کے توہمات، اور وصل سے مُراد معنوی اتحاد ہے۔ دریا سے مُراد مرتبۂ اطلاق اور حباب سے مقیدات کا تعین ہے۔ مطلب یہ کہ دنیوی موجودات جو آفتابِ وجودِ حقیقی کے طلوع ہونے کی جگہیں ہیں۔ اگرچہ ان میں اس حضرت وجود مطلق نے

ظہور فرمایا ہے، لیکن اسی ظہور کو چکا چوند کر دینے والی شعاعوں کی حدّت ریزی سے وہ مخفی و مستور رہا۔ اور جیسا کہ وہ ہے کسی کے ادراک میں نہ آسکا۔ (مصرع) اس کے ظہور کی کثرت کا یہ عالم کہ عیاں ہونے کے باوجود بھی وہ نہاں ہے۔ لہذا اس کے اتحاد معنوی اور تو ہم جدائی کا کیا کیا جا سکتا ہے۔ ہر چند کہ وہ بحرِ اطلاق عین حباب تقیّد ہے، لیکن مقیّد بیچارہ مطلق کی کیفیت سے بالکل بے بہرہ و محروم ہوتا ہے اُس کا "عین" نہیں بن سکتا۔ اور سمندر، اس میں حباب، اور حباب کی مانند مٹھی کا خالی ہونا ۔ اس صنعت مراعات النظیر نے جو لطف پیدا کر دیا ہے وہ بالکل عیاں و ظاہر ہے۔

هوالناصر

شروع اللہ کے نام سے جو نہایت مہربان اور بہت رحم والا ہے

سب تعریف اللہ کے واسطے ہے جس نے ہدایت دی ہمیں سلامتی کے راستوں کی۔ انعام کیا ہم پر ایمان اور اسلام کے ساتھ، اور درود و سلام ہو اُس کے رسول محمدؐ صلعم پر اور آپؐ کی آل کرامؓ اور اصحاب عظام پرؓ۔ امّا بعد پس یہ چونتیسواں ۳۴ باب ہے جو سُبُل السلام کے نام سے موسوم ہے۔ آ گیا تمھارے پاس اللہ کی طرف سے نور اور کتاب مبین جس کے ذریعے اللہ ہدایت دیتا ہے اس کو جس نے پیروی کی اُس کی رضامندی کی، اور سلامتی کے راستوں کی۔ پس نہیں بیان کیا اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں مگر وہ کچھ جو بندوں کی سلامتی اور ان کی خیر کا سبب ہے دونوں جہانوں میں، پس جس نے اللہ سبحانہٗ کی پیروی کی رضامندی کی اور چلا اس کے راستے پر، جس کی طرف اللہ نے اُسے ہدایت دی، وہ ہو جاتا ہے سالم اور محفوظ نفس کے دھوکے سے اور ابلیس کے شر سے، دُنیا میں اور جہنم کی آگ اور سزاؤں سے آخرت میں۔ اور اللہ اُسے داخل کرے گا (دار السلام) سلامتی کے گھر میں۔ بے شک میں تمہیں سکھاتا ہوں اللہ کی تعلیم کے ساتھ اچھا اخلاق جو اصلاح کرنے والا ہے تمھارے معاش کی، اور مفید ہے تمھارے معاد کے لیے تمسک کرتے ہوئے اس کی آیات کے ساتھ اور استقلال کر کے اللہ تعالیٰ کے کلمات کے ساتھ۔ وہی ہے جس نے مجھے عطا کی ہے قوت انبساط اور مطالب کا اخراج اس کے کلام سے جو قدسی قوت ہے اپنے کرم اور احسان سے چمٹتے ہوئے رسول اللہؐ کے دامن سے جو کہ خُلق عظیم کے حامل ہیں۔

"ان پر خدا کا درود اور سلامتی"۔

آیاتِ قرآنی کی نصیحتوں کا ان کے فوائد اور نکات سمیت بیان کا باب

اس وارد میں جو پند و نصیحت بھی وارد ہوئی اس کی سند آیاتِ قرآنی سے ہے۔ گویا کہ اپنی طرف سے کچھ نہیں کہا، بلکہ انہی آیات کے مطالب و معانی کی توضیح کر دی ہے۔ ہر چند یہ ساری کی ساری کتاب اپنے متن اور شرح سمیت آیاتِ قرآنی اور احادیثِ نبویؐ سے مستند ہے۔ لیکن یہاں اس وارد میں چونکہ آیاتِ قرآنی کے جملے اور فقرے پے در پے آرہے ہیں، اور ان کے نکات کے فوائد بڑی لطافت سے بیان کیے گئے ہیں، اس بنا پر اس وارد کو آیات ہی سے مشرف و مقید کروں گا۔ یہ اللہ تعالیٰ کی کتاب کی آیات ہیں جن کی میں تلاوت کرتا ہوں تمھارے سامنے، تاکہ میں حجت کو تمام کر سکوں۔ اور حجت بالغہ اللہ ہی کے لیے ہے۔ اگر اللہ چاہتا تو تم سب کو ہدایت دے دیتا۔ کیا لوگوں کو تعجب ہے کہ تائید کرے اللہ تعالیٰ اپنی آیات کے ساتھ اپنے بندے کی، اور القا کرے اُن میں سے ایک آدمی کے دل میں کہ وہ ڈرائے لوگوں کو ان آیات سے اور بشارت دے ان لوگوں کو جو ایمان لاتے ہیں، اور وہ یہ اعتقاد رکھیں کہ ان کے لیے ان کے رب کے پاس سچی عزت اور سرفرازی ہے۔ تو منکرین نے کہا کہ بے شک یہ کھلا کھلا جادوگر ہے، اور جو کچھ کہ بتایا جاتا ہے کتاب میں، اور جو کچھ کہ اصحاب کے دلوں میں ڈالا جاتا ہے وہ عجیب چیز ہے۔ آگاہ رہو بے شک وہ شبہ میں ہیں اپنے رب سے ملاقات کے معاملے میں اور نہیں جانتے کہ اللہ تعالیٰ خاص کر لیتا ہے اپنی رحمت کے ساتھ جسے چاہتا ہے اور اُسے خالص محمدیوںؐ میں سے بنا دیتا ہے۔ اور جب ان پر پڑھی جاتی ہیں اللہ کی آیات کھُلی کھُلی تو کہتے ہیں۔ وہ لوگ جو نہیں اُمید رکھتے اللہ سے ملاقات کی جھٹلانے والوں میں سے کہ اللہ نے تیری مدد نہیں کی اپنے کلام کے ساتھ۔ یہ تو تیرے اپنے نفس کی طرف سے ہے۔ پاک ہے اللہ۔ میرے لیے مناسب نہیں کہ میں کہوں وہ بات جس کا مجھے کوئی حق نہیں۔ اور یہ میرے اپنے نفس سے نہیں ہے۔ میں تو فقط اس کی پیروی کرتا ہوں جو وحی کی میرے اللہ نے میرے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر۔ اگر تو حکم دیا ہوتا میرے رب نے ان آیات کے بیان کا اس نہج پر بشارت دینے اور ڈرانے کے ساتھ تو میں نہ پڑھتا ان کو تمھارے سامنے پہنچانے کے طریقے پر۔ پس میں رہا ہوں تمھارے درمیان اک عرصے تک، کیا تم عقل نہیں رکھتے۔ پس ہلاکت ہے جھٹلانے والوں کے

لیے وہ نہیں پیروی کرتے مگر گمان کی۔ بے شک گمان جو ہے وہ حق سے کچھ بھی بے نیاز نہیں کرتا۔ اور اسی طرح جھٹلایا ان لوگوں نے اس سے پہلے اس چیز کو جسے لائے رسولؑ، اور ان میں سے بعض وہ ہیں جو ایمان لائے اس پر، اور ان میں سے بعض وہ تھے جو نہیں ایمان لائے اس پر، اور اللہ مفسدین کو خوب جانتا ہے۔ پس اگر انھوں نے مجھے جھٹلایا، میرے لیے میرا عمل ہے اور ان کے لیے اُن کا عمل ہے۔ ادھر وہ بری ہیں اس سے جو میں کرتا ہوں، ادھر میں بری ہوں اس سے جو وہ کرتے ہیں۔ بے شک اللہ تعالیٰ بندوں پر کچھ بھی ظلم نہیں کرتا، لیکن لوگ اپنی جانوں پر خود ظلم کرتے ہیں۔ پس اے قوم اگر میرا تمھارے درمیان رہنا اور اللہ کی آیات سنا سنا کر تمھیں غفلت سے بیدار کرنا تمھارے لیے ناقابلِ برداشت ہو گیا ہے تو میرا بھروسہ تو اللہ پر ہے۔ پس اگر تم نے منہ موڑا تو پھر میرا کیا نقصان ہے۔ میں تو تم سے کوئی اجر نہیں مانگتا میرا اجر تو اللہ کے ذمے ہے، اور وہی میرے لیے کافی ہے۔ اور نہیں ہے کسی نفس کے لیے کہ وہ ایمان لائے اللہ پر مگر اللہ کی اجازت سے، پس میں عبادت نہیں کرتا اُس کی جیسی کہ تم عبادت کرتے ہو اللہ کو چھوڑ کر۔ اور وہ تمھارا عقلی خدا ہے جس کا تم تصوّر کرتے ہو۔ جیسے فلسفی اور صوفیا اور اس کا نام تم رکھتے ہو واجب اور وجود مطلق اور اُسے گمان کرتے ہو عقلی ماخوذ جنس میں سے یا کلی طبیعی ہرگز نہیں بلکہ میں عبادت کرتا ہوں اس اللہ کی جو کہ جانتا ہے اس کو جو تمھارے سامنے تھی، ہے اور تمھارے پیچھے بھی ہے۔ اور تم احاطے میں نہیں لا پاتے کسی چیز کو اس کے علم میں سے، مگر ایسی چیز کو جو وہ چاہتا ہے اور تم اسے کما حقہٗ نہیں پہچانتے۔ (جیساکہ معرفت کا حق ہے) وہ میرا رب ہے۔ تمھارا رب ہے، اور میں نے اپنے چہرے کو دینِ حنیف (سیدھے دین) کے لیے قائم کر لیا ہے۔ اور میں مشرکوں میں سے نہیں ہوں۔ اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں ہو جاؤں خالص محمدیوں میں سے۔ پس اے لوگو آ گیا حق تمھارے پاس تمھارے رب کی طرف سے۔ پس جس نے ہدایت پائی بے شک اس نے ہدایت پائی اپنے ہی نفس کے لیے۔ اور جو گمراہ ہوا تو اس کی گمراہی اس ہی کے اوپر وبال ہے۔ اور میں تمھارے اوپر کوئی کارساز نہیں ہوں۔ اور میں پیروی کرتا ہوں اس کی جو وحی کیا گیا میرے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر، اور میں صبر کرتا ہوں جیسا بھی اللہ فیصلہ کر دے۔ اور وہ بہترین فیصلہ کرنے والا ہے۔ یہ سمجھ لیجیے کہ مخلص محمدیوں (ان پر خدا کی سلامتیاں ہوں) کے مطالب و معارف کی بنیاد کلام اللہ اور حدیث نبویؐ پر ہے۔ وہ کسی کشف و انکشاف کو جو کتاب اللہ کے خلاف ہو قابلِ اعتبار نہیں سمجھتے اور

کبھی اصطلاحاتِ نبویہؐ کے الفاظ بغیر گفتگو نہیں کرتے، کیونکہ ان کا اصل مقصد تو صرف کلام اللہ اور احادیثِ نبویؐ کے اسرار و رموز کی خوبیوں سے ہے جو کم نظروں کی نگاہوں سے پوشیدہ رہتے ہیں۔ ان کا مقصد کسی اور مطالب کا اظہار نہیں جیساکہ ان نئے نئے فرقوں میں رونما ہے۔ میرے اس دعوے کا گواہ ان عبارات و کلمات میں آیات و احادیث کا ارتباط بھی ہے جو دوسروں کو میسر نہیں ہو سکا۔ اور آج تک کوئی کتاب بھی قرآن کے ایسے چمکدار جواہر اور احادیث نبویؐ کے موتیوں جڑے تاج سے مزیّن و درخشاں نہیں ہو سکی۔ اور کسی جگہ یہ تمام معقول و منقول مطالب یکجا جمع نہیں پائے گئے، نہ ہی دلیل و ایمان کو یوں متحد کیا گیا۔ اور یہ مقولہ کہ ہمیں دی گئی ہیں پُر مغز باتیں ان مخلص محمدیؐ کا سہ لیسوں کی تائید کرتا ہے۔ اور ہم نے کتاب میں کسی چیز کا اضافہ نہیں کیا، قندیلِ نبوتؐ سے ان اقتباس کرنے والوں کے حال پہ گواہ ہے۔ اُن کا اخلاق محض حکما (دانشوروں) کی طرح عقلی تہذیب ہی سے مہذب نہیں بلکہ وہ تو اخلاق خداوندی اپناتے ہیں۔ ان کے آداب دانشوروں کی طرح صرف قوت فکر ہی سے مقرر نہیں بلکہ انھیں خود حضور رسالت پناہ ادب و آداب سکھلانے والے ہیں۔ ان کے معارف تمام تر فنا فی اللہ اور فنا فی الرسولؐ ہونے پہ مبنی ہوتے ہیں جن میں کچھ حشو و زوائد نہیں ہوتا۔ ان کی راہ، راہِ مصطفیؐ ہے، اور ان کا طریق، طریق محمدیؐ۔ ان کا کام صفائی در صفائی، اور ان کا شعار اخلاقِ حسنہ۔ وہ خود سے دور اور خدا سے نزدیک ہوتے ہیں اور مقید ہوتے ہوئے بھی بالکل آزاد ہیں۔ رباعی

چون آئینہ باید کہ مصفّا باشی
تا مظہر نور حق تعالیٰ باشی
اے دردؔ اگر قربِ خدا می خواہی
دُور از خود و نزدیک بدلہا باشی

ترجمہ رباعی: تمہیں آئینے کی طرح صاف و شفاف ہونا چاہیے تاکہ تو حق تعالیٰ کے نور کا مظہر بن سکے، اے دردؔ اگر تو خدا کا قرب چاہتا ہے تو خود سے دور ہو کر خدا کے نزدیک ہو جا۔ مصنّف کی اپنی وضاحت ملاحظہ کیجیے کہ صاف و شفاف ہونے سے مراد ہے ماسوی اللہ کے، خیالات اور بغض و حسد و کینہ اور تکبّر و نفاق سے پاک ہونا ہے۔ اور حدِّ کمال تک نفس کی تطہیر اور صفائی قلب کرنا ہے۔ تاکہ ظاہر و باطن پاک و صاف ہو کر حق تعالیٰ کے جمال باکمال کی جلوہ گاہ بن جائیں۔ نور حق کا مظہر ہونے سے مراد ہے خود

یں اخلاقِ الٰہیہ پیدا کرنا اور سراپا صفاتِ خداوندی سے متصف ہوجانا جیسے سخاوت، احسان اور لطف و کرم، اور قربِ حق سے مراد ہے۔ اس بے نظیر و بے مثال کی حضوری و مشاہدہ سے مشرف ہونا ہے۔ خود سے دُور ہونے سے مراد فنائے تام کا حاصل کرنا اور اپنی نفسانی خواہشات سے چھٹکارا پانا ہے۔ دلوں کے ہونے سے مراد لوگوں کے دلوں میں محبوب و مقبول ہونا اور بنی نوعِ انسان کے آرام و آسائش کا باعث بنتا ہے۔ اور حق بات تو یہ ہے کہ اس سے بہتر طرزِ زندگی ہو ہی نہیں سکتا کہ انسان اس سے خوش ہوں اور کسی کے دل کو نفاق کے کانٹوں سے چھلنی نہ کرے۔ بے شک منافق آگ کے نچلے طبقوں میں ہوں گے۔ یعنی اس سے بہتر طرزِ معاشرت کیا ہوگی کہ زندگی یوں بسر کی جائے۔ کیونکہ جب تو دوسروں کو ناخوش نہیں کرے گا تو وہ بھی تمھاری مخالفت نہ کریں گے۔ اور یوں طرفین میں سلامتی کی برکات کا نزول ہوگا۔ اسی لیے نبی کریم صلعم نے فرمایا کہ مسلمان وہ ہے کہ محفوظ رہے مسلمان اس کی زبان سے، اور اس کے ہاتھ سے اور اشرف ترین ایمان یہ ہے کہ لوگ تجھ سے امن میں رہیں، اور اشرف ترین اسلام یہ ہے کہ لوگ تیری زبان اور ہاتھ سے سلامت رہیں، اور اشرف ترین ہجرت یہ ہے کہ تو برائیوں کو چھوڑ دے۔ اور اشرف ترین جہاد یہ ہے کہ تو قتل کر دے اور کونچوں کو کاٹ دے اپنے توسنِ نفس کو، اور اشرف ترین زُہد یہ ہے کہ سکون پا جائے تیرا دل اس چیز پر جو تجھے دی گئی ہے۔ اور سب سے اشرف چیز جس کا تو سوال کرے اللہ تعالیٰ سے، وہ عافیت ہے دین و دُنیا میں۔ دُنیاوی بہتری یہی حُسنِ اخلاق ہے جو آخرت اور عقبیٰ کی نیکیوں کے پھل کی صورت میں ملتا ہے۔ اور یہی مطلب ہے اس آیت کریمہ کا اور دُنیائے محمود کا کہ اے ہمارے پروردگار ہم کو دُنیا میں بھی بہتری عنایت کیجیے، اور آخرت میں بھی بہتری دیجیے اور ہم کو دوزخ کے عذاب سے بچائیے۔ اور اچھے اخلاق کا کمال یہ ہے کہ جس طرح دوسروں سے بدسلوکی نہیں کرنی چاہیے، نہ ہی ان کے لیے موجبِ آزار ہونا چاہیے۔ بلکہ ان کے لیے بھلائی اور نفع رسانی کا موجب بننا چاہیے۔ اسی طرح اپنے نفس سے بھی بدسلوکی نہیں کرنی چاہیے، اور نہ ہی خود کو ایذا پہنچانی چاہیے۔ خود کو بھی نفع و نیکی ہی پہنچانی چاہیے۔ یعنی خود کو شرعی ممنوعات سے باز رکھنا چاہیے اور نیک کاموں پر توجہ دینی چاہیے۔ تاکہ آخرت میں نجات مل سکے۔ اور یہاں بھی زندگی پُر لطف ہو۔ کیونکہ تیرے نفس کا بھی تجھ پر حق ہے۔ یاد رکھو کہ نفاق کی صورت یہ ہے کہ بظاہر تو مومنوں سے اخلاص ظاہر کرو، مگر باطن میں اُن سے مخلص نہ ہو۔ اور نفاق کی حقیقت یہ ہے کہ زبان سے تو کلمہ طیبہ یعنی لا الٰہ الا اللہ

محمد الرسول اللہ پڑھے اور مقصود اس کے سوا کوئی اور ہو۔ زبان سے لاحول ولاقوۃ الاباللہ کہے اور اُس کے علاوہ بھی کسی اور کو فاعل شمار کرے۔ اور یہ آیت کریمہ کہ تم جہاں کہیں بھی ہو وہ تمہارے ساتھ ہے۔ تمھیں زبانی یاد ہو مگر دل پہ غفلت کا پردہ پڑا ہوا ہو، اور حضوریٔ حق اور مشاہدۂ ذات سے محروم رہو، اور یہ آیت کریمہ تو خوب ازبر ہو کہ کوئی رزق کھانے والا جاندار روئے زمین پر نہیں کہ اس کی روزی اللہ تعالیٰ کے ذمے نہ ہو مگر پھر بھی دل میں روزی کا تردد موجود ہو۔ اور اس آیت کریمہ کی بھی تلاوت کرے کہ وہی اوّل ہے، وہی آخر ہے، وہی ظاہر ہے اور وہی باطن ہے، اور پھر بھی مخلوق کو موجود مستقل سمجھے اور علیٰ ہذا القیاس۔ سفلی اعتبارات میں کھو کر نچلے ترین طبقوں میں جا گرے اور وہیں اٹک رہے۔ خود کو توحید کے اعلیٰ ترین مرتبے تک نہ پہنچائے، جدائی کی آگ میں جھلستا رہے اور دل کو نورِ وحدت سے فروزاں نہ کرے۔ پس یہ ہے تفسیر اس آیت کریمہ کی کہ بے شک منافق آگ کے نچلے ترین طبقات میں ہوں گے۔ کبھی خود کو اُس سے دُور نہ رکھ، کہیں بالکل ہی دوری نہ ہو جائے اور اپنے نفس و طبیعت سے میل جول نہ رکھ تاکہ تو مہجور نہ ہو جائے۔ اپنے نفس کو ہوا و ہوس سے بچائے رکھنا ہی جنت الماویٰ ہے۔ خود کو دور لے جانا عبارت ہے غرور و نخوت سے، اور یقیناً یہ قرب حق سے دُوری کا موجب ہیں اور غفلت سے پیدا ہوتے ہیں۔ تیرے نفس سے مراد بھی خودی و انانیت ہے۔ طبیعت سے مراد حیوانی خواہشات اور بدنی لذات کا تقاضا ہے، اور نفس ناطقہ کا ان ادنیٰ مادیات کی طرف جھکاؤ مجردات عالیہ سے دوری و مہجوری اور قرب حق تعالیٰ سے محرومی کا باعث بنتا ہے۔ پس جس کسی نے اپنے نفس کو حسّی لذتوں سے روکا اور نفسانی و شہوانی خواہشات سے باز رکھا، اس کا ٹھکانہ بہشت میں ہے۔ اُسے دائمی سکون میسر آجائے گا۔ جس طرح تجھے اپنے نفس اور طبیعت کی پیروی نہیں کرنی چاہیے۔ اسی طرح دوسروں سے بھی نہ تو دشمنی سے الجھنا چاہیے نہ ہی لڑنا۔ کیونکہ مومنوں میں وہی افضل ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے دوسرے مسلمان مامون و مصئون ہوں۔ مومنوں میں ایمانی لحاظ سے افضل وہ جس کا خلق و اخلاق اسلامی لحاظ سے احسن ہو۔ اور مہاجروں میں افضل وہ جس نے تہی منکرات سے ہجرت کی (چھوڑ دیا) اور سب سے افضل جہاد محض رضائے الٰہی کے لیے اپنے نفس کے خلاف جہاد کرنا ہے۔ کبھی کسی کے مدّمقابل مت بنو، کیونکہ ہر طرف وہی ذات مطلق ہے جیساکہ اس آیت کریمہ میں آیا ہے کہ تم جدھر کا بھی رُخ کرو ادھر اللہ تعالیٰ کا رُخ ہے۔ طرف

شدن اک اصطلاح ہے جس کا مطلب ہے مقابل میں آنا۔ پس کبھی کسی سے حقیقی دشمنی رکھ کر مقابلہ نہیں کرنا چاہیے، جیسا کہ جاہل لوگ اکثر باہم کرتے ہیں، کیونکہ ہر طرف وہی ذاتِ خداوندی ہے اور کوئی شے اس کے احاطے سے باہر نہیں۔ بے شک اللہ تعالیٰ تمام اشیا پر محیط ہے، اور تمام کائنات میں وہی حقیقت واحدہ جلوہ افروز ہے، اور موجودات پر سر بسر اسی وجود مطلق کا نور پھیلا ہوا ہے۔ پس تم جدھر کو رُخ کرو گے اسی کے رُخ (چہرے) کو پاؤ گے۔ سبھی کی بازگشت ادھر ہی کو ہے۔ الغرض ہر جگہ اس کے جمال باکمال کو مدنظر رکھنا چاہیے، اور مخالفت کی تلخی کو جو باطن کو بدمزہ کر دیتی ہے۔ سینے سے نکال دینا چاہیے تاکہ رضا و تسلیم کے معانی میں خلل نہ آنے پائے۔ اور چشم بصیرت میں مکروہ بھی مرغوب (من پسند) نظر آئے۔

عوام اور جاہلوں کے عناد و دشمنی کی تنبیہ اور
خواص اور عارفوں کی مخالفت کی حقیقت کے بیان کا باب

عوام اور جاہلوں میں باطنی اور حقیقی دشمنی اور مخالفت ہوتی ہے۔ دشمنی کی چبھن ان کے باطن کو بے آرام اور مشاہدۂ ذات سے روکے رکھتی ہے۔ اعتدال کی حد کو پھلانگ جانے کی وجہ سے انھیں ہلاکت کے کنوئیں میں دھکیل دیتی ہے۔ اور خاصانِ حق یا عارفانِ ذات کو اپنے مخالفوں سے جو لڑائی، بھڑائی اور قتل و غارت کی صورت میں وقوع پذیر ہوتی ہے، جیسے انبیائے کرامؑ، ائمہ معصومینؓ یا صحابۂ کرام کو (ان سب پر اللہ کی سلامتیاں ہوں) وہ ظاہری اور مجازی مخالفت تھی۔ ہر چند کہ وہ کفر میں بھی حق تعالیٰ کے کامل احاطے کا مشاہدہ کرتے تھے جیسا کہ قرآن شریف میں ہے کہ اللہ تعالیٰ کافرین کا احاطہ کیے ہوئے ہے لیکن اپنے مرتبۂ ہدایت سے وہ پورا انصاف کر رہے تھے جس مرتبے کے وہ مظہر تھے۔ ان کا مقصد دُنیا کی بھلائی تھا اور بنی نوع انسان کو فساد سے بچاتا تھا۔ لہٰذا کلیتہً ان کا مقصود یہی تھا۔ اگرچہ اس میں بعض اشخاص کا جزوی بگاڑ ہوا لیکن چند اشخاص کو ضرر پہنچانا جو اس کے سزاوار تھے عوام کی بھلائی اور خیر کے لیے تھا۔ مثال اس کی یہ کہ اگر سانپ زید کی انگلی کو ڈس لے اور زید اپنی جان اور باقی جسم کی سلامتی کے پیشِ نظر خود ہی اس کی انگلی کو کاٹ ڈالے تاکہ باقی بدن میں زہر سرایت نہ کر جائے، تو زید کا یہ عمل اگرچہ انگلی کے لیے تو ضرر رساں ہے، لیکن زید نے دشمنی کی بنا پر تو نہیں کیا، نہ ہی دشمنی سے اُسے کاٹا ہے۔ وہ اپنی اس انگلی کو بھی اپنے دیگر اعضا کی طرح عزیز جانتا تھا۔ اُسے تو مجبوراً اسے قطع کرنا پڑا۔ اس

کا آزار بھی جسمانی طور پہ زید ہی کو ہوا ، لیکن وہ کرتا تو کیا ؟ اُسے فقط وہی ایک انگلی تو عزیز نہ تھی اُسے تمام اعضا مساوی طور پہ عزیز ہیں۔ تمام اعضا کی حفاظت کے لیے اس عضو کی دوستی کو دشمنی میں بدل دیا اور اُسے انگلی کاٹنے کا روادار بنا دیا۔ کیونکہ وہ جانتا ہے کہ زہر اس انگلی میں سرایت کر چکا ہے ، اور وہ بے کار ہو گئی ہے تو وہ اسے کاٹنے کے درد کو گوارا کرتا ہے ، تاکہ سارا جسم ہی ضائع نہ ہو جائے اور یوں وہ موت سے بچ جاتا ہے۔ یہ آخری علاج اُس نے مجبوری کے باعث اور ضرورت کے تحت کیا ہے۔ وگرنہ تو جہاں تک اس سے ہو سکتا تھا وہ دیگر تدابیر ہی کرتا رہا۔ اور جہاں تک ممکن ہوا ان کی اصلاح کرتا رہا۔ پس انبیاؑ و اولیائے کرام دوستی اور رحمت کی بنا پر بے ادبوں کو ادب سکھاتے اور مجرموں کو سزا دیتے اور مخالفوں کو مارتے تھے ، نہ یہ کہ غیظ و غضب اور دشمنی سے پیش آتے تھے ۔

ہمارے پیغمبرِ اسلام حضور نبی کریم صلعم دونوں جہانوں کے لیے رحمت تھے۔ ان کا ہر عمل سراپا رحمت تھا جیسا کہ حضور پاکؐ نے خود فرمایا : کہ جب تم فیصلہ کرو تو عدل کرو ، اور جب تم قتل کرو تو اچھی طرح قتل کرو۔ بے شک اللہ تعالیٰ پسند کرتا ہے احسان کرنے والوں کو۔ پس رسول اللہ صلعم کے اتباع کامل کا ارادہ کرو ، اور خلق عظیم کے اس مالک کی مکمل طور پہ متابعت کرو ، اور جہاں تک ہو سکے کسی کو رنجیدہ خاطر نہ کرو ۔ ہر جاندار کو اپنی طرح سمجھو اور جہاں تک ہو سکے کسی کی دل آزاری نہ کرو۔ اس لیے کہ تم خود بھی دل رکھتے ہو ۔ مومنوں کے دل بمنزلہ عرش الٰہی کے ہیں۔ دل عبارت ہے نفس ناطقہ سے ، اور قلب سے مُراد وہ سرو ناز بھی ہے جو گوشت کا لوتھڑا ہے ۔ پس پہلے اعتبار سے نتیجہ یہ نکلا کہ بنی نوع انسان میں سے کسی فرد کو بھی آزار نہیں پہنچانا چاہیے۔ کسی کی اذیت کو خود اپنی اذیت سمجھو کیونکہ انسانی افراد اگرچہ صورت میں مختلف ہیں مگر حقیقت سب کی ایک ہی ہے ، اور ایک ہی جنس ہے ۔ دوسرے لحاظ سے مقصود یہ کہ انسانوں اور حیوانوں میں سے کسی جاندار کو آزار نہ دو ۔ کیونکہ حیوانات میں بھی روح حیوانی ہوتی ہے ۔ اُنھیں بھی دکھ سکھ کا احساس اور ادراک ہوتا ہے ۔ پس اگرچہ وہ حقیقت میں تیرے ہم قسم نہیں لیکن جنس مشترکہ ہے ۔ اور اس مرتبے میں تمھارے مساوی ہیں اور ان الفاظ سے کہ کسی کو آزار نہ پہنچاؤ ، مُراد یہ ہے کہ جانداروں میں سے کسی کو ناحق اذیت نہ دو ۔ اگر انسانوں میں سے کوئی تمھارے درپئے آزار ہو یا وہ دوسروں کو آزار پہنچاتا ہو ۔ دین و ایمان کے سلسلے میں فساد پیدا کرتا ہو تو اتنا تدارک ضرور کرنا چاہیے کہ اُس کا شرّ پھیلنے نہ پائے ۔ شرعی احکام کے

مطابق اُسے مارنا، پیٹنا یا ہلاک کر دینا حاکموں اور بادشاہوں کے لیے روا ہے۔ اسی لیے کہ وہ موذیوں میں داخل تھا۔ اسی طرح کسی جانور کو بھی خواہ مخواہ نہیں مارنا چاہیے، کیونکہ جان ایک نادر چیز ہے جو دوبارہ حاصل نہیں ہوتی۔ لہٰذا حیوانوں کو یا تو انسانوں کے دفعِ مضرت کے لیے مارنا چاہیے جیسے سانپ اور بچھو وغیرہ یا کسی فائدے کے حصول کے لیے جیسے بھیڑ بکری اور اونٹ کا ذبیحہ۔ ورنہ بغیر کسی مقصد کے ان کی ایذا رسانی سے ہاتھ کھینچ رکھنا چاہیے جیساکہ قرآن میں آیا ہے کہ نہ قتل کرو کسی نفس کو جسے حرام کر دیا اللہ نے مگر حق کے ساتھ۔ اور یہ جو بعض مذاہب میں جانور کا مارنا سرے سے جائز ہی نہیں۔ وہ رحم کی فراوانی کی وجہ سے ہے کہ وہ حقیقت میں ایک ظلم ہے جس کا ضرر حضرت انسان ہی پر عاید ہوتا ہے، جو اشرف المخلوقات ہے۔ اور جس گروہ میں ان کے نزدیک کسی جاندار کے مرنے یا اس کی ایذا رسانی کی مطلق پروا ہی نہیں، وہ محض سنگ دلی، بے رحمی اور غفلت کی بنا پر ہے۔ سب سے درست، بہتر اور معتدل وہی طریق ہے جو شریعتِ محمدیہ میں ہے۔ (ان سب پر خدا کی رحمتیں اور سلامتیاں ہوں) کہ جسے شریعت میں مارنے کا حکم ہے اُسے مار دو، اور جس جاندار کا ذبیحہ خدا نے حلال کر دیا ہے اُسے ذبح کرو۔ اور موذیوں کی ایذا رسانی سے پہلے ان کے قتل کو جائز سمجھو۔ شرعی حُکم اور اجازت کے بغیر کسی جاندار کو دُکھ نہیں دینا چاہیے، مارنا یا قتل کرنا تو الگ رہا۔ اور اگر تمھاری وضع درویشانہ ہے تو عالم طریقت میں تمھارے مناسب حال یہ ہے کہ محض اپنے نفس کی خاطر کسی حیوان کو ذبح نہ کرو۔ سوائے قربانی یا دوست احباب کی ضیافت کے، اور خود بھی ان کے ساتھ کھانے میں شرکت کرو، اس سے یہ مقصود نہیں کہ خشک زاہدوں اور دعوت دینے والوں کی طرح بالکل حیوانات کو ترک ہی کر دو، بلکہ ہمارا حاصل مطلب یہ ہے کہ فقط اپنی ہی ذات کے لیے کسی جانور کو آزار نہ دو، ہاں دوسرے مسلمانوں اور مومنوں کے فائدے کی خاطر اس کے ذبیحہ کو روا رکھو اور محض اپنے کسی خاص ذاتی معاملے میں حق پر ہونے کے باوجود بھی اپنے مدِّ مقابل کو نہ مارو۔ بدی کا بدی سے بدلہ نہ لیتے ہوئے اُسے ظاہراً اور حقیقتاً بھی دل و جان سے معاف کر دو۔ دیکھیے یہ ارشاد کہ لوگوں میں سے لوگوں کو سب سے شدید عذاب دینے والا دُنیا میں سب سے زیادہ عذاب پانے والا ہے، لوگوں میں سے اللہ کے ہاں قیامت کے دن۔ لوگوں کے ساتھ خوشی و مسرّت سے مل۔ اپنی پیشانی سے گرہیں کھول دو، تاکہ خود بھی باغ و بہار بن سکو اور دوسروں کے لیے یارِ غار، یعنی جس طرح لوگ تمھارے ہاتھوں اور زبان سے

محفوظ رہیں۔ اسی طرح تیرے اخلاق حسنہ سے بھی آرام و سکون پائیں۔ معاشرت میں تُرش رُوئی اور بدخوئی سے کام نہ لو۔ اپنی بود و باش میں خوش خلقی اور خندہ روئی کو اپنا لو۔ جس کسی سے بھی ملو ہنستے، مُسکراتے، خوش اخلاقی سے ملو۔ کیونکہ ہر شخص خدا ہی کا مظہر ہے اور اُس محبوبِ حقیقی کے سوا اور کوئی جلوہ گر نہیں لہذا دوستوں سے ملتے وقت خوش ہونا چاہیے نہ کہ ناخوش۔ اس طرزِ معاشرت کا طبعِ انسانی پہ یہ اثر ہوتا ہے کہ انسان ہمیشہ خوش و خرم رہتا ہے اور خود اپنی ذات میں اک باغ و بہار بن جاتا ہے، اور دوسروں کے لیے ایک سچا رفیق اور یار دوست، جیساکہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اعمال میں سب سے زیادہ پسندیدہ عمل اللہ کے ہاں فرائض کے بعد سرور کا داخل کرنا ہے مسلمان میں، یعنی اُسے خوش کرنا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ حضرت خواجہ عبدالخالق غجدوانی نے جو نقشبندی سلسلے کے سردار گنے جاتے ہیں، اپنے بیٹے کو نصیحت فرمائی کہ اے بیٹے شیخی و بزرگی کا دروازہ بند کر کے دوستی کا دروازہ کھول، اور جب ایسی صاف و پاک بود و باش میسر ہو جائے تو تمھیں دُنیا و آخرت کے عذاب سے نجات مل جائے گی۔ حدیث شریف میں آیا ہے کہ جس کسی کو خدا نے اچھا خلق عطا کیا اسے دوزخ کی آگ نہ جلائے گی۔ کیونکہ یہی بداخلاقی جو حسد، کینے، نفاق، تکبر، غرور اور زود رنجی سے عبارت ہے۔ آدمی کو یہاں بھی بدمزہ کرتی ہے اور آخرت میں بھی آزار پہنچاتی ہے۔ جب دل و دماغ کی تختی سے ایسے خیالات مٹ جائیں گے تو پھر آرام ہی آرام ہے، اور اچھے خلق والا دونوں عالم میں نجات کے لائق ہے۔ لہذا یہ سچ ہے کہ خوش خلقی سے بڑھ کر کوئی دولت و سعادت نہیں۔ اور خلقِ محمدیؐ، خلقِ عظیم ہے جیساکہ اس آیت کریمہ سے ظاہر ہے کہ بے شک آپ اخلاق حسنہ کے اعلیٰ پیمانے پر ہیں۔ خدا کے بندوں سے محض فی سبیل اللہ محبت کرنا ہی اخلاقِ حسنہ ہے۔ بداخلاقی اور بدخوئی حماقت ہے اور غرور و تکبر جہالت ہے۔ یہ دُنیا سہل ہے، اور تکبر جہل۔ دُنیا عبارت ہے اس فانی دُنیا کے اعتبارات موہومہ سے جن میں جاہل لوگ ظاہری اور باطنی طور پر پھنسے ہوئے ہوتے ہیں۔ عارف لوگ ظاہری طور پر تو ادائے حق کی خاطر اسے کسی حد تک ملحوظ رکھتے ہیں۔ مگر باطنی طور پر وہ اس پھندے سے بالکل آزاد ہوتے ہیں۔ لہذا دُنیا کے یہ تمام امورِ موہومہ ان کی نظروں میں ہیچ ہیں۔ کیونکہ اُنھیں ثبات نہیں اور اپنے حسب نسب اور مال و منال پر غرور و تکبر کرنا جہالت کی وجہ سے ہوتا ہے جو اس پہ پردہ ڈال دیتے ہیں کیونکہ یہ سب امور جن میں وہ مبتلا ہیں اعتبارات موہومہ کے سوا اور کچھ نہیں۔ سو کسی پر اعتراض نہ کرو، تاکہ

وہ تم سے مُنہ نہ پھیر لے۔ اگر تم پر کوئی اعتراض کرے تو اسے تسلیم کر لو۔ جیسا کہ اس آیت کریمہ میں آیا ہے کہ جب جہلا ان سے جہالت کی بات کرتے ہیں تو وہ رفعِ شرؔ کی بات کہتے ہیں۔ یعنی کبھی بھی کسی سے اعتراض یا چھیڑ خانی کی بات نہیں کرنی چاہیے، کہ یہ تو کج طبع غافلوں اور سنگدل لوگوں کا کام ہے جن کی بدفطرت کی وجہ سے دوسرے ان سے روگردانی یا چشم پوشی کرتے اور اُن سے دُور بھاگتے ہیں اور جس کی وجہ سے بہت سے لوگ ان سے نفرت و کدورت رکھنے لگ جاتے ہیں۔ اُن سے گریزاں اور پرے پرے رہتے ہیں۔ جیسا کہ اس آیت کریمہ سے واضح ہے کہ (اے نبیؐ) اگر آپ تند خو، سخت طبیعت ہوتے تو یہ آپ کے پاس سے سب منتشر ہو جاتے۔ سو آپ ان کو معاف کر دیجیے اور آپ ان کے لیے استغفار کر دیجیے، اور ان سے خاص خاص باتوں میں مشورہ لیتے رہا کیجیے۔ یہ بھی جان لو کہ اعتراض پیدا ہوتا ہے عیب بینی اور نکتہ چینی سے، جو خود عیب ہیں۔ تم تو عارف و محقق ہو تمھیں چاہیے کہ ہر جگہ ہنر کے سوا کچھ اور دیکھو ہی نہیں، اور اس باغ دُنیا میں وحدت کے پھولوں کے سوا اور کچھ نہ چُنو، کیونکہ ہر موجود میں ایک ہی حقیقت جلوہ افروز ہے۔ اور اگر ممکنات کی امکانیت کو دیکھا جائے تو پتہ چلے گا کہ امکان کے یہ داغ تو ہر ممکن الوجود اپنے ساتھ رکھتا ہے۔ بے عیب ذات فقط خدا کی ہے۔ جو دوسروں پر اعتراض کرتا ہے، اس کے اپنے اندر اس کے علاوہ اور بھی کئی عیب ہوتے ہیں جو صرف خود شناسی کی نگاہ سے دیکھے جا سکتے ہیں، وہ خود بینوں کی نگاہوں سے پوشیدہ رہتے ہیں۔ اعتراض سے منع کرنے سے ہمارا مطلب یہ ہے کہ بھلائیوں اور نیک کاموں کے کرنے اور ممنوعاتِ شرعی سے باز رہنے کی تلقین کرو، اسلام اور دین کی راہ پند و موعظت کی راہ ہے۔ کیونکہ دین تو اک نصیحت ہے۔ بلکہ حاصل مطلب یہ کہ جب کسی پر اپنی بات کو موثر نہ پاؤ، اور بے فائدہ سمجھو تو پھر خواہ مخواہ اس کی خطا پکڑنے کی غرض سے اعتراض نہ کرو کہ یہ بدباطن لوگوں کا شیوہ ہے۔ اور خشک مغز زاہدوں کی طرح خود بینی کی بنا پر نہ لڑ بھڑ کہ یہ آئینِ درویشی نہیں۔ اکثر لوگ خلوص نیت کو نہ بھانپتے ہوئے محض نفسانی وجہ سے حق بات کو قبول نہیں کرتے اور انکار بلکہ نفرت کرتے ہیں۔ اگر کوئی تم پر اعتراض کرے تو اُسے تسلیم کر لو اور اپنے قصور کا اعتراف کر لو، کیونکہ ہر انسان خطا و نسیان کا پُتلا ہے۔ اگر واقعی وہ غلطی تم میں موجود ہے تو اُسے دُور کرنے کی کوشش کرو، اور اگر نہیں تو وہ شخص افترا پرداز ٹھہرا۔ تمھیں تو کوئی خلل نہ پہنچے گا جس سے تو رنجیدہ خاطر ہو۔ لہذا اللہ تعالیٰ نے آنے

والے لوگوں کی تربیت کے لیے پچھلے لوگوں کے حال احوال سے خبر دیتے ہوئے فرمایا ہے کہ جب جاہلا
اُن سے جہالت کی بات کرتے ہیں، تو وہ رفع شرؔ کی بات کہتے ہیں، اگر چشمِ حق بین ہو تو راہ یہی ہے
یعنی اگر چشمِ بصیرت روشن ہے، اور ہر امر کی حقیقت دکھائی دیتی ہے تو پھر دُنیا و آخرت کی سلامتی و خیریت
کی راہ اسی قسم کی گزر بسر ہے جس کا ہم نے اوپر ذکر کر دیا کیونکہ دُنیا تو پہاڑ کی گونج کی مانند ہے۔ غم و مسرت
کی کھیتی جو کہو گے سن لوگے، جو بوؤ گے وہی کاٹو گے، یعنی جیسا کہ پہاڑ میں جس قسم کی آواز نکالو گے تو وہ
گنبد کی صدا کی طرح لوٹ کر ویسی ہی سنائی دے گی۔ دُنیا میں بھی اہلِ دُنیا سے جس قسم کی گفتگو کرو گے
اُسی قسم کا جواب سُن لوگے۔ اگر کسی کو کڑوی کسیلی بات کہو گے تو کڑوی کسیلی سُن لوگے۔ اگر کسی سے نرم و
ملائم بات کرو گے تو اُس کا بھی اثر دیکھ لوگے۔ یہ دُنیا تو خوشی و غم کی کھیتی ہے۔ اگر بھلے کام کا بیج بوؤ گے،
تو آخر الامر خود ہی شاد کام ہو گے۔ اور اگر کسی بُرے کام کا بیج بوؤ گے تو آخر کار خود ہی پشیمان و غمناک
ہو گے۔ لہٰذا ہوش سے کام لو۔ سوچ سمجھ کر بات زبان پر لاؤ، اپنے اعمال اور نفس کی اصلاح پر
کمر ہمت باندھ لو، کسی دوسرے سے سروکار نہ رکھو۔ رضا و تسلیم کی راہ پر گامزن رہو۔ یاد رکھو کہ
اللہ اپنے بندوں کو دیکھتا ہے۔ اور عاقل کے لیے اشارہ ہی کافی ہوتا ہے۔ وہ اسی سے قیاس کر کے
دیگر امور کو بھی ویسے ہی سرانجام دیتا ہے۔ احمق کو تو بہت سے وعظ و نصیحت سے بھی کوئی فائدہ
نہیں پہنچتا۔ جو کچھ کہا جاتا ہے وہ اُسے سنتا ضرور ہے، لیکن پھر وقت پڑنے پر اُسے بھلا دیتا ہے
اور جو بات اس سے نہ کہی گئی ہو وہ خود اسے سمجھتا بُوجھتا نہیں۔ اس لیے کہ اس میں نیک و بد کے امتیاز
کی قوت ہی نہیں، اور ہر چیز کو بیان کرنا اک امر محال ہے کہ ہر بات کی جزئیات کی کوئی حد و انتہا نہیں
ہوتی۔ لہٰذا اہلِ حق کے نزدیک کتاب و سُنتؐ کے ساتھ ساتھ قیاس بھی اک ضروری امر ہے۔ جس بات کا
کتاب و سنت سے صریح الفاظ میں پتہ نہ چل سکے وہاں قیاس سے کام لو، اور اُسی کے لیے اجماع
ضروری ہے، کیونکہ اجماع میں یقیناً کوئی نہ کوئی پختہ عقل کا مالک تو ہو گا ہی جو خطا نہیں کرے گا۔ اسی
لیے حضور پاک صلعم نے فرمایا کہ نہیں اکٹھی ہو گی میری اُمت گمراہی پر بہ حیثیتِ مجموعی۔ ہر بات اور
ہر کام کو سوچ سمجھ کر کرنا چاہیے۔ حیوانات کی طرح اپنی باگ ڈور نفس یا طبیعت کے ہاتھ میں نہ
دے دینی چاہیے۔ اور سارا وقت خدا کے بندوں کی خیر خواہی اور ان کی نفع رسانی میں صرف کرو، کیونکہ
اپنی خیر بھی اسی بات میں ہے۔ وہی آدمی بھلا جس سے دوسروں کو نفع پہنچے اور اگر اس سب کے

باوجود بھی کوئی تم سے ناراض ہو تو وہ خود سے ناراض ہوگا، نہ کہ تجھ سے، کیونکہ جس طرح صاف باطن اور نیک طینت لوگ سب سے دوستی اور اخلاص رکھتے ہیں، اسی طرح سنگ دل اور بدباطن لوگوں کو بندگانِ خدا سے خواہ مخواہ کی دشمنی اور بدگمانی ہوتی ہے۔ وہ اپنے آپ حسد و کینے کی آگ میں جلتے رہتے ہیں اور سارا وقت دوسروں کی عیب جوئی اور نکتہ چینی میں لگے رہتے ہیں۔ اور اپنے اس عیب سے غافل ہوتے ہیں، وہ خود اپنے آپ کو نہیں دیکھتے۔ لہذا اس تمام اخلاص اور صفائی قلب کے باوجود بھی ایسے لوگوں میں سے کوئی تم سے ناراحت و ناراض ہو اور یونہی بدگوئی کرے تو وہ حقیقت میں تم سے نہیں اپنے آپ سے ناراض ہے۔ اور اپنی بُری خُو کی وجہ سے اس مصیبت میں مبتلا ہے۔ تو اپنی طرف سے صاف پاک رہ تاکہ اللہ تجھے معاف کرے۔ دیکھو یہ آیت کریمہ کہ آخرت میں کوئی کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اُٹھائے گا۔ یہاں ہر شخص کا معاملہ اُس کے اپنے ساتھ ہے۔ اپنے دل کو ماسوی اللہ کے خیالات سے پاک صاف رکھنا چاہیے اور مشاہدۂ ذاتِ حق سے راحت اور آسودگی حاصل کرنی چاہیے تاکہ تیرے اور خدا کے درمیان کوئی پردہ حائل نہ ہونے پائے، اور ان لوگوں کو ان کے اپنے نفوس کے شر و فساد کی آفت میں چھوڑ دینا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ نے اُنھیں اس دُنیا میں بھی اس مصیبت میں مبتلا کر رکھا ہے اور آخرت میں بھی مبتلا رکھے گا۔ اور اُنھیں ان کی بدی کی سزا دے گا۔ کیونکہ کوئی آدمی کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اُٹھائے گا۔ جس کے کندھوں پر جو بوجھ ہوگا، وہی اُسے اُٹھائے گا۔ سبحان اللہ دوست یار نہ رہے، وہ اس دُنیا سے کوچ کر گئے۔ ہم سب اللہ کی طرف سے آئے ہیں اور اسی کی طرف لوٹ جائیں گے۔ یاالٰہی جو باقی بچے ہیں ان کو سلامت رکھ۔ اپنے دل کو اللہ کے سوا دیگر خیالات سے روک۔ اللہ بس اور باقی سب ہوس۔ یہاں کلمہ سبحان اللہ کا استعمال بطور تعجب کیا گیا ہے، یعنی اللہ تعالیٰ تغیر و تبدل سے مبرا ہے۔ وہ پیدا کر کے اور مار کر اپنی عجیب قدرت دکھاتا ہے۔ اکثر یار دوست جو ہماری طرح زندہ تھے ہماری طرح بات چیت کرتے تھے۔ ایک دوسرے کے ساتھ محبت و اخلاص سے پیش آتے تھے۔ نہ معلوم آناً فاناً کہاں چلے گئے۔ اُن کا کیا بنا؟ ان کا اب کوئی نام و نشان بھی باقی نہیں۔ پس اسی طرح عنقریب ہم بھی انہی کے رنگ میں رنگے جائیں گے، اگر اللہ نے چاہا ہم ان سے ضرور ملنے والے ہیں۔ کیونکہ تمام موجودات حضرت وجود باری تعالیٰ کے ظہور کے لیے موجود ہے۔ یعنی اللہ کی طرف سے آتے ہیں۔ اور آخرکار اسی کی طرف لوٹ جائیں گے۔ (انا للہ وانا الیہ راجعون) باقی ماندہ یار دوستوں کے لیے صلاح و

سلامتی بھی اللہ ہی کے لیے ہے تاکہ طریق محمدیؒ (ان سب پر خدا کا درود و سلام) کا فیض جاری رہے اور مومنین سلامت رہیں، اور اپنے حال پر رحم کرنے کے لیے بھی ہے کہ اس ضعیف بندے کا محبت بھرا دل مومنوں کے غم کو دیکھنے کی طاقت نہیں رکھتا۔ بلکہ ان کی زندگی کو اپنی زندگی سے عزیز رکھتا ہے اور دل کو اپنی طرف متوجہ کرنے کی استدعا اس لیے ہے کہ اب بڑھاپا آن پہنچا ہے اور ظہور کی باگ ڈور اخفا و پوشیدگیوں کی طرف مڑ رہی ہے۔ پس اُنھیں اور ان کے کاروبار کو اس ناصر و ہادیٔ مطلق کو سونپتے ہوئے خود مشاہدۂ ذاتِ اقدس میں لگ جاؤ۔ اور دوست کی طرف سے پیغام کے منتظر رہو۔ جب تک کارکنانِ قضا و قدر نے ہمیں زندہ رکھا اور طریق محمدیؒ اور یار دوستوں اور آل اولاد کی ہم سے جو خدمت چاہی کروائی ہے۔ جس کی قسمت میں یہ سعادت مقدر ہوگی اسی سے ظہور پذیر ہوتی رہیگی اور خدا نے چاہا تو یہ طریق محمدیؒ قیامت تک برقرار و ترقی پذیر رہے گا۔ اور اللہ تعالیٰ اس کا حامی و ناصر ہوگا۔ میں نے اُن سے نہیں کہا مگر وہی جس کا تو نے مجھے حکم دیا کہ عبادت کرو اللہ کی۔ اور میرا رب تمھارا رب ہے۔ اور میں تھا ان پر گواہ جب تک میں ان کے درمیان تھا۔ اور جب تو نے مجھے وفات دے دی تو تو تھا ان پر نگراں اور تو ہر چیز پر گواہ ہے۔ اپنے عزیز بھائیؒ کو نالۂ عندلیب اور اُس کی شاخوں یعنی دیگر رسائل، آل، تمام فرزندوں، اہلِ بیت، یار دوستوں اور محمدیوں کے امیر کے مقبرۂ مبارک کو اس حافظ و ناصرِ حقیقی اللہ جل شانہٗ و عم نوالہٗ کو سونپ کر ہم خود ہر لمحہ اسی خدائے لم یزل کے حسن و جمال کے تماشائی بن گئے، اور اس آیتِ کریمہ کے بموجب میں اپنا معاملہ اللہ کے سپرد کرتا ہوں۔ خدا تعالیٰ سب بندوں کا نگراں ہے۔ آہ ہائے مرا شوق اپنے باپ کو ملنے کی طرف وہ میرے ساتھ تھا دُنیا میں، اور وہ عنقریب ہوگا اگر اللہ نے چاہا تو سکرات میں میرے ساتھ اور قبر میں اور قیامت میں، اور جنت میں میرے ساتھ۔ اور آدمی اسی کے ساتھ ہوتا ہے جس سے اس نے محبت کی۔ رباعی

چون دود نہ پیچد از چہ سودا بدماغ
کردست جگر غم احبا ہمہ داغ
رفتند بخواب اہل بزم و مارا
بازست ہنوز چشم مانند چراغ

ترجمہ رباعی: احباب کے غم نے جگر کو داغ داغ کر دیا ہے۔ نہ جانے یہ سودا دھوئیں کی طرح دماغ

کو نہیں چڑھتا - اہل بزم نے محو خواب ہو کر آنکھیں بند کرلیں، لیکن شمع کی طرح ہماری آنکھیں ہنوز کھلی ہیں - یہ وارد جناب قبلۂ کونین والد بزرگوار کی حین حیات میں تحریر ہوا - اس کی شرح اب ان کی رحلت کے بعد لکھی گئی ہے - لہذا اس باب کے لکھتے وقت چونکہ یاران گذشتہ و رفتگاں کی یاد آئی جو ان تمام اوصاف وصفات کے کلی طور پر حامل تھے - خصوصاً شیخ معین الدینؒ کی یاد جو مجھ ناچیز سے خاص محبت وانس رکھتے تھے - حضرت قبلۂ کونین والد بزرگوارم بھی ان پہ خاص مہربانی فرماتے تھے - ان کی وفات کے بعد فرمایا کہ معین الدین مرا نہیں زندہ ہے - اور عالم ذوق و شوق میں ان کی زبان الہام بیان پر یہ الفاظ جاری ہوئے کہ اللہ کے دوستوں کو کبھی موت نہیں آتی - پس درد جدائی کے حسب حال فی البدیہہ یہ رباعی معرض تحریر میں آئی جس نے ماسوی اللہ کی محبت کو بالکل ٹھنڈا کر دیا - شعر اور تمثیل ہر دو کی خوبیاں بالکل عیاں ہیں وہ محتاج بیان نہیں ہیں -

---

هوالناصر

شروع اللہ کے نام سے جو نہایت مہربان اور بہت رحم کرنے والا ہے

سب تعریف اللہ کے واسطے ہے جس نے ہمیں آیات کی تاویل سکھائی، اور ذات وصفات کے اسرار و رموز ہم پر منکشف کیے۔ اور درود و سلام ہو اس کے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر جو مخلوقات میں سے بہترین ہیں، اور اُس کی آل پر جو اس کی برکات سے مشرف ہیں۔ اور اُس کے اصحاب پر جو اُس کے فیوض سے مستفیض ہیں۔ اما بعد پس یہ پینتیسواں ۳۵ باب ہے جس کا نام احسن تاویل ہے۔ منکشف کیا اللہ تعالیٰ نے ہم پر اور تم پر قرآن کے اسرار کو جس طرح کہ اُس نے توفیق دی ہمیں اور تمھیں اس کی تلاوت کی۔ پس ہر کلام کا ایک ظاہر ہوتا ہے اور ایک باطن۔ ظاہر تو الفاظ اور خطوط ہوتے ہیں، اور یہ محسوس ہونے والا جسمانی امر ہے۔ پس الفاظ تو وہ آوازیں ہیں جو حلقوم میں واقع ہوتی ہیں اور دونوں حنجروں میں اور زبان اور دونوں ہونٹوں میں اور آوازیں ظاہر ہوتی ہیں جب پھیپھڑوں سے ہوا نکلتی ہے حرارتِ غریزی جو کہ دل میں ہوتی ہے اس کی ترویح (فرحت و آسائش) کے بعد۔ پس وہ الفاظ سُنے جاتے ہیں اُن کے لہجے میں جو پہنچتے ہیں کانوں کی سماعت کے اندر جو اُٹھائے جاتے ہیں ہواہیں، اور ان کا ادراک کیا جاتا ہے کانوں کے ذریعے قوت سامعہ کی مدد سے، اور وہ اٹھائیس ۲۸ حرف ہیں لغت عربیہ میں۔ پس جہاں تک دوسری زبانوں کا تعلق ہے، پس ممکن ہے یہ حروف زیادہ ہوں یا کم ہوں اور خطوط وہ نقوش ہوتے ہیں جنھیں قلموں سے کھینچا جاتا ہے تختیوں کے اوپر اور پلندوں کے اندر، اور ان کا

ادراک قوتِ باصرہ سے ہوتا ہے آنکھوں کے ذریعے۔ پس خطی حروف وضع کیے گئے ہیں نشانیوں کی شکل میں تاکہ ان سے دلالت ہو سکے لفظی حروف پر، اور بے شک حروف لفظیہ کی نشانیاں وضع کی گئی ہیں تاکہ ان سے دلالت حاصل کی جا سکے حروف فکریہ پر، اور وہی اصل اور باطن ہیں، اور وہی معنیٰ اور مطلوب ہیں، اور وہی امر روحانی معقول ہے نقوش کے غور و فکر کے معاملے میں جو مستور ہے اپنے جوہر کے اندر، الفاظ کے ساتھ اس کے معانی کے اخراج سے پہلے، اور یہ نفس کا تصوّر کرنا ہے اس کے تفکّر کے اندر اور ظاہر اور باطن میں سے ہر ایک کے لیے بہت سارے مراتب ہیں۔ نحوی، فصاحت و بلاغت، منطق، واقع کے مطابق اور سننے والے کی استعداد اور حقیقت کے بیان کے اعتبار سے، پس نہیں جانتا کلام کی حقیقت کو مگر اس کلام کا متکلّم ہی، اور نہیں سمجھتا اس کی مراد مگر وہ خود ہی۔ اور سننے والے اور دیکھنے والے اس کے الفاظ سے ڈھلتے ہیں، اور نکالتے ہیں مطالب اس سے اپنی عقلوں اور اپنے فہم کی نسبت سے، پس ہر وہ چیز جس کو بیان کرتے ہیں لوگ دوسرے کے کلام کے مطالب میں سے وہ سب کی سب تاویلیں ہیں، اور وہ داخل ہیں مولّات (تاویل شدہ کلام) میں۔ اگرچہ ان میں سے بعض کہنے والے کی بھی مراد ہوں سوائے اس کے کہ جس کی تفسیر کرے متکلّم ایک اور عبارت سے، وہ اس کی تفسیر ہے اگرچہ اس میں ہو اس کی اپنی تاویل کے معانی۔ اور جو واقع ہوا ہے اللہ تعالیٰ کے کلام میں، اور نہیں جانتا اس کی تاویل کو کوئی بھی سوائے اللہ کے بلحاظ تاویل کی تفسیر کے، اور باعتبار تاویل کرنے والوں کے، نہ کہ خود اپنے نفس کے اعتبار سے، جیسے کہ اس کی تفسیر بیان کی ہے اس نے اپنے قول سے، اور راسخ جو ہے اپنے علم میں، وہ یہ کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے، یہ سب کچھ ہمارے رب کی طرف سے ہے اور اس بات سے نصیحت نہیں حاصل کرتے مگر عقل والے لوگ، اور مقطّعات قرآنیہ کے معنی بھی علما اور عارفین نے اپنی فہم کی مقدار کے مطابق کیے ہیں۔ جو کچھ کہ وہ سمجھے اس چیز کے اعتراف کے ساتھ کہ وہ عاجز رہے ہیں کہ اس کی حقیقت کو کماحقہٗ پا سکیں۔ اللہ ہی بہتر جاننے والا ہے ان کی حقیقت کو جیسی کہ وہ حقیقت ہے۔ بے شک میں بھی لکھتا ہوں اس کے بعض اسرار کو جن کا الہام کیا ہے مجھے میرے رب نے، اور سکھایا ہے مجھے اپنی جناب سے اپنے رسول صلعم کے طفیل۔ جان لو کہ بے شک "الٓمٓ" (الف۔ لام۔ میم) مفرد حروف ہیں مقطّعاتِ قرآنیہ میں سے کہ نہیں جانتا ان کی تاویل کو کوئی بھی سوائے اللہ کے اور اُس کے رسولؐ کے، اور علم میں راسخ لوگوں کے جو علم الٰہی سے مستفیض

ہو چکے ہیں۔ جن کو کہ سکھایا ہے اللہ تعالیٰ نے اپنی جناب سے وہ علم ۔ کہتے ہیں ہم ایمان لے آئے ہر اُس چیز پر جو نازل کی اللہ نے ہمارے رسولؐ پر، اور تمام قرآن ہمارے رب کی طرف سے ہے اور وہ بیان کرتے ہیں لوگوں کے لیے اسی قدر جتنا کہ واضح کیا ہے اللہ تعالیٰ نے ان پر ان کے رازوں میں سے، جیسے کہ لکھا ہے مفسرین نے ان تین مذکورہ بالا حروف کے معانی کے بارے میں کہ میں اللہ ہوں سب سے زیادہ جاننے والا ہوں، اور بعض عارفوں نے لکھا ہے کہ جب ان حروف مفردہ کو جمع کر دیا جائے اور لکھا جائے ایک لفظ کی صورت میں لفظ "الم" فارسیہ بمعنی درد۔ پس الم سے مراد محبت الٰہی ہے۔ اور ان میں سے بعض نے کہا ہے کہ الف سے مراد ایمان باللہ، اور لام سے مراد لقاءاللہ اور م (میم) سے مراد معرفت الٰہیہ ہے۔ اور اسی طرح ہر محقق عارف نے اشارہ کیا ہے خاص معانی کی طرف جو اس پر منکشف کیے گئے۔ پس جہاں تک ان معنوں کا تعلق ہے جو منکشف کیے اللہ نے مجھ پر اپنے فضل سے، وہ یہ ہیں۔ یعنی (الف) اشارہ ہے مرتبہ احدیہ، مجردیہ، ذاتیہ، ظاہراً، باطناً۔ کیونکہ الف مفرد کے حرف کا ظاہر جو ہے وہ خطِ واحد مستقیم ہے اور اُس کا باطن عدد واحد ہے تعداد کے لحاظ سے۔ اسی لیے الف کو ضمّ نہیں کیا جاتا لکھنے میں بھی، لکھے ہوئے کلمات کے ساتھ آوازمیں، اور اس میں چھپا ہوا اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ احدیت ذاتیہ بے نیاز ہے تمام جہانوں سے، اور ملایا جاتا ہے اُسے کلموں کے آخر میں کتابی شکل میں اس اعتبار سے کہ تمام امور کا ذات مجردہ الٰہیہ کی طرف رجوع کرنے کے اعتبار سے دلالت کرتا ہے۔ جس طرح کہ ذاتِ الٰہیہ موجودات میں سے کسی ایک سے بھی متحد نہیں ہوتی اور ان میں سے ہر ایک چیز آخر کار اسی کی طرف لوٹتی ہے ۔ اور ذات ہر وقت ہوتی ہے جیسے وہ تھی قائم اپنی اصل احدیت کی صورت میں ہمیشہ اولاً اور آخراً۔ اور وہ نہیں بدلی اضافات اور اعتبارات کے لاحق ہونے سے، اور لام (ل) اشارہ ہے۔ ذاتی لوازم کے مرتبے کی طرف جو کہ حقیقی صفات اور تحقیق شدہ کمالاتِ ثانیہ ہیں اللہ تعالیٰ کی ذات میں، اور وہ تقدّس ہے۔ اور یہ مرتبۂ نازل شدہ اور مفصلہ ہے ذاتِ وجوبیہ کے لیے اور اُس پر زائد ہے ظہور کی زیادتی کے ساتھ تنزل کی جانب جیسے کہ حرف لام (ل) کی صورت حاصل ہوتی ہے دائرے کو ملانے سے الف کے ساتھ نیچے کی جانب سے اور جب مل جاتی ہے یہ دائرے سے، تو بن جاتا ہے الف، لام کتابت میں۔ اور م (میم) اشارہ ہے مفصّلات اسمائیہ کے مرتبے کی طرف جو کہ مرتبہ ہے ذات کا صفات سے ملاحظہ ہونے کا۔ اور اسے

مرتبۂ اسمائی سے موسوم کیا جاتا ہے، اور وہ صفات کے مرتبے سے نیچے اُتر آتا ہے اعتباری تنزل کے لحاظ سے، اور وہ ہو جاتا ہے بہت زیادہ ظاہر ہونے والا۔ اپنے مظاہر کے اظہار کے لیے جو کہ موجودات دینوی کی حقیقتیں ہیں۔ اور جب مرتبۂ صفات میں جن کی طرف اشارہ کیا گیا ہے (م) کے ساتھ امتیاز اعتباری سے علم کے حضور میں۔ نہیں زوال پذیر ہوا یہ مرتبہ اس مرتبے سے کھلا کھلا زائل ہونا۔ اسی لیے جمع کر دی گئی ہے لام۔ میم کے ساتھ لکھتے ہیں اللہ جل شانہٗ کی کتاب میں۔ پس فرمایا اللہ عزوجل نے ان تین حروف مقطعہ کے بیان کے بعد جو دلالت کرتے ہیں ذات اور صفات اور اسماء کے مراتب پر طریق مذکورہ کے ساتھ دلالتِ ایمائی (اشارتی) یہ وہ کتاب ہے، نہیں ہے اس میں کوئی شک اور ذالک الکتاب سے مراد وہی تین غیبی مراتب ہیں جن کی طرف اشارہ کیا ہے لکھے ہوئے حروف میں۔ اسی لیے کہا کہ ہدایت ہے متقین کے لیے جو ایمان رکھتے ہیں غیب پر، اور ہوتی مراد بذلک الکتاب سے القرآن جیسا کہ مفسروں نے لکھا ہے۔ تو چاہیے تھا کہ کہتا ھذا الکتاب (یہ کتاب) اور نہ کہتا ذلک الکتاب (وہ کتاب) وہ لوگ جو ایمان رکھتے ہیں اس چیز پر جو نازل کی گئی ہے تم پر اور نازل کی گئی ہے تم سے پہلے۔ پس یہاں پر مراد نازل شدہ کتابیں ہیں جیسے قرآن مجید، توریت، انجیل اور زبور وغیرہ۔ اُن صحف میں سے جو نازل ہوئے انبیا پر (ہمارے نبی اور ان پہ درود و سلام)۔ پس اسے دیکھنے والے دیکھ انصاف کے ساتھ کہ بے شک اللہ کے کلام کا سیاق۔ آیا دلالت کرتا ہے اس چیز پر جو ہم نے کہی ہے یا دلالت کرتا ہے اس پر جو دوسروں نے کہی اس سے پہلے، اور اللہ اس چیز پر جو ہم کہتے ہیں نگران ہے اور وکیل ہے اور وہی بہتر جانتا ہے۔

بعض قرآنی آیات اور حضرت محمد مصطفیٰ ؐ اور موسیٰ علیہ السلام کے معاملے کی تاویلات کے بیان کا باب

اس بیان کی تاویل جس کی طرف بات لوٹتی ہے۔ وہ اصل میں لوٹانا ہے اور شرع میں آیت کو اس کے ظاہری معنی سے ہٹا کر اس معنی کی طرف لے جانا جس کی وہ محتمل ہے جب کہ وہ محمول معنی وہ ہوں جو مرادی طور پر کتاب و سنت سے موافقت رکھتے ہوں۔ اور تفسیر و تاویل میں فرق یہ ہے کہ تفسیر شہادت ہے اللہ پر، اور قطعی بات ہے کہ اس میں اس لفظ سے یہ معنی لیے اور تفسیر قرآنی

رائے سے محروم ہوتی ہے، اور نہیں جائز مگر بنی صلعم کی طرف سے نص کے ساتھ اور تاویل محتمل معنوں میں سے کسی ایک کو ترجیح دینا ہے بغیر کسی حقی دلیل اور شہادت کے اللہ کی طرف سے اور نہیں محروم ہوتی تاویل رائے سے عالم کے لیے الفاظ کے ساتھ، اور عارف کے لیے معانی کے ساتھ - لہذا اس وارد (باب) میں بعض آیات کے باطنی معانی کا بیان ہے جو آنحضرت سیدالمرسلین (ان پر خدا کی تمام صلوٰۃ اور مکمل سلامتیاں ہوں) اور خدا کے مابین معاملے پہ ان کے ظاہری الفاظ و بیان کے مطابق اور موافق بھی ہیں - نیز حضرت موسیٰ علیہ السلام (ان پر اور ہمارے نبیؐ پر درود و سلام) کے اپنے رب کے ساتھ معاملہ یعنی تجلّیٔ ذات و دیدار کے معاملے کا بیان، اور حضور سیدالمرسلینؐ کے مرتبے کا کاملیت اور تمامیت کے لحاظ سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مرتبے سے فرق و امتیاز کا بیان - غرض یہ کہ جو کچھ تحقیقات سے ملتا ہے، اور حالات کے اسرار جس طرح کھُلتے ہیں میں اسی کا اظہار کرتا ہوں - رباعی

گرم سفرم زمنزلے می گویم
افسانۂ شوق محملے می گویم
این قافلۂ مست مئ بے دردی ومن
بانگ جرسم درد دلے می گویم

ترجمہ رباعی: میں ہر لحظہ گرم سفر ہوں، یعنی جادۂ فنا طے کر رہا ہوں، لہذا منزل ہی کی بات کرتا ہوں - محملِ محبوب کے شوق کا افسانہ کہتا ہوں - قافلے کے میرے دوسرے ساتھی جو یہ راہ طے کر رہے ہیں - بیدردی اور بے ہوشی کی شراب سے سرمست ہیں - میں جرس کارواں کی طرح ہر دم محو خروش ہو کر اپنا دردِ دل بیان کرتا ہوں (مگر کوئی سنتا ہی نہیں) اب دیکھیے مصنف اس کی تلمیحات و اشارات وکنایات کی یوں وضاحت کرتا ہے - گرم سفر بودن سے ہماری مراد ہر آن راہ فنا کو طے کرنے سے ہے - منزل سے مُراد منزل آخرت اور منزل مقصود یعنی وصل حق - افسانے سے مراد ان حالات و معارف کا بیان ہے - محمل سے مراد وُہ عالم علویات و الہیات جو ذاتِ حق کی تجلی گاہ ہے - قافلے سے مراد اپنے ہمعصر لوگ - بے دردی سے مراد غفلت و مدہوشی ہے - دردِ دل سے مُراد وہ احساس جو عشق کی چوٹوں سے دل میں پیدا ہوتا ہے - حاصل مطلب یہ کہ میں ہر لحظہ جادۂ فنا کو طے کر رہا ہوں اور عالم آخرت کی طرف

بڑھ رہا ہوں جو آخری منزل اور آرام گاہ ہے۔ ہر وقت منزل مقصود یعنی وصل ذاتِ حق کی باتیں کرتا ہوں، اور اللہ ہی کی طرف ہیں پھر رجوع کرتا ہے۔ یں اس عالم علویات اور الٰہیات یعنی اس کی تجلّی گاہ کے جلووں سے بڑے ذوق و شوق سے آگاہ کرتا ہوں، لیکن میرے یہ ہمعصر ہمراہی جو میرے ساتھ اس جادۂ فناو قوت کو طے کر رہے ہیں، غفلت و مدہوشی کی شراب سے چور ہیں، وہ سنتے ہی نہیں یں جرس کارواں کی طرح ہردم گرم خروش اور فریاد کُناں، عشق کی چوٹوں کے محسوسات کو آشکارا کرتا ہوں، حقیقت کا اظہار کرتا ہوں، لیکن ان کے کان ہیں اُن سے وہ سنتے نہیں، ان کی آنکھیں ہیں مگر ان سے دیکھتے نہیں۔ وہ چوپایوں کی طرح ہیں۔ بلکہ گمراہ ہیں، اور یہ لوگ غافل ہیں۔ غافلوں کی یہ جماعت معذور ہے۔ وہ کریں تو کیا؟ ان کے کان اس کلام کے سننے سے بے بہرہ ہیں۔ اے اللہ اس قوم کو ہدایت فرما۔ بے شک وہ نہیں جانتے۔ اللہ تعالیٰ نازل کرتا ہے معانی مومن کے قلب پر حجاب کے بغیر اور اُسے سکھاتا ہے اپنی جناب سے علوم (علم لدنی عطا فرماتا ہے) عوام الناس کی آنکھ اُس جلوے کو دیکھنے سے عاری ہے وہ نہیں سمجھتے کہ اللہ تعالیٰ قلب مومن کو اپنے نور سے منور کر دیتا ہے، اور وہ نورِ رحمانی ہی سے دیکھتا ہے۔ مادی کان شور و غل سے پیدا ہونے والی اس آواز کے سوا جو ہوا کے سہارے کان کے سوراخ تک پہنچتی ہے، اور کچھ سنتے ہی نہیں اور یہ مادی آنکھیں ان محسوس ہونے والی اشیا جو مخروطی شعاعوں کے سبب سے نظر آتی ہیں ان کے سوا اور کچھ دیکھتی ہی نہیں۔ دید و شنید کا یہ معاملہ جو اللہ تعالیٰ اپنے رسول کریم صلعم کے صدقے خاص الخاص بندوں سے روا رکھتا ہے۔ وہ انفس و آفاق سے ماورا ہے۔ اس کا تعلق صرف قبولیت اور برگزیدگی سے ہے۔ ان کو نہ ان آنکھوں نے دیکھا اور نہ اِن کانوں نے سُنا۔ نہ ایسی کوئی آنکھ ہے جو اُسے دیکھ سکے۔ نہ ہی ایسا کوئی کان ہے جو اُسے سُن سکے۔ ہر چند کہ عشق کی شورشوں نے گریہ و فغاں کا علم لہرا دیا اور جلوۂ حُسن نے سب پردے اُٹھا دیے لیکن کسی نے اس پہ کان نہ دھرا، اور نہ ہی اُسے دیکھنے کے لیے آنکھ کھولی، اور اس آیت کریمہ کے بموجب کہ اُس جیسی کوئی اور شے نہیں، وہ سننے والا ہے اور سب کچھ دیکھنے والا ہے۔ شورش عشق عبارت ہے پہلی محبت کے ابھرنے سے جس کا پتہ ہمیں اس قول سے چلتا ہے کہ اُس (خدا) نے چاہا کہ وہ پہچانا جائے۔ اور جلوۂ حُسن سے مُراد وجود ذات کا انواع و اقسام کے ظہورات میں موجزن ہونا ہے پس ہر چند کہ حُبِّ اول نے اپنے ہی دیدار کے شوق میں اپنے مظاہر میں ذوق و شوق کے نالے بلند کیے اور

عارفانِ ذات کی زبانی پیغام و سلام کا راستہ بھی کھولا، اور شاہدِ وجود رنگا رنگ کے لباسوں میں ملبوس ہو کر جلوہ افروز ہوا جو ہر جانب سے ہر کسی تک پہنچ رہا تھا۔ جس نے درمیان سے تمام حجاب اور پردے دُور کر دیے اور اپنے آپ کو کسی طرح نہ چھپایا، لیکن ان حقائقِ ممکنہ میں سے جو عدم و فنا کی تاریکیوں کا مال ہیں۔ کسی نے بھی اُس کے دیدار کے لیے آنکھ نہ کھولی، نہ ہی اس کی گفتگو پر کان دھرا۔ چونکہ اُس جیسی کوئی شے نہیں، وہ بے مثال ہے۔ سب کچھ سننے اور دیکھنے والا ہے۔ یہ شنوائی اور بینائی اس کے وجودی کمالات اور حقیقی صفات میں سے ہے، لہٰذا اُس نے آپ ہی اپنے آپ کو دیکھا۔ دیکھئے قرآن پاک کی یہ آیت کریمہ کہ اُس کو کسی کی نگاہ محیط نہیں ہو سکتی، مگر وہ سب نگاہوں کو محیط ہو جاتا ہے۔ اُس نے اپنے کلام کو آپ ہی سُنا۔ اس آیت کریمہ پر غور کیجیے کہ آج کے دن کس کی حکومت ہوگی۔ بس اللہ ہی کی ہوگی جو یکتا اور غالب ہے۔ اَلْیَوْمَ میں الف لام استغراق کا ہے۔ جس میں تمام قسم کے دن شامل ہیں۔ یہی نہیں کہ فقط قیامت کا دن ہی اللہ تعالیٰ کے لیے مخصوص ہے اور اب اس کی ملکیت کسی دوسرے کے ہاتھوں میں ہے، اور قیامت کے دن ان ہاتھوں سے نکل جائے گی۔ اللہ تعالیٰ بہت اعلیٰ وارفع اور سب سے بلند و بالا ہے۔ کیا دُنیا اور کیا آخرت ہر جگہ اسی کی جلوہ گاہ ہے۔ دونوں جہان اس اللہ جل جلالہٗ اور عم نوالہٗ کی بارگاہ کے فرش ہیں۔ کون ہو سکتا ہے جو اس کے حُسن کا تماشا کرے یا اُس کے کلام کو سُن سکے ع کوئی مکان مکین کے بغیر کیسے ہو سکتا ہے۔ یعنی دیکھنے کے لیے نظر آنے والی چیز اور اُسے دیکھنے والا اور سننے کے لیے سامع اور متکلم دونوں کا وجود ضروری ہے۔ ع وہ خود تماشا بھی ہے اور تماشائی بھی۔ موسیٰ علیہ السلام کی شخصیت نے اپنے ایک سوال کا جواب پایا کہ تم مجھے نہیں دیکھ سکتے۔ اور محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم (ان پر خدا کا درود و سلام) نے جب بیچ میں اپنے آپ کو نہ پایا تو وہ دیدارِ ذات کے شرف سے شرفیاب ہوئے جیسا کہ اس آیت کریمہ سے ثابت ہے کہ قلبِ مصطفیٰؐ نے دیکھنے میں کوئی غلطی نہ کی، اور پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے بندے پر وحی نازل کی جو کچھ کہ نازل فرمائی تھی۔ اسی لیے ہمارے محقق مرشد (ان پر خدا کی دائمی برکات ہوں) نے فرمایا تھا کہ جسے دیدار نصیب ہو گیا اس کی زبان گنگ ہو گئی یعنی ع جو پا گیا ہے راز وہ گُم ہے، خموش ہے۔ زبان کا وصف گویائی ہے، مگر جس نے دیکھ لیا اس کی زبان کا وصف خموشی ہے۔ جب تک خودی کا پردہ درمیان سے نہ اٹھاؤ گے اس کے دیدار کی تاب نہ لا سکو گے۔ اپنی طرف سے کوئی تمنّا اور استدعا

نہیں کرنی چاہیے۔ حتیٰ کہ تجلیات کی تمنّا اور مکاشفات کی استدعا بھی نہیں کرنی چاہیے، کیونکہ طلب کی صورت میں تیری ہستی کی بقا دکھائی دیتی ہے، اور جب تک تو، تُو ہے اس سے حجاب میں رہے گا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی اس تمام تر قدرت نفس کے باوجود سُنا جو کچھ کہ سُنا، اور ان کی یہی ہستی دیدار ذات سے مانع ہوئی۔ اور حضرت محمد مصطفےٰ صلعم نے خود کو درمیان نہ دیکھا اور شرف دیدار سے مشرف ہوئے۔ دیکھیے یہ آیت کریمہ کہ اب ہم نے تجھ پر سے تیرا پردہ اُٹھا دیا۔ سو آج تو تیری نگاہ بڑی تیز ہے۔ پس حضرت موسیٰ کلیم اللہ بلا تشبیہہ زبانِ حق یا لسان الغیب تھے۔ جو سوال وجواب کرتے رہے، مگر مطلوب کو دیکھ نہیں پاتے تھے۔ ادھر حبیبِ خدا حضرت محمدؐ مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم بلا تشبیہہ بمنزلہ حق تعالیٰ کی چشم بصیر کے تھے وہ عین الغیب تھے۔ زبان سے کچھ نہیں کہہ رہے تھے مگر وہ مشاہدۂ ذات کر رہے تھے، اور بے صدا حروف کلام سے اپنے محبوب کے ساتھ محو گفتگو تھے۔ جو عبارت ہے اشارات وکنایات سے، جو کچھ کہ موسیٰ علیہ السلام سُن رہے تھے وہ ہمارے پیغمبر (ان پر خدا کا درود وسلام) دیکھ رہے تھے۔ پس قرآنی مقطعات کی رموز کو وہاں سے سمجھ لو۔ ہاں زبان کا کام سوال کرنا ہے اور وہ دیدار نہیں کرتی۔ لیکن آنکھ کی زبان گنگ ہے، اور وہ دیکھ رہی ہے۔ ہمارے قبلہ عالم والد بزرگوار (ان پر خدا کی دائمی برکات ہوں) کا یہ مذکورہ بالا شعر انہی معانی کا حامل ہے۔ چونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام (ان پر اور ہمارے نبی پر درود وسلام) نے اپنی ہستی کے ادراک کے باوجود دیدار ذات کی تمنّا کی جو "ربِ اَرِنی" کے کلمات سے ظاہر ہے تو حق تعالیٰ نے ان پر تجلّی نہ فرمائی بلکہ خدا نے اس پہاڑ کو اپنی تجلّی گاہ بنایا، جو اپنی ہستی سے بے خبر تھا۔ جیسا کہ اس آیتِ کریمہ سے واضح ہے کہ پس ان کے رب نے جو اس پر تجلی فرمائی (تجلّی نے) اس پہاڑ کے پرخچے اڑا دیے۔ اور موسیٰ علیہ السلام بے ہوش ہو کر گر پڑے۔ پھر جب افاقہ میں آئے تو عرض کی بے شک آپ کی ذات منزہ اور رفیع ہے۔ میں آپ کی جناب میں معذرت کرتا ہوں، اور سب سے پہلے میں اس پہ یقین کرتا ہوں۔ یہاں جو حضرت موسیٰؑ کے مرتبے میں کمی دکھائی گئی ہے۔ وہ خاتم الانبیاؐ یعنی ہمارے نبی پاک صلعم کی نسبت سے ہے۔ اولیائے کرام کی نسبت سے نہیں۔ کیونکہ کامل ترین ولی بھی ادنیٰ ترین نبی کے برابر نہیں ہو سکتا۔ اگرچہ امتِ محمدیہؐ کے اولیائے کرام سے حضور نبی پاکؐ کے صدقے خدا نے یوں معاملہ کیا ہے کہ دوسری امتوں کے نبیؑ ان پہ رشک کرتے ہیں جیسا کہ مشہور ہے کہ

اکثر نبیوںؑ نے حضور سرورِ کائنات ؐ کے امتی ہونے کی تمنا کی ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی متابعت کریں گے۔ اور حضرت امام مہدی ؓ (ان پر اور ان کے جد پر درود وسلام) کی امامت کی پیروی کریں گے۔ ہمارے پیغمبر پاک (ان پہ درود و سلام) کونین کے سردار ہیں اور ان کے اجزا (آل) دونوں عالم کے افراد کے سردار ہیں۔ محمدیوں ہی کا دور دورہ ہوگا۔ نور محمدی عالم اور اہل عالم پہ محیط وحاوی ہے۔ اور اُس آفتاب عالمتاب کی روشنی میں سبھی ستارے ماند ہیں۔ اور ممکنات الوجود کے یہ سارے قطرات اسی بحر بیکراں میں غرق ہیں۔ قصہ کوتاہ یہ کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر یہ حقیقت واضح کی کہ جب تک اُن میں اپنا شعور ہستی باقی ہے، وہ تجلی ذات حق کے لائق نہیں ہو سکتے۔ یہی وجہ تھی کہ حق تعالیٰ نے پہاڑ پر تجلی گرائی جو اپنی ہستی سے بے خبر تھا۔ اس پہاڑ پہ تجلی ریز ہونے اور حضرت موسیٰؑ جیسے برگزیدہ رسول پہ تجلی نہ گرانے کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی کمزوری نہ سمجھنا چاہیے، بلکہ اس قسم کی روگردانی اور چشم پوشی محبوبوں اور معشوق کے تغافل کی ادا ہے جو وہ اپنے عشاق سے کرتے رہے ہیں۔ اور ان کو سننے یا دیکھنے کی غرض سے دوسروں سے گفتگو کرتے ہیں، اور اُس کو اپنا دیدار کراتے ہیں۔ دیکھیے یہ شعر حسب حال ہے کہ اے محبوب تو اپنا دیدار ہمیں کرا بھی رہا ہے، اور ساتھ ہی ساتھ چھپتا ہے، اور سامنے آنے سے پرہیز کرتا ہے گویا یوں اپنے بازارِ حُسن اور ہماری آتشِ شوق کو تیز کرتا ہے۔ بہر حال موسیٰ علیہ السلام اس امر کی تکرار کیوں نہ کرتے، اور دیدار کی تمنا میں لب کشائی کیوں نہ فرماتے کہ ان کی قوم کی استعداد اس امر کی مقتضی تھی۔ چونکہ قوم نے بھی یہ کلمات کہہ کر زبان درازی کی تھی کہ ہم ایمان نہ لائیں گے جب تک خدا کو ظاہراً سامنے نہ دیکھ لیں اور حق تعالیٰ کا اپنا فرمان بھی ہے کہ ہم نے کسی قوم میں کوئی پیغمبرؑ ایسا نہیں بھیجا جو اُن کی زبان میں اُنھیں پیغام حق نہ سناتا ہو۔ پس حضرت موسیٰؑ کی امت نے دیدار کی طلب اپنی زبان سے کی پیغمبرؑ نے بھی حق تعالیٰ سے اسی امر کی استدعا کی تاکہ وہ پہلے خود اُسے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں، پھر اس کے بعد دوسروں کو چاہے دکھائیں یا نہ دکھائیں۔ وہ تو اس معاملے میں خدا کی طرف سے اپنے دل کی تسلی کے خواہاں تھے تاکہ اس تسلی کی برکت سے قوم کو بھی اطمینان دلا سکیں۔ کیونکہ پہلے تو پیشوا کو جس بات کی مکمل تسلی اور اطمینان ہوگا تو پھر اُن کے پیروکاروں پر ان کی استعداد کے مطابق اس اطمینان و تسلی کا پرتو پڑے گا ورنہ یہ کہاں سے ثابت ہو کہ تمام فیوض و برکات کا سرچشمہ وہ ہے۔ لہذا موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کی استعداد کے تقاضے کی بنا پر یہ تمنا کی اور اللہ تعالیٰ نے ان پہ حقیقت

کا کما حقہٗ انکشاف فرمادیا۔ یعنی خالص تنزیہی لحاظ سے جواب دیا کہ تم مجھے نہیں دیکھ سکتے۔ کیونکہ آنکھ اس مرتبے کو محسوس کرنے کی اہل نہیں، اور وہ ہرگز دیکھا نہیں جا سکتا، اور تشبیہی اعتبار سے نوری تجلّی فرمائی اور دیدار طلب کرنے والے کی آنکھ کو وہ تجلی دکھا کر حیران و ششدر کر دیا۔ آیت کریمہ کا یہ ٹکڑا کہ اُس کے ربّ نے اس پر تجلی فرمائی، اسی صورتِ حال کا گواہ ہے۔ مذکورہ بالا آیت کے مطابق پیغمبروںؑ کو ان کی قوموں کی زبانوں کی موافقت ہی سے بھیجا گیا، تو حضرت موسیٰؑ کی زبانِ قال سے بھی ان کی قوم کی استعداد کے مطابق وہی الفاظ نکلے جس سے پیغمبرؑ کی زبانِ قال اور قوم کی زبانِ حال و قال کا اتحاد ثابت ہو گیا۔ لوگوں کو رشد و ہدایت کی کثرت اور فیض رسانی کے لیے اس قوم کی سطح کی مناسبت سے نیچے اُتر آنا ضروری ہے۔ کیونکہ کامل انسانوں کا کام انھی سے ہوتا ہے جن سے وہ رجوع کرتے ہیں۔ لہٰذا نبوت کے مقام میں نبیؑ کا رُخ خلق کی طرف ہوتا ہے برعکس مرتبۂ ولایت کے کہ ولی کا رخ اللہ تعالیٰ کی طرف ہوتا ہے۔ اور اس مرتبے میں جس کی عوام سے زیادہ شراکت ہوگی، اتنی ہی اس کی رشد و ہدایت زیادہ ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اُمت اکثر انبیاءؑ سے زیادہ تھی۔ چونکہ وہ اپنی قوم سے مناسبت اور شراکت زیادہ رکھتے تھے اور ان کے ساتھ شمولیت کی بنا پر، ان پر زبردست طریق سے اثر انداز ہوتے تھے۔ اور کوئی آدمی بھی ان کے عذاب و سزا کی حکم عدولی نہیں کر سکتا تھا۔ چنانچہ اُنھوں نے ایک ہی دن میں اپنی قوم کے ستّر ہزار آدمیوں کو توبہ قبول کرنے کے سلسلے میں قتل کر ڈالا۔ جیسا کہ اس آیت کریمہ میں حکم آیا ہے کہ بعض آدمی بعض کو قتل کرو، یہ عمل در آمد تمھارے لیے بہتر ہوگا تمھارے خالق کے نزدیک۔ پھر حق تعالیٰ اپنی عنایت سے تم پر متوجہ ہوئے۔ بے شک وہ تو ایسے ہی ہیں کہ توبہ قبول کر لیتے ہیں اور بڑی عنایت فرماتے ہیں۔ اور سبھی نے ان کا یہ حکم قبول کر لیا وہ آگے بڑھتے گئے اور اپنے آپ کو قتل ہونے کے لیے پیش کرتے رہے۔ ہمارے پیغمبر پاکؐ جو سراپا خیر و رحمت تھے، اُن کے حکم میں حضرت موسیٰ علیہ السلام سے زیادہ اثر و نفوذ تھا، اور وہ مرتبۂ خالق و مخلوق میں تمام و کمال مناسبت رکھتے تھے، اور دُنیا و آخرت کے تمام مراتب کے جامع تھے، مگر گناہگاروں کے اُس شفیع نے اپنی اُمت سے کبھی ایسا غضبناک سلوک روا نہ رکھا۔ ہاں کفار سے جنگ و جدال اور قتل و غارت کا حکم ضرور دیتے تھے۔ اور مومنین ان کے حکم کو پوری رضا و رغبت سے قبول کرتے تھے اور جانیں نثار کر دیتے تھے اور اطاعتِ خدا اور رسولؐ کی انتہا کر دیتے تھے۔ قصہ کوتاہ یہ کہ حضرت موسیٰؑ

کی شخصیت کے امتیاز کے باعث ذات سبحانہ' نے دوسری بار بھی آگ کی مخصوص شکل میں تجلّی فرمائی۔ حضرت موسیٰؑ نے اُسے محض آگ ہی سمجھا اور فرمایا کہ وہ تو آگ ہے، لیکن چونکہ صفت کلام سے صحیح مناسبت رکھتے تھے۔ آخر کلام نے مغالطے سے پردہ اُٹھادیا اور یہ کہہ کر اُنھیں خبردار کیا کہ میں تمھارا رب ہوں۔ یعنی چونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے نفس میں اعتباری تشخصات امتیاز غالب تھا۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ سے درخواست کی تھی کہ مجھے اپنا آپ مخصوص صورت میں دکھا۔ حق تعالیٰ نے کوہ طور پہ نوری تجلّی فرمائی جیساکہ پہلے بیان گزرچکا ہے۔ پس دوسری بار بھی اس مقدس وادی میں آگ کی خاص شکل میں تجلّی فرمائی، اور حضرتِ موسیٰؑ نے اپنے اُس امتیازی اعتبار کی راہ سے اُسے محض آگ ہی سمجھا، اور اُس تجلّی کی حقیقت پہ نگاہ نہ کی۔ اور اُس اعتباری صورت کو نظر امتیاز سے محو نہ کرسکے۔ چونکہ صفت کلام الٰہی میں نہایت زبردست نسبت رکھتے تھے، جیساکہ خود خداتعالیٰ نے قرآن میں فرمایا ہے کہ ارشاد ہوا کہ اے موسیٰؑ میں نے اپنی پیغمبری اور اپنی ہم کلامی سے اور لوگوں پر تم کو امتیاز دیا ہے۔ اسی صفت نے اِنّی انا اللہ (کہ میں تمھارا رب ہوں) کے کلمات سے ان کی رہنمائی کی اور حقیقتِ حال سے آگاہ کیا۔ اور پھر دکھادیا حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جو کچھ کہ دکھایا۔ **معرفت** نبوت کی نسبت میں اعتبارات و مراتب کا اثبات ہے کہ اُس میں نچلی سطح پر آنے کی وجہ رُوبہ خَلق ہونے کی بنا پر ہے، اور ولایت کی نسبت میں امتیازات کی برطرفی و نفی ہے۔ کیونکہ وہ عروج اور روبحق ہونے کی کیفیت کا مقام ہے۔ لہٰذا حضرت موسیٰ علیہ السلام کے باطن میں نبوت کی نسبت غالب تھی، اور ولایت کی نسبت مغلوب تھی۔ اسی بنا پر ان کی نظر سے اعتباری تشخّصات ہٹ نہ سکے اور مخلوق کی صورت معنیٔ حق کا حجاب بن جاتی تھی اور ہمارے خاتم الانبیاؐ (ان پہ خدا کا درود و سلام ہو) میں نبوت اور ولایت کی یہ دونوں نسبتیں پورے اعتدال کے ساتھ تھیں۔ ان میں سے کوئی بھی کمزور نہ تھی کہ دوسری اس پہ غالب آجائے۔ کوئی چیز کسی چیز کی مانع نہ تھی۔ نہ تو مخلوق حجاب بن سکتی تھی، اور نہ حق حجاب خلق بن سکتا تھا۔ بلکہ وہ مخلوق کے آئینے میں بھی حُسن خالق کا مشاہدہ فرماتے تھے۔ اور احاطہ' حق میں بھی موجودات کی علمی صورتوں کا معائنہ کرتے تھے۔ دیکھیے یہ آیت کریمہ کہ یاد رکھو وہ لوگ اپنے رب کے روبرو جانے کی طرف سے شک میں پڑے ہیں۔ یاد رکھو کہ وہ ہر چیز کو اپنے علم کے احاطے میں لیے ہوئے ہے۔ غرضیکہ ہمارے پیغمبر علیہ السلام (ان پہ خدا کا درود و سلام) ہر نسبت میں کامل ہیں، اور ان کی جامع حقیقت تمام حقائق پہ شامل

ہے ۔ **فائدہ** پس سمجھ لینا چاہیے کہ ہرچند کہ منصب نبوت کے معنی میں جو امر واحد ہے انبیائے کرامؑ میں
فرق و امتیاز نہیں ہے ۔ سب اللہ کے نبیؑ ہیں، جیسا کہ قرآن پاک میں خدا نے خود فرمایا ہے کہ ہم رسولوں
میں سے کسی ایک میں بھی تفریق نہیں کرتے ۔ کیونکہ معنی نبوت کا فیض تو حق تعالیٰ کی جانب سے ہے
اور اپنے بندوں کی برگزیدگی بھی اسی کی طرف سے ہے، اور اُن سے اسی کا معاملہ ہے ۔ پس حق تعالیٰ جو واحد
حقیقی ہے، اس سے امر واحد کے سوا اور کچھ صادر نہیں ہو سکتا ۔ جیسا کہ یہ قول بھی ہے کہ واحد سے
واحد کے سوا اور کچھ صادر ہو ہی نہیں سکتا ۔ اس مرتبے میں امتیازی کثرت کو دخل نہیں ۔ ہاں انسانی
ذاتوں کی اہلیتوں کے اختلافات کے اعتبار سے ایک دوسرے سے مراتب و مناصب میں امتیاز
ضرور ہے جیسا کہ خود قرآن میں خدا نے فرمایا ہے کہ ہم نے تم میں سے بعض کو بعض پر فضیلت دی ۔
اور یہ بات حضرات انبیاؑ کی امکانی حیثیتوں کی راہ سے ہے ۔ اُس آفتاب حقیقی کے نور کی تجلّی وہی واحد
ہے ۔ رنگوں کا اختلاف مختلف شیشوں کی بنا پر ہے ۔ بہرحال میں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے
اسرار اور سید المرسلین حضور پاکؐ (ان پر خدا کی سلامتیاں اور رحمتیں ہوں) کی نسبت کی فضیلت و
بزرگی اپنی طرف سے بیان نہیں کی ۔ بلکہ میں نے وہ کچھ لکھا جو مجھے دکھایا گیا ہے اور جسے آیاتِ قرآنی
اور احادیث نبویؐ کی سندات سے مستند کیا گیا ہے ۔ میں تو آئینے کے اس طرف بٹھائے جانے
والی طوطی کی مانند ہوں ۔ جو کچھ استادِ ازل نے کہا میں نے وہی دُہرا دیا ۔ میں حضرت خواجہ حافظ شیرازی
کا یہ حسب حال شعر اس مطلب کی وضاحت کے لیے لایا ہوں ۔ بعض لوگ جو اس شعر کے سلسلے میں یہ سوال
کرتے ہیں کہ طوطی کو تو آئینے کے سامنے رکھتے ہیں، اور سکھانے والا استاد آئینے کے پیچھے بیٹھتا ہے
حافظ نے خود کو طوطی سے مثال دی ہے، لیکن اپنے آپ کو اس کے پیچھے لکھا ہے ۔ تو یہ بات کیسے
درست ہو سکتی ہے ۔ ان کا یہ اعتراض شعر کے صحیح مطلب کو نہ سمجھ سکنے کی وجہ سے ہے ۔ کیونکہ
کلمۂ "پس" کا مطلب حافظ کے نزدیک آئینے کی ایک طرف سے ہے ۔ گویا پیچھے کے لحاظ سے
نہیں ۔ جس طرح طوطی کے اعتبار سے استاد پس آئینہ ہے ۔ یعنی کہ آئینے کے اس طرف ؛ اسی طرح
استاد کے اعتبار سے طوطی بھی پس آئینہ ہے ۔ وہ بھی آئینے کی ایک طرف سے عبارت ہے ۔ قصّہ
کوتاہ یہ کہ یہاں میری مراد بھی یہی ہے، کہ جس طرح اُستاد آئینے کی ایک طرف بیٹھتا ہے اور طوطی کو
آئینے کی دوسری طرف رکھتا ہے اور خود باتیں کرنے لگتا ہے تاکہ طوطی آئینے میں اپنی ہی شکل کو دیکھ کر

یہ سمجھے کہ وہ دوسری طوطی ہے، اور جو کچھ استاد کہتا ہے اس کو طوطی کی آواز سمجھ کر اپنی ہی جنس سے سیکھتی ہے اور خود بھی وہی بات دہراتی ہے، اور جو کچھ اُستاد نے سکھایا وہی بیان کرتی ہے۔ اسی طرح بلا تشبیہ میرا یہ صاف و شفاف قلب جو شیشے کی طرح صاف اور دنیاوی نقوش کے زنگ سے پاک ہے۔ اس کے اس طرف سے اللہ تعالیٰ حقایق و معارف القاء فرماتا ہے، اور میرے اربعہ عناصر کے اس وجود کو طوطی کی طرح استاد ازل کے آئینے کے سامنے رکھ دیا ہے۔ اس شیشے میں گویا اپنی حقیقت کو دیکھتا ہے اور واقعاً آوازِ حق کو سنتا ہے، اور جو کچھ حق تعالیٰ فرماتا ہے وہی بیان کرتا ہے۔ عنایت لم یزلی سے اللہ کے اس شاگرد کا بیان باطنی طور پہ سراسر حق تعالیٰ کے ارادے کے مطابق ہے، اور ظاہراً بھی کلام الٰہی، آیاتِ قرآنی اور احادیثِ نبوی کے مطابق ہے، اور حضور پاک (ان پہ خدا کا درود و سلام ہو) کے صدقے کبھی ایسا کشف نہیں ہوا جو کتاب و سنت کے خلاف ہو۔ اللہ حفاظت کرے ہماری اپنی حفاظت کے ساتھ، اور بچائے ہمیں اپنی عصمت کے ساتھ، اور ہمیں بھی اپنے ساتھ اُڑھائے اپنی سرداری کی چادر، اور مشرف کرے اپنی شریعت کے شرف کے ساتھ۔ پس ہر قسم کی تعریف اللہ کے لیے ہے جس نے بنایا ہمیں اپنے مخلص محفوظ لوگوں میں سے، اور سید المرسلینؐ کی آل میں سے جو اللہ کی مخلوق میں سے بہترین ہیں، اور ان کی تمام آل میں سے۔ اور حقیقت حال اللہ ہی جانتا ہے۔ میں نے یہ مشہور جملہ کسی شک و تردد کی وجہ سے نہیں لکھا، جیسے کہ دوسروں کا طریقہ ہے بلکہ مذکورہ بالا سچے مقولوں کے یقین و ثبوت کے لیے لکھا ہے۔ حال کے ساتھ قال کی حقیقت کا بھی وہی گواہ ہے۔ فیض ربانی سے جو کچھ میرے دل پہ القا ہوتا ہے۔ وہ آیات قرآنی سے مستند ہوتا ہے۔ میں نے اپنی طرف سے کچھ نہیں لکھا، اور اسی لیے میں نے کہا کہ اللہ حقیقت حال کو سب سے بہتر جانتا ہے اور جو کچھ اس نے مجھ سے لکھوایا ہے۔ وہ دوسروں کی تحقیقات کی نسبت زیادہ صحیح اور حق ہے۔ قصہ کوتاہ یہ کہ پچھلے مطلب کی طرف رجوع کرنا چاہیے، اور حقیقت کے چہرے سے پردہ اُٹھانا چاہیے۔ کیونکہ اس کے سارے کاروبار فقط اسی سے ہیں۔ اس کے معاملات میں اس کا کوئی شریک نہیں۔ رباعی

آں ذاتِ غیور یار با خویشتن ست

وآں آئینہ رو دوچار با خویشتن ست

گنجائش غیر در حریمش نبود!
اورا ہمہ کاروبار باخویشتن ست

ترجمہ رباعی: وہ غیور ذات خود ہی اپنی یار دوست ہے۔ وہ آئینہ خود اپنے آپ ہی کے بالمقابل ہے۔ اس کے حریم ناز میں غیر کی سمائی کہاں؟ اس کا کاروبار اور سروکار خود اپنے آپ ہی سے ہے۔ (مصنف کی اپنی وضاحت کے مطابق) ذات غیور سے مراد مرتبۂ احدیت حق وحدہٗ لا شریک وجل جلالہ سے ہے۔ اس کی غیرت نے دُنیا بھر میں غیر کو نہ چھوڑا۔ غیرت کا اطلاق ذات باری تعالیٰ کے لیے ہے۔ کیونکہ غیرتِ حق مشہور ہے، اور حدیث شریف میں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم سے زیادہ غیرت مند ہے۔ اور آئینہ روئی سے مراد اس صاحب علم کی علم سمیت ذات ہے جو اس کی علمی صورتوں کے ظہور کا مرتبہ ہے۔ دوچار ہونے سے مُراد باطن وجود کا ظاہر وجود اور غیر عدم سے مقابلے سے ہے۔ اس کے حریم سے مراد وجوبِ واجب تعالیٰ ہے۔ اور کاروبار سے مراد اسمائے حسنیٰ اور ان کی صفات کے کمالات کے اظہار سے ہے، اور سارے مجموعے کا مطلب یہ ہے کہ اُس وحدہٗ لاشریک کا مرتبۂ احدیت اپنی یگانگت کی غیرت کے تقاضے سے کسی بیگانے کو جو اس سے مغائرت رکھتا ہو وجود میں نہیں لایا۔ اس ذات نے اپنے علم سمیت اپنی علمی صورتوں کا اظہار علمی آئینے میں کیا۔ اور ان صورتوں نے مرتبۂ خارج میں آئینہ داری کی وجہ سے نمود پائی اور مقابلہ وجود کے ظاہری اور باطنی مرتبے میں ہے۔ وجوب واجب جو موجود مطلق ہے۔ اس کے حریم میں غیر وجود کی گنجائش نہیں، کیونکہ وہ عدم ہے۔ پس اسمائے حسنیٰ اور ان کی صفات کے کمالات کے اظہار کا کاروبار اُسے اپنی ذات ہی سے ہے۔ کیونکہ وہ واحد ہے اس کا کوئی شریک نہیں۔

ھُوالنّاصح

شروع اللہ کے نام سے جو نہایت مہربان اور بڑا رحم کرنے والا ہے

ہر قسم کی تعریف اللہ تعالیٰ کے لیے ہے۔ جس نے مجھے بنایا۔ پس وہی ہدایت دیتا ہے۔ وہی ہے، جو مجھے کھلاتا پلاتا ہے۔ اگر میں مریض ہوتا ہوں تو مجھے شفا دیتا ہے۔ وہی ہے جو مجھے مارے گا پھر زندہ کرے گا۔ وہی ذات ہے جس سے میں اُمید کرتا ہوں کہ بخش دے گی مجھے میری خطائیں قیامت کے دن۔ اے اللہ مجھے حکم عطا فرما اور مجھے نیکوں کے ساتھ، اور بنا دے مجھے سچائی کی زبان آخرین میں اور بنا مجھے نعمتوں والی جنت کے وارثوں میں سے، اور درود و سلام ہو سید المرسلین، خاتم النبیینؐ پر۔ اور آپ کی آلؓ اور تمام اصحاب پر۔ پس یہ چھتیسواں باب ہے، اور اس کا نام شفاءُ اللناس ہے۔ الشفا جو ہے وہ شفا القلب ہے۔ اور مرض، مرض القلب، جیسے عیش جو ہے وہ عیش آخرت ہے اور عذاب، عذاب آخرت ہے۔ جب غافل لوگوں کے دلوں میں واقع ہوا فانی اعتبارات سے تعلق کا مرض جسے کہ تعبیر کیا گیا ہے دُنیا و ما فیہا سے مادہ وہمیہ کے غلبے کے ساتھ، اور اُس کا تجاوز کرنا حد طبعی سے اور صحتِ عقلی ان سے زائل ہوگئی۔ پس اللہ نے بھیجا پیغمبروں کو جو دلوں کے اطبّا ہیں (ان پر درود و سلام) ان کی صحت کی حفاظت کے لیے اور اُنھیں سکھانے کے لیے ادویات و علاجات اوامر و مناہی سے، اور اُنھیں دکھائیں چیزوں کی حقائق جیسی کہ وہ ہیں، اور اصلاح کرنے والے ہیں معاش کی اور معاد کی، اور تہذیب کرنے والے ہیں بندوں کے اخلاق کی، اور بیماری اور دوا کی حقیقت کو جاننے والے ہیں، اور واقف

ہیں بیماری کی علت کی کیفیت سے اور شفا کے سبب سے، اور جانتے ہیں زیادتی کا طریقہ ناقص چیز میں جو فساد کا سبب ہوتی ہے۔ اور جانتے ہیں تنقیص کے نہج میں زائد میں جو خلل کا مورث ہوتا ہے یہاں تک کہ صلاح اور اعتدال درست ہو جاتے ہیں، جیسے طبیب جسمانی عالم ہوتا ہے بیماری اور دوا کا، اور جانتا ہے انسانی جسم میں بیماری کے داخل ہونے کی علت کو مقدار میں حد طبعی سے اخلاط (خلطوں) میں زیادتی کی وجہ سے یا اس کی کمی کی وجہ سے ——— اور اس کی کیفیت کے تغیر کی وجہ سے، اور وہ جانتا ہے ناقص میں زیادتی کے علاج کا طریقہ اور زائد میں کمی کے علاج کا طریقہ یہاں تک کہ جسم درست ہو جاتا ہے، اور اُسے حاصل ہو جاتی ہے صحت۔ پس اے ایمان والو جو اپنی صحت کی حفاظت کرنے والے ہو، اور اے مسلمانو جو اپنی نجات کی سعادت کے طالب ہو، کرو وہ کچھ جو تم طاقت رکھتے ہو اوامر میں سے، اور اجتناب کرو مناہی سے، اور اللہ نہیں تکلیف دیتا کسی نفس کو مگر اس کی وسعت کی نسبت سے، اور جان لو کہ اطبائے الٰہیہ کبھی کبھی علاج کرتے ہیں لوگوں کا ضد کے ساتھ، جیسے اطبائے یونانیہ، اور کبھی علاج کرتے ہیں بالمثل (اسی سے) جیسے اطبائے ہندیہ۔ پس حکم دینا شارع علیہ السلام کا جہاد کے لیے اللہ کے راستے میں بزدل آدمی کو علاج بالضد ہے، اور بہادر آدمی کو علاج بالمثل ہے۔ برعکس سے منع کیا ہے۔ لیکن علاج بالضد جو ہے، یہ ایک درست راستہ ہے اور ایک مشہور معاملہ ہے، اور ایک مسلوک راستہ ہے، اور ایک مجرب چیز ہے جس میں ضرر کا احتمال نہیں، اور یہ بڑا مضبوط اور قوی الاثر ہے۔ پس تو اگر گہری نگاہ ڈالے اور غور و فکر کرے شرع کے اوامر و مناہی و احکام اور حدود اور ترغیب اور ڈراتے میں، اور وعدے اور وعید اور زجر و تہدید میں تو تو جان لیتا ہے کہ اس میں سے اکثر ایسے افعال کے احکام ہیں جو طبیعت کے منافی ہیں، اور نواہی وہ ہیں جن میں انسانی سرشت میں جو چیزیں موجود ہیں اُن سے روکا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حکم دیا روزے کا، اور کھانے پینے کو ترک کرنے کا شدید بھوک اور پیاس کے وقت اور طہارت کا، سخت سردی اور ٹھنڈک میں اور نماز کے قیام کا اور پاکیزگی اختیار کرنے کا، شہوت کے ہیجان کے وقت اور بردباری کا، غصے کی صورت میں اور خوف کے موقع پہ بہادری کا، اور قدرت ہوتے ہوئے معاف کر دینے کا، اور حکومت کے وقت عدل کرنے کا، اور شدائد (مصیبتوں) کے وقت صبر کرنے کا، اور تقدیرات کی کارروائیوں کے وقت راضی ہونے کا، اور اچھی طرح حوصلہ کرنے کا مصائب کے وقت، اور جد و جہد کرنا اور مستعد ہونا کسل مندی کے

وقت، اور دُنیا میں متمکن ہو جانے پر بھی زُہد کا۔ اور اسی طرح دوسرے جوان افعال، اعمال اور اقوال و اوصاف سے مشابہ ہیں، ایسے ہیں کہ جو جبلت میں ان کے خلاف کیفیت پائی جاتی ہے اور طبیعتوں میں ان کے علاوہ خواہشات اور راحت طلبی اور ناز و نعمت کا حصول اور لذتیں حاصل کرنے کا رجحان پایا جاتا ہے۔ غوث الاعظم نے (اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہو) فتوح الغیب میں لکھا ہے کہ عبادت یہ ہے کہ بندے اپنے نفس اور اپنی خواہش کی مخالفت میں ہوں، اور خیر ساری کی ساری اس کی عداوت ہے۔ اور جان لو کہ دُنیا کے بندوں کے اخلاق جو ہیں وہ ہیں جنھیں طبیعت نے مرکوز کر دیا ہے جبلت میں بغیر کسی کوشش کے ان کی طرف سے، جیسے کہ نفس اور طبیعت کی خواہش ہے۔ پس وہ اسی میں کوشش کرتے ہیں، اور اسی پہ عمل کرتے ہیں، جیسے کہ چوپایوں کی طرح جسموں کے منافع کی طلب میں اور تکلیف دینے والی چیزوں کو اُن سے دُور کرنے کی شکل میں۔ جیسے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ وہ کھاتے ہیں جیسے کہ کھاتے ہیں چوپائے۔ اور آگ ان کے لیے ٹھکانہ ہے۔ اور جہاں تک اپنائے آخرت کے اخلاق کا تعلق ہے۔ پس یہ وہ ہیں جن کا اُنھوں نے اکتساب کیا ہے، اپنی جدوجہد اور سعیٔ پیہم سے شریعت کے حکم کے اتباع کی مناسبت سے، اور عقل کی رہبری سے، اور ہو جاتی ہے یہ ان کی عادت زمانے کی پوری طوالت کے لیے، اور کثرتِ استعمال، اور اُسی پہ اُنھیں ہدیہ دیا جاتا ہے اور ثواب دیا جاتا ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ذکر کیا کہ نہیں ہے کسی انسان کے لیے مگر وہی جو وہ کماتا ہے، اور یہ کہ وہ اپنی کوشش کا ثمر عنقریب دیکھ لے گا۔ پھر اُسے پورا پورا بدلہ دیا جائے گا۔ پس اے خالص محمدیو! اپنے نفسوں کا علاج کرو، اور اپنے درمیان اصلاح کرو ظاہری طور پہ بھی اور باطنی طور پہ بھی شریعتِ مصطفویؐ اور طریقۂ محمدیہ کے مطابق۔ کیونکہ آج سے لے کر قیامت کے دن تک علاج کا نسخہ ایک ہی ہے، اور وہ شریعت کا نسخہ ہے۔ باقی تمام نسخے منسوخ ہو گئے، اور نہیں ہے کسی کے لیے روا (جائز) کہ نسخے کو تبدیل کرے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان کے ذریعے رسالت کو مکمل فرمایا اور وہ سلسلہ ختم ہو گیا۔ سوائے اس کے کہ وہ عارف جو راست رو لوگوں کے تلامذہ ہیں، اُن کے لیے جائز ہے کہ وہ تغیر کر دیں وزن میں اور خوراک کی مقدار میں مریض کے مزاج کی مناسبت سے عباداتِ فاضلہ کی قلت میں سے یا کثرت میں سے اور تجویز کرنا عمل کا ارادے کے ساتھ، اور رخصت کے ساتھ حسبِ اوقات و مقامات جو کہ ایسے ہیں جیسے

فصلیں اور شہر ہوں۔ اور جائز امور کا ارتکاب یا اُن سے روکنا طبیعت کی قوت اور کمزوری کے اعتبار سے، لیکن یہ حکم حرام اور فرائض میں لاگو نہیں ہے۔ کیونکہ حرام جو ہے وہ حرامِ شرعی ہے، اور فرض، فرضِ شرعی ہے۔ جہاں تک یہ اولیاءؒ، صالحین اور مصلح لوگ ہیں۔ یہ نہیں پائے جاتے ہر زمانے میں زیادہ، بلکہ ہوتا ہے ایک ہی شخص اپنے زمانے میں اور مشرف کرتا ہے اللہ تعالیٰ اُسے منفرد مقام کے ساتھ۔ پس یہ عرفا بنی اسرائیل کے انبیاءؑ کی طرح ہیں۔ کیونکہ انبیائے بنی اسرائیلؑ بھی تابع تھے اپنے باپ ابراہیم علیہ السلام کی شریعت کے، اور اُنھوں نے مخالفت نہیں کی ان کی شریعت کی۔ پس اے محمدؐ میں بیان کروں گا عنقریب تمھارے لیے اللہ کی مدد کے ساتھ وہ چیز جو تمھیں فائدہ دے گی زیادہ دُنیا اور آخرت میں، اور میں تمھارے لیے ایک امانت دار نصیحت کرنے والا ہوں۔

ترک اسباب اور ان کی مراعات کے بیان کا باب

دراصل متن میں ترک اسباب کی حقیقت اور اس کو ملحوظِ خاطر رکھنے کے بیان سے ہمارا مقصد قطعی طور پر متوکّل مومنوں کے لیے ہے کہ درویش کو ان دونوں نسبتوں سے کونسی شق اختیار کرنی چاہیے، اور درویشانہ وضع کے شایانِ شان کونسی ہے۔ لیکن چونکہ جزئیات کا ایک ایک کر کے بیان کرنا دشوار ہے اس لیے فقط بیماری میں دوا کے اختیار اور پھر اس کے ترک کرنے کے اظہار پر اکتفا کی گئی ہے، کیونکہ عاقل کے لیے اشارہ ہی کافی ہوتا ہے۔ چونکہ متن میں ظاہری مرض اور دوا کے موقع کا بیان آگیا تھا، کارکنانِ قضا و قدر نے میرے دل میں یہ خیال ڈال دیا کہ اس تذکرے کے دوران شرح میں مرض باطنی اور اُس کے علاج کا بھی تھوڑا بہت ذکر کروں۔ میں اپنے مطلب کا آغاز طبِ باطنی سے کروں، اور اسی مقصد کو اس فن کا مصدر و منبع بتاؤں، اور بدنی طب کے قواعد کے مطابق ہی طبِ نفسی کے مطالب کو ایک نئے اسلوب میں بیان کروں، اور اسباب و علامات، نظریات و عملیات سے امراض کی تشخیص، نسخہ دوا اور غذا کی تجویز اور نبض و قارورہ اور پرہیز کو تفصیل سے سپردِ قلم کروں، تاکہ ہر سالک کو اوصاف، اخلاق، حالات و کیفیات کا معالجہ دریافت کرنے میں سہولت ہو اور وہ آسانی سے سعادت کی صحت حاصل کر سکے۔ اور باطنی صحت کے محافظ قلبی امراض کی حقیقت کو پا سکیں اور اس کے اسباب اور علامات کو پہچان سکیں، اور صالح اور فاسد اخلاط کے فرق کو سمجھ سکیں،

اور اُس کی مادی اور سادہ امراض میں امتیاز کر سکیں۔ اس کی دواؤں اور علاج سے آگاہ ہو سکیں، اور علاج معالجہ میں کوئی غلطی نہ کریں۔ اور مرض کی تشخیص میں کسی غلطی میں نہ پڑیں، اور یوں دُنیا و آخرت میں صلاح و فلاح نصیب ہو سکے اور فوری اور دیرپا شفا اور صحت و سلامتی، خیر و عافیت، سعادت اور نجات نصیب ہو۔ لہٰذا اس شرح اور متن کے مجموعے کا نام شفاء للناس رکھا گیا ہے۔ توفیق اسی سے ہے اور شفا بھی اسی کی طرف سے ہے۔ یہ سمجھ لینا چاہیے کہ ظاہری صحت و مرض کی طرح باطنی صحت و مرض بھی ہوتی ہے۔ تندرست دل اور مریض دل بھی ہوتا ہے۔ اس مرض میں کافر و فاسق و فاجر لوگ مبتلا ہوتے ہیں جیسا کہ قرآن شریف میں ہے کہ ان کے دل مریض ہوتے ہیں۔ اللہ ان کے مرض کو بڑھا دیتا ہے، اور مومن، صالح اور متقی لوگ صحیح سالم و تندرست ہوتے ہیں جیسا کہ خود خدا تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ وہاں اس کی نجات ہوگی جو اللہ کے پاس (کفر و شرک سے) پاک دل لے کر آئے گا۔ پیدائش کے وقت تو سبھی صحت کی حالت میں پیدا ہوتے ہیں۔ کیونکہ ہر پیدا ہونے والا بچہ فطرتِ اسلام پہ پیدا ہوتا ہے۔ پھر اس کے بعد مختلف اسباب کے تحت اُنھیں طرح طرح کے امراض جیسے کفر، نفاق اور بداخلاقی وغیرہ لاحق ہو جاتے ہیں۔ بعض کو ہلاک ہی کر دیتے ہیں۔ بعض جن کے نصیب میں ہو اُنھیں شفا بھی ہو جاتی ہے۔ انبیاءؑ و اولیائے کرام جو خدائی طبیب ہوتے ہیں، بندوں کی حفظانِ صحت کی کوشش کرتے ہیں جیسا کہ قرآن پاک میں آیا ہے، کہ کہہ دو اے نبیؑ کہ میں تم سے کوئی صلہ نہیں مانگتا، میرا صلہ تو میرے رب کے ذمّے ہے۔ یہ سمجھ لو کہ جس طرح بدنی مرض کی دو قسمیں ہیں، ایک مادی اخلاط کی کیفیت جو مقدار کے تغیرّ و تبدل کے باعث ہو، جیسے مادی تپش اور دوسری قسم سادہ جو خارجی امور کے سبب سے پیدا ہو۔ جیسے زیادہ حرکت کرنے یا دھوپ میں بیٹھنے سے حرارت لاحق ہو جاتی ہے۔ اسی طرح قلبی امراض بھی دو قسم کی ہیں، ایک نفسی (ذاتی) یعنی بُرے اخلاق پیدائش ہی سے موجود ہوتے ہیں۔ جیسے سرد مزاجوں میں حماقت اور خشک مزاجوں میں بخل۔ دوسری قسم عارضی ہے، جو بُری صحبت اور بُرے کاموں میں کثرت سے مشغول رہنے سے پیدا ہوتی ہے۔ جیسے جوُا بازوں میں چوری اور دغابازی اور فاسقوں میں کھیل تماشا (جو اُنھیں نیک کاموں سے روکے) ایسے اخلاق کو پوری جدوجہد اور سعیٔ کامل سے سنوارا جا سکتا ہے۔ مکمل طور پہ رفع کرنا ممکن نہیں، جیسا کہ خدا نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اس پیدا کی ہوئی چیز کو جس پہ اُس نے تمام آدمیوں کو پیدا کیا ہے، بدلنا نہ چاہیئے۔ پس

یہی کچھ ہو سکتا ہے کہ مرض میں افاقہ ہو جائے اور بڑھنے نہ پائے اور ہلاک نہ کر دے۔ اس کے مواقع بدلتے رہتے ہیں۔ مثلاً اگر کسی شخص میں ذاتی بُخل ہو، اور محض بخل کی بنا پر مال جمع کرے۔ جب سدھر جائے گا تو مال کو نیک نیت سے جوڑے گا، تاکہ وہ اسراف کرنے والوں میں شمار نہ ہو۔ اور کسی حد تک اللہ کی راہ میں بھی خرچ کرے گا۔ یعنی شرعی احکام کے بموجب زکوٰۃ ادا کرے گا۔ صدقہ دے گا، اور مستحقین میں کچھ نہ کچھ بانٹے گا۔ اور اگر وہ پیدائشی اسراف کرنے والا ہو تو مہذب بن کر وہ ایثار و قربانی کی نیت سے خرچ کرے گا، اور جو کچھ ہاتھ لگتا ہے خدا کی راہ میں صرف کر دیتا ہے اور علیٰ ہذا القیاس۔ تمام فطری اوصاف تغیر پذیر ہو کر اپنے مصارف کے سلسلے میں ایک قسم کی نقل مکانی ہی کرتے ہیں، اور درحقیقت اپنی اسی خالص یاد میں رہتے ہیں۔ لیکن نجات کے لیے یہی کچھ کافی ہے۔ عارضی مرض والوں کا اخلاق تھوڑی بہت کوشش سے سدھر جاتا ہے۔ آسانی سے زائل ہو سکتا ہے۔ بُری عادات اور بُری صحبت کو ترک کرنے میں تھوڑی بہت جدوجہد کرنی چاہیے۔ کچھ تھوڑی بہت آزمائش اور عبرت سے تنبیہ ہو جاتی ہے۔ یاد رکھو کہ گرم مزاج انسانوں میں اکثر بڑے شیر دل، دلیر اور دریا دل سخی ہوتے ہیں، اور ان میں زیادہ تر تو خوفناک امور میں بڑے دلیر، کاموں میں کم پائیدار تاخیر پسند، حرکت میں عجلت پسند، غیظ و غضب میں انتہا پسند ہوتے ہیں۔ ان کی حرکت میں تیزی، غیظ و غضب میں شدت، مراجعت میں سرعت، بغض و کینہ کی کمی و قلت ہوتی ہے۔ تیز فہم، تیز طبع، صحیح الخیال اور کھرے و خالص ہوتے ہیں۔ سرد مزاجوں کی اکثریت کند ذہن، غلیظ الطبع اور ناخوشگوار قسم کے لوگوں کی ہوتی ہے۔ مرطوب مزاجوں میں زیادہ تر نرم طبع، نرم دل، خوش اخلاق، خوش اختلاط، زود پذیر و زود فراموش ہوتے ہیں۔ خشک مزاج اپنے کاموں میں صابر، رائے میں ثابت ہوتے ہیں، اور بات کو مشکل ہی سے قبول کرتے ہیں۔ ان کی طبائع میں بغض و کینہ، بخل و امساک اور تحفظ ہوتا ہے۔ سارے اخلاق، اوصاف اور خصائل اخلاط کی کیفیات و خصوصیات میں اثر انداز ہوتے ہیں۔ پس ان میں صبر و عزم، مٹی کے اثر کی وجہ سے ہوتا ہے۔ فراموشی اور نرمی پانی کے اثر کی بنا پر، تندی و تیزی آگ کے اثر سے، اور لطافت و سبکی ہوا کے اثر سے ہوتی ہے۔ پس جب خشکی غالب آجائے تو وہ عزم و صبر کو بے رحمی، سنگدلی اور تند خوئی میں بدل دیتی ہے۔ رطوبت غالب آجائے تو وہ نرمی کو سستی و خواری میں بدل

دیتی ہے ۔ گرمی غالب آجائے تو وہ تیزی و تندی کو طیش میں بدل دیتی ہے ۔ برودت (سردی) غالب آجائے تو وہ ذکاوت کو کند ذہنی میں بدل دیتی ہے ۔ ان سب کے اعتدال سے اخلاق میں اعتدال اور اچھے اوصاف کی جامعیت میں استقامت پیدا ہوتی ہے جس سے عین عزم کی حالت میں ذکاوت، عین نرمی میں عزم، عین متانت میں تندی و تیزی بھی حاصل ہوتی ہے ۔ اخلاق میں سے خُلق کی کوئی شق غالب آنے نہیں پاتی، اور نہ ہی حدِ اعتدال سے بڑھتی ہے، اور نہ ہی حدِ اوسط سے تجاوز کرتی ہے ۔ ایسے معتدل اخلاق والا عارف جس میں چاہے کچھ بڑھا لیتا ہے، اور جتنا گھٹانا چاہے گھٹا سکتا ہے اور ہمیشہ معاملات میں عدل ہی کو ملحوظِ خاطر رکھتا ہے ۔ نفس اور رُوح کے خواص کی الگ الگ پہچان کرتا ہے ۔ بنی نوعِ انسان کے نفسانی کاموں میں دیکھنا، سننا، سونگھنا، چکھنا، چھونا، محسوس کرنا کھانا، پینا، سونا، ہنسنا، خوش اور مغموم ہونا ہے ۔ اور روحانی کاموں میں سوچ بچار، سمجھ بُوجھ، درک و ادراک، علم، حیا، پرہیزگاری، سبقت لے جانا اور ناشائستہ کاموں سے منع کرنا اور کرم و شفقت پیدا کرنا ہے ۔ نفس کی علامات میں تیزی و تندی، سبکی، شہوت، کھیل تماشا، ہنسی مذاق فرومائیگی، حماقت، دغابازی، سختی و غصّہ اور لاچاری و مجبوری ہیں، اور روحانی علامات عبارت ہیں حلم، وقار، پاکدامنی، حیا، زیبائی، مہربانی، صدق، نرمی، ملائمت اور صبر سے ۔ پس اگر بُرے اخلاق میں سے کوئی خُلق غالب آجائے تو اُس کا علاج اس کی ضد یعنی اخلاقِ حمیدہ سے کرنا چاہیے ۔ یعنی تندی و تیزی کا علاج حلم ہے، ہلکے پن اور سبکی کا وقار، شہوت کا پاکدامنی، تماش بینی کا حیا اور کھیل تماشے کا اس کی ممانعت، ہنسی مذاق کا فہم و دانش اور حماقت کا کرم، دغا و فریب کا صدق، سختی کا نرمی و ملائمت اور تیزی و تندی کا صبر و حلم ہے ۔ چونکہ ہر بدنی مرض کا علاج اس کی ضد سے کیا جاتا ہے اور ظاہری صحت کی حفاظت کی جاتی ہے، مثال کے طور پر جب خاکی اخلاقِ غالب آجائیں، تو اُن کا آبی اخلاق سے علاج کرنا چاہیے، سختی کا علاج نرمی سے، بخل کا عطا و بخشش سے، اور اصرار کا اُس کے ترک کرنے سے، اور اسی طرح دوسرے اخلاق کا علاج قیاس کر لو ۔ یاد رکھو کہ ظاہری اخلاط کی طرح باطن میں بھی چار باطنی اخلاط ہیں ۔ پہلی علم کی خلط، یہ سب اخلاط کی مرکب اور بہترین، اور روحِ انسانی کے لیے مناسب ترین ہے ۔ جیسا کہ خون جو گرم مرطوب ہے اور حیوانی روح کا مزاج رکھتا ہے ۔ دوسرے غیظ و غضب جو وحشیانہ نفس سے مناسبت رکھتا ہے ۔ جیسے صفرا جو گرم خشک ہے

اور گرم مرضوں کا باعث بنتا ہے۔ تیسرے شہوت جو چوپایوں کے نفس سے مناسبت رکھتی ہے جیسے بلغم جو سرد مرطوب ہے۔ اور سردی سے پیدا ہونے والے امراض کا موجب تھے۔ وہم جو نفس شیطانی سے مناسبت رکھتا ہے، جیسے سودا جو سرد خشک ہے، اور وسواسی امراض کا مورث ہوتا ہے۔ بدن کی ظاہری چار اخلاط کی طرح ان باطنی چار اخلاط کا ہونا بھی نہایت لازمی اور ضروری ہے۔ کیونکہ ان کے بغیر دنیاوی زندگی یا اُخروی نجات کا تصوّر ہی نہیں کیا جا سکتا۔ پس ان میں سے کسی ایک کو مکمل طور پر زائل کر دینے کا ارادہ سراسر غلطی اور حماقت ہے۔ آثار و علامات کی کیفیت و مقدار میں یعنی بشری لوازمات کے گھٹانے کا ارادہ محض جہالت و کم علمی ہے۔ مثال کے طور پر عقلی قوت کے ساتھ وہمی مادے یا قوّت کا معتدل اشتراک لازمی و ضروری ہے۔ کیونکہ اگر وہمی قوت کلی طور پر زائل ہو جائے تو پھر دُنیا اور آخرت کی صلاح ممکن نہیں، اور انسان ابدی ہلاکت کے گڑھے میں جا گرتا ہے۔ لہٰذا دلوں میں قوت وہم کی زیادتی اور اُس کے حدِ اعتدال سے تجاوز کرنے سے حُبِ دُنیا پیدا ہوتی ہے، اور قوتِ وہم کے معتدل ہونے سے حُبِ آخرت پیدا ہوتی ہے۔ وہم کا قطعی زوال محال ہے۔ کیونکہ انسان میں اس قوت کو بھی اسی حکیم مطلق نے اپنی حکمت بالغہ سے پیدا کیا ہے اور حکیم (دانا) کا کوئی کام حکمت سے خالی نہیں ہوتا، اور اللہ تعالیٰ سب سے بڑا صاحب علم اور حکمت والا ہے۔ اور اسی طرح غضبانی، شہوانی اور علمی قوتوں کے متعلق قیاس کر لو۔ ان اخلاط کا اپنی قدرتی حد تک اعتدال انسانی صلاحیتوں کے لیے تقویت بخش اور نیکی و نیک نیتی کا موجب ہے۔ اور ان کی مقدار میں کمی بیشی (حدِ اعتدال سے تجاوز کرنے سے) اور کیفیت کے بدل جانے سے فسق کا مرض لاحق ہوتا ہے جو انسانی موت و ہلاکت کا باعث بنتا ہے۔ مثال کے طور پر علمی قوت کے معتدل ہونے سے صحیح دریافت، حقیقت کا صحیح ادراک، ایمان و اطمینان، مشاہدۂ ذات الٰہی، اللہ سے روحانی نسبت، امر حق پر پختہ یقین، شریعت کی حقیقت تک رسائی اور ایسے ہی دیگر کمالات حاصل ہوتے ہیں جو علمی قوت سے تعلق رکھتے ہیں۔ اسی قوت کے افراط (بیشی و زیادتی) سے جو اک عیب ہے، اور جس کی تعبیر یوں ہے کہ انسان بے فائدہ امور کی دریافت، بے اصل اور غلط مقدمات کی ترتیب اور اُمور پہ غور و خوض میں پوری توجہ مرکوز کرتا ہے، جن کے فہم و ادراک سے انسانی عقل عاجز ہے، اور اسی قسم کے زائد از ضرورت اور ضرر رساں کاموں میں لگ جاتا ہے۔ اور اگر اس قوت میں تفریط (کمی) کے باعث انسان حدِ اعتدال

سے پیچھے رہ جائے تو وہ بھی اک نقص ہے جس کا نام حماقت ہے، اور انسان حقیقت دریافت کرنے سے محروم رہ جاتا ہے، اور اسے حصے میں کفر، اضطرار، باطل عقیدہ، شریعت سے انحراف اور ایسے دیگر احمقانہ امور ملتے ہیں۔ اور علمی کیفیت میں تغیر و تبدل سے رکاوٹوں، اوقات کے اختلاف، تردّد و تذبذب، گاہے انکاری اور گاہے اقراری کیفیت، اور سمجھے، اور ان سمجھے امور میں یکسانیت کی بنا پر عقیدے میں اختلاف پیدا ہو جاتا ہے۔ غضبانی قوت کے اعتدال سے حمیت، غیرت، شجاعت، ہمت، بلا کشی اور اسی طرح کے دیگر اوصاف حمیدہ جن کا تعلق استقامت اور غنا سے ہوتا ہے، پیدا ہوتے ہیں، اور اس کی زیادتی سے جسے تہوّر کہتے ہیں، زود رنجی، تکبّر، غرور، سرکشی، خودسری اور شدت غضب سے متعلق دیگر خواص پیدا ہوتے ہیں۔ اور اس کی تفریط (کمی) سے بزدلی، بداعتقادی، بے غیرتی، نامردی اور اسی طرح کے دیگر خصائل پیدا ہوتے ہیں جن کا تعلق بزدلی سے ہوتا ہے۔ اس کی کیفیت بدلنے سے انسان متلون مزاج، غیر مستقل مزاج، نفس پرست بن کر ہوا و ہوس اور جسمانی شہوات اور ایسی ہی دیگر جسمانی لذات کا متوالا ہو جاتا ہے۔ شہوانی قوت کے معتدل ہونے میں پاک دامنی، قناعت، تحمل بردباری، حیا و مروت اور قوتِ اعتدال سے تعلق رکھنے والے دیگر اوصاف پیدا ہوتے ہیں۔ اسی قوت کی افراط (بیشی) سے فسق و فجور، لالچ، بے صبری، رنگارنگی، بے مروتی، بے حیائی، اور اس قوت سے تعلق رکھنے والے ایسے ہی دیگر اوصاف پیدا ہوتے ہیں۔ اس قوت کی تفریط (کمی) سے بے عشقی، بے محبتی، بے انسی، بے شوقی، بے کاری، اور اسی تفریط سے متعلقہ ایسے ہی دیگر خواص پیدا ہوتے ہیں، اور اس قوت کی کیفیت کے ادل بدل سے حرص و لالچ، انتہائی ظاہر آرائی، لغوپن اور اس سے متعلق دیگر ایسی خصوصیات پیدا ہو جاتی ہیں۔ قوت واہم کے اعتدال سے بے خوفی، بے غمی، ماسوی سے بے تعلقی، خوفِ خدا، دائمی حزن و فکر اور حق تعالیٰ سے قوی تعلق اور اعتدال سے متعلق اسی قسم کے دیگر کمالات پیدا ہوتے ہیں۔ اس کی زیادتی سے دنیوی الجھاؤ، خواہشات کا طول، مفلسی کا خوف، فقر و فاقہ سے ڈر، اور اس قوت سے متعلقہ ایسے ہی دیگر امور پیدا ہوتے ہیں۔ اس کی تفریط (کمی) سے عذاب آخرت سے بے خوفی، خدا اور رسولؐ سے نہ ڈرنے، ملحدانہ بود و باش اختیار کرنے، کاموں کے انجام پہ نگاہ نہ رکھنے اور اس سے تعلق رکھنے والی دیگر خصوصیات پیدا ہوتی ہیں۔ اس کیفیت کے تغیر و تبدل سے وسوسوں کی کثرت، نفسانی خیالات، فاسد اوہام، اور باطل امور کی طرف رجحان، وقت کے ضائع کرنے کی طرف

جھکاؤ۔ اور ایسے ہی دیگر اوصاف جنم لیتے ہیں۔ غرضیکہ تمام خصائل میں اصلاح اعتدال کو ملحوظ خاطر رکھنا چاہیے، اور تمام صفات میں بگاڑ یا خلل ڈالنے والی قوتوں کے ازالہ پہ ہمت صرف کرنی چاہیے۔ جیساکہ حضور سرورِ کائنات ؐ نے فرمایا ہے کہ ظرف کی آفت اس کا خالی ہونا ہے۔ اور بہادری کی آفت بغاوت ہے۔ اور سخاوت کی آفت احسان جتانا ہے، اور خوبصورتی کی آفت تکبّر اور غرور ہے، اور عبادت کی آفت سستی و کوتاہی، اور بات کی آفت جھوٹ ہے، اور علم کی آفت بھول جانا ہے، اور بردباری کی آفت حماقت ہے۔ اور حسب نسب کی آفت غرور و فخر ہے، اور سخاوت کی آفت اسراف (فضول خرچی) ہے۔ یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ وہ عبادتیں اور فریضے جن کی بجا آوری شرعی احکام کے مطابق فرض اور واجب ہے، جیسے پنجگانہ نمازیں، نماز وتر، رمضان کے روزے وغیرہ بمنزلہ غذا کے ہیں۔ جن سے انسانی روح غذائیت حاصل کرتی ہے اور ترقی کے مراتب بڑھتے ہیں۔ انھیں کبھی ترک نہیں کرنا چاہیے۔ ان کے اوقات میں تبدیلی یا کمی بیشی کی اپنی طرف سے کوئی تجویز نہیں کرنی چاہیے۔ وہ تو صاحب شریعت کی تجویز پہ موقوف ہیں۔ جیسے کہ حضور ؐ نے سفر میں نماز قصر اور حج کے دن عرفات میں ظہر و عصر کو ملا کر پڑھنے کی اجازت دی ہے۔ اگر مریض یا مسافر ہو تو رمضان کے روزوں کو قضا کر کے دیگر ایام میں رکھنا بھی جائز ہے۔ شرع کا حکم ایسے ہی ہے، جیسے کہ ہیضے میں غذا نہ کھانا یا بیماری کی صورت میں غذا کا کم کر دینا ہے، یا ایک ہی وقت کھانے پہ اکتفا کرنا ہے۔ لیکن ان مقررہ اوقات کے سوا اس غذا کی مقدار میں خلل ڈالنا روا نہیں، مگر ایسی کیفیت میں جب دل جمعی نصیب ہو اور فراغت بھی حاصل ہو قرآن شریف کی تلاوت کو طول دیا جا سکتا ہے، اور رکوع و سجود کو بڑے سکون و اطمینان سے، اور نماز کو خشوع و خضوع اور حضور قلب سے ادا کرنا چاہیے۔ اور اگر ایسا کام آن پڑے کہ نماز کے فوت ہونے کا اندیشہ ہو یا وقت ہاتھ سے نکلا جا رہا ہو تو جلدی میں اتنی قرأت کی جا سکتی ہے جس سے نماز درست رہے، اور اسی طرح دیگر امور میں حالات کے مناسب عمل کرنا چاہیے، اور جن چیزوں کو شریعت نے قطعاً حرام قرار دیا جیسے کہ شراب، جوا بازی وغیرہ۔ وہ زہر ہلاہل کی طرح ہیں جو ہر انسان کو ہلاک کر دیتا ہے، اور سعادت و نیک بختی کے خلاف ہے اور جو چیزیں شرعی لحاظ سے مکروہ ہیں۔ وہ اعضا کو سُن کر دینے والی اشیا کی طرح ضرر رساں ہیں۔ وہ انسانی ذہن و فہم کو سُن کر دیتی ہیں، اور قوت ادراک کی تیزی کو نقصان پہنچاتی ہیں۔ اور جو کچھ شرعی طور پہ

مباح ہے ، وہ پھلوں اور سبزی ترکاریوں کی مانند ہیں ، جو بعض اوقات فائدہ پہنچاتی ہیں اور بعض اوقات نقصان دہ ہوجاتی ہیں ، اور مسنون نفلی عبادتیں اور آنحضرتؐ سے منقول دعائیں دواؤں کی غذا کی مانند ہیں ۔ وہ ذکر اذکار اور اوراد و وظائف جن کا استنباط اور استخراج قرآن وحدیثؐ ہوتا اور جنھیں واضح اشارہ یا دلالت سے لزوم حاصل ہو، اور خاصا فائدہ پہنچاتی ہوں ، اور بزرگان دین میں مروج رہی ہوں ، اور اکابر دین کا شیوہ ، وہ بالکل غذائی دواؤں کی طرح ہیں ۔ اور اگلے پچھلے بزرگوں کے ایجاد کردہ افعال و اعمال جو سالکانِ راہ کے لیے نفع بخش ہیں ، اور خلاف شرع بھی نہیں ہیں ۔ وہ مطلق دوا کی طرح ہیں جن میں غذائیت نہیں ہوتی ۔ نفلی عبادات میں نماز تہجد خاص طور پر باطن کو تقویت بخشتی ہے اور اللہ تعالیٰ سے ایسی نسبت پیدا کرتی ہے جو ہر وقت اور ہر مقام میں ہر خاص و عام کی قوتِ مشاہدہ کے لیے مفید ہے ۔

نبض و قارورہ کے بیان کا باب

انسانی مزاج کی کیفیت دریافت کرنے کے لیے وجوہات و ثبوت بمنزلہ قارورہ کے ہیں ۔ اور قول و فعل بمنزلہ نبض کے ۔ جس سے اُس کے باطن کی ساری حقیقت آشکارا ہوجاتی ہے ۔ اور کسی شخص کی وضع قطع اور صحبت بمنزلہ چہرے مہرے اور رنگ و روپ کے ہیں ، ان سے بھی حقیقت کا پتہ چل جاتا ہے ۔ اور نبض کی سُستی ، تیزی اور اُبھار اور اُتار مثل رنگ روپ کے ہے جس سے ہر شخص کی طاقت ، توانائی اور قدر و منزلت دیکھ کر اس کی صحت یا بیماری کا فیصلہ اس کے حال کے مطابق کرنا چاہیے ۔ لہذا اقوال بمنزلہ قارورہ کے ہیں ۔ کیونکہ بات چیت کے ڈھنگ سے باطن کی حقیقت معلوم ہوجاتی ہے ، اور پست کلمات تلچھٹ کی طرح ہیں ، اور اعلیٰ اور ادنیٰ کے بین بین باتیں لٹک رہنے والی (معلّق) چیزوں کی طرح اور بے فائدہ بلند کلمات پیشاب کے اوپر والی جھاگ کی طرح ہیں ۔ افعال بمنزلہ نبض کے ہیں ، جن سے ہر شخص کی حقیقت ظاہر ہوجاتی ہے ۔ نبض کی قسمیں جو آدمی شرعی آداب پہ قائم رہے اس کی نبض منتظم ہے ، جو سستی اور کاہلی برتتا ہے ، اُس کی نبض غیر منتظم ہے ۔ جس کے احوال مستقیم ہوں ، اور وہ وقت کی پابندی کرتا ہو ، اُس کی نبض عظیم ہے ۔ جو ارادے سے عمل کرتا ہے اس کی نبض میں اُبھار ہے جو کبھی عبادات میں سرگرم ہوجاتا ہے اور کبھی فرضوں کو بھی ترک

کر دیتا ہے۔ اس کی نبض کی حرکت ادلتی بدلتی رہتی ہے، اور جو بے کاری کا عادی ہو، اور اُس کا نفس تعطل کا خوگر ہو جائے۔ اُس کی نبض کی حرکت چیونٹی اور آنتوں کی حرکت کی طرح ہے، اور یہ بڑی ردّی علامات ہیں کیونکہ ایسے ناکارہ، نکمّے اور جاہل خوش بختی کی زندگی نہیں گزار سکتے۔ وہ بدبختی ہی میں مر جاتے ہیں۔ اسی سے قیاس کر لو نبض کی بڑی قسمیں ہیں۔ جس کا ذہن سلیم اور رسا ہو گا وہ اسی سے قیاس کر لے گا۔ قارورہ کی قسمیں باتوں کا رنگ ڈھنگ بمنزلہ قارورہ کے ہے۔ وہ یوں کہ اگر کوئی آدمی ملحدوں کی طرح انکار آمیز اور شبہ دار باتیں کرتا ہے تو وہ بگاڑ اور فساد کی علامت ہے جو بمنزلہ خون کے ہے۔ اور اگر کوئی سخت اور تند باتیں کرتا ہے تو وہ غضبانی قوت کے غلبے کی علامت ہے جو بمنزلہ صفرا کے ہے۔ اور اگر زبان پر اکثر فحش باتیں لاتا ہے، اور ہمیشہ ہنسی مذاق اور شوخی شنگی و بیباکی کی طرف مائل ہوتا ہے، اور لغو و بکواسیات قسم کا کلام کرتا ہے تو یہ شہوانی قوت کے غلبے کی علامت ہے جو بمنزلہ بلغم کے ہے۔ خواہ وہ مباشرت کی شہوت نہ ہو، دوسری شہوتیں ہوں۔ ان کی حقیقت اس کے کلام کے مضامین و مطالب ہی سے کھل جاتی ہے۔ اور اگر اس کی زبان پر ہمیشہ آرزوؤں کے تانتے اور دُنیاوی لالچ کے تذکرے ہوں، اور ایسے ہی دیگر وسوسوں میں مبتلا ہو تو وہ وہمی قوت کے غلبہ کی علامت ہے، جو بمنزلہ سودا کے ہے۔ ہر ایک کا علاج، معالجات کے عنوان تلے لکھا جائے گا۔ ان مذکورہ قواعد پہ عمل کریں، یعنی حفظان صحت کو مدِّنظر اور پاسِ شریعت کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے جو مناسب سمجھیں کریں۔ کیونکہ یہ بڑا تیر بہدف علاج ہے۔ اس علاج میں کوئی خامی نہیں، یقیناً نفع بخش ہو گا۔ ضرر کا کوئی احتمال نہیں۔ کسی کی اگر اجل ہی آن پہنچی ہو تو الگ بات ہے۔ اس کے حق میں بھی یہ علاج مہلک ثابت نہ ہو گا۔ زندگی اور موت طبیب کے اختیار میں نہیں۔ طبیب تو فقط طبیعت کا خدمتگزار ہے۔ شفا تو اُس شافیٔ مطلق کے ہاتھ میں ہے۔ جیسا کہ اس آیت کریمہ میں ہے، کہ تم جسے پسند کرو اسے ہدایت نہیں دے سکتے، لیکن اللہ جسے چاہتا ہے ہدایت دے دیتا ہے۔ اگرچہ قرآن پاک شفا کے نسخوں سے بھرا پڑا ہے۔ جیسا کہ خود فرمانِ الٰہی ہے کہ ہم قرآن میں ایسی چیزیں نازل کرتے ہیں کہ وہ ایمان والوں کے حق میں شفا اور رحمت ہیں لیکن شقی القلب لوگوں کو اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ جیسا کہ پچھلی آیت کے تسلسل میں ہے، کہ ناانصافوں کو اس سے اور اُلٹا نقصان بڑھتا ہے۔ **علاج معالجے** اگر علمی قوت میں جو بمنزلہ خون کے ہے۔ تھوڑی بہت خرابی ہو تو کیفیت میں تغیر و تبدل سے اُس کا تصفیہ کرنا چاہیے۔ امور حقہ کو پڑھا، سکھا کر یا سمجھا، بجھا

کر، جیسے اہم شہد یا شہترے سے خون کا تصفیہ کرتے ہیں۔ اگر فساد حد سے بڑھ گیا ہو تو اُس کا علاج اخراج (خارج کرنے) سے ہے۔ جس طرح بھی سہل اور مفید ہو۔ خواہ دینی مقدمات پہ غور و خوض کی ممانعت سے، خواہ فساد انگیز بحث مباحثوں کے بھلانے، خواہ زاید علوم کے روکنے سے۔ کہ خون نکالنے کے لیے یہ باتیں بمنزلہ فصد کرانے، پچھنے اور جونکیں لگوانے کے ہیں۔ ان کا فائدہ یقینی ہے۔ اور اس صفائی کے بعد دوا دارو کی طرف توجہ دینی چاہیے۔ **دوا** دائمی و قلبی ذکر، صبح و شام کا مراقبہ، قلبی و زمانی آگہی، اور نسبت رابطے کی یادداشت، نگہداشت اور اس کی تقویت، حبی نسبت اور عشقی کیفیت میں انتہائی سعی، ظاہری عبادت کی کثرت، دل کو خیالات سے خالی کرنا، اور حالتِ جذب سے مدد طلب کرنا۔ **پرہیز** زیادہ بولنے، زیادہ کھانے اور زیادہ سونے سے پرہیز کرنا، اور اہلِ غفلت کی صحبت میں زیادہ آنے جانے سے بچنا۔ خاص طور سے لغوگو ملحدوں کی ہم نشینی سے پرے رہنا جو اپنے آپ کو توحید پرست خیال کرتے ہیں، اور عقل و فہم کا دعویٰ بھی رکھتے ہیں۔ حالانکہ وہ بے دین احمق ہیں۔ ایسے خام اور ناکام صوفیوں اور بدانجام گمراہوں کی صحبت میں ہرگز ہرگز نہیں بیٹھنا چاہیے، جو شرعی احکام میں مستی اور دینی امور میں کاہلی کرتے ہیں۔ ان کی ہم نشینی زہر قاتل ہے۔ وہ انسان کے ظاہر و باطن کو تباہ کر کے بالآخر اُسے ہلاک کر دیتی ہے۔ اور دُنیا و آخرت میں اُسے ذلیل و خوار، بے اعتبار، بدنام پریشان حال، معتوب اور مغضوب بنا دیتی ہے۔ دم آخر عجب بیکسی و بے بسی کی موت مرواتی اور اُسے مضطر بناتی ہے۔ زندگی میں بھی اُسے محسوسات میں مبتلا رکھتی ہے، اور موت کے بعد جہنم میں دھکیل دیتی ہے۔ میں نے بہت سے ایسے لوگوں کا حال اور انجام خود اپنی ان ظاہری آنکھوں سے دیکھا ہے۔ اور باطنی آنکھوں سے بھی مشاہدہ کیا ہے۔ ان کے لیے بڑی خرابی ہے، بڑی ہی خرابی ہے۔ پس ان کے لیے ہلاکت ہے، ہلاکت۔ اور وہ شیاطین انسی ہیں، اور مراد ان سے یہی گمراہ، اور گمراہ کرنے والے لوگ ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے کلام میں وہ جو کہ وسوسے ڈالتا ہے لوگوں کے سینوں میں جنات میں سے، اور لوگوں میں سے!! کیونکہ یہ لغوگو انسان معقول باتوں کا دعویٰ کر کے بیچارے سادہ لوح انسانوں کو شکوک و شبہات میں ڈال دیتے ہیں۔ اور ابلہ فریبی کی راہ سے ان نافہموں کے دل میں انکار کے وسوسے اور خیالات ڈال دیتے ہیں، جیسا کہ اس آیت کریمہ میں ذکر ہے، کہ وہ کہتے ہیں کیا ہم ایمان لاویں گے، جیسا ایمان لائے ہیں یہ بے وقوف۔ یاد رکھو بے شک یہی ہیں بے وقوف، لیکن وہ اس

کا علم نہیں رکھتے۔ کیونکہ جب وہ محمدیؐ محققین کے پاس آتے تو ان کی تقریر و تحریر کے سامنے تو اللہ تعالیٰ کی عنایت سے اپنی ہزلیات کے غلط ہونے کا عقلی اور نقلی طور پر اعتراف کر لیتے تھے، اور پھر لاچار و مجبور ہو کر شریعت مصطفویہؐ اور طریق محمدیہؐ کی حقانیت کا اقرار کر لیتے ہیں۔ اور ان بے سرو سامانوں کے ہاتھ میں جو واقعتاً باطل پرست تھے اقرار کے سوا اور کچھ نہیں آتا۔ جیسا کہ قرآن شریف میں آیا ہے کہ جب خلوت میں اپنے شریر سرداروں کے پاس پہنچتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم بے شک تمھارے ساتھ ہیں۔ ہم تو صرف استہزا کیا کرتے ہیں۔ اللہ ہی استہزا کر رہا ہے اُن کے ساتھ، اور ڈھیل دیے چلا جاتا ہے اِن کو، اور وہ اپنی سرکشی میں حیران و سرگردان ہو رہے ہیں۔ **غذا** اس کی غذا ہے حضورِ قلب سے فرض نمازیں ادا کرنا۔ پابندیٔ اوقات کرنا۔ اللہ تعالیٰ کے بے مثال اور لاثانی ہونے پر دائمی توجہ رکھنا، ظاہری باطنی طور پر یادِ حق میں مشغول رہنا۔ اگر غضباتی قوت میں جو بمنزلہ صفرا کے ہے تھوڑی بہت خرابی پیدا ہو جائے، تو سکون بخش باتوں سے اُسے اعتدال پر لانا۔ یعنی زبان سے توبہ و استغفار کے کلمات کا ورد کرنا، اپنے آپ کو اس غیظ و غضب پر ملامت کرنا، عجز و انکساری اور عاجزی اختیار کرنا، اور ایسی ہی دیگر دوائیں جو مناسب حال و وقت ہوں، کیونکہ جب انسان غصّے میں ہو تو اعوذ باللہ پڑھے جو غصّے کو ٹھنڈا کرتی ہے۔ اور اگر وہ غضب اپنی زیادتی کے باعث فساد کا موجب بن جائے تو پھر اس کا علاج قے اور دست آور اشیا سے اس کا اخراج ہے۔ یعنی ان افعال اور اقوال کی تکرار جو اس غضبی قوت کو دور کرنے والے ہیں۔ جیسا کہ حیوانات کا ترک کرنا۔ کثرت سے تسبیح و ذکر کرنا، غیظ و غضب کی حالت میں نئے سرے سے وضو کرنا۔ غصّے کے عالم میں غضب ناک نہ ہونا چاہیے۔ غصّے کی حالت میں اگر کھڑا ہو تو بیٹھ جائے، بیٹھا ہو تو لیٹ جائے یا اُٹھ کر اُس محفل سے چلا جائے۔ یا غضب کے محرک امر کی طرف توجہ ہی نہ دے، اور اپنے دل و دماغ کو دیگر امور کی طرف مائل کر کے اُس آگ کو بجھائے اور زبان سے بے فائدہ زیادہ گوئی نہ کرے۔ جہاں تک ہو سکے خاموشی اختیار کرے یا پھر دوسروں سے نرم و ملائم لہجے میں گفتگو کرے۔ اور فحش باتوں کو تو چھوڑیئے، کڑوی کسیلی بات تک نہ کرے۔ اس قول کے مطابق عمل کرے کہ جب کوئی آدمی غصّے میں ہو تو چاہیے کہ سکوت اختیار کرے اور غصّے کے بعد کی ان پشیمانیوں، ندامتوں، قباحتوں اور خرابیوں کو یاد کرے جن کا اُسے بارہا تجربہ ہو چکا ہے۔ کیونکہ ایسی حرکات و سکنات، کلمات اور نیتوں کی ان تدبیروں سے یقیناً غصّے

کی آگ بجھ جاتی ہے، اور حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام کو اسی تربیت کے سلسلے میں حق تعالیٰ نے فرمایا تھا کہ فرعون اور فرعونیوں سے نرم و ملائم باتیں کرنا۔ **دوا** اپنی نشست و برخاست (صحبت) زیادہ تر بڑوں سے رکھو، اور بول چال زیردستوں سے، کیونکہ غصہ تو زیردستوں ہی پہ آتا ہے۔ **پرہیز** جاہلوں کی صحبت سے پرہیز کرو، اور مغلوب بچاروں پہ غضب رانی سے بچو۔ **غذا** اس کی غذا غم خواری، اور تحمل و بردباری ہے۔ اگر شہوانی قوت میں جو بمنزلہ بلغم کے ہے تھوڑی بہت خرابی ہو تو اُس کی روک تھام اس کے بے جا مصرف سے پیدا ہونے والی قباحتوں اور خرابیوں کو ملحوظ رکھ کر کرے۔ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ؐ سے شرم و حیا کرنی چاہیے، اور اللہ کے رسول کے کسی حکم کی خلاف ورزی سے ڈرنا چاہیے۔ ایسے وقت میں خود کو دوسروں کی آنکھ سے دیکھنا چاہیے اور خود اپنے آپ سے محجوب رہنا چاہیے، کیونکہ حیا ایمان ہی سے ہے۔ اور اگر یہ قوت اپنی زیادتی کی وجہ سے فساد کا موجب بن جائے تو اس کے اخراج کے لیے یہ علاج ہے کہ نکاح کا جلاب لے اور میل جول زیادہ تر اپنے ہی رشتہ داروں سے رکھے۔ **دوا** وہ کام ہیں جو پاک دامنی کے لیے مفید ہوں۔ مثلاً روزے رکھنا یا ایسی ریاضت کرنا جس سے شہوت میں کمی آئے۔ **پرہیز** بسیار خوری اور شکم پروری سے پرہیز کرے۔ فاسق و فاجر اور اوچھے لوگوں کی صحبت اور نامحرم عورتوں کی خلوت سے بچے۔ حسین و جمیل عورتوں کو شہوانی نظروں سے نہ دیکھے۔ **غذا** اس کی غذا ہے۔ ماہ رمضان کے فرض روزے بڑے اہتمام و احتیاط سے رکھنا، رمضان کے آخری دس دنوں میں اعتکاف میں بیٹھنا۔ اپنی شرمگاہ اور اپنے سارے حواس خمسہ اور سارے قوا و اعضا کے بے جا استعمال سے مکمل حفاظت اور دیگر مستحبات اور سنتوں کی ادائیگی اور نفلی روزے رکھنا ہے، جیسے کہ چاندنی راتوں کی تیرھویں چودھویں اور پندرھویں کے روزے۔ کیونکہ گڑگڑا کر کی جانے والی عبادتیں بھی بمنزلہ غذائی دوا کے ہیں۔ اور ان کی غذائیت ان کی دوائیت پر غالب ہے، اور اسی قسم کی دوسری غذائیں جو طبیعت کی اصلاح کے لیے تقویت بخش ہیں استعمال کرنی چاہئیں۔ مثلاً دائمی طور پہ باوضو رہنا۔ نماز میں لمبی قرأت کرنا اور نوافل کثرت سے پڑھنا، کیونکہ نماز فحش باتوں اور خلاف شرع کاموں اور سرکشی سے روکتی ہے۔ اگر وہمی قوت میں جو بمنزلہ سودا کے ہے تھوڑی بہت زیادتی ہو تو اس کی اصلاح معقول امور کے مطالعے سے کرنی چاہیے۔ اور یہ قوت اپنی زیادتی کے باعث فساد کا موجب بن جائے تو اُس کا علاج اس مادۂ وہم

کے اخراج سے کرنا چاہیے کہ امور موہومہ کی اسیری سے بتدریج قطع تعلق کرتے جائیں۔ جی چاہے یا نہ چاہے، اپنے نفس کو جہاں تک ہو سکے دُنیا کی زائد چیزوں سے روکے رکھے۔ **دوا** گوشہ نشینی اور تنہائی اختیار کرنے اور اہلِ دُنیا سے کم میل جول رکھنے میں ہے۔ عرصۂ حیات کے ختم ہونے کے مطالعے اور عرصۂ ممات کے نزدیک تر ہونے کے مشاہدے میں ہے۔ **پرہیز** نفسانی اور طبیعی لذّات اور دیگر ایسے امور سے اجتناب کرنا جو موہومات میں پھنسنے کے موجب ہوں یا قوتِ وہمیہ کو تقویت دینے میں ممد ہوں۔ **غذا** کاموں کے انجام پر غور و خوض کرنا، اور حضوری و مشاہدۂ ذات کو ہر وقت مدِّ نظر رکھنا۔ اگر یہ قلبی مرض کسی خارجی امر کے سبب سے پیدا ہوا ہو تو اس کی علامت یہ ہے کہ مریض ناپسند امور میں دلی رضا و رغبت سے اور شدومد سے مشغول نہ ہوگا۔ بلکہ اکثر طبعی طور پر آپ ہی متنبہ اور آگاہ ہو کر نادم و پشیمان ہو جائے گا، اور اپنی حالت پر افسوس کرے گا۔ اللہ بچائے اگر ایسے مریض کا مرض طول پکڑ کر دیرینہ و کہنہ ہو جائے تو پھر بمنزلہ اس مادی مرض کے ہو جاتا ہے جس کا تدارک بڑا دشوار ہو جاتا ہے۔ عادت فطرت ثانیہ بن جاتی ہے۔ اس سادہ مرض کا علاج ان اسباب کا ترک کرنا ہے جو اس مرض کا موجب بنے اور صالحین و مومنین کی صحبت اختیار کرنا ہے خاص طور پر ایسے خاصانِ حق جو حق سبحانہٗ تعالیٰ کی حضوری و مشاہدے سے دائمی مسرور رہتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ کی عبادت و اطاعت میں شرع مصطفیؐ اور طریق محمدیؐ کے انداز میں مشغول رہنے میں ہے۔ یہ سب کچھ جو کہا گیا ہے ہر اک خلط کے زیادہ اسباب و علامات اور خرابیوں کی کلیات اور ان کی اصلاح کا بیان ہے۔ لیکن ان کی ترکیب سے پیدا ہونے والے امراض تو بہت زیادہ ہیں جن کی جزئیات کو احاطۂ شمار میں نہیں لایا جا سکتا، اور نہ ہی ہر مرض و نسخہ و علاج کا الگ الگ بیان کیا جا سکتا ہے۔ اسے طبیب کی رائے، اور اُس کی تشخیص اور نسخے کی تجویز پر چھوڑتے ہیں۔ جس مریض میں بھی مرض مرکب پائی جائے مذکورہ بالا علامات کے بموجب ہر خلط کے اشتراک میں کمی یا بیشی کی دریافت کر کے اس کی مناسب دوا لکھنی چاہیے، اور دوائی کے اجزا میں غالب اور مغلوب خلطوں کو ملحوظ خاطر رکھنا چاہیے۔ ہر خلط کے سلسلے میں مذکورہ دوائیوں میں سے جو بھی مریض کے مناسب حال ہو تو نسخہ کی ترکیب میں اس کے اوزان اور اجزا میں سالک کے وقت اور مقام کے مطابق کمی یا بیشی کرنی چاہیے۔ چنانچہ ہم یہاں مرکب امراض میں سے ایک مرض کا بیان کرتے ہیں، اور اس کا علاج معالجہ تحریر کیے دیتے ہیں۔ اسی پر قیاس کرتے

ہوئے دوسرے امراض میں عمل کرنا چاہیے۔ مثال کے طور پہ اگر کسی میں باطنی وحشت، بے سکونی اور نیک اعمال کی طرف سے دل کی بے توجہی کا مرض پیدا ہو جائے، اگر وہ بغیر کسی وجہ کے ہے اور ظاہری طور پہ اس کا سبب معلوم نہیں ہوتا تو سمجھ لینا چاہیے کہ یہ علمی قوت کے جل جانے، اور شہوانی قوت کے غلبے کی وجہ سے ہے جو بمنزلہ خون و صفرا کے ہے۔ ان چار باطنی اخلاط میں سے ہر خلط جب جل جاتی ہے تو وہ مکمل طور پہ وہم بن جاتی ہے، بالکل ظاہری اخلاط کی طرح کہ ہر خلط جب جل جاتی ہے تو وہ سودا بن جاتی ہے۔ پس وہ وحشت وہم کی وجہ سے ہے جو علم کی سوختگی سے پیدا ہوا، اور قلب کا امور خیر کی طرف متوجہ نہ ہونا شہوانی قوت کے غلبے کی وجہ سے ہے۔ یعنی کہ نفس اپنی نفسانی خواہشات کی طرف مائل ہے۔ اس کا علاج ان ہر دو خلطوں کے سلسلے میں مذکورہ دواؤں سے کرنا چاہیے اور اگر یہ وحشت فکر معاش کی وجہ سے ہے، اور یہ بے سکونی حرص و لالچ اور آرزوؤں کے طول کی بنا پر ہے، اور قلب کا نیک اعمال کی طرف متوجہ نہ ہونا سرکشی و سرتابی کی وجہ سے ہے تو سمجھ لینا چاہیے کہ مرض وہم و غضب کی شراکت سے ہے جو بمنزلہ سودا و صفرا کے ہے۔ اور اس کا علاج ان اخلاط کے سلسلے میں مذکورہ بالا ادویہ سے کرنا چاہیے۔ اور اسی قیاس کی بنا پر سارے امراض کا علاج معالجہ کرنا چاہیے۔ یہ بھی جان لیں کہ اس ڈھب اور خاص طریقے سے باطنی طبابت اور قلبی علاج معالجہ بھی ایک فن ہے جو مجھ فقیر بے نوا سے منسوب و مخصوص ہے۔ جسے حق سبحانہ تعالیٰ نے اپنی خاص عنایت سے مجھے سکھایا، اور اُس کے نظریات و عملیات ظاہری طبابت سے بھی زیادہ واضح اور عیاں کر کے سمجھائے اور طبی قواعد سے ایسی مطابقت اور پھر ہر کلیہ قاعدہ کی موافقت اور اس طرف سے علاج معالجہ کرنے کا انداز آج تک اخلاق یا سلوک کی کسی کتاب میں نہیں دیکھا گیا، اور آج تک کسی نے ایسا بیان نہیں کیا۔ طبِ باطن کے اس نئے علم کی از سرِ نو بنیاد ابھی رکھی گئی ہے۔ اور علاج معالجے کی یہ راہیں یوں کھولی گئی ہیں، کہ اس کے بعد اسی قیاس پہ صاحبِ باطن عارفوں کے دلوں پہ باقی جزئیات خود بخود منکشف ہوتی جائیں گی۔ اور خدا نے چاہا تو اہلِ سلوک کے تجربے و عمل میں آتی جائیں گی۔ خوف طوالت کی وجہ سے زیادہ تفصیل کو چھوڑ دیا گیا ہے۔ اور ان کلیات کی جزئیات کی صراحت و وضاحت کو خوبیٔ طبع اور ذہنِ سلیم پر چھوڑ دیا ہے۔ چونکہ یہ کتاب ساری کی ساری حکمتِ الٰہیہ محمدیہ کے بیان سے بھری پڑی ہے۔ یہ طبِ باطن بھی اسی کے فنون سے ایک فن ہے، جو یہاں صریحاً طبی اصطلاحات کے مطابق معرضِ

بیان میں آیا ہے، وگرنہ ہر مقام میں احوال انسانی کی عام اصطلاح ہی کا بیان ہے۔ اور ہر وارد (باب) میں قلوب کی صحت اور دعوت بسوئے محبوب ہی ملحوظ خاطر ہے، لیکن اس فن طبابت میں مہارت پیدا کرنے کے لیے بھی مطب میں بیٹھنا اور نسخہ نویسی کرنا ضروری ہے، یعنی اپنے اوپر مخلص مومنوں اور محمدیوں کی صحبت کو دلی رضا و رغبت سے لازمی قرار دے لینا، کیونکہ طبیت کی صحبت اختیار کیے بغیر علاج معالجہ کی قوت حاصل نہیں ہو سکتی۔ علم اور شے ہے اور عمل کچھ اور ہی شے ہے۔ ورنہ تو علم طب کا ہر واقف عالم طبیب بن بیٹھتا۔ حالانکہ صورتِ حال یہ ہے کہ اکثر کم علم اطبا جنھوں نے کسی کامل طبیب کی صحبت پائی ہو، ان بڑے عالم فاضلوں کی نسبت، جنھوں نے کسی طبیب سے اکتساب فیض نہیں کیا، صحیح تشخیص اور درست نسخے تجویز کرتے ہیں۔ ہاں عامل عالم کا مرتبہ بے علم عامل سے اور بے عمل عالم سے افضل ہے، کہ ان دونوں کو ہمیشہ غلطی کا خطرہ رہتا ہے۔ پس اس علم الکتاب کا مطالعہ علمی، عملی، ظاہری، باطنی، ذوقی اور حالی طور پر ان مخلص محمدیوں کے لیے زیادہ نفع بخش اور فائدہ مند ہے جنھوں نے اس طریق محمدیؐ کے بزرگوں کی صحبت اختیار کی ہو۔ اور ان کی تربیت سے اصلاح پا کر اپنے علم و عمل کی تصحیح کی ہو۔ اور ان کے ظاہری اور باطنی فیوض و برکات سے شرفیاب ہوئے ہوں۔ بعض وجوہ کے پیشِ نظر یہ سب آدمیوں کے لیے مفید اور سود مند ہے، اور بعض وجوہ کے پیشِ نظر شاید مخالفین کی مخالفت اور انکار کا باعث بھی ہو۔ جیسا کہ اس آیت کریمہ میں مذکور ہے کہ گمراہ کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس مثال کی وجہ سے بہتوں کو۔ اور ہدایت کرتا ہے اسی کی وجہ سے بہتوں کو، اور گمراہ نہیں کرتا اللہ تعالیٰ اس مثال سے کسی کو مگر صرف بے حکمی کرنے والوں کو جو کہ توڑتے رہتے ہیں اس معاہدے کو جو اللہ تعالیٰ اسے کر چکے تھے اس کے استحکام کے بعد، اور قطع کرتے رہتے ہیں ان تعلقات کو کہ حکم دیا اللہ نے ان کو وابستہ رکھنے کا اور فساد کرتے رہتے ہیں زمین میں۔ پس یہ لوگ پورے خسارے میں پڑنے والے ہیں۔ قصہ کوتاہ یہ کہ ہمیں اپنے متن کے مطلب کی طرف لوٹنا چاہیے، اور درویش انسان کے ظاہری اسباب کو ترک کرنے اور ملحوظ رکھنے کو بیان کرنا چاہیے۔ اور ان ہر دو امور کی مفصل تشریح پہ لب کشائی کرنی چاہیے، کہ ان دونوں شقوں میں سے سالک کے مناسبِ حال کونسی شق ہے اور ترک کر دینے والی کونسی ہے۔ پس سمجھ لو کہ اب ہم اسباب ظاہر کے ترک کرنے اور اس امر کو ملحوظ خاطر رکھنے کے متعلق لکھتے ہیں۔ جس کی راستی و درستی خود پہ واضح ہو گئی ہو۔ چونکہ اس معاملے میں بعض

عزیزوں کو اختلاف ہے۔ ان میں سے بعض کا یہ ارشاد ہے کہ درویش کو کلی طور پر اسباب ظاہر کو ترک کر دینا چاہیے اور کھانے پینے کے لیے بھی کہیں سے کسی معین تنخواہ وغیرہ کا اہتمام نہیں کرنا چاہیے اور دانش مند اور متمول آدمی سے عجز وانکسار ونرمی سے پیش نہیں آنا چاہیے۔ نہ ہی امیروں اور بادشاہوں کے ہاں آنا جانا چاہیے، اور بیماری کے وقت طبیبوں کی طرف ہرگز رجوع نہیں کرنا چاہیے۔ دوا دارو کا ہرگز استعمال نہیں کرنا چاہیے، کیونکہ یہ اسباب ظاہری میں مبتلا ہونا توکل کے منافی اور درویشی کی راہ کی رکاوٹ ہے۔ جیساکہ اس آیت کریمہ سے واضح ہے کہ جو شخص اللہ پر توکل کرے گا تو اللہ تعالیٰ اُس (کی اصلاح مہمات) کے لیے کافی ہے، اور بعض فرماتے ہیں کہ حکمت الٰہیہ کے مظاہر سے ہاتھ ہرگز نہیں کھینچنا چاہیے کہ اُس حکیم مطلق کی حکمتِ بالغہ کے خلاف اقدام ہے۔ گویا یہ امر اس مسبب الاسباب کے ساتھ مقابلے کا دروازہ کھولنے کے مترادف ہے، اور نہ ہی عرفان و معرفت کا یہ تقاضا ہے۔ آخر خدا نے انسان کو عقل وفہم اور آنکھ، ناک، کان اسی لیے تو عطا فرمائے ہیں، کہ یہ آیت کریمہ بھی اسی بات کی خبر دیتی ہے کہ انسان کو ایمان کے بارے میں صرف اپنی ہی کمائی ملے گی۔ بہرحال ہر کسی کو جیسی صورتِ حال پیش آتی ہے، وہ ویسے ہی اظہار رائے کر دیتا ہے۔ اس آیت کریمہ کے مطابق کہ ہر (ذی مذہب) کے واسطے ایک ایک قبلہ رہا ہے جس کی طرف وہ عبادت میں مُنہ کرتا رہا ہے۔ بہر کیف مجھ فقیر پر جو کچھ منکشف کیا گیا وہ یوں ہے کہ توکل اور عرفان تو حالاتِ قلب کے زمرے سے ہیں جس کے حقیقی معنوں سے صرف اللہ تعالیٰ ہی آگاہ ہے۔ کوئی کسی کے دل کی صحیح اطلاع نہیں رکھتا۔ ہو سکتا ہے کہ بظاہر کوئی انسان اسباب ظاہری کو ملحوظ رکھتا ہو، مگر اس کے توکل اور باطنی کاموں میں کوئی خلل نہ آتا ہو، اور دیکھئے یہ مصرع کہ فرمایا حضور پاک ؐ نے کہ توکل کے ساتھ ساتھ اونٹ کا گھٹنا بھی باندھ دو۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کوئی بندۂ خدا ظاہری اسباب کو ترک کر دے مگر لوگوں کے ساتھ تیزی و تندی سے پیش آئے، اور سبب اُس کا جہالت و بدخلقی کے سوا اور کچھ نہ ہو۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اسباب ظاہری کا ملحوظ رکھنا کسی ابتلا، بے دینی، بے یقینی اور پست ہمتی کی بنا پر ہو، نہ کہ عرفان و حقیقت کی وجہ سے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ترک اسباب اللہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ پر کلی اعتماد اور ذاتی بزرگی وعظمت و استغنا کی وجہ سے ہو۔ اعمال کی پرکھ تو نیتوں پہ ہے۔ حاصل کلام یہ کہ اللہ تعالیٰ سے نسبت پیدا کرنی چاہیے۔ فنا فی اللہ اور بقا باللہ کی حالت کو پہنچنا چاہیے۔ اس کے بعد جو کچھ بھی ظہور پذیر ہوگا۔ وہ

بالکل ٹھیک، صحیح اور اچھا ہوگا۔ لہٰذا پچھلے بزرگوں نے معاش کے دونوں طریقے ہی اختیار کیے، لیکن میں نے جو کچھ اپنے بزرگوں سے دیکھا ہے، اور ان کو عمل پیرا ہوتے ہوئے دیکھا، کہ انھوں نے پہلی صورت ہی اختیار کی۔ وہی ان کا معمول تھا، یعنی اسباب ظاہری کا ترک کرنا اور دنیوی امور سے التفات نہ کرنا سچی بات یہ ہے کہ آئینِ درویشی کے مناسب گزر بسر کا یہی طریقہ ہے۔ شانِ فقر بھی اسی طرزِ معاش کا تقاضا کرتی ہے۔ اور کاملوں کے اکمل ترین درجہ کا تقاضا بھی یہی ہے کہ باطنی اور ظاہری توکل کو یکجا جمع کر دیا جائے، اور یوں خارجی اور داخلی توکل حاصل ہو جائے، اور ان بندشوں سے بالکل پاک و مبرّا ہو، اور احادیثؐ دواؤں کے استعمال کے ثابت ہونے کا مطلب یہ ہے، کہ اگر تمھاری سعی و جستجو کے بغیر ہی خدا تعالیٰ علاج معالجے کے اسباب پیدا کر دے، انھیں اپنے آپ سے منسوب نہیں کرنا چاہیے، اور ان کا استعمال کر لینا چاہیے۔ حاصل مقصد یہ کہ خود اپنی طرف سے نہ کوئی تدبیر کرو اور نہ علاج۔ مرض کے دفعیہ کو دوا پر موقوف نہ سمجھو۔ اسباب کے ہونے نہ ہونے کی طرف قطعاً توجہ نہ کرو۔ اور اگر بلا ارادہ اور بغیر تلاش کے طبیب اور دوا میسر آجائیں اور دل بھی مان جائے تو پھر جس طرح غذا کھاتا ہے، اسی طرح دوا بھی کھالے۔ اور یہ سمجھ رکھے کہ اگر مقدر میں ہے تو دوا اثر کرے گی ورنہ نہیں۔ جس طرح بغیر کسی تردد اور تلاش کے گزر بسر ہو رہی ہے۔ یہ صورت بھی اسی طریق سے ظہور پذیر ہوئی ہے تو پھر اسے روک کر خود کیوں دخل اندازی کرے۔ اگر وہ چیز منع ہوتی تو ظہور پذیر ہی نہ ہوتی۔ اللہ کے سوا اور کوئی منع کرنے والا نہیں، نہ اُس کے سوا کوئی بھیجنے والا ہے، نہ اُس کے سوا کوئی نفع یا ضرر پہنچا سکتا ہے۔ الغرض ظاہری اسباب پر نگاہ ہی نہ ڈالنی چاہیے، اور اسباب کے ہونے یا نہ ہونے کو یکساں سمجھے۔ **ترک کی قسمیں** یہ سمجھ لینا چاہیے کہ اسباب کو ترک اور ماسوی اللہ سے قطع تعلق کرنا راہِ سلوک کی جملہ ضروریات میں سے ہے، اور اللہ کی راہ پر چلنے والوں کے لیے فرض ہے۔ جیسا کہ خود اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے۔ کہ آپ کہہ دیجیے کہ اللہ تعالیٰ نے نازل فرمایا ہے۔ پھر ان کو ان کے مشغلہ میں بیہودگی کے ساتھ لگا رہنے دیجیے۔ ہاں ترک کی چار قسمیں ہیں۔ حکمی ترک، ظاہری ترک، باطنی ترک اور حقیقی ترک۔ حکمی ترک یہ ہے کہ دُنیاوی اسباب کو مطلقاً ترک نہ کرے، اور اکتساب معاش میں سعی و جستجو سے ہاتھ بالکل نہ کھینچے، لیکن ان میں سے بعض کو شرعی حکم کے بموجب ترک کر دے، اور ہرگز کوئی ایسا عمل نہ کرے جس کے ذریعے منفعت کا حصول جائز نہ ہو۔ یعنی رشوت کا مال

نہ لے۔ تجارت میں زیادہ نفع نہ کمائے۔ اور علی ہذا القیاس۔ جس چیز سے بھی شرع نے منع کیا ہے اس کا ارتکاب نہ کرے۔ ایسا شخص مومن صالحوں اور حکمی تارکوں کے زمرے میں داخل ہے۔ اسی قدر ترکِ اسباب سے وہ دُنیا و آخرت کے زیادہ تر نقصانات سے محفوظ رہے گا۔ ظاہری ترک یہ ہے کہ بظاہر اس نے دُنیاداری کے اسباب کو ترک کر کے درویشوں جیسی وضع قطع بنا رکھی ہو، اور دُنیا داروں کی طرح کسب معاش، تجارت، ملازمت یا ایسے دوسرے کام نہ کرے، لیکن امرا اور بادشاہوں سے وہ کوئی جاگیر، یومیہ مزدوری (روزینہ) یا مقررہ تنخواہ وغیرہ درویشانہ انداز میں قبول کرے، اور ماہانہ حساب کتاب بھی دنیا داروں کی طرح کرے۔ ہاتھ روک کر خرچ کرے۔ خرچ کو آمدنی کے مطابق رکھے، اور اہل فقر کی طرح بے دھڑک خدا کی راہ میں خرچ نہ کرے، تو پھر اگر اُس نے اس سلسلے میں خود سوال نہیں کیا، نہ کوشش کی ہے، نہ خوشامد، اور جادۂ درویشی سے قدم باہر رکھا ہے، نہ آئینِ درویشی کے کچھ منافی کیا ہے۔ ایسا آدمی ظاہری تارکوں کی جماعت میں شامل سمجھا جائے گا۔ گو در اصل اسباب کی طرف اس کی رغبت و توجہ باقی رہی۔ اسی سلسلے میں دلی لگاؤ بھی رہا۔ ان امرا سے رجوع بھی کیا، لیکن خود نہ کسی کے آگے دستِ سوال دراز کیا، نہ کوئی سعی و تردد کیا۔ نہ التجا کی، نہ خوشامد۔ یعنی جس طرح کہ درویشوں کو روزی کی تلاش نہیں کرنی چاہیے۔ اور بظاہر اس نے فقر کا لبادہ اوڑھ رکھا ہے۔ ایسے شخص کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ اُس نے ترکِ اسباب اختیار نہیں کیا، بلکہ لبادہ بدل رکھا ہے۔ وہ بھک منگوں اور گدڑی پوشوں میں سے ہے۔ باطنی معنوی ترک کا مطلب ہے کہ اس شخص کی باطنی نگاہ ظاہری اسباب پہ ہرگز نہ پڑے۔ اس کی باطنی چشم کو دائماً مشاہدۂ ذات نصیب رہے، اور باطنی طور پہ اُسے ماسوی اللہ سے کلی طور پہ قطع تعلق رہے، اور طبعاً بھی دنیاوی معاملات اور اہل دُنیا سے میل جول سے نفرت کرے، لیکن چونکہ ہر بات کا اختیار تو اُسی مختارِ حقیقی کو ہے، تو حال حاضر میں اگر اللہ تعالیٰ نے اُسے ظاہری اسباب سے رہائی نہیں بخشی اور اُسے اکتساب معاش کے لیے تجارت یا ملازمت پہ لگا رکھا ہے، ایسے شخص کو تارک معنوی کہیں گے، اور وہ انہی کے زمرے میں شمار ہوگا۔ ترکِ حقیقی یہ ہے کہ ظاہری اور باطنی ہر دو طور پہ دُنیا و مافیہا کو ترک کر دے، اور اُس میں معنوی اور ظاہری ترک، دونوں ہوں، اور وہ کسی معینہ معاش کے اسباب کی کسی قید میں گرفتار نہ ہو، اور اُسے اللہ تعالیٰ پہ پورا توکل اور ماسوی اللہ سے قطعی انقطاع حاصل ہو۔ ایسا شخص تارکِ حقیقی کہلائے گا۔ کیونکہ اس

کی ذات ترک کی تمام قسموں کی جامع ہے۔ اگرچہ ہدیوں اور نذرانوں کی شکل میں اسے اتنی آمدنی ہو کہ اکثر اہل اسباب کو بھی میسر نہ ہو، لیکن وہ سب کا سب خدا کی راہ میں صرف کر دیتا ہو، اور اپنی ذات پر خرچ نہ کرتا ہو۔ اور اپنے فقر کو ہاتھ سے نہ دینے پائے، جیسے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس دُنیا کا سب مال ومنال، مالِ غنیمت، اور نذر نذرانے آتے تھے، لیکن ان کے فقر و فاقہ میں فرق نہ آنے پایا۔ معاش، فقر، توکل، ترکِ اسباب اور تجرید و تنہائی کے مطالب کا مفصل بیان انشاءاللہ اُن سے متعلقہ متفرق واردوں میں اپنے صحیح مقامات پر پوری شرح و تفصیل کے ساتھ آئے گا۔

سوال اگر تم یہ کہو کہ پچھلے بزرگوں نے بھی ملکیتیں اور معاش کے سلسلے میں مدد امداد قبول فرمائی ہے تو آپ یہ کیسے کہہ سکیں گے کہ وہ تارکِ حقیقی نہ تھے۔ **جواب** اللہ تعالیٰ معاف کرے۔ استغفر اللہ۔ اکابر دین کے حضور میں ایسی باتوں کے احتمال کی کیا گنجائش؟ وہ حقیقی تارک ہو گزرے ہیں۔ وہ ظاہری اور باطنی طور پر ماسوی اللہ سے قطع تعلق کیے ہوئے تھے۔ انھوں نے وہ روش اللہ کی رضا۔ خدا کے حکم، وقت کے تقاضے اور دوسروں کے فائدے کے لیے اختیار کی ہو گی۔ ایسے بزرگوں کی عظمت میں تردّد کیسا؟ ان کا حال تو سورج کی طرح ظاہر و روشن ہے۔ لیکن ایسے لوگ جنھیں حق تعالیٰ نے ایسی قیود سے آزاد رکھا ہو، اور ان اعتبارات کا پابند نہ کیا ہو، اور اُنھیں کامل توکل عطا کیا ہو۔ اس سلسلے میں تھوڑے سے کم پایہ پر ہیں۔ حضرت سلیمان اور حضرت یوسف علیہما السلام کی نبوت میں شک نہیں، لیکن وہ فقرِ محمدیؐ (ان پر خدا کا درود وسلام) سے بے بہرہ و محروم تھے۔ خود قرآن میں خدا نے فرمایا کہ ہم نے تم میں سے بعض کو بعض پر فضیلت دی، اور اسی لیے ہمارے پیغمبر پاکؐ نے فرمایا کہ مجھے اپنے فقر پہ فخر و ناز ہے۔ **رعایت کی قسمیں** ترکِ اسباب کے مقابل اسباب کی رعایت کی بھی چار قسمیں ہیں۔ حکمی رعایت، ظاہری رعایت، باطنی رعایت اور حقیقی رعایت۔ پس ترک اسباب کا اعلیٰ و کامل مرتبے کا مقام رعایت کے ادنیٰ اور نچلے مراتب پر ہے۔ اور اس کے ادنیٰ و نچلے میں اُس کا اعلیٰ و کامل مقام۔ چنانچہ ترکِ حقیقی میں حکمی رعایت بھی درج ذیل ہے۔ جو یوں ہیں کہ ترکِ حقیقی کے ساتھ شرعی احکام کے بموجب اہلِ حق کی رعایت کرے، اپنے آپ کو خواہ مخواہ مصیبت اور ہلاکت میں نہ ڈالے جیسا کہ یہ فرمان ہے کہ نہ ڈالو اپنے آپ کو اپنے ہی ہاتھوں ہلاکت میں۔ اور پاگلوں کی طرح خلقِ خدا کی طرف سے بالکل بے توجہ نہ ہو جائے۔ ہاں زہر و تریاق، رسّی اور سانپ اور دوست و

دشمن میں امتیاز کرتے ہوئے وقت کے مطابق و موافق جو کچھ اس حکیم حقیقی یعنی اللہ جل شانہٗ کی طرف سے دل میں القا ہو اُس کے مطابق عمل پیرا ہو۔ اپنے، بلکہ سبھی کے افعال کو اللہ ہی کی طرف سے جانے۔ یہ حکمی رعایت تمام انبیاءؑ کرامؑ اور اولیا اللہ نے ملحوظ رکھی ہے۔ معنوی ترک میں ظاہری رعایت کا ظہور ہے یعنی کہ باطنی ترک و قطع تعلق کے ساتھ ظاہری مراعات کو کھلے بندوں کرتا رہے۔ یعنی جو وضع قطع اختیار کر رکھی ہے اُسے ملحوظ رکھے۔ محمدیؐ مومنوں کے مخصوص اوضاع و احوال اور متابعت کو خود پر لازم رکھے۔ کیونکہ جس شخص نے مشابہت کی کسی قوم کے ساتھ، پس وہ اُنہی میں سے ہے۔ یہ رعایت بھی تمام انبیاءؑ و اولیائے کرام نے ملحوظ رکھی ہے۔ کیونکہ داڑھی رکھنا، مونچھوں کو ترشوانا، اور اسی قسم کے دیگر ظاہری امور اسی امر کی خبر دیتے ہیں تاکہ محمدیوںؐ کو ظاہری فرق بھی غیر مسلموں سے آشکارا کر دے۔ رعایت کی یہ دو ادنیٰ اور نچلی اقسام جو ترک اعلیٰ و عالی کے تحت ہیں، قابلِ ستائش اور ناقابلِ مذمت ہیں۔ بلکہ انسانی حقیقت اور دُنیاوی نظم و نسق و بندوبست اور صلاح و خیریت کے لوازمات میں سے ہیں۔ ان دونوں صورتوں میں ترک اسباب کو رعایت پر غلبہ حاصل ہے ۔ رعایت کسی شمار قطار میں نہیں۔ ظاہری ترک میں باطنی رعایت ہے ۔ باطنی رعایت یہ ہے کہ بظاہر گو دُنیاوی اسباب کو ترک کر دیا ہو لیکن باطن میں اسباب کی جانب میلان ہو، اور فاعلِ حقیقی یعنی حق تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ پر اسباب کی وساطت کے بغیر کامل یقین نہ ہو، اور نہ دلی سکون حاصل ہو ۔ گو بظاہر تو ترک اسباب کا اتفاق ہو۔ اور کسی ترک اسباب کی حقیقی رعایت کے نہ ہونے کی چار صورتیں ہیں۔ یعنی ظاہری اور باطنی طور پر اسبابِ ظاہری کا اسیر رہنا ، اور دائماً دُنیا اور اہلِ دُنیا سے مشغول رہنا، اور تلاش دُنیا میں بھی ہمہ تن مصروف رہنا، اور ہمیشہ غفلت میں ڈوبے رہنا۔ اُن سے خدا کی پناہ ۔ اور رعایت کی یہ دو قسمیں یعنی باطنی اور حقیقی دونوں قابلِ مذمت ہیں ۔ خداوند تعالیٰ یہ کسی مومن کے نصیب میں نہ کرے ۔ درحقیقت یہ گویا کفر ہی ہے۔ ہر آدمی جو کسی لمحے حق تعالیٰ سے غافل ہے۔ ان لمحات میں وہ کافر ہے مگر پوشیدہ طور پر ، اگر یہی غفلت مستقل طور پر لاحق ہو جائے تو پھر اس پر اصلاح کے دروازے بند ہو جاتے ہیں ۔ فائدہ یہ سمجھ لیں کہ ابتدائی تارک جب ظاہری ترک اختیار کرتے ہیں تو وہ اپنے آپ کو تمام مراتب کا تارک سمجھ بیٹھتے ہیں ، اور اس حالت میں وہ دُنیا اور اس کے متعلقات کو عجیب و غریب طریقے سے غیر مطلق سمجھ کر حق جل جلالہٗ کے مقابل میں اُنھیں بھی مستقل وجود ثابت کر کے ماسویٰ

اللہ سے روگردانی کرتے ہیں۔ دوسروں کو ماسوی اللہ میں گرفتار سمجھتے ہیں، اور خود کو آزاد خیال کرتے ہیں اور اپنے زعم میں رو بحق ہوتے ہیں۔ حالانکہ قرآن شریف میں آیا ہے کہ تم جدھر بھی رُخ کرو، اُدھر اللہ تعالیٰ ہی کا رُخ ہے۔ ان میں سے اکثر غرور و نخوت، صلاح و تقویٰ، اور تکبر و خود بینی، ترک و تنہائی کے پر و بال نکال کر انسانیت کی سیدھی راہ سے بدک کر حیوانیت کی فضائیں اڑنے لگتے ہیں، اور اپنی لاعلمی اور خودسری سے بد اخلاقی میں داخل ہو کر دائرۂ انسانیت سے باہر نکل جاتے ہیں، اور یوں اپنی خرد ماغی کا ثبوت دیتے ہیں۔ انتہائی حد تک پہنچ جانے والے تارک جب ترک حقیقی تک پہنچتے ہیں، اور ماسوی اللہ سے حقیقی انقطاع پیدا کر لیتے ہیں، یعنی سب کو بالکل نیست و نابود اور معدوم ذاتی سمجھتے ہیں اور نمود عالم کو اک موہوم نمود تصور کرتے ہیں اور اس واجب الوجود کے علاوہ کسی اور کو موجود نہیں سمجھتے۔ علائق دنیوی اور کثرت موہومہ ہی کو واصل بحق ہونے میں مانع سمجھتے ہوئے ان سے روگردانی کر لیتے ہیں۔ اس واحد حقیقی کی طرف رُخ کر کے اسی کے مشاہدے میں مصروف رہتے ہیں، اور مظاہر سے مرتبۂ ظاہر بن جاتے ہیں، اور اس مقولے کے مطابق اُس سے اُسی کی پناہ مانگتے ہیں۔ باوجود اس کے کہ وہ جانتے ہیں کہ سبھی کو اللہ کی طرف لوٹنا ہے۔ اور تمام امور اسی کی طرف رجوع کریں گے، اور جو کچھ ہے اسی سے ہے۔ سب کی انتہا بھی اسی تک ہے۔ جیساکہ قرآن شریف میں آیا ہے کہ تیرے رب کی طرف ہی انتہا ہے۔ ذاتی ہدایت کے بموجب جو کاملانِ حق کی ذات کا تقاضا ہوتی ہے۔ وہ وحدانیت حق کے مشاہدے کا راستہ دکھاتے ہیں، اور توحید کی طرف دعوت دیتے ہیں۔ جس طرح دوسروں کو تمام امور میں معذور سمجھتے ہیں اور کسی کو حقارت کی نظر سے نہیں دیکھتے۔ اسی طرح اپنے آپ کو بھی اس سلسلے میں مجبور و لاچار جانتے ہیں، اور غرور و تکبر سے کام نہیں لیتے۔ لہٰذا خود کو فنا کر کے وجودِ حق میں بقا پاتے ہیں۔ ہر چند کہ وہ کسی شے کو فاعل نہیں سمجھتے، اور نہ ہی اسباب کو لاحاصل (بے فائدہ) گردانتے ہیں، اور سبب کو مسبّب کا مظہر سمجھتے ہیں، پھر بھی خود ان اسباب میں سے انہی اسباب کو اختیار کرتے ہیں۔ جملہ پیشوں میں سے صرف توکل و درویشی ہی کے پیشے انتخاب نہیں کرتے جیساکہ اس حدیث شریف میں آیا ہے کہ ہر نبیؑ کی ایک حرفت (پیشہ) تھی، اور میرے دو پیشے ہیں فقر اور جہاد۔ سبب اور پیشے کا بے اسبابی و درویشی وضع پر اطلاق اس قسم کا ہے کہ مطلق کو بھی مقید کیا جا سکتا ہے یعنی اُسے اطلاقی تقیید حاصل ہے۔ لہٰذا اگرچہ تقیّد کے شائبہ سے خالی نہیں، لیکن ان سب تقیّدات

سے مبرّا ہے، اور تمام مقیدات سے برتر۔ **نصیحت** سالکان راہ کو چاہیے کہ وہ اپنے مناسب حال ذریعہ معاش اختیار کریں۔ اگر وہ یہ سمجھیں کہ قطع اسباب میں باطنی تردد، پراگندگی اور وحشت لاحق ہوتی ہو، اور جو تھوڑی بہت حضوری وآگہی حاصل ہوئی ہے وہ بھی ہاتھ سے جاتی رہنے کا اندیشہ ہے تو وہ یقیناً ترک اسباب کو ملحوظ خاطر رکھتے ہیں، اور کسب حلال سے روزی کماتے ہیں اور باطنی کاموں میں سرگرم رہتے ہیں، اور ترک کے پہلے مرتبے پر جو حکمی ترک کہلاتا ہے اپنا قدم جمائے رکھتے ہیں۔ اور اس حالت میں سالک راہ حق کو اتنی دُنیا ہی مفید اور راہ طریقت پہ مددگار ہے اور اُس کی آخرت کی کھیتی ہے۔ دیکھئے یہ قول کہ چاہ اس میں جو کہ تجھے دیا اللہ نے دار آخرت سے، اور نہ بھول جا اپنا حصہ دُنیا میں سے اور احسان کر جیسا اللہ تعالیٰ نے تجھ پر احسان کیا، اور زمین پر فساد کا متلاشی نہ ہو بے شک اللہ تعالیٰ فسادیوں کو محبوب نہیں رکھتا۔ اور اگر یہ سمجھیں کہ اسباب کو ملحوظ رکھنے میں ما سوی اللہ سے تعلق بڑھتا ہے، اور باطنی قطع تعلق میسر نہیں ہوتا، اور لوگوں کی ملاقاتوں میں پریشانی رونما ہوتی ہے، اور روزگار کی تلاش اور حصول میں دلی پراگندگی لاحق ہو جاتی ہے تو وہ ظاہری طور پر بھی ترکِ اسباب کرتے ہیں، اور تنہائی اور گوشہ نشینی اختیار کر لیتے ہیں، اور ذکر اذکار اور اوراد و وظائف میں مشغول ہو جاتے ہیں جس سے اللہ تعالیٰ سے نسبت پیدا ہوتی ہے۔ اور فنا و بقا کا پتہ چلتا ہے، اور وجود و عدم سب اس کے لیے یکساں ہو جاتے ہیں۔ علاج سے طبیب کا مقصد صحت کے تحفظ سے ہوتا ہے۔ گرم مزاجوں کو ٹھنڈائی سے اعتدال پہ لانا چاہیے، اور سرد مزاجوں کا گرم چیزوں سے علاج کرنا چاہیے۔ تندرست کو کسی چیز کی حاجت نہیں ہوتی، لیکن چونکہ حقیقی اعتدال کا تصوّر تو کسی شخص میں بھی نہیں کیا جا سکتا، اس لیے اپنے علاج سے کسی لحہ بھی غافل نہیں رہنا چاہیے تاکہ چھوٹی موٹی تدبیر ہی سے صحت بحال ہو جائے، اور کوئی بڑی بیماری نہ آن دبوچے۔ یعنی جو سالک اپنی باطنی صحت کا تحفظ چاہتا ہے اُسے چاہیے کہ ہر لحظہ اپنی تربیت میں مشغول رہے۔ اور جو کچھ اس کے باطن کے لیے مفید ہو اسے عمل میں لائے۔ اور قلبی علاج کو بدنی علاج پر مقدم رکھے تاکہ دل کی بیماریوں سے شفا پائے۔ یہ بدنی امراض تو جب تک زندگی ہے لگتی اور زائل ہوتی رہتی ہیں۔ اور آخرکار جو بہانہ بھی مقدر ہو اس سے ہلاک کر دیتی ہے۔ لہٰذا باطنی امراض کے ازالے کا مکمل اہتمام کرنا چاہیے اور بدنی امراض پہ توجہ بشریت کے تقاضے کے مطابق ہی دینی چاہیے، اور بالکل حیوانوں کی طرح تن پروری

ہی میں مصروف نہیں رہنا چاہیے ۔ دیکھئے قرآن مجید کی یہ آیت کریمہ کہ اے لوگو تمھارے پاس آگئی ہے نصیحت تمھارے رب کی طرف سے ہے، اور شفا اس کے لیے جو سینوں میں ہے، اور ہدایت اور رحمت مومنین کے لیے ۔ رباعی

تا کے بغم منضج و مسہل خوردن ۔ !
خود را ز تردد اینہمہ افسردن
اے درد اجل چو ہیچکس رانگذاشت
بر زیستن ایں قدر نباید مُردن

ترجمہ رباعی : جلاب اور جلاب لینے سے پہلے کی مادّہ کو نرم کر دینے والی دواؤں کا کب تک غم کھاتے رہوگے، اور کب تک اپنے آپ کو ایسے ترددات و تفکرات سے افسردہ و پژمردہ رکھوگے۔

اے درد جب موت کسی کو بھی نہیں چھوڑتی تو پھر زندگی کی خاطر اتنی جان ماری نہیں کرنی چاہیے ۔

(مصنف کے اپنے مطابق) منضج اور مسہل بطور تمثیل آئے ہیں، اور ان سے مراد ظاہری اسباب ہیں۔ مقصد یہ کہ ظاہری اسباب ہی میں محو ہو کر نہ رہ جانا چاہیے ۔ کیونکہ ہر حال میں مرنا تو ہے ہی اور زندگی کا یہ چولا اتارنا ہی ہے ۔ لہذا زندگی اور حفظ صحت کے توہمات میں اتنا نہیں کھو جانا چاہیے اور نہ اسباب ظاہری کا اتنا اہتمام کرنا چاہیے، اور نہ ہی جان کو جوکھوں میں ڈالنا چاہیے ۔ موثر حقیقی (خدا) نے اگرچہ دواؤں میں اثر ضرور رکھ دیا ہے، اور مسبب الاسباب نے اسباب کا دروازہ کھول رکھا ہے، لیکن اگر وہ کسی سر دردی کے بغیر میسر ہو جائیں، اور اتنا تردد و تلاش نہ کرنی پڑے تو یقیناً ان کے استعمال کی کوشش کر لینی چاہیے، اور رضائے الٰہی کی خلاف ورزی نہیں کرنی چاہیے کیونکہ جب اللہ تعالیٰ کسی چیز کا ارادہ کر لیتا ہے، تو اس کے اسباب بھی مہیا کر دیتا ہے۔ چونکہ بر سبیل تذکرہ جلاب اور مادّے کو پکانے اور نرم کرنے والی دواؤں کا ذکر آ گیا۔ اس متن میں دواؤں، کیفیت مرض، مزاج، طبیعت، طبیب، صحت، موت اور زندگی کا خصوصی بیان کیا گیا، لیکن ہر حال میں ہمارا مقصود مشاہدۂ ذات حق اور ماسوی اللہ سے قطع تعلق ہی رہا ۔ جیسے کہ متن کے دیگر جملے اس بات کی دلالت کرتے ہیں ۔ اگرچہ عالم اسباب سے انکار کرنا نادانی کی وجہ سے ہے ۔ مگر محض اسباب ہی پہ موقوف رکھنا سراسر بے ایمانی ہے ۔ حاصل کلام یہ کہ موجودات میں موثر اور فاعلِ حقیقی تو خدا ہی ہے

اگرچہ اس کی تاثیر دنیوی مظاہر میں بھی ظہور پذیر ہوتی ہے، اور نمودار ہونے والی پہلی مخلوق سے لے کر حضرتِ انسان تک میں جاری وساری ہے، جو خاتمِ مخلوقات ہے۔ اور مسبب جو اسباب کا پیدا کرنے والا ہے، اپنے مظاہر میں جو اس کی جلوہ گاہیں تجلی افروز ہے، اور وجوبی واصلی سببیت تمام موجبات میں جلوہ گر ہے۔ اور مسبب الاسباب کی وہی قدرت واحدہ ازل سے لے کر ابد تک جاری ہے، اور متاثر ہونے والی یہ تمام اشیا جو باہمی علت ومعلول کی حیثیت سے اضافی واعتباری تاثیر وتاثر کی نسبت رکھتے ہیں اس کی جلوہ گاہ کے سوا اور کچھ نہیں۔ لیکن جو کچھ موہوم امکانی دخل کی وساطت اور تمھاری اپنی سعی وجستجو کے توسل کے بغیر واجبی طور پر خود بخود ہی تمھارے حال میں ظہور پذیر ہو جائے، اور لازمی طور پر پردہ غیب سے منصۂ شہود میں آجائے وہ تمھارے لیے ضروری ہے، اُسے یقیناً استعمال کرنا چاہیے، اور رضائے الٰہی سے روگردانی نہیں کرنی چاہیے۔ کیونکہ اسباب، مسبب الاسباب ہی کے ارادے سے جمع ہوتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ خود اسباب کی فراہمی میں پریشاں حال وپراگندہ خاطر نہیں ہونا چاہیے۔ کیونکہ تمھارے ارادے سے کوئی شے وجود میں نہیں آسکتی، اور اگر ایسا ہو سکتا تو پھر اہل اسباب میں سے تو کوئی نہ مرتا، اور نہ ہی امرا اور بادشاہ مصیبتوں اور بیماریوں میں مبتلا ہوتے، اور بیچارے غریبوں اور مسکینوں میں سے کوئی پل بھر کے لیے صحیح وسالم وقائم نہ رہتا۔ جو کچھ تمھارا مقدر ہے وہ خود بخود تم تک پہنچ جاتا ہے۔ اور جس چیز کا حق تعالیٰ ارادہ کرتا ہے اس کے اسباب بھی اسی وقت مہیا کر دیتا ہے۔ کیا ہوا اگر اسباب اس وقت تمھیں نظر نہیں آرہے۔ غیب کا جاننے والا اور حقیقی قوت اور قدرت کا مالک خدا سب کچھ کر گزرنے کی توانائی رکھتا ہے۔ اگر تمھاری ہی مرضی اور منشا کے مطابق ظاہری اسباب بھی بہم پہنچا دے تو ٹھیک ہے۔ اس سے ظاہر بینوں کی تسلی ہو جاتی ہے، ورنہ بالکل بے فکر وبے وسواس ہو جانا چاہیے۔ اگر زندگی ہے تو حق سبحانہ تعالیٰ طبیعت کو مرض پر غالب کر دے گا، اور اسی ایک سبب سے صحت رونما ہو جائے گی۔ کیونکہ طبیب کو طبیعت کا خدمت گزار کہتے ہیں۔ اگر وہی دوا کو قبول نہ کرے تو کوئی اثر ظہور پذیر نہیں ہوتا۔ یعنی اگر ظاہری اسباب تمھارے فہم کے موافق نہ ہوں، اس حالت میں بھی اللہ پر توکل پورے اطمینانِ قلب سے کرنا چاہیے۔ اور کسی قسم کی گھبراہٹ اور بے چینی کو دل میں نہ گزرنے دینا چاہیے۔ کیونکہ جس وقت تمھاری اجل آن پہنچتی ہے تو اسباب کے وجوہ بھی کچھ فائدہ نہیں دیتے۔ اسی لیے

توحق تعالیٰ نے اسباب کو بند کیا ہے، کہ تو یوں بے سروسامانی میں مرجائے، تو پھر مرتے وقت پریشانی اور نارضامندی سے کیا فائدہ؟ اور اگر اجل کا وقت ابھی نہیں پہنچا تو تم کسی طرح بھی نہیں مروگے۔ اگر دوا دارو اور طبیب جیسے اسباب میسر نہیں تو کیا ہوا؟ حق تعالیٰ نے تمھاری شفا کے لیے ایک بڑا قوی سبب ودیعت فرما رکھا ہے، اور وہ طبیعت ہے۔ طبیب بھی طبیعت کے خدمت گزار ہوتے ہیں، اور دوائیاں طبیعت کے لیے جنگی ہتھیار ہیں۔ اگر اس جنگ میں طبیعت ہی مقابلے کی نہ ٹھانے تو دواؤں کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ پس اگر خدا چاہے تو وہ طبعی اسلحہ کی وساطت کے بغیر بھی صرف اپنی قوت سے تمھارے دشمن یعنی مرض کو لڑکھڑا دے گا۔ آخر دور دراز دیہات کے لوگ جو نہ ڈاکٹر کو جانتے ہیں اور نہ ہی دوا کو جب تک مقدر ہے زندہ رہتے ہیں۔ اور شہری لوگ جہاں تک ہوسکتا ہے، ڈاکٹر حکیموں کی طرف رجوع کرتے ہیں اور علاج معالجے سے باز نہیں آتے لیکن جب موت آتی ہے تو مرجاتے ہیں۔ کبھی تو سارے کام کاج حق تعالیٰ ہی کے سپرد کردینے چاہئیں اور ہر امر میں اسی کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔ اور اس کی طاقت وقوت سے مدد طلب کرنی چاہیے اور کسی ایسی مصیبت و بلا کے نزول سے ڈرتے رہنا چاہیے جس کی سہار تمھاری طاقت سے باہر ہو۔ دیکھیے یہ آیت کریمہ اور انسانی دعا کہ اے ہمارے رب نہ لاد ہم پر وہ چیز جس کے لیے ہم میں سہار نہیں ہے۔ یہ قدرت الٰہیہ ہے جو ظاہر ہوتی ہے بندے میں۔ پس اسے طاقت بشریہ کہا جاتا ہے اور وہ نہیں متحمل ہوتی اس آزمائش کے بوجھ کی جو کہ جلالی تجلی ہے سوائے اس طاقت کے جسے پہنچایا اللہ تعالیٰ نے اپنے بندے پر اپنی قدرت کے ساتھ۔ پس اگر طاقت کمزور ہو اپنے ظرف کی حیثیت سے، اور وزن زیادہ قوی اور شدید ہو اس سے اپنی شان کے لحاظ سے۔ پس عاجز آجاتا ہے بندہ اس سے، اور اس کا متحمل نہیں ہوسکتا اپنے علم میں، اور چھوڑ دیتا ہے اسی طاقت کے آلے کو، اور ترک کردیتا ہے علم کے تعلق کو کلیتہً اس سے، اور فرار اختیار کرتا ہے اپنے رب کی طرف اس کی حمایت میں، اور اللہ اُسے نجات دیتا ہے اس بلا سے، اور وہ فوت ہوجاتا ہے۔ اور اگر ہوتا ہے وہ شدید طاقت سے زیادہ کہ اُس سے زیادہ شدید کوئی نہ ہو تو بندہ اپنے علم سے غائب ہوجاتا ہے اور گریز کرتا ہے بے ہوش ہو کر، اور اگر وہ اتنا کمزور ہو جو اس کی طاقت کی مقدار کے مطابق ہو۔ پس مجبور ہوجاتا ہے آدمی اپنے حال میں، اور اس کے جلال کے مشاہدے کے ساتھ، اور متزلزل ہوجاتا

ہے اس کا علم اپنے مقام میں اپنی مصیبتوں اور مشکلوں کے ادراک کے ساتھ، اور جب ہوتا ہے وہ زیادہ کمزور اس سے، اور اس سے کم ہوتا ہے تو قائم رہتا ہے آدمی اس میں، اور اُس کا علم منتشر نہیں ہوتا، بلکہ وہ اس کا متحمل ہو جاتا ہے۔ اور وہ اس کے حالات سے متغیر نہیں ہوتا اور اس کی کیفیات کو پالیتا ہے۔ اسی لیے ہمارے رب نے ہمیں ہماری زبان سے یہ دعا کروائی کہ ہم پر ایسا بوجھ نہ ڈال جس کی ہم میں سہار نہ ہو۔ اور اسی طرح تجلیٔ جمالی ہے کہ جس سے مشرف کرتا ہے اللہ اپنے بندوں کو، اگرچہ وہ زیادہ شدید ہے اس کی طاقت سے، اور اُس کا بھی بندہ متحمل نہیں ہوسکتا اور فوت ہو جاتا ہے۔ جیسے وفات پاگئے۔ بعض خواص ان حالات اور تجلیات میں، اور بعض عوام اپنے سرور اور نشاط کے کمال کے اوقات میں، اور حاصل کرنے کے ساتھ جس کی وہ تمنا کرتے تھے شدید اشتیاق کے ساتھ۔ اور اگر وہ ہوتا ہے شدید یا ضعیف یا اضعف (زیادہ کمزور) پس ہوتا ہے بندہ اس قیاس کے مطابق جس کو تم نے جان لیا حالات تجلیات جلالیہ میں۔ پس کثیر جمال بھی جلال ہے اس کے حق میں جس کو پیدا کیا اللہ نے ضعیف، اور یہ دُنیاوی زندگی کی کیفیات کا بیان ہے، اور جہاں تک اُخروی زندگی کا تعلق ہے تو معاملہ اس طرح نہیں، کیونکہ اُس زندگی میں موت نہیں ہے، اور اُس میں نفوس سے علم زائل نہیں ہوتا، اور نہ وہ نفوس کو چھوڑتا ہے اور نہیں چھوڑتے نفوس آلاتِ علم کے تصرف کو وہاں، اور جنت دوزخ فنا نہیں ہوتے۔ کیونکہ ان دونوں کے رہنے والے فنا نہیں ہوتے۔ پس یہ دونوں جنت اور دوزخ باقی رہتے ہیں اپنے رہنے والوں کی بقا کے ساتھ۔ اور اللہ تعالیٰ عطا کرتا ہے عذاب دیے جانے والوں کو عذاب برداشت کرنے کی قوت جو کہ تجلیٔ جلالی ہے، اور زیادتی کرتا ہے عذاب میں شدت کی، اور وہ ہوتا ہے ان کی طاقت کی مقدار کے مطابق، اور وہ اپنے بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں ہے، اور سب سے کم اہل نار میں سے عذاب کے لحاظ سے پہنایا جائے گا دو جوتے آگ کے، کھولے گا اس کا دماغ اس کے جوتوں کی حرارت سے جس طرح کہ ہوگئی زیادتی ان کی سزاؤں اور دکھوں میں، اسی طرح ہوگی زیادتی ان کی حیات اور جسموں میں جیسے کہ رسولِ کریم صلعم نے فرمایا کہ کافر کے دونوں کندھوں کے درمیان تین دن کی مسافت ہوگی تیز سوار کے لیے۔ اور ایک روایت میں ہے کہ کافر کی داڑھ اُحد جتنی ہوگی، اور اُس کی جلد کی موٹائی تین دن کی مسافت کے برابر ہوگی۔ پس وہ برداشت کریں گے عذاب اور مجبور ہو جائیں گے

سزا اور شدت کو پانے میں، اور وہ نہیں قدرت رکھیں گے فرار کی اللہ کی حمایت میں علم کو بھول جانے کی اپنے تعینات سے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: جب کبھی جل جائے گی ان کی جلد، ہم بدل دیں گے اسے نئی جلد سے، تاکہ وہ عذاب چکھیں بے شک اللہ تعالیٰ بہت غلبے والا اور دانا ہے۔ پس بعض کا عذاب بعض کی نسبت زیادہ شدید ہوتا ہے۔ جہاں تک اس شخص کی طاقت کی نسبت کا تعلق ہے جس پر عذاب واقع ہو، وہ شدید ہوتی ہے اشد نہیں۔ ورنہ اگر ایسا نہ ہو تو وہ کیسے اُسے برداشت کر سکے گا۔ پس نہیں ہے کوئی طاقت ممکنات میں سے کسی ایک کے لیے بھی کہ وہ متحمل ہو سکے اللہ جل شانہٗ کی تجلّی کا جیساکہ اُس کا حق ہے سوائے اس قوی کے جسے یہ جلالت دی گئی ہو۔ اسی لیے کہتا ہے اللہ تعالیٰ جہنم سے، کیا تو بھر گئی؟ یعنی کیا وہ پہنچ گئی اس حد کو جس کی اُسے اشتہا تھی؟ پس جہنم کہے گی کیا کچھ اور ہے؟ تو لائیں۔ پس وہ بھرے گی نہیں، یہاں تک کہ رکھ دے گا اللہ تعالیٰ اپنا پاؤں، یعنی پہنچے گا جہنم کو مرتبۂ جلالیہ کے وصول کے ساتھ جو اس کا مظہر ہے جیسے کہ پہنچنے کا حق ہے۔ پس جہنم کہے گی قط قط، یعنی میں سیر ہو گئی اس چیز سے جس کی مجھے اشتہا تھی۔ پس اگر اللہ تعالیٰ نہیں ظلم کرتا اپنے بندوں میں سے کسی ایک پر۔ پس معاملے کے آخر میں یہ راز منکشف کر دیا جائے گا اہلِ نار پر بھی۔ اور مشرف کیے جائیں گے کمترین مرتبے کے مشاہدے سے الٰہی مراتب میں سے جو کہ سبب ہے ان تجلیات کے قیام کا۔ اور تفسیر کرتا ہے پاؤں سے، قدم سے اور پنڈلی سے، جس طرح کہ خبر دی اللہ عزّوجلّ نے اس معاملے کے بارے میں، کہ جس دن پنڈلی کو کھول دیا جائے گا اور اُنھیں بلایا جائے گا سجدے کی طرف، اللہ تعالیٰ جنت اور اُس کے رہنے والوں کو مرتبۂ جمال کے ساتھ پہنچائے گا، اور مشرف کرے گا اُنھیں تجلیات سے، اور اُنھیں دے گا طاقت ان تجلیات کے اُٹھانے کی، اور ان کی تخلیق میں اضافہ کرے گا۔ پس وہ زیادہ ہو جائیں گے خوبصورتی اور جمال کے لحاظ سے، اور سب سے کم درجے کے جنتی کے لیے اسّی ہزار ۸۰۰۰۰ خادم ہوں گے اور بہتر بیویاں۔ اس کا ایک گنبد ہوگا موتیوں اور زبرجد اور یاقوت کا جیسے کہ جابیہ اور صنعا کے درمیان ہے، اور جب خواہش کرے آدمی کسی صورت کی کہ اس میں وہ داخل ہو اور اُس سے متصف ہو، اور داخل ہوں گے جنت میں چاند کی صورت میں چودھویں کے چاند کی طرح آسمان میں شدت کے ساتھ چمکنے والے موتی نما ستارے کی طرح روشنی کے لحاظ سے، اور ایک آدمی کی

تخلیق میں ان کے باپ آدمؑ کی صورت میں ساٹھ ہاتھ آسمان میں، اور دے گا اللہ تعالیٰ مومن کو ستّو آدمیوں کی قوت۔ پس پکارنے والا پکارے گا۔ بے شک تمھارے لیے ہے کہ تم ہوش میں آؤ، صحت مند ہو، اور کبھی بیمار نہ پڑو، اور بے شک ہمارے لیے ہے کہ تم جوان رہو، اور تم بوڑھے نہ ہو کبھی بھی۔ اور بے شک تمھارے لیے ہے کہ تم نعمتوں والے ہو، اور وہ کبھی مایوس نہیں ہوں گے۔ پس حلال کر دے گا اللہ تعالیٰ ان پر اپنی رضامندی، اور اس کے بعد کبھی ان پر ناراض نہیں ہوگا، اور وہ پہنچیں گے مرتبۂ عالیہ کو دیکھنے کے ساتھ جو کہ مراتبِ الٰہیہ میں سے ہے۔ جس کا کام شروع میں وجہ اللہ (اللہ کا چہرہ) پس وہ دیکھیں گے اس کا جمال اور سنیں گے اُس کا کلام، اور حق تعالیٰ ان پہ متجلی ہوگا اپنے تجلیات جمالیہ کے ساتھ، اور جلوہ ریز ہوگا عطا کی ہوئی طاقت کی مقدار کے مطابق۔ حضور پاک صلعم نے فرمایا: پس جب حجاب اُٹھا دیا جائے گا۔ پس وہ دیکھیں گے اللہ کے چہرے کو۔ پس انہیں نہیں دی جائے گی کوئی چیز زیادہ محبوب ان کے نزدیک اپنے رب کے دیکھنے سے، اور ان لوگوں کے لیے جنھوں نے بھلائی کا طریقہ اختیار کیا، ان کے لیے بھلائی ہے اور مزید فضل۔ پس جب ہوگی تجلی طاقت سے قوی تو اہلِ نعیم گر پڑیں گے سجدہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کے لیے اس وقت تک جب تک اللہ تعالیٰ چاہے گا، اور وہ قدرت نہیں رکھ پائیں گے نعمتوں کی طرف متوجہ ہونے کی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اسی دوران جب کہ اہل جنت اپنی نعمتوں میں ہوں گے، چمکے گا ان پر نور۔ پس وہ اپنے سر اُٹھائیں گے، پس اچانک رب اوپر سے ان کی طرف جھکا ہوا ہوگا ، اور اللہ کہے گا تم پر سلامتی ہو اہلِ جنت۔ رسول اللہ صلعم نے فرمایا: یہ ہے اللہ کا قول (سلام ہوگا ان پر مہربان رب کی طرف سے) پس دیکھے گا اللہ ان کی طرف، اور وہ اس کی طرف دیکھیں گے۔ پس وہ نہیں متوجہ ہو پائیں گے نعمتوں میں سے کسی چیز کی طرف، جب تک کہ وہ دیکھتے رہیں گے اللہ کی طرف، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ ان سے پردے میں ہو جائے گا، اور اس کا نور باقی رہے گا پس تجلی میں تخفیف ہو جائے گی۔ پس وہ لوٹ آئیں گے افاقے کی طرف، اور قدرت رکھیں گے تجلی کی برداشت کی اور اس سے لذت اندوز ہوں گے۔ الفائدہ جان لو کہ تجلیات جمالیہ بہت زیادہ ہیں تجلیات جلالیہ سے، اور جمال کا ظہور زیادہ ہے جلال کے ظہور سے۔ جیسے کہ اللہ بلند و برتر نے کہا، اپنے عذاب میں جسے چاہتا ہوں پہنچاتا ہوں، اور میری رحمت ہر چیز پر وسیع ہے۔ پس سبقت لے گئی اُس کی رحمت اُس کے غضب پر، کیونکہ ہر چیز پر وسیع ہوگئی عام طور پہ اور غضب

مختص ہوگیا مخصوص افراد کے ساتھ ۔ جمال کے پلڑے کو جلال کے پلڑے پر ترجیح حاصل ہوگی ، اور دُنیا میں بھی اس کی تجلیات جمالیہ ہر ایک کے حال میں زیادہ ہیں تجلیاتِ جلالیہ سے ، اور انسان اور حیوان کے افراد کی صحت تمام عمر میں زیادہ ہے مرض کے حالات کی نسبت سے ، اور بیماری کے امتداد کی نسبت سے اور صحیح صحت مند زیادہ ہیں اور بیمار کم ہیں ، اور مرض میں بھی مرض کی شدت کی حالت تھوڑی ہوتی ہے اور تخفیف کی کیفیات زیادہ ہوتی ہیں ، اور علیٰ ہذا القیاس تمام حالاتِ متعلقہ بالجمال بہت زیادہ ظاہر ہونے والے ہوتے ہیں ، اور متعلقہ بالجلال بہت کم ظاہر ہوتے ہیں ۔ کیونکہ جلال اشیا کو ختم کرنے کا موجب ہوتا ہے ۔ پس اگر جلال غالب ہوتا تو کوئی چیز نہ پائی جاتی ، اور وہ مانع ہوتا ایجاد کے لیے شروع دن سے ہی ۔ پس جمال ایجاد کا سبب بنا ، اور سبب ہوا مخلوقات کی موجودیت کا ، اور ہر چیز اس کی رحمتِ عامہ کے ضمن میں ہے ۔ اور عہدۂ شکر بجا لانے سے نہیں نکلتی ۔ تنبیہہ وہ لوگ جنھیں بنایا اللہ تعالیٰ نے صبر کرنے والا حقیقت پر ، اور راضی قضا پر بہتر ہے ۔ اللہ تعالیٰ اُنھیں پہلے قوت ایمان اور اُس کی شدت اور اللہ کے ساتھ نسبت کی قوت اور اس کی محبت اور طاقت متحمل ہونے کی اس کی جمالی اور جلالی تجلیات کی اپنی رحمت اور قدرت کے کمال کے ساتھ ۔ پھر نازل کرتا ہے ان پر ان تجلیات میں سے وہ کچھ جو ان کی طاقت سے کم ہوتا ہے جنھیں وہ اُٹھاتے ہیں صبر کے ساتھ ، اور راضی ہوکر شکر ادا کرنے والے بن کر ، اور وہ مشرف ہوتے ہیں اس کے تمام جمالی اور جلالی ناموں کے فیض سے ۔ اور تجلی افروز ہوتا ہے حق ان پر تمام شانوں کے ساتھ اور مائل ہوتا ہے ان کی طرف اپنی تمام صفات کے ساتھ ۔ پس جو کوئی سب سے قوی ہوتا ہے اللہ کے ساتھ نسبت میں وہ سب سے زیادہ قوی ہوتا ہے آزمائش کو برداشت کرنے میں ۔ آزمائش کے سلسلے میں لوگوں میں سے زیادہ شدید انبیاؑ ہوتے ہیں ، پھر ان کی مثل آزمائش میں ڈالا جاتا ہے ۔ آدمی اپنے دین کی نسبت سے ، اگر وہ ہوتا ہے اپنے دین میں مضبوط تو اس کی آزمائش شدید ہوتی ہے ۔ اور اگر ہوتا ہے وہ اپنے دین میں کمزور ، بتلا کیا جاتا ہے اپنے دین کی نسبت سے ، اور نہیں ظاہر ہوتی کوئی مصیبت کسی بندے پر ، یہاں تک کہ وہ چھوڑتی ہے اس حالت میں کہ وہ آدمی چلتا ہے زمین پر کہ اس کی کوئی خطا نہیں رہتی ۔ اور لوگوں میں سے سب سے زیادہ آزمائش کے لحاظ سے دُنیا میں نبیؐ ہے یا صفی ہے ۔ اور اگر ہر آزمائش کا نزول طاقت سے بڑھ کر نہ رکھتا ہو اس کے اُٹھانے پر کوئی ، اور تمام آدمی اس مقام پر عاجز ہوتے ہیں ، اور نہیں

ہوتی طاقت کسی کو جلال الٰہی کے مقابلے کی، اور یہاں تک خواص کی فضیلت کا تعلق ہے، اور ان کی فوقیت کا معاملہ ہے عوام پر، وہ اس لیے کہ وہ اس میں ہوتے ہیں راضی اور شاکر، اور نہیں قدرت رکھتے عوام ان شدائد پر کہ ان پر صبر کر سکیں۔ پس جس معاملے میں صبر کرتے ہیں، عوام نکل جاتے ہیں اس میں ایمان سے اور اطمینان سے، اور پڑ جاتے ہیں کفر اور گمراہی میں۔ لوگوں میں سے سب سے شدید آزمائش کے لحاظ سے انبیاؑ ہیں، پھر صالحین ہیں۔ ان میں سے ہر ایک تھا کہ فقر میں مبتلا تھا۔ یہاں تک کہ نہیں پاتا تھا سوائے ایک چوغے کے، پس اُسے پہن لیتا تھا اور مبتلا کیا جاتا تھا جوؤں سے، یہاں تک کہ اُسے مار ڈالتی تھیں۔ اور ان میں سے ایک ایسا بھی آدمی تھا جو زیادہ خوش ہوتا تھا آزمائش میں تم میں سے کسی آدمی کے عطا پر خوش ہونے کی نسبت، اور کوئی حد اور انتہا نہیں ہے ان درجات کے تفاوت میں اور ان مراتب کے اختلاف میں، نہ اوپر کی جانب اور نہ نیچے کی جانب، اور وہ مشاہدہ جو نہیں باقی رہتا اس میں التفات ہے ماسوی اللہ کی طرف مطلقاً، اور استغراق تام ہے خالص ذات میں بغیر ادراک اسماء وصفات کے، اور عدم توجہ کلیتہً تجلیات جمالیہ اور جلالیہ کے احساس کی طرف، یہاں تک کہ ہوتا ہے وہ سبب شکر اور صبر کا خواص میں سے خاص لوگوں کے حالات میں سے بعض اوقات (لی مع اللہ) میرے لیے اللہ کے ساتھ ایک وقت ہے، اسی کا شعور دلانے والا ہے۔ یہ حالت ہے نہ اس کے لیے کوئی مقام ہے، نہ اس کے لیے کوئی دوام ہے، اور اگر ایسا نہ ہوتا تو عروج اور ترقی کاملوں میں مفقود ہوتے، اور نہ باقی رہتا فرق عبد اور ربیت میں۔ اور نہ پہنچتا بندہ رب کے درجے کو۔ پس حق وہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے کہا۔ اے ہمارے رب نہ لاد ہم پر وہ چیز جس کی ہمیں سہار نہیں ہے۔ ہم سے درگزر فرما۔ ہمیں بخش دے۔ ہم پر رحم فرما تو ہمارا آقا ہے۔ ہماری مدد فرما کافرین کے خلاف بالجملہ اس چیز کے ساتھ جس میں ہم ہیں۔ اگرچہ ہر کوئی تقدیر کی تسخیر سے مجبور و لاچار ہے اور ہر وقت بعض اسباب کو ترک کرنے اور بعض کے اختیار کرنے میں لگا رہتا ہے، کیونکہ کوئی تارک کبھی بھی مکمل طور پر ترک اسباب نہیں کر پاتا، اور اسباب کے پنجے میں جکڑے ہوئے آدمی سے مطلق ترک اسباب نہیں ہو سکتا۔ لیکن تارکین کا اطلاق ان لوگوں پر ہے جو حقیقت میں ان امور سے آزاد ہیں، اور انھیں این و آں سے کوئی دلی لگاؤ نہیں، اور وہ چشم التفات کا گوشہ ماسوی اللہ پہ ڈالتے ہی نہیں، اور اللہ تعالیٰ کی عنایت میں ان سب بندھنوں سے آزاد ہو چکے ہیں۔ وہ

اپنے معاش (روزی) کے سلسلے میں بالکل بے فکر ہوتے ہیں، بلکہ مداخلت تک نہیں کرتے اور قطعاً
سعی و جستجو نہیں کرتے۔ اور گرفتارانِ اسباب کا اطلاق ان لوگوں پر ہوتا ہے جو واقعی ان امور و اسباب
کے پیچھے بُری طرح مرے جارہے ہوں، اور اللہ تعالیٰ کی فاعلیت اور رزق رسانی میں شک و شبہ رکھتے
ہوں اور صرف ظاہری اسباب سے دل بستگی رکھتے ہوں۔ مسبب الاسباب پر ایمان نہ رکھتے ہوں۔ گو
بظاہر یہ لوگ بے کار اور ناکارہ ہوتے ہیں۔ بعض اوقات بے دخل و بے اختیار ہو کر بعض اسباب کو
ترک کر دیتے ہیں، پھر بھی اپنے گروہ سے باہر نہیں نکلتے، اور تارکوں کے زمرے میں داخل نہیں ہوتے۔
چنانچہ حکمی اور صوری رعایت کے سبب سے اپنے فرقے سے باہر نہیں نکلتے اور مصلحتاً اسباب اور
کسب حلال کو ملحوظ رکھنے میں مشغول رہتے ہیں۔ ان کے تمام مراتب کی اقسام و احکام کا اوپر مفصل
ذکر آچکا ہے۔ قصہ کوتاہ یہ کہ تارکوں کی جماعت سے قابلِ اعتبار اور شمار کے لائق دو ہی قسمیں ہیں یعنی
حقیقی اور معنوی تارک۔ جنھوں نے ترک اسباب اختیار کیا ہے صرف اسی کی قدرت کاملہ سے ادھر
مائل ہوئے ہیں، اور جنھوں نے اسباب کو ملحوظ خاطر رکھا ہے۔ اُنھوں نے خدا کی ہر حال میں شامل
(دائمی شامل حال) حکمت کو سمجھا ہے۔ یعنی جنھوں نے حقیقت امر کو سمجھا، دیکھا بھالا اور اپنے تمام کاموں
میں اسی کی کارسازی کو جلوہ گر پایا، پھر اس سب سے بہتر کارساز پہ اعتماد کیا تو اسباب کی جستجو اور تردد
کے جھنجھٹ کو خیر باد کہا۔ درویشانہ وضع اختیار کی۔ لہٰذا ان دنیوی اسباب کی وساطت کے بغیر
اُس قادرِ مطلق کا خاص تقرب حاصل کر لیا، اور جنھوں نے اسباب کو مسبب الاسباب کی مظہریت
سمجھ کر اُنھیں ملحوظِ خاطر رکھا اور رزق حلال کمانے میں مصروف ہیں، وہ انھی اسباب کے آئینہ
میں مسبب الاسباب کا حُسن و جمال دیکھتے ہیں۔ اُنھوں نے حکمتِ الٰہیہ کے معاملے کو خوب سمجھا جو ادنیٰ و
اعلیٰ ہر کسی کے شامل حال ہے۔ لیکن پہلے گروہ کی نسبت یہ دوسرا گروہ مظاہر کے پردے کی اوٹ
میں ہے۔ اگرچہ وہ بھی مظاہر میں اسی کے حسن کا مشاہدہ کرتے ہیں، لیکن مظہر کے وجود کے بغیر
اُنھیں اطمینان قلب نصیب نہیں ہوتا اور بے حجاب حضوری سے وہ محروم ہیں۔ اور پہلے گروہ سے
حجابات بالکل اُٹھ گئے ہیں، اور وہ اس منعمِ حقیقی کے دستر خوان سے نعمتیں کھانے لگے ہیں جن کے
متعلق قرآن پاک میں آیا ہے کہ اب ہم نے تجھ پر سے تیرا پردہ (غفلت کا) اُٹھا دیا۔ سو آج تو تیری
نگاہ بڑی تیز ہے۔ سو ان احباب کی مثال یوں ہے کہ کوئی آدمی اپنے محبوب کے حُسن کا آئینے میں

مشاہدہ کرے اور معشوق اس کے سامنے نہ ہو بلکہ پردے میں ہو، اور تارکان اسباب کی مثال ایسی ہے جو اپنے محبوب کا بالمشافہ مشاہدہ کرے اور محبوب اس کے سامنے بیٹھا ہو۔ ایسے مقربین کو بھلا فرصت ہی کہاں کہ وہ محبوب کے حسن وجمال کے عکس کا مشاہدہ کریں جو کائنات کے اس آئینہ خانے میں جلوہ گر ہے۔ کبھی کبھی محبوب ہی کے ارشاد کے مطابق ان آئینوں کی طرف بھی دیکھ لیتے ہیں، کیونکہ اسی حُسن واحد کو چاروں طرف متعدد صورتوں میں جلوہ گر دیکھنا بھی تو اک طرفہ تماشا ہے، اور عشق ومحبت کی شورش کو ہر روز مزید بھڑکاتا ہے۔ محبوب کے جمال کا آئینوں کی وساطت کے بغیر مشاہدہ، محویت، فنا اور حیرت لاتا ہے۔ لہذا مقربین کا یہ گروہ جو تارکِ اسباب ہے، اسباب کو ملحوظ رکھنے والے عارفوں کے گروہ سے زیادہ کامل وفاضل ہے، کہ وہ محبوب کو آئینے میں اور آئینے کے بغیر دونوں طریق سے دیکھتے ہیں، مگر دوسرے آئینے کے سوا کہیں نہیں دیکھتے، اور آئینے سے باہر دیکھ ہی نہیں سکتے۔ لیکن چونکہ محققین اور عارفین کے ان دونوں گروہوں کا معاملہ شخص واحد ہی سے ہے۔ وہ بے پردہ ہو یا درپردہ کوئی فرق نہیں۔ جو عمل بھی نیک نیت سے کیا جائے وہ اچھا عمل ہے، اور جو عمل غفلت، جہالت یا بُری نیت سے کیا جائے عیب دار ہے۔ کیونکہ اعمال کا فیصلہ نیتوں پہ ہوتا ہے۔ اور یہ ایک حدیثِ متواتر ہے جو تمام اسلامی فرقوں کے نزدیک مسلم الثبوت اور قابلِ قبول ہے، اور اس کا ترجمہ اس کے سوا کچھ اور نہیں کہ عملوں کی درستی نیتوں پر منحصر ہے۔ یعنی اگر نیت نیک ہے تو اس کی وجہ سے جو عمل بھی ظہور میں آئے گا نیک عمل ہوگا، اور اگر نیت بُری ہے تو اس کی وجہ سے جو عمل بھی ظہور پذیر ہوگا بُرا عمل ہوگا۔ اور اس کی حقیقت یہ ہے کہ لفظِ عمل کا اطلاق ارادے کی حرکت یا سکون پر کیا جاتا ہے۔ اور جو حرکت یا سکون بغیر ارادے کے ہو اُسے عمل نہیں کہا جا سکتا۔ اور قدرتی افعال جو بغیر ارادے کے طبعی طور پر ظہور پذیر ہوتے ہیں وہ افعال وآثار ہیں اعمال نہیں۔ اور یہ جو طبیبوں کی اصطلاح میں دوائی کی تاثیر کو دوا کا عمل کہتے ہیں، یہ مجازی طور پر ہے حقیقی طور پر نہیں۔ لہذا نیک ارادے کی حرکت کے لحاظ سے اوامر کی فرمانبرداری (اطاعت) عمل خیر میں داخل ہے، اور اُن سے رُک جانا بُرے ارادے کے سکون کے اعتبار سے بُرے اعمال میں داخل ہے، اور اُن سے پرہیز کرنا ارادۂ خیر کے سکون کے لحاظ سے اعمالِ خیر میں داخل ہے۔ لہذا اعمال فی نفسہ نہ اچھے ہیں نہ بُرے، وہ نیت کے مطابق خیر وشر کی کیفیت سے کیف آور بن جاتے ہیں۔ اب اس سے مذکورہ بالا حدیث، کہ اعمال کی درستی نیتوں پر منحصر

ہے، کا راز بالکل واضح ہو گیا۔

نیّت کی حقیقت کی اصل کے بیان پہ حاشیہ آرائی جو تمام نیّتوں کا منبع ہے اور دیگر کلّی و جزئی فروعات کی کیفیّتوں کی تفصیل کا تذکرہ

اس سے یہ نہ سمجھ لینا چاہیے کہ چونکہ اعمال بذاتِ خود نہ اچھے ہیں نہ بُرے، وہ نیّت ہی پر منحصر ہیں لہذا بُری نیت سے سرانجام پاتے والے اوامر بھی شرّ ہی میں داخل ہو جائیں گے، اور اگر نیک نیتی سے کیے جائیں تو مناہی کو بھی مٹا دیں گے اور وہ شرّ نہ ہو گا۔ ایسے توہمات سے خدا کی پناہ۔ یہ بات ذہن نشین کریں کہ نیّت کی اصل اپنے اختیار میں نہیں کہ چاہیں تو نیت نیک کریں یا چاہیں تو بُری نیت کا خیال باندھ لیں۔ بلکہ حقیقت یوں ہے کہ نیت جو تمام اعمال کا مبدا و منشا ہے الہامات الٰہی میں سے ہے۔ جو ابتدائے آفرینش ہی سے نفوس کو درست کرتے وقت اس نیت کا الہام یا ودیعت ہو جاتی ہے۔ جیسا کہ اس آیت کریمہ سے واضح ہے کہ قسم ہے انسان کی جان کی، اور اُس ذات کی جس نے اُس کو درست بنایا، پھر اس کو بدکرداری اور پرہیزگاری دونوں باتوں کا القا کیا۔ سو یہ نیت بغیر کسی قصد کے طبعاً پیدا ہوتی ہے اور اُس کی اچھائی یا برائی کی تفریق نفس کرتا ہے۔ اور اسی کے مطابق اعمال اچھے یا بُرے ہو جاتے ہیں۔ اس میں قطعاً کوئی فرق نہیں ہوتا۔ نہ ہی انسان اس نیت کا ادل بدل کر سکتا ہے۔ چونکہ حیوانات میں جزئیات کا ادراک ہے۔ وہ جزوی خیر یا جزوی شرّ کو پا لیتے ہیں، مگر کلیتہً ادراک نہیں کر سکتے۔ اور انسان جو کُل اور جزو سب کا ادراک رکھتا ہے اپنی قوتِ عاقلہ، ارادہ و نیت کے ادراک سے اس کا ضمیر کلی خیر یا کلی شر کو سمجھ لیتا ہے۔ اور دوسری نیّتوں سے جو اسی نیّت کے مختلف شعبے ہوتے ہیں اور نفس سے اُن کا تعلق ہوتا ہے، اور حیوانات میں مشترک ہوتے ہیں۔ طبعی رغبت یا نفرت اور اغراض و اوقات سے جزئی اچھائی یا جزوی برائی کو بھی صاف طور پر پا لیتا ہے۔ اور ان کے خیر و شرّ کا احساس کرتا ہے۔ لہذا اس درخشندہ شرع میں جو امور منع ہیں، اور گناہ کبیرہ میں داخل ہیں۔ ان میں نیک نیت کا ہرگز احتمال نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ وہ اپنی ابتدا ہی سے بُرے واقع ہوئے ہیں۔ وہ ہر دور اور ہر زمان میں تمام افراد کے نزدیک بُرے واقع ہوئے ہیں۔ پھر ان میں تغیر و تبدل کیسے ہو سکے۔ لہذا وہ اعمال تمام کے نزدیک بُرے ہیں، اور کوئی آدمی بھی اُن کے کارِ خیر ہونے کا فیصلہ نہیں دے سکتا۔

حتیٰ کہ جو لوگ غفلت و جہالت سے ان کاموں کے مرتکب ہوتے ہیں وہ بھی طبعاً جانتے ہیں کہ یہ کام واقعۃً اچھے نہیں، اور وہ کام تمام شریعتوں اور دینوں میں مکمل طور پر شر ہیں اور ظاہری اور باطنی طور پر فساد و بگاڑ کا موجب ہیں۔ یہ ممکن ہی نہیں کہ کسی سے وہ کام نیک نیت سے سرزد ہوں۔ وہ اللہ اور بندوں کے نزدیک عذاب، عتاب، ملامت اور ندامت و پشیمانی کا باعث ہیں۔ اور اگر کسی شخص سے بلا ارادہ سہواً ہی سرزد ہوں۔ ہر چند قصداً اس کام کو کرنے والے کی نسبت اس کے عذاب میں کچھ کمی اور تخفیف واقع ہو جائے، لیکن وہ گناہ ہی کے زمرے میں داخل ہوں گے، اور اسی کے مطابق سزا و جزا کے مستحق۔ اور اگر بالفرض کوئی آدمی اپنے خیال میں نیک نیت سے وہ کام کرے تو یہ جزوی اور عارضی نیت اصل نیت کے مقابلے میں قابلِ اعتبار نہیں ہوسکتی۔ اور ظاہری و باطنی طور پر اس کا شر دُور نہیں ہوسکتا، اور اگر کسی سے ایسا عمل عقل و ہوش (جن سے شرعی فرائض عاید ہوتے ہیں) کے کھو جانے کی حالت میں سرزد ہو تو باطنی طور پر اس کا شر اُس شخص کے حق میں جزوی شمار نہ ہوگا، لیکن ظاہری طور پر وہ شر اس شخص پہ عاید ہوگا، اور اُس کے بُرے اثرات دوسروں تک بھی پہنچتے ہیں۔ اور حقیقتاً اس عمل سے فساد زائل نہیں ہوتا۔ اسی طرح جو امور اوامر اور نیکیوں میں داخل ہیں تمام افراد و ادوار کی نسبت سے ان کا منشا و مبدا نیک نیت ہوتی ہے۔ لہٰذا وہ اعمال تمام افراد انسانی کے نزدیک نیک ہیں جیسے کہ معبودِ حقیقی کی عبادت کہ کوئی شخص بھی اس پہ بدی کا فیصلہ نہیں دے سکتا۔ حتیٰ کہ جو لوگ غفلت اور جہالت سے عبادت نہیں بھی کرتے وہ بھی طبعاً خوب جانتے ہیں کہ حقیقتاً یہ اچھی چیز ہے۔ اور تمام شریعتوں اور دینوں میں اس کے کارِ خیر ہونے پہ اتفاق رائے ہے۔ وہ ظاہراً اور باطناً بھی نیک ہیں۔ اور اللہ اور بندوں کے نزدیک بھی ثواب کا باعث اور تعظیم و تکریم کا موجب ہیں۔ خواہ بعض افراد سے بلا ارادہ یا بغیر نیت کے سرزد ہوں۔ ہر چند کہ ارادے کی نسبت اس شخص کے حق میں ثواب کی قدر سے کمی ہو جائے گی، لیکن نیک اعمال میں داخل ہوگی اور خیر کا باعث ہوگی۔ اور اگر اوامر کی بجا آوری میں کوئی شخص اتفاقاً بُری نیت و شر کے باعث ریا اور مکر سے کام لے۔ اگرچہ اس کے حق میں وہ اعمال محو ہو جائیں گے اور اُسے خاصہ فائدہ نہ پہنچا ہیں، لیکن بظاہر اور بذاتہ وہ اعمال خیر ہی ہیں قطع نظر اس بُری نیت کے۔ اور اگر کسی سے اعمال ایسی حالت میں سرزد ہوں کہ اُس کے ہوش و عقل قائم نہ ہوں چونکہ یہ حالت اوامر کی فرضیت کے اسقاط کا موجب ہوتی ہے تو گو باطنی طور پر اس شخص کے حق میں اس کی

نیکی شمار نہ بھی ہو۔ ظاہراً اور اُس عمل کی ذات سے اس کی خیر و نیکی زائل نہیں ہوتی، اور وہ امور جو گناہ ہائے صغیرہ میں داخل ہیں۔ اور جن میں جزوی شر ہوتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اوقات، نیتوں، افراد اور لوازم و آثار کے تغیر و تبدل کے مطابق ان میں سے کسی عمل کو وہ اعمالِ خیر میں داخل کر دے۔ کیونکہ قرآن مجید کی یہ آیت کریمہ اسی بات کی تائید کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کے گناہوں کی جگہ نیکیاں عطا فرمائے گا۔ لہذا فقر میں کسی بڑے کار خیر کے لیے کوئی چھوٹا موٹا شر جائز ہو سکتا ہے۔ یہ مسلمہ ہے کہ ضروریات جو ہیں یہ حرام کو بھی حلال کر دیتی ہیں۔ اور چھوٹا گناہ فساد نیت کے ساتھ اور شر کے نتیجے کے لحاظ سے کثیر ہو جاتا ہے۔ مثلاً وہ جھوٹ جو ہنسی کھیل میں بولا جائے اور کسی کے لیے شر یا اذیت کا باعث نہ ہو، جب اس جھوٹ کے ساتھ قتل و فساد اور ایسے دیگر بُرے کاموں کی نیت شامل ہو جائے۔ ہر چند کہ دونوں جھوٹ ہی ہیں، لیکن دونوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ ہو سکتا ہے کہ نیکی، بدی اور بُرائی میں بدل جائے اور بُرے آثار پیدا ہوں۔ اسی لیے مصلحت آمیز جھوٹ کو فتنہ برپا کرنے والے سچ سے بہتر کہا گیا ہے۔ نیک نیتی اور خیر کے ارادے سے کیا ہوا گناہ کبیرہ بھی گناہ صغیرہ میں بدل جاتا ہے۔ یا اُس کے شر میں کمی آجاتی ہے، یا بالکل رفع ہو جاتی ہے۔ اپنی صورت کے لحاظ سے تو وہ کبیرہ ہے لیکن حقیقتاً وہ گناہ کبیرہ نہیں۔ خیر کثیر سے مشروط ہونے کی بنا پر وہ خالص شر نہ رہا چنانچہ ملا جلال الدین دوانی نے عضدیہ عقائد (معاون عقائد) کی شرح میں بلا عذر شہادت کے چھپانے کو گناہ کبیرہ لکھا ہے۔ لہذا عذر یا وجہ کی صورت میں جس میں دیگر کارہائے خیر بھی ملحوظ ہوں وہ کبائر میں داخل نہ ہوگا۔ لہذا کبیرہ اور صغیرہ گناہوں کے مراتب میں فرق ہے۔ بعض دوسروں کی نسبت زیادہ بڑے اور بُرے ہوتے ہیں۔ اور وہ کبیرہ جن پہ حد کا تعین ہو جائے یا جس پہ سزا کی دھمکی ہو یا جس میں قطعی دلیل سے نہی کا ورود ہو اور وہ دین کی حرمت کی ہتک کا موجب ہو۔ جو ایسا نہ ہو وہ گناہ صغیرہ ہے۔ اور ان امور کا دریافت کرنا اور ان پر فیصلہ دینے کا اسی کو حق حاصل ہے جو خلوص نیت رکھتا ہو اور نیتوں کی درستی یا نادرستی کو جانتا پہچانتا ہو۔ اور نفسانی اور شہوانی ہوا و ہوس سے بالکل پاک ہو۔ اور فنا فی اللہ اور بقا باللہ کی منازل سے گزر کر حضرت خضر علیہ السلام کی طرح قرب خاص سے مشرف ہو چکا ہو جو ان کی اپنی طرف سے نہ تھا۔ حق تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر اسی حقیقت کے انکشاف کے لیے حضرت خضر علیہ السلام سے ملاقات کا حکم دیا تھا۔ اور حضرت خضرؑ نے فرمایا تھا کہ آپ سے میرے ساتھ

صبر نہ ہو سکے گا۔ لہذا خدا کے خاص بندوں سے اگر کوئی غلط قسم کی کوئی چیز مشاہدے میں آئے یا کوئی بات نیک نیت کے باوجود بھی اس سے مختلف نظر آئے تو حقیقت سے نافہم اور نابلد ہوتے ہوئے اُسے خطا نہیں سمجھنا چاہیے، اور غیرتِ خداوندی سے ڈرنا چاہیے، اور نیک نیتی ہی پہ محمول کرنا چاہیے کیونکہ اللہ تعالیٰ نیتوں کے جاننے والا ہے، اور اُس کے بندوں کو اُس سے خاص راہ و رسم اور خصوصی قرب ہوتا ہے۔ اولیائے کرام اس کے گنبد تلے ہوتے ہیں۔ اُنھیں اس کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ حاصل کلام یہ کہ کوئی عمل غفلت سے نہ کرو اور ہر حال میں اسی کی قدرت کا مشاہدہ کرو کہ اُس کے سوا کسی اور کو قوت اور طاقت حاصل نہیں، سب کی باگ ڈور اسی کے ہاتھ میں ہے۔ نیک نیت سے کیے جانے والا کام نیک ہوتا ہے۔ رباعی:

نے آنکہ دوا ہیچ ندارد اثرے
موقوف نہ زندگی بہر برگ و برے
مشروط بشرط این وآن نیست کہ ہست
نبض و مرض و شفا بدستِ دگرے

ترجمہ رباعی: یہ بات کہ دوا میں اثر تھا یا نہیں۔ زندگی انہی جڑی بوٹیوں ہی پہ موقوف نہیں۔ یہ این و آن کی شرائط سے مشروط نہیں، اور یہ نبض، مرض اور شفا کسی اور ہی کے ہاتھ میں ہے۔ یعنی یہ نہیں کہ دواؤں میں سرے سے اثر سے ہی نہیں، کیونکہ اشیا کے خواص تو تسلیم شدہ ہیں۔ وہ حکیم مطلق (خدا) ان میں جب چاہتا ہے اثر و تاثیر ڈال دیتا ہے، اور یوں مریض کو ان اسباب کے پردے میں شفا بخش دیتا ہے، اور نہ یوں ہے کہ دوائیاں فی نفسہٖ نفع بخش ہیں، اور یقینی طور پہ مرض کا دفیعہ کر دیتی ہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو پھر اہل اسباب اور اطبا کبھی نہ مرتے، لہذا صحت یا بیماری دوا کے دینے یا نہ دینے پہ منحصر یا مشروط نہیں۔ خدا چاہے تو اس بہانے شفا بخش دیتا ہے، اور چاہے تو ان کے بغیر بھی بیماری کو دُور کر دیتا ہے۔ حاصل مطلب یہ کہ کسی امر کا مقیّد نہیں ہونا چاہیے، اور نہ ہی حق کے مشاہدے سے غافل ہونا چاہیے۔ بلا تردد کام جو بھی شکل اختیار کریں، اس میں خدا کی رضا سمجھ کر ان سے روگردانی نہیں کرنی چاہیے، نہ ہی سکونِ قلب میں خلل ڈالنا چاہیے جیسا کہ

اس آیت کریمہ سے واضح ہے کہ میں اپنا معاملہ اللہ کے سپرد کرتا ہوں، خدا تعالیٰ سب بندوں کا نگران ہے۔ اسباب کا ہونا یا نہ ہونا ایک برابر ہے۔ بعض اوقات عین اسباب میں بھی انتہائی بے سروسامانی کی حالت ہو جاتی ہے۔ یہ بے اسبابی کی گزر بسر بھی تو سبب ہی کی ایک صورت ہے۔ پس اسے سمجھ لے اور اعتبارات میں سے کسی اعتبار سے نہ چمٹو اور نہ متوجہ ہو کسی نسب یا اضافات کی طرف، اور بنا اپنے دل کو مطمئن ہر حالت میں، اور لوٹ اپنے رب کی طرف اور آ۔

هوالنّاصح

شروع اللہ کے نام سے جو نہایت مہربان اور بڑے رحم والا ہے

ہر قسم کی تعریف اللہ ہی کے لیے ہے، جس نے بنایا ہمیں اپنے اولیا میں سے اور کہا بے شک اللہ کے ولی وہ لوگ ہیں جو ایمان لائے اور ہم سے وعدہ کیا ہے اپنی ملاقات کا، اور بے شک اللہ کا وعدہ حق ہے، اور درود و سلام اس کے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر جو سیدالانبیا اور سندالاصفیا ہیں اور آپ کی آلؓ اور اصحاب اور احباب پر۔ امابعد پس یہ سینتیسواں ۳۷ باب ہے جو لقاءُ اللہ سے موسوم ہے۔ نقصان اُٹھایا ان لوگوں نے جنھوں نے جھٹلایا اللہ کی ملاقات کو، اور وہ ہدایت یافتہ نہیں ہیں، اور جو کوئی اُمید رکھتا ہے اللہ سے ملاقات کی تو بے شک اللہ کا اجل آنے والا ہے جس کی اُمید کی جاتی ہے اور متعلق ہے امور ممکنہ کے ساتھ۔ اسی لیے استعمال کیا جاتا ہے کلمۂ (لَعَلَّ) شاید کہ یوں ہو جو اس کے ساتھ خاص ہے ممکنات میں۔ جیسے تم کہتے ہو شاید کہ بادشاہ میری عزت کرے تمنا کے برعکس کیونکہ یہ اس سے زیادہ عام ہے۔ چاہے تو یہ کسی چیز کے حصول کی طلب ہو یا اس کا روکنا ہو، اور اسی لیے اطلاق ہوتا ہے کلمۂ مخصوصہ (لَیت۔ کاش کہ) کا جو مخصوص ہوتا ہے ممکنات اور ممتنعات کے لیے جیسے تم کہتے ہو، کاش کہ زید کھڑا ہوتا اور کاش کہ جوانی لوٹتی۔ پس اللہ تعالیٰ کی اس قول سے مراد یہ ہے کہ جو کوئی اُمید کرتا ہے اس کے لقائے کے حصول کے طلب کی آخرت میں ممکن طریقے پر جیسے کہ ہوتا ہے اس کی تجلیات نوریہ و صوریہ میں خواص کے لیے اس زندگی میں بھی، جیسے کہ مشاہدہ کیا موسیٰ علیہ السلام (ان پر

اور ہمارے نبیؐ پر درود و سلام) نے اللہ کی نوری تجلیات کا کوہ طور پر اور وادئ مقدس میں ۔ نہ کہ ممتنع طریقے پر جو کہ ذاتی تنزیہہ کی حیثیت میں ہے ۔ کیونکہ ممکن نہیں اس کا مشاہدہ عین بصر کے ساتھ دونوں زندگیوں میں ، اور سُنا موسیٰؑ نے (ہمارے نبیؐ اور ان پہ درود و سلام) اسی اعتبار سے جواب (لن ترانی) کہ تو مجھے نہیں دیکھ سکتا ۔ اور کہا اللہ جل شانہ نے اسی حیثیت سے کہ نگاہیں اُسے نہیں پا سکتیں ۔ پس جو کوئی ایمان رکھنے والا ہے اللہ پر اور اُس کے رسولؐ پر دُنیا میں اور اُمید رکھتا ہے اللہ سے ملاقات کی آخرت میں تو بے شک اللہ کا وعدہ آنے والا ہے ۔ وہ صادق الوعد ہے جس کی شان بلند ہے ، جس کی گرفت مضبوط ہے ۔ پس اس کا وعدہ ملاقات کا برحق ہے ۔ اور اس ملاقات کی اُمید کا واثق ہے مومن بندے کے دل میں اور وہ دیکھے گا عنقریب اپنے رب کو جیسے وہ دیکھتا ہے چاند کو بدر کی رات ۔ اسی لیے شرط لگائی اُمید کی اللہ سبحانہ نے اپنے قول میں حصولِ دیدار کے لیے ۔ پس جو نہیں اُمید رکھتا ملاقات کی ، اور نہیں دیکھتا اس کی نشانیاں اور نہیں مائل ہوتا اس کی تجلیات کی طرف اور انکار کرتا ہے اُس کی اخروی رویت (دیدار) کا دُنیا میں جس کا کہ وعدہ کیا اللہ نے اپنی ملاقات کا ۔ پس وہ نہیں دیکھے گا آخرت میں بھی ، جیسے وہ نہیں دیکھتا دُنیا میں بھی ۔ جو اس دُنیا میں اندھا ہے ، پس وہ آخرت میں بھی اندھا ہے ۔ بے شک وہ لوگ جو نہیں اُمید رکھتے ہماری ملاقات کی ، اور راضی ہو گئے حیاتِ دنیوی سے اور اسی کے ساتھ مطمئن ہو گئے ہیں ، اور وہ لوگ جو ہماری آیات سے غافل ہیں ، ان سب کا ٹھکانہ جہنم ہے اس وجہ سے جو وہ کمائیاں کرتے ہیں ، اور جان لو کہ وہ اشکالات جو کہ لازم آتے ہیں آنکھوں سے دیکھنے کے اقرار سے ، یہ محاذات (روبرو ہونا ۔ مقابل ہونا) میں سے اور جگہ کے معین کرنے میں سے ہے ۔ اور یہ ہوتا ہے کسی جہت میں محدود کرنے کے فعل کو فرض کرنے سے دوسری جانب کو چھوڑ کر اور ایک سمت یا دوسری سمت کو چھوڑ کر ، اور پورا پورا لے لینا نگاہ کا ، اور تنظریے کو احاطے میں لے لینا تمام کا تمام ۔ ہرگز نہیں بلکہ شک کرنے والوں کے دلوں پہ زنگ چڑھا ہوا ہے ۔ نہیں ہے وہ کہیں ۔ وہ ہر جہت اور طرف میں ہے ، پس جس طرف بھی تم مُنہ پھیرو گے ، وہیں اللہ تعالیٰ موجود ہے ۔ اور اُسے احاطے میں نہیں لے سکتی بصیرت ۔ پس نگاہ ایسا کیوں کر سکتی ہے ، جب وہ خود ہر چیز کو احاطہ کیے ہوئے ہے ۔ اور مزید یہ کہ یہ تمام اشکالات ہوتے ہیں اس کثیر حسی عالم میں اور اخروی لطیف عالم میں نہیں ہوتا حال وہاں اس طرح ، کیونکہ عالم لطیف میں جمع ہوتے ہیں اضداد ، اور نہیں مانع

اضداد کا جمع ہونا۔ مثلاً یہ کہ دیکھے انسان خواب میں ایک عظیم سمندر کہ جس کی گہرائی کی کوئی اتھاہ نہ ہو اور جس کا کوئی کنارا نہ ہو۔ اسی چیز کو دیکھے تنگ اور محدود مکان میں کہ سمندر بہ رہا ہو اور چل رہا ہو نیچے سے اوپر کی طرف، اور نکل رہی ہوائیں سے آگ بھڑکتی ہوئی جس سے وہ مشاہدہ کرے اس سمندر کی گہرائی کا، اور وہ چلا جا رہا ہو اپنے چہرے کی سیدھ میں اپنے دونوں قدموں پر بغیر غرق ہوئے، اور وہ اڑتا ہو شعلوں میں بغیر جلے ہوئے، اور نہیں جھٹلاتی عقل باوجود اس کے کہ پانی اور آگ کا ایک جگہ پر جمع ہونا عملاً ممکن نہیں۔ اور انتہا اور لا انتہا، اور وسعت اور تنگی اور حالت میں تغیر مائل ہوتا ہے۔ چیز کا طبعی میلان کے خلاف بلا رکاوٹ۔ یہ خالی ہونا ہے چیز کا ان کے لوازم ذاتیہ سے۔ پس اسی طرح نہیں مانع ہوتا سمت اور محاذات کا مقید ہونا عالم اخروی میں جو لطافتوں والا ہے عالم رویا سے۔ اور رب کو دیکھنے کی مثال جو کسی سمت میں نہیں ہے، اور نہ مکان میں ہے نہ زمان میں ہے۔ اسی عالم حسی میں بھی ہوتا ہے ان خواص کے لیے کہ ہو جاتی ہے دُنیا ان کے حق میں آخرت حقیقتاً ان کے معاملات ان کے رب کے ساتھ ان کو قبول نہیں کرتی عوام کی عقل، اور ان سے معاملہ کیا جاتا ہے جو کچھ کہ کیا جاتا ہے۔ اور وہ وقت (رات) گزار دیتے ہیں اپنے رب کے ہاں، اور وہ اُنھیں کھلاتا ہے، اور اُنھیں پلاتا ہے، اور وہ دیکھتے ہیں جو کچھ کہ دیکھتے ہیں۔ اور سنتے ہیں جو کچھ کہ سنتے ہیں، اور نہیں سمجھتا ارباب ذوق کا کلام مگر صاحب ذوق ہی۔ جو نہیں چکھتا وہ نہیں جانتا۔

دیدار اور تجلّی کی حقیقت کے بیان کا باب

اس امر کا بیان کہ اللہ جل شانہٗ کے دیدار کی اور تجلّی کی حقیقت کیا ہے۔ اور اس عالم شہود میں عارفوں کو تجلّیات ذات کیسے میسر آتی ہیں، اور اُس عالم آخرت میں سارے مومنوں کو یہ دیدار کیسے نصیب ہوگا؟ اور حق سبحانہٗ تعالیٰ اس عالم میں نظروں سے کیسے پوشیدہ ہے۔ اور اُس عالم آخرت میں بھی کس حیثیت سے پوشیدہ رہے گا۔ یہ سمجھ لیجیے کہ اس مسئلہ دیدار میں مختلف اسلامی فرقوں میں اختلاف ہے۔ ان میں سے چند ایک فرقے آخرت میں دیدارِ ذات کے اقراری ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ یہاں اس دُنیا میں بھی باطنی آنکھوں سے حق تعالیٰ کا مشاہدہ روا ہے۔ لیکن اس دُنیا میں ظاہری آنکھوں سے نہیں دیکھا جا سکتا۔ خواب میں دیکھنا بھی جائز ہے۔ اور انشاء اللہ مومنوں کو آخرت میں بھی دیدار میسّر

ہو جائے گا۔ خود خدا نے فرمایا ہے کہ جو شخص اپنے رب سے ملنے کی اُمید رکھتا ہے تو اُس کو تو ایسے ایسے حوادث سے پریشان نہیں ہونا چاہیے، کیونکہ اللہ تعالیٰ سے ملنے کا وہ وقتِ معین ضرور آنے والا ہے۔ اور اس سلسلہ میں احادیثِ نبویؐ کو بھی بطور ثبوت لاتے ہیں، کہ بے شک تم عنقریب دیکھو گے اپنے رب کو عیاں طور پر۔ پس ایسی چیز جس کی اللہ کے رسولؐ نے خبر دی ہے، یقینی ہے۔ عشاق کے شوق کے کیا کہنے۔ اگر دیدار کی بات درمیان میں نہ ہوتی تو عشاق کا دل کس چیز سے آسودگی پاتا۔ حوروں اور محلات کے معاملات تو دُنیاوی معاملات کی طرح ہیں، اور جنت کے عجائبات کی تمنا کرنا اہل حرص و ہوا کا کام ہے۔ اور ان فرقوں کی اکثریت حق عزّوجلّ کے دیدار کی ہر دو عالم ہی میں انکاری ہے۔ یہ بھی کلام اللہ ہی سے سندیں پیش کرتے ہیں۔ اور اس آیتِ کریمہ کا سہارا لیتے ہیں جس کے معنی ہیں کہ اس کو تو کسی کی نگاہ محیط نہیں ہو سکتی، اور وہ سب نگاہوں کو محیط ہو جاتا ہے۔ اور وہ بڑا باریک بین اور باخبر ہے۔ ہر گروہ اس چیز کے ساتھ جو اس کے پاس ہے خوش ہے۔ خدا کی قسم اس ذاتِ کبریا کے دیدار کی کسے طاقت اور آنکھوں میں اس کے دیدار لطیف کی اہلیت کہاں؟ دیدار میں تو سمت اور روبرو ہونے کی شرط ہوتی ہے اور ذاتِ حق تعالیٰ صاحبِ جہت نہیں۔ اُس حضرت بے مثال اور لاثانی سے روبرو ہونا اک امر محال ہے۔ جس نے اُسے پہچان لیا تو اس کے ادراک کے سلسلے میں اپنے عجز کا اعتراف کر لیا۔ آنکھوں یا بصارت کو یہ طاقت کہاں کہ اُسے دیکھنے کی جرأت کریں۔ قصہ کوتاہ یہ کہ جو کچھ جناب امیر المحدثین (اللہ ان کے باطنی رازوں سے ہمیں قوت و برکت دے) یعنی والد بزرگوار کی برکت سے مجھ فقیر حقیر پہ ظاہر ہوا اور جو کچھ جامعیتِ محمدیہؐ (ان پر خدا کا درود و سلام) کے فیضان کی عمومیت سے مجھ پہ کشف ہوا، وہ یہ ہے کہ دیدار حق کے یہ اقراری اور انکاری دونوں گروہ سچ ہی کہتے ہیں۔ کیونکہ ہر کسی کے پاس آیاتِ قرآنی کی سند ہے۔ مگر جو کچھ وہ کہتے ہیں، بے سوچے سمجھے کہتے ہیں اور وہ معاملے کی حقیقت سے آگاہ نہیں، اور کلام اللہ کی آیات کے ماحصل کو نہیں پا سکے۔ وگرنہ وہ کتاب اللہ کی بعض آیات ہی کو سند نہ ٹھہراتے۔ ہماری سند تو پورا قرآن مجید ہے دیکھئے یہ آیت کریمہ کہ (بس یوں کہو) تم کتاب کے بعض احکام پر تو ایمان رکھتے ہو، اور بعض پر ایمان نہیں رکھتے۔ لیکن کریں بھی تو کیا؟ ان کے دلوں سے خودی کا پردہ نہیں اُٹھا اور ان پر طریقِ محمدیہؐ کی کلیت و جامعیت کا انکشاف نہیں ہوا۔ وہ اپنے جزوی تصوّر اور کوتاہ اندیش عقل

ہی کے بل بوتے پر حکایتاً ہی ایسے الفاظ زبان سے نکالتے ہیں، اور جو کچھ وہ زبان سے کہتے ہیں اس کی رمز سے وہ آگاہ نہیں۔ فائدہ اس مسئلے پر ان کا اختلاف ویسے ہی ہے جیسے کہ وجود کے موضوع بحث پر متکلمین اور حکما میں اختلاف ہے، اور معاملے کی حقیقت کے سمجھے بغیر باہم بحث مباحثے کیے جا رہے ہیں اور لڑ بھڑ رہے ہیں۔ اگر وہ مرتبۂ ذات الوجود کو جو موجودیت کا نشانِ امتیاز ہے اور مرتبۂ وجود ظلی کو جو مصدری معنوں میں ہے، سمجھ کر ہر مرتبے کے احکام کو اسی مرتبے پر چسپاں کریں جو اس کے لیے لازم ہے، اور لفظ وجود کا اسی پر اطلاق کریں جو اس کے مرتبے کے شایانِ شان ہے تو پھر کوئی شک و شبہ پیدا نہ ہوگا۔ اور باہمی اختلاف جاتا رہے گا۔ اور چشمِ بصیرت سے حجاب پوری طرح اُٹھ جائے گا۔ اسی کو لے لے کیونکہ یہی فوائد کی اصل ہے!!

دیدار کے سلسلے میں تحقیق

یہ دیکھ لیجیے کہ رویت (دیدارِ ذات) کے معنی علم و وجدان کے ہیں جو قلب انسانی کے افعال میں سے ایک فعل ہے۔ اس میں حواس باصرہ کو کوئی دخل نہیں۔ اگر یوں ہو تو پھر اس متعدی فعل کو دو مفعولوں سے رجوع ہوگا۔ جیسے میں نے زید کو عالم دیکھا، بمعنی میں نے جان لیا۔ اور رویت کے معنی آنکھ سے دیکھنے کے بھی ہیں۔ ان معنوں میں وہ متعدی بیک مفعول ہے۔ جیسے میں نے زید کو دکھایا۔ علم بمعنی علم حاسہ بھی آیا ہے۔ (حس کرنے والا) جیسے میں نے اس کی شخصیت کو پہچان لیا۔ یہ ہے کسی چیز کی اصل کو جان لینا بغیر حکم کے۔ اور رویت (دیدار) بھی اگر ایسا متعدی ہی ہو جو مفعول واحد کو چاہتا ہے اور اُس سے مقصود بغیر حکم کے کسی شے کی حقیقت کا علم ہو تو وہ رویتِ علمی ہے۔ پس چونکہ رویت کا استعمال ان دونوں معانی میں ہے۔ جہاں کہیں جس کسی معنی کی حیثیت و صلاحیت اس میں ہوگی، اور اُس سے منظور اور مُراد بھی وہی ہو، تو وہ اس معنوں میں استعمال ہوا، اور اسی طرح ارائیت جس طرح کہ اس قول میں کہ میں نے نہیں دیکھی کوئی چیز، مگر یہ کہ میں نے دیکھ لیا اللہ کو اُس سے پہلے اور اُس کے ساتھ اور اُس کے اندر اور اس کے بعد۔ پہلے تو آنکھوں کی بینائی (ابصارت) سے، اور دوسرے دل کی بینائی (بصیرت) سے دیکھنا ہے۔ اسی طرح فارسی میں بھی (دیدن) انہی دو معنوں میں مستعمل ہے یعنی دانستن (جاننے) اور بمعنی دیدن آنکھ سے دیکھنے کے۔ جیسے کہ تم کہتے ہو کہ میں نے زید کی حقیقت کو دیکھا۔ گویا زید ہی کی

صورت کو دیکھا، جانا اور پہچانا۔ یعنی دیکھا میں نے اُسے ظاہری آنکھوں کی جانچ سے۔ اور بَصَر کے (ب) اور (ص) دونوں پر زیر ہوں تو وہ بھی بینائی اور دانائی دونوں کے معانی میں استعمال ہوا ہے۔ جیسے میں نے اُسے دیکھ لیا یعنی پہچان لیا۔ اور جیسے کہ اللہ تعالیٰ کا قول ہے کہ میں نے وہ چیز دیکھی جو تم نے نہیں دیکھی (یعنی میں وہ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے) دل کی بینائی بمعنی بصیر۔ بینا و دانا اور الابصار بمعنی دیدن اور بمعنی البصرت قریب ہیں علم حاسہ کے معانی کے۔ بصیرت یعنی کسی چیز کی آگہی و بینائی۔ انہی معنوں کے سلسلے میں دیکھئے یہ فرمان الٰہی: بلکہ اس روز انسان خود اپنی حالت پہ خوب مطلع ہوگا۔ اور اگر دونوں حروف پر زیر کے ساتھ پڑھا جائے تو مطلب ہوگا کہ کسی چیز کو غور سے دیکھنا اور اس پہ نگاہ رکھنا، پس چیز نظر آنے والی ہوگی۔ رویت کے معنی اگر علم لیے جائیں تو پھر وہ معلوم چیز ہوگی، یعنی جس کا علم ہو۔ اور اگر روئیت کے معنی آنکھ کی بینائی کے لیے جائیں تو چیز مبصر (بینائی والی، پہچاننے والی) ہوگی۔ حاصل مطلب یہ کہ اللہ تعالیٰ کی تجلیات اور نشانیاں جو تشبیہی مراتب ہیں، اور روئیت اور ابصار دونوں کے لائق ہیں، اس دُنیا میں بھی دیکھے اور پہچانے جا سکتے ہیں، اور اُس عالم میں پوری پاکیزگی و تازگی سے دیکھے جا سکیں گے اور عارفوں اور مومنوں کی آنکھیں اور دل ان سے خوب محظوظ ہوں گے۔ اور تنزیہی مدارج اس لطافت کے ساتھ جس کا تعلق علم و عرفان سے ہے جب کہ مرئی کو معلوم کے معنوں میں لیا جائے، اور عارف اس عالم میں بھی اس روئیت (دیدار) سے شرفیاب ہوئے ہیں، اور اُس عالم آخرت میں بھی ان پر پوری طرح ظاہر ہوگا۔ اور وہ اپنے روبرو آنکھوں سے اس کا معائنہ کر سکیں گے۔ ترمذی سے روایت ہے کہ ابن عباس نے کہا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے رب کو دیکھا۔ عکرمہ نے کہا کیا اللہ یہ نہیں کہتا کہ اُسے نگاہیں نہیں پا سکتیں، اور وہ نگاہوں کو پا لیتا ہے۔ تو ابن عباس نے کہا تیرا ستیا ناس ہو یہ اس وقت ہے جب کہ اللہ تعالیٰ نے تجلّی کی نور سے جو اس کا نور ہے۔ اور دیکھنے والا اگر یہی مادی بصارت رکھتا ہے تو اس کو نظر آنے والی چیزیں بھی مادی ہی ہونگی۔ جیسے کہ حیوانات کو نظر آنے والی چیزیں، کیونکہ حیوانات صرف جزئیات کا ادراک رکھتے ہیں۔ اور صرف غیر مادی بصیرت ہو تو اُس کو نظر بھی مادہ سے پاک (غیر مادی) چیزیں آئیں گی۔ جیسے فرشتے کہ ان کی معلومات کامل ہیں۔ اگر ان ہر دو (یعنی بصارت و روئیت) کا جامع ہو تو اُسے مشاہدے کے تمام تشبیہی اور تنزیہی مراتب حاصل ہیں اور اس کے دیدار میں مادیات و مجردات سبھی شامل ہوں گے۔ جیسا کہ انسان جو دُنیا و آخرت کے

تمام مراتب کا جاننے والا ہے اور لامتناہی تجلیات کا دیکھنے والا ہے۔ یہ کامل جامعیت انسان کامل کے سوا کسی مخلوق کو بھی نہیں ہوتی۔ وہ اشرف المخلوقات ہے۔ اللہ تعالیٰ ظاہری اور باطنی طور پر سوائے انسان کامل کے کسی اور پر تجلی ریز نہیں ہوا۔ حق بات تو یہ ہے کہ واقعی وہ خلافت الٰہیہ کا مستحق ہے۔ اور "علم آدمؑ الاسما" والی آیت کریمہ اسی بات کی خبر دیتی ہے۔ اس تمام انکشاف کے باوجود بھی مخلص محمدیوں کا ورد ہے۔ "ما عرفناک" یعنی کہ اے خدا ہم تیری معرفت کو کما حقہٗ حاصل نہ کر سکے۔ اور اُن کا اسپِ ہمت ہمیشہ چالاک، اور ان کا ذوق وشوق روز افزوں ہے۔ اور ان کی توجہ خدائے بیمثال اور مرتبہ ذات پاک کی طرف ہے، جو علم ومعرفت اور دیدار سے ماورأ ہے۔ اس لحاظ سے کہ نہ تو اس کا پورا ادراک ہو سکتا ہے، نہ ہی علم، اور نہ ہی اُسے دیکھا جا سکتا ہے۔ اور حضور نبی کریم صلعم نے فرمایا کہ بے شک اللہ تعالیٰ عقلوں سے بھی اسی طرح پردے میں ہے جیسے کہ پردے میں ہے نگاہوں سے، بے شک ملاء اعلیٰ اس کو طلب کرتے ہیں جیسے تم اس کی تلاش میں ہو۔ ہر چند کہ یہ تمام مراتب جن کا ذکر ہوا مُراد اسی سے ہے۔ ہر مرتبہ میں صاحبِ ادراک و بصیرت بھی وہی ہے۔ کیونکہ ان مراتب کا فرق ان کی حیثیتوں کی بنا پر ہے۔ وگرنہ ان اضافات سے قطع نظر کریں تو وہی مرتبہ جس کا نہ علم ہے نہ دیکھا جا سکتا ہے، نہ اس کا ادراک اور بصیرت ہو سکتی ہے۔ اور وہی مرتبے جو دیکھے جا سکتے ہیں یا جن کا علم ہو سکتا ہے، وہی ماورائے ادراک و بصارت ہیں۔ پس اس بے عیب ذات باری تعالیٰ کو اس تمام پاکی و پاکیزگی کے باوجود تمام عارف اور مومنوں کو ان کے اپنے اپنے مراتب کے مطابق رویت مسلم ہے بغیر کسی تغیر و تبدل کے ذاتِ واجب میں۔ ع باوجود اس کے کہ تم اسے نہیں دیکھ سکتے پھر بھی ہر سو اسی کے جلوؤں کو دیکھ رہے ہو۔

تمثیل

مثال کے طور پر اگر ماہیت اور ہویت (وحدت ذات) کا فرق نہ کرو اور تشبیہہ و تنزیہہ کو ملحوظ نہ رکھو اور کل و جزو کے اعتبار سے نگاہ نہ ڈالو، اور روح و جسم کے مرتبے کا امتیاز نہ کرو۔ نوع اور فرد کے معانی میں فرق نہ کرو اور کہو کہ میں نے انسان کو ظاہری آنکھ سے دیکھا تو بھی یہ درست و صحیح ہے۔ کیونکہ وحدتِ ذات ماہیت کی مظہر ہے، اور تشبیہہ تنزیہہ کا آئینہ ہے۔ اور جزو، کل کا منظر، جسد،

روح کا آئینہ دار، اور افراد، انواع ہی کی جلوہ گاہ ہیں۔ لہذا آنکھ سے انسان کا دیدار مسلم اور تحقیق شدہ ہے۔ اگر ماہیت کی کلیت اور ہویت کی جزویت پہ تحقیقی نگاہ نہ ڈالو، اور تنزیہی و تشبیہی مراتب کو الگ الگ کر دو۔ روح اور جسم میں فرق کرو۔ نوعی معنی کے اطلاق میں تمیز اور فردی معانی پہ تقید کر دو، اور تمہارا مقصود وہی عالی مراتب ہو اور کہو کہ میں نے انسان کو ظاہری آنکھ سے نہیں دیکھا اور نہ ہی دیکھ سکتا ہوں۔ یہ مادی آنکھیں ان غیر مادی چیزوں کے دیدار کی اہلیت ہی نہیں رکھتی تو بھی یہ صحیح و درست ہے۔ اور انسان کے ظاہر و باطن پہ مجموعی طور پر اگر عرفانی نگاہ ڈالو اور کہو کہ میں نے ایک لحاظ سے انسان کو دیکھا ہے، اور ایک لحاظ سے نہیں دیکھا تو یہ بھی درست و صحیح ہے۔ اور اگر اپنے ہی ظاہر و باطن کا ملاحظہ کر کے کہہ دو کہ میں انسان کو ظاہراً بھی دیکھتا ہوں اور باطناً بھی تو بھی صحیح و درست ہے۔

خلاصہ

حاصل کلام یہ کہ رویت (دیدار الہی) سے انکار نہیں کرنا چاہیے، بلکہ لقاء اللہ کا امیدوار رہنا چاہیے، اور کبھی بھی یاس و نومیدی کے بیابان میں بھٹکتے ہوئے خود کو اس سے محروم نہ کرنا چاہیے۔ کیونکہ قرآن شریف میں آیا ہے کہ ہم ان لوگوں کو جن کو ہمارے پاس آنے کا کھٹکا نہیں ہے، ان کے حال پہ چھوڑے رکھتے ہیں کہ اپنی سرکشی میں بھٹکتے رہیں۔ اور نہ ہی اس کے دیدار کے مادی مبصرات کے دیدار کی طرح قائل ہو جانا چاہیے۔ اس ذات واجب الوجود کو اپنے ناقص فہم سے ممکن الوجود موجود سمجھ کر امکانی دائرے میں داخل کرتے ہوئے اُسے جہات و اطراف، آگے، پیچھے، سامنے یا روبرو ہونے کا مقید نہیں بنانا چاہیے۔ لہذا حق بات یہ ہے کہ نہ تو رویت کا اقرار کرنے والے ہی رویت کی حقیقت کو کما حقہٗ سمجھ سکے ہیں۔ اور نہ ہی رویت کے منکرین ذات کی ماہیت کو کما حقہٗ بھانپ سکے ہیں، خود ہی اپنے ذہن میں ایسے معانی تراشے بیٹھے ہیں جو رویت کے حقیقی معنوں کے برعکس ہیں، اور یوں اس کا اقرار یا انکار کرتے ہیں، اور ناسمجھی سے باہم نزاع کھڑا کر رہے ہیں۔ ان کو جو مشکلات پیش آ رہی ہیں، وہ ان کے انہی موہوم معانی کے دم سے ہیں۔ ورنہ جو کچھ خدا اور اُس کے رسول ؐ نے فرمایا ہے وہ حق اور حقیقت ہے۔ اس میں کسی قسم کے شبہ و تردد کی گنجائش

نہیں۔ خدا نے جو کچھ فرمایا وہ سچ ہے، اور وہی راستوں کی ہدایت دینے والا ہے۔

تجلّی کی مزید تحقیق اور اس کی قسمیں

تجلّی کا مطلب ہے منکشف یا آشکارا ہونا خواہ وہ دل پہ آشکار ہو خواہ آنکھوں پہ۔ پس جو کچھ عالمِ غیب سے دل پر منکشف ہو اسے وجدانی تجلّی کہنا چاہیے، اور جو کچھ آنکھوں سے دیکھا جائے اسے مشہودی تجلی کہنا چاہیے۔ اِن میں سے ہر ایک کی دو دو قسمیں ہیں: وجدانی تجلی یا تو حالی ہوتی ہے یا کشفی۔ حالی وہ جس میں حال کا غلبہ ہو اور وہی غلبہ انکشاف کا باعث بن جائے، جیسے کہ مجنوں کی حالت تھی کہ عشق کی فراوانی اور تجلّی کے تصور کی کثرت کو خود پر جلوہ ریز پاکر خود کو ہی لیلیٰ سمجھنے لگا، اور پکار اُٹھا کہ میں ہی لیلیٰ ہوں۔ منصور نے بھی اسی حالت میں انا الحق کہا تھا۔ اس حالت میں امرِ معلوم کا مطابق واقع ہونا ضروری نہیں۔ ہوسکتا ہے مطابق واقع ہو اور ہوسکتا ہے کہ نہ بھی ہو لیکن پکارنے والا صاحبِ حال اپنی بات میں سچا ہے۔ اُس نے تو وہی کچھ کہا جو اُسے دکھایا گیا، اور کشفی تجلّی وہ ہے جس میں انکشاف کا باعث غلبۂ حال یا اس کی شدت نہ ہو بلکہ انکشاف حقیقت کی وجہ تزکیۂ نفس اور تصفیۂ قلب ہو، اور جو کچھ واقعی ہو وہ اُسے وہی دکھاوے۔ ہر کُند نظر کی نگاہ اُسے نہیں دیکھ سکتی۔ اس معاملے میں امرِ واقع سے تجاوز جائز نہیں۔ دیکھئے یہ آیت کریمہ، کہ قلب نے دیکھی ہوئی چیز پر کوئی غلطی نہ کی۔ مشہودی تجلی یا نوری ہوتی ہے یا صوری۔ نوری وہ جس میں شکل و صورت نہ ہو صرف نور ہی نور ظاہر ہو۔ سالکانِ راہِ حقیقت پہ یہ نورانی تجلیات ان کی استعداد و اوقات کے مطابق پنج گانہ لطائف (غیبی عنایات) یعنی قلب، روح، سِرّ، خفی اور اخفیٰ کی مختلف انواع اور مختلف رنگوں مثلاً زرد، سُرخ، سفید، سیاہ اور سبز رنگوں میں رونما ہوتی ہیں۔ یہ سب رنگ اسی مرکزِ انوار کے رنگ ہیں جو نوری وجود ہے، اور اپنے مظاہر میں جلوہ گر ہوتا ہے۔ جیسا کہ مولانا جامیؒ نے فرمایا ہے کہ سب صورتیں رنگ برنگے شیشے تھے جن پہ آفتابِ وجود کا عکس پڑا۔ شیشہ جس رنگ کا تھا، سُرخ، زرد یا سبز، آفتاب کا نور اسی رنگ میں نظر آیا۔ ان تجلیات کی شہودی حالت میں صاحبِ معاملہ کے لیے جہت، غیر جہت یا تنزیہہ و تشبیہہ کا لحاظ نہیں ہوتا، تاکہ اس مقدس ذات کے حضور اُسے ان مشکلات سے دوچار نہ ہونا پڑے جو ناواقفوں کو پیش آتی ہیں۔ جس نے

یہ کام کیا ہے وہی ان رموز کو جانتا ہے، اور خدا نے چاہا تو عالمِ آخرت میں بھی حق جل شانہٗ کا وہ نور مطلق مومنوں کو اس دُنیا سے بھی بڑھ کر نظر آئے گا، اور ان کی باطنی آنکھ اپنے رتبے میں ترقی کر کے اس مخفی ترین مرتبے کو دیکھنے کی اہلیت پالے گی۔ اور ہر کسی کے کان میں قرآن مجید کی یہ نوید جانفزا سنائی دے گی، کہ آج تو ہم نے تیرا پردہ ہٹادیا، آج تو تمھاری نظر بڑی تیز ہے۔ اور صوری تجلّی وہ جو شکلاً یا صورتاً ہو، خواہ کسی مخصوص شکل میں یا معین شخصیت میں، جیسا کہ میں نے خدا کا دیدار پایا گھوڑے کی صورت میں، یا کہ میں نے دیکھا اپنے رب کو امرد (بے ریش لڑکے) کی صورت میں۔ خواہ تمام شخصیتوں یا شکلوں میں اس آیت کریمہ کے اطلاق کی راہ سے۔ کہ یاد رکھو کہ وہ لوگ اپنے رب کے روبرو جانے کی طرف سے شک میں پڑے ہیں۔ یاد رکھو کہ وہ ہر چیز کو اپنے علم کے احاطے میں لیے ہوئے ہے۔ یہ آیت بھی اسی تجلّی کی تائید کرتی ہے کہ عارفوں کو تو دُنیا میں بھی ان نورانی اور صوری تجلیات سے نوازا جاتا ہے، اور عاقبت میں بھی وہ جمیلِ مطلق کے مشاہدے سے شرف یاب ہوں گے۔

سلوک کی اصطلاحی تجلّیات کی قسمیں

ذاتی تجلّی وہ ہے جس کا بغیر کسی صفت کے اعتبار کے مبدا اُو منشا خود ذات ہی ہو۔ یعنی بلا ملاحظہ ذاتی شانوں، حضوری اور مشاہدے کے، لیکن یہ اصطلاحی معنی ہیں، کیونکہ سالکوں کو راہِ سلوک میں جب یہ حاصل ہوتی ہے، اور صفاتی اور اسمائی اعتبارات کے کسی اعتبار، اور دنیوی و اُخروی مظاہر میں سے کسی مظہر کے بلا ملاحظہ اس بارگاہِ اقدس میں توجہ اور رجوع حاصل ہو جاتا ہے۔ اور ان پر اپنے علم کے مطابق ذاتی، وصفی، عینی اور اثری طور پر فنا فی اللہ کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے اور اس موہومہ انانیت کا شعور جاتا رہتا ہے۔ اور بقا باللہ کی کیفیت ظہور پذیر ہوتی ہے، تو وہ خود درمیان میں بالکل نہیں رہتے۔ اب اُن کا دہی وجود ہی موجود ہوتا ہے۔ اور وہ اس مرتبے کو پہنچ جاتے ہیں جہاں کہا جاتا ہے، کہ نہیں جانتا اللہ کو مگر اللہ ہی، اور نہیں ذکر کرتا اللہ کا مگر اللہ ہی۔ محققین ذاتی تجلّی کی بشارت دیتے ہیں۔ وگرنہ فی الحقیقت تو ذاتی تجلّی محال ہے، اور اسمائے حسنیٰ اور صفات کی وساطت کے بغیر ذات تک پہنچنا محض اک خیال ہے اور اک گمان۔ نہیں حق جلوہ فرما ہوتا اپنی ذات کی حیثیت سے موجودات پر۔ مگر یہ کہ پردے کے پیچھے سے اسمائی پردوں میں سے۔ اسی لیے اللہ عزوجل نے کہا

کہ وسیلہ پکڑو اس کی طرف اور کہا کہ ڈراتا ہے اللہ تعالیٰ تمھیں اپنے آپ سے، اور اُس کے ساتھ تمام تجلیات ذاتی ہیں۔ کیونکہ صفات اور اسماء کا وجود نہیں ہے مگر ذات کے ساتھ، اور نہیں ظاہر ہوا ان مراتب میں کچھ بھی مگر اُس کی ذات ہی۔ صفاتی تجلّی ان لوگوں کی اصطلاح ہے جن کا مبداء و منشا صفات ہوں، صفاتی تعین کی حیثیت سے، اور امتیاز اس کا ذات سے۔ اگر معاملے کی حقیقت پر نگاہ ڈالو تو تمھیں پتہ چل جائے گا کہ ذاتی تجلّی بھی صفاتی تجلّی ہی ہے۔ اور صفاتی تجلّی بھی ذاتی تجلّی ہی ہے۔ اور نہیں ہے فرق مگر امتیازات اعتباریہ کے ساتھ۔ جیسے کہ تمام مراتب میں ہوتا ہے۔ پس جامع عارف نہیں غافل ہوتا۔ دو حیثیتوں سے تمام مدارج ہیں۔ صفاتی تجلّی کی حالت میں سالک میں اپنی ذات کا شعور باقی رہتا ہے۔ لیکن اپنے آپ کو وجودی آثار کا مبدا نہیں پاتا، اور اپنی ساری نسبتوں اور اضافتوں کی نفی کرتا ہے۔ اور اپنی صفات کو خدائی صفات کا مظہر سمجھتا ہے۔ اور اسی کی مدد و معاونت سے کمالات کا حصول کرتا ہے۔ یہ حدیث قدسی کہ اللہ کا پیارا بندہ اسی سے سنتا ہے اور اسی کے ذریعے دیکھتا ہے، بھی اسی امر کی خبر دیتی ہے۔ اس مقام پر فنا بھی میسّر ہو جاتی ہے۔ لیکن وہ مکمل فنا نہیں ہوتی، اور سالک مکمل طور پر ظلّی مراتب سے باہر نہیں آتا۔ اور فعلی تجلّی وہ ہے جس کا مبدا و منشا فعل ہو، یعنی کہ ہر فعل میں اس فاعل حقیقی ہی کو کارگر پائے۔ اس حالت میں سالک کو ایک معمولی سی فنا حاصل ہوتی ہے۔ اور اپنے وجود اور کمالاتِ وجود کا شعور برقرار رہتا ہے۔ لیکن ان کمالات و صفات کے نتائج کے ظہور میں یعنی ان افعال میں وہ مشیت ایزدی اور ارادۂ خداوندی کو کارفرما پاتا ہے۔ اور اس پہ اس آیت کریمہ کی بدولت حقیقت کھُل جاتی ہے کہ بدون خدا کے چاہے تم لوگ کچھ نہیں چاہ سکتے۔ جس طرح وہ اپنا اور دوسروں کا خالق اسی کو سمجھتا ہے۔ اسی طرح اپنے اور دوسروں کے اعمال و افعال کا خالق بھی اسی کو گردانتا ہے۔ جیسا کہ قرآن پاک میں ہے کہ تم کو اور تمھاری ان بنائی ہوئی چیزوں کو اللہ ہی نے پیدا کیا ہے۔ جب سب کی ذاتیں اسی کی بدولت موجود ہیں، اور اسی نے پیدا کیں۔ لہٰذا ان سے سرزد ہوتے والی فروعات ان کی اپنی کیسے ہو سکتی ہے۔ اس فعلی تجلی کا مرتبہ صفاتی تجلّی سے کم تر ہے۔ کیونکہ یہ تجلّی صفات کے مظاہر سے تعلق رکھتی ہے اور کائنات ہی کے مراتب میں اس کا مشاہدہ ہوتا ہے۔ اس مقام پر جس طرح سالک اپنے سارے جسم میں اپنی رُوح کے حکم کو نافذ پاتا ہے، اور اُس کے حکم کے بغیر اس کے جسم سے کوئی حرکت

سرزد نہیں ہوتی، اسی طرح اپنے یا اپنے سے الگ ساری کائنات میں اس کی قدرتِ کاملہ کا مشاہدہ کرتا ہے، اور سب کو تقدیرِ الٰہی کے سامنے بے بس پاتا ہے۔ اور سمجھ جاتا ہے کہ اللہ کے حکم کے بغیر کوئی ذرہ بھی حرکت نہیں کرسکتا۔ رباعی:

فریاد کہ حسنِ بے حجاب اورا
در پردہ نہفت پردۂ کوریٔ ما
صد جلوہ نمود یار وما بے خبراں
افسوس نداشتیم چشمِ بینا

ترجمہ رباعی: فریاد ہے واویلا، واحسرتا کہ اس کے حُسن بے حجاب کو (بے پردہ حسن کو) ہماری کور چشمی (اندھے پن) نے پردوں میں چھپا دیا۔ محبوب نے سینکڑوں جلوے دکھائے مگر افسوس کہ ہم بے خبروں کے پاس ہی چشمِ بینا نہ تھی۔ حُسن بے حجاب سے مراد مرتبۂ حضرتِ وجود ہے۔ جو آشکارا واضح اور مدرک اول ہے۔ کوری سے مراد اس حقیقت سے غافل ہوتا ہے۔ اس ذات واحد کے سینکڑوں جلوؤں سے مراد کثرت اور چشمِ بینا سے مراد حقیقت بین آنکھ ہے۔ حاصل رباعی یہ کہ نورِ وجود ویسے ہی آشکار ہے جیسے کہ سورج، لیکن ہم غافلوں کے پاس حقیقت بین آنکھ نہ تھی۔ کہ حُسن وحدت کا مشاہدہ کثرت کے آئینوں میں کرسکتے، اور انسانی آنکھ کی پتلیوں میں بھی یہ اہلیت نہیں کہ حضرت وجود کے حسن کو اطلاقی حیثیت سے مشاہدہ کرسکیں۔ کیونکہ بصارت مادی قوت ہے اور حیوانات کو بھی حاصل ہے۔ جب حیوانات کو کلیات کا ادراک نہیں، تو پھر وہ مرتبہ جو نہ کلی ہے نہ جزوی اس کا ادراک کیسے ہو؟ ان ظاہری، مادی آنکھوں کا اتنا ہی کام ہے کہ جزوی امور میں سے جو کچھ مشاہدے میں آئے تو ان پہ تصرف رکھنے والا نفس اسے اپنی وساطت سے دکھائے، اور اُس کے لیے بینائی کا آلہ بن جائے۔ وہ قابض اگر فقط نفس حیوانی ہے تو وہ نظر آنے والی چیزوں کو آنکھ کی وساطت سے دیکھے گا۔ جیسے کہ حیوانات جزئی امور کا مشاہدہ کرتے ہیں، اور اگر قابض نفس ناطقہ ہے جو حیواتی اور انسانی روح دونوں کا جامع ہے، تو وہ اشیائے مبصرہ کو حیوانی قوت کی بنا پر آنکھ کی وساطت سے دیکھتا ہے، اور عقلی قوت سے ان غیر مادی اشیا کے کلی یا جزوی ہونے کا ادراک کرتا ہے۔ لہٰذا یہ آنکھ کی پُتلی جس کی حیثیت ایک آلے سے زیادہ نہیں۔ جب وہ اشیا کی جُزویت کو نہیں دیکھ سکتی تو پھر وہ کلیت اور مطلقیت

کے معانی کا ادراک کیسے کر سکے گی جس کے ادراک سے نفس حیوانی بھی عاجز ہے۔ اور اُس وجود کے حسن کا مشاہدہ کیسے کرے جو ہر اضافت سے پاک اور اطلاق سے مبرّا ہو۔ کیونکہ اس مرتبے کا جیسا کہ وہ ہے کسی قوّت یا حس سے ادراک نہیں کیا جا سکتا۔ جیسا کہ قرآن شریف میں ہے۔ کہ اسے کوئی نگاہ محیط نہیں ہو سکتی، اور اُس کی نگاہ سب پہ محیط ہے۔ وہی باریک بین اور وہی باخبر ہے۔ ادراک کے لغوی معنی ہیں کسی شے کا تمام حدود اور انتہا کا احاطہ کرنا، اور اللہ تعالیٰ کی نہ کوئی حد ہے نہ انتہا۔ لہذا آنکھ اس کا ادراک نہیں کر سکتی۔ کیونکہ آنکھیں غیر محدود اور لامتناہی کا ادراک کیسے کریں جب کہ وہ محدود اور متناہی کا ادراک نہیں کر سکیں، بلکہ وہ ذرات میں سے ایک ذرے کی تمام اطراف کا احاطہ نہیں کر سکیں۔ دیکھنا سے مراد ہے عام طور پہ احاطہ یا غیر احاطہ کو ملحوظ رکھے بغیر دیکھنا ہے۔ پس جائز ہے کہ ادراک کے بغیر بھی آنکھوں سے دیدار کے شرف سے مشرف ہو جائیں۔ یہ بھی جان لو کہ دیکھنے کی نسبت ادراک میں عمومیت ہے۔ کیونکہ دیکھنا تو فقط اسی ایک حسِ باصرہ سے مخصوص ہے اور ادراک کا تعلق سبھی حواس سے ہے جیسا کہ تم کہتے ہو کہ میں رنگوں کا ادراک آنکھ سے کرتا ہوں اور آواز کا کان سے، اور علیٰ ہذا القیاس۔ ہر محسوس شے کا ادراک اسی شے کی متعلقہ حس سے محسوس کیا جاتا ہے، اور ادراک کی قوت اپنے آلات کی مدد سے ہر شے کا ادراک کرتی ہے، لیکن وہ ذات سبحانہٗ کی لطافت و تنزیہہ کا مرتبہ ایسا ہے کہ اس کا بصری قوت سے ادراک نہیں ہو سکتا۔ لہذا مذکورہ بالا آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے اپنے لیے لطیف و خبیر کے الفاظ اسی مرتبۂ علم و تنزیہہ کی مناسبت سے کہے ہیں۔ لہذا اس تنزیہہ کو مجرد ہونے کے لحاظ سے تشبیہہ بھی نہیں دی جا سکتی، چہ جائے کہ آنکھ اُسے دیکھ سکے۔ ظاہری باطنی حواس میں سے کوئی حس بھی اس کا ادراک نہیں کر سکتی جب کہ علم کو بھی کماحقہٗ اس کا ادراک نہیں ہو سکتا۔ اسی لیے تو رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ اے رب ہم کماحقہٗ تیری معرفت حاصل نہ کر سکے۔ اور مراتب تشبیہہ میں تنزیہی معنی کی شمولیت کے اعتبار سے ہر مرتبے میں اس کی ہستی کے ادراک کے بغیر بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اور کوئی حس اس کے ادراک سے بے بہرہ بھی نہیں۔ بلکہ آنکھوں کی ذات میں اس کے سوا اور کوئی موجود بھی نہیں۔ کیونکہ وہ تمام نگاہوں پہ محیط ہے والی آیت کریمہ بھی یہی خبر دیتی ہے۔ واہ سبحان اللہ! چونکہ ادراک نفس کا کام ہے نہ کہ بصارت کا۔ اسی لیے خداوند تعالیٰ نے لا تدرکہ الابصار کہا ہے اور لا تراہ الابصار نہیں کہا۔ یہ ایک دقیق بات ہے جو بیان کی گئی ہے

یعنی لفظ ادراک میں ہر چند کہ حس سے ادراک کے معنی بھی داخل ہیں، لیکن مطلق کی جانب حس یا حس کے بغیر ہی ادراک غالب ہے۔ اسی لیے قوت عاقلہ کو جو محسوسات اور معقولات کا ادراک کرتی ہے قوتِ دراکہ بھی کہتے ہیں۔ چونکہ ادراک نفس کا فعل ہے نہ کہ آنکھ۔ خدا تعالیٰ نے آنکھوں سے اُس کی سند کی نفی کر دی، اور روئیت کو آنکھ سے دیکھنے کے معانی میں منع و نفی کے مقابلے میں نہیں لایا کیونکہ وہ قوتِ باصرہ کا کام ہے۔ اسی لیے لا تراہ الابصار نہیں فرمایا، ورنہ ان تجلّیات کے اعتبار سے جو دیکھی جا سکتی ہیں نوری ہوں یا صوری، عارفان کو بھی یہی مشاہدہ حاصل ہے۔ اور مومنوں کو وہاں بھی نصیب ہوگا۔ یعنی اگر آیت مذکورہ میں لا تدرکہ الابصار کو لا تراہ الابصار کے معانی پہ محمول کر دیا جائے اور تشبیہی تجلّیات کے اعتبار سے دیدارِ الٰہی کا انکار کر دیا جائے، تو پھر یہ بات کیسے درست ہوگی کہ عارفوں کو اس دنیا میں بھی روئیت حق حاصل ہے اور آخرت میں بھی عوام و خاص مومنوں کو ان کے مراتب کے مطابق نصیب ہوگی۔ چنانچہ اکثر آیات انہی معانی پر دلالت کرتی ہیں۔ مثلاً یہ آیت کریمہ کہ بہت سے چہرے اس دن بارونق ہوں گے، اپنے رب کی طرف دیکھ رہے ہوں گے، اور پھر یہ آیت کریمہ کہ جو شخص اللہ سے ملنے کی اُمید رکھتا ہے اس کو تو ایسے ایسے حوادث سے پریشان نہ ہونا چاہیے کیونکہ اللہ سے ملنے کا وہ معین وقت ضرور آنے والا ہے۔ گویا پہلی آیت عارفوں کے حق میں ہے جو آج اس وقت بھی اس شاہدِ حقیقی کے حُسنِ دل افروز کا دائمی مشاہدہ کر رہے ہیں، اور کل بھی جس نظارے کا وعدہ دیا گیا ہے۔ اس مشاہدۂ ذات سے سرخرو ہوں گے۔ اور دوسری آیت کریمہ مومنین سے متعلق ہے جہاں انہیں آخرت میں یہ مژدہ دیا گیا ہے، اور وہ اسی وعدے کے سہارے دن گزار رہے ہیں۔ اور حالِ حاضر میں مشاہدے کی طرف سے غافل ہیں۔ پس عارفوں کو جو حالت اب بھی میسر ہے دوسرے مومنین پر آخرت میں منکشف ہو جائے گی۔ عارف لوگ اپنی اس کیفیت سے ترقی کر کے اعلیٰ علیین کی طرف چلے جائیں گے، جیسا کہ خواص و عوام کے مراتب میں یہاں فرق ہے، وہاں بھی رہے گا۔ ان مراتب کی انتہا نہیں۔ بلند درجوں والا ہے وہ اور صاحب فضل ہے۔ اور ہر اعلیٰ و ادنیٰ کو اس کی استعداد کے مطابق انکشاف ہوگا اور بیچ میں شک و شبہ کا کوئی پردہ حائل نہ ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کا یہ قول کہ اپنے رب کی طرف دیکھنے والے ہیں۔ پس ایک گروہ یہ کہتا ہے کہ اُس کے ثواب کی طرف دیکھنے والے ہیں۔ مالک بن انس نے کہا انھوں نے جھوٹ کہا۔ ہرگز نہیں، وہ اپنے رب سے اس دن پردے میں ہوں گے۔

لوگ دیکھ رہے ہوں گے اللہ کی طرف قیامت کے دن اپنی آنکھوں سے، اور اگر نہ دیکھیں گے مومن اپنے رب کو قیامت کے دن تو نہ تعبیر کرتا اللہ تعالیٰ کفار کے حجاب کے ساتھ!! اور جب حق تعالیٰ نے یہ فرمایا کہ وہ لوگ جنھوں نے جھٹلایا ہماری نشانیوں کو اور ہماری ملاقات کو، اُس سے ایک گروہ نے یہ گمان کیا کہ لقائے الٰہی سے مراد ثواب و اجر کا چہرہ ہے۔ اور اس قول کی بنیاد آخرت میں رویت حق سے انکار ہے۔ کیونکہ یہ گروہ دیدارِ حق کا انکاری ہے، اور ان عقل کے اندھوں کے انکار کا سبب یہ بنا کہ ان کا خیال ہے کہ سوائے اجسام اور اعراض (قائم بذات غیر) کے کسی کو دیکھا نہیں جا سکتا۔ اور اس پر اجماعِ امت ہے کہ حق تعالیٰ نہ جسم ہے نہ عرض (قائم بغیر) پس اسی وہم و قیاس پہ اُنھوں نے دیدارِ حق سے انکار کر دیا۔ اور معاملہ اس طرح نہیں جیسا اُنھوں نے گمان کیا۔ یعنی کہ سوائے اجسام اور اعراض کے اور کچھ دیکھا نہیں جا سکتا۔ باقی سب غیر مرئی ہیں۔ وہ اگر ذرا سوچیں تو اس حقیقت کو پالیں گے کہ اگر رنگ نہ ہوں تو اجسام بھی درحقیقت غیر مرئی ہیں، اور نور نہ ہو تو رنگ بھی غیر مرئی ہیں اور نور نہ جسم ہے نہ عرض، کیونکہ اگر نور جسم ہوتا تو دوسرے ٹھوس اجسام شیشہ و بلور وغیرہ میں سرایت نہ کرتا۔ کیونکہ سب دانشور متفق ہیں کہ ایک جسم دوسرے جسم میں داخل نہیں ہو سکتا، اس لیے کہ اگر مان لیا جائے کہ ایک جسم دوسرے میں داخل ہو سکتا ہے تو پھر یہ بھی لازمی طور پر جائز ہوگا کہ سارے اجسام اس جسم واحد میں داخل ہو جائیں۔ نور اجسام کی طرح عرض نہیں۔ اگر ہم نہیں دیکھتے نور کو مگر اجسام میں۔ چنانچہ نفس ناطقہ (رُوح) جسم نہیں ہے۔ ہم اسے نہیں دیکھ سکتے، سوائے اس کے افعال کو جو اجسام میں جا کر ظاہر ہوتے ہیں ۔ اور اسی طرح سارے مجردات (غیر مادی، پاک روحیں و فرشتے) جو نہ جسم ہیں نہ عرض، اور ان کے افعال ظاہر نہیں ہوتے سوائے جسموں کے اور کہیں۔ پس اسی طرح نور جسم نہیں، اگرچہ ہماری آنکھیں اسے بغیر اجسام کے نہیں دیکھ سکتیں۔ اگر اللہ تعالیٰ کا وصف کرتا جائز نہ ہوتا تو وہ اپنے کلام پاک میں رویت کے سلسلے میں حجاب و تجلّی کی کبھی خبر نہ دیتا کیونکہ وہ چیزیں جن پہ رویت کا اطلاق جائز نہیں، ان کی توصیف حجاب و تجلی سے نہیں کی جاتی اور اپنی ذات کی صفات کو اور ان سب چیزوں کو جن سے اس کی توصیف کرنا جائز ہے خود اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے، ان جھگڑالو منکروں کی عقل نارسا اس کی توصیف کیا کرے گی ۔ اور سچ کہا جو کچھ اللہ نے کہا، اور اللہ سے زیادہ سچی بات کہنے والا کون ہے۔ تجلّی عبارت ہے ظہورِ اشیا سے مرتبۂ ثانیہ میں۔ پس نفس

ناطقہ (روح) پہلے مرتبے سے فیض یاب ہے جو تجلی کے پڑنے کا مقام دمرتبہ ہے۔ آنکھ ثانوی مرتبہ سے بہرہ مند ہے جو تجلی کا درجہ ہے، جس طرح آپ انسانی شخصیتوں کو دیکھتے ہیں اور انھیں انسان سمجھتے ہیں۔ پس اسے سمجھ لے، کیونکہ یہ چیز نفع بخش ہے رویت کے مسئلے میں۔ تجلی کے اصطلاحی معنی یہی ہیں جو متن میں لکھے گئے ہیں۔ لہذا نفس ناطقہ (روح) اپنی ذات کے لحاظ سے پہلا مرتبہ رکھتا ہے یعنی وہ مفہوم کے ادراک کو روشن و آشکارا کر دیتا ہے، اور نگاہ آنکھ کی وساطت سے دوسرے درجے سے استفادہ کرتی ہے یعنی تجلی کو دیکھتی ہے آنکھ سے، لہذا ہم نے انسانی شخصیت کے دیدار اور اُس کی حقیقت کے ادراک کی مثال محض سمجھانے کے لیے پیش کی ہے۔ اول الذکر محسوس ہے اور موخر الذکر معقول۔ لہذا سمجھ لیجیے کہ اب خدا کے فضل سے تمھیں رویت (دیدار) کے مسئلہ میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہ رہ جائے گی۔ واہ سبحان اللہ تجلی کو دیکھو اور تجلی گاہ کو بھانپ لو۔ اس بات کے فرق کی مفصل تشریح و توضیح کی گئی ہے۔ اب مزید وضاحت کی ضرورت نہیں۔ رباعی:

فہمید نصیب دیدہ نتواند شد

توحید نصیب دیدہ نتواند شد

ابصار زِ ادراک شہودش محروم

ایں دیدہ نصیب دیدہ نتواند شد

ترجمہ رباعی: فہم و ادراک آنکھوں کے نصیب میں نہیں۔ آنکھیں مشاہدہ وحدت سے بہرہ مند نہیں ہوسکتیں قوتِ باصرہ مشاہدۂ ذات سے محروم ہے، یہ دیدار بھی چشمِ ظاہری کے نصیب میں نہیں۔ مصنف کی اپنی تشریح یوں ہے۔ کہ فہم جو تجلی گاہ کے ادراک کا نام ہے وہ آنکھوں کے نصیب میں نہیں اور اس کثرت کے مراتب میں توحید یعنی مشاہدۂ وحدت ذات بھی ظاہری آنکھوں کے حصے میں نہیں آیا۔ اس سے تو فقط نفس ناطقہ (روح انسانی) ہی آگاہ ہوسکتی ہے۔ آنکھیں فقط مختلف قسم کی تجلیوں کو دیکھ سکتی ہیں جو محض اعتباری امور ہیں۔ لہذا یہ بصارت حضرتِ حق کے کماحقہٗ شہود سے محروم ہے۔ یہ دیدار نہ تو مادی آنکھوں کو اس دُنیا میں نصیب ہوا نہ آخرت میں نصیب ہوگا۔ ظاہری آنکھ اللہ تعالیٰ کے تشبیہی نور سے روشن ہے جو ذات باری تعالیٰ کا ظاہر ہے اور آخرت میں بھی انشاءاللہ یونہی روشن رہے گی۔ لیکن باطنی آنکھ (چشم بصیرت) حق تعالیٰ کے تنزیہی نور سے بہرہ یاب ہے جو ذات جل جلالہٗ کا باطنی نور ہے۔ خدا کے فضل سے یہاں بھی اسے نصیب ہے اور آخرت میں بھی ہوگا۔ وہی اوّل ہے وہی آخر ہے۔ وہی ظاہر ہے اور وہی باطن ہے:

هوالنّاصر

شروع اللہ کے نام سے جو نہایت مہربان اور بہت رحم والا ہے

ہر قسم کی تعریف اللہ رب العالمین کے لیے ہے، اور درود و سلام اس کے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر اور اُس کی آل رضؓ اور تمام اصحابؓ پر۔ امابعد پس یہ اڑتیسواں باب ہے جو قول لین (نرم گفتگو) سے موسوم ہے۔ قول لین جو ہے اس کے معنی ملائم کلام ہے۔ سننے والے کی طبیعت سے مناسبت رکھنے والا کلام ہے۔ کیونکہ اس باب میں ممکن کی فنا اور ممکن کی حقیقت کا بیان ہے جو مقتضی ہے حدوث اور زوال کی۔ اُسے یہ نام اس لیے دیا گیا ہے کہ انسان طبعاً ان کلمات سے متاثر ہوتا ہے جس میں فنا کا ذکر ہو، اور اُسے قبول کر لیتا ہے بغیر شک و شبہ اور تردد کے۔ اُس کے حقائق ممکنہ کے ساتھ مناسب ہونے کی وجہ سے، اور موت کے تذکرے اور فنا ہو جانے میں وحشت اور بدکنے میں جس چیز سے اضافہ ہوتا ہے موجود ممکن میں وجوب بالغیر کے وجود کے سبب کیونکہ وجوب نفی کرتا ہے امتناع کی اپنی ضدیت سے، اور اس سے بھاگتا ہے اور اُسے قبول نہیں کرتا۔ پس پاک ہے وہ ذات کہ جس کے لیے فوت ہونا نہیں۔ اور ہر نفس کے لیے موت کا ذائقہ ہے۔

فنا و زوال کے مختصر بیان کا باب

ممکن الوجود موجودات جو حادث ہیں، اور جن کا وجود اعتباری ہے۔ ان کے انجام پذیر

اور نیست و نابود ہونے کا مختصر بیان متن میں آچکا ہے۔ اس سلسلے میں مفصل اظہار خیال نہیں کیا گیا۔ فقط اشارات و کنایات پہ اکتفا کی گئی ہے۔ اس مناسبت سے کہ فنا کے معنی ہیں عدم کے اور عدم میں کسی تفصیل کی گنجائش نہیں۔ لہذا اس کے بیان میں اختصار ہی بہتر ہے۔ وہ فقط حضرت وجود مطلق (اللہ تعالیٰ) کا مرتبہ ہے جو مفصل اور لاتعداد مرتبوں میں جلوہ گر ہے۔ اللہ جل شانہٗ کی قدرت و طاقت کی انتہا نہیں۔ اگرچہ یہ ممکنہ حقائق جو اس وقت موجود ہیں، اپنے ذاتی عدم کے تقاضے کی بنا پر ان کی حد بھی ہے اور انتہا بھی۔ یہ حد و انتہا عدمی معانی کے اشتراک سے لاحق ہوئی ہے۔ لیکن درحقیقت وہ غیر محدود اور لاانتہا جلال و وسعت کے مالک وجودِ مطلق کے مظاہر ہیں۔ جیسا کہ خود خدا تعالیٰ نے قرآن میں فرمایا ہے کہ جتنی چیزیں ہیں ہمارے پاس سب کے خزانے ہیں، اور ہم اس چیز کو ایک معین مقدار سے اتارتے ہیں۔ ان حقائق ممکنہ کا ذات الوجوب کی وجودی تجلی کے لیے مستعد رہنا اسے عدم کی تنگ گھاٹی سے نکال کر لامتناہی بنا کر وجود کی بے انتہا وسعتوں میں ڈال دیتا ہے۔ جہاں اللہ کی وسعتیں اُسے ڈھانپ لیتی ہیں، کیونکہ وہ ذاتِ مطلق ہر شے پر محیط ہے۔ حق سبحانہٗ تعالیٰ ہر شے کی تفصیل کا حق خود ہی ادا کر دیتا ہے، جیسا کہ قرآن پاک میں خدا نے فرمایا کہ ہم نے ہر چیز کو خوب تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ یہ سمجھ لو کہ تفصیل کی دو قسمیں ہیں۔ ایک صوری اور دوسری بیانی۔ صوری تفصیل عبارت ہے اشیا کی ذاتوں کے انداز سے ان کے ذاتی لوازم اور ذاتی صفات سمیت۔ اس صوری تفصیل کی بھی آگے دو قسمیں ہیں۔ ایک ثبوتی اور دوسری وجودی۔ محققی یا ثبوتی عبارت ہے صانع کے علم میں اشیا کی ذات کے ثبوت سے، جیسے علمی صورتیں (اللہ تعالیٰ کی صورِ علمیہ) اور ممکنہ موجودات کے حقائق کا مرتبہ بھی کہتے ہیں، اور وجودی تفصیل عبارت ہے اس موجودات عالم میں وجودی اور پیدائشی مرتبے سے اشیا کے فی نفسہٖ موجود ہونے سے جو ذہنی اور خارجی مرتبہ ہے، نیز امکانی مرتبہ ہے موجودات کے ذہنی اور خارجی امتیاز پانے سے۔ اور بیانی تفصیل عبارت ہے انہی اشیا کی صفات، اوصاف، قرائن اور اجزا کے بیان کرنے سے، اس بیانی تفصیل کی بھی آگے عقلی اور نقلی، دو قسمیں ہیں۔ عقلی وہ تفصیل جو عقلی دلائل اور ذہنی قیاسات سے ظاہر ہو اور نقلی وہ جو شریعت، قرآن مجید اور احادیثِ نبویؐ سے ثابت ہو۔ قصہ مختصر یہ کہ ان تمام مفصل مراتب کی تفصیل اسی حیثیت سے کہ وہ وجود مطلق کے آئینہ دار ہیں، اور

خدائی کلمات ہیں، اور وہ قادرِ مطلق کے لفظ کُن کہنے سے عالم وجود میں آئے ہیں اور آ رہے ہیں ، جتنی بھی لکھی جائے کم ہے ۔ جیسا کہ اس آیت کریمہ سے واضح ہے کہ اے رسولؐ! آپؐ ان سے کہہ دیجیے کہ اگر میرے رب کی باتیں لکھنے کے لیے سمندر کا پانی روشنائی کی جگہ ہو تو میرے رب کی باتیں ختم ہونے سے پہلے سمندر ختم ہو جاوے ، اور وہ باتیں احاطے میں نہ آویں ۔ اگرچہ اس سمندر کی مثل ایک دوسرا سمندر اس کی مدد کے لیے ہم لے آویں ۔ اس آیت کریمہ کی ترتیب سے صاف ظاہر ہے کہ اس ذاتِ مطلق کے کلمات و عبارات جو اس وقت از روئے قوت (حقیقتاً) موجود ہیں، لاانتہا ہیں ۔ اور سمندر جو اس وقت موجود اور مخصوص متعین ہے اس کا ختم و تمام ہو جانا بیان کیا گیا ہے، خواہ اس سمندر کی مانند کے الفاظ بھی انہی معنوں کی تائید کرتے ہیں، یعنی اس جیسا جو سمندر بھی مدد کو آئے گا وہ بھی اسی بحر کی مانند ایک خاص متعین ہوگا ، اور لامتناہی مطلق تعینات کی تشریح کے لیے کافی نہ ہوگا ورنہ لا انتہا کی انتہا لازم آئے گی ۔ اور علیٰ ہذا القیاس ۔ ابدالآباد تک وجود میں آنے والا ہر موجود اس ذاتِ حق کے بحرِ بیکراں کا ایک قطرہ ہے، اور اللہ کے لشکروں کو اُس کے سوا اور کوئی نہیں جانتا ۔ کیونکہ حق سبحانہٗ تعالیٰ کے علم میں از روئے قوت (درحقیقت) جو امور ہیں وہ بھی حالِ حاضر کے امور معلوم ہوتے ہیں، بلکہ حق تعالیٰ کا علم قوت ، قدرت اور فعل سے وسیع تر ہے ۔ اور یہ تعبیرات بھی تو عبارات کی تنگ دامنی کی وجہ سے ہیں ۔ کیونکہ ذہن ، خارج ، قدرت اور فعل ، تنزیہہ (بے عیب ہونا) تشبیہہ (مانند قرار دینا) اطلاق (بے قید ہونا) و تقید (قید و شرط) ممکن و واجب ، محدود و لا انتہا ، تعین و لاتعین ، غیب و حضور ، وحدت و کثرت ، کل و جزو ، عمومیت و خصوصیت ، منفی و مثبت ، شے کے ساتھ شرط ، بغیر شے کے شرط ، اور بغیر شرط کے ، مکان و لامکان ، زمانی و غیر زمانی ، روحانی ، جسمانی ، مثال ، خیال ، مفرد و مادی ، فراق و قرب ، صوری و غیر صوری ، جوہر و عرض ، حرکت و سکون ، علت و معلول ، گرفتگی و کشادگی ، نفع و نقصان ، بناو بگاڑ ، خوش قسمتی ، بدقسمتی ، ظاہر و باطن ، اعلیٰ و ادنیٰ ، قرب و دوری ، داخل و خارج ، پاکیزگی و غلاظت ، امتیاز و قبولیت ، شنوائی و بینائی ، بلغم و خون ، ارادہ و گفتگو ، زندگی و پیدائش ، شہود و وجود ، یکسانیت و اجنبیت ، دانائی و نادانی ، ایسا ویسا (کذا) بُرا بھلا ، خدائی و بندگی ، استحقاق و سرشت ، اختصار و تفصیل ، روشنی و تاریکی ، وحدت و حقیقت ، اصلیت و روح ، ذات و صفت ، اسم و رسم وغیرہ وغیرہ ۔ یہ سبھی اس ذات کبریا کی ذاتی حالتوں ، اضافی اعتبارات

اعتباری نسبتوں اور علمی اضافتوں کے مراتب ہیں۔ اللہ بڑا ہے۔ وہ بہت بڑا ہے۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اللہ بڑا ہے۔ اللہ بڑا ہے، اور سب حمد و ستائش اسی کے لیے ہے۔ غرضیکہ ممکنات کے سبھی مراتب فی نفسہٖ ہمیشہ فنا و زوال کے خطرے میں رہتے ہیں۔ اور اُس واجب الوجود سے الگ ہو کر ذاتی غیریت (اجنبیت) کے تقاضے کی بنا پر ہر لحہ فنا ہوتے رہتے ہیں، بلکہ ہمیشہ اپنے اس عدم کے مرتبے میں رہتے ہیں اور یوں سوائے اس کے وجود کے اور کوئی موجود نہیں۔ رباعی:

در قسمت من ہست چو معدومی و بس
آثار وجود چوں تواں کرد ہوس
آبم نشاند چو گہر گردی را
چوں لعل ز آتشم نمی سوزد خس

ترجمہ رباعی: میری قسمت میں فقط وہی معدومیت ہے۔ میں وجود کے خواص کی ہوس کیسے کر سکتا ہوں میں آبِ گوہر کی طرح ہوں۔ میں گرد کو کیسے بٹھا سکتا ہوں۔ آتشیں لعل کی طرح ہوں جس کی آگ خس و خاشاک کو نہیں جلا سکتی۔ مصنف خود اس رباعی کی تلمیحات کی یوں وضاحت کرتا ہے کہ ممکنات کی قسمت میں چونکہ واجب الوجود سے غیریت کے لحاظ سے معدومیت اور فنا ہی لکھی ہے۔ لہذا وجود کے خواص یعنی صفات اور افعال ممکن الوجود میں کیسے پائے جا سکتے ہیں۔ اس ذات باری تعالیٰ کے سوا نہ کوئی فاعل ہے اور نہ موجود۔ یہ وجودی کمالات فقط کہنے کو حقائق ممکنہ سے منسوب کیے جاتے ہیں، ورنہ فی الحقیقت ان سب اضافتوں کا مضاف وہی واجب الوجود ہے۔ ہمارے ساتھ ان کی نسبت ایسی ہے جیسی گوہر کو آب اور لعل کو آتش سے ہے۔ وہ تو محض کہنے کو آب و آتش ہیں، ورنہ ان کے اندر وہ رِقّت (پتلا پن) یا سوز نہیں۔ اس رباعی کی طرح میرا ذہن بھی فنا کی خبر دیتا ہے۔ اور عدم کا دروازہ کھولتا ہے۔ لہذا اس کے معانی کو مفصل طور پر بیان کیے بغیر میں نے فہموں کی باگ ڈور انہی کے اختیار کے ہاتھ میں سونپ دی۔ اب وہ جو چاہیں سمجھیں۔ جس سے چاہیں محمول کریں، کیونکہ اس آیت کریمہ کے مطابق ہر ذی مذہب کے واسطے ایک ایک قبلہ رہا ہے، جس کی طرف وہ عبادت میں مُنہ کرتا رہا ہے۔ جس طرح متن میں اس بات کے معانی کو اختصار سے بیان کیا گیا ہے اسی طرح اس وقت بھی دل تفصیل سے لکھنے کی طرف مائل نہیں، سوائے مذکورہ بالا وجہ و سبب

کے خدا ہی جانتے کہ اس میں کیا حکمت ہوگی ۔ میں نے اپنی طرف سے یہ کام نہیں کیا ۔ لفظ فنا یا اس کی بیانی اضافت کی تکرار سے فنا کی نہایت اور عدم و ہلاکت کی انتہا سے منظور احساس فنا ہے نہ کہ زوال فنا یا نفی کی نفی مقصود ہے جو مثبت بن جاتی ہے ۔ لیکن وہ فرمان الٰہی کہ ہر شخص (ذی مذہب) کے لیے ایک ایک قبلہ رہا ہے جس کی طرف وہ عبادت میں منہ کرتا رہا ہے ۔ تم نیک کاموں میں تگاپو کرو ، تم خواہ کہیں ہوگے ، اللہ تعالیٰ تم سب کو حاضر کر دیں گے ۔ بالیقین اللہ تعالیٰ ہر امر پر پوری قدرت رکھتے ہیں ۔ وجہ کے معنی ہیں سمت اور قبلہ ، اور ہر موجود کے لیے موجودات میں سے ایک خاص سمت جس کی طرف وہ مائل ہوتا ہے طبعاً اپنی استعداد کے تقاضے کے مطابق وہی حقیقتاً اس کا قبلہ ہے اور اُس کا اللہ نے انسان کو والی بنایا ہے ۔ کیونکہ مشرق و مغرب اللہ ہی کے لیے ہے ۔ اسی کے لیے ہے جو کچھ زمین میں ہے ۔ پس وہ والی بناتا ہے کافروں کو ان کے معبد کا ، اور ان کی رہبری کرتا ہے گمراہی پر ، اپنے مضل اسم کے ساتھ ، اور بلاتا ہے اُنھیں آگ کی طرف جو ان کی قرار گاہ ہے ۔ اور ان کے رب کے ان کی قربت کا مکان ہے ، اور یہی اس کا اسم مضل ہے اور والی بناتا ہے مومنین کو کعبے کا ، اور ان کی رہبری کرتا ہے ہدایت پر اسم "ہادی" کے ساتھ اور وہ سچائی کی مسند پر ہوتے ہیں اپنے قدرت والے مالک کے پاس ۔ پھر اس نے حکم دیا مومنین کو جو کہ بھلائیوں کے ساتھ اس کی ہدایت کے مظاہر ہیں ، اور کہا پس سبقت کرو بھلائیوں کی طرف اور انھیں خبر دی جامع مرتبے کی جامعیت کی تمام صفاتِ کمال اور اسماء کے ساتھ ، اور فرمایا جہاں کہیں تم ہوگے اللہ تم سب کو لے آئے گا ۔ پس جامع اللہ کی طرف ان کا مرجع ہے ، اور اسی کی طرف لوٹنا ہے ، اور بے شک اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے ۔ اور یہ اجمال و اختصار بھی مختلف انسانوں کے ذہنوں کے حوالے کرتا ہوں ۔ رباعی :

اے درد دلی کہ راز حق فہمید
ہر بحث ہماں حجت مولیٰ فہمید
عارف دانست آنچہ عارف دانست
ملا فہمید آنچہ ملا فہمید

ترجمہ رباعی : اے درد جس دل نے راز حق کو پالیا ، اس نے ہر بحث کو اسی مولا کریم ہی کی دلیل و

برہان سمجھا۔ عارف نے اُسے اپنی استعداد اور ملاّ نے اپنی استعداد کے مطابق سمجھا۔ (مصنف رباعی کی خود وضاحت کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ) جس کسی نے رازِ حق کو پا لیا تو وہ سمجھ گیا کہ ہر موجود اسی کی حقانیت کا مظہر ہے، اور کوئی شے بے فائدہ و باطل نہیں ہے۔ اور وہ اسی آیت کریمہ کا ورد کرتا تھا کہ اے ہمارے رب تو نے یہ سب کچھ یونہی بے کار ہی تو نہیں بنایا، اور وہ جانتا ہے کہ ہر بحث مباحثہ اسی حق تعالیٰ کے ثبوت کی دلیل و برہان ہے۔ اور ہر صورت میں اسی کے کمالات کا ظہور ہے۔ پس عارف جو حقیقت، باطن اور معانی سے آگاہ ہے اُس نے اُسے حق سمجھا اور ملاّ جو ظاہری صورت، ظاہر اور الفاظ سے چمٹا رہا اس نے بحث مباحثے کو اور دلائل و براہین کو حق ہی سمجھا، کیونکہ ظاہر بھی وہی ہے، اور باطن بھی وہی ہے۔

ھوالناصر

شروع اللہ کے نام سے جو نہایت مہربان اور بہت رحم والا ہے

ہر قسم کی تعریف اللہ تعالیٰ کے لیے ہے جس نے داخل کیا ہمیں دار السلام میں سرداری کے ساتھ۔ اور داخل کیا ہمیں دیار اسلام میں عبادت کے ساتھ، اور درود وسلام ہو اس کے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نبوت اور رسالت کے ختم کرنے والے پر، اور آپؐ کی آلؓ پر، اور آپؐ کے عادل اور شریف النفس اصحابؓ پر۔ امابعد پس یہ انتالیس ۳۹ واں باب ہے، جو دار السلام (سلامتی کے گھر) کے نام سے موسوم ہے۔ اللہ دار السلام کی طرف بلاتا ہے، اور وہ آپ کے رسول صلعم کا گھر ہے۔ پس بلایا اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو اس گھر کی طرف، اور جو داخل ہوگیا اس گھر میں، یعنی اس نے وسیلہ پکڑا اس گھر والے علیہ السلام والصلوٰۃ کا، اور امان پائی اور متمسک ہوگیا اس گھر کے رہنے والوں کی محبت کے ساتھ۔ کافی ہے اس کے لیے اس گھر کے رہنے والوں میں سے (کوئی ایک) اور اللہ اس کا حشر کرے گا قیامت کے دن ان کے زمرے میں بھی، اور داخل کرے گا اُسے جنت میں، اور وہی دار السّلام سے موسوم ہے۔ جیسے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سلمان ہم میں سے ہے، یعنی اہلِ بیت میں سے ہے۔ پس وہ لوگ کہ یہ گھر جنھیں اپنے ساتھ لے کر کھڑا ہوا، وہ اساس (بنیاد) اور دیواروں، اور چھت اور دروازے کی طرح ہیں۔ اس کے لیے، اور وہ بلند مرتبے والے امام اور اولاد، جو کہ اولاد ہیں اس گھر والے کی، وارث ہیں، اور مالکوں میں سے ہیں اس گھر کے۔ اور ازواج مطہرات اور خادم اور خادمائیں اسی گھر سے ہیں اپنے درجات کی تفاوت کے

ساتھ اور تمام مذکورا قسام میں سے سب کے سب متعلق ہیں رسول اللہ کے گھر سے، اور داخل ہیں آپ کے اہل وعیال کے زمرے میں ۔ اے گھروالو! اللہ کی تم پر رحمت اور اُس کی برکات ہوں ۔ اس کے سوا نہیں کہ اللہ چاہتا ہے کہ دُور کر دے تم سے ناپاکی ، اور پاکیزہ کرے اللہ تمھیں پاکیزہ کرنا ، اور ہدایت دی اللہ نے ہمیں اور تمام مومنین کو تم سے محبت کرنے کی ، اور مشرف کیا ہمیں اور تمام مسلمین کو تمھاری اطاعت سے ، اور جو تمھاری اطاعت کرتا ہے ، پس اس نے رسول کی اطاعت کی ، اور جو رسول کی اطاعت کرتا ہے اس نے گویا اللہ کی اطاعت کی ۔

بعض آیات قرآنی اور اہل بیت سے محبت کے معارف کے بیان کا باب

لفظ معارف سے مراد متن میں بعض آیات کی عارفانہ انداز میں تاویل ہے ، اور نتیجہ آیات قرآنی اور احادیث نبوی کی ترتیب سے اخذ کیا گیا ہے ۔ جس طرح اس آیت کریمہ میں کہ اللہ تعالیٰ سب تدبیریں کرنے والوں سے اچھا ہے ۔ مکر و تدبیر (چال) سے مقصود موہوم اضافی موجودات کا اظہار اور وجود مطلق یعنی موجود حقیقی کے مرتبے کا اخفا (چھپانا) ہے ۔ اور اس حدیثِ نبوی کی ترتیب میں کہ میں علم کا شہر ہوں ۔ اور اس آیت کریمہ میں کہ گھروں میں ان کے دروازوں سے داخل ہوا کرو ، شہر علم کے دروازے یعنی حضرت علی علیہ السلام کے وسیلہ اور وساطت کی فرضیت کو ثابت کیا گیا ہے ۔ اور حق بات یہی ہے کہ ان کے وسیلے کے بغیر علمی نسبت کا دروازہ نہیں کھلتا ، اور نہ ہی حق تعالیٰ کی پہچان حاصل ہوتی ہے ۔ ان کی محبت ایمان کی کسوٹی ہے ۔ ان سے روگردانی نفاق وگمراہی کی دلیل ہے ۔ جیسا کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا جو علیؓ سے محبت نہیں رکھتا وہ منافق ہے ، اور جو اُن سے بغض نہیں رکھتا وہ مومن ہے ۔ جو بھی علم کے اس دروازے سے دُور ہے وہ شہر علم سے دُور رہا ۔ اگر تم یہ کہو کہ حدیث میں تو لفظ شہر آیا ہے ، اور آیت میں گھر کا لفظ استعمال ہوا ہے تو پھر مطلوبہ نتیجہ کیسے حاصل ہوا ۔ ہم یہ کہتے ہیں کہ خواہ گھر ہو یا شہر ۔ ہر مقام میں آمد و رفت کے لیے دروازہ ہی ہوتا ہے ۔ بنانے والے نے اس گھر یا شہر میں آنے جانے کے لیے دروازے ہی کو بنایا ہے ، لہٰذا اگر کوئی اندر سے آنے کے لیے دروازے سے الگ راستہ اختیار کرے تو یہ بنانے والے کی مرضی کے خلاف ہے ۔ وہ تو چوروں سے ملتا جلتا ہے ، اور یہاں آیت کریمہ کا صرف اسی قدر حصہ منظور ہے کہ گھروں میں دروازوں کی راہ آنا چاہیے

اور حدیث شریفؐ کا بھی فقط وہی حصہ مقصود ہے، کہ ہر مکان میں داخل ہونے کا راستہ دروازہ ہی ہے نہ کہ ان دروازوں کے مضاف الیہ پہ نگاہ ہے جو گھر اور شہر میں۔ یہ ایک لطیف بات ہے جو محبت اور ایمان کے ساتھ ظاہر ہوئی، یہ فقہی مسئلہ نہیں ہے۔ ایک روایت کے مطابق حدیث شریف میں بیت کی جگہ لفظ "دار" آیا ہے۔ یعنی کہ "انا دار الحکمت و علی بابہا"۔ اہل بیت اور ائمہ معصومین کی محبت عین رسول اللہ صلعم سے محبت ہے۔ (ان پہ اور ان کی آل پہ سلامتی ہو) کیونکہ کسی کے اعضا اور اجزا سے محبت کا مطلب بھی اس شخص سے محبت ہوتا ہے۔ اور ان سے دشمنی اُس شخص سے دشمنی، اور علیٰ ہذا القیاس۔ جیسا کہ حضور پاکؐ نے فرمایا ہے کہ فاطمہؓ میرا جگر گوشہ ہے۔ جس نے اُسے ایذا دی اُس نے مجھے ایذا دی، اور ان کے شوہر کے بارے میں فرمایا کہ تیرا گوشت میرا گوشت ہے، اور تیرا خون میرا خون ہے، اور میںؐ اور علیؓ ایک نور سے ہیں۔ پس فرمایا کہ اپنے اہل میں سے مجھے سب سے زیادہ پیاری فاطمہؓ ہے، اور اہلِ بیت میں سے سب سے پیارے حسنؓ اور حسینؓ ہیں۔ ان اقوال میں حضور پاکؐ کے مقصود اور ان کے دل کی بات کو ایمان اور محبت کی نگاہ و نور سے دیکھنا چاہیے۔
حقیقت فہمی سے کام لیتے ہوئے سمجھنا چاہیے کہ آنحضرت صلعم کی رضا اور خوشنودی کس بات میں ہے۔ خدا اور رسولؐ خدا کو حاضر و ناظر جانتے ہوئے ان کی رضا و خوشنودی کے حصول کی کوشش کرنی چاہیے۔ اور جان بوجھ کر حق باتوں سے چشم پوشی نہیں کرنی چاہیے۔ زید بن ارقم سے روایت ہے کہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: علیؓ، حسنؓ و حسینؓ اور فاطمہؓ کے بارے میں کہ میں لڑتا ہوں اُن سے جو ان سے لڑنے والا ہے، اور مجسم سلامتی ان کے لیے جو اُن سے سلامتی رکھتا ہے۔ اور انھی سے روایت ہے کہ اُنھوں نے کہا کہ کھڑے ہوئے رسول اللہؐ ایک دن ہمارے درمیان ایک چشمے پر جسے خماً کہتے تھے۔ جو مکے اور مدینے کے درمیان ہے۔ پس تعریف کی، حمد کی اللہ کی، اور اُس کی تعریف کے بعد وعظ کیا، اور ذکر کیا، پھر فرمایا: اما بعد اے لوگو میں اس کے سوا نہیں کہ اک بشر ہوں۔ قریب ہے کہ آجائے میرے پاس میرے رب کا ایلچی۔ پس میں سر تسلیم خم کر دوں، اور میں چھوڑ رہا ہوں تم میں دو بھاری چیزیں۔ ان دونوں میں سے پہلی اللہ کی کتاب ہے جس میں ہدایت ہے۔ پس پکڑ لو اللہ کی کتاب کو اور اُس سے چمٹ جاؤ۔ پس اُنھوں نے ابھارا کتاب اللہ پر اور اس میں رغبت دلائی پھر فرمایا، اور میرے گھر والے، اور میں تمھیں یاد دلاتا ہوں اللہ کی اپنے گھر والوں کے بارے میں۔ یہیں سے سمجھ لینا چاہیے

کہ یہ باتیں کس رنگ میں کہی گئی ہیں، اور اللہ تعالیٰ کو درمیان میں لاکر بار بار تاکید کی ہے اور زور دیا ہے کہ میں تمھیں خدا کی یاد دلاتا ہوں، اور ان لوگوں کے سلسلے میں تمھاری کوتاہی پر تمھیں عذاب سے ڈراتا ہوں۔ اور کہا شدید ہوگا اللہ کا غضب اس پر جس نے مجھے ایذا دی میرے خاندان کے بارے میں۔ نیز صحابۂ عظام اور صحابۂ کرام بھی آلِ محمدؐ کے حکم میں ہیں۔ اور یاراں و رفیقان پیغمبر (ان سب کو خدا کی خوشنودی حاصل ہو) کی بھی آلِ رسولؐ کی طرح تعظیم و تکریم اور تصدیق و تسلیم سب پرہیزگاروں کے لیے لازمی اور ضروری ہے۔ کیونکہ وہ سرورِ کائناتؐ کی صحبت کے شرف سے مشرف ہوئے۔ ہر کسی پر آشکارا ہے کہ اُنھوں نے کتنی قربانیاں دیں، اور کیسی خدمات بجا لائے۔ ان کے کمالات اور ان کی عظمتیں کسی بیان کی محتاج نہیں۔ جو کوئی احادیث پیغمبرؐ کا تتبع کرتا ہو اس پر یہ بات واضح ہوگی کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم اپنے جن اصحاب اور قبائل سے خوش تھے ان کے متعلق کتنی ہی کثیر التعداد احادیثؐ موجود ہیں۔ فرمایا رسول اللہ صلعم نے میرے اصحاب کی تعظیم کرو کہ وہ تم میں سے بہترین ہیں۔ اور فرمایا اپنے اصحابؓ کے بارے میں اُنھیں نہ بناؤ ہدف، میرے بعد۔ پس جس نے ان سے محبت کی تو میری محبت کے ساتھ محبت کی، اور جس نے ان سے بغض رکھا تو میرے بُغض کے ساتھ ان سے بُغض رکھا۔ اور فرمایا جب ارادہ کرتا ہے اللہ تعالیٰ میری اُمت میں سے کسی سے نیکی کا تو ڈال دیتا ہے میرے اصحاب کی محبت اُس کے دل میں۔ اور ہر کسی اچھے رفیق اور خاص صحابی کے بارے میں ایسی کتنی حدیثیں موجود ہیں کہ کسی اور کو ان کے مقابلے میں نہیں لایا جاسکتا اور نہ ہی باہمی ضدّ و تنقیض کی بنیاد رکھی جاسکتی ہے۔ کسی ایک صحابی کے فضل و خوبی کے مقام کو متعین کرتے وقت کسی دوسرے صحابی کے نقص و خرابی کی کوئی گنجائش نہیں۔ اپنے اپنے موقع پر ہر ایک کے مرتبے کے مطابق اس کی مدح و ستائش ہی میں حُسنِ بیان کا کمال اور ان کی فضیلتوں کے اظہار میں فضل و خوبی کی انتہا ہے۔ ان میں سے ہر ایک دوسرے سے صاف دل تھا اور دوسرے کو اپنے سے افضل سمجھتا تھا۔ اور حضرت جابرؓ سے روایت ہے، اُنھوں نے کہا کہ کہا عمرؓ نے ابوبکرؓ سے۔ اے رسول اللہؐ کے بعد بہترین شخص۔ پس ابوبکر نے فرمایا خوب اگر تم نے یہ بات کہی ہے۔ بے شک میں نے سنا ہے رسول اللہؐ سے یہ فرماتے ہوئے کہ نہیں طلوع ہوا سورج کسی آدمی پر جو بہتر ہو عمرؓ سے۔ اتفاق سے متن میں چونکہ اہلِ بیت سے محبت کا تقریباً اتنا ہی تذکرہ تھا

اور خلفائے راشدین اور دیگر صحابۂ کبار رض (ان سب کو خدا کی خوشنودی حاصل ہو) کے فضائل اور مراتب کا اظہار وہاں نہ تھا۔ لہٰذا متن ہی کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے شرح میں بھی ہم نے صرف اہلِ بیت رض اور آلِ رسول ص کے مراتب اور خصوصیات کے بیان پہ اکتفا کی ہے، نیز یہ بات بھی ہماری نگاہ میں تھی کہ پہلے دو خلیفوں رض کی اوّلیت اور افضلیت تو آفتاب سے بھی زیادہ روشن ہے۔ ان کے فیوض و برکات نے اک دُنیا کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے۔ وہ محتاجِ بیان نہیں۔ نیز یہ بات بھی ہمارے پیشِ نظر رہی کہ اہلِ سنّت والجماعت کے اکثر محققین نے اکثر و بیشتر مقامات پر صحابۂ رسول ص کے کمالات اور بزرگیاں بیان کی ہیں، لیکن ائمہ معصومین اور اہلِ بیت رسول اللہ ص کے حالات کی شایانِ شان شرح نہیں لکھی۔ لہٰذا ان کے مراتب پہ روشنی ڈالنے کے لیے اس امر کا بیان ضروری ہوگیا۔ لہٰذا ان وجوہ کی بنا پر ہم نے انہی مطالب کے بیان پہ اکتفا کی تاکہ اہل بیت رسول اللہ ص کی محبت کا شعلہ دلوں میں ہمیشہ بھڑکتا رہے، اور لوگ قربِ امامت کے فیوض سے مستفیض ہو سکیں۔ اس تحریر سے ہماری یہ غرض بھی تھی کہ طرفین کے متعصّب اصحاب کو تعصّب کی بلندیوں سے ذرا اعتدال کی حد تک یوں نیچے لایا جائے کہ جانبین میں سے کسی جانب کو دوسرے پہ ترجیح نہ دی جائے اور اہلِ بیت رض اور اصحاب رسول ص کی محبت مساوی طریق سے حاصل کی جائے۔ یہاں ہمارا مقصد ایک کو دوسرے پر ترجیح دینا نہیں، جیساکہ تفضیلی شیعہ یا متعصّب سُنی حضرات کا شیوہ ہے۔ ہدایت دے ہمیں اور تمھیں اللہ سیدھے راستے کی، اور اللہ ہی کی طرف سے توفیق ہے۔ فرمایا رسول اللہ صلعم نے، تم میں سے صراطِ مستقیم پر سب سے زیادہ ثابت قدم وہ شخص ہے جو تم میں سب سے زیادہ محبت کرنے والا ہے میرے گھر والوں رض سے اور میرے اصحاب رض سے۔ پس ہر قسم کی تعریف اس اللہ کے لیے ہے جو راتوں میں سے ایک رات میں اپنے بندے کو لے گیا، یا دوسرے معاملات میں سے ولایت کے مقام میں سے مقام خلافت تک، اور کمالات نبوت تک، اور اس کے اردگرد برکت نازل کی۔ اور منور کیا اس کے دل کو تاکہ دکھائے اُسے دوسرے مقامات سب کے سب اللہ کے قربات میں سے، اس کی آیاتِ کبریٰ میں سے، اور وہ ہر چیز کی بصیرت رکھتا ہے۔ پس اس نے دیکھا چاروں خلفاء کے مقامات کو بالتفصیل، اور جو کچھ فرق تھا نبی کریم ص کے خلفا میں سے کسی ایک میں اس کے ساتھ کہ اللہ نے ان میں سے بعض کو بعض پر بعض امور میں فضیلت دی بعض کو بعض پر، اور پایا

شیخین رضی اللہ عنہما (دونوں پہلے خلیفے رضی اللہ عنہما) کے مرتبوں کو خلافت کی ترتیب میں رفعت کے کمال پر اور سابق، سابق ہی ہوتے ہیں، اور منور کیا اللہ تعالیٰ نے آخرت کے آسمان کو ان دونوں کی بھلائیوں سے جس طرح اس نے منور کیا دُنیا کے آسمانوں کو ستاروں کی زینت سے، اور کہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوبکر رضی اللہ عنہ و عمر رضی اللہ عنہ میرے نزدیک سماعت اور بصارت کی منزل میں سر ہیں، اور اقتدا کرو ان لوگوں کی جو میرے بعد ہیں۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ و عمر رضی اللہ عنہ اہلِ جنّت کے ادھیڑ عمروں کے سرداروں میں سے ہیں سوائے نبیوں علیہم السلام اور مرسلین علیہم السلام کے۔ اگر وزن کیا جائے تمام اُمت کے ایمان کا صدیق رضی اللہ عنہ کے ایمان کے ساتھ، تو اُس کے ایمان کو ترجیح حاصل ہو جائے۔ اگر لیتے رسول اللہ صلعم اپنے رب کے علاوہ کسی کو دوست، تو بناتے ابوبکر رضی اللہ عنہ کو خلیل، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ مجھ سے ہے اور میں اس سے ہوں۔ اور ابوبکر رضی اللہ عنہ میرا بھائی ہے دُنیا میں اور آخرت میں۔ بے شک ابوبکر رضی اللہ عنہ تھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مصاحب، نزول کے مقام پر اور کمالاتِ نبوت کے مقام پر جس طرح وہ دو میں سے دوسرے تھے غار کے اندر ان کے ساتھ۔ اور وہ لوگوں میں سے بہترین آدمی تھے خیر البشر صلعم کے بعد ان کی امت میں، اور نہیں اُنڈیلی گئی کوئی چیز رسول اللہ کے سینے میں، مگر یہ کہ اُن کے سینے میں بھی اُنڈیلی گئی۔ اور وہ مکمل اور کامل تابع تھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اور آپ کے پہلے خلیفہ تھے۔ اور صحابہ میں سب سے افضل تھے محقق طور پر۔ اللہ ان سے راضی ہو۔ اور فاروق رضی اللہ عنہ جن کی رائے موافق ہوتی تھی وحی و کتاب سے۔ وہ دین کا ستون ہیں، اور انھوں نے صرف کیا اپنا تمام کا تمام وقت اللہ کی حدود کے قیام میں اور خلافت کے انتظام میں۔ اُن کو مقامِ نبوت علیہ السلام سے کامل نسبت ہے۔ اور اگر ہوتا کوئی نبی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد تو عمر رضی اللہ عنہ ہوتے، لیکن حضور پاک کے بعد کوئی نبی نہیں۔ اسی لیے پھیلا اسلام ان کے زمانے میں، اور بے شک حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت میں محدثین ہیں، اور ان میں سے عمر رضی اللہ عنہ بھی ہیں۔ اور حق ان کی زبان پر بولتا ہے، اور وہ فرق کرنے والے ہیں حق اور باطل کے درمیان۔ اُن کا عدل اظہر من الشمس ہے۔ اور صدیق رضی اللہ عنہ اور فاروق رضی اللہ عنہ کھڑے ہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مقام پر حقیقتاً، اور ان دونوں کو نسبت معیت ہے رسول اللہ صلعم سے، اور ان دونوں سے اعراض کرنا گویا روگردانی کرنا ہے اللہ اور اُس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے، اور ان دونوں کی اطاعت، اطاعتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ اور جو کوئی رسول کی اطاعت کرتا ہے، اس نے اللہ کی اطاعت کی۔ اور جو اُس سے مُنہ پھیر لیتا ہے وہ نقصان اُٹھانے والوں

میں سے ہے۔ اور عثمان رضؓ جو بردباری اور حلم میں کامل ہے، اور عفت والا، اور سخاوت والا ہے اور بلند ہوئے خلافت کی بدولت اور خلافت کے منصب کی شرافت کی بدولت اپنے مقام سے بلند مقام کی طرف، یہاں تک کہ وہ حضورِ پاک کے خلفا میں سے تیسرے خلیفہ بن گئے، جب کہ کہا رسول اللہؐ نے ان کے حق میں کہ جب میں مرجاؤں اور ابوبکرؓ و عمرؓ و عثمانؓ مرجائیں، تو اگر تو مرنے کی استطاعت رکھتا ہو تو مر جا۔ وہ کھڑے ہوئے نبی کریم صلعم کے مقام پر اور کھینچ لیا رحمت کو اللہ تعالیٰ سے، اور نازل ہوئی برکتیں ان پر اسی لیے، کہ انھوں نے جمع کی کتاب منزل جو کہ قرآن ہے اور اُسے مرتب کیا اس کے مطابق جو ترتیب ہے لکھی ہوئی لوحِ محفوظ میں۔ پھر وہ بلند ہوگئے شہادت کے ساتھ مرتبۂ قصویٰ تک جو کہ ابدی زندگی ہے مقامِ قربت میں۔ اور نہ گمان کرو ان لوگوں کو جو قتل کیے گئے اللہ کے راستے میں مردہ، بلکہ وہ تو زندہ ہیں اپنے رب کے ہاں رزق دیے جاتے ہیں۔ خوش ہیں اس پر جو انھیں اللہ نے دیا اپنے فضل سے، اور ہر نبیؑ کے لیے رفیق ہے جنت میں اور ہمارے رسول اللہؐ کے رفیق عثمان ابن عفان رضؓ ہیں۔ انھوں نے خرچ کیا کثیر مال اللہ کے راستے میں اس کی محبت میں رسول اللہؐ کے سامنے، اور اللہ ضائع نہیں کرتا احسان کرنے والوں کے اجر کو اور وہ شوہر ہیں رسول اللہ صلعم کی دو بیٹیوں کے، اسی لیے انھیں ذوالنورین کہا گیا، اور رسول اللہؐ راضی تھے کمال رضامندی کے ساتھ۔ اور ان کا نام انھوں نے دیکھا لکھا ہوا عرش کی پنڈلی پر، اور فرشتوں کے پروں پر، اور پاک کیا تھا اللہ نے انھیں کبر اور حسد اور کینے اور غصّے اور بغض سے۔ علی مرتضیٰ رضؓ جو فقرِ محمدی کے مالک تھے اور خاتم الخلفا تھے اور ولایت کے تخت کے سلطان تھے، اور علم کے شہر کے دروازے تھے، اور بی بی فاطمہ رضؓ عنہا کے شوہر تھے، اور حسنینؑ کے والد، اور عجائب کے مظہر اور غرائب کے ظاہر کرنے والے تھے۔ اور مکمل ہوا ان کا عروج اللہ کی طرف اور منقطع ہوگئے مخلوق کے ساتھ سب کے سب، اور اللہ سبحانہ' کا وسیلہ مکمل طور پر پکڑا، اور انھیں عینی نسبت ہے رسول اللہؐ سے، اور ان کا گوشت رسول اللہؐ کا گوشت ہے۔ اور ان کا خون رسول اللہؐ کا خون ہے۔ جس کے نبی کریمؐ مولی ہیں، پس علیؑ بھی اس کے مولی ہیں، اور وہ رسول اللہ صلعم کے بھائی ہیں دنیا میں اور آخرت میں بھی۔ اور کھول دیا اللہ نے ان کے دل پر علم لدنّی کا دروازہ، گویا کہ وہ قرآنِ ناطق ہوں۔ اللہ ان سے راضی ہو۔ پس یہ ستون ہیں خلفائے اربعہ دین کے ارکان میں، اور رسولِ امینؐ کے آگے امین ہیں۔ پس جو کوئی ان سے

محبت کرتا ہے، پس وہ رسول اللہؐ کی محبت کے ساتھ محبت کرتا ہے، اور جو کوئی ان سے بغض رکھتا ہے
پس اس نے بغض رکھا رسول اللہ کے بغض کے ساتھ۔ ہم اُس سے اللہ کی پناہ میں آتے ہیں۔ اور اللہ حق
بات کہتا ہے اور رستے کی ہدایت کرتا ہے۔ قصہ کوتاہ یہ کہ اہلِ بیتؓ اور ائمہ معصومینؓ کی فضیلتوں اور
اور ان کے مرتبوں کی کیا شرح لکھی جائے کہ وہ کمالات و فضائل کے مجمع البحرین ہیں، تمام ظاہری و باطنی
فضیلتیں ان پر آکر ختم ہو جاتی ہیں۔ ان میں ظاہری جزئیت اور عینیت (یکسانیت) بھی ہے۔ اور
ان کے طریق اور لڑی سے ہونے کے ناطے معنوی فرزندیت بھی ہے اور رفاقت بھی۔ یہ ان کی بزرگواری
کی سب سے بڑی خصوصیات ہیں۔ (ان سب پر خدا کی سلامتی و رحمت ہو) جب دوسرے علما کے
بارے میں کہا گیا ہے کہ علما انبیاعؑ کے وارث ہوتے ہیں، تو شہر علم کے اجزا جو بالکل اسی شہر کی مانند ہیں
تو پھر وہ امامت و ولایت کے وارث کیوں نہ ہوں گے۔ الغرض میں کیا کہوں اور کیا لکھوں۔ میری
محبت کا یہ جوش اور محمدیتؐ کی حقانیت متعصب لوگوں کو جوش و خروش میں لے آئے گی، کیونکہ سچ کڑوا ہوتا
ہے، اور یہ بیان بھی اک سچا بیان ہے۔ اس تحریر میں اس بات کا اظہار ہے جو حقیقت ہے اس
میں متعصبین کے کسی فرقے کی طرفداری نہیں، کیونکہ وہ بیچارے تو لڑائی جھگڑے کے حجابات میں پہلے
ہی محجوب ہیں۔ اعتدال کی راہ چھوڑ کر اور افراط و تفریط میں کھو کر وہ اُمتِ محمدیہؐ میں فساد برپا کر رہے ہیں
اور خالص محمدیت سے بے بہرہ ہیں۔ اُنھوں نے اعتدال کی ڈور کو ہاتھ سے چھوڑ دیا ہے، جو کہ سیدھی
راہ ہے۔ بغض کی محبت کے غلبے نے ان کی عقل پر پردہ ڈال دیا ہے۔ چنانچہ رافضی اسی میں مبتلا ہیں۔
یہ عامیانہ اور جاہلانہ محبت ہے۔ اس سے ہدایت کے کام میں خلل پڑتا ہے۔ ہم بی بی فاطمہؓ کی اولاد
ہیں، تو ہمارے ان حضرات سے ہم سے بڑھ کر کسے محبت ہوگی۔ اپنے اپنے ہی ہوتے ہیں اور غیر غیر۔
لہذا ہمارے ہمعصر مومنین اگر رسولؐ اور آلِ رسولؐ سے محبت کا دعویٰ کرتے ہیں، تو ہماری اطاعت
بھی ان پہ لازم آتی ہے۔ ہم وہی کچھ بیان کرتے ہیں جو صحیح ہے، اور جس میں ان حضرات کی اپنی رضا
شامل ہے، وگرنہ انھیں پورا اختیار ہے۔ ہمارا کام تو آگاہ کرنا تھا۔ کل قیامت میں وہ، ہم،
ہمارے امامؓ، خدا اور رسولؐ کے سامنے حاضر ہوں گے۔ بے شک اللہ کا وعدہ نزدیک ہی ہے تمھارے
اے لوگو بے شک میرے رب نے میرے دل پہ دروازہ کھول دیا ہے اپنی رحمت سے، اور سکھایا ہے
مجھے اپنے ہاں سے علم، اور یہ بات اللہ سے بعید نہیں، اور عطا فرمائی ہے مجھے کتاب اس میں

وضاحت ہے ہر چیز کی۔ اور ہدایت اور بشارت ہے ہر طالب اور مرید کے لیے، اور بنایا ہے مجھے ہدایت یافتہ ائمہ کا وارث (اللہ کی سلامتی ہو ان سب پر) اور اللہ تعالیٰ اس بات پر جو میں کہتا ہوں گواہ ہے۔ پس ڈرو اللہ سے جو کہ بلائے گا تمام لوگوں کو ان کے امام کے ساتھ اُس دن کہ نہیں مالک ہوگا کوئی نفس کسی نفس کے لیے کسی چیز کا۔ ہر نفس کے لیے ہوگا جو کچھ اس نے کمایا، اور جو اُس نے بُرے عمل کیے ہوں گے اس کا وبال اسی پر ہوگا، اور اللہ تعالیٰ نہیں ہے ظلم کرنے والا اپنے بندوں پر۔ پس جواب دو اللہ پکارنے والے کو، اور داخل ہو جاؤ طریق محمدیؐ میں، اور جو داخل ہو گیا اس میں وہ امن میں ہو گیا۔ اور نہیں ہے اس کے خلاف کوئی بھی دلیل کسی بھی شیطان سرکش کی۔ اور تم بھول گئے جو کچھ کہ فرمایا رسول اللہ صلعم نے کہ میں چھوڑنے والا ہوں تم میں دو وزنی چیزیں، اللہ کی کتاب اور اپنا خاندان۔ اور یہ دونوں الگ نہیں ہوں گے، یہاں تک کہ وارد ہوں گے میرے پاس حوض پر۔ پس دیکھو اللہ تعالیٰ کی کتاب کا اتفاق آپ کے خاندان کے ساتھ آنکھیں کھول کر دیکھو، اور یہ سب سے بڑی برہان اور دلیل ہے۔ پس جس نے دیکھا اور جو اندھا ہو گیا اس کا وبال اس کی جان پر ہے۔ جو اس دُنیا میں اندھا ہے وہ آخرت میں بھی اندھا ہے، اور گمراہ راستے والا ہے۔ تمھارا رب خوب جانتا ہے جو تمھارے دلوں کے اندر ہے گزر گئی تم سے پہلے ایک اُمت جنھوں نے ائمہ کی پیروی نہ کی، اور یہ اللہ کا طریقہ ہے، اور تم سب اللہ کی سنت میں تبدیلی نہیں پاؤ گے۔ پس پاک ہے وہ جو میرا رب ہے، اور کافی ہے کارساز کے طور پر۔

بعض کی اصلیت سے ناواقفیت نے ان کی چشمِ بصیرت کو چندھیا دیا ہے، جیسا کہ خارجیوں کو یہ گمراہی نصیب ہوئی۔ وہ اہل بیت کے مرتبوں اور منصبوں سے قطعاً نابلد ہیں، اور اپنے ہی زعم میں یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ ہم پہ صحابہ کبارؓ کی عظمت و بزرگی کی حقیقت کا انکشاف ہو چکا ہے۔ جب انہیں پیغمبرؐ کے اپنے ہی اجزا (جگر گوشے) نظر نہ آئے، جو آنحضرت صلعم کے قریب ترین تھے، تو اُنھیں یارانِ پیغمبرؐ کے کمالات کا پتہ کیسے چل گیا فرزندوں کی نسبت جن کی حیثیت ثانوی ہے۔ اس سے یہ نہ سمجھے گا کہ صحابۂ کبارؓ کے مراتب کو گھٹایا جا رہا ہے۔ اور نہ ہی ایسا سوچ کر اپنے اوپر گمراہی کے دروازے کھولئے۔ ایسے تمام ناروا توہمات سے خدا بچائے۔ یہ ثانوی حیثیت ظاہری نسبت کے اعتبار سے کہی ہے، ورنہ باطنی حیثیت کے لحاظ سے تو وہ سابقون الاولون میں سے ہیں، اور خاص مقربوں میں سے۔ اے ناواقفو تم ہماری طرح ہمارے پیغمبرؐ کے اصحاب کی قدر و منزلت کو ہرگز نہیں سمجھ سکتے۔ تم تو غیر ہو۔ اسلام کی برکت سے یہ تم نے

تو عارضی طور پر صحابۂ کبارؓ کی قدر پہچانی ۔ ہم تو سیّد ہیں، ہمیں محمدیوںؐ سے پورا توسل ہے ۔ ہم اپنے ذاتی ایمان کی برکت سے مہاجرین اور انصار کی صحیح قدر و منزلت کیسے نہ جانیں پہچانیں گے ۔ سبحان اللہ کیا نیک گمان ہے ۔ ہمارے اللہ جل شانہ نے فرمایا ہے کہ بعض ظن و گمان گناہ ہوتے ہیں ۔ یہ فرمان تمھارے حق میں صادق آتا ہے ۔ صحابۂ کبارؓ کی صحیح قدر و منزلت کو بھی خالص محمدیؐ ہی کما حقہ جانتے ہیں، اور آلِ رسولؐ کی صحیح قدر و منزلت کو بھی کما حقہ وہی پہچانتے ہیں ۔ یہ حق ہے اور حق ہی میں کہتا ہوں ۔ لہٰذا ان حق باتوں کو جو آیاتِ قرآنی اور احادیثِ نبویؐ کے مطالب پر مشتمل ہیں ہوش اور انصاف کے کانوں سے سننا چاہیے اور خود غرضی، تعصب اور ہٹ دھرمی سے مخالفت نہیں کرنی چاہیے ۔ مخلص محمدیؐ اصحاب جن کا پیشوائی و بزرگی کا شرف تسلسل و تواتر سے پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتا ہے ۔ اور سلسلۂ اہل بیت سے جن کی نسبت مُسلّم ہے اور جو صحابیوں کے مرتبے کے صحیح قدر دان ہیں، ان کی صحبت کے فیض اور ان کی صحبت کی برکت سے خالص محمدیؐ بن جانا چاہیے، اور ان کی تعظیم و تکریم کو ان عالی حضرت کی محبت و معرفت کا حیلہ وسیلہ سمجھنا چاہیے ۔ تنبیہہ چونکہ مرشد اور مرشد زادوں کے آداب کو کما حقہ بجالانا سبھی کے لیے خاصہ دشوار ہے، اور وہ ان بزرگان طریقت کے فرزندوں کے لوازم ارادت و عقیدت کی ادائیگی سے قاصر ہیں، لہٰذا اس فرزندیت کی حیثیت سے وہ حضرت شاہ نقشبند حضرت غوث الثقلین رحؒ کی اعتقادی نسبت سے بھی عہدہ برآ نہیں ہو سکتے، تو پھر بھلا وہ سادات کی حیثیت کے آداب کما حقہ کیسے بجالا سکتے ہیں جن کا تعلق ایمانی نسبت سے ہے ۔ چونکہ یہ حق بات ان پہ خود بھی واضح بلکہ مسلّم ہے ۔ اور وہ دل میں خوب جانتے ہیں کہ واقعتاً ہم سادات یعنی آل و اولاد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آداب سے عہدہ برآ نہیں ہو رہے تو بعض کمزور ایمان والے حیلہ سازیہ گمان کرنے لگتے ہیں کہ سیّد ہونا تو اک ظنّی بات ہے یقینی طور پر ثابت نہیں ہوتا ۔ حالانکہ خدا کے فضل سے لوگوں کا سیّد ہونا تو ہزارہا لوگوں کی زبانی تسلسل و تواتر کے درجے تک پہنچ جاتا ہے، اور ساری دُنیا جانتی ہے اور ان کے آباو اجداد کا شجرہ نسب کتابوں میں بھی درج ہے جو نجیب الطرفین ہیں، اور شروع سے لے کر آج تک نسلِ بعدِ نسلاً وہ اپنے آبا و اجداد سے اپنے سیّد ہونے کے بارے میں سنتے آئے ہیں، اور ان کے آبا و اجداد اور اسلاف کے سیّد ہونے کا شہرہ ہے ۔ نہ فقط مسلمانوں کے کانوں نے، بلکہ ان کے ماں باپ، اور پھر ان کے آبا و اجداد تک نے سُنا، اور یقینی طور پر ان کا دعویٰ نسب تواتر

کی حد تک جا پہنچتا ہے۔ تو پھر ایسے اشخاص کی سیادت کے متعلق ظن و گمان کو کیا دخل؟ اور اُن کے اس جھوٹے حیلے کی گنجائش کہاں کہ سیادت اک ظنی امر ہے۔ رہی یہ بات کہ یہ بعض سادات جن کے احوال کا اتہ پتہ نہیں ہوتا اور ان کے حسب نسب کا پچھلے لوگوں کی زبانی بھی کچھ معلوم نہیں ہوتا۔ فقط ابھی ابھی سنا گیا ہو، اور یا خود انہی کی زبانی معلوم ہوا ہو کہ وہ بھی سید ہیں، سیادت کے ایسے دعویداروں کے آداب کی بجا آوری میں بھی کوتاہی نہیں کرنی چاہیے۔ وہ جانیں اور ان کا کام کہ وہ سادات میں داخل ہیں یا ان سے خارج۔ اس کی حقیقت تو وہ جھوٹے دعویدار خود ہی قیامت کے دن دیکھ لیں گے۔ اُمتیوں کو تو حضورؐ پیغمبر علیہ السلام کے اسمِ مبارک کا ادب ملحوظ خاطر رکھنا چاہیے جب لوگ ان ملبوسات و تبرکات کا جنھیں حضورؐ کے لباس مبارک سے نسبت دی جائے ادب آداب بجا لاتے ہیں، اور اُنھیں آثار شریف کہتے ہیں۔ حالانکہ ان کے یقینی ہونے کی کوئی سند بھی نہیں ہوتی، نہ ہی کوئی ثبوت ملتا ہے۔ پھر بھی حضور پاکؐ کے اسم مبارک کی مناسبت کے باعث ان کی بے ادبی کرنا جائز نہیں سمجھتے۔ اور ایمانی قوت اور محبت کے غلبے کا تقاضا بھی یہی ہے کہ بغیر چھان بین کے آداب بجا لاتے رہیں، تو پھر حضور سرورِ کائناتؐ کی اولاد کے حق میں اسی نسبت کو ظن و گمان سمجھنا اور اُسے معتبر نہ جاننا بھی تو یقیناً بڑے انحراف سے خالی نہیں۔ ہم مخلص محمدیؐ ہمیشہ حق بات ہی بیان کرتے ہیں۔ ہمیں خارجیوں اور رافضیوں سے کوئی سروکار نہیں۔ تبرکات کے آداب میں جو ایک ہی تسلیم و سلام میں ادا ہو جاتے ہیں، اپنی جنس سے مختلف ان بے جان چیزوں کے سامنے تو ان کی خودی اور نفسانی شر و فساد سر نہیں اٹھاتا، اور سادات کے سامنے جو ان کے اپنے ہی بنی نوع انسان ہیں، پورے آداب اور لوازمات کا پورے عجز و انکسار سے بجا لانا ذرا دشوار امر ہے۔ لہٰذا ان پر گراں اور ناگوار گزرتا ہے۔ سادات کی کثرت کی وجہ سے جو اُنھیں خدا نے حضور سرور کائناتؐ کی دُعا و برکت سے عطا فرمائی ہے۔ اور ادھر اُمت محمدیہؐ کی کثرت اور ان کی ایمانی قوت کی کمزوری کے باعث ان میں سے اکثر و بیشتر کے دلوں میں سادات کی وہ قدر و منزلت نہیں رہی کہ وہ کون عالی نسب ہیں، اور امت کے ان افراد کو ان سے کیا نسبت ہے۔ اتنی ہی تھوڑی سی مدت میں اُنھیں بھلا دیا۔ وہ جو کچھ بھی ہوں سو ہوں، مومنوں پر تو ان کی تعظیم و تکریم کرنا واجب ہے۔ جس طرح گناہ مومنوں کو ایمان سے خارج نہیں کرتے، اسی طرح سادات کی لغزشیں اور تقصیریں انھیں ان کے حسبی نسبی شرف و بزرگی سے

باہر نہیں نکال سکتے، اور نہ ہی ان کی ہتک عزت اور عدم احترام کا باعث بنتے ہیں، اور اس مشہور مقولے کے مطابق کہ صالحین کی اولاد کی فی سبیل اللہ تعظیم و تکریم کرو، اور بدکرداروں کی اولاد کی اُن کے عمل سے۔ سیادت کا دعویٰ کرنے والے بدکرداروں کی عزت و حرمت محض حضور رسول کریم صلعم کے پاسِ ادب کی بنا پر کرنی چاہیے۔ ان کی تعظیم و تکریم بجا لانے کے لیے فقط حُبِ رسول اللہؐ کا غلبہ چاہیے اور اسی نسبت کو دیکھو ان کے افعال و اعمال کو دیکھنا مناسب نہیں۔ وہ جو کہتے ہیں کہ (بندگی باید پیمبر زادگی منظور نیست) تو اس کا مطالعہ تو خود سادات کو کرنا چاہیے تاکہ وہ اس بات پر پورا یقین کرکے دینی ترقی کرنے سے محروم نہ رہ جائیں، اور ہمیشہ اپنے عجز و تقصیر کو مدِنظر رکھیں۔ اس سلسلے میں اُن کا معاملہ اپنے خدا اور رسولؐ سے ہے۔ دوسروں کو دخل در معقولات کی کوئی ضرورت نہیں۔ چنانچہ آنحضرت صلعم نے حضرت بی بی فاطمۃ الزہراؓ کو اسی امر کے مطالعے پر زور دیتے ہوئے فرمایا کہ فاطمہؓ تم اس بات پر تکیہ نہ کرنا کہ تم پیغمبر زادی ہو، نیک عمل کرو، عمل کرو، عمل کرو، اور سارے مومنین کو عمل یا غیر عمل کی شرط کے بغیر ان کی بھلی یا بُری حالت میں بھی تعظیم و تکریم کا حکم دیا ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام کے بیٹے کی مانند پیغمبر زادگی اس وقت فائدہ نہیں دیتی اور نہ ہی منظور ہوتی ہے جب کہ وہ آل اولاد اپنے پیغمبرؑ کے دین و ایمان کو قبول ہی نہ کریں۔ مگر اس بات کا کسی سیّد سے وقوع میں آنا ممکن ہی نہیں۔ اللہ تبارک و تعالیٰ نے حضور رسولِ مقبولؐ (ان پر خدا کا درود و سلام) کی آل اولاد کو کفر کے ان داغ دھبوں سے پاک اور محفوظ رکھا ہے۔ سہواً یا غفلتاً ان کے گناہ و عصیان جوہر ذاتی میں خلل انداز نہیں ہوتے۔ صاحبِ شریعت کی شرعی حدود کا قیام پہلے تو ان کے اپنے اوپر ہے پھر دوسروں پر ہوگا۔ یہ الگ بات ہے کہ اس کا تعلق تربیت سے ہو۔ وہ دوسروں کے لیے ہتک عزت کی دستاویز نہیں بن سکتی۔ مثال کے طور پر اگر کوئی آدمی اپنے فرزندوں کو ادب سکھائے اور کسی غلطی یا قصور کی بنا پر اُنھیں تنبیہ کرے یا اصلاح کے لیے زجر و توبیخ، تو اُسے یہ منظور نہیں ہوتا کہ دوسرے ان کو حقیر سمجھیں یا ذلیل و بے وقعت جانیں اور انہیں ایذا و آزار پہنچائیں۔ بلکہ یہ تو انھوں نے بکمال مہربانی و شفقت ان کے دنیوی آرام اور دینی سعادت کی غرض سے ایسا کیا بلکہ سب کے سامنے ان کی قدر و منزلت کے لیے کیا۔ وہ بات اس وقت بھی خفت و حقارت کے لیے نہ تھی۔ یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ جو سادات صالحین کے زمرے میں داخل ہیں۔ اور ان کا سیّد

ہونا آفتاب اور روز روشن کی طرح عیاں ہے اور وہ محمدیؐ طریقت پر چلتے ہیں۔ دعوت بھی اسی خالص محمدیؐت کی دیتے ہیں، تو خدا اور رسول اللہؐ کی خاطر سبھی کو ان کا پورے ذوق و شوق اور خلوص و محبت سے اتباع کرنا چاہیے اور ان کی دعوت کو قبول کرنا چاہیے۔ اہلِ دُنیا یا امت محمدیہؐ کے لوگ ان سے جو سلوک بھی روا رکھ رہے ہیں یا رکھیں گے، فی الحقیقت وہ براہِ راست حضور محمد مصطفیٰؐ (ان پر خدا کا درود و سلام) سے ہے۔ یہ قطعاً بیچ میں نہیں آتے، ان کی روح، روح محمدیؐ ہے، ان کا ایمان، ان کا گوشت پوست، ان کا محبوب و دوست سب کچھ محمدیؐ ہے۔ ان کا گھر خانۂ محمدؐ ہے، ان کا زمانہ، زمانۂ محمدیؐ، ان کا دور، دورِ محمدیؐ (ان پر درود و سلام) محمدیؐ طریقت کی وسعت تمام طریقوں پر حاوی ہے۔ ہم مسلمانوں میں سے کسی کو بھی بے گانہ نہیں سمجھتے۔ وہ خواہ کسی طریق یا سلسلے میں سے ہوں ہم انہیں محمدیوںؐ میں سے ہی سمجھتے ہیں۔ ان کی رحمت اور عنایت سبھی کے شاملِ حال ہے، اور ہمارا وسیلہ بھی الّا ماشاء اللہ کامل وسیلہ ہے۔ خدا کی پناہ اگر کوئی محمدیؐت سے صاف انکار کرتا ہے تو ہم سیدوں کا اس سے کوئی سروکار نہیں۔ پس اللہ تعالیٰ نے اس دور کو ہمارا دور بتایا ہے۔ اور ہمیں اپنے دور کے سب لوگوں کو خالص محمدیؐت کی طرف دعوت دینے کا حکم عطا فرمایا ہے۔ بعض کا شمار داعیانِ حق میں ہوتا ہے، اور بعض کا مقبولانِ حق میں۔ اور خدا کے فضل سے جو بات بھی بیان کی جا رہی ہے وہ آیاتِ قرآنی اور احادیث نبویؐ سے مستند ہے لہٰذا تمام انصاف پسند مومنوں کو اس آیت کریمہ کے بموجب کہ وہ بات کو سنتے ہیں اور اس میں سے جو بہترین ہے اس کا اتباع کرتے ہیں خالص محمدیؐت کا اختیار کرنا لازم ہے۔ اگر انصاف ناپسند لوگ محض یا ہمعصر ہونے کی بنا پر اس حق بات کو قبول نہ کریں تو انھیں پورا اختیار ہے۔ کیونکہ اپنے ہم عصروں میں ہم ایسے واقعات اکثر دیکھتے ہیں۔ یہ کوئی نئی بات نہیں۔ بلکہ اس سے بھی بڑھ کر باتیں ظہور پذیر ہو چکی ہیں۔ انبیائے کرامؑ کو ناحق قتل تک کیا گیا، امتیوں کی بات چھوڑیے، ان کے دوسرے سید بھائیوں کو اپنے ایسے بھائیوں سے متفق ہو کر خدا اور رسولؐ کی خوشنودی کی خاطر ان کا اتباع کرنا ضروری ہے۔ خواہ وہ اپنے آپ کو دوسرے مومنوں کی نسبت ادنیٰ و کم تر سمجھتے ہیں۔ ہر کسی سے شفقت و مہربانی سے پیش آتے ہیں۔ لیکن سب کو اپنی حدود کے اندر رہنا چاہیے، اور تمام امور میں ان کی تقلید کرنی چاہیے کیونکہ اللہ تعالیٰ کی حفاظت اور رسالتمآبؐ کی حمایت ان کے شاملِ حال ہے۔

منصبِ امامت کی تحقیق

ولایت اور امامت قربِ خداوندی کے مدارج و مناصب ہیں۔ یہ جو کچھ لوگ منصب امامت کو قرب الٰہی کے مناصب میں سے نہیں گنتے، اور لفظ امام سے فقط پیشوا یا مقتدا ہی کا مفہوم لیتے ہیں۔ وہ جس عالم، فاضل کو چاہتے ہیں اسی کو اپنی جماعت کا امام ماننے لگتے ہیں، وہ مرتبۂ امامت کی حقیقت سے ناآشنا اور جاہل ہیں۔ وہ اس حقیقت شناسی سے محروم ہیں۔ وہ بالکل چمگادڑ کی طرح ہیں، جو درخشاں اور روشن آفتاب کو نہیں دیکھ سکتی۔ یہ بعض عزیزان، جو مرتبۂ امامت کو بھی مرتبۂ نبوتؐ کی طرح بارہ اماموں کی ذات تک محدود کر کے ختم کر دیتے ہیں۔ اور یوں ان عالی جناب حضرات کی برکتوں سے محروم کر دیتے ہیں۔ انہیں فقط جاہلانہ محبت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے خاصانِ حق کو پیدا ہی اس لیے کیا کہ اوروں کو محبوب تک پہنچائیں، اور اللہ کے بندوں کو قربِ حق تعالیٰ سے مشرف فرمائیں۔ فقط کلمۂ طیبہ یا نماز روزہ سکھانا تو ہر کسی کو آتا ہے۔ ظاہری علوم کا کوئی استاد بھی اس سلسلہ میں کافی ہے۔ دنیا و آخرت کی صلاح کو حکما نے بھی خوب سمجھا اور اپنے شاگردوں کو سکھایا پڑھایا ہے۔ انبیاؑ و اولیائے کرام تو پیدا ہی اس لیے کیے گئے کہ وہ اللہ کے ساتھ نسبت کا خیال لوگوں کے دلوں میں ڈالیں، اور ان کی صحبت کے فیض سے لوگ قرب الٰہی حاصل کر سکیں اور روئے زمین پر یہ فیض یونہی قیامت تک جاری رہے۔ اور حضور رسول مقبولؐ نے حضرت علیؓ کو جو شہر علم کا دروازہ کہا ہے، اس سے یہی مُراد ہے کہ وہ دروازہ کھُلا رہے اور اس کا فیض قیامت تک جاری رہے۔ نہ یہ کہ یہ دروازہ بند ہو جائے تو کیسے پھر دروازے اور دیواریں کیا فرق رہ گیا۔ لہٰذا اس سلسلے میں با اختیار محمدیوں کا خالص اور صحیح عقیدہ یہ ہے کہ قربت الٰہیہ کے مناصب میں سے امامت کا منصب نبوت سے کم تر اور ولایت سے بالاتر ہے۔ چنانچہ جب خدا تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اس نعمت سے مشرف کیا تو فرمایا کہ میں بنانے والا ہوں تمھیں لوگوں کے لیے امام۔ حضرت ابراہیم خلیل اللہ نے اس سلسلے کے جاری رہنے کی طلب کرتے ہوئے عرض کی کہ کیا میری اولاد میں سے بھی۔ اس مرتبے کے حصول کے لیے خاتم النّبیینؐ نے دُعا فرمائی اور اُسے ہر نماز میں پڑھنے کا حکم دیا۔ یعنی اے اللہ رحمتیں بھیج محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور اُن کی آل پر جس طرح تو نے رحمت نازل کی ابراہیمؑ پر، اور اُن کی آل پر۔ بے شک تو ہی

حمد کے لائق ہے اور بزرگی والا ہے۔ اے اللہ برکتیں نازل فرما محمدؐ صلعم پر، اور ان کی آل پر جیسے تو نے برکتیں نازل کی ابراہیمؑ پر اور ان کی آل پر، بے شک تو ہی حمد کے لائق ہے اور بزرگی والا ہے۔ اور حق تعالیٰ نے اس دعا کو شرف قبولیت بخشا۔ اور اس سرورِ کائناتؐ کو منصب نبوت و ولایت کے ساتھ ساتھ امامت کا مرتبہ بھی عطا فرمایا۔ اور نبوت تو انہی کی بے مثال ذات پر ختم کر دی۔ اور ائمہ معصومین کی صورت میں امامت اور ولایت کے مرتبے کو جاری رکھا۔ اور امامت و ولایت کی نسبت کی قوت و کمال اور اہلبیت کو ان بارہ اماموں کی ذات پہ موقوف کیا، اور دونوں امور کا فیض قیامت تک جاری رکھا۔ اور ولایت کا فیض اللہ کی مشیّت کے مطابق امّتیوں کو پہنچتا ہے۔ لیکن امامت کا فیض سادات بنی فاطمہؓ کے لیے مخصوص ہے، کیونکہ حضور پاکؐ کی دعا میں لفظ آل آیا ہے۔ نیز اسے تشبیہہ بھی آلِ ابراہیمؑ سے دی گئی ہے۔ حدیث شریف میں جو بارہ اشخاص کی قید و شرط لگائی گئی ہے، اس سے مراد اسی نسبت کا تمام و کمال ہونا ہے۔ حق بات یہی ہے کہ وہ مرتبہ محض بارہ ائمہ معصومین ہی کو حاصل ہے۔ اس مرتبے پہ اور کوئی شخص نہیں پہنچتا نہ ہی پہنچے گا۔ امام کے لیے ضروری ہے کہ اُس کے تابعین میں اس کے بھائیوں یا فرزندوں میں سے کوئی اور بھی اسی زمانے میں درجۂ کمال تک پہنچا ہو اور ولایت کی نسبت پیدا کر کے اس کی پیروی کرے، کیونکہ بغیر مقتدی کے امامت ثابت نہیں ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ حضور نبی کریم صلعم نے فرمایا تھا، کہ اے علیؓ تم مجھ سے ہو جیسے کہ ہارون موسیٰؑ سے تھا۔ ولایت میں اس بات کی شرط نہیں۔ ایسا شخص بھی ہو سکتا ہے جو خود ولی ہو لیکن اس کے تابعین میں سے کوئی بھی ولی نہ ہو۔ امامت میں یہ شرط ضروری ہے۔ جب کبھی سادات میں سے کسی کو اس نسبت سے نوازتے ہیں اور موروثی فیض سے شرف یاب کرتے ہیں تو مومنین پر اس کی مدد امداد لازم ہے اور اُس سے محبت اور اُس کا اتباع واجب ہے۔ اس آیت کریمہ کا یہی مقصود ہے کہ تم اللہ کا کہنا مانو اور رسولؐ کا کہنا مانو، اور تم میں سے جو لوگ اہل حکومت ہیں ان کا بھی۔ اولیاء اللہ کو بھی ان کی اطاعت ضروری ہے خواہ وہ قطب ہی کیوں نہ ہوں۔ سورج کے سامنے چراغ کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی۔ وہ وہی کچھ کہے گا جو مناسب حال ہوگا۔ اس کا معاملہ خدا و رسولؐ کے ساتھ ہے۔ سبھی کے لیے اس کی اطاعت بھی بہتر ہے۔ وگرنہ نتیجہ جو ہوگا وہ قیامت میں دیکھ لیں گے۔ ہمارا کام تو صرف پیغام کا پہنچا دینا ہے۔

سیادت کی حقیقت

سیادت (سرداری) اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے ایک صفت ہے۔ لہذا اللہ کے ایک ہزار ایک ناموں میں سید السادات بھی ہے۔ گویا یہ اسمائے الٰہی میں سے ایک نام ہے۔ فی الحقیقت سیّد (سردار) وہی ذات باری تعالیٰ ہے اور بس۔ حدیث شریف میں بھی آیا ہے کہ سیّد (سردار) اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ فرمانبرداری کی بدولت رسولوںؑ کے سردار حضرت محمد مصطفیٰؐ کو سرداری حاصل ہے۔ (ان پر خدا کا درود و سلام) اور ان کے ضمن میں حضرت بی بی فاطمہؓ، حضرت علیؓ، امام حسنؓ اور امام حسینؓ کو سرداری نصیب ہوئی۔ پھر ان عالی قدر حضرات کی نسل اور آل اولاد کو یہ مرتبہ میسر ہوا۔ اور انشاءاللہ یہ مرتبہ قیامت تک سادات میں جاری رہے گا۔ ہاں ساداتِ بنی فاطمہؓ کا مرتبہ علوی سادات سے بلند تر ہے۔ یہ سمجھ لینا چاہیے کہ ایک مرتبہ ظاہری سیادت کا جو نسب اور فرزندیت کی بنا پر تمام سادات کو حاصل ہے۔ ایک مرتبہ باطنی سیادت کا ہے، اور حق تعالیٰ کے خاص قرب کا دوسرا نام ہے اور اس کی تعبیر بھی مرتبۂ امامت سے کی جاتی ہے۔ اس سیادت کا فیض ساداتِ بنی فاطمہؓ میں سے خدا جسے چاہتا ہے، عنایت کرتا ہے۔ ساداتِ بنی فاطمہؓ کے علاوہ یہ فیض کسی اور کے نصیب میں نہیں۔ علوی سادات اور امتیوں میں سے کوئی بھی اس عالیشان مرتبے پر فائز نہیں ہو سکتا۔ خواہ وہ غوث اور قطب، اور دیگر ظاہری و باطنی کمالات سے مشرف ہی کیوں نہ ہو۔ یہ عالی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضور خاتم الانبیا (ان پر خدا کا درود و سلام ہو) کی آل اولاد ہی سے مخصوص کی گئی ہے، کیونکہ حضرت امام حسنؓ اور امام حسینؓ کے دوسرے بھائیوں نے سیادتِ علویہ کے باوجود بھی حسنینؓ ہی کی اطاعت و پیروی کی ہے۔ سادات بنی فاطمہؓ کے دیگر افراد کو بھی ایسے فرد کا اتباع لازم ہے جس میں یہ ظاہری نسبت ہو۔ جیسا کہ ہر امامؓ کے زمانے میں ان کے بھائی بندوں اور آل اولاد نے انہی کا اتباع اور انہی کی پیروی کی۔ حتیٰ کہ حضرت امام حسینؓ نے امام حسنؓ کی فرمانبرداری کی، اور اپنے عزم راسخ کے باوجود ان کی حین حیات میں تلوار کو نیام سے باہر نہیں نکالا، کیونکہ اپنے زمانے میں وقت کی مصلحت اور زمانے کے تقاضوں کے مطابق ان کا ارادہ جنگ لڑنے کا نہ تھا۔ اور امام حسینؓ کے زمانے میں یہی مناسب تھا، کہ اب عملی اقدام کیا جائے، لہذا دونوں صاحبان نے وہی

کچھ کیا جو کچھ کہ کیا جانا چاہیے تھا۔ اور وہ اپنے وقت کے امام اور نائب پیغمبرؐ تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ہر زمانے میں ان کی نسل میں سے جس کسی کو امامت کے فیض سے مستفیض فرمایا تو اس دور کی موجودات کے ہر اعلیٰ اور ادنیٰ پر ان کی تقلید و اطاعت لازمی کر دی۔ پس جو لوگ ان صاحبانِ حکومت کے سچے احکام کی اطاعت نہ کریں گے اور ان سے محبت اور اعتقاد کا مظاہرہ نہ کریں گے، اُن کا جو پھل ہوگا وہ آخرت میں چکھ لیں گے ہمارا کام تو پیغام کا پہنچا دینا ہے۔ فائدہ یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ اصحابِ پیغمبرؐ کی عظمت بھی آل کی عظمت کی مانند ہے، کیونکہ یارانِ رسولؐ تھے ہی ایسے۔ اور آل کی عظمت صحابہؓ کی عظمت ہے کہ ان کے صاحبزادے ایسے ہوئے۔ آل اور اصحابِ پیمبرؐ میں پوری پوری صفائی ہے۔ کیونکہ اگر یہ نہ ہو پھر یہ کسی اور پہ عائد ہو جاتی ہے، ایسے توہمات سے خدا کی پناہ۔ وہ گروہ جو اپنے ہی پاس سے ان کا باہمی مقابلہ کر کے بعض کی بعض پر فضیلت ثابت کرتے ہیں۔ اس امر کو اپنا عقیدہ اور ایمانی اصول تصوّر کرتے ہیں۔ وہ تعصب اور دشمنی کی گرفتاری میں مبتلا ہیں۔ وہ قرآن اور حدیثؐ کی خلاف ورزی کر رہے ہیں، اور زائد اور من گھڑت باتوں سے بدعتیں پیدا کر کے اسے ہی دین و ایمان کے اصولات و کلیات قرار دیتے ہیں۔ اور اپنے جبلّی غرور و عداوت کی وجہ سے جانبداری اختیار کرتے ہوئے ان میں سے بعض کا بعض سے مقابلہ کرتے ہیں، اور پھر انتہائی بے ادبی سے ان کے فضائل و نقائص کا توازن و تقابل کرتے ہیں۔ اور اس بات کو قطعاً ملحوظِ خاطر نہیں رکھتے کہ وہ کن کا کن سے موازنہ کر کے ایک کے نقائص نکال کر دوسرے کی فضیلت بیان کرتے ہیں۔ چونکہ دراصل ان حضرات کا اتحاد اور ان کی یگانگت ان پر واضح اور ذہن نشین ہی نہیں ہوتی اس لیے وہ ایسا کرتے ہیں۔ اور اس کا نتیجہ یا فائدہ صرف اختلافات کا حصول ہے۔ لہٰذا چونکہ وہ ذہنی طور پہ بھی ان میں سے کسی ایک کے صاحبِ فضیلت ہونے کے فرق و اختلاف کو نہیں جانتے، اور طرفداری کرتے وقت بھی کسی ایک جانب کو الگ اور علیحدہ قرار نہیں دے سکتے۔ ورنہ ایسی فضیلت یا افضلیت کو ثابت کرنے کے لیے اتنی ردّ و قدح بحث مباحثے اور لڑائی جھگڑائی سے کام نہ لیتے، چنانچہ امامین یا دیگر ائمہ معصومین کی باہمی فضیلت توازن و تقابل یوں کبھی کسی کے ذہن میں نہیں آیا۔ لہٰذا اس تعصب کو جو محض ان کی ذاتی ہٹ دھرمی کا نتیجہ ہے چھوڑ دینا چاہیے، اور خالص محدثیت اختیار کر کے نئے نئے عقیدوں سے کوئی سروکار نہیں رکھنا چاہیئے اور سبھی کو درجہ بدرجہ کامل و فاضل، خوب اور بہتر سمجھنا چاہیے، اور اپنی طرف سے

مقابلہ کر کے ان میں سے کسی کو اعلیٰ یا کم تر قرار نہیں دینا چاہیے۔ کسی کے کہنے سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ اور کسی ایک صنف کے اعلیٰ یا ادنیٰ پن کا مقابلہ اسی صنف کے افراد سے کیا جا سکتا ہے۔ عامۃ المسلمین کا عوام الناس سے، اولیا کا اولیا سے، صحابہؓ کا صحابہؓ سے، اہلِ بیتِ رسولؐ کا اہلِ بیت رسولؐ سے اور انبیاءؑ کا انبیاءؑ سے۔ کسی ایک صنف کو دوسری صنف سے خلط ملط نہ کرنا چاہیے، کیونکہ ایک فرد کے اپنی صنف کے سبھی افراد سے صاحب فضیلت ہونے پر بھی وہ فرد دوسری صنف میں داخل نہیں ہو سکتا۔ اور نہ ہی ان کے احکام اس پر صادق آ سکتے ہیں۔ لہٰذا احادیث پیغمبرؐ میں اہل بیت و آل رسولؐ سے متعلق خصوصی احکام الگ ہیں۔ اور صحابہ کرامؓ سے متعلق خصوصی احکام الگ، امورِ عامہ میں سبھی شامل ہیں۔ لہٰذا تمام کلی و جزوی وجوہ کی بنا پر بھی کسی ایک کو دوسرے پر کلی فضیلت نہیں ہو سکتی۔ اور بعض جزوی امور کے راستے جزوی فضیلت یا کلی امور کے لحاظ سے کلی افضلیت تو اسی کا حصہ ہے جس کے مقدر میں خدا نے لکھ دیا ہو۔ اور یہ آیت کریمہ کہ ہم نے بعض کو بعض پر فضیلت دی اسی لحاظ سے ہے۔ حیرانی کی بات ہے جن کا عقیدہ یہ روا رکھے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواری ان کے اور اُن کے خلیفوں کے دوست و خیر خواہ ہوں، مگر خاتم النبیینؐ کے صحابہ کرامؓ ان کی آل اولاد کے مخالف ہوں اور انھیں خلافت کے سزاوار نہ سمجھیں۔ اللہ تعالیٰ ایسے باطل عقیدے سے بچائے۔ اور ایسے حضرات پر بھی تعجب ہوتا ہے، جن کے ایمان کا یہ تقاضا ہو کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت داؤد علیہ السلام کے بیٹے تو نبی ہوں اور محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم جو سارے جہانوں کے لیے رحمت ہیں۔ ان کی آل اولاد حضور پاکؐ کے کمالات سے بہرہ یاب نہ ہو۔ اور دوسرے یاران و اصحاب پیمبرؐ سے بھی کم تر ہوں۔ اللہ تعالیٰ ایسے فاسد عقیدوں سے ہمیں اپنی حفاظت میں رکھے۔ پس ہر چند کہ نبوت کا منصب ختم ہو چکا ہے، لیکن خلفائے راشدین میں سے ہر ایک (ان سب کو خدا کی خوشنودی حاصل ہو) حضور نبی کریم صلعم کا قائم مقام نائب اور راستگار خلیفہ ہے۔ اگرچہ وحی کے نزول کا سلسلہ اور نبوت دونوں ختم ہو چکے ہیں، لیکن ائمہ معصومین نبوت کے تمام کمالات سے بہرہ مند ہیں۔ جب امتِ محمدیہ کے سلسلے میں کہا جاتا ہے کہ اُمت محمدیہ کے علماءؒ بنی اسرائیل کے انبیاءؑ جیسے ہیں، تو پھر یہ ائمہ حضرات کمالاتِ محمدیؐ سے کس طرح فیض یاب نہ ہوں گے۔ حیف صد حیف یہ لوگ اپنے عقیدے کے مطابق جو کچھ جانتے ہیں سو جانتے ہی ہیں، لیکن یہ بات یقینی ہے کہ ائمہ حضرات (ہدایت ان کے

اجداد پر اور ان پر سلامتی) خلفائے راشدین میں سے ہر ایک کو اپنے اپنے دور میں خلافت کا زیادہ حقدار اور سزاوار سمجھتے تھے، اور یہ بھی یقینی امر ہے کہ صحابہ کبار بھی خود کو آلِ رسولؐ (جس پر وہ ایمان لائے تھے) پر بہمہ وجوہ افضل و برتر نہ سمجھتے تھے۔ ان کا یہی کمال تھا کہ وہ رسولؐ و آل رسولؐ پر جان چھڑکتے تھے۔ ورنہ یہ بات بہت نامناسب اور ناخوشگوار ہوتی۔ وہی حضرات جو صحابہ کرامؓ میں سب سے افضل تھے، وہی اس امر کا خاص لحاظ اور پاس رکھتے تھے، اور یہی بات ان کو صاحب کمال بنا دیتی ہے۔ پس وہ اگر صحابہ ہی کے مولیٰ اور صاحب نہ ہوتے تو اور کس کے ہوتے۔ اکثر صحابہ سے یہ روایت ہے کہ جس وقت آنحضرت صلعم نے غدیر خم پہ نزول فرمایا، تو مومنوں کو جمع کیا، اور حضرت علیؓ کا ہاتھ تھامتے ہوئے فرمایا، کیا تم نہیں جانتے کہ میں ہر مومن سے ان کے اپنے نفوس (جانوں) سے زیادہ قریب ہوں۔ لوگوں نے کہا، کیوں نہیں یا رسول اللہؐ۔ پس فرمایا، اے اللہ جس کا میں مولیٰ ہوں پس علیؓ اس کا مولیٰ ہے۔ اے اللہ رہبری کر اس کی جس کی وہ رہبری کرے اور دشمنی کر اس سے جس سے جس سے وہ دشمنی کرے، اور محبت کر اس سے جس سے وہ محبت کرے، اور بغض رکھ اس سے جس سے وہ بغض رکھے۔ اور مدد کر اس کی جس کی وہ مدد کرے، اور ذلیل کر اُسے جسے وہ ذلیل کرے۔ اور گھما دے حق کو اس کے ساتھ جہاں وہ گھومے۔ پس ملے حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ سے اس کے بعد پس فرمایا، یہاں ابنِ ابی طالب تو ہو گیا ہے مومنوں کا مولیٰ (ہر صبح و شام) پس صحابہ عظمت کمال اور فضیلت، اور ان میں سے صاحبانِ کمال کی افضلیت اگر اہلِ بیت کو معلوم نہ ہوگی تو اور کسے معلوم ہوگی۔ لہٰذا انتہائی قدردانی کی بنا پر وہ ان کو اپنے سے افضل قرار دیتے رہے۔ اور رسول اللہ صلعم کے فرمان کے مطابق ان کی پوری متابعت اور فرمانبرداری کرتے تھے، اور ہر حال میں دین محمدیؐ کے اجرا پر اپنی توجہ مبذول رکھتے تھے اور دیگر کسی کام سے سروکار نہ رکھتے تھے۔ اور اب بھی ان کی نسل اور آل و اولاد سے فلاح و بہبود کے سلسلے میں بے غرضی سے کام لیتے ہیں۔ اور انہی حضرات کی مرضی کے مطابق گفتگو کرتے ہیں۔ لہٰذا سبھی کو چاہیے کہ اپنے کانوں سے روئی کے پنبے نکال کر غور سے سنیں، اس افراط و تفریط کو ترک کر دیں۔ انصاف کی آنکھیں کھولیں اور ظلم نہ کریں۔ آخر کار کام محمد مصطفےٰؐ اور اُن کی آل ہی سے پڑے گا۔ اور یوم جزا کا مالک خالص محمدیوں کی دادرسی کرے گا۔ اور اس آیت کریمہ کے بموجب کہ تم جن باتوں میں باہمی اختلاف رکھتے تھے، اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اُن کا فیصلہ کر دے گا۔

ان لوگوں کی ہٹ دھرمی نے ان کو خالص محمدیتؐ کی وحدت سے الگ کر دیا ہے اور انھیں اس نجات پانے والے فرقے سے جدا کر کے دُور پھینک دیا ہے۔ جس کی طرف اس حدیث شریف میں اشارہ ہے کہ عنقریب میری امت افتراق میں پڑ جائے گی۔ ان کی یہ انا اور غرور بیجا ہیں اور خالص محمدیوںؐ سے پیچھے رہ جانا ان کی بڑی غلطی ہے۔ اے قوم کیا نہیں وعدہ کرتا تم سے تمھارا رب خالص محمدیؐ طریقے کو اختیار کرنے کا اچھا وعدہ قرآنی آیات کے شواہد کے ساتھ۔ کیا وعدہ تم پر طویل ہو گیا اور تم بھول گئے محمدیت، اور تم نے گمان کیا کہ یہ طریقہ بھی نیا طریقہ ہے جیسے دوسرے طریقے ہیں جنھیں نیا بنا لیا ہے محمدیوںؐ نے اپنی طرف سے ہی، یا تم نے یہ خیال کیا کہ اترے گا تم پر غضب تمھارے رب کی طرف سے آخرت میں۔ پس تم نے ممانعت کی میرے وعدے کی، پس تم نے نہ سنی میری دعوت اطاعت اور اعتقاد کے کان سے، اور اے قوم تم آزمائش میں ڈالے گئے اس سے اور تم نے نہ ادراک کیا حقیقت کا، اور بے شک تمھارا رب رحمان ہے۔ اس کی رحمت سے مایوس نہ ہو۔ پس میری پیروی کرو اور اطاعت کرو میرے حکم کی جس کا میں تمھیں حکم دیتا ہوں اللہ اور رسولؐ کے حکم سے۔ اور میں نے یہ کام اپنی جانب سے نہیں کیا۔ اس کے سوا نہیں کہ تمھارا اللہ وہ ہے کہ نہیں کوئی معبود سوائے اس کے۔ علم کے لحاظ سے ہر چیز پر محیط ہے۔ پس اے مخاطب اسی طرح ہم بیان کرتے ہیں تم پر ان خبروں میں سے جو گزر چکی ہیں، اور بے شک آگئی ہے تم پر ہماری جانب سے نصیحت۔ اللہ سبحانہٗ تعالیٰ کی تذکیر کی نصیحت اخذ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی آیات سے۔ جس نے روگردانی کی اس سے، بے شک وہ اٹھائے گا قیامت کے دن بوجھ، اور سلامتی ہو اس پر جس نے پیروی کی ہدایت کی۔ اے منصف حقیقت کو دیکھ، اور اے بے تعصب انسان ہوش کے کانوں کو کھول، کسی کی بیجا حمایت و طرفداری نہ کر، فقط اس امر کو سمجھ کہ کون حق بجانب ہے۔ اور محمد مصطفیٰ صلعم کی رضا کس بات میں ہے۔ اگر تم نے پیروی کی ان خواہشات کی بعد اس کے کہ آگیا تمھارے پاس علم، نہیں ہے تیرے واسطے کوئی ولی اور نہ کوئی مددگار، اے اللہ مدد فرما جس نے دینِ محمدؐ کی مدد کی اور ذلیل کر اُسے جس نے دینِ محمد صلعم کو ذلیل کیا۔ اللہ کے بندو بے شک اللہ تمھیں حکم دیتا ہے عدل کا، احسان کا، اور روکتا ہے تمھیں فحش اور ناپسندیدہ باتوں سے، اور ہر کسی سے نصیحت کرتا ہے تاکہ تم نصیحت حاصل کرو، اور اس کا ذکر اعلیٰ و اولیٰ و اکبر ہے۔

آل واہلِ بیت کے الفاظ کی تحقیق

یہ سمجھ لو کہ آل اہل و عیال کے معانی میں آتا ہے اور تابعین و مقلدین کے لیے بھی آتا ہے۔ چنانچہ اسی لحاظ سے یہ کہا گیا، ہر مومن کی طرف اور ہر اس شخص کی طرف جو میرے راستے پر چلے، تو پھر اس لحاظ سے یا ان معنوں میں صحابۂ کبارؓ (انھیں خدا کی رضا و خوشنودی حاصل ہو) ہی کو کیا کہنا، کیونکہ سارے مومن اور مسلمان آل میں داخل ہیں۔ یہ اطلاق تو اس قسم کا ہے جیسے عموماً کہہ دیتے ہیں کہ سچے دوست اور موافق احباب فرزندوں کی طرح ہوتے ہیں یا کہ بادشاہوں کی رعیت ان کے بال بچوں کی طرح ہوتی ہے۔ پس یہاں بھی تشبیہہ دی جانے والی چیز پر جس سے تشبیہہ دی گئی ہے، اس کی افضلیت ثابت ہو جاتی ہے ورنہ اس کی تعریف و توصیف کی ہی نہ جاتی۔ یہ تو کبھی نہیں کہتے کہ بیٹے دوستوں کی طرح ہوتے ہیں یا شاہزادے رعیت کی مانند ہوتے ہیں۔ اور اکثر دوست یاروں ہی کی تعریف اور انہی کے خلوص و دوستی کا تذکرہ زبانوں پر آتا ہے۔ اپنے بال بچوں کی نسبت ایسی گفتگو نہیں کی جاتی، کیونکہ ان کی تعریف تو خود اپنی تعریف ہو جاتی ہے۔ بلکہ اپنے سے زیادہ محبت و میلان کا تذکرہ دوستوں ہی کے باب میں کیا جاتا ہے، اور بھائیوں بیٹوں سے بڑھ کر ان کی بزرگی و بہتری بیان کی جاتی ہے۔ بعض امراو ارکینِ سلطنت کو بھی ان کی جان نثاری اور ایثار و قربانی کی بنا پر شاہزادوں سے بھی بڑھا دیتے ہیں۔ لیکن اس اطلاق کے باوجود بھی فرزند اور غیر فرزند یکساں نہیں ہو جاتے، اور نہ ہی حقیقتاً متحد ہو سکتے ہیں۔ حقیقت حقیقت ہے اور مجاز مجاز۔ لہذا تمام وجوہ یعنی لفظی، معنوی، لغوی، اصطلاحی، حقیقی اور مجازی معنوں میں آنحضرت صلعم کی آل سے مراد و مطلوب آنحضرتؐ کی اولاد اور نسل ہی سے ہے، اور اس لفظ کی باہمی مسابقت کی دوڑ اور عمومی مشہوری کے باعث اسی معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ جب اس میں صحابہؓ کو بھی شریک کرنا منظور ہو تو اس کے ساتھ اصحاب کا لفظ الگ لاتے ہیں۔ اور علیٰ آلہٖ و اصحابہٖ کہتے یا لکھتے ہیں۔ کیونکہ ان کا ذکر کیے بغیر اس لفظ کا آنحضرتؐ کی آل اولاد اور نسل ہی کا مفہوم لیا جاتا ہے۔ اگرچہ اس لفظ آل کا اطلاق کسی ایسے آدمی کی قوم اور اُس کے تابعین پر بھی ہو سکتا ہے جس کی اپنی آل اولاد نہ ہو۔ لیکن چونکہ ہمارے آنحضرت صلعم کے ہاں تو آل اولاد موجود ہے تو پھر کسی اور کو اس سلسلے میں ان سے شراکت نہیں ہو سکتی۔ اگر یہ لفظ اپنے عام معنوں ہی میں استعمال ہوتا

توپھر اس کو ان خاص حضرات سے کیسے منسوب کیا جا سکتا تھا۔ لہذا چونکہ اس کے خصوصی معانی کے مظاہر وہی حضرات ہیں تو یہ لفظ بھی اُنھی کے لیے مختص ہو گئے۔ بعض آل کی تفسیر اہل بیت سے بھی کرتے ہیں، ان معنوں میں کہ بنی ہاشم کے وہ لوگ جن پر صدقہ حرام ہے۔ فخر رازی نے لکھا ہے، کہ بہتر یہی ہے کہ اہلِ بیت سے مراد اولاد اور ازواج مطہرات ہی لی جائے۔ حضرات علیؓ بھی انہی میں داخل ہیں۔ باہمی اتحاد و میل ملاپ کے باعث بھی اور اس لحاظ سے بھی کہ اہلِ بیت فقط حضرت بی بی فاطمہؓ، امیر المومنین حضرت علیؓ اور امام حسنؓ اور امام حسینؓ (ان سب پر خدا کی رحمت و سلامتی ہو) ہی کے لیے مخصوص ہے۔ جیسا کہ مباہلہ والا قصہ اور "حدیث کسا" بھی اسی پر دلالت کرتے ہیں۔ یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ ایک بیت نسبی یعنی خاندانی ہے جیسا کہ دادا کی اولاد کو اس کی بیت کہتے ہیں۔ ان معنوں میں قریب ترین قرابت داری کا شرف بھی بنی ہاشم کو حاصل ہے۔ ایک بیت سکنی ہوتی ہے، جو باہمی مراتب کی فوقیت اور تفاوت کے باوجود ایک ہی گھر میں بسنے والے سبھی ساکنوں کو حاصل ہوتی ہے۔ ایک بیت پیدائشی ہوتی ہے جس میں دیگر خصوصیات سمیت یہ خصوصیت صرف اولاد ہی کو حاصل ہوتی ہے۔ پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور امیر المومنین حضرت علیؓ ہی صاحبِ خانہ اور گھر کے مالک ہیں، اور ان کے فرزند بھی صاحبِ خانہ اور مالک خانہ ہیں۔ امیر المومنین حضرت علیؓ کی آنحضرتؐ سے عجیب ظاہری اور باطنی اپنائیت ہے، اور اک طرفہ جسمانی و روحانی اتحاد ہے کہ یہ فرمودات کہ میں اور علی ایک ہی نور سے ہیں۔ تیرا گوشت میرا گوشت ہے۔ تیرا خون میرا خون ہے۔ گویا ان کا معاملہ ایک نفس کی طرح ہے۔ اور حسنینؓ کو بھی حضور پاکؐ سے ابنی نسبت حاصل ہے۔ چنانچہ آیۂ مباہلہ میں خود خداوند تبارک و تعالیٰ نے اس امر کا اظہار کیا کہ آپ فرما دیجیے (اے نبیؐ) کہ آجاؤ، ہم اور تم بلا لیں اپنے بیٹوں کو اور تمھارے بیٹوں کو اور اپنی عورتوں کو اور تمھاری عورتوں کو، اور خود اپنے تنوں کو اور تمھارے تنوں کو۔ یہاں امام حسنؓ اور امام حسینؓ کی فرزندیت بالکل واضح اور عیاں ہے۔ اور جمع متکلم کی ضمیروں سے وہی نفس واحدہ والا معاملہ ہے اور مراد حضرت علیؓ ہیں۔ اور لفظ انفس کا استعمال بھی انہی کی یگانگت اور اتحاد پہ دلالت کرتا ہے۔ اس آیت مذکورہ کے قصے سے حضور پاکؐ کی ان حضرات سے شدید محبت ظاہر ہوتی ہے کہ ان کے دل و جان، جگر گوشے اور نور نظر تھے۔ سعد بن وقاص سے روایت ہے کہ جب نازل ہوئی یہ آیت کہ ہم بلاتے ہیں اپنے بیٹوں کو، اور تم اپنے بیٹوں کو، تو بلایا حضرت علیؓ، فاطمہؓ اور حسنؓ حسینؓ کو، اور عرض

کی کہ اے اللہ یہ سب میرے گھر والے ہیں۔ مردوں اور عورتوں سے مراد حضور پاکؐ، حضرت علیؓ، بی بی فاطمہؓ اور حسنینؓ ہیں، اور فرمایا یہی اہلِ بیت ہیں۔ حضور پاکؐ کی ازواجِ مطہراتؓ جنھیں امہات المومنین کہتے ہیں وہ حضورؐ کے اہلِ خانہ ہیں۔ ان عالی قدر حضرات کے علاوہ اگر کسی اور شخص پر اس کا اطلاق آیا ہوگا تو وہ قریب قرابت داری یا زیادہ میل ملاپ اور اہلِ بیت کی زیادہ خدمت گزاری کی وجہ سے ہے۔ اور خاندانِ نبوتؐ کی عظمت و بزرگی یا مشہور عوام اور معلوم عوام ہونے کے باعث۔ مومنین سوائے اس گھرانے کے اور کسی گھر کو نہیں جانتے۔ بیت کے ساتھ آنحضرتؐ کے اسم گرامی کا اضافہ ضروری نہیں کہ یہ لفظ اہلِ بیت مخصوص ہی رسول اللہؐ کے گھرانے سے ہے۔ لہٰذا اس وارد (باب) کے عنوان میں بھی لفظ اہل بیت (ان سب پر خدا کا درود وسلام) ہی لایا گیا ہے اور لفظ بیت کے ساتھ الف لام فارسی ترکیب سے لایا گیا ہے بلا ضرورت نہیں۔ نکتہ یہ ذہن نشین کر لیں کہ بیٹا، باپ کی ذات کا مظہر ہوتا ہے اور بیٹی اس کی صفات کی مظہر ہوتی ہے۔ چونکہ حضور پاکؐ پہ نبوت ختم ہو چکی اور ان کے بیٹوں کو حق تعالیٰ نے بچپن ہی میں اس جہان سے اُٹھا لیا تھا۔ تو حق بات یہ ہے کہ نبیؑ کا بیٹا اگر نبیؑ نہ ہو تو گویا وہ اپنے درجۂ کمال سے بچھڑ کر رہ گیا، اور اپنی اصلیت تک نہ پہنچ سکا۔ خلافت اس کے مرتبے سے کم تر چیز ہے۔ فرمایا رسول اللہؐ نے کہ اگر زندہ رہتا ابراہیمؑ (ابن محمدؐ) تو وہ ہوتے سچے نبیؑ۔ لہٰذا حق سبحانہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں جہاں ختم نبوت کا ذکر کیا ہے، اس سے پہلے مردوں میں سے حضورؐ کے کسی کے باپ ہونے کی نفی کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ محمدؐ تمھارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں، لیکن اللہ کے رسولؐ ہیں اور نبیوں کے ختم پر ہیں۔ مردوں کی شرط اور مومنین سے خطاب کی ضمیر کا ماحصل یہی ہے کہ وہ مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں، نہ یہ کہ کسی بیٹے یا بیٹی کے باپ ہونے کی نسبت بھی نہیں۔ حضور پاک کی کنیت ابوالقاسم ہے۔ اور حضرت بی بی فاطمہؓ (ان پر خدا کی سلامتی ہو) نے اس آیت کریمہ کے نزول پر خوشی ومسرّت کا اظہار فرمایا کہ نفی کرتے وقت حق تعالیٰ نے مردوں کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اور ختم نبوت کے معنی یہ ہیں کہ کمال کے تمام مراتب ان کی ذات بابرکات پر آ کر ختم ہو گئے، پھر کونسا درجہ باقی رہ گیا۔ چنانچہ زمانہ گزرنے کے ساتھ ساتھ اُمتوں کے بگاڑ کے وقت دوسرے نبیؑ کی ضرورت ہوتی تھی۔ اب حضور پاکؐ کی نسل سے کامل افراد اور مخلص پیروکار اور تابعین جو بمنزلہ انبیاءؑ کے ہیں مستقلاً قیامت تک یہ کام سرانجام دیتے رہیں گے اور کسی اور کی ضرورت ہی

نہ رہے گی۔ پس چونکہ خدا کو یہی منظور تھا کہ نبوت کا سلسلہ ختم کر دے اور حضور پاکؐ کے فیض اور ان کے کمالات کے ظہور کو بند نہ کرے، تو ذاتِ الٰہی نے آنحضرت صلعم کے فرزندوں کو انھی کی صفات کی مظہر بی بی فاطمہؓ کی وساطت سے ظاہر کیا، اور ان کی ذات کا مظہر ایک واسطے اور پردۂ صفات سے پیدا کیا، جو ذاتی ظہورات ہی ہیں، اور جگر گوشے ہونے کے واسطے سے وہ وساطت اور بھی زیادہ محبت کا موجب ہوگئی۔ آنحضرتؐ کو ان کی سلامتی اس حد تک منظور تھی، کہ اُنھوں نے زندگی میں حضرت ابراہیمؑ کی جگہ لے لی اور امتِ مسلمہ کی اصلاح و ہدایت یا اُنھیں گمراہی سے روکنے کے لیے حضورؐ نے کلام الٰہی اور اپنی آل اولاد چھوڑی۔ اور امامت و ولایت کے مراتب، کمالاتِ محمدیہؐ اور خالص محمدیتؐ سے ان کی مستقل نسبت قیامت تک جاری رہے گی۔ حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ میں نے دیکھا رسول اللہؐ کو ان کے حج میں عرفہ کے دن وہ اپنی اونٹنی قصولی پر سوار خطاب فرما رہے تھے۔ میں نے یہ فرماتے سُنا کہ اے لوگو میں چھوڑ رہا ہوں تم میں وہ چیز کہ اگر تم اسے پکڑ لوگے تو گمراہ نہیں ہوگے؛ اللہ کی کتاب اور میرا خاندان، میری عترت (نسل) میرے گھر والے ہیں۔ اور زید بن ارقمؓ سے روایت ہے کہ فرمایا رسول اللہؐ نے کہ میں چھوڑ رہا ہوں تم میں وہ چیز کہ اگر تم اس کو پکڑے رکھوگے تو گمراہ نہیں ہوگے۔ ان میں سے ایک دوسری سے بڑی ہے۔ اللہ کی کتاب رسی ہے جو لٹکائی گئی ہے آسمان سے زمین کی طرف، اور میرا خاندان میرے گھر والے۔ یہ دونوں الگ نہیں ہوں گے یہاں تک کہ وہ نازل ہوں گے حوض پر۔ پس دیکھو کہ تم کیسے خلافت کرتے ہو میری ان دونوں کے بارے میں۔ اور حضرت امام حسنؓ اور امام حسینؓ کو فی الحقیقت نبی پاک صلعم سے اپنی اضافت ہے جیسا کہ مباہلہ والی آیت کریمہ سے صاف ظاہر ہے۔ اور اکثر احادیثؐ میں بھی آیا ہے کہ رسول اللہ صلعم منبر پر تھے اور حسن ابن علیؓ ان کے پہلو میں تھے۔ اور کبھی وہ متوجہ ہوتے تھے لوگوں کی طرف اور کبھی حضرت حسنؓ کی طرف اور فرماتے تھے بیشک میرا یہ بیٹا سردار ہے۔ اور اسامہ بن زیدؓ سے روایت ہے؛ کہتا ہے نکلے نبی کریم صلعم اور حسنؓ، حسینؓ آپ پر سوار تھے۔ آپ نے فرمایا یہ میرے بیٹے ہیں، اور یہ میری بیٹی کے بیٹے ہیں۔ اور آپ نے کہا اے اللہ میں ان سے محبت کرتا ہوں، پس تو بھی ان سے محبت کر اور ان سے بھی محبت کر جو ان سے محبت کرتے ہیں۔ حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ سوال کیا گیا رسول اللہؐ سے، آپ کے گھر والوں میں آپ کو سب سے زیادہ محبوب کون ہیں۔ آپؐ نے فرمایا حسنینؓ۔ اور آپؐ کہتے تھے فاطمہؓ سے بلاؤ میرے لیے میرے

دونوں بیٹوں کو۔ پس ان دونوں کو آپ پیار کرتے، چمکارتے اور اپنے ساتھ لگاتے۔ اور اکثر صحابہ کبارؓ اور ان کے بھائی بند بھی حسنینؓ کو مخاطب کرتے وقت یا ابنِ رسول اللہؐ ہی کہتے تھے۔ اور سچی بات تو یہ ہے کہ اولاد کی اولاد سے بھی عجب محبت اور انسیت ہوتی ہے۔ ان کی فرزندیت اور جزئیت دوگنی ہوجاتی ہے، اور ان پر اپنی اضافت کا اطلاق منہ بولے بیٹوں کی طرح مجازاً یا لفظاً نہیں ہوتا۔ وہ امرِ واقعی ہوتا ہے۔ یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ جب خلفاءحضرات کے اس سعادت سے بہرہ مند ہونے کا وقت آیا جس کے وہ پورے حقدار اور سزاوار تھے۔ اس وقت امام حسنؓ وحسینؓ کی عمر ظہور کمالات کی نہ تھی۔ وہ بہت کم سن تھے، اور یوں بھی نبیؐ کی جانشینی عام سلطنت کے طریقوں کے مطابق وراثۃً تخت نشینی یا حکمرانی نہیں ہوتی۔ لہذا کارکنانِ قضا و قدر نے اتنا عرصہ انہی برحق خلیفوں سے حقانی امور کو سرانجام دلوایا ورنہ کسی اور کی نوبت ہی نہ آتی۔

تحیّۃ کی حقیقت

یہ جان لیجیے کہ تحیّۃ کے معنی سلام کے ہیں۔ اور جمہور کا اتفاق ہے کہ یہ آیت کریمہ کہ اگر تم پر کوئی سلام بھیجے تو اُس کا جواب اس سے احسن طریق پر دو، سلام ہی کے بارے میں ہے، نیز سلام علیک کے احسن جواب کی واجبیت پر بھی دلالت کرتا ہے۔ یعنی جواب میں اس پر رحمتہ اللہ بڑھاؤ۔ اور اگر السلام علیکم و رحمتہ اللہ کہا جائے تو اس پر بھی برکاتہٗ بڑھا دیا جائے۔ اور یہ انتہا ہے۔ یا اس طرح جیساکہ روایت ہے کہ کسی شخص نے حضورؐ سے السلام علیکم کہا تو حضور پاکؐ نے جواباً وعلیکم السلام و رحمتہ اللہ کہا۔ اور ایک اور آدمی نے السلام علیکم و رحمتہ اللہ و برکاتہٗ کہا تو حضورؐ نے جواب میں فرمایا تم پر بھی۔ اس آدمی نے کہا میرے حق میں آپ نے کمی فرمائی، پس کہاں ہے وہ سب کچھ جو اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔ حضور پاکؐ نے فرمایا کہ تم نے میرے کہنے کے لیے کچھ بھی نہ چھوڑا جو میں اس پر بڑھا دیتا، لہذا میں نے وہی سب کچھ تمھارے حق میں لوٹا دیا۔ جان لو کہ ہر قسم کی تحیات اللہ کے لیے ہے جس طرح کہ حمد اسی کے لیے ہے ساری کی ساری۔ پس جب تمھیں سلام کیا جائے سلامتی کے ساتھ تو تم پر سلامتی بھیجی جاتی ہے اللہ تعالیٰ کے ضمن میں ہی، پس اس صورت میں ہوتی ہے سلام اللہ کے لیے اصالۃً اور تمھارے لیے تبعیتۃً۔ جیساکہ جسم جو ہے وہ بالذات مشارٌ الیہ ہے، اور سطح

ہے پیروی کرتے ہوئے ۔ کیونکہ سطح کا کوئی وجود نہیں ہوتا مگر اس کے ساتھ ہی ، اور یہ گمان نہ کرو اس بیان سے کہ اللہ تعالیٰ امعروض ہے ، اور خلق اس پہ عارض ہے ۔ ہرگز نہیں ، بلکہ اس کے سوا نہیں کہ ہم نے بیان کی ہے مثال بالجملہ مطلب کو سہولت سے سمجھانے کے لیے ۔ پس اگر تمھیں سلام کیا جائے سلامتی کے ساتھ اُس کے ضمن میں جس کے لیے سارے کے سارے تحیّات ہیں ، پس تم سلام کرو اس سے مبرّا انانیت کے امتزاج کو مطلقاً خالص کرنے کے لیے ۔ اور لوٹاؤ اس سلام کو اسی کی طرف جو اس کا زیادہ حقدار ہے ، تاکہ زیادہ کیا جائے تم میں اس کی رحمت کا نور اور برکت اور لوٹاؤ اُسے اس مظہر کی طرف کہ جس کے واسطے سے تم پر وہ سلام پہنچا ہے شکر ادا کرتے ہوئے نعمت کا ۔ اور انعام دینے والا ظاہر اور مظہر سے ہے ۔ جس طرح کہ نبی کریم صلعم نے فرمایا جو نہیں شکر ادا کرتا لوگوں کا وہ اللہ کا شکر بھی ادا نہیں کرتا ۔ اور زیادتی کرو لفظوں میں بھی ظاہری اور باطنی مطابقت کے لحاظ سے ، اور کہو وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ ۔ اے اللہ تو سلامتی ہے اور تجھ ہی سے سلام ہے ۔ تو پاک ہے اے زندگی والے اے اکرام والے ، اور درود بھیج اور سلامتی بھیج اس پہ جو رحمۃ اللّعالمین ہے اور آپؐ کی آل اور اصحاب ، سب پہ قیامت کے دن تک ۔ تنبیہہ ایک گروہ کے نزدیک صلوٰۃ و سلام کے الفاظ رسالت مآب حضور نبی کریم صلعم ہی سے مخصوص ہیں اور ان کے ضمن میں آل و اصحاب آنحضرتؐ کے لیے بھی جائز ہیں ۔ لیکن جب فقط کسی امام یا صحابی کا ذکر ہو تو اُس کے ساتھ رضی اللہ عنہٗ کے لفظ لانے چاہئیں ۔ اس صورت میں مرتبۂ نبوت کا امامت اور ولایت کے مراتب سے امتیاز و کمال ہے ۔ اگر کسی کی زبان سے یہ سنیں کہ ائمہ اور آل رسولؐ پہ بھی صلوٰۃ و سلام کہتا ہے تو دل میں بُرا مناتے ہیں اور اسے شیعہ حضرات میں شمار کرتے ہیں اور جس طرح ایک گروہ رسول اللہ کا نام زبان پہ آتے ہی یا سنتے ہی حضور پہ صلوٰۃ و سلام بھیجتا ہے ۔ اسی طرح کسی امام کا نام سنتے ہی اس پہ صلوٰۃ و سلام بھیجنا چاہیے ، کیونکہ ائمہ معصومین حضورؐ سے اپنائیت و عینیّت کی نسبت رکھتے ہیں ۔ اور اسی سرور کائنات کے اجزا (جگر گوشے) ہیں ۔ ان معنوں میں مرتبۂ ادب میں کمی واقع نہیں ہوتی بلکہ یہ کمال ادب ہے ، کیونکہ کسی شخص کی نسل یا آل اولاد کی تعظیم بھی درحقیقت اسی شخص کی تعظیم و تکریم ہوتی ہے ۔ اسی کی محبت کا غلبہ ان کی محبت کا باعث بنتا ہے ۔ اور صحیح بات یہ ہے کہ جو کچھ اول الذکر جماعت نے کہا وہ بھی ایک لحاظ سے صحیح ہے ۔ کیونکہ اس میں بھی ادب ہی ملحوظ خاطر ہے اور مرتبۂ نبوت کا زیادہ پاس و احساس ہوتا ہے اور جو کچھ دوسرے

گروہ نے کہا ہے۔ وہ بھی ایک لحاظ سے صحیح ہے کہ جب عامۃ المسلمین کو ایک دوسرے پر سلام بھیجنا لازم ہے اور اُس کا جواب دینا بھی واجب ٹھہرا، اور اللہ تعالیٰ بھی جملہ مومنین سے خطاب کرتے وقت ان پر صلوٰۃ بھیجتا ہے، جیسا کہ اس آیت کریمہ میں آیا ہے کہ وہ ایسا رحیم ہے کہ وہ خود بھی اور اُس کے فرشتے بھی تم پر رحمت بھیجتے رہتے ہیں تاکہ حق تعالیٰ تم کو تاریکیوں سے نور کی طرف لے آئے اور اللہ تعالیٰ مومنین پر بہت مہربان ہے۔ وہ جس روز اللہ تعالیٰ سے ملیں گے۔ تو ان سے جو سلام ہوگا وہ یہ ہوگا کہ السلام علیکم، اور اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے عمدہ صلہ جنت میں تیار کر رکھا ہے، تو پھر آنحضرت صلعم کی آل اولاد پر صلوٰۃ وسلام بھیجنا کیسے روا نہ ہوگا۔ جب کہ خود حضور پاکؐ نے ہمیں ہر نماز میں ان پر صلوٰۃ وسلام بھیجنے کا حکم دیا ہے۔ ہاں خالص محمدیوں کے لیے بہتر اور زیادہ مناسب یہی ہے کہ جب کبھی ان کی زبان پر کسی امامؑ کا نام آئے یا وہ کسی امامؑ کا نام سنیں تو کہنا چاہیے کہ ان پہ اور ان کے جد سب پر درود وسلام۔ اور جب حضرت بی بی فاطمہؓ کا نام آئے تو ان کے والد اور ان دونوں پہ صلوٰۃ و درود کہنا چاہیے، کیونکہ اس صورت میں ادب ملحوظ رہتا ہے کہ حضور سرورِ کائناتؐ کو شامل کر کے ان سب پر درود وسلام۔ حضور نبی کریمؐ کی وساطت کے بغیر تنہا انہی پہ نہیں جس سے بے ادبی کے پہلو کا گمان گزرتا ہے، اور یوں حضور پاکؐ کی دُعا پہ بھی عمل ہو گیا کہ اے خدا حضرت محمدؐ اور ان کی آل پر رحمتیں اور برکتیں نازل فرما۔ اور یہ ان عالی قدر حضرات کی رضا و خوشنودی کا باعث بھی ہے، کیونکہ ان کا نام ونشان حضور پاک ہی کا نام ونشان ہے (ان پہ خدا کی رحمتیں اور سلامتیاں ہوں)، اور نیز خود حضور پاکؐ کے فرمان اور ارشاد کے مطابق ہے۔ حضرت عبدالرحمٰن ابنِ لیلیٰ سے روایت ہے کہ مجھے ملے کعب بن عجزی پس کہا کیا میں تجھے ہدیہ نہ کروں، وہ ہدیہ جو میں نے سُنا نبی کریمؐ سے۔ پس میں نے کہا کہ مجھے ہدیہ کرو۔ پس اُنھوں نے کہا، ہم نے سوال کیا رسول اللہ صلعم سے۔ ہم نے کہا یا رسول اللہؐ کیسے درود بھیجا جائے آپ پر اور اہل بیت پر۔ بے شک اللہ تعالیٰ نے ہمیں سکھا دیا کہ ہم کیسے سلامتی بھیجیں آپؐ پر۔ حضورؐ نے فرمایا کہ یوں۔ اے اللہ رحمتیں نازل فرما محمدؐ پر اور آلِ محمدؐ پر جس طرح تو نے رحمت نازل کی ابراہیمؑ پہ اور آلِ ابراہیمؑ پہ، بے شک تو ہی حمد کے لائق اور بزرگی والا ہے۔ اے اللہ برکتیں نازل فرما محمدؐ پہ اور آلِ محمدؐ پہ، جس طرح تو نے برکات نازل کیں ابراہیمؑ پہ اور آلِ ابراہیمؑ پہ، بے شک تو ہی حمد کے لائق اور بزرگی والا ہے۔ اسی طرح

دوسرے انبیاؑ کا نام لیتے یا سنتے وقت حضور پاک صلعم کی تقلید کرتے ہوئے ان پر بھی سلام بھیجنا چاہیے اور "علیہ السلام" کہنا چاہیے، اور اگر یہ کہیں یا کہا جائے کہ صحابہ کبار کے ذکر پر بھی اسی طور سلام بھیجتے ہوئے یہ کہنا چاہیے کہ محمدؐ اور ان کے ساتھیوں پر سلام و درود۔ کیونکہ آنحضرت صلعم کے ضمن میں جس طرح آل پیمبرؐ پر سلام بھیجتے ہیں۔ اصحابِ پیمبرؐ پر بھی سلام بھیجیے۔ ہم کہتے ہیں کہ ہمارے نزدیک اس میں کوئی مضائقہ نہیں یقیناً وہ اس بات کے حقدار ہیں۔ اسی لیے ہم نے اپنی ساری تصنیفات میں آل کے ساتھ اصحاب لائے ہیں۔ لیکن چونکہ ہمارے پیغمبر علیہ السلام نے چونکہ ہمیں نماز میں فقط آل پر سلام بھیجنے کا حکم دیا ہے اور ساتھ ہی حضرت ابراہیمؑ اور ان کی آل سے بھی تشبیہہ دی ہے۔ اس لیے ہم ائمہ معصومینؑ کے نام کے ساتھ ان کی جدّ کو شامل کر کے کہتے ہیں کہ فلاں کو اور اُن درود و سلام۔ لفظ آل سے پہلے لفظ اصحاب یا فقط اصحاب کا ذکر نہ تو کسی درود شریف میں نظر آیا اور نہ ہی کسی کتاب میں اور نہ ہی تاحال کسی کی زبان سے سُنا گیا ہے۔ لہٰذا اصحابؓ پر آلؑ ہی کی شمولیت سے سلام بھیجنا چاہیے، کیونکہ سچے دوست اور مخلص احباب بھی آل اولاد ہی کی طرح ہوتے ہیں اور انہی کے زمرے میں شامل ہوتے ہیں۔ یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ حضور سرورِ کائناتؐ کے اسم مبارک کے بغیر بھی اہل بیتؑ کے ناموں کے ساتھ سلام بھیجا جائے تو اس میں ترکِ ادب کا کوئی پہلو نہیں۔ ہر چند کہ اس کے معنی سلام کے ہیں مگر یہ لفظی ہیں۔ جب خود اللہ تعالیٰ نے مومنوں کو یوں فرمایا ہے، کہ تم پر کوئی مشروع طور پر سلام کرے تو تم اس سلام سے اسے اچھے الفاظ میں سلام کرو، یا ویسے ہی الفاظ کہہ ڈالو۔ پس اہلِ بیتؑ جن کی شان میں آیہ تطہیر نازل ہوئی، اور جو اپنی سرشت میں پاک و پاکیزہ ہیں، ان میں سے کسی امامؑ کے نام پر کبھی حضورؐ کے نام کے ذکر کے بغیر بھی درود و سلام کہہ دیا جائے تو ناگوار نہیں گزرنا چاہیے، اور نہ ہی اُسے سوئے ادب سمجھنا چاہیے۔ حضورؐ کی شمولیت کے بغیر اس لفظ صلوٰۃ کا اطلاق تو اس کی ایک ہی اسم مبارک سے خصوصیت کی بنا پر یہ خیال گزرتا ہے۔ لہٰذا صلوٰۃ و سلام کا اطلاق تقلید و فرمانبرداری کے بغیر نہیں کرنا چاہیے کہ اصل میں جناب رسالت مآبؐ ہی کے لیے مخصوص ہے۔ کیونکہ جب تم آنحضرت صلعم پر درود بھیجتے ہو تو اُس فرمانِ الٰہی کے مطابق کہ اس سے بہتر لفظوں میں جواب دو یا وہی الفاظ لوٹا دو، اُدھر سے بھی تم پر برکات نازل کی جاتی ہیں، اور تم اس آیت کریمہ کا مورد ہو جاتے ہو کہ ان کو پروردگار مہربان کی طرف سے سلام فرمایا جاوے گا۔ تم محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کی آل پر درود بھیجو تا کہ اللہ اپنے فضل و کرم

سے تمھارے گناہوں کو بخش دے۔ قصہ کوتاہ یہ کہ خواہشات نفسانی کی الفت اور دُنیا اور علائق دنیاوی سے محبت ہی محبت الٰہیہ کی راہ کی رکاوٹ اور حبِّ رسولؐ سے مانع ہوجاتی ہے اور اس کا مبدا و منشا اپنی موہوم ہستی کا علم اور شعور و آگہی اور نفسانی غرور و تکبّر ہے جیسا کہ کہتے ہیں کہ علم حجابِ اکبر ہے۔ خودی و انا کا یہ خیال سالکانِ راہ کو فنافی الرسولؐ اور فنافی اللہ کی منازل سے دور رکھتا ہے۔ اسی لیے ہم نے متن کے آغاز میں اس مطلب کو بیان کیا۔ رباعی:

گاہی خلش غرور باشد مارا

گہ ناخن عجز می خراشد مارا

ما ہیچ نیستم درد وہم ہستی

ہر لحظہ بصورتے تراشد مارا

ترجمہ رباعی: کبھی ہمیں اپنی ہستی کے غرور کی خلش رہتی ہے۔ کبھی ہمیں عجز و انکسار کا ناخن چھیلتا ہے۔ اے دردؔ ہم کچھ بھی نہیں صرف ہستیٔ موہوم اور وہم ہیں۔ ہر لحظہ ہمیں ایک نئی صورت میں تراشتا ہے۔ (مصنف کی اپنی وضاحت کے مطابق) غرور سے مراد ہستی و بقا کا دعویٰ ہے۔ اور عجز سے مراد اپنے عدم و فنا پر نظر دوڑانا ہے۔ وہم سے مراد اپنی موہوم انا اور آگہی ہے، اور حاصل مطلب یہ کہ ہم تمام حقائق ممکنہ حقیقت میں نہ معدوم ہیں نہ موجود۔ کیونکہ اگر ہمارا عدم ذاتی ہوتا تو ہم ممتنع ہوتے اور وجود ذاتی ہوتا تو واجب ہو جاتے، لہذا ممکنات کے عدم و وجود میں امتناع و وجوب لاحق ہو جاتے ہیں، اور یہ موہوم عدم یعنی اعتباری وجود، یہ وہم و گمان حضرت واجب الوجود کے مراتب کی شمولیت سے لاحق ہوا، جو ہر لحظہ ہمیں اک نئی صورت میں تراشتا ہے، گاہے عدم اور گاہے موجود دکھائی دیتے ہیں۔ یہ موجود یا معدوم ہونا دونوں اعتباری ہیں۔ اور مرتبۂ وجود میں شے کی شرط سے اور لاشے کی شرط سے۔ ورنہ ذات الوجود اور ذات العدم کا سلسلہ ہمارے فہم و ادراک سے ماوراء ہے۔ سبحان اللہ معدوم کو نمود میں لانا اللہ ہی کی صفت کاملہ ہے۔ اور اللہ سب سے بہتر تدبیر کرنے والا ہے۔ پھر موجود کو پردے میں چھپا دینا بھی اسی کی ستاری کا وصف ہے۔ بے شک اللہ تعالیٰ نور و ظلمت کے ستر ہزار پردوں میں ہے۔ ان حقائق معدومہ کو جو اپنی ذات میں معدوم ہیں موجودات میں لے آنا حق تعالیٰ ہی کی صنعت کاری ہے۔ کیونکہ مکر کے معنی فریب کے ہیں۔ اور یہ فریب تو حق سبحانہ

تعالیٰ نے ممکنات کو دیا ہے کہ وہ موجودات نظر آتے ہیں، حالانکہ حقیقت میں موجود فقط وہی ذات واجب الوجود ہے اور حضرت وجود یعنی موجود حقیقی کو ان اعتبارات کے پردے میں مستور کر دینا۔ اس کی ستاری کی صفت سے ہے کہ اُس ہستیٔ مطلق نے اپنے نور کو ان اضافات کے پردوں میں چھپا رکھا ہے اور یہاں ہونے کے باوجود بھی پنہاں ہے۔ مادی اور ارضی تعینات تاریکی کے پردے ہیں، اور غیر مادی و افلاکی و علوی تشخصات نورانی پردے ہیں۔ حدیث شریف میں حق سبحانہ کے لیے ستر ہزار پردوں کی یہ شرط ان کی کثرت کے اظہار کے لیے لائی گئی ہے، نہ یہ کہ وہ فقط اسی تعداد تک محدود ہیں۔ پس حقیقت کو دیکھیے اور اپنے دل کے آئینے سے کدورت کے زنگ کو کھرچ ڈالیے۔ جلوۂ حقیقت کے مشاہدوں نے یہی نغمہ الاپا ہے کہ اگر پردے کو بیچ میں سے ہٹا بھی دیا جاتا تو میں از روئے تعین کچھ زیادہ نہ ہو پاتا۔ اور ہمیشہ انہی کلمات پہ زبان کھولی کہ مجھ سے سوال کرو جو کچھ عرش سے ورے ورے (دکم) ہے۔ یہ دونوں مقولے آخری خلیفہ امیرالمومنین حضرت علیؑ (ان پر اور پیغمبر علیہ السلام پہ درود و سلام) سے منسوب ہیں۔ پہلے مقولے کا مطلب یہ ہے کہ اگر پردہ ہٹا دیا جائے، یعنی کہ اعتبارات کا پردہ درمیان سے اُٹھا دیا جائے تو میرے یقین محکم میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا۔ کیونکہ اعتبارات کے ان حجابات کے ہوتے ہوئے بھی مجھ پہ اعتبارات کے نہ ہونے کا مرتبہ منکشف ہے اور میں اپنے عرفان و معرفت کی نگاہ سے اُس لامحدود (لاتعین) قادرِ مطلق کا مشاہدہ کرتا ہوں۔ اور دوسرے معنی یہ بھی ہیں کہ لفظ لو پہلے جملے کی نفی کی وجہ سے دوسرے جملے کی نفی کے لیے آیا ہے۔ اور شرط اور جزا ہر ایک مثبت کو منفی اور منفی کو مثبت بنا دیتا ہے، لہٰذا حاصل مطلب یہ کہ ان مراتب اور تعینات میں مزید بلندی نہیں آتی، اور نہ ہی اس کا مفروضہ قائم کیا جا سکتا ہے، اور میرا تعین، ہمیشہ روبہ ترقی ہے اور اس میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ کیونکہ تعین بھی انہی مراتب میں سے ہے۔ اگر وہ مراتب نہ ہوتے تو یہ یقین بھی نہ ہوتا۔ دوسرے مقولے کے معنی یہ ہیں کہ مجھ سے پوچھو اور تحقیق کرو۔ موجودات کے تمام مراتب کی چھان بین کرو۔ کیونکہ عرش پہ جا کے تمام بلندیاں اور سمتیں ختم ہو جاتی ہیں۔ تمام موجودات اس کے نیچے ہے۔ اور تمام وجوبی اور الٰہی مراتب بھی جو اس سے ماورا ہیں، اور ہر امر میں پورا اطمینان حاصل کرو کہ کوئی چیز ڈھکی چھپی یا ان دیکھی اور ان سمجھی نہیں۔ اور سچ فرمایا رسول اللہ صلعم نے کہ میں علم کا شہر ہوں اور علیؓ اس کا دروازہ ہے: پس نیکی نہیں یہ کہ تم گھروں میں ان کی پشتوں سے آؤ، بلکہ نیکی اس کی ہے جس نے تقویٰ اختیار کیا۔ اور آؤ گھروں میں ان کے گھروں

کے راستے سے۔ حضور علیہ السلام نے خود کو شہرِ علم فرمایا۔ یہاں علم سے مراد باطنی علم ہے جو بشری استعداد کے مطابق حقیقت کا جیسی کہ وہ ہے کما حقہٗ انکشاف ہے۔ لفظ شہر سے تعبیر کرنے کا مقصد علوم کی کثرت کا اظہار ہے۔ یعنی کہ حضور انور علیہ السلام پر تمام دینوی اور اُخروی حقائق منکشف تھے۔ لفظ باب کا اطلاق حضرت علیؓ (عجائب کے ظاہر کرنے والے) کی ذات پہ اس لیے کیا گیا ہے کہ وہ تمام علوم و معارف اور اسرار و رموز اسی دروازے سے آشکار ہوں گے۔ اور مومنین کو تاقیامت اسی راہ سے فیض پہنچتا رہے گا۔ اس اُمتِ مسلمہ کے اولیائے کرام اسی دروازے سے علم و معرفت کی بستی میں داخل اور قربِ الٰہی کے بلند مرتبے پر فائز ہو کر اربابِ حقیقت کے زمرے میں داخل ہوتے رہیں گے۔ اور حق بات یہی ہے کہ تمام طریقوں اور سلسلوں کی انتہا انہی کی ذاتِ گرامی پر جا کر ختم ہوتی ہے۔ جس طرح ظاہری اسلام دیگر صحابہ کرام کے باعث بھی پھیلا تھا۔ اور اسلام نے ان سے تقویت بھی پائی تھی، اسی طرح باطنی ایمان، علمی نسبت اور قربِ حق علم کے اس شہر سے خاص مومنین کے نصیب میں آیا اور امیر المومنین حضرت علیؓ کا سارے مومنوں پر احسان ہے۔ اور ظاہری اور باطنی طور پر کوئی شخص بھی ان کی درگاہ سے (آستانے سے) انحراف نہیں کر سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس کا میں مولیٰ علیؓ بھی اُس کا مولیٰ۔ اور تبلیغ دعوتِ حق کے دوران فرمایا کہ علیؑ مجھ سے ہے اور میں علیؓ سے ہوں۔ قصہ کوتاہ یہ کہ جب علم کے شہر یعنی حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے جو درحقیقت اللہ ہی کا گھر ہیں، ہدایت کا دروازہ کھولا، اور اللہ نے گھروں میں دروازے کی راہ سے داخل ہونے کا حکم دیا تو پھر شہرِ علم میں داخل ہونے کے لیے شہرِ علم کا وسیلہ پکڑو اور اس راہ سے علمی نسبت میں داخل ہو جاؤ۔ کیونکہ مذکورہ بالا حدیث کے معنی واضح ہیں اور آیتِ کریمہ کا ماحصل بھی۔ اے ہمارے رب کھول دے ہمارے اوپر اسی گھر کا دروازہ، اور عطا کر ہمیں اہلِ بیتؑ کی محبت اور جو اس میں داخل ہو گیا وہ امن میں ہو گیا۔ اس گھر کے دروازے کھلنے سے مراد اہلِ بیتؑ سے نسبت کے فیوض اور برکات کا پہنچنا ہے۔ محبت کے نصیبے سے مراد زبردست وسیلہ اور اس میں داخل ہونے سے مراد اس نسبت سے مستقل قرار پکڑنا اور مقام حاصل کرنا ہے۔ اور امن پانے سے مراد شیطان کے مکر و فریب اور ماسویٰ اللہ کے بندھنوں سے محفوظ رہنا ہے، کیونکہ اس نسبت رکھنے والوں تک شیطان کے قبضے کا ہاتھ نہیں پہنچتا جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔ اللہ کے بندوں

میں شریف اور بزرگ ترین حضرات اللہ کے بندے اور رسولؐ یعنی حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی نسل ہی کے افراد ہیں۔ (ان سب پر خدا کا درود و سلام) ۔ اور آیت کریمہ کے محل و قوع کی خوبی تو متن میں روشن و واضح ہے، وہ محتاج بیان نہیں ۔ یا خدا جب تو نے محض اپنی بے سبب عنایت سے ہمیں ظاہری سیادت (سید ہونا) کی سعادت سے شرفیاب فرمایا یعنی جدّی نسبت سے حسنی اور حُسینی سیّد بنایا ہم گنہ گاروں کے باطن کو بھی رسولِ مقبولؐ کے طفیل اور ان کی آل مطہر (ان سب پر خدا کی سلامتی اور برکات نازل ہوں) کے طفیل ماسوی اللہ کے پھندوں سے آزاد اور پاک رکھ ۔ اور اپنی دائمی حضوری و مشاہدے کی سعادت سے نواز۔ اور رسول مقبولؐ اور ان کے اہلِ بیت کی کامل محبت اور فرمانبرداری عطا فرما ۔ اور حضور خاتم النّبیین (ان پر خدا کا درود و سلام) کے طفیل ہمارا انجام بخیر کر۔ آمین ثم آمین ۔

رباعی:

یارب چہ زیاں کارم و گویم کہ بخش
یاری زگنہ دارم و گویم کہ بخش
دارم چو محمدؐ شفیع محشر
صد تودہ گنہ آرم و گویم کہ بخش

ترجمہ رباعی: یارب میں کتنا زیاں کار ہوں اور پھر بھی یہی کہتا ہوں کہ مجھے بخش دے ۔ سر پر گناہوں کا گٹھڑ ہے اور کہتا ہوں کہ مجھے بخش دے ۔ میں چونکہ محمد مصطفیٰ صلعم جیسا شافع روزِ جزا رکھتا ہوں اور گناہوں کے ایسے سینکڑوں گٹھڑ بھی لے آؤں تو یہی کہوں گا خداوندا مجھے بخش دے ۔ (مصنف نے خود بھی رباعی کی وضاحت یوں کی ہے کہ) ہر چند کہ میں سراسر گھاٹے ہی کا سوداگر ہوں اور اپنے ذمے بے شمار گناہ رکھتا ہوں لیکن حضور پاک نبی کریمؐ میری شفاعت کرنے والے ہیں اور آلِ عبا میرے حامی ہیں تو پھر مجھ ناچیز کی تقصیروں اور گناہوں میں اتنی مجال کہاں کہ مجھ پر دوزخ کا دروازہ کھول سکیں اور مجھے میرے ربّ رحیم کے کشادہ دستِ کرم سے اُچک کر لے جا سکیں ۔ انشاء اللہ اپنے شافع روزِ جزا کی قوت اور ائمہ معصومین کی حمایت کے بل بوتے پر میں اپنے گناہوں کے بوجھ کے علاوہ اپنے مشفق دوستوں اور یارانِ طریقت کے گناہوں کے سینکڑوں گٹھڑ بھی اپنے ہمراہ لاؤں گا اور عرض کروں گا کہ اے میرے بخشنہار خدا، اے میرے رحم کرنے والے پروردگار ۔ اے میرے پردہ پوش رب اور میرے بخشنے والے رب، جس طرح دُنیا میں تو نے ہم گناہگاروں کی لاج رکھ لی اور ہماری لغزشوں پر نگاہ نہ ڈالی، اب

بھی اپنے حبیبؐ کی شفاعت کے صدقے اور نالۂ عندلیب (مصنف کے والد بزرگوار کی تصنیف کا نام) کی برکت سے ہم روسیاہوں کو بخش دے۔ اور ان مخلص محمدؐیوں کو دوسرے امتیوں کے سامنے شرمسار نہ کر اور ہمارے جرموں پر ہماری پکڑ نہ کر، کیونکہ غلام کی مار پیٹ سے اُس کے مالک کی توہین ہوتی ہے، جیسا کہ حق سبحانہ تعالیٰ نے یہاں فرمایا انشاء اللہ وہاں بھی تمام شہادتوں کے سامنے سب کے روبرو کہے گا کہ اے مخلص پیروانِ محمدؐ اللہ کی رحمت سے نااُمید نہ ہو۔ بے شک اللہ تعالیٰ تمام گناہوں کو بخش دینے والا ہے۔ چونکہ تم نے دُنیا میں اپنے نام ونشان کو میرے قرب کے نام ونشان میں گم کرکے بالکل فنافی الرسولؐ کر دیا تھا اب میری رحمت اور بخشش کے سائبان تلے آجاؤ تاکہ میں تمھیں اپنے دامنِ کرم میں چھپا لوں اور تمھارے تمام گناہوں کو ملیامیٹ کر دوں۔ اور تمھارے رسولِ مقبولؐ کی برکت سے جیسا کہ میں نے قرآن میں کہا تاکہ اللہ آپ کی سب اگلی اور پچھلی خطائیں معاف فرمادے۔ ہم نے پہلے اور پچھلے سب گناہوں کو بخش دیا اور تمھیں معاف فرمایا۔ جاؤ آدمی اسی کے ساتھ ہے جس سے اسے محبت ہو کے مطابق اسی کے قدموں سے چمٹے رہو۔ اے ہمارے رب ہمیں اپنے نور سے منور فرما، اور ہمیں بخش دے۔ بے شک تو ہر شے پر قدرت رکھتا ہے۔

هوالناصر

شروع اللہ کے نام سے جو نہایت مہربان اور بہت رحم والا ہے

ہر قسم کی تعریف اللہ کے لیے ہے جس نے بھیجا رسولوںؑ کو بشارت دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر، اور سلام ہو اس کے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر جو نبیوںؑ میں سب سے افضل ہیں اور آپ کی آلؑ اور اصحابؓ سب کے سب پر۔ اما بعد پس یہ چالیسواں باب ہے جس کا نام "البشیر والنذیرؑ" ہے

اے لوگو مجھے سکھایا میرے رب نے اپنی جناب سے علم اور بے شک میں تمھیں اس سے ڈرانے اور بشارت دینے والا ہوں۔ اور میں اُسی کا حکم کہتا ہوں کہ بخشش طلب کرو اپنے رب سے توبہ کرو اس کی طرف، وہ تمھیں اچھے متاع سے متمتع کرے گا طے شدہ اجل تک۔ اور دے گا ہر فضل والے کو اُس کا فضل، اور اگر تم نے پیٹھ پھیر لی تو بے شک میں تمھارے بارے میں ڈرتا ہوں بڑے دن کے عذاب سے؛ اللہ کی طرف تمھارا لوٹنا ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ میں تو فقط ڈرانے والا اور بشارت دینے والا ہوں ان لوگوں کے لیے جو ایمان رکھتے ہیں، اور وہ لوگ جنھوں نے کفر کیا اور آخرت کی ملاقات کو جھٹلایا، وہ ایمان نہیں رکھتے مگر اُنھوں نے کہا جو کچھ کہ کہا پہلے لوگوں نے۔ نہیں ہے یہ مگر بشر تمھاری طرح۔ کھاتا ہے اس میں سے کہ کھاتے ہو تم جس میں سے، اور پیتا ہے اس میں سے جسے تم پیتے ہو، اور اگر تم نے اطاعت کی اپنے جیسے بشر کی۔ بے شک تم اس حالت میں نقصان اُٹھانے والے ہو جاؤ گے۔ کیا وہ تمھیں دھمکاتا ہے اس بات سے کہ تم مرجاؤ گے اور تم مٹی اور ہڈیاں ہو جاؤ گے

اور تم نکالے جاؤ گے۔ حیف صد حیف اس بات پر جس سے تم ڈرائے جاتے ہو۔ اُٹھائے نہیں جائیں گے۔
نہیں ہے یہ مگر ایک ایسا شخص جس نے افترا پردازی کی اللہ پر جھوٹ کی۔ ہم تو ایمان لانے والے نہیں۔
بالجملہ بشارت ہر وہ سچی خبر ہے کہ جس سے چہرے کا ظاہر متغیر ہو جائے (کھل اُٹھے)، کیونکہ استعمال ہوا
ہے بھلائی اور شر دونوں میں۔ ہاں شر میں اس کا استعمال اغلب ہے ترغیب دینے اور ابھارنے میں۔
اور اُس کا مطلق استعمال نہیں ہوتا مگر خیر پر، اور جب ہوتا ہے مقید تو استعمال ہوتا ہے اس کا شر پر بھی۔
جیسے اللہ کا قول ہے کہ انھیں دردناک عذاب کی بشارت دو۔ اور انذار کا مطلب ہے بُرے کام کی خبر دینا
اس سے بچنے اور اُس سے احتراز کرنے کے لیے، اور تبشیر اور انذار کاملین کے خواص میں سے ہے۔ کیونکہ
وہ دیکھتے ہیں آنے والے معاملات کو ان کے وقوع سے پہلے قدسی قوت کے ساتھ، اور دیکھتے ہیں معاملات
کے انجام کو کشفی نظر سے۔ اور خبر دیتے ہیں لوگوں کو اس چیز کے بارے میں جو ہونے والی ہے۔ اور ڈراتے
ہیں اُنھیں اُخروی سزاؤں سے، اور بشارت دیتے ہیں عاقبت میں ملنے والی نعمتوں کی۔ پس آگیا تمھارے
پاس بشیر و نذیر اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس کا دیکھنے والا ہے۔

فحش کاموں سے بچنے اور اُمید و رجا کے بیان کا باب

آس و امید حق تعالیٰ کی طرف سے ایمان کا پھل ہے۔ جتنا ایمان مضبوط ہوگا۔ اتنا ہی اُمید کا
غلبہ بھی قوی ہوگا۔ مایوسی و نااُمیدی کفر سے پیدا ہوتی ہے، جیسا کہ خود اس آیت کریمہ میں آیا ہے کہ
بے شک اللہ کی رحمت سے وہی لوگ نااُمید ہوتے ہیں جو کافر ہیں۔ بے یقینی جتنی غالب
ہوگی اتنا ہی مایوسی کا زیادہ غلبہ ہوگا۔ اور پھر اس آیت کریمہ کے بموجب بھلا اپنے رب کی رحمت سے
کون نااُمید ہوتا ہے بجز گمراہ لوگوں کے۔ اُمید واثق کے باوجود بھی مجموعی طور پر ممنوع فحش کاموں سے
پرہیز ضروری ہے، کیونکہ ایسے فحش کام انسان کو طبعی طور پر پاکیزگی اور پرہیزگاری پہ توجہ دینے سے
باز رکھتے ہیں اور مادی اور غلیظ کاموں میں مشغول رکھتے ہیں جو اخلاقی بگاڑ اور حجاب کا باعث بن
جاتے ہیں۔ حد سے زیادہ جسمانی لذات دل کو سیاہ کر دیتی ہیں، جس طرح انھی لذات کا بالکل ترک
کر دینا بھی انسان کو کُند ذہن اور افسردہ دل بنا دیتا ہے۔ دل پر مُردنی چھا جاتی ہے۔ ہر کام میں اعتدال
ہی قابل ستائش ہے۔ قرآنِ شریف کی یہ آیت کریمہ اس امر کی گواہ ہے کہ خوب کھاؤ اور پیو اور حد سے

مت نکلو۔ پاکباز عارف خشک مغز زاہدوں سے بالکل الگ تھلگ ہوتے ہیں۔ قرآن پاک کی یہ آیت اسی اعتدال کی خبر دیتی ہے کہ اے نبیؐ جس چیز کو اللہ نے آپ پر حلال کیا ہے، آپؐ (قسم کھاکر) اس کو اپنے اوپر کیوں حرام کرتے ہیں، اور یہ آیت کریمہ کہ تمھارے نفس کا بھی تم پر حق ہے، اسی حالت پہ دلالت کرتی ہے، نیز یہ آیت کریمہ بھی اسی حقیقت کا انکشاف کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کو تمھارے ساتھ (احکام میں) آسانی کرنا منظور ہے اور تمھارے (احکام و قوانین) مقرر کرنے میں دشواری منظور نہیں۔ اور یہ مقولہ کہ اسلام میں ترک دُنیا کا حکم نہیں ہے، کلفتوں کو رفع کر دینے والا ہے، اور یہ حدیث شریف کہ میری اُمت میں وہی لوگ افضل ہیں، جو اپنے اعمال میں فراخی و ملائمت سے کام لیتے ہیں۔ پاک صاف انسان بنو۔ اپنے آپ کو شیخی اور غرور سے بھرا ہوا مت بناؤ۔ اللہ تعالیٰ گناہوں کو بخشنے والا ہے، اور انسان اس کی بخشش کا امیدوار ہے۔ اس آس و اُمید کے بیان کا ماحصل یہ نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ کے غضب سے بالکل بے خوف ہو جانا چاہیے، کیونکہ ہمارے عقائد میں سے یہ عقیدہ بھی ہے کہ اللہ کی طرف سے مایوس ہونا کفر ہے اور اللہ کی طرف سے بالکل بے خوف ہو جانا بھی کفر ہے۔ ایمان اسی اُمید و بیم کے بین بین ہے، بلکہ ہماری مُراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت اس کے غضب پہ سبقت رکھتی ہے۔ جلالی اسمائے حسنیٰ کم ہیں اور جمالی زیادہ، لہٰذا رحمت اس کے غضب پر غالب ہے تو اُمید کو بھی خوف پر غالب رکھنا چاہیے۔ بس اتنا خوف ہی کھانا چاہیے جو انسان کو شرعی ممنوعہ کاموں سے روکے رکھے اور نیک کاموں کے احکام کی فرمانبرداری سے شرفیاب کرے۔ اور اُسے کہیں قائلِ اختیار (مُنکرِ جبر) ہونے کے بھنور میں نہ پھینک دے، اور وہ شریعت کی راہ سے تجاوز نہ کر جائے۔ نہ یہ کہ خوف اور دہشت کے غلبے کی بنا پر اُسے رب کریم کی ذات سے اُنس ہی نہ رہے، بلکہ اس سے وحشت ہونے لگے اور وہ ہمیشہ اس سے ڈرتا اور بدکتا ہی رہے، کیونکہ آدمی تو خطا و نسیان کا پُتلا ہے جیسا کہ حضرت علیؓ کا فرمودہ ہے کہ دُنیا میں گناہوں سے پاک تو کوئی بندہ نہیں۔ آخر انسان فرشتہ تو نہیں۔ اگر گناہ ہو گیا تو ہونے دو، پھر توبہ کر لینی چاہیے۔ کیونکہ گناہوں سے توبہ کر لینے والا ایسا ہی ہو جاتا ہے جیسے کہ اُس نے گناہ نہ کیا ہو، جیسے کہ اس آیت کریمہ سے بھی واضح ہے۔ اور بعد ازاں حاصل کر لیے آدمؑ نے اپنے رب سے چند کلمات تو اللہ تعالیٰ نے رحمت کے ساتھ توجہ فرمائی ان پہ، یعنی توبہ قبول کر لی۔ بے شک وہ ہے ہی بڑا توبہ قبول کرنے والا مہربان۔ جیسا کہ ہمارے مرشد مہربان (خدا ان

کے فیض کو ہمیشہ جاری رکھے) نے لکھا ہے، اے فرشتو مجھ پہ اعتراض کیا کرتے ہو ذرا لکتے تک پہنچنے
کی کوشش کرو۔ میرے جرم و گناہ، میری بندگی کے رخسار پر اک سیاہ تل کی مانند ہیں۔ یعنی ہماری
یہ گنہگاری ہماری بندگی کے چہرے پر اک خال کی مانند ہے، جو حسن کو مزید زیبائش بخشتا ہے۔ یہ ذہن
نشین رکھو کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن شریف میں توبہ، ندامت اور استغفار کا حکم دیا ہے۔ یہ بھی اک قسم
کی اطاعت ہے جس سے خدا کے بندے نیکی، جزا اور ثواب کے حقدار بن جاتے ہیں اور توبہ استغفار
اور ندامت کی نوبت گناہ کے بعد آتی ہے؛ اس کے سوا نہیں۔ لہذا اللہ عم نوالہٗ نے ارادہ کر رکھا
ہے کہ جب اس کے بندے گناہ کریں تو ان کے گناہوں کو معاف کر کے اپنے بندوں پر احسان کرے،
جیسا کہ وہ ان کی پاکدامنی، نیکی و کرم کی توفیق اور اطاعت بجا لانے پہ احسان فرماتا ہے، اور جیسا کہ اس
نے خود قرآن میں بھی فرمایا کہ آپ کہہ دیجیے کہ اے میرے بندو جنھوں نے (کفر و شرک) کر کے اپنے اوپر
زیادتیاں کی ہیں کہ تم خدا کی رحمت سے ناامید مت ہو۔ بالیقین خدا تعالیٰ تمام گزشتہ گناہوں کو معاف
فرما دے گا۔ بے شک وہ بڑا بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔ یہ بھی سمجھ لو کہ فقیہوں کا فقیہہ، حکما کا
دانا ترین اور عارفوں کا سرتاج اور کامل ترین ولی وہ شخص ہے جسے رشد و ہدایت کا کام سونپا گیا ہے۔
اور وہ انھیں نصیحت کرتا ہے اور خدا و رسول کی طرف بلاتا ہے۔ انھیں ظاہری اور باطنی ہدایت دے کر
دنیا میں زہد و ریاضت میں مشغول رکھتا ہے اور انھیں اللہ کی ناخوشی اور غضب سے ڈراتا ہے۔ مگر انھیں
اللہ کی مہربانی سے مایوس نہیں کرتا۔ اور نہ ہی اس کی رحمت سے مایوس ہونے دیتا ہے۔ اس کے عذاب
سے ڈراتا ہے۔ اور ساتھ ہی اس کے فضل و احسان و رحمت کو بھی ان کے سامنے بڑے حسن و خوبی سے
بیان کرتا ہے۔ نہ ہی انھیں گناہوں کی کھلی چھٹی دیتا ہے اور نہ ہی ترک اطاعت و عبادت کو جائز
سمجھنے کا اختیار دیتا ہے اور یہ اولیائے کرام میں سے کامل ترین اصحاب کا نصیب ہے جو صحیح نائب
حق ہیں اور وہی لوگ سیدھی راہ پر ہیں۔ قصہ کوتاہ یہ کہ مقصد ہمارا یہ ہے کہ امید و رجا کے پلڑے کو
خوف و ہراس کے پلڑے پر ترجیح دے، تاکہ خدائے غفار کی مغفرت کی ڈور کا سرا ہاتھ سے چھوٹنے
نہ پائے۔ کیونکہ آخر کار موت کے بعد ہر وہ کیفیت جو نفس انسانی میں راسخ ہو چکی ہوگی اور جس کا ملکہ پیدا
ہو چکا ہوگا وہی کیفیت غلبہ پا کر عالم برزخ میں مثالی صورت اختیار کر کے ظاہر ہوگی۔ اگر تو امید غالب ہے
تو بخشش و رحمت اور بہشتی نعمتوں کی شکل اختیار کر کے نظر آئے گی۔ اور اگر مایوسی قوی تھی تو وہ غضب و

عتابِ خداوندی اور دوزخ کی سزاؤں کی صورت میں جلوہ گر ہوگی اور قیامت کے دن قفس عنصری یعنی جسم ہی اُٹھیں گے اور مذکورہ بالا کیفیتوں کے موافق ہی معاملہ طے پائے گا۔ جنتی جنت میں چلے جائیں گے اور دوزخی دوزخ میں جا گھسیں گے۔ اللہ کا فرمان ہے کہ میں اپنے بندے کے گمان کے مطابق ہوں۔ پس وہ گمان کرے میرے بارے میں جو چاہے۔ اور حضور پاک صلعم نے اپنی موت سے تین دن پہلے فرمایا کہ لوگوں تم میں سے کوئی فوت نہ ہو مگر یہ کہ وہ اللہ کے ساتھ حُسن ظن رکھے۔ کیا ہمارے عزیز یہ نہیں دیکھتے کہ حق سبحانہٗ تعالیٰ اس دُنیا میں بھی اپنے بندوں سے ایسا ہی معاملہ کرتا ہے۔ جو لوگ ظاہری اسباب کے بندھنوں میں بندھے ہوتے ہیں اور اپنی ہی تدبیر اور تلاش پر بھروسہ کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی رزق رسانی کا صرف زبانی کلامی اقرار کرتے ہیں لیکن دل سے اس کی تصدیق نہیں کرتے۔ اپنے ظاہر و باطن کو ایک سا نہیں بناتے، اور نہ ہی شرک و نفاقِ خفی سے پاک ہوتے ہیں۔ جب تک وہ اپنے کام کی تلاش و کوشش اور تدبیر و تردد نہ کریں اور ظاہری اسباب کا وسیلہ نہ پکڑیں ان کی روزی انہیں میسر نہیں آتی۔ اور نہ ہی دلی اطمینان اور تسلی حاصل ہوتی ہے۔ ان کے دلوں سے روزی کی پریشانی اور کلفت دور نہیں ہوتی اور جمعیت خاطر نصیب نہیں ہوتی۔ لیکن جو لوگ خدا کے فضل و کرم سے ان ظاہری اسباب کے پھندوں سے آزاد ہوتے ہیں اور ان کے یقین محکم کی نظر اسی کی قدرتِ کاملہ پر گڑی ہوتی ہے، وہ اپنے مقدر کی روزی کھاتے پیتے ہیں۔ انہیں پورا اطمینانِ قلب نصیب ہوتا ہے اور ان کے دل و دماغ پر رنج و پریشانی کا غبار کبھی نہیں بیٹھنے پاتا۔ وہ ظاہری اور باطنی سکون سے زندگی بسر کرتے ہیں۔ سب حمد و ستائش اللہ ہی کے لیے ہے اور اس کے سوا کسی اور کو قوت اور طاقت نہیں۔ اور نہیں ہے کوئی مخصوص سوائے اس کے۔ آیا انسان پر اللہ سبحانہٗ کی عنایت سے مسلسل ایسا وقت زمانے میں سے اپنی زندگی کے دور میں کہ نہیں تھا وہ باطنی طور پر کوئی قابلِ ذکر چیز اور بنایا اللہ نے اُسے ہمیشہ کے لیے غنی خلق سے اور منقطع ماسویٰ اللہ سے، اور دُور کر دیا اس سے معاش کے غم کو اور ناداری کے خوف کو اور اپنی اہل کے اندر زندگی میں اسے مسرور بنایا۔ بے شک اللہ تعالیٰ نے بنایا اُسے اپنی صورت میں۔ اسے تخلیق کیا اللہ تعالیٰ نے اپنے اخلاق پر، اور وہ ہو گیا سننے والا دیکھنے والا، اور رہبری کی اُس کی، اُس کے رب نے ہدایت کے راستے کی طرف اور بنایا اُسے شُکر گزار بندہ۔ اور تیار کیں کافروں کے واسطے جو خواہشات کے بندے ہیں اور جنھوں نے بنا لیا اپنی خواہشات کو اپنا معبود دنیوی قیود میں سے اور

ڈنیا کی محبت کی آگ میں سے ان کے لیے اللہ تعالیٰ نے زنجیریں، طوق اور جہنم ۔ بے شک نیک لوگ جو ایمان رکھتے ہیں اللہ پر اور وہ خالص محمدیؐ ہیں ۔ پیتے ہیں دُنیا میں بھی تقرب و معیت کے چشمے سے جس سے کہ پیتے ہیں اللہ کے مقرب بندے، اور وہ عنقریب پئیں گے ۔ اگر اللہ نے چاہا تو آخرت میں بھی اس جام سے بھی کہ جس میں کافور کی آمیزش ہوگی ۔ وہ پورا کرتے ہیں نذروں کو جو نذریں اُنھوں نے مانیں اللہ کے لیے اپنے نفسوں کو اللہ کے رستے میں صرف کرنے میں جب تک کہ وہ زندہ رہے اور ڈرتے ہیں اس دن سے جس کی آفت ہر طرف پھیلی ہوئی ہوگی ۔ اور کھلاتے ہیں وہ کھانا جو اللہ نے اُنھیں کھلایا اپنے فضل سے رزق باطنی و ظاہری میں سے اللہ کی محبت میں بغیر کسی غرض کے، طلب کرنے والے مسکینوں اور ان یتیموں کو جن کے مشائخ فوت ہو گئے ان کے حقیقت کو پہنچنے سے پہلے ہی اور اسیروں کو دُنیا کے اسیروں میں سے، اور اللہ تعالیٰ ان کے لیے مددگار ہے ۔ اور وہ کہتے ہیں لوگوں سے کہ اس کے سوا نہیں کہ ہم کھلاتے ہیں تمھیں اللہ کے لیے جسے ہم دیکھتے ہیں ہر سمت ہر وقت۔ ہم نہیں چاہتے تم سے اس معاملے پر کچھ اجر یا شکر گزاری کے جذبات ، اللہ ہمارا رب ہے اور بے شک ہم ڈرتے ہیں اپنے رب سے ، اس دن سے جو سخت مصیبت کا انتہائی طویل دن ہے۔ اور وہ یوم حساب ہے، جس میں حساب کرے گا اللہ تعالیٰ جس کا چاہے گا اپنے فضل سے آسان حساب۔ پس بچائے اللہ تعالیٰ اپنے رسول صلعم کے طفیل اس دن کے شر سے ۔ اور ہمیں بخشے اللہ تعالیٰ تازگی اور سرور ، اور بدلہ دے ہمیں اس کا جو کہ ہم نے صبر کیا دُنیا میں جیسے کہ اُس نے وعدہ کیا جنت اور ریشمی لباس کا۔ ہوں ہم اس کی مہربانی سے تکیہ لگائے ہوئے جنت کے اندر اونچی مسندوں پر جیسے کہ تھے ہم تکیہ لگائے ہوئے ، اس معبر دُنیا میں جو کہ خود ساختہ تکیہ گاہ اور مسند ہے ، جو امیر محمدؐین (مصنف کے والدِ بزرگوار) کا تخت ہے (اللہ کی رحمت ہو اُن پر) اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔ قصہ کوتاہ یہ کہ ہمیشہ اللہ کی رحمت کا اُمیدوار رہنا چاہیے اور اللہ کی ڈور کو مضبوط تر بنانا چاہیے ۔ ہر چند کہ انسان بیچارہ ظالم و جاہل ہے لیکن بارگاہِ قدس میں یہی خاکی انسان مقبول بھی ہے ۔ رباعی :

ہر چند کہ من دل فضولی دارم
فہمید کج و طبع جہولی دارم
با ایں ہمہ ای رحمت بی علۃ حق
از در گہت اُمید قبولی دارم

ترجمہ رباعی: ہر چند کہ میرا دل لغویات و ہزلیات میں ڈوبا ہوا ہے اور میں کج فہم اور جاہل ہوں، لیکن ان تمام عیوب و نقائص کے باوجود اے اللہ تعالیٰ کی بے سبب رحمتِ کاملہ میں تیری بارگاہ سے قبولیت کی اُمید رکھتا ہوں۔ (مصنف کی اپنی وضاحت کے مطابق) لفظ "من" سے جو واحد متکلم ہے، مراد تمام بنی نوع انسان ہے۔ یہ فقط اپنے ہی حال کی خبر یا اپنا ہی رونا نہیں۔ واقعاً انسانی قلب فضول واقع ہوا ہے، یعنی انسان کا نفس ناطقہ اپنی لغویت کی سے ضروری اور غیر ضروری

معانی کا ادراک کرتا ہے اور کیا کچھ درکار ہے اور کیا کچھ نہیں؛ سب کو خوب سمجھتا ہے اور ممکن و محال کے مفہوم کا تصوّر کرتا ہے۔ اور اپنی نظری اور عملی حکمت کی قوت کی بنا پر اپنے اختیاری اور غیر اختیاری امور کو دریافت کرتا ہے۔ اسے ان کثیر التعداد مراتب کا علم اپنے ذاتی جہل اور کج فہمی (جو اس کی معدومیت کا نشان ہے) کی بدولت حاصل ہوا۔ اس کی یہی خامی اُس کے کمال کا باعث بنی۔ کیونکہ اگر وہ صحیح اور درست فہم ہوتا اور اس کی سرشت میں جہالت نہ ہوتی تو اُسے سب درست ہی درست نظر آتا، یعنی کہ فقط حضرت ذات الوجود جو موجود حقیقی ہے اور دائمی حاضر ہے وہ اس خالص وحدت کے سوا کچھ نہ دیکھ پاتا اور نہ ہی اس تمام کثرت موہوم کو معلوم کر سکتا، بلکہ مرتبۂ وحدت سے بھی آگاہ نہ ہو سکتا جو کثرت کی طرح اعتباری ہی ہے۔ لہذا انسان کی کج فہمی اور جہالت اس کے علم و معرفت کا باعث بنی۔ جیسا کہ قرآن پاک میں ہے کہ بے شک انسان ظالم و جاہل ہے۔ لہذا اپنے ان تمام ذاتی عیوب کے باوجود وہ اللہ تعالیٰ کی لامتناہی رحمت کا امیدوار ہے۔ اُس کے نقائص ذاتی کمالات کے مظہر ہیں۔ ہر چند وہ اپنی ذات کے لحاظ سے جاہل و تباہ ہے، لیکن اس آیت کریمہ کے بموجب کہ ہم نے آدمؑ کی اولاد کو عزت دی، وہ اللہ کی عنایت سے بارگاہِ الٰہیہ میں مقبول ہے اور اس امر کا ڈھنڈورا پیٹتا ہے کہ ہمارا مالک حقیقی ہر عرضی درخواست کرنے والے کی عرضداشت منظور کر لیتا ہے اور اس آیت کریمہ کے مطابق کہ انسان کو چاہیے کہ میرے احکام کو قبول کرے۔ اس کریم مطلق کی صلائے عام نے اُسے دُعا مانگنے پر مامور کر رکھا ہے، لہذا اپنے گناہوں کے باوجود بھی ہم اس کی رحمت طلب کرنے پر مجبور ہیں اور اپنی بخشش کے لیے دعا مانگنے پر بے اختیار و لاچار ہیں۔ وہ کریم ہے اور اُس کی شانِ کریمی کے حقدار گناہگار ہی ہیں۔ حق تعالیٰ کے فیض عام نے تمام

ممکنہ حقائق کی دعاؤں کو قبول کرنے کی دعوت دی ہے اور ہر حقیقت نے جس چیز کا تقاضا کیا اُسے عطا فرمائی ۔ ایسا نہ ہوتا تو اُس معطیٔ مطلق کی بارگاہ عالی کے حق میں بخل لازم آتا کیونکہ میں عرضی درخواست کرنے والے کی عرض کو منظور کر لیتا ہوں اسی لیے نازل ہوئی ہے ۔ اور جب بندہ یارب یارب پکارتا ہے تو کہتا ہے اللہ میں حاضر ہوں میرے بندے ، سوال کر ہم تمھیں دیتے ہیں ، یہ بھی اسی امر پر دلالت کرتا ہے ۔ ورنہ زبانی تو لوگ ہمیشہ دُعا کرتے ہی ہیں ۔ لیکن کوئی اثر ظہور پذیر نہیں ہوتا ۔ مگر جو کچھ قبول ہے وہ اسی مقبول دعوت کی قسم ہے کہ اُس وقت زبانی طلب اور اُس امر کا استعدادی تقاضا مطابقت اختیار کر لیتے ہیں ، لہذا اس آیت کریمہ کے بموجب کہ میں ہر عرضی درخواست کرنے والے کی درخواست منظور کر لیتا ہوں ۔ سو اُن کو چاہیے کہ میرے احکام کو قبول کیا کریں اور مجھ پر یقین رکھیں ، اُمید ہے کہ وہ لوگ رشد و فلاح حاصل کر سکیں گے ۔ ہم گنہگار مومن اپنی زبان حال و قال سے رحمتِ حق طلب کرنے پہ مجبور و بے اختیار ہیں ، کیونکہ گناہ و عصیاں اس کی شان غفاری کا مظہر ہیں اور ہم گنہگار اُس غفور الرحیم کی بارگاہ سے مغفرت کا تقاضا کرتے ہیں ۔ پس اپنے استعدادی تقاضے کے مطابق زبانی بھی اس کی رحمت و مغفرت کی طلب کرنی چاہیے تاکہ استعداد اور زبان میں موافقت حاصل ہو سکے اور دُعا شرفِ قبولیت پا سکے ۔ اللہ تعالیٰ کی وسیع رحمت جلوہ فرما ہو اور ہمارے جرموں اور گناہوں کو معاف کر دے اور مٹا دے ۔ کیونکہ اس آیت کریمہ کے بموجب بے شک نیک کام بُرے کاموں کو مٹا دیتے ہیں ۔ پس پکارو اللہ کو اس حالت میں کہ تم یقین رکھتے ہو اجابت کا اور جان لو بے شک اللہ تعالیٰ نہیں قبول کرتا غافل دل کی دُعا ۔ اگر تم یہ کہو کہ جس طرح انسانی گناہ اس غفار کی مغفرت کا تقاضا کرتے ہیں تو اُس حقیقی منتقم کے انتقام و سزا کے مقتضی بھی ہیں تو ہمارا جواب یہ ہے کہ انتقام و سزا کا تقاضا تو کفار کے گناہ کرتے ہیں ۔ کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور رسول اللہؐ کی رسالت پہ ایمان نہیں رکھتے اور اُنھوں نے اُس ہادیٔ مطلق سے قطعاً کوئی نسبت پیدا نہیں کی ، مومنین تو انشاء اللہ بخشی ہوئی ارواح ہیں ۔ حضورؐ نے فرمایا جس نے لا الٰہ الا اللہ پڑھا ، وہ جنت میں داخل ہو گیا ۔ کہا نبی کریم صلعم نے کہ میرے پاس جبرئیل علیہ السلام آئے اور کہا بشارت دے اپنی امت کو کہ جو کوئی فوت ہو گیا اس طرح کہ نہیں ٹھہراتا اللہ کے ساتھ کسی کو وہ جنت میں داخل ہو گیا ۔ کہا اے جبرئیلؑ خواہ اس نے چوری کی ، اگرچہ اس نے زنا کیا ہو ۔ جبرئیل نے کہا ہاں ۔ میں نے کہا اے جبرئیل اگرچہ اس نے چوری کی

اگر چہ اس نے زنا کیا، جبرئیلؑ نے کہا۔ ہاں اور اگر چہ اس نے شراب پی۔ لہذا اللہ تعالیٰ نے دعا کی قبولیت کے لیے ایمان کا حکم بھی دیا ہے اور فرمایا ہے کہ اُنھیں چاہیے کہ میرے احکام کو قبول کیا کریں اور مجھ پر یقین و ایمان رکھیں تو اُمید ہے کہ وہ لوگ فلاح و رشد حاصل کر سکیں گے۔ قرآن مجید کا واضح فرمان ہے کہ بیشک اللہ تعالیٰ اس بات کو نہ بخشے گا کہ اُس کے ساتھ کسی کو شریک قرار دیا جائے، اور اس کے سوا اور جتنے گناہ ہیں جس کے منظور ہوگا۔ وہ گناہ بخش دے گا۔ اور جو شخص اللہ کے ساتھ شریک ٹھہراتا ہے وہ بڑی دُور کی گمراہی میں جا پڑا۔ شرک کی جڑ اور اس کا منبع یہی اپنی انا کا دعویٰ اور ماسوی اللہ کی ہستی کا شعور ہے جو حقیقت میں اعتباری حیثیت کے سوا کچھ بھی نہیں اور اللہ وحدہٗ لاشریک ہے اور مغفرت کے سلسلے میں ایماندار مومنوں کے لیے بھی جسے چاہے گا بخش دے گا کی تخصیص جو کر دی اس کی وجہ یہ ہے کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ کی رحمت و مغفرت پر یقین کامل نہیں رکھتے اور نہ ہی اُنھیں اس سے انس یا نسبت ہے، نہ ہی حضوری اور شہود حاصل کیا ہے۔ ان کی بے یقینی اُنھیں دوزخ کی طرف گھسیٹ لے جائے گی۔ لیکن آخر کار حضور محمد صلی اللہ علیہ وسلم (ان پر خدا کا درود و سلام) کی شمولیت بھی ایسے کمزور ایمان والوں کو نجات دلا دے گی۔ اور جنت تک لے جائے گی۔ سطحی علما جو حقیقت سے نابلد ہیں وہ اپنے زعم میں اسی دہشت اور وحشت کو ایمان سمجھتے ہیں۔ حالانکہ اس قسم کا خوف اور دہشت و وحشت جو عوام یعنی علمائے سُو کو ہوتی ہے۔ وہ خداوندِ کریم اور رسولِ مقبولؐ کے وسیلے کے نہ ہونے کی وجہ سے ہوتی ہے۔ دیکھیے یہ آیت کریمہ کہ یاد رکھو اللہ کے دوستوں پر نہ کوئی اندیشہ ناک واقعہ پڑنے والا ہے، اور نہ وہ کسی مطلوب کے فوت ہونے پر مغموم ہوتے ہیں۔ اسی لیے تو حضرت غوث الاعظم قدس سرہ العزیز نے فرمایا کہ میرے مرید مت ڈر، اللہ میرا رب ہے، اور حضرت شاہ نقشبند قدس سرہٗ نے فرمایا تھا کہ ہم تو اللہ کے فضل والے ہیں۔ ہمیں تو اسی کے فضل کے دروازے سے لائے ہیں۔ یہ اُمید و بیم جو خواص کو حاصل ہوتی ہے وہ دوزخ کے خوف اور بہشت کی اُمید جیسی نہیں۔ ان کی اُمید و بیم تو ایسی ہے جیسی کہ محبت کے معاملات میں عاشق کو معشوق سے ہوتی ہے۔ وہ بالکل الگ چیز ہے۔ انبیائے کرامؑ اور اولیائے اللہ (جن سے خدا راضی اور وہ خدا سے راضی ہیں) جو نبوت کے کمالات سے بہرہ مند ہوتے ہیں۔ اُنھیں اس قسم کا آخرت کا خوف ہرگز نہیں ہوتا۔ یہ بظاہر عالم اور بباطن جاہل لوگوں کو ہوتا ہے، جنھیں خود اطمینانِ قلب حاصل نہیں ہوتا۔ وہ خدا کے بندوں کو

حد سے زیادہ ڈراتے دھمکاتے ہیں، اور یوں اُنس و وسیلے کی ڈور کو منقطع کر دیتے ہیں، اور دلوں کی کھیتیوں میں عتاب و عذاب اور غیظ و غضب کا بیج بوتے ہیں۔ تم میل ملاپ اور دلوں کو جوڑنے کے لیے آئے یا لڑائی بھڑائی اور دلوں کو توڑنے کے لیے۔ نہیں مایوس ہوتا اس کی رحمت سے کوئی بھی، کبھی بھی اور نہ ہی مایوس کرے کوئی ایک دوسرے کو، اور جس کسی نے کسی کو مایوس کیا پس وہ خود مایوس ہو گیا اللہ کی طرف سے۔ لیکن وہ کریں تو کیا؟ وہ بھی مجبور و معذور ہیں۔ ان کے دلوں سے شکوک و شبہات دُور نہیں ہوئے۔ نہ انکار اور واضح کفر سے کام لیتے ہیں، کہ بالکل مایوس ہو جائیں اور نہ ہی حقیقی ایمان رکھتے ہیں جس کی بدولت وہ اس حافظ و ناصر خدا کے حفظ و امان میں چلے جائیں۔ نہ وہ اِدھر کے ہیں نہ اُدھر کے۔ متشکک، متردّد اور متذبذب لوگ یونہی بین بین بھٹکے رہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے آسمانی کلام میں رسولوںؑ کو بشارت دینے والے اور ڈرانے والے کہا ہے اور واضح طور پر فرمایا ہے، کہ ہم پیغمبروںؑ کو صرف اس واسطے بھیجا کرتے ہیں کہ وہ بشارت دیں اور ڈرائیں۔ خوشخبری مومنین سے متعلق ہے اور ڈرانا دھمکانا کفار سے اور بشارت کو ڈرانے پہ مقدم رکھا ہے، لہٰذا اس کا ماحصل یہ کہ اُمید کو خوف پر مقدم سمجھنا چاہیے تاکہ جو کچھ مقصود ہے وہ ظہور پذیر ہو، یعنی پرورش یافتگان کو اپنے پروردگار تک رسائی۔ چونکہ اُنھیں ڈرائے بغیر اصلاح کا تصور بھی نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا تھوڑا بہت ڈرانا بھی چاہیے، اور وہ خوف بس اتنا جتنا آٹے میں نمک۔ شاید نمک ذائقے کو درست کرنے کے لیے ہوتا ہے ورنہ منظور تو غذا کا کھانا ہے۔ یہ نہیں کہ سارا نمک ہی نمک ہو اور تھوڑی سی غذا کیونکہ یوں تو کھانا تقویت کا نہیں ہلاکت کا باعث بن جائے گا۔ بلاؤ اپنے رب کے راستے کی طرف حکمت اور اچھی نصیحتوں کے ساتھ۔ یہی تکمیل کا کمال ہے۔ اور یہ بات ناقصوں کے بغیر صورت پذیر نہیں ہو سکتی۔ اور عفو ہی رحمت کے کمال کی دلیل ہے اور یہ گنہگاروں کے بغیر ظہور پذیر نہیں ہو سکتی۔ اسی لیے رسول اللہ صلعم نے فرمایا تھا۔ قسم ہے اُس ذات کی کہ جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ اگر تم گناہ نہ کرو تو لے جائے گا اللہ تمھیں اور لے آئے گا ایک ایسی قوم کہ جو گناہ کرے گی۔ اللہ سے بخشش مانگیں گے اور اللہ اُنھیں بخشے گا۔ کمال کی انتہا یعنی اکمل درجہ یہ ہے کہ کسی دوسرے کو کامل بنایا جائے، اور یہ بات ناقصوں کے بغیر صورت پذیر نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ اگر ناقص نہ ہوگا تو کامل کیسے بنائیں گے۔ کامل کو تو کامل نہیں بنایا جا سکتا۔ وہ تحصیل حاصل ہے اور رحمت کا کمال یا آخری درجہ یہ ہے کہ تقصیروں اور جرموں کو دیدہ دانستہ معاف کر دیا جائے تو یہ

بات بھی بغیر مجرموں اور گنہگاروں کے کیسے صورت پذیر ہو سکتی ہے۔ کیونکہ بے گناہ کو معاف کرنے کے تو کچھ معنی ہی نہیں، لہذا ہم فرشتوں کو تو مغفور نہیں کہہ سکتے۔ لہذا انسان کے عیوب و گناہ ہی حق سبحانہٗ تعالیٰ کی شان غفاری کی اکملیت کا مظہر ہیں۔ اس لیے تو رسول اللہ صلعم نے فرمایا تھا کہ مجھے قسم ہے اس خدائے واحد کی جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے کہ اگر تم گناہ نہ کرتے تو خدا تمھیں غارت کر دیتا اور ایسی قوم کو پیدا کرتا جو گناہ کرے اور اُس سے بخشش و مغفرت کی طلب کرے اور اللہ تعالیٰ اُنھیں بخش دے۔ نیز حضور پاکؐ نے یہ بھی فرمایا کہ اللہ تعالیٰ گناہگاروں کے چھوٹے بڑے گناہ سب معاف کر دے گا سوائے شرک کے، اگرچہ وہ فوت ہو جائیں بغیر توبہ کے۔ ابن عباسؓ سے روایت ہے فرمایا کہ رسول اللہ صلعم نے بھیجا پیغام وحشی بن حرب کی جانب جو حضرت حمزہؓ کا قاتل تھا، اُسے دعوت دیتے ہوئے اسلام کی طرف۔ پس اُس نے پیغام بھیجا ' اے محمدؐ آپ کیسے بلاتے ہیں مجھے جب کہ آپ یہ کہتے ہیں کہ جس نے قتل کیا یا شرک کیا یا گناہوں کا ارتکاب کیا، کئی گنا بڑھا دیا جائے گا اُس کے لیے عذاب قیامت کے دن اور وہ اس عذاب میں ہمیشہ ہمیشہ ذلیل و خوار ہو کر رہے گا۔ اور میں نے یہ سب کچھ کیا ہے۔ کیا آپ میرے لیے کوئی چھوٹ پاتے ہیں۔ پس نازل کی اللہ تعالیٰ نے یہ آیت۔ سوائے اس کے جس نے توبہ کی اور ایمان لایا اور عمل صالح کیے اور یہی لوگ ہیں کہ بدل دے گا اللہ تعالیٰ جن کی برائیوں کو اچھائیوں میں اور اللہ بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔ پس وحشی نے کہا کہ یہ شرط یعنی سوائے اس کے جس نے توبہ کی، ایمان لایا عمل صالح کیے سخت شرط ہے، ممکن ہے میں اس پہ قادر نہ ہو پاؤں۔ پس اللہ تعالیٰ نے آیت نازل کی۔ بے شک اللہ تعالیٰ نہیں بخشتا کہ اُس کے ساتھ کسی کو شریک بنایا جائے، اور بخش دیتا ہے ہر وہ گناہ جو اس سے کم درجے کا ہو جس کو چاہتا ہے۔ پس وحشی نے کہا میں یہ دیکھتا ہوں کہ یہ اس کی مشیّت کے بعد ممکن ہے۔ پس ہم نہیں جانتے کہ وہ بخشتا ہے یا نہیں بخشتا۔ پس اس کے علاوہ بھی کچھ ہے۔ پس نازل کیا اللہ تعالیٰ نے کہ اے میرے بندو جنھوں نے اپنے نفسوں پہ زیادتی کی اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو۔ وحشی نے کہا یہ تو ٹھیک ہے۔ پس وہ اسلام لے آیا۔ لوگوں نے کہا کہ یا رسول اللہؐ بے شک ہمیں بھی پہنچی ہے وہ چیز جو پہنچی ہے وحشی کو۔ آپؐ نے فرمایا یہ مسلمانوں کے لیے عام طور پہ ہے۔ الغرض اس کا فضل بے حد و حساب ہے اور اے ناعاقبت اندیش غافل! ابھی توبہ کے دروازے کھلے ہیں جو تجھے ابھی گناہ کی طاقت دے

رکھی ہے، لہٰذا گناہوں کو ترک کر دے، قبل اس کے کہ وہ تجھے ترک کر دیں۔ توبہ و استغفار پہ زبان کھول قبل اس کے تمھیں ابدی چپ لگ جائے۔ ورنہ آخر کار تیرے گناہ خود تجھ سے توبہ کرنے لگیں گے۔ تو ان سے کنّی کترائے گا، میرے رب غفور الرحیم کی رحمت و بخشش حد سے زیادہ ہے یعنی اللہ تعالیٰ کی عنایات بے غایات حد و حساب سے باہر ہیں۔ ہم اس کی لاتعداد نعمتوں کا شمار نہیں کر سکتے۔ ہم غفلت کے مارے گنہگار بندوں نے عاقبت اندیشی کو ہاتھ سے چھوڑ رکھا ہے اور اپنی زندگی کے ایام و اوقات کو بے مقصد اور بے معنی امور میں صرف کر رہے ہیں۔ خود خدا نے فرمایا ہے کہ انسان بڑے خسارے میں ہے مگر جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے اچھے عمل کیے۔ لیکن فرصت کو غنیمت سمجھ اور دُعا و استغفار کی راہ پہ چلو کیونکہ ابھی توبہ کے دروازے کھُلے ہیں۔ یعنی ہم گناہ کرنے یا اُس کے ترک کرنے پہ ابھی قادر ہیں۔ خواہ فعلاً اس کے ارتکاب پہ قادر ہو، خواہ از رُوئے قوت اس فعل کے ارتکاب کی اہلیت رکھتے ہو۔ جب یہی قدرت اور اہلیت تم سے چھین لی گئی اس وقت توبہ کے دروازے بند ہو چکے ہوں گے، تم اس وقت کس چیز سے توبہ کرو گے۔ تم معصیت کے ان امور کا منبع ہی نہ رہو گے۔
لہٰذا تجھے خود گناہوں اور غیر شرعی کاموں کو ترک کر دینا چاہیے۔ قبل اس کے کہ گناہ و شرعی ممنوعات تجھے ترک کر دیں۔ یعنی کہ تجھ میں گناہ کرنے کی قوت ہی باقی نہ رہے۔ یعنی وہ قوت تجھ سے چھین لی جائے۔ توبہ و استغفار پہ زبان کھولنی چاہیے، قبل اس سے کہ تجھ پر موت کی خاموشی کا دروازہ کھول دیں اور تیری زبان میں حرکت کی طاقت نہ رہے، کیونکہ آخر سب کو یہ حالت پیش آتی ہے۔ یہ بھی جان لو کہ آخری وقت کا ایسا ایمان جو خوف و خطر کے باعث ہو، مقبول ایمان نہیں ہوتا۔ اگرچہ اُس وقت کی توبہ رد نہیں ہوتی، مگر اس میں کوئی مزہ بھی نہیں ہوتا اور نہ ہی وہ عمدہ قسم کے پھل پھول پہ منتج ہوتی ہے۔ کیونکہ ایسے شخص کی بساطِ زندگی لپیٹی جانے کو ہوتی ہے اور اس شخص کی توبہ و استغفار مقبولیت کا دروازہ بند ہونے کو ہوتا ہے۔ جیسا کہ اس آیت کریمہ سے واضح ہے کہ توبہ جس کا قبول کرنا اللہ تعالیٰ کے ذمے ہے وہ ان ہی کی ہے جو حماقت سے کوئی گناہ کر بیٹھتے ہیں، پھر قریب ہی وقت میں توبہ کر لیتے ہیں، سو ایسوں پہ تو خدا تعالیٰ توجہ فرماتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے۔ حکمت والا ہے اور ایسے لوگوں کی توبہ نہیں جو گناہ کرتے رہتے ہیں، یہاں تک کہ جب ان میں کسی کے سامنے موت ہی آ کھڑی ہوئی تو کہنے لگا کہ میں اب توبہ کرنے والا ہوں۔ اور نہ ان لوگوں کی جن کو

حالتِ کفر پر موت آجاتی ہے، ان لوگوں کے لیے ہم نے دردناک سزا تیار کر رکھی ہے۔ سو ایسی حالت سے جتنا پہلے ہو توبہ کر لی جائے، اور باعث سعادت و خوش بختی اور جتنا بھی خدا کی طرف رجوع کر لیا جائے اتنا ہی انجام بخیر۔ جس طرح تمام قوا کی اضمحلال کے وقت سارے گناہ اور غیر شرعی کام انسان کو چھوڑ جاتے ہیں، اسی طرح جزوی طور پر ہر قوت کے زوال کے وقت اس قوت سے مخصوص گناہ و عصیاں بھی اُسے چھوڑ جاتے ہیں، لہذا ہمتِ مردانہ کے شایانِ شان یہی بات ہے کہ

دسترس ہونے کے باوجود ہاتھ کھینچ لیا جائے۔ کیونکہ گناہوں اور شرعی ممنوعات کو یوں ترک کرنا خوبصورت انداز میں علیحدہ ہونا ہے۔ جیساکہ قرآن پاک میں خود خدا فرماتا ہے کہ خوبصورتی کے ساتھ ان سے الگ رہو۔ نہ کہ بے دست و پا ہو کر مایوسی کا شکار بن جاؤ۔ اس قسم کا چھوڑنا یا ترک کرنا تو الگ ہونے کا نہایت کریہہ انداز ہے۔ پس گناہ تمھیں چھوڑ جائیں گے ہجر کریہہ کی طرح۔

رباعی:

این شعبدہ ہا کہ رو نمایند ہمہ
زشتند ولی نکو یند ہمہ
ترک ہمہ اختیار باید کردن
زان پیش کہ ترک تو نمایند ہمہ

ترجمہ رباعی: یہ تمام مداری والے کھیل جو اب رونما ہو رہے ہیں۔ یہ سب کے سب بُرے مگر بھلے معلوم ہوتے ہیں۔ ہمیں تمام اختیارات سے دست بردار ہو جانا چاہیے، قبل اس کے کہ وہ سارے ہمیں ترک کر دیں۔ (مصنف کی اپنی وضاحت کے مطابق) نفسانی خواہشات کی یہ شعبدہ بازیاں جو اس وقت رونما ہو رہی ہیں فی الحقیقت نہایت بُری ہیں لیکن تیری وحشیانہ نگاہ کو لبھاتی ہیں اور بھلی معلوم ہوتی ہیں۔ ہوشیار رہ اور ان لذاتِ جسمانی کو ترک کرنے پہ اپنی ہمت صرف کر، کیونکہ آخر کار یہ سارے فانی اور ناپائیدار امور تجھ سے بے وفائی کریں گے اور تو چاہے یا نہ چاہے وہ جُدائی کا راستہ اختیار کر لیں گے۔ تم بھی دُعا کرو کہ اے ہمارے رب ہم نے اپنا بڑا نقصان کیا اور اگر تو ہماری مغفرت نہ کرے گا اور ہم پر رحم نہ کرے گا تو واقعی ہمارا بڑا نقصان ہو جائے گا۔

هوالناصر

شروع اللہ کے نام سے جو نہایت مہربان اور بہت رحم والا ہے

ہر قسم کی تعریف اللہ کے واسطے ہے جس نے ہمیں واضح غلبے سے مشرف فرمایا اور ایمان و یقین کی دولت بخشی اور درود و سلام اس کے رسول محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر جو اگلوں اور پچھلوں کے لیے باعث فخر ہیں اور اُن صؐ کی آل رضؓ پر اور اصحاب رضؓ پر قیامت کے دن تک۔ اما بعد پس یہ اکتالیسواں[۴۱] باب ہے جو سلطان مبین سے موسوم ہے۔ سلطان کے معنی غلبے اور حجت کے ہیں جس کی بدولت اللہ تعالیٰ نے انسان کو موجودات پر مسلّط کیا اپنے تسلّط کے ضمن میں اور بنایا اُسے واضح غالب۔ دی اُسے حجت بالغہ اور زمین کی خلافت اور مسخر کیے اُس کے لیے رات اور دن اور ستارے اور نہریں اور عالم امکان میں انسان کو پورا تسلّط عطا فرمایا۔ اور بنایا اُسے خدا نے سلیط یعنی فصیح اور سکھائی اُسے گویائی تاکہ لوگوں میں بیان کرے حکمت ربانی اور اسرار یزدانی۔ اور نکالے ناقصوں کو نقص کے گڑھوں سے اوج کمال تک اور ملائے اُنھیں اُن کے رب سے بشری طاقت کی مقدار کے مطابق دلوں کی صفائی اور تزکیۂ نفس اور ادراکِ حقیقت کے ساتھ جس کے اوپر انحصار ہے نفس امر میں اور تہذیب اخلاق میں اور تصحیح عقائد و اعمال میں موافقت رکھتے ہوئے شریعتِ نبویہ کے ساتھ اور طریقۂ محمدیہ کے ساتھ اور تعلیم دینا علوم ظاہری اور باطنی۔ پس ہر قسم کی تعریف اللہ کے لیے ہے، جو چن لیتا ہے اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے اور بناتا ہے اُسے محمد مجتبیٰ صلعم کے خاندان سے۔ مبعوث کرتا ہے اُسے دُنیا و آخرت میں چلتا پھرتا

سردار، محمدی جھنڈے کے سائے میں، اور وہ ہوتا ہے ان دونوں اُس کے ہاتھ میں۔ اور اللہ عظیم فضل والا ہے ۔

انسانی حقیقت اور عرفانی کیفیت کے بیان کا باب

اس امر کا بیان کہ انسانی ماہیت کیا ہے، اور انسان کو عرفانی کیفیت کیسے حاصل ہوتی ہے اور مکمل معرفت اُسے کس راستے نصیب ہوتی ہے۔ یہ سمجھ لینا چاہیے کہ انسان جو حیوانِ ناطق ہے اس کی حقیقت مادی اور غیر مادی چیزوں سے مرکب ہے۔ نطق جس کے معنی کلیات و جزئیات کے ادراک کے ہیں، وہ نفس ناطقہ کا حصّہ ہے اور وہ غیر مادی معانی ہیں، اور ارادۃً حساسیت اور حرکت روح حیوانی کا کام ہے اور یہ مادی فضیلت ہے۔ لہٰذا انسان جو ان دونوں مرتبوں کا مالک ہے۔ گویا مفردات و مادیات اور امر و خلق کے عالم کا جامع ہے۔ عالمِ شہادت اس کی ظاہری چشم کے سامنے اور عالمِ غیب اس کی باطنی آنکھ پہ منکشف ہے۔ لہٰذا غائب و حاضر کے جاننے والے اللہ جل شانہٗ نے اُسے اپنا خلیفہ اور نائب کہا اور فرشتوں سے فرمایا کہ میں ضرور بناؤں گا زمین پہ ایک نائب۔ یہ آیت کریمہ ہر چند کہ موجودات کے باوا آدم علیہ السلام (ان پہ اور ہمارے نبی پہ درود و سلام) کے بارے میں ہے لیکن فی الحقیقت یہ نعمت تمام انسانوں کے شاملِ حال ہے۔ کیونکہ آدم علیہ السلام بھی نوعِ انسانی کے اک جزو تھے اور ایک نوع کے افراد کی حقیقت متفقہ طور پہ ایک ہی ہوتی ہے، لہٰذا ایک فرد کی تفصیل اس نوع کی تمام موجودات کی تفصیل ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسان اشرف المخلوقات کہلایا اور اللہ تعالیٰ نے اُسے زمین پہ اپنا خلیفہ ٹھہرایا اور اپنے تمام کمالات کا جامع مظہر بنایا اور اپنے تنزیہی، تشبیہی، حیاتی، ارادی، کلامی، سمعی اور بصری اور دیگر تمام صفاتی کمالات اور ذاتی ظہورات اس میں ظاہر کیے، کیونکہ قرآن شریف کی یہ آیت کریمہ کہ خدا نے آدم علیہ السلام کو کل چیزوں کے اسماءؑ کا علم دے دیا، اسی طرف اشارہ کرتی ہے۔ چونکہ خلیفہ اُسے کہتے ہیں جو بعد میں آئے اور کسی کا نائب ہو۔ لہٰذا پہلے اس مظہر کے پردے سے حق تعالیٰ ظاہر ہوتا ہے۔ اور اُسی کا خلیفہ خود اُس کے بعد ظہور پذیر ہوتا ہے۔ کیونکہ موجود وجود ہے اور ماہیات اس وجود سے کھینچ کر نکالی گئی ہیں۔ پہلے کسی شے کی ہستی ادراک و سمجھ میں آتی ہے اس کے بعد پتہ چلتا ہے کہ یہ فلاں شے ہے

پس انسان اپنے رب کے ظہور کے ضمن میں ظاہر ہوتا ہے اور اصل میں اسی کا ظاہر ہے، اور پھر اسی کی تبعیت سے خلیفہ ظاہر ہوتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ اُسے خلافت کی خلعت اپنی شمولیت ہی راہ سے پہناتا ہے، اور اُس کے ظاہر و باطن اس حدیث شریف کے نور سے منور کر دیتا ہے کہ مجھ (خدا) ہی سے وہ سنتا ہے اور میرے (خدا کے) ساتھ ہی دیکھتا ہے۔ رباعی:

انسان کہ جناب او جناب عالی ست
ای درد عجیب درگہ فارغبالی ست
در بزمِ خیال او کہ رشکِ خلد ست
چوں آئینہ جای ہر کہ آید خالی ست

ترجمہ رباعی: انسان جس کی درگاہ بارگاہ عالی ہے۔ اے درد یہ فارغ البالی کی عجیب درگاہ ہے۔ اس کی بزمِ خیال میں جس پہ بہشت بھی رشک کرتی ہے آئینے کی طرح ہر آنے والے کے لیے جگہ خالی ہوتی ہے۔ (مصنف رباعی کی خود یوں وضاحت کرتا ہے) انسان جس کا مرتبہ اس ذات کے مرتبے کے بعد آتا ہے۔ اس کی حقیقت تمام حقائق پہ فائق ہے اور تمام تعینات اس کے تعین سے پیدا ہوتے ہیں۔ کیونکہ تعین اوّل حقیقت محمدیہؐ ہے (اس حقیقت کے مالک پہ خدا کی رحمت و سلامتیاں) حقیقت انسانی کی یہ بارگاہ بھی عجیب فارغ البالی کی بارگاہ ہے کہ اُس لاتعین ذات کے بعد جو فراغت انسان کو حاصل ہے وہ کسی دیگر مخلوق کو میسر نہیں۔ اور کسی مقید (متعین) نے اسی لا محدود سے ایسی نسبت پیدا نہیں کی اور اُس کی اطلاقی کیفیت جس طرح انسان پر منکشف ہوئی وہ کسی اور پر یوں عیاں نہ ہوئی۔ اور اس کی قوتِ متخیلہ جو مادی ہے اور عقلی قوت سے اس کی نسبت جو غیر مادی ہے اگرچہ کم پایہ اور فرومایہ ہے لیکن اس کی وسعت کا بھی یہ عالم ہے کہ اس میں موجودات کی جتنی صورتیں بھی جلوہ گر ہوں اُسے تنگی کا احساس نہیں ہوتا۔ کیسی بڑی شان ہے اللہ کی، جو تمام صنّاعوں سے بڑھ کر ہے۔ انسان کی حقیقت جامعہ جو وجوبی اور امکانی مراتب کی آئینہ دار ہے اس حکیم مطلق کی بنائی ہوئی اک عجیب معجون ہے اور ایسا عجیب نسخہ ہے جس نے تمام نسخوں کو منسوخ کر دیا ہے۔ ابلیسی حقیقت کو منہ کے بل گرانے والا وہی ہے۔ اور فرشتوں کے مقدس گروہ کو اپنے سامنے سربسجود کرنے والا بھی وہی ہے۔ اے بندۂ خدا اپنے آپ اور اپنی حقیقت کو پہچان اور کسی انسانِ کامل کی متابعت

(تقلید) سے منہ نہ موڑ۔ اے حضرت انسان قفل معرفت کی چابی تو ہی ہے، اور یہ قول کہ جس نے اپنے آپ (نفس) کو پہچان لیا اس نے اپنے رب کو پہچان لیا، انسانی حقیقت کی عظمتوں اور وسعتوں کے بیان اور حضرت انسان کی جامعیت کے تمام مراتب کے اظہار کا ماحصل ہے۔ چونکہ انسان تمام چیزوں کا جامع اور مخلوقات میں اس کی بہتر اور احسن مخلوق ہے، لہذا اس کی تخلیق کے بیان میں خدا نے اپنے آپ کو احسن الخالقین (تمام صناعوں سے بڑھ کر) کہا۔ سچی بات یہ ہے کہ احسن سے احسن چیز ہی تخلیق ہوتی ہے۔ ایسے خالق کے شایانِ شان ایسی مخلوق ہی ہے۔ تمام موجودات اسی باکمال کے اجزا ہیں۔ حضرت انسان پر اس مرتبۂ اجمال کی تفصیل اور لفظ معجون کا اطلاق اس کی ترکیب کی وجہ سے کیا گیا ہے جو علوی خوبیوں اور سفلی (ارضی) اجزا سے مرکب ہے اور تمام اسمائے ذات کی جلوہ گاہ ہے۔ حاصل مطلب یہ کہ انسان ایک عجیب مجموعہ ہے۔ اور انسان کے دیگر نسخوں کو منسوخ کرنے والے سے مراد اس کے اشرف المخلوقات ہونے سے ہے۔ جس نے اپنی قدر و منزلت کے پہلو سے اعتباری نظر سے تمام موجودات کو بے وقعت کر دیا۔ یہی وجہ ہے کہ فرشتے اس کے سامنے سربسجود ہوئے۔ ابلیس اسی کی مخالفت سے رد کر دیا گیا۔ اور متن میں فرشتوں کو انسان کا غلام مجازی طریق سے کہا گیا ہے۔ اور انبیائے کرامؑ کے مرتبے کے فرشتوں سے افضلیت کی بنا پر جیسا کہ کہتے ہیں کہ فلاں فلاں کا بندہ ہے یعنی اس کا پیروکار اور دوست ہے اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ فرشتے انبیائے کرامؑ کے خادموں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ کیونکہ وہ ان کے لیے محبوبِ حقیقی کا پیغام اور سلام لاتے ہیں اور ان کے کاموں کو سرانجام دیتے ہیں اور یہ بات بھی ہمارے اعتقادات میں سے ہے کہ انسانوں کے رسول فرشتوں کے رسولوں سے افضل ہیں۔ اور عارفوں میں سے بعض جو اس امر کے قائل ہیں کہ فرشتوں کا اعلیٰ طبقہ انبیاءؑ سے زیادہ فضیلت رکھتا ہے۔ وہ بعض جزئی حیثیتوں مثلاً علم کے سیکھنے اور غیب کی خبروں کے جاننے اور اسی قسم کے دیگر امور کی وجہ سے ہے۔ لیکن حق بات یہی ہے کہ انبیائے کرامؑ فرشتوں سے افضل ہیں۔ کیونکہ کسی خوبی کی ملکیت انسانی خوبیوں ہی کا حصہ ہے۔ کیا ہوا وہ امور انبیاءؑ کو فرشتوں کے ذریعے حاصل ہوئے۔ خادم خادم ہے اور مخدوم مخدوم۔ جو کچھ بھی ہے حضرت انسان کے لیے، اور انسان حضرت رحمان کے لیے۔ کیونکہ وہ پیدا کیا گیا ہے اسی کی صورت پر۔ پس اپنے نفس کی پہچان تمام اشیا کی جان پہچان ہے۔ اور اپنے آپ کو پا لینا گویا حق تعالیٰ تک

رسائی کا موجب ہے۔ **ترغیب** جب اپنے نفس کی پہچان معرفتِ الٰہی کا دیباچہ ہے، تو پہلے اپنی پہچان کے لیے پوری کوشش اور پورا اہتمام کرنا چاہیے تاکہ دل پر نفس کی سیر کا دروازہ کھل جائے۔ اور یہ بات کسی ایسے مرد کامل کی صحبت اور خدمت کے بغیر میسر نہیں آسکتی جس پر حقیقت کا انکشاف ہو چکا ہو۔ لہٰذا متن میں سرتابی کرنے یا مُنہ موڑنے سے جو ممانعت کی گئی ہے۔ اس سے کسی مرد کامل کی پیروی سے سرتابی مُراد ہے۔ اگر کسی ایسے مردِ کامل کی بابرکت صحبت میسرّ آجائے تو زہے نصیب! جتنی بھی خدمت اور اتباع ہو سکے اسے عین سعادت اور غنیمت سمجھنا چاہیے، کیونکہ آخر کار اس کا نتیجہ سامنے آجائے گا۔ یہ ممکن ہی نہیں کہ ایسے بزرگواروں کی صحبت سے فیض نہ پہنچے۔ طالب کی استعداد کے مطابق فائدہ ہو ہی جائے گا۔ وہ ایسے لوگ ہیں کہ ان کا ہم نشین بدبخت ہو ہی نہیں سکتا۔ اور اگر بظاہر ایسا کوئی مردِ کامل میسر نہ آسکے تو جن بزرگوں سے عقیدت و ارادت ہو ان کا کلام پڑھنا چاہیے ان کی تصنیفات کو وسیلہ بنا کر ان کی روحوں سے روحانی تعلق و توسط پیدا کرنا چاہیے۔ یہ اویسی طریقہ ہے۔ ارواح سے بھی فیض پہنچتا ہے۔ ارادت ہو تو اولیائے کرامؒ کا کلام بھی متوسلین کے لیے اسرار و رموز کو کھول دیتا ہے۔ یہ بے جان نقوش (الفاظ) جو اس وقت آپ کاغذ کے صفحے پر دیکھ رہے ہیں، ایک وقت ایسا تھا جب یہی الفاظ ایک زندہ انسان کی زبان سے نکل رہے تھے۔ پس جس زبان سے تم ان لکھے ہوئے الفاظ کا تلفظ کرو گے، تو وہ دوبارہ نئی زندگی پا کر وہی کلام اپنے معانی میں سے تمھیں بھی کچھ نہ کچھ فیض پہنچائے گا۔ اور اس کلام کی قرأت کی برکت سے اک قسم کی ہم نشینی و ہم کلامی ظہور پذیر ہو جائے گی۔ عشق فقط دیدار ہی سے پیدا نہیں ہوتا۔ بسا اوقات ہم نشینی سے خوش بختی بھی نمودار ہو جاتی ہے۔ لہٰذا عارفانِ ذات کی چھوڑی ہوئی عمدہ تصانیف باقیاتِ صالحات میں داخل سمجھیے۔ اگرچہ ہر کسی کی سمجھ اور پسند کے مطابق لکھنا تو بہت دشوار ہے، لیکن فرمان صرف اکثریت کے لحاظ سے ہے۔ یہ چند حروف جو مجھ سے لکھوائے جا رہے ہیں، اسی اکثریت کے نفع نقصان کے لیے لکھوائے جا رہے ہیں۔ جیسے کہ اس آیت کریمہ میں ہے کہ اللہ تعالیٰ اس مثال کی وجہ سے بہتوں کو گمراہ کرتے ہیں اور بہتوں کو ہدایت کرتے ہیں اس کی وجہ سے، اور گمراہ نہیں کرتے اللہ تعالیٰ اس مثال کی وجہ سے کسی کو مگر صرف بے حکمی کرنے والوں کو۔

رباعی:

چشمم گرو دیدن فانوس خودست

گوشم ہمہ بر صدای ناقوس خودست

در بزم ظہور بے سبب نامدہ ام

چوں شمع مرا سر قدمبوس خودست

ترجمہ رباعی: میری آنکھیں اپنے ہی فانوس کو دیکھنے کے لیے رہین ہیں۔ میرے کان اپنے ہی ناقوس کو سننے کے لیے ہمہ تن مصروف ہیں۔ میں اس بزم ظہور میں یونہی بے وجہ تو نہیں آیا۔ شمع کی طرح میرا سر بھی اپنے ہی قدموں کو چومتا ہے۔ (مصنف کی اپنی تشریح کے مطابق) آنکھ کی بینائی اپنی ہی جسمانی نشانیوں کے دیکھنے کے لیے ہے۔ اور کانوں کی سماعت اپنے ہی غیر فانی کلمات سننے کے واسطے ہے۔ ہر کوئی اپنا سراغ لگانے ہی کے درپے ہے اور ہر کسی کو اپنے آپ تک پہنچنے کا مسئلہ درپیش ہے۔ شمع کی طرح اپنی ہی آگ میں جلنا چاہیے اور اپنا سر اپنے ہی قدموں پر ڈال دینا چاہیے۔ کیونکہ خودرسی اور خودشناسی کا منتہائے کمال یہی ہے۔

هوالنّاصر

شروع اللہ کے نام سے جو نہایت مہربان اور بڑا رحم والا ہے

ہر قسم کی تعریف اللہ کے واسطے ہے۔ کون ہے اس سے اچھا کلام کے لحاظ سے، اور زیادہ عادل اُس سے انتظام کے لحاظ سے، اور درود و سلام ہو اس کے رسول ؐ پر جسے اس نے بنایا نور اور امام اور آپ کی آل رضؓ اور اصحاب پر کہ جن سے اللہ راضی ہوا دین اور اسلام کے لحاظ سے۔ اما بعد پس یہ بیالیسواں[۴۲] باب ہے جو احسن القول سے موسوم ہے۔ بے شک احسن الکلام اللہ علیم و علاّم کا کلام ہے۔ پس کلام وہ جو کہ ہے کاشف اسرارِ قرآنیہ کا اور آیاتِ فرقانیہ کے ساتھ ملا ہوا ہے اور استدلال کرتا ہے عقلی دلیلوں سے اور مزین ہے خوبصورت استعاروں سے اور فصیح عبارتوں سے۔ یہ اقوال میں سے بہترین ہے۔ پس وہ لوگ جو سنتے ہیں قول کو اور پیروی کرتے ہیں اس میں سے بہترین کی۔ وہی منصف ہیں وہی عقل والے ہیں اور نہیں قدرت رکھتا بندہ ایسے کلام کے تکلّم کی، یہاں تک کہ نہ ہو جائے اُسے مکمل نسبت اللہ تعالیٰ کے کلام کی صفت سے اور قوی تقرب متکلم حقیقی جل شانہٗ سے۔ پس اُسے سکھاتا ہے اللہ تعالیٰ اپنی جناب سے علم، اور وہ نہیں بولتا اپنی نفسانی خواہش سے، اور نہ قوتِ شاعریہ سے۔ اور اُس کا قول شعرا کے اقوال کی جنس میں سے نہیں ہوتا۔ اور اس کا بولنا اہلِ ہوس کے بولنے کی قسم میں سے نہیں ہے۔ وہ تو فقط رب کی طرف سے القا کیا ہوتا ہے اس کے دل کے اندر، اور اللہ سمیع و علیم ہے۔

امکانی حقیقت اور اُس کے متعلّقات کا باب

حقیقت، ماہیت، عین اور ذات کے ایک ہی معنی ہیں۔ یہ وارد امکانی ماہیت اور اُس کے ذاتی تقاضوں کے بارے میں ہے جو مذکورہ بالا حقیقت کے لوازمات اور متعلقات ہی سے ہے، اور وہ ہے حدوث، ہستی، حصول اور تغیر و تبدل (ادل بدل)۔ ممکنات کے اسی تغیر و تبدل و حدوث کی دلیل ٹھہراتے ہیں، جیساکہ داناؤں نے کہا ہے کہ دُنیا تغیر پذیر رہتی ہے، اور ہر تغیر پذیر شے حادث ہوتی ہے، لہٰذا یہ جہاں بھی حادث ٹھہرا۔ اگر تم حقیقت کو سمجھ لو تو یہ بات پالوگے کہ یہ دلیل (برہان اِنّی) ہے جو ارباب ظاہر پہ بھی عیاں ہے اور وہ انہی معلولات سے علتوں کا سراغ لگاتے ہیں، ورنہ علت کو معلول کے توسل کے بغیر ذاتی لحاظ سے نہیں پا سکتے۔ کیونکہ ممکنات کا حدوث اس کے تغیر و تبدل کی علت قرار پایا، نہ یہ کہ وہ حدوث کسی علت یا وجہ کے بغیر ہوا۔ کیونکہ حدوث ذاتی ممکن ہے۔ اور تغیرؔ عارضی اور حدوث کا اس کے تغیر پر تقدم ظاہر ہے، لہٰذا اہلِ ظاہر جہان کے اسی تغیر و تبدل ہی سے جہان کے حادث ہونے کو دریافت کرتے ہیں۔ اور اربابِ حقیقت جن پر کسی شے کی ماہیت منکشف ہوجاتی ہے پہلے تو علت کا مشاہدہ کرتے ہیں اور پھر اسی کی بدولت معلول کو پالیتے ہیں۔ ان کی دلیل لمی ہے۔ وہ عالم کے حادث ہونے کی راہ سے دُنیا کے تغیر و تبدل کو سمجھ لیتے ہیں جس طرح کہ کوئی طبیب پہلے تو خلطوں کی سڑاند سے سُراغ لگاتا ہے، اس کے بعد بیمار کے تپ کو دیکھتا ہے (پالیتا ہے)۔ پہلی صورت تو ایسی ہے کہ پہلے چھُو کر تپ کو محسوس کرے اور اُس کے بعد خلطوں کی سڑاند کا پتہ چلائے۔ پس سمجھ لو کہ ممکنات کے حادث ہونے کی وجہ امکان ہی ہے۔ جس طرح خلطوں کی بدبو بخار کی علّت ہے، کیونکہ امکان کے معنی ہیں طرفین سے ضرورت سلب کر لینا جس سے عدم کی وجود ممکن پہ سبقت اور وجود واجب کا تقدم اس کے وجود پر لازم ٹھہرا۔ اسی لیے حکماء تمام ممکنات کے ذاتی حدوث کے قائل ہیں، اور اس حدوث زمانی والے بعض کے ساتھ حدوث ذاتی کو بھی شامل سمجھتے ہیں اور محتاجی کی وجہ امکان کو گردانتے ہیں، برعکس متکلمین کے جو محتاجی کی وجہ حدوث کو سمجھتے ہیں اور اس صورت حادث ہونے کے وقت ممکن کو واجب کی محتاجی ہوتی ہے وگرنہ وہ واجب سے بے نیاز ہے اور یہ بات ناگوار سی ہے کہ اس صورت میں ممکن کے حدوث کے وقت واجب

کے وجود کا ہونا ضروری ہے۔ اس صورت میں خواہ ممکن موجود ہو یا نہ ہو واجب کا وجود ضروری ہے۔
پس سمجھ لینا چاہیے کہ اصل میں امکان ہی حدوث کا تقاضا کرتا ہے اور حدوث کے لیے تغیر و تبدل لازم ٹھہرا۔ کیونکہ فی الحقیقت حدوث سے ہی تغیر کا دوسرا نام، کیونکہ حادث نئی پیدا ہونے والی چیز کو کہتے ہیں یعنی کہ وہ پہلے نہ تھی، اب نئے سرے سے پیدا ہوئی اور یہی بات تمام تغیرات کی جڑ یا اصل ہے۔ یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ تغیر فنا ہی کی ایک قسم ہے اور اعتباری عدم کی ایک نوع، اور تغیر مرکب اشیا میں رونما ہوتا ہے۔ وہ مفرد اشیا جن میں ترکیب پانے کو عمل دخل نہیں ہوتا ان میں تغیر کا گزر نہیں، لہذا حکما جو اتنی حکمت سے بہرہ یاب ہیں وہ مفردات اور جواہر کو قدیم اور لازوال سمجھتے ہیں۔ اور انبیائے کرامؑ اور ان کے پیروکار جو اللہ تعالی کی حکمت کاملہ سے کما حقہ واقف ہیں۔ وہ اعلی مفرد اور حقیقی واحد صرف ذات حق سبحانہ تعالی ہی کو سمجھتے ہیں اور اس مفردیت اور وحدت کی نسبت کو بھی اسی مقدس مرتبے میں حیطۂ تحریر میں لانا مشکل سمجھتے ہیں۔ وہ تمام امکانی مفردات اور غیر مفردات کو حقیقی مرکبات ہی سمجھتے ہیں۔ ان دنیاوی چیزوں کی وسعت کو اضافی اور اعتباری وسعت سمجھتے ہیں۔ وہ ان کی حقیقت کو وجود اور عدم اعتباری سے مرکب سمجھتے ہیں۔ اور دراصل ان کی حقیقت کو وجود ظلی جس کے معنی دنیاو حصول کے ہیں اور عدم اعتباری جو عدم کا سایہ ہے، ان دو سے مرکب سمجھتے ہیں۔ کیونکہ ممکن میں اگر یہ ترکیب نہ ہوتی تو وہ واجب ہوتا یا ممتنع۔ لہذا یہ موجود ممکنات بھی مفردات ہی ہیں۔ خواہ وہ جواہر (قائم بالذات اشیاء) سے مرکب ہوں یا اعراض (قائم بذات غیر اشیاء) سے۔ ان تیز بین حضرات کی سچی معرفت کے وہ تمام حادث ہی ہیں، اور ہمیشہ زوال کی زد میں رہتے ہیں۔ کیونکہ سب چیزیں فنا ہونے والی ہیں بجز اس کی ذات کے۔ رباعی:

گاہی تلف شادی بیہودہ شدیم
گہ با غم بے فائدہ آلودہ شدیم
گلگشت گلستان تخیل کردیم
از گردش رنگ خویش فرسودہ شدیم

ترجمہ رباعی: کبھی تو ہم بیہودہ خوشیوں میں کھوئے رہتے ہیں، اور کبھی بے فائدہ غموں سے لتھڑے رہتے ہیں۔ ہم اپنے ہی تخیل کے باغ کے پھولوں سے لطف اندوز ہوتے رہے، پھر اپنا ہی رنگ

اڑ جانے کے باعث فرسودہ ہو کر رہ گئے ۔ (مصنف کی اپنی وضاحت یوں ہے کہ) وجود کی اصل چونکہ موہوم ہے، اس لیے اس کے متعلقات بھی یقیناً موہومات ہی ہوں گے ۔ لہذا یہ خوشی اور غم سب توہمات ہیں ایسے جذباتی امور میں مبتلا ہونا لغو اور بے سود ہے سوائے اتنے کے جتنا ان کے بواعث کا تقاضا ہے اور یہ جو تم باغِ عالم کی سیر کرتے ہو اور اس کے مختلف رنگوں کو دیکھتے ہو یہ دراصل تمھارے اپنے ہی تخیل کا کرشمہ ہے جو تم پر جلوہ افروز ہوتا ہے اور تمھارے رنگ کے بدل جانے سے تجھے فرسودہ کر دیتا ہے، کیونکہ یہ معلومہ کیفیتیں موہوم اعتبارات سے زیادہ اور کچھ بھی نہیں ۔ یہ دائرہ امکان (امکانی دائرہ) ہر میدان کی گیند ہے جو عجب کھینچا تانی میں مبتلا اور لڑھکتی رہتی ہے ۔ اس پر عجب آن بنی ہے ۔ کبھی تو وجوب کے صاحب غلبے کے تلے آجاتی ہے اور کبھی امتناعات کے بلّے کی زد میں آجاتی ہے ۔ ہر چند طرفین کی طرف سے ضرورت سلب شدہ ہے، لیکن پھر بھی ہمیشہ طرفین اُسے پاؤں تلے روندتے رہتے ہیں ۔ مرتبۂ امکان کو لفظ دائرے سے اس لیے تعبیر کیا گیا ہے کہ دائرہ قوسوں پر مشتمل ہوتا ہے تو گویا امکان کے طرفین یعنی وجود و عدم اس دائرے کی قوسوں کی حیثیت رکھتے ہیں اور دائرے کی گولائی کے لحاظ سے اس کے لیے گیند کا لفظ استعمال ہوا، کیونکہ اُس سے اُسے مکمل مشابہت پائی جاتی ہے اور ہر میدان کے لفظ سے مراد وجوب بالغیر اور امتناع بالغیر ہے، جیسے کہ ہم نے اس کی طرف متن کے اندر اشارہ کیا ہے ۔ اور امکانی حقیقت جس کی کوئی ضرورت نہیں، عجیب مجبوری کا شکار ہے کہ گاہے واجب اُسے اپنے ضمن میں ہستی عطا کر دیتا ہے اور کبھی اس کا امتناع عدم اُسے نیست بنا دیتا ہے گرچہ اپنی ذات میں وہ طرفین کی نسبت سے معرا ہے، لیکن ان کی متابعت کی بنا پر طرفین کی صفات سے متصف ہے ۔ پس اگر تو اپنی حقیقت سے آگاہ ہے تو وجود و عدم میں سے کچھ بھی نہ چاہو ۔ جب بلائیں فوراً چلے آؤ اور جب دھتکار دیں تو چلتے بنو ۔ کیونکہ اس آیت کریمہ کے بموجب، وہ جو کچھ کرتا ہے اس سے کوئی باز پرس نہیں کر سکتا اور اوروں سے باز پرس کی جا سکتی ہے ۔ الغرض ہست تو فقط وہی ہے اور ممکنات کے لیے تو سوائے حکم بجا لانے کے اور کوئی تصور ہی نہیں ہو سکتا ۔ اگر تم اپنی ماہیت سے باخبر ہو تو چاہیے کہ اپنی طرف سے کچھ نہ چاہو ۔ اس کی رضا پر راضی رہو، کیونکہ اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے کرتا ہے، اسی کے ارادے کو مضبوطی اور استحکام ہے ۔ یہ حقائق ممکنہ جو اپنی ذات کے لحاظ سے عدمات ہی ہیں ۔ ان میں اتنی اہلیت ہی نہیں کہ وہ حضرت واجب الوجود

کے کاموں کی باز پرس کر سکیں۔ بلکہ وہ ان حقائق ممکنہ سے باز پرس کرتا ہے۔ یعنی ان حقائق ممکنہ کے تقاضوں اور ان کی استعدادوں کی استدعا کے مطابق اس تمام موجوداتِ عالم کو وجود میں لاتا ہے۔

رباعی:

که در طلب کمال علم و هنریم
گاهی زره بیهدگی در بدریم
داریم هجوم بر لبِ بحرِ خیال
هستی پل بسته هست و ما میگذریم

ترجمہ رباعی: ہم کبھی علم و ہنر کے کمال کی طلب کرتے ہیں اور کبھی بیہودگی کی راہ سے دربدر ٹھوکریں کھاتے پھرتے ہیں۔ بحرِ خیال کے ساحل پہ اک ہجوم ہے، اسی ہستیٔ واحد نے اس پہ پُل باندھ رکھا ہے اور ہم اس پہ سے گزر رہے ہیں۔ (مصنف خود اس کی تشریح میں لکھتا ہے کہ) ہم موہوم ممکنات اگر کمال و ہنر کی جستجو میں ہیں تو ہم یونہی بے کار زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ہم نے بحرِ خیال کے ساحل پہ یعنی اس عالم توہمات میں ہجوم برپا کر کھا ہے، اور اس راہ کو ہم حضرت واجب الوجود کی شمولیت سے طے کر رہے ہیں۔ دیکھئے یہ آیت کریمہ کہ اللہ تعالیٰ ہر وقت کسی نہ کسی کام میں رہتا ہے۔

هوالنّاصح

شروع اللہ کے نام سے جو نہایت مہربان اور بہت رحم والا ہے

ہر قسم کی تعریف اللہ کے لیے ہے جو پہنچنے والا ہے اپنے معاملے کو اپنے کلمات سے، جاننے والا ہے مخلوقات کے حقائق کے راز کو اور درود و سلام ہو اس کے رسول ؐ پر جس نے پہنچائے اس کے پیغامات اور آپ ؐ کی آل رضؓ اور اصحاب رضؓ پر، جو اس کی صفات سے متصف ہیں۔ اما بعد پس یہ تینتالیسواں[۴۳] باب ہے جو القول البلیغ سے موسوم ہے۔ بلیغ کے معنی ہیں فصیح۔ اور نہیں موسوم کیا گیا یہ باب اس نام سے فصاحت کی خاصیت کے اعتبار سے بالخصوص دوسرے پر واردات کے معاملے میں، بلکہ موسوم کیا گیا ہے باعتبار کلام کے پہنچانے حقیقت ممکنہ کے اصل تک وہ عدم ذاتی ہے، اور اُس عدم کے ساتھ سبقت لے جاتا اور اُس کے وجود کے بعد اس کا ملیامیٹ ہونا اور لوگوں کو متنبہ کرنا اُن کا فنا دکھا کر اور ان کو نصیحت کرنا موت کے تذکرے کے ساتھ۔ جیسے کہ اللہ نے حکم دیا" اور اُنھیں نصیحت کر اور انھیں کہو ان کے نفسوں کے بارے میں بلیغ قول۔ بے شک اللہ اپنے معاملے کو پہچاننے والا ہے۔ نہیں ہے کوئی معبود سوائے اس کے اور نہ کوئی حاکم سوائے اس کے۔

دوؔ عدموں کے درمیان وجود کے معانی کے بیان کا باب

دو عدموں کے درمیان وجود ایسے ہے، جیسے حیض کے دو خونوں کے درمیان آنے والی طہارت۔

یہ قول شہرِ علم کے دروازے حضرت علیؓ سے منسوب کرتے ہیں اور اس قول کا ماحصل اس اعتباری وجود کا اضافی عدم اور صوری فنا ہے اور انسانی پیکر۔ یعنی ہر شخص کی صورت تغیر و تبدل پذیر ہے، نہ یہ کہ اس کا مطلب نفس ناطقہ کی بقا سے انکار یا فنا کے اقرار سے ہے۔ کیونکہ یہ باطل عقیدہ تو کافروں، ملحدوں اور ان کم عقلوں کا ہے جن کی بنیاد ہی گمراہی پر ہے۔ انسانی روح تو مرنے کے بعد بھی فنا نہیں ہوتی۔ موت کے بعد پھر سے اُٹھنا برحق، عالم برزخ کا عذاب و ثواب بھی اک امر واقعی ہے اور قیامت کے دن جسموں کا جمع ہونا بھی تحقیق شدہ امر ہے۔ جس کی خبر شرع میں بھی آئی ہے۔ اور جس کے متعلق ہم نے اس مقدمہ اور عالمِ مثال کے بیان کی شرح والے وارد الموسوم مفاتح الغیب میں بھی مفصل لکھا ہے۔ لیکن اس موہوم صورت کا اچانک فنا اور اُس حاصل شدہ کیفیت کا نیست و نابود ہونا بھی عیاں ہے اور پھر بھی سابقہ عدم لاحق ہو جائے گا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہم مدتوں تک اس عالم میں نہ تھے اور ہمارے بغیر بھی اس عالم اور اہلِ عالم کا کاروبار یونہی جاری تھا۔ کسی کو ہماری ہستی کا وہم و گمان بھی نہ تھا کچھ عرصے بعد ہم پھر اس عالم میں نہیں ہوں گے اور کوئی ہمیں یاد بھی نہیں کرے گا اور زمانہ اسی ڈھنگ سے گزرتا رہے گا، اور اہل خانہ جیسے ہیں ویسے ہی گزر بسر کرتے رہیں گے۔ اور جب تک حق تعالیٰ کا ارادہ ہوگا وہ اس کائنات کے عظیم نظام کو قائم رکھے گا۔ قیامتِ کبریٰ کے وقوع پذیر ہونے کی مدّت کا تعین کرنا اک حماقت ہے، اگرچہ اس کا برپا ہونا بلاشبہ مسلم الثبوت ہے جیسا کہ اس آیت کریمہ سے ظاہر ہے کہ یہ (منکر) لوگ آپ سے قیامت کے متعلق پوچھتے ہیں۔ آپ فرما دیجیے کہ اس کی خبر تو بس اللہ ہی کے پاس ہے۔ ہر شخص کی اپنی موت اس کے لیے قیامتِ صغریٰ ہے۔ کیونکہ یہ مدتوں بعد سب کی موت پہ آنے والی قیامتِ کبریٰ سے کم ہے۔ قیامت فی الفور گزر جائے گی اور پلک جھپکنے میں آنکھ پھر کھُلے گی۔ دیکھیے یہ آیت کریمہ کہ پھر صور پھونکا جائے گا، سو وہ سب یکایک قبروں سے نکل نکل کر اپنے رب کی طرف جلدی جلدی چلنے لگیں گے۔ کہیں گے اے ہاں ہماری کم بختی، ہم کو ہماری قبروں سے کس نے اُٹھایا۔ یہ وہی قیامت ہے جس کا رحمان نے وعدہ کیا تھا اور پیغمبرؑ سچ کہتے تھے۔ پس وہ ایک روز کی آواز ہوگی، جس سے یکایک سب جمع ہو کر ہمارے پاس حاضر کر دیے جائیں گے۔ یعنی وہ صور لوگوں کی موت کے بعد پھونکا جائے گا، جس کی آواز سے وہ سب قبروں سے نکل کر اپنے رب کی طرف بھاگیں گے، اور کہیں گے ہائے ہمارا بُرا ہو، کس نے ہمیں اُٹھایا ہماری قبروں سے، یہ ہے وہ بات

جس کا وعدہ کیا تھا رحمن نے، اور سچ کہا تھا رسولوں نے۔ پس اچانک ایک زور کی چیخ و پکار ہوگی۔ پس وہ سب کے سب ہمارے پاس حاضر کیے جاویں گے، یعنی پھونکا جائے گا صور انسان کی موت کے بعد، پس وہ اپنی قبروں سے اپنے رب کی طرف دوڑیں گے، پس جب وہ اُٹھائے جائیں گے اس حالت میں جس میں زمانے کا طول اور قصر برابر ہیں۔ پس وہ کہیں گے زمانے کے طول اور قصر میں امتیاز رکھتے ہوئے اور حصولِ سکونت کی وجہ سے اس مکان کی برکت کے ساتھ، ہمارا بُرا ہو، کس نے اُٹھایا ہے ہمیں آرامگاہوں سے۔ پس اللہ خبیر نے الہام کیا ان کے دلوں میں، یہ ہے وہ بات جس کا وعدہ کیا تھا اللہ نے، اور رسولوںؑ نے سچ کہا تھا اور یہ پھونکنا موت سے قیامت کی طرف ہے۔ پس ہوگی ایک زور کی چیخ و پکار، اور وہ سب کے سب اللہ کے ہاں حاضر کر دیے جائیں گے۔ پس اس دن نہیں ظلم کیا جائے گا نفوسِ انسانیہ میں سے کسی نفس پر کچھ بھی ظلم۔ اور تمھیں جزا بھی دی جائے گی مگر جو تم کرتے ہو۔ قصہ کوتاہ یہ کہ قیامت کی خبریں جو آیات و احادیثؐ میں آئی ہیں، بالکل یقینی اور مسلم الثبوت ہیں۔ اس جہان سے کوچ کر جانا بھی تحقیق شدہ بات ہے، اور اور آخرت کے عذاب و ثواب کا معاملہ درپیش ہوگا۔ ہستیٔ موہوم تو محض اپنا گمان و تصور ہی ہے اور یہ مانگا تانگا وجود اک قرض کی مانند ہے جسے آخر ادا کرنا ہی پڑے گا اور خدا نے چاہا تو یکسانیت و اجنبیت کے امتیاز کا بوجھ بھی جو ہماری اس دنیوی ہستی سے لاحق ہے سر سے اُتار پھینکنا ہی ہوگا۔

رباعی:

ہستی کہ وبال گردن آمد چوں دین
ہنگامۂ وہم تست کو غیر و چہ عین
ای پیش و پس تو، ہیچ چشمی بکشا
گر واقعی از وجود بین العدمین

ترجمہ رباعی: یہ ہستی جو قرض کی طرح تیری گردن کا وبال بن گئی ہے۔ یہ سارے ہنگامے تمھارے ذہن کی پیداوار ہیں۔ ذرا آنکھ کھول کے دیکھ۔ اگر تو دو عدموں کے درمیان اس وجود کی حقیقت کو سمجھے تو تیرا آگا پیچھا دونوں کچھ بھی نہیں۔ (مصنف کی اپنی وضاحت کے مطابق) یہ ہستی جو اُس ہستیٔ مطلق جل جلالہٗ سے مستعار لی گئی ہے یہ اعتباری ہستی تو اک قرض ہے، جسے واپس لوٹا کر اس کی ادائیگی سے بری الذمہ ہونا چاہیے۔ لہذا اس اعتباری ہستی کے یہ سارے ہنگامے صرف تیرا وہم ہے۔ کہاں ہے عینیت (یکسانیت) اور غیریت یعنی (اجنبیت)

کس سے ؟ کیونکہ عینیت کے دعوے کے لیے بھی تو غیریت چاہیے اور غیریت کو پھر یقیناً وجود میں شرکت چاہیے۔ کیونکہ مغائرت والے وجودوں میں وجود کا ہونا ظاہر ہے اور مغائرت کے لحاظ سے موافقت بھی ظاہر، اور وہ ذاتِ سبحانہٗ نہ کسی کی عین ہے نہ کسی کی غیر۔ اور یہ اضافات مسلوبہ ہیں ، یعنی حاصل کیے گئے ہیں آپ کی جانب سے اس کے ساتھ ہر قسم کے اعتبارات اسی کی طرف منسوب ہیں۔ عینیت وغیریت کی یہ قید حقیقت سے کما حقہٗ آگاہ نہ ہونے کی وجہ سے ہے۔ جس نے اللہ کو پہچان لیا اس کی زبان گنگ ہوگئی۔ یعنی طہارت کے ایام میں خلل کے وہ دن بھی ایامِ حیض ہی میں شمار ہوتے ہیں۔ یہ ہستیٔ موہوم جو نیستی کے لیے بھی ننگ و عار ہے اسی مرتبۂ عدم میں داخل سمجھو۔ اس اعتباری وجود کو جو دو عدموں کے درمیان واقع ہے خلل یافتہ طہارت سے اس لیے منسوب کیا گیا ہے کہ طُہر متخلل اُسے کہتے ہیں کہ حائض عورت کو کبھی یوں بھی پیش آجاتا ہے کہ حیض کے دنوں میں ایک دو دن حیض نہیں آتا۔ وہ پاک ہوجاتی ہے مگر پھر خون آنے لگ جاتا ہے تو مسئلہ کی رُو سے حکم یہ ہے کہ اس بے اعتبار طہارت کو بھی ایامِ حیض ہی میں داخل سمجھا جائے۔ اسی طرح اے موہوم شخص اپنے آگے پیچھے نظر دوڑا، یعنی ماضی و مستقبل کو دیکھ کہ مدتوں تک تو نہ تھا، کچھ عرصہ بعد تو پھر نہ ہوگا۔ لہٰذا اگر تو دو عدموں کے درمیان وجود سے واقف ہے اور اس اعتباری وجود اور اعتباری عدم کی حقیقت کو کما حقہٗ سمجھتا ہے تو بھی اپنے آپ کو "ہست" نہ سمجھ اور خود کو درمیان میں نہ جان۔ حیف صد حیف کہ اس تمام بے ثباتی کے باوجود تو فرعونیت اور نمرودیت کے دعوے کرتا ہے یعنی باوجودیکہ دُنیا اور اہلِ دُنیا کی بے ثباتی اور بے اعتباری روشن و ظاہر ہے اور سبھی پہ ثابت بھی ہے، لیکن پھر بھی بہت سے لوگ غرور و تکبر میں مبتلا اور دُنیاوی محبت میں گرفتار ہیں ۔

رباعی :

ہر صبح چو صبح سینہ شق باید کرد
ہر شام جگر خون چو شفق باید کرد
بر ہستی بے ثبات مثل شبنم
سر تا قدم از شرم عرق باید کرد

ترجمہ رباعی : ہر صبح کو صبح ہی کی طرح اپنا سینہ شق کرنا چاہیے (جیسے کہ علی الصبح پو پھٹتی ہے) ہر شام کو شام میں پھولنے والی شفق کی طرح اپنا جگر خون آلود کرلینا چاہیے۔ اپنی اس بے ثبات ہستی پہ مارے

شرم کے شبنم کی مانند سر سے لے کر پاؤں تک عرق آلود ہو جانا چاہیے۔ (مصنف خود تلمیحات و استعارات کی کڑیاں یوں کھولتا ہے کہ) ہر صبح طلوعِ آفتاب پہ روشنی میں جب اپنے وجود کو بھی موجود سمجھو تو پھر چاہیے کہ تم صبح ہی طرح اپنا سینہ چاک کر ڈالو، یعنی اپنے اعتباری تعین کا پردہ پھاڑ ڈالو۔ خود کو عرفانی نگاہ میں نیست و نابود کر دو، اور موجود اسی ظہورِ آفتاب کو سمجھو اور ہر شام کو جب عدمیہ تاریکیوں کے سائے بڑھنے لگیں۔ ظاہری تشخص پر اعتباری عدم چھانے لگے تو تمہیں چاہیے کہ اپنے جگر کو شفق کی سُرخی اور لالی کی طرح ہستیِ مطلق کے شوق میں خون آلود کر لو۔ اور اس حالت میں خود کو اُس آفتابِ وجود کے نور سے محروم نہ سمجھو، کیونکہ اعتباری عدم بھی وجود بشرط لاشئ ہی کی ایک قسم ہے۔ اور عدم محض جو اندھیری رات کی طرح محض تاریکی و ظلمت ہی ہے، وہ عدم ہی ہے۔ لہٰذا اِس ناپائیدار ہستی پر جو کبھی اعتباری ہستی کے شکنجے میں جکڑی ہے، اور کبھی اعتباری نیستی کے جال میں پھنسی ہوئی ہوتی ہے سر تا پا یعنی ابتدا سے لے کر انتہا تک اپنے آپ کو شبنم کی مانند شرم و ندامت کے پسینے میں شرابور کر کے بالکل نیست و نابود بنا دو۔ اس رباعی کے محاسنِ شعری سخن فہم حضرات کی نظر سے پوشیدہ نہ رہیں گے۔

هوالناصر

شروع اللہ کے نام سے جو نہایت مہربان اور بہت رحم والا ہے

ہر قسم کی تعریف اللہ کے لیے ہے جو ہمارے ساتھ ہے جہاں کہیں ہم ہوتے ہیں۔ اور ہدایت دی ہمیں اس بات کی اور ہم نہیں تھے ہدایت پانے والے، اگر نہ ہمیں ہدایت دیتا اللہ۔ درود وسلام ہو اس کے رسول محمد صلعم ہمارے آقا اور مولیٰ پر اور آپؐ کی آلؓ اور آپؐ کے اصحابؓ پر، جنھوں نے چاہا اللہ کا فضل اور اس کی رضا۔ امابعد پس یہ چوالیسواں ۴۴ باب ہے جو موسوم ہے معیت اللہ (رفاقتِ حق) سے اور معیت کی قسمیں ہیں۔ ایک معیت صوریہ، اور یہ باہم قریب ہوتا ہے جیسے کہ واقع ہوتا ہے دو جسموں کے درمیان مکان کے اعتبار سے، یا تقرب جیسے عقل اور جسم میں ہوتا ہے تاثر اور تاثیر کے ساتھ۔ یا اقتران (اکٹھے ہونا) جیسے نفس اور بدن میں ہوتا ہے تدبیر اور تصرف کے ساتھ۔ اور دوسری معیتِ معنویہ جیسی کہ واجب اور ممکن میں ہے عموماً امکان کا ہونا افتقار (محتاجی) کی علت کے طور پر ممکن ہے واجب کی طرف۔ اور معیت اضافیہ، یا بالخصوص جیسے خالق و مخلوق میں ہے بلحاظ حدوث کا ہونا افتقار کی علت کے طور پر حادث سے قدیم کی طرف، اور معیتِ حقیقہ جیسے کہ اللہ کی ذات میں ہے اور اس کی صفات میں ہے، صفات کے امتیاز کی نسبت کے ساتھ، ذات سے ہٹ کر، اور معیتِ اعتباریہ جیسے طلوعِ شمس اور وجود نہار میں ہے، اور معیتِ علمیہ جیسے عالم کی معیت معلوم کے ساتھ، اور معیتِ ملازمہ جیسے ہیولیٰ کی معیت صورت کے ساتھ اور معیتِ عارضیہ۔ جیسے

اعراض کی معیت اس کے موضوعات کے ساتھ۔ اور معیت لازمیہ جیسے ماہیت اور اس کے لوازم میں ہوتی ہے اس طرح کہ اس میں عدم خلو اور انفکاک نہیں ہوتا اپنے ذاتی لوازم اور معیت اور ہیت سے، جیسے کہ حاصل ہوتے ہیں انبیاؑ کو اور اولیائے کرام کو اللہ کے اُن کو چن لینے کے ساتھ۔ ایک معیت کسبیہ جیسے کہ حاصل ہوتی ہے سالکوں اور طالبوں کو اشغال اور اذکار پر مداومت سے عامل ہونے سے اور مراقبات کی کثرت سے۔ معیتِ وصفیہ جیسے کہ حاصل ہوتی ہے پاکبازوں اور صالحین کو اللہ کے اخلاق کو اپنانے اور نیکیوں کے سرانجام دینے سے، اور برائیوں سے بچنے سے اور ریاضت کے حصول سے۔

خودی اور دوئی کی لزومیت کا بیان

انانیت سے مراد اپنی خودی کا علم اور اپنی ہستی کا شعور ہے، اور اشنیت سے مُراد دوئی اور مغائرت (اجنبیت) ہے۔ خودی کے علم کے لیے دوئی لازمی ہے، خواہ وہ دوئی اعتباری ہو خواہ حقیقی، کیونکہ ہستی کا یہ علم مرتبۂ ثانیہ ہے، جو دوئی کا مبدا و منبع ہے۔ اور وہ ذاتِ مطلق جو عین الوجود بھی ہے، عین العلم، عین السمع اور عین البصر بھی ہے، اس کا مرتبہ اس مرتبۂ ثانیہ یعنی ہستی کے علم سے بہت بلند و بالا ہے۔ اس خالص وحدت کے مرتبہ میں کئی وجوہ سے دُوئی کی گنجائش ہی نہیں۔ وہی ذات الوجود ذات العلم بھی ہے۔ اور یہ مرتبۂ ثانیہ جو دوئی کا منبع ہے فی الحقیقت علم کا علم ہے جو ہستی کے علم کی شکل میں معلوم ہوتا ہے، اور یہ مرتبہ مفت کے مرتبوں میں داخل ہے اور متقدمین نے دوئی کے اسی مبدا کو وحدت سے تعبیر کیا ہے۔ اور کثرت کا منبع کیا ہے۔ اور اس سے پیدا ہونے والی مغائرت کا نام کثرت رکھا۔ اور اُسے اسی اختصار کی تفصیل قرار دیا ہے۔ وہ کثرت کو موہوم سمجھتے ہیں اور وحدت کو موجود۔ بالکل چکر لگانے والے شعلے کی طرح جو گھومتے وقت دائرے کی شکل میں نظر آتا ہے، مگر موجود فقط وہی شعلہ ہوتا ہے جو تیزی سے گھومنے کے باعث دائرے کی طرح گول دکھائی دیتا ہے۔ یہی حال وجود واحد کا ہے جو کثرت کے مختلف مراتب میں نمودار ہوا۔ چونکہ وحدت اور کثرت میں باہمی رفاقت ہے، لہذا کثرت میں وحدت ہے اور وحدت میں کثرت۔ وحدت، کثرت کے وجود کی علت ہے اور کثرت کی علت، وحدت کا ظہور ہے۔ لہذا انانیت جو وحدت ہے اور دوئی

جو کثرت ہے ان دونوں کا باہمی ساتھ ثابت ہو گیا۔ رباعی:

فرمودہ چنیں حضرت حیّ قیّوم
در گوش دلم کہ اے طلسم موہوم
ہشدار کہ در عالم کثرت ہرگز
تا من ہستم تو ہم نگردی معدوم

ترجمہ رباعی: خدائے حیّ وقیّوم نے میرے دل کے کانوں میں یوں فرمایا، یعنی قلب پہ القا کیا کہ اے موہوم طلسم خبردار، اس عالم کثرت میں جب تک میں ہوں تو بھی معدوم نہ ہوگا یعنی رہے گا (مصنف استعارات کی وضاحت خود یوں کرتا ہے) حق جل جلالہٗ کے فرمانے سے مراد علم وعرفان کا القا ہے۔ گوشِ دل سے مراد قوت ادراک اور حاصل مطلب یہ ہے کہ خدا نے مجھ پہ یہ حقیقت منکشف فرمائی کہ چونکہ حق تعالیٰ کا علم قدیم و لازوال ہے اور اُس کی معلومات بھی لازوال ہیں جو اس کے علم سے کبھی زائل نہیں ہوتیں، وگرنہ اس بارگاہ عالی میں جہل لازم آئے گا۔ سو جب تک وُہ، وُہ ہے۔ ہم بھی اس کی بدولت "ہم" ہیں۔ اور اب ہم جو اپنے آپ کو خارجی موجودات سمجھتے ہیں یعنی تشخص سمیت ایک کلی ماہیت جانتے ہیں۔ یہ حقیقت سے ناواقفیت کی وجہ سے ہے۔ ورنہ ماہیت اور تشخص دونوں اس آفتاب وجود کی نورانی شعاعوں میں گم ہیں، جیسا کہ اس آیت کریمہ میں ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر شے پہ محیط ہے۔ لہذا اگر ہم نہیں ہیں تو اس وقت بھی نہیں ہیں، اور اگر ہیں تو پھر ہمہ وقت ہیں۔ یہ بزمِ کثرت جو شمع امتیاز سے روشن ہے، یہ من و تو کے اعتبار سے ممتاز ہے۔ لہذا لفظ (من) میں متکلم کے لحاظ سے لفظ تو (مخاطب) بھی لازم ہے۔ اشیا اپنی اضداد ہی سے پہچانی جاتی ہیں، یعنی کثرت کی یہ محفل خود علم ہی سے روشن اور ظاہر ہے۔ اور من و تو کے اعتبارات کے لحاظ سے یہ ساری اعتباری کثرت پیدا ہوتی ہے۔ ان تمام مراتب کی تجلی گاہ علم ہی تو ہے۔ لہذا جب تم خود کو لفظ (من) یعنی میں سے تعبیر کرتے ہو، تو پھر اس کے بالمقابل بے اختیار دوسرے کو جو سامنے ہے لفظ "تو" سے اور جو غائب ہے (یعنی موجود نہیں ہے) تو اسے لفظِ اُو "(وہ) سے تعبیر کرتے ہو۔ کیونکہ ہر شے اپنی ضد ہی سے پہچانی جاتی ہے۔ لہذا ثابت یہ ہوا کہ من (میں) کے تصوّر کے ساتھ (تو) اور (اُو) کا تصوّر بھی ہوتا ہے۔ اور درحقیقت علم بذات خود ماسوٰی کے علم کا متضمن بھی ہوتا ہے۔ ہر چند کہ علم حضوری

کے مرتبے میں جو صرف اپنے ہی نفس کا علم ہے، اس معنیٰ کا امتیاز ظاہر نہیں ہوتا، لیکن ذات العلم میں یہ معانی مختصراً شامل ہوتے ہیں۔ اور یہ علم حضوری ہی ہے جو علم حصولی کے مرتبے میں تفصیل پیدا کرتا ہے۔ بلکہ وہی ایک علم ہے جس نے ہر مرتبے میں ایک علٰحدہ نام پالیا اور اُس کا نام علم حضوری، علم حصولی، علم اجمالی اور علم تفصیلی ہوگیا۔ لہٰذا، جس طرح ذات العلم میں یہ تمام علمی مراتب شامل ہیں، اسی طرح علم سے متعلق معلومات کے مراتب بھی ہیں اور عالم و معلوم کی حیثیات بھی۔ واہ سبحان اللہ۔ کیا شانِ خداوندی ہے۔ اس کا اپنے متعلق علم اور اس کا ہمارے متعلق علم دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ پیدا کرنے والے کے تصور کے ساتھ ساتھ پیدا کیے جانے والے کا تصور بھی آتا ہے۔ رزق دینے والے رزّاق کے ساتھ رزق لینے والے کا تصوّر بھی آتا ہے۔ اسی سے قیاس کرلو کہ دوسری اضافی صفات میں بھی مضاف و مضاف الیہ کا باہمی تصوّر ہوگا۔ چونکہ پدری و فرزندی اور پرورش و پروردگار کے تصوّر کو ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا، اس آیت کریمہ کے بموجب تم بھی حق تعالیٰ کا ذکر کیا کرو جس طرح تم اپنے آباو اجداد کا ذکر کیا کرتے ہو، بلکہ یہ ذکر اس سے بدرجہا بڑھ کر ہو۔ پرورش پانے والوں کو اپنے پروردگار کا خاص وسیلہ ہوتا ہے، اور خالق کی اپنی مخلوق پہ عام عنایت ہوتی ہے۔ جیساکہ قرآن شریف میں آیا ہے کہ تم جہاں کہیں بھی ہو وہ تمھارے ساتھ ہوتا ہے۔ اُس مقام پہ اس آیت کریمہ کے لانے کا مقصد صرف حق تعالیٰ کا اپنے بندوں سے مستقل ساتھ کا اظہار کرتا ہے، بغیر اس قید کے کہ آیا وہ اس کے ساتھ ہیں یا وہ ان کے ساتھ ہے اور یہ بات اس وہم کو دُور کرنے کے لیے کہی گئی ہے کہ اگر کوئی یہ اعتراض کرے کہ متن کی عبارت تو خالق اور مخلوق کے تصور کی لزومیت پہ دلالت کرتی ہے اور مذکورہ بالا آیت اللہ تعالیٰ کی اپنے بندوں کے ساتھ (رفاقت) کی خبر دیتی ہے۔ آہ میں کیا کہوں اور کیا لکھوں، کیونکہ بندوں سے اللہ کی معیت کے بیان سے زبان قاصر ہے۔ پس وہ ہمارے ساتھ ہوتا ہے جہاں کہیں بھی ہم ہوتے ہیں ظاہراً اور باطناً۔ بے شک ہم اس کے ساتھ ہیں اس کے علم میں جہاں کہیں بھی وہ وارد ہوتا ہے۔ پچھلے باب میں جو عدمیت پر دلالت کرتا تھا وہ اس دنیوی ہستی کے اعتبار سے تھی نہ کہ نفس ناطقہ کی بقا کے انکار پہ جیساکہ ملحدوں اور مشرکوں کا عقیدہ ہے۔ اللہ ایسے بُرے عقائد سے بچائے۔ یعنی اس سے پہلے والے باب میں دو عدموں کے درمیان وجود کے معانی پر جو ہستی موہوم کے عدم ہونے پر دلالت کی گئی تھی، وہ ممکنات ذاتی عدمیت اور اس ناپائیدار دُنیا کے فانی ہونے کے اعتبار سے تھی۔ نہ یہ کہ دائرہ امکان سے واجب الوجود کے

فیوض کو سلب کر لینے پر یا انسان کے نفس ناطقہ کی بقا کے انکار کی رو سے نہیں۔ کیونکہ یہ بات تو عقل و نقل دونوں کے خلاف ہے۔ کیونکہ یہ تو بے دین، بدمذہبوں کا عقیدہ اور بدشعار ملحدوں کا گمان ہے۔ خدا ایسی گمراہیوں سے دُور رکھے اور جاہل عقیدوں سے بچائے۔ رباعی:

ما صاف دلان نہ ہاؤ ہوئے داریم

نی بحث بکس نہ گفتگوئے داریم

جز جلوہ او ز ما نباید طلبید

ما آئینہ ایم عکس روئے داریم

ترجمہ رباعی: ہم صاف دل لوگ ہیں، نہ ہی ہاؤ ہُو مچاتے ہیں نہ ہی کسی سے بحث مباحثہ یا تکرار کرتے ہیں۔ ہم سے اس کے سوا اور کچھ طلب نہ کیجیے، ہم تو ایک آئینہ ہیں، جو دیکھنے والے کا عکس ہی اُسے دکھا دیتے ہیں۔ (مصنف کی اپنی وضاحت یُوں ہے) صاف دلوں سے مراد اہلِ حقیقت کی جماعت ہے۔ جنھوں نے اپنے آبگینۂ دل سے شکوک و شبہات کے زنگ کو اللہ تعالیٰ کے فیضِ عام کے صیقل سے رگڑ کر صاف و شفاف کر رکھا ہے۔ ہاؤ ہُو سے مُراد ہے کہ ہم اپنی انانیت کا دعویٰ اور اپنی خودی کا شور نہیں مچاتے، اور اہلِ ظاہر سے مراد وہ جو حقیقت کے سمجھنے سے معذور ہیں۔ ہم لوگ بحث مباحثہ یا تکرار و مناظرہ نہیں کرتے۔ کیونکہ اہلِ مشاہدہ کی نگاہوں میں سوائے ظہورِ دوست کے اور کچھ آتا اور سماتا ہی نہیں۔ لہذا اگر اصحابِ ظاہر بھی اسی تزکیۂ نفس اور صفائیٔ قلب سے کام لیں اور خودی کے پردے کو درمیان سے اُٹھا دیں تو ہمارے اندر جلوۂ حقیقت کے سوا اور کچھ نظر نہ آئے گا۔ کیونکہ ہم سراسر اسی کی حقیقت کے مظہر ہیں، اور آئینے کی مانند اس کے حسن کی تجلی گاہ ہیں۔

هوالناصر

شروع اللہ کے نام سے جو نہایت مہربان اور بہت رحم والا ہے

سب تعریف اللہ کے واسطے ہے، جس نے احادیث اور آیات کی تاویل سکھائی اور منکشف کیے مجھ پر ذات اور صفات کے اسرار، اور درود وسلام ہو اس کے رسولؐ پر جو کمالات کے خاتم ہیں اور اشرف المخلوقات ہیں، اور آپؐ کی آلؓ اور اصحابؓ پر جو حسنات کے مجموعے اور بھلائیوں کے سرچشمے ہیں۔ امابعد یہ پینتالیسواں ۴۵ باب ہے، جو تاویل احادیث سے موسوم ہے۔ اے میرے رب تو نے عطا کیا ہے مجھے ملک اور سکھایا ہے مجھے احادیث کی تاویل کرنا۔ پس میرے حق میں ملک بدن اور حواس ہیں اور میں ان کا بادشاہ اور مدبر ہوں، اور میں تصرف کرنے والا ہوں۔ اور مجھے دیا میرے رب نے یہ ملک تاکہ میں حاصل کروں اس کے ذریعے ملک آخرت کی سلطنت اور دارالبقا کو۔ اور ہو جاؤں اضافی بادشاہ ہمیشہ رہنے والا، قادرِ مطلق حقیقی بادشاہ کے پاس۔ اور میری مملکت میرے رب کی ملکیت ہے، جس کا میں خلیفہ ہوں۔ اور میری رعایا بالعموم تمام مخلوق ہے اپنے منیب کی پیروی کرنے کے ضمن میں، وہ منیب صلی اللہ علیہ وسلم جو بھیجے گئے تمام لوگوں کی طرف پس جو کوئی ہمارا اصحاب، ہمارا آقا ہے، وہ اس کا مولی ہے۔ پس ہم اس کی اولاد البتہ اس کے موالی ہیں۔ اور نہیں ہے ہمارے اوپر جن وانس میں سے کسی کو غلبہ۔ اور ہم میں سے ہر ایک امیر ابنِ امیر ابن امیر ہے۔ ہمارے دادا امیر المومنین علیؓ تک (محمدؐ صلعم اور ان پر سلامتی ہو) اور خاص طور پر جو ہمارے زمانے میں حاضر ہیں۔ خاص طور پر وہ مقرب،

میطیع اور جو خدمت میں موجود ہیں ۔ حاضرین و غائبین ، اگلے لوگ اور پچھلے لوگ اولادیں سے ، دوستوں میں سے اور تبع تابعین میں سے ، درجات ، مراتب ، خدمات ، مناصب ، خصوصیات ، تعلقات اور مناسبات اور سبقت میں تفاوت کی نسبت سے ۔ پس ہر قسم کی تعریف تیرے لیے ہے ۔ اے میرے رب تو نے بنایا میرے لیے ان پر غلبہ ، اور مجھے بھیجا ان کے لیے حجت اور برہان بنا کر ، اور دی مجھے تعلیم اور مجھ سے تو نے کلام کیا اور کھول دیا میرے لیے میرے سینے کو اور آسان کر دیا میرے لیے میرا معاملہ اور میری زبان کی گرہ کھول دی ۔ لوگ میری بات سمجھتے ہیں اور بنایا تو نے مجھے محمدیوں کے حق میں امیر اور بنایا میرے لیے میرے گھر میں سے ، میرے بھائی محمدؐ میر کو وزیر اور اس سے تو نے میرا ہاتھ مضبوط کیا اور اسے شریک کیا میرے کام میں تاکہ میں تیری کثیر تسبیح کروں اور تیرا کثیر ذکر کروں ، اور تو ہمیں دیکھنے والا ہے ۔ میرے رب ۔ بخش دے مجھے اور میرے بھائی کو اور داخل کر ہمیں اپنی رحمت میں اور تو سب سے بڑا رحم کرنے والا ہے ۔ اور میں نے توجہ کی مخلوق کو تیری جانب دعوت دینے کی طرف ، تیرے حکم کے مطابق تیرے اوپر توکل کرتے ہوئے ، کہ تو اور تیرا بھائی جا میری آیات کے ساتھ اور کوتاہی نہ کرنا میرے ذکر میں اور میں بنادوں گا تمھارے لیے غلبہ ، پس وہ تمھارے پاس نہیں پہنچ پائیں گے ۔ میری آیتوں میں سے تم دونوں اور تمھارے پیروکار غالب آجائیں گے ۔ پس اے میرے بھائی تو میرے لیے اس مقام پر ہے ، جس میں ہارونؑ ہے موسیٰؑ کے لیے بغیر تشبیہ کے ۔ اور یہ محمدیوں کے امیر کی عنایت اور ان کے فضل پہنچانے سے ہے ۔ (درود ہو اللہ کا محمدؐ اور ان کی آل پر) ان (حضورؐ) کے فیض عام کی وجہ ، اور مجھے عطا کی میرے رب نے قوتِ فہم کلام کے راز کی اور اس کے اشکال کے نتیجے کی اور ان کے مرادی معنوں کی اور ان کے استعاروں کی ، اور عطا کی مجھے معانی کے استخراج کی قوت ایک ہی کلام سے کثیر مطالب کی ، مختلف حیثیات کے مطابق ، متعدد قواعد کی روشنی میں ، نحو ، منطق ، معانی ، بیان اور بدیع میں سے ، اور عطا کی مجھے توفیق کی قوت ، حکمت کلام ، تصوف اور تطبیق دنیا ، حالات اور مقاماتِ باطنیہ کے درمیان اور عبادات اور ظاہری اطاعات اور حقیقت ، شریعت ، طریقت اور معرفت کو جمع کرنے کی ، اور سکھائی میرے رب نے مجھے عموماً تمام احادیث کی تاویل مطلقاً اور خاص طور پر احادیثِ مصطفویہؐ کی تاویل بھی ۔ (ان احادیث کے کہنے والے پر درود و سلام) اور تاویل آیاتِ قرآنیہ اس کے اپنے احسان اور کرم سے ، بلند ہے اس کی شان ، عام ہے اس کا احسان ۔

بڑی جلیل ہے اس کی برہان، اور اُس کا غلبہ بڑا مضبوط ہے ۔

بعض احادیثؐ اور آیات کے نکات و رموز کے بیان کا باب

اس باب میں ان احادیث شریف کہ مومن کا دل خدائے رحمان کی دو انگلیوں کے درمیان ہوتا ہے، اور یہ کہ اللہ تعالیٰ نے آدمؑ کو اپنی صورت پہ پیدا کیا ۔ اور اس آیت کریمہ کہ کئی چہرے اس روز بارونق ہوں گے اور اپنے رب کی طرف دیکھ رہے ہوں گے، کی باریکیوں، خوبیوں اور بعض دوسری آیات اور احادیثؐ سے اقتباس کر کے بعض دیگر کلمات کا ایک مختصر مگر جامع انداز میں بیان ہے، جیسے کہ آگے آرہا ہے۔ ہر لفظ کے معانی کی جزئیات کی تفصیل سہ گانہ دلالت، یعنی مطابقت، شمولیت اور لزومیت کے لحاظ سے بہت سے معانی ہیں۔ جب کسی پہ جس قدر کھولیں گے، کھلتے ہی جائیں گے اور جو کوئی جتنا بیان کر سکے گا، کر تا ہی رہے گا ۔ لیکن اس سب کے باوجود خدا اور رسولؐ کے کلام کے لا انتہا مطالب کا وہ نہ ختم ہونے والا خزانہ اسی طرح معمور رہے گا۔ کیونکہ کلام کی صفت علم کی صفت کا مظہر ہے جس طرح علم کی صفت وجود کی مظہر ہے ۔ لہذا جو کچھ وجود میں ہے وہی علم ہی سے منکشف ہوتا ہے۔ اور جو کچھ علم میں ہے وہ کلام سے پیدا ہوتا ہے ۔ پس یہ راز ہے کہ جب وہ ارادہ کرتا ہے کسی کام کا تو کہتا ہے ہو جا، اور وہ ہو جاتا ہے ۔ پس کلام الٰہی ذات کے تمام اعتبارات اور اُس کی شانوں کا مجموعہ ہے۔ چونکہ کمالاتِ خداوندی لا انتہا ہیں اس لیے کلام اللہ کے معانی کی بھی کوئی انتہا نہیں ۔ لہذا مخلوقات میں بھی گویائی (بولنے کی قوت) تمام انسانی کمالات کی ایک جامع مظہر ہے ۔ اور قرآن حکیم کی اس آیت کریمہ کو اس حال کی شرح سمجھیے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو بنایا اور اُسے گویائی سکھائی ۔ اور پھر ان سب میں انسانیت کا فرد کامل جو تمام اعلیٰ کمالات کو ختم اور تمام کرنے والا ہے (ان پہ خدا کی رحمت اور سلامتی ہو) تمام فصیح بیانوں سے سب سے بڑا فصیح البیان ہے ۔ اور ہم نے تمھیں پُر مغز باتیں عطا کیں، انھی کی شان میں ہے خدا کی قسم کفار کو یہ چیلنج کہ اس جیسی کوئی ایک سورۃ بنا لاؤ، ان کے مخالفوں کے منہ پہ ایک طمانچہ تھا ۔ اور یہ آیت کریمہ کہ اگر تم سچے ہو تو اللہ کے سوا اپنے کوئی اور گواہ اور شاہد لے آؤ، بھی انھی کے مخالفوں کی گردن پر ایک گھونسہ ہے۔ جس طرح قوت گویائی کلام الٰہی کے تمام اسرار و رموز کے معانی کے بیان سے قاصر ہے، اسی طرح احادیثِ نبویؐ کی تمام

باریکیوں اور خوبیوں کو بیان کرنے سے بھی عاجز ہے۔ قیامت تک جو کوئی بھی جو کچھ بیان کرتا ہے گا وہ کم اور ناکافی ہوگا۔ اور مخلص محمدیؐ جنھوں نے حقیقت کے اظہار سے بہرہ مند ہونے کی سعادت پائی ہے، اُنھوں نے اس معاملے سے پردہ اُٹھا دیا ہے۔ وہ شہرِ علم کے دروازے کا آستانہ ہیں، اور سید ہونے کے ناطے وہ اہلِ بیت میں شامل ہیں، بلکہ وہ خود مطلق درمیان میں ہیں ہی نہیں۔ وہی اک نور واحد ہے نسلاً بعد نسلٍ ظہور پذیر ہو رہا ہے۔ اور رموز و اسرار کا انکشاف کرتا ہے، اگرچہ بُعدِ زمانی و مکانی کے لحاظ سے وہ ان سے بہت دور ہیں، لیکن جان اور ایمان کے لحاظ سے اسی نور سے متصل ہیں۔ خدا کا شکر صد شکر کہ یہ ظاہری دوری باطنی قرب کے لیے مددگار ثابت ہوئی اور راستے کی یہ طوالت ختم ہوئی۔ رباعی:

یک عمر ز دور میشنیدم اورا
در بر بخیال می کشیدم اورا
اکنوں کہ چو آئینہ رسیدم پیشش
خود را او دید و من ندیدم اورا

ترجمہ رباعی: اک عمر یعنی مدت مدید اور عرصۂ بعید تک تو ہم دُور ہی سے اس کے متعلق سنتے رہے اور عالمِ خیال ہی میں اُسے اپنے سینے سے بھینچتے رہے۔ اب جب آئینے کی طرح ہم اس کے سامنے آئے تو میں نے اُسے نہیں دیکھا، اس نے خود ہی اپنے آپ کو دیکھا ہے۔ (مصنف خود رباعی کی کڑیاں یوں کھولتا ہے) دُور سے سننے سے مُراد ہے عارفانِ حق کی زبانی حقائق کو سننا اور اس علم سے متعلق کتابوں اور رسالوں کو پڑھنا۔ عالمِ خیال میں بغل گیر ہونے سے مُراد ہے قصداً اور تکلفاً ان کیفیات کا مطالعہ کرنا، اور ذکر اذکار اور اوراد و وظائف میں ہمیشہ مشغول رہنا ہے۔ آئینے کے سامنے جانے سے مراد ہے حضوری و شہودِ ذات، اور حقیقت کا انکشاف، اس وقت مشاہدۂ عرفان کی نسبت سوائے ذاتِ حق تعالیٰ اور کہیں نہیں۔ کیونکہ اللہ کو نہیں جانتا مگر اللہ ہی اور نہیں ذکر کرتا اللہ کا مگر اللہ ہی۔ پس عین وصال میں بھی محرومی دامن گیر ہے اور ہمیشہ رسائی و حیرت دست و گریبان۔ اگر دل دلدار کے ہاتھ میں نہ ہوتا تو صبر و قرار کو کون چھین لے جاتا۔ اور یہ کیوں کہتے کہ مومن کا دل خدائے رحمان کی دو انگلیوں کے درمیان ہے۔ جس طرف چاہتا ہے اُسے موڑ دیتا ہے۔

ایسے وقت میں وصل و محرومی دونوں ایک دوسرے کے عین ہیں ۔ رسائی و حیرت دونوں یکساں ۔ اگر اپنی مظہریت اور مشاہدے پہ آنکھ کھولے تو وہ سرتاپا اسی کی تجلی سے بھرپور اور اُسی کے نور سے نورٌ علیٰ نور ہوتا ہے ۔ اور اگر اپنی موہوم خودی اور اجنبیت پہ نگاہ کرے تو سراسر ہجر و فراق ، مہجور اور قرب کی بساط سے دُور ، گویا عین رسائی میں بھی حیرت ہے ۔ اور عین حیرت میں بھی دیدارِ ذات ہے ۔ دیدار و وصل کی حالت میں بیقراری ہے اور کمال اختیار کے باوجود لاچاری ۔ لہذا آئینۂ دل قلب کے نام سے موسوم ہوا جو ان حالات میں الٹ پلٹ کرتا ہے اور خدائے رحمان کی انگلیاں اسمائے ذات کے ظہورات میں جو اس کے ہاتھ کی قدرت سے ظاہر ہوئے اور انگلیاں مثبت و منفی ظہور ۔ لہذا خدائے رحمان کی رحمت کہ ایجاد کا منبع و مبدا ہے وہی مومن کے قلب کو ایک حالت سے دوسری حالت میں بدل دیتی ہے تاکہ اُسے تمام اسماء کی مظہریت حاصل ہو جائے ۔ پس وہی ہے جس نے پیدا کیا انسان کو اپنی محبت میں اور اُسے اپنی صورت میں ڈھالا اور دیکھتا ہے اس کی طرف شوق کی نظر سے ہر وقت جس طرح کہ دیکھتا ہے ایک خوبصورت آدمی اشتیاق کی نگاہ سے اس عورت کی طرف جو کہ اُس کے ہاتھ میں ہوتی ہے ۔ پس جو بندے ہیں ان کے لیے ہوں گے چہرے اس دن تر و تازہ اور دیکھ رہے ہوں گے اپنے رب کی طرف نور کے ساتھ ۔ اور اپنی صورت پہ بنایا کا مآخذ یہ حدیث شریف ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آدم کو رحمان کی صورت پہ بنایا ۔ اور اس امر کا راز کہ حدیث شریف میں اسم رحمان ہی کو کیوں خصوصیت سے لایا گیا ہے ، یہ ہے کہ اسم رحمان بھی اسم اللہ کی طرح تمام اسماء کا جامع ہے ۔ اور اس اسم سے مراد بھی وہی جامع مرتبہ ہے ۔ جو اسم اللہ پر دلالت کرتا ہے ۔ جیساکہ قرآن شریف میں ہے کہ تم خواہ اللہ کو پکارو خواہ رحمان کو ۔ اس قدر فرق ہے کہ اسم اللہ میں تنزیہی غلبہ ہے اور اسم رحمان میں تشبیہی جانب فائق ہے ۔ لہذا مطلب یہ ہوا کہ اُس ذات سبحانہٗ نے انسان کو رحمان کی صورت پہ پیدا کیا ۔ یعنی اُسے مرتبۂ جامعہ کا منظر بنایا ۔ اور اُس میں تمام کمالات جمع کر دیے ۔ اور چونکہ صورت کی تخلیق میں تشبیہی معنوں کا اظہار ہے لہذا حدیث شریف میں وہ اسم لایا گیا جس میں تشبیہی جانب فائق تھی ۔ لہذا انسانی حقیقت حق سبحانہٗ تعالیٰ کے کمالات کی صورت کے ظہور کا آئینہ ہے ۔ جس طرح آئینے میں دیکھنے والے کے عکس کے سوا کچھ نہیں ہوتا ۔ لہذا اللہ تعالیٰ نے انسان کو زمین پہ اپنا نائب بنایا ۔ اے لوگو !

اگر تم چاہتے ہو اس کی آئینہ داری - پس پاکیزہ کرو اپنے دلوں کو خطرات سے اس کے ذکر کے ساتھ، کیونکہ وہ چیزیں دل کے آئینے کو مکدر کر دیتی ہیں، اور حدیثِ نفس شیطان کے پلید کاموں میں سے کام ہے - پس اے لوگو! اگر چاہتے ہو کہ اس کی آئینہ داری کی حقیقت کا انکشاف تم پر بھی ہو جائے تو اپنے دلوں کو ماسوی اللہ کے خیالات سے پاک رکھو، کیونکہ ماسوی اللہ کے خیالات اور حدیثِ نفس دل کے آئینے کو مکدّر اور تاریک بنا دیتے ہیں - یہ تو شیطانی عمل سے بھی ناپاک ہوتے ہیں - یعنی کہ اگر تمھارا ارادہ ہو کہ تم پر اس آئینہ داری کی حقیقت آشکارا ہو جائے، اور تمھیں بھی مشاہدۂ ذات نصیب ہو تو اپنے دلوں کو ماسوی اللہ کے خیالات سے پاک کر لو، کیونکہ ایسے خیالات اور نفسانی باتیں دل کے آئینے کو مکدر اور تاریک کر دیتی ہیں، اگرچہ ہر آدمی کمالات خداوندی کی جامعیت کا آئینہ ہے، مگر ان کے دلوں پر غفلت اور ماسوی اللہ کے خیالات کے زنگ نے ان کے آئینوں کو گدلا اور تاریک کر دیا ہے - ؎

موجِ دریای ہوس اینجا غبارِ سینہ است   گر شود ایں آب ساکن تختۂ آئینہ است

یہاں ہوا و ہوس کے سمندر کی موجیں اس کے سینے کا غبار بن گئی ہیں - اگر یہ لہریں نہ اُٹھیں اور پانی ساکن ہو جائے تو وہ سطح آب شیشے یا آئینے کا تختہ بن جائے - جب تک اس زنگ اور کدورت کو رگڑ کر دور نہیں کریں گے اور ذکر اذکار اور اوراد و وظائف کے صیقل سے اُسے مانجیں گے نہیں، وہ دیکھنے کے قابل نہیں ہوگا - نہ ہی اس کی جلوہ گاہ بن سکے گا - اس کدورت کا باعث اور ان ماسوی اللہ کے خیالات کا موجب یہی اس کی خودی کی شیطنت ہے اور ان کا شیطان ان کا اپنا نفس ہے، جو ان کے دلوں میں وسوسہ ڈالتا ہے - ہر وقت وسوسے ڈالتا ہے، سوائے اللہ کے ان بندوں کے، جن کے دلوں پر مشاہدۂ ذات کا غلبہ ہے - چونکہ اللہ کے نیک بندوں یعنی عارفانِ ذاتِ حق کے دلوں پر حق تعالیٰ کے مشاہدے کی کیفیت کا ہر دم غلبہ رہتا ہے، شیطان کی ان تک دسترس نہیں ہوتی، سو وہ ان پر غلبہ نہیں پا سکتا - اگر تقاضائے بشریت کی وجہ سے یا اس آیت کریمہ کے بموجب کہ انھیں شیطان نے ڈگمگا دیا، کبھی اُسے تھوڑا بہت تصرف حاصل ہو بھی جائے، تو وہ تصرف کسی شمار میں نہیں آتا - پھر جلد ہی اللہ تعالیٰ کی اعانت اور عنایت سے وہ تصرف دُور ہو جاتا ہے - بات غالب آنے والی چیز کی ہو رہی ہے اور اس مذکورہ بالا آیت کریمہ کے مطابق عارفانِ حق پر چونکہ مشاہدۂ ذات ہی غالب رہتا ہے اس لیے ان پر شیطان کا کلّی غلبہ نہیں ہو سکتا - اللہ کے یہ دوست خدا کے اُس دشمن سے محفوظ رہتے

ہیں۔ وہ اس مردود شیطان سے خدا تعالیٰ کی پناہ مانگتے ہیں اور اُس کی رضا و تسلیم سے اس کی اعانت کے طلبگار ہوتے ہیں۔ جب شیطنت وہی خودی کا دعویٰ ہے تو جب ہم نے خدا کی پناہ لے لی اور اپنے آپ کو اس کے وجود کی اوٹ میں چھپا لیا تو ہم شیطان کے شر سے محفوظ ہو گئے، اور یہی حقیقت ہے اس بات کی جو کہتے ہیں، کہ اعوذ باللہ یا لاحول ولا قوۃ پڑھنے سے شیطان بھاگ جاتا ہے۔ جب انانیت کا دعویٰ ہی جاتا رہا، یعنی شیطان ہی بھاگ گیا تو تسلیم و رضائے حق حاصل ہو گئی۔ کیونکہ وہی دلی مرادیں اور نفسانی خواہشیں دل کو ناراحت اور تنگ کرتی رہتی ہیں۔ اب مکمل سکون قلب نصیب ہوگیا۔ اور قلب اس حضرتِ سلام کی آئینہ داری سے مرتبۂ تسلیم سے شرفیاب ہوگیا۔ اور یہ حدیث قدسی کہ محبانِ حق کا گوش، گوشِ حق نیوش اور ان کی چشم، چشمِ حق بین بن جاتی ہے، بھی اسی آئینہ داری ہی کی خبر دیتی ہے۔ وہ امانت جسے انسان نے اپنے ذمے لے لیا اس سے مراد یہی جامعیت ہے، اگرچہ امانت کا بوجھ انسان نے اُٹھایا ہوا ہے لیکن ذاتِ حق کی اعانت ہی اس کی باربردار ہے۔ بادشاہ کے عطیوں کو اسی کی سواریاں ہی اُٹھا سکتی ہیں۔ یہ آئینہ داری سوائے حضرت انسان کے اور کسی کو حاصل نہیں۔ اور نہ ہی جامعیت کی اس امانت اور حقیقت کا کوئی اور حامل ہوا۔ کمالاتِ الٰہیہ کی یہ امانت آئینہ داری کی راہ سے اسی امین کو سپرد کی گئی۔ چونکہ آنکھ۔ کان، ہاتھ پاؤں اور دیگر تمام ظاہری اعضا کے عکس میں اسی شخص کی صورت ہوتی ہے جو اس آئینے کے سامنے ہو۔ لہذا حدیث شریف میں یہ آیا ہے کہ میرے محبوب بندے جن کانوں سے سنتے ہیں وہ کان میں بن جاتا ہوں اور جن آنکھوں کے ساتھ دیکھتے ہیں وہ آنکھیں میں بن جاتا ہوں۔ امکانی حقیقت کا آئینہ خود تو وجود اور وجودی کمالات سے معرا ہے، اس لیے واجب الوجود نے اپنی شمولیت سے اُسے وجود عطا فرمایا۔ رباعی:

اے آنکہ ہمیشہ در خیال اوئی
یا طالب دولت وصال اوئی
از خود آ نہمہ کمال اورا
چوں آئینہ مظہر جمال اوئی

ترجمہ رباعی: اے وہ انسان جو ہمیشہ اس کے خیالوں میں مگن رہتا ہے یا اس کے وصل کی سعادت

کا دائمی طلبگار رہتا ہے ۔ اس کے یہ سارے کمالات خود اپنے آپ سے طلب کر، کیونکہ تو اُسی کے حُسن و جمال کا مظہر ہے ۔ (بقول مصنف) اگر تو حق تعالیٰ کے حضور و شہود کی نسبت کے حصول کے خیالات میں کھویا رہتا ہے یا قرب و وصال خداوندی کا طلبگار رہتا ہے ۔ تو اپنے آپ کو پالے اور اپنے آئینہ دل سے مُنہ نہ موڑ ۔ ہمیشہ اپنے قلب کے تزکیہ و تصفیہ میں کوشاں رہو، کیونکہ تم بھی آئینے کی طرح خود ہی حسنِ باکمال کبریائی کے مظہر ہو ۔ اسی لیے کہتے ہیں کہ جس نے اپنے آپ کو پہچان لیا اس نے خدا کو پہچان لیا ۔

هوالناصر

شروع اللہ کے نام سے جو نہایت مہربان اور بہت رحم والا ہے

ہر قسم کی تعریف اللہ تعالیٰ کے لیے ہے جس نے ہمیں دیے اقوال ثابتہ ہر جانب سے اور ہمیں ثابت قدم کیا ان کے ساتھ زندگی میں اور موت کے بعد، اور ہمیں توفیق دی موت کے ذکر کی کثرت کے ساتھ جو کہ لذات کو فنا کر دینے والی ہے۔ اور بچایا ہمیں شہوات اور لذتوں سے اور درود و سلام ہو اُس کے رسولؐ سید السادات پر اور آپؐ کی آلؑ اور اصحابؓ پر جو زندہ اور مُردوں میں سے بہتر بن ہیں۔ اما بعد یہ چھیالیسواں[۴۶] باب ہے جو قولِ ثابت سے موسوم ہے۔ پس ثابت قدم کیا ہے اللہ نے ان لوگوں کو جو ایمان لائے قولِ ثابت کے ساتھ، اور دُنیا کی زندگی میں اور آخرت میں اور گمراہ کرتا ہے اللہ ظالموں کو اور کرتا ہے جو چاہتا ہے۔ اور قول ثابت سے مراد وہ کلام ہے جو مواقع کے مطابق ہو اور جو کوئی اس پر ایمان لایا اور اس پہ اس نے اعتقاد رکھا وہ اس سے نتیجہ نکال لیتا ہے۔ ثابت قدم رکھتا ہے اللہ تعالیٰ دُنیا کی زندگی میں صراطِ مستقیم پر، شریعت پر استقامت کے ساتھ اور محفوظ رکھتا ہے لوگوں کے شرّ سے اور خناس کے وسوسوں سے اور آخرت میں بناتا ہے اللہ تعالیٰ اس کی قرار گاہ جنت میں، اور گمراہ کرتا ہے ان ظالموں کو جنھوں نے روگردانی کی اس قولِ ثابت سے، عقل اور نقل کے ساتھ، دُنیا میں اور پہنچاتا ہے اُنھیں آخرت میں آگ کی طرف، اور کرتا ہے جو چاہتا ہے حکمت بالغہ کے تقاضے کے تحت اور اُس سے سوال نہیں کیا جاتا اس چیز کے بارے میں جو وہ کرتا ہے

حالانکہ لوگوں سے سوال و جواب ہوگا۔

موت اور لذّات کی طرف نفس کی توجہ
اور ترک لذات میں سعادت کے حصول کے بیان کا باب

موت کا یقینی ہونا اور ہر کسی پر اس کا وارد ہونا تو اک مسلمہ امر ہے۔ اس امر میں کسی کو بھی شک و شبہ نہیں۔ لہذا موت کا ایک نام یقین ہے۔ جیساکہ اس آیت کریمہ کہ اپنے رب کی عبادت کرتے رہو، یہاں تک کہ آپ کو موت آجائے، کی تفسیر میں مفسرین نے یقین سے مراد موت ہی لی ہے۔ یہ سمجھ لینا چاہیے کہ جس طرح حق تعالیٰ نے حیات کو پیدا کیا ہے اور حیات ایک وجودی امر ہے۔ اور وجود بشرط شے کا مظہر ہے۔ اسی طرح اس نے موت کو بھی پیدا کیا ہے اور موت بھی اک وجودی امر ہے اور وجود بشرطِ لاشے کا مظہر ہے۔ تیار شدہ چیزوں میں زندگی، موت ہی کے لیے تیار کی گئی ہے ملاحظہ ہو یہ آیت کریمہ کہ وہ خدا بڑا عالی شان ہے جس کے قبضے میں تمام سلطنت ہے۔ اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ جس نے موت اور حیات کو پیدا کیا تاکہ تمھاری آزمائش کرے کہ تم میں سے کون شخص عمل میں اچھا ہے۔ موت اگر عدمی معنوں میں ہوتی تو حق سبحانہٗ تعالیٰ اس پہ لفظ خلق کا اطلاق نہ کرتا، کیونکہ عدم کو پیدا کرنا تو اک بے معنی بات ہے۔ پس وہ شخص جو زندگی میں شخصیت رکھتا تھا مرنے کے بعد وہ میت بن گیا اور حضرت وجود دونوں حالتوں میں اس پہ تجلی ریز ہے۔ وہی زندہ کرتا ہے وہی مارتا ہے۔ نفس ناطقہ جو زندگی میں جسم پر قابض تھا اس وقت اس نے یہ قبضہ چھوڑ دیا ہے۔ اور دوسرے جہان میں تصرف پیدا کر لیا ہے۔ خداوند کریم نے اپنے کلام میں موت کے پیدا کرنے کو حیات کی تخلیق پہ مقدم رکھا ہے۔ وہ زندگی پہ قوت کے غلبے کی وجہ سے ہے۔ اس بات کا سبھی کو یقین ہے کہ زندگی، موت کا دیباچہ ہے۔ اُس کا نتیجہ فوت ہونا ہے۔ اس موت کے ذکر کو پہلے لانے سے معلوم یہ ہوتا ہے کہ اس آیت کریمہ کے مطابق کہ آپ کو بھی مرنا ہے اور ان کو بھی کہ یہ جہان (دُنیا) جسے ہم عرصۂ حیات کہتے ہیں موت کا جہان ہے۔ اور وہ جہان جو اس کے بعد ظہور پذیر ہوگا وہ عالم حیات ہے جسے زوال نہیں، اس لیے زندگی کو نیند سے تعبیر کیا گیا ہے جو موت کی بہن ہے۔ اور موت کو لفظ تنبیہہ سے تعبیر کیا گیا جو زندگی کے لوازمات میں سے ہے۔ لوگ

سب کے سب سورہے ہیں جب وہ مرجائیں گے بیدار ہوجائیں گے۔ اور اس تقریر کا ماحصل یہ ہے کہ اس حکم کہ مرنے سے پہلے مرجاؤ کی فرمانبرداری کے مطابق اپنی عین حیات میں بھی اپنے آپ کو حق حیّ و قیوم کے ارادے کے سامنے اس طرح بے قوت اور بے دست و پا سمجھنا چاہیے۔ جیسے کہ میّت غسل دینے والے کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ اور یوں راضی برضا ہو کر فنا فی اللہ ہوجانا چاہیے اور مُردوں ہی طرح زندگی گزارنی چاہیے اور اپنے ارادوں اور اپنی مرادوں کی نفی کرکے جسمانی اور نفسانی خواہشات سے بالکل خالی ہوجانا چاہیے تاکہ موت کے بعد ابدی حیات جو بقائے الٰہی ہی کا پرتو ہے احسن طریق سے رونما ہو۔ اور موت کی تلخی جس کا ذائقہ سبھی کے لیے ناگوار ہے، تمھاری طبیعت کے لیے خوشگوار بن جائے۔ یہ آیت کریمہ کہ اگر تم سچے ہو تو موت کی تمنّا کرکے دکھاؤ اسی معانی کی صراحت کرتی ہے۔ نفس کی مرغوب چیزوں کی طرف انتہائی توجہ اور اُس کی شہوتوں کی طرف رجحان کی حقیقت یوں ہے کہ یہ نفس امارہ ایک حیوانی و وحشی نفس ہے، اور نفس لوامہ اور نفس مطمئنہ یعنی قوت عاقلہ اور نفس ناطقہ کی مانند اک وجودی امر ہے۔ اور مرغوب چیزیں اور نرم و نازک اشیا بھی وجودی امر ہیں اور وجود بذاتہٖ اپنے کمالات کا تقاضا کرتا ہے، جس طرح نفس ناطقہ کے مرتبے میں وجود ملائم چیزوں کے حصول کا تقاضا کرتا ہے جو مشتمل ہیں علم الٰہیات، علم معقول اور بارگاہِ ذات سے انس و محبت اور فرشتوں سے مشابہت کی تمنا کرنے سے، اسی طرح وہی وجود نفس حیوانی میں اپنی مرغوب چیزوں کے حصول کا تقاضا کرتا ہے جو کھانے پینے اور اپنے بھائی بندوں پر غلبہ پانے اور دیگر حیوانی شہوتوں پر مشتمل ہے، کیونکہ پانی کا رنگ وہی ہوتا ہے جو اس کے ظرف (برتن) کا ہو۔ ظاہرا اپنے مظہر ہی کے رنگ میں ظہور پذیر ہوتا ہے، باوجودیکہ اس کی بیرنگی میں کوئی فرق نہیں آتا۔ لہٰذا سعادت لذتوں کے ترک کرنے ہی سے حاصل ہوتی ہے اور شہوانی لذتوں سے قطع تعلق نجات کا باعث ہوتا ہے۔ کیونکہ جسمانی لذتیں طبعاً نیچے کو، مادیات کی طرف کھینچتی ہیں اور عالی مرتبوں سے روکے رکھتی ہیں اور جو حقیقت و کیفیت نفس میں راسخ ہوجاتی ہے، اس کا ملکہ پیدا ہوجاتا ہے تو اس کے آثار نفس پر مرتب ہوجاتے ہیں انسان خواہ زندہ ہو یا مردہ۔ اور موحّد اور عارف لوگ جو سبھی کو اچھا سمجھتے ہیں، سب کچھ اللہ ہی طرف سے جانتے ہیں، ہر خیر و شر کو اللہ تعالیٰ ہی سے نسبت دیتے ہیں، وہ اک علٰحدہ بات ہے اور عین ایمان ہے، کیونکہ اللہ کے سوا کسی کو قدرت اور قوت حاصل نہیں۔ اور

یہ ملحد اور بے دین لوگ اپنے افعال کو حق سبحانہ' کی ذات ہی سے نسبت دیتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ اس بہانے سے ہر ناشائستہ کام کر سکیں۔ یہ ایک بالکل الگ بات ہے اور عین کفر اور گمراہی ہے جیسا کہ اس آیت کریمہ سے ظاہر ہے کہ آپ نے اس شخص کی حالت بھی دیکھی جس نے اپنا خدا اپنی خواہش نفسانی کو بنا رکھا ہے۔ رباعی:

بر خلق در واہمہ بازست اینجا
ہنگامہ غفلت ست و آز ست اینجا
ہر چند کہ تارِ زندگے کوتاہ است
عمر طول اصل دراز ست اینجا

اس دُنیا میں خلق خدا پہ وہم و توہمات کا دروازہ کھُلا ہوا ہے، اور یہاں غفلت اور حرص و آز کا ہنگامہ بپا ہے۔ ہر چند کہ عمر کی رسی (ڈور) نہایت کوتاہ ہے مگر خواہشوں کے طول کی عمر یہاں بہت دراز ہے (مصنف کی اپنی وضاحت یوُں ہے) خلق کے معنی مخلوقِ خدا کے ہیں، جس سے مُراد بنی نوع انسان ہے، جو اشرف المخلوقات کہلاتی ہے اور اسی سے یہاں تخاطب ہے۔ اور واہمہ ایک مادی قوت جس کے مفردات دماغ میں پائے جاتے ہیں۔ اور یہاں مُراد ہے اعتباری توہمات میں پھنسے رہنے سے، جس کا پھل غفلت اور حرص ہے۔ عرصہ حیات کو استعارۃً تار (ڈور) کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ کیونکہ زمانہ ایک متصّل واحد ہے اور تار (ڈور) بھی ایک مستقل واحد۔ پس ہر چند کہ زندگی کی ڈور کوتاہ ہے یعنی اتنی طویل نہیں۔ غافلوں کی خواہشات کو طویل اس لیے کہا کہ وہ ان کی زندگی کی طوالت سے بڑھ کر ہیں، اور یہ اس لیے ہے کہ موت کے وقت کا چونکہ کسی کو علم نہیں، اسی اُمید میں کہ شاید وہ عمر طبعی کو پہنچ پائے انسان کے لیے خواہشوں کا یہ طول وبالِ جان بن جاتا ہے۔ اس کی آل اولاد اور پس ماندگان کے لیے تشویش و تردد کا باعث بن جاتا ہے۔ مرنے کے بعد وہ ان کی بقا میں اپنی بقا سمجھتا ہے۔ اگرچہ یہ دونوں باتیں ہی لغو در لغو ہیں۔ لیکن آدمی اس سے بڑھ کر الجھاؤ اور گورکھ دھندے میں اسیر۔ اگرچہ موت کی یاد جو اپنی اعتباری صورت کا عدم ہے۔ ان لذات کو مٹانے والی ہے اور طبعاً دل کو ان فانی محبوب چیزوں سے ٹھنڈا کر دیتی ہے۔ لیکن زندگی جو اک وجودی اثر ہے حال حاضر میں سبھی کو حاصل ہے۔ وہ اجازت، نہیں دیتی کہ کوئی آدمی اپنے نفس کی مرغوب و محبوب

چیزوں یعنی کمالاتِ وجودی سے باز رہے۔ اور قرآن پاک فرماتا ہے کہ تم بدون خدائے رب العالمین کے چاہے کچھ نہیں چاہ سکتے۔ یہاں متن میں موت کو اعتباری صورت کا عدم کہا اور اوپر شروع میں امرِ وجودی کہا اور مرتبۂ بشرط لا کا مظہر قرار دیا۔ اس سے کلام کے معانی میں کوئی الجھاؤ یا تنازعہ نہیں سمجھنا چاہیے کیونکہ اعتباری عدم بھی وجود بشرط لا ہی کی قسم ہے اور عدم مطلق نہیں۔ اس کے ساتھ ہی علام اعتباری کا اجرا ہم نے اعتباری صورت میں کیا اور کسی شخص کی ذات پر جائز نہیں رکھتا۔ کیونکہ کسی چیز کے قبول کرنے کی حالت میں قابل و مقبول کا وجود ضروری ہے جیسا کہ پیوستگی اور علیحدگی کی حالت میں ڈھانچے کا وجود باقی رہتا ہے۔ اتصال کی حالت میں اسے وحدت حاصل تھی اور علیحدگی کی شکل میں کثرت لاحق ہوگئی۔ ڈھانچہ اکائی میں، اکائی ہے اور کثرت میں، کثیر۔ کثرت کے وقت اتّصالی صورت کی فنا میں کثرت کی صورت کا وجود ہے، لہذا اگر اتصالی فنا کو علیحدگی کے ثبوت کے لحاظ سے وجودِ بشرطِ شی اور اتصال چھن جانے کے اعتبار سے وجود بشرط لا شے کیا جائے، تو دونوں صورتوں میں جائز ہے۔ یہ اعتباری عدم اعتباری وجود میں شامل ہے۔ اور باہم نقیض (ضد) ہونے کا احتمال نہیں رہتا۔ پس سمجھ لیں کہ حیات جو شے کی شرط سے امرِ وجودی ہے اور اس وقت حاصل بھی ہے وہ موت پر جو مرتبہ بشرط لا کا مظہر ہے غالب آجاتی ہے اور اپنی مرغوب چیزوں سے ہاتھ نہیں کھینچتی اور نفس کے خلاف کام کرنا آدمی کو ناگوار گزرتا ہے اور یہ خواہشات بھی اللہ جلِ شانہٗ کی خواہش کی شاخیں ہیں۔ لہذا عوام اپنے کاموں میں معذور ہیں اور خواص اپنے افعال میں مجبور ہیں۔ جیسا کہ قرآن شریف میں آیا ہے کہ جسے اللہ ہدایت دے دے اُسے کوئی گمراہ نہیں کر سکتا اور جسے وہ گمراہ کر دے اُسے کوئی ہدایت نہیں دے سکتا۔ غرضیکہ دم مارنے کی گنجائش نہیں۔ اگر سبھی لوگ عارف اور خود آگاہ ہوتے تو دُنیا دُنیا ہی نہ ہوتی۔ اور اگر سبھی لوگ غافل ہوتے تو آخرت کے چہرے سے پردہ کون اُٹھاتا۔ دانا کا کوئی کام حکمت سے خالی نہیں ہوتا۔ ظاہر بین حضرات اپنی سمجھ سے معذور ہیں کہ اس جہان کی فانی زندگی سے آگے کا انھیں کچھ پتہ ہی نہیں اور اپنی بقا اسی زندگی تک محدود سمجھتے ہیں، اور اسی کے تقاضے کے مطابق اپنے مقاصد و خواہشات کی تکمیل میں چمٹے رہتے ہیں۔ دیکھئے یہ آیت کریمہ کہ آپ ان کو حیاتِ دنیوی کا حریص عام آدمیوں سے بھی بڑھ کر پائیں گے۔ اور اربابِ حقیقت اپنی دید (دیدار) کے ہاتھوں مجبور ہیں۔ ان کے دلوں پر دوسری دُنیا کے دروازے کھول دیے گئے ہیں اور

حریم خاص کا رستہ بتادیا گیا ہے۔ جس طرح دنیاوی امور کا انتظام سرانجام دینا اہلِ دُنیا کے وجود سے متعلق ہے۔ اسی طرح دنیا و آخرت کی اصلاح عارفوں کے وجود سے متعلق ہے۔ وہ دونوں جہانوں کے مالک ہیں۔ یہ دُعائے قرآنی کہ اے ہمارے پروردگار ہمیں دُنیا میں بھی بہتری عنایت کیجیے اور آخرت میں بھی بہتری دیجیے۔ اور یہاں دُنیا سے حسنہ وہی ہے جو عاقبت میں مددگار اور آخرت کی کھیتی کے لیے سازگار ہو۔ جو اچھا ہے، اُسے پکڑلو اور جو خراب ہے، اُسے چھوڑدو۔ اگرچہ تحقیقی نگاہ میں کلیّت اور اطلاق کے اعتبار سے جو کچھ بھی موجود ہے، وہ خوب و مرغوب ہے کہ وہ خیر محض ہی کا وجود ہے، جیساکہ قرآن شریف میں آیا ہے کہ خدا نے یہ سب کچھ یونہی فضول ہی تو پیدا نہیں کیا۔ لیکن جزئیت اور تقید کے لحاظ سے بعض کو خیر سے اور بعض کو شر سے نسبت ہے۔ اور ہر شخص جو حقیقی جز ہے اور خاص تقید سے مقیّد ہے، اُسے چاہیے کہ وہ اپنی بھلائی کے لیے کوشاں رہے اور برائیوں سے باز رہے اور حقیقت بینی سے آنکھ نہ چُرائے یعنی تیری سعادت اسی میں ہے کہ ادنیٰ چیز کو اعلیٰ کی خاطر چھوڑدے اور اپنی ضرورت کے مطابق اکتفا کرے اور اعتباری وجود کو بھی اعتباری عدم میں داخل سمجھے تاکہ تو ہمیشہ باقی رہنے والے وجود مطلق کے مشاہدے سے محروم نہ رہ جائے اور ہمیشہ عجز و انکسار سے رہے جو امکانی حقیقت کا نصیبہ ہے۔ اور سب کچھ ہونے کے باوجود بھی خود کو کچھ نہ سمجھے۔ ماسوی اللہ کے پھندوں سے نجات پانے کی سعادت اور حق تعالیٰ کے قرب و نزدیکی کا شرف اسی میں ہے اور وضیع چیز جیسی ادنیٰ چیز عبارت ہے دنیاوی فانی امور سے، اور شریف عبارت ہے عاقبت کی نعمتوں سے جنھیں باقیات صالحات کہتے ہیں (یعنی آثارِ خیر جو بعد از مرگ بھی باقی رہتے ہیں) اور دُنیا کو ترک کیے بغیر اللہ تعالیٰ سے مضبوط نسبت پیدا نہیں ہوسکتی۔ اور دُنیائے فانی کے مشاغل سے قطع تعلق کیے بغیر اللہ تعالیٰ سے مضبوط نسبت پیدا نہیں ہوسکتی۔ اور دُنیائے فانی کے مشاغل سے قطع تعلق کیے بغیر آثارِ خیر اور نیک کاموں کی سعادت میسّر نہیں ہوتی۔ اور ضرورت کے مطابق سے مراد اسی قدر جو بندے کو طلب اور کسب کیے بغیر خود بخود مل جائے۔ اور اللہ تعالیٰ اس کا خود ضامن ہے۔ جو کچھ نہیں ملا وہ فی الحقیقت ضروری بھی نہ تھا۔ کیونکہ ضرورت کے لیے لزومیت (لازم ہونا) ضروری ہے۔ اور لزومیت کے لیے وجود ضروری ہے۔ پس جو کچھ مقدر میں ہو اسی پر اکتفا کرنی چاہیے اور اپنی طرف سے خواہشات اور ہوا و ہوس کو نہیں کرنا چاہیے کیونکہ وہ زائد از ضرورت ہیں۔ اور اعتباری وجود یعنی اس موجودیت کو بھی اپنے تصوّر میں آنے والی معدومیت

میں داخل کر لینا چاہیے تاکہ مرتبۂ لابشرط جو مرتبۂ بشرط شے اور بشرط لاشے دونوں میں شامل ہے، یعنی وجود مطلق کا مشاہدہ نصیب ہو جائے اور یہ امکانی عدمیت جو عرفانی نگاہ میں ممکنات کا خاصہ ہے تیرے وجود کو شکستہ رکھے۔ اور باوجودیکہ تمام مراتب تجھ میں ظہور پذیر ہوں ان کا اظہار نہ کرے۔

رباعی:

خمار خمار گر ز صہبا بشکست
در محتسب از غرور مینا بشکست
اینہا ہمہ بندۂ ہوائی نفس اند
من بندہ آنکسم خود را بشکست

ترجمہ رباعی: شراب خوار کا خمار شراب پینے ہی سے اُترتا ہے، اور محتسب یعنی متقی لوگ اپنے زہد کے غرور سے مینا ہی کو توڑ دیتے ہیں۔ یہ سب ہوا و ہوس کے بندے ہیں۔ میں تو اس مرد کامل کا غلام ہوں جس نے اپنے نفس کو شکست دی ہو۔ (مصنف خود تلمیحات رباعی کی وضاحت یوں کرتا ہے کہ) شراب خور یعنی نفس کا بندہ اگر اپنے خمار کی بدمزگی اس دُنیائے فانی کی لذات و خواہشات سے دُور کرتا ہے اور یا محتسب یعنی متقی و پرہیزگار اپنے زہد و تقویٰ کی رعونت کی وجہ سے اپنے کڑوے کسیلے لفظوں سے مخلوقِ خدا کے دل توڑتا ہے اور یہ دونوں ہوا و ہوس کے جال سے رہائی نہیں پا سکے۔ اور نہ ہی اس مقام کی طرف بڑھے ہیں جسے فنافی اللہ کہتے ہیں۔ پس کسی ایسے مرد کامل سے عقیدت و ارادت پیدا کر کے اس کی غلامی اختیار کرنی چاہیے تاکہ ہمیشہ اپنے نفس اور خودی و تکبر کے مارنے میں کوشاں ہو۔ نہ کہ تن پروری کے لیے دُنیا داروں کی طرح شہوات و لذات میں پھنس جائے۔ اور نہ ہی خشک مغز زاہدوں کی طرح اپنے زہد و تقوی پہ نازاں ہو کر دوسروں کو حقارت سے دیکھے، خود کو صاف سمجھ کر اُن سے دُور رہے۔

هوالناصر

شروع اللہ کے نام سے جو نہایت مہربان اور بہت رحم والا ہے

ہر قسم کی تعریف اللہ تعالیٰ کے لیے ہے جس نے ہمیں پلایا مشروبِ طہور، اور محفوظ رکھا ہمیں ان چیزوں سے جو ممنوع ہیں۔ اور درود و سلام اللہ کے رسول محمد صلعم پر جنھیں اس نے بھیجا ہدایت اور نور بنا کر اور آپؐ کی آلؓ اور اصحابؓ پر جن کی سعی و کوشش کو اللہ نے قبول فرمایا۔ اما بعد یہ سینتالیسواں[۴۷] باب ہے جو شراب طہور سے موسوم ہے۔ پلائے اللہ ہمیں اور تمھیں شرابِ طہور اپنے جذبات میں سے اس جذبے کے ساتھ جو جنؔ و انس کی عبادت میں پوشیدہ ہے۔ پس جو یہ پاکیزہ شراب پیتا ہے یا جس نے یہ شرابِ طہور پی اور اس سے افاقہ زائل نہ ہوا اور نہ ہی نشے کے غلبے کے ساتھ حدودِ شریعہ اس پر وارد ہوتی ہیں۔ اور دیتا ہے اللہ تعالیٰ اُسے ہوش عین نشے کی حالت میں، فرق اور جمع کے مرتبے کے درمیان۔ اور لوگوں کے اندر اس کی ہدایت کثیر ہو جاتی ہے، اور جان لیتا ہے ہر شخص اپنے مشرب کو۔ یہ کیفیت انتہائی عمدہ کیفیات میں سے ہے۔ اور یہ مقام بلند مقامات میں سے ہے۔ کیا ہی اچھا ثواب اور اعلیٰ درجے کی قیام گاہ۔ اور یہ ع۔ ن جامع بلاتا ہے خلائق کو عام دعوت کے ساتھ اسی نعمت کی طرف جو نعمتِ عظمیٰ ہے۔ اور عطا فرمائی ہے اللہ نے اُسے یہ نعمت طریقِ محمدیؐ کے طفیل و فیض سے (اس طریق کے صاحب پر درود و سلام ہو) اور وہ کہتا ہے اپنے اس نشے کے ساتھیوں کو کہ کھاؤ اور پیئو، اور زمین میں فساد نہ پھیلاتے پھرو۔ اور جس پہ غالب آگیا نشہ

اور تجاوز کر گیا حدِ ادب سے، نہیں پہنچتا نفع اس سے لوگوں کو اکثر اوقات بلکہ ہوتا ہے ضرر کا باعث۔ پس یہ کیفیت ردّی کیفیات میں سے ہے۔ اور یہ مقام گھٹیا مقامات میں سے ہے۔ اور بہت بُری شراب ہے اور بُری قیام گاہ ہے۔ سوائے اس کے کہ اس حالت والا شخص اپنے نفس میں سزا نہیں دیا جائے گا کیونکہ اربابِ سُکر معذور ہوتے ہیں اور جو نہیں چکھتا کسی کیفیت میں سے کوئی چیز یا نہیں پہنچتا نشے کے درجے کو اور کہتا ہے نشے میں غرق لوگوں کی طرح ایسے قول جن کی اجازت نہ ہو، اور عمل کرتا ہے ایسے جو مشروع نہیں ہیں نقل یا تقلید سے وہ ملحد ہے۔ اور تو دیکھتا ہے لوگوں کو نشے کی حالت میں، حالانکہ وہ نشے میں نہیں، بلکہ اللہ کا عذاب بھی بڑا شدید ہے۔ ہم اللہ کی پناہ میں آتے ہیں اپنے نفوس کے شرّوں سے اور اپنے اعمال کی برائیوں سے۔ تم بری ہو اُس سے جو میں کرتا ہوں اور میں بری ہوں اس سے جو تم کرتے ہو۔

مستی و ہُشیاری کے بیان کا باب

مستی عبارت ہے عارف کی عقل پر، نفس ناطقہ کے سرور کے غلبے اور مشاہدۂ ذات کی شدت سے، کیونکہ ایسی حالت میں اعتبارات کا امتیاز اور حفظِ مراتب کا شعور باقی نہیں رہتا۔ جیسا کہ ظاہری مستوں کو ان کے ظرف سے بڑھ کر ظاہری مستی لاحق ہونے سے امتیاز این و آن نہیں رہ جاتا، یہی کفرِ طریقت ہے جو مراتب میں اسلام سے برتر ہے۔ اس کیفیت کو مرتبۂ جمع کہتے ہیں اور جمع الجمع کا مرتبہ یہ ہے کہ مطلق بے خبری اور بے ہوشی طاری ہو جاتی ہے۔ اور امتیاز اور بے امتیازی دونوں گم ہو جاتے ہیں۔ اور مستی کی یہ حالت مقام فنا فی اللہ سے نکلتی ہے۔ اس وقت عارف کی نگاہ سے ماسوی اللہ کا وجود بالکل گم ہو جاتا ہے، بلکہ شہود و مشاہدے کا ادراک بھی باقی نہیں رہتا۔ اور ہشیاری عبارت ہے غائب ہونے اور زوال سے ہوش میں آنے کے بعد عارف کے علم و امتیاز کی طرف رجوع کرنے سے۔ اس مقام پر حقیقت کا کماحقہٗ انکشاف ہوتا ہے اور مکمل مشاہدہ میسر آتا ہے۔ اور حفظِ مراتب کے سب آداب کو عین اسی طرح ملحوظ خاطر رکھا جاتا ہے جیسا کہ چاہیے، جس سے قلبی سکون و طمانیت حاصل ہوتی ہے اور وہ مستانہ لغزشیں جاتی رہتی ہیں، اور عارف اپنے اس جہانِ تو پہ خود ہی غالب آجاتا ہے۔ اس کی کم ظرفی کی کوئی علامت ظاہر نہیں ہوتی۔ یہی حقیقی اسلام اور

شریعت کی حقیقت ہے۔ اس درجے کو فرق بعد الجمع بھی کہتے ہیں۔ اور یہ مرتبہ مقام بقا باللہ سے نکلتا ہے۔ اس وقت عارف کو خالق میں مخلوق اور مخلوق میں خالق نظر آتا ہے۔ نہ ہی حق خلق کے لیے حجاب بنتا ہے، اور نہ ہی مخلوق خالق کا حجاب بنتی ہے۔ اس مقام پر عارف حق سبحانہٗ کے قرب اور نزدیکی سے بہت محظوظ ہوتا ہے۔ اور وہ دُنیاداروں کی ہدایت کا باعث اور خلق خدا کو محبوب تک پہنچانے کا موجب بنتا ہے۔ قصہ کوتاہ توحید سے پیدا ہونے والے غلبے اور مستی کی کیفیت کا بیان ہو چکا۔ **رباعی:**

نے جام و نہ مینا و نہ ساقی و نہ مل

نے مطرب و نے نغمہ نہ چنگ نہ دہل

ہنگامۂ ہستی ست چہ حسن و چہ عشق

نے شمع نہ پروانہ نہ گل نے بلبل

ترجمہ رباعی: یہاں نہ کوئی جام ہے، نہ مینا، نہ ساقی، نہ شراب، اور نہ مغنّی، نہ نغمہ، نہ چنگ و رباب، نہ چنگ ڈھولک، ہنگامہ حسن ہے، نہ شمع ہے، نہ پروانہ، نہ گل، نہ بلبل، یعنی کیا حسن اور کیا عشق، یہ سب اسی ذات ہی کے ہنگامے ہیں۔ (مصنف اس رباعی کی تلمیحات و استعارات کی کڑیاں خود یوں کھولتا ہے کہ) جام و مینا سے مراد مادی تعینات کے ظروف ہیں اور ساقی سے مراد (عقول عشرہ) فرشتے ہیں کہ ان ادنیٰ معلولات کو فیض پہنچانے والے ہیں۔ شراب سے مراد اعتباری وجود، مطرب سے مراد نفوسِ ناطقہ، نغمہ سے قول، فعل اور چنگ و دُہل، ہوش و حواس اور اعضا ہیں۔ ہنگامۂ ظہور سے مُراد وجود ظلی ہے۔ ہستی سے مراد ذات الوجود جو موجودات کا نشانِ امتیاز ہے۔ حُسن سے مُراد مرتبۂ ظاہر وجود اور عشق سے باطن وجود کا ظاہر وجود کی طرف رجحان سے ہے۔ پروانہ و بلبل عارفوں کی شخصیتیں ہیں، جو ذاتِ الٰہی کے عاشق ہیں اور اس امر کا مظہر ہیں کہ میں نے پسند کیا کہ میں اُسے جان لوں۔ اس کے عشق کی آگ میں جلتے ہیں اور اُس کے دردِ عشق سے گریہ وزاری کرتے ہیں۔ شمع و گُل سے مُراد خوب و خوبصورت مظاہر اور ہمیشہ باقی رہنے والے آثارِ خیر ہیں۔ جنھیں ہادیٔ مطلق نے اپنے بندوں کی رہنمائی کے لیے آشکارا کیا ہے اور وہ آثارِ خیر جنّت کے پھول ہیں جو اللہ کے نیک بندوں کے دماغ کو انس و محبت کی خوشبو سے معطر رکھتے ہیں۔ حاصل مطلب یہ کہ کیا مادّی

تعینات اور کیا علوی مبادیات (ملائکہ)، کیا ان کا اعتباری وجود اور کیا انسانی نفوس ناطقہ، کیا ان کے افعال و اقوال، ہوش و حواس اور اعضا، کیا وجودِ ظلّی کا ظہور جو بننے اور سنوارنے کا باعث ہے، سبھی عدمی معانی ہیں اور مفہومات سے زیادہ اور کچھ نہیں۔ اس میں سوائے ذات الوجود کے اور کچھ بھی موجود نہیں، کیونکہ وہ موجودیت کا امتیازی نشان ہے۔ یہ سبھی اس مرتبۂ وجود کے ظہورات ہیں جو ظاہری اور باطنی مراتب میں نمودار ہیں اور ان معانی کے مشاہدہ کرنے والے عارف، اپنے علوم، نیکیوں اور آثارِ خیر کے باوجود اس مرتبے کے سامنے ہیچ ہیں اور زوال پذیر۔ آگاہ رہو کہ ہر چیز اللہ کے سوا باطل ہے۔ اس بیان سے ہمارا مقصد حضرت وجود کے حضور میں موہوم اعتباری مراتب کی فنا و ہلاکت اور ان بے بُود ظواہر کی نفی کے اظہار سے ہے۔ یہ رباعی مستوں کے مذاق کے مطابق موزوں ہوئی اور حالتِ جمع کی خبر دیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ (اسی بنا پر) مست حضرات نے کیف و حال کے غلبے سے خلاف شرع کلمات پہ زبان کھولی اور نہ گائے جانے والے گیت گائے۔ ہم نے ان بزرگوں کے غیر شرعی کلمات کو یہاں لانا مناسب نہیں سمجھا، اور بعض بے ادبوں کی طرح بعض آیات و احادیث کو بھی انہی خلاف شرع کلمات میں شمار کرنے کو خلافِ ادب سمجھا۔ لہٰذا ان غیر شرعی کلمات کی مثالیں بیان نہیں کیں۔ صاحبِ علم حضرات سے تو یہ بات ڈھکی چھپی نہیں کہ مغلوب الحال مستوں نے مستی کے عالم میں کیا کیا کچھ نہیں کہا۔ لیکن اکابر دین نے فرق و جمع کے اس باوقار مقام پہ ہرگز ایسی باتیں اپنی زبان سے نہیں نکالیں اور محویت کے باوجود امتیاز کی ڈور کو ہاتھ سے نہیں چھوڑا اور سنتِ الٰہی کے مطابق وہ سب کے ساتھ ہوتے ہوئے بھی سب سے الگ ہیں، اور سب سے الگ ہوتے ہوئے بھی سب کے ساتھ ہیں۔ وہ بزرگ جو فنا کی منزل کے بعد ہشیاری و بقا کے مقام تک پہنچے ہیں، وہ مخلوق خدا کی ہدایت کا باعث اور منصب ارشاد کے مالک ہیں۔ عوام کی اصلاح کا کام انہی کو سونپا گیا ہے۔ ان پہ ظاہر و باطن، وحدت و کثرت، یکسانیت اور اجنبیت، خلق سے رجوع اور قطع تعلق سب کی حقیقت صاف ظاہر اور پوری طرح منکشف ہے۔ ان کی چشم بصیرت سے سب حجاب دُور ہو گئے ہیں۔ انھیں پورا سکونِ قلب حاصل ہوتا ہے۔ ان چہروں میں سے کوئی چہرہ ان سے چھپا ہوا نہیں ہوتا۔ احسن بیان کے شرف سے شرف یاب ہیں۔ فرق و جمع، تنزیہہ و تشبیہہ، امتیاز و اتحاد کے جامع ہیں۔ وہ مطالب کو یوں بیان کرتے ہیں کہ حقیقی معنوں کا اظہار بھی ہو جائے اور شریعت

کے پاسِ ادب کا دامن بھی نہ چھوٹے۔ وہ عین مستی میں بھی باہوش ہیں اور کمال جوش وخروش میں بھی خاموش ہیں۔ تعلقات رکھتے ہوئے بھی بے تعلق ہیں، اور بے تعلقی کے باوجود بھی تعلق دار ہیں۔ رباعی:

مینا است اگر سرِ نیاز ست اینجا
جام ست دگر دیدۂ باز ست اینجا
این محفل درد جای بدمستی نیست
ھشدار کہ بزم امتیاز ست اینجا

ترجمہ رباعی: یہاں نیاز مند سر مینا کی مانند ہے۔ جام کو کھلی ہوئی دیدۂ عبرت سمجھیے، دُنیا کی یہ محفل دردِ مستی و بدمستی کی جگہ نہیں، خبردار یہ بزم امتیاز ہے۔ (مصنف خود ان الفاظ و کلمات کی یوں عقدہ کشائی کرتا ہے) مینا اس سر کی صورت ہے جو زمین پر سجدۂ مستانہ میں ہے اور جام کی شکل اس ڈبڈبائی آنکھ کی صورت ہے جس نے دیدۂ عبرت کھول رکھا ہے اور جو محو حیرت ہے۔ لہذا یہ محفل ہستی یعنی یہ عالم جہاں کثرت جلوہ گر ہے اور جو امتیاز ہی کی شاخ ہے۔ یہ بدمستی یا بے امتیازی کی جگہ نہیں۔ یہاں ہوش و ہشیاری کو مستی پر غالب رکھنا چاہیے اور حفظ مراتب کو ملحوظ خاطر رکھنا چاہیے۔ کیونکہ یہ محفل، محفل امتیاز ہے اور انسان محرم راز ہے۔

اشاریہ

مرتب: اشفاق انور

قرآنی آیات کریمہ کی فہرست

صفحہ کتاب	سورہ
۶۹۵	العنکبوت : ۵
۶۹۶	النساء : ۱۲۲
۷۰۱	البقرہ : ۱۴۸
۷۰۵	البقرہ : ۱۸۹
۷۱۶	الزمر : ۱۸
۷۱۷	البقرہ : ۱۲۴
۷۳۰	الاحزاب : ۴۳
۷۳۷	ہود : ۲ ـ ۴
۷۳۷	المومنون : ۳۳ ـ ۳۸
۷۳۸	یوسف : ۸۷
۷۳۹	البقرہ : ۱۸۵
۷۳۹	البقرہ : ۳۷
۷۴۰	الزمر : ۵۳
۷۴۴	البقرہ : ۱۸۶
۷۴۵	النساء : ۱۱۶
۷۴۷	المائدہ : ۶۹
۷۴۸	النساء : ۱۷ ـ ۱۸
۷۴۹	المزمل : ۱۰
۷۴۹	الاعراف : ۲۳
۷۵۲	المومنون : ۱۴
۷۶۱	النساء : ۶۳
۷۶۲	الاعراف : ۱۸۷
۷۶۲	یٰس : ۵۱ ـ ۵۳
۷۶۹	الحدید : ۶
۷۷۱	یوسف : ۱۰۱
۷۷۲	طٰہٰ : ۴۲
۷۷۹	ابراہیم : ۲۷
۷۸۷	الحج : ۲

فارسی رباعیات کی فہرست

صفحہ ۳۰۰

گر باد نسیم مست بوئ تو گذشت
درفصلِ بہار محو روئ تو گذشت
یارب چہ قدر بخلق نزدیکے ترے
ہر کس کہ زخود گذشت سوئ تو گذشت

صفحہ ۳۰۵

اے بہر شفاعتِ دو عالم لائق
دارم زجناب تو اُمّید واثق
بے شبہہ ز خورشید حقیقت بجہاں
تو مخبر صادقے چو صبحِ صادق

صفحہ ۳۰۶

زد شعلہ چو حُسن دلفروزش خوانند
گل کرد چو نارعشق سوزش خوانند
خلق ست عبارت از ظہورِ خالق
خورشید چو جلوہ کرد روزش خوانند

صفحہ ۳۱۴

آں دل کہ ہمہ وقت بحق آگاہ ست
خالی زخیالات گدا و شاہ ست
در دیدۂ مردانِ اہلِ تحقیق
مصراع دگر زبہر بیت اللہ است

صفحہ ۳۲۱

بحرِ ہستی کہ درخروش افتادہ است
از کشمکش علم بجوش افتادہ است
یارب مددے بیخودئ مے خواہم
یارِ دو جہاں بر سرِ ہوش افتادہ است

صفحہ ۳۲۹

لوحِ امکان بود ز ہستی سادہ
واجب ہمہ جا فیض وجودی دادہ
الآن کما کان اگر در نظر ست
ممکن ز عدم پائے برون ننہادہ

صفحہ ۳۳۵

ہر جا کہ ترا جلوہ گرے خواہد بود
دل در صد پردہ دری خواہد بود
در صفحۂ امکان طرفتے نبود
باطل چوں سطح جوہری خواہد بود

صفحہ ۳۴۱

ادراک مرا دعوت پیدائے کرد
فریاد کہ رسوئ شناسی کرد
زیں پیش نداشتم دماغ صحبت
علم ست کہ ایں انجمن آرائ کرد

صفحہ ۳۴۲

مہمانی رنج و المے باید کرد
دل را آباد از غمے باید کرد
فرصت مفت ست ای ز ہستی غافل
شادی گر نیست ماتمے باید کرد

صفحہ ۳۴۵

اینجا کہ بلیۂ تقید عام ست
آزادگی ای درد خیال خام ست
زندانی قید ہستیم چوں طاؤس
ہر نقش پری کہ ہست چشم دام ست

صفحہ ۳۴۸

مارا نبود گذر دران کو کہ توئی
تو ہر سو کس نرفتہ آنسو کہ توئی
گو آئینہ وجہ تو باشد ہمہ خلق
نتواں دیدن ترا ازاں رو کہ توئی

صفحہ ۳۵۲

یک چند چو شعلہ سر فرازی کردیم
یک عمر ہماں زبان درازی کردیم
ہر سرکشی کہ بود آخر چو شمع
دیدیم کہ صرف جان گدازی کردیم

صفحہ ۳۵۴

از ہر بد و نیک چون خوش و شاد شدیم
وارستہ ز خار و گل چو شمشاد شدیم
یعنی دل را کہ باعث تفرقہ بود
بستیم بزلف یار و آزاد شدیم

صفحہ ۳۵۷

گاہے سحر ست و گاہ شام ست اینجا
از کون و فساد انتظام است اینجا
مانند شرر مشو ز ہستی غافل
در چشم زدن کار تمام ست اینجا

صفحہ ۳۵۹

مطرب فانی و بزم و ساقی فانی
یا ہر کہ شدی آہ ملاقی فانی
بردار دل از کثرت بے بود جہان
اللہ بود باقی و باقی فانی

صفحہ ۳۶۵

سر رشتۂ نظم ما و من برہم خورد
چوں گل اوراق ایں چمن برہم خورد
تا جمع نمودیم چو مژگان خود را
اے درد ہزار انجمن برہم خورد

صفحہ ۳۶۸

دیدیم کہ در مجمع خلق بے بود
اے درد بجز نزاع ماؤ تو نبود
از محفل کثرتِ تشتت بنیاد
برخاست دل و بکنج وحدت آسود

صفحہ ۳۷۲

ہر لحظہ دریں خانہ کہ من می آیم
گم کردہ رہ شناختن می آیم
چون شعلہ کجا رسیدنم منظورست
پیوستہ برون ز خویشتن می آیم

صفحہ ۳۸۴

اے درد اگر صفای جانے داری
آئینہ حُسن بے نشانے داری
دانم بمحیط خویش واصل کردی
چون سیل تو ہم طبع روانے داری

صفحہ ۳۸۸

شخص انسان کہ شانِ اعظم دارد
دارد بخود آنچہ ہر دو عالم دارد
لیکن نتوان یافت ہجر کونین
آن گوہر نایاب کہ آدم دارد

صفحہ ۳۹۲

در عجز بساز کبریائیم ہمہ
در کسوتِ فقر باغنائیم ہمہ
ما درویشان بسان اکسیر اے درد
خاکیم اگرچہ کیمیائیم ہمہ

صفحہ ۳۹۷

اے آنکہ بخواب صد تماشا دیدی
باغ وچمن وبہار وگلہا دیدی
نیرنگے عالم مثالت کل کرد
پنہاں بتو بود اینکہ پیدا دیدی

صفحہ ۴۰۹

خواہی کہ ہمہ را از الٰہی فہمی
چیزے کہ برون ز فہم خواہی فہمی
اے بے خبر از خویش چہ امکان دارد
اسرارِ الٰہی تو کماہی فہمی

صفحہ ۴۱۳

ہر چند کہ بر لب ست حرف خندہ
دل کہ نکشید لیک طرف خندہ
چون گل ہمہ مشق سینہ چاکیہا بود
عمرے کہ نمودہ ایم صرفِ خندہ

صفحہ ۴۱۵

ہر چند ہمہ باب و رنگ آمدہ ایم
از شیشۂ دل بزیر سنگ آمدہ ایم
تا کے بگر فتگیٔ خاطر سازیم
چون غنچہ ز وضع خویش تنگ آمدہ ایم

صفحہ ۴۲۲

اطلاق و تقیید ارچہ ممتاز جلی ست
در مرتبۂ جمع ہمان یک معنی ست
فہمیدہ بعمرو و زید بنگر کاینجا
جزئیست تخیل و تعقل کلّی ست

صفحہ ۴۲۵

وحدت نظّارہ باز یکتای اوست
کثرتِ آئینہ دار پیدائی اوست
تنزیہ تجرد و تقیید تشبیہ
سلب و ایجاب وصف رعنائی اوست

صفحہ ۴۲۹

آنانکہ بتحصیل نظر داشتہ اند
خرمن خرمن ز علم انباشتہ اند
ہشدار کہ برگ و بار گل خواہد کرد
زین تخم کہ در مدرکہ ات کاشتہ اند

صفحہ ۴۳۸

یک عمر قدم براہِ افسانہ زدیم
یک چند درِ کعبہ و بتخانہ زدیم
المنۃ للّٰہ کہ آخر اسے درد
در میکدہ آمدیم و پیمانہ زدیم

صفحہ ۴۴۲

لا یوجد جاعل ولا مجعول
لا یثبت فاعل ولا مفعول
ادرکت وجودہ بلا شرط الشیٔ
لا علۃ ہہنا ولا معلول

صفحہ ۴۴۶

یا رب اذا عرفت انت المعبود
انی لسجدت حیث انت المسجود
ایاک وجدت فی جمیع الاعیان
یا من انت الوجود انت الموجود

صفحہ ۴۵۱

ہر چند نشد دل حقیقت آگاہ
پائے طلبش ہست ہمان بر سر راہ
یا رب تو ز خود نشان دہی باند ہے
مائیم و ہمیں نام تو اللّٰہ اللّٰہ

صفحہ ۴۵۵

کیفیتِ چشم تو بخاطر جا کرد
مستغنیم از کشمکش صہبا کرد
بر دل چو نظر فتاد از خود رفتم
این شیشہ مگر نشأ می پیدا کرد

صفحہ ۴۵۸

از حرص گر آستین فشاند دل ما
چون شہ چہ عجب کہ حکم راند دل ما
اے درد ہزار سلطنت مفت بود
جمعیت اگر بہم رساند دلِ ما

صفحہ ۴۶۱

بر دوش ہوا ربستہ نفس محمل ما
حیف ست کہ پیچید ہوسے در دل ما
حل ہمچو حباب گرچہ کردیم ولی
جز ہیچ نداشت در گرہ مشکل ما

صفحہ ۴۶۷

اے درد چگویم ارچہ گویم باتو
خود بے خبرم خبر گرچہ گویم باتو
او باطنِ محض گشتہ از فرطِ ظہور
ظاہر تر ازین دگر چگویم باتو

صفحہ ۴۶۹

آن جلوہ کہ از طاق شعورم افگند
بر خرمن ہوش برقِ طورم افگند
تا پردۂ راز اقربیت ندرد
نزدیک شد آنقدر کہ دورم افگند

صفحہ ۴۷۲

درد آنکہ ازو گرمی صد محفل بود
روزی دو سہ زین پیش دریں منزل بود
رو بر سرِ تربتش بجان آگاہ
کاین مشتِ غبار در زمانی دل بود

صفحہ ۴۷۵

گر بودہ ام و اگر نبودم رفتم
بال و پر جلوۂ کشودم رفتم
در آئینہ وہم چو تمثال اے درد
روئی کہ نداشتم نمودم رفتم

صفحہ ۴۸۰

ہرچند کند زمانہ کارِ خود را
از دست مدہ تو اعتبارِ خود را
از پای فتادہ ایم چوں سایہ ولی
برکس نفگندہ ایم بارِ خود را

صفحہ ۴۸۴

با اہل دول تندی خو پیدا کن
در گلشن سکنت نمو پیدا کن
تا کے زہوٗ ازلی بعزت آتش
در خاک نشین و آبرو پیدا کن

صفحہ ۴۹۲

اللہ قضی کل قضا و قدر
واللہ بہ وجود نفع و ضرر
لاحول ولاقوۃ الا باللہ
لولا تاثیرہ لما کان اثر

صفحہ ۴۹۶

حمد المنزہ یسمی بالہ
فی الخلق و جدتہ والکان سواہ
مراۃ جمالہ جمیع الاکوان
فی الکون لمارات الایاہ

صفحہ ۵۰۲

گر مست شبابیم خراب شیبیم
در محو ہنر تمام صرف عیبیم
ستارِ عیوب نیست جز پردہ غیب
مشتاق لقائی پردہ پوشش غیبیم

صفحہ ۵۰۳

ہر چند ہزار جلوہ پیدا کردیم
آخر ہمہ را بخویش اخفا کردیم
چون کاغذ آتش زدہ در ما پوشید
چیزے کہ بصد چشم تماشا کردیم

صفحہ ۵۰۷

شب زندہ نداشتی و مُردن نزدیک
مانندِ سحر نفس شمردن نزدیک
دل غافل و مرگ بر قریب ست اے دردؔ
گل خندد و ہنگام فسردن نزدیک

صفحہ ۵۱۰

بر جرم گر اعتراف خواہی کردن
دل را اے دردؔ صاف خواہی کردن
یارب تو کریم و من گنہگار توام
دانم آخر معاف خواہی کردن

صفحہ ۵۱۶

اندیشہ اگرچہ پیش و پس میگردد
در خویش دلی بہر نفس مے گردد
نے ہیچ کسے شریک ہستی باشد
ہستی نہ شریک ہیچ کس مے گردد

صفحہ ۵۲۵

اے درد اگر محرم راز قدمی
با شادی و غم چرا عبث متہمی
اے ہیچ ترا باین خیالات چہ کار
جائے کہ وجود ست تو آنجا عدمی

صفحہ ۵۳۰

آن جلوہ بدیدہ یار خواہد گردید
رازش ہمہ آشکار خواہد گردید
آئینہ ایم و خود پرست ست نگار
ناچار بما دو چار خواہد گردید

صفحہ ۵۳۲

ناچار اے درد درجہاں باید زیست
ہر چند کہ شد زیست گراں باید زیست
مُردن بمراد خود میسر گر نیست
چندی بمراد دیگران باید زیست

صفحہ ۵۳۴

ہر چند کہ صد جلوہ نمود ست وجود
واکردن چشم غیر حیرت ننمود
معلوم نگشت انکشافی کہ مراست
بکشود کہ و بر کہ کشاد و چہ کشود

صفحہ ۵۳۷

جاہل طبعیم گرچہ باعرفانیم
طفلیم ہنوز گو مطوّل خوانیم
حرفے از ما دگر نباید پرسید
ما مبدائیم آنچہ ما مبدانیم

صفحہ ۵۴۰

ای درد ازین بزم اگر باخبرے
بیہودہ چرا بہر طرف می نگرے
بر خویش چو شمع چشم بکشا کاینجا
ہر چند ستادہٴ ولی میگزرے

صفحہ ۵۴۴

کو مرِ حقیقتے کہ ہستیش نگفت
گو کہ ہر معنیٴ کہ ایجاد نسفت
گلزار جہاں طرفہ سرائی کہن است
اے درد کدام گل کہ اینجا نشگفت